

Resized



**Some of the .pdf files we
download from the Internet
are not fit enough for direct
upload to our servers.**

**We enhance the scan quality
of such files, resize the
pages to a standard size
which is reasonably
readable and then upload them.**

فہرست

آخری سیوٹ

آنکھیں

اب اور کہنے کی ضرورت نہیں

اس کا پتی

اللہ دتا

الو کا پٹھا

انتظار

اولاد

ایک ٹریس کی آنکھ

باجھ

باسط

بچنی

بسم اللہ

بغیر اجازت

بلاؤز

بلونت سنگھ جی بھیا

بھنگن

بلیو

پریشانی کا سبب

پہچان

آخری سیلوٹ

یہ کشمیر کی لڑائی بھی کچھ عجیب و غریب تھی۔ صوبیدار رب نواز کا دماغ ایسی بندوبست بن گیا تھا جس کا گھوڑا خراب ہو گیا ہو۔

چھپلی بڑی جنگ میں وہ کئی محاذوں پر لڑ چکا تھا مارنا اور مرنا جانتا تھا چھوٹے بڑے افسروں کی نظروں میں اس کی بڑی توقیر تھی، اس لیے کہ وہ بڑا بہادر سردار اور سمجھدار سہاوی تھا۔ پلانوں کا ڈھنگل کام ہمیشہ اسے ہی سونپتے تھے اور وہ ان سے عہدہ برآ ہوتا تھا۔ مگر اس لڑائی کا ڈھنگ ہی نرالا تھا دل میں بڑا اولولہ، بڑا جوش تھا۔ جھوک پیاس سے بے پرواہ صرف ایک ہی لگن تھی، دشمن کا صغلیا کر دینے کی، مگر جب اس سے سامنا ہوتا تو جانی پہچانی صورتیں نظر آتیں بعض دوست دکھائی دیتے، بڑے بغلی قسم کے دوست، جو چھپلی لڑائی میں اس کے دوش بدوش، اتحادیوں کے دشمنوں سے لڑے تھے، پر اب جان کے پیاسے بنے ہوئے تھے۔

صوبیدار رب نواز سوچتا تھا کہ یہ سب خواب تو نہیں چھپلی بڑی جنگ کا اعلان۔۔۔۔۔ بھرتی، قد اور چھاتیوں کی پیمائش، پی ٹی، چاند ماری اور پھر محاذ۔۔۔۔۔ ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر، آخر جنگ کا خاتمہ، پھر ایک دم پاکستان کا قیام اور ساتھ ہی کشمیر کی لڑائی، اوپر تلے کتنی چیزیں رب نواز سوچتا تھا کہ کرنے والے نے یہ سب کچھ سوچ سمجھ کر کیا ہے تاکہ دوسرے بوکھلا جائیں اور سمجھ نہ سکیں۔ ورنہ یہ بھی کوئی بات تھی کہ اتنی جلدی اتنے بڑے انقلاب برپا ہو جائیں۔

اتنی بات تو صوبہ پیدار رب نواز کی سمجھ میں آتی تھی کہ وہ کشمیر حاصل کرنے کے لئے لڑ رہے ہیں کشمیر کیوں حاصل کرنا ہے، یہ بھی وہ اچھی طرح سمجھتا تھا اس لیے کہ پاکستان کی بقاء کے لیے اس کا الحاق اشد ضروری ہے، مگر نشانہ باندھتے ہوئے اسے جب کوئی جانی پہچانی شکل نظر آ جاتی تھی تو وہ کچھ دیر کے لیے بھول جاتا تھا کہ وہ کس غرض کے لیے لڑ رہا ہے، کس مقصد کے لیے اس نے بندوق اٹھائی ہے، اور وہ یہ غالباً اسی لیے بھولتا تھا کہ اسے بار بار خود کو یاد کرنا پڑتا تھا کہ اب کی وہ صرف تنخواہ، زمین کے مربعوں اور ٹمغوں کے لیے نہیں بلکہ اپنے وطن کی خاطر لڑ رہا ہے، یہ وطن پہلے بھی اس کا وطن تھا، وہ اسی علاقے کا رہنے والا تھا جو اب پاکستان کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ اب اسے اپنے اسی ہم وطن کے خلاف لڑنا تھا جو کبھی اس کا ہمسایہ ہوتا تھا، جس کے خاندان سے اس کے خاندان کے پشت پشت کے دیرینہ مراسم تھے۔ اب اس کا وطن وہ تھا جس کا پانی تک بھی اس نے کبھی نہیں پیا تھا، پر اب اس کی خاطر، ایک دم اس کے کاندھے پر بندوق رکھ کر یہ حکم دے دیا گیا تھا کہ جاؤ، یہ جگہ جہاں تم نے ابھی اپنے گھر کے لیے دو اینٹیں بھی نہیں چنیں، جس کی ہوا اور جس کے پانی کا مزہ ابھی ابھی تک تمہارے منہ میں ٹھیک طور پر نہیں بیٹھا، تمہارا وطن ہے۔۔۔۔۔ جاؤ اس کی خاطر پاکستان سے لڑو۔۔۔۔۔ اس پاکستان سے جس کے سین دل میں تم نے اپنی عمر کے اتنے برس گزارے ہیں۔

رب نواز سوچتا تھا کہ یہی حال ان مسلمان فوجیوں کا ہے جو ہندوستان میں اپنا گھر بار چھوڑ کر یہاں آئے ہیں وہاں ان سب سے سب کچھ چھین لیا گیا تھا یہاں آ کر انہیں اور تو کچھ نہیں ملا البتہ بندوقیں مل گئی ہیں۔ اسی وزن کی، اسی شکل کی، اسی

مارکہ اور چھاپ کی۔

پہلے سب مل کر ایک ایسے دشمن سے لڑتے تھے جن کو انہوں نے پیٹ اور انعام و اکرام کی خاطر اپنا دشمن یقین کر لیا تھا۔ اب وہ خود دو حصوں میں بٹ گئے تھے۔ پہلے سب ہندوستانی فوج کہا کرتے تھے اب ایک پاکستانی تھا اور دوسرا ہندوستانی۔ ادھر ہندوستان میں مسلمان ہندوستانی فوج تھے رب نواز جب ان کے متعلق سوچتا تو اس کے دماغ میں ایک عجیب گڑبڑ سی پیدا ہو جاتی۔ اور جب وہ کشمیر کے متعلق سوچتا تو اس کا دماغ بالکل جواب دے جاتا۔۔۔۔۔۔ پاکستانی فوجی کشمیر کے لیے لڑ رہے تھے یا کشمیر کے مسلمانوں کے لیے؟ اگر انہیں کشمیر کے مسلمانوں ہی کے لیے لڑایا جاتا تھا تو حیدر آباد، اور جو ناگڑھ کے مسلمانوں کے لیے کیوں انہیں لڑنے کے لیے نہیں کیا جاتا تھا اور اگر یہ جنگ ٹھیٹ اسلامی جنگ تھی تو دنیا میں دوسرے اسلامی ملک ہیں وہ اس میں کیوں حصہ نہیں لیتے۔

رب نواز بہت سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ یہ باریک باریک باتیں فوجی کو بالکل نہیں سوچنا چاہئیں اس کی عقل موٹی ہونی چاہئے۔ کیونکہ موٹی عقل والا ہی اچھا سپاہی ہو سکتا ہے، مگر فطرت سے مجبور کبھی کبھی وہ چور دماغ سے ان پر غور کر رہی لیتا تھا اور بعد میں اپنی اس حرکت پر خوب ہنستا تھا۔

دریائے کشن گنگا کے کنارے اس سڑک کے لیے جو مظفر آباد سے کرن جاتی ہے۔ کچھ عرصے سے لڑائی ہو رہی تھی۔۔۔۔۔۔ عجیب و غریب لڑائی تھی رات کو بعض اوقات آسپہاڑیاں فائروں کے بجائے گندی گندی گالیوں سے گونج اٹھتی تھیں۔ ایک مرتبہ صوبیدار رب نواز اپنی پائٹون کے جوانوں کے ساتھ شب خون

مارنے کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ وہ ریچے ایک کھائی سے گالیوں کا شور اٹھا پہلے تو وہ گھبرا گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ بہت سے بھوت مل کر ناچ رہے ہیں اور زور زور کے قہقہے لگا رہے ہیں وہ بڑبڑایا ”خنزیر کی دم۔۔۔۔۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔“

ایک جوان نے گونجتی ہوئی آوازوں سے مخاطب ہو کر یہ بڑی گالی دی اور رب نواز سے کہا ”صوبیدار صاحب گالیاں دے رہے ہیں اپنی ماں کے یار“ رب نواز یہ گالیاں سن رہا تھا جو بہت اکسانے والی تھیں اس کے جی میں آئی کہ بزن بول دے مگر ایسا کرنا غلطی تھی، چنانچہ وہ خاموش رہا۔ کچھ دیر جوان بھی چپ رہے، مگر جب پانی سر سے گزر گیا تو انہوں نے بھی گلا پھاڑ پھاڑ کے گالیاں لڑھکانا شروع کر دیں۔۔۔۔۔ رب نواز کے لیے اس قسم کی لڑائی بالکل نئی چیز تھی۔ اس نے جوانوں کو دو تین مرتبہ خاموش رہنے کے لیے کہا، مگر گالیاں ہی کچھ ایسی تھیں کہ جواب دینے بنا انسان سے نہیں رہا جاتا تھا۔

دشمن کے سپاہی نظر سے اوجھل تھے رات کو تو خیر اندھیرا تھا، مگر وہ دن کو بھی نظر نہیں آتے تھے۔ صرف ان کی گالیاں نیچے پہاڑی کے قدموں سے اٹھتی تھیں اور پتھروں کے ساتھ ٹکرا کر ہوا میں چلی جاتی تھیں۔ رب نواز کی پانوں کے جوان جب ان گالیوں کا جواب دیتے تھے تو اس کو ایسا لگتا تھا کہ وہ نیچے نہیں جاتیں، اوپر کواڑ جاتی ہیں اس سے اس کو خاصی کوفت ہوتی تھی۔۔۔۔۔ چنانچہ اس نے جھنجھلا کر حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔

رب نواز کو وہاں کی پہاڑیوں میں ایک عجیب بات نظر آئی تھی۔ چڑھائی کی طرف کوئی پہاڑی درختوں اور بوٹوں سے لدی پسندی ہوتی تھی اور اترائی کی

طرف گنجی کشمیری، تو کے سر کی طرح۔ کسی کی چڑھائی کا حصہ گنجا ہوتا تھا اور اترائی کی طرف درخت ہی درخت ہوتے تھے چڑ کے لمبے تناور درخت، جن کے بٹے ہوئے دھانگے جیسے پتوں پر فوجی بوٹ بھسل بھسل جاتے تھے۔

جس پہاڑی پر صوبیدار رب نواز کی پٹانوں تھی، اس کی اترائی درختوں اور جھاڑیوں سے بے نیاز تھی۔ ظاہر ہے کہ حملہ بہت ہی خطرناک تھا مگر سب جوان بخوشی تیار تھے۔ گالیوں کا انتقام لینے کے لیے وہ بہت بے تاب تھے۔ حملہ ہوا اور کامیاب رہا۔ وہ جوان مارے گئے۔ چار زخمی ہوئے، دشمن کے تین آدمی کھیت رہے، باقی رسد کا کچھ سامان چھوڑ کر بھاگ نکلے۔

صوبیدار رب نواز اور اس کے جوانوں کو اس بات کا بڑا دکھ تھا کہ دشمن کا کوئی زندہ سپاہی ان کے ہاتھ نہ آیا جس کو وہ خاطر خواہ گالیوں کا مزہ چکھاتے۔ مگر یہ مورچہ فتح کرنے سے وہ ایک بڑی اہم پہاڑی پر قابض ہو گئے تھے۔ وائرلیس کے ذریعے سے صوبیدار رب نواز نے پٹانوں کو مقررہ مسجرا سلم کو فوراً ہی اپنے حملے کے اس نتیجے سے مطلع کر دیا تھا اور شاہباش وصول کر لی تھی۔

قریب قریب ہر پہاڑی کی چوٹی پر پانی کا ایک تالاب سا ہوتا تھا۔ اس پہاڑی پر بھی تالاب تھا، مگر دوسری پہاڑیوں کے تالابوں کے مقابلے میں زیادہ بڑا اس کا پانی بھی بہت صاف اور شفاف تھا۔ گو موسم سخت سرد تھا۔ مگر سب نہائے، وادنت بچتے رہے مگر انہوں نے کوئی پرواہ نہ کی۔ وہ ابھی اس شغل میں مصروف تھے کہ فائر کی آواز آئی۔ سب ننگے ہی لیٹ گئے جھوڑی دیہ کے بعد صوبیدار رب نواز خاں نے دور بین لگا کر نیچے دھلوانوں پر نظر دوڑائی، مگر اسے دشمن کے چھپنے کی

ادھر سے ادھر اُدھر فائر ہوئے، ادھر سے بھی جواباً گولیاں چلنے لگیں۔۔۔ صوبیدار رب نواز نے دور میں سے دشمن کی پوزیشن کا بغور مطالعہ کیا وہ غالباً بڑے بڑے پتھروں کے پیچھے محفوظ تھے۔ مگر یہ محافظ دیوار بہت ہی چھوٹی تھی زیادہ دیر تک وہ جتنے نہیں رہ سکتے تھے۔ ان میں سے جو بھی ادھر ادھر بٹتا، اس کا صوبیدار رب نواز کی زد میں آنا یقینی تھا۔

تھوڑی دیر فائر ہوتے رہے۔ اس کے بعد رب نواز نے اپنے جوانوں کو منع کر دیا کہ وہ گولیاں ضائع نہ کریں صرف تاک میں رہیں جو ٹہنی دشمن کا کوئی سپاہی پتروں کی دیوار سے نکل کر ادھر یا ادھر جانے کی کوشش کرے اس کو اڑا دیں۔ یہ حکم کر اس نے اپنے الف نگنے بدن کی طرف دیکھا اور بڑبڑایا ”خزمرہ کی دم-----کپڑوں کے بغیر آدمی حیوان معلوم ہوتا ہے۔“

لجے لجے وقتوں کے بعد دشمن کی طرف سے اکا دکا فائر ہوتا رہا یہاں سے اس کا جواب کبھی کبھی دے دیا جاتا۔ یہ کھیل پورے دو دن جاری رہا۔۔۔۔۔ موسم یک لخت بہت سرد ہو گیا۔ اس قدر سرد کہ دن کو بھی خون منجمد ہونے لگتا تھا، چنانچہ صوبیدار رب نواز نے چائے کے دو شروع کرا دیئے۔ ہر وقت آگ پر کیتلی دھری رہتی۔ جونہی سردی زیادہ ستاتی ایک دو اس گرم گرم مشروب کا ہو جاتا۔ ویسے دشمن پر یہ اثر نہ تھا۔ ایک ہفتا تو دوسرا اس کی جگہ دو روزین لے کر بیٹھ جاتا۔

فاصلہ زیادہ نہیں تھا رب نواز کے الفاظ دشمن تک پہنچ گئے، کیونکہ وہاں سے کسی نے کہا ”گالی ندوے بھائی“

رب نواز نے اپنے جوانوں کی طرف دیکھا اور بڑے جھنجھلائے ہوئے تعجب کے ساتھ کہا ”بھائی؟۔۔۔۔۔“ پھر وہ اپنے منہ کے آگے دونوں ہاتھوں کا بھونپو بنا کر چلایا ”بھائی ہوگا تیری ماں کا جتنا۔۔۔۔۔ یہاں سب تیری ماں کے بارہیں!“

ایک دم ادھر سے ایک زخمی آواز بلند ہوئی ”رب نواز!“
رب نواز کانپ گیا۔۔۔۔۔ یہ آواز اس پاس کی پیمائوں سے سر پھوڑتی
رہی اور مختلف انداز میں، رب نواز۔۔۔۔۔ رب نواز، دہرائی بالآخر خون منجمد
کروہنے والی سر وہوا کے ساتھ جانے کہاں اڑ گئی۔

رب نواز بہت دیر کے بعد چونکا ”یہ کون تھا“ پھر وہ آہستہ سے بڑبڑایا ”خزیر کی دم!“

اس کو اتنا معلوم تھا ٹیڈال کے محاذ پر سپاہیوں کی اکثریت 2/9 رجمنٹ کی ہے۔ وہ بھی اسی رجمنٹ میں تھا۔ مگر یہ آواز تھی کس کی؟ وہ ایسے بے شمار آدمیوں کو جانتا تھا۔ جو کبھی اس کے عزیز ترین دوست تھے کچھ ایسے بھی جن سے اس کی دشمنی تھی، چند ذاتی اغراض کی بناء پر لیکن یہ کون تھا جس نے اس کی گالی کا برامان کر اسے چیخ کر پکارا تھا۔

رب نواز نے دور بین لگا کر دیکھا، مگر پیڑی کی ہلتی ہوئی چھدری دائرہ میں اسے کوئی نظر نہ آیا۔ دونوں ہاتھ کا جھونپو بنا کر اس نے زور سے اپنی آواز ادھر پھینکی ”یہ کون تھا؟“ رب نواز بول رہا ہے۔۔۔۔۔ رب نواز۔۔۔۔۔ رب نواز“

یہ رب نواز، بھی کچھ دیر تک پیڑیوں کے ساتھ ٹکراتا رہا۔ رب نواز بڑبڑایا ”خنزیر کی دم!“ فوراً ہی ادھر سے آواز بلند ہوئی ”میں ہوں۔۔۔۔۔ میں ہوں رام سنگھ!“

رب نواز یہ سن کر یوں اچھال جیسے وہ چھلانگ لگا کر دوسری طرف جانا چاہتا ہے پہلے اس نے اپنے آپ سے کہا ”رام سنگھ؟“ پھر حلق پھاڑ کے چلایا ”رام سنگھ؟“۔۔۔۔۔ بوائے رام سنگھ۔۔۔۔۔ خنزیر کی دم!“

”خنزیر کی دم“ ابھی پیڑیوں کے ساتھ ٹکرا کر پوری طرح گم نہیں ہوئی تھی کہ رام سنگھ کی پھٹی پھٹی آواز بلند ہوئی ”بوائے کمہار کے کھوتے!“

رب نواز پھوپھوں کرنے لگا جوانوں کی طرف رعب دار نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ بڑبڑایا ”کہتا ہے۔۔۔ خنزیر کی دم!“ پھر اس نے رام سنگھ کو جواب دیا ”

اوئے بابائے کے کڑاہ پر شاو۔۔۔۔۔ اوئے خنزیر کے جھٹکے“
 رام سنگھ بے تحاشا تھپے لگانے لگا۔ رب نواز بھی زور زور سے ہنسنے لگا۔
 پیازیاں یہ آوازیں بڑے کھلنڈرے انداز میں ایک دوسرے کی طرف اچھالتی
 رہیں۔۔۔۔۔ صوبیدار رب نواز کے جوان خاموش تھے۔
 جب فیسی کا دورہ ختم ہوا تو ادھر سے رام سنگھ کی آواز بلند ہوئی ”دیکھو یا رہمیں
 چائے پینی ہے!“
 رب نواز بولا ”بیو۔۔۔۔۔ عیش کرو“
 رام سنگھ چلایا ”اوئے عیش کس طرح کریں۔۔۔۔۔ سامان تو ہمارا ادھر پڑا
 ہے“
 رب نواز نے پوچھا ”کدھر“
 رام سنگھ کی آواز آئی ”ادھر۔۔۔۔۔ جدھر تمہارا فائر ہمیں اڑا سکتا ہے“
 رب نواز ہنسا ”تو کیا چاہتے ہو تم۔۔۔۔۔ خنزیر کی دم!“
 رام سنگھ بولا ”ہمیں سامان لے آئے دے“
 ”لے آ!“ یہ کہہ کر اس نے اپنے جوانوں کی طرف دیکھا
 رام سنگھ کی تشویش بھری آواز بلند ہوئی ”تو اڑا دے گا، کمہار کے کھوتے!“
 رب نواز نے ہنسا کر کہا ”بک نہیں اوئے سنتو کھسر کے کچھوے“
 رام سنگھ ہنسا ”قسم کھا نہیں مارے گا!“
 رب نواز نے پوچھا ”کس کی قسم کھاؤں!“
 رام سنگھ نے کہا ”کسی کی بھی کھا لے!“

پھر اس نے دور بین لے کر خود ہی دیکھا۔ ایک آدمی ڈرتے ڈرتے پتھروں کے بل پتھروں کے عقب سے نکل کر جا رہا تھا۔ چھوڑی دور اس طرح چل کر وہ اٹھا اور تیزی سے بھاگا اور کچھ دور جھاریوں میں غائب ہو گیا۔ دو منٹ کے بعد واپس آیا تو اس کے دونوں ہاتھوں میں کچھ سامان تھا۔ ایک لٹلے کے لیے وہ رکا۔ پھر تیزی سے پتھروں کی محفوظ دیوار کی طرف بھاگا اور بالآخر وہاں پہنچ گیا۔ وہ نظروں سے اوجھل ہوا تو رب نواز نے اپنی بندوق چلا دی۔ مزاح کے ساتھ ہی رب نواز کا قہقہہ بلند ہوا۔ یہ دونوں آوازیں مل کر کچھ دیر چنبھناتی رہیں۔ پھر رام سنگھ کی آواز آئی ”تمھنک بو۔“

”نومینشن“ رب نواز نے یہ کہہ کر جوانوں کی طرف دیکھا ”ایک راؤنڈ ہو جائے“

تفریح کے طور پر دونوں طرف سے گولیاں چلنے لگیں۔۔۔۔۔ پھر خاموشی ہو گئی رب نواز نے دور بین لگا کر دیکھا پراڑی کی واڑھی میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ وہ پکارا ”چائے تیار کر لی رام سنگھ؟“

جواب آیا ”ابھی کہاں اونے کمہار کے کھوتے!“

رب نواز ذات کا کہنا تھا جب کوئی اس کی طرف اشارہ کرتا تھا تو غصے سے اس

کا خون کھولے لگتا تھا۔ ایک صرف رام سنگھ کے منہ سے وہ اسے برداشت کر لیتا تھا اس لیے کہ وہ اس کا بے تکلف دوست تھا۔ ایک ہی گاؤں میں وہ پل کر جوان ہوئے تھے۔ دونوں کی عمر میں صرف چند دن کا فرق تھا۔ دونوں کے باپ، پھر ان کے باپ بھی ایک دوسرے کے دوست تھے۔ ایک ہی سکول میں پرائمری تک پڑھتے تھے اور ایک ہی دن فوج میں بھرتی ہوئے تھے اور پچھلی بڑی جنگ میں کئی محاذوں پر اکٹھے لڑے تھے۔

رب نواز اپنے جوانوں کی نظروں میں خود کو خفیف محسوس کر کے بڑبڑایا ”خزیر کی دم۔۔۔۔۔ اب بھی باز نہیں آتا۔“ پھر وہ رام سنگھ سے مخاطب ہوا ”بک نہیں اوئے کھوتے کی جوں۔“

رام سنگھ کا قہقہہ بلند ہوا رب نواز نے ایسے ہی شست باندھی ہوئی تھی تفریحاً اس نے لہلی دبا دی ترائخ کے ساتھ ہی ایک فلک شکاف چیخ بلند ہوئی۔ رب نواز نے فوراً دو رہین لگائی اور دیکھا کہ ایک آدمی نہیں، رام سنگھ پیٹ پکڑے، پتھروں کی دیوار سے ڈراہٹ کر دوہرا ہوا اور گر پڑا۔

رب نواز زور سے چیخا ”رام سنگھ! اور اچھل کر کھڑا ہو گیا، ادھر سے بیک وقت تین چار فائر ہوئے ایک گولی رب نواز کا دایاں بازو چاتی ہوئی نکل گئی۔ فوراً ہی وہ اوندھے منہ زمین پر گر پڑا۔ اب دونوں طرف سے فائر شروع ہو گئے۔ ادھر کچھ سپاہیوں نے گڑبڑ سے فائدہ اٹھا کر پتھروں کے عتب سے نکل بھاگنا چاہا۔ ادھر سے فائر جاری تھے مگر نشانے پر کوئی نہ بیٹھا۔ رب نواز نے اپنے جوانوں کو اتارنے کا حکم دیا تین فوراً ہی مارے گئے، لیکن افتاں و خیزاں باقی جوان دوسری پہاڑی پر پہنچ

گئے۔“

رام سنگھ خون میں لت پت پتھر ملی زمین پر پڑا کراہ رہا تھا گولی اس کے پیٹ میں لگی تھی رب نواز کو دیکھ کر اس کی آنکھیں تہمتا اٹھیں مسکرا کر اس نے کہا ”اوئے کمہار کے کھوتے، یہ تو نے کیا کیا۔“

رب نواز، رام سنگھ کا زخم اپنے پیٹ میں محسوس کر رہا تھا، لیکن وہ مسکرا کر اس پر جھکا اور دو زانو ہو کر اس کی پیچھے کھولے لگا ”خزیر کی دم، تم سے کس نے باہر نکلنے کو کہا تھا۔“

پیچھا اتارنے سے رام سنگھ کو سخت تکلیف ہوئی۔ درد سے وہ پلا پلا پڑا۔ جب پیچھا اتر گئی اور رب نواز نے زخم کا معائنہ کیا جو بہت خطرناک تھا تو رام سنگھ نے رب نواز کا ہاتھ دبا کر کہا ”میں اپنا آپ دکھانے کے لیے باہر نکلا تھا کہ تو نے۔۔۔۔۔ اوئے رب کے پتر۔۔۔۔۔ فائر کر دیا۔“

رب نواز کا گلا رندہ گیا ”متم وحدہ، الا شریک کی۔۔۔۔۔ میں نے ایسے ہی بندوق چلائی تھی۔۔۔۔۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تو کھوتے کا سنگھ باہر نکل رہا ہے۔۔۔۔۔ مجھے افسوس ہے!“

رام سنگھ کا خون کافی بہہ نکلا تھا۔ رب نواز اور اس کے ساتھی کئی گھنٹوں کے بعد وہاں پہنچے تھے۔ اس عرصے تک تو ایک پوری مٹک خون کی خالی ہو سکتی تھی۔ رب نواز کو حیرت تھی کہ اتنی دیر تک رام سنگھ زندہ رہ سکا ہے۔ اس کو امید نہیں تھی کہ وہ بچے گا۔ ہلانا جلا نا غلط تھا، چنانچہ اس نے فوراً وائرلیس کے ذریعے سے پلائون کمانڈر سے درخواست کی کہ جلد ہی ایک ڈاکٹر روانہ کیا جائے۔ اس کا دوست رام

سنگھ زخمی ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر کاہاں تک پہنچنا اور پھر وقت پر پہنچنا بالکل محال تھا۔ رب نواز کو یقین تھا کہ رام سنگھ صرف چند گھنٹوں کا مہمان ہے پھر بھی وائریس پر پیغام پہنچا کر اس نے مسکرا کر رام سنگھ سے کہا ”ڈاکٹر آرہا ہے۔۔۔ کوئی فکر نہ کر۔“
 رام سنگھ بڑی نحیف آواز میں سوچتے ہوئے بولا ”فکر کسی بات کی نہیں۔۔۔۔۔ یہ بتا میرے کتنے جوان مارے ہیں تم لوگوں نے؟“
 رب نواز نے جواب دیا ”صرف ایک!“
 رام سنگھ کی آواز اور زیادہ نحیف ہو گئی تیرے کتنے مارے گئے؟
 رب نواز نے جھوٹ بولا ”چھ!“ اور یہ کہہ کر اس نے معنی خیز نظروں سے اپنے جوانوں کی طرف دیکھا۔

”چھ۔۔۔۔۔ چھ!“ رام سنگھ نے ایک ایک آدمی اپنے دل میں گنا ”میں زخمی ہوا تو وہ بہت بد دل ہو گئے تھے۔۔۔۔۔ پر میں نے کہا۔۔۔۔۔ کھیل جاؤ اپنی اور دشمن کی جان سے۔۔۔۔۔ چھ۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے!“ وہ پھر ماضی کے دھندلکوں میں چلا گیا ”رب نواز۔۔۔۔۔ یاد ہیں وہ دن تمہیں۔۔۔۔۔“
 اور رام سنگھ نے بیٹے دن یاد کرنے شروع کر دیئے۔ کھیتوں کھلیانوں کی باتیں سکول کے قصبے 2/9 جاٹ رجمنٹ کی داستانیں۔۔۔۔۔ مائڈنگ افسروں کے لطیفے اور باہر کے ملکوں میں اجنبی عورتوں سے معاشقے ان کا ذکر کرتے ہوئے رام سنگھ کو کوئی بہت دلچسپ واقعہ یاد آ گیا۔ ہنسنے لگا تو اس کے ٹیس اٹھی مگر اس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے وہ زخم سے اوپر ہی اوپر ہنس کر کہنے لگا ”اوئے سور کے

تل۔۔۔۔۔ یاد ہے تمہیں وہ مڈم۔۔۔۔۔“
 رب نواز نے پوچھا ”کون؟“
 رام سنگھ نے کہا ”وہ۔۔۔۔۔ اٹلی کی۔۔۔۔۔ کیا نام رکھا تھا ہم نے اس
 کا۔۔۔۔۔ بڑی مارخور عورت تھی!“
 رب نواز کو فوراً ہی وہ عورت یاد آ گئی ”ہاں،
 ہاں۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ مڈم منینا فنیٹو۔۔۔۔۔ پیسہ ختم، تماشا ختم۔۔۔۔۔ پر
 تجھ سے کبھی کبھی رعایت کر دیتی تھی سولینی کی بیٹی!“
 رام سنگھ زور سے ہنسا۔۔۔۔۔ اور اس کے زخم سے جھجے ہوئے خون کا ایک
 لوتھرا نکل آیا سرسری طور پر رب نواز نے جو پٹی باندھی تھی وہ کھسک گئی تھی اسے
 ٹھیک کر کے اس نے رام سنگھ سے کہا ”اب خاموش رہو“
 رام سنگھ کو بہت تیز بنا رہا تھا۔ اس کا دماغ اس کے باعث بہت تیز ہو گیا تھا
 بولنے کی طاقت نہیں تھی مگر بولے چلا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی رک جاتا۔ جیسے یہ دیکھ رہا
 ہے کہ ٹینکی میں کتنا پٹرول باقی ہے کچھ دیر کے بعد اس پر ہڈیانی کیفیت طاری ہو
 گئی، لیکن کچھ ایسے وقفے بھی آتے تھے کہ اس کے ہوش و حواس سلامت ہوتے
 تھے۔ انہی وقفوں میں اس نے ایک مرتبہ رب نواز سے سوال کیا ”یار! چوکی بتا، کیا
 تم لوگوں کو واقعی کشمیر چاہیے!“
 رب نواز نے پورے خلوص کے ساتھ کہا ”ہاں، رام سنگھ!“
 رام سنگھ نے اپنا سر ہلایا ”نہیں۔۔۔۔۔ میں نہیں مان سکتا۔۔۔۔۔ تمہیں ورغایا
 گیا ہے۔“

رب نواز نے اس کو یقین دلانے کے انداز میں کہا ”تمہیں درخایا گیا ہے۔۔۔۔۔ قسم پختن پاک کی۔۔۔۔۔“

رام سنگھ نے رب نواز کا ہاتھ پکڑ لیا ”قسم نہ کھایا را۔۔۔۔۔ ٹھیک ہوگا“ لیکن اس کا لہجہ صاف بتا رہا تھا کہ اس کو رب نواز کی قسم کا یقین نہیں۔

دن ڈھلنے سے کچھ دیر پہلے پانوں مائنٹ میجر اسلم آیا اس کے ساتھ چند سپاہی تھے، مگر ڈاکٹر نہیں تھا۔ رام سنگھ بے ہوشی اور زرع کی حالت میں کچھ بڑا رہا تھا۔ مگر آواز اس قدر کمزور اور شکستہ تھی کہ سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ میجر اسلم بھی 2/9 جاٹ رجمنٹ کا تھا اور رام سنگھ کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ رب نواز سے سارے حالات دریافت کرنے کے بعد اس نے رام سنگھ کو بلایا۔۔۔۔۔ ”رام سنگھ۔۔۔۔۔ رام سنگھ!“

رام سنگھ نے اپنی آنکھیں کھولیں لیٹے لیٹے اینشن ہو کر اس نے سیلوٹ کیا لیکن پھر آنکھیں کھول کر اس نے ایک لمبے کے لیے غور سے میجر اسلم کی طرف دیکھا اس کا سیلوٹ کرنے والا اکڑا ہوا ہاتھ ایک دم گر پڑا۔ جھنجھلا کر اس نے بڑبڑاتا شروع کیا ”کچھ نہیں اوئے رام سیاں۔۔۔۔۔ بھول ہی گیا تو سور کے نکلا۔۔۔۔۔ کہ یہ لڑائی۔۔۔۔۔ یہ لڑائی؟“

رام سنگھ اپنی بات پوری نہ کر سکا بند ہوتی ہوئی آنکھوں سے اس نے رب نواز کی طرف نیم سوائیہ انداز میں دیکھا اور سر دھو گیا۔

8 اکتوبر 1951ء

☆☆☆☆☆☆

آنکھیں

اس کے سارے جسم میں مجھے اس کی آنکھیں بہت پسند تھیں!
یہ آنکھیں بالکل ایسی ہی تھیں جیسے اندھیری رات میں موٹر کار کی ہیڈ لائٹس،
جن کو آدمی سب سے پہلے دیکھتا ہے، آپ یہ نہ سمجھئے گا کہ وہ بہت خوبصورت
آنکھیں تھیں۔ ہرگز نہیں، میں خوبصورتی اور بدصورتی میں تمیز کر سکتا ہوں لیکن
معاف کیجئے گا، ان آنکھوں کے معاملے میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ وہ
خوبصورت نہیں تھیں لیکن اس کے باوجود ان میں بے پناہ کشش تھی۔

میری اور ان آنکھوں کی ملاقات ایک ہسپتال میں ہوئی۔ میں اس ہسپتال کا
نام آپ کو بتانا نہیں چاہتا، اس لیے کہ اس سے میرے اس افسانے کو کوئی فائدہ
نہیں پہنچے گا

بس آپ یہی سمجھ لیجئے کہ ایک ہسپتال تھا، جس میں میرا ایک عزیز آپریشن
کرائے کے بعد اپنی زندگی کے آخری سانس لے رہا تھا۔

یوں تو میں رواری کا قائل نہیں، مریضوں کے پاس جا کر ان کو دم دلا سہ دینا
بھی مجھے نہیں آتا۔ لیکن اپنی بیوی کے پیہم اصرار پر مجھے جانا پڑا تا کہ میں اپنے
مرنے والے عزیز کو اپنے خلوص اور اپنی محبت کا ثبوت دے سکوں۔

یقین مانئے کہ مجھے سخت کوفت ہو رہی تھی۔ ہسپتال کے نام ہی سے مجھے نفرت
ہے، معلوم نہیں کیوں۔۔۔۔۔ شاید اس لیے کہ ایک بار بمبئی میں اپنی بورچی
ہمسائی کو جس کی کلائی میں موج آگئی تھی، مجھے جے جے ہسپتال میں لے جانا پڑا

میں ان آنکھوں کا ذکر کر رہا تھا جو مجھے بے حد پسند تھیں۔

وہ برقع پہنے ہوئے تھی، مگر نقاب اٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں دوا کی ایک بوتل تھی اور وہ جنرل وارڈ کے برآمدے میں ایک چھوٹے سے لڑکے کے ساتھ چلی آرہی تھی۔

میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں جو بڑی تھیں، نہ چھوٹی، سیاہ تھیں نہ بھوری، نیلی تھیں نہ سبز، ایک عجیب قسم کی چمک پیدا ہوئی۔ میرے قدم رک گئے وہ بھی ٹھہر گئے اس نے اپنے ساتھی لڑکے کا ہاتھ پکڑا اور بوکھلائی ہوئی آواز میں کہا ”تم سے چلنا نہیں جاتا!“

لڑکے نے اپنی کلائی چھرائی اور تیزی سے کہا ”چیل تو رہا ہوں۔۔۔۔۔۔ تو
تو اندھی ہے!“

میں نے یہ سنا تو اس لڑکی کی آنکھوں کی طرف دوبارہ دیکھا اس کے سارے وجود میں صرف اس کی آنکھیں ہی تھیں جو مجھے پسند آئی تھیں

میں آگے بڑھا اور اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے مجھے پلکیں نہ جھپکنے والی آنکھوں سے دیکھا اور پوچھا ”ایکسرے کہاں لیا جاتا ہے؟“

اتفاق کی بات ہے کہ ان دنوں ایکسرے ڈیپارٹمنٹ میں میرا ایک دوست کام کر رہا تھا، اور میں اسی سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ میں نے اس لڑکی سے کہا ”آؤ، میں تمہیں وہاں لے چتا ہوں میں بھی ادھر جی جا رہا ہوں۔“

لڑکی نے اپنے ساتھی لڑکے کا ہاتھ پکڑا اور میرے ساتھ چل پڑی۔ میں نے ڈاکٹر صادق کا پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ ایکسرے لینے میں مصروف ہیں۔

دروازہ بند تھا اور باہر مریضوں کی ایک بھیڑ لگی تھی۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے تیز و تند آواز آئی ”کون ہے۔۔۔۔۔ دروازہ مت ٹھوکو“

لیکن میں نے پھر دستک دی۔ دروازہ کھٹکا اور ڈاکٹر صادق مجھے گالی دیتے دیتے رہ گیا ”اوہ۔۔۔ تم ہو!“

”ہاں بھئی۔۔۔ میں تم سے ملنے آیا تھا۔ دفتر میں گیا تو معلوم ہوا کہ تم یہاں ہو“

”آ جاؤ اندر!“

میں نے لڑکی کی طرف دیکھا اور اس سے کہا ”آؤ۔۔۔۔۔ لیکن لڑکے کو باہر ہی رہنے دو!“

ڈاکٹر صادق نے ہولے سے مجھ سے پوچھا ”کون ہے یہ؟“

میں نے جواب دیا ”معلوم نہیں، کون ہے۔۔۔ ایکسرے ڈیپارٹمنٹ کا پوچھ رہی تھی میں نے کہا چلو، میں لیے چتا ہوں“

ڈاکٹر صادق نے دروازہ اور زیادہ کھول دیا۔ میں اور وہ لڑکی اندر داخل ہو گئے۔

چارپانچ مریض تھے ڈاکٹر صادق نے جلدی جلدی ان کی سکریننگ کی، اور انہیں رخصت کیا۔ اس کے بعد کمرے میں ہم صرف دو رہ گئے میں اور وہ لڑکی۔

ڈاکٹر صادق نے مجھ سے پوچھا ”انہیں کیا بیماری ہے؟“
میں نے اس لڑکی سے پوچھا ”کیا بیماری ہے تمہیں؟“۔۔۔۔۔ ایک سرے کے لیے تم سے کس ڈاکٹر نے کہا تھا؟“

اندھیرے کمرے میں لڑکی نے میری طرف دیکھا اور جواب دیا ”مجھے معلوم نہیں، کیا بیماری ہے۔۔۔۔۔ ہمارے محلے میں ایک ڈاکٹر ہے۔ اس نے کہا تھا کہ ایک سرے کراؤ“

ڈاکٹر صادق نے اس سے کہا کہ مشین کی طرف آئے۔ وہ آگے بڑھی تو بڑے زور کے ساتھ اس سے ٹکرائی۔ ڈاکٹر نے تیز لہجے میں اس سے کہا۔۔۔۔۔ ”کیا تمہیں بھائی نہیں دیتا۔“

لڑکی خاموش رہی۔ ڈاکٹر نے اس کا برقع اتارا اور اسکرین کے پیچھے کھڑا کر دیا۔ پھر اس نے سوئچ اون کیا۔ میں نے شیشے میں دیکھا تو مجھے اس کی پسلیاں نظر آئیں۔ اس کا دل بھی ایک کونے میں کالے سے دھبے کی صورت میں دھڑک رہا تھا۔

ڈاکٹر صادق پانچ چھ منٹ تک اس کی پسلیوں اور ہڈیوں کو دیکھتا رہا اس کے بعد اس نے سوئچ آف کر دیا اور روشنی کر کے مجھ سے مخاطب ہوا ”چھاتی بالکل

صاف ہے۔“

لڑکی نے معلوم نہیں کیا سمجھا کہ اپنی چھاتیوں پر جو کافی بڑی بڑی تھیں وہ بچے کو درست کیا اور برقع ڈھونڈنے لگی۔

برقع ایک کونے میں میز پر پڑا تھا میں نے بڑھ کر اسے اٹھایا اور اس کے حوالے کر دیا ڈاکٹر صادق نے رپورٹ لکھی اور اس سے پوچھا۔۔۔۔۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

لڑکی نے برقع اوڑھتے ہوئے جواب دیا ”جی میرا نام۔۔۔۔۔ میرا نام حنیفہ ہے“

”حنیفہ!“ ڈاکٹر صادق نے اس کا نام پرچی پر لکھا اور اس کو دے دی ”جاؤ، یہ اپنے ڈاکٹر کو دکھا دینا“

لڑکی نے پرچی لی اور قمیض کے اندر اپنی انگلیاں میں اڑس لی۔

جب وہ باہر نکلی تو میں غیر ارادی طور پر اس کے پیچھے پیچھے تھا لیکن مجھے اس کا پوری طرح احساس تھا کہ ڈاکٹر صادق نے مجھے شک کی نظروں سے دیکھا تھا اسے جہاں تک میں سمجھتا ہوں، اس بات کا یقین تھا کہ اس لڑکی سے میرا تعلق ہے۔ حالانکہ جیسا آپ جانتے ہیں، ایسا کوئی معاملہ نہیں تھا۔۔۔۔۔ سوائے اس کے کہ مجھے اس کی آنکھیں پسند آگئی تھیں۔

میں اس کے پیچھے پیچھے تھا اس نے اپنے ساتھی لڑکے کی انگلی پکڑی ہوئی تھی جب وہ تاگلوں کے اڈے پر پہنچے تو میں نے حنیفہ سے پوچھا ”تمہیں کہاں جانا ہے؟“

اس نے ایک گلی کا نام لیا تو میں نے اس سے جھوٹ موٹ کہا ”مجھے بھی ادھر
 ہی جانا ہے۔۔۔۔ میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دوں گا“
 میں نے جب اس کا ہاتھ پکڑ کر تانگے میں بٹھایا تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ میری
 آنکھیں ایک سریز کا شیشہ بن گئی ہیں۔ مجھے اس کا گوشت پوست دکھائی نہیں دیتا
 تھا۔۔۔۔۔ صرف ڈھانچہ نظر آتا تھا۔۔۔۔۔ لیکن اس کی آنکھیں۔۔۔۔۔ وہ
 بالکل ثابت و سالم تھیں، جن میں بے پناہ کشش تھی۔
 میرا جی چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ بیٹھوں لیکن یہ سوچ کر کہ کوئی دیکھ لے گا،
 میں نے اس کے ساتھی لڑکے کو اس کے ساتھ بٹھا دیا اور آپ اگلی نشست پر بیٹھ
 گیا۔

تا نگہ چلا تو حنیفہ مجھ سے مخاطب ہوئی ”تم کون ہو؟“
 ”میں۔۔۔ میں سعادت حسن منٹو ہوں“
 ”حسن من گویا۔۔۔۔۔ یہ من تو کیا ہوا؟“
 ”کشمیریوں کی ایک ذات ہے“
 ”ہم بھی کشمیری ہیں“
 ”اچھا؟“
 ”ہم کنگ وائس ہیں!“
 میں نے مزہ کر اس سے کہا ”یہ تو بہت اونچی ذات ہے“
 وہ مسکرائی اور اس کی آنکھیں اور زیادہ پرکشش ہو گئیں
 میں نے اپنی زندگی میں بے شمار خوبصورت آنکھیں دیکھی تھیں۔ لیکن وہ

آنکھیں جو حنیفہ کے چہرے پر تھیں، بے حد پرکشش تھیں، معلوم نہیں ان میں کیا چیز تھی جو کشش کا باعث تھی میں اس سے بیشتر عرض کر چکا ہوں کہ وہ قطعاً خوب صورت نہیں تھیں لیکن اس کے باوجود میرے دل میں کھب رہی تھیں۔

میں نے جسارت سے کام لیا اور اس کے بالوں کی ایک لٹ کو جو اس کے ماتھے پر لٹک کر اس کی ایک آنکھ کو ڈھانپ رہی تھی، انگلی سے اٹھایا اور اس کے سر پر چسپاں کر دی۔۔۔ اس نے برا نہ مانا۔

میں نے اور جسارت کی اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اس پر بھی اس نے کوئی مزاحمت نہ کی اور اپنے ساتھی لڑکے سے مخاطب ہوئی ”تم میرا ہاتھ کیوں دوبارہ ہو؟“

میں نے فوراً اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور لڑکے سے پوچھا ”تمہارا مکان کہاں ہے؟“

لڑکے نے ہاتھ کا اشارہ کیا ”اس بازار میں!“

تائنگے نے ادھر کا رخ کیا بازار میں بہت بھیڑ تھی ٹریک بھی معمول سے زیادہ تانگہ رک رک کے چل رہا تھا سڑک میں چونکہ گڑھے تھے، اس لیے بڑے زور کے دھچکے لگ رہے تھے۔ بار بار اس کا سر میرے کندھوں سے ٹکراتا تھا، اور میرا جی چاہتا تھا کہ اسے اپنے زانو پر رکھ لوں اور اس کی آنکھیں دیکھتا رہوں۔

جموڑی دیر کے بعد ان کا گھر آ گیا لڑکے نے تائنگے والے سے رکنے کے لیے کہا۔ جب تانگہ رکا تو وہ نیچے اترا۔ حنیفہ بیٹھی رہی میں نے اس سے کہا ”تمہارا گھر آگیا ہے“

حنیفہ نے مڑ کر میری طرف اپنی عجیب و غریب آنکھوں سے دیکھا ”بدرو کہاں ہے؟“

میں نے اس سے پوچھا ”کون بدرو؟“

”وہ لڑکا جو میرے ساتھ تھا“

میں نے لڑکے کی طرف دیکھا جوتا ننگے کے پاس ہی تھا ”یہ کھڑا تو ہے“

”اچھا۔۔۔۔!“ یہ کہہ کر اس نے بدرو سے کہا ”بدرو! مجھے اتار تو دو“

بدرو نے اس کا ہاتھ پکڑا اور بڑی مشکل سے نیچے اتارا۔ میں سخت متحیر تھا کچلی نشست پر جاتے ہوئے میں نے اس لڑکے سے پوچھا ”کیا بات ہے۔۔۔۔۔ یہ خود نہیں اتر سکتیں؟“

بدرو نے جواب دیا ”جی نہیں۔۔۔۔۔ ان کی آنکھیں خراب ہیں۔۔۔۔۔ دکھائی نہیں دیتا۔“

☆☆☆☆☆☆

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

میں جب امین پہلوان سے ملا تو وہ تین مہینے کی قید کاٹ کر واپس آیا تھا میں نے اس سے پوچھا ”امین اس دفعہ کیسے جیل میں گئے“

امین مسکرایا ”اپنے کاروبار کے سلسلے میں“

”کیا کاروبار تھا“

”جو رہا ہے وہی ہے“

”بھئی بتاؤ تو۔۔۔۔۔“

”بتانے کی کیا ضرورت ہے۔۔۔۔۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں مگر خواہ مخواہ مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔“

میں نے تھوڑے سے توقف کے بعد اس سے کہا۔۔۔۔۔ ”ایمن تمہیں آئے دن جیل میں جانا کیا پسند ہے“

ایمن پہلوان مسکرایا ”جناب۔۔۔۔۔ پسند اور ناپسند کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ لوگ مجھے پہلوان کہتے ہیں حالانکہ میں نے آج تک اکھاڑے کی شکل نہیں دیکھی۔۔۔۔۔ ان پر ہنر ہوں۔۔۔۔۔ کوئی اور ہنر بھی مجھے نہیں آتا۔۔۔۔۔ بس جیل جانا آتا ہے وہاں میں خوش رہتا ہوں۔ مجھے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔۔۔۔۔ آپ ہر روز دفتر جاتے ہیں کیا وہ جیل نہیں۔“

میں لا جواب ہو گیا ”تم ٹھیک کہتے ہو امین! لیکن بغیر جانے والوں کا معاملہ دوسرا ہے۔۔۔۔۔ لوگ انہیں بری نگاہوں سے نہیں دیکھتے“

”کیوں نہیں دیکھتے ضلع پچھری کے نئے منشی اور کلرک ہیں انہیں کون اچھی نظر سے دیکھتا ہے۔۔۔۔۔ رشوتیں لیتے ہیں۔۔۔۔۔ جھوٹ بولتے ہیں اور پرلے درجے کے مکار ہوتے ہیں مجھ میں ایسا کوئی عیب نہیں۔۔۔۔۔ میں اپنی روزی بڑی ایمانداری سے کماتا ہوں۔“

میں نے اس سے پوچھا ”کس طرح؟“

اس نے جواب دیا ”اس طرح کہ اگر کسی کا کام کرتا ہوں اور قید کاٹتا ہوں جیل میں محنت مشقت کرتا ہوں اور بعد میں اس شخص سے جس کی خاطر میں نے سزا بھگتی تھی۔ مجھے دو تین سو روپیہ ملتا ہے تو یہ میرا معاوضہ ہے اس پر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔ میں رشوت تو نہیں لیتا۔۔۔۔۔ حلال کی کمائی ہوں لوگ مجھے غنڈہ سمجھتے ہیں۔۔۔۔۔ بڑا خطرناک غنڈہ۔۔۔۔۔ لیکن میں آپ کو بتاؤں کہ میں نے آج تک کسی کے تھپڑ بھی نہیں مارا۔ میری لائن بالکل الگ ہے۔“

اس کی لائن واقعی دوسروں سے الگ تھی۔۔۔۔۔ مجھے حیرت تھی کہ تین چار مرتبہ قید کاٹنے کے باوجود اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی وہ بڑا سنجیدہ مگر گنوار قسم کا آدمی تھا جس کو کسی کی پروا انہیں تھی قید کاٹنے کے بعد جب بھی آتا تو اس کا وزن کم از کم دس پاونڈ زیادہ ہوتا۔

ایک دن میں نے اس سے پوچھا ”امین کیا وہاں کا کھانا تمہیں راس آتا ہے“

اس نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا ”کھانا کیسا بھی ہو۔۔۔۔۔ اس کا

راں کرنا آدمی کا اپنا کام ہے۔۔۔۔۔ مجھے وال سے نفرت تھی لیکن جب پہلی مرتبہ مجھے وہاں کنکروں بھری وال دی گئی اور ریت ملی روٹی، تو میں نے کہا۔۔۔۔۔ امین یار۔۔۔۔۔ یہ سب سے اچھا کھانا ہے، کھا اور خدا کا شکر بجا لا۔ چنانچہ میں ایک دو روزی میں عادی ہو گیا۔۔۔ مشقت کرتا کھانا کھاتا اور یوں محسوس ہوتا جیسے میں نے گنے کے بول سے پیٹ بھر کر کھانا کھایا ہے۔“

میں نے ایک دن اس سے پوچھا ”تم نے کبھی کسی عورت سے بھی محبت کی ہے“

اس نے اپنے دونوں کان پکڑے۔۔۔۔۔ ”خدا بچائے اس محبت سے مجھے صرف اپنی ماں سے محبت ہے“

میں نے اس سے پوچھا ”تمہاری ماں زندہ ہے“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ خدا کے فضل و کرم سے۔۔۔۔۔ بہت بوڑھی ہے لیکن آپ کی دعا سے اس کا سایہ میرے سر پر دیر تک قائم رہے گا اور وہ تو ہر وقت میرے لیے دعائیں مانگتی رہتی ہے کہ خدا مجھے نیکی کی ہدایت کرے۔“

میں نے اس سے کہا ”خدا تمہاری ماں کو سلامت رکھے پر میں نے یہ پوچھا تھا کہ تمہیں کسی عورت سے محبت ہوئی ہے یا نہیں دیکھو جھوٹ نہیں بولنا“

امین پہلوان نے بڑے تیز لہجے میں کہا ”میں نے اپنی زندگی میں آج تک کبھی جھوٹ نہیں بولا۔۔۔۔۔ میں نے کسی عورت سے محبت نہیں کی“

میں نے پوچھا ”کیوں۔۔۔۔۔“

اس نے جواب دیا ”اس لیے کہ مجھے اس سے دلچسپی ہی نہیں“

میں خاموش رہا

تیسرے روز اس کی ماں پر فالج گرا اور وہ راہی ملک عدم ہوئی۔ امین پہلوان کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں تھا وہ سو گوار مغموم اور دل شکستہ بیٹھا تھا کہ شیر کے ایک رئیس کی طرف سے اسے بلاوا آیا۔ وہ اپنی عزیز ماں کی میت چھوڑ کر اس کے پاس گیا اور اس سے پوچھا کیوں میاں صاحب آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے۔ میاں صاحب نے کہا ”تمہیں کیوں بلایا جاتا ہے۔۔۔۔۔ ایک خاص کام ہے“

امین نے جس کے دل و دماغ میں اپنی ماں کا کفن دفن تیر رہا تھا پوچھا ”حضور یہ خاص کام کیا ہے“

میاں صاحب نے سگریٹ ساگایا ”بلک مارکیٹ کا قصہ ہے مجھے معلوم ہوا ہے کہ آج میرے گودام پر چھاپہ مارا جائے گا سو میں نے سوچا کہ امین پہلوان بہترین آدمی ہے جو اسے نمٹا سکتا ہے۔“

امین نے بڑے مغموم اور رنجی انداز میں کہا ”آپ فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

”بھئی خدمت و دمت کی بات تم مت کرو۔۔۔۔۔ بس صرف اتنی سی بات ہے کہ جب چھاپہ پڑے تو گودام کے مالک تم ہو گے۔ گرفتار ہو جاؤ گے زیادہ سے زیادہ جرمانہ پانچ ہزار روپے ہو گا اور ایک دو برس کی قید“

”مجھے کیا ملے گا“

”جب وہاں سے رہا ہو کر آؤ گے تو معاملہ طے کر لیا جائے گا“

امین نے میاں صاحب سے کہا ”حضور یہ دور کی بات ہے جرماتو آپ ادا کر دیں گے لیکن قید تو مجھے کاٹنا پڑے گی آپ باقاعدہ سودا کریں“

میاں صاحب مسکرائے ”تم سے آج تک میں نے کبھی وعدہ خلافی کی ہے۔۔۔ بچپلی دفعہ میں نے تم سے کام لیا اور تم کو تین مہینے کی قید ہوئی تو کیا میں نے جیل خانے میں ہر قسم کی سہولت بہم نہ پہنچائی تم نے باہر آ کر مجھ سے کہا کہ تمہیں وہاں کوئی تکلیف نہیں تھی۔۔۔ اگر تم کچھ عرصہ کے لیے جیل چلے گئے تو وہاں تمہیں برا سانس ہوگی۔“

امین نے کہا ”جی۔۔۔ یہ سب درست ہے۔۔۔ لیکن۔۔۔“

”لیکن۔۔۔ کیا؟“

امین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ”میاں صاحب۔۔۔ میری ماں مر گئی ہے۔“

”کب“

”آج صبح“

میاں صاحب نے افسوس کا اظہار کیا ”کفنا دینا دیا ہوگا“

امین کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرتے گئے ”میاں صاحب! ابھی کچھ بھی نہیں ہو سکا۔۔۔ میرے پاس تو اپنے کھانے کے لیے بھی کچھ نہیں ہے۔“

میاں صاحب نے چند لحظات حالات پر غور کیا اور امین سے کہا ”تو ایسا کرو۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ تجھ پر تکلیف کا بندوبست میں ابھی کیے دیتا ہوں۔۔۔ تمہیں کسی قسم کا تردد نہیں کرنا چاہیے۔۔۔ تم گودام پر جاؤ اور

اپنی ڈیوٹی سنبھالو“

امین نے اپنی میلی قمیص کی آستین سے آنسو پونچھے ”لیکن میاں صاحب
میں۔۔۔۔۔ میں اپنی ماں کے جنازے کو کندھا بھی نہ دوں“

میاں صاحب نے فلسفیانہ انداز میں کہا ”یہ سب ریکی چیزیں ہیں مرحومہ کو
دفناتا ہے سو یہ کام بڑی اچھی طرح سے ہو جائے گا تمہیں جنازے کے ساتھ جانے
کی کیا ضرورت ہے تمہارے ساتھ جانے سے مرحومہ کو کیا راحت پہنچے
گی۔۔۔۔۔ وہ تو بے چاری اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہے۔۔۔ اس کے
جنازے کے ساتھ کوئی بھی جائے۔۔۔۔۔ کیا فرق پڑتا ہے۔۔۔۔۔ اصل
میں تم لوگ جاہل ہو۔۔۔۔۔ میں اگر مر جاؤں تو مجھے کیا معلوم ہے کہ میرے
جنازے میں کس کس عزیز اور دوست نے شرکت کی تھی۔ مجھے اگر جلا بھی دیا جائے
تو کیا فرق پڑتا ہے۔ میری لاش کو چیلوں اور گدھوں کے حوالے کر دیا جائے تو مجھے
اس کی کیا خبر ہوگی۔ تم زیادہ جذباتی نہ بنو دنیا میں سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ
اپنی ذات کے متعلق سوچا جائے۔۔۔۔۔ میں پوچھتا ہوں تمہاری ممانی کے ذرائع
کیا ہیں۔“

امین سوچنے لگا چند لمحات اپنی بساط کے مطابق غور کرنے کے بعد اس نے
جواب دیا ”حضور میری ممانی کے ذرائع آپ کو معلوم ہیں مجھ سے کیوں پوچھتے
ہیں“

”میں نے اس لیے پوچھا تھا کہ تمہیں میرا کام کرنے میں کیا حیل و جت ہے
میں تمہاری ماں کی جھڑو تنگین کا ابھی بندوبست کیے دیتا ہوں اور جب تم جیل سے

واپس آؤ گے تو“

امین پہلوان نے بڑے بیڑے انداز میں پوچھا ”تو آپ میرا بھی بندوبست
کر دیں گے“

میاں صاحب بوکھلائے ”تم کیسی باتیں کرتے ہو امین پہلوان“
امین پہلوان نے ذرا درشت لہجے میں کہا ”امین پہلوان کی ایسی کی تہی آپ
یہ بتائیے کہ مجھے کتنے روپے ملیں گے۔۔۔۔ میں ایک ہزار سے کم نہیں لوں گا“
”ایک ہزار تو بہت زیادہ ہیں“

امین نے کہا ”زیادہ ہے یا کم۔۔۔۔ میں کچھ نہیں جانتا۔۔۔۔۔ میں جب
قید کاٹ کر آؤں گا تو اپنی ماں کی قبر پر پتہ بناؤں گا سنگ مرمر کی۔۔۔۔۔ وہ مجھ
سے بہت پیار کرتی ہے۔“

میاں صاحب نے اس سے کہا ”اچھا بھئی ایک ہزار ہی لے لینا“
امین نے میاں صاحب سے کہا ”تو لائی اتنے روپے دیجئے کہ میں کفن و فن کا
انتظام کر لوں۔۔۔۔۔ اس کے بعد میں آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہو جاؤں
گا۔“

میاں صاحب نے اپنی جیب سے ہونہ نکالا۔۔۔۔۔ ”لیکن تمہارا کیا بھروسہ
ہے“

امین کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کو کسی نے ماں بہن کی گالی دی ہے ”میاں
صاحب آپ مجھے بے ایمان سمجھتے ہیں۔۔۔۔۔ بے ایمان آپ ہیں۔۔۔۔۔ اس
لیے کہ اپنے فعلوں کا پوچھ میرے سر پر ڈال رہے ہیں“

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

”میں۔۔۔۔۔میاں۔۔۔۔۔دین کی بیٹی ہوں۔۔۔۔۔ان سے جو آپ کی
گفتگو ہوئی میں نے سب سنی۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔“
امین نے کہا
”اور اب کہنے کی ضرورت نہیں“

☆☆☆☆☆☆



اس کا پتی

لوگ کہتے تھے کہ نھو کا سر اس لیے گنجا ہوا ہے کہ وہ ہر وقت سوچتا رہتا ہے اس بیان میں کافی صداقت تھی کیونکہ سوچنے وقت نھو ہمیشہ سر کھجایا کرتا ہے کیونکہ اس کے بال بہت کھر درے اور خشک ہیں اور تیل نہ ملنے کے باعث بہت خستہ ہو گئے ہیں۔ اس لیے بار بار کھجایا نے سے اس کے سر کا درمیانی حصہ بالوں سے بالکل بے نیاز ہو گیا ہے۔ اگر اس کا سر ہر روز دھویا جاتا تو یہ حصہ ضرور چمکتا مگر میل کی زیادتی کی وجہ سے اس کی حالت بالکل اس توڑے کی سی ہو گئی ہے جس پر ہر روز روٹیاں پکائی جائیں مگر اسے صاف نہ کیا جائے۔

نھو بھنے پر اینٹیں بنانے کا کام کرتا تھا یہی وجہ ہے کہ اکثر اپنے خیالات کو کچی اینٹیں سمجھتا تھا اور کسی پر فوری غائب نہیں کرتا تھا اس کا یہ اصول تھا کہ خیال کو اچھی طرح پکا کر باہر نکالنا چاہیے تھا تا کہ جس عبارت میں بھی وہ استعمال ہو اس کا ایک مضبوط حصہ بن جائے۔

گاؤں والے اس کے خیالات کی قدر کرتے تھے اور ہر بات میں اس سے مشورہ لیا کرتے تھے لیکن اس قدر افزائی سے نھو اپنے آپ کو اہم نہیں سمجھنے لگا تھا جس طرح گاؤں میں شہجو کا کام ہر وقت لڑتے جھڑتے رہتا تھا۔ اسی طرح اس کا کام ہر وقت دوسروں کو مشورہ دیتے رہتا تھا وہ سمجھتا تھا کہ ہر شخص صرف ایک کام کے لیے پیدا ہوتا ہے چنانچہ شہجو کے بارے میں چوپال پر جب کبھی ذکر چھڑتا تو وہ ہمیشہ یہی کہا کرتا تھا کھاد کتنی بدبودار چیز سے بنتی ہے پر کھیتی باڑی اس کے بنا سو ہی

نہیں سکتی سمجھو کے ہر سانس میں گالیوں کی باس آتی ہے ٹھیک ہے پر گاؤں کی چہل پہل اور رونق بھی اسی کے دم سے قائم ہے اگر وہ نہ ہوتا لوگوں کو کیسے معلوم ہوگا کہ گالیاں کیا ہوتی ہیں، اچھے بول جاننے کے ساتھ ساتھ برے بول بھی معلوم ہونے چاہئیں۔

نٹھو بھنے سے واپس آ رہا تھا اور حسب معمول سر کھجاتا گاؤں کے کسی مسئلے پر غور و فکر کر رہا تھا۔ اللہین کے کھمبے کے پاس پہنچ کر اس نے اپنا ہاتھ سر سے علیحدہ کیا۔ جس کی انگلیوں سے وہ بالوں کا ایک میل بھرا گچھا مروڑ رہا تھا وہ اپنے جھونپڑے کے تازہ لپے ہوئے چہوترے کی طرف بڑھنے ہی والا تھا کہ سامنے سے اسے کسی نے آواز دی۔

نٹھو پلٹا اور اپنے سامنے والے جھونپڑے کی طرف بڑھا جہاں سے مادھو اسے اب ہاتھ کے اشارے سے بلا رہا تھا۔

جھونپڑے کے چھجے کے نیچے چہوترے پر مادھو، اس کا ٹکڑا بھائی اور چودھری بیٹھے تھے ان کے انداز نشست سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی نہایت ہی اہم بات سوچ رہے ہیں سب کے چہرے کچی اینٹوں کی مانند پیلے تھے مادھو تو بہت دنوں کا بیمار دکھائی دیتا تھا ایک کونے میں طاقتے کے نیچے روپا کی ماں بیٹھی تھی غلیظ کپڑوں میں وہ میلے کپڑوں کی ایک گٹھڑی دکھائی دے رہی تھی۔

نٹھو نے وہ رہی سے معاملے کی نزاکت محسوس کی اور قدم تیز کر کے ان کے پاس پہنچ گیا۔

مادھو نے اشارے سے اس کو پاس بیٹھنے کو کہا۔ نٹھو بیٹھ گیا اور اس کا ایک ہاتھ

مادھواس کو اپنے پاس بٹھا کر خاموش ہو گیا۔ مگر اس کے کپکپاتے ہونٹ صاف ظاہر کر رہے تھے کہ وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن فوراً نہیں کہہ سکتا۔ مادھوکا لنگڑا بھائی بھی خاموش تھا اور بار بار اپنی کٹی ہوئی لانگ کے آخری ٹنڈ منڈ حصے پر جو گوشت کا ایک بد شکل لوتھر سا بنا ہوا تھا، ہاتھ پھیر رہا تھا، روپا کی ماں خاکچے میں رکھی ہوئی مورتی کی مانند گونگی بنی ہوئی تھی اور چودھری اپنی مونچھوں کو تادینا بھول کر زمین پر لکیریں بنا رہا تھا۔

مادھو بولا ”نخو بات یہ ہے کہ۔۔۔۔۔ بات یہ ہے کہ۔۔۔۔۔ اب میں تمہیں کیا بتاؤں کہ بات کیا ہے میں کچھ کہنے کے قابل نہ رہا۔۔۔۔۔ چودھری! تم ہی جی کڑا کر کے سارا قصہ سنا دو۔“

نخنوں نے گردن اٹھا کر چودھری کی طرف دیکھا مگر وہ کچھ نہ بولا اور زمین پر لکیں بناتا رہا۔

دو پہر کی اداس فضا با اکل خاموش تھی، البتہ کبھی کبھی چیلوں کی چٹین سنائی دیتی تھیں اور جھونپڑے کے دا بنے ہاتھ گھوڑے پر جو مرغ کوڑے کو کرید رہا تھا۔ کبھی کبھی کسی مرغ کو دیکھ کر بول اٹھتا۔

چند لمحوں تک جھونپڑے کے چھجکے کے نیچے سب خاموش رہے اور تھو معاٹے کی نزاکت اچھی طرح سمجھ گیا۔

روپا کی ماں نے روٹی آواز میں کہا ”میرے پھوٹے بھاگ!۔۔۔۔۔ اس کو تو جو کچھ اجڑنا تھا اجڑی، مجھ ابھاگن کی ساری دنیا پر باد ہو گئی۔۔۔۔۔ کیا اب کچھ نہیں ہو سکتا؟“

مادھو نے کندھے ہلائے اور نگوں سے مخاطب ہو کر کہا ”کیا ہو سکتا ہے؟ بھی میں یہ کانک کا ٹیکا اپنے ماتھے پر لگانا نہیں چاہتا۔۔۔۔۔ میں نے جب اپنے لالو کی بات روپا سے کی تھی تو مجھے یہ قندہ معلوم نہیں تھا۔۔۔۔۔ اب تم لوگ خود ہی وچار کرو کہ سب کچھ جانتے ہوئے میں اپنے بیٹے کا بیاہ روپا سے کیسے کر سکتا ہوں؟“

یہ سن کر نگوں کی گردن اٹھی، وہ شاید یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ لالو کا بیاہ روپا سے کیوں نہیں ہو سکتا ابھی کل تک سب ٹھیک ٹھاک تھا اب اتنی جلدی کیا ہو گیا کہ روپا لالو کے قابل نہیں رہی۔ وہ روپا اور لالو دونوں کو اچھی طرح جانتا تھا اور سچ پوچھو تو گاؤں میں ہر شخص ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتا ہے وہ کون سی بات تھی جو اسے ان دونوں کے بارے میں معلوم نہ تھی روپا اس کے سامنے پھولی پھلی، بڑھی اور جوان ہوئی۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ اس کے گال پر ایک زور کا دھپا بھی مارا تھا اور اس کو اتنی مجال نہ ہوئی تھی کہ چوں بھی کرے حالانکہ گاؤں کی سب چھوکریاں چھو کرے گستاخ تھے اور بڑوں کا بالکل ادب نہ کرتے تھے روپا تو بڑی بھولی بھالی لڑکی تھی۔ باتیں بھی بہت کم کرتی تھی اور اس کے چہرے پر کوئی ایسی علامت نہ تھی جس سے یہ پتہ چلتا کہ وہ کوئی شرارت بھی کر سکتی ہے پھر آج اس کی بابت یہ باتیں کیوں ہو رہی تھیں۔

نگوں کو گاؤں کے ہر چھوٹے اور اس کے اندر رہنے والوں کا حال معلوم تھا

مثال کے طور پر اسے معلوم تھا کہ چودھری کی گائے نے صبح سویرے ایک چھڑا دیا ہے اور مادھو کے ٹنڈے بھائی کی بیساکھی ٹوٹ گئی۔ گاما حلوائی اپنی مونچھوں کے بال چنوار ہاتھ کہ اس کے ہاتھ سے آئینہ گر کر ٹوٹ گیا اور ایک سیر دو دھ کے پیسے تانی کو بطور قیمت دینا پڑے۔۔۔۔۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ دو ایلوں پر پر سرام اور گنگو کی فنج چنچتے ہوتے رہ گئی تھی اور سالگ رام نے اپنے بچوں کو پاڑ بھون کر کھائے تھے حالانکہ وید جی نے منع کیا تھا کہ ان کو مریچوں والی کوئی شے نہ دی جائے۔۔۔۔۔ نتو حیران تھا کہ ایسی کون سی بات جو اسے معلوم نہیں تمام خیالات اس کے دماغ میں ایک دم آئے اور وہ مادھو کا اسے اپنی حیرت دور کرنے کی خاطر سے کوئی سوال کرنے ہی والا تھا کہ چودھری نے زمین پر طوطے کی شکل کرتے ہوئے کہا ”کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔۔۔ جھوڑے ہی دنوں میں وہ بچے کی ماں بن جائے گی“

تو یہ بات تھی کہ نتو کے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ پبر کی دھوپ میں اڑنے والی ساری چیلیں اس کے دماغ میں گھس کر چنچنے لگی ہیں اس نے اپنے بال زیادہ تیزی سے مروڑنے شروع کر دیئے۔

مادھو کا کا، نتو کی طرف جھکا اور بڑے دکھ بھرے لہجے میں اس سے کہنے لگا ”بیٹا! تمہیں یہ تو معلوم ہے کہ میں نے اپنے بیٹے کی بات روپا سے پکی کی تھی اب میں تم سے کیا کہوں۔۔۔۔۔ ذرا کان لاؤ ادھر“ اس نے ہولے سے نتو کے کان میں کچھ کہا اور پھر اسی لہجے میں کہنے لگا ”کتنی شرم کی بات ہے میں تو کہیں کانہ رہا، یہ میرا بڑھاپا اور یہ جان لیوا دکھ اور تو لورالو کو بتاؤں کیا دکھ ہوا ہوگا۔۔۔۔۔ تمہیں

انصاف کرو کیا لالو کی شادی اب اس سے ہو سکتی ہے۔۔۔ لالو کی شادی تو ایک طرف رہی، کیا ایسی لڑکی ہمارے گاؤں میں رہ سکتی ہے۔۔۔ کیا اس کے لیے ہمارے یہاں کوئی جگہ ہے؟“

نھو نے سارے گاؤں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور اسے ایسی کوئی جگہ نظر نہ آئی جہاں روپا اپنے والد سمیت رہ سکتی تھی۔ البتہ اس کا ایک جھونپڑا تھا۔ جس میں وہ چاہے کسی کو بھی رکھتا پچھلے برس اس نے کوڑھی کو اس میں پناہ دی تھی حالانکہ سارا گاؤں اسے روک رہا تھا اور اسے ڈرا رہا تھا کہ دیکھو نھو یہ بیماری بڑی چھوت والی ہوتی ہے ایسا نہ ہو کہ کہیں تمہیں چٹ جائے لیکن وہ اپنی مرضی کا مالک تھا اس نے وہی کچھ کیا جو اس کے من نے اچھا سمجھا کوڑھی اس کے گھر میں پورے چھ مہینے رہ کر مر گئی لیکن اسے بیماری و بیماری باکل نہ لگی اگر گاؤں میں روپا کے لیے کوئی جگہ نہ رہے تو کیا اس کا یہ مطلب تھا کہ اسے ماری ماری پھرنے دیا جائے۔ ہرگز نہیں، نھو اس بات کا قائل نہ تھا کہ دکھی پر اور دکھ لاد دینے جائیں اس کے جھونپڑے میں ہر وقت اس کے لیے جگہ تھی۔

وہ چھ مہینے تک اس کوڑھی کی تیمارداری کر سکتا تھا اور روپا کوڑھی تو نہیں تھی۔۔۔۔۔ کوڑھی تو نہیں تھی، یہ سوچتے ہوئے نھو کا دماغ ایک گہری بات سوچنے لگا۔۔۔۔۔ روپا کوڑھی نہیں تھی، اس لیے وہ ہمدردی کی زیادہ مستحق بھی نہ تھی۔ اسے کیا روگ تھا؟۔۔۔ کچھ بھی نہیں، جیسا کہ یہ لوگ کہہ رہے تھے، وہ جھوڑے ہی دنوں بچے کی ماں بننے والی تھی، پر یہ بھی کوئی روگ ہے اور کیا ماں بننا کوئی پاپ ہے؟ لڑکی عورت بننا چاہتی ہے اور عورت ماں، اس کی اپنی استری ماں

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

تم سے پوچھ رہا ہے اور وہ کوئی غیر جموڑی ہے، جو تم یوں اپنے من کو چھپا رہی ہو۔۔۔۔۔ تم روتی کیوں ہو غلطی ہو ہی جایا کرتی ہے۔۔۔۔۔ الالوکی کسی اور سے شادی ہو جائے گی اور تم اپنی جگہ خوش رہو گی۔۔۔ تمہیں دنیا کا ڈر ہے تو میں کہوں گا کہ تم بالکل بیوقوف ہو، لوگوں کے جو جی میں آئے کہیں، تمہیں اس سے کیا۔۔۔۔۔ غلطی کر کے اپنے آپ کو دوسروں کے حوالے کر دینا تو میری سمجھ میں سب سے بڑی غلطی ہے۔۔۔۔۔ جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ اب تو ہمیں یہ سوچنا ہے کہ اس کے آگے کیا ہو گا۔۔۔۔۔ تم دوسروں کی بابت نہ سوچو، اپنی فکر کرو، سب سے زیادہ ضروری چیز اس وقت تم ہو اور کچ پوچھو تو اپنی ذات ہی ہمیشہ سب سے ضروری ہوتی ہے۔۔۔۔۔ رونے دھونے سے کچھ نہ ہو گا روپا، آنسو بھری آنکھوں سے نہ تم مجھے ہی ٹھیک طور سے دیکھ سکتی ہو اور اپنے آپ کو۔۔۔۔۔ رونا بند کرو اور مجھے ساری بات بتاؤ۔“

روپا کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ اس سے کیا کہے، وہ دل میں سوچتی تھی کہ اب ایسی کون سی بات رہ گئی ہے جو دنیا کو معلوم نہیں یہی سوچتے ہوئے اس نے نتھو سے کہا ”نتھو بس! مجھ سے زیادہ تو دوسروں کو معلوم ہے میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ جو کچھ میں سوچتی تھی ایک سپنا تھا، یوں تو ہر چیز سپنا ہوتی تھی، پر یہ سپنا بڑا ہی عجیب ہے کیسے شروع ہوا کیونکر ختم ہوا۔ اس کا کچھ پتا ہی نہیں چلتا۔ بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام دن جو میں کبھی خوشی سے گزارتی تھی آنکھوں میں آنسو بننا شروع ہو گئے ہیں۔۔۔۔۔ میں گھڑا لے کر اچھلتی، کودتی، گاتی کنویں پر پانی بھرنے گئی پانی بھر کر جب واپس آنے لگی تو ٹھوکر لگی اور گھڑا پکنا چور ہو گیا، مجھے بڑا دکھ ہوا، میں

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

نہتوں نے اٹھ کر بلانا شروع کر دیا وہ سوچ رہا تھا ایک دو سیکنڈ غور کرنے کے بعد اس نے کہا، ”کبھی نہیں۔۔۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔۔۔ میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا، تم کیوں مرو۔ یوں تو موت سے چھکارا نہیں، سب کو ایک دن مرنا ہے پر اسی لیے تو جینا بھی ضروری ہے۔۔۔۔۔ میں کچھ لکھا پڑھا نہیں، میں کوئی پنڈت نہیں، پر جو کچھ میں نے کہا ہے ٹھیک ہے تم مجھے اس کا نام بتادو۔ میں تمہیں اس کے پاس لے جاؤں گا اور اسے مجبور کروں گا کہ وہ تمہارے ساتھ بنیام کر لے اور تمہیں اپنے پاس رکھے۔۔۔۔۔ وہی تمہارا بیٹا ہے“

روپا نے جواب دیا ”تم میرے لیے سب کچھ کر سکتے ہو تھو! پر جس آدمی کے پاس تم مجھے لے جانا چاہتے ہو کیا وہ بھی کچھ کرے گا؟۔۔۔۔۔ وہ تو مجھے بھول ہی چکا ہوگا“

نہو نے کہا، تمہیں دیکھتے ہی اسے سب کچھ یاد آ جائے گا۔۔۔۔۔ باقی چیزوں کی یاد اسے میں دلاؤں گا۔۔۔۔۔ تم مجھے اس کا نام تو بتاؤ۔۔۔۔۔ یہ ٹھیک ہے کہ استری اپنے پتی کا نام نہیں لیتی، پر ایسے موقع پر تمہیں کوئی الحاح نہ آئی چاہیے۔“

رو پا خاموش رہی، اس پر نختو اور زیادہ مضطرب ہو گیا ”میں تمہیں ایک سیدھی بات سمجھاتا ہوں اور تم سمجھتی ہی نہیں ہو، لگتی! جو تمہارے بچے کا باپ ہے وہی تمہارا پتی ہے۔۔۔۔۔ اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں تم بس آنسو بہائے جاتی ہو، کچھ سنتی ہی نہیں ہو۔۔۔۔۔ میں پوچھتا ہوں اس کا نام بتانے میں ہرج ہی کیا ہے۔۔۔۔۔ لو، تم نے تو اور رونا شروع کر دیا ہے اچھا بھئی ہیں زیادہ باتیں نہیں کرتا تم یہ بتاؤ کہ وہ ہے کون۔۔۔۔۔ تم مان لو میں اس کا کان پکڑ کر سیدھے راستے پر لے آؤں گا۔“

رو پانے سسکیوں میں کہا ”تم بار بار پتی نہ کہو نختو۔۔۔۔۔ میری جوانی، میری آشنا، میری دنیا، کبھی کی وہ صوا ہو چکی ہے۔۔۔۔۔ تم میری ماگ میں سیندھو رہنا چاہتے ہو اور میں چاہتی ہوں کہ سارے بال ہی فوج ڈالوں۔۔۔۔۔ نختو اب کچھ نہیں ہو سکے گا۔۔۔۔۔ میری جھولی کے پیر زمین پر گر کر۔۔۔۔۔ سب کے سب موری میں جا پڑے ہیں۔ اب انہیں باہر نکالنے سے کیا فائدہ۔۔۔۔۔ اس کا نام پوچھ کر تم کیا کرو گے۔۔۔۔۔ لوگ تو اب میرا نام بھول جانا چاہتے ہیں۔“

نختو تنگ آ گیا اور تیز لہجے میں کہنے لگا ”تم۔۔۔۔۔ تم بیوقوف ہو۔۔۔۔۔ میں اب تم سے کچھ نہیں پوچھوں گا۔“

وہ اٹھ کر جانے لگا تو رو پانے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا ایسا کرتے ہوئے اس کا رنگ بالکل زرد پڑ گیا۔

نختو نے اس کی گیلی آنکھوں کی طرف دیکھا ”بولو؟“

رو پا بولی ”نختو بھیا! مجھے مارو مجھے خوب پیڑ، شاید میں اس طرح اس کا نام بتا

دوں۔۔۔ تمہیں یاد ہوگا ایک بار میں نے بچپن میں مندر کے ایک چڑ سے کچے
آم توڑے تھے اور تم نے ایک ہی چائنا مار کر مجھ سے سچی بات کہلوائی تھی۔۔۔ آؤ
مجھے مارو یہ چور جسے میں نے اپنے من میں پناہ دے رکھی ہے بغیر مار کے باہر نہیں
نکلے گا۔“

نٹھو خاموش رہا۔ ایک لمبے کے لیے اس نے کچھ سوچا پھر ایک ایسی کی اس نے روپا
کے پیلے گال پر اس زور سے تھپڑ مارا کہ چھت کے چند سوکھے اور گرد سے اٹے
ہوئے تھکے دھمک کے مارے نیچے گر پڑے نٹھو کی سخت انگلیوں نے روپا کے گال پر
کئی نہریں کھود دیں

نٹھو نے گرج کر پوچھا ”بناؤ وہ کون ہے؟“

جھونپڑے کے باہر مادھو کے لنگڑے بھائی کی آدھی ٹانگ کانپی، چودھری
جس تھکے سے زمین پر ایک اور طوطے کی شکل بنا رہا تھا ہاتھ کاٹنے کے باعث دو ہرا
ہو گیا۔ مادھو کا کانے کلنگ کی طرح اپنی گردن اونچی کر کے جھونپڑے کے اندر
دیکھا۔

اندر سے نٹھو کی خشم آلود آواز آرہی تھی مگر یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے
آنکھوں ہی آنکھوں میں مادھو کا کا، چودھری اور لنگڑے کیشو نے آپس میں کئی
باتیں کیں آخر میں مادھو کا کا، کا بھائی بیسا کھی ٹیک کراٹھا۔ وہ جھونپڑے میں جانے
ہی والا تھا کہ نٹھو باہر نکلا کیشو ایک طرف ہٹ گیا نٹھو نے پٹ کراپے پیچھے دیکھا اور
کہا ”آؤ روپا! پھر اس نے روپا کی ماں سے کہا، ”ماں تم بالکل چننا نہ کرو سب ٹھیک
ہو جائے گا ہم شام تک لوٹ آئیں گے۔“

کسی نے تھو سے یہ نہ پوچھا کہ وہ روپا کو لے کر کدھر جا رہا ہے مادیو کا کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ تھو اور روپا دونوں چہوترے سے اتر کر موری کے اس پار جا چکے تھے چنانچہ وہ اپنی مونچھ کے سفید بال نوپنے میں مصروف ہو گیا اور چودھری کبڑے تھکے کو سیدھا کرنے لگا۔

بھنے کے مالک لالہ کشیش داس کا لڑکا کشیش جسے بھنے کے مزدور چھوٹے لالہ جی کہا کرتے تھے اپنے کمرے میں اکیلا چائے پی رہا تھا پاس ہی تپائی پر ایک کھلی ہوئی کتاب رکھی تھی جسے غالباً وہ پڑھ رہا تھا کتاب کی جلد کی طرح اس کا چہرہ بھی جذبات سے خالی تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے اپنے چہرے پر غلاف چڑھا رکھا ہے وہ ہر روز اپنے اندر ایک نیا کشیش پاتا تھا وہ جاڑے اور گرمیوں کے درمیانی موسم کی طرح متغیر تھا۔ وہ گرم اور سردیوں کا ایک مجموعہ تھا دوسرے دماغ سے سوچتے تھے لیکن وہ ہاتھوں اور پیروں سے سوچتا تھا وہ اپنی عمر کی ان منزلوں کو طے کر رہا تھا جہاں ہر شے کھیل نظر آتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اپنی زندگی کو گیند کی مانند اچھال رہا تھا وہ سمجھتا تھا کہ اچھل کو وہی زندگی کا اصل مقصد ہے اس کو مسنے سے بہت زیادہ مزہ آتا ہے ہر شے کو وہ مسل کر دیتا تھا۔

عورتوں کے متعلق اس کا نظریہ یہ تھا کہ مرد خواہ کتنا ہی بوڑھا ہو جائے مگر اس کو عورت جوان ملنی چاہیے عورت میں جوانی کو وہ اتنا ہی ضروری خیال کرتا تھا جتنا اپنے ٹینس کھیلنے والے ریکٹ میں بنے ہوئے جال کے اندر تناؤ کو وہ اپنے دوستوں کو کہا کرتا تھا زندگی کے ساز کا ہر تار ہر وقت تنا ہوا ہونا چاہیے تاکہ ذرا سی جنبش پر بھی وہ لرزنا شروع کر دے

یہ لرزش، یہ کپکپاہٹ جس سے ستیش کو اس قدر پیار تھا دراصل اس کے گندے خون کے کھواؤ کا نتیجہ تھی جنسی خواہشات اس کے اندر اس قدر زیادہ ہو گئی تھیں کہ جوان حیوانوں کو دیکھ کر بھی اسے لذت محسوس ہوتی تھی وہ جب اپنی گھوڑی کے جوان بچے کے کپکپاتے ہوئے بھورے بدن کو دیکھتا تو اسے ناقابل بیان مسرت حاصل ہوتی تھی اس کو دیکھ کر کئی بار اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ وہ اپنا بدن اس کے تروتازہ بدن کے ساتھ گھسے۔

ستیش چائے پی رہا تھا اور دل ہی دل میں چائے دانی کی تعریف کر رہا تھا جو بے داغ سفید چینی کی بنی ہوئی تھی ستیش کو داغ پسند نہیں تھے وہ ہر شے میں ہمواری پسند کرتا تھا، صاف بدن عورتوں کو دیکھ کر اکثر کہا کرتا تھا میری نگاہیں اس عورت پر کئی گھنٹے تیرتی رہیں۔۔۔۔۔ وہ کس قدر ہموار تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شفاف پانی کی چھوٹی سی جھیل ہے۔

یہ کمرہ جس میں اس وقت ستیش بیٹھا تھا۔ خاص طور پر اس کے لیے بنوایا گیا تھا کمرے کے سامنے ٹینس کورٹ تھا یہاں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ٹینس کھیلتا تھا آج اس نے اپنے دوستوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ ٹینس کھیلے نہیں آئے گا کیونکہ اسے آج ایک دلچسپ کھیل کھیلتا تھا بھنگلی کی جوان لڑکی جس کے متعلق اس نے ایک روز اپنے دوست سے یہ کہا تھا ”تم اسے دیکھو۔۔۔۔۔ سچ کہتا ہوں تمہاری نگاہیں اس کے چہرے پر سے پھسل پھسل جائیں گی میری نگاہیں اس کو دیکھنے سے پہلے اس کے کمر درے بالوں کو تھام لیتی ہیں تاکہ پھسل نہ جائیں۔۔۔۔۔“ آج ایک مدت کے بعد ٹینس کورٹ میں اس سے ملاقات کرنے کے لیے آ رہی تھی۔

وہ چائے پی رہا تھا اور اس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چائے میں اس جوان لڑکی کے سانولے رنگ کا ٹکس پڑ رہا ہے۔

اس کے آنے کا وقت ہو گیا تھا باہر سوکھے پتے کھڑکے تو تیش نے پیالی میں سے چائے کا آخری گھونٹ پیا اور اس کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔۔۔۔۔ ایک لمبا سا سایہ ٹینس کورٹ کے جھاڑو دینے ہوئے سینے پر متحرک ہوا اور لڑکی کے بجائے نختو نمودار ہوا۔

تیش نے غور سے اس کی طرف دیکھا کہ آنے والا ایک بھٹے کا مزدور ہے نختو اپنے سر کے بالوں کا ایک گچھا انگلیوں سے مروڑ رہا تھا اور ٹینس کورٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ تیش کی کرسی برآمدے میں جکھی تھی۔ پاس پہنچ کر نختو کھڑا ہو گیا اور تیش کی طرف یوں دیکھنے لگا گویا چھوٹے الہ جی کو اس کی آمد کی غرض و غایت اچھی طرح معلوم ہے۔

تیش نے پوچھا ”کیا ہے؟“

نختو خاموشی سے برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا ”چھوٹے الہ جی! میں اسے لے کر آیا ہوں اب آپ اسے اپنے پاس رکھ لیجئے، گاؤں والے اسے بہت تنگ کر رہے ہیں“

تیش حیران ہو گیا اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ نختو کیا کہہ رہا ہے اس نے پوچھا ”کسے؟۔۔۔۔۔ کسے تنگ کر رہے ہیں“

نختو نے جواب دیا ”آپ۔۔۔۔۔ آپ۔۔۔۔۔ کی روپا کو۔۔۔۔۔ آپ کی پتی کو“

ستیش نے پوچھا ”کہاں ہے رویا؟“

”ختمو اٹھو کھڑا ہوا“ باہر کھڑی ہے۔۔۔۔ میں ابھی اسے لاتا ہوں“

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

یہ کہہ کر تیش نے اپنی جیب سے نوہ نکالا اور دس روپے کا نوٹ نھو کے ہاتھ میں دے کر کہا ”یہ رہا تمہارا انعام۔۔۔۔۔ جاؤ عیش کرو“
 نھو چپکے سے اٹھا دس روپے کا نوٹ اس نے اچھی طرح مٹھی میں دبایا اور وہاں سے چل دیا تیش نے اطمینان کا سانس لیا کہ چلو چھٹی ہوئی اب وہ بھنگی کی لڑکی کی بابت سوچنے لگا کہ اگر اسے بھی۔۔۔۔۔ مگر یہ کیا نھو روپا کے ساتھ واپس آ رہا تھا۔

روپا کی نظریں ہلکی ہوئی تھیں اور وہ یوں چل رہی تھی جیسے اسے بہت تکلف ہو رہی تھی تیش نے سوچا ”یہ بچہ پیدا کرنا بھی ایک اچھی خاصی مصیبت معلوم ہوتی ہے“

نھو اور روپا دونوں برآمدے کی سیڑھیوں کے پاس کھڑے ہو گئے تیش نے روپا کی طرف دیکھے بغیر کہا ”دیکھو روپا! میں نے۔۔۔۔۔ اس کو سب کچھ سمجھا دیا ہے تم فکر نہ کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔۔۔ سمجھیں۔۔۔۔۔ کیوں بھی تم نے اسے سب کچھ بتا دیا؟“

نھو نے دس روپے کا نوٹ خاموشی سے تیش کی طرف بڑھا دیا اور کہا ”چھو لے لالہ جی! کاغذ کے اس ٹکڑے سے آپ مجھے خریدنا چاہتے ہیں میں تو ایک بہت بڑا سودا کرنے آیا تھا۔“

تیش نے سمجھا کہ نھو شاید دس روپے سے زیادہ مانگتا ہے ”کتنے روپے چاہئیں تجھے۔۔۔۔۔ میرے پاس اس وقت پچاس ہیں، لیکن ہوں تو لے جاؤ“
 نھو نے روپا کی طرف دیکھا روپا کی آنکھوں سے آنسو نکل کر سینٹ سے لپی

ہوئی میڑھیوں پر ٹپک رہے تھے اس کے دل پر یہ قطرے پگھلے ہوئے سیسے کی طرح
 گر رہے تھے۔ تیش کی طرف اس نے مڑ کر کہا ”چھوٹے لالہ جی! یہ آپ کی چٹی
 ہے آپ اس کے بچے کے باپ ہیں۔۔۔ جیسے بڑے لالہ جی آپ کے پتا
 ہیں۔۔۔۔۔ روپا کے لیے اور کوئی جگہ نہیں ہے، وہ آپ کے پاس رہے گی اور
 آپ اسے چٹی بنا کر رکھیں گے۔۔۔۔۔ سب گاؤں والے اسے دھتکار رہے ہیں،
 کس لیے۔۔۔۔۔ اس لیے کہ وہ آپ کا بچہ اپنے پیٹ میں لیے لیے پھرتی
 ہے۔۔۔۔۔ آپ کو تنہا مانا پڑے گا اس لڑکی کا ہاتھ جس نے آپ کو اپنا سب کچھ
 دے دیا۔۔۔۔۔ آپ کا دل پتھر کا نہیں ہے چھوٹے لالہ جی! اور اس چھوٹے لالہ جی کا دل
 بھی پتھر نہیں ہے۔۔۔۔۔ آپ نے اس کو سہارا نہ دیا تو اور کون دے گا یہ آتی نہیں
 تھی رو رو کے اپنی جان ہکان کر رہی تھی میں نے اسے سمجھایا اور کہا بچی تو کیوں
 روتی ہے تیرا پتی جیتا ہے چل میں تجھے اس کے پاس لے چلوں“

تیش کو پتی چٹی کا مطلب ہی سمجھ میں نہ آتا تھا ”دیکھو بھائی! زیادہ بکو اس نہ
 کرو تم یوں ڈرا دھمکا کر مجھ سے زیادہ روپیہ وصول نہیں کر سکتے۔ میں ایک سو روپیہ
 دینے پر راضی ہوں مگر شرط یہ ہے کہ بچہ ضائع کر دیا جائے اور تم جو مجھ سے یہ کہتے
 ہو کہ میں اسے اپنے گھر میں بسا لوں تو یہ ناممکن ہے۔ میں اس کا پتی خواب میں
 بھی نہیں بنا اور نہ یہ میری کبھی چٹی بنی ہے۔۔۔۔۔ سمجھو؟ سو روپیہ لینا ہو تو کل آ
 کے یہاں سے لے جانا اب یہاں سے نو دو گیارہ ہو جاؤ۔“

نٹھو بھنا گیا

”اور۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ یہ بچہ کیا آسمان سے آ گیا ہے؟۔۔۔۔۔ اس کی

آنکھوں میں آنسو بھوت پریتوں نے بھر دیئے ہیں۔۔۔۔۔ میرا دل۔۔۔۔۔ میرا
 دل کون مسل رہا ہے۔۔۔۔۔ یہ رو پے۔۔۔۔۔ یہ سو رو پے کیا آپ خیرات کے
 طور پر دے رہے ہیں۔۔۔۔۔ کچھ ہوا ہے تو سب کچھ ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ کوئی
 بات ہے تو یہ باپل مچ رہی ہے۔۔۔۔۔ آپ اس کے بچے کے باپ ہیں تو کیا اس
 کے پتی نہیں؟۔۔۔۔۔ میری عقل کو کچھ ہو گیا ہے یا آپ کی سمجھ کو۔۔۔۔۔“
 خٹیش یہ تقریر برداشت نہ کر سکا ”الو کے ٹھے! تو جاتا ہے کہ نہیں یہاں سے،
 کھڑا اپنی منطق چھانٹ رہا ہے، جا جو کچھ کرنا ہے کر لے۔۔۔۔۔ دیکھوں تو میرا کیا
 بگاڑ لے گا۔“

نھو نے ہولے سے کہا ”میں تو سنوارنے آیا تھا چھوٹے لالہ
 جی۔۔۔۔۔ آپ ناحق کیوں بگڑ رہے ہیں آپ کیوں نہیں اس کا ہاتھ تھام لیتے یہ
 آپ کی پتی ہے۔“

”پتی کے بچے، اب تو اپنی بکواس بند کرے گا یا نہیں۔۔۔۔۔ بچے بچے کیا
 بک رہا ہے۔۔۔۔۔ جالے جا اپنی اس کچھ لگتی کو، ورنہ یاد رکھ، کھال ادھیڑ دوں گا۔“
 نھو کے سب ٹھے اکڑ گئے ”بھگوان کی قسم، مجھ میں اتنی شقتی ہے کہ یوں ہاتھوں
 میں دبا کر تیرا سارا ابو نچوڑ دوں۔۔۔۔۔ میری کھال تیرے ان نازک ہاتھوں سے
 ادھیڑے گی۔۔۔۔۔ میں تیری بوٹی بوٹی نوچ سکتا ہوں۔۔۔۔۔ پر میں کچھ نہیں کر
 سکتا۔۔۔۔۔ میں تجھے ہاتھ تک نہیں لگانا چاہتا۔۔۔۔۔ تو روپا کے بچے کا
 باپ ہے، تو روپا کا پتی ہے اگر میں نے تجھ پر ہاتھ اٹھایا تو مجھے ڈر ہے کہ روپا کے
 دل کو دھکا لگے گا۔۔۔۔۔ تو عورتوں سے ملتا جلتا ہے پر تو عورت کا دل نہیں

رکھتا۔“

ستیش آپے سے باہر ہو گیا اور چیخنے لگا ”تیری اور تیری روپا کی ایسی
تیمی۔۔۔۔۔ نکل یہاں سے باہر“

نھو بڑھ کر روپا کے آگے کھڑا ہو گیا اور ستیش کے پاس۔۔۔۔۔ بالکل
پاس جا کر کہنے لگا ”چھوٹے لالہ جی مجھے معاف کر دیجئے میں نے ایسی باتیں کہہ
دی ہیں جو مجھے نہیں کہنا چاہیے تھیں۔۔۔۔۔ مجھے معاف کر دیجئے مگر روپا کا ہاتھ
تھام لیجئے۔۔۔۔۔ آپ اس کے پتی ہیں، اس کے بھاگ میں آپ کے بنا اور کوئی
مرد نہیں لکھا گیا یہ آپ کی ہے۔۔۔۔۔ اب آپ اسے اپنالیں۔۔۔۔۔ یہ دیکھئے میں
آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں“

”کیسے وہیات آدمی سے واسطہ پڑا ہے“ ستیش نے کمرے کے اندر جاتے
ہوئے کہا ”کہتا ہوں میں روپو روپا کو نہیں جانتا مگر یہ خواہ مخواہ سے میرے پلے
باندھ رہا ہے۔۔۔۔۔ جاؤ جاؤ ہوش کی دوا کرو“

کمرے کا صرف دروازہ کھلا تھا جس میں سے ستیش اندر داخل ہوا تھا اندر
داخل ہو کر اس نے یہ دروازہ بند کر دیا نہ تو نے دروازے کی نکلڑی کی طرف دیکھا تو
اسے ستیش کے چہرے اور اس میں کوئی فرق نہ آیا۔

نھو نے اپنے سر کے بال مروڑنے شروع کیے اور جب پلٹ کر اس نے روپا
سے کچھ کہنا چاہا تو وہ جا چکی تھی۔۔۔۔۔ وہ اس کا پیچھا کرنے کے لیے بھاگا مگر وہ
جا چکی تھی باہر نکل کر اس نے روپا کو بہت دور درختوں کے جھنڈ میں غائب ہوتے
دیکھا وہ اس کے پیچھے یہ کہتا ہوا بھاگا ”روپا۔۔۔۔۔ روپا تھبر جا۔۔۔۔۔ میں ایک بار

پھر اسے سمجھاؤں گا۔۔۔۔۔ وہی تیرا پتی ہے۔۔۔۔۔ اس کا گھر ہی تیری اصل جگہ ہے۔۔۔

وہ بہت دیر تک بھاگتا رہا مگر روپا بہت دور نکل گئی تھی۔۔۔۔۔ اس روز سے آج تک نٹھو، روپا کی تلاش میں سرگرداں ہے مگر وہ اسے نہیں ملتی وہ لوگوں سے کہتا ہے ”میں روپا کے پتی کو جانتا ہوں۔۔۔۔۔ تم اسے ڈھونڈ کر لاؤ میں اسے اس کے پتی سے ملاؤں گا“

لوگ یہ سن کر ہنس دیتے ہیں۔۔۔۔۔ بچے جب بھی نٹھو کو دیکھتے ہیں تو اس سے پوچھتے ہیں ”اس کا پتی کون ہے نٹھو بھیا!“ تو نٹھو ان کو مارنے کے لیے دوڑتا ہے۔۔۔

☆☆☆☆☆☆

اللہ دتا

دو بھائی تھے اللہ رکھا اور اللہ دتا دونوں ریاست پٹیالہ کے باشندے تھے ان کے آباؤ اجداد الہیہ تھے مگر جب ان دو بھائیوں کا دوا ملازمت کی تلاش میں پٹیالہ آیا تو وہیں کا ہو رہا۔

اللہ رکھا اور اللہ دتا دونوں سرکاری ملازم تھے ایک چیف سیکرٹری صاحب بہادر کا اردلی تھا، دوسرا کنٹرولر آف سٹورز کے دفتر کا چیر اسی۔

دونوں بھائی ایک ساتھ رہتے تھے تاکہ خرچ کم ہو بڑی اچھی گزر رہی تھی ایک طرف اللہ رکھا جو بڑا تھا، اور کبھی کبھی کسی غریب اور نادار عورت کو پھانس بھی لیا کرتا تھا مگر اللہ رکھا نے ہمیشہ چشم پوشی سے کام لیا تھا کہ گھر کا امن و سکون درہم برہم نہ ہو۔

دونوں شادی شدہ تھے اللہ رکھا کی دو لڑکیاں تھیں ایک بیابھی جا چکی تھی اور اپنے گھر میں خوشی تھی دوسری جس کا نام صغریٰ تھا، تیرہ برس کی تھی اور پرائمری سکول میں پڑھتی تھی۔

اللہ دتا کی ایک لڑکی تھی۔۔۔۔۔ زینب۔۔۔۔۔ اس کی شادی ہو چکی تھی مگر اپنے گھر میں کوئی اتنی خوش نہیں تھی اس لیے کہ اس کا خاندان اباش تھا پھر بھی وہ جوں توں بھائے جا رہی تھی۔

زینب اپنے بھائی طفیل سے تین سال بڑی تھی اس حساب سے طفیل کی عمر اٹھارہ انیس برس کے قریب ہوتی تھی وہ لوہے کے ایک چھوٹے سے کارخانے

میں کام سیکھ رہا تھا لڑکا ذہین تھا چنانچہ کام سیکھنے کے دوران میں بھی پندرہ روپے ماہوار اسے مل جاتے تھے۔

دونوں بھائیوں کی بیویاں بڑی اطاعت شعار، محنتی اور عبادت گزار عورتیں تھیں۔۔۔۔۔ انہوں نے اپنے شوہروں کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ زندگی بڑی ہموار گزر رہی تھی کہ ایک ایسی ہندو مسلم فساد شروع ہو گئے دونوں بھائیوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کے مال و جان اور عزت آمد پر حملہ ہو گا اور انہیں نہایت افراتفری اور کسمپرسی کے عالم میں ریاست پٹیلہ چھوڑنا پڑے گی۔۔۔۔۔ مگر ایسا ہوا۔

دونوں بھائیوں کو قطعاً معلوم نہیں کہ اس خونیں طوفان میں کون سا درخت گرا۔ کون سے درخت کی کون سی ٹہنی ٹوٹی۔۔۔۔۔ جب ہوش و حواس کسی قدر درست ہوئے تو چند حقیقتیں سامنے آئیں اور وہ ہلرز گئے۔

اللہ رکھا کی لڑکی کا شوہر شہید کر دیا گیا تھا اور اس کی بیوی کو بلوائیوں نے بڑی بے دردی سے ہلاک کر دیا تھا۔

اللہ دتا کی بیوی کو بچیس کھوں نے کرپانوں سے کاٹ ڈالا تھا اس کی لڑکی نمب۔۔۔۔۔ کا بد چلن شوہر بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔

رونا دھونا بیکار تھا۔ صبر شکر کر کے بیٹھ رہے۔۔۔۔۔ پہلے تو کیمپوں میں گلتے مڑتے رہے پھر گلی کوچوں میں بھیک مانگا کیے آخر خدا نے سن لی اللہ دتا کو گوجرانوالہ میں ایک چھوٹا سا شکتہ مکان سر چھپانے کو مل گیا ظلیل نے دوڑ دھوپ کی تو اسے کام مل گیا۔

اللہ رکھالا ہو رہی میں دیر تک در بدر پھرتا رہا جوان لڑکی ساتھ تھی گویا ایک پہاڑ کا پہاڑ اس کے سر پر کھڑا تھا یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس غریب نے کس طرح ڈیڑھ برس گزرا بیوی اور بڑی لڑکی کا غم وہ بالکل بھول چکا تھا۔ قریب تھا کہ وہ کوئی خطرناک قدم اٹھائے کہ اسے ریاست پیالہ کے ایک بڑے افسر مل گئے جو اس کے بڑے مہربان تھے اس نے ان کو اپنی حالت زار الف سے لے کر ینے تک سنانی آدمی رحم دل تھا اس کو بڑی دقتوں کے بعد لاہور کے ایک عارضی دفتر میں اچھی ملازمت مل گئی تھی، چنانچہ انہوں نے دوسرے روز ہی اس کو چالیس روپیہ ماہوار پر ملازم رکھ لیا اور ایک چھوٹا سا کوارٹر بھی رہائش کے لیے دلوا دیا۔

اللہ رکھانے خدا کا شکر ادا کیا جس نے اس کی مشکلات دور کیں اب وہ آرام سے سانس لے سکتا تھا اور مستقبل کے متعلق اطمینان سے سوچ سکتا تھا صغریٰ بڑی سلیقے والی سکھ لڑکی تھی سارا دن گھر کے کام کاج میں مصروف رہتی ادھر ادھر سے لکڑیاں چن کر لاتی چولہا ساگاتی اور مٹی کی ہنڈیا میں ہر روز اتنا سالن پکاتی جو وہ وقت کے لیے پورا ہو جائے آٹا گوند مٹی پاس ہی تنور تھا وہاں جا کر روٹیاں لگوا لیتی۔

تنہائی میں آدمی کیا کچھ نہیں سوچتا۔ طرح طرح کے خیالات آتے ہیں صغریٰ عام طور پر دن میں تنہا ہوتی تھی اور اپنی بہن اور ماں کو یاد کر کے آنسو بہاتی رہتی تھی، پر جب باپ آتا تو وہ اپنی آنکھوں میں سارے آنسو خشک کر لیتی تھی تاکہ اس کے زخم ہرے نہ ہوں لیکن وہ اتنا جانتی تھی کہ اس کا باپ اندر ہی اندر گھلا جا رہا ہے اس کا دل ہر وقت روتا رہتا ہے مگر وہ کسی سے کہتا نہیں صغریٰ سے بھی اس نے کبھی اس

کی ماں اور بہن کا ذکر نہیں کیا تھا۔

زندگی افتاں و خیزاں گزر رہی تھی اوپر گوجرانوالہ میں اللہ دتا اپنے بھائی کے مقابلے میں کسی قدر خوش حال تھا، کیونکہ اسے بھی ملازمت مل گئی تھی اور زینب بھی معمولاً بہت سہانی کام کر لیتی تھی مل ملا کے کوئی ایک سو روپے ماہوار ہو جاتے تھے جو تینوں کے لیے بہت کافی تھے۔

مکان چھوٹا تھا، مگر ٹھیک تھا اوپر کی منزل میں طفیل رہتا تھا، چلی منزل میں زینب اور اس کا باپ دونوں ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اللہ دتا اسے زیادہ کام نہیں کرنے دیتا تھا چنانچہ منہ اندھیرے اٹھ کر وہ صحن میں جھاڑو دے کر چولہا ساگادیتا تھا کہ زینب کا کام کچھ ہلکا ہو جائے وقت ملتا تو وہ دو تین گھڑے بھر کر گھر و بچہ پر رکھ دیتا تھا۔

زینب نے اپنے شہید خاوند کو کبھی یاد نہیں کیا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس کی زندگی میں کبھی تھا ہی نہیں وہ خوش تھی اپنے باپ کے ساتھ بہت خوش تھی بعض اوقات وہ اس سے لپٹ جاتی تھی۔۔۔ طفیل کے سامنے بھی اور اس کو خوب چومتی تھی۔

صغریٰ اپنے باپ سے ایسے چہل نہیں کرتی تھی۔۔۔۔۔ اگر ممکن ہوتا تو وہ اس سے پردہ کرتی اس لیے نہیں کہ وہ کوئی نامحرم تھا نہیں۔۔۔۔۔ صرف احترام کے لیے۔۔۔۔۔ اس کے دل سے کئی دفعہ یہ دعا اٹھتی ”یا پروردگار۔۔۔۔۔ میرا باپ میرا جنازہ اٹھائے“

بعض اوقات کئی دعائیں اُٹی ثابت ہوتی ہیں جو خدا کو منظور تھا، وہی ہوتا تھا

غریب صغریٰ کے سر پر غم و اندوہ کا ایک اور پہاڑ ٹوٹنا تھا۔

جون کے مہینے دو پہر کو دفتر کے کسی کام پر جاتے ہوئے تھقی ہوئی سڑک پر اللہ رکھا کو ایسی لوگی کہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ لوگوں نے اٹھایا ہسپتال پہنچایا مگر دوا دارو نے کوئی کام نہ کیا۔

صغریٰ باپ کی موت کے صدمے سے نیم پاگل ہو گئی اس نے قریب قریب اپنے آدھے بال نوچ ڈالے کہ ہمسایوں نے بہت دم دلاسا دیا۔ مگر یہ کارگر کیسے ہوتا۔۔۔ وہ ایسی کشتی کے مانند تھی جس کا بادبان ہونہ کوئی پتوار اور بیچ منجھدار کے آن پھنسی ہو۔

پٹیا لے کے وہ افسر جنہوں نے مرحوم اللہ رکھا کو ملازمت دلوائی تھی فرشتہ رحمت ثابت ہوئے ان کو جب اطلاع ملی تو دوڑے آئے سب سے پہلے انہوں نے یہ کام کیا کہ صغریٰ کو موٹر میں بٹھا کر گھر چھوڑ آئے اور اپنی بیوی سے کہا کہ وہ اس کا خیال رکھے۔ پھر ہسپتال جا کر انہوں نے اللہ رکھا کے غسل وغیرہ کاہ ہیں انتظام کیا اور دفتر والوں سے کہا کہ وہ اس کو دفن آئیں۔

اللہ دتا کو اپنے بھائی کے انتقال کی خبر بڑی دیر کے بعد ملی بہر حال وہ لاہور آیا اور پوچھتا پوچھتا وہاں پہنچ گیا جہاں صغریٰ تھی اس نے اپنی جھتی کو بہت دم دلاسا دیا بہلایا سینے کے ساتھ لگایا پیار کیا، دنیا کی بے ثباتی کا ذکر کیا، بیاہر بننے کو کہا، مگر صغریٰ کے پھٹے ہوئے دل پر ان تمام باتوں کا کیا اثر ہوتا غریب خاموش اپنے آنسو دوپٹے میں خشک کرتی رہی۔

اللہ دتا نے افسر صاحب سے آخر میں کہا ”میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں

میری گروں آپ کے احسانوں تلے ہمیشہ دہلی رہے گی مرحوم کی تجہیز و تکفین کا آپ نے بندوبست کیا پھر یہ بچی جو بالکل بے آسرا رہ گئی تھی، اس کو آپ نے اپنے گھر میں جگہ دی۔۔۔ خدا آپ کو اس کا اجر دے۔۔۔ اب میں اسے اپنے ساتھ لیے جاتا ہوں میرے بھائی کی بڑی قیمتی نشانی ہے۔“

افسر صاحب نے کہا ”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ لیکن تم ابھی اسے کچھ دیر اور یہاں رہنے دو۔۔۔۔۔ طبیعت سنبھل جائے تو لے جانا“
اللہ دتا نے کہا ”حضور! میں نے ارادہ کیا ہے کہ اس کی شادی اپنے لڑکے سے کروں گا اور بہت جلدی!“

افسر صاحب بہت خوش ہوئے ”بڑا نیک ارادہ ہے۔۔۔۔۔ لیکن اس صورت میں جب کہ تم اس کی شادی اپنے لڑکے سے کرنے والے ہو اس کا اسی گھر میں رہنا مناسب نہیں تم شادی کا بندوبست کرو مجھے تاریخ سے مطلع کر دینا خدا کے فضل و کرم سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

بات درست تھی اللہ دتا واپس گوجرانوالہ چلا گیا نہیب اس کی غیر موجودگی میں بڑی اداس ہو گئی تھی جب وہ گھر میں داخل ہوا تو اس سے پٹ گئی اور کہنے لگی کہ اس نے اتنی دیر کیوں لگائی

اللہ دتا نے پیار سے اسے ایک طرف بٹلایا ”ارے بابا، آنا جانا، کیا ہے۔۔۔۔۔ قبر پر فاتحہ پڑھنی تھی صغریٰ سے ملنا تھا، اسے یہاں لانا تھا“
نہیب نہ معلوم کیا سوچنے لگی ”صغریٰ کو یہاں لانا تھا“ ایک دم چونک کر ”ہاں۔۔۔۔۔ صغریٰ کو یہاں لانا تھا پر وہ کہاں ہے؟“

ایک اگلی بھی لے دی پھر اس نے محلہ والوں سے اپیل کی کہ وہ ایک یتیم لڑکی کی شادی کے لیے جو بالکل بے سہارا ہے، حسب توفیق کچھ دیں۔

صغریٰ کو قریب قریب کبھی جانتے تھے اور اس کے حالات سے واقف تھے، چنانچہ انہوں نے مل ملا کر اس کے لیے بڑا اچھا جہیز تیار کر دیا۔

صغریٰ واپس بنی تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ تمام دکھ جمع ہو گئے ہیں اور اس کو پیسے رہے ہیں بہر حال وہ اپنے سسرال پہنچی جہاں اس کا استقبال زینب نے کیا، کچھ اس طرح کہ صغریٰ کو اسی وقت معلوم ہو گیا کہ وہ اس کے ساتھ بہنوں کا سا سلوک کبھی نہیں کرے گی بلکہ ساس کی طرح پیش آئے گی۔

صغریٰ کا اندیشہ درست تھا اس کے ہاتھوں کی مہندی ابھی اچھی طرح اترنے بھی نہیں پائی تھی کہ زینب نے اس سے نوکروں کے کام لینے شروع کر دیئے، جھاڑو دیتی، برتن وہ مانتھتی، چولہا وہ جھونکتی، پانی وہ بھرتی یہ سب کام وہ بڑی پھرتی اور بڑے سلیقے سے کرتی لیکن پھر بھی زینب خوش نہ ہوتی بات بات پر اس کو ڈانٹتی، ڈیٹتی، جھڑکتی رہتی۔

صغریٰ نے دل میں تہیہ کر لیا تھا، وہ یہ سب کچھ برداشت کرے گی اور کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لائے گی کیونکہ اگر اسے یہاں سے دھکا مل گیا تو اس کے لیے اور کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔

اللہ دتا کا سلوک البتہ اس سے برا نہیں تھا زینب کی نظر بچا کر کبھی کبھی وہ اس کو پیار کر لیتا تھا اور کہتا تھا کہ وہ کچھ فکر نہ کرے سب ٹھیک ہو جائے گا۔

صغریٰ کو اس سے بہت ڈھارس ہوتی زینب جب کبھی اپنی کسی سہیلی کے ہاں

جانی اور اللہ دتا اتفاق سے گھر پر ہوتا تو وہ اس سے دل کھول کر پیار کرتا۔ اس سے بڑی میٹھی میٹھی باتیں کرتا کام میں اس کا ہاتھ بناتا اس کے واسطے اس نے جو چیزیں چھپا کر رکھی ہوتی تھیں، دیتا اور سینے کے ساتھ لگا کر اس سے کہتا ’صغریٰ تم بڑی پیاری ہو!‘

صغریٰ جھینپ جاتی دراصل وہ اتنے پر جوش پیار کی عادی نہیں تھی اس کا مرحوم باپ اگر کبھی اسے پیار کرتا چاہتا تھا تو صرف اس کے سر پر ہاتھ پھیر دیا کرتا تھا یا اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر یہ دعا دیا کرتا تھا ’خدا میری بیٹی کے نصیب اچھے کرے‘

صغریٰ، طفیل سے بہت خوش تھی وہ بڑا اچھا خاوند تھا جو ماما تھا اس کے حوالے کر دیتا تھا، مگر صغریٰ زینب کو دے دیتی تھی اس لیے کہ وہ اس کے قہر و غضب سے ڈرتی تھی۔

طفیل سے صغریٰ نے زینب کی بدسلوکی اور اس کے ساتھ ایسے برتاؤ کا کبھی ذکر نہیں کیا تھا وہ صلح کل تھی، وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے باعث گھر میں کسی قسم کی بد مزگی پیدا ہو اور بھی کئی باتیں تھیں جو وہ طفیل سے کہنا چاہتی تو کہہ دیتی مگر اسے ڈر تھا کہ طوفان برپا ہو جائے گا اور سب اس میں سے بچ کر نکل جائیں گے مگر وہ اکیلی اس میں پھنسی جائے گی اور اس کی تاب نہ لاسکے گی۔

یہ خاص باتیں اسے چند روز ہوئے معلوم ہوئی تھیں اور وہ کانپ کانپ گئی تھی۔ اب اللہ دتا اسے پیار کرتا چاہتا تو وہ الگ ہٹ جاتی، یاد دہڑا کر اوپر چلی جاتی، جہاں وہ اور طفیل رہتے تھے۔

طفیل کو جمعہ کی چھٹی ہوتی تھی اللہ دتا کو اتوار کی اگر نصاب گھر پر ہوتی تو وہ جلدی جلدی کام کاج ختم کر کے اوپر چلی جاتی اگر اتفاق سے اتوار کو نصاب کہیں باہر گئی ہوتی تو صغریٰ کی جان پر بنی رہتی ڈر کے مارے اس سے کام نہ ہوتا لیکن نصاب کا خیال آتا تو اسے مجبوراً کانپتے ہاتھوں اور دھڑکتے دل سے طوعاً و کرہاً سب کچھ کرنا پڑتا۔ اگر وہ کھانا وقت پر نہ پکائے تو اس کا خاوند بھوکا رہے، کیونکہ وہ ٹھیک بارہ بجے اپنا شاگرد روٹی کے لیے بھیج دیتا تھا۔

ایک دن اتوار کو جب کہ نصاب گھر پر نہیں تھی اور وہ آنا گوندھ رہی تھی اللہ دتا پیچھے سے بے پاؤں آیا اور کھلنڈرے انداز میں اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ وہ تڑپ کر اٹھی مگر اللہ دتا نے اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا۔

صغریٰ نے چیخا شروع کر دیا مگر وہاں سننے والا کون تھا اللہ دتا نے کہا ”شور مت مچاؤ۔۔۔۔۔ یہ سب بے فائدہ ہے۔۔۔۔۔ چلو آؤ“

وہ چاہتا تھا کہ صغریٰ کو اٹھا کر اندر لے جائے وہ کمزور تھی مگر خدا جانے اس میں کہاں سے اتنی طاقت آگئی کہ اللہ دتا کی گرفت سے نکل گئی اور ہانپتی کانپتی اوپر پہنچ گئی کمرے میں داخل ہو کر اس نے اندر سے کنڈی چڑھا دی۔

تھوڑی دیر کے بعد نصاب آگئی اللہ دتا کی طبیعت خراب ہو گئی تھی اندر کمرے میں بیٹ کر اس نے نصاب کو پکارا وہ آئی تو اس سے کہا ”ادھر آؤ میری مائیں دباؤ۔۔۔۔۔ نصاب اچک کر پلنگ پر بیٹھ گئی اور اپنے باپ کی مائیں دبانے لگی تھوڑی دیر کے بعد دونوں کے سانس تیز تیز چلنے لگے۔“

نصاب نے اللہ دتا سے پوچھا ”کیا بات ہے۔۔۔۔۔ آج تم اپنے آپ

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

الوکا پٹھا

قاسم صبح سات بجے حاف سے باہر نکلا اور غسل خانے کی طرف چلا راستے میں، یہ اس کو ٹھیک طور پر معلوم نہیں، سونے والے کمرے میں، صحن میں یا غسل خانے کے اندر اس کے دل میں یہ خوانش پیدا ہوئی کہ وہ کسی کو الوکا پٹھا کہے بس صرف ایک بار غصے میں یا طنز یہ انداز میں کسی کو الوکا پٹھا کہہ دے۔

قاسم کے دل میں اس سے پہلے کئی بار بڑی بڑی انوکھی خوانشیں پیدا ہو چکی تھیں مگر یہ خوانش سب سے نرانی تھی وہ بہت خوش تھارات اس کو بڑی پیاری نیند آئی تھی وہ خود کو بہت تازہ محسوس کر رہا تھا لیکن پھر یہ خوانش کیسے اس کے دل میں داخل ہو گئی۔ دانت صاف کرتے وقت اس نے ضرورت سے زیادہ وقت صرف کیا جس کے باعث اس کے مسوڑھے چھل گئے دراصل وہ سوچتا رہا کہ یہ عجیب و غریب خوانش کیوں پیدا ہوئی مگر وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔

بیوی سے وہ بہت خوش تھا ان میں کبھی لڑائی نہ ہوتی تھی نوکروں پر بھی وہ ناراض نہیں تھا اس لیے کہ غلام محمد اور نبی بخش دونوں خاموشی سے کام کرنے والے مستعد نوکر تھے۔ موسم بھی نہایت خوشگوار تھا فروری کے سہانے دن تھے جن میں کنوارے کی تازگی تھی ہوا خشک اور ہلکی دن چھوٹے نہ راتیں لمبی نیچر کا توازن بالکل ٹھیک تھا اور قاسم کی صحت بھی خوب تھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کسی کو بغیر وجہ کے الوکا پٹھا کہنے کی خوانش اس کے دل میں کیوں کر پیدا ہو گئی۔

قاسم نے اپنی زندگی کے اٹھائیس برسوں میں متعدد لوگوں کو الوکا پٹھا کہا ہوگا

اور بہت ممکن ہے کہ اس سے بھی کڑے لفظ اس نے بعض موقعوں پر استعمال کیے ہوں اور گندی گالیوں بھی دی ہوں مگر اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ایسے موقعوں پر خواہش بہت پہلے اس کے دل میں پیدا نہیں ہوتی تھی مگر اب اچانک طور پر اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ کسی کو الو کا پٹھا کہنا چاہتا ہے اور یہ خواہش لمحہ بہ لمحہ شدت اختیار کرتی چلی گئی جیسے اس نے اگر کسی کو الو کا پٹھا نہ کہا تو بہت بڑا ہرج ہو جائے گا۔

وانت صاف کرنے کے بعد اس نے چھلے ہوئے مسوڑھوں کو اپنے کمرے میں جا کر آئینے میں دیکھا مگر دیر تک ان کو دیکھتے رہنے سے بھی وہ خواہش نہ دہی جو ایک ایسی اس کے دل میں پیدا ہو گئی تھی۔

قاسم منطقی قسم کا آدمی تھا وہ بات کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کا عادی تھا آئینہ میز پر رکھ کر وہ آرام کرسی پر بیٹھ گیا اور ٹھنڈے دماغ سے سوچنے لگا۔

”مان لیا کہ میرا کسی کو الو کا پٹھا کہنے کو جی چاہتا ہے۔۔۔۔۔ مگر یہ کوئی بات تو نہ ہوتی۔۔۔ میں کسی کو الو کا پٹھا کیوں کہوں۔۔۔۔۔؟ میں کسی سے ناراض بھی تو نہیں ہوں۔۔۔۔۔“

یہ سوچتے سوچتے اس کی نظر سامنے دروازے کے نیچے میں رکھے ہوئے حقے پر پڑی۔ ایک دم اس کے دل میں یہ باتیں پیدا ہوئیں، عجیب و اہیات نوکر ہیں دروازے کے عین نیچے میں یہ حقہ لگا دیا ہے میں ابھی اس دروازے سے اندر آیا ہوں، اگر ٹھوکر سے بھری ہوئی چلم گر پڑتی تو پا انداز جو کہ موج کا بنا ہوا ہے جانا شروع ہو جاتا اور ساتھ ہی قالین بھی۔۔۔۔۔

اس کے جی میں آئی کہ غلام محمد کو آواز دے جب وہ بھاگا ہوا اس کے سامنے آ جائے تو وہ بھرے ہوئے حقے کی طرف اشارہ کر کے اس سے صرف اتنا کہے ”تم نرے الو کے پٹھے ہو“ مگر اس نے تامل کیا اور سوچا ”یوں بگڑنا اچھا معلوم نہیں ہوتا اگر غلام محمد کو اب بلا کر الو کا پٹھا کہہ بھی دیا تو وہ بات پیدا نہ ہوگی اور پھر۔۔۔۔۔ اور پھر اس بے چارے کا کوئی قصور بھی تو نہیں ہے میں دروازے کے پاس بیٹھ کر ہی تو ہر روز حقہ پیتا ہوں۔“

چنانچہ وہ خوشی جو ایک لمحے کے لیے قاسم کے دل میں پیدا ہوئی تھی کہ اس نے الو کا پٹھا کہنے کے لیے ایک اچھا موقع تلاش کر لیا غائب ہو گئی۔
ہفتہ کے وقت میں ابھی کافی دیر تھی پورے دو گھنٹے پڑے تھے، دروازہ کے پاس کرسی رکھ کر قاسم اپنے معمول کے مطابق بیٹھ گیا اور حقہ نوشی میں مصروف ہو گیا۔

کچھ دیر تک وہ سوچ بچار کیے بغیر حقے کا دھواں پیتا رہا اور دھواں کے انتشار کو دیکھتا رہا۔ لیکن جو نبی وہ حقے کو چھوڑ کر کپڑے تبدیل کرنے کے لیے ساتھ والے کمرے میں گیا تو اس کے دل میں وہی خواہش نئی تازگی کے ساتھ پیدا ہوئی۔
قاسم گھبرا گیا۔ بھئی حد ہو گئی ہے۔۔۔۔۔ الو کا پٹھا۔۔۔۔۔ میں کسی کو الو کا پٹھا کیوں کہوں اور بفرض محال میں نے کسی کو الو کا پٹھا کہہ بھی دیا تو کیا ہو گا۔۔۔۔۔

قاسم دل ہی دل میں ہنسا وہ صحیح الدماغ آدمی تھا اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ خواہش جو اس کے دل میں پیدا ہوئی ہے بالکل بیہودہ اور بے سرو پا ہے لیکن اس

کا کیا علاج تھا کہ دبانے پر وہ اور بھی زیادہ ابھر آتی تھی۔

قاسم اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ بغیر کسی وجہ کے الوکا پٹھانہ کہے گا خواہ یہ خواہش صدیوں تک اس کے دل میں تلملاتی رہے شاید اسی احساس کے باعث یہ خواہش جو ہتھکی ہوئی چمکاؤ کی طرح اس کے روشن دل میں چلی آئی تھی اس قدر زور پ رہی تھی۔

پتلون کے ہٹن بند کرتے وقت جب اس نے دماغی پریشانی کے باعث اوپر کا ہٹن نچلے کاج میں داخل کر دیا تو وہ جھلا اٹھا ”بھئی کون ہوگا۔۔۔۔۔۔ یہ کیا بیہودگی ہے۔۔۔ دیوانہ پن نہیں تو اور کیا ہے۔۔۔۔۔۔ الوکا پٹھا کہو۔۔۔۔۔۔ الوکا پٹھا کہو اور یہ پتلون کے سارے ہٹن مجھے پھر سے بند کرنے پڑیں گے“ لباس پہن کر وہ میز پر آ بیٹھا اس کی بیوی نے چائے بنا کر پیانی اس کے سامنے رکھ دی اور تو اس پر مکھن لگانا شروع کر دیا روزانہ معمول کی طرح ہر چیز ٹھیک ٹھاک تھی تو اس اتنے اچھے سنکے ہوئے تھے کہ مکسٹ کی طرح کرکرتے اور ڈبل روٹی بھی اعلیٰ قسم کی تھی خمیر میں سے خوشبو آ رہی تھی مکھن بھی صاف تھا چائے کی کیتلی بے داغ تھی اس کی مونٹھ کے ایک کونے پر قاسم ہر روز میل ویکھا کرتا تھا مگر آج وہ دھبہ بھی نہیں تھا۔

اس نے چائے کا ایک گھونٹ پیا اس کی طبیعت خوش ہو گئی، خالص دارجلنگ کی چائے تھی جس کی مہک پانی میں بھی برقرار تھی دو دھک کی مقدار بھی صحیح تھی۔ قاسم نے خوش ہو کر اپنی بیوی سے کہا ”آج چائے کا رنگ بہت ہی پیارا ہے اور بڑے سلیقے سے بنائی گئی ہے۔“

بیوی تعریف سن کر خوش ہوئی مگر اس نے منہ بنا کر ایک ادا سے کہا ”جی ہاں۔۔۔ بس آج اتفاق سے اچھی بن گئی ہے ورنہ ہر روز تو آپ کو نیم گھول کے پلائی جاتی ہے۔۔۔۔۔ مجھے سلیقہ کہاں آتا ہے۔۔۔۔۔ سلیقے والیاں تو وہ موٹی ہوئل کی چھو کریاں ہیں جن کے آپ ہر وقت گن گایا کرتے ہیں“

یہ تقریر سن کر قاسم کی طبیعت مکدر ہو گئی ایک لمحہ کے لیے اس کے جی میں آنی کہ چائے کی پیالی میز پر الٹ دے اور وہ نیم جو اس نے اپنے بچے کی پھنسیاں دھونے کے لیے غلام محمد سے منگوائی تھی اور سامنے بڑے طاقتے میں پڑی تھی گھول کر پی لے مگر اس نے مردباری سے کام لیا ”یہ عورت میری بیوی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی بات بہت ہی بھونڈی ہے مگر ہندوستان میں سب لڑکیاں بیوی بن کر ایسی بھونڈی باتیں ہی کرتی ہیں اور بیوی بننے سے پہلے اپنے گھروں میں وہ اپنی ماؤں سے کیسی باتیں سنتی ہیں؟ بالکل ایسی ادنیٰ قسم کی باتیں اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ عورتوں کو عمومی زندگی میں اپنی حیثیت کی خبر ہی نہیں۔۔۔۔۔ میری بیوی تو پھر بھی غیبت ہے یعنی صرف ایک ادا کے طور پر ایسی بھونڈی بات کہہ دیتی ہے، اس کی نیت نیک ہوتی ہے بعض عورتوں کا تو یہ شعار ہوتا ہے کہ ہر وقت کہو اس کرتی رتی ہیں“

یہ سوچ کر قاسم نے اپنی نگاہیں اس طاقتے سے ہٹالیں۔ جس میں نیم کے پتے دھوپ میں سوکھ رہے تھے اور بات کا رخ بدل کر اس نے مسکراتے ہوئے کہا ”دیکھو، آج نیم کے پانی سے بچے کی ٹانگیں ضرور دھو دینا نیم زخموں کے لیے بڑی اچھی ہوتی ہے۔۔۔۔۔“ اور دیکھو، تم موسمیوں کا رس ضرور پیا کرو۔۔۔۔۔ میں فطر

سے لوٹتے ہوئے ایک درجن اور لے آؤں گا یہ رس تمہاری صحت کے لیے بہت ضروری ہے۔

بیوی مسکرا دی ”آپ کو تو بس ہر وقت میری ہی صحت کا خیال رہتا ہے۔۔۔۔۔ اچھی بھلی تو ہوں، کھاتی ہوں، چیتی ہوں، دوڑتی ہوں، بھاگتی ہوں۔۔۔۔۔ میں نے جو آپ کے لیے بادام منگوا کے رکھے ہیں۔۔۔۔۔ بھیجی آج دس بیس آپ کی جیب میں ڈالے بغیر نہ رہوں گی۔۔۔۔۔ لیکن دفتر میں کہیں بانٹ نہ دیجئے گا۔“

قاسم خوش ہو گیا کہ چلو مومسیوں کے رس اور باداموں نے اس کی بیوی کے مصنوعی فٹے کو دور کر دیا اور یہ مرحلہ آسانی سے طے ہو گیا دراصل قاسم ایسے مرحلوں کو آسانی کے ساتھ ان طریقوں ہی سے طے کیا کرتا تھا جو اس نے پڑوس کے پرانے شوہروں سے سیکھے تھے اور اپنے گھر کے ماحول کے مطابق ان میں تھوڑا بہت رد و بدل کر لیا تھا۔

چائے سے فارغ ہو کر اس نے جب سگریٹ نکال کر ساگایا اور اٹھ کر دفتر جانے کی تیاری کرنے ہی والا تھا کہ پھر وہی خوانہ نش نمودار ہو گئی اس مرتبہ اس نے سوچا، اگر میں کسی کو الو کا پٹھا کہہ دوں تو کیا ہرج ہے۔۔۔۔۔ زیر لب بالکل ہولے سے کہہ دوں، الو۔۔۔۔۔ کا۔۔۔۔۔ پٹھا تو میرا خیال ہے کہ مجھے دلی تسکین ہو جائے گی یہ خوانہ نش میرے سینے میں بوجھ بن کر بیٹھ گئی ہے کیوں نہ اس کو پاکا کر دوں۔۔۔۔۔ دفتر میں۔۔۔۔۔

اس کو صحن میں بچے کا کموڈ پڑا نظر آیا یوں صحن میں کموڈ رکھنا سخت بد تمیزی تھی اور

خصوصاً اس وقت جب کہ وہ ناشتہ کر چکا تھا اور خوشبودار کرکری توس اور تلے ہوئے انڈوں کا ذائقہ ابھی تک اس کے منہ میں تھا۔۔۔۔۔ اس نے زور سے آواز دی ”غلام محمد“

قاسم کی بیوی جو ابھی تک ناشتہ کر رہی تھی بولی ”غلام محمد باہر گوشت لینے گیا ہے۔۔۔۔۔ کوئی کام تھا آپ کو اس سے؟“

ایک سیکنڈ کے اندر اندر قاسم کے دماغ میں بہت سی باتیں آئیں ”کہہ دوں، یہ غلام محمد الو کا چٹھا ہے۔۔۔۔۔ اور یہ کہہ کر جلدی سے باہر نکل جاؤں۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ وہ خود تو موجود ہی نہیں پھر۔۔۔۔۔ بالکل بیکار ہے۔۔۔۔۔ لیکن سوال یہ ہے کہ بے چارے غلام محمد ہی کو کیوں نشہ بنایا جائے اس کو تو میں ہر وقت الو کا چٹھا کہہ سکتا ہوں۔۔۔۔۔“

قاسم نے ادھ جلا سگریٹ گرا دیا اور بیوی سے کہا ”کچھ نہیں میں اس سے یہ کہنا چاہتا تھا کہ دفتر میں میرا کھانا بے شک ڈیڑھ بجے لے آیا کرے۔۔۔۔۔ تمہیں کھانا جلدی بھیجنے میں بہت تکلیف کرنا پڑتی ہے، یہ کہتے ہوئے اس نے بیوی کی طرف دیکھا۔ جو فرش پر اس کے گرائے ہوئے سگریٹ کو دیکھ رہی تھی قاسم کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ یہ سگریٹ اگر بجھ گیا اور یہاں پڑا رہا تو اس کا بچہ ریٹنا ریٹنا آئے گا اور اسے ٹھا کر منہ میں ڈال لے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے پیٹ میں گڑبڑ مچ جائے گی۔ قاسم نے سگریٹ کا ٹکڑا اٹھا کر غسل خانے کی موری میں پھینک دیا“ یہ بھی اچھا ہوا کہ میں نے جذبات سے مغلوب ہو کر غلام محمد کو الو کا چٹھا نہیں کہہ دیا۔۔۔۔۔ اس سے اگر ایک غلطی ہوئی ہے تو ابھی

ابھی مجھ سے بھی ہونی تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ میری غلطی زیادہ شدید تھی۔۔۔۔۔
 قاسم بڑا صحیح الدماغ آدمی تھا اسے اس بات کا احساس تھا کہ وہ صحیح خطوط پر غور
 و فکر کرنے والا انسان ہے مگر اس احساس نے اس کے اندر برتری کا خیال کبھی پیدا
 نہیں کیا تھا۔ یہاں پر پھر اس کی صحیح الدماغی کو دخل تھا کہ وہ احساس برتری کو اپنے
 اندر دبا دیا کرتا تھا۔

موری میں سگریٹ کا ٹکڑا پھینکنے کے بعد اس نے بلا ضرورت صحن میں ٹہلنا
 شروع کر دیا وہ دراصل کچھ دیر کے لیے بالکل خالی الذہن ہو گیا تھا۔
 اس کی بیوی ناشتے کا آخری توس کھا چکی تھی قاسم کو یوں ٹپلتے دیکھ کر وہ اس
 کے پاس آئی اور کہنے لگی ”کیا سوچ رہے ہیں آپ؟“
 قاسم چونک پڑا ”کچھ نہیں۔۔۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔۔۔ دفتر کا وقت ہو
 گیا کیا؟“ یہ لفظ اس کی زبان سے نکلے اور دماغ میں وہی الوکا پٹھا کہنے کی خواہش
 مڑپنے لگی۔

اس کے جی میں آئی کہ بیوی سے صاف صاف کہہ دے کہ یہ عجیب و غریب
 خواہش اس کے دل میں پیدا ہو گئی ہے جس کا سر ہے نہ پیر، بیوی ضرور ہنسے گی اور
 یہ بھی ظاہر ہے کہ اس کو بیوی کا ساتھ دینا پڑے گا، چنانچہ یوں ہنسی ہنسی میں الوکا پٹھا
 کہنے کی خواہش اس کے دماغ سے نکل جائے گی۔ مگر اس نے غور کیا اس میں کوئی
 شک نہیں کہ بیوی ہنسے گی اور میں خود بھی ہنسون گا لیکن ایسا نہ ہو کہ یہ بات مستقل
 مذاق بن جائے۔۔۔۔۔ ایسا ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے کیا ضرور ہو جائے گا۔
 اور بہت ممکن ہے کہ انجام کار نا خوشگوار پیدا ہو، چنانچہ اس نے اپنی بیوی سے کچھ

نہ کہا اور ایک لمحہ تک اس کی طرف یونہی دیکھتا رہا۔

بیوی نے بچے کا کموڈ اٹھا کر کونے میں رکھ دیا اور کہا ”آج صبح آپ کے برخوردار نے وہ ستایا ہے کہ اللہ کی پناہ۔۔۔۔۔ بڑی مشکلوں کے بعد میں نے اسے کموڈ پر بٹھایا اس کی مرضی یہ تھی کہ بستر ہی کو خراب کرے۔۔۔۔۔ آخر لڑکا کس کا ہے۔۔۔۔۔؟“

قاسم کو اس قسم کی چیخ پسند تھی ایسی باتوں میں وہ تیکھے مزاج کی جھلک دیکھتا تھا۔ مسکرا کر اس نے بیوی سے کہا ”لڑکا میرا ہی ہے مگر۔۔۔۔۔ میں نے تو آج تک کبھی بستر خراب نہیں کیا یہ عادت اس کی اپنی ہوگی۔“

بیوی نے اس ک بات کا مطلب نہ سمجھا قاسم کو مطلقاً افسوس نہ ہوا، اس لیے کہ ایسی باتیں وہ صرف اپنے منہ کا ذائقہ درست کرنے کے لیے کیا کرتا تھا۔ وہ اور بھی خوش ہوا جب اس کی بیوی نے جواب نہ دیا اور خاموش ہو گئی۔

”اچھا بھئی میں اب چلتا ہوں خدا حافظ!“

یہ لفظ جو ہر روز اس کے منہ سے نکلتے تھے آج بھی اپنی پرانی آسانی کے ساتھ نکلے اور قاسم دروازہ کھول کر باہر چل دیا۔

کشمیری گیٹ سے نکل کر جب وہ نکلسن پارک کے پاس سے گزر رہا تھا تو اسے ایک ڈائری والی آدمی نظر آیا۔ ایک ہاتھ میں کھلی ہوئی شلوار تھا مے وہ دوسرے ہاتھ سے استنجا کر رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر قاسم کے دل میں پھر الو کا پٹھا کہنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ ”لو بھئی، یہ آدمی ہے جس کو الو کا پٹھا کہہ دینا چاہیے۔۔۔۔۔ یعنی جو صحیح معنوں میں الو کا پٹھا ہے۔۔۔۔۔ ذرا انداز ملاحظہ

کرو۔۔۔ کس انتہاک سے ڈرائی کلین کیے جا رہا ہے۔۔۔۔۔ جیسے کوئی بہت اہم کام سرانجام پا رہا ہے۔۔۔۔۔ لعنت ہے۔“

لیکن قاسم صحیح الدماغ آدمی تھا اس نے تعیل سے کام نہ لیا اور جھوڑی دیہ غور کیا ”میں اس فٹ پاتھ پر جا رہا ہوں اور وہ دوسرے فٹ پاتھ پر، اگر میں نے بلند آواز میں بھی اس کو الو کا چٹا کہا تو وہ چونکے گا نہیں۔ اس لیے کہ کم بخت اپنے کام میں بہت بری طرح مصروف ہے چاہیے تو یہ کہ اس کے کان کے پاس زور سے نعرہ بلند کیا جائے اور جب وہ چونک اٹھے تو اسے بڑے شریفانہ طور پر سمجھایا جائے، قبلہ آپ الو کے پٹھے ہیں۔۔۔۔۔ لیکن اس طرح بھی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوگا۔“

چنانچہ قاسم نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

اسی اثناء میں اس کے پیچھے سے ایک سائیکل نمودار ہوئی۔ کالج کی ایک لڑکی اس پر سوار تھی اس لیے کہ پیچھے بستہ بندھا تھا۔ آنا فانا اس لڑکی کی ساڑھی فری و ہیل کے دانتوں میں پھنسی، لڑکی نے گھبرا کر اگلے پیسے کا بریک دبایا۔ ایک دم سائیکل بے قابو ہوئی۔ اور ایک جھٹکے کے ساتھ لڑکی سائیکل سمیت سڑک پر گر پڑی۔

قاسم نے آگے بڑھ کر لڑکی کو اٹھانے میں غلت سے کام نہ لیا اس لیے کہ اس نے اس حادثہ کے رد عمل پر غور کرنا شروع کر دیا تھا مگر جب اس نے دیکھا کہ لڑکی کی ساڑھی فری و ہیل کے دانتوں نے چبا ڈالی ہے اور اس کا بورڈ بہت بری طرح ان میں الجھ گیا ہے تو وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ لڑکی کی طرف دیکھے بغیر اس نے سائیکل کا پیچھا پیہہ ڈرا اور نچا اٹھایا تا کہ اسے گھما کر ساڑھی کو فری و ہیل کے دانتوں میں سے نکال لے اتفاق ایسا ہوا کہ پیہہ گھمانے سے ساڑھی کچھ اس طرح تاروں

کی لپیٹ میں آئی کہ ادھر بیٹھ کوٹ کی گردنت سے باہر نکل آئی قاسم بوکھلا گیا اس کی اس بوکھلاہٹ نے لڑکی کو بہت زیادہ پریشان کر دیا زور سے اس نے ساڑھی کو اپنی طرف کھینچا فری وہیل کے دانتوں میں ایک ٹکڑا اڑا رہ گیا اور ساڑھی باہر نکل آئی۔ لڑکی کا رنگ الال ہو گیا تھا قاسم کی طرف اس نے غضبناک نگاہوں سے دیکھا اور بچھے ہوئے لہجہ میں کہا ”الو کا پٹھا“

ممکن ہے کچھ دیر لگی ہو مگر قاسم نے ایسا محسوس کیا کہ لڑکی نے جھپٹ پٹ نہ جانے اپنی ساڑھی کو کیا کیا اور ایک دم سائیکل پر سوار ہو کر یہ جاوہ جا ”نظروں سے غائب ہو گئی۔“

قاسم کو لڑکی کی گالی سن کر بہت دکھ ہوا خاص کر اس لیے کہ وہ یہی گالی خود کسی کو دینا چاہتا تھا مگر وہ بہت صحیح الدماغ آدمی تھا ٹھنڈے دل سے اس نے اس حادثہ پر غور کیا اور اس لڑکی کو معاف کر دیا۔ ”اس کو معاف ہی کرنا پڑے گا۔ اس لیے کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں۔ عورتوں کو سمجھنا بہت مشکل کام ہے اور ان عورتوں کو سمجھنا تو اور بھی مشکل ہو جاتا ہے جو سائیکل پر سے گری ہوئی ہوں، لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اس نے اپنی لمبی جراب میں اوپر ران کے پاس تین چار کانڈ کیوں اڑس رکھے تھے؟“

☆☆☆☆☆☆

انتظار

(گھڑی آٹھ بجاتی ہے)

منتظر: آدھا گھنٹہ۔۔۔۔۔ صرف آدھا گھنٹہ اور پھر اس کے بعد۔۔۔۔۔ عین کی
آخری ڈوبتی ہوئی گونج کتنی پیاری تھی اور۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔
منتظر کا منطقی وجود: اگر وہ نہ آئی۔۔۔۔۔ یعنی اگر۔۔۔۔۔
منتظر: کیوں نہ آئے گی۔۔۔۔۔ ضرور آئے گی (پھپکی ہنسی)۔۔۔۔۔ یہ
اندیشے بالکل فضول ہیں (اپنے آپ کو تسلی دینے کے انداز میں) اس نے مجھ سے
وعدہ کیا ہے۔

منطقی وجود: وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا

منتظر: کتنا اغوی خیال ہے۔۔۔۔۔ کسی کے شعر کا ایک مصرعہ ہے شاید، لیکن کس
قدر عامیانا ہے۔۔۔۔۔ ایسی شاعری ہی نے تو۔۔۔۔۔ وہ ضرور آئے گی اور
شاعری۔۔۔۔۔ شاعری اچھی چیز ہے۔۔۔۔۔ تپائی پر جو یہ گلدان پڑا ہے میں نے
اس میں ابھی تک پھول کیوں نہ سجائے (پھولدان اٹھاتا ہے)۔۔۔۔۔ یہ
پھولدان اسے پسند ہے۔ آج وہ اسے اور بھی پسند کرے گی زنگس اور ہنفسہ کے
پھول اسے بہت بھاتے ہیں۔۔۔۔۔ یہاں پر یہ ٹھیک رہے گا۔۔۔۔۔ کیوں
(پھولدان پھر وہیں رکھ دیتا ہے سیٹی بجاتا ہے)

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

(وقفہ)

منتظر: (ایک ایک لفظ کر کے) وہ

-----ائیں-----گھر-----میں-----

ہمارے-----خدا-----کی-----قدرت-----ہے-----خدا کی قدرت

ہے (چونک کر) خدا کی قدرت خدا کی قدرت یعنی اس کا آنا بالکل اچانک تھا

شاعر کو اس کی آمد کا یقین نہیں تھا۔۔۔۔۔بھئی ہو گا مگر ہمیں تو پورا یقین ہے کیوں؟

منطقی وجود: اگر-----اگر-----

منتظر: ہٹاؤ جی اس خیال کو-----ہاں-----تو میں کیا سوچ رہا

تھا۔۔۔۔۔سوچ کیا رہا تھا؟ سوچنے کی بات ہی کیا ہے؟ وہ ضرور آئے

گی۔۔۔۔۔چند منٹوں کی بات ہے۔

منطقی وجود: ایک گھنٹے میں ساٹھ منٹ ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ساٹھ

منتظر: ستائیس منٹ اور رہ گئے ہیں۔۔۔۔۔صرف ستائیس۔۔۔۔۔(گھڑی کی

ٹک ٹک بلند ہو کر پھر اپنی اصلی حالت پر آ جاتی ہے) ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی

ہے پھولدان بھی جگ گیا سگریٹ ساگالیتا ہوں ایک سگریٹ کم از کم دس منٹ جلتا

رہے گا۔

منطقی وجود: ساڑھے سات منٹ

منتظر: تو کیا ہوا۔۔۔۔۔(سگریٹ ساگالتا ہے)

منطقی وجود: کش زور سے کیوں لے رہے ہو

منتظر: ساتھ ساتھ ہٹاتا بھی رہوں تو ٹھیک رہے گا (ہٹاتا ہے) ہاں۔۔۔۔۔تو یہ

بات ہے۔

منطقی وجود: کیا بات ہے تم کھوئے کھوئے سے کیوں ہو؟

منتظر: کوئی بات نہیں، بات کیا ہوگی ایک صرف اتنا ڈر ہے کہ۔۔۔۔۔

منطقی وجود: موسم خراب ہے

(کڑک سی بلند ہوتی ہے)

منتظر: (گھبرا کر) یہ بکلی کی کڑک تو نہیں ہے؟

منطقی وجود: سگریٹوں کا ڈبہ جو آپ نے ابھی ابھی کھولا تھا اس کا ڈھکنا آپ کے پیچ کے نیچے آگیا ہے۔

منتظر: (ہنستا ہے) آواز بالکل بکلی کی سی پیدا ہوئی۔۔۔۔۔ کیا ڈھکنا ہی تھا؟۔۔۔ ڈھکنا ہی تھا۔۔۔۔۔ (کھڑکی کھولتا ہے) موسم زیادہ خراب تو نہیں ہے بادل؟ وہ اب تو گھر سے چل پڑی ہوگی یہ سگریٹ ختم ہونے ہی میں نہیں آتا۔ انگلیوں میں مسلا گیا ہے۔

منطقی وجود: دوسرا ساگلا اور یوں تھوڑا سا وقت بھی خرچ ہو جائے گا

منتظر: نہیں۔۔۔ زیادہ سگریٹ میں نہیں پیوں گا، منہ سے بو آئے گی۔ بہت

ممکن ہے اسے ناگوار معلوم ہو۔۔۔۔۔ اس نے ایک بار کہا بھی تو تھا۔۔۔۔۔

وہ: (یعنی جس کا انتظار کیا جا رہا ہے، اس کی آواز آتی ہے) تمہیں میری ہی

جان کی قسم جواب سے سگریٹ پیو۔۔۔۔۔

منتظر: مجھے عدول حکمی نہیں کرنی چاہیے (وقفہ)

منطقی وجود: سگریٹ بجھا دیا اب یہ وقت کیسے کسے گا

منتظر: یہ گراموفون باجا۔۔۔۔۔ ریکارڈ نکال کر باہر رکھ دوں، بہت ممکن ہے وہ بھانا چاہے۔

منطقی وجود: ایک ریکارڈ پورے تین منٹ تک بجاتا رہے گا
منتظر: تین منٹ۔۔۔۔۔ (ریکارڈ لگاتا ہے)۔۔۔۔۔ تین منٹ تک
بجاتا رہے گا۔ کیا برا ہے۔۔۔ موسیقی مجھے پسند ہے
(ریکارڈ بھانا ہے)
رات کئی گن گن کے تارے
(ریکارڈ پر سے ایک دم سونے ہٹا لیتا ہے)

منتظر: کیا وہاں ریکارڈ ہے رات کئی گن گن کے تارے۔۔۔۔۔
منطقی وجود: ابھی تو آٹھ بج کر کچھ منٹ ہوئے ہیں ساری رات پڑی ہے۔
منتظر: ابھی آٹھ بج کر کچھ منٹ ہی ہوئے ہیں۔۔۔۔۔ تو اس کا کیا مطلب
ہے۔۔۔۔۔ میں اتنا بے تاب کیوں ہو رہا ہوں۔۔۔۔۔ آجائے
گی۔۔۔۔۔ ایسی باتوں ہی سے تو ان لوگوں کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچ جاتا
ہے۔۔۔۔۔ میں اس کا انتظار بالکل نہیں کروں گا۔۔۔۔۔ کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں میز پر
یہ سفید کاغذ رکھا ہی ہے۔ اس پر اس مینے کا حساب لکھنا شروع کر دیتا
ہوں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ سگریٹ، پانچ روپے۔۔۔۔۔ سگریٹ پانچ روپے۔۔۔۔۔ (یہ
آواز فید ہوتی جاتی ہے اور جس کا انتظار کیا جا رہا ہے اس کی آواز ابھرتی آتی ہے)
وہ: تمہیں میری جان کی قسم جواب سے سگریٹ پیو۔۔۔۔۔ دیکھو تو کتنے کمزور ہو
رہے ہو۔۔۔۔۔ با دام کھایا کرو

منتظر: اسے میرا کتنا خیال ہے۔۔۔ ابھی آ بھی جائے۔ مگر۔۔۔۔۔
منطقی و جوہ: ساڑھے آٹھ بجنے میں ابھی کافی دیر ہے۔
منتظر: میں سمجھتا ہوں یہ گھڑی فاسٹ ہے۔۔۔ کیا پتہ ہے کہ۔۔۔۔۔
منطقی و جوہ: گھڑی سلو ہو
منتظر: اچی نہیں، اس گھڑی کا وقت بالکل صحیح ہے۔۔۔۔۔ ابھی پرسوں ہی
تو ٹھیک کرائی ہے۔۔۔ (وقفہ)۔۔۔ کہیں اس کی گھڑی میں فرق نہ ہو۔
منطقی: ایسا ہو سکتا ہے
منتظر: تو یہ کوئی بڑی بات نہیں۔۔۔ پانچ نہیں دس منٹ کا فرق ہوگا
منطقی: اس وقت سے لے کر اب تک دس منٹ مشکل سے گزرے
ہیں۔۔۔۔۔ نہیں ابھی دس منٹ نہیں گزرے۔
منتظر: تو یہ کوئی بڑی بات نہیں۔۔۔۔۔ پانچ نہیں دس منٹ کا فرق ہو
گا۔
منطقی: اس وقت سے لے کر اب تک دس منٹ مشکل سے گزرے
ہیں۔۔۔۔۔ نہیں ابھی دس منٹ نہیں گزرے۔
منتظر: گھڑی میں ضرور خرابی ہے۔۔۔۔۔ کھول کر نہ دیکھ لوں
منطقی و جوہ: کھول کر آپ کو کیا نظر آ جائے گا
منتظر: کچھ نہیں میں نے تو یہ کہا تھا کہ چلو یوں تھوڑا سا وقت گزر جائے گا
منطقی و جوہ: تو چلیے پرزے کھول کر بیٹھ جائیے مگر یاد رہے اس دن کی طرح پھر
جڑیں گے نہیں۔

منتظر: (ہنستا ہے) کیسے کیسے عجیب خیال آتے ہیں (ہنستا ہے پھر گاتا ہے)
 کیسے کیسے عجیب خیال آتے ہیں۔۔۔۔۔ نہیں وزن ٹھیک نہیں ہے۔۔۔۔۔
 منطقی: جو: یہ آپ کو شاعری کیا سوچھی
 منتظر: (خوب ہنستا ہے) یہ شاعری بھی اچھی رہی۔۔۔۔۔ اب آ بھی
 جائے۔۔۔۔۔ وقت کیا ہوا ہے۔۔۔۔۔ ساڑھے۔۔۔۔۔
 منطقی: ابھی ساڑھے کہاں۔۔۔۔۔ سوا کہیے سوا
 منتظر: مجھے کوئی کام بھی نہیں ہے آج
 منطقی: اس مہینے کا حساب لکھنا تھا
 منتظر: اجی اعنت بھیجو حساب کتاب پر یہ بھی کوئی وقت ہے حساب کتاب
 کا۔۔۔۔۔ لیکن ایسے وقت میں کرنا کیا چاہیے۔
 منطقی: اس کو ایک خط لکھنا شروع کرو
 منتظر: بالکل ٹھیک۔۔۔۔۔ (وقفہ)۔۔۔۔۔ اس پیڈ کا کاغذ اچھا ہے گا
 منطقی: ہاں۔۔۔۔۔ خوشبودار ہے
 منتظر: کیا لکھوں۔۔۔۔۔ (وقفہ)۔۔۔۔۔ مضمون سمجھ میں نہیں آتا۔
 منطقی: لکھو۔۔۔۔۔ میں تمہارا بہت انتظار کرتا رہا
 منتظر: اور جب وہ آئے تو یہ خط اس کو دے دیں۔۔۔۔۔ خیال اچھا ہے۔۔۔۔۔ تو
 لکھتا ہوں۔۔۔۔۔ (وقفہ)۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ اب وہ گھر سے چل پڑی ہو
 گی۔۔۔۔۔ یہ خط اس کے آنے تک ختم نہ ہوگا۔
 منطقی: تم خط لکھنا شروع تو کرو

منتظر: میری پیاری۔۔۔ تم نے آج وعدہ کیا تھا کہ ساڑھے آٹھ بجے آؤ گی
 میں تمہارا شدت سے انتظار کرتا رہا۔۔۔۔۔
 منطقی: کتنی پچھپچھی عبارت ہے
 منتظر: پچھپچھی۔۔۔۔۔ نہیں تو۔۔۔۔۔ (وقفہ)۔۔۔۔۔ واقعی پچھپچھی
 ہے۔۔۔۔۔ اب تو وہ آتی ہی ہو گی (کاغذ پھاڑ دیتا ہے) خط کی کوئی ضرورت نہیں
 میں اس کو زبانی بتا دوں گا۔
 منطقی: بشرطیکہ وہ آجائے
 منتظر: یہ شرط کبھی۔۔۔۔۔ وہ ضرور آئے گی
 منطقی: وجود اگر۔۔۔۔۔ اگر۔۔۔۔۔
 منتظر: نہیں۔۔۔۔۔ نہیں
 منطقی: ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے
 منتظر: کیسے یہ وہ خیال ہیں
 منطقی: اگر وہ نہ آئی تو
 منتظر: ضرور آئے گی
 منطقی: دیکھ لیں گے

(دستک کی آواز)

منتظر: (خوش ہو کر) لو وہ آگئی (گھبرا کر) سب چیزیں ٹھیک ہیں
 ؟۔۔۔۔۔ سگریٹوں کا ڈبہ؟۔۔۔۔۔ اسے کہاں رکھوں؟۔۔۔۔۔ کون
 ہے؟۔۔۔۔۔ اس کا ڈھکانا کہاں ہے؟۔۔۔۔۔ لعنت!۔۔۔۔۔ خالی ہی کہیں چھپا دیتا

ہوں۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ اور یہ۔۔۔۔۔ آیا۔۔۔۔۔ بس اب سب ٹھیک ٹھاک
ہے۔

منطقی: اپنا دم تو درست کرلو۔۔۔۔۔ ہانپ رہے ہو
منتظر: دم و دم سب ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے اس کو تھوڑا سا ڈرانا
چاہیے۔

(دروازہ کھولتا ہے اور پھر ایک دم ڈرانے کی خاطر ”ہپ“ کرتا ہے)
اخبار والا: (ڈرے ہوئے انداز میں) اجی صاحب۔۔۔۔۔ آپ نے تو
مجھے ڈرا ہی دیا۔۔۔۔۔ فاف
منتظر: تم۔۔۔۔۔ ت۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ تم کون ہو۔۔۔۔۔ تم اخبار والے
کیوں ہو؟۔۔۔۔۔ بھاگ جاؤ یہاں سے۔

اخبار والا: حضور یہ پوچھنے آیا تھا کہ دونوں اخبارا^{شیشیمین} اور ہندوستان^{شیشیمین} شیمز
لایا کروں یا اکیلا^{شیشیمین}۔۔۔۔۔ جیسا آپ حکم دیں۔
منتظر: جتنے بھی ہوں لے آیا کرو
اخبار والا: بہت اچھا سرکار

(اخبار والا جاتا ہے دروازہ بند کر دیا جاتا ہے)
منتظر: اس اخبار والے کو بھی اسی وقت آنا تھا۔۔۔۔۔ کمبخت ڈر گیا تھا (بستا ہے)
(ہولے ہولے دستک دینے کی آواز)
منتظر: (ہنسی روک کر) آگئی۔۔۔۔۔ آگئی۔۔۔۔۔
(دروازہ کھولتا ہے اور پھر ایک دم ”ہپ“ کرتا ہے)

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ہوں (گھڑی بڑے بڑے وقفوں کے بعد تک کرتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ
 سیکنڈ لمبے ہو گئے ہیں) مجھے کچھ ہو گیا ہے
 منطقی وجود پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا
 منتظر پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا (میز پر انگلیوں سے دھول بجاتا ہے) یہ
 میں کیا کر رہا ہوں (گھڑی کی بھیا تک آواز)
 (اٹھ کر اضطراب کے ساتھ بلانا شروع کر دیتا ہے)
 منطقی وجود: پیچ لڑکھڑا رہے ہیں
 منتظر: تو اچھا بھلا بیٹھا تو تھا۔۔۔۔۔ اٹھ کر چلنے کیوں لگا۔۔۔۔۔ حلق سوکھ
 رہا ہے لیکن اب تو اس کے آنے میں کوئی دیر نہیں چند منٹوں کی۔۔۔۔۔
 منطقی وجود: چند منٹوں کی جن میں۔۔۔۔۔ (گھڑی لمبے لمبے سانس لیتی
 ہے)

(کانڈ کھڑکھڑاتا ہے)
 منتظر: آج ہوا کتنی تیز ہے۔۔۔۔۔ کیانڈر کا کانڈ کھڑکھڑا رہا ہے
 (برتن گرنے کی آواز)
 منتظر: اس میری ہمسائی کے گھر میں ہر وقت برتن ہی گرتے رہتے ہیں
 منطقی: آج تمہارے کان بڑے تیز ہیں
 فریب آرزو کی سہل انگاری نہیں جاتی
 ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تری آواز پا سمجھے
 منتظر: ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تری آواز پا سمجھے۔۔۔۔۔ آواز پا۔۔۔۔۔ دل

(دروازے پر دستک)

منطقی: دروازہ آپ کے سامنے ہے

(دروازہ کھولنے کی آواز)

دوست: اسلام علیکم

السلام۔۔۔۔۔ک۔۔۔۔۔کیسے تشریف لائے

دوست: میں تم کو اس گھوڑی کی بابت کچھ بتانے آیا تھا

منتظر: کھو۔۔۔ کھو۔۔۔ کھوڑی

دوست: ہاں وہی جس کی بابت کالے خاں کہتا تھا کہ بڑی دولتیاں جھاڑتی ہے۔
بھی تھی بڑی منہ زور۔۔۔۔۔ پڑی نہیں جننے دیتی تھی۔ گدھریاں کرتی تھی
گدھر یاں۔

فاتنہ نظر : بگ۔۔ دھڑیاں۔۔۔۔۔۔ جی

دوست: منہ کی بہت کڑی تھی۔۔۔۔۔ الف ہو جاتی تھی الف

منتظر: جی۔۔۔ کسی سلوٹری کے حوالے کر دی ہوئی
دوست: ہم تو گھاس کھا گئے ہو۔۔۔۔۔ کہاں کا سوار کہاں کا سلوٹری قدم
رکاب میں گیا اور بگٹ ہو گئی۔۔۔۔۔ اور مجھے تو پٹھے پر ہاتھ نہیں دھرنے
دیتی تھی ایسی چمکتی تھی جیسے بجلی۔۔۔۔۔
منتظر: میں۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔
دوست: کاٹھیاواڑ کھیت کی تھی نا۔۔۔۔۔ چھوٹے تو سر پٹ جائے انجر پنجر
ڈھیلے کر دے۔۔۔۔۔
منتظر: میں۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔
دوست: یہ میں میں کیا کرتے ہو
منتظر: میں بیمار ہوں۔۔۔۔۔ سخت بیمار ہوں۔۔۔۔۔ آپ
آپ۔۔۔۔۔ اوہ۔۔۔۔۔ ساڑھے آٹھ بجنے والے ہیں۔
دوست: (فکر مند لہجہ میں) تم بیمار ہو لیکن بھی عجیب بیوقوف ہو مجھ سے تم نے
پہلے کیوں نہ کہا۔۔۔۔۔ اب اطمینان سے اپنا سارا حال سناؤ مجھے کوئی خدمت بتاؤ
بھئی واللہ سال کر دیا۔۔۔۔۔ اور ہاں۔۔۔۔۔ یہ ساڑھے آٹھ بجے تم نے کیا کہا تھا۔
منتظر: (مردہ آواز میں) ساڑھے آٹھ بجے۔۔۔۔۔ ساڑھے آٹھ بجے
مجھے دوا پینی ہے۔
دوست: لاؤ میں پلا دیتا ہوں۔۔۔۔۔ کہاں ہے دوا۔۔۔۔۔ ساڑھے آٹھ
بجے میں اب کون سی دیر ہے۔۔۔۔۔ دوا کہاں ہے
منتظر: نہیں۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ میں خود پی لوں گا آپ تکلیف نہ

کریں۔۔۔۔۔آپ۔۔۔۔۔آپ جائے
 دوست: میں تمہیں یہاں بیمار چھوڑ کر کیسے جاسکتا ہوں
 منتظر: میں۔۔۔۔۔میں۔۔۔۔۔بیمار نہیں ہوں۔۔۔۔۔میں ابھی ٹھیک ہو
 جاؤں گا آپ جائے۔۔۔۔۔اوہ خدا کے لیے آپ جائے مجھے دل کا دورہ پڑ
 جائے گا
 دوست: دل کا دورہ۔۔۔۔۔بھئی اب تو میں ہر گز نہیں جاؤں
 گا۔۔۔۔۔بتاؤ دوا کہاں ہے۔
 منتظر: وہ میرے پاس نہیں ہے۔۔۔۔۔آپ جائے۔۔۔۔۔خدا کے لیے
 جائے
 دوست: تمہیں اس حالت میں چھوڑ کر میں ڈاکٹر کے پاس بھی تو نہیں جاسکتا
 منتظر: کیا کہا؟۔۔۔۔۔(انظر اب بڑھتا جاتا ہے گھڑی کی آواز زیادہ لمبے
 لمبے سانس لیتی ہے)۔۔۔۔۔کیا کہا؟ آپ ڈاکٹر کے پاس بھی نہیں جائیں
 گے۔۔۔۔۔میں۔۔۔۔۔میں۔۔۔۔۔مر جاؤں گا۔۔۔۔۔خدا کے لیے ڈاکٹر
 کے پاس دوڑے جائے۔۔۔۔۔میری حالت بہت خراب
 ہے۔۔۔۔۔میری۔۔۔۔۔حالت۔۔۔۔۔بہت
 نازک۔۔۔۔۔ہے۔۔۔۔۔جائے۔۔۔۔۔(آواز کمزور ہوتی جاتی ہے)
 دوست: غش طاری ہو گیا۔۔۔۔۔کیا ہوا؟۔۔۔۔۔ڈاکٹر؟۔۔۔۔۔کہاں
 ملے گا۔۔۔۔۔ڈاکٹر۔۔۔۔۔(گھبراہٹ کے عالم میں دوڑتا جاتا ہے) اب کوئی ڈاکٹر مل
 جائے اس وقت (چلا جاتا ہے)

(گھڑی اصلی حالت میں ٹک ٹک کرتی ہے۔۔۔ یہ آواز ڈیرھ
 سیکنڈ تک جاری رہتی ہے۔۔۔ آخر میں کلاک میں خرخراہٹ پیدا
 ہوتی ہے اور ایک ٹن کی آواز آتی ہے اس ٹن کی گونج جھوڑی دیر قائم
 رہتی ہے پھر گھڑی کی ٹک ٹک بالکل بند ہو جاتی ہے اور ایک سیکنڈ تک
 مکمل خاموشی طاری رہتی ہے۔۔۔ اس خاموشی کے بعد دروازہ
 کھلتا ہے اور جس کا انتظار کیا جا رہا ہے وہ آتی ہے)
 وہ: دیکھو تو، کس مزے سے جناب سو رہے ہیں۔ گویا ان کو معلوم ہی نہیں میں آ
 رہی ہوں۔۔۔ کافی گہری نیند سو رہے ہیں۔۔۔ خدا جانے کہاں سے گھومتے
 گھماتے تھک کر آئے ہوں گے۔۔۔ (خفگی کے ساتھ) تو مجھے کیا ضرورت
 پڑی ہے کہ یہاں بن بائے مہمانوں کی طرح کھڑی رہوں۔۔۔ (دروازہ بند
 کر کے چلی جاتی ہے)

☆☆☆☆☆☆

اولاد

جب زبیدہ کی شادی ہوئی تو اس کی عمر پچیس برس کی تھی اس کے ماں باپ تو یہ چاہتے تھے کہ سترہ برس کی ہوتے ہی اس کا بیاہ ہو جائے مگر کوئی مناسب و موزوں رشتہ ملتا ہی نہیں تھا اگر کسی جگہ بات طے ہونے پاتی تو کوئی ایسی مشکل پیدا ہو جاتی کہ رشتہ عملی صورت اختیار نہ کر سکتا۔

آخر جب زبیدہ پچیس برس کی ہو گئی تو اس کے باپ نے ایک رنڈوے کا رشتہ قبول کر لیا۔۔۔۔ اس کی عمر پینتیس برس کے قریب قریب تھی، یا شاید اس سے بھی زیادہ ہو۔ صاحب روزگار تھا مارکیٹ میں کپڑے کی تھوک فروشی کی دکان تھی ہر ماہ پانچ چھ سو روپے کمایا تھا۔

زبیدہ بڑی فرماںبردار لڑکی تھی اس نے اپنے والدین کا فیصلہ منظور کر لیا چنانچہ شادی ہو گئی، اور وہ اپنی سسرال چلی گئی۔

اس کا خاوند جس کا نام علم الدین تھا، بہت شریف اور محبت کرنے والا ثابت ہوا۔ زبیدہ کی ہر آسائش کا خیال رکھتا تھا کپڑے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ حالانکہ دوسرے لوگ اس کے لیے ترستے تھے۔ چالیس ہزار اور تھری بی کا لٹھا، شنوں اور دو گھوڑے کی بوسکی کے تھانوں کے تھان زبیدہ کے پاس موجود تھے۔

وہ اپنے میکے ہر نفٹے جاتی۔۔۔۔ ایک دن وہ گئی تو اس نے ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی بین کرنے کی آواز سنی اندر گئی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کا باپ اچانک دل کی حرکت بند ہونے کے باعث مر گیا ہے۔

ہو“

”کیسی ویسی میں نہیں جانتی۔۔۔۔۔ میں نے یہ سب روپے علم الدین کو
دے دیئے ہوتے، مگر میں چاہتی ہوں کہ تمہارے کوئی بچہ پیدا ہو۔۔۔۔۔ تو یہ
سارا روپیہ اس کو تحفے کے طور پر دوں۔“

زبیدہ کی ماں کو اس بات کا بڑا خیال تھا کہ ابھی تک بچہ پیدا کیوں نہیں
ہوا۔۔۔۔۔ شادی ہوئے قریب قریب دو برس ہو چکے تھے، مگر بچے کی پیدائش
کے آثار ہی نظر نہیں آتے تھے۔

وہ اسے کئی حکیموں کے پاس لے گئی۔ کئی معجونیں، کئی سفوف، کئی قرص اس کو
کھلاوائے، مگر خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

آخر اس نے پیروں فقیروں سے رجوع کیا تو نے ٹوکے استعمال کئے گئے۔
تعویذ دے گئے بھی۔۔۔۔۔ مگر مراد بر نہ آئی زبیدہ۔۔۔۔۔ اس دوران میں تنگ آ گئی
ایک دن چنانچہ اس نے اکتا کر اپنی ماں سے کہہ دیا ”چھوڑو اس قصے کو۔۔۔۔۔ بچہ
نہیں ہوتا تو نہ ہو۔۔۔۔۔“

اس کی بوڑھی ماں نے منہ بسور کر کہا ”بیٹا۔۔۔۔۔ یہ بہت بڑا قصہ
ہے۔۔۔۔۔ تمہاری عقل کو معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ تم اتنا بھی نہیں سمجھتی ہو
کہ اولاد کا ہونا کتنا ضروری ہے اسی سے تو انسان کی زندگی کا باغ سدا ہر ابھرا رہتا
ہے۔“

زبیدہ نے پھما چنگیر میں رکھا ”میں کیا کروں۔۔۔۔۔ بچہ پیدا نہیں ہوتا تو
اس میں میرا کیا قصور ہے۔“

برصیا نے کہا ”قصور کسی کا بھی نہیں بیٹی۔۔۔ بس صرف ایک اللہ کی مہربانی چاہیے“

زبیدہ اللہ میاں کے حضور ہزاروں مرتبہ دعائیں مانگ چکی تھی کہ وہ اپنے فضل و کرم سے اس کی گود ہری کرے مگر اس کی ان دعاؤں سے کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ جب اس کی ماں نے ہر روز اس سے بچے کی پیدائش کے متعلق باتیں کرنا شروع کیں، تو اس کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ فخر زمین ہے، جس میں کوئی پودا اگ ہی نہیں سکتا۔

راتوں کو وہ عجیب عجیب سے خواب دیکھتی۔ بڑے اوٹ پٹانگ قسم کے، کبھی یہ دیکھتی کہ وہ لقمہ و قحط میں کھڑی ہے اس کی گود میں ایک گل گوتھنا سا بچہ ہے، جسے وہ ہوا میں اتنے زور سے اچھالتی ہے کہ وہ آسمان تک پہنچ کر غائب ہو جاتا ہے۔

کبھی یہ دیکھتی کہ وہ اپنے بستر میں لیٹی ہے جو ننھے منے بچوں کے زندہ اور متحرک گوشت سے بنا ہے۔

ایسے خواب دیکھ دیکھ کر اس کا دل و دماغ غیر متوازن ہو گیا۔۔۔۔۔ بیٹھے بیٹھے اس کے کانوں میں بچوں کے رونے کی آواز آنے لگتی، اور وہ اپنی ماں سے کہتی ”یہ کس کا بچہ رو رہا ہے؟“

اس کی ماں نے اپنے کانوں پر زور دے کر یہ آواز سننے کی کوشش کی، جب کچھ سنائی نہ دیا تو اس نے کہا ”کوئی بچہ رو نہیں رہا۔۔۔۔۔“

”نہیں ماں۔۔۔۔۔ رو رہا ہے۔۔۔۔۔ بلکہ رو رو کے ہا کان ہوئے جا رہا

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ایک دن علم الدین نے دیکھا کہ وہ نوٹ جو اس نے اپنی بیوی کو لاکر دیئے تھے، دودھ کی پٹیلی میں پڑے ہیں وہ بہت حیران ہوا کہ یہ کیسے یہاں پہنچ گئے چنانچہ اس نے زبیدہ سے پوچھا ”یہ نوٹ دودھ کی پٹیلی میں کس نے ڈالے ہیں؟“

زبیدہ نے جواب دیا ”بچے بڑے شریر ہیں، یہ حرکت انہی کی ہوگی“

علم الدین بہت متحیر ہوا ”لیکن یہاں بچے کہاں ہیں؟“

زبیدہ اپنے خاوند سے کہیں زیادہ متحیر ہوئی ”کیا ہمارے ہاں بچے نہیں۔۔۔۔۔ آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔۔۔۔۔ ابھی سکول سے واپس آتے ہوں گے۔۔۔۔۔ ان سے پوچھوں گی کہ یہ حرکت کس کی تھی۔“

علم الدین سمجھ گیا اس کی بیوی کے دماغ کا توازن قائم نہیں لیکن اس نے اپنی ساس سے اس کا ذکر نہ کیا کہ وہ بہت کمزور عورت تھی۔

وہ دل ہی دل میں زبیدہ کی دماغی حالت پر افسوس کرتا رہا مگر اس کا علاج اس کے بس میں نہیں تھا اس نے اپنے کئی دوستوں سے مشورہ لیا ان میں سے چند نے اس سے کہا کہ پاگل خانے میں داخل کرا دو۔ مگر اس کے خیال ہی سے اسے وحشت ہوتی تھی۔

اس نے دکان پر جانا چھوڑ دیا سارا وقت گھر رہتا اور زبیدہ کی دیکھ بھال کرتا، کہ مبادا وہ کسی روز کوئی خطرناک حرکت کر بیٹھے۔

اس کے گھر پر ہر وقت موجود رہنے سے زبیدہ کی حالت کسی قدر درست ہو گئی، لیکن اس کو اس بات کی بہت فکر تھی کہ دکان کا کاروبار کون چلا رہا ہے۔ کہیں وہ آدمی جس کو یہ کام سپرد کیا گیا ہے، نہیں تو نہیں کر رہا۔

علم الدین یہ سب کچھ دیکھتا اور اس کا دل رونے لگتا۔ اور وہ سوچتا کہ شاید اس کے گناہوں کی سزا اس کو مل رہی ہے۔ یہ گناہ کیا تھے، اس کا علم، علم الدین کو نہیں تھا۔

ایک دن اس کا ایک دوست اس سے ملا جو بہت پریشان تھا علم الدین نے اس سے پریشانی کی وجہ دریافت کی تو اس نے بتایا کہ اس کا ایک لڑکی سے معاشرہ ہو گیا تھا اب وہ حاملہ ہو گئی ہے۔ نقاط کے تمام ذرائع استعمال کیے گئے ہیں، مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ علم الدین نے اس سے کہا ”دیکھو! نقاط و نقاط کی کوشش نہ کرو۔ بچہ پیدا ہونے دو“

اس کے دوست نے جسے ہونے والے بچے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، کہا ”میں بچے کا کیا کروں گا؟“
”تم مجھے دے دینا“

بچہ پیدا ہونے میں کچھ دیر تھی اس دوران میں علم الدین نے اپنی بیوی زبیدہ کو یقین دلایا کہ وہ حاملہ ہے اور ایک ماہ کے بعد اس کے بچہ پیدا ہو جائے گا
زبیدہ بار بار کہتی ”مجھے اب زیادہ اولاد نہیں چاہیے، پہلے ہی کیا کم ہے“
علم الدین خاموش رہتا

اس کے دوست کی داشتہ کے لڑکا پیدا ہوا، جو علم الدین نے زبیدہ کے پاس جو کہ سو رہی تھی، لٹا دیا۔۔۔ اور اسے چکا کر کہا ”زبیدہ، تم کب تک بے ہوش پڑی رہو گی یہ دیکھو، تمہارے پہلو میں کیا ہے۔“

زبیدہ نے کروٹ بدلی اور دیکھا کہ اس کے ساتھ ایک ننھا منا بچہ ہاتھ پاؤں

مار رہا ہے۔ علم الدین نے اس سے کہا ”لڑکا ہے اب خدا کے فضل و کرم سے
ہمارے پانچ بچے ہو گئے ہیں۔“

زبیدہ بہت خوش ہوئی ”یہ لڑکا کب پیدا ہوا؟“
”صبح سات بجے“

”اور مجھے اس کا علم ہی نہیں۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے درود کی وجہ سے میں بے
ہوش ہو گئی ہوں گی۔“

علم الدین نے کہا ”ہاں، کچھ ایسی ہی بات تھی، لیکن اللہ کے فضل و کرم سے
سب ٹھیک ہو گیا۔“

دوسرے روز جب علم الدین اپنی بیوی کو دیکھنے گیا تو اس نے دیکھا کہ وہ لبو
لبان ہے اس کے ہاتھ میں اس کا کٹ تھروٹ استرا ہے وہ اپنی چھاتیاں کاٹ
رہی ہے۔

علم الدین نے اس کے ہاتھ سے استرا چھین لیا ”یہ کیا کر رہی ہو تم؟“
زبیدہ نے اپنے پہلو میں لیٹے ہوئے بچے کی طرف دیکھا اور کہا ”ساری
رات بلکتا رہا ہے، لیکن میری چھاتیوں میں دو دھند اتر آئے۔۔۔ لعنت ہے
ایسی۔۔۔“

اس سے آگے، وہ اور کچھ نہ کہہ سکی۔ خون سے لتھڑی ہوئی ایک انگلی اس نے
بچے کے منہ کے ساتھ لگا دی، اور ہمیشہ کی نیند سو گئی۔

☆☆☆☆☆☆

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

دھننا یہ آواز باہر سے اس چوٹی کمرے میں کھڑکیوں کے راستے اندر داخل
 ہوئی ولن صاحب جھٹ سے اٹھ بیٹھے اور اپنی آنکھیں ملنے لگے مونچھوں والے
 ایکٹر کے لمبے لمبے کان ایک ارتعاش کے ساتھ اس نسوانی آواز کو پہچاننے کے لیے
 تیار ہوئے۔ منشی صاحب نے میک اپ ٹیبل پر سے مائیکس اٹھالیں اور ولن صاحب
 کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا

”اوئی، اوئی، اوئی۔۔۔۔۔ ہائے۔۔۔۔۔ ہائے“

اس پر ولن، منشی اور دوسرے ایکٹر جو نیم غنودگی کی حالت میں تھے چونک
 پڑے، سب نے کاٹھ کے اس بکس نما کمرے سے اپنی گردنیں باہر نکالیں

”ارے، کیا ہے بھئی“

”خیر تو ہے“

”کیا ہوا؟“

”اماں، یہ تو۔۔۔۔۔ دیوی ہیں“

”کیا بات ہے! دیوی؟“

جتنے منہ اتنی باتیں۔۔۔۔۔ کھڑکی میں سے نکلی ہوئی ہر گردن بڑے انتظار
 کے ساتھ متحرک ہوئی اور ہر ایک کے منہ سے گھبراہٹ میں ہمدردی اور استفسار
 کے طے چلے جذبات کا اظہار ہوا۔

”ہائے۔۔۔۔۔ ہائے۔۔۔۔۔ ہائے۔۔۔۔۔ اوئی۔۔۔۔۔ اوئی“

دیوی، کمپنی کی ہر دھڑیہ بیروئن کے چھوٹے سے منہ سے چیخیں نکلیں اور باہوں
 کو انتہائی کرب و انتظار کے تحت ڈھیلا چھوڑ کر اس نے اپنے چہل پہن پاؤں کو

زور زور سے اسٹوڈیو کی پتھریلی زمین پر مارتے ہوئے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔
 ٹھہر کا ٹھہر کا بوٹا سا قد، گول گول گدرا یا ہوا ڈیل، کھلتی ہوئی گندمی رنگت، خوب
 خوب کالی کالی تیکھی بھنوس، کھلی پیشانی پر گہرا کسوم کا ٹیکا۔۔۔۔۔ بال کالے بھنورا
 سے جو سیدھی مانگ نکال کر پیچھے جوڑے کی صورت میں لپیٹ دے کر نگلھی کیے
 ہوئے تھے، ایسے معلوم ہوتے تھے، جیسے شہد کی بہت سی مکھیاں چستے پر بیٹھی ہوئی
 ہیں۔

کنارے دار سفید سوتلی ساڑھی میں لپی ہوئی، چولی کجراتی تراش کی تھی، بغیر
 آستینوں کے، جن میں سے جو بن پھٹا پڑتا تھا، ساڑھی بمبئی کے طرز سے بندھی تھی
 چاروں طرف بیٹھا بیٹھا جھول دیا ہوا تھا۔۔۔۔۔ گول گول کلا نیں جن میں کھلی
 کھلی جاپانی ریشمیں چوڑیاں کھنکھا رہی تھیں۔ ان ریشمیں چوڑیوں میں ملی ہوئی
 ادھر ادھر والا بتی سونے کی پتلی پتلی گنٹنیاں، جھم جھم کر رہی تھیں کان موزوں اور لوہے
 بڑی خوبصورتی کے ساتھ نیچے جھکی ہوئیں، جن میں سے ہیرے کے آویزے، شبنم کی
 دو تھراتی ہوئی بوندیں معلوم ہو رہی تھیں۔

چیخنی چلاتی، اور زمین کو چپل پہنے بیروں سے کوٹتی، دیوی نے داہنی آنکھ کو نٹھے
 سے سفید رومال کے ساتھ ماننا شروع کر دیا۔

”ہائے میری آنکھ۔۔۔۔۔ ہائے میری آنکھ۔۔۔۔۔ ہائے“

کاٹھ کے بکس سے باہر نکلی ہوئی کچھ گردنیں اندر کو ہو گئیں اور جو باہر تھیں، پھر
 سے ملنے لگیں۔

”آنکھ میں کچھ پڑ گیا ہے؟“

”یہاں کنکر بھی تو بے شمار ہیں۔۔۔۔۔ ہوا میں اڑتے پھرتے ہیں“

”یہاں جھاڑو بھی تو چھ مہینے کے بعد دی جاتی ہے“

”اندر آ جاؤ، دیوی“

”ہاں، ہاں، آؤ۔۔۔۔۔ آنکھ کو اس طرح نہ ملو“

”ارے بابا۔۔۔۔۔ بولانا تکلیف ہو جائے گی۔۔۔۔۔ تم اندر تو آؤ“

آنکھ ماتی ماتی، دیوی کمرے کے دروازے کی جانب بڑھی

وہن نے لپک کر تپانی سے بڑی صفائی کے ساتھ ایک رومال میں چائے کی پیالیاں سمیٹ کر میک اپ ٹیبل کے آئینے کے پیچھے چھپا دیں اور اپنی پرانی پتلون سے ٹیبل کو جھاڑ پونچھ کر صاف کر دیا۔ باقی ایکٹروں نے کرسیاں اپنی اپنی جگہ پر جمادیں اور بڑے سلیقے سے بیٹھ گئے۔ منشی صاحب نے پرہیزی اور جلی بیڑی بھینک کر جیب سے ایک سگریٹ نکال کر ساکنا شروع کر دیا۔

دیوی اندر آئی صوفے پر سے منشی صاحب اور وہن اٹھ کھڑے ہوئے منشی

صاحب نے بڑھ کر کہا ”آؤ، دیوی یہاں بیٹھو“

دروازے کے پاس بڑی بڑی سیام و سفید مونچھوں والے بزرگ بیٹھے تھے،

ان کی مونچھوں کے لٹکے اور بڑھے ہوئے بال تھر تھرائے اور انہوں نے اپنی

نشست پیش کرتے ہوئے گجراتی لہجہ میں کہا ”ادھر بیٹھو“

دیوی ان کی تھر تھراتی ہوئی مونچھوں کی طرف دھیان دیئے بغیر آنکھ ماتی اور

ہائے ہائے کرتی آگے بڑھ گئی ایک نوجوان نے جو ہیرو سے معلوم ہو رہے تھے اور

پھنسی پھنسی قمیض پہنے ہوئے تھے، جھٹ سے ایک چوکی نما کرسی سرکا کر آگے بڑھا

دی اور دیوی نے اس پر بیٹھ کر اپنی ناک کے بانسے کو رومال سے رگڑنا شروع کر دیا۔

سب کے چہرے پر دیوی کی تکلیف کے احساس نے ایک عجیب و غریب رنگ پیدا کر دیا تھا۔ مٹی صاحب کی قوت احساس چونکہ دوسرے مردوں سے زیادہ تھی، اس لیے چشمہ ہٹا کر انہوں نے اپنی آنکھ مانا شروع کر دی تھی۔ جس نوجوان نے کرسی پیش کی تھی، اس نے جھک کر دیوی کی آنکھ کا ملاحظہ کیا اور بڑے منکرانہ انداز میں کہا ”آنکھ کی سرخی بتا رہی ہے کہ تکلیف ضرور ہے“

ان کا لہجہ پھٹا ہوا تھا آواز اتنی بلند تھی کہ کمرہ گونج اٹھا یہ کہنا تھا کہ دیوی نے اور زور زور سے پلانا شروع کر دیا اور سفید ساڑھی میں اس کی ٹانگیں انظراب کا بے پناہ مظاہرہ کرنے لگیں۔

وہ صاحب آگے بڑھے اور بڑی ہمدردی کے ساتھ اپنی سخت کمر جھکا کر دیوی سے پوچھا ”جلن محسوس ہوتی ہے یا چھین“

ایک اور صاحب جو اپنے سولا ہیٹ سمیت کمرے میں ابھی ابھی تشریف لائے تھے، آگے بڑھ کے پوچھنے لگے ”پوٹوں کے نیچے رگڑی تو محسوس نہیں ہوتی“

دیوی کی آنکھ سرخ ہو رہی تھی پوٹے ملنے اور آنسوؤں کی نمی کے باعث میلے میلے نظر آرہے تھے پتوٹوں میں سے ال ال ڈوروں کی جھلک چک میں سے غروب آفتاب کا سرخ سرخ منظر پیش کر رہی تھی۔ وہنی آنکھ کی پلکیں نمی کے باعث بھاری اور گھنی ہو گئی تھیں، جس سے ان کی خوبصورتی میں چار چاند لگ گئے تھے۔

باہیں ڈھیلی کر کے دیوی نے دیکھتی آنکھ کی پتلی نچاتے ہوئے کہا۔

”آں۔۔۔۔۔ بڑا تھک چلا ہوتی ہے۔۔۔۔۔ ہائے۔۔۔۔۔ اوئی“ اور پھر سے آنکھ کو گیلے رہ مال سے مانا شروع کر دیا۔

سیاہ و سفید مونچھوں والے صاحب نے جو کونے میں بیٹھے تھے، بلند آواز میں کہا ”اس طرح آنکھ نہ رگڑو ورنہ پتلی کوئی اور تھک چلا ہو جائے گی۔“
 ”ہاں، ہاں۔۔۔۔۔ ارے، تم پھر وہی کر رہی ہو“ پھٹی آواز والے نوجوان نے کہا

”وہن جو فوراً ہی دیوئی کی آنکھ کو ٹھیک حالت میں دیکھنا چاہتے تھے، بگڑ کر بولے“
 تم سب بیکار باتیں بنا رہے ہو۔۔۔۔۔ کسی سے ابھی تک یہ بھی نہیں ہوا کہ دوڑ کر ڈاکٹر کو بلا لائے۔۔۔۔۔ اپنی آنکھ میں یہ تکلیف ہو تو پتہ چلے۔۔۔۔۔“ یہ کہہ کر انہوں نے مڑ کر کھڑکی میں سے باہر گردن نکالی اور زور زور سے پکارنا شروع کیا۔
 ارے۔۔۔۔۔ کوئی ہے۔۔۔۔۔ کوئی ہے؟ گلاب؟۔۔۔۔۔ گلاب“

جب ان کی آواز صدا ’صحر ا ثابت ہوئی تو انہوں نے گردن اندر کو کر لی اور بڑبڑاتا شروع کر دیا ”خدا جانے ہوٹل والے کا یہ چھو کرا کہاں غائب ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔ پڑا اونگھ رہا ہو گا اسنو ڈیو میں کسی تختے پر۔۔۔۔۔ مردود، نابکار“ پھر فوراً ہی دور اسنو ڈیو کے اس طرف گلاب کو دیکھ کر پلائے، جو انگلیوں میں چائے کی پیالیاں لٹکائے پلا آ رہا تھا ”ارے گلاب۔۔۔۔۔ گلاب!“

گلاب بھاگتا ہوا آیا اور کھڑکی کے سامنے پہنچ کر ٹھہر گیا۔ وہن صاحب نے گھبرائے ہوئے لہجے میں اس سے کہا ”دیکھو! ایک گلاس میں پانی لاؤ۔۔۔۔۔ جلدی سے۔۔۔۔۔ بھاگو“

گلاب نے کھڑے کھڑے اندر جھانکا، دیکھنے کے لیے کہ یہ گڑ بڑ کیا ہے۔۔۔ اس پر ہیرو صاحب لٹکارے ”ارے دیکھتا کیا ہے۔۔۔۔۔ انا گلاس میں جھوڑا سا پانی۔۔۔۔۔ بھاگ کے جا، بھاگ کے“

گلاب سامنے، ٹین کی چھت والے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ دیوی کی آنکھ میں چھین اور بھی زیادہ بڑھ گئی اور اس کی بنارس لٹکڑے کی کیری ایسی ننھی منی ٹھوڑی روتے بچے کی طرح کانپنے لگی اور وہ اٹھ کر درو کی شدت سے کراہتی ہوئی صوفے پر بیٹھ گئی دتی ہوئے سے ماچس کی ڈبیا کے برابر ایک آئینہ نکال کر اس نے اپنی دکھتی آنکھ کو دیکھنا شروع کر دیا۔ اسنے میں غشی صاحب بولے ”گلاب سے کہہ دیا ہوتا۔۔۔۔۔ پانی میں جھوڑی سی برف بھی ڈالتا اے۔“

”ہاں، ہاں، ہر دپانی اچھا رہے گا“ یہ کہہ کر ولن صاحب کھڑکی میں سے گردن باہر نکال کر چلائے ”گلاب۔۔۔۔۔ ارے گلاب۔۔۔۔۔ پانی میں جھوڑی سی برف چھوڑ کے لانا“

اس دوران میں ہیرو صاحب جو کچھ سوچ رہے تھے، کہنے لگے ”میں بولتا ہوں کہ رومال کو سانس کی بھانپ سے گرم کرو اور اس سے آنکھ کو سینک دو۔۔۔۔۔ کیوں واوا؟“

”ایک دم ٹھیک رہے گا“ سیاہ و سفید مونچھوں والے صاحب نے سر کو اثبات میں بڑے زور سے ہلاتے ہوئے کہا۔

ہیرو صاحب کھونٹیوں کی طرف بڑھے۔ اپنے کوٹ میں سے ایک سفید رومال نکال کر دیوی کو سانس کے ذریعے سے اس کو گرم کرنے کی ترکیب بتائی اور الگ ہو

کر کھڑے ہو گئے۔ دیوی نے رومال لے لیا اور اسے منہ کے پاس لے جا کر گال
پچھلا پچھلا کر سانس کی گرمی پہنچائی، آنکھ کو نکور دی مگر کچھ افاقہ نہیں ہوا۔

”کچھ آرام آیا؟“ سوال ہیٹ والے صاحب نے دریافت کیا
دیوی نے رونی آواز میں جواب دیا ”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ ابھی نہیں
کا۔۔۔۔۔ میں مر گئی!“

اتنے میں گلاب پانی کا گلاس لے کر آ گیا۔ ہیرو اور ولن دوڑ کر بڑھے اور
دونوں نے مل کر دیوی کی آنکھ میں پانی چھلکا دیا جب گلاس کا پانی آنکھ کو غسل دینے
میں ختم ہو گیا تو دیوی پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گئی اور آنکھ جھپکاتے لگی۔
”کچھ افاقہ ہوا“

”اب تکلیف تو نہیں ہے؟“
”کنکری نکل گئی ہوگی“

”بس تھوڑی دیر کے بعد آرام آ جائے گا“
آنکھ دھل جانے پر پانی کی ٹھنڈک نے تھوڑی دیر کے لیے دیوی کی آنکھ میں
چھین رفع کر دی، مگر فوراً ہی پھر سے اس نے درد کے مارے چلانا شروع کر دیا۔
”کیا بات ہے؟“ یہ کہتے ہوئے ایک صاحب باہر سے اندر آئے اور
دروازے کے قریب کھڑے ہو کر معاملے کی اہمیت کو سمجھنا شروع کر دیا۔
نوو اور دہنہ سال ہونے کے باوجود چست و چالاک معلوم ہوتے تھے مونچھیں
سفید تھیں جو بیڑی کے دھوکے کے باعث سیاہی مائل زرد رنگت اختیار کر چکی تھیں
ان کے کھڑے ہونے کا انداز بتا رہا تھا کہ فوج میں رہ چکے ہیں۔

سیاہ رنگ کی ٹوپی سر پر ذرا اس طرف ترچھی پہنے ہوئے تھے پتلون اور کوٹ کا کپڑا معمولی اور خاکستری رنگ کا تھا کولہوں اور رانوں کے اوپر پتلون میں پڑے ہوئے جھول اس بات پر چغلیاں کھا رہے تھے کہ ان کی ٹانگوں پر گوشت بہت کم ہے۔ کالر میں بندھی ہوئی میلی ٹکائی کچھ اس طرح نیچے لٹک رہی تھی کہ معلوم ہوتا تھا وہ ان سے روچھی ہوئی ہے۔ پتلون کا کپڑا گھٹنوں پر سے کھینچ کر آگے بڑھا ہوا تھا، جو یہ ہمارا تھا کہ وہ اس بے جان چیز سے بہت کڑا کام لیتے رہے ہیں۔ گال بڑھاپے کے باعث پتکے ہوئے آنکھیں ذرا اندر کودھنسی ہوئیں، جو بار بار شانوں کی عجیب جنبش کے ساتھ سکیڑی جاتی تھیں۔

آپ نے کاندھوں کو جنبش دی اور ایک قدم آگے بڑھ کر کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے پوچھا ”کنکر پڑ گیا ہے کیا؟“ اور اثبات میں جواب پا کر دیوی کی طرف بڑھے ہیرو اور ولن کو ایک طرف ہٹنے کا اشارہ کر کے آپ نے کہا ”پانی سے آرام نہیں آیا۔۔۔۔۔ خیر۔۔۔۔۔ رومال ہے کسی کے پاس؟“

نصف درجن رومال ان کے ہاتھ میں دے دیئے گئے بڑے ڈرامائی انداز میں آپ نے ان پیش کردہ رومالوں میں سے ایک منتخب کیا، اور اس کا ایک کنارہ پکڑ کر دیوی کو آنکھ پر سے ہاتھ ہٹالینے کا حکم دیا۔

جب دیوی نے ان کے حکم کی تعمیل کی تو انہوں نے جیب میں سے مداری کے سے انداز میں ایک چرمی بوٹا نکالا اور اس میں سے اپنا چشمہ نکال کر مال احتیاط سے ناک پر چڑھا لیا۔ پھر چشمے کے شیشوں میں سے دیوی کی آنکھ کا دورہ ہی سے اکڑ کر معائنہ کیا پھر دفعتاً فوٹو گرافر کی سی پھرتی دکھاتے ہوئے آپ نے اپنی ٹانگیں

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دیوی جو آئینے میں روئی صورت بنائے اپنا اطمینان کر
رہی تھی ایک ایک مسکرائی اور پھر کھل کھلا کر ہنس دی۔۔۔۔۔ چوٹی کمرے میں مترنم
تارے بکھر گئے۔

”اب آرام ہے۔۔۔۔۔ اب آرام ہے“ یہ کہہ کر دیوی، سیٹھ کی جانب
روانہ ہو گئی، جو ہوٹل کے پاس اکیلا کھڑا تھا، اور سب لوگ دیکھتے رہ گئے۔
ہیرہ جب صوفے پر بیٹھنے لگا تو منشی صاحب کی ران نیچے دب گئی آپ بھنا گئے
”اب کیا پھر سونے کا ارادہ ہے۔۔۔۔۔ چلو بیٹھو، مجھے کل والے سین کے
ڈائیاگ سناؤ“

ہیرہ کے دماغ میں اس وقت کوئی اور ہی سین تھا۔

☆☆☆☆☆☆

بانجھ

میری اور اس کی ملاقات آج سے ٹھیک دو برس پہلے اپولو بندر پر ہوئی شام کا وقت تھا سورج کی آخری کرنیں سمندر کی ان دو دراز لہروں کے پیچھے غائب ہو چکی تھیں جو ساحل کے بچ پر بیٹھ کر دیکھنے سے مولے کپڑے کی تہیں معلوم ہوتی تھیں میں گیٹ آف انڈیا کے اس طرف پہلے بچ چھوڑ کر جس پر ایک آدمی چپی والے سے اپنے سر کی مائش کر رہا تھا دوسرے بچ پر بیٹھا تھا اور حد نظر پھیلے ہوئے سمندر کو دیکھ رہا تھا دور بہت دور، جہاں سمندر اور آسمان آئل مل رہے تھے۔ بڑی بڑی ہیریں آہستہ آہستہ اٹھ رہی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک بہت بڑا گدلے رنگ کا قالین ہے، جسے ادھر سے ادھر سمیٹا جا رہا ہے۔

ساحل کے سب قمقمے روشن تھے۔ جن کا عکس کنارے کے لرزاں پانی پر کپکپاتی ہوئی موٹی موٹی لکیروں کی صورت میں جگہ جگہ رہنگ رہا تھا۔ میرے پاس پتھر ملی دیوار کے نیچے کئی کشتیوں کے لپٹے ہوئے بادبان اور بانس ہوئے ہوئے حرکت کر رہے تھے سمندر کی لہروں اور تماشا نیوں کی آواز ایک گنگناہٹ بن کر فضا میں گھلی ہوئی تھی کبھی کبھی کسی آنے یا جانے والی موٹر کے ہارن کی آواز بلند ہوتی اور یوں معلوم ہوتا کہ بڑی دلچسپ کہانی سننے کے دوران میں کسی نے زور سے ”ہوں“ کی ہے۔

ایسے ماحول میں سگریٹ پینے کا بہت مزہ آتا ہے میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کی ڈبیا نکالی مگر ماچس نہ ملی جانے کہاں بھول آیا تھا سگریٹ کی ڈبیا

واپس جیب میں رکھنے ہی والا تھا کہ پاس سے کسی نے کہا
”ماچس لیجئے گا“

میں نے مڑ کر دیکھا بچہ کے پیچھے ایک نوجوان کھڑا تھا یوں تو بمبئی کے عام
باشندوں کا رنگ زرد ہوتا ہے لیکن اس کا چہرہ خوفناک طور پر زرد تھا میں نے اس
کا شکریہ ادا کیا ”آپ کی بڑی عنایت ہے“
یہ سن کر اس نے ماچس کی ڈبیا جو اس کے ہاتھ ہی میں تھی میری طرف بڑھادی
میں نے پھر شکریہ ادا کیا اور کہا ”تشریف رکھیے“
اس نے جواب دیا ”آپ سگریٹ سلا لیتے، مجھے جانا ہے“

مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اس نے جھوٹ بولا ہے کیونکہ اس کے لہجے سے اس
بات کا پتہ چلتا تھا کہ اسے کوئی جلدی نہیں ہے اور نہ اسے کہیں جانا ہے آپ کہیں
گئے کہ لہجے سے ایسی باتوں کا پتہ کیسے چل سکتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس
وقت ایسا ہی محسوس ہوا چنانچہ میں نے ایک بار پھر کہا ”ایسی جلدی کیا
ہے۔۔۔ تشریف رکھیے“ اور یہ کہہ کر میں نے سگریٹ کی ڈبیا اس کی طرف بڑھا
دی ”شوق فرمائیے“

اس نے سگریٹ کے چھاپ کی طرف دیکھا اور جواب دیا ”شکریہ میں صرف
اپنا براغذ پیا کرتا ہوں“

آپ مانیں نہ مانیں مگر میں قسمیہ کہتا ہوں کہ اس بار اس نے پھر جھوٹ بولا
اس مرتبہ پھر اس کے لہجے نے چغلی کھائی اور مجھے اس سے دلچسپی پیدا ہو گئی اس لیے
کہ میں نے اپنے دل میں قصد کر لیا تھا کہ اسے ضرور اپنے پاس بٹھائوں گا اور اپنا

سگریٹ پلو اؤں گا میرے خیال کے مطابق اس میں مشکل کی کوئی بات ہی نہ تھی کیونکہ اس کے دو جملوں ہی نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہے اس کا جی چاہتا ہے کہ میرے پاس بیٹھے اور سگریٹ پئے لیکن بیک وقت اس کے دل میں یہ خیال بھی پیدا ہوتا ہے کہ میرے پاس نہ بیٹھے اور میرا سگریٹ نہ پئے چنانچہ ہاں اور نہ کا یہ تضاد اس کے لہجے میں صاف طور پر مجھے نظر آیا تھا آپ یقین جانئے کہ اس کا وہ جو بھی ہونے اور نہ ہونے کے سچ میں لٹکا ہوا تھا۔

اس کا چہرہ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں بے حد پتلا تھا اس پر اس کی ناک آنکھوں اور منہ کے خطوط اس قدر مدہم تھے جیسے کسی نے تصویر بنائی ہے اور اس کو پانی سے دھو ڈالا ہے کبھی کبھی اس کی طرف دیکھتے دیکھتے اس کے ہونٹ ابھر سے آتے لیکن پھر راکھ میں لپٹی ہوئی چنگاڑی کی مانند سو جاتے۔ اس کے چہرے کے دوسرے خطوط کا بھی یہی حال تھا آنکھیں گدلے پانی کی دو بڑی بڑی بوندیں تھیں جن پر اس کی چمکری پلکیں جھکی ہوئی تھیں بال کالے تھے مگر ان کی سیاہی جلے ہوئے کاغذ کی مانند تھی جن میں بھوسلا پن بھی ہوتا ہے قریب سے دیکھنے پر اس کی ناک کا صحیح نقشہ معلوم ہو سکتا تھا مگر دور سے دیکھنے پر وہ بالکل چھٹی معلوم ہوتی تھی کیونکہ جیسا کہ میں اس سے پیشتر بیان کر چکا ہوں اس کے چہرے کے خطوط بالکل ہی مدہم تھے۔

اس کا قد عام لوگوں جتنا تھا یعنی نہ چھوٹا نہ بڑا البتہ جب وہ ایک خاص انداز سے یعنی اپنی کمی کی ہڈی کو ڈھیلیا چھوڑ کے کھڑا ہوتا تو اس کے قد میں نمایاں فرق پیدا ہو جاتا اس طرح جب وہ ایک دم کھڑا ہوتا تو اس کا قد جسم کے مقابلے میں

بہت بڑا دکھائی دیتا۔

کپڑے اس کے خستہ حالت میں تھے لیکن میلے نہیں تھے کوٹ کی آستيوں کے آخری حصے کثرت استعمال کے باعث گھس گئے تھے اور پھوسڑے نکل آئے تھے کالر کھلا تھا اور قمیص بس ایک اور دکھائی کی مار تھی مگر ان کپڑوں میں بھی وہ خود کو ایک باوقار انداز میں پیش کرنے کی سعی کر رہا تھا میں نے سعی کر رہا تھا اس لیے کہا کیونکہ جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کے سارے وجود میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی اور مجھے ایسا معلوم ہوا تھا کہ وہ اپنے آپ کو میری نگاہوں سے اوچھل رکھنا چاہتا ہے۔

میں اٹھ کھڑا ہوا اور سگریٹ ساگاکر اس کی طرف پھر ڈبیا بڑھا دی ”شوق فرمائیے“

یہ میں نے کچھ اس طریقے سے کہا اور فوراً ہی ماچس ساگاکر اس انداز سے پیش کی کہ وہ سب کچھ بھول گیا۔ اس نے ڈبیا میں سے سگریٹ نکال کر منہ میں دبایا اور اسے ساگاکر پینا بھی شروع کر دیا لیکن ایکایکی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور منہ میں سے سگریٹ نکال کر مصنوعی کھانسی کے آثار حلق میں پیدا کرتے ہوئے اس نے کہا ”کیونکہ مجھے راس نہیں آتے ان کا تمباکو بہت تیز ہے میرے گھٹے میں فوراً خراشیں پیدا ہو جاتی ہیں“

میں نے اس سے پوچھا ”آپ کون سے سگریٹ پسند کرتے ہیں؟“

اس نے تلاً کر جواب دیا ”میں۔۔۔ میں۔۔۔ میں دراصل سگریٹ بہت کم پیتا ہوں کیونکہ ڈاکٹر اور وکیل نے منع کر رکھا ہے ویسے میں تھری فائیو پیتا ہوں جن کا

تمہا کو تیز نہیں ہوتا۔“

اس نے جس ڈاکٹر کا نام لیا وہ بمبئی کا بہت بڑا ڈاکٹر ہے اس کی فیس دس روپے ہے جن سگریٹوں کا اس نے حوالہ دیا ان کے متعلق آپ کو بھی معلوم ہوگا کہ بہت مہنگے داموں پر ملتے ہیں اس نے ایک ہی سانس میں دو جھوٹ بولے جو مجھے ہضم نہ ہوئے مگر میں خاموش رہا حالانکہ سچ عرض کرتا ہوں اس وقت میرے دل میں یہی خواہش چمکیاں لے رہی تھی کہ اس کا غلاف اتار دوں اور اس کی دروغ گوئی کو بے نقاب کر دوں اور اسے کچھ اس طرح شرمندہ کروں کہ وہ مجھ سے معافی مانگے مگر میں نے جب اس کی طرف دیکھا تو اس فیصلے پر پہنچا کہ اس نے جو کچھ کہا ہے اس کا جز بن کر رہ گیا ہے جھوٹ بول کر چہرے پر جو ایک سرفخی سی دڑ جایا کرتی ہے مجھے نظر نہ آئی بلکہ میں نے دیکھا کہ وہ جو کچھ کہہ چکا ہے اس کو حقیقت سمجھتا ہے اس کے جھوٹ میں اس قدر اخلاص تھا یعنی اس نے اتنے پر خلوص طریقے پر جھوٹ بولا تھا کہ اس کی میزان احساس میں ہلکی سی جنبش بھی پیدا نہیں ہوئی تھی خیر اس قصے کو چھوڑیے ایسی باریکیاں میں آپ کو بتانے لگوں تو صفحوں کے صفحے کالے ہو جائیں گے اور افسانہ بہت خشک ہو جائے گا۔

جموڑی سی رہی گفتگو کے بعد میں نے اس کا راہ پر لگا لیا اور ایک اور سگریٹ پیش کر کے سمندر کے دفریب منظر کی بات چھیڑ دی چونکہ افسانہ نگار ہوں اس لیے کچھ اس دلچسپ طریقے پر اسے سمندر، پولو بندر اور وہاں آنے جانے والے تماشاویوں کے بارے میں چند باتیں سنائیں کہ چھ سگریٹ پینے پر بھی اس کے حلق میں خرخرامٹ پیدا نہ ہوئی اس نے میرا نام پوچھا میں نے بتایا تو وہ اٹھ کھڑا

ہوا اور کہنے لگا ”آپ۔۔۔۔۔ آپ مسٹر۔۔۔۔۔ ہیں۔۔۔۔۔ میں آپ کے کئی افسانے پڑھ چکا ہوں مجھے۔۔۔۔۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ ہی۔۔۔۔۔ ہیں۔۔۔۔۔ مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی واللہ بہت خوشی ہوئی ہے۔“

میں نے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہا مگر اس نے اپنی بات شروع کر دی ”ہاں خوب یاد آیا ابھی حال ہی میں آپ کا ایک افسانہ میں نے پڑھا ہے۔۔۔۔۔ عنوان بھول گیا ہوں۔۔۔۔۔ اس میں آپ نے ایک لڑکی پیش کی ہے جو کسی مرد سے محبت کرتی تھی مگر وہ اسے دھوکا دے گیا اسی لڑکی سے ایک اور مرد بھی محبت کرتا تھا جو افسانہ سناتا ہے جب اس کو لڑکی کی افتاد کا پتہ چلتا ہے تو وہ اس سے ملتا ہے اور اس سے کہتا ہے زندہ رہو۔۔۔۔۔ ان چند گھڑیوں کی یاد میں اپنی زندگی کی بنیادیں کھڑی کرو جو تم نے اس کی محبت میں گزاری ہیں اس مسرت کی یاد میں جو تم نے چند لمحات کے لیے حاصل کی تھی“ مجھے اصل عبارت یاد نہیں رہی لیکن مجھے بتائے کیا ایسا ممکن ہے۔۔۔۔۔ ممکن کو چھوڑیے آپ یہ بتائیے کہ وہ آدمی کیا آپ تو نہیں تھے؟۔۔۔۔۔ معاف کیجئے گا میں ایسے سوال کر رہا ہوں جو مجھے نہیں کرنے چاہئیں۔۔۔۔۔ مگر کیا آپ ہی نے اس سے کوٹھے پر ملاقات کی تھی اور اس کی تھکی ہوئی جوانی کو اب گتھتی ہوئی چاندنی میں چھوڑ کر نیچے اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلے آئے تھے۔۔۔۔۔ یہ کہتے ہوئے وہ ایک دم ٹھہر گیا ”مگر مجھے ایسے باتیں نہیں پوچھنی چاہئیں۔۔۔۔۔ اپنے دل کا حال کون بتاتا ہے۔“

اس پر میں نے کہا ”میں آپ کو بتاؤں گا۔۔۔۔۔ لیکن پہلی ملاقات میں سب

کچھ پوچھ لینا اور سب کچھ بتانا اچھا معلوم نہیں ہوتا آپ کا کیا خیال ہے؟“ وہ جوش جو گفتگو کرتے وقت اس کے اندر پیدا ہو گیا تھا ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا اس نے دھیسے لہجے میں کہا ”آپ کا فرمانا بالکل درست ہے مگر کیا پتہ ہے کہ آپ سے پھر کبھی ملاقات نہ ہو“

اس پر میں نے کہا ”اس میں شک نہیں، ہمیں بہت بڑا شہر ہے لیکن ہماری ایک نہیں، بہت سی ملاقاتیں ہو سکتی ہیں بیکار آدمی ہوں یعنی افسانہ نگار۔۔۔۔۔ شام کو ہر روز اسی وقت بشرطیکہ بیمار نہ ہو جاؤں آپ مجھے ہمیشہ اسی جگہ پر پائیں گے۔۔۔۔۔ یہاں بے شمار لڑکیاں سیر کو آتی ہیں اور میں اس لیے آتا ہوں کہ خود کو کسی کی محبت میں گرفتار کر سکوں۔۔۔۔۔ محبت بری چیز نہیں ہے۔“

”محبت۔۔۔۔۔ محبت۔۔۔۔۔!“ اس نے اس سے آگے کچھ کہنا چاہا مگر نہ کہہ سکا اور جلتی ہوئی رسی کی طرح آخری بل کھا کر خاموش ہو گیا۔

میں نے ازراہ مذاق اس سے محبت کا ذکر کیا تھا دراصل اس وقت فضا ایسی دلفریب تھی کہ اگر میں کسی عورت پر عاشق ہو جاتا تو مجھے افسوس نہ ہوتا۔ جب دونوں وقت آپس میں مل رہے ہوں نیم تاریکی میں بجلی کے تفتے قطار کے اندر آنکھیں جھپکنا شروع کر دیں ہوا میں نکلی پیدا ہو جائے اور فضا پر ایک افسانوی کیفیت سی چھا جائے تو کسی اجنبی عورت کے قربت کی ضرورت محسوس ہوا کرتی ہے ایک ایسی ضرورت جس کا احساس تحت شعور ہی میں چھپا رہتا ہے۔

خدا معلوم اس نے کس افسانے کے متعلق مجھ سے پوچھا تھا مجھے اپنے سب افسانے یاد نہیں اور خاص طور پر وہ تو بالکل یاد نہیں جو رو مانی ہیں میں اپنی زندگی میں

بہت کم عورتوں سے ملا ہوں وہ افسانے جو میں نے عورتوں کے متعلق لکھے ہیں یا تو کسی خاص ضرورت کے ماتحت لکھے ہیں یا محض دماغی عیاشی کے لیے میرے ایسے افسانوں میں چونکہ خلوص نہیں ہے اس لیے میں نے کبھی ان کے متعلق غور نہیں کیا ایک خاص طبقے کی عورتیں میری نظر سے گزری ہیں اور ان کے متعلق ہیں میں نے چند افسانے لکھے ہیں مگر وہ رومان نہیں ہیں اس نے جس افسانے کا ذکر کیا تھا وہ یقیناً کوئی ادنیٰ درجے کا رومان تھا جو میں نے اپنے چند جذبات کی پیاس بجھانے کے لیے لکھا ہوگا۔۔۔۔۔ لیکن میں نے تو اپنا افسانہ بیان کرنا شروع کر دیا۔

ہاں، تو جب وہ محبت کہہ کر خاموش ہو گیا تو میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ محبت کے بارے میں کچھ اور کہوں چنانچہ میں نے کہنا شروع کیا، ”محبت کی یوں تو بہت سی قسمیں ہمارے باپ دادا بیان کر گئے ہیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ محبت خواہ ملتان میں پیدا ہو یا سائبیریا کے تخیل بستہ میدانوں میں ہمدیوں میں پیدا ہو، یا گرمیوں میں، امیر کے دل میں پیدا ہو یا غریب کے دل میں۔۔۔۔۔ محبت خوب صورت کریں یا بد صورت، بد کردار کرے یا نیکو کار۔۔۔۔۔ محبت محبت ہی رہتی ہے اس میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ جس طرح بچے پیدا ہونے کی صورت ہمیشہ ایک سی چلی آرہی ہے اسی طرح محبت کی پیدا آتش بھی ایک ہی طریقے پر ہوتی ہے یہ جدا بات ہے کہ سعیدہ بیگم ہسپتال میں بچہ جنے اور راجکماری جنگل میں غلام محمد کے دل میں بھنگن محبت پیدا کر دے اور نور ال کے دل میں کوئی رانی جس طرح بعض بچے وقت سے پہلے پیدا ہوتے ہیں اور کمزور رہتے ہیں اسی طرح محبت بھی کمزور رہتی ہے جو وقت سے پہلے جنم لے بعض دفعہ بچے بڑی تکلیف سے پیدا ہوتے ہیں

بعض دفعہ محبت بھی بڑی تکلیف دے کر پیدا ہوتی ہے جس طرح عورت کا حمل گر جاتا ہے اسی طرح محبت بھی گر جاتی ہے بعض دفعہ بانجھ پن پیدا ہو جاتا ہے، ادھر بھی آپ کو ایسے آدمی نظر آئیں گے جو محبت کرنے کے معاملے میں بانجھ ہیں۔۔۔۔۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ محبت کرنے کی خواہش ان کے دل سے ہمیشہ کے لیے مٹ جاتی ہے یا ان کے اندر وہ جذبہ ہی نہیں رہتا نہیں، یہ خواہش ان کے دل میں موجود ہوتی ہے مگر وہ اس قابل نہیں رہتے کہ محبت کر سکیں جس طرح عورت اپنے جسمانی تقائس کے باعث بچے پیدا کرنے کے قابل نہیں رہتی اسی طرح یہ لوگ چند روحانی تقائس کی وجہ سے کسی کے دل میں محبت پیدا کرنے کی قوت نہیں رکھتے۔۔۔۔۔ محبت کا ارتقا بھی ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔“

مجھے اپنی گفتگو دلچسپ معلوم ہو رہی تھی چنانچہ میں اس کی طرف دیکھے بغیر لکچر دینے چلا جا رہا تھا لیکن جب میں اس کی طرف متوجہ ہوا تو وہ دو رسمندہ کے اس پار خلا میں دیکھ رہا تھا اور اپنے خیالات میں گم تھا میں خاموش ہو گیا۔ جب زور سے کسی موٹر کا بارن بجا تو وہ چونکا اور خالی الذہن ہو کر کہنے لگا ”جی۔۔۔۔۔ آپ نے بالکل درست فرمایا ہے!“

میرے جی میں آئی کہ اس سے پوچھوں۔۔۔۔۔ ”درست فرمایا ہے؟۔۔۔۔۔ اس کو چھوڑیے آپ یہ بتائیے کہ میں نے کہا کیا ہے؟“ لیکن میں خاموش رہا اور اس کو موقع دیا کہ اپنے وزنی خیالات دماغ سے جھٹک دے وہ کچھ دیر سوچتا رہا اس کے بعد اس نے پھر کہا ”آپ نے بالکل ٹھیک فرمایا ہے لیکن۔۔۔۔۔ خیر چھوڑیے اس قصے کو“

میں جموڑی دیر خاموش رہا کیونکہ وہ ایسی حالت میں نہیں تھا کہ میری بات غور سے سن سکتا۔ لیکن جب اس نے اصرار کیا تو میں نے کہنا شروع کیا میں آپ سے

یہ پوچھ رہا تھا کہ ان لوگوں کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے جو محبت کرنے کے معاملے میں بانجھ ہوتے ہیں۔۔۔ میں ایسے آدمیوں کے جذبات اور ان کی اندرونی کیفیات کا اندازہ نہیں کر سکتا لیکن جب میں اس بانجھ عورت کا تصور کرتا ہوں جو صرف ایک بیٹی یا بیٹا حاصل کرنے کے لیے دعائیں مانگتی ہے خدا کے حضور میں گر گزرتی ہے۔ اور جب وہاں سے کچھ نہیں ملتا تو نے لوگوں میں اپنا گویا ہر مقصود ڈھونڈتی ہے۔ شمشانوں سے راکھ لاتی ہے کئی کئی راتیں جاگ کر سادھوؤں کے بتائے ہوئے منتر پڑھتی ہے تیس ماننی ہے۔ چڑھاوے چڑھاتی ہے تو میں خیال کرتا ہوں کہ اس آدمی کی بھی یہی حالت ہوتی ہوگی جو محبت کے معاملے میں بانجھ ہو۔۔۔۔۔ ایسے لوگ واقعی ہمدردی کے قابل ہیں مجھے اندھوں پر اتنا رحم نہیں آتا۔ جتنا ان لوگوں پر آتا ہے۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ جھوک نکل کر دفعتاً اٹھ کھڑا ہوا اور پرلی طرف منہ کر کے کہنے لگا ”اوہ، بہت دیر ہو گئی مجھے ضروری کام کے لیے جانا تھا یہاں باتوں باتوں میں کتنا وقت گزر گیا۔“

میں بھی اٹھ کھڑا ہوا وہ پلٹا اور میرا ہاتھ دبا کر لیکن میری طرف دیکھے بغیر اس نے ”اب رخصت چاہتا ہوں“ کہا اور چل دیا۔

دوسری مرتبہ اس سے میری ملاقات پھر پولو بندر ہی پر ہوئی۔ میں سیر کا مادی نہیں ہوں مگر اس زمانے میں ہر شام پولو بندر جانا میرا دستور ہو گیا تھا ایک مینیہ کے بعد جب مجھے آگرہ کے ایک شاعر نے ایک لمبا چوڑا خط لکھا جس میں اس نے نہایت ہی حریصانہ طور پر پولو بندر اور وہاں جمع ہونے والی بیویوں کا ذکر کیا اور

دن پوری طرح ڈھل چکا تھا اور اجالے کا کوئی نشان باقی رہا تھا۔ اکتوبر کی گرمی میں کمی واقع نہیں ہوتی تھی ہوا چل رہی تھی۔۔۔۔۔ تنہکے ہوئے مسافر کی طرح، سیر کرنے والوں کا جھوم زیادہ تھا میرے پیچھے موٹریں ہی موٹریں کھڑی تھیں۔ بیچ بھی سب کے سب پر تھے جہاں بیٹھا تھا۔ وہاں دو باتونی، ایک کجراتی اور ایک پارسی نہ جانے کب کے جمے ہوئے تھے دونوں کجراتی بولتے تھے مگر مختلف لب و لہجہ سے پارسی کی آواز میں دوسرے وہ کبھی باریک سر میں بات کرتا تھا کبھی مولے سر میں جب دونوں تیزی سے بولنا شروع کر دیتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے طوطے مینا کی لڑائی ہو رہی ہے۔

کوئی بیچ خالی نہیں تھا اس لیے میں نے اس سے کہا ”آپ سے بہت دیر کے

بعد ملاقات ہوئی۔۔۔۔۔ چلیے سامنے ریسٹوران میں بیٹھتے ہیں یہاں کوئی بچہ خالی نہیں۔“

اس نے رسمی طور پر چند باتیں کہیں اور ساتھ ہولیا چند گزروں کا فاصلہ طے کرنے پر ہم دونوں ریسٹوران میں بید کی بڑی بڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے چائے کا آرڈر دے رک میں نے اس کی طرف سگریٹوں کا ٹین بڑھا دیا۔ اتفاق کی بات ہے میں نے اسی روز دس روپے دے کر ڈاکٹر ارولکر سے مشورہ لیا تھا اور اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اول تو سگریٹ پیتا ہی موقوف کرو اور اگر تم ایسا نہیں کر سکتے تو اچھے سگریٹ پیا کرو مثال کے طور پر پانچ سو پیپن۔۔۔۔۔ چنانچہ میں نے ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق یہ ٹین اسی شام خرید لیا تھا، اس نے ڈبے کی طرف غور سے دیکھا۔ پھر میری طرف دکاہیں اٹھائیں کچھ کہنا چاہا مگر خاموش ہو گیا۔

میں ہنس پڑا ”آپ یہ نہ سمجھئے گا کہ میں نے آپ کے کہنے پر یہ سگریٹ پینا شروع کیے ہیں۔۔۔۔۔ اتفاق کی بات ہے کہ آج مجھے بھی ڈاکٹر ارولکر کے پاس جانا پڑا کیونکہ کچھ دنوں سے میرے سینے میں درد ہو رہا ہے چنانچہ اس نے مجھ سے کہا کہ یہ سگریٹ پیا کرو لیکن بہت کم۔۔۔۔۔“

میں نے یہ کہتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور محسوس کیا کہ اس کو میری یہ باتیں ناگوار معلوم ہوئی ہیں چنانچہ میں نے فوراً اپنی جیب سے وہ نسخہ نکالا جو ڈاکٹر ارولکر نے مجھے لکھ کر دیا تھا۔ یہ کاغذ میز پر میں نے اس کے سامنے رکھ دیا ”یہ عبارت مجھ سے پڑھی تو نہیں جاتی مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے وٹامن کا سارا خاندان اس نسخے میں جمع کر دیا ہے۔“

اس کاغذ کو جس پر ابھرے ہوئے کالے حروف میں ڈاکٹر ارومکر کا نام اور پتہ مندرج تھا اور تاریخ بھی لکھی ہوئی تھی۔ اس نے چورنگا ہوں سے دیکھا اور وہ انظر اب جو اس کے چہرے پر پیدا ہو گیا تھا فوراً وہ رہو گیا چنانچہ اس نے مسکرا کر کہا ”کیا وجہ ہے کہ اکثر لکھنے والوں کے اندر وہاں منتر ختم ہو جاتی ہیں؟“

میں نے جواب دیا ”اس لیے کہ انہیں کھانے کو کافی نہیں ملتا کام زیادہ کرتے ہیں لیکن اجرت بہت ہی کم ملتی ہے“

اس کے بعد چائے آگئی اور دوسری باتیں شروع ہو گئیں پہلی ملاقات اور اس ملاقات میں غالباً ڈھائی مہینے کا فاصلہ تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ پہلے سے زیادہ پیلا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پیدا ہو رہے تھے اسے غالباً کوئی روحانی تکلیف تھی جس کا احساس اسے ہر وقت رہتا تھا۔ کیونکہ باتیں کرتے کرتے وہ بعض اوقات ٹھہر جاتا اور اس کے ہونٹوں سے غیر ارادی طور پر آہ نکل جاتی۔ اگر ہنسنے کی کوشش بھی کرتا تو اس کے ہونٹوں میں زندگی پیدا نہیں ہوتی تھی۔

میں نے یہ کیفیت دیکھ کر اس سے اچانک طور پر پوچھا ”آپ اداس کیوں ہیں؟“

”اداس۔۔۔۔۔ اداس!“ ایک پھکی سی مسکراہٹ جو انہیں مرنے والوں کے لبوں پر پیدا کرتی ہے جو ظاہر کرنا چاہتی ہے کہ وہ موت سے خائف نہیں اس کے ہونٹوں پر پھیل ”میں اداس نہیں ہوں آپ کی طبیعت اداس ہوگی“ یہ کہہ کر اس نے ایک ہی گھونٹ میں چائے کی پیالی خالی کر دی اور اٹھ کھڑا ہوا

”اچھا تو میں اجازت چاہتا ہوں۔۔۔۔۔ ایک ضروری کام سے جانا ہے“
مجھے یقین تھا کہ اسے کسی ضروری کام سے نہیں جانا ہے مگر میں نے اسے نہ روکا
اور جانے دیا اس دفعہ پھر اس کا نام دریافت نہ کر سکا۔ لیکن اتنا پتہ چل گیا کہ وہ
ذہنی اور روحانی طور پر بے حد پریشان تھا وہ اداس تھا بلکہ یوں کہیے کہ اداسی اس
کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکی تھی مگر وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی اداسی کا دوسروں
کو علم ہو۔ وہ دو زندگیاں بسر کرنا چاہتا تھا ایک وہ جو حقیقت تھی اور ایک وہ جس کی
تخلیق میں وہ ہر گھڑی، ہر لمحہ مصروف رہتا تھا لیکن اس کی زندگی کے یہ دونوں پہلو
نا کام تھے۔ کیوں؟۔۔۔۔۔ یہ مجھے معلوم نہیں۔

اس سے تیسری مرتبہ میری ملاقات پھر ا پولو بندر پر ہوئی۔ اس دفعہ میں اسے
اپنے گھر لے گیا۔ راستے میں ہماری کوئی بات چیت نہیں ہوئی لیکن گھر پر اس کے
ساتھ بہت سی باتیں ہوئیں۔ جب وہ میرے کمرے میں داخل ہوا تو اس کے
چہرے پر چند لمحات کے لیے اداسی چھا گئی مگر وہ فوراً ہی سنبھل گیا اور اس نے اپنی
عادت کے خلاف اپنے آپ کو بہت تروتازہ اور باتونی ظاہر کرنے کی کوشش کی اس
کو اس حالت میں دیکھ کر مجھے اس پر اور بھی ترس آیا وہ ایک موت جیسی یقینی حقیقت
کو جھٹا رہا تھا اور مزہ یہ ہے کہ اس خود فریبی سے کبھی کبھی وہ مطمئن بھی نظر آتا تھا۔
باتوں کے دوران میں اس کی نظر میرے میز پر پڑی۔ شیشے کے فریم میں اس کو
ایک لڑکی کی تصویر نظر آئی اٹھ کر اس نے تصویر کی طرف جاتے ہوئے کہا ”کیا میں
آپ کی اجازت سے یہ تصویر دیکھ سکتا ہوں“
میں نے کہا ”بصدا شوق!“

اس نے تصویر کو ایک نظر دیکھا اور دیکھ کر کرسی پر بیٹھ گیا ”اچھی خوبصورت لڑکی ہے۔۔۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی۔۔۔۔۔“

”جی نہیں۔۔۔۔۔ ایک زمانہ ہا اس سے محبت کرنے کا خیال میرے دل میں پیدا ہوا تھا بلکہ یوں کہیے کہ تصویر سی محبت میرے دل میں پیدا ہو بھی گئی تھی مگر افسوس ہے کہ اس کو اس کی خبر تک نہ ہوئی اور میں۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ نہیں بلکہ وہ بیاہ دی گئی۔۔۔۔۔ یہ تصویر میری پہلی محبت کی یادگار ہے جو اچھی طرح پیدا ہونے سے پہلے ہی مر گئی۔“

”یہ آپ کی محبت کی یادگار ہے۔۔۔۔۔ اس کے بعد تو آپ نے اور بہت سے رومان بھی لڑائے ہوں گے“ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری ”یعنی۔۔۔۔۔ یعنی آپ کی زندگی میں تو کوئی ایسی نامکمل اور مکمل محبتیں موجود ہوں گی۔“

میں کہنے ہی والا تھا کہ جی نہیں خاکسار بھی محبت کے معاملے میں آپ جیسا ہی بنجر ہے مگر جانے کیوں، یہ کہتا کہتا رک گیا اور خواہ مخواہ جھوٹ بول دیا ”جی ہاں۔۔۔۔۔ ایسے سلسلے ہوتے ہی رہتے ہیں۔۔۔۔۔ آپ کی کتاب زندگی بھی تو ایسے واقعات سے بھر پور ہوگی۔“

وہ کچھ نہ بولا اور بالکل خاموش ہو گیا جیسے کسی گہرے سمندر میں غوطہ لگا گیا ہے۔ دیر تک جب وہ اپنے خیالات میں غرق رہا اور میں اس کی خاموشی سے اس ہونے لگا تو میں نے کہا ”اجی حضرت! آپ کن خیالات میں کھو گئے؟“ وہ چونک پڑا ”میں۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ کچھ نہیں، میں ایسے ہی کچھ سوچ رہا تھا“

میں نے پوچھا ”کوئی جیتا ہوئی کہانی یاد آگئی۔۔۔۔۔ کوئی مچھڑا ہوا سپنا مل گیا۔۔۔۔۔ پرانے زخم برے ہو گئے“

”زخم۔۔۔۔۔ پرانے۔۔۔۔۔ زخم۔۔۔۔۔ کئی زخم تو نہیں۔۔۔۔۔ صرف ایک ہی ہے۔ بہت گہرا، بہت کاری۔۔۔۔۔ اور زخم میں چاہتا بھی نہیں ایک ہی زخم کافی ہے“ یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور میرے کمرے میں ٹہلنے کی کوشش کرنے لگا کیونکہ اس چھوٹی سی جگہ میں جہاں کرسیاں، میز اور چارپائی سب کچھ پڑا تھا ٹہلنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ میز کے پاس اسے رکنا پڑا۔ تصویر کو اب کی دفعہ گہری نظروں سے دیکھا اور کہا ”اس میں اور اس میں کتنی مشابہت ہے۔۔۔۔۔ مگر اس کے چہرے پر ایسی شوخی نہیں تھی اس کی آنکھیں بڑی تھیں مگر ان آنکھوں کی طرح ان میں شرارت نہیں تھی وہ فکر مند آنکھیں تھیں ایسی آنکھیں جو دیکھتی بھی ہیں اور سمجھتی بھی ہیں“ یہ کہتے ہوئے اس نے ایک سرد آہ بھری اور کرسی پر بیٹھ گیا ”موت بالکل ناقابل فہم چیز ہے خاص طور پر اس وقت جبکہ یہ جوانی میں آئے۔۔۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ خدا کے علاوہ ایک اور طاقت بھی ہے جو بڑی حاسد ہے۔ جو کسی کو خوش دیکھنا نہیں چاہتی۔۔۔۔۔ مگر چھوڑ دینے اس قصے کو۔“

میں نے اس سے کہا ”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ آپ سنا تے جائیے۔۔۔۔۔ لیکن اگر آپ ایسا مناسب سمجھیں۔۔۔۔۔ سچ پوچھئے تو میں یہ سمجھ رہا تھا کہ آپ نے کبھی محبت کی ہی نہ ہوگی۔“

”یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ میں نے کبھی محبت کی ہی نہیں اور ابھی ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ میری کتاب زندگی ایسے کئی واقعات سے بھری پڑی ہوگی“ یہ کہہ

کر اس نے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا ”میں نے اگر محبت نہیں کی تو یہ دکھ میرے دل میں کہاں سے پیدا ہو گیا ہے؟ میں نے اگر محبت نہیں کی تو میری زندگی کو یہ روگ کہاں سے چٹ گیا ہے؟ میں اداس کیوں رہتا ہوں۔۔۔۔ مجھے اپنے آپ کا ہوش کیوں نہیں ہے؟ میں روز بروز موم کی طرح کیوں پگھلا جا رہا ہوں؟“

بظاہر یہ تمام سوال وہ مجھ سے کر رہا تھا مگر دراصل وہ سب کچھ اپنے آپ ہی سے پوچھ رہا تھا۔

میں نے کہا ”میں نے جھوٹ بولا تھا کہ آپ کی زندگی میں ایسے کئی واقعات ہوں گے مگر آپ نے بھی تو جھوٹ بولا تھا کہ میں اداس نہیں ہوں اور مجھے کوئی روگ نہیں ہے۔۔۔ کسی کے دل کا حال جاننا آسان بات نہیں ہے۔ آپ کی اداسی کی اور بہت سی وجہیں ہو سکتی ہیں مگر جب تک مجھے آپ خود نہ بتائیں میں کسی نتیجے پر کیسے پہنچ سکتا ہوں۔۔۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ واقعی روز بروز کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ آپ کو یقیناً بہت بڑا صدمہ پہنچا ہے اور۔۔۔ اور۔۔۔ مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔“

”ہمدردی۔۔۔۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ”مجھے کسی کی ہمدردی کی ضرورت نہیں اس لیے کہ ہمدردی اسے واپس نہیں لاسکتی۔۔۔۔ اس عورت کو موت کی گہرائیوں سے نکال کر میرے حوالے نہیں کر سکتی جس سے مجھے پیار تھا۔۔۔ آپ نے محبت نہیں کی۔۔۔ مجھے یقین ہے آپ نے محبت نہیں کی اس لیے کہ اس کی ناکامی نے آپ پر کوئی داغ نہیں چھوڑا۔۔۔ میری طرف دیکھئے“

یہ کہہ کر اس نے خود اپنے آپ کو دیکھا ”کوئی جگہ آپ کو ایسی نہیں ملے گی جہاں میری محبت کے نقش موجود نہ ہوں۔۔۔ میرا وجود خود اس محبت کی ٹوٹی ہوئی عمارت کا ملبہ ہے۔۔۔ میں آپ کو یہ داستان کیسے سناؤں اور کیوں سناؤں جبکہ آپ اسے سمجھ ہی نہیں سکیں گے۔۔۔ کسی کا یہ کہہ دینا کہ میری ماں مر گئی ہے آپ کے دل پر وہ اثر پیدا نہیں کر سکتا جو موت نے بیٹے پر کیا تھا۔۔۔ میری داستان محبت آپ کو۔۔۔ کسی کو بھی بالکل معمولی معلوم ہوگی مگر مجھ پر جو اثر ہوا ہے اس سے کوئی بھی آگاہ نہیں ہو سکتا اس لیے کہ محبت میں نے کی ہے اور سب کچھ صرف مجھی پر گزرا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اس کے حلق میں تلخی پیدا ہو گئی تھی کیونکہ وہ بار بار جھوک نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”کیا وہ آپ کو دھوکا دے گئی“ میں نے اس سے پوچھا ”یا کچھ اور حالات تھے؟“

”دھوکا۔۔۔ وہ دھوکا دے ہی نہیں سکتی تھی۔ خدا کے لیے دھوکا نہ کہیے وہ عورت نہیں فرشتہ تھی مگر براہوا اس موت کو جو ہمیں خوش نہ دیکھ سکی اور اسے ہمیشہ کے لیے اپنے پروں میں سمیٹ کر لے گئی۔۔۔ آہ!۔۔۔ آپ نے میرے دل پر خراشیں پیدا کر دی ہیں۔۔۔ سینے۔۔۔ سینے۔۔۔ میں آپ کو اس دردناک داستان کا کچھ حصہ سنا تا ہوں۔۔۔ وہ ایک بڑے اور امیر گھرانے کی لڑکی تھی جس زمانے میں اس کی اور میری پہلی ملاقات ہوئی۔ میں اپنے باپ دادا کی ساری جائیداد عیاشیوں میں برباد کر چکا تھا۔ میرے پاس ایک کوڑی بھی نہیں تھی۔ اپنا

وطن چھوڑ کر میں لکھنؤ چلا آیا۔ اپنی موٹر چونکہ میرے پاس ہوا کرتی تھی اس لیے میں صرف موٹر چلانے کا کام جانتا تھا چنانچہ میں نے اسی کو اپنا پیشہ قرار دینے کا فیصلہ کیا پہلی ملازمت مجھے ڈپٹی صاحب کے یہاں ملی۔ جن کی وہ اکلوتی لڑکی تھی۔۔۔ یہ کہتے کہتے وہ اپنے خیالات میں کھو گیا اور دفعتاً چپ وہ گیا۔ میں بھی خاموش رہا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ جھونکا اور کہنے لگا ”میں کیا کہہ رہا تھا؟“

آپ ڈپٹی صاحب کے یہاں ملازم ہو گئے

”ہاں۔۔۔۔۔ وہ انہی ڈپٹی صاحب کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ہر روز صبح نو بجے میں زہرہ کو موٹر میں سکول لے جایا کرتا تھا وہ پردہ کرتی تھی مگر موٹر ڈرائیور سے کوئی کب تک چھپ سکتا ہے۔ میں نے اسے دوسرے روز ہی دیکھ لیا۔۔۔۔۔ وہ صرف خوبصورت ہی نہیں تھی بلکہ اس میں ایک خاص بات بھی تھی۔۔۔۔۔ بڑی سنجیدہ اور متین لڑکی تھی اس کی سیدھی مانگ نے اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کا وقار پیدا کر دیا تھا وہ۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ میں کیا عرض کروں وہ کیا تھی میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں اس کی صورت اور سیرت بیان کر سکوں۔“

بہت دیر تک وہ اپنی زہرہ کی خوبیاں بیان کرتا رہا اس دوران میں نے کئی مرتبہ اس کی تصویر کھینچنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خیالات اس کے دماغ میں ضرورت سے زیادہ جمع ہو گئے ہیں۔ کبھی کبھی بات کرتے کرتے اس کا چہرہ تہمتا اٹھتا لیکن پھر اسی چھا جاتی اور وہ آہوں میں گفتگو کرنا شروع کر دیتا۔ وہ اپنی داستان بہت آہستہ آہستہ سنارہا تھا جیسے خود بھی مزہ لے رہا ہو۔ ایک ایک ٹکڑا جوڑ کر اس نے اپنی ساری کہانی پوری کی۔ جس کا ماحصل یہ تھا۔

زہرہ سے اسے بے پناہ محبت ہو گئی کچھ دن تو موقع پا کر اس کا دیدار کرنے اور طرح طرح کے منصوبے باندھنے میں گزر گئے۔ مگر جب اس نے سنجیدگی سے اس محبت پر غور کیا تو خود کو زہرہ سے بہت دور پایا ایک موٹر ڈرائیور اپنے آقا کی لڑکی سے محبت کیسے کر سکتا ہے؟ چنانچہ جب اس تلخ حقیقت کا احساس اس کے دل میں پیدا ہوا تو وہ مغموم رہنے لگا لیکن ایک روز اس نے بڑی جرأت سے کام لیا کانڈ کے ایک پرزے پر اس نے زہرہ کو چند سطر لکھیں۔۔۔۔۔ یہ سطر مجھے یاد ہیں۔

”زہرہ! میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں تمہارا نوکر ہوں تمہارے والد صاحب مجھے تمیں روپے ماہوار دیتے ہیں مگر میں تم سے محبت کرتا ہوں۔۔۔۔۔ میں کیا کروں، کیا نہ کرو، میری سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔۔۔“

یہ سطر کانڈ پر لکھ کر اس نے کانڈ اس کی ایک کتاب میں رکھ دیا دوسرے روز جب وہ اسے موٹر میں سکول لے گیا تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے ہینڈل کئی بار اس کی گرفت سے نکل نکل گیا مگر خدا کا شکر ہے کہ کوئی ایکسیڈنٹ نہ ہوا۔ اس روز اس کی کیفیت عجیب رہی شام کو جب وہ زہرہ کو سکول سے واپس لایا ہاتھ اتارے راستے میں اس لڑکی نے موٹر روکنے کے لیے کہا اس نے جب موٹر روک لی تو زہرہ نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہا ”دیکھو نعیم آئندہ تم ایسی حرکت کبھی نہ کرنا میں نے ابھی تک لبا جی سے تمہارے اس خط کا ذکر نہیں کیا جو تم نے میری کتاب میں رکھ دیا تھا لیکن اگر پھر تم نے ایسی حرکت کی تو مجبوراً ان سے شکایت کرنا پڑے گی۔“

”مجھے۔۔۔۔۔ چلو اب موٹر چلاؤ۔“

اس گفتگو کے بعد اس نے بہت کوشش کی کہ ڈپٹی صاحب کی نوکری چھوڑ دے اور زہرہ کی محبت کو اپنے دل سے ہمیشہ کے لیے منادے مگر وہ کامیاب نہ ہو سکا ایک مہینہ اسی کشمکش میں گزر گیا۔ ایک روز اس نے پھر جرأت سے کام لے کر خط لکھا اور زہرہ کی ایک کتاب میں رکھ کر اپنی قسمت کے فیصلے کا انتظار کرنے لگا اسے یقین تھا کہ دوسرے روز صبح کو اسے نوکری سے برطرف کر دیا جائے گا مگر ایسا نہ ہوا شام کو سکول سے واپس آتے ہوئے زہرہ اس سے ہم کلام ہوئی اور ایک بار پھر اس کو ایسی حرکتوں سے باز رہنے کے لیے کہا ”اگر تمہیں اپنی عزت کا خیال نہیں تو کم از کم میری عزت کا تو کچھ خیال تمہیں ہونا چاہیے۔“ یہ اس نے ایک بار پھر اسے کچھ اس سنجیدگی اور متانت سے کہا کہ نعیم کی ساری امیدیں فنا ہو گئیں اور اس نے قصد کر لیا کہ وہ نوکری چھوڑ دے گا اور لکھنؤ سے ہمیشہ کے لیے چلا جائے گا مہینے کے اخیر میں نوکری چھوڑنے سے پہلے اس نے اپنی کوٹھڑی میں لائٹن کی مدھم روشنی میں زہرہ کو آخری خط لکھا اس میں اس نے نہایت درد بھرے لہجے میں اس سے کہا ”زہرہ! میں نے بہت کوشش کی کہ میں تمہارے کپے پر عمل کر سکوں مگر دل پر میرا اختیار نہیں ہے یہ میرا آخری خط ہے، کل شام کو میں لکھنؤ چھوڑ دوں گا اس لیے تمہیں اپنے والد سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ تمہاری خاموشی میری قسمت کا فیصلہ کر دے گی مگر یہ خیال نہ کرنا کہ تم سے دور رہ کر تم سے محبت نہیں کروں گا میں جہاں کہیں بھی رہوں گا میرا دل تمہارے قدموں میں رہے گا میں ہمیشہ ان دنوں کو یاد کرتا رہوں گا جب میں موٹر اس لیے آہستہ آہستہ چلاتا تھا کہ تمہیں دھکا نہ

لگے۔۔۔۔۔ میں اس کے سوا اور تمہارے لیے کر ہی کیا سکتا تھا۔۔۔۔۔“

یہ خط بھی اس نے موقع پا کر اس کی کتاب میں رکھ دیا صبح کو زہرہ نے سکول جاتے ہوئے اس سے کوئی بات نہ کی اور شام کو بھی راستے میں اس نے کچھ نہ کہا چنانچہ وہ بالکل ناامید ہو کر اپنی کوٹھڑی میں چلا آیا جو تھوڑا بہت اسباب اس کے پاس تھا باندھ کر اس نے ایک طرف رکھ دیا اور لائین کی اندھی روشنی میں چارپائی پر بیٹھ کر سو پنے لگا کہ زہرہ اور اس کے درمیان کتنا بڑا فاصلہ ہے۔

وہ بے حد مغموم تھا اپنی پوزیشن سے اچھی طرح واقف تھا اسے اس بات کا احساس تھا کہ وہ ایک ادنیٰ درجے کا ملازم ہے اور اپنے آقا کی لڑکی سے محبت کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتا لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی سوچتا تھا کہ اگر وہ اس سے محبت کرتا ہے تو اس میں اس کا کیا قصور ہے اور پھر اس کی محبت فریب تو نہیں وہ اسی اوہیل بن میں تھا کہ آدھی رات کے قریب اس کی کوٹھڑی کے دروازے پر دستک ہوئی اس کا دل دھک سے رہ گیا لیکن پھر اس نے خیال کیا کہ مانی ہوگا ممکن ہے اس کے گھر میں کوئی ایسا ایکی بیمار پڑ گیا ہو اور وہ اس سے مدد لینے کے لیے آیا ہو لیکن جب اس نے دروازہ کھولا تو زہرہ سامنے کھڑی تھی۔۔۔۔۔ جی ہاں زہرہ۔۔۔۔۔ دسمبر کی سردی میں شال کے بغیر وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی زبان لنگ ہو گئی اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، کیا کہے چند لمحات قبر کی سی خاموشی میں گزر گئے آخر زہرہ کے ہونٹ ہلکے اور تھر تھراتے ہوئے لہجے میں اس نے کہا ”نعیم میں تمہارے پاس آگئی ہوں بتاؤ اب تم کیا چاہتے ہو۔۔۔۔۔ لیکن اس سے پہلے کہ تمہاری اس کوٹھڑی میں داخل ہوں میں تم سے چند سوال کرنا چاہتی ہوں۔“

نعیم خاموش رہا لیکن زہرہ اس سے پوچھنے لگی ”کیا واقعی تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟“

نعیم کو جیسے تھیس سی لگی اس کا چہرہ تہمتا اٹھا ”زہرہ تم نے ایسا سوال کیا ہے جس کا جواب اگر میں دوں تو میری محبت کی توہین ہوگی۔۔۔ میں تم سے پوچھتا ہوں، کیا میں محبت نہیں کرتا؟“

زہرہ نے اس سوال کا جواب نہ دیا اور تھوڑی دیر خاموش رہ کر اپنا دوسرا سوال کیا

”میرے باپ کے پاس کافی دولت ہے مگر میرے پاس ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں جو کچھ میرا کہا جاتا ہے میرا نہیں، ان کا ہے۔ کیا تم مجھے دولت کے بغیر بھی دیرا ہی عزیز سمجھو گے؟“

نعیم بہت جذباتی آدمی تھا چنانچہ اس سوال نے بھی اس کے وقار کو زخمی کیا بڑے دکھ بھرے لہجے میں اس نے زہرہ سے کہا ”زہرہ خدا کے لیے مجھ سے ایسی باتیں نہ پوچھو جن کا جواب اس قدر عام ہو چکا ہے کہ تمہیں تھرڈ کلاس عشقیہ ماحولوں میں بھی مل سکتا ہے“

زہرہ اس کی کوٹھڑی میں داخل ہو گئی اور اس کی چار پائی پر بیٹھ کر کہنے لگی ”میں تمہاری ہوں اور ہمیشہ تمہاری رہوں گی“

زہرہ نے اپنا قول پورا کیا جب دونوں لکھنؤ چھوڑ کر دہلی چلے آئے اور شادی کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہنے لگے تو ڈپٹی صاحب ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہاں پہنچ گئے نعیم کو نوکری مل گئی تھی اس لیے وہ گھر میں نہیں تھا ڈپٹی صاحب نے

زہرہ کو بہت برا بھلا کہا ان کی ساری عزت خاک میں مل گئی تھی وہ چاہتے تھے کہ زہرہ نعیم کو چھوڑ دے اور جو کچھ ہو چکا ہے اسے بھول جائے وہ نعیم کو دو تین ہزار روپیہ دینے کے لیے بھی تیار تھے مگر انہیں ناکام لوٹنا پڑا۔ اس لیے کہ زہرہ نعیم کو کسی قیمت پر بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہوئی اس نے اپنے باپ سے کہا ”اباجی! میں نعیم کے ساتھ بہت خوش ہوں آپ اس سے اچھا شوہر میرے لیے کبھی تلاش نہ کر سکتے ہیں اور وہ آپ سے کچھ نہیں مانگتے اگر آپ ہمیں دعائیں دے سکیں تو ہم آپ کے ممنون ہوں گے۔“

ڈپٹی صاحب نے جب یہ گفتگو سنی تو بہت خشم آلود ہوئے انہوں نے نعیم کو قید کر دینے کی دھمکی بھی دی مگر زہرہ نے صاف صاف کہہ دیا ”اباجی! اس میں نعیم کا کیا قصور ہے سچ تو یہ ہے کہ ہم دونوں بے قصور ہیں البتہ ہم ایک دوسرے سے محبت ضرور کرتے ہیں اور وہ میرا شوہر ہے۔۔۔۔۔ یہ کوئی قصور نہیں ہے میں نابالغ نہیں ہوں“

ڈپٹی صاحب عقلمند تھے فوراً سمجھ گئے کہ جب ان کی بیٹی ہی رضامند ہے تو نعیم پر کیسے جرم عائد ہو سکتا ہے چنانچہ وہ زہرہ کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلے گئے کچھ عرصے کے بعد ڈپٹی صاحب نے مختلف لوگوں کے ذریعے نعیم پر دباؤ ڈالنے اور اس کو روپے پیسے سے لالچ دینے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔

دونوں کی زندگی بڑے مزے میں گزر رہی تھی گو نعیم کی آمدن بہت ہی کم تھی اور زہرہ کو جو ناز و نعمت میں پلٹی تھی بدن پر کھر دے کپڑے پہننے پڑتے تھے اور اپنے ہاتھ سے سب کام کرنے پڑتے تھے مگر وہ خوش تھی اور خود کو ایک نئی دنیا میں

پاتی تھی جہاں قدم قدم پر نعیم کی محبت کے نئے نئے پہلو اس پر منکشف ہوتے تھے وہ بہت سکھی تھی۔۔۔۔ بہت سکھی، نعیم بھی بہت خوش تھا لیکن ایک روز خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ زہرہ کے سینے میں ایک موذی درد اٹھا اور پیشتر اس کے کہ نعیم اس کے لیے کچھ کر سکے وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئی اور نعیم کی دنیا ہمیشہ کے لیے تاریک کر گئی۔

یہ داستان اس نے رک کر اور خوب مزے لے لے کر قریب چار گھنٹوں میں سنائی۔ جب وہ اپنا حال دل سنا چکا تو اس کا چہرہ بجائے زرد ہونے کے متمنا اٹھا جیسے اس کے اندر آہستہ آہستہ کسی نے خون داخل کر دیا ہے لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اس کا حلق سوکھ گیا تھا۔

داستان جب ختم ہو گئی تو وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا، جیسے اسے بہت جلدی ہے اور کہنے لگا ”میں نے بہت غلطی کی۔۔۔ جو آپ کی اپنی داستان محبت سنا دی۔۔۔ میں نے بہت غلطی کی۔۔۔ زہرہ کا ذکر صرف مجھی تک محدود رہنا چاہیے تھا۔۔۔ لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔“ اس کی آواز بھر ا گئی۔۔۔ ”میں زندہ ہوں اور وہ۔۔۔ وہ۔۔۔“ اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا اور جلدی سے میرا ہاتھ دبا کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

نعیم سے پھر میری ملاقات نہ ہوئی پولو بندر پر کئی مرتبہ اس کی تلاش میں گیا مگر وہ نہ ملا چہ یا سات مہینے کے بعد اس کا ایک خط مجھے ملا جو میں یہاں پر نقل کر رہا ہوں۔

”۔۔۔ صاحب!“

زہرہ فسانہ نہ ہی مگر میں تو فسانہ ہوں وہ مرچکی ہے، اس لیے مجھے بھی مر جانا چاہیے یہ خط آپ کو میری موت کے بعد ملے گا۔۔۔ الوداع۔۔۔ زہرہ مجھے ضرور ملے گی۔۔۔ کہاں؟۔۔۔ یہ مجھے معلوم نہیں

میں نے یہ چند سطور صرف اس لیے آپ کو لکھ دی ہیں کہ آپ افسانہ نگار ہیں
اگر اس سے آپ افسانہ تیار کر لیں تو آپ کو سات آنٹھ روپے مل جائیں گے کیونکہ
ایک مرتبہ آپ نے کہا تھا کہ افسانے کا معاوضہ آپ ایک سات سے دس روپے
تک مل جایا کرتا ہے یہ میرا تحفہ ہوگا اچھا الوداع۔

آپ کا ”ماقاتی نعیم“

نعیم نے اپنے لیے زہرہ بنائی اور مر گیا۔۔۔ میں نے اپنے لیے یہ افسانہ تخلیق
کیا ہے اور زندہ ہوں۔۔۔۔۔ یہ میری زیادتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆

باسط

باسط بالکل رضامند نہیں تھا لیکن ماں کے سامنے اس کی کوئی پیش نہ چلی اول
اول تو اس کو اتنی جلدی شادی کرنے کی خواہش نہیں تھی اس کے علاوہ وہ لڑکی بھی
اسے پسند نہیں تھی جس سے اس کی ماں اس کی شادی کرنے پر تلی ہوئی تھی وہ بہت
دیر تک مالتا رہا۔ جتنے بہانے بنا سکتا تھا اس نے بنائے، لیکن آخر ایک روز اس کو
ماں کی اٹل خواہش کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہی پڑا اور اصل افکار کرتے کرتے وہ
بھی تنگ آ گیا تھا چنانچہ اس نے دل میں سوچا ”یہ بک بک ختم ہی ہو جائے تو اچھا
ہے، ہونے دو شادی، کوئی قیامت تو نہیں ٹوٹ پڑے گی۔۔۔۔۔ میں بھالوں
گا۔“

اس کی ماں بہت خوش ہوئی لڑکی والے اس کے عزیز تھے اور وہ عرصہ ہوا ان کو
زبان دے چکی تھی جب باسط نے ہاں کی تو وہ تاریخ چکی کرنے کے لیے لڑکی
والوں کے ہاں گئی انہوں نے مال منول کی تو باسط کی ماں کو بہت غصہ آیا ”سعیدہ
کی ماں! میں نے اتنی مشکلوں سے باسط کو رضامند کیا ہے، اب تم تاریخ چکی نہیں کر
رہی ہو شادی ہوگی تو اسی مہینے کی بیس کو ہوگی نہیں تو نہیں ہوگی اور یہ بات سولہ آنے
چکی ہے سمجھ لیا۔“

دھمکی نے کام کیا لڑکی کی ماں بالآخر راضی ہو گئی سب تیاریاں مکمل ہوئیں بیس
کو دہن گھر میں تھی باسط کو گو وہ پسند نہیں تھی، لیکن وہ اس کے ساتھ بھانے کا فیصلہ کر
چکا تھا، چنانچہ وہ اس سے بڑی محبت سے پیش آیا۔ اس پر بالکل ظاہر نہ ہونے دیا

کہ وہ اس سے شادی کرنے کے لیے تیار نہیں تھا اور یہ کہ وہ زبردستی اس کے سر منڈھ دی گئی ہے۔

نئی دہائیں عام طور پر بہت شرمیلی ہوتی ہیں لیکن باسط نے محسوس کیا کہ سعیدہ ضرورت سے زیادہ شرمیلی ہے۔ اس کے اس شرمیلے پن میں کچھ خوف بھی تھا جیسے وہ باسط سے ڈرتی ہے شروع شروع میں باسط نے سوچا کہ یہ چیز دور ہو جائے گی مگر وہ بڑھتی ہی گئی۔ باسط نے اس کو چند روز کے لیے میکے بھیج دیا واپس آئی تو اس کا خوف آلود شرمیلا پن ایک حد تک دور ہو چکا تھا باسط نے سوچا ایک دو مرتبہ اور میکے جائے گی تو ٹھیک ہو جائے گی مگر اس کا یہ قیاس غلط نکلا! سعیدہ پھر خوف زدہ رہنے لگی۔

باسط نے ایک روز اس سے پوچھا ”سعیدہ تم ڈی ڈری کیوں رہتی ہو؟“
سعیدہ یہ سن کر چونکی ”نہیں تو۔۔۔۔۔ نہیں تو۔۔۔۔۔“

باسط نے اس سے بڑے پیار بھرے لہجے میں کہا ”آخر بات کیا ہے۔۔۔۔۔ خدا کی قسم مجھے بڑی الجھن ہوتی ہے۔۔۔۔۔ کس بات کا ڈر ہے تمہیں۔۔۔۔۔ میری ماں اتنی اچھی ہے وہ تم سے ساسوں کا سا سلوک نہیں کرتی میں تم سے اتنی محبت کرتا ہوں۔۔۔۔۔ پھر تم ایسی صورت کیوں بنائے رکھتی ہو کہ معلوم ہوتا ہے تمہیں یہ خوف ہے کہ کوئی تمہیں پیٹے گا“ یہ کہہ کر اس نے سعیدہ کا منہ چوما۔ سعیدہ خاموش رہی اس کی آنکھیں البتہ اور زیادہ خوف زدہ ہو گئیں باسط نے اس کو اور پیار کیا اور کہا ”تمہیں ہر وقت ہنستی رہنا چاہیے۔۔۔۔۔ لو اب ذرا ہنسو۔۔۔۔۔ ہنسو میری جان!“

سعیدہ نے ہنسنے کی کوشش کی باسط نے پیار سے اس کو تھپکی دی ”
 شاباش۔۔۔۔۔ اسی طرح مسکراتا چہرہ ہوتا چاہیے بروقت!“
 باسط کی یہ محبت ظاہر ہے کہ بالکل مصنوعی تھی، کیونکہ سعیدہ کے لیے اس کے
 دل میں کوئی جگہ نہیں تھی لیکن وہ صرف اپنی ماں کی خاطر چاہتا تھا کہ سعیدہ سے اس
 کا رشتہ نامکام ثابت نہ ہو اس کی ماں اپنی شکست کبھی برداشت نہ کر سکتی اس نے
 اپنی زندگی میں شکست کا منہ دیکھا ہی نہیں تھا اس لیے باسط کی انتہائی کوشش یہی تھی
 کہ سعیدہ سے اس کی نبھ جائے، چنانچہ اپنے دل میں سعیدہ کے لیے اس نے
 بڑے خلوص کے ساتھ مصنوعی محبت پیدا کر لی تھی۔

اس کی ہر آسائش کا خیال رکھتا تھا اپنی ماں سے سعیدہ کی چھوٹی سی بات کی بھی
 تعریف کرتا تھا جب وہ یہ محسوس کرتا کہ اس کی ماں بہت مطمئن ہے، اس بات سے
 مطمئن ہے کہ اس نے باسط کا رشتہ ٹھیک جگہ کیا ہے تو اس کو دلی خوشی ہوتی۔

شادی کو ایک مہینہ ہو گیا اس دوران میں سعیدہ کئی مرتبہ میکے گئی باسط کو اس پر
 کوئی اعتراض نہیں تھا وہ سمجھتا تھا کہ یوں اس کا خوف آلودہ شرمیلا پن دور ہو جائے
 گا مگر ایسا نہ ہوا یہ دن بدون بڑھتا پلا جا رہا تھا اب تو سعیدہ وحشت زدہ دکھائی دیتی
 تھی باسط حیران تھا کہ بات کیا ہے اس کے بارے میں اس نے ماں سے کوئی بات
 نہ کی اس لیے کہ اسے یقین تھا کہ وہ اس کو ڈانٹ پلاتیں ”بکواس نہ کرو مجھے معلوم
 تھا تم ضرور ایک روز اس میں کیڑے ڈالو گے۔“

باسط نے سعیدہ ہی سے کہا ”میری جان! تم مجھے بتاتی کیوں نہیں ہو“
 سعیدہ چونک اٹھی ”جی؟“

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

باسط کی ماں آگئی باسط نے اس سے کہا ”امی جان! دیکھئے سعیدہ ضد کر رہی ہے طبیعت اس کی ٹھیک نہیں، کہتی ہے مجھے امی جان کے پاس لے چلو۔“
 باسط کی ماں نے بڑی بے پروائی سے کہا ”کل چلی جانا سعیدہ!“
 سعیدہ نے اور کچھ نہ کہا خاموش ہو کر باہر صحن میں چلی گئی تھوڑی دیر کے بعد باسط باہر نکلا۔ سعیدہ صحن میں نہیں تھی اس نے ادھر ادھر تلاش کیا مگر وہ نہ ملی باسط نے سوچا اور پر کو غصے پر ہوگی اور پر گیا تو غسل خانے کا دروازہ بند تھا کھٹکنا کر اس نے آواز دی ”سعیدہ!“

کوئی جواب نہ ملا تو پھر پکارا ”سعیدہ!“
 اندر سے بڑی نحیف آواز آئی ”جی!“
 باسط نے پوچھا ”کیا کر رہی ہو“
 اور زیادہ نحیف آواز آئی ”نہا رہی ہوں“

باسط نیچے آگیا سعیدہ کے بارے میں سوچتا سوچتا باہر گلی میں بکااموری کی طرف نظر پڑی تو اس میں خون ہی خون تھا اور یہ خون اس غسل خانے سے آرہا تھا جس میں سعیدہ نہا رہی تھی باسط کے ذہن میں تلے اوپر کئی خیالات اوندھے سیدھے گرے پھر یہ گردان شروع ہو گئی ”دوا۔۔۔۔۔خون۔۔۔۔۔خون۔۔۔۔۔“

دوا۔۔۔۔۔ڈر۔۔۔۔۔دوا۔۔۔۔۔خون۔۔۔۔۔ڈر۔۔۔۔۔“
 پھر اس نے آہستہ آہستہ سوچنا شروع کیا۔ سعیدہ کی ماں شادی کی تاریخ چکی نہیں کرتی تھی اس نے کہا تھا ایک دو مہینے ٹھہر جاؤ۔۔۔ سعیدہ کا بار بار اپنی ماں سے ملنے جانا۔۔۔ اس کا ہر وقت خوفزدہ رہنا دوا کھانا اور خاص طور پر آج بہت

ہی زیادہ وحشت زدہ رہنا۔

باسط سارا معاملہ سمجھ گیا۔ سعیدہ پیٹ سے تھی جب وہ دلہن بن کر اس کے پاس آئی تھی اس کی ماں کی یہ کوشش تھی کہ حمل گر جائے چنانچہ آج وہ چیز ہو گئی باسط نے سوچا ”کیا میں اوپر جاؤں جا کر سعیدہ کو دیکھوں۔۔۔۔۔ اپنی ماں سے بات کروں“ ماں کا سوچا تو اس کو خیال آیا کہ وہ یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکے گی وہ اپنے بیٹے کی آنکھوں میں ذلیل ہونا کبھی گوارا نہیں کرے گی ضرور کچھ کھا کر مر جائے گی وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا اپنے کمرے میں گیا اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

کئی بار اس کو سعیدہ کا خیال آیا کہ وہ خدا معلوم کس حالت میں ہوگی اس کے جسم پر اس کے دل و دماغ پر کیا کچھ بیتا ہوگا اور کیا بیت رہا ہوگا کیسے اتنا بڑا راز چھپائے گی کیا لوگ پہچان نہیں جائیں گے جوں جوں وہ سعیدہ کے بارے میں سوچتا اس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ بڑھتا جاتا اس کو سعیدہ پر ترس آنے لگا ”بے چاری معلوم نہیں بے ہوش پڑی ہے یا ہوش میں ہے ہوش میں بھی اس پر جانے کیا گزری ہوگی کیا وہ نیچے آ سکے گی؟“

تھوڑی دیر کے بعد وہ اٹھ کر صحن میں گیا تو سعیدہ نیچے آئی اس کا رنگ بے حد زرد تھا اتنا زرد کہ وہ بالکل مردہ معلوم ہوتی تھی اس سے بمشکل پٹا جاتا تھا۔ ناک میں لڑکھڑاہی تھیں کمر میں جیسے جان ہی نہیں تھی باسط نے اس کو دیکھا تو اس پر بہت ترس آیا اندر سے برق اٹھایا اور اس سے کہا ”چلو میں تمہیں چھوڑ آؤں۔“

سعیدہ نے بہت ہمت سے کام لیا باسط کے ساتھ چل کر باہر سڑک تک گئی باسط نے تانگہ لیا اور اس کو اس کی ماں کے پاس چھوڑ آیا ماں نے اس سے پوچھا ”

سعیدہ کہاں ہے؟“

باسط نے جواب دیا ”خند کرتی تھی میں اسے چھوڑ آیا ہوں“
 باسط کی ماں نے اس کو ڈانٹا ”یکو اس کرتے ہو خند کرنے دی ہوتی تم اسی
 طرح اس کی عادتیں خراب کرو گے اور پھر مجھ سے کہو گے کہ میں نے غلط جگہ تمہارا
 رشتہ کیا تھا۔“

باسط نے کہا ”نہیں امی جان! سعیدہ بڑی اچھی لڑکی ہے“
 اس کی ماں مسکرائی ”میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ وہ بہت نیک لڑکی ہے تم
 اسے ضرور پسند کرو گے“ پھر تھوڑی دیر چھالیا کانٹے کے بعد ایک دم باسط سے
 مخاطب ہوئی ”اور ہاں باسط یہ اوپر غسل خانے میں خون کیساتھا“
 باسط شہنا گیا ”وہ۔۔۔۔۔ کچھ نہیں امی جان! میری نکیر پھوٹی تھی“
 ماں نے بڑے غصے کے ساتھ کہا ”کم بخت گرم چیزیں نہ کھلایا
 کرو۔۔۔۔۔ جب دیکھو جبین موندگ پھلی سے بھری ہیں۔“

باسط کچھ دیر اپنی ماں کے ساتھ باتیں کرتا رہا وہ اٹھ کر کہیں گئی تو باسط اوپر غسل
 خانے میں گیا پانی ڈال کر اس کو اچھی طرح صاف کیا اس کے دل کو اس بات کا بڑا
 اطمینان تھا کہ اس نے اپنی ماں سے سعیدہ کے متعلق کوئی بات نہیں کی اور نہ اس
 نے سعیدہ پر یہ ظاہر ہونے دیا کہ وہ اس کا راز جانتا ہے۔

وہ دل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ سعیدہ کا راز ہمیشہ اس کے سینے میں دفن رہے گا وہ
 کافی تکلیف اٹھا چکی تھی باسط کے خیال کے مطابق اس کو اپنے کیے کی سزا مل چکی
 تھی مزید سزا دینے کا کوئی فائدہ نہیں ”خدا کرے وہ جلد تندرست ہو جائے اب

اس کے چہرے پر وہ الجھن پیدا کرنے والا خوف نہیں رہے گا، وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ نیچے سے اس کی ماں کی چیخ کی آواز آئی باسط لوٹا رکھ کر دوڑا نیچے گیا سب کمرے دیکھے ڈیوڑھی میں گیا تو اس کی ماں فرش پر اونڈھی پڑی تھی، مردہ اس کے سامنے کوڑے والے لکڑی کے بکس میں ایک چھوٹا بہت ہی چھوٹا سا مکمل بچہ کپڑے میں لپیٹا پڑا تھا۔

باسط کو بے حد صدمہ ہوا اس نے پہلے اس بچے کو اٹھایا کپڑے میں اچھی طرح لپیٹا اور اندر جا کر بوٹ کے خالی ڈبے میں بند کر دیا پھر ماں کو اٹھا کر اندر چارپائی پر لٹایا اور اس کے سر ہانے بیٹھ کر دیر تک رہتا رہا۔

سعیدہ کو اطلاع پہنچی تو اس کو اپنی ماں کے ساتھ آتا پڑا وہ اسی طرح زرد تھی پہلے سے زیادہ مڈھال باسط کو بہت ترس آیا اس سے کہا ”سعیدہ جو اللہ کو منظور تھا ہو گیا۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں رونا بند کرو اور جاؤ اندر لیٹ جاؤ“

اندر جانے کے بجائے سعیدہ ڈیوڑھی میں گئی جب واپس آئی تو اس کا چہرہ بلدی کی طرح زرد تھا باسط خاموش رہا سعیدہ نے اس کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں آنسو تھے یہ آنسو صاف بتا رہے تھے کہ وہ باسط کا شکریہ ادا کر رہی ہے۔۔۔ باسط نے اس سے بڑے پیار سے کہا ”زیادہ رونا اچھا نہیں سعیدہ! جو خدا کو منظور تھا ہو گیا“

دوسرے روز اس نے بچے کو نہر کے کنارے گڑھا کھود کر دفن دیا۔

29 جولائی 1950ء

☆☆☆☆☆☆

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

میں ہمارے گھر میں وہ کجری جو اوپلے لے کر آتی تھی، تیر کی طرح سیدھی تھی اس کی عمر بھی اتنی ہی ہو گی جتنی اس بھنگن کی تھی۔۔۔۔۔ مگر وہ تین برس کے بعد بھی ویسی ہی جوان تھی۔۔۔۔۔ سر و قد۔۔۔۔۔ اوپلوں کا نوکرا اس کے سر پر ہوتا تھا۔۔۔۔۔ ایک پہاڑ سا بنا ہوا مگر مجال ہے کہ اس کی گردن میں ہلکی سی جنبش آ جائے یا اس کی کمر میں خفیف سا خم آ جائے۔۔۔۔۔ تین برس وہ ہمارے یہاں آتی رہی۔ اس کے بعد اس کی شادی ہو گئی۔۔۔۔۔ اس کے یکے بعد دیگرے تین لڑکے پیدا ہوئے۔۔۔۔۔ اور مجید، میں خدا کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ اس کی کمر ویسی کی ویسی مضبوط تھی۔۔۔۔۔ تم میری مان لو کہ بھنگنیں گوجریوں کا مقابلہ کسی صورت بھی نہیں کر سکتیں“

مجید تلملارہا تھا اس نے پان کی گھوری چند نیا سے نکال کر اپنے کتلے میں دبائی چھوی ڈبیا سے ماچس کی تیلی کی مدد سے تھوڑا سا قوام نکالا اور منہ میں ڈال کر بڑے قہل سے کہا ”رشید بھائی۔۔۔۔۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔۔۔۔۔ لیکن جس بھنگن کا تصور میرے دماغ میں ہے اور جس کی دراصل میں بات کرنا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ اس کی گردن کو امرتسر کی کوئی کجری نہیں پہنچ سکتی۔۔۔۔۔ وہ ایک قیامت تھی۔۔۔۔۔ ایک فتنہ تھی۔۔۔۔۔ اب تم ایسا کرو کہ میری ساری داستان سن لو تا کہ تمہیں اس فتنہ و قیامت کے متعلق کچھ معلوم ہو سکے۔۔۔۔۔ جو بن ڈھلنے کی تم جو بات کرتے ہو اس کو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کجریوں کا قد لمبا ہوتا ہے قدرتی طور پر انہیں جلدی ڈھلنا چاہیے، مگر ایسا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ وہ ننگے پاؤں رہتی ہیں اور اپنے سر پر بقول تمہارے پہاڑ سا اوپلوں کا نوکرا اٹھائے اٹھائے پھرتی ہیں۔۔۔۔۔ لیکن لعنت

بھینجی جونی الحال کجریوں پر، کیونکہ مجھے بچنی کی بات کرنا ہے جو ہمارے محلے کی بڑی کراری بھنگن تھی۔۔۔ اس کا قد تو انگشتانہ بھر کا تھا مگر زبان اسکندری گرتھی شادی شدہ تھی، مگر خاوند سے ہر روز لڑتی جھگڑتی رہتی تھی۔ ہمارے کمپاؤنڈ میں یہ دونوں میاں بیوی ہر روز صبح سویرے آتے اور ایک بڑے درخت کے ساتھ جھولا لٹکا دیتے اس میں وہ اپنا لڑکا ڈال دیتے تھے مگر مصیبت یہ تھی کہ اس کو جھلانے والا اور کوئی نہیں تھا، چنانچہ دونوں میاں بیوی جھاڑو چھوڑ کر اسے جھولا جھلاتے یا گود میں اٹھائے پھرتے تھے۔“

رشید نے مجید سے کہا ”یہ جھولے کی بات کہاں سے آگئی۔۔۔۔۔ تم تو ایک کراری بھنگن کی بات کر رہے تھے۔۔۔۔۔ جو بقول تمہارے بہت خوبصورت تھی۔“

مجید نے فوراً کہا ”یا تم جھولے کے ساتھ کیوں انک گئے۔۔۔۔۔ میری پوری کہانی تو سن لو۔۔۔۔۔ یہ جھولے کی نہیں بچنی کی ہے۔۔۔ اس بچنی کی جسے میں ساری عمر فراموش نہیں کر سکتا۔۔۔ وہ ایک آفت تھی۔۔۔ صبح اپنے خاوند کے ساتھ آتی تھی۔۔۔ ہاتھ میں لمبی سی جھاڑو لیے۔۔۔۔۔ ماتھے پر سینکڑوں تیوریاں۔۔۔۔۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ابھی جھاڑو آپ کے سر پر دے مارے گی۔۔۔۔۔ مگر ایسا موقع کبھی نہیں آیا۔۔۔۔۔ میں نے ہزاروں بار اس کو گھورا، لیکن اس نے میرے سر پر جھاڑو نہیں ماری۔۔۔ اس کی تیوریاں اس کے ماتھے پر بدستور قائم رہیں اور وہ حسب سابق اپنا کام کرتی رہی۔ اس کا خاوند جس کا نام معلوم نہیں کیا تھا، اول درجے کا زن مرید تھا۔ اس کا قد اپنی بیوی سے بھی چھوٹا

میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی نام اس کا بچنی تھا۔۔۔۔۔ یعنی بچن سے تعلق رکھتا تھا۔ مگر وہ تو پچھا پچھا کلنی تھی۔۔۔۔۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ اس کو اپنے قبضے میں لے آؤں، پر نام کا مریبا وہ چٹے پر ہاتھ ہی نہیں دھرنے دیتی تھی۔“

یہ سن کر رشید بولا ”تم یا رہمیشہ ایسے معاملوں میں کورے رہے ہو“
مجید کے گہری چوٹ لگی ”کو اس کرتے ہو۔۔۔۔۔ میں نے ایک روز اسے پکڑ لیا۔۔۔۔۔ میرے گھر کے باہر وہ جھاڑو دے رہی تھی کہ میں نے اس کا بازو پکڑ لیا اور اپنے ساتھ چمٹا لیا۔“

”پھر کیا ہوا؟“ رشید نے ازراہ مذاق سگریٹ ساگایا اور ماچس کی تیلی بجھا کر اس کے کئی ٹکڑے کر کے ایش ٹرے میں ڈال دیئے۔

مجید کو ایسا معلوم ہوا، کہ رشید نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں، بہت جڑ بڑ ہوا لیکن آدمی سچا تھا اس لیے جھوٹ نہ بول سکا ”یا رشید! تم مذاق اڑاتے ہو۔۔۔۔۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جو کچھ اس روز ہوا، اس کا مذاق اڑانا ہی چاہیے۔۔۔۔۔ میں نے اسے اپنے ساتھ بھیج لیا۔۔۔۔۔ لیکن اس حرامزادی نے کھینچ کے اپنی جھاڑو میرے منہ پر دے ماری۔ میں شرم کے مارے اندر بھاگ گیا۔۔۔۔۔ لیکن فوراً باہر نکلا۔۔۔۔۔ دیکھا کہ وہ میرے مکان کے باہر جھاڑو دے رہی ہے۔۔۔۔۔ میں نے اسے پھر پکڑا۔۔۔۔۔ اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔۔۔۔۔ میں نے سوچا۔۔۔۔۔“

رشید نے مجید کا فقرہ مکمل کر دیا ”کہ معاملہ درست ہو گیا ہے“
مجید بوکھلا گیا ”خاک درست ہوا۔۔۔۔۔ وہ میری گرفت سے نکل کر سیدھی

میری بیوی کے پاس چلی گئی۔۔۔۔۔ لیکن اس سے کوئی شکایت نہ کی۔۔۔۔۔ میں ڈر کے مارے دہکا ہوا تھا۔۔۔۔۔ میں نے صرف یہ سنا، اور میری جان کا بوجھ ہلکا ہوا۔۔۔۔۔ ”بی بی جی، آج بھی پانی نہیں آیا۔۔۔۔۔ یہ ان لوگوں کو جو آپ سے ہر مہینے دس روپے وصول کرتے ہیں، کیا ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ کیوں وہ اتنا خیال نہیں کرتے کہ آپ کو ہر روز ماشکی کو دس مشکوں کے چار آنے فی مشک کے حساب سے دو روپے آٹھ آنے دینا پڑیں۔۔۔۔۔ میں نے خدا کا اٹھ اٹھ شکر ادا کیا کہ اس نے میری عزت و آبرورکھ لی۔۔۔۔۔ لیکن میں نے بعد میں سوچا کہ میری عزت و آبرورکھنے والی اصل میں بچنی ہے۔۔۔۔۔ لیکن جب زیادہ سوچا تو احساس ہوا کہ ایسا سوچنا کفر ہے۔

رشید قریب قریب تنگ آچکا تھا اس نے اپنے دوست کی خاطر آواز دبا کر کہا ”کافر کے بچے۔۔۔۔۔ بات تو کر یہ کہ تیرا اس بچنی کی بچی سے کیا ہوا؟۔۔۔۔۔ کیا تم نے اسے چالایا؟“

مجید نے رشید کی پند نیا سے ایک گھوری لی اور کہا ”دیکھو رشید۔۔۔۔۔ تم بچنی کو جانتے نہیں۔۔۔۔۔ افسوس ہے کہ میں افسانہ نگار نہیں ورنہ میں اس کا کردار بہت اچھی طرح۔۔۔۔۔ جیتا جاگتا پیش کر سکتا۔۔۔۔۔ وہ معلوم نہیں ہے، کیا تھی۔۔۔۔۔ عمر اس کی زیادہ سے زیادہ۔۔۔۔۔ یہ سمجھو کہ سترہ اٹھارہ برس کے قریب ہوگی۔۔۔۔۔ قد اس کا ساڑھے چار فٹ ہوگا۔۔۔۔۔ چھاتی ایسی تھی جیسے لوہے کی بنی ہے حالانکہ ایک بچے کی ماں تھی“

رشید بہت تنگ آگیا ”ایک بچے کی ماں کے بچے۔۔۔۔۔ تو اپنی داستان کے

انجام کو پہنچ۔۔۔ مجھے ایک بہت ضروری کام سے جانا ہے۔۔۔ ساڑھے سات بج چکے ہیں، لیکن تمہاری داستان ہی ختم ہونے میں نہیں آتی۔“
 مجید سنجیدہ رہا ”رشد لالے!۔۔۔۔۔ معاملہ بڑا نازک ہے۔“
 ”کس کا؟۔۔۔ تمہارا یا میرا؟“

”میں نہیں کہہ سکتا، لیکن جس وقت کی میں بات کر رہا ہوں، اس وقت معاملہ میرا تو بہت نازک تھا۔۔۔۔۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا، کیا کروں، کیا نہ کروں۔۔۔ اب تم یہ خیال کرو کہ میں ہزاروں کا مالک تھا۔۔۔ تم جانتے ہی ہو کہ ماں باپ مرکب چکے تھے۔۔۔ ساری جائیداد کا میں وارث تھا جہاں چاہتا لٹا دیتا۔۔۔۔۔ اس روز جب میں نے بچی کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچا اور وہ میری گرفت سے یوں الگ ہوئی، جیسے میرا کام تمام کر دے گی لیکن میری بیوی سے اس نے اس سلسلے کا ذکر تک نہ کیا تو مجھے امید ہو گئی کہ چند ایسے معاملوں کے بعد میں کامیاب ہو جاؤں گا۔“

رشد نے اس سے پوچھا ”تجھے کامیابی ہوئی“
 ”خاک۔۔۔ تم اسے جانتے ہی نہیں ہو۔۔۔۔۔ بڑی تیز خو لڑکی ہے۔۔۔۔۔ اپنے خاوند کو کچھ نہیں سمجھتی۔۔۔۔۔ لیکن ایک عجیب بات ہے کہ میں نے اس سے اتنی چھیڑ چھاڑ کی، لیکن اس نے کسی سے بات تک نہ کی، ورنہ اگر وہ چاہتی تو میرا گھر نکالا کر سکتی تھی“

رشد مسکرایا ”میں تمہاری بچی کو جانتا ہوں“
 مجید نے بڑی حیرت سے پوچھا ”تم کیسے جانتے ہو اس کو؟“

”جس طرح تم جانتے ہو۔۔۔۔۔ کیا تم نے ٹھیکالے رکھا ہے کہ وہ تمہارے ہی محلے میں کام کیا کرے۔۔۔ میں اس کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں“
 مجید کو یقین نہ آیا ”بکو اس کرتے ہو۔۔۔ اس کی عمر ہی کتنی ہے کہ تم اسے جانو۔۔۔۔۔ دو برس سے کچھ مہینے اوپر ہو گئے ہیں کہ وہ ہمارے محلے میں روزانہ آتی ہے اس کے لڑکے کی عمر بھی دو سال کے قریب ہوگی۔۔۔ یعنی جب وہ ہمارے ہاں ملازم ہوئی تو اس کے کوئی بچہ نہیں تھا۔۔۔ لیکن دو تین مہینے کے بعد اس کی گود میں ایک لڑکا تھا۔“

رشید پھر مسکرایا ”تمہارا؟“

”میرا؟“ مجید گھبرا گیا، لیکن فوراً سنبھل کر اس نے مذاق کا جواب مذاق میں دیا ”میرا ہوتا تو کیا کہنے تھے۔۔۔ کم از کم میں یہ تو کہنے کے قابل ہو جاتا کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوں۔“

رشید کی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب رنگ اختیار کر گئی ”تمہیں اپنی بچنی کے شوہر کا نام معلوم نہیں“
 ”نہیں!“

”میں بتاتا ہوں تمہیں۔۔۔۔۔ اس کے شوہر کا نام رشید ہے!“

مجید بوکھلا گیا ”رشید؟۔۔۔ کیا اس کا نام رشید ہے؟“

رشید نے بڑے وثوق اور بڑی سنجیدگی سے جواب دیا ”ہاں اس کا نام رشید ہے۔۔۔ اصل میں وہی اس کا شوہر ہے“

”وہ جو اس کے ساتھ ہمارے محلے میں جھاڑو دیتا ہے اور اپنے بچے کو جھولا

جھلاتا ہے، مجید کی بوکھلاہٹ اسی طرح قائم تھی
 رشید کی تنہائی میں کچھ اضافہ ہو گیا ”وہ لوکا پٹھا اپنے بچے کو جھولا نہیں جھلاتا“
 ”تو کسے جھلاتا ہے۔۔۔ کیا وہ اس رشید کا بچہ نہیں؟“
 ”نہیں!“
 ”تو کس کا بچہ ہے؟“
 ”ایک بہت غریب اور نادار آدمی کا۔۔۔ جو خوبصورت بھی نہیں۔۔۔ تم
 سے ہزاروں درجے نیچے ہے“
 ”کون ہے وہ؟“
 ”پوچھ کے کیا کرو گے؟“
 ”کروں گا کیا۔۔۔ بس ایسے ہی جاننا چاہتا ہوں“
 رشید نے ایک سگریٹ ساگایا اور بڑے اطمینان سے کہا ”جاننا چاہتے ہو تو
 جان لو۔۔۔ وہ رشید میں ہوں۔۔۔ تمہاری بچہنی سے میری آشنائی بچپن کی
 ہے۔۔۔ وہ گیارہ برس کی تھی۔۔۔ میں تیرہ برس کا۔۔۔ جب سے میرا اس کا
 معاملہ چلا آ رہا ہے۔۔۔ وہ لڑکا جو تم اس کی گود میں دیکھتے ہو اور جسے اس کا لوکا پٹھا
 شوہر ہر روز جھولا جھلاتا ہے، اس خاکسار کی اولاد ہے۔۔۔ شکر ہے خداوند کریم کا
 کہ لڑکی نہ ہوئی، ورنہ میں تو اسے دوسرے ہی روز مار ڈالتا۔۔۔۔۔“
 یہ کہہ کر رشید فوراً اٹھا اور چلا گیا۔۔۔ مجید سوچتا رہ گیا کہ خداوند کریم نے
 اس پر کون سا کرم کیا تھا جو وہ اس کا شکر گزار تھا۔۔۔۔۔!

☆☆☆☆☆

بسم اللہ

فلم بنانے کے سلسلے میں ظہیر سے سعید کی ملاقات ہوئی سعید بہت متاثر ہوا۔ بمبئی میں اس نے ظہیر کو سنٹرل اسٹوڈیوز میں ایک دوسرے دیکھا تھا اور شاید چند باتیں بھی کی تھیں مگر مفصل ملاقات پہلی مرتبہ لاہور ہی میں ہوئی۔

لاہور میں یوں تو بے شمار فلم کمپنیاں تھیں مگر سعید کو اس تلخ حقیقت کا علم تھا کہ ان میں سے اکثر کا وجود صرف ان کے نام کے بورڈوں تک ہی محدود ہے۔ ظہیر نے جب اس کو اکرم کی معرفت بلایا تو اس کو سو فیصدی یقین تھا کہ ظہیر بھی دوسرے فلم پروڈیوسروں کی طرح کھوکھلا ہے جو لاکھوں کی باتیں کرتے ہیں آفس قائم کرتے ہیں کرائے پر فرنیچر لاتے ہیں اور آخر میں آس پاس کے ہوٹلوں کے بل مار کر بھاگ جاتے ہیں۔

ظہیر نے بڑی سادگی سے سعید کو بتایا کہ وہ کم سے کم سرمائے سے فلم بنانا چاہتا ہے۔ بمبئی میں وہ اسٹنٹ فلم بنانے والے ڈائریکٹر کا اسٹنٹ تھا۔ پانچ برس تک وہ اس کے ماتحت کام کرتا رہا اس کو خود فلم بنانے کا موقع ملنے ہی والا تھا کہ ہندوستان تقسیم ہو گیا اور اسے پاکستان آنا پڑا۔ یہاں وہ تقریباً ڈھائی سال بیکار رہا مگر اس دوران میں اس نے چند آدمی ایسے تیار کر لیے جو وہ پیدا لگانے کے لیے تیار ہیں۔ اس نے سعید سے کہا ”دیکھئے جناب! میں کوئی فرسٹ کلاس فلم بنانا نہیں چاہتا۔ کم علم آدمی ہوں اسٹنٹ فلم بنا سکتا ہوں اور انشاء اللہ اچھا اسٹنٹ فلم بناؤں گا پچاس ہزار روپوں کے اندر راند سو فیصدی نفع تو یقینی ہے۔۔۔۔۔ آپ کا کیا خیال

ہے؟“

سعید نے کچھ دیر سوچ کر جواب دیا ”ہاں اتنا نفع تو ہونا چاہیے“
ظہیر نے کہا ”جو آدمی روپیہ لگانے کے لیے تیار ہیں میں نے ان سے کہہ دیا
ہے کہ حساب کتاب سے میرا کوئی واسطہ نہیں ہوگا یہ آپ کا کام ہے۔۔۔۔۔ باقی
سب چیزیں میں سنبھال لوں گا۔“

سعید نے پوچھا ”مجھ سے آپ کیا خدمت چاہتے ہیں“
ظہیر نے بڑی سادگی سے کہا ”پاکستان کے تقریباً تمام ڈسٹری بیوٹر آپ کو
جانتے ہیں میری یہاں ان لوگوں سے واقفیت نہیں بڑی نوازش ہوگی اگر آپ
میرے فلم کی ڈسٹری بیوشن کا بندوبست کر دیں۔“

سعید نے کہا ”آپ فلم تیار کر لیں انشاء اللہ ہو جائے گا“
”آپ کی بڑی مہربانی ہے“ یہ کہہ کر ظہیر نے میز پر پڑے ہوئے پیڈ پر پنسل
سے ایک پھول سا بنایا ”سعید صاحب! مجھے سو فیصد یقین ہے کہ میں کامیاب
رہوں گا۔۔۔۔۔ ہیر وئن میری بیوی ہوگی۔“

سعید نے پوچھا ”آپ کی بیوی؟“

”جی ہاں“

”پہلے کسی فلم میں کام کر چکی ہیں“

”جی نہیں“ ظہیر نے پیڈ پر پھول کے ساتھ شاخ بناتے ہوئے کہا ”میں نے
شادی یہاں لاہور میں آکر کی ہے۔۔۔۔۔ میرا ارادہ تو نہیں تھا کہ اسے فلم انڈیا میں
لاؤں مگر اس کو شوق ہے۔۔۔۔۔ بہت شوق ہے ہر روز ایک فلم دیکھتی

ہے۔۔۔۔۔ میں آپ کو اس کا فوٹو دکھاتا ہوں۔“
ظہیر نے میز کا دراز کھول کر ایک لفافہ نکالا اور اس میں سے اپنی بیوی کا فوٹو
سر کا کر سعید کی طرف بڑھا دیا۔

سعید نے فوٹو دیکھا معمولی خدو خال کی جوان عورت تھی تنگ ماتھا، باریک
ناک موٹے موٹے ہونٹ آنکھیں بڑی بڑی اور اداس۔
یہ آنکھیں ہی تھیں جو اس کے چہرے کے دوسرے خطوط کے مقابلے میں
سب سے نمایاں تھیں سعید نے غور سے ان کو دیکھنا چاہا مگر معیوب سمجھا اور فوٹو میز
پر رکھ دیا

ظہیر نے پوچھا ”کیا خیال ہے آپ کا؟“
سعید کے پاس اس سوال کا جواب تیار نہیں تھا اس کے دل و دماغ پر دراصل وہ
آنکھیں چھائی ہوئی تھیں بڑی بڑی اداس آنکھیں، غیر ارادی طور پر اس نے میز پر
سے فوٹو اٹھایا اور ایک نظر دیکھ کر پھر وہیں رکھ دیا اور کہا ”آپ زیادہ بہتر جانتے
ہیں“

ظہیر نے پیڑ پر ایک اور پھول بنانا شروع کیا ”یہ فوٹو اچھی نہیں۔۔۔۔۔ ذرا
سی ہلی ہوئی ہے۔“

اتنے میں پچھلے دروازے کا پردہ ہلا اور ظہیر کی بیوی داخل ہوئی۔۔۔۔۔ وہی
بڑی بڑی اداس آنکھیں ظہیر اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا ”عجیب و غریب نام ہے
اس کا۔۔۔۔۔“ بسم اللہ! پھر سعید کی طرف اشارہ کیا ”یہ میرے دوست سعید
صاحب ہیں“

بسم اللہ نے کہا ”آداب عرض“

سعید نے اس کا جواب اٹھ کر دیا ”تشریف رکھیے“

بسم اللہ دو پٹہ ٹھیک کرتی سعید کے پاس والی کرسی پر بیٹھ گئی ہلکے پیازی رنگ کے کلف لگے ملل کے مبین دوپٹے کے پیچھے اس کے سینے کا ابھار چغلیاں کھارہا تھا۔ سعید نے اپنی نگاہیں دوسری طرف پھیر لیں۔

ظہیر نے فوٹو واپس اٹھانے میں رکاوٹ اور سعید سے کہا ”مجھے سو فیصد ی یقین ہے کہ بسم اللہ پہلے ہی فلم میں کامیاب ثابت ہوگی لیکن سمجھ میں نہیں آتا، اس کا فلمی نام کیا رکھوں بسم اللہ ٹھیک معلوم نہیں ہوتا کیا خیال آپ کا۔“

سعید نے بسم اللہ کی طرف دیکھا اس کی بڑی بڑی اواس آنکھوں میں وہ ایک لٹلے کے لیے جیسے ڈوب سا گیا۔ فوراً ہی نگاہ اس طرف سے ہٹا کر اس نے ظہیر سے کہا ”جی ہاں۔۔۔۔۔ بسم اللہ ٹھیک نہیں ہے کوئی اور نام ہونا چاہیے۔“

تموڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ بسم اللہ خاموش تھی اس کی بڑی بڑی اواس آنکھیں بھی خاموش تھیں۔ سعید نے اس دوران میں ان آنکھوں کے اندر کئی بار ڈبکیاں لگائیں ظہیر اور وہ دونوں باتیں کرتے رہے بسم اللہ خاموش بیٹھی اپنی بڑی بڑی اواس آنکھوں پر چھائی ہوئی سیاہ پلکیں جھپکا کی اس کے ہلکے پیازی رنگ کے کلف لگے ملل کے دوپٹے کے پیچھے اس کے سینے کا ابھار برابر چغلیاں کھاتا رہا۔ سعید ادھر دیکھتا ایک دھکے کے ساتھ اس کی نظریں دوسری طرف پلٹ جاتیں۔

بسم اللہ کا رنگ گہرا سا ہوا تھا فوٹو میں اس رنگت کا پتا نہیں چلتا تھا اس گہرے

سانو لے رنگ پر اس کی بڑی بڑی کالی آنکھیں اور بھی زیادہ اداس ہو گئی تھیں سعید نے کئی مرتبہ سوچا کہ اس اداسی کا باعث کیا ہے۔۔۔۔۔ ان کی ساخت ہی کچھ ایسی ہے کہ اداس دکھائی دیتی ہیں یا کوئی اور وجہ ہے کوئی معقول بات سعید کے ذہن میں نہ آئی۔

ظہیر بمبئی کی باتیں شروع کرنے والا تھا کہ بسم اللہ اچھی اور چلی گئی اس کی چال میں بے ڈھنگاپن تھا جیسے اس نے اونچی اڑھنی کے چپل نئے نئے استعمال کرنے شروع کیے ہیں۔ غرارے کی نشست بھی ٹھیک نہیں تھی سلوٹوں کا گراؤ بھدا تھا اس کے علاوہ سعید نے یہ بھی محسوس کیا کہ ادب آداب سے بسم اللہ محض کوری ہے۔۔۔۔۔ لیکن اس کے گہرے سانو لے چہرے پر دو بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اداس ہونے کے باوجود کس قدر جذبات انگیز تھیں۔

چند ہی ملاقاتوں میں ظہیر سے سعید کے تعلقات بہت گہرے ہو گئے ظہیر بے حد سادہ دل تھا اس خاص چیز سے سعید بہت متاثر ہوا تھا اس کی کسی بھی بات میں بناوٹ نہیں ہوتی تھی خیال جس شکل میں پیدا ہوتا تھا سادہ الفاظ میں تبدیل ہو کر اس کی زبان پر آ جاتا تھا کھانے پینے اور رہنے سہنے کے معاملے میں بھی وہ سادگی پسند تھا۔

جب بھی سعید اس کے یہاں جاتا ظہیر اس کی خاطر تواضع کرتا سعید نے اس سے کئی بار کہا کہ تم یہ تکلف نہ کیا کرو مگر وہ نہ مانا وہ اکثر کہا کرتا ”اس میں کیا تکلف ہے آپ کا اپنا گھر ہے۔“

سعید نے جب تقریباً ہر روز ظہیر کے ہاں جانا شروع کیا تو اس نے سوچا کہ یہ

بہت بری بات ہے وہ میری اتنی عزت کرتا ہے مجھے اپنا دوست سمجھتا ہے اور میں اس سے صرف اس لیے ملتا ہوں کہ مجھے اس کی بیوی سے دلچسپی ہوگئی ہے یہ بہت بری بات ہے۔

اس کے ضمیر نے کئی دفعہ اسے لو کا مگر وہ برابر ظہیر کے ہاں جاتا رہا۔
بسم اللہ اکثر آجاتی تھی شروع شروع میں خاموش بیٹھی رہتی پھر آہستہ آہستہ اس نے باتوں میں حصہ لینا شروع کر دیا لیکن گفتگو کے لحاظ سے وہ خام تھی سعید کو دکھ ہوتا تھا کہ وہ اچھی باتیں کرنا کیوں نہیں جانتی۔

کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ ظہیر گھر سے باہر تھا سعید نے آواز دی تو بسم اللہ بولی 'باہر گئے ہوئے ہیں' یہ سن کر کچھ دیر کھڑا رہا کہ شاید وہ اس سے کہے، اندر آ جائے ابھی آتے ہیں مگر ایسا نہ ہوا۔

ظہیر کے فلم کا چکر چل رہا تھا اس کا ذکر قریب قریب ہر روز ہوتا ظہیر کہتا مجھے اتنی جلدی نہیں ہے ہر ایک چیز آرام سے ہوگی اور اپنے وقت پر ہوگی۔
سعید کو ظہیر کے فلم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس کو اگر دلچسپی تھی تو بسم اللہ سے جس کی بڑی بڑی اداس آنکھوں میں وہ کئی بار غوطے لگا چکا تھا اور اس کی یہ دلچسپی دن بدن بڑھتی جا رہی تھی جس کا احساس اس کے لیے بہت تکلیف دہ تھا کیونکہ یہ کھلی ہوئی بات تھی کہ وہ اپنے دوست ظہیر کی بیوی سے جسمانی رشتہ پیدا کرنے کا خواہاں تھا۔

دن گزرتے گئے ظہیر کے فلم کا کام وہیں کا وہیں تھا۔ سعید ایک دن اس سے ملنے گیا تو وہ کہیں باہر گیا ہوا تھا چلنے ہی والا تھا کہ بسم اللہ نے کہا "اندر آ جائیے وہ

کہیں دو نہیں گئے“

سعید کا دل دھڑکنے لگا کچھ تو قف کے بعد وہ کمرے میں داخل ہوا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ بسم اللہ میز کے پاس کھڑی تھی سعید نے جرأت سے کام لے کر اس سے کہا ”بیٹھے“

بسم اللہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی تھوڑی دیر خاموش رہی اس کے بعد سعید نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا ”ظہیر آئے نہیں ابھی تک؟“

بسم اللہ نے مختصر جواب دیا ”آجائیں گے“

تھوڑی دیر پھر خاموشی رہی اسی دوران میں کئی مرتبہ سعید نے بسم اللہ کی آنکھوں کی طرف دیکھا اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اٹھ کر ان کو چومنا شروع کر دے اس قدر چومے کہ ان کی ساری اداسی دھل جائے مگر سعید نے اس خواہش پر قابو پا کر اس سے کہا ”آپ کو فلم میں کام کرنے کا بہت شوق ہے؟“

بسم اللہ نے ایک جمائی لی اور جواب دیا ”ہے تو سہی“

سعید صاحب بن گیا ”یہ لائن اچھی نہیں میرا مطلب ہے بڑی بدنام ہے“ اس کے بعد اس نے فلم لائن کی تمام ہرائیاں بیان کرنا شروع کر دیں ظہیر کا خیال آیا تو اس نے رخ بدل لیا ”آپ کو شوق ہے تو خیر دوسری بات ہے کیریئر مضبوط ہو تو آدمی کسی بھی لائن میں ثابت قدم رہ سکتا ہے پھر ظہیر خود اپنا فلم بنا رہا ہے لیکن آپ کسی دوسرے کے فلم میں کام ہرگز نہ کیجئے گا۔“

بسم اللہ خاموش رہی سعید کو اس کی یہ خاموشی بہت بری معلوم ہوئی پہلی مرتبہ اس کو تنہائی میں اس سے ملنے کا موقع ملا تھا مگر وہ بولتی ہی نہیں تھی سعید نے

ایک دوسرے پر ڈرتے ڈرتے ٹوہ لینے والی نگاہوں سے اسے دیکھا مگر کوئی رد عمل پیدا نہ ہوا۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ اس سے مخاطب ہوا ”اچھا تو پان ہی کھلائیے“

بسم اللہ اٹھی ریشمی قمیص کے پیچھے اس کے سینے کا نمایاں ابھار ہلا سعید کی نگاہوں کو دھکا سا لگا۔ بسم اللہ دوسرے کمرے میں گئی تو وہ ڈر ڈر کے تیکھی تیکھی باتیں سوچنے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ پان لے کر آئی اور سعید کے پاس کھڑی ہو گئی ”بیجے“ سعید نے شکریہ کہہ کر پان لیا تو اس کی انگلیاں بسم اللہ کی انگلیوں سے چھوئیں اس کے سارے بدن میں برقی لہر دوڑ گئی اس کے ساتھ ہی ضمیر کا کانٹا اس کے دل میں چبھا۔

بسم اللہ سامنے کرسی پر بیٹھ گئی اس کے گہرے سانولے چہرے سے سعید کو کچھ پتہ نہیں چلتا تھا سعید نے سوچا کوئی اور عورت ہوتی تو فوراً سمجھ جاتی کہ میں اسے کن آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں، لیکن شاید سمجھ گئی ہو شاید یہ بھی سمجھی ہو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

سعید کا دماغ بے حد مضطرب تھا ایک طرف بسم اللہ کا ستانے والا وجود تھا اس کی بڑی بڑی اداس آنکھیں اس کے سینے کا نمایاں ابھار، دوسری طرف ظہیر کا خیال، اس کے ضمیر کا کانٹا، سب عجیب الجھن میں پھنس گیا تھا۔ بسم اللہ کی طرف سے کوئی اشارہ نہیں ملا تھا اس کا مطلب صاف تھا کہ جو چیز سعید سوچ رہا ہے ناممکن ہے مگر وہ پھر بھی اس کو انہی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ اس سے مخاطب ہوا ”ظہیر نہیں آئے میرا خیال ہے میں چتا ہوں“
 بسم اللہ نے خلاف توقع کہا ”نہیں نہیں بیٹھے“
 ”آپ تو کوئی بات ہی نہیں کرتیں“ یہ کہہ کر سعید اٹھا
 بسم اللہ نے پوچھا ”چلے؟“
 سعید نے اس کی طرف ٹوہ لینے والی نگاہوں سے دیکھا ”جی نہیں بیٹھتا ہوں
 آپ کو اگر کوئی اعتراض نہ ہو“
 بسم اللہ نے ایک جمائی لی ”مجھے کیا اعتراض ہوگا“
 بسم اللہ کی آنکھوں میں خمار سا پیدا ہو گیا سعید نے کہا ”آپ کو شاید نیند آرہی ہے۔“

”جی ہاں رات جاگتی رہی“
 سعید نے ذرا بے تکلفی سے پوچھا ”کیوں؟“
 بسم اللہ نے ایک اور جمائی لی ”کہیں باہر گئے ہوئے تھے“
 سعید بیٹھ گیا تھوڑی دیر کے بعد بسم اللہ سو گئی اس کے سینے کا نمایاں ابھار ریشمی قمیض کے پیچھے سانس کے زیر و بم سے ہولے ہولے مل رہا تھا بڑی بڑی او اس آنکھیں اب بند تھیں دایاں بازو ایک طرف ڈٹک گیا تھا آستین اوپر کواٹھ گئی تھی سعید نے کہا گہرے سانولے رنگ کی کلائی پر ہندی کے حروف کھدے ہوئے تھے اسنے میں ظہیر آگیا۔

سعید اس کی آمد پر شیشا سا گیا ظہیر نے اس سے ہاتھ ملایا اپنی بیوی بسم اللہ کی

طرف دیکھا ”ارے سو رہی ہے“
 سعید نے کہا ”میں جا رہا تھا کہنے لگیں ظہیر صاحب ابھی آ جائیں گے آپ
 بیٹھے میں بیٹھا تو آپ سو گئیں“
 ظہیر ہنسا، سعید بھی ہنسنے لگا
 ”بھئی واہ۔۔۔ اٹھو اٹھو“ ظہیر نے بسم اللہ کے سر پر ہاتھ پھیرا
 بسم اللہ نے ایک لمبی آہ بھری اور اپنی بڑی بڑی اداس آنکھیں کھول دیں اداسی
 کے ساتھ ساتھ اب ان میں ویرانی سی بھی تھی۔
 ”چلو چلو۔۔۔۔۔ اٹھو ایک ضروری کام پر جانا ہے“ بسم اللہ سے یہ کہہ کر
 ظہیر سعید سے مخاطب ہوا ”معاف کیجئے گا سعید صاحب میں ایک کام سے جا رہا
 ہوں انشاء اللہ کل ملاقات ہوگی۔“
 سعید چلا گیا دوسرے روز اس نے ظہیر کے ہاں جانے سے پہلے یہ دعا مانگی کہ
 وہ گھر پر نہ ہو وہ ہاں پہنچا تو باہر کئی آدمی جمع تھے سعید کو ان سے معلوم ہوا کہ بسم اللہ
 ظہیر کی بیوی نہیں تھی وہ ایک ہندو لڑکی تھی جو فسادوں میں یہاں رہ گئی تھی ظہیر اس
 سے پیشہ کرتا تھا پولیس ابھی ابھی اسے برآمد کر کے لے گئی ہے۔
 وہ بڑی بڑی سیاہ اور اداس آنکھیں اب بھی سعید کا پیچھا کرتی رہتی ہیں۔

☆☆☆☆☆

بغیر اجازت

نعیم ڈبلتا ڈبلتا ایک باغ کے اندر چلا گیا۔۔۔ اس کو وہاں کی فضا بہت پسند آئی۔۔۔ گھاس کے ایک تنختے پر لیٹ کر اس نے خود کلامی شروع کر دی۔
 ”کیسی پر فضا جگہ ہے۔۔۔۔۔ حیرت ہے کہ آج تک میری نظروں سے اوجھل رہی۔۔۔۔۔ نظریں۔۔۔۔۔ اوجھل“
 اتنا کہہ کر وہ مسکرایا
 ”نظر ہو تو چیزیں نظر بھی نہیں آتیں۔۔۔ آہ کہ نظر کی بے نظری!“
 دیر تک وہ گھاس کے اس تنختے پر لیٹا اور غنڈک محسوس کرتا رہا لیکن اس کی خود کلامی جاری تھی۔

”یہ نرم زم گھاس کتنی فرحت ناک ہے“
 آنکھیں پاؤں کے تلوؤں میں چلی آئیں۔۔۔۔۔ اور یہ پھول۔۔۔۔۔ یہ پھول اتنے خوبصورت نہیں جتنی ان کی ہرجائی خوشبو ہے۔۔۔۔۔ ہر شے جو ہرجائی ہو۔۔۔۔۔ خوبصورت ہوتی ہے۔۔۔۔۔ ہرجائی عورت۔۔۔۔۔ ہرجائی مرد۔۔۔۔۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔۔۔ یہ خوبصورت چیزیں پہلے پیدا ہوئی تھیں۔۔۔۔۔ یا خوبصورت خیال۔۔۔۔۔ ہر خیال خوبصورت ہوتا ہے۔۔۔۔۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ ہر پھول خوبصورت نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ مثال کے طور پر یہ پھول، اس نے اٹھ کر ایک پھول کی طرف دیکھا اور اپنی خود کلامی جاری رکھی۔
 یہ اس شبی پر اکڑوں بیٹھا ہے۔۔۔۔۔ کتنا سفلہ دکھائی دیتا ہے بہر حال یہ جگہ

خوب ہے۔۔۔ ایک بہت بڑا دماغ معلوم ہوتی ہے۔۔۔ روشنی بھی ہے۔۔۔ سائے بھی ہیں۔۔۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت میں نہیں بلکہ یہ جگہ سوچ رہی ہے۔

یہ پر فضا جگہ جو اتنی دیر میری نظروں سے اوجھل رہی۔
اس کے بعد نعیم فرط مسرت میں کوئی غزل گانا شروع کر دیتا ہے۔۔۔ کہ
اچانک موٹر کے ہارن کی کرخت آواز اس کے ساز دل کے سارے تازہ بخوڑ دیتی ہے۔

وہ چونک کر اٹھتا ہے۔۔۔ دیکھتا ہے کہ ایک موٹر پاس کی روش پر کھڑی ہے اور ایک لمبی لمبی موٹوں والا آدمی اس کی طرف قبر آلودنگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔۔۔ اس موٹوں والے آدمی نے گرج کر کہا۔

”اے تم کون ہو۔۔۔۔“

نعیم جو اپنے ہی نشہ میں سرشار تھا چونکا۔۔۔۔

”یہ موٹر اس باغ میں کہاں سے آگئی“

موٹوں والا جو اس باغ کا مالک تھا بڑبڑایا

وضع قطع سے تو آدمی شریف معلوم ہوتا ہے مگر یہاں کیسے گھس آیا۔۔۔۔ کس
اطمینان سے لیٹا تھا جیسے اس کے باوا کا باغ ہے۔۔۔۔ پھر اس نے بلند آواز میں
لکار کے نعیم سے کہا

”اماں۔۔۔۔ کچھ سنتے ہو۔۔۔۔“

نعیم نے جواب دیا

”حضور سن رہا ہوں۔۔۔۔۔ تشریف لے آئیے۔۔۔۔۔ یہاں بہت پر فضا جگہ ہے۔“

باغ کا مالک بھنا گیا

”تشریف کا بچہ۔۔۔۔۔ ادھر آؤ“

نعیم لیٹ گیا

”بھئی مجھ سے نہ آیا جائے گا تم خود ہی چلے آؤ۔۔۔۔۔ واللہ بڑی دلفریب جگہ ہے تمہاری سب کو فٹ دور ہو جائے گی“

باغ کا مالک موٹر سے نکلا۔۔۔۔۔ اور غصے میں بھرا ہوا نعیم کے پاس آیا

”اٹھو یہاں سے“

نعیم کے کانوں کو اس کی تیکھی آواز بہت ناگوار گزری ”اتنے اونچے نہ بولو۔۔۔۔۔ آؤ میرے پاس لیٹ جاؤ۔۔۔۔۔ بالکل خاموش جس طرح کہ میں لیٹا ہوا ہوں۔۔۔۔۔ آنکھیں بند کر لو۔۔۔۔۔ اپنا سارا جسم ڈھیلا چھوڑ دو۔۔۔۔۔ دماغ کی ساری بتیاں گل کر دو۔۔۔۔۔ پھر جب تم اس اندھیرے میں چلو گے تو ٹٹولتی ہوئی تمہاری انگلیاں غیر ارادی طور پر ایسے قیمتی روشن کریں گی جن کے وجود سے تم بالکل نافل تھے۔“

آؤ میرے ساتھ لیٹ جاؤ

باغ کے مالک نے ایک لحظہ سوچا۔۔۔۔۔ نعیم سے کہا

”دیوانے معلوم ہوتے ہو۔۔۔۔۔“

نعیم مسکرایا ”نہیں۔۔۔۔۔ تم نے کبھی دیوانے دیکھے ہی نہیں۔۔۔۔۔ میری

جگہ یہاں اگر کوئی دیوانہ ہوتا تو وہ ان بکھری ہوئی جھاڑیوں اور ٹہنیوں پر بچوں کے
گالوں کے مانند لٹکے ہوئے پھولوں سے کبھی مطمئن نہ ہوتا۔۔۔۔۔ دیوانگی
اطمینان کا نام نہیں میرے دوست۔۔۔۔۔ لیکن آؤ ہم دیوانگی کی باتیں کریں۔“
”بکو اس بند کرو۔۔۔۔۔ نکل جاؤ یہاں سے“

باغ کے مالک کو طیش آگیا۔۔۔۔۔ اس نے اپنے ڈرائیور کو بلایا کہ آکر نعیم کو
دھکے مار کر باہر نکال دے۔

”ارے تم کون ہو۔۔۔۔۔ بڑے بد تمیز معلوم ہوتے ہو“
جب نعیم باہر جا رہا تھا تو اس نے گیٹ پر ایک بورڈ دیکھا جس پر یہ لکھا تھا
”بغیر اجازت اندر آنا منع ہے“
وہ مسکرایا

”حیرت ہے کہ یہ میری نظروں سے اوجھل رہا۔۔۔۔۔ نظر ہو تو بعض
چیزیں نظر نہیں بھی آتیں۔۔۔۔۔ آہ نظر کی یہ بے نظیری“
یہاں سے نکل کر وہ ایک آرٹ کی نمائش میں چلا گیا تا کہ اپنی ذہنی تندرست رہ کر
سکے

ہال میں داخل ہوتے ہی اس کو عورتوں اور مردوں کا جھرمٹ نظر آیا جو
دیواروں پر لگی پینٹنگز دیکھ رہا تھا۔

ایک مرد کسی پارسی عورت سے کہہ رہا تھا
”مسز فوجدار۔۔۔۔۔ یہ پینٹنگ دیکھی آپ نے“
مسز فوجدار نے تصویر کو ایک نظر دیکھنے کے بعد ایک عورت شیریں کی طرف

بڑے غور سے دیکھا اور اس مرد سے جو غالباً اس کا ہونے والا شوہر تھا کہا
 ”تم نے دیکھا شیریں کتنی سچ بن کے آئی ہے۔“
 ایک نوجوان عورت ایک نو عمر لڑکی سے کہہ رہی تھی ”ٹریا ادھر آ کے تصویریں
 دیکھ۔۔۔۔۔۔ تو وہاں کھڑی کیا کر رہی ہے“
 ٹریا کو تصویروں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اصل میں اس کو ایک بوائے فرینڈ سے
 مانا تھا۔
 ایک ادھیڑ عمر کا مرد جسے پینٹنگز سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اپنے ادھیڑ عمر کے
 دوست سے کہہ رہا تھا۔
 ”میری زکام کی وجہ سے غم حال ہے، ورنہ ضرور آتی۔۔۔۔۔۔ آپ جانتے ہی
 ہیں پینٹنگز سے اسے کتنی دلچسپی ہے اب تو وہ بہت اچھی تصویریں بنا لیتی ہے
 پرسوں اس نے پنسل کاغذ لے کر اپنے چھوٹے بھائی کی سائیکل کی تصویر
 اتاری۔۔۔۔۔۔ میں تو دنگ رہ گیا“
 نعیم پاس کھڑا تھا۔۔۔۔۔۔ اس نے ہلکے سے طنز کے ساتھ کہا
 ”ہو، ہو سائیکل معلوم ہوتی ہوگی“
 دونوں دوست جھونکے ہو کر رہ گئے کہ یہ کون بد تمیز ہے چنانچہ ان میں سے ایک
 نے نعیم سے پوچھا۔
 ”آپ کون ہیں؟“
 نعیم بوکھلا گیا
 ”میں۔۔۔۔۔۔ میں“

”میں میں کیا کرتے ہو۔۔۔۔۔ بتاؤ تم کون ہو“

نعیم نے سنبھل کر کہا

”آپ ذرا آرام سے پوچھئے۔۔۔۔۔ میں آپ کو بتا سکتا ہوں“

”تم یہاں آئے کیسے؟“

نعیم کا جواب بڑا مختصر تھا

”جی پیدل۔۔۔“

عورتیں اور مرد جو اس پاس کھڑے تصویریں دیکھنے کی بجائے خدا معلوم کن کن چیزوں پر تبصرہ کر رہے تھے ہنسنا شروع کر دیا۔۔۔ اتنے میں اس نمائش کا ناظم آیا اس کو جب نعیم کی گستاخی کے متعلق بتایا گیا تو اس نے بڑے کڑے انداز میں اس سے پوچھا

”تمہارے پاس کارڈ ہے“

نعیم نے بڑے بھولے پن سے جواب دیا

”کارڈ۔۔۔۔۔ کیسا کارڈ۔۔۔۔۔ پوسٹ کارڈ؟“

ناظم نے اپنا لہجہ اور کڑا کر کے نعیم سے کہا

”بغیر اجازت تم اندر چلے آئے جاؤ بھاگ جاؤ یہاں سے“

نعیم ایک تصویر کو دیکھ کر دیر تک دیکھنا چاہتا تھا مگر اسے بادل نحو استہ وہاں سے

ٹکنا پڑا۔۔۔ سیدھا اپنے گھر گیا دروازے پر دستک دی اس کا نوکر فضول باہر نکلا

نعیم نے اس سے درخواست کی۔

”کیا میں اندر آ سکتا ہوں“

فضلو بولکھلا گیا۔۔۔۔۔ ”حضور۔۔۔۔۔ حضور۔۔۔۔۔ یہ آپ کا اپنا گھر ہے اجازتی کیسی؟“

نعیم نے اس سے کہا
”نہیں فضلو۔۔۔۔۔ یہ میرا گھر نہیں۔۔۔۔۔ یہ گھر جو مجھے راحت بخشتا ہے
کیسے میرا ہوسکتا ہے۔۔۔۔۔ مجھے اب ایک نئی بات معلوم ہوئی ہے“
فضلو نے بڑے ادب سے پوچھا
”کیا سرکار؟“
نعیم نے کہا

”یہی کہ یہ میرا گھر میرا نہیں۔۔۔۔۔ البتہ اس کا گرد و غبار۔۔۔۔۔ اس کی تمام
غنائتیں میری ہیں۔۔۔۔۔ وہ تمام چیزیں جن سے مجھے کوفت ہوتی ہے میری
ہیں لیکن وہ تمام چیزیں جن سے مجھے راحت پہنچتی ہے کسی اور کی۔۔۔۔۔ خدا
جانے کس کی۔۔۔۔۔ میں اب ڈرتا ہوں۔۔۔۔۔ کسی اچھی چیز کو اپنانے سے خوف
گلتا ہے یہ پانی میرا نہیں۔۔۔۔۔ یہ ہوا میری نہیں۔۔۔۔۔ یہ آسمان میرا
نہیں۔۔۔۔۔ وہ لحاف جو میں سردیوں میں اوڑھتا ہوں میرا
نہیں۔۔۔۔۔ اس لیے کہ میں اس سے راحت طلب کرتا تھا۔“

فضلو جاؤ۔۔۔۔۔ تم بھی میرے نہیں
نعیم نے فضلو کو کوئی بات کرنے نہ دی
وہ چلا گیا

رات کے دس بج چکے تھے

ہیرا منڈی کے ایک کوٹھے سے پیا بن مائیں آوت چین کے بول باہر اڑاڑ
 کے آرہے تھے
 نعیم اس کوٹھے پر چلا گیا
 اندر مچرا سننے والے تین چار مردوں کی طرف دیکھا۔۔۔ اور طوائف سے کہا
 ”ان اصحاب کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا“
 طوائف مسکرائی
 ”انہیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔۔۔ ادھر مسند پر بیٹھئے۔۔۔ گاؤ تکیہ لے
 لیجئے“
 نعیم بیٹھ گیا۔۔۔ اس نے کمرے کا جائزہ لیا اور اس طوائف سے کہا
 ”یہ کتنی اچھی جگہ ہے“
 طوائف سنجیدہ ہو گئی
 ”آپ کیل مذاق اڑانے آئے ہیں۔۔۔ یہ اچھی جگہ ہے۔۔۔ جسے تم
 شرفا حد سیز یا وہ گندی جگہ کہتے ہیں“
 نعیم نے اس سے کہا
 ”یہ اچھی جگہ اس لیے ہے کہ یہاں بغیر اجازت کے آنا منع ہے کا بورڈ
 آویزاں نہیں ہے۔“
 یہ سن کر طوائف اور اس کا مچرا سننے والے تما شین ہنسنے لگے
 نعیم نے ایسا محسوس کیا کہ دنیا ایک اس قسم کی طوائف ہے جسے مچرا سننے کے
 لیے اس قسم کے چغدا آتے ہیں۔

باور

کچھ دنوں سے مومن بہت بے قرار تھا۔ اس کا وجود کچا پھوڑا سا بن گیا تھا۔ کام کرتے وقت باتیں کرتے ہوئے حتیٰ کہ سوچنے پر بھی اسے ایک عجیب قسم کا درد محسوس ہوتا تھا۔ ایسا درد جس کو اگر وہ بیان بھی کرنا چاہتا تو نہ کر سکتا۔

بعض اوقات ٹیٹھے ٹیٹھے وہ ایک دم چونک پڑتا۔ دھندلے دھندلے خیالات جو عام حالتوں میں بے آواز بلبلوں کی طرح پیدا ہو کر مٹ جایا کرتے ہیں۔ مومن کے دماغ میں بڑے شور کے ساتھ پیدا ہوتے اور شور ہی کے ساتھ چھٹتے۔ اس کے دل و دماغ کے نرم و نازک پردوں پر ہر وقت جیسے خاردار پاؤں والی چیونٹیاں سی رہتی تھیں ایک عجیب قسم کا کھنچاؤ اس کے اعضا میں پیدا ہو گیا تھا جس کے باعث اسے بہت تکلیف ہوتی تھی۔ اس تکلیف کی شدت جب بڑھ جاتی تو اس کے جی میں آتا کہ اپنے آپ کو ایک بڑے سے ہاون میں ڈال دے اور کسی سے کہے۔
”مجھے کوئی شروع کر دیں۔“

باورچی خانہ میں گرم مصالحہ کو کوٹتے وقت جب لوہے سے لوہا ٹکراتا اور دھمکیوں سے چھت میں ایک گونج سی دوڑ جاتی تو مومن کے ننگے پیروں کو یہ لرزش بہت بھلی معلوم ہوتی۔ پیروں کے ذریعے سے یہ لرزش اس کی تنی ہوئی پندلیوں اور رانوں میں دوڑتی ہوئی اس کے دل تک پہنچ جاتی، جو تیز ہوا میں رکھے ہوئے دینے کی لو کی طرح کانپنا شروع کر دیتا۔

مومن کی عمر پندرہ برس کی تھی۔ شاید سولہواں بھی لگا ہو۔ اسے اپنی عمر کے متعلق

صحیح اندازہ نہیں تھا۔ وہ ایک صحت مند اور تندرست لڑکا تھا۔ جس کا لڑکپن تیزی سے جوانی کے میدان کی طرف بھاگ رہا تھا۔ اسی وہڑنے جس سے مومن بالکل غافل تھا اس کے لہو کے برق طرے میں سنسنی پیدا کر دی۔ وہ اس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتا مگر کام رہتا۔

اس کے جسم میں کئی تہدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ گردن جو پہلے تیلی تھی۔ اب موٹی ہو گئی تھی۔ بانہوں کے پٹوں میں انٹھن سی پیدا ہو گئی تھی۔ کنٹھ نکل رہا تھا۔ سینے پر گوشت کی تہہ موٹی ہو گئی تھی اور اب کچھ دنوں سے پستانوں میں گولیاں سے پڑ گئی تھیں۔ جبکہ ابھرائی تھی جیسے کسی نے ایک ایک برنڈا اندر داخل کر دیا ہے۔ ان ابھاروں کو ہاتھ لگانے سے مومن کو بہت دردمحسوس ہوتا تھا۔ کبھی کبھی کام کرنے کے دوران میں غیر ارادی طور پر جب اس کا ہاتھ ان گولیوں سے چھو جاتا تو وہ تڑپ اٹھتا۔ قمیض کے مولے اور کھر درے کپڑے سے بھی اس کو تکلیف دہ سرسراہٹ محسوس ہوتی تھی۔

نسل خانے میں نہاتے وقت یا باورچی خانہ میں جب کوئی اور موجود نہ ہو۔ مومن اپنے قمیض کے بٹن کھول کر ان گولیوں کو غور سے دیکھتا۔ ہاتھوں سے مسلاتا۔ درد ہوتا۔ میسین اٹھتیں۔ جیسے جسم پیلوں سے لدھے ہوئے چیز کی طرح زور سے ہلایا گیا ہو۔ کانپ کانپ جاتا۔ مگر اس کے باوجود وہ اس درد پیدا کرنے والے کھیل میں مشغول رہتا۔ کبھی کبھی زیادہ دبائے پر یہ گولیاں پچک جاتیں اور ان کے منہ سے ایک لیسڈار لعاب نکل آتا۔ اس کو دیکھ کر اس کا چہرہ کان کی لودوں تک سرخ ہو جاتا۔ وہ یہ سمجھتا کہ اس سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہے۔

گناہ اور ثواب کے متعلق مومن کا علم بہت محدود تھا۔ ہر وہ فعل جو ایک انسان دوسرے انسان کے سامنے نہ کر سکتا ہو۔ اس کے خیال کے مطابق گناہ تھا۔ چنانچہ جب شرم کے مارے اس کا چہرہ کان کی لوؤں تک سرخ ہو جاتا تو وہ جھٹ سے اپنی قمیض کے بٹن بند کر لیتا اور دل میں عہد کرتا کہ آہندہ ایسی فصول حرکت کبھی نہیں کرے گا لیکن اس عد کے باوجود دوسرے یا تیسرے رہ تخیلے میں وہ پھر اس کھیل میں مشغول ہو جاتا۔

مومن سے سب گھروالے خوش تھے۔ بڑا خفی لڑکا تھا۔ جب ہر کام وقت پر کر دیتا تو کسی کو شکایت کا موقع کیسے ملتا۔ ڈپٹی صاحب کے یہاں اسے کام کرتے ہوئے صرف تین مہینے ہوئے تھے۔ لیکن اس قلیل عرصے میں اس نے گھر کے ہر فرد کو اپنی محنت کش طبیعت سے متاثر کر لیا تھا۔ چہرہ روپے مہینے پر نوکر ہوا تھا۔ مگر دوسرے مہینے ہی اس کی تنخواہ میں دو روپے بڑھا دیئے گئے تھے۔ وہ اس گھر میں بہت خوش تھا۔ اس لیے کہ اس کی یہاں قدر کی جاتی تھی مگر اب کچھ دنوں سے وہ بے قرار تھا۔ ایک عجیب قسم کی آوارگی اس کے دماغ میں پیدا ہو گئی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ سارا دن بے مطلب بازاروں میں گھومتا پھرے یا کسی سنان مقام پر جا کر لیٹا رہے۔

اب کام میں اس کا جی نہیں لگتا تھا لیکن اس بے دلی کے ہوتے ہوئے بھی وہ کاہلی نہیں برتتا تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ گھر میں کوئی بھی اس کے اندرونی انتشار سے واقف نہیں تھا۔ رضیہ تھی سو وہ دن بھر باجہ بجائے، نئی نئی فلمی طرزیں سیکھنے اور رسالے پڑھنے میں مصروف رہتی تھی۔ اس نے کبھی مومن کی نگرانی ہی نہ کی تھی۔

شکلیہ الہیہ مومن سے ادھر ادھر کے کام لیتی تھی اور کبھی کبھی اسے ڈانٹتی بھی تھی۔ مگر اب کچھ دنوں سے وہ بھی چند بلاؤں کے نمونے اتارنے میں بے طرح مشغول تھی۔ یہ بلاؤں اس کی ایک سہیلی کے تھے جسے نئی نئی تراشوں کے کپڑے پہننے کا بے حد شوق تھا۔ شکلیہ اس سے آٹھ بلاؤں مانگ کر لائی تھی اور کانڈوں پر ان کے نمونے اتار رہی تھی چنانچہ اس نے بھی کچھ دنوں سے مومن کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔

ڈپٹی صاحب کی بیوی سخت گیر عورت نہیں تھی۔ گھر میں دو نوکر تھے۔ یعنی مومن کے علاوہ ایک بڑھیا بھی تھی جو زیادہ تر باورچی خانے کا کام کرتی تھی۔ مومن کبھی کبھی اس کا ہاتھ بنا دیا کرتا تھا۔ ڈپٹی صاحب کی بیوی نے ممکن ہے مومن کی مستعدی میں کوئی کمی دیکھی ہو مگر اس نے مومن سے اس کا ذکر نہیں کیا تھا اور وہ انقلاب جس میں مومن کا دل و دماغ اور جسم گزر رہا تھا۔ اس سے تو ڈپٹی صاحب کی بیوی بالکل ناغل تھی۔ چونکہ اس کا کوئی لڑکا نہیں تھا۔ اس لیے وہ مومن کی ذہنی اور جسمانی تبدیلیوں کو نہیں سمجھ سکتی اور پھر مومن نوکر تھا..... نوکروں کے متعلق کون غور و فکر کرتا ہے؟ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک وہ تمام منزلیں پیدل طے کر جاتے ہیں اور آس پاس کے آدمیوں کو خبر تک نہیں ہوتی۔

مومن کا بھی بالکل یہی حال تھا۔ وہ کچھ دنوں سے موڑ مڑتا زندگی کے ایک ایسے راستے پر آکھایا تھا جو زیادہ لمبا تو نہیں تھا مگر بے حد پرخطر تھا۔ اس راستے پر اس کے قدم کبھی تیز تیز اٹھتے تھے۔ کبھی ہولے ہولے وہ دراصل جاننا نہیں تھا کہ ایسے راستوں پر کس طرح چلنا چاہیے۔ انہیں جلدی طے کرنا چاہیے یا کچھ وقت لے کر

آہستہ آہستہ ادھر ادھر کی چیزوں کا سہارا لے کر طے کرنا چاہیے۔ مومن کے ننھے پاؤں کے نیچے آنے والے شباب کی گول گول چکنی بیٹیاں بچھل رہی تھیں۔ وہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکتا تھا۔ اسی لیے بے حد مضطرب تھا۔ اس اضطراب کے باعث کئی بار کام کرتے کرتے چونک کر وہ غیر ارادی طور پر کسی کھوئی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیتا اور اس کے ساتھ لٹک جاتا۔ پھر اس کے دل میں خواہش پیدا ہوتی کہ ناگوں سے پکڑ کر اسے کوئی اتنا کھینچے، اتنا کھینچے کہ وہ ایک مہینہ تار بن جائے۔ یہ سب باتیں اس کے دماغ کے کسی ایسے گوشے میں پیدا ہوئی تھیں کہ وہ ٹھیک طور پر ان کا مطلب نہیں سمجھ سکتا تھا۔

غیر شعور پر وہ چاہتا تھا کہ کچھ ہو..... کیا ہو؟ بس کچھ ہو۔ میز پر قریب سے جینی ہوئی پلیٹیں ایک دم اچھلنا شروع کر دیں۔ کیتلی پر رکھا ہوا ڈھکنا پانی کے ایک ہی ابال سے اوپر کواڑ جائے۔ تل کی جستی مانی پر دباؤ ڈالے تو وہ دہری ہو جائے اور اس میں سے پانی کا ایک فوارہ پھوٹ نکلے۔ اسے ایک ایسی زبردست انگڑائی آئے کہ اس کے سارے جوڑیلجھڑیلجھڑے ہو جائیں اور اس میں ایک ڈھیلا پن پیدا ہو جائے۔

کوئی ایسی بات وقوع پذیر ہو جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھی ہو۔
مومن بہت بے قرار تھا۔

رضیہ نئی طرز سیکھنے میں مشغول تھی اور شکلیہ کانڈروں پر بلاؤزوں کے نمونے اتار رہی تھی۔ جب اس نے یہ کام ختم کر لیا تو وہ نمونہ جوان سب میں اچھا تھا۔ سامنے رکھ کر اپنے لیے اودھی سائن کا بلاؤز بنانا شروع کر دیا۔ اب رضیہ کو بھی اپنا بلاؤز اور

فلمی گانوں کی کاپی چھوڑ کر اس طرف متوجہ ہوتا پڑا۔

شکیلہ ہر کام بڑے اہتمام اور چاؤ سے کرتی تھی۔ جب سینے پر ونے ٹیٹھی تو اس کی نشست بڑی پر اطمینان ہوتی تھی۔ اپنی چھوٹی بہن رضیہ کی طرح وہ افراتفری پسند نہیں کرتی تھی۔ ایک ایک ٹاکا سوچ سمجھ کر بڑے اطمینان سے لگاتی تھی تاکہ غلطی کا امکان نہ رہے۔ پیانٹس بھی اس کی بہت صحیح تھی۔ اس لیے کہ پہلے کانڈکٹ کر پھر کپڑا کاٹتی تھی۔ یوں وقت زیادہ صرف ہوتا ہے مگر چیز بالکل فٹ تیار ہوتی تھی۔

شکیلہ بھر بھر جسم کی صحت مند لڑکی تھی ہاتھ بہت گدگدے تھے۔ گوشت بھری خروٹلی انگلیوں کے آخر میں ہر جوڑ پر ایک ایک ننھا گڑھا تھا۔ جب مشین چلاتی تھی تو یہ ننھے ننھے گڑھے ہاتھ کی حرکت سے کبھی کبھی غائب بھی ہو جاتے تھے۔

شکیلہ مشین بھی بڑے اطمینان سے چلاتی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی دو یا تین انگلیاں بڑی نرمی کے ساتھ مشین کی ہتھی گھماتی تھیں۔ کلائی میں ایک ہکا سا خم پیدا ہو جاتا تھا۔ گردن ذرا اس طرف جھک جاتی تھی اور بالوں کی ایک لٹ جسے شاید اپنے لیے کوئی مستقل جگہ نہیں ماتی تھی۔ نیچے پھسل آتی تھی۔ شکیلہ اپنے کام میں اس قدر منہمک رہتی کہ اسے ہٹانے یا جمانے کی کوشش ہی نہیں کرتی تھی۔

جب شکیلہ اودی سائن سامنے پھیلا کر اپنے ماپ کا بلاؤز تراشنے لگی تو اسے ٹیپ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کیونکہ ان کا اپنا ٹیپ گھس گھسا کر اب بالکل نکلڑے نکلڑے ہو گیا تھا۔ لوہے کا گزمو جو دھتھا مگر اس سے کمر اور سینے کی پیانٹس کیسے ہو سکتے ہیں۔ اس کے اپنے کئی بلاؤز موجود تھے مگر اب چونکہ وہ پہلے سے کچھ موٹی ہو

گئی تھی۔ اس لیے ساری پینائش وہ بارہ کرنا چاہتی تھی۔

قمیض اتار کر اس نے مومن کو آواز دی۔ جب وہ آیا تو اس سے کہا ”جاؤ

مومن دوڑ کر چھ نمبر سے کیڑے کا گز لے آؤ۔ کہنا شکلیہ بی بی مانگتی ہے۔“

مومن کی نگاہیں شکلیہ کی سفید بنیان کے ساتھ ٹکرائیں۔ وہ کئی بار شکلیہ بی بی کو

ایسی بنیانوں میں دیکھ چکا تھا۔ مگر آج اسے ایک عجیب قسم کی جھجک محسوس ہوئی۔

اس نے اپنی نگاہوں کا رخ دوسری طرف پھیر لیا اور گھبراہٹ میں کہا ”کیسا گز بی

بی جی۔“

شکلیہ نے جواب دیا۔ ”کیڑے کا گز..... ایک گز تو یہ تمہارے سامنے پڑا

ہے۔ یہ لوہے کا ہے۔ ایک دوسرا گز بھی ہوتا ہے، کیڑے کا۔ جاؤ چھ نمبر میں جاؤ

اور دوڑ کے ان سے یہ گز لے آؤ۔ کہنا شکلیہ بی بی مانگتی ہیں۔“

چھ نمبر کا فلیٹ بالکل قریب تھا۔ مومن فوراً ہی کیڑے کا گز لے کر آ گیا۔ شکلیہ

نے یہ گز اس کے ہاتھ سے لیا اور کہا۔ ”یہیں ٹھہر جاؤ۔ اسے ابھی واپس لے

جانا۔“ پھر وہ اپنی بہن رضیہ سے مخاطب ہوئی۔ ”ان لوگوں کی کوئی چیز اپنے پاس

رکھ لی جائے تو وہ بڑھیا تقاضے کر کر کے پریشان کر دیتی ہے..... ادھر آؤ یہ گز

لو اور یہاں سے میرا ماپ لو۔“

رضیہ نے شکلیہ کی کمر اور سینے کا ماپ لینا شروع کیا تو ان کے درمیان کئی باتیں

ہوئیں۔ مومن دروازے کی دہلیز میں کھڑا تکلیف دہ خاموشی سے یہ باتیں سنتا رہا۔

”رضیہ تم گز کو کھینچ کر ماپ کیوں نہیں لیتیں..... پچھلی دفعہ بھی یہی ہوا۔ تم

نے ماپ لیا اور میرے بلاؤز کا ستیا ناس ہو گیا۔ اوپر کے حصہ پر اگر کیڑا فٹ نہ

آئے تو ادھر ادھر بگلوں میں جھول پڑ جاتے ہیں۔“

”کہاں کالوں۔ کہاں کانہ لوں۔ تم تو عجیب مجھے میں ڈال دیتی ہو۔ یہاں کا ماپ لینا شروع کیا تھا تو تم نے کہا ذرا اور نیچے کالو..... ذرا چھوٹا بڑا ہو گیا تو کون سی آفت آ جائے گی۔“

”بھئی واہ..... چیز کے فٹ ہونے ہی میں تو ساری خوبصورتی ہے۔ شریا کو دیکھو کیسے فٹ کپڑے پہنتی ہے۔ مجال ہے جو کہیں شکن پڑے کتنے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں ایسے کپڑے..... لو اب ماپ لو.....“

یہ کہہ کر شکلیہ نے سانس کے ذریعے اپنا سینہ بھلانا شروع کیا۔ جب اچھی طرح پھول گیا تو سانس روک کر اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ ”لو اب جلدی کرو۔“

جب شکلیہ نے سینے کی ہوا خارج کو تو مومن کو ایسا محسوس ہوا۔ اس کے اندر ریڑ کے کئی غبارے پھٹ گئے ہیں۔ اس نے گھبرا کر کہا۔ ”گزلایئے بی بی جی..... دے آؤں۔“

شکلیہ نے اسے جھٹک دیا۔ ”ذرا ٹھہر جاؤ۔“

یہ کہتے ہوئے کپڑے کا گز اس کے نئے بازو سے لپٹ گیا۔ جب شکلیہ نے اسے اتارنے کی کوشش کی تو مومن کو اس کی سفید بغل میں کالے کالے بالوں کا ایک گچھا نظر آیا۔ مومن کی اپنی بگلوں میں بھی ایسے ہی بال اگ رہے تھے مگر یہ گچھا اسے بہت بھلا معلوم ہوا۔ ایک سنسنی سی اس کے سارے بدن میں دوڑ گئی۔ ایک عجیب و غریب خواندہ اس کے دل میں پیدا ہوئی کہ یہ کالے کالے بال اس

کی مونچھیں بن جائیں۔ بچپن میں وہ بھٹوں کے کالے اور سنہری بال نکال کر اپنی مونچھیں بنایا کرتا تھا۔ ان کو اپنے بالائی ہونٹ پر جماتے وقت جو سرسراہٹ اسے محسوس ہوا کرتی تھی۔ اسی قسم کی سرسراہٹ اس خواہش نے اس کے بالائی ہونٹ اور ناک میں پیدا کر دی۔

شکیلہ کا بازو اب نیچے جھک گیا تھا اور بغل چھپ گئی تھی مگر مومن اب بھی کالے بالوں کا وہ گچھا دیکھ رہا تھا۔ اس کے تصور میں شکیلہ کا بازو دیر تک ویسے ہی اٹھارہا اور بغل میں اس کے سیاہ بال جھانکتے رہے۔

تھوڑی دیر کے بعد شکیلہ نے مومن کو گز دے دیا اور کہا۔ ”جاؤ.....“ واپس دے آؤ۔ کہنا بہت بہت شکریہ ادا کیا ہے۔“

مومن گز واپس دے کر باہر صحن میں بیٹھ گیا۔ اس کے دل و دماغ میں دھندلے دھندلے خیال پیدا ہو رہے تھے۔ دیر تک وہ ان کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے غیر ارادی طور پر اپنا چھوٹا سا ٹرک کھولا جس میں اس نے عید کے لیے نئے کپڑے بنوا کر رکھے تھے۔

جب ٹرک کا ڈھکنا کھلا اور نئے لٹھے کی بو اس کی ناک تک پہنچی تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ نہادھو کر اور یہ نئے کپڑے پہن کر وہ سیدھا شکیلہ بنی بی کے پاس جائے اور اسے سایم کرے..... اس کی لٹھے کی شلوار کس طرح کھڑکھڑ کرے گی اور اس کی رومی ٹوپی.....

رومی ٹوپی کا خیال آتے ہی مومن کی نگاہوں کے سامنے اس کا پسندنا آ گیا اور پسندنا فوراً ہی ان کالے کالے بالوں کے گچھے میں تبدیل ہو گیا جو اس نے شکیلہ کی

بغل میں دیکھا تھا۔ اس نے کپڑوں کے نیچے سے اپنی نئی رومی ٹوپی نکالی اور اس کے نرم اور نکلیے پھند نے پر ہاتھ پھیرنا شروع ہی کیا تھا کہ اندر سے شکلیہ بی بی کی آواز آئی۔ ”مومن!“

مومن کی زبان میں لکنت پیدا ہو گئی۔ ”نہیں بی بی جی!“

”تو کیا کر رہے تھے؟“

”کچھ..... کچھ بھی نہیں؟“

”کچھ تو ضرور کرتے ہو گے۔“ شکلیہ یہ سوال کیے جا رہی تھی مگر اس کا حسیان اصل میں بلاؤز کی طرف تھا جسے اب اسے کچا کرنا تھا۔

مومن نے کھسیانی نہیں کے ساتھ جواب دیا۔ ”ٹرنک کھول کر اپنے منے کپڑے دیکھ رہا تھا۔“

شکلیہ کھلکھلا کر نہیں۔ رضیہ نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

شکلیہ کو ہنستے دیکھ کر مومن کو ایک عجیب سی تسکین محسوس ہوئی اور اس تسکین نے اس کے دل میں یہ خواہش پیدا کی کہ وہ کوئی ایسی منہکاہ خیز طور پر احمقانہ حرکت کرے جس سے شکلیہ کو اور زیادہ ہنسنے کا موقع ملے۔ چنانچہ لڑکیوں کی طرح جھینپ کر اور لہجے میں شرمات پیدا کر کے اس نے کہا۔ ”بڑی بی بی جی سے پیسے لے کر میں ریشمی رومال بھی لاؤں گا۔“

شکلیہ نے ہنستے ہوئے اس سے پوچھا۔ ”کیا کرو گے اس رومال کو؟“

مومن نے جھینپ کر جواب دیا۔ ”گھٹے میں باندھ لوں گا بی بی جی.....“

بڑا اچھا معلوم ہو گا۔“

یہ سن کر شکلیہ اور رضیہ دونوں دیر تک ہنستی رہیں۔

”گھٹے میں باندھو گے تو یاد رکھنا اسی سے پھانسی دے دوں گی۔“ یہ کہہ کر شکلیہ نے اپنی ہنسی دبانے کی کوشش کی اور رضیہ نے کہا ”کمبخت نے مجھے کام ہی بھلا دیا رضیہ میں نے اسے کیوں بلایا تھا؟“

رضیہ نے جواب نہ دیا اور وہ نئی فلمی طرز نگہنانا شروع کر دی جو وہ دو روز سے سیکھ رہی تھی۔ اس دوران میں شکلیہ کو خود ہی یاد آ گیا کہ اس نے مومن کو کیوں بلایا تھا۔ ”دیکھو مومن! میں تمہیں یہ بنیان اتار کر دیتی ہوں۔ دو انیوں کے پاس جو ایک دکان نئی کھلی ہے نا، وہی جہاں تم اس دن میرے ساتھ گئے تھے۔ وہاں جاؤ اور پوچھ کے آؤ کہ اہلس چھ بنیانوں کا وہ کیا لے گا..... کہنا ہم چھ لیں گے۔ اس لیے کچھ رعایت ضرور کرے..... سمجھ لیا نا؟“

مومن نے جواب دیا۔ ”جی ہاں!“

”اب تم پرے ہٹ جاؤ۔“

مومن باہر نکل کر دروازے کی اوٹ میں ہو گیا۔ چند لمحات کے بعد بنیان اس کے قدموں کے پاس آ کر اور اندر سے شکلیہ کی آواز آئی۔ ”ہم اسی قسم کی اسی ڈیزائن کی بالکل یہی چیز لیں گے۔ فرق نہیں ہونا چاہیے۔“

مومن نے بہت اچھا کہہ کر بنیان اٹھالیا جو پسینے کے باعث کچھ کچھ گیلا ہو رہا تھا۔ جیسے کسی نے بھاپ پر رکھ کر فوراً ہی ہٹالیا ہو۔ بدن کی بو بھی اس میں نہ ہوئی تھی بیٹھی بیٹھی گرمی بھی تھی۔ یہ تمام چیزیں اس کو بہت بھلی معلوم ہوئیں۔

وہ اس بنیان کو جو بلی کے بچے کی طرح ملائم تھا۔ اپنے ہاتھوں میں مستابا ہر چلا

گیا۔ جب بھاؤ وادو دریافت کر کے بازار سے واپس آیا تو بٹھیلہ بلاؤز کی سلائی شروع کر چکی تھی اس اووی اووھی ساٹن کے بلاؤز کی جو مومن کی رومی ٹوپی کے پھندے سے کہیں زیادہ چمکیلی اور چمکدار تھی۔

یہ بلاؤز شاید عید کے لیے تیار کیا جا رہا تھا کیونکہ عید اب بالکل قریب آگئی تھی۔

مومن کو ایک دن میں کئی بار بلایا گیا۔ دھاگہ لانے کے لیے، استری نکالنے کے لیے، سوئی ٹوٹ گئی تو نئی سوئی لانے کے لیے شام کے قریب جب بٹھیلہ نے دوسرے روز پر باقی کام اٹھا دیا تو وہ دھاگے کے ٹکڑے اور اووی ساٹن کی بیکار کتڑیں اٹھانے کے لیے بھی اسے بلایا گیا۔

مومن نے اچھی طرح جگہ صاف کر دی۔ باقی سب چیزیں اٹھا کر باہر پھینک دیں۔ مگر ساٹن کی چمکیلی کتڑیں اپنی جیب میں رکھ لیں..... بالکل بے مطلب کیونکہ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ ان کا کیا کرے گا؟

دوسرے روز اس نے جیب سے کتڑیں نکالیں اور الگ بیٹھ کر ان کے دھاگے الگ کرنے شروع کر دیئے۔ دیر تک وہ اس کھیل میں مشغول رہا۔ حتیٰ کہ دھاگے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کا ایک گچھا سا بن گیا۔ اس کو ہاتھ میں لے کر وہ دباتا رہا۔ مسلتا رہا۔ لیکن اس کے تصور میں بٹھیلہ کی وہی بغل تھی جس میں اس نے کالے کالے بالوں کا ایک چھوٹا سا گچھا دیکھا تھا۔

اس دن بھی اسے بٹھیلہ نے کئی بار بلایا..... اووی ساٹن کے بلاؤز کی ہر ٹھیک اس کی نگاہوں کے سامنے آتی رہی۔ پہلے جب اسے کچا کیا گیا تھا تو اس پر

سفید دھاگے کے بڑے بڑے ٹانگے جا بجا پھیلے ہوئے تھے۔ پھر اس پر استری کی گئی جس سے سب شکنیں دور ہو گئیں اور چمک بھی دوبالا ہو گئی۔ اس کے بعد کچی حالت ہی میں شکلیہ نے اسے پہنا۔ رضیہ کو دکھایا۔ دوسرے کمرے میں سنگھار میز کے پاس آئینے میں خود کو ہر پہلو سے اچھی طرح دیکھا۔ جب پورا اطمینان ہو گیا تو اسے اتارا۔ جہاں جہاں تنگ یا کھلا تھا وہاں نشان بنائے۔ اس کی ساری خامیاں دور کیں۔ ایک بار پھر پہن کر دیکھا جب بالکل فٹ ہو گیا تو پکی سلامتی شروع کی۔ ادھر سائن کا یہ بلاؤز سیاہاں تھا۔ ادھر مومن کے دماغ میں عجیب و غریب خیالوں کے ٹانگے سے ادھر رہے تھے۔ جب اسے کمرے میں بلایا جاتا اور اس کی نگاہیں چمکیلی سائن کے بلاؤز پر پڑتیں تو اس کا جی چاہتا کہ وہ ہاتھ سے چھو کر اسے دیکھے صرف چھو کر ہی نہیں۔ بلکہ اس کی ملائم اور نرمیں دامن پر دیر تک ہاتھ پھیرتا رہے۔ اپنے کھر درے ہاتھ۔

اس نے ان سائن کے ٹکڑوں سے ان کی ملائمت کا اندازہ کر لیا تھا۔ دھاگے جو اس نے ٹکڑوں سے نکالے تھے اور بھی زیادہ ملائم ہو گئے تھے۔ جب اس نے ان کا گچھا بنایا تو دباؤ وقت اسے معلوم ہوا تھا کہ ان میں ربر کی سی ٹپک بھی ہے۔ وہ جب بھی اندر آ کر بلاؤز کو دیکھتا۔ ان کا خیال فوراً ان بالوں کی طرف دوڑ جاتا جو اس نے شکلیہ کی بغل میں دیکھے تھے۔ کالے کالے بال۔ مومن سوچتا تھا کیا وہ بھی اس سائن ہی کی طرح ملائم ہوں گے؟

بلاؤز بالآخر تیار ہو گیا۔ مومن کمرے کے فرش پر گیا، کپڑا پھیر رہا تھا۔ کہ شکلیہ اندر آئی۔ قمیض اتار کر اس نے پلنگ پر رکھی۔ اسی کے نیچے اسی قسم کا سفید

بنیان تھا۔ جس کا نمونہ لے کے مومن بھاؤ دریافت کرنے گیا تھا..... اس کے اوپر کشلیہ نے اپنے ہاتھ کا سلاہوا بلاؤز پہنا۔ سامنے کے ہک لگائے اور آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

مومن نے فرش صاف کرتے ہوئے آئینہ کی طرف دیکھا۔ بلاؤز میں اب جان سی پڑ گئی تھی۔ ایک دو جگہ پر وہ اس قدر چمکتا تھا کہ معلوم ہوتا تھا سائیں کا رنگ سفید ہو گیا ہے..... کشلیہ کی پیٹھ مومن کی طرف تھی جس پر ریڑھ کی ہڈی کی لمبی چھری بلاؤز فٹ ہونے کے باعث اپنی پوری گہرائی کے ساتھ نمایاں تھی۔ مومن سے رہانہ گیا۔ چنانچہ اس سے کہا۔ ”بی بی جی! آپ نے درزیوں کو بھی مات کر دیا ہے۔“

کشلیہ اپنی تعریف سن کر خوش ہوئی مگر وہ رضیہ کی رائے طلب کرنے کے لیے بے قرار تھی۔ اس لیے وہ صرف ”اچھا ہے نا“ کہہ کر باہر دوڑ گئی..... مومن آئینے کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ جس میں بلاؤز کا سیاہ اور چمکیلا عکس دیر تک موجود رہا۔

رات کو جب وہ پھر اس کمرے میں صراحی رکھنے کے لیے آیا تو اس نے کھوئی پر نکلڑی کے پینگر میں اس بلاؤز کو دیکھا۔ کمرے میں کوئی موجود نہیں تھا۔ چنانچہ آگے بڑھ کر پہلے اس نے غور سے دیکھا۔ پھر ڈرتے ڈرتے اس پر ہاتھ پھیرا۔ ایسا کرتے ہوئے یوں لگا کہ کوئی اس کے جسم کے ملائم رویوں پر ہولے ہولے بالکل ہوائی لمس کی طرح ہاتھ پھیر رہا ہے۔

رات کو جب وہ سویا تو اس نے کئی اوٹ پناگ خواب دیکھے..... ڈپٹی

صاحب نے پتھر کے کونلوں کا ایک بڑا ڈھیر اسے کوٹنے کو کہا۔ جب اس نے ایک کونلا اٹھایا اور اس پر ہتھوڑے کی ضرب لگائی تو وہ نرم نرم بالوں کا ایک گچھا بن گیا..... یہ کالی کساند کے مہین مہین تار تھے۔ جن کا گولا بنا ہوا تھا پھر یہ گولے کالے رنگ کے غبارے بن کر ہوا میں اڑنا شروع ہوئے..... بہت اوپر جا کر یہ پھٹنے لگے..... پھر آندھی آگئی اور مومن کی رومی ٹوپی کا پھندا کہیں غائب ہو گیا..... پھندا نے کی تلاش میں وہ نکلا..... دیکھی ان دیکھی جگہوں میں گھومتا رہا..... نئے لٹھے کی بو بھی کہیں سے آنا شروع ہوئی پھر نہ جانے کیا ہوا..... ایک کالی سائن کے بلاؤز پر اس کا ہاتھ پڑا..... کچھ دیر وہ اس دھڑکتی ہوئی چیز پر اپنا ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر دفعتاً ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا جھوڑی دیر تک تو وہ کچھ نہ سمجھ سکا کہ کیا ہو گیا ہے اس کے بعد اسے خوف اور تعجب اور ایک انوکھی ٹیس کا احساس ہوا، اس کی حالت اس وقت عجیب و غریب تھی، پہلے اسے تکلیف دہ حرارت محسوس ہوئی تھی، مگر چند لمحات کے بعد ایک ٹھنڈی سی لہر اس کے جسم پر رینگنے لگی۔

بلونت سنگھ مجھیا

شاہ صاحب سے جب میری ملاقات ہوئی تو ہم فوراً بے تکلف ہو گئے۔ مجھے صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ سید ہیں اور میرے دور دراز کے رشتے دار بھی ہیں۔ وہ میرے دور یا قریب کے رشتہ دار کیسے ہو سکتے تھے، اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ سید تھے اور میں ایک محض کشمیری۔

بہر حال ان سے میری بے تکلفی بہت بڑھ گئی۔ ان کو ادب سے کوئی شغف نہیں تھا۔ لیکن جب ان کو معلوم ہوا کہ میں افسانہ نگار ہوں تو انہوں نے مجھ سے میری چند کتابیں مستعار لیں اور پڑھیں۔

یہ کتابیں جو کہ افسانوں کے مجموعے تھیں، انہوں نے پڑھیں اور مجھے بہت تعجب ہوا کہ انہوں نے چند افسانوں کی بہت تعریف کی۔ اتفاق سے یہ افسانے ایسے تھے جو ادبی دنیا میں شاہکار تسلیم کیے جا چکے تھے۔

شاہ صاحب میرے پڑوسی تھے۔ انہوں نے ایک مکان الاٹ کر رکھا تھا۔ لیکن خاندان کے افراد چونکہ زیادہ تھے اس لیے انہوں نے اپنے فلیٹ کے نیچے موٹر گیراج پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ اس میں انہوں نے اپنی بیٹھک کا انتظام کیا تھا۔ اوپر زمانہ تھا، شاہ صاحب کے دوست یا ربے شمار تھے اس لیے اس گیراج میں وہ ان کی خاطر عداوت کرتے تھے۔

ایک دن ان سے افسانوں کے بارے میں باتیں ہوئیں تو انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”میری زندگی میں ایسی کئی حقیقتیں ہیں جن کو تم افسانے بنا کر پیش کر سکتے

ہو۔“

میں بروقت فسانوں کی تلاش میں رہتا ہوں۔ چنانچہ میں فوراً متوجہ ہوا اور شاہ صاحب سے کہا۔ ”مجھے امید ہے کہ آپ اچھا مواد دیں گے!“

شاہ صاحب نے جواباً کہا۔ ”میں افسانہ نگار نہیں..... لیکن میری زندگی میں ایک ایسا واقعہ ہوا ہے جو قابل ذکر ہے..... میں نے قابل ذکر اس لیے کہا ہے کہ آپ بہت بڑے افسانہ نگار ہیں۔ ورنہ یہ واقعہ جو میں اب بیان کرنے والا ہوں میرے نزدیک بے حد حیرت انگیز ہے۔“

شاہ صاحب نے کہا ”جی! میں نہیں کہہ سکتا کہ جو واقعہ میں آپ کو سنانے والا ہوں، ہر شخص کے لیے حیرت کا باعث ہوگا..... میں صرف اپنی ذات کے متعلق آپ سے عرض کر رہا ہوں..... اور یہ حقیقت ہے کہ میں جو داستان آپ کو سناؤں گا، اس وقت تک میری زندگی میں محیر العقول حیثیت رکھتی ہے۔“

شاہ صاحب نے ”نیل کٹر“ سے اپنے ناخن کاٹنے شروع کیے میں ان کی داستان سننے کے لیے بے تاب تھا، مگر شاید وہ آواز کے متعلق سوچ رہے تھے کہ اپنی داستان کو کہاں سے شروع کریں۔ میرا خیال درست تھا کہ جو کچھ ان پر بیتا تھا اس کو کئی برس ہو چکے تھے وہ تمام واقعات کی یاد اپنے ذہن میں تازہ کر رہے تھے۔

میں نے سگریٹ ساگایا۔ انہوں نے اپنی دس انگلیوں کے ناخن کاٹ کر ”نیل کٹر“ تپائی پر رکھا اور مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ”میں ان دنوں کاہل میں تھا۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمحات خاموش رہے، اس کے بعد بولے۔ ”میری ہاں بہت بڑی دکان تھی جس میں بڑھیا سے بڑھیا سامان موجود رہتا تھا۔“

میں نے شاہ صاحب کی یہ خود تعریفی سنی اور ان سے کہا۔ ”یقیناً آپ بہترین سلیزمین ہیں کہ آپ کی گفتگو کا اندازہ ہی اس کا ثبوت ہے۔“

شاہ صاحب مسکرائے۔ ”مگر مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی داستان بہترین سلیزین کے انداز بیان میں بیان نہیں کر سکوں گا۔“

میں نے ان سے کہا۔ ”آپ شروع تو کیجیے۔“

شاہ صاحب نے چند لحظات اپنے حافظے کو پھر نوا اور اپنی داستان شروع کی۔ ”منو صاحب! جیسا کہ میں آپ سے پہلے عرض کر چکا ہوں، میں کابل میں تھا۔ یہ کوئی دس برس پہلے کی بات ہے جب میری صحت بہت اچھی تھی۔ یوں تو میں اب بھی تنومند کہلاتا ہوں، مگر اس زمانے میں میرا جسم آج کے مقابلے میں دگنا تھا۔ ہر روز ورزش کرتا تھا، سیکڑوں ڈنر پھیلتا تھا، ملکہ رگھماتا تھا۔ سگریٹ پیتا تھا نہ شراب، بس ایک اچھا کھانے کی عادت تھی۔ افغانی نہیں، ہندوستانی، چنانچہ میں امرتسر سے اپنے ساتھ ایک بہت اچھا کشمیری باورچی لے گیا تھا جو ہر روز میرے لیے لذیذ سے لذیذ کھانے تیار کر کے میز پر رکھتا تھا میری زندگی بڑی ہموار گزر رہی تھی۔ آمدن بہت معقول تھی۔ بینک میں لاکھوں افغانی روپے جمع تھے..... لیکن.....“

شاہ صاحب تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔ میں نے ان سے پوچھا۔ ”لیکن کہہ کر آپ چپ ہو گئے..... اس کا یہ مطلب نہیں نکلتا کہ آپ پھر بھی ناخوش تھے۔“

شاہ صاحب نے اعتراف کیا ”جی ہاں! میں ان تمام آسائشوں کے باوجود ناخوش تھا..... اس لیے کہ میں اکیلا تھا..... مجرد تھا..... اگر میری دکان میں عورتیں اور لڑکیاں زیادہ نہ آتیں تو بہت ممکن ہے کہ مجھے اپنے تجربہ کا احساس نہ ہوتا.....“

لیکن معاملہ اس کے برعکس تھا کابل کی ہر صاحب ثروت عورت میری دکان میں آتی تھی..... دکان میں داخل ہوتے ہی یہ عورتیں اور لڑکیاں اپنا برقع اتار کر ایک طرف رکھتیں اور سودا خریدنے میں مصروف ہو جاتیں..... منو صاحب! آپ کا شاید یہ خیال ہو کہ وہ بڑا شرعی قسم کا لباس پہنتی ہوں گی، مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یوں تو وہ ہاں کی عورتیں اور لڑکیاں پردہ کرتی ہیں مگر لباس ٹھیک یورپین پہنتی ہیں۔ سکرٹ، کٹے ہوئے بال، رنگے ہوئے ناخن، پنڈلیاں نگلی..... جب وہ میری دکان میں آتی تھیں تو اپنے برقعے اتار کر ایک طرف رکھ دیتی تھیں اور مال دیکھنے میں مصروف ہو جاتی تھیں۔“

شاہ صاحب نے بولنا بند کیا تو میں نے ان سے پوچھا ”آپ کو ان میں سے کسی سے محبت تو یقیناً ہو گئی ہو گی۔“

شاہ صاحب بہت سنجیدہ ہو گئے۔ ”جی ہاں! ایک لڑکی سے ہوئی تھی، جو اپنا برقع نہیں اتارتی تھی، حتیٰ کہ نقاب بھی نہیں اٹھاتی تھی۔“
میں نے ان سے پوچھا۔ ”کون تھی وہ؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”ایک بہت بڑے گھرانے سے متعلق تھی۔ اس کا باپ فوج کا اعلیٰ افسر تھا۔ بڑا سخت گیر..... مجھے اس سے صرف اس لیے محبت ہوئی کہ وہ ہاتھوں کے علاوہ اپنے جسم کا کوئی حصہ نہیں دکھاتی تھی۔“
میں نے پوچھا۔ ”اس کی وجہ؟“

شاہ صاحب نے کہا ”مجھے معلوم نہیں اور نہ میں نے اس سے کبھی اس بارے میں استفسار ہی کیا..... لیکن میرے تصور میں وہ انتہا درجے کی حسین تھی۔“

گوری چٹی..... جسم خواہ برقعے میں لپیٹا ہو، لیکن اس کے تناسب کے متعلق اندازہ لگانا کوئی اتنا زیادہ مشکل نہیں تھا..... میں نے چور آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ وہ جوانی کا آؤرش مجسمہ ہے..... لیکن مصیبت یہ تھی کہ وہ چند منٹوں کے لیے میری دکان میں آتی تھی۔ چیزیں خریدنے اور ان کی قیمتوں کے بارے میں فیصلہ کرنے میں چند منٹ صرف کرتی تھی اور چلی جاتی تھی۔“

میں نے شاہ صاحب سے پوچھا۔ ”یہ سلسلہ کب تک جاری رہا.....؟“

”قریب قریب چھ مہینے تک..... مجھ میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ میں اس سے اپنی محبت کا اظہار کروں۔ میں اس سے بہت مرعوب تھا، اس لیے کہ وہ دوسروں سے مختلف تھی۔ اس میں ایک عجیب قسم کی رعونت تھی..... میں اس کو بے طرح گھورتا تھا، حالانکہ یہ شائستگی نہیں تھی۔ لیکن میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا..... منٹو صاحب! ایک دن میں دکان میں بیٹھا اس کے متعلق سوچ رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ نوکر نے ریسپورڈ اٹھایا اور مجھ سے کہا کہ کوئی خاتون آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں..... میں نے سوچا کہ کوئی گاہک ہوگی اور نئے مال کے متعلق پوچھنا چاہتی ہوگی۔ اٹھ کر میں نے ریسپورڈ ہاتھ میں لیا اور پوچھا، مادام آپ کیا چاہتی ہیں؟ ادھر سے آواز آئی، کیا آپ سید مظفر علی ہیں؟ میں نے جواب دیا، جی ہاں..... ارشاد!..... اب میں نے آواز پہچان لی تھی..... یہ اسی کی تھی..... اس کی جو میری دکان میں برقع نہیں اتارتی تھی..... میں گھبرا گیا..... منٹو صاحب! یہ عاشق ہونا بھی ایک عجیب لعنت ہے۔“

یہ سن کر میں مسکرایا۔ ”آپ ٹھیک فرماتے ہیں شاہ صاحب..... لیکن

افسوس ہے کہ میں اس لعنت میں ابھی تک گرفتار نہیں ہوا۔“
 شاہ صاحب کو بہت افسوس ہوا۔ ”حد ہو گئی ہے۔۔۔ انسان اپنی جوانی میں کم از کم ایک مرتبہ تو ضرور عشق میں گرفتار ہوتا ہے۔۔۔ خیر، آپ کو ابھی تک عشق نہیں ہوا تو خدا کرے کہ بہت جلد ہو جائے، کیونکہ یہ مرض بہت دلچسپ ہے۔“
 میں نے مسکرا کر شاہ صاحب سے کہا۔ ”آپ اپنی داستان بیان کیجیے۔۔۔ مجھے عشق ہو گا تو میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو اس کی پوری روئیدار سنا دوں گا۔“

شاہ صاحب کرسی پر سے اٹھ کر پلنٹری پر لیٹ گئے اور آنکھیں بند کر لیں۔
 ”منٹو صاحب۔۔۔ میں اس لڑکی کے عشق میں اس بری طرح گرفتار ہوا کہ ورزش بھول گیا۔۔۔ وہ میری دکان پر اکثر آتی تھی۔۔۔ میں اس کو گھورتا تھا۔۔۔ لیکن دیکھئے میرا دماغ کتنا خراب ہو گیا ہے یہ اسی عشق خانہ خراب کا باعث ہے۔۔۔ میں آپ سے اس کے ٹیلیفون کی بات کر رہا تھا۔۔۔ جب میں نے ریسیور اٹھایا اور اس کی آواز پہچان لی تو اس نے مجھ سے کہا دیکھو میں جب بھی تمہاری دکان میں آتی ہوں، تم مجھے گھورتے ہو۔ اگر اپنی خیریت چاہتے ہو تو ٹھیک ہو جاؤ ورنہ تمہارے حق میں بہت برا ہو گا۔۔۔ منٹو صاحب میں جواب سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے ٹیلیفون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔۔۔ میں دیر تک گونگے ریسیور کو کان کے ساتھ لگائے کھڑا رہا اور سوچتا رہا کہ اس دھمکی کا مطلب کیا ہے۔“

میں نے شاہ صاحب سے پوچھا ”کیا وہ دھمکی اصلی تھی؟“
 ”جی ہاں۔۔۔ چوتھے روز وہ میری دکان میں آئی تو میں نے اس کی نقاب کی

طرف پھر انہی نگاہوں سے دیکھا تو اس نے جھنجھلا کر میرے ملازموں کے سامنے
مجھ سے کہا..... تمہیں شرم نہیں آتی کہ تم مجھے اس طرح دیکھتے ہو..... میں سن ہو گیا
..... لیکن اس نے چند چیزیں خریدیں..... دام دیئے اور اپنی موٹر میں بیٹھ کر چلی
گئی۔“

میں شاہ صاحب کی داستان میں کافی دلچسپی لے رہا تھا۔ ”عجیب لڑکی تھی.....
آپ سے اسے نفرت بھی تھی، مگر اس کے باوجود آپ کی دکان میں آتی تھی۔“
شاہ صاحب نے آنکھیں کھولیں۔ ”منو صاحب! یہی وجہ تھی کہ میرے دل
میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس کی نفرت و حقارت مصنوعی ہے وہ دراصل وہ میری محبت
سے متاثر ہو چکی ہے اور محض بناوٹ کے طور پر غصے کا اظہار کرتی ہے..... لیکن
جب ایک روز اس نے مجھے بہت زور سے لعن طعن کی تو میں مرد ہو گیا..... پر اس کی
محبت تھی جو میرے دل سے جاتی ہی نہیں تھی..... میں نے بہت کوشش کی کہ اس کو
بھول جاؤں..... میں نے خود کو سمجھایا کہ تم عجیب بے وقوف ہو۔ ایک لڑکی جس کی
تم نے شکل نہیں دیکھی..... جو تم سے نفرت کرتی ہے، تم اس سے عشق فرما رہے ہو۔
باز آؤ، تمہارا کاروبار ماشاء اللہ بہت اچھا ہے۔ سارے افغانستان میں تمہاری
ساکھ ہے۔ یہ کیا جھک مار رہے ہو..... لیکن منو صاحب عشق بہت بری بلا ہے میں
اس سے اپنا پیچھا نہ چھڑا سکا.....“

میں نے ان سے کہا ”آپ خواہ مخواہ داستان طویل بناتے جا رہے ہیں۔
انجام پر پہنچئے“

شاہ صاحب پلٹنڑی پر سے اٹھے اور کرسی پر بیٹھ گئے۔ ”حضرت ایسی

داستانیں اکثر طویل ہوا کرتی ہیں۔ عشق ایک مرض ہے اور جب تک طول نہ پکڑے، مرض نہیں ہوتا۔ محض ایک مذاق ہوتا ہے۔۔۔۔۔ خیر، اب جبکہ آپ چاہتے ہیں کہ میں اپنی داستان طویل نہ بناؤں تو مختصر طور پر عرض کرتا ہوں کہ میرا عشق جب بہت شدت اختیار کر گیا تو ایک روز میں بے اختیار رونے لگا۔ میرے شہر امرتسر کا ایک باشندہ سردار بلونت سنگھ تھا جو مجھے کے ایک اچھے خاندان کا فرد تھا۔ وہ کابل میں ایک انجینئرنگ فرم میں ملازم تھا۔ کھانے پینے والا آدمی تھا، اس لیے وہ ہر مہینے مجھ سے پچاس ساٹھ روپے قرض لے جاتا تھا۔ مزید قرض لینے کی غرض ہی سے وہ اس وقت میری دکان میں آیا جب کہ میری آنکھیں نمناک تھیں۔ وہ میرے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے معلوم نہیں مجھ سے کیا پوچھا اور میں نے جانے کیا جواب دیا لیکن جب اس نے مجھ سے یہ کہا۔ ”دوست تم کو کوئی روگ لگ گیا ہے۔“ تو میں چونک پڑا۔ ”نہیں نہیں۔۔۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔ سردار بلونت سنگھ مجھے اپنی گھنی مونچھوں کے اندر مسکرایا۔۔۔۔۔ تم جھوٹ بولتے ہو، صاف صاف بتاؤ، تمہیں یہاں کسی سے عشق ہوا ہے۔۔۔۔۔ میں خاموش رہا تو وہ پھر بولا، دیکھو اگر کوئی مشکل درپیش ہے تو ہم سب ٹھیک کر دیں گے۔۔۔۔۔ جب اس نے اسی قسم کی چند اور باتیں کہیں تو میں نے سارا معاملہ اس کو بتا دیا۔“

میں نے پوچھا ”تو اس نے مشکل آسان کرنے کا کیا گرتایا؟“

شاہ صاحب نے کہا۔ ”اس نے مجھے ایک منتر بتایا“

”منتر؟“

”جی ہاں!“

”آپ سید ہیں..... کیا آپ منتر جنتر پر ایمان لاسکتے ہیں؟“

شاہ صاحب نے کہا۔ ”اانا تو نہیں چاہیے تھا کہ یہ ہمارے مذہب میں جائز نہیں..... لیکن اس وقت سردار بلونت سنگھ کا مشورہ ماننا ہی پڑا، اس لیے کہ عشق بری بلا ہے..... اس نے مجھے ایک منتر بتایا اور کہا کہ سات رنگوں کے پھول لو۔ ان میں سے ہر ایک پر یہ منتر پڑھ کر پھونکو اور منزل کے روز اس لڑکی کو کسی نہ کسی طریقے سے سنگھارو..... یہ منتر مجھے ابھی تک یاد ہے۔“

میں نے ان سے کہا۔ ”ذرا سنائیے تو“

شاہ صاحب نے ایک ٹھٹھے کے لیے اپنے حافٹے کو ٹٹولا اور کہا:-

دیوی	دس	کھیا	کورو
بھل	کھڑے	پھل	بھل
پیارے	تاہر	سنگھ	پھل
جو	کوبی	لے	پھلوں
کبھی	نہ	چھوڑے	ہمارا
ہمیں	چھوڑ	کسی	اور
پیٹ	پھول	بجسم	ہو
دہائی	سلیمان	پیر	پیغمبر

میں نے یہ منتر سنا تو مجھے اپنا لڑکپن یاد آ گیا جب میں نے منتروں کی ایک کتاب خریدی تھی اور اس میں سے ایک منتر ازبر اس غرض سے کیا تھا کہ میں سکول کے تمام امتحانوں میں پاس ہوتا چلا جاؤں..... یہ منتر مجھے اب تک یاد ہے

.....اونگ نما کا مشیری اتمادے بھرنگ پر اسواہ..... لیکن اس کے پڑھنے کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ میں نویں جماعت میں فیل ہو گیا تھا۔

میں نے اس منتر کا ذکر شاہ صاحب سے نہ کیا اور ان سے پوچھا۔ ”تو آپ نے سات رنگ کے پھولوں پر یہ منتر پڑھا؟“

”جی ہاں..... وہ آئی..... اس نے مجھے سیلفیون پر کہہ دیا تھا کہ وہ آئے گی۔ شام کو پانچ بجے کے قریب۔ میں اس کا انتظار کرتا رہا۔ وہ ٹھیک پانچ بج کر پانچ منٹ پر آئی اور اس نے چیکو سلوا کیا کے مال کے متعلق استفسار کیا۔ عرض یہ ہے کہ مال وال کا قصہ بالکل فراڈ تھا..... میں نے اس سے کہا کہ ملازموں نے ابھی تک پیٹیاں نہیں کھولیں، آپ کل تشریف لائیے گا۔ وہ بہت جریز ہوئی، میں منتر پڑھنے پھولوں کی طرف دیکھ رہا تھا..... اتفاق کی بات کہ اس نے بھی ان پھولوں کی طرف دیکھا اور مجھ سے کہا، یہ پھول تمہاری میز پر کہاں سے آگئے؟..... میں نے جواب دیا، یہ میں نے آپ کے لیے خریدے تھے۔ اگر آپ کو پسند ہوں..... میرا مطلب ہے اگر آپ کو ان کی خوشبو پسند ہو۔ تو آپ انہیں قبول فرمائیں..... اس نے وہ سات پھول اٹھائے اور انہیں سونگھا۔“

میں نے ان سے پوچھا ”اس لڑکی کا ردِ عمل کیا تھا؟“

شاہ صاحب نے جواب دیا۔ ”اس نے ناک بھونچہ کر کہا..... یہ پھول ہیں؟..... ان میں تو خوشبو ہے نہ بدبو..... بہر حال اس نے وہ پھول سونگھے..... چند چیزیں خریدیں اور چلی گئی..... شام کو سردار بلونت سنگھ مجھے میا میری دکان پر آیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا..... کہ وہ پھول سنگھا دیئے؟ میں نے اس سے کہا۔ سنگھا تو

دینے ہیں، لیکن اس کا نتیجہ کیا نکلے گا، یہ مجھے معلوم نہیں۔ سردار بلونت سنگھ ہنسنا۔ اس نے بڑے زور سے میرا ہاتھ دبایا اور کہا دوست! اب تمہارا کام سمجھو کہ پندرہ آنے ہو گیا ہے۔“

مجھے بڑی حیرت تھی کہ منتر کے ذریعے سے ایسا کام پندرہ آنے کیونکر ہو سکتا ہے، مگر سید صاحب نے کہا شروع کیا۔ ”منو صاحب! آپ یقین ماننے کے میرا کام پندرہ آنے مکمل ہو گیا..... دوسرے دن کو کو جان کا ٹیلیفون آیا کہ وہ کچھ چیزیں خریدنے کے لیے آرہی ہے، میں نے اس کا استقبال کیا..... وہ کوئی چیز خریدنا نہیں چاہتی تھی۔ بہت دیر تک وہ میری دکان میں ادھر ادھر پھرتی رہی۔ اس کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوئی، تم سے کئی مرتبہ کہہ چکی ہوں کہ مجھے گھورا نہ کرو..... اور وہ جو تم نے پھول سنگھائے تھے، اس کا کیا مطلب تھا.....“

میں نے کو کو جان سے لگت بھرے لہجے میں کہا۔ ”میں..... میں..... وہ پھول جو تھے..... پھول تھے..... میں نے..... میں نے..... مال جو چیکو سلووا کیا سے آیا تھا، کھلا ہوا نہیں تھا اس لیے میں نے وہ پھول آپ کی خدمت میں پیش کر دیئے..... کو کو جان برقعے میں سخت مضطرب تھی..... اس نے اضطراب بھرے لہجے میں کہا۔ تم نے مجھے پھول کیوں سنگھائے؟“..... میں نے اس سے بڑے معصومانہ انداز میں پوچھا ”کیا آپ کو اس سے کوئی تکلیف ہوئی.....؟“ وہ بڑے گرم انداز میں بولی ”تکلیف.....؟ میں ساری رات وہ سات پھول دیکھتی رہی ہوں..... پھول آتے تھے اور جب میں انہیں حاصل کرنا چاہتی تھی تو وہ مجھ سے پڑے ہٹ جاتے تھے..... یہ کیسے پھول تھے؟ میں نے جواب دیا ”میرے وطن کے تھے“

..... چونکہ میرے وطن کے تھے اس لیے میں نے آپ کی خدمت میں پیش کیے
..... لیکن مجھے حیرت ہے کہ وہ رات بھر آپ کو کیوں نظر آتے اور ستاتے رہے۔“
میں نے شاہ صاحب سے پوچھا ”یہ پھول آپ نے کہاں سے منگوائے
تھے؟“

شاہ صاحب نے جواب دیا ”جی! منگوائے کہاں سے تھے وہیں افغانستان
کے تھے..... نہایت وایات قسم کے پھول، جن میں خوشبو نام کو بھی نہیں تھی.....
شام کو سردار بلونت سنگھ آیا، مزید قرض لینے کے لیے۔ اس نے مجھ سے قرض لینے
سے پہلے دریافت کیا، کہیے شاہ صاحب، اس معاملے کا کیا ہوا؟ میں نے اس کو
ساری بات بتادی..... وہ قرض لینا بھول گیا۔ اپنا بالوں بھر ابا تھ میرے کندھے پر
زور سے مار کر چلایا۔ شاہ جی، آپ کا کام سولہ آنے ہو گیا ہے..... وکی کی ایک
بوتل منگائیے۔“

شاہ صاحب نے مجھے بتایا کہ انہوں نے وکی کی بوتل کے علاوہ ایک ڈبہ
سگریٹوں کا بھی منگوایا جس میں سے سردار بلونت سنگھ مجھے تھپتھپا تمباکو نوشی کے ٹھیٹ
انداز میں پے درپے کئی سگریٹ پھونکتے رہے۔ جب جانے لگے تو انہوں نے شاہ
صاحب سے کہا کہ دیکھو ابھی جموڑی ہی کسر باقی ہے۔ اگلے منگواتم تم اور ساتھ پھول
اور ان پر وہی منتر پڑھ کر اس لڑکی کو سنگھار دو..... بیڑا پار ہو جائے گا.....

شاہ صاحب بہت پریشان ہوئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اب کی کوکو
جان کو پھول کیسے سنگھاسکیں گے جبکہ وہ اس معاملے کے متعلق شام کی تھی لیکن معاملہ
عشق کا تھا، اس لیے شاہ صاحب موت کے منہ میں جانے کے لیے بھی تیار تھے۔

شاہ صاحب نے پشاور سے پھول منگوائے..... ان میں سے سات منتخب کیے اور ہر ایک پر منتر پڑھا اور اپنے میز کے گلداں میں رکھ دیئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی دکان میں جا بجا گلداں رکھوائے اور ان میں پھول سجادیئے۔

پیر کو شاہ صاحب نے کوکو جان کو ٹیلیفون کیا اور اس سے پھر جھوٹ بوالاکہ چیکو سلووا کیا کامال کل گیا ہے، آپ آئیے اور دیکھ لیجیے۔ کوکو جان آئی، مگر مال وال موجود نہیں تھا..... شاہ صاحب تھوڑی دیر کے لیے بوکھلائے، پھر ذرا ہوش سمجھال کر اپنے نوکروں کو عن طعن کی کہ تم نے ابھی تک مال کیوں نہیں کھولا۔

کوکو جان کے ساتھ اس کی والدہ بو بو جان تھی۔ وہ ایک طرف ٹائلٹ کا سامان دیکھنے میں مصروف تھی۔ کوکو جان نے جب دکان میں جا بجا پھول دیکھے تو وہ متعجب ہونے کے علاوہ مضطرب بھی ہوئی۔

میرے میز پر وہ خاص پھول پڑے تھے۔ وہ ان کے پاس آئی گلداں میں سے اٹھا کر اس نے انہیں سونگھا اور مجھ سے کہا ”یہ افغانستان کے پھول نہیں۔“

میں نے جواب دیا۔ ”جی ہاں..... یہ میرے وطن کے ہیں..... اور میں نے خاص آپ کے لیے منگوائے ہیں۔ بو بو جان خرید و فروخت میں مشغول تھی۔ اس دوران میں کوکو جان سے میں نے اپنی والدہانہ محبت کا اظہار کیا۔ وہ سخت ناراض ہوئی اور اپنی ماں کے ساتھ چلی گئی..... شام کو سردار بلونت سنگھ مجھ پر آیا..... اس سے بات چیت ہوئی۔ میں نے اس کو دس روپے قرض دیئے۔ جب اس نے روپے اپنی جیب میں ڈالے تو مجھ سے پوچھا۔ آج منگل ہے..... وہ پھول سنگھادیئے تھے آپ نے؟..... میں نے سارا واقعہ بیان کر دیا..... سردار بلونت

سنگھ نے اپنا بالوں بھرا ہاتھ زور سے میرے ہاتھ پر مارا اور کہا، شاہ جی، اب کام سترہ آنے پورا ہو گیا ہے..... وکی کی ایک بوتل منگاؤ۔“

شاہ صاحب نے وکی کی بوتل منگائی۔ سردار بلونت سنگھ مجھے مٹھیا نے آدھی، دکان میں پی اور آدھی اپنے ساتھ لے گیا۔ میں نے شاہ صاحب سے پوچھا۔ ”دوسری دفعہ پھول سنگھانے سے کیا نتیجہ برآمد ہوا۔“

شاہ صاحب نے جواب دیا ”وہ بہت بے چین ہو گئی۔ اسے دن رات اتنے پھول نظر آنے لگے کہ ایک دن وہ سخت اضطراب کی حالت میں آئی۔ برقع جو اس نے کبھی اتارا نہیں تھا، کیلے کے چھلکے کی طرح اتار کر ایک طرف پھینکا اور مجھ سے مخاطب ہوئی ”دیکھو شاہ! تم نے مجھ پر کبھی جادو کر دیا ہے..... میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا“ جو مجھے پہلی بار نظر آیا تھا منلو صاحب! میں نے اپنی زندگی میں اس جیسی حسین لڑکی اب تک نہیں دیکھی..... میں اس کو دیکھتا رہا..... اس نے بڑے تیز و تند لہجے میں کہا۔ ”تم نے مجھے پھول کیوں سنگھائے تھے..... میں پاگل ہوتی جا رہی ہوں..... دن ہو یا رات، ہر وقت مجھے وہ تمہارے پھول دکھائی دیتے ہیں، مجھے معلوم ہے کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں ایک شریف گھرانے کی لڑکی ہوں۔ میرے والدین غنقریب میری شادی کر رہے ہیں۔ تم نے مجھ پر یہ کیا جادو پھونکا ہے.....“ یہ کہہ کر اس نے میرے میز پر سے گلدان میں سے پھول نکالے اور فرش پر پھینک کر اپنی سینڈل سے مسل دیئے لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ ناراض ہونے کے باوجود ناراض نہیں تھی اور چاہتی تھی کہ میں اس سے باتیں کروں، لیکن مجھے اس کا یقین نہیں تھا اس لیے

میں خاموش رہا۔۔۔۔۔ وہ کچھ دیر غصے کی حالت میں کھڑی رہی۔ اس کے بعد اس نے برقع پہنا اور چلی گئی۔“

میں نے شاہ صاحب سے پوچھا ”تو سردار بلونت سنگھ بھٹیا کا منتر کام کر گیا!“
 ”جی ہاں کام کر گیا۔۔۔۔۔ اس کو پھول ہی پھول نظر آتے تھے میں نے کئی مرتبہ سوچا کہ یہ سب بکواس ہے، مگر کلو جان کی باتوں سے مجھے یقین ہو گیا کہ منتر اپنا اثر کر گیا ہے، حالانکہ جو منتر آپ سن چکے ہیں، اس میں ایسی کوئی بات نہیں جس سے آدمی کو یہ معلوم ہو کہ وہ اثر کرے گا۔۔۔۔۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ جب پھر میری دکان میں آئی تو برقع اتار کر مجھ سے بغل گیر ہو گئی اور رونا شروع کر دیا۔ میں نے اس کو کئی مرتبہ چوما۔ اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ تھوڑی دیر کے بعد میری میز پر گلدان میں جو پھول پڑے تھے اس نے نکالے اور انہیں نوچ کر ایک طرف پھینک دیا۔ اس کے بعد وہ برقع پہن کر تیزی سے باہر نکل گئی۔“

داستان کافی طوالت پکڑ رہی تھی۔ میں نے شاہ صاحب سے کہا ”آپ مختصراً فرمائیے کہ انجام کیا ہوا؟۔۔۔۔۔ کیا وہ لڑکی آپ کو مل گئی؟“

شاہ صاحب نے ایک آہ بھری۔ ”جی نہیں۔۔۔۔۔ اس کی شادی ہو گئی۔ مگر جملہ عروسی میں داخل ہوتے ہی معلوم نہیں کیا ہوا کہ وہ گری اور گرتے ہی مر گئی۔ اس کے ہاتھ میں ساتھ پھول تھے مختلف رنگوں کے۔“

میں نے دیکھا کہ شاہ صاحب کی پائنتزی کے ساتھ تپائی پر پیتل کے پھولدان میں سات مختلف رنگوں کے پھول اڑ سے ہوئے تھے۔

مہنگا من

”پرے بٹے.....“

”کیوں؟“

”مجھے آپ سے بو آتی ہے۔“

”ہر انسان کے جسم کی ایک خاص بو ہوتی ہے..... آج میں برسوں کے بعد تمہیں اس سے تنفر کیوں محسوس ہونے لگا؟“

”میں برس..... اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ میں نے اتنا طویل عرصہ کیسے بسر کیا ہے۔“

”میں نے کبھی آپ کو اس عرصہ میں تکلیف پہنچائی؟“

”جی کبھی نہیں۔“

”تو پھر آج اچانک آپ کو مجھ سے ایسی بو کیوں آنے لگی جس سے آپ کی ناک جو ماشاء اللہ کافی بڑی ہے اتنی غضب ناک ہو رہی ہے۔“

”آپ اپنی ناک تو دیکھئے..... پکوڑا سی ہے۔“

”میں اس سے اٹکا نہیں کرتا..... پکوڑے، تم جانتی ہو مجھے بہت پسند ہیں۔“

”آپ کو تو ہر وہابیات چیز پسند ہوتی ہے..... کوڑے کرکٹ سے بھی آپ دلچسپی لیتے ہیں۔“

”کوڑا کرکٹ ہمارا ہی تو پھیلا یا ہوتا ہے..... اس سے آدمی دلچسپی کیوں نہ لے..... اور تم جانتی ہو آج سے دس سال پہلے جب تمہاری ہیرے کی اگلی گھٹی گم ہو

گئی تھی تو اسی کوڑے کے ڈھیر سے میں نے تمہیں تلاش کر کے دی تھی۔“
 ”بڑا کرم کیا تھا آپ نے مجھ پر۔“
 ”بھئی کرم کا سوال نہیں..... فارسی کا ایک شعر ہے“
 خاکساراں را بد حقارت مگر
 توچہ دانی کہ وریں گردا سوارے باشد
 ”میں خاک بھی نہیں سمجھی۔“
 ”یہی وجہ ہے کہ تم نے ابھی تک مجھے نہیں سمجھا..... ورنہ میں برس ایک آدمی کو
 پہچاننے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔“
 ”ان بیس برسوں میں آپ نے کون سا کھ پہنچایا ہے مجھے؟“
 ”تم دکھ کی بات کرو..... بتاؤ میں نے کون سا دکھ تمہیں اس عرصے میں
 پہنچایا؟“
 ”ایک بھی نہیں۔“
 ”تو پھر یہ کہنے کا کیا مطلب تھا..... ان بیس برسوں میں آپ نے کون سا کھ
 پہنچایا ہے مجھے؟“
 ”آپ میرے قریب نہ آئے..... میں سونا چاقتی ہوں۔“
 ”اس غصے میں نیند آ جائے گی تمہیں؟“
 ”خاک آئے گی..... بہر حال..... آنکھیں بند کر کے لیٹی رہوں گی اور.....“
 ”اور کیا کریں گی؟“
 ”لیٹی اس روز پر آنسو بہاؤں گی جب میں آپ کے پلے باندھی گئی۔“

”تمہیں یاد ہے وہ دن کیا تھا..... سن کیا تھا..... وقت کیا تھا؟“

”میں کبھی وہ دن بھول سکتی ہوں..... خدا کرے وہ کسی لڑکی پر نہ آئے۔“

”تم بتاؤ دو..... میں تمہاری یادداشت کا امتحان لینا چاہتا ہوں۔“

”اب آپ میرا امتحان کیا لیں گے..... پرے بٹے..... مجھے آپ سے بڑا

رہی ہے۔“

”بھی حد ہو گئی ہے..... تمہاری اتنی لمبی ناک جو کہیں ختم ہونے ہی میں نہیں

آتی اس کو آخر کیا ہو گیا ہے..... مجھ سے تو اس کو بڑی بھینی بھینی خوشبو آنا چاہیے

..... تم نے مجھ سے ان بیس برسوں میں ہزاروں مرتبہ کہا کہ آپ جب کسی کمرے

میں داخل ہوں اور وہاں سے نکل جائیں تو میں پہچان جایا کرتی ہوں کہ آپ وہاں

آئے تھے۔“

”آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔“

”دیکھو..... میں نے اپنی زندگی میں آج تک جھوٹ نہیں بولا..... تم مجھ پر یہ

الزام نہ دھرو۔“

”واہ جی واہ، بڑے آئے ہیں آپ کہیں کے سچے..... میرا سو روپے کا نوٹ

آپ نے چرایا اور صاف مگر گئے۔“

”یہ کب کی بات ہے؟“

”دو جون سن انیس سو بیالیس کو..... جب سلمیٰ میرے پیٹ میں تھی۔“

”یہ تاریخ تمہیں خوب یاد رہی۔“

”کیوں یاد نہ رہتی۔ جب آپ سے میری اتنی زیر دست لڑائی ہوئی تھی۔ میں

اندرا کمرے میں پڑی تھی۔ آپ نے چابی بڑی صفائی سے میرے ہتھکے کے نیچے سے نکالی۔ دوسرے کمرے میں جا کر الماری کھولی اور اس میں جو سات سو روپے تھے ان میں سے ایک نوٹ اڑا کر لے گئے۔ میں نے جب دو ڈھائی گھنٹوں کے بعد اٹھ کر دیکھا تو آپ سے جھجھوٹی۔ مگر آپ تھے کہ پروں پر پانی ہی نہیں لیتے تھے۔ آخر میں خاموش ہو گئی۔“

”یہ دو جون سن انیس سو بیالیس کی بات ہے۔۔۔۔۔ آج کل سن چون چل رہا ہے۔ اب اس کے ذکر کا کیا فائدہ؟“

”فائدہ تو ہر حالت میں آپ ہی کا رہتا ہے۔۔۔۔۔ میری ایک نیلم کی انگلی بھی آپ نے غائب کر دی تھی، لیکن میں نے آپ سے کچھ نہیں کہا تھا۔“

”دیکھو میں تمہاری جان کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ اس نیلم کی انگلی کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں۔“

”اور اس سو روپے کے نوٹ کے متعلق“

”اب تمہاری جان کی قسم کھاتی ہے تو سچ بھنا ہی پڑے گا۔۔۔۔۔ میں نے۔۔۔۔۔ میں نے چہرہ ایا ضرور تھا، مگر صرف اس لیے کہ اس مہینے مجھے تنخواہ دیر سے ملنے والی تھی اور تمہاری سالگرہ تھی۔ تمہیں کوئی تحفہ دینا تھا۔ ان بیس برسوں میں تمہاری ہر سالگرہ پر میں اپنی استطاعت کے مطابق کوئی نہ کوئی تحفہ پیش کرتا رہا ہوں۔“

”بڑے تحفے تحائف دیئے ہیں آپ نے مجھے۔“

”ہاں شکری تو نہ بنو۔“

”میں کئی دفعہ کہہ چکی ہوں، آپ پرے ہٹ جائیے۔۔۔۔۔ مجھے آپ سے بڑا آتی ہے۔“

”کس کی؟“

”یہ آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔“

”میں نے خود کو کئی مرتبہ سوکھا ہے، مگر میری پکڑا ایسی ناک میں ایسی کوئی بو

نہیں گھسی۔ جس پر کسی بیوی کو اعتراض ہو سکے۔“

”آپ باتیں بنانا خوب جانتے ہیں۔“

”اور باتیں بگاڑنا تم۔۔۔ میری سمجھ میں نہیں آتا آج تم اس قدر راض کیوں ہو۔“

”اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھئے۔“

”میں اس وقت قمیض پہنے نہیں ہوں۔“

”کیوں؟“

”سخت گرمی ہے۔“

”سخت گرمی ہو یا نرم۔۔۔ آپ کو قمیض اتارنا چاہیے تھی۔ یہ کوئی شرافت

نہیں۔“

”محترمہ! آپ نے بھی تو قمیض اتار رکھی ہے۔۔۔ اپنے ننگے بدن کو ملاحظہ

فرمائیے۔“

”اوہ۔۔۔ یہ میں نے کیا واہیات پن کیا ہے۔“

”یہ واہیات پن تو آپ گرمیوں میں بیس برس سے کر رہی ہیں۔“

”آپ جھوٹ بولتے ہیں۔“

”خیر جھوٹ بولنا تو ہر مرد کی عادت ہوتی ہے۔“

”آپ مجھ سے دوری رہیں۔“

”کیوں؟“

”تو بہ..... انا کھ بار کہہ چکی ہوں کہ مجھے آپ سے بہت گندی بو آ رہی ہے۔“

”پہلے صرف بو تھی..... اب گندی ہو گئی۔“

”خبردار، جو آپ نے مجھے ہاتھ لگایا۔“

”اس قدر بیزاری آخر کیوں؟“

”میں اب آپ سے قطعاً بیزار ہو چکی ہوں۔“

”ان بیس برسوں میں تم نے کبھی ایسی بیزاری کا اظہار نہیں کیا تھا۔“

”اب تو کر دیا ہے۔“

”لیکن مجھے معلوم تو ہو کہ اس کی وجہ کیا ہے۔“

”میں کہتی ہوں، مجھے مت چھوئیے۔“

”تم نہیں مجھ سے اتنی کراہت کیوں ہو رہی ہے۔“

”آپ ہاپاک ہیں..... بے حد ذلیل ہیں۔“

”دیکھو، تم بہت زیادتی کر رہی ہو۔“

”آپ نے کم کی ہے۔ کوئی شریف آدمی آپ کی طرح ایسی ذلیل حرکت نہیں

کر سکتا تھا۔“

”کون سی؟“

”آج صبح کیا ہوا تھا؟“

”آج صبح؟..... بارش ہوئی تھی۔“

”بارش ہوئی تھی..... لیکن اس بارش میں آپ نے کس کو اپنی آغوش میں

دبایا ہوا تھا؟“

”اوہ!“

”بس اس کا جواب اب ’’اوہ‘‘ ہی ہوگا..... میں نے پکڑ جولیا آپ کو۔“

”دیکھو میری جان.....“

”مجھے اپنی جان و ان مت کہیے..... آپ کو شرم آئی چاہیے۔“

”کس بات پر..... کس گناہ پر؟“

”میں کہتی ہوں آدمی گناہ کرے..... لیکن ایسی گندگی میں نہ گرے۔“

”میں کس گندگی میں گرا ہوں؟“

”آج صبح آپ نے اس..... اس.....“

”کیا؟“

”اس بھنگن کو..... جو ان بھنگن کو جو مٹھائی والے کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔“

”لا حول والا..... تم بھی عجیب عورت ہو..... وہ غریب حاملہ ہے بارش میں

جھاڑو دیتے ہوئے اس کو خش آیا اور گر پڑی۔ میں نے اس کو اٹھایا اور اس کے

کوارٹر میں لے گیا۔“

”پھر کیا ہوا؟“

”تمہیں معلوم نہیں کہ وہ مر گئی؟“

”ہائے..... بے چاری..... میں تو ٹھنڈی برف ہو گئی ہوں۔“

”میرے قریب آ جاؤ..... میں تمہیں پہن لوں؟“

”اس کی کیا ضرورت ہے؟ تمہاری قمیض میں ہوں۔“

بیکو

تسلیم اور دلا سے بے کاریں۔ لوہے اور سونے کے یہ مرکب میں چھٹانکوں
 پھانک چکا ہوں۔ کون سی دوا ہے جو میرے حلق میں نہیں اتاری گئی۔ میں آپ
 کے اخلاق کا ممنون ہوں مگر ڈاکٹر صاحب میری موت یقینی ہے۔ آپ کیسے کہہ
 رہے ہیں کہ میں وق کا مریض نہیں۔ کیا میں ہر روز خون نہیں چھوکتا؟ آپ یہی کہیں
 گے کہ یہ میرے گٹے اور دانتوں کی خرابی کا نتیجہ ہے مگر میں سب جانتا ہوں۔
 میرے دونوں پیچھے پڑے خانہ زنبور کی طرح مٹک ہو چکے ہیں چڑا آپ کے انجکشن
 مجھے دوبارہ زندگی نہیں بخش سکتے۔ دیکھئے، میں اس وقت آپ سے باتیں کر رہا
 ہوں مگر سینے پر ایک وزنی انجن دوڑتا ہوا محسوس کر رہا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ میں
 ایک تاریک گڑھے میں اتر رہا ہوں..... قبر بھی تو ایک تاریک گڑھا ہے۔ آپ
 میری طرف اس طرح نہ دیکھئے ڈاکٹر صاحب، مجھے اس چیز کا کامل احساس ہے کہ
 آپ اپنے ہسپتال میں کسی مریض کا مرنا پسند نہیں کرتے مگر جو چیز اٹل ہے وہ ہو
 کے رہے گی۔ آپ ایسا کیجیے کہ مجھے یہاں سے رخصت کر دیجیے۔ میری ٹانگوں
 میں تین چار میل چلنے کی قوت ابھی باقی ہے۔ کسی قریب کے گاؤں میں چلا جاؤں
 گا اور..... مگر میں تو رہا ہوں۔ نہیں نہیں۔ ڈاکٹر صاحب یقین کیجیے میں موت
 سے خائف نہیں۔ یہ میرے جذبات ہیں، جو آنسوؤں کی شکل میں باہر نکل رہے
 ہیں۔ آہ! آپ کیا جانیں۔ اس مدقوق سینے سے کیا کچھ باہر نکلنے کو چل رہا ہے میں
 اپنے انجام سے باخبر ہوں۔ آج سے پانچ برس پہلے بھی میں اس وحشت ناک

انجام سے باخبر تھا، جانتا تھا اور اچھی طرح جانتا تھا کہ کچھ عرصے بعد میری زندگی کی ڈوری ختم ہو جائے گی۔ میں نے اس گیند کو جسے آپ زندگی کے نام سے پکارتے ہیں، خود اپنے پاؤں پر کلباڑی مار کر کاٹا ہے۔ اس میں کسی کا قصور نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں اس کھیل میں لذت محسوس کر رہا ہوں۔ لذت..... ہاں لذت..... میں نے اپنی زل دگی کی کئی راتیں حسن فروش عورتوں کے تاریک اڈوں پر گزاری ہیں۔ شراب کے نشے میں چور میں نے کس بیدروی سے خود کو اس حالت پر پہنچایا۔ مجھے یاد ہے انہی اڈوں کی سیاہ پیشہ عورت..... کیا نام تھا اس کا؟..... ہاں گلزار مجھے اس بری طرح اپنی جوانی کو کچھڑ میں لت پت کرتے دیکھ کر مجھ سے ہمدردی کرنے لگ گئی تھی۔ بے وقوف عورت، اس کو کیا بتاتا کہ میں اس کچھڑ میں کس کا عکس دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے گلزار اور دیگر ہم پیشہ عورتوں سے نفرت تھی اور اب بھی ہے، لیکن کیا آپ مریموں کو زہر نہیں کھلاتے اگر اس سے اچھے نتائج کی امید ہو۔ میرے درد کی دوا ہی تاریک زندگی تھی۔ میں نے بڑی کوششوں اور مصیبتوں کے بعد اس انجام کو بلایا ہے۔ جس کی کچھ روداد آپ نے میرے سر ہانے ایک تیزی پر لکھ کر لکھا رکھی ہے۔ میں نے اس کے انتظار میں ایک ایک گھڑی کس بیتابی سے کاٹی ہے، آہ! کچھ نہ پوچھئے لیکن اب مجھے دلی تسکین حاصل ہو چکی ہے۔ میری زندگی کا مقصد پورا ہو گیا ہے۔ میڈوق اور سل کامریض ہوں۔ اس مرض نے مجھے کھوکھلا کر دیا ہے..... آپ حقیقت کا اظہار کیوں نہیں کر دیتے بخدا اس سے مجھے بے تسکین حاصل ہوگی۔ میرا آخری سانس آرام سے نکلے گا..... ہاں ڈاکٹر صاحب تو یہ بتائیے، کیا آخری لمحات واقعی تکلیف دہ ہوتے

ہیں؟ میں چاہتا ہوں میری جان آرام سے اُٹھے۔ آج میں واقعی بچوں کی باتیں کر رہا ہوں۔ آپ اپنے دل میں یقیناً مسکراتے ہوں گے کہ میں آج معمول سے بہت زیادہ باتونی ہو گیا ہوں۔ دیا جب بچنے کے قریب ہوتا ہے تو اس کی روشنی تیز ہو جایا کرتی ہے۔ کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں؟..... آپ تو بولتے ہی نہیں اور میں ہوں کہ بولے جا رہا ہوں۔ ہاں..... ہاں..... بیٹھے..... میرا جی چاہتا ہے کہ آج کسی سے باتیں کیے جائیں۔ آپ نہ آتے تو خدا معلوم میری کیا حالت ہوتی..... آپ کا سفید سوٹ آنکھوں کو کس قدر بھلا معلوم ہو رہا ہے۔ کفن بھی اسی طرح صاف ستھرا ہوتا ہے۔ پھر آپ میری طرف اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں۔ آپ کو کیا معلوم کہ میں مرنے کے لیے کس قدر بے تاب ہوں۔ اگر مرنے والوں کو کفن خود پہننا ہو تو آپ دیکھتے ہیں اس کو کتنی جلدی اپنے گرد لپیٹ لیتا۔ میں کچھ عرصہ اور زندہ رہ کر کیا کروں گا؟ کہ وہ مر چکی ہے، میرا زندہ رہنا فضول ہے۔ میں نے اس موت کو بہت مشکلوں کے بعد اپنی طرف آمادہ کیا ہے اور اب میں اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دے سکتا۔ وہ مر چکی ہے اور اب میں بھی مر رہا ہوں۔ میں نے اپنی سنک دلی..... وہ مجھے سنک دل کے نام سے پکارا کرتی تھی، کی قیمت ادا کر دی ہے اور خدا گواہ ہے کہ اس کا کوئی سکہ بھی کھوٹا نہیں۔ میں پانچ سال تک ان کو پرکھتا رہا ہوں۔ میری عمر اس وقت پچیس برس کی ہے۔ آج سے ٹھیک سات برس پہلے میری اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ آہ، ان سات برسوں کی روداد کتنی حیرت افزا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کی تفصیل کاغذوں پر پھیلا دے تو انسانی دلوں کی داستانوں میں کیسا دلچسپ اصفافہ ہو دنیا ایک ایسے دل کی دھڑکن

سے آشنا ہوگی۔ جس نے اپنی غلطی کی قیمت خون کی ان تھوکوں میں ادا کی ہے۔
 جنہیں آپ ہر روز جلاتے رہتے ہیں۔ کہ ان کے جراثیم دوسروں تک نہ پہنچیں
 آپ میری بکواس سنتے سنتے کیا تنگ تو نہیں آگئے خدا معلوم کیا کیا کچھ بکاتا
 رہا ہوں۔ تکلف سے کام نہ لیجیے۔ آپ واقعی کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ میں خود کچھ نہیں
 سمجھ سکا۔ صرف اتنا جانتا ہوں کہ بھوت سے واپس آ کر میرے دل و دماغ کا ہر
 جوڑ مل گیا تھا۔ اب یعنی آج جب کہ میرے جنون کا دورہ ختم ہو چکا ہے اور موت کو
 چند قدم کے فاصلے پر دیکھ رہا ہوں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ وزن جو میری
 چھاتی کو دا بے ہوئے تھا ہلکا ہو گیا ہے اور میں پھر زندہ ہو رہا ہوں موت و وزن جو
 میری چھاتی کو دا بے ہوئے تھا ہلکا ہو گیا ہے اور میں پھر زندہ ہو رہا ہوں موت میں
 زندگی کیسی دلچسپ چیز ہے آج میرے ذہن سے دھند کے تمام بادل اٹھ
 گئے ہیں۔ میں ہر چیز کو روشنی میں دیکھ رہا ہوں۔ سات برس پہلے کے تمام واقعات
 اس وقت میری نظروں کے سامنے ہیں۔ دیکھئے میں لاہور سے گرمیاں
 گزارنے کے لیے کشمیر کی تیاریاں کر رہا ہوں۔ سوٹ سلوائے جا رہے ہیں۔
 ہولڈال اور ٹرنک کپڑوں سے پر کیے جا رہے ہیں۔ میں رات کی گاڑی سے جموں
 روانہ ہوتا ہوں۔ شمیم میرے ساتھ ہے۔ گاڑی کے ڈبے میں بیٹھ کر ہم عرصہ تک
 باتیں کرتے رہتے ہیں۔ گاڑی چلتی ہے۔ شمیم چلا جاتا ہے۔ میں سو جاتا ہوں۔
 دماغ ہر قسم کی فکر سے آزاد ہے۔ صبح جموں کے اسٹیشن پر جاگتا ہوں کشمیر کی حسین
 وادی کی ہونے والی سیر کے خیالات میں گمن لاری پر سوار ہوتا ہوں۔ بھوت سے
 ایک میل کے فاصلے پر لاری کا پہیہ پتھر ہو جاتا ہے شام کا وقت ہے۔ اس لیے

رات بوٹ کے ایک ہوٹل میں کانا چڑتی ہے۔ اس ہوٹل کا کمرہ مجھے بے حد غلیظ معلوم ہوتا ہے مگر کیا معلوم تھا کہ وہاں پر مجھے پورے دو مہینے رہنا پڑے گا۔ صبح سویرے اٹھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ لاری کے انجن کا ایک پرزہ بھی خراب ہو گیا ہے اس لیے مجبوراً ایک دن اور بوٹ میں ٹھہرنا پڑے گا۔ یہ سن کر میری طبیعت کس قدر افسردہ ہو گئی تھی اس افسردگی کو دور کرنے..... میں اس روز شام کو سیر کے لیے نکلتا ہوں۔ چیر کے درختوں کا تنفس، جنگلی پرندوں کی نغمہ سرائیاں سب کے درختوں کا حسن اور غروب ہوتے سورج کا دل کش سماں۔ لاری والے کی بے احتیاطی اور رنگ میں بھنگ ڈالنے والی تھدیر کی گستاخی کا رنج افزا خیال محو کر دیتا ہے۔ میں نیچر کے مسرت افزا مناظر سے لطف اندوز ہوتا سڑک کے ایک موڑ پر پہنچتا ہوں۔ دفعتاً میری نگاہیں اس سے دو چار ہوتی ہیں۔ بیگو مجھ سے بیس قدم کے فاصلے پر اپنی بھینس کے ساتھ کھڑی ہے..... جس داستان کا انجام اس وقت آپ کے پیش نظر ہے اس کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔

وہ جوان تھی۔ اس کی جواہر پر بوٹ کی فضا پوری شدت کے ساتھ جلوہ گر تھی سبز لباس میں ملبوس وہ سڑک کے درمیان کئی کا ایک دراز قد بونا معلوم ہو رہی تھی چہرے کے تانبے ایسے تابیاں رنگ پر اس کی آنکھوں کی چمک نے ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی تھی جو چشمے کے پانی کی طرح صاف اور شفاف تھیں..... میں اس کو کتنا غصہ دیکھتا رہا۔ یہ مجھے معلوم نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ میں نے دفعتاً اپنا سینہ موسیقی سے لبر پو پایا اور پھر میں مسکرا دیا۔ اس کی ہلکی ہوئی نگاہوں کی توجہ بھینس سے ہٹ کر میرے تنم سے ٹکرائی۔ میں گھبرا گیا۔ اس نے ایک تیز تجسس سے میری

طرف دیکھا۔ جیسے وہ کسی بھولے ہوئے خواب کو یاد کر رہی ہے پھر اس نے اپنی چھتری کو دانتوں میں دبا کر کچھ سوچا اور مسکرا دی۔ اس کا سینہ چشمے کے پانی کی طرح دھڑک رہا تھا۔ میرا دل بھی میرے پہلو میں اگلڑا لیاں لے رہا تھا..... آہ یہ پہلی ملاقات کس قدر لذیذ تھی۔ اس کا ذائقہ ابھی تک میرے جسم کی ہر رگ میں موجود ہے..... وہ چلی گئی..... میں اس کو آنکھوں سے اوجھل ہوتے دیکھتا رہا۔ وہ اس انداز سے چل رہی تھی جیسے کچھ یاد کر رہی ہے۔ کچھ یاد کرتی ہے مگر پھر بھول جاتی ہے اس نے جاتے ہوئے پانچ چھ مرتبہ میری طرف مڑ کر دیکھا لیکن فوراً ہی سر پھیر لیا جب وہ اپنے گھر میں داخل ہو گئی جو سڑک کے نیچے مکئی کے چھوٹے سے کھیت کے ساتھ بنا ہوا تھا۔ میں اپنی طرف متوجہ ہوا۔ میں اس کی محبت میں گرفتار ہو چکا تھا۔ اس احساس نے مجھے سخت متحیر کیا۔ میری عمر اس وقت اٹھارہ سال کی تھی۔ کالج میں اپنے ہم جماعت طلبہ کی زبانی میں محبت کے متعلق سن چکا تھا۔ عشیقہ داستانیں بھی اکثر میرے زیر مطالعہ رہی تھیں۔ مگر محبت کے متعلق سن چکا تھا۔ عشیقہ داستانیں بھی اکثر میرے زیر مطالعہ رہی تھیں۔ مگر محبت کے حقیقی معنی میرے نظروں سے پوشیدہ تھے۔ اس کے جانے کے بعد جب میں نے ایک ناقابل بیان تلخی اپنے دل کی دھڑکنوں میں حل ہوتی ہوئی محسوس کی تو میں نے خیال کیا شاید اسی کا نام محبت ہے..... یہ محبت ہی تھی..... عورت سے محبت کرنے کا پہلا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ مرد کی ہو جائے، یعنی وہ اس سے شادی کر لے۔ وہ آرام سے اپنی بقایا زندگی گزار دے۔ شادی کے بعد یہ محبت کروٹ بدلتی ہے۔ پھر مرد اپنی محبوبہ کے کاندھوں پر ایک گھر تعمیر کرتا ہے۔ میں نے جب بیگو کو

اپنے دل سے وابستہ ہوتے محسوس کیا تو فطری طور پر میرے دل میں اس رفیقہ حیات کا خیال پیدا ہوا جس کے متعلق میں اپنے کمرے کی چار دیواری میں کئی خواب دیکھ چکا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی میرے دل سے یہ صدا اٹھی۔ ”دیکھو سعید یہ لڑکی ہی تمہارے خوابوں کی پری ہے۔“ چنانچہ میں تمام واقعے پر غور کرتا ہوا ہوٹل واپس آیا اور ایک ماہ کے لیے ہوٹل کا وہ کمرہ کرائے پر اٹھالیا جو مجھے بے حد غلیظ محسوس ہوا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہوٹل کا مالک میرے اس ارادے کو سن کر بہت متحیر ہوا تھا۔ اس لیے کہ میں صبح اس کی غاقت پسندی پر ایک طویل لیکچر اسے دے چکا تھا۔ داستان کتنی طویل ہوتی جا رہی ہے، مگر مجھے معلوم ہے کہ آپ اسے غور سے سن رہے ہیں۔۔۔۔۔ ہاں ہاں آپ سگریٹ سلا سکتے ہیں۔ میرے گلے میں آج کھانسی کے آثار محسوس نہیں ہوتے۔ آپ کی ڈبیہ دیکھ کر میرے ذہن میں ایک اور واقعہ کی یاد تازہ ہو گئی ہے۔ بیگم بھی سگریٹ پیا کرتی تھی۔ میں نے کئی بار اسے گولڈ فلیک کی یہ ڈبیاں لا کر دی تھیں۔ وہ بڑے شوق سے ان کو منہ میں دبا کر دھوئیں کے بادل اڑایا کرتی تھی۔ دھواں۔۔۔۔۔ میں اس نیلے دھوئیں کو اب بھی دیکھ رہا ہوں جو اس کے گیلے ہونٹوں پر قرض کیا کرتا تھا۔۔۔۔۔ ہاں تو دوسرے رز میں شام کو اسی وقت ادھر سیر کو گیا۔ جہاں مجھے وہ سڑک پر ملی تھی۔ دیر تک سڑک کے ایک کنارے پتھروں کی ایک دیوار پر بیٹھا رہا۔ مگر وہ نظر نہ آئی۔۔۔۔۔ اٹھا اور ٹہلتا آگے نکل گیا۔ سڑک کے دائیں ہاتھ ڈھلوان تھی جس پر چیر کے درخت اگے ہوئے تھے۔ بائیں ہاتھ بڑے بڑے پتھروں کے کٹے پھٹے سرائی بھر رہے تھے۔ ان پر جمی ہوئی مٹی کے ڈھیلوں میں گھاس

اگی ہوئی تھی۔ ہوا ٹھنڈی اور تیز تھی۔ چیر کے تاگا نما پتوں کی سرسراہٹ کانوں کو بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ جب موڑ مڑا تو دفعتاً میری نگاہیں سامنے انھیں مجھ سے سوگڑ کے فاصلے پر وہ اپنی جینس کو ایک سنگین حوض میں پانی پلا رہی تھی۔ میں قریب پہنچا۔ مگر اس کو نظر بھر کر دیکھنے کی جرأت نہ کر سکا اور آگے نکل گیا اور جب واپس مڑا تو وہ گھر جا چکی تھی۔ اب ہر روز اس طرف سیر کو جانا میرا معمول ہو گیا۔ مگر بیس روز تک میں اس سے ملاقات نہ کر سکا۔ میں نے کئی بار باؤلی پر پانی پیتے وقت اس سے ہم کلام ہونے کا ارادہ کیا۔ مگر زبان گنگ ہو گئی۔ کچھ بول نہ سکا قریباً ہر روز میں اس کو دیکھتا۔ مگر رات کو جب میں تصور میں اس کی شکل دیکھنا چاہتا تو ایک وحشت سی چھا جاتی۔ یہ عجیب بات ہے کہ میں اس کی شکل کو اس کے باوجود کہ اسے ہر روز دیکھتا تھا۔ بھول جاتا تھا۔ بیس دنوں کے بعد ایک روز چار بجے کے قریب جب کہ میں ایک باؤلی کے اوپر چیر کے سائے میں لیٹا تھا۔ وہ ایک خور و سال لڑکے کو لے کر اوپر چڑھی۔ اس کو اپنی طرف آتا دیکھ کر میں سخت گھبرا گیا۔ دل میں یہی آئی کہ وہاں سے بھاگ جاؤں لیکن اس کی سمت بھی نہ رہی۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر آگے نکل گئی۔ چونکہ اس کے قدم تیز تھے۔ اس لیے لڑکا پیچھے رہ گیا۔ میں اٹھ کر پیٹھ گیا۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ دفعتاً لڑکے نے ایک چیخ ماری اور چشم زدن میں چیر کے خشک پتوں پر سے پھسل کر نیچے آ رہا۔ میں فوراً اٹھا اور بھاگ کر اسے اپنے بازوؤں میں تھام لیا۔ چیخ سن کر وہ مڑی اور دوڑنے کے بڑھے ہوئے قدم روک کر آہستہ آہستہ میری طرف آئی۔ اپنی جوان آنکھوں سے مجھے دیکھا اور لڑکے سے یہ کہا۔ ”خدا جانے تم کیوں گر گر پڑتے ہو؟“

میں نے گفتگو شروع کرنے کا ایک موقع پا کر اس سے کہا۔ ”بچہ ہے، اس کی انگلی پکڑ لیجیے۔ ان پتوں نے خود مجھے کئی بار اوندھے منہ گرا دیا ہے۔“
یہ سن کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ”آپ کے ہیٹ نے تو خوب لڑکھنیاں کھائی ہوں گی۔“

”آپ ہنستی کیوں ہیں؟ کسی کو گرتے دیکھ کر آپ کی طبیعت اتنی شاد کیوں ہوتی ہے اور جو کسی روز آپ گر پڑیں تو..... وہ گھڑا جو ہر روز بھر کر شام کے وقت آپ گھر لے جاتی ہیں۔ کس بری طرح زمین پر گر کر نکلڑے نکلڑے ہو جائے گا۔“

”میں نہیں گر سکتی.....“ یہ کہتے ہوئے اس نے دفعتاً نیچے باؤلی کی طرف دیکھا اس کی بھینس نالی پر ہندھے ہوئے پل کی طرف خرماں خرماں جا رہی تھی۔ یہ دیکھ کر اس نے اپنے حلق سے ایک عجیب قسم کی آواز نکالی۔ اس کی گونج ابھی تک میرے کانوں میں محفوظ ہے۔ کس قدر جوان تھی یہ آواز، اس نے بڑھ کر لڑکے کو کاندھے پر اٹھالیا اور بھینس کو، اے چھٹاں، اے چھٹا کے نام سے پکارتی ہوئی چشم زدن میں نیچے اتر گئی۔ بھینس کو واپس موڑ کر اس نے میری طرف دیکھا اور گھر کو چل دی..... اس ملاقات کے بعد اس سے ہم کلام ہونے کی جھجک دور ہو گئی۔ ہر روز شام کے وقت باؤلی پر یا چیر کے درختوں تلے میں اس سے کوئی نہ کوئی بات شروع کر دیتا۔ شروع شروع میں ہماری گفتگو کا موضوع بھینس تھا۔ پھر میں نے اس سے اس کا نام دریافت کیا اور اس نے میرا اس کے بعد گفتگو کا رخ اصل مطلب کی طرف آگیا۔ ایک روز دوپہر کے وقت جب وہ نالے میں ایک بڑے

سے پتھر پر بیٹھی اپنے کپڑے دھو رہی تھی میں..... اس کے پاس بیٹھ گیا۔ مجھے کسی خاص بات کا اظہار کرنے پر تیار نہ دیکھ کر اس نے جنگلی بلی کی طرح میری طرف گھور کر دیکھا اور زور زور سے اپنی شلووار کو پتھر پر جھٹکتے ہوئے کہا۔

”آپ کشمیر کب جا رہے ہیں۔ جہاں بٹوت میں کیا دھڑا ہے جو آپ یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔“

یہ سن کر میں نے مستفسرانہ ٹکا ہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ گویا میں اس کے سوال کا جواب خود اس کی زبان سے چاہتا ہوں۔ اس نے ٹکا میں نیچی کر لیں اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آپ سیر کرنے کے لیے آئے ہیں۔ میں نے سنا ہے کشمیر میں بہت سے باغ ہیں۔ آپ وہاں کیوں نہیں چلے جاتے؟“

موقع اچھا تھا۔ چنانچہ میں نے دل کے تمام دروازے کھول دیئے۔ وہ میرے جذبات کے بستے ہوئے دھارے کا شور خاموشی سے سنتی رہی۔ میری آواز نالے کے پانی کی گنگناہٹ میں جو ننھے ننھے سنگریزوں سے کھیلتا ہوا بہہ رہا تھا۔ ڈوب ڈوب کر ابھر رہی تھی۔ ہمارے سروں کے اوپر اخروٹ کے گھنے درخت میں چڑیاں چچہہا رہی تھیں ہوا اس قدر تازہ لطیف تھی کہ اس کا ہر جھونکا بدن پر ایک خوشگوار کپکپی طاری کر دیتا تھا۔ میں اس سے پورا ایک گھنٹہ گفتگو کرتا رہا۔ اس سے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں اور شادی کا خواہشمند ہوں۔ یہ سن کر وہ بالکل متحیر نہ ہوئی لیکن اس کی ٹکا میں جو دور پہاڑیوں کی سیاہی اور آسمان کی نیلاہٹ کو آپس میں ملتا ہوا دیکھ رہی تھیں۔ اس بات کی مظہر تھیں کہ وہ کسی گہرے خیال میں مستغرق ہے کچھ عرصہ خاموش رہنے کے بعد اس نے

میرے اصرار پر صرف اتنا جواب دیا۔

”اچھا آپ کشمیر نہ جائیں۔“

یہ جواب اختصار کے باوجود حوصلہ افزا تھا..... اس ملاقات کے بعد ہم دونوں بے تکلف ہو گئے۔ اب پہلا سا حجاب نہ رہا۔ ہم گھنٹوں ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرتے رہتے۔ ایک روز میں نے اس سے نشانی کے طور پر کچھ مانگا تو اس نے بڑے بھولے انداز سے اپنے سر کے دو کلپ اتار کر میری ہتھیلی پر رکھ دیئے اور مسکرا کر کہا۔ ”میرے پاس یہی کچھ ہے۔“ یہ کلپ میرے پاس ابھی تک محفوظ ہیں۔ خیر، کچھ دنوں کی طول طویل گفتگوؤں کے بعد میں نے اس کی زبان سے کہلوا لیا کہ وہ مجھ سے شادی کرنے پر رضامند ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب اس روز شام کو اس نے اپنے گھرے کو سر پر سنبھالتے ہوئے اپنی رضامندی کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا کہ ”ہاں میں چاہتی ہوں۔“ تو میری مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی تھی۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ ہوٹل کو واپس آتے ہوئے کچھ گایا تھا۔ اس پر مسرت شام کے چوتھے روز جب کہ میں آنے والی ساعت سعید کے خواب دیکھ رہا تھا۔ یکایک اس مکان کی تمام دیواریں گر پڑیں جن کو میں نے بڑے پیار سے استوار کیا تھا۔ بستر میں پڑا تھا کہ صبح سیالکوٹ کے ایک صاحب جو بغرض تبدیلی آب و ہوا بنوت میں قیام پذیر تھے اور ایک حد تک بیکو سے میری محبت کو جانتے تھے۔ میری چارپائی پر بیٹھ گئے اور نہایت ہی متفکرانہ لہجہ میں کہنے لگے:

”وزیر بیگم سے ملاقاتوں کا ذکر آج بنوت میں ہرنچے کی زبان پر ہے میں وزیر بیگم کے کیریئر سے ایک حد تک واقف تھا۔ اس لیے کہ سیالکوٹ میں اس لڑکی

کے متعلق بہت کچھ سن چکا ہوں مگر یہاں بوٹ میں اس کی تصدیق ہو گئی ہے، ایک ہفتہ پہلے یہاں کا قصابی اس کے متعلق ایک طویل حکایت سنا رہا تھا۔ پرسوں پان والا آپ سے ہمدردی کا اظہار کر رہا تھا کہ آپ عصمت بانڈی لڑکی کے دام میں پھنس گئے ہیں۔ کل شام کو ایک اور صاحب کہہ رہے تھے کہ آپ ایک ٹوٹی ہوئی ہنڈیا خرید رہے ہیں۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ بعض لوگ اس سے آپ کی گفتگو پسند نہیں کرتے۔ اس لیے کہ آپ جب سے بوٹ میں آئے ہیں وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے۔ میں نے آپ سے حقیقت کا اظہار کر دیا ہے۔ اب آپ بہتر سوچ سکتے ہیں۔“

عصمت بانڈی لڑکی، ٹوٹی ہوئی ہنڈیا، لوگ اس سے میری گفتگو پسند نہیں کرتے مجھے اپنی سماعت پر یقین نہ آتا تھا۔ بیگو اور..... اس کا خیال ہی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ مگر جب دوسرے روز مجھے ہوٹل والے نے نہایت ہی رازدرا نہ لہجے میں چند باتیں کہیں تو میری آنکھوں کے سامنے تاریک سی دھند چھا گئی۔ ”بابو جی! آپ بوٹ میں سیر کے لیے آئے ہیں۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ آپ یہاں کی حسن فروش لڑکی کی محبت میں گرفتار ہیں۔ اس کا خیال اپنے دل سے نکال دیجیے۔ میرا اس لڑکی کے گھر آنا جانا ہے، مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپ نے اس کو کچھ کپڑے بھی خرید دیئے ہیں آپ نے یقیناً اور بھی روپے خرچ کیے ہوں گے۔ معاف کیجیے مگر یہ سراسر حماقت ہے۔ میں آپ سے یہ باتیں ہرگز نہ کرتا۔ کیونکہ یہاں بیسیوں عیش پسند مسافر آتے ہیں۔ مگر آپ کا دل ان سیاہیوں سے پاک نظر آتا ہے۔ آپ بوٹ سے چلے جائیں اس قماش کی لڑکی سے گفتگو کرنا اپنی عزت کو خطرے میں

ڈالنا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان باتوں نے مجھے بے حد افسردہ بنا دیا ہے۔ وہ مجھ سے سگریٹ، میٹھائی اور اسی قسم کی دوسری معمولی چیزیں طلب کیا کرتی تھی اور میں بڑے شوق محبت سے اس کی یہ خواہش پوری کیا کرتا تھا۔ اس میں ایک خاص اطف تھا مگر اب ہوٹل والے کی بات نے میرے ذہن میں مہیب خیالات کا تلاطم برپا کر دیا۔ گزشتہ ملاقاتوں کے جتنے نقوش میرے دل و دماغ میں محفوظ تھے اور جنہیں میں ہر روز بڑے پیار سے اپنے تصور میں لا کر ایک خاص قسم کی مٹھاس محسوس کیا کرتا تھا۔ دفعتاً تاریک شکل اختیار کر گئے۔ مجھے اس کے نام ہی سے عفونت آنے لگی۔ میں نے اپنے جذبات پر قابو پانے کی بہت سی کوشش کی مگر بے سود۔ میرا دل جو ایک کالج کے طالب علم کے سینے میں دھڑکتا تھا اپنے خوابوں کی یہ بری اور بھیا تک تعبیر دیکھ کر چلا اٹھا۔ اس کی باتیں جو کچھ عرصہ پہلے مجھے بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ ریا کاری میں ڈوبی ہوئی معلوم ہونے لگیں..... میں نے گزشتہ واقعات، بیگو کی نقل و حرکت، اس کی ہر جنبش اور اپنے گرد و پیش کے ماحول کو پیش نظر رکھ کر عمیق مطالعہ کیا۔ تو تمام چیزیں روشن ہو گئیں۔ اس کا ہر شام کو ایک مریض کے ہاں دو دھڑلے کر جانا اور وہاں ایک عرصہ تک بیٹھی رہنا۔ باؤلی پر برس ونا کس سے جیبا کا نہ گفتگو، وہ پٹے کے بغیر ایک پتھر سے دوسرے پتھر پر اچھل کود، اپنی ہم عمر لڑکیوں سے کہیں زیادہ شوخی اور آزادی،..... ”وہ یقیناً عصمت باختہ لڑکی ہے۔“ میں نے یہ رائے مرتب تو کر لی۔ مگر آنسوؤں سے میری آنکھیں گیلی ہو گئیں۔ خوب رویا مگر دل کا بو جھہکا نہ ہوا۔ میں چاہتا تھا کہ ایک بار اور آخری بار اس سے ملوں اور اس کے منہ پر تمام غصے کو تھوک دوں۔ یہی صورت تھی جس سے

مجھے کچھ سکون ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں شام کو باؤلی کی طرف گیا۔ وہ پلگندہ پرانا
کی جھاڑیوں کے پیچھے ٹیلھی میرا انتظار کر رہی تھی۔ اس کو دیکھ کر میرا دل کس قدر
کڑھتا۔ میرا حلق اس روز کی تلخی کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ اس کے قریب پہنچا اور
پاس ہی ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ چٹا اس کی بھینس اس کا بچھڑا چند گزوں پر بیٹھے
جگالی کر رہے تھے۔ میں نے گفتگو کا آغاز کرنا چاہا۔ مگر کچھ کہہ نہ سکا۔ غصے اور
انصر دگی نے میری زبان پر قفل لگا دیا۔ مجھے خاموش دیکھ کر اس کی آنکھوں کی چمک
مانند پڑ گئی، جیسے چشمے کے پانی میں کسی نے اپنے مٹی بھرے ہاتھ دھو دیئے ہیں۔
پھر وہ مسکرائی۔ یہ مسکراہٹ مجھے کسی قدر مصنوعی اور پھیکلی معلوم ہوئی۔ میں نے سر
جھکالیا اور سنگریزوں سے کھینا شروع کر دیا تھا۔ شاید میرا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ اس
نے غور سے میری طرح دیکھا اور کہا ”آپ بیمار ہیں؟“

اس کا یہ کہنا تھا کہ میں برس پڑا۔ ”ہاں بیمار ہوں، یہ بیماری تمہاری دی ہوئی
ہے۔ تمہیں نے یہ روگ لگایا ہے۔ بیکو! میں تمہارے چال چلن کی سب کہانی سن
چکا ہوں اور تمہارے سارے حالات سے باخبر ہوں۔“

میری چہیتی ہوئی یہ باتیں سن کر اور بدلے ہوئے تیور دیکھ کر وہ بھونچکا سی رہ گئی
اور کہنے لگی۔ ”اچھا تو میں اچھی لڑکی نہیں ہوں۔ آپ کو میرے چال چلن کے متعلق
سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کیسی بہکی بہکی باتیں کر
رہے ہیں۔“

میں چلایا۔ ”گویا تم کو معلوم نہیں۔ ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو تو
اپنی سیہ کاریوں کا سارا نقشہ تمہاری آنکھوں تلے گھوم جائے گا۔“ میں طیش میں آ

گیا۔ ”کتنی بھولی بنتی ہو، جیسے کچھ جانتی ہی نہیں۔ پروں پر پانی ہی نہیں پڑنے دیتیں۔ میں کیا کہہ رہا ہوں، بھلا تم کیا سمجھو جاؤ جاؤ بیگو تم نے مجھے سخت دکھ پہنچایا ہے۔“ یہ کہتے کہتے میری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے۔

وہ بھی سخت مضطرب ہو گئی اور جل کر بول اٹھی۔ ”آخر میں بھی تو سنوں کہ آپ نے میرے بارے میں کیا کیا سنا ہے۔ پر آپ تو رو رہے ہیں۔“

”ہاں رو رہا ہوں، اس لیے کہ تمہارے افعال ہی اتنے سیاہ ہیں کہ ان پر ماتم کیا جائے۔ تم پاکبازوں کی قدر کیا جانو۔ اپنا جسم بیچنے والی لڑکی محبت کیا جانے۔ تم..... تم صرف اتنا جانتی ہو کہ کوئی مرد آئے اور تمہیں اپنی چھاتی سے بھینچ کر چومنا چاہنا شروع کر دے اور جب سیر ہو جائے تو اپنی راہ لے۔ کیا یہی تمہاری زندگی ہے۔“

میں غصے کی شدت میں دیوانہ ہو گیا تھا۔ جب اس نے میری زبان سے اس قسم کے سخت کلمات سنے تو اس نے ایسا ظاہر کیا جیسے اس کی نظر میں یہ سب گفتگو ایک معمہ ہے۔ اس وقت طیش کی حالت میں میں نے اس کی حیرت کو نمائشی خیال کیا اور ایک قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”جاؤ میری نظروں سے دور ہو جاؤ، تم ہاپاک ہو۔“

یہ سن کر اس نے ڈری ہوئی آواز میں صرف اتنا کہا۔ ”آپ کو کیا ہو گیا ہے؟“

”مجھے کیا ہو گیا ہے..... کیا ہو گیا ہے۔“ میں پھر برس پڑا۔ ”اپنی زندگی کی سیہ کاریوں پر نظر دوڑاؤ تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ تم میری بات اس لیے نہیں سمجھتی ہو کہ میں تم سے شادی کرنے کا خواہشمند تھا۔ اس لیے کہ میرے سینے

میں شہوانی خیالات موجود نہیں، اس لیے کہ میں صرف محبت کرتا ہوں۔ جاؤ مجھے تم سے سخت نفرت ہے۔“

جب میں بول چکا تو اس نے جھوک نکل کر اپنے گٹے کو صاف کیا اور تھر تھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”شاید آپ یہ خیال کرتے ہوں گے کہ جان بوجھ کر انجان بن رہی ہوں مگر سچ جاننے مجھے کچھ معلوم نہیں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک شام آپ سڑک پر سے گزر رہے تھے آپ نے میری طرف دیکھا تھا اور مسکرا دیئے تھے۔ یہاں بیسیوں لوگ ہم لڑکیوں کو دیکھتے ہیں اور مسکرا کر چلے جاتے ہیں۔ پھر آپ متواتر باؤلی کی طرف آتے رہے۔ مجھے معلوم تھا کہ آپ میرے لیے آتے ہیں مگر اسی قسم کے کئی واقعے میرے ساتھ گزر چکے ہیں۔ ایک روز آپ نے میرے ساتھ باتیں کیں اور اس کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے سے ملنے لگے۔ آپ نے شادی کے لیے کہاں اور میں مان گئی۔ مگر اس سے پہلے اسی قسم کی کئی درخواستیں سن چکی ہوں جو مرد بھی مجھ سے ملتا ہے۔ دوسرے تیسرے روز میرے کان میں کہتا ہے۔ بیکو! دیکھ میں تیری محبت میں گرفتار ہوں، رات دن تو ہی میرے دل و دماغ میں بسی رہتی ہے۔ آپ نے مجھ سے یہی کہا۔ آپ بتائے محبت کیا چیز ہے۔ مجھے کیا معلوم کہ آپ نے دل میں چھپا رکھا ہے یہاں آپ جیسے کئی لوگ ہیں جو مجھ سے یہی کہتے رہتے ہیں۔ بیکو تمہاری آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ صدقے ہو جاؤں۔ تمہارے ہونٹ کس قدر پیارے ہیں۔ جی چاہتا ہے ان کو چومے جاؤں۔۔۔۔۔ وہ مجھے چومتے رہتے ہیں۔ کیا یہ محبت نہیں؟ کئی بار میرے دل میں خیال آیا ہے کہ محبت کچھ اور ہی چیز ہے مگر

میں پڑھی لکھی نہیں اس لیے مجھے کیا معلوم ہو سکتا ہے۔ میں نے قاعدہ پڑھنا شروع کیا مگر چھوڑ دیا۔ اگر میں پڑھوں تو پھر چملاں اور اس کے منجھڑے کا پیٹ کون بھرے۔ آپ اخبار پڑھ لیتے ہیں۔ اس لیے آپ کی باتیں بڑی ہوتی ہیں۔ میں کچھ نہیں سمجھ سکتی۔ چھوڑیے اس قصے کو۔ آئیے کچھ اور باتیں کریں۔ مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ میری ماں کہہ رہی تھیں کہ بیگم تو ہیٹ والے بابو کے پیچھے دیوانی ہو گئی ہے۔“

میری نظروں کے سامنے سے وہ تاریک پردہ اٹھنے لگا تھا۔ جو اس انجام کا باعث تھا۔ مگر دعنا میرے جوش اور غصے نے پھر اسے گرا دیا۔ بیگم کی گفتگو بے حد سادہ اور معصومیت سے پرتھی۔ مگر مجھے اس کا ہر لفظ بناوٹ میں لپٹا نظر آیا۔ میں نے ایک لمحہ بھی اس کی اہمیت پر غور نہ کیا۔

”بیگم میں بچہ نہیں ہوں کہ تم مجھے چکنی چڑی باتوں سے بے وقوف بنا لو گی۔“ میں نے غصہ میں اس سے کہا۔ ”یہ فریب کسی اور کو دینا۔ کہتے ہیں کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے تم نے ابھی ابھی اپنی زبان سے اس بات کا اعتراف کیا ہے۔ اب میں کیا کہوں.....“

”نہیں..... نہیں..... کہیے۔“ اس نے کہا۔

”کئی لوگ تمہارے منہ کو چومتے رہے ہیں۔ تمہیں شرم آنی چاہیے۔“

”ہائے آپ تو سمجھتے ہی نہیں۔ اب میں کیا جھوٹ بولتی ہوں۔ میں خود چھوڑا ہی ان کے پاس جاتی ہوں اور منہ بڑھا کر چومنے کو کہتی ہوں۔ اگر آپ اس روز میرے بالوں کو چومنا چاہتے۔ جب کہ آپ ان کی تعریف کر رہے تھے تو کیا میں

انکار کر دیتی؟ میں کس طرح انکار کر سکتی ہوں۔ مجھے پلاں بہت پیاری لگتی ہے اور میں اس کو ہر روز چومتی ہوں۔ اس میں کیا برج ہے میں چاہتی ہوں کہ لوگ میرے بالوں، میرے ہونٹوں اور میرے گالوں کی تعریف کریں اس سے مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ خبر نہیں کیوں؟ میں صبح سویرے اٹھتی ہوں اور پلاں کو لے کر گھاس چرانے کے لیے باہر چلی جاتی ہوں۔ بارہ بجے روٹی کھا کر پھر گھر سے نکل آتی ہوں۔ شام کو پانی بھرتی ہوں۔ ہر روز میرا یہی کام ہے۔ مجھے یاد ہے آپ نے مجھ سے کئی مرتبہ کہا تھا کہ میں پانی بھرنے نہ آیا کروں، بھینس نہ چرایا کروں۔ شاید آپ اسی وجہ سے ناراض ہو رہے ہیں۔ مگر یہ تو بتائیے کہ میں گھر پر رہوں تو پھر آپ مجھ سے ملاقات کیونکر کر سکیں گے؟ میں نے سنا ہے کہ پنجاب میں لڑکیاں گھر سے باہر نہیں نکلتیں مگر ہم پہاڑی لوگ ہیں، ہمارا یہی کام ہے۔“

”تمہارا یہی کام ہے کہ ہر راہ گزر سے لپٹنا شروع کر دو۔ تم پہاڑی لوگوں کے چلن مجھ سے چھپے ہوئے نہیں، یہ تقریر کسی اور کو سنانا۔ گھر پر رہو یا باہر پھرو۔ اب مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ ان پہاڑیوں میں رہ کر جو سبق تم نے سیکھا ہے وہ مجھے پڑھانے کی کوشش نہ کرو۔“

”آپ بہت تیز ہوتے جا رہے ہیں، بہت چل نکلے ہیں۔“ اس نے قدرے بگڑ کر کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے لوگوں نے آپ کے بہت کان بھرے ہیں۔ مجھے بھی تو پتہ لگے کہ وہ کون مرن جو گے ہیں جو میرے متعلق آپ کو ایسی باتیں سنارہے ہیں۔ آپ خواہ مخواہ اتنے گرم ہوتے جا رہے ہیں یہ سچ ہے کہ مردوں کے ساتھ باتیں کرتی ہوں اور ان سے ملتی ہوں مگر.....“ یہ کہتے ہوئے اس کے گال

سرخ ہو گئے مگر میں نے اس کی طرف دھیان نہ دیا۔ ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بولی۔ ”آپ کہتے ہیں کہ میں بری لڑکی ہوں۔ یہ غلط ہے۔ میں لگتی ہوں..... سچ مچ لگتی ہوں، کل آپ کے جانے کے بعد میں پتھر پر بیٹھ کر دیر تک روتی رہی۔ جانے کیوں۔ ایسا کئی دفعہ ہوا ہے کہ میں گھنٹوں رویا کرتی ہوں، آپ نہیں گے۔ مگر اس وقت بھی میرا جی چاہتا ہے کہ یہاں سے اٹھ بھاگوں اور اس پھاڑی کی چوٹی پر بھاگتی ہوئی چڑھ جاؤں اور پھر کوئی پھانسی نیچے اتر آؤں۔ میرے دل میں ہر وقت ایک بے چینی رہتی ہے۔ بھینس چراتی ہوں، پانی بھرتی ہوں نکڑیاں کاٹتی ہوں لیکن یہ سب کام میں اوپر سے دل سے کرتی ہوں۔ میرا جی کسی کو ڈھونڈتا ہے معلوم نہیں کس کو..... میں دیوانی ہوں۔“

بیگو کی یہ عجیب غریب باتیں جو درحقیقت اس کی زندگی کا ایک نہایت الجھا ہوا باب تھیں اور جسے بغور مطالعہ کرنے کے بعد سب راز حل ہو سکتے تھے۔ اس وقت مجھے کسی مجرم کا غیر مربوط بیان معلوم ہو نہیں۔ بیگو اور میرے درمیان اس قدر تاریک اور مونا پر وہ حائل تھا کہ حقیقت کی نقاب کشائی بہت مشکل تھی۔

”تم دیوانی ہو۔“ میں نے اس سے کہا۔ ”کیا مردوں کے ساتھ بیٹھ کر جھاڑیوں کے پیچھے پیروں باتیں کرتے رہنا بھی اس دیوانگی ہی کی ایک شاخ ہے؟..... بیگو تم دیوانی ہو مگر اپنے کام میں آنٹوں کا کھڑا ہوشیار!“

”میں باتیں کرتی ہوں، ان سے ملتی ہوں۔ میں نے کب اس سے انکار کیا ہے۔ ابھی ابھی میں نے آپ سے اپنے دل کی سچی بات کہی تو آپ نے مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ اب اگر میں کچھ اور کہوں تو اس سے کیا فائدہ ہوگا، آپ کبھی

”ما نہیں گے ہی نہیں۔“

”نہیں، نہیں، کہو، کیا کہتی ہو۔ تمہارا نیا فلسفہ بھی سن لوں۔“

”سنیے پھر! یہ کہہ کر اس نے تھکی ہوئی ہرئی کی طرح میری طرف دیکھا، اور آہ بھر کر بولی۔ ”یہ باتیں جو میں آج آپ کو سنانے لگی ہوں، میری زبان سے پہلے کبھی نہیں نکلیں۔ میں یہ آپ کو بھی نہ سناتی مگر مجبوری ہے۔ آپ عجیب و غریب آدمی ہیں۔ میں بہت سے لوگوں سے ملتی رہی ہوں مگر آپ بالکل نرالے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مجھے آپ سے.....“ وہ ہچکچاتی۔ ”ہاں آپ سے پیار ہو گیا ہے۔ آپ نے کبھی مجھ سے غیر بات نہیں کہی حالانکہ میں جس سے ملتی رہی ہوں۔ وہ مجھ سے کچھ اور ہی کہتا تھا۔ میری اماں جانتی ہے کہ میں گھر میں ہر وقت آپ ہی کی باتیں کرتی ہوں۔ میرا منہ تھکتا ہی نہیں۔ آپ کے آنے پر میں نے گاہوں کے پاس دو دھڑ لے جانا چھوڑ دیا ہے۔ لوگوں سے باتیں کرنا بند کر دیں۔ پانی بھرنے کے لیے بھی زیادہ تر چھوٹی بہن کو بھیجتی رہی ہوں۔ آپ کے آنے سے پہلے میں لوگوں سے ملتی رہی ہوں۔ اب میں آپ کو کیا بتاؤں کہ میں ان سے کیوں ملتی تھی..... مجھے کوئی مرد بھی بلاتا تو میں اس سے باتیں کرنے لگتی اس لیے..... نہیں، میں نہیں بتاؤں گی..... میرا دل جو چاہتا تھا۔ وہ ان لوگوں کے پاس نہیں تھا، میں بری نہیں، اللہ کی قسم، بے گناہ ہوں، خدا معلوم لوگ مجھے برا کیوں کہتے ہیں آپ بھی مجھے برا کہتے ہیں۔ جس طرح آپ نے آج میرے منہ پر اتنی گالیاں دی ہیں۔ اگر آپ کی بجائے کوئی اور ہوتا تو میں اس کا منہ نوچ لیتی مگر آپ..... اب میں کیا کہوں، میں بہت بدل گئی ہوں۔ آپ اچھے آدمی ہیں۔“

میں خیال کرتی تھی کہ آپ مجھے کچھ سکھائیں گے۔ مجھے اچھی اچھی باتیں سنائیں گے لیکن آپ مجھ سے خواہ مخواہ لڑ رہے ہیں..... آپ کو کیا معلوم کہ میں آپ کی کتنی قدر کرتی ہوں میں نے آپ کے سامنے کبھی گالیاں نہیں دیں، حالانکہ ہمارے گھر سارا دن گالی گلوچ ہوتی رہتی ہے۔“

”میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب! اس پہاڑی لڑکی کی گفتگو کس قدر سادہ تھی مگر افسوس ہے کہ اس وقت میرے کانوں میں روئی ٹھنسی ہوئی تھی۔ اس کے ہر لفظ سے مجھے عصمت فروشی کی بو آ رہی تھی۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا۔“

”بیگم تم ہزار قسمیں کھاؤ مگر مجھے یقین نہیں آتا۔ اب جو تمہارے جی میں آئے کرو میں کل بٹوٹ چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ میں نے تم سے محبت کی مگر تم نے اس کی قدر نہ کی۔ تم نے میرے دل کو بہت دکھ دیا ہے..... خیر اب جاتا ہوں۔ مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔“

مجھے جاتا دیکھ کر وہ سخت مضطرب ہو گئی اور میرا بازو پکڑ کر اور پھر اسے فوراً ہی ڈرتے ہوئے چھوڑ کر تھرائی ہوئی آواز میں صرف اس قدر کہا۔ ”آپ جا رہے ہیں؟“

میں نے جواب دیا۔ ”ہاں جا رہا ہوں تاکہ تمہارے چاہنے والوں کے لیے میدان صاف ہو جائے۔“

”آپ نہ جائیے۔ اللہ کی قسم میرا کوئی چاہنے والا نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ ”نہ جائیے، نہ جائیے نہ.....“ آخری الفاظ اس کی

گلوگیر آواز میں دب گئے اس کا رونا میرے دل پر کچھ اثر نہ کر سکا۔ میں چل پڑا۔ مگر اس نے مجھے بازو سے پکڑ لیا اور روتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”آپ خفا کیوں ہو گئے ہیں۔ میں آئندہ کسی آدمی سے بات نہ کروں گی۔ اگر آپ نے مجھے کسی مرد کے ساتھ دیکھا تو آپ اس چٹری سے جتنا چاہیے۔ پیٹ لیجیے۔ آئیے گھر چلیں، میں آپ کے لیے حقہ تازہ کر کے لاؤں گی۔“

میں خاموش رہا اور اس کا ہاتھ چھوڑ کر پھر چل پڑا۔ اس وقت بیلو سے ایک منٹ کی گفتگو کرنا بھی مجھے گراں گز رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ لڑکی میری نظروں سے ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو جائے۔ میں نے ہشکل دو گز کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ وہ میرے سامنے آکھڑی ہوئی۔ اس کے بال پریشان تھے۔ آنکھوں کے ڈورے سرخ اور ابھرے ہوئے تھے۔ سینہ آہستہ آہستہ دھڑک رہا تھا۔

اس نے پوچھا۔ ”کیا آپ واقعی جا رہے ہیں؟“

میں نے تیزی سے جواب دیا۔ ”تو اور کیا جھوٹ بک رہا ہوں۔“

”جائیے!“

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے اشک رواں تھے اور گال آنسوؤں کی وجہ سے میلے ہو رہے تھے۔ مگر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چمک ناچ رہی تھی۔

”جائیے!“ یہ کہہ کر وہ اٹنے پاؤں مڑی۔ اس کا قد پہلے سے لمبا ہو گیا تھا۔

میں نے نیچے اترنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دور جا کر میں نے جھاڑیوں کے پیچھے سے رونے کی آواز سنی۔ وہ رو رہی تھی..... وہ تھرائی ہوئی آواز ابھی تک

”یہ ہے میری داستان ڈاکٹر صاحب، میں نے اس پیراڑی لڑکی کی محبت کو شکرا دیا۔ اس غلطی کا احساس مجھے پورے دو سال بعد ہوا۔ جب میرے ایک دوست نے مجھے یہ بتایا کہ بیلو نے میرے جانے کے بعد اپنے شباب کو دونوں ہاتھوں سے لٹانا شروع کر دیا اور دق کے مریضوں سے ملنے کی وجہ سے وہ خود اس کا شکار ہو گئی۔ پھر بعد ازاں مجھے معلوم ہوا کہ اس مرض نے بالآخر اسے قبر کی گود میں سلا دیا۔ اس کی موت کا باعث میرے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔ وہ زندگی کی شاہراہ پر اپنا راستہ تلاش کرتی تھی مگر میں اس کو بھول جلیوں میں چھوڑ کر بھاگ آیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بھٹک گئی۔ میں مجرم تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے لیے وہی موت تجویز کی جس سے وہ دو چار ہوئی۔ وہ وزن جو میں پانچ سال اپنی چھاتی پر اٹھائے پھرتا رہا ہوں، خدا کا شکر ہے کہ اب ہلکا ہو گیا ہے۔“

میں مریض کی داستان خاموشی سے سنتا رہا۔ وہ بول چکا تو پھر بھی خاموش رہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کے جذبات پر رائے زنی کروں۔ چنانچہ وہاں سے اٹھ کر چلا گیا مجھے کئی مریضوں کی داستانیں سننے کا اتفاق ہوا ہے مگر یہ نہایت عجیب و غریب اور پر اثر داستان تھی۔ گو مریض بیماری کی وجہ سے ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ مگر حیرت ہے کہ اس نے اپنے طویل بیان کو کس طرح جاری رکھا۔ صبح کے وقت میں اس کا ٹیپر پیچ دیکھنے کے لیے آیا مگر وہ مرنے لگا تھا۔ سفید چادر اوڑھے وہ بڑے سکون سے سو رہا تھا۔

جب اس کو غسل دینے لگے تو ہسپتال کے ایک نوکر نے مجھے بلایا اور کہا۔

”ڈاکٹر صاحب اس کی مٹھی میں کچھ ہے۔ میں نے اس کی بند مٹھی کو آدھا کھول کر دیکھا۔ لوہے کے دو کپ تھے۔ اس کی بیلو کی یادگار۔“
”ان کو نکالنا نہیں یہ اس کے ساتھ ہی دفن ہوں گے۔“ میں نے غصہ سے دینے والوں سے کہا اور دل میں غم کی ایک عجیب و غریب کیفیت لیے دفتر چلا گیا۔



پریشانی کا سبب

’نعیم میرے کمرے میں داخل ہوا اور خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا اور اخبار کی آخری کاپی کے لیے جو مضمون لکھ رہا تھا اس کو جاری رکھنے ہی والا تھا کہ معاً مجھے نعیم کے چہرے پر ایک غیر معمولی تبدیلی کا احساس ہوا۔ میں نے چشمہ اتار کر اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”کیا بات ہے نعیم! معلوم ہوتا ہے تمہاری طبیعت ماساز ہے۔“

’نعیم نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری اور جواب دیا۔ ”کیا بتاؤں، عجب مشکل میں جان پھنس گئی ہے۔ بیٹھے بٹھائے ایک ایسی بات ہوئی ہے کہ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔“

میں نے کاندھ کی جتنی پرچیاں لکھی تھیں جمع کر کے ایک طرف رکھ دیں اور زیادہ دلچسپی لے کر اس سے پوچھا۔ ”کوئی حادثہ پیش آ گیا..... فلم کمپنی میں کسی ایکٹرس سے.....“

’نعیم نے فوراً ہی کہا۔ ”نہیں بھائی! ایکٹرس ویکٹرس سے کچھ بھی نہیں ہوا۔ ایک اور ہی مصیبت میں جان پھنس گئی ہے۔ تمہیں فرصت ہو تو میں ساری داستان سناؤں۔“

’نعیم میرا دوست ہے۔ جب سے وہ بمبئی آیا ہے اس سے میری دوستی چلی آ رہی ہے۔ وہ یوں کہ بمبئی آتے ہی اس نے میرے اخبار میں کام کیا اور خود کو بہت سی اہلیتوں کا مالک ثابت کیا۔ پھر آہستہ آہستہ جب مجھے اس کے اعلیٰ خاندان کا پتا

پلا! اور اسی قسم کی دوسری واقعتیں نکلتی آئیں تو میرے دل میں اس کی عزت اور بھی زیادہ ہو گئی، چنانچہ چھ مہینے کے مختصر عرصے ہی میں وہ میرا بے تکلف دوست بن گیا۔

فہیم نے میرے اخبار کو دلچسپ بنانے کے لیے مجھ سے زیادہ کوششیں کیں۔ ہر ہفتے جب اس نے ایک نئی کہانی لکھنا شروع کی اور میں نے اس کی تین چار کہانیاں پڑھیں تو مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ اخبار میں اگر فہیم پڑا رہا تو اس کی تمام دکاوٹیں تباہ ہو جائیں گی، چنانچہ میں نے موقع ملتے ہی ایک فلم کمپنی میں اس کی سفارش کی اور وہ مکالمہ نگار کی حیثیت سے فوری وہاں ملازم ہو گیا۔

فلم کمپنی کی ملازمت کے دوران میں فہیم نے وہاں کے سینکڑوں اور ڈائریکٹروں پر کیہ سا اثر ڈالا، اس کے متعلق مجھے کچھ علم نہیں۔ میں بے حد مصروف آدمی ہوں لیکن فہیم سے ایک دو بار مجھے اتنا ضرور معلوم ہوا تھا کہ وہاں اس کا کام پسند کیا گیا ہے۔ اب ایسا کیسی نہ جانے کیا حادثہ پیش آیا تھا جو اس کا رنگ یوں ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا تھا۔

فہیم بے حد شریف آدمی ہے۔ اس سے کسی نامعقول حرکت کی توقع ہی نہیں ہو سکتی تھی، میں سخت متحیر ہوا کہ ایسی کون سی افتاد پڑی جو فہیم کسی کو اپنا منہ دکھانے کے قابل نہ رہا۔ میں نے اس سے اجازت لے کر جلدی جلدی آخری کاپی کے لیے مضمون کا ہتھکڑیا حصہ مکمل کیا اور تمام پرچیاں کاب کر دے کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ ”بھئی معاف کرنا میں فوراً ہی تمہاری داستان نہ بن سکا..... لیکن میں پوچھتا ہوں یہ داستان آخر بنی کیسے؟..... تم..... تم..... خیر چھوڑو اس قصے کو، تم مجھے سارا

واقعہ سناؤ۔“

نعیم نے جیب سے سگریٹ نکال کر ساگایا اور کہا۔ ”اب میں تمہیں کیا بتاؤں، جو کچھ ہوا، میری اپنی بیوقوفی کی بدولت ہوا۔ ہماری فلم کمپنی میں ایک ایکٹر ہے۔ عاشق حسین، اول درجے کا چغند ہے۔ چونکہ دوسروں کی طرح اسے ستاتا نہیں ہوں اس لیے وہ مجھ پر بری طرح فریفتہ ہے، یہ فریفتہ میں نے اس لیے کہا ہے کہ وہ مجھ سے اسی طرح باتیں کرتا ہے جس طرح خوبصورت عورتوں سے کی جاتی ہیں۔“

میں ہنس پڑا۔ ”پر تم اتنے خوبصورت تو نہیں ہوا۔“

نعیم کے پیلے چہرے پر بھی ہنسی کی لال لال دھاریاں پھیل گئیں۔ ”کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا ہے۔ دراصل وہ اپنے اخلاص اور اپنی بے لوث محبت کا ظہار کرنا چاہتا ہے اور چونکہ اسے ایسا کرنے کا طریقہ نہیں آتا اس لیے اس کا پیاروی شکل اختیار کر لیتا ہے جو اس کو غالباً اپنی بیوی سے ہوگا..... ہاں تو یہ عاشق حسین صاحب جو اول درجے کے رقص میں اور رقص کے سوا اور کچھ بھی نہیں جانتے پرسوں شوٹنگ کے بعد مجھے ملے۔ سیٹ پر میں نے ان کے مکالمے درست کرنے میں کافی محنت کی تھی۔ اس کا حق ادا کرنے کے لیے انہوں نے فوراً ہی کچھ سوچا اور کہا۔ نعیم صاحب! میں اُسے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”فرمائیے۔“ انہوں نے پھر کچھ سوچا اور کہا۔ ”ون بھر کام کرنے کے بعد میں بہت تھک گیا ہوں۔ آپ بھی ضرور تھک گئے ہوں گے۔ چلیے کہیں گھوم آئیں۔“ اب میں یہاں اپنی ایک کمزوری بتا دوں۔ موسم اگر خوشگوار ہو تو میں عموماً بہک جاتا

ہوں۔ شام کا جھپٹنا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اور فضا میں ایک عجیب قسم کی اداسی گھٹی ہوئی تھی۔ جوان کنوارے آدمیوں کے دل میں ایسی اداسی ضرور موجود ہوتی ہے جو پھیل کر ایسے موقعوں پر بہت وسعت اختیار کر لیا کرتی ہے۔ میرے بدن پر ایک کچکی سی طاری ہو گئی جب میں نے جوہو کے سمندری کنارے کا تصور کیا جہاں شام کو نرم آلودہوائیں یوں چلتی ہیں جیسے بھاری بھاری ریشمی ساڑھیاں پہن کر عورتیں چلتی ہیں۔ میں فوراً تیار ہو گیا۔ ”چلیے..... مگر کہاں جائیے گا۔“ اب عاشق حسین نے پھر سوچا اور کہا۔ ”کہیں بھی چلے چلیں گے..... یہاں سے باہر تو نکلیں۔“ ہم دونوں گیٹ سے باہر نکلے اور موڑ پر بس کا انتظار کرنے لگے۔

یہاں تک کہہ کر نعیم رک گیا۔ اس کے چہرے کی زردی اب دور ہو رہی تھی۔ میں نے اس کے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر ساگایا اور کہا۔ ”تم دونوں گیٹ سے باہر نکل کر بس کا انتظار کرنے لگے۔“

نعیم نے سر ہلایا۔ ”اور شادی اعمال ادھر سے عاشق حسین کے ایک مارواڑی دوست کا گزر ہوا۔ وہ موٹر میں جا رہا تھا کہ اچانک عاشق حسین کی نظر اس پر پڑی۔ فوراً ہی اس نے مارواڑی زبان میں اپنے دوست کو کھڑے کے لیے کہا۔ موٹر کی، عاشق حسین نے اس سے مارواڑی زبان میں چند باتیں کیں پھر دوڑ کر میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔ چلیے..... کام بن گیا۔ موٹر مل گئی۔ اسی میں چلتے ہیں۔“ میں چل پڑا موٹر میں داخل ہونے سے پہلے عاشق نے اپنے مارواڑی دوست سے جو شکل و صورت کے اعتبار سے ڈرائیور معلوم ہوتا تھا تعارف کرایا اور حسب معمول مبالغے سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”یہ مارواڑ کے بہت بڑے سیٹھ ہیں۔ یہاں ایک

”میں قطعاً نہیں جانتا۔ یعنی اگر مجھے اس عورت کے متعلق کچھ علم ہو تو مجھ پر لعنت۔ خدا معلوم کون ہے، پر اب میں اتنا جانتا ہوں کہ اس نے ہم لوگوں پر فوجداری مقدمہ دائر کر رکھا ہے۔ جرم ڈاکہ اور چوری ہے۔“

میں نے تعجب سے پوچھا۔ ”ڈاکہ اور چوری۔“

نعیم کے لہجہ نے ایسی متانت اختیار کر لی جس میں روحانی اذیت کی جھلک صاف دکھائی دیتی تھی۔ کہنے لگا۔ ”ہاں..... ڈاکہ اور چوری مجھے دفعات اچھی طرح یاد نہیں مگر ان کا مطلب یہی ہے کہ ہم نے مداخلت بے جا کی، زہرہ کے گھر پر ڈاکہ ڈالا اور اس کی چند قیمتی اشیاء چہا کر لے گئے، لیکن یہ تو داستان کا انجام ہے۔ پہلے کے واقعات تمہیں سنالوں پھر اس طرف آتا ہوں..... میں کیا کہہ رہا تھا؟“

میں نے جواب دیا۔ ”یہ کہ تم اس مارواڑی کی موٹر میں بیٹھ گئے۔“

”ہاں میں عاشق حسین کے کہنے پر اس منحوس مارواڑی کی موٹر میں بیٹھ گیا۔ موٹر وہ خود چارہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اگلی سیٹ پر ایک اور آدمی بیٹھا تھا جو اس سے کم منحوس نہیں تھا۔ عاشق حسین نے شاید اس کے متعلق کہا تھا کہ وہ موٹر میں بنانے کا کام کرتا ہے۔ خیر موٹر مختلف بازاروں سے ہوتی ہوئی وادری طرف جانکی ظاہر تھا کہ ہم جو ہو جائیں گے، چنانچہ میں بہت خوش تھا جو ہو کی گیلی گیلی ریت سے مجھے بے حد پیار ہے۔ کبھی کبھی ادھر جا کر میں گیلی ریت پر ضرور لیٹا کرتا ہوں اور دیر تک کھلے آسمان کی طرف دیکھا کرتا ہوں جو اتنا ہی پر اسرار اور ناقابل رسا دکھائی دیتا ہے جتنا ایک اجنبی عورت کا تصور..... سامنے رات کی سرمئی روشنی میں سمندر کروٹیں لیتا ہے، اوپر گد لے آسمان پر تارے یوں چمکتے ہیں جیسے انہونی باتیں کسی جوان آدمی کے دل میں ٹمٹما رہی ہوں۔ ایک عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ وہ اس پار جہاں آسمان اور سمندر کوئی واضح خط بنائے بغیر آپس میں گھل مل جاتے ہیں۔ ایک ایسی دھندلی روشنی نظر آیا کرتی ہے جو خوبصورت شعروں کی طرح

مصنوعی ہوتی ہے..... میں جوہو کی سیر کے خیال میں مگن تھا کہ عاشق حسین نے موٹر کو دائرہ میں ایک جگہ ٹھہرا لیا اور مجھ سے کہا چلیے..... کچھ پی لیں۔“ جیسا کہ تمہیں معلوم ہے، بیڑ مجھے پیاری ہے۔ عاشق حسین کو خدا معلوم کہاں سے اس بات کا پتا چلا تھا کہ میں پیا کرتا ہوں۔ خیر..... ہم چاروں داخل ہوئے۔ ایک بوتل بیڑ کی میں نے پی اور ایک عاشق حسین نے۔ مارواڑی سیٹھ اور موٹریں بنانے والے نے کچھ نہ پیا۔ ہم جلد ہی ہی فارغ ہو گئے۔ پھر موٹر میں بیٹھے اور جوہو کا رخ کیا مگر فوراً ہی عاشق حسین کو ایک کام یاد آ گیا۔ ”اوہ مجھے تو اپنی شاگرد زہرہ کے ہاں جانا ہے۔ آج اس سے ملنے کا میں نے وعدہ کیا تھا..... نعیم صاحب اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو پانچ منٹ لگیں گے۔ اس کا مکان بالکل قریب ہے۔“ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا، چنانچہ اس نے موٹر ایک گلی میں ٹھہرائی اور اکیلا سامنے والے مکان کی طرف بڑھا۔

میں نے پوچھا۔ ”یگلی کس طرف ہے۔“
 نعیم نے جواب دیا۔ ”دائرہ میں ہے..... ادھر جہاں پارسیوں کے بے شمار مکان ہیں، غالباً اس کو پارسی کالونی کہتے ہیں۔“

..... ہاں تو عاشق حسین موٹر سے نکل کر سامنے مکان کی طرف بڑھا۔ ایک چھوٹا سا دو منزلہ مکان تھا۔ بیچھے طے کر کے عاشق نے دروازہ پر دستک دی۔ جب کسی نے دروازہ نہ کھولا تو عاشق نے دوسری بار زور سے دست دی۔ اندر سے کسی عورت کی آواز آئی ”کون ہے۔“ عاشق حسین نے بلند آواز میں جواب دیا۔ ”عاشق!“ اندر سے خشم آلود آواز آئی۔ ”عاشق کی.....“ عاشق حسین نے یہ

گالی سن کر ہماری طرف دیکھا اور زور سے دروازہ کھٹکھٹانا اور یہ کہنا شروع کیا۔
 ”دروازہ کھولو..... دروازہ کھولو۔“

یہ سن کر میں نے کہا۔ ”اس عورت نے شاید عاشق کا غلط مطلب سمجھا ورنہ جیسا کہ تم ابھی کہہ چکے ہو وہ عاشق کی شاگرد تھی۔“

”جانے بلا..... کیا تھی اور کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ عاشق حسین نے جھوٹ ہی بولا ہو اور بیڑ کی ایک بوتل پینے کے بعد زہرہ کا خیال اس کے دماغ میں آ گیا ہو۔ کسی نے اس سے کبھی کہا ہو گا کہ فلاں نمبر کے فلیٹ میں ایک عورت زہرہ رہتی ہے..... لیکن اس سے کیا بحث ہے..... عاشق حسین نے او دھم مچانا شروع کر دی۔ اندر سے گالیاں آتی رہیں اور بیشتر اس کے کہ میں اسے منع کر سکتا۔ تین چار دھکے مار کر اس نے دروازہ توڑا اور زبردستی اندر داخل ہو گیا۔ جب یہ شور ہوا تو اس پاس کے رہنے والے پاری اکٹھے ہو گئے۔ میں بے حد پریشان ہوا، چنانچہ اسی پریشانی میں موٹر سے باہر نکلا اور عاشق کو باہر لانے کی خاطر اس مکان میں داخل ہو گیا۔ میرے پیچھے پیچھے عاشق کے دونوں ساتھی بھی چلے آئے۔ میں نے اس فلیٹ کے تینوں کمرے دیکھے مگر نہ عاشق نظر آیا نہ اس کی شاگرد زہرہ۔ خدا معلوم کہاں غائب ہو گئے تھے۔ گھر کے پرانی طرف دوسرا راستہ تھا، ممکن ہے وہ ادھر سے باہر نکل گئے ہوں۔ میں چند منٹ ان تین کمروں میں رہا، جب کوئی سراغ نہ ملا تو باہر نکل کر موٹر میں بیٹھ گیا۔ وہ پاری جو گلی میں جمع ہو گئے تھے گھور گھور کر میری طرف دیکھنے لگے۔ میں اور زیادہ پریشان ہو گیا۔ بیڑ کا سارا نشہ جو دماغ میں تھا اتر کر میری ٹانگوں میں چلا آیا۔ میرے جی میں آئی کہ عاشق، اس کے ساتھیوں اور ان کی موٹر کو وہیں چھوڑ

کر بھاگ جاؤں مگر..... عجیب مشکل میں میری جان پھنس گئی تھی۔ اگر بھاگنے کی کوششیں کرتا تو یقیناً وہ پاری جو مجھے چڑیا گھر کا بندر سمجھ کر گھور رہے تھے پکڑ لیتے..... دس بارہ منٹ اسی شش و پنج میں گزرے۔ اس کے بعد عاشق اور اس کے دونوں دوست مکان میں سے باہر نکلے اور موٹر میں بیٹھ گئے۔ میں نے عاشق سے کوئی بات نہ پوچھی۔ موٹر چلی اور جب دادر کا حلقہ آیا تو میں نے اس سے کہا مجھے یہیں اتار دو، میں بس میں گھر چلا جاؤں گا۔“ عاشق کے دماغ سے جو ہو کی سیر کا خیال نکل گیا تھا، اس نے اپنے مارواڑی دوست سے موٹر روکنے کے لیے کہا، چنانچہ میں ان سے رخصت لے کر گھر چلا آیا اور اس واقعے کو بھول گیا۔

نعیم نے ایک اور سگریٹ ساگایا اور کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ میں نے پوچھا۔ ”اس کے بعد کیا ہوا؟“ مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ نعیم نے بڑی تلخی کے ساتھ کہا۔ ”اس بیوقوف کے بچے عاشق حسین سے جب پولیس والوں نے پوچھا کہ تمہارے ساتھ اور کون تھا تو اس نے اپنے مارواڑی دوست، اس موٹر بنانے والے کا اور میرا نام لے دیا۔ ہم تینوں ایک گھنٹے کے اندر اندر گرفتار کر لیے گئے۔“ میں نے پوچھا۔ ”یہ کب کی بات ہے؟ تم نے مجھے اطلاع کیوں نہ دی۔“

نعیم نے جواب دیا۔ کل وہ ڈھائی بجے کے قریب ہماری گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ میں نے تمہیں ٹیلی فون پر ضرور مطلع کیا ہوتا اگر میرے حواس بجا ہوتے۔ بخدا میں سخت پریشان تھا۔ پولیس انسپکٹر ٹیکسی میں ہم سب کو تھانے لے گیا۔ وہاں بیانات قلمبند ہوئے تو مجھے پتا چلا کہ عاشق حسین کے وہ مارواڑی دوست جو کسی کاروبار کے سلسلے میں یہاں آئے تھے زہرہ کا پنکھا اٹھا کر اپنے ساتھ لے آئے

تھے۔ بکلی کا یہ پنکھا پولیس نے ان سے حاصل کر لیا تھا۔
یہ سن کر میں نے تشویشناک لہجہ میں کہا۔ ”اس سے تو چوری صاف ثابت ہوتی ہے۔“

”چوری ثابت ہوتی ہے جیسی تو میں اس قدر پریشان ہوں اور بچ پوچھتو اگر یہ ثابت نہ بھی ہوتی تو میری پریشانی اسی قدر رہتی۔ تھانے اور عدالت میں جانا بے حد شرمناک ہے، پر اب کیا کیا جائے۔ جو ہونا ہے ہو چکا ہے۔ اس خفت سے چھٹکارا نہیں مل سکتا جو مجھے اٹھانا پڑے گی اور اٹھانا پڑ رہی ہے۔ میں بالکل بے گناہ ہوں یعنی ظاہر ہے کہ زہرہ کو میں بالکل نہیں جانتا، اس کے مکان پر میں اگر گیا تو محض عاشق حسین کی وجہ سے اس چغد کے کہنے پر جو ایک بول تو بیڑ بھی ہضم نہیں کر سکتا۔“

نعیم کے چہرے پر نفرت اور غصے کے ملے جلے جذبات دیکھ کر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ ”بھئی..... بہت برے پھنسے۔“
نعیم نے اسی انداز میں کہا۔ ”ہنسی میں پھنسی اسی کو کہتے ہیں..... کل..... اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے عدالت کا منہ دیکھا اور وہ زہرہ بھی پہلی مرتبہ مجھے نظر آئی۔“

میں نے فوراً ہی پوچھا۔ ”کیسی ہے؟“
نعیم نے بے پرواہی سے جواب دیا۔ ”بری نہیں..... یعنی شکل صورت کے اعتبار سے اچھی خاصی ہے..... بیٹھوی چہرہ ہے جس پر کیلوں اور مہاسوں کے داغ نظر آتے ہیں۔ لمبے لمبے کالے بال ہیں۔ پیشانی تنگ ہے۔ جوان ہے۔ ایسا

معلوم ہوتا ہے کہ حال ہی میں اس نے یہ دھند شروع کیا ہے۔“
 میں نے بغیر کسی مطلب کے یوں ہی پوچھا۔ ”کیسا دھند؟“
 نعیم نے شرما سا گیا۔ ”ارے بھئی..... وہی جو عورتیں کرتی ہیں۔ زہرہ کے
 چہرے پر اس کی چھاپ دور سے نظر آ سکتی ہے..... مجھے اس عورت پر اتنا غصہ کبھی
 نہ آتا مگر جب مجسٹریٹ نے میری طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ تم اس کو پہچانتی
 ہو۔“ تو زہرہ نے میری طرف اپنی بڑی بڑی دھلی ہوئی آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔
 ”ہاں صاحب! پہچانتی ہوں۔ اسی نے میرا چاندی کا ٹی سیٹ اٹھایا تھا۔ جب اس
 نے یہ جھوٹ بولا تو خدا کی قسم جی میں آئی ملعونہ کے حلق میں کٹہرے کا ایک ڈنڈا
 نکال کر ٹھونس دوں۔ اتنا بڑا جھوٹ!“

اس پر میں نے کہا۔ ”بھئی جھوٹ تو بولے گی۔ اس کے بغیر کام کیسے چلے گا۔
 اسے اپنا کیس مضبوط بھی تو بنانا ہے..... اب تو تمہیں قبر درویش بردہاں درویش
 سب کچھ سننا پڑے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ نعیم نے بڑی پریشانی کے ساتھ کہا۔ ”جو کچھ ہوگا اسے ہر
 حالت میں سہتا ہی پڑے گا مگر..... مگر..... میں کیا بتاؤں میں کس قدر پریشان ہو
 گیا ہوں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا..... اگر کسی مرد نے مجھ پر ایسا مقدمہ دائر کیا ہوتا تو
 مجھے اتنی پریشانی نہ ہوتی مگر ذرا غور تو کرو، وہ عورت ہے..... اور میں عورتوں کی
 تعظیم کرتا ہوں۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیوں؟“
 نعیم نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ ”اس لیے کہ میں عورتوں کو جانتا ہی

نہیں۔ کسی عورت سے ملنے اور اس سے کھل کر بات چیت کرنے کا مجھے کبھی موقع ہی نہیں ملا۔ اب زندگی میں پہلی مرتبہ عورت آئی ہے تو مدعی بن کر۔“

میں نے ہنسنا شروع کر دیا۔ نعیم نے اس پر ہنسنے کا کہا۔ ”تم ہنسنے ہو مگر یہاں میری جان پر بنی ہے۔۔۔۔۔ دو دن سے میں کمپنی نہیں جا رہا۔۔۔۔۔ وہاں یہ بات ضرور پہنچ چکی ہوگی۔ سیٹھ صاحب کے سامنے کیا منہ لے کے جاؤں گا۔ انہوں نے اگر کچھ پوچھا تو میں کیا جواب دوں گا۔“

میں نے کہا۔ ”جو اصل بات ہے ان کو بتا دینا۔“

”وہ تو میں بتا ہی دوں گا مگر خدا کے لیے سوچو تو یہی کہ میری پوزیشن کیا ہے۔۔۔۔۔ میں سیٹھ صاحب کی بے حد عزت کرتا ہوں اس لیے کہ وہ میرے آقا ہیں اگر انہوں نے مجھے بدکردار سمجھ کر برطرف کر دیا تو عمر بھر کے لیے میں داغدار ہو جاؤں گا۔ ملازمت کھونے کا مجھے اتنا افسوس نہیں ہو گا مگر یہاں سوال عزت و ناموس کا ہے۔۔۔۔۔ وہ ضرور بدگمان ہو جائیں گے۔ میں ان کی طبیعت سے اچھی طرح واقف ہوں، میری سچی باتوں کو بھی وہ جھوٹا ہی سمجھیں گے۔ فلم کمپنی میں ہر شخص جھوٹ بولتا ہے۔ وہ خود بھی ہمیشہ جھوٹ بولتے ہیں۔ اب میں کیا کروں۔۔۔۔۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“

میں نے ہر ممکن طریقے سے نعیم کی اخلاقی جرأت بڑھانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ وہ بے حد ڈرپوک ہے۔ خاص کر عورتوں کے معاملے میں تو اس کی بزدلی بہت ہی زیادہ ہے۔ دراصل معاملہ بھی سنگین تھا اگر برقی پنکھا برآمد نہ ہوتا تو کیس بالکل معمولی رہ جاتا۔ مگر پولیس اس مارواڑی سے پنکھا حاصل کر چکی تھی

اس لیے ظاہر ہے کہ زہرہ ایک حد تک سچی تھی۔

نعیم زیادہ دیر تک میرے پاس نہ ٹھہرا اور چلا گیا۔ دوسرے روز شام کو وہ پھر آیا۔ اس کی پریشانی اور بھی زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ آتے ہی کہنے لگا۔ ”بھائی! ایک مصیبت میں تو جان بچھنی تھی، اب ایک اور آفت گئے پڑ گئی ہے۔“

میں نے تشویش کے ساتھ کہا۔ ”کیا ہوا..... کیا کوئی اور کیس کھڑا ہو گیا۔“

”نہیں..... کیس وہی ہے، مگر ایک ایسی بات ہوئی ہے جو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔“ نعیم نے کرسی پر بیٹھ کر اضطراب کے ساتھ ٹانگ ہلانا شروع کی۔

”آج صبح سینٹھ صاحب نے مجھے بلانے کے لیے موٹر بھیجی۔ مجھے جانا ہی پڑا حالانکہ میں ارادہ کر چکا تھا کہ کبھی نہیں جاؤں گا۔ بخدا فلم کمپنی میں داخل ہوتے وقت میری حالت وہی تھی جو حساس ملازموں کی ہوتی ہے۔ شرم کے مارے میرا حلق سوکھ رہا تھا۔ سر بھاری ہو گیا تھا۔ نیچی نظریں کیے جب میں سینٹھ صاحب کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ بڑے تپاک کے ساتھ انہوں نے پہلی مرتبہ میرے ساتھ پنڈھیک کیا اور ہنس کر کہنے لگے۔ ”مشی صاحب! آپ نے کمال کر دیا۔ آپ تو چھپے رستم نکلے۔ بیٹھے تشریف رکھیے۔“ میں مذمت میں غرق کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ بھی بیٹھ گئے۔ پھر انہوں نے ایسی باتیں شروع کیں کہ میرے اوسان خطا ہو گئے۔ کہنے لگے۔ ”آپ گھبراتے کیوں ہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ بتائیے کہ یہ زہرہ ہے کیسی؟ کچھ اچھی ہے؟“

بھئی آپ نے تو کمال کر دیا۔ میں سنتا ہوں کہ آپ نے پی کروہ دھمال مچائی کہ پاری کالونی کے سب آدمی اکٹھے ہو گئے۔ کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ زہرہ کی ساڑھی اتار کر لے گئے.....

پہلے بھی تو آپ اس کے ہاں آتے جاتے ہوں گے پھر حزامزادی نے پولیس میں رپورٹ کیوں لکھوائی، پر کیا پتا ہے آپ نے بہت زیادہ شرارتیں کی ہوں۔“ ایسی ہی بے شمار باتیں انہوں نے مجھ سے کہیں۔ میں خاموش رہا۔ اس کے بعد انہوں نے چائے منگوائی۔ ایک پیالہ میرے لیے بنایا اور پھر وہی گفتگو شروع کر دی۔ ”چاندی کاٹی سیٹ جو آپ اٹھا کر لے گئے تھے، مجھے اگر آپ پر پرنٹ کر دیں تو میں ابھی آپ کو اپنے وکیل کے پاس لے جاتا ہوں۔۔۔۔۔ ایسی اچھی وکالت کرے گا کہ زہرہ کی طبیعت صاف ہو جائے گی۔۔۔۔۔ میں سنتا ہوں زہرہ شکل صورت کی اچھی ہے تو بھئی اس مقدمہ کے بعد اسے یہاں لے آؤں۔ اپنے فلم میں اسے کوئی چھوٹا سا رول دے دیں گے۔۔۔۔۔ اور ہاں، یہ آپ نے اچھا کیا کہ اسی کی شراب پی اور اسی کی چیزیں اڑا کر لے گئے۔۔۔۔۔ پر آپ ایک درجن آدمی اپنے ساتھ کیوں لے گئے تھے؟ بے چاری اتنے آدمی دیکھ کر گھبرا گئی ہوگی۔“ بات بات پر وہ ہنستے تھے جیسے گفتگو کے لیے انہیں ایک نہایت ہی دلچسپ موضوع مل گیا ہے۔ تعجب ہے کہ اس سے پہلے انہوں نے کبھی میرے سلام کا جواب بھی نہیں دیا تھا۔

میں نے کہا۔ ”تو کیا ہوا۔ تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ وہ تم پر ناراض نہ ہوئے۔“ نعیم نے بگڑ کر کہنے لگا۔ ”یہ بھی تم نے خوب کہا۔ کہ مجھے خوش ہونا چاہیے۔ وہ مجھے مجرم سمجھ رہے تھے جو کہ میں نہیں ہوں۔۔۔۔۔ میں کیا کہہ سکتا تھا۔ خاموش رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے خزانچی کو بلایا اور مجھے سورہ پے ایڈوانس دلوائے حالانکہ دو مہینے سے کسی ملازم کو تنخواہ نہیں مل رہی۔“

میں نے کہا۔ ”تو کیا ہوا؟“

”ارے بھئی! تم ساری بات تو سن لو۔“ نعیم کھج گیا۔ سو روپے دلوا کر انہوں نے کہا۔ ”یہ آپ اپنے پاس رکھیے۔ آپ کو مقدمہ کے لیے ضرورت ہوگی۔ وکیل کا بندوبست میں ابھی کیے دیتا ہوں۔“ ٹیلی فون پر انہوں نے فوراً ہی وکیل سے بات کی، پھر مجھے اپنی موٹر میں بٹھا کر اس کے پاس لے گئے۔ ساری باتیں اس کو سمجھائیں اور کہا۔ ”دیکھئے، اس مقدمے میں جان لڑا دیجیے گا..... بات بالکل معمولی ہے، اس لیے کہ منشی صاحب سے زہرہ کے تعلقات بہت پرانے ہیں۔“ میں کیا کہتا۔ وہاں بھی خاموش رہا۔

میں نے ہنس کر نعیم سے کہا۔ ”اب بھی خاموش رہو۔ تمہارا کیا بگڑ گیا ہے؟“ نعیم اٹھ کھڑا ہوا اور انظر اب کے ساتھ ٹہلنے لگا۔ ”ابھی کچھ بگڑا ہی نہیں۔ عدالت میں مجھے بیان دینا پڑے گا کہ زہرہ میری وابستہ ہے اور میں اسے ایک مدت سے جانتا ہوں..... اور..... اور..... سیٹھ صاحب نے آج شام مجھے مدعو کیا ہے۔ کہتے تھے گرین چلین گے۔ وہاں کچھ شغل رہے گا..... میری جان عجیب مصیبت میں پھنس گئی ہے..... سمجھ میں نہیں آتا کیا ہو رہا ہے۔“

پہچان

ایک نہایت ہی تھرڈ کلاس ہوٹل میں دیہی و سکی کی بوتل ختم کرنے کے بعد طے ہوا کہ باہر گھوما جائے۔ اور ایک ایسی عورت تلاش کی جائے جو ہوٹل اور و سکی کے پیدا کردہ تکدر کو دور کر سکے۔ کوئی ایسی عورت ڈھونڈی جائے جو ہوٹل کی کثافت کے مقابلے میں نفاست پسند اور بد ذائقہ و سکی کے مقابلے میں لذیذ ہو۔

فخر نے ہوٹل کی غلیظ فضا سے باہر نکلتے ہی مجھ سے اور مسعود سے کہا۔ ”کوئی دانے دار عورت ہو۔۔۔۔۔ اچھے گویے کے گلے کی طرح اس میں بڑے بڑے دانے ہوں۔۔۔۔۔ خدا کی قسم طبیعت صاف ہو جائے۔“

و سکی دانوں سے بالکل خالی تھی۔ سوڈا بھی بالکل بے جان تھا۔ غالباً اسی وجہ سے فخر ”دانے دار عورت“ کا قائل ہو رہا تھا۔ ہم تینوں عورت چاہتے تھے۔ فخر دانے دار عورت چاہتا تھا۔ مجھے ایسی عورت مطلوب تھی جس میں بنیاد نہ ہو اپنی نفیس کے روپے لے کر ٹرنک میں یا جہاں اس کا جی چاہے رکھے اور کچھ عرصہ کے لیے بھول جائے کہ سو دا کر رہی ہے۔

اس بازار کا راستہ جو ہم جانتے تھے جہاں عورتیں مل سکتی ہیں کالی، نیلی، پیلی، الال اور جامنی رنگ کی عورتیں۔ پیڑوں کی طرح ان کے مکان ایک قطار میں دور تک دوڑتے چلے گئے ہیں۔ یہ رنگ برنگی عورتیں ان میں پکے ہوئے پھلوں کے مانند لگی رہتی ہیں۔ آپ نیچے سے ڈھیلے اور پتھر مار کر انہیں گرا سکتے ہیں۔

ہمیں یہ عورتیں مطلوب نہیں تھیں۔ دراصل ہم اپنے آپ کو دھوکا دینا چاہتے

تھے ہم ایسی عورت یا عورتیں چاہتے تھے جو حرف عام میں ”پرائیویٹ ہوں“ یعنی جو منڈی کے جوم میں سے نکل کر علیحدہ شریف محلوں میں اپنا کاروبار چلا رہی ہوں۔ ہم تینوں میں فخر سب سے زیادہ تجربہ کار تھا۔ قوت ارادی بھی اس میں ہم سب سے زیادہ تھی۔ ایک تانگے والا جب ہمارے پاس سے گزرا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا اور بغیر کسی جھجک کے معنی خیز لہجے میں اس سے کہا۔

”ہم سیر کرنا چاہتے ہیں۔ چلو گے؟“

تانگے والا سنجیدہ اور متین آدمی معلوم ہوتا تھا ہم تینوں کی طرف باری باری دیکھا۔ میں جھینپ سا گیا خاموشی ہی خاموشی میں وہ ہم سے کہہ گیا تھا، تم نو جوانوں کو شراب پی کر یہ کیا ہو جاتا ہے؟

فخر نے دوبارہ اس سے کہا۔ ”ہم سیر کرنا چاہتے ہیں..... چلو گے؟“ پھر فوراً ہی اسے کچھ خیال آیا اور اپنا مطلب اور زیادہ واضح کر دیا۔ ”کوئی مال وال ہے تمہاری نگاہ میں؟“

مسعود اور میں دونوں ایک طرف کھسک گئے۔ مسعود نے گھبرا کر مجھ سے کہا۔

”یہ فخر کیا آدمی ہے اسے کچھ سمجھاؤ۔“

مسعود سے میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ فخر نے آواز دی۔ ”وہ کی پینے کے باوجود ہمیں سردی محسوس ہو رہی تھی۔ چونکہ اگلی نشست پر تھا اور تینوں میں سب سے زیادہ کمزور تھا۔ اس لیے میرے کان سن ہو رہے تھے۔ جب تانگہ ڈفرن برج کے نیچے اترتا تو میں نے غلغلہ نکال کر کانوں اور سر پر لپیٹ لیا اور اوور کوٹ کا کالر بھی اونچا کر لیا۔“

سانس گھوڑے کے نتھنوں سے بھاپ بن کر باہر نکل رہا تھا۔ ہم تینوں خاموش تھے۔ تانگے والا مولے اور کھر درے کھل میں لپٹا خاموشی سے اپنا تانگہ چلا رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ سنجیدگی اس کے چہرے پر ٹھہری رہی تھی۔ جو مجھے بہت بری معلوم ہوئی۔ چنانچہ میں نے فخر سے کہا۔ ”فخر یہ آدمی کیسا ہے۔۔۔۔۔ کوئی بات ہی نہیں کرتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کاسٹرا نکل پی کر بیٹھا ہے۔“ تانگے والا میرے اس ریمارک پر بھی خاموش رہا۔ فخر نے کہا۔ ”زیادہ باتیں کرنے والے آدمی ٹھیک نہیں ہوتے۔ ہمارا مطلب سمجھ گیا ہے۔ لے چلے گا۔ جہاں بھی چیز اچھی ہوئی۔“

مسعود جو سگریٹ سلگا رہا تھا۔ ایک دم بولا۔ ”واللہ عورت کتنی اچھی چیز ہے۔ عورت، عورت کم ہے چیز زیادہ ہے۔“ میں نے اس کو ذرا اور خوبصورت بنا کر کہا۔ ”مسعود! چیز نہیں۔۔۔۔۔ چیز ی۔“

شاعر آدمی تھا۔ پھر ک اٹھا۔ ”واللہ کیا بات پیدا کی ہے، چیز نہیں، چیز ی۔۔۔۔۔ سو میاں تانگے والے چیز اور چیز ی میں فرق ہے۔ اس کا دھیان رکھنا۔“ تانگے والا خاموش رہا۔

اب میں نے اس کی طرف اور زیادہ غور سے دیکھا۔ مضبوط جسم کا آدمی تھا۔ عمر پینتیس برس کے لگ بھگ ہوگی۔ تلی تلی مونچھیں تھیں۔ جن کے بال نیچے کو جھکے ہوئے تھے۔ سردی کے باعث چونکہ اس نے کھل کا ڈھانا سا بنا رکھا تھا۔ اس لیے اس کا پورا چہرہ نظر نہ آتا تھا۔

میں نے اس کی طرف دیکھ کر فخر سے پوچھا۔ ”کہاں لے جا رہے ہو میں؟“

فخر نے جو زیادہ سوچ بچار کا عادی نہیں تھا۔ جواب دیا ”اُس نے بیتاب کیوں ہوتے ہو؟ ابھی جموڑی دیر کے بعد چیز تمہارے سامنے آ جائے گی۔“
 مسعود نے اس پر فخر سے کہا۔ ”تم سے کیا بات ہوئی ہے اس کی؟“
 فخر نے جواب دیا۔ ”روشن آرا روڈ پر..... کچھ میمیں رتی ہیں۔ کہتا ہے ہمارے کام کی ہیں۔“
 میوں کا نام سن کر مسعود اپنے دوست کی ایک اظہم یاد آ گئی۔ اس کا حوالہ دے کر اس نے کہا۔

”تو چلو آج لگے ہاتھوں ارباب وطن کی بے بسی کا انتقام بھی لے لیا جائے گا۔ واللہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تانگے والا صاحب ذوق ہے۔ وہ نظم ضرور پڑھی ہوگی اس نے۔“
 اس کے بعد دیر تک میوں کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ میں اور مسعود میوں کے بالکل قائل نہیں تھے۔ لیکن فخر کو عورتوں کی یہ قسم پسند تھی۔ ”ان کا علم سانسیفک ہوتا ہے۔ یعنی یہ عورتیں سانسیفک طریقے پر اپنا کاروبار چلاتی ہیں۔ ان کے مقابلے میں مشرقی عورتوں کو دیکھئے تو وہی فرق نظر آئے گا۔ جو ہمارے یہاں کی ریوڑھی اور وہاں کی مانی میں ہے۔ بھئی دراصل بات یہ ہے کہ ان میوں کا پکینگ بڑا اچھا ہوتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”فخر! ممکن ہے تمہارا نظریہ درست ہو مگر بھائی! میں ایسے موقعوں پر زبان کی مشکلات برداشت نہیں کر سکتا۔ میں اپنے دفتر میں بڑے صاحب کے ساتھ انگریزی بول سکتا ہوں۔ میں یہاں دہلی میں رہ کر اس تانگے والے سے اردو میں بات چیت کرنا گوارا کر سکتا ہوں۔ مگر اس موقع پر انگریزی میں گفتگو نہیں کر

سنا۔ میری پتلون انگریزی، میری ٹائی انگریزی، میرا شو انگریزی..... یہ سب چیزیں انگریزی ہو سکتی ہیں۔ مگر خدا کے لیے وہ چیز مجھ سے انگریزی میں کیسے ہو سکتی ہے۔“

فخر اپنا نظریہ بھول کر پھٹنے لگا۔ مسعود شاید ابھی تک اپنے دوست کی لکھی ہوئی نظم پر غور کر رہا تھا۔ جس میں شاعر نے ایک فرنگی عورت کے ہونٹ چوس کر ارباب وطن کی بے بسی کا انتقام لیا تھا۔ دفعتاً چونک کر اس نے کہا۔ ”کیوں بھی! یہ تا نگ، کب تک چتا رہے گا؟“

تا نگے والے نے ایک دم ہاگیں کھینچ کر تا نگہ ٹھہرا دیا اور فخر سے کہا۔ ”وہ جگہ آگنی صاحب! آپ اکیلے چلیے گا۔“
ہم تینوں تا نگے والے کے پیچھے پیچھے چل دیئے۔

ایک نیم روشن گلی میں وہ ہمیں لے گیا۔ دلی کی دوسری گلیوں سے یہ گلی کچھ مختلف تھی۔ اس لیے بہت چوڑی تھی۔ دائیں ہاتھ کو ایک منزلہ مکان تھا۔ جس کی کھڑکیوں اور دروازوں پر چھتیں لٹکی ہوئی تھیں۔ ایک دروازے کی چٹائی اٹھا کر تا نگے والا اندر داخل ہو گیا۔ چند لمحات کے بعد باہر آیا اور ہمیں اندر لے گیا۔

کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے جب کہا۔ ”بھائی ہم کہیں اونڈھے منہ نہ گر پڑیں۔“ تو دوسرے کمرے سے کسی عورت کی بھدی آواز سنائی دی۔ ”الٹین تو لے گیا ہوتا تو“ اور جھوڑی دیر کے بعد تا نگے والا ایک اندھی سی الٹین لے کر نمودار ہوا۔ ”چلیے اندر تشریف لے چلیے۔“ ہم تینوں اندر تشریف لے گئے وہ کافی جھنگلی، انتہائی بد صورت عورتیں نظر آئیں جنہوں نے ڈھیلے ڈھیلے فرائک پہن

رکھے تھے۔ یہ میمیں تھیں۔ میں نے اپنی ہنسی روک کر فخر سے کہا۔ ”کیا لہندہ
ٹافیاں اور سٹ ہیں۔“

میری یہ بات سن کر ان میموں میں سے ایک جس کا چہرہ سرخی لگانے کے
باعث زیادہ پکی ہوئی اینٹ کی سی رنگت اختیار کر گیا تھا۔ ہنسی..... میں بھی ہنس دیا
اور بڑے پیار سے پوچھا۔ ”کیا نام ہے آپ کا؟“
بولی۔ ”لوسی۔“

شاعر مسعود نے آگے بڑھ کر دوسری سے پوچھا۔ ”آپ کا؟“
اس نے جواب دیا۔ ”میری۔“

فخر بھی آگے بڑھ آیا۔ ”کیوں صاحب آپ کام کیا کرتی ہیں؟“
دونوں لڑائیں۔ ایک نے ادا سے کہا۔ ”کیسا بات کرتا ہے تم؟“

دوسری نے کہا۔ ”جلدی کرو۔ رہنا مانگتا ہے یا نہیں۔ ہمیں روٹی پکانا ہے۔“
میں نے اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھا تو گیلیے آٹے سے بھرے ہوئے تھے
اور وہ اس کی مروڑیاں بنا رہی تھی۔ تانگے والا قطعی طور پر ہمیں غلط جگہ لے آیا تھا۔
مروڑیاں اس کے ہاتھوں سے کچے فرش پر گر رہی تھیں اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا
کہ تاج رو رہا ہے اور یہ مروڑیاں اس کے آنسو ہیں۔

ہم تینوں کے اس مکان میں آ کر سخت پریشان ہو گئے۔ مگر ہم اپنی پریشانی ان
دو عورتوں پر ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ہمیں سخت ناامیدی ہوئی تھی اگر ہم ان
سے صاف لفظوں میں کہہ دیتے کہ تم ہمارے مطلب کی نہیں ہو تو ضرور ان کے
جذبات کو بھیس پختی۔ عورت جس کے ہاتھ آٹے میں لتھڑے ہوں ایسے جذبات

سے عاری نہیں ہو سکتی۔

میں نے ان دونوں کی تعریف کی۔ فخر نے بھی میرا ساتھ دیا۔ پھر ہم تینوں جلد واپس آنے کا وعدہ کر کے وہاں سے نکل گئے۔ تانگے والا ہمارا مطلب سمجھ گیا تھا چنانچہ اسے چند لمحات کے لیے وہاں ٹھہرنا پڑا۔ جب وہ باہر نکلا تو فخر نے اس سے کہا۔ ”تم انہیں یہیں کہتے ہو؟“

تانگے والے نے بڑی متانت کے ساتھ جواب دیا۔ ”لوگ یہی کہتے ہیں صاحب!“ وہ لوگ جھک مارتے ہیں..... میں نے خیال کیا تھا کہ تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو گے..... اب خدا کے لیے کسی ایسی جگہ لے چلو جہاں ہم چند گھنٹیاں اپنا دل بہا سکیں۔

مسعود نے تینوں کا اجتماعی مقصد اور زیادہ واضح کرنے کی کوشش کی۔ ”دیکھو ہم ایسی جگہ جانا چاہتے ہیں جہاں کچھ عرصے کے لیے بیٹھ سکیں..... ہمیں ایسی عورت کے پاس لے چلو جو باتیں کرنے کا سلیقہ رکھتی ہو..... بھائی ہم گورے نہیں ہیں۔ کسی فوج کے سپاہی نہیں ہیں۔ تین شریف آدمی ہیں جنہیں عورت سے بات چیت کیے برسوں گزر چکے ہیں..... سمجھے؟“

تانگے والے نے اس بات میں سر ہلا دیا۔ ”تو چلیے..... بیٹھے..... آپ کو صدر بازار لے چتا ہوں۔“

فخر نے پوچھا۔ ”کون ہے وہاں؟“

تانگے والے نے گھوڑے کی باگیں تھام کر جواب دیا۔ ”ایک پنجابن ہے بہت لوگ آتے ہیں اس کے پاس۔“

تا نگے والے نے پنہا بن کے گھر کا رخ کیا۔

راستے میں ان دو میموں کا ذکر چھڑ گیا۔ ہم میں سے ہر ایک کو وہاں جانے کا افسوس تھا۔ اس لیے کہ ہم سب سے زیادہ وہ ناامید ہوئی تھیں۔ میں نے ان کو کچھ روپے دے دیئے ہوتے۔ مگر یہ بھیک ہو جاتی..... فخر نے ہماری اس گھٹکو میں زیادہ حصہ نہ لیا۔ وہ چاہتا تھا کہ ان کا ذکر نہ کیا جائے لیکن جب تک تا نگہ پنہا بن کے گھر تک نہ پہنچا۔ ان کا ذکر ہوتا رہا۔

تا نگہ ایک فراخ بازار میں فٹ پاتھ کے پاس رکا۔ طویلے کے ساتھ والا۔ کان تھا۔ جدھر کا ہم چاروں نے رخ کیا۔ زینہ طے کر کے ہم اوپر پہنچے۔ سامنے پاخانہ تھا دروازے سے بے نیاز..... اس کے ساتھ ہی پرانی وضع کا مغلنی کمرہ تھا۔ جس میں ہم چاروں داخل ہوئے۔ اس کمرے کے آخری سرے پر چار آدمی بیٹھے فلاش کھیلنے میں مصروف تھے۔ جو ہماری آمد سے ناقل رہے۔ البتہ وہ عورت جو ان کے پاس کھڑی تھی اور ایک آدمی کے پتوں میں دلچسپی لے رہی تھی آہٹ پا کر ہماری طرف آئی۔

یہاں بھی لائین کی مدھم رہی تھی۔ جس کو فلاش کھیلنے والے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ جب وہ فخر کے پاس آئی اور کوہلے پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی تو میں نے غور سے اسے دیکھا..... اس کی عمر کم از کم 35 برس کے قریب تھی چھاتیوں بڑی بڑی تھیں۔ جو اس نے بڑے ہی بیہودہ اور فحش انداز سے اوپر کو اٹھا رکھی تھیں۔ تنگ ماتھے پر نیلے رنگ کا چاندکھدا ہوا تھا۔ جب وہ مسعود کی طرف دیکھ کر مسکرائی تو مجھے اس کے سامنے کے دو دانتوں میں سونے کی کیلیں نظر آئیں..... بڑی خوفناک عورت تھی اس کا منہ کچھ اس انداز سے کھلتا تھا جیسے لیموں نچوڑنے

والی مشین کا کھلتا ہے۔

اس نے فخر کو آنکھ ماری اور پوچھا۔ ”کہو کیا بات ہے؟“

فخر نے بچے کی طرح کہا۔ ”آپ کا نام؟“

اس نے کولہے پر ہاتھ رکھے۔ ہم تینوں کو باری باری سے دیکھا۔ ”گلزار۔“
فخر نے فوراً ہی معذرت کی۔ ”ہم گلاب کے یہاں آئے تھے۔ غلطی سے ادھر
چلے آئے معاف کر دیجیے گا۔“

یہ سن کر وہ فخر کے ہاتھ سے سگریٹ چھین کر کش لگاتی فلاش کیلئے والوں کے
پاس چلی گئی۔ جو ابھی تک ہماری آمد سے غافل تھے۔ نیچے اتر کر ہم تینوں نے
تانگے والے کو پھر اپنا مطلب سمجھایا اور اس کو بتایا کہ ہم کس قسم کی عورت چاہتے
ہیں اس نے ہم تینوں کا لیکچر سنا اور کہا۔ ”آپ جھوڑے لفظوں میں مجھے بتائیے۔
کہ آپ کہاں جانا چاہتے ہیں؟“

فخر نے اسے سمجھایا۔ ”دیکھو ہمیں کسی لڑکی کے پاس لے چلو..... ایسی عورت
کے پاس جو سولہ سترہ برس کی ہو۔ اس سے زیادہ کی ہرگز نہ ہو سکتی ہے؟“
تانگے والے نے کمر کی بکل مار کے باگیں تھامیں۔ ”آپ نے پہلے ہی کہہ
دیا ہوتا چلیے..... اب آپ کو ٹھیک جگہ پر لے چلوں گا۔“

آدھ گھنٹے کے بعد ٹھیک جگہ بھی آ گئی..... خدا معلوم کون سا بازار تھا۔ دوسری
منزل پر ایک بیٹھک سی تھی جس کے دروازے پر مونا اور میلا مات لگ رہا تھا۔
جب ہم اندر داخل ہوئے تو سامنے آنکھن میں ایک دیہاتی بڑھیا چوہا جھونک رہی
تھی..... مٹی کے کونڈے میں کندھا ہوا آٹا پاس ہی پڑا تھا۔ دھواں اس قدر تھا کہ

اندرواغل ہوتے ہی ہماری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

بڑھیا نے چو لپے میں لکڑیاں جھاڑ کر ہماری طرف دیکھا اور تانگے والے سے
دیہاتی لہجے میں کہا۔ ”اُنہیں اندر لے جاؤ۔“

تانگے والے نے اندھیرے کمرے میں دیاسلانی جلا کر ہمیں داخل کیا اور ریل
سے لنگی ہوئی لائین کو روشن کر کے باہر چلا گیا۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کونے
میں ایک بہت بڑا پلنگ تھا۔ جس کے پائے رنگین تھے۔ اس پر میلی سی چادر پھیلی
ہوئی تھی۔ تکیہ بھی پڑا تھا۔ جس پر سرخ رنگ کے پھول کڑھے ہوئے تھے۔ پلنگ
کے ساتھ والی دیوار کی کانس پر تیل کی ایک میلی بوتل اور لکڑی کی کنگھی پڑی تھی۔
اس کے دانتوں میں سر کا میل اور کئی بال پھنسے ہوئے تھے۔ پلنگ کے نیچے ایک ٹونا
ٹرنک تھا۔ جس پر ایک کالی گرکانی رکھی ہوئی تھی۔

مسعود اور فخر دونوں پلنگ پر بیٹھ گئے۔ میں کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک
پست قد لڑکی اپنے سے دو گنا دوپٹہ اوڑھنے کی کوشش کرتی اندر داخل ہوئی۔ فخر اور
مسعود دونوں اٹھ کھڑے ہوئے جب وہ لائین کی روشنی میں آئی تو میں نے اسے
دیکھا اس کی عمر بمشکل 12 برس کے قریب ہوگی۔ چھاتیاں آڑو کے برابر تھیں۔ مگر
اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے جسم کو پیچھے چھوڑ کر بہت آگے نکل چکی
ہے۔ بہت آگے جہاں شاید اس کی ماں بھی نہیں پہنچ سکی۔ جو باہر آنگن میں چولہا
جھونک رہی تھی۔ اس کے نتھنے پھڑک رہے تھے۔ اور اس انداز سے اپنا ایک ہاتھ ہلاتا
رہی تھی جیسے مکار وکاندار کی طرح ڈنڈی مارے گی اور کبھی پورا تول نہیں تولے گی۔
ہم تینوں اس کو حیرت بھری نظروں سے دیکھتے رہے۔ فخر شرم بھی محسوس کر رہا

تھا۔ مسعود کی ساری شاعری سمٹ کر شاید اس کے ناخنوں میں چلی گئی۔ کیونکہ وہ بری طرح انہیں دانتوں سے کاٹ رہا تھا۔

میں نے ایک بار پھر اس کی طرف دیکھا جیسے مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ مختلف سی لڑکی تھی۔ جو ایک بہت بڑا میلا دوپٹہ اوڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ رنگ گہرا سا نوا، بدن کی ساخت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بڑی تیزی سے چلی ہوئی گاڑی ہے جو ایک دم رک گئی ہے۔ اس کے پیروں میں بریک لگ گئے ہیں اور وہ ہیں کھڑے کھڑے اس کا رنگ و روغن و جوپ اور بارش میں اڑ گیا ہے۔ اس عمر میں بھدی سی بھدی لڑکی کے جسم میں ایک قسم کی شوخ جاوہیت ہوتی ہے۔ اس میں بالکل نہیں تھی۔ کپڑوں کے باوجود وہ نگلی دکھائی دیتی تھی۔ بہت ہی بیہودہ اور ناواقف طریقے پر نگلی..... اس کے جسم کا نچلا حصہ قطعی طور پر سے غیر نسوانی تھا۔

میں اس سے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس کے عقب سے ایک بڑھا نمودار ہوا۔ بالکل سفید ڈاڑھی سر ضعف کے باعث ہل رہا تھا۔ لڑکی نے دیہاتی زبان میں ان سے کچھ کہا۔ جس کا مطلب میں صرف اس قدر سمجھا کہ وہ بڑھا اس کا نانا ہے۔ ہم تینوں صحیح معنوں میں اٹھ بھاگے۔ نیچے بازار میں پہنچے تو ہمارا تگدر کچھ دور ہوا۔

بڑھے اور لڑکی کو دیکھ کر ہمارے جمالیاتی ذوق کو بہت ہی شدید صدمہ پہنچا تھا۔ ویر تک ہم چپ چاپ رہے۔
فخر بلاتا رہا۔ مسعود ایک کونے میں پیشاب کرنے کے لیے بیٹھ گیا۔ میں اوور

کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اور پر آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔ جہاں نامکمل
چاند بالکل اس زرد بیسوالونڈیا کی طرح جس کے جسم کا نچلا حصہ قطعی طور پر غیر
نسوانی تھا۔ بادل کے ایک بڑے ٹکڑے کا دو پٹا اوڑھنے کی کوشش کر رہا تھا..... اس
سے کچھ دور ایک چھوٹا سفید ٹکڑا اس کے ماما کے ضعیف سر کی طرح لرز رہا تھا

.....

میرے بدن پر جھرجھری طاری ہو گئی۔
ہم غائب ہوں بارہ منٹ تک بازار میں کھڑے رہے اس کے بعد تانگے والا نیچے
اتر آخر کے پاس جا کر اس نے کہا۔ ”آپ نے آٹھ بجے تانگہ لیا تھا..... اب گیارہ
بج چکے ہیں تین گھنٹوں کے پیسے دے دیجیے۔“
فخر نے کچھ کہے بغیر دو روپے اس کو دے دیئے۔ روپے لے کر وہ مسکرایا۔
”بابو! آپ کو کچھ پہچان نہیں..... ایسی کراڑی لونڈیا تو شہر بھر میں نہیں ملے گی
آپ کو..... خیر آپ کو اختیار..... تانگے میں بیٹھنے میں ابھی آیا۔“
اس کو اوپر جانے کی زحمت نہ اٹھانا پڑی۔ کیونکہ سفید ریش بوڑھا اس کے پیچھے
پیچھے چلا آیا تھا اور موری کے پاس کھڑا اپنا ضعیف سر ہلا رہا تھا۔ اس کو دو روپے
دے کر جب تانگے والے نے باگیں تھامیں تو اس کی شبیدگی غائب تھی۔ ”چل
بیٹا“ کہہ کر اس نے اپنی بھدی مکر مسرت بھری آوازیں گانا شروع کر دیا۔
”ساون کے نظارے ہیں..... لا لا.....“
اختتام..... حصہ اول

فہرست

پچاسویں کہانی
پیرن
ترقی پسند
تکون
تاکے والے کا کہانی
ٹوٹو
ٹھنڈا گوشت
ٹیزھی لکیر
ٹیڈیال کا کتا
جسم اور روح
جنٹیل مینوں کا برش
جھوٹی کہانی
جیب کنفن
چوری
چوہے دان
چور
حامد کا بچہ
حجامت
حج اکبر

پچھا ہا

گوپال کی ران پر جب یہ بڑا پھوڑا نکلا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔
 گرمیوں کا موسم تھا۔ آم خوب ہوئے تھے۔ بازاروں میں، گلیوں میں،
 دکانداروں کے پاس، پھیری والوں کے پاس، جہدھر دیکھو، آم ہی آم نظر آتے۔
 ال، پیلے سبز رنگ رنگ کے..... سبزی منڈی میں لاکھوں کے حساب سے ہر قسم
 کے آم آتے تھے اور نہایت سستے داموں فروخت ہو رہے تھے۔ یوں سمجھئے کہ پچھلے
 برس کی کسر پوری ہو رہی تھی۔

سکول کے باہر چھوٹو رام پھل فروش سے گوپال نے ایک روز خوب جی بھر کے
 آم کھائے اور جیب میں سے ایک مہینے کے بچائے ہوئے چو پیسے جمع تھے سب کے
 سب ان آموں پر خرچ کر دیئے۔ جن کے گودے لورس میں شہید گھلا ہوا تھا۔
 اس روز چھٹی کے وقت آم کھانے کے بعد انگلیاں چاٹتے ہوئے گوپال کو
 سکول کے حلوائی سے دودھ کی لسی پینے کا خیال آیا تھا اور اس خیال کو عملی جامہ
 پہنانے کی خاطر اس نے گندہ آرام حلوائی سے پاؤ دودھ کی لسی بنانے کو کہا بھی تھا۔
 مگر حلوائی نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا۔ ”بابو گوپال! پہلا حساب چکا دو تو اور اوصار
 دوں گا ورنہ نہیں۔“

گوپال نے اگر آم نہ کھائے ہوتے یا اگر اس کی جیب میں چھوڑے بہت پیسے
 ہوتے۔ تو وہ وہیں کھڑے کھڑے گندہ آرام کا حساب چکا دیتا اور کچھ نہیں تو نقد دام
 دے کر لسی کا وہ گلاس لے لیتا۔ جس میں برف کا ٹکڑا ڈالیاں لگا رہا تھا اور جسے

حلوائی نے ہر سامنہ بنا کر اپنے پیچھے لوہے کے تھال پر رکھ دیا تھا۔ مگر گوپال کچھ بھی نہ کر سکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چوتھے روز اس کی ران پر یہ بڑا پھوڑا نکل آیا اور تین چار روز تک ابھرتا رہا۔

گوپال کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے؟ وہ پھوڑے سے اتنا پریشان نہیں تھا جتنا اس کے درد سے..... اور سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ پھوڑا دن بدن لال ہوتا چلا جا رہا تھا اور اس کے منہ پر بدن کی جھلی پھینا شروع ہو گئی تھی۔ بعض اوقات گوپال کو یہ معلوم ہوتا کہ پھوڑے کے اندر کوئی ہنڈیا ابل رہی ہے اور اس کے اندر سب کچھ ایک ہی اہال میں نکلنا چاہتا ہے۔ یہ چیز اسے بہت پریشان کر رہی تھی اور پھوڑے کی جسامت دیکھ کر ایک مرتبہ تو اسے ایسا معلوم ہوا تھا کہ اس کی جیب میں سے کاٹچ کی گولی نکل کر اس کی ران میں گھس گئی ہے۔

گوپال نے گھر میں پھوڑے کی بابت کسی سے ذکر نہ کیا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر پتا جی کو اس کا پتہ چل گیا تو وہ اپنے تھانے کی لکھیوں کا سارا غصہ اسی پر نکالیں گے اور بہت ممکن ہے کہ وہ اسے اس چھڑی سے پھینا شروع کر دیں۔ جو چھوڑے روز ہوئے گروہاری وکیل کے منشی نے وزیر آباد سے انہیں تحفے کے طور پر لاکر دی تھی۔ ماں کا مزاج بھی کم گرم نہ تھا۔ وہ اگر اسے آم کھانے کے جرم کی سزا نہ دیتی تو اس غلطی پر اس کے کان کھینچ کھینچ کر ضرور لال کر دیتی۔ کہ اس نے گھر کے باہر اکیلے اکیلے آم کیوں اڑائے۔ اس کی ماں کا اصول تھا کہ گوپال اگر تجھے زہر بھی کھاتا ہو تو گھر میں کھاتا۔ گوپال اچھی طرح جانتا تھا کہ اس اصول کے پیچھے اس کی

ماں کی صرف یہ خواہش تھی کہ گوپال کے منہ کے ساتھ اس کا منہ بھی چتا رہے۔
 کچھ بھی ہو گوپال کی ران پر پھوڑا اٹکنا تھا۔ نکل آیا۔ اس کا باعث جہاں تک
 گوپال سمجھ سکا تھا۔ وہی آم تھے۔ اس نے پھوڑے کی بابت گھر میں کسی سے ذکر
 نہ کیا تھا۔ اس کو اپنے پتا جی کی وہ ڈانٹ اچھی طرح یاد تھی۔ جو نسل خانے کے اندر
 بتائی گئی تھی۔ اس کے پتا جی لالہ پرشوم داس تھانیدار لنگوٹ باندھے تل کی دھار
 کے نیچے اپنی گنجی چند یار رکھے اور بڑی توند بڑھائے مونچھوں میں سے آم کا رس
 چوس رہے تھے۔ سامنے بالٹی میں ایک درجن کے قریب آم پڑے تھے۔ جو
 انہوں نے صبح سویرے ایک ٹھیلے والے سے اس کا چالان کاٹ کر حاصل کیے
 تھے۔ گوپال باپ کی پیٹھ مل رہا تھا اور میل کی مروڑیاں بنا رہا تھا۔ جب اس نے
 ہاتھ صاف کرنے کے لیے بالٹی میں ڈالے تھے اور چپکے سے ایک آم آڑا مٹا چاہا
 تھا۔ تو لالہ جی نے بڑے زور سے اس کا ہاتھ جھٹک کر چھوٹے سے آم کو مونچھوں
 سمیت منہ میں ڈالتے ہوئے کہا تھا۔ ”بے شرم..... تجھے بڑوں کا لحاظ کرنا جانے
 کب آئے گا؟“

اور جب گوپال نے روئی صورت بنا کر کہا تھا۔ ”پتا جی..... آم کھانے کو
 میرا بھی تو جی چاہتا ہے۔“ تو تھانیدار صاحب نے آم کی گتھلی چوس کر موری میں
 پھینکتے ہوئے کہا تھا۔ ”گوپو تیرے لیے یہ آم بہت گرم تھا۔ پھوڑے پنہیاں
 چاہتا ہے۔ تو بیشک کھالے..... دو تین بارشیں اور ہو لینے دے، پھر خوب ٹھاٹ
 سے کھائیو تیری ماں سے کہوں گا وہ لسی بنا دے گی..... چل اب پیٹھ مل۔“ اور گوپال
 نے یہ رکاوٹ کی بات سن کر خاموشی سے اپنے پتا جی کی پیٹھ ماننا شروع کر دی۔ اور

آم کی مٹھاس نے جو پانی اس کے منہ میں بھر دیا تھا۔ اسے دیر تک نکلتا رہا تھا۔
 اس کے دوسرے روز اس نے آم کھائے اور چوتھے روز اس کی ران پر پھوڑا
 نکل آیا۔ اس کے پتا کی بات سچی ثابت ہوئی۔
 اب اگر گوپال گھر میں کسی سے اس پھوڑے کی بات کرتا تو ظاہر ہے کہ خوب
 پینتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خاموش رہا اور پھوڑے کا بڑھاپہ بند کرنے کی تدبیریں
 سوچتا رہا۔

ایک روز اس کے پتا جی تھانے سے واپسی پر جب گھر آئے۔ تو ان کے ہاتھ
 میں ایک لمبی سی مٹی تھی۔ گوپال کی ماں کو آواز دے کر انہوں نے یہ مٹی اس کے
 ہاتھ میں دے کر کہا۔ ”پھوڑے پھنسی کی بہار ہے۔ ذرا سا پھاپا پھوڑے پر لگا دو
 گی۔ یوں آرام آ جائے گا۔۔۔۔۔ یوں۔۔۔۔۔ بمبئی کا خالص مرہم ہے۔ سنبھال کے
 رکھ۔“

گوپال اپنی بہن نرملا کے ساتھ صحن میں گیند بٹا کھیل رہا تھا۔ اتفاق کی بات
 ہے کہ جب تھانیدار جی مرہم دے کر اپنی مٹی کو کچھ سمجھا رہے تھے۔ تو نرملا نے زور
 سے گیند پھینکی۔ گوپال کا دھیان باپ کی طرف تھا۔ گیند زور سے پھوڑے پر لگی۔
 گوپال بلبللا اٹھا لیکن درد کو اندر ہی اندر پی گیا۔ وہ سکول میں ماسٹر جی رام کے
 مشہور ریبید کی مار کھا کر درخت سے کا مادی ہو چکا تھا۔

ادھر گوپال کے پھوڑے پر گیند لگی۔ ادھر اس کے باپ کی آواز بلند ہوئی۔ ذرا
 سا پھاپے پر لپ کر کے لگا دو گی۔۔۔۔۔ یوں آرام آ جائے گا۔۔۔۔۔ یوں۔۔۔۔۔ اور یوں
 کے ساتھ اس کے باپ کی چٹکی نے گویا گوپال کے سوتے ہوئے دماغ کی چٹکی بھر

لی۔ اس کو اپنے درد کا علاج معلوم ہو گیا۔

اس کی ماں نے مرہم بتی سامنے والاں میں سلائی کی چاری میں رکھ دی۔ گوپال کو اچھی طرح معلوم تھا۔ کہ اس کی ماں عام طور پر سلائی کی چاری ہی میں سب سنبالنے والی چیزیں رکھا کرتی ہے۔ سب سے زیادہ سنبالنے والی چیز وہ موچنا تھا۔ جس سے اس کی ماں ہر دسویں پندرہویں روز اپنے ننگ ماتھے کے بال صاف کیا کرتی تھی۔ یہ بلا شک و شبہ سلائی کی چاری میں اس پڑیا سمیت موجود تھا۔ جس میں کونکوں کی سفید را کھ جمع رہتی تھی۔ جو اس کی ماں بال نوچ کر ماتھے پر لگایا کرتی تھی۔

تاہم گوپال نے اپنا اطمینان کرنے کے لیے گیند والاں میں پھینک دی اور اس کو پلنگ کے نیچے سے نکالتے ہوئے اپنی ماں کو سلائی کی چاری میں مرہم رکھتے دیکھ لیا۔

دوپہر کو اس نے اپنی بہن نرملا کو ساتھ ملا کر چھوٹی قینچی جس سے اس کا باپ انگلیوں کے ناخن کاٹا تھا۔ مرہم کی بتی اور اپنے باپ کے پانچا مے سے بچا ہوا ٹھسے کا وہ ٹکڑا حاصل کر لیا۔ جس سے اس کی ماں ایک اور ٹکڑے کو ساتھ ملا کر شلوار کی میانی بنانا چاہتی تھی۔

دونوں یہ چیزیں لے کر اوپر کونکوں پر چلے گئے اور برساتی کے نیچے کونکوں کی بوریوں کے پاس بیٹھ گئے۔

نرملا نے اپنی جیب سے لٹھے کا ٹکڑا نکال کر اپنی ران پر شلوار کے پھسلتے ہوئے ریشمی کپڑے پر پھیلا کر جب گوپال کی طرف اپنی ناچتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔

تو اس وقت ایسا معلوم ہوا کہ گیارہ برس کی یہ کم سن لڑکی جو دریائی سرکنڈے کی طرح نرم اور چکلی تھی۔ ایک بہت بڑے کام کے لیے اپنے آپ کو تیار کر رہی ہے۔

اس کا ننھا سادل جو اس وقت تک صرف ماں باپ کی جھڑکیوں اور اپنی لڑائیوں کے میلے ہوتے ہوئے چہروں کی فکر سے دھڑکا کرتا تھا۔ اب اپنے بھائی کی ران پر پھوڑا دیکھنے کے خیال سے دھڑک رہا تھا۔ اس کے کان کی لوہی اُل اور نرم ہو گئی تھیں۔

گوپال نے گھر میں اپنے پھوڑے کی بابت کسی سے ذکر نہ کیا تھا لیکن اب اسے نرملا کو ساری بات سنائی پڑی۔ کہ کس طرح اس نے چوری چوری آم کھائے اور لسی پینا بھول گیا اور اس کی ران پر پیسے کے برابر پھوڑا نکل آیا۔ جب اس نے اپنی رام کہانی سنا کر نرملا سے رازدارانہ لہجے میں کہا تھا۔ ”دیکھ نرملا! گھر میں یہ بات کسی سے نہ کہو۔“ تو نرملا نے بڑی متین صورت بنا کر جواب دیا تھا۔ ”میں پاگل جھوڑی ہوں۔“

ریڑ کا غبارہ پھٹ گیا ہے۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔
اور اس کے اندر جو کچھ ہے پھوٹ بیٹے گا۔ گوپال نے مرہم کو اٹھلی پر اٹھاتے ہوئے کہا۔

نرملا کا گلابی رنگ اب بمبئی کے مرہم کی طرح پیلا ہو گیا تھا۔ اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔ ”مگر یہ پھوڑے کیوں نکلتے ہیں بھیا؟“
”گرم چیزیں کھانے سے۔“ گوپال نے ایک ماہر طبیب کے سے انداز میں

جواب دیا۔

نرملہ کو وہ دو انڈے یاد آ گئے۔ جو اس نے دو ماہ پہلے کھائے تھے۔ وہ کچھ سوچنے لگی۔

گوپال اور نرملہ کے درمیان چند باتیں اور ہوئیں۔ اس کے بعد وہ اصل کام کی طرف متوجہ ہوئے۔ نرملہ نے لٹھے کا ایک گول پھاہا کاٹا۔ بڑی نفاست سے، یہ روپے کے برابر تھا اور اس کی گولائی میں مجال ہے جو ذرا سا نقص بھی ہو اسی طرح گول تھا۔ جس طرح نرملہ کی ماں کے ہاتھ کی بنی ہوئی روئی گول ہوتی تھی۔

گوپال نے اس پھاہے پر تھوڑا سا مرہم لگا دیا اور اسے اچھی طرح پھیلائے کے بعد پھوڑے کی طرف غور سے دیکھا۔ نرملہ گوپال کے اوپر جھکی ہوئی تھی اور گوپال کی ہر حرکت کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ گوپال نے جب پھاہا اپنے پھوڑے کے اوپر جما دیا تو گوپال کو یقین تھا کہ نرملہ یہ بات اپنے تک ہی رکھے گی۔ چنانچہ اس نے پاجامے کو اوپر اڑس لیا۔ نرملہ کا دل دھک دھک کرنے لگا جب گوپال نے بیٹھ کر اپنا پھوڑا دکھایا اور نرملہ نے دور ہی سے اپنی انگلی سے اسے چھوا۔ تو اس کے بدن پر ایک جھرجھری سی طاری ہو گئی۔ سی سی کرتے ہوئے اس نے ابھرتے ہوئے لال پھوڑے کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”کتنا لال ہے۔“

”ابھی تو اور ہو گا۔“ گوپال نے اپنے مردانہ حوصلے کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا۔ نرملہ نے حیرت سے کہا۔ ”سچ؟“

”ابھی تو کچھ لال نہیں ہے“ جو پھوڑا“ میں نے چرنجی کے منہ پر دیکھا ہے۔ وہ اس سے کہیں زیادہ بڑا اور لال تھا۔“ گوپال نے پھوڑے پر دو انگلیاں پھیریں۔

تو ابھی اور بڑے گا؟ نرملا آگے سرک آئی۔

”کیا پتا ہے..... ابھی تو بڑھتا چلا جا رہا ہے۔“ گوپال نے جیب میں سے مرہم کی بتی نکال کر کہا۔

نرملا سہمی گئی۔ ”اس مرہم سے تو آرام آ جائے گا؟“

گوپال نے بتی کے ایک سرے پر سے کاغذ کی تہہ جدا کی اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”اس کا ایک پھاہا لگانے ہی سے پھٹ جائے گا۔“

”پھٹ جائے گا۔“ نرملا کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے کان کے پاس بم پھٹا ہو۔ وہ کانپ گئی۔ جیسے اس کے بدن پر کسی نے برف کا ٹکڑا رکھ دیا ہے۔

”اب آرام آ جائے گا؟“ نرملا نے نیم سوالیہ انداز میں کہا۔

گوپال جواب دینے بھی نہ پایا تھا۔ کہ برساتی کے برابر والی سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ یہ ان کی ماں تھی جو غائب کو نلے لینے کے لیے آ رہی تھی۔

گوپال اور نرملا نے بیک وقت ایک دوسرے کے چہرے کی طرف دیکھا اور کچھ کہے سے بغیر سب چیزیں اکٹھی کر کے اس پرانے صندوق کے پیچھے چھپا دیں۔ جہاں ان کی بلی سندری بچے دیا کرتی تھی اور چپکے سے بھاگ گئے۔

یہاں سے بھاگ کر گوپال جب نیچے گیا تو اس کے باپ نے اسے باہر فالودہ لانے کے لیے بھیج دیا۔ جب واپس آیا تو اسے گلی میں نرملا ملی۔ فالودے کا گلاس اس کے حوالے کر کے وہ وہ چہنجی کے گھر چلا گیا اور اس طرح ان چیزوں کو اپنی اپنی جگہ پر رکھنا بھول گیا۔ جو ماں کے اچانک آ جانے سے اس نے اور نرملا نے صندوق کے پیچھے چھپا دی تھیں۔

چرنجی کے یہاں وہ دیر تک تاش کھیلتا رہا۔ کھیل سے فارغ ہو کر جب وہ چرنجی کی بغل میں ہاتھ ڈالے کمرے سے باہر نکل رہا تھا۔ تو کسی بات پر اس کا دوست ہنسا اور اس کے دانے گال پر پھوڑے کا نشان لمبی سی لکیر بن گیا۔ اس کو دیکھ کر فوراً ہی اپنے پھوڑے کا گوپال کو خیال آیا اور اس خیال کے ساتھ ہی اسے وہ چیزیں یاد آ گئیں جو صندوق کے پیچھے پڑی تھیں۔ چرنجی کی بغل سے ہاتھ نکال کر وہ بھاگا۔ گھر پہنچ کر اس نے وہاں کی فضا دیکھی۔ اس کی ماں صحن میں بیٹھی اس کے باپ سے ”ملاپ“ اخبار کی خبریں سن رہی تھی۔ دونوں کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ گوپال ان کے پاس سے گزرا۔ دونوں نے اس کی طرف دیکھا۔ مگر اس سے کوئی بات نہ کی۔ گوپال کو اطمینان ہو گیا کہ ابھی تک اس کی ماں نے اپنی سلامتی کی پٹاری نہیں دیکھی۔ چنانچہ وہ چپکے سے کونچے پر چلا گیا۔

بڑے کونچے کو طے کر کے دروازے کے اندر داخل ہونے والا ہی تھا کہ اس کے قدم رک گئے۔

صندوق کے پاس بیٹھی نما کچھ کر رہی تھی۔ گوپال پیچھے ہٹ گیا اور چھپ کر دیکھنے لگا۔

نما بڑے انباک سے پھاہا تراش رہی تھی۔ اس کی پتلی پتلی انگلیاں قینچی سے بڑا نفیس کام لے رہی تھیں۔ پھاہا کاٹنے کے بعد اس نے جھوڑا سا سر ہم نکال کر اس پر پھیپھڑیاں اور گردن جھکا کر اپنے کرتے کے بنے کھولے سینے کے طرف دائی چھونا سا بھارتھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نگلی پر صابن کا چھوڑا سا مکمل بلبلہ انکا ہوا ہے۔ نما نے پھاہے پر پھونک ماری اور اسے اس ننھے سے ابھار پر جمادیا۔

پنہسپنہسی کہانی

سخت سردی تھی۔

رات کے دس بجے تھے۔ شالا مار باغ سے وہ سڑک جو ادھر لایا ہو کر آتی ہے، سنسان اور تاریک تھی۔ بادل گھرے ہوئے تھے اور ہوا بہت تیز چل رہی تھی۔
گر دو پیش کی ہر چیز ٹھنھری ہوئی تھی۔ سڑک کے دو روئے پست قدمکان اور درخت و حسدنی و حسدنی روشنی میں سکڑے سکڑے دکھائی دے رہے تھے۔ بجلی کے کھمبے ایک دوسرے سے دور دور بنے، روٹھے اور اکتائے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ساری فضا میں ہدمزگی کی کیفیت تھی۔ ایک صرف تیز ہوا تھی جو اپنی موجودگی منوانے کی بیکار کوشش میں مصروف تھی۔

جب دو سائیکل سوار نمودار ہوئے اور ہوا کے تیز و تند جھونکے ان کے کانوں سے لکرائے تو انہوں نے اپنے اپنے اوور کوٹ کا کالر اونچا کر لیا۔ دونوں خاموش تھے۔ مخالف ہوا کے باعث انہیں پیڈل چلانے میں کافی زور صرف کرنا پڑ رہا تھا۔ مگر وہ اس کے احساس سے غافل ایک دوسرے کا سایہ بنے شالا مار باغ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اگر کوئی انہیں دور سے دیکھتا تو اسے ایسا معلوم ہوتا کہ سڑک جو لوہے کی زنگ آلود چادر کی طرح پھیلی ہوئی تھی، ان کی سائیکلوں کے ساکت پہیوں کے نیچے ہو لے ہو لے کھسک رہی ہے۔

بہت دیر تک وہ دونوں سنسان فاصلہ خاموشی میں طے کرتے رہے۔ آخر ان سے ایک سائیکل سے اتر کر اپنے سر دبا تھک کومند کو بھاپ سے گرم کرنے لگا۔ ”سخت

سر دی ہے۔“

اس کے ساتھی نے بڑیک لگائی اور ہنسنے لگا۔ ”بھائی جان، وہ..... وہ ہو سکی کہاں گئی؟“

”جنم میں..... جہاں ساری شام غارت ہوئی وہاں وہ بھی ہوئی۔“

دونوں بھائی تھے، مگر ایسے بھائی جو چاروں میب شرعی اکٹھے مل جل کے کرتے تھے۔ دونوں نے صبح یہ پروگرام بنایا تھا کہ دفتر سے فارغ ہو کر رشوت کے اس روپے کا جو انہیں دو بجے کے قریب ملنا تھا، جائز استعمال سوچیں گے۔

روپہ انہیں دو بجے سے پہلے ہی مل گیا، اس لیے کہ رشوت دینے والا بہت بے قرار تھا۔ بڑے بھائی نے روپیہ جیب میں رکھنے سے پہلے تمام نوٹ اچھی طرح دیکھ کر اپنا اطمینان کر لیا کہ وہ نشان زدہ نہیں تھے۔ رقم زیادہ نہیں تھی۔ دو سو ایک روپے تھے۔ انہوں نے دو سو طلب کیے تھے مگر ایک کا اضافہ رشوت دینے والے نے شکن کے لیے کیا تھا جو بڑے بھائی نے اپنے چھوٹے بھائی سے مشورہ کر کے ایک اندھے بھکاری کو دے دیا تھا، جب وہ دونوں ہیرامنڈی کی طرف جا رہے تھے۔

چھوٹے بھائی کی جیب میں اسکاچ کی بوتل تھی۔ بڑے کی جیب میں تھری فائیو کے دو ڈبے۔ عام طور پر دونوں گولڈ فلیک پیتے تھے، مگر جب رشوت ملتی تو ایسا برانڈ پیتے تھے جس کے دام زیادہ ہوں۔

ہیرامنڈی میں داخل ہوا ہی چاہتے تھے کہ بادشاہی مسجد سے اذان کی آواز آئی۔ بڑے نے چھوٹے سے کہا۔ ”چلو یا رنماز پڑھ لیں۔“

چھوٹے نے اپنی پھولی ہوئی جیب کی طرف دیکھا۔ ”اس کا کیا کریں بھائی جان؟“

بڑے نے جموڑی دیرو سوچا اور کہا۔ ”اس کا انتظام کر لیتے ہیں..... اپنا یا ربٹ جو ہے۔“

بٹ پان فروش کی دکان قریب ہی تھی۔ چھوٹے نے مہین کاغذ میں لپیٹی ہوئی بوتل اس کے حوالے کی۔ بڑے نے اپنی اور اپنے بھائی کی سائیکل دکان کے تھڑے کے ساتھ لٹائی اور بٹ سے کہا۔ ”ہم ابھی آئے نماز پڑھ کے۔“
بٹ نے قہقہہ لگایا۔ ”دو نفل شکرانے کے بھی۔“

دونوں بھائیوں نے بادشاہی مسجد میں نماز ادا کی اور دو نفل شکرانے کے بھی پڑھے۔ واپس آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ بٹ کی دکان بند ہے۔ ساتھ والے دکاندار سے پوچھا تو اس نے کہا۔ ”نماز پڑھنے گیا ہے۔“
دونوں بھائیوں کو سخت تعجب ہوا۔ ”نماز؟“

دکاندار نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”سال چھ ماہی میں کبھی کبھی پڑھ لیا کرتا ہے۔“

دونوں بہت دیر تک بٹ کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔ جب وہ نہ آیا تو بڑے نے چھوٹے سے کہا۔ ”جاؤ یا ر..... ایک بوتل اور لے آؤ..... میں نے خواہ مخواہ اس حرام زادے بٹ پر اعتبار کیا۔“

چھوٹے نے روپے لیے اور بڑے سے کہا۔ ”جیب ہی میں پڑی رہتی تو کیا حرج تھا؟“

”چھوڑو یا ر..... بناؤ اس قصے کو مجھے بوتل جانے کا اتنا افسوس نہیں..... کہیں
گر کر بھی لوٹ سکتی تھی..... افسوس تو اس بات کا ہے کہ بڑی بے دردی سے پی رہا
ہو گا کم بخت۔“

چھوٹے نے پیڈل پر پاؤں رکھا اور پوچھا۔ ”آپ یہیں ہوں گے؟“
بڑے نے بڑے اکتائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”ہاں بھئی، یہیں کھڑا
رہوں گا..... شاید بہک کر ادھر آ نکلے..... لیکن تم جلدی آ جانا۔“
چھوٹا جلدی واپس آ گیا، مگر اس کا چہرہ لٹکا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور
آدمی تھا جو کیر پر بیٹھا ہوا تھا۔ بڑا تارگیا کہ ضرور کوئی گزرتا ہے۔ لیکن اسے زیادہ
دیر تک ذہنی کشمکش میں مبتلا نہ رہنا پڑا کیونکہ چھوٹے نے سائیکل سے اترتے ہی
اس کو سارا واقعہ سنا دیا۔

شراب کی دکان سے دوسری بوتل لے کر جو نہیں وہ باہر نکلا تو بارش شروع ہو چکی
تھی۔ اسے جلد واپس پہنچنا تھا۔ افراتفری میں اس نے سائیکل پر سوار ہونے کی
کوشش کی مگر وہ ایسی پھسلی کہ سنبھالے نہ سنبھلی۔ سڑک پر اونڈھنے منہ گرا اور دوسری
بوتل بھی جہنم میں چلی گئی۔

چھوٹے نے ساری داستان تفصیل کے ساتھ سنا کر اللہ کا شکر ادا کیا۔ ”میں بچ
گیا بھائی جان..... بوتل کا کوئی ٹکڑا اگر کپڑے چیر کر گوشت تک پہنچ جاتا تو اس
وقت کسی ہسپتال میں پڑا ہوتا۔“

بڑے نے اللہ کا شکر ادا کرنا مناسب نہ سمجھا۔ شراب کی دکان سے جو آدمی اس
کے بھائی کے ساتھ آیا تھا اس کو تیسری بوتل کے پیسے دے کر اس نے بٹ پان

فروش کی بند دکان کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں ایک بہت ہولناک قسم کی گالی دے کر اس کی دکان کو جھسم کر ڈالا۔

دونوں کو معلوم تھا کہ انہیں کہاں جانا ہے۔ چوک کے اس طرف نان کباب والے کے اوپر جو بالا خانہ تھا، اسی میں ان دونوں بھائیوں کی بالائی آمدنی کا جائز نکاس ہوتا تھا۔ لونڈیا کم گو تھی۔ کھانے پینے والی تھی۔ عادات و اطوار کے لحاظ سے طوائف کم اور کلرک زیادہ تھی۔ اسی لیے ان کو پسند تھی کہ وہ خود بھی کلرک تھے۔ جب دونوں خوب پی جاتے تو دفتری گفتگو شروع کر دیتے۔ ہیڈ کلرک کیسا ہے، صاحب کیسا ہے، اس کے گھر والی کی طبیعت کیسی ہے۔ گھنٹوں اپنے اپنے ماتحتوں اور اپنے انسروں کے ماضی اور حال پر تبصرہ کرتے رہتے اور وہ بڑے انہماک سے سنتی رہتی۔

بہت کن سری تھی، مگر دونوں بھائی اس کا گانا سن کر یوں جھومتے تھے جیسے وہ ان کے کانوں میں شہد ٹپکا رہی ہے..... لیکن آج جب وہ گانے لگی تو ان کو پہلی مرتبہ محسوس ہوا کہ وہ سر میں ہے نہ تال میں۔ چنانچہ اس کا گانا بند کر کے انہوں نے باقی بچی ہوئی شراب پینا شروع کر دی۔

طوائف جس کا نام شیداں تھا، بہت کم پینے والی تھی، مگر جانے اسے کیا ہوا کہ جب ان دونوں بھائیوں نے اس کا گانا بند کر کے پینا شروع کی تو وہ ایسی بہکی کہ بوتل اٹھا کر ساری کی ساری سوکھی پی گئی۔

بڑے کو بہت غصہ آیا۔ مگر وہ اسے پی گیا۔ کیونکہ چھوٹا بڑے مزے میں تھا لیکن زیادہ دیر تک اس پر یہ کیف طاری نہ رہا۔ کیونکہ جب اس نے اور پینے کے

لیے بوتل اٹھائی تو وہ خالی تھی۔ اب دونوں یکساں طور پر بے مزہ تھے۔
 بڑے نے چھوٹے سے مشورہ کرنا ضروری نہ سمجھا۔ شیداں کے استاد مائٹو کو
 روپے دے کر اس نے کہا۔ ”جاؤ، بھاگ کر جاؤ اور ایک بوتل جھانڈو کی لے آؤ۔“
 استاد نے روپے گن کر جیب میں رکھے اور کہا۔ ”سرکار! بلیک میں ملے گی۔“
 بڑا جو پہلے ہی بہنایا ہوا تھا چلا کر بولا۔ ”ہاں، ہاں۔۔۔۔۔ جانتا ہوں۔ اسی لیے تو
 میں نے پانچ زیادہ دیئے ہیں۔“

جھانڈا آئی۔ دو دور چلے تو بڑے نے محسوس کیا کہ پانی ٹلی ہے۔ امتحان لینے کی
 خاطر اس نے تھوڑی سی رکابی میں ڈالی اور اس کو دیا سلائی دکھائی۔ ایک لٹلے کے
 لیے نیم جان نیلگوں سا دھواں اٹھا اور دیا سلائی شوں کر کے رکابی میں بجھ گئی۔
 دونوں بھائیوں کو اس قدر کوفت ہوئی کہ غصے میں بھرے ہوئے اٹھے۔ بڑے
 نے پانی ٹلی بوتل ہاتھ میں لی۔ اس کا ارادہ تھا کہ یہ وہ اس شراب فروش کے سر پر
 دے مارے گا جس نے بے ایمانی کی تھی، مگر فوراً اسے خیال آیا کہ ان کے پاس
 پر مٹ نہیں تھا۔ اس لیے مجبوراً گالیاں دے کر خاموش ہو گئے۔

چھوٹے کی کوششوں سے ہدمزگی کسی حد تک دور ہوئی تھی کہ شیداں نے جو اس
 کی مدد کر رہی تھی سب کھایا پیا اگھنا شروع کر دیا۔ اب دونوں بھائیوں نے مناسب
 خیال کیا کہ چلا جائے۔ چنانچہ استاد کی تجویز سے سائیکلیں لے کر وہ ہیرامندی کی
 گلیوں میں دیر تک بے مقصد گھومتے رہے، مگر اس آوارہ گردی کے باوجود ان کی
 کوفت دور نہ ہوئی۔ واپس گھر جانے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ انہیں بٹ دکھائی
 دیا۔ نشے میں دھست تھا اور کوٹھوں کی طرف گردن اٹھا اٹھا کر وہی تباہی بک رہا

تھا۔ دونوں بھائیوں کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ آگے بڑھ کر اس کاٹینو ادبا
 دیں۔ مگر ان سے پہلے ایک سپاہی نے اس کو پکڑ لیا اور تھانے لے گیا۔
 چھوٹے نے بڑے سے کہا۔ ”پھیلے بھائی جان..... ذرا تماشا دیکھیں۔“
 بڑے نے پوچھا۔ ”کس کا؟“
 ”بٹ کا اور کس کا؟“

بڑے کے ہونٹوں پر معنی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”پاگل ہوئے ہو..... تھانے
 میں اگر اس نے ہمیں پہچان لیا یا کسی نے ہمارے منہ کی بوسوگھ لی تو ہمیں اپنا تماشا
 بھی ساتھ ساتھ دیکھنا پڑے گا۔“
 چھوٹے نے دل ہی دل میں بڑے کی دوراندریشی کی داد دی اور کہا ”تو پھیلے
 گھر چلیں!“

دونوں اپنی اپنی سائیکل پر سوار ہوئے۔ بارش تھم چکی تھی لیکن سرد ہوا بہت تیز
 چل رہی تھی۔ ابھی وہ ہیرامنڈی سے باہر نہیں نکلے تھے کہ انہیں اس تانگے میں جو
 ان کے آگے آگے چل رہا تھا، اپنے دفتر کا بڑا افسر نظر آیا۔ دونوں نے ایک دم اس
 کی نگاہوں سے بچنے کی کوشش کی مگر کام رہے۔ کیونکہ وہ انہیں دیکھ چکا تھا۔
 ”بلو!“

انہوں نے اس بلو کا جواب نہ دیا۔
 ”بلو!“

اس بلو کے جواب میں انہوں نے اپنی اپنی سائیکل روک لی..... افسر نے
 تانگہ ٹھہرا لیا اور ان سے بڑے مریبا نہ انداز میں کہا۔ ”کہو مسٹر! عیش ہو رہے

ہیں؟“

چھوٹے نے ”جی ہاں!“ اور بڑے نے ”جی نہیں!“ میں جواب دیا۔ اس پر افسر نے قہقہہ لگایا۔ ”میرا عیش تو اُدھورا رہا۔“ پھر اس نے افسرانہ انداز میں پوچھا۔
”تمہارے پاس کچھ روپے ہیں؟“

اس مرتبہ بڑے نے ”جی ہاں!“ اور چھوٹے نے ”جی نہیں!“ میں جواب دیا، جس پر افسر نے دوسرا قہقہہ بلند کیا جو ٹھٹھٹ افسرانہ تھا۔ ”ایک سو روپے کافی ہوں گے اس وقت!“

بڑے نے بڑے میکا تک انداز میں اپنی جیب سے سو روپے کا نوٹ نکالا اور اپنے چھوٹے بھائی کی طرف بڑھا دیا۔ چھوٹے نے پکڑ کر افسر کے حوالے کر دیا، جس نے ”تھینک یو!“ کہا اور تانگے سے اتر کر لڑکھڑاتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔
دونوں بھائی تھوڑی دیر تک خاموش رہے۔ بڑے نے تمام حالات پیش نظر رکھ کے اپنے سر کو زور سے جنبش دی۔ ”معلوم نہیں، آج صبح صبح کس کا منہ دیکھا تھا۔“

چھوٹے کے منہ سے یہ بڑی گالی نکلی۔ ”اسی..... کا، جس نے دو سو ایک روپے دیئے۔“

بڑے نے بھی اس کو مناسب و موزوں گالی سے یاد کیا۔ ”ٹھیک کہتے ہو..... لیکن میں سمجھتا ہوں، سارا قصور اس فالتو روپے کا ہے جو اس نے اپنی ماں کی رواں سے شلن کے طور پر دیا تھا۔“
”اس نماز کا بھی جو ہم نے پڑھی!“

”اور اس کا حرامی بیٹ کا بھی!“

”میں تو شکر کرتا ہوں کہ پولیس نے اس کو پکڑ لیا، ورنہ میں نے آج ضرور اس کا خون کر دیا ہوتا۔“

”اور لینے کے دینے پڑ جاتے۔“

”لینے کے دینے تو پڑ ہی گئے۔۔۔۔۔ خدا معلوم یہ ہمارا افسر کہاں سے آن پکا۔“

”لیکس سمجھتا ہوں اچھا ہی ہوا۔۔۔۔۔ سو روپے میں سالہا کا ناتو ہو گیا۔“

”یہ تو ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ لیکن آج کی شام بہت بری طرح غارت ہوئی۔“

”چلو چلیں۔۔۔۔۔ ایسا نہ ہو کوئی اور آفت آ جائے۔“

دونوں پھر اپنی اپنی سائیکل پر سوار ہوئے اور بیر امنڈی سے نکل آئے۔

بڑے نے دفتر سے نکلتے ہی یہ منصوبہ بنایا تھا کہ اسکاچ کے دو تین دور ہونے

کے بعد وہ شیداں سے کہے گا کہ وہ اپنی چھوٹی بہن کو بلائے۔ اس کی وہ بہت

تعریفیں کیا کرتی تھی۔ کم عمر اور الہڑتھی۔ اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اس نے گاؤں کی

صحت مند فضا میں گزارا تھا اور وہ خدا شروع کیے اسے بمشکل چند مہینے ہوئے تھے۔

اسکاچ و سکی اور شیداں کی چھوٹی بہن۔۔۔۔۔ اس سے بڑھ کر اور عیاشی کیا ہو سکتی

تھی۔۔۔۔۔ مگر اس کا یہ سارا منصوبہ خاک میں مل گیا اور صرف کوفت باقی رہ گئی۔

چھوٹے نے بھی کھل کھیلنے کی سوچی تھی۔ موسم خوشگوار تھا۔ و سکی اور شیداں یقینی

طور پر اسے اور بھی خوشگوار بنا دیتے اور وہ اس قدر محفوظ ہوتا کہ چند رہ میں روز تک

اسے اور کسی عیش کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔۔۔۔۔ مگر سارا معاملہ چوہٹ ہو گیا۔

دونوں کے سر بھاری اور دل کڑوے کیلے تھے۔ دونوں کی ہر بات الٹی ثابت

ہوئی تھی۔ اس کاچ کی پہلی بوتل بٹ پان فروش لے اڑا، دوسری سڑک کے پتھروں پر ٹوٹ کر بہہ گئی۔ تیسری عین اس وقت داغ مفارقت دے گئی جب کہ سرور گھڑے رہے تھے۔ چوتھی کنایت کی خاطر ویسی منگوائی تو اس میں آدھا پانی نکلا اور سوکا آخری نوٹ افسر نے ہتھیلیا لیا۔

بڑے کی کوفت زیادہ شدید تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے دماغ میں عجیب عجیب سے خیال آ رہے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ اور بھی کچھ ہو..... کوئی ایسی بات ہو کہ وہ کتوں کی طرح زور زور سے بھونکنا شروع کر دے..... یا ایسا زچ بچ ہو کہ اپنی سائیکل کے پرزے اڑا دے، اپنے تمام کپڑے اتار کر پھینک دے اور تنگ دھڑنگ کسی کنوئیں میں چھٹا لگا دے۔ جس طرح حالات نے اس کا منہ اڑایا تھا، اسی طرح وہ ان کا منہ اڑانا چاہتا تھا۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ وہ حالات پیدا ہو کر وہیں ہیرا منڈی میں وفات پا گئے تھے۔ اب نئے حالات اور وہ بھی ایسے حالات کیسے پیدا ہوں جن کا وہ حسب منشا منہ اڑا سکے، اس کے متعلق سوچنے سے وہ خود کو ماری پاتا تھا۔

ایک صرف گھر تھا، جہاں وہ لحاف اوڑھ کر سو سکتے تھے..... مگر خالی خولی لحاف اوڑھ کر سو جانے میں کیا رکھا تھا۔ اس سے تو بہتر یہی تھا کہ وہ سو سو کے دونوںوں میں چرس ملا تبا کو بھرتے اور پی کر انٹا غنیل ہو جاتے۔ اور صبح اٹھ کر غنیمت کے ایک روپے کا کسی پیر فقیر کے مزار پر چڑھا دیتے۔

سوچتے سوچتے بڑے نے زور کا عمرہ بلند کیا۔ ”ہمت تیری ایسی کی تہی۔“
چھوٹے نے گھبرا کر پوچھا۔ ”پتھر ہو گیا؟“

بڑے نے جھنجھلا کر جواب دیا۔ ”نہیں یار..... میں نے اپنا دماغ پتھر کرنے کی کوشش کی تھی۔“

چھوٹا سمجھ گیا۔ ”اب جلدی گھر پہنچ جائیں۔“

بڑے کی جھنجھلاہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ ”وہاں کیا کریں گے..... بطنوں کے بال مونڈیں گے؟“

چھوٹا بے اختیار ہنسنے لگا۔ بڑے کو یہ ہنسی بہت ناگوار گزری۔ ”خاموش رہو جی!“

دیر تک دونوں خاموشی میں گھر کا فاصلہ طے کرتے رہے۔ اب وہ اس سڑک پر تھے جو لوہے کی زنگ آلود چادر کی طرح پھیلی ہوئی تھی، اور ایسا لگتا تھا کہ ان کی سائیکلوں کے پہیوں کے نیچے ہولے ہولے کھسک رہی ہے۔

بڑے نے جب اپنے سرد ہاتھ منہ کی بھاپ سے گرم کیے اور کہا۔ ”سخت سردی ہے۔“ تو چھوٹے نے ازراہ مذاق پوچھا۔ ”بھائی جان! وہ..... وہ کی کہاں گئی؟“

بڑے کے جی میں آئی کہ چھوٹے کو سائیکل سمیت اٹھا کر سڑک پر چلک دے مگر اس قدر کہہ رکھا۔ ”جہنم میں..... جہاں ساری شام غارت ہوئی وہاں وہ بھی ہوئی۔“

یہ کہہ کر وہ بجلی کے کھمبے کے ساتھ کھڑا ہو کر پیشاب کرنے لگا۔ اتنے میں چھوٹے نے آواز دی۔ ”بھائی جان! وہ دیکھئے کون آ رہا ہے۔“

بڑے نے مڑ کر دیکھا۔ ایک لڑکی تھی جو سردی میں ٹھٹھرتی، کانپتی، قدموں سے راستہ ٹٹولتی، ان کی جانب آرہی تھی۔ جب پاس پہنچی تو اس نے دیکھا کہ اندھی ہے آنکھیں کھلی تھیں مگر اس کو بھائی نہیں دیتا تھا، کیونکہ کھمبے کے ساتھ وہ کھڑا تھے

نکراتے بچی تھی۔

بڑے نے غور سے اس کی طرف دیکھا..... جوان تھی۔ عمر یہی سولہ سترہ برس کے قریب ہوگی۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں بھی اس کا سڈول بدن جاذب توجہ تھا۔ چھوٹے نے اس سے پوچھا۔ ”کہاں جا رہی ہے تو؟“ اندھی نے مختصرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”راستہ بھول گئی ہوں..... گھر سے آگ لینے کے لیے نکلی تھی۔“

بڑے نے پوچھا۔ ”تیرا گھر کہاں ہے؟“ اندھی بولی۔ ”پتا نہیں..... کہیں پیچھے رہ گیا ہے۔“ بڑے نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ ”چل میرے ساتھ۔“

اور وہ اسے سڑک کے اس پار لے گیا جہاں اینٹوں کا پرانا بھٹ تھا جو ویرانے کی شکل میں بکھرا ہوا تھا۔ اندھی سمجھ گئی کہ اس کو راستہ بتانے والا اسے کس راستے پر لے جا رہا ہے۔ مگر اس نے کوئی مزاحمت نہ کی..... شاید وہ ایسے راستوں پر کئی مرتبہ چل چکی تھی۔

بڑا خوش تھا کہ چلو کو فٹ دور کرنے کا سامان مل گیا۔ کسی کی مداخلت کا کھٹکا بھی نہیں تھا۔ اوور کوٹ اتار کر اس نے زمین پر بچھایا اور وہ اور اندھی دونوں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

اندھی جنم کی اندھی نہیں تھی۔ فسادات سے پہلے وہ اچھی بھلی تھی لیکن جب سکھوں نے اس کے گاہوں پر حملہ کیا تو بھگدڑ میں اس کے سر پر گہری چوٹ لگی جس کے باعث اس کی بسارت چلی گئی۔

بڑے نے اوپر سے دل سے اس سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ اس کو اس کے ماضی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ دو روپے جیب سے نکال کر اس نے اس کی ہتھیلی پر رکھے اور کہا۔ ”کبھی کبھی ملتی رہا کرنا..... میں تمہیں کپڑے بھی بنوا دوں گا۔“

اندھی بہت خوش ہوئی۔ بڑے نے جب اس کو اپنی روشن آنکھوں اور پھر تیلے ہاتھوں سے اچھی طرح ٹٹولا تو وہ بھی بہت خوش ہوا۔ اس کی کوفت کافی حد تک دور ہو گئی لیکن ایک دم اسے اپنے چھوٹے بھائی کی پہنچی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”بھائی جان..... بھائی جان!“

بڑے نے پوچھا۔ ”کیا ہے؟“

چھوٹا سامنے آیا۔ بڑے خوف زدہ لہجے میں اس نے کہا۔ ”دوسپاہی آرہے ہیں۔“ بڑے نے ہوش و حواس قائم رکھتے ہوئے اپنا اوور کوٹ کھینچا جس پر اندھی بیٹھی ہوئی تھی۔ جھٹکے سے وہ اس خندق میں گر پڑی جس میں سے پکی ہوئی اینٹیں نکالی گئی تھیں۔ گرتے وقت اس کے منہ سے بلند چیخ نکلی۔ مگر دونوں بھائی وہاں سے غائب ہو چکے تھے۔

چیخ سن کر سپاہی آئے تو انہوں نے بے ہوش اندھی کو خندق میں سے باہر نکالا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا..... تھوڑی دیر کے بعد اسے ہوش آیا تو اس نے سپاہیوں کو دیکھنا شروع کیا جیسے وہ بھوت ہیں..... پھر ایک دم دیوانہ وار چلانے لگی۔ ”میں دیکھ سکتی ہوں..... میں دیکھ سکتی ہوں..... میری نظر واپس آ گئی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ بھاگ گئی۔ اس کے ہاتھ سے جو دو روپے گرے وہ سپاہیوں نے اٹھالے۔

پیرن

یہ اس زمانے کی بات ہے جب میں بے حد مفلس تھا۔ بمبئی میں نور پے ماہوار کی ایک کھولی میں رہتا تھا جس میں پانی کا تل تھا نہ بکلی۔ ایک نہایت ہی غلیظ کوٹڑی تھی جس کی چھت پر سے ہوا رہا کھٹل میرے اوپر گرا کرتے تھے۔ چوہوں کی بھی کافی بہتات تھی۔ اتنے بڑے چوہے میں نے پھر کبھی نہیں دیکھے۔ بلیاں ان سے ڈرتی تھیں۔

چالی یعنی بلڈنگ میں صرف ایک غسل خانہ تھا۔ جس کے دروازے کی کنڈی ٹوٹی ہوئی تھی۔ صبح سویرے چالی کی عورتیں پانی بھرنے کے لیے اس غسل خانے میں جمع ہو جاتی تھیں۔ یہودی، مرہٹی، کجراتی، کرچین..... بھانت بھانت کی عورتیں۔

میرا یہ معمول تھا کہ ان عورتوں کے اجتماع سے بہت پہلے غسل خانے میں جاتا دروازہ بھیڑتا اور نہما شروع کر دیتا۔ ایک روز میں دیر سے اٹھا۔ غسل خانے میں پہنچ کر نہما شروع کیا تو جھوڑی دیر کے بعد کھٹ سے دروازہ کھلا۔ میری پردہ سن تھی۔ بغل میں گاگر دبائے۔ اس نے معلوم نہیں کیوں ایک لٹلے کے لیے مجھے غور سے دیکھا۔ پھر ایک دم پلٹی۔ گاگر اس کی بغل سے پھسل اور فرش پر لڑھکنے لگی..... ایسی بھاگی جیسے کوئی شیر اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ میں بہت ہنسا اٹھ کر دروازہ بند کیا اور نہما شروع کر دیا۔

جھوڑی دیر کے بعد پھر دروازہ کھلا۔ برج موہن تھا۔ میں نہما کے فارغ ہو چکا

تھا اور کپڑے پہن رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا ”بھئی منو آج اتوار ہے۔“
 مجھے یاد آگیا کہ برج موہن کو باندہ جانا تھا، اپنی دوست پیرن سے ملنے کے
 لیے وہ ہراتوار کو اس سے ملنے جاتا تھا۔ وہ ایک معمولی شکل و صورت کی پاری لڑکی
 تھی جس سے برج موہن کا معاشرہ قریباً تین برس سے چل رہا تھا۔
 ہراتوار کو برج موہن مجھ سے آٹھ آنے ٹرین کے کرائے کے لیے لیتا۔ پیرن
 کے گھر پہنچتا۔ دونوں آدھے گھنٹے تک آپس میں باتیں کرتے۔ برج موہن
 اسٹریڈ ویلکی کے کراس ورڈ پزل کے حل اس کو دیتا اور چلا آتا۔ وہ بیکار تھا۔ سارا
 دن سر نیوڑھائے یہ پزل اپنی دوست پیرن کے لیے حل کرتا رہتا تھا۔ اس کو
 چھوٹے چھوٹے کئی انعام مل چکے تھے مگر وہ سب پیرن نے وصول کیے تھے۔ برج
 موہن نے ان میں سے ایک دھڑی بھی اس سے نہ مانگی تھی۔
 برج موہن کے پاس پیرن کی بے شمار تصویریں تھیں۔ سلوار قمیض میں،
 چست پاجامے میں، ساڑھی میں، فرائیڈ میں، بیدنگ کسٹوم میں، فینسی ڈریس
 میں..... غالباً سو سے اوپر ہونگی۔ پیرن قطعاً خوبصورت نہیں تھی، بلکہ میں تو یہ کہوں
 گا کہ بہت ہی ادنیٰ شکل و صورت کی تھی لیکن میں نے اپنی اس رائے کا اظہار برج
 موہن سے کبھی نہیں کیا تھا۔ میں نے پیرن کے متعلق کبھی کچھ پوچھا ہی نہیں تھا کہ
 وہ کون ہے، کیا کرتی ہے، برج موہن سے اس کی ملاقات کیسے ہوئی، عشق کی ابتدا
 کیوں کر ہوئی۔ کیا وہ اس سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے؟ برج موہن نے بھی
 اس کے بارے میں مجھ سے کچھ بات چیت نہ کی تھی۔ بس ہراتوار کو وہ مائتے کے
 بعد مجھ سے آٹھ آنے کرائے کے لیتا اور اس سے ملنے کے لیے باندہ روانہ ہو

جاتا اور وہ پیر تک لوٹ آتا۔

میں نے کھولی میں جا کر اس کو آٹھ آنے دیئے، وہ چلا گیا۔ وہ پیر کو لوٹا تو اس نے خلاف معمول مجھ سے کہا۔ ”آج معاملہ ختم ہو گیا۔“

میں نے اس سے پوچھا۔ ”کون سا معاملہ؟ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ کس معاملے کی بات کر رہا ہے۔“

برج موہن نے، جیسے اس کے سینے کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہو، مجھ سے کہا۔ ”پیرن سے آج دو نوک فیصلہ ہو گیا ہے..... میں نے اس سے کہا۔ جب بھی تم سے ملنا شروع کرتا ہوں مجھے کوئی کام نہیں ملتا۔ تم بہت منحوس ہو۔ اس نے کیا بہتر ہے، ملنا چھوڑ دو دیکھو گی تمہیں کیسے کام ملتا ہے۔ میں منحوس ہوں مگر تم اول درجے کے نکھڑو اور کام چور ہو..... سواب یہ قصہ ختم ہو گیا ہے اور میرا خیال ہے انشا اللہ کل ہی مجھے کام مل جائے گا صبح تم مجھے چار آنے دینا۔ میں سیٹھ مانو بھائی سے ملوں گا، وہ مجھے ضرور اپنا اسٹنٹ رکھ لے گا۔“

یہ سیٹھ مانو بھائی جو فلم ڈائریکٹر تھا متعدد مرتبہ برج موہن کو ملازمت دینے سے انکار کر چکا تھا۔ کیونکہ اس کا بھی پیرن کی طرح یہی خیال تھا کہ وہ کام چور اور نکما ہے لیکن دوسرے روز جب برج موہن مجھ سے چار آنے لے کر گیا تو وہ پیر کو اس نے مجھے یہ خوشخبری سنائی کہ سیٹھ مانو بھائی نے بہت خوش ہو کر اسے ڈھائی سو روپے ماہوار پر ملازم رکھ لیا ہے۔ کنٹریکٹ ایک برس کا ہے جس پر دستخط ہو چکے ہیں۔ پھر اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سو روپے نکالے اور مجھے دکھائے۔ ”یہ ایڈوانس ہے..... جی تو میرا چاہتا ہے کہ کنٹریکٹ اور سو روپے لے کر باند رہ جاؤں

اور پیرن سے کہوں کہ لو دیکھو، مجھے کام مل گیا ہے، لیکن ڈر ہے کہ مانو بھائی مجھے فوراً جواب دے دے گا۔۔۔۔۔ میرے ساتھ ایک نہیں کئی مرتبہ ایسا ہو چکا ہے۔ ادھر ملازمت ملی، ادھر پیرن سے ملاقات ہوئی۔۔۔۔۔ معاملہ صاف۔ کسی نہ کسی بہانے مجھے نکال باہر کیا گیا۔ خدا معلوم اس لڑکی میں یہ نحوست کہاں سے آ گئی۔ اب میں کم از کم ایک برس تک اس کا منہ نہیں دیکھوں گا۔ میرے پاس کپڑے بہت کم رہ گئے ہیں۔ ایک برس لگا کر کچھ بنوالوں تو پھر دیکھا جائے گا۔“

چھ مہینے گزر گئے۔ برج موہن برابر کام پر جا رہا تھا۔ اس نے کئی نئے کپڑے بنوالے تھے۔ ایک درجن رومال بھی خرید لیے تھے۔ اب وہ تمام چیزیں اس کے پاس تھیں جو ایک کنوارے آدمی کے آرام و آسائش کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ ایک روز اسنو ڈیو گیا ہوا تھا کہ اس کے نام ایک خط آیا۔ شام کو جب وہ لوٹا تو میں اسے یہ خط دینا بھول گیا۔ صبح ناشتے پر مجھے یاد آیا تو میں نے یہ خط اس کے حوالے کر دیا۔ لفافہ پکڑتے ہی وہ زور سے چیخا۔ ”اغت!“

میں نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

”وہی پیرن۔۔۔۔۔ اچھی بھلی زندگی گزر رہی تھی۔“ یہ کہہ کر اس نے چیخ سے لفافہ کھولا خط کا کاغذ نکالا اور مجھ سے کہا۔ ”وہی کم بخت ہے۔۔۔۔۔ میں کبھی اس کا پیٹہ رائٹنگ بھول سکتا ہوں۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا لکھتی ہے؟“

”میرسر۔۔۔۔۔ کبھی ہے مجھ سے اس اتوار کو ضرور ملو۔ تم سے کچھ کہنا ہے۔“ یہ کہہ کر برج موہن نے خط لفافے میں ڈالا اور جیب میں رکھ لیا۔ ”لو بھئی منو، نوکری

”کیا بکواس کرتے ہو؟“

میں نے اس سے کہا۔ ”اگر تمہیں اتنا وثوق ہے تو مت جاؤ اس سے ملنے۔“
 ”یہ نہیں ہو سکتا۔۔۔ وہ بلائے تو مجھے جانی پڑتا ہے۔“
 ”کیوں؟“

دوسرے روز ناشتہ کر کے وہ باندہ چلا گیا۔ پیران سے ملاقات کر کے لوٹا۔ تو اس نے اس ملاقات کے بارے میں کوئی بات نہ کی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”مل آئے ایسے منحوس ستارے سے؟“

ہم دونوں نے حاجی کے ہوٹل میں کھانا کھایا۔ اس دوران میں پیرن کی کوئی بات نہ ہوئی۔ رات کو سونے سے پہلے اس نے صرف اتنا کہا۔ ”اب دیکھئے کل کیا گل کھلتا ہے۔“

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

اسٹوڈیو سے جلد لوٹ آیا مجھ سے ملا تو خوب زور سے ہنسا ”چھٹی منٹو بھائی۔“
 میں نے سمجھا مذاق کر رہا ہے: ”ہناؤ جی۔“
 ”جو ہنا تھا وہ تو ہٹ گیا..... اب میں کیسے ہناؤں..... سیٹھ مانو بھائی پر مانچ آ
 گئی ہے..... اسٹوڈیو میل ہو گیا ہے۔ میری مہر سے خواندہ پچا رہے مانو بھائی پر
 بھی آفت آئی۔“ یہ کہہ کر برج موہن پھر ہنسنے لگا۔
 میں نے صرف اتنا کہا۔ ”یہ عجیب سلسلہ ہے۔“
 ”دیکھ لو..... اسے کہتے ہیں ہاتھ نکلن کو آری کیا۔“ برج موہن نے سگریٹ
 ساگایا اور کیمرا اٹھا کر باہر گھومنے چلا گیا۔

برج موہن اب بیکار تھا۔ جب اس کی جمع پونجی ختم ہو گئی تو اس نے ہر اتوار کو
 پھر مجھ سے باندھ جانے کے لیے آٹھ آنے مانگنے شروع کر دیئے۔ مجھے ابھی تک
 معلوم نہیں آدھ پون گھنٹے میں وہ پیرن سے کیا باتیں کرتا تھا۔ ویسے وہ بہت گفتگو
 کرنے والا تھا۔ مگر اس لڑکی سے جس کی نحوست کا اس کو مکمل طور پر یقین تھا وہ کس
 قسم کی باتیں کرتا تھا۔ میں نے ایک روز اس سے پوچھا۔ ”برج کیا پیرن کو بھی تم
 سے محبت ہے؟“

”نہیں، وہ کسی اور محبت کرتی ہے۔“

”تم سے کیوں ملتی ہے؟“

”اس لیے کہ میں ذہین ہوں، اس کے بھدے چہرے کو خوبصورت بنا کر پیش
 کر سکتا ہوں۔ اس کے لیے کراس ورڈ پزل حل کرتا ہوں۔ کبھی کبھی اس کو انعام بھی
 دلوادیتا ہوں..... منٹو تم نہیں جانتے ان لڑکیوں کو۔ میں خوب پہنچتا ہوں انہیں

..... جس سے وہ محبت کرتی ہے، اس میں جو کمی ہے، مجھ سے مل کر پوری کر لیتی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔ ”بڑی چار سو بیس ہے۔“

میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔ ”مگر تم کیوں اس سے ملتے ہو؟“
 برج موہن ہنسا، چشمے کے پیچھے اپنی آنکھیں سکڑ کر اس نے کہا۔ ”مجھے مزہ آتا ہے۔“

”کس بات کا۔“

”اس کی نحوست کا..... میں اس کا امتحان لے رہا ہوں۔ اس کی نحوست کا امتحان..... یہ نحوست اپنے امتحان میں پوری اتری ہے۔ میں نے جب بھی اس سے ملنا شروع کیا، مجھے اپنے کام سے جواب ملا..... اب میری ایک خواہش ہے کہ اس کے منہ اس اثر کو چکمدے دے جاؤں۔“

میں نے اس سے پوچھا۔ ”کیا مطلب؟“

برج موہن نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”میرا یہ جی چاہتا ہے کہ ملازمت سے جواب ملنے سے پہلے ملازمت سے علیحدہ ہو جاؤں، یعنی خود اپنے آقا کو جواب دے دوں۔ ان سے بعد میں کہوں، جناب مجھے معلوم تھا کہ آپ مجھے برطرف کرنے والے ہیں۔ اس لیے میں نے آپ کو زحمت نہ دی اور خود علیحدہ ہو گیا اور آپ مجھے برطرف نہیں کر رہے تھے۔ یہ میری دوست بچن تھی جس کی ناک کیمرے میں اس طرح گھسٹی ہے جیسے تیرا!“

برج موہن مسکرایا۔ ”یہ میری ایک چھوٹی سی خواہش ہے، دیکھو پوری ہوتی ہے یا نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”عجیب و غریب خواہش ہے۔“

”میری ہر چیز عجیب و غریب ہوتی ہے..... پچھلے اتوار میں نے پیرن کے اس دوست کے لیے جس سے وہ محبت کرتی ہے، ایک فونو تیار کر کے دیا۔ الو کی دم اسے کمپی ٹیشن میں بھیجے گا..... یقینی طور پر انعام ملے گا اسے۔“ یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔

برج موہن واقعی عجیب و غریب آدمی تھا۔ وہ پیرن کے دوست کو کئی بار فونو تیار کر کے دے چکا ہے۔ اسٹریڈو ویلکس میں یہ فونو اس کے نام سے چھپتے تھے اور پیرن بہت خوش ہوتی تھی۔ برج موہن ان کو دیکھتا تھا تو مسکرا دیتا تھا۔ وہ پیرن کے دوست کے شکل صورت سے نا آشنا تھا۔ پیرن نے برج موہن سے اس کی ملاقات تک نہ کرائی تھی۔ صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ کسی مل میں کام کرتا ہے اور بہت خوبصورت ہے۔

ایک اتوار کو برج باندرا سے واپس آیا تو اس نے مجھ سے کہا۔ ”لو بھیجی منو! آج معاملہ ختم ہو گیا۔“

میں نے اس سے پوچھا۔ ”پیرن والا؟“

”ہاں بھیجی..... کپڑے ختم ہو رہے تھے، میں نے سوچا کہ یہ سلسلہ ختم کرو۔“

اب انشاء اللہ دنوں ہی میں کوئی نہ کوئی ملازمت مل جائے گی..... میرا خیال ہے۔

سیٹھ نیاز علی سے ملوں اس نے ایک فلم بنانے کا اعلان کیا ہے..... کل ہی جاؤں گا۔ تم یا رڈرا اس کے دفتر کا پتا لگالینا۔“

میں نے اس کے دفتر کا نیا فون ایک دوست سے پوچھ کر برج موہن کو بتا دیا۔

وہ دوسرے روز وہاں گیا۔ شام کو لوٹا۔ اس کے مطمئن چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ ”لو

بھی منلو!“ یہ کہہ کر اس نے جیب سے مائپ شدہ کاغذ نکالا اور میری طرف پھینک دیا۔ ”ایک پکچر کا کنٹریکٹ تنخواہ دو سو روپے ماہوار۔ کم ہے، لیکن سیٹھ ناز نے کہا ہے، بڑھادوں گا..... ٹھیک ہے۔“

میں ہنسا۔ ”اب بیرن سے کب ملو گے؟“

برج موہن مسکرایا۔ ”کب ملوں گا؟ میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ مجھے اس سے کب ماننا چاہیے..... منلو یا را! میں نے تم سے کہا تھا کہ ایک میری چھوٹی سی خواہش ہے، بس وہ پوری ہو جائے۔ میرا خیال ہے مجھے اتنی جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ ذرا میرے تین چار جوڑے بن جائیں۔ پچاس روپے ایڈوانس لے آیا ہوں پچیس تم رکھ لو۔“

پچیس میں نے لیے۔ ہوٹل والے کا قرض تھا جو فوراً چکا دیا گیا۔ ہمارے دن بڑی خوشحالی میں گزرنے لگے۔ سو روپیہ ماہوار میں کمالیتا تھا۔ دو سو روپے ماہانہ برج موہن لے آتا تھا۔ بڑے عیش تھے۔ پانچ مہینے گزر گئے کہ اچانک ایک روز بیرن کا خط برج موہن کو وصول ہوا۔ ”لو، بھی منلو! عزرائیل صاحب تشریف لے آئے۔“

صحیح بات ہے کہ میں نے اس وقت خط دیکھ کر خوف سا محسوس کیا مگر برج موہن نے مسکراتے ہوئے لفافہ چاک کیا۔ خط کا کاغذ نکال کر پڑھا۔ بالکل مختصر تحریر تھی۔ میں نے برج سے پوچھا۔ ”کیا فرماتی ہیں؟“

”فرماتی ہیں۔ اتوار کو مجھ سے ضرور ملو۔ ایک اشد ضروری کام ہے۔“ برج موہن نے خط لفافے میں واپس ڈال کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔

میں نے اس پوچھا۔ ”جاؤ گے؟“

”جانا ہی پڑے گا۔۔۔۔۔۔“ پھر اس نے یہ فلمی گیت گانا شروع کر دیا۔

”مت بھول مسافر تجھے جانا ہی پڑے گا“

میں نے اس سے کہا۔ ”برج مت جاؤ اس سے ملنے۔۔۔۔۔۔ بڑے اچھے دن گزر رہے ہیں ہمارے۔۔۔۔۔۔ تم نہیں جانتے، میں خدا معلوم کس طرح تمہیں آٹھ آنے دیا کرتا تھا۔“

اتوار کو برج، پیرن سے ملنے باند رہ گیا۔ واپس آیا تو اس نے مجھ سے صرف اتنا کہا۔ ”میں نے اس سے کہا، یہ بارہویں مرتبہ ہے کہ مجھے تمہاری نحوست کی وجہ سے ہر طرف ہوتا پڑے گا۔۔۔۔۔۔ تم پر رحمت ہو زرتشت کی۔“

میں نے پوچھا۔ ”اس نے یہ سن کر کچھ کہا۔“

برج نے جواب دیا۔ ”فقط یہ۔۔۔۔۔۔ تم سلی ایڈیٹ ہو۔“

”تم ہو؟“

”سو فیصدی!“ یہ کہہ کر برج ہنسا۔ ”اب میں کل صبح دفتر جاتے ہی استعفیٰ پیش کر دینے والا ہوں۔ میں نے وہیں پیرن کے ہاں لکھ لیا تھا۔“

برج موہن نے مجھے استعفیٰ کا کاغذ دکھایا۔ دوسرے روز خلاف معمول اس نے جلدی جلدی ناشتہ کیا اور دفتر روانہ ہو گیا۔ شام کو لوٹا تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔

اس نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ مجھے ہی بلا آخر اس سے پوچھنا پڑا۔ ”کیوں برج کیا ہوا؟“

اس نے بڑی ناامیدی سے سر ہلایا۔ ”کچھ نہیں یار۔۔۔۔۔۔ سارا قصہ ہی ختم ہو

گیا۔“

”کیا مطلب؟“

”میں نے سیٹھ نیاز علی کو اپنا استعفیٰ پیش کیا تو اس نے مسکرا کر مجھے ایک آفیشل خط دیا۔ اس میں یہ لکھا تھا کہ میری تنخواہ پچھلے مہینے سے دوسو کے بجائے تین سو روپے ماہوار کر دی گئی ہے۔“

پیرن سے برج موہن کی دلچسپی ختم ہو گئی اس نے مجھ سے ایک روز کہا۔
”پیرن کی نحوست ختم ہونے کے ساتھ ہی وہ بھی ختم ہو گئی..... اور میرا ایک نہایت دلچسپ مشغلہ بھی ختم ہو گیا۔ اب کون مجھے بیکار رکھنے کا موجب ہو گا۔“

ترقی پسند

جو گند رنگھ کے افسانے جب مقبول ہونا شروع ہوئے تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ مشہور ادیبوں اور شاعروں کو اپنے گھر بلائے اور ان کی دعوت کرے۔ اس کا خیال تھا کہ یوں اس کی شہرت اور مقبولیت اور بھی زیادہ ہو جائے گی۔

جو گند رنگھ بڑا خوش فہم انسان تھا۔ مشہور ادیبوں اور شاعروں کو اپنے گھر بلا کر اور ان کی خاطر تواضع کرنے کے بعد جب وہ اپنی بیوی امرت کور کے پاس بیٹھتا تو کچھ دیر کے لیے بالکل بھول جاتا کہ اس کا کام ڈاکخانہ میں چھٹیوں کی دیکھ بھال کرنا ہے۔ اپنی تین گز می پیالہ فیشن کی رنگی ہوئی پگڑی اتار کر جب وہ ایک طرف رکھ دیتا تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ اس کے لمبے لمبے کالے گیسوؤں کے نیچے جو چھوٹا سا سر چھپا ہوا ہے اس میں ترقی پسند ادب کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ اس احساس سے اس کے دل و دماغ میں ایک عجیب قسم کی ہمت پیدا ہو جاتی اور وہ یہ سمجھتا کہ دنیا میں جس قدر افسانہ نگار اور ناول نویس موجود ہیں۔ سب کے سب اس کے ساتھ ایک نہایت ہی لطیف رشتے کے ذریعے سے منسلک ہیں۔

امرت کور کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ اس کا خاوند لوگوں کو مدعو کرنے پر اس سے ہر بار یہ کیوں کہا کرتا ہے۔ ”امرت! یہ جو آج چائے پر آ رہے ہیں ہندوستان کے بہت بڑے شاعر ہیں۔ سمجھیں، بہت بڑے شاعر! دیکھو ان کی خاطر تواضع میں کوئی کسر نہ رہے۔“

آنے والا کبھی ہندوستان کا بہت بڑا شاعر ہوتا تھا یا بہت بڑا افسانہ نگار اس سے کم پائے کا کوئی آدمی وہ کبھی بلاتا ہی نہیں تھا اور پھر دعوت میں اونچے اونچے سروں میں جو باتیں ہوتی تھیں ان کا مطلب ہو آج تک نہ سمجھ سکی تھی۔ ان گفتگوؤں میں ترقی پسندی کا ذکر عام ہوتا تھا۔ اس ترقی پسندی کا مطلب بھی امرت کور کو معلوم نہیں ہوا تھا۔

ایک دفعہ جب جوگندر سنگھ ایک بہت بڑے افسانہ نگار کو چائے پلا کر فارغ ہوا اور اندرسوئی میں آ کر بیٹھا تو امرت کور نے پوچھا۔ ”یہ موٹی ترقی پسندی کیا ہے؟“

جوگندر سنگھ نے پکڑی سمیت اپنے سر کو ایک خفیف سی جنبش دی اور کہا۔ ”ترقی پسندی..... اس کا مطلب تم فوراً ہی نہیں سمجھ سکو گی۔ ترقی پسند اس کو کہتے ہیں جو ترقی پسند کرے۔ یہ لفظ فارسی کا ہے۔ انگریزی میں ترقی پسند کو ریڈیکل کہتے ہیں۔ وہ افسانہ نگار، یعنی کہانیاں لکھنے والے، جو افسانہ نگاری میں ترقی چاہتے ہوں۔ ان کو ترقی پسند افسانہ نگار کہتے ہیں۔ اس وقت ہندوستان میں صرف تین چار ترقی پسند افسانہ نگار ہیں جن میں میرانا م بھی شامل ہے۔“

جوگندر سنگھ عادتاً انگریزی لفظوں اور جملوں کے ذریعے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا کرتا تھا۔ اس کی یہ عادت پک کر اب طبیعت بن گئی تھی۔ چنانچہ اب وہ بلا تکلف ایک ایسی انگریزی زبان میں سوچتا تھا جو چند مشہور انگریزی ناول نویسوں کے اچھے اچھے چست فقرہ پر مشتمل تھی۔ نام گفتگو میں وہ پچاس فیصد انگریزی لفظ اور انگریزی کتابوں سے چنے ہوئے فقرے استعمال کرتا تھا۔ افلاطون کو وہ

ہمیشہ پلینو کہتا تھا۔ اسی طرح ارسطو کو ارسٹو ٹل۔ ڈاکٹر سنگھ انڈیا فرامڈ ہوشو پنہار اور ٹپشے کا ذکر وہ اپنی ہر معرکے کی گفتگو میں کیا کرتا تھا۔ عام بات چیت میں وہ ان فلسفیوں کا نام نہیں لیتا تھا اور بیوی سے گفتگو کرتے وقت وہ اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتا تھا کہ انگریزی لفظ اور یہ فلسفی نہ آنے پائیں۔

جو گند رنگھ سے جب اس کی بیوی نے ترقی پسندی کا مطلب سمجھا تو اسے بہت مایوسی ہوئی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ ترقی پسندی کوئی بہت بڑی چیز ہوگی۔ جس پر بڑے بڑے شاعر اور افسانہ نگار اس کے خاوند کے ساتھ مل کر بحث کرتے رہتے ہیں لیکن جب اس نے یہ سوچا کہ ہندوستان میں صرف تین چار ترقی پسند افسانہ نگار ہیں تو اس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہو گئی۔ یہ چمک دیکھ کر جو گند رنگھ کے مونچھوں بھرے ہونٹ ایک دہی دہی سی مسکراہٹ کے باعث کپکپائے۔ ”امرت..... تمہیں یہ سن کر خوشی ہوگی کہ ہندوستان کا ایک بہت بڑا آدمی مجھ سے ملنے کی خواہش رکھتا ہے۔ اس نے میرے افسانے پڑھے ہیں اور بہت پسند کیے ہیں۔“

امرت کو رنے پوچھا۔ ”یہ بڑا آدمی کوی ہے یا آپ کی طرح کہانیاں لکھنے والا۔“

جو گند رنگھ نے جیب سے ایک لفافہ نکالا اور اسے اپنے دوسرے ہاتھ کی پشت پر تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ”یہ آدمی کوئی بھی ہے۔ افسانہ نگار بھی ہے لیکن اس کی سب سے بڑی خوبی جو اس کی نہ مٹنے والی شہرت کا باعث ہے اور یہی ہے۔“

”وہ خوبی کیا ہے؟“

”وہ ایک آوارہ گرد ہے۔“

”آوارہ گرد؟“

”ہاں..... وہ ایک آوارہ گرد ہے جس نے آوارہ گردی کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا ہے..... وہ ہمیشہ گھومتا رہتا ہے..... کبھی کشمیر کی ٹھنڈی وادیوں میں ہوتا ہے اور کبھی ملتان کے پتے ہوئے میدانوں میں..... کبھی انکا میں کبھی تبت میں.....“

امرت کو رکی دلچسپی بڑھ گئی۔ ”مگر یہ کرتا کیا ہے؟“

”گیت اکٹھے کرتا ہے..... ہندوستان کے ہر حصے کے گیت..... پنجابی، کجراتی، مرہٹی، پشاور، سرحدی، کشمیری، مارہاڑی..... ہندوستان میں جتنی زبانیں بولی جاتی ہیں، ان کے جتنے گیت اس کے ملتے ہیں اکٹھے کر لیتا ہے۔“

”اتنے گیت اکٹھے کر کے کیا کرے گا۔“

”کتابیں چھاپتا ہے، مضمون لکھتا ہے تاکہ دوسرے بھی یہ گیت سن سکیں۔ انگریزی زبان کے کئی رسالوں میں اس کے مضمون چھپ چکے ہیں۔ گیت اکٹھے کرنا اور پھر ان کو سلیقے کے ساتھ پیش کرنا کوئی معمولی کام نہیں۔ وہ بہت بڑا آدمی ہے امرت بہت بڑا آدمی ہے اور دیکھو اس نے مجھے خط کیا لکھا ہے۔“

یہ کہہ کر جو گند رنگھ نے اپنی بیوی کو وہ خط پڑھ کر سنایا جو ہرند رما تھ ترپانھی نے اس کو اپنے گاؤں سے ڈاکخانہ کے پتے سے بھیجا تھا۔ اس خط میں ہرند رما تھ ترپانھی نے بڑی میٹھی زبان میں جو گند رنگھ کے افسانوں کی تعریف کی تھی اور لکھا تھا کہ آپ ہندوستان کے ترقی پسند افسانہ نگار ہیں۔ جب یہ فقرہ جو گند رنگھ نے

پڑھا تو بول اٹھا۔ ”لو دیکھو ترپاٹھی صاحب بھی لکھتے ہیں کہ میں ترقی پسند ہوں۔“
جوگندر سنگھ نے پورا خط سنانے کے بعد ایک دو سیکنڈ اپنی بیوی کی طرف دیکھا
اور اثر معلوم کرنے کے لیے پوچھا۔ ”کیوں؟“

امرت کو اپنے خاوند کی تیز نکاہی کے باعث کچھ جھینپ سی گئی اور مسکرا کر کہنے
لگی۔ ”مجھے کیا معلوم..... بڑے آدمیوں کی باتیں بڑے ہی سمجھ سکتے ہیں۔“
جوگندر سنگھ نے اپنی بیوی کی اس ادھر غور نہ کیا۔ وہ دراصل ہرند رنا تھہر ترپاٹھی
کو اپنے یہاں بلانے اور اسے کچھ بھرانے کی بابت سوچ رہا تھا۔ ”امرت! میں کہتا
ہوں ترپاٹھی صاحب کو دعوت دے دی جائے، کیا خیال ہے تمہارا..... لیکن میں یہ
سوچتا ہوں کیا پتہ ہے وہ انکار کر دے..... بہت بڑا آدمی ہے، ممکن ہے وہ ہماری
اس دعوت کو خوشامد سمجھے۔“

ایسے موقعوں پر وہ بیوی کو اپنے ساتھ شامل کر لیا کرتا تھا تا کہ دعوت کا بوجھ وہ
آمیوں میں بٹ جائے۔ چنانچہ جب اس نے ”ہماری“ کہا تو امرت کو رنے جو
اپنے خاوند جوگندر سنگھ کی طرح بے حد سادہ لوح تھی ہرند رنا تھہر ترپاٹھی سے دلچسپی
لینا شروع کر دی۔ حالانکہ اس کا نام ہی اس کے لیے ناقابل فہم تھا اور یہ بات بھی
اس کی سمجھ سے بالاتر تھی کہ ایک آوارہ گرد گیت جمع کر کر کے کیسے بہت بڑا آدمی
بن سکتا ہے۔ جب اس سے یہ کہا گیا تھا کہ ہرند رنا تھہر ترپاٹھی گیت جمع کرتا ہے تو
اسے اپنے خاوند کی ایک سنائی ہوئی بات یاد آ گئی تھی کہ ولایت میں کئی لوگ
تیتریاں پکڑنے کا کام کرتے ہیں اور یوں کافی روپیہ کماتے ہیں۔ چنانچہ اس نے
خیال کیا تھا کہ شاید ترپاٹھی صاحب نے گیت جمع کرنے کا کام ولایت کے کسی

آدمی سے سیکھا ہوگا۔

جوگندر سنگھ نے پھر اپنا اندیشہ ظاہر کیا۔ ”ممکن ہے وہ ہماری اس دعوت کو خوشامد سمجھے۔“

”اس میں خوشامد کی کیا بات ہے اور بھی تو کئی بڑے آدمی آپ کے پاس آتے ہیں۔ آپ ان کو خط لکھ دیجیے، میرا خیال ہے وہ آپ کی دعوت ضرور قبول کر لیں گے اور پھر ان کو بھی تو آپ سے ملنے کا بہت شوق ہے..... ہاں یہ تو بتائیے کیا ان کی بیوی بچے ہیں؟“

”بیوی بچے؟“ جوگندر سنگھ نے خط کا مضمون انگریزی زبان میں سوچتے ہوئے کہا۔ ”ہوں گے..... ضرور ہوں گے..... ہاں ہیں۔ میں نے ان کے ایک مضمون میں پڑھا تھا ان کی بیوی بھی ہے اور ایک بچی بھی ہے۔“

یہ کہہ کر جوگندر سنگھ اٹھا، خط کا مضمون اس کے دماغ میں مکمل ہو چکا تھا۔ دوسرے کمرے میں جا کر اس نے چھوٹے سائز کا پیڈ نکالا جس پر وہ خاص خاص آدمیوں کو خط لکھا کرتا تھا اور ہر ندرتا تھڑپاٹھی کے نام اردو میں دعوت نامہ لکھا۔ یہ اس مضمون کا ترجمہ تھا جو اس نے اپنی بیوی سے گفتگو کرتے وقت سوچ لیا تھا۔

تیسرے روز ہر ندرتا تھڑپاٹھی کا جواب آیا۔ جوگندر سنگھ نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ لفافہ کھولا۔ جب اس نے پڑھا کہ اس کی دعوت قبول کر لی گئی ہے تو اس کا دل اور بھی دھڑکنے لگا۔ اس کی بیوی امرت کو روتھوپ میں اپنے چھوٹے بچے کے کیسوں میں دبی ڈال کر مل رہی تھی کہ جوگندر سنگھ لفافہ ہاتھ میں لے کر اس کے پاس پہنچا۔ ”انہوں نے ہماری دعوت قبول کر لی، کہتے ہیں کہ وہ لاہوریوں بھی

ایک ضروری کام سے آرہے تھے..... اپنی تازہ کتاب چھپوانے کا ارادہ رکھتے ہیں
..... اور ہاں..... انہوں نے تم کو پر نام کہا ہے۔“

امرت کو اس احساس سے بہت خوش ہوئی کہ اتنے بڑے آدمی نے جس کا
کام گیت اکٹھے کرنا ہے اس کو پر نام کہا ہے۔ چنانچہ اس نے دل ہی دل میں خدا کا
شکرا ادا کیا کہ اس کا بیاہ ایسے آدمی سے ہوا جس کو ہندوستان کا ہر بڑا آدمی جانتا
ہے۔

سردیوں کا موسم تھا۔ نومبر کے پہلے دن تھے۔ جو گندرسنگھ صبح سات بجے بیدار
ہو گیا اور دیر تک بستر میں آنکھیں کھولے پڑا رہا۔ اس کی بیوی امرت کو اس کا
بچہ دونوں لحاف میں لپیٹے پاس والی چارپائی پر پڑے تھے۔ جو گندرسنگھ نے سوچنا
شروع کیا۔ ترپانگھی صاحب سے مل کر اسے کتنی خوشی ہوگی اور خود ترپانگھی صاحب کو
بھی یقیناً اس سے مل کر مسرت حاصل ہوگی۔ کیونکہ وہ ہندوستان کا جواں افکار
افسانہ نویس اور ترقی پسند ادیب ہے..... ترپانگھی صاحب سے وہ ہر موضوع پر گفتگو
کرے گا۔ گیتوں پر، دیہاتی بولیوں پر، افسانوں پر اور تازہ جنگلی حالات پر..... وہ
ان کو بتائے گا کہ دفتر کا ایک مخفی کلرک ہونے پر بھی وہ کیسے اچھا افسانہ نگار بن گیا۔
کیا یہ عجیب سی بات نہیں کہ ڈاکخانہ میں چٹھیوں کی دیکھ بھال کرنے والا انسان طبعاً
آرٹسٹ ہو۔

جو گندرسنگھ کو اس بات پر بہت ماز تھا کہ ڈاکخانہ میں مزدوروں کی طرح چھ
سات گھنٹے کام کرنے کے بعد بھی وہ اتنا وقت نکال لیتا ہے کہ ایک ماہانہ پرچہ

مرتب کرتا ہے اور دو تین پرچوں کے لیے ہر مہینے ایک افسانہ بھی لکھتا ہے۔
دوستوں کو ہر وقت جو لمبے چوڑے خط لکھے جاتے تھے، ان کا ذکر الگ رہا۔

دیر تک وہ بستر پر لیٹا ہر دن رات تھرتپاٹھی سے اپنی پہلی ملاقات کی ذہنی تیاریاں کرتا رہا۔ جو گندرسنگھ نے اس کے افسانے اور مضمون پڑھے تھے اور اس کا فوٹو بھی دیکھا تھا اور کسی کے افسانے پڑھ کر اور فوٹو دیکھ کر وہ نام طور پر یہی محسوس کیا کرتا تھا کہ اس نے اس آدمی کو اچھی طرح جان لیا ہے لیکن ہر دن رات تھرتپاٹھی کے معاملے میں اس کو اپنے اوپر اعتبار نہیں آتا تھا کبھی اس کا دل کہتا تھا کہ تپاٹھی ایک ایسے آدمی کی صورت میں پیش ہوتا تھا جس نے کپڑوں کے بجائے اپنے جسم پر کاغذ لپیٹ رکھے ہوں اور جب وہ کاغذوں کے متعلق سوچتا تھا تو اسے انارکلی کی وہ دیوار یاد آ جاتی تھی جس پر سینما کے اشتہار اوپر تلے اتنی تعداد میں چپکے ہوئے تھے کہ ایک اور دیوار بن گئی تھی۔

جو گندرسنگھ بستر پر لیٹا دیر تک سوچتا رہا کہ اگر وہ ایسا ہی آدمی نکل آیا تو اس کو سمجھنا بہت دشوار ہو جائے گا۔ مگر بعد میں جب اس کو اپنی ذہانت کا خیال آیا تو اس کی مشکلیں آسان ہو گئیں اور وہ اٹھ کر ہر دن رات تھرتپاٹھی کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔

خط و کتابت کے ذریعے سے یہ طے ہو گیا تھا کہ ہر دن رات تھرتپاٹھی خود جو گندرسنگھ کے مکان پر چلا آئے گا۔ کیونکہ تپاٹھی یہ فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ وہ لاری سے سفر کرے گا یا ریلوے ٹرین سے۔ بہر حال یہ بات تو قطعی طور پر طے ہو گئی تھی کہ جو گندرسنگھ سوموار کو ڈاکخانہ سے چھٹی لے کر سارا دن اپنے مہمان کا انتظار کرے

گا۔

نہا ہٹو کر اور کپڑے بدل کر جو گند رنگھ دیر تک باورچی خانہ میں اپنی بیوی کے پاس بیٹھا رہا۔ دونوں نے چائے دیر سے پی، اس خیال سے کہ شاید تڑپاٹھی آ جائے لیکن جب وہ نہ آیا تو انہوں نے کیک وغیرہ سنبھال کر الماری رکھ لیے اور خود خالی چائے پی کر مہمان کے انتظار میں بیٹھ گئے۔

جو گند رنگھ باورچی خانے سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ آنینے کے سامنے کھڑے ہو کر جب اس نے اپنی ڈاڑھی کے بالوں میں لوہے کے چھوٹے چھوٹے کلپ اٹکانے شروع کیے کہ وہ نیچے کی طرف تہہ ہو جائیں تو باہر دروازے پر دستک ہوئی۔ ڈاڑھی کو ویسے ہی نامکمل حالت میں چھوڑ کر اس نے ڈیوڑھی کا دروازہ کھولا۔ جیسا کہ اس کو معلوم تھا سب سے پہلے اس کی نظر ہرند رتا تھ تڑپاٹھی کی سیاہ گھنی ڈاڑھی پر پڑی جو اس کی ڈاڑھی سے بیس گنا بڑی تھی بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔

ہرند رتا تھ کے ہونٹوں پر جو بڑی بڑی مونچھوں کے اندر چھپے ہوئے تھے مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اس کی ایک آنکھ جو قدرے ٹیڑھی تھی زیادہ ٹیڑھی ہو گئی اور اس نے اپنی لمبی لمبی زلفوں کو ایک طرف جھٹک کر اپنا ہاتھ جو کسی کسمان کا ہاتھ معلوم ہوتا تھا جو گند رنگھ کی طرف بڑھا دیا۔

جو گند رنگھ نے جب اس کے ہاتھ کی مضبوط گرفت محسوس کی اور اس کو تڑپاٹھی کا وہ چہ می تمہیا نظر آیا جو حاملہ عورت کے پیٹ کی طرح پھولا ہوا تھا تو وہ بہت متاثر ہوا۔ وہ صرف اس قدر کہہ سکا۔ ”تڑپاٹھی صاحب آپ سے مل کر مجھے بے حد خوشی

ہوئی ہے۔“



ہرند رانا تھ ترپانھی کو آئے اب پندرہ روز ہو چکے تھے۔ اس کی آمد کے دوسرے روز ہی اس کی بیوی اور بچی بھی آگئی تھیں۔ یہ دونوں ترپانھی کے ساتھ ہی گاؤں سے آئی تھیں مگر دو روز کے لیے مزنگ میں ایک دور کے رشتے دار کے ہاں ٹھہر گئی تھیں اور چونکہ ترپانھی نے اس رشتے دار کے پاس ان کا زیادہ دیر تک ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا تھا اس لیے اس نے ان کو اپنے پاس بلوایا تھا۔

پہلے چار دن بڑی دلچسپ باتوں میں صرف ہوئے۔ ہرند رانا تھ ترپانھی سے اپنے افسانوں کی تعریف سن کر جوگندر بہت خوش ہوتا رہا۔ اس نے ایک مکمل افسانہ جو کہ غیر مطلوبہ تھا ترپانھی کو سنایا اور داد حاصل کی۔ وہ مکمل افسانے بھی سنائے جن کے متعلق ترپانھی نے اچھی رائے کا اظہار کیا۔ ترقی پسند ادب پر بھی بحثیں ہوتی رہیں۔ مختلف افسانہ نگاروں کی فنی کمزوریاں نکالی گئیں۔ نئی اور پرانی شاعری کا مقابلہ کیا گیا۔ غرضیکہ یہ چار دن بڑی اچھی طرح گزرے اور جوگندر نگلے ترپانھی کے شخصیت سے بہت متاثر ہوا۔ اس کی گفتگو کا انداز جس میں بیک وقت بچپنا اور بڑھاپا تھا جوگندر کو بہت پسند آیا۔ اس کی لمبی ڈاڑھی جو اس کی اپنی ڈاڑھی سے بیس گنا بڑی تھی اس کے خیالات پر چھا گئی اور اس کی کالی کالی زلفیں جن میں دیہاتی گیتوں کی سی روانی تھی ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے رہنے لگیں۔ ڈاکھانے میں چھٹیوں کی دیکھ بھال کرنے کے دوران میں بھی ترپانھی کی یہ زلفیں اسے نہ بھولیں۔

چار دن میں ترپانھی نے جو گند رنگھ کو موہ لیا۔ وہ اس کا گرویدہ ہو گیا۔ اس کی ٹیڑھی آنکھ میں بھی اس کی خوبصورتی نظر آنے لگی۔ بلکہ ایک بار تو اس نے سوچا۔
 ”اگر ان کی آنکھ میں ٹیڑھا پن نہ ہوتا تو چہرے پر یہ بزرگی کبھی پیدا نہ ہوتی۔“
 ترپانھی کے موئے موئے ہونٹ جب ترپانھی کی گھنی مونچھوں کے پیچھے ملتے تو جو گندرا ایسا محسوس کرتا کہ جھاڑیوں میں پرندے بول رہے ہیں۔ ترپانھی ہو لے ہو لے بولتا تھا اور بولتے بولتے جب وہ اپنی لمبی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتا تو جو گندرا کے دل کو بہت راحت پہنچتی۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس کے دل پر پیار سے ہاتھ پھیرا جا رہا ہے۔

چار روز تک جو گندرا ایسی فضا میں رہا جس کو اگر وہ اپنے کسی افسانے میں بھی بیان کرنا چاہتا تو نہ کر سکتا لیکن پانچویں روز ایک ایکی ترپانھی نے اپنا چرمی تھیلا کھولا اور اس کو اپنے افسانے سناتے شروع کیے اور دس روز تک وہ متواتر اس کو اپنے افسانے سناتا رہا۔ اس دوران میں ترپانھی نے جو گندرا کو کئی کتابیں سنا دیں۔
 جو گندرا رنگھ تنگ آ گیا۔ اب اس کو افسانوں سے نفرت پیدا ہو گئی۔ ترپانھی کا چرمی تھیلا جس کا پیٹ بڑیوں کی توند کی طرح پھولا ہوا تھا اس کے لیے ایک مستقل عذاب بن گیا۔ ہر روز شام کو دفتر سے لوٹتے ہوئے اسے اس بات کا کھٹکار ہنے لگا کہ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی ترپانھی سے ملاقات ہوگی۔ ادھر ادھر کی چند سرسری باتیں ہوں گی، وہ چرمی تھیلا کھول جائے اور اس کو ایک یا دو طویل افسانے سنا دیئے جائیں گے۔

جو گندرا رنگھ ترقی پسند تھا۔ یہ ترقی پسندی اگر اس کے اندر نہ ہوتی تو وہ صاف

لفظوں میں ترپاٹھی سے کہ دیتا۔ ”بس..... بس..... ترپاٹھی صاحب بس..... بس.....
اب مجھ میں آپ کے افسانے سننے کی طاقت نہیں رہی۔“ مگر وہ سوچتا۔ ”نہیں
..... نہیں..... میں ترقی پسند ہوں۔ مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے۔ دراصل یہ میری
کمزوری ہے کہ اب ان کے افسانے مجھے اچھے نہیں لگتے۔ ان میں ضرور کوئی نہ کوئی
خوبی ہوگی..... اس لیے کہ ان کے پہلے افسانے مجھے خوبیوں سے بھرے ہوئے
نظر آتے تھے..... میں..... میں..... متعصب ہو گیا ہوں۔“

ایک ہفتے سے زیادہ عرصے تک جو گند رنگھ کے ترقی پسند دماغ میں یہ کشمکش
جاری رہی اور وہ سوچ سوچ کر اس حد تک پہنچ گیا جہاں سوچ بچار ہو ہی نہیں سکتا۔
طرح طرح کے خیال اس کے دماغ میں آئے مگر وہ ان کی ٹھیک طور پر جانچ
پڑتال نہ کر سکتا۔ اس کی ذہنی افرا تفری آہستہ آہستہ بڑھتی گئی اور وہ ایسا محسوس
کرنے لگا کہ ایک بہت بڑا مکان ہے جس میں بے شمار کھڑکیاں ہیں۔ اس مکان
کے اندر وہ اکیلا ہے۔ آندھی آگئی ہے، کبھی اس کھڑکی کے پٹ بجتے ہیں کبھی اس
کھڑکی کے اور اس کے سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اتنی کھڑکیوں کو ایک دم بند کیسے
کرے۔

جب ترپاٹھی کو اس کے یہاں آئے بیس روز ہو گئے تو اسے بے چینی محسوس
ہونے لگی۔ ترپاٹھی اب شام کو نیا افسانہ لکھ کر جب اسے سناتا تو جو گند کو ایسا محسوس
ہوتا کہ بہت سی کھیاں اس کے کانوں کے پاس بھنبنھنا رہی ہیں وہ کسی اور ہی سوچ
میں غرق ہوتا۔

ایک روز ترپاٹھی نے جب اس کو اپنا تازہ افسانہ سنایا۔ جس میں کسی عورت اور

مرد کے جنسی تعلقات کا ذکر تھا تو یہ سوچ کر اس کے دل کو دھکا سا لگا کہ پورے اکیس دن اپنی بیوی کے پاس سونے کے بجائے وہ ایک لمبڈر ٹھیل کے ساتھ ایک ہی لحاف میں سوتا رہا ہے۔ اس احساس نے جوگندر کے دل و دماغ میں ایک لمحہ کے لیے انقلاب برپا کر دیا۔ ”یہ کیسا مہمان ہے کہ جو تک کی طرح چٹ کر ہی رہ گیا ہے۔ یہاں سے ملنے کا نام ہی نہیں لیتا..... اور..... اور..... میں ان کی بیوی صلیب کو تو بھول ہی گیا تھا اور ان کی بیٹی..... سارا گھراٹھ کر یہاں چلا آیا ہے۔ ذرہ بھی خیال نہیں کہ ایک غریب آدمی کا کچھ مر نکل جائے گا..... میں ڈاکھانے میں ملازم ہوں صرف پچاس روپے ماہوار مانتا ہوں، آخر کب تک ان کی خاطر تواضع کرتا رہوں گا اور پھر افسانے..... اس کے افسانے جو کہ ختم ہونے ہی میں نہیں آتے۔ میں انسان ہوں۔ لوہے کا ٹرنک نہیں ہوں جو ہر روز اس کے افسانے سنتا رہوں..... اور کس قدر غضب ہے کہ میں اپنی بیوی کے پاس تک نہیں گیا..... سردیوں کی یہ راتیں ضائع تو ہو رہی ہیں۔“

اکیس دنوں کے بعد جوگندر ترپانھی کو ایک نئی روشنی میں دیکھنے لگا۔ اب اس کو ترپانھی کی ہر چیز معیوب نظر آنے لگی۔ اس کی میز چھٹی آنکھ جس میں جوگندر پہلے خوبصورتی دیکھتا تھا اب صرف ایک میز چھٹی آنکھ تھی۔ اس کی کالی زلفوں میں بھی اب جوگندر کو وہ ملائی دکھائی نہیں دیتی تھی اور اس کی ڈاڑھی دیکھ کر اب وہ سوچتا تھا کہ اتنی لمبی ڈاڑھی رکھنا بہت بڑی حماقت ہے۔

جب ترپانھی کو اس کے یہاں آئے کچیس دن ہو گئے تو ایک عجیب و غریب کیفیت اس کے اوپر طاری ہو گئی۔ وہ اپنے آپ کو اجنبی سمجھنے لگا۔ اسے ایسا محسوس

ہونے لگا جیسے وہ کبھی جو گند رنگھ کو جانتا تھا مگر اب نہیں جانتا۔ اپنی بیوی کے متعلق وہ سوچتا۔ ”جب ترپانھی چلا جائے گا اور سب ٹھیک ہو جائے گا تو میری نئے سرے سے شادی ہوگی..... میری وہ پرانی زندگی جس کو ماٹ کے طور پر لوگ استعمال کر رہے ہیں پھر عود کر آئے گی..... میں پھر اپنی بیوی کے ساتھ سو سکوں گا..... اور.....“

اس کے آگے جب وہ سوچتا تو جو گند رنگھ کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے اور اس کے حلق میں کوئی تلخ سی چیز پھنس جاتی۔ اس کا جی چاہتا کہ دوڑا دوڑا اندر جائے اور امرت کو روکو جو کبھی اس کی بیوی ہوا کرتی تھی اپنے گلے سے لگا لے اور رونا شروع کر دے۔ مگر ایسا کرنے کی ہمت اس میں نہیں تھی کیونکہ وہ ترقی پسند افسانہ نگار تھا۔

کبھی کبھی جو گند رنگھ کے دل میں یہ خیال دو دھ کے اہال کی طرح اٹھتا کہ ترقی پسندی کا لحاف جو اس نے اوڑھ رکھا ہے اتار پھینکے اور چلانا شروع کر دے۔ ”ترپانھی! ترقی پسندی کی ایسی قیسی۔ تم اور تمہارے اکٹھے کیے ہوئے گیت سب بکو اس ہیں۔ مجھے اپنی بیوی چاہیے..... تمہاری خواندہشیں تو ساری گیتوں میں جذب ہو چکی ہیں مگر میں ابھی نو جوان ہوں..... میری حالت پر رحم کرو۔ ذرا غور تو کرو میں جو ایک منٹ اپنی بیوی کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا بچیس دنوں سے تمہارے ساتھ ایک ہی لحاف میں سو رہا ہوں..... کیا یہ قلم نہیں۔“

جو گند رنگھ بس گھول کے رہ جاتا۔ ترپانھی اس کی حالت سے بے خبر ہر روز شام کو اسے اپنا تازہ افسانہ سنا دیتا اور اس کے ساتھ لحاف میں سو جاتا۔

جب ایک مہینہ گزر گیا تو جوگندر سنگھ کا پیانہ صبر لبریز ہو گیا۔ موقع پا کر غسل خانے میں وہ اپنی بیوی سے ملا۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس ڈر کے مارے کہ ترپاٹھی کی بیوی نہ آ جا ہے اس نے جلدی سے اس کا یوں بوسہ لیا جیسے ڈاکخانہ میں لفافوں پر مہر لگائی جاتی ہے اور کہا۔ ”آج رات تم جاگتی رہنا۔ میں ترپاٹھی سے یہ کہہ کر باہر جا رہا ہوں کہ رات کے ڈھائی بجے واپس آؤں گا لیکن میں جلدی آ جاؤں گا۔ بارہ بجے..... پورے بارہ بجے میں ہو لے ہو لے دست دوں گا تم چپکے سے دروازہ کھول دینا اور پھر ہم..... ڈیوڑھی بالکل الگ تھلگ ہے لیکن تم احتیاط کے طور پر وہ دروازہ جو غسل خانہ کی طرف کھلتا ہے بند کر دینا۔“

بیوی کو اچھی طرح سمجھا کر وہ ترپاٹھی سے ملا اور اس سے رخصت لے کر چلا گیا۔ بارہ بجنے میں چار سو دگھنٹے باقی تھے جن میں سے دو جوگندر سنگھ نے اپنی سائیکل پر ادھر ادھر گھومنے میں کاٹے۔ اس کو سردی کی شدت کا بالکل احساس نہ ہوا اس لیے کہ بیوی سے ملنے کا خیال کافی گرم تھا۔

دو گھنٹے سائیکل پر گھومنے کے بعد وہ اپنے مکان کے پاس میدان میں بیٹھ گیا اور محسوس کرنے لگا کہ وہ رومانی ہو گیا ہے۔ جب اس نے سردرات کی دھندیلی خاموشی کا خیال کیا تو اسے یہ ایک جانی پہچانی چیز معلوم ہوئی۔ اوپر ٹھٹھرے ہوئے آسمان پر تارے چمک رہے تھے جیسے پانی کی موٹی موٹی بوندیں جم کر موٹی بن گئی ہیں۔ کبھی کبھی ریلوے انجن کی چیخ خاموشی کو چھیڑ دیتی اور جوگندر سنگھ کا افسانہ نگار دماغ یہ سوچتا کہ خاموشی بہت بڑا عرف کا ڈھیلا ہے اور سیٹی کی آواز شیخ ہے جو اس کے سینے میں کسب گئی ہے۔

بہت دیر تک جو گندرا ایک نئے قسم کے رومان کو اپنے دل و دماغ میں پھیلاتا رہا اور رات کی اندھیری خوبصورتیوں کو گنتا رہا۔ ایک ایک ان خیالات سے چونک کر اس نے گھڑی میں وقت دیکھا تو بارہ بجے ہیں دو منٹ باقی تھے۔ اٹھ کر اس نے گھر کا رخ کیا اور دروازے پر ہولے سے دستک دی۔ پانچ سینڈ گزر گئے۔ دروازہ نہ کھلا ایک بار اس نے پھر دستک دی۔

دروازہ کھلا۔ جو گندرا نگلے نے ہولے سے کہا۔ ”امرت“ اور جب نظریں اٹھا کر اس نے دیکھا تو امرت کور کے بجائے ترپاٹھی کھڑا تھا۔ اندھیرے میں جو گندرا نگلے کو ایسا معلوم ہوا کہ ترپاٹھی کی ڈاڑھی اتنی لمبی ہو گئی ہے کہ زمین کو چھو رہی ہے اس کو پھر ترپاٹھی کی آواز سنائی دی۔ ”تم جلدی آ گئے..... چلو یہ بھی اچھا ہوا میں نے ابھی ابھی ایک افسانہ مکمل کیا ہے۔ آؤ سنو۔“

تلون

بارش کا شور..... آہستہ آہستہ یہ شور شدت پکڑتا ہے۔
 نیلم: (ڈرتے ہوئے لہجے میں) کھڑکی بند کرو جمیل..... باہر رات کا اندھیرا
 ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہمیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے..... اف یہ کالی رات
 کتنی بھیا تک ہے۔
 جمیل: (جلدی سے) اتنی بھیا تک نہیں جتنی تمہاری کالی زلفیں ہیں۔
 نیلم: تو ڈرنا چاہیے آپ کو۔
 جمیل: (بنتا ہے) ان کالی رسیوں سے جو سانپ کی طرح بل تو کھاتی ہیں مگر
 ڈس نہیں سکتیں۔ (بنتا ہے) تمہارے سر کے یہ کالے دھاگے صرف شاعروں ہی
 کے لیے جان بن سکتے ہیں نیلم..... ہاں تو کھڑکی کیا جھج بند کروں..... کیا تمہیں
 واقعی ڈر لگتا ہے۔
 نیلم: اس بھیا تک رات سے زیادہ اس وقت مجھے تم سے خوف محسوس ہوتا
 ہے۔
 (کھڑکی بند کر دیتی ہے)
 جمیل: خوف..... مجھ سے تمہیں خوف محسوس ہوتا ہے..... ہونا چاہیے۔ اس
 لیے کہ خوف ہی تم جیسی عورتوں کو رام کر سکتا ہے..... وہ شاعر..... وہ شاعر..... کیا
 نام تھا اس شاعر کا۔
 نیلم: تم اپنے دوست کو اتنی جلدی بھول گئے۔

جمیل: میں اسے اس کی موت کے بعد بھولا ہوں، اس لیے کہ اب اس کو یاد رکھنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا..... اور تم تو اسے اس کی زندگی ہی میں بھول گئی تھیں۔
 نیلم: خدا کے لیے..... خدا کے لیے گڑے مردے نہ اکھاڑو جمیل!
 جمیل: جو تم کفنائے بغیر دفن کر چکی ہو..... نیلم! اللہ اگر میں کبھی تمہاری محبت میں گرفتار ہو جاؤں تو مزہ آ جائے..... تمہیں اپنی اس انگوٹھی میں گننے کی طرح نہ جڑ لوں تو میرا نام جمیل نہیں..... وہ لوگ بیوقوف تھے جو تمہارے عشق میں آہیں بھرتے مر گئے..... مجھے تعجب ہے کہ ان میں سے کسی نے تمہارا گلا کیوں نہیں کاٹ ڈالا..... یہ سفید سفید گلا جس میں تم اتنے اچھے مر نکال سکتی ہو اور ایسے راگ کا جاوہ چلاتی ہو۔

نیلم: تم کیوں نہیں کاٹ ڈالتے۔

جمیل: اس لیے کہ میں تم سے محبت نہیں کرتا۔

نیلم: مانتی ہوں، لیکن پھر تم مجھ سے دلچسپی کیوں لیتے ہو؟

جمیل: سیاح جب بمبئی میں آتے ہیں تو مالابار کی پہاڑی پر وہ مقام دیکھنے کے لیے ضرور رخصتہ جاتے ہیں جہاں باؤلہ قتل کیا گیا تھا..... میں تم سے ملتا ہوں اس لیے کہ تم ایک ایسا تاریخی مقام بن گئی ہو جہاں کئی بیوقوفوں نے جان دی ہے۔
 نیلم: تم چاہو تو شاعر بن سکتے ہو۔

جمیل: مگر تم چاہو تو کچھ بھی نہیں بس سکتیں..... عورت اڑ سے ایک ہی راگ لے کر آتی ہے جسے وہ وقت بے وقت گاتی رہتی ہے..... بتاؤ تمہارے ساز حیات میں دھوکے اور فریب کے سوا کیا اور کوئی راگ ہے؟

نیلم: بہت سے راگ ہیں۔ جب تم مجھ سے محبت کرو گے تو سناؤں گی..... فی
الحال یہ چند شعر سنو۔

جمیل: کیا اس بے وقوف شاعر کے ہیں؟
نیلم: نہیں میرے اپنے ہیں۔

(با جے پرائگیاں پلاتی ہے اور ذیل کے شعر گاتی ہے)

زندگی	ایک	سرگرائی	ہے
یہ	مرا	عالم	جوانی
یہ	جو	پلکوں	چہ قطرہ خوں
تیرے	اکرام	کی	نشانی
مسکراتا	جسے	نصیب	نہ ہو
وہ	جوانی	بھی	کیا جوانی

(احمد ندیم قاسمی)

جمیل: اچھا گاتی ہو..... (گلاس میں شراب اٹھیلنا ہے)..... اور یہ شراب
بھی بری نہیں۔

نیلم: (آخری شعر گاتی ہے).....

ہے ان آنکھوں کا رنگ پانی میں
ورنہ کیا ہے شراب، پانی ہے
جمیل: خود ستانی کا دوسرا نام عورت ہے، کیوں نیلم.....؟ اور معلوم ہوتا ہے
آج کسی نے تمہاری آنکھوں کی تعریف نہیں کی، جب ہی تمہیں ان کا رنگ شراب

میں گھولنا پڑا..... بخدا نیلم تم بڑی دلچسپ عورت ہو۔ تمہاری پلکوں میں چھنے ہوئے آنسو دیکھ کر مجھے ریگستان کے کنویں یاد آ جاتے ہیں..... ہاں یہ تو بتاؤ آج تم رو کیوں رہی ہو..... اگر مجھے مرغوب کرنے کے لیے تم نے یہ آنسو بہائے ہیں تو میں کہوں گا کہ تم نے ناحق تکلیف کی..... میرے دل کی چھت چیتی نہیں۔

نیلم: (با جے کے پردے چھیڑتی ہے اور ایک ٹھنڈی سانس بھرتی ہے)
جمیل عورتیں روتی ہیں..... جانتے ہو عورتیں کیوں روتی ہیں۔

جمیل: کم روزیادہ شراب پیئیں۔ (اور شراب گلاس میں ڈالتا ہے)
نیلم: (تک آ کر بلند آواز میں) جمیل..... (ایک دم آواز دبا کر) اب میں تم سے کیا کہوں جمیل؟

جمیل: کہو کہ جمیل تم خوبصورت ہو..... تمہاری گفتگو ایسی ہے جیسے شراب کے یہ متحرک بلبلے..... تمہاری جوانی ایسی ہے جیسے اس ساز کے تنے ہوئے تار..... تم عورتوں کا..... تم حسین عورتوں کا..... کہو کیا کہو گی..... ہاں کہو کہ تم حسین عورتوں کا خواب جمیل ہو..... کہو..... کچھ ایسا ہی کہو اور کہے چلی جاؤ..... اگر عورتیں اپنی تعریف سے خوش ہو سکتی ہیں تو کیا ایک مرد نہیں ہو سکتا..... ہاں یہ تو بتاؤ نیلم، آج تمہاری شراب سسکیاں کیوں بھر رہی ہے..... میں نے دو گھنٹ پئے ہیں اور مجھے ایسا محسوس ہوا ہے کہ میرے حلق سے وہ آہیں نیچے اتر گئی ہیں..... یہ شراب کسی دل جلے کا تھوہ تو نہیں۔

(کھڑکی ہوا کے دباؤ سے کھل جاتی ہے۔ بارش کا شور سنائی دیتا ہے)
جمیل: کھڑکی بند کرو نیلم..... باہر رات کا اندھیرا ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہمیں

آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے..... اف یہ کالی رات کتنی بھیا تک ہے۔

نیلم: اتنی بھیا تک نہیں جتنی تمہاری گفتگو ہے۔

جمیل: تو مجھ سے ڈرنا چاہیے تمہیں۔

نیلم: (ہنستی ہے) ڈرنا چاہیے..... تمہاری ان باتوں سے جو بالکل کھوکھلی

ہیں (ہنستی ہے) ان چنگاریوں سے جن میں خود بھی جلنے کی قوت نہیں۔ ہاں تو

کھڑکی کیا چمچ بند کروں..... کیا تمہیں واقعی ڈر لگتا ہے؟

جمیل: مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان تمام مردوں کی روحیں جو تمہاری محبت کا

زہر بن کر اس دنیا سے اٹھ گئے ہیں۔ آج رات اس کالی بارش میں نہا رہی ہیں

..... نیلم: ذرا خیال تو کرو، اگر چمچ مجھے یہ روحیں تمہارا راستہ روک کر کھڑی ہو جائیں تو

..... تو.....

نیلم: اگر تمہاری روح بھی اس قطار میں ہوئی تو شاید مجھے ایک لمسے کے لیے

ٹھٹکانا پڑے۔

جمیل: کیوں؟

نیلم: اس کیوں کا جواب اس وقت دوں گی جب تمہاری روح کالی بارش میں

نہائے گی اور میرا راستہ روک کر کھڑی ہو جائے گی۔

جمیل: تم اب دلیر ہو گئی ہو۔

نیلم: تم اسے دلیری کہتے ہو مگر یہ عورت کی سب سے بڑی بزدلی ہے۔

جمیل: کیا؟

نیلم: یہی..... یہی دلیری۔

جمیل: تمہاری باتیں اس وقت شراب کے گھونٹوں سے زیادہ مزہ دے رہی ہیں۔

نیلیم: تو شراب چھوڑ دو۔ یہی پیو۔

جمیل: بخدا آج تم نے میری طبیعت خوش کر دی..... میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ جب میرے ہوش و حواس بجا نہ رہے تو چند دنوں کے لیے تم سے ضرور محبت کروں گا..... جانتی ہو محبت کسے کہتے ہیں۔

نیلیم: ہوش و حواس بحال نہ رہنے کی صورت میں کسی وعرت سے چند دنوں کے لیے کھیلنا۔

جمیل: تمہاری یہ باتیں کسی روز مجھے مجبور کر دیں گی کہ میں..... کہ میں.....

نیلیم: کہو..... کہو۔

جمیل: کہ میں تمہیں ایک کتاب بنا کر اپنی الماری میں رکھ لوں..... تم سی عورتوں کو فرصت کے وقت ضرور پڑھنا چاہیے۔

نیلیم: پہلے قاعدہ تو پڑھ لیا ہوتا۔

جمیل: ہوشیار طالب علموں کے لیے ابتدائی معلومات اتنی ضروری نہیں ہوتیں۔

نیلیم: ہائے تمہاری ہوشیاری..... تمہیں اس ہوشیاری پر کتنا ناز ہے لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری ہوشیاری کسی عورت کے سامنے گھٹنے ٹیک دے۔

جمیل: میری ہوشمندی شاعروں کی ہوشمندی نہیں..... ہاں یہ تو ہٹاؤ تم نے اس بیچارے شاعر سے اتنا برا سلوک کیوں کیا؟

نیلیم: اس لیے کہ مجھ سے تمہارا سلوک اچھا نہیں تھا۔

جمیل: یہ منطق میری سمجھ میں نہیں آیا۔

نیلیم: اور نہ کبھی آئے گا..... اپنے گھروں میں آسانی کے ساتھ سوٹ کیسوں کا تالا کھولنے والے مرد جب کسی عورت کے دل کا تالا کھولنا چاہیں تو یہی مشکل پیش آیا کرتی ہے۔ اور وہ لوگ جو تم ایسے مشکل پسند ہوتے ہیں آسانیاں ان کے لیے دشواریاں ہوتی ہیں۔

جمیل: کون سی آسان بات سمجھنا میرے لیے دشوار ہے۔

نیلیم: کہ تمہارے برے سلوک نے مجھے تمہارے شاعر دوست سے برا سلوک کرنے پر مجبور کیا۔

جمیل: کتنی آزادانہ مجبوری ہے۔

نیلیم: تمہیں سیدھی سادی بات میں الجھاؤ پیدا کر کے شاید لطف آتا ہے..... لیکن یاد رکھو کسی روز تم خون ان بھول بھلیوں میں ایسے پھنسو گے کہ نکلنے کا نام نہ لو گے..... حقائق کا ہر وقت منہ چڑھانا بھی اچھا نہیں۔ تم جانتے ہو..... نہیں تم محسوس کرتے ہو اس لیے کہ محسوس کرنا جاننے سے بہت بہتر ہے کہ تمہارے دوست شاعر کی محبت کو میں نے صرف اس لیے ٹھکرا دیا کہ تمہاری ٹھوکروں سے مجھے پیار ہو گیا تھا۔

جمیل: میں زیادہ شراب تو نہیں پی گیا۔

نیلیم: نہیں تم نے صرف دو گلاس پئے ہیں..... مدہوش میں ہو رہی ہوں۔

جمیل: تو پھر کوئی حرج نہیں..... کہو کیا کہہ رہی تھیں۔ تم نے میرے شاعر

دوست کی محبت کو صرف اس لیے ٹھکرا دیا کہ میری ٹھوکروں سے تمہیں پیار ہو گیا تھا
..... ہاں پھر کیا ہوا؟

نیلیم: جو ہونا تھا۔

جمیل: یعنی

نیلیم: شاعروں کے سینکڑوں شعر میں ہر روز پھانکتی رہی مگر میرے دل میں
محبت کی شہریت پیدا نہ ہوئی اور تمہاری خشک باتوں نے (کھڑکی
شور کے ساتھ کھلتی ہے۔ ہوا کی تیز سیٹیاں کمرے میں پھیل جاتی ہیں۔ عباس کھڑکی
کے راستے اندر داخل ہوتا ہے۔ نیلیم چیختی ہے) عباس!

عباس: (زور سے کھڑکی بند کر دیتا ہے اور فرش پر اپنے زنی بوتلوں کے ساتھ
چٹا نیلیم کے پاس آ جاتا ہے) ہاں شاعر عباس مگر چیخ کیسی
..... کیا پرانے دوستوں کا استقبال ایسی چیخوں سے کیا جاتا ہے؟ اور جمیل تم
کیوں ڈر گئے کیا میں تمہارا عزیز دوست عباس نہیں ہوں جس کے سینکڑوں
شعر ہر روز پھانکنے پر بھی نیلیم کے دل کا باضمہ درست نہیں ہوا خبردار جو تم اپنی جگہ
سے ہلے میرا پستول شعر نہیں کہتا۔ ایسا نہ ہو کہ اس سے بدکلامی ہو جائے
..... ہاں کہو نیلیم تم کیا کہہ رہی تھیں جمیل کی خشک باتوں نے
جمیل کی خشک باتوں نے کیا کیا۔

نیلیم: (بھنچے ہوئے لہجہ میں) عباس تم زندہ ہو؟

عباس: مجھے خود تو یہی محسوس ہوتا ہے۔

جمیل: ریل گاڑی کے حادثہ میں تمہارے مر جانے کی افواہ.....

عباس: غلط تھی لیکن آج شب کے حادثے میں تمہارے مرجانے کی افواہ غلط نہ ہوگی۔

جمیل: تو مجھے ابھی ابھی وصیت کر دینا چاہیے اور اپنی ساری جائیداد تمہارے حق میں محفوظ کر دینا چاہیے۔

عباس: تمہاری جائیداد..... کیا ہے تمہاری جائیداد؟
جمیل: میری شکل باتیں جو تمہارے شعروں کے ساتھ مل کر شاید نیلیم کا دل موہ سکیں۔

عباس: (ایک دم غصے میں آ کر)..... جو میں نہ موہ سکا۔ یہی کہنا چاہتے ہو نا تم..... دہلی زبان میں آج تم نے جس بات کی طرف اشارہ کیا ہے اگر مجھے پہلے معلوم ہوتی تو میرے دل کا بوجھ اس قدر زیادہ نہ ہوتا..... وہ بوجھ جو اب تمہیں اپنے کاندھوں پر اٹھانا پڑے گا..... میں یہوقوف ہوں..... جیسا کہ تم نیلیم سے کہہ رہے تھے شاعر بے وقوف ہی ہوا کرتے ہیں مگر وہ تم جیسے خدا نہیں ہوتے..... بھیر کی کھال میں تم جیسے چیتے نہیں ہوتے..... تم..... تم..... اپنی طرف سے شاید ایک دلچسپ کھیل کھیلتے رہے مگر جانتے ہو تم نے مجھے بے حد دکھ پہنچایا ہے..... تم نے میری حساس روح کو پاؤں تلے روند دیا ہے..... تم نے شاعر کو تکلیف نہیں دی ایک انسان کو دکھ دیا ہے جو محبت میں گرفتار تھا..... جانتے ہو محبت کرنے والے انسانوں کی روح بہت حساس ہوتی ہے۔

جمیل: میں نے کبھی محبت نہیں کی۔

عباس: لیکن اب تمہیں کرنا ہوگی۔

جمیل: کس سے؟

عباس: نیلم سے..... اس عورت سے جس سے میں محبت کرتا ہوں.....
اس مغنیہ سے جس کے حلق سے نکلے ہوئے سروں میں اتنے برس میری روح
آشیانہ بناتی رہی اور جس کے تنکے تم نے ہوائی بگولا بن کر اڑا دیئے..... سنتے ہو
اس عورت سے جس کی نسوانیت میری نرم و نازک شاعری نے بنائی ہے تم اپنی
کھر دریں باتوں سمیت محبت کرو گے۔

جمیل: پور تم؟

عباس: میں..... میں تمہارا تماشا دیکھوں گا۔
جمیل: تمہیں کیسے معلوم ہوگا کہ میں واقعی نیلم سے محبت کرتا ہوں۔
عباس: تمہیں اس بات کا ثبوت دینا ہوگا..... اور اس سے میری محبت کا
ثبوت یہ ہے کہ آج نصف شب کے بعد شاعر عباس، نیلم پر اپنی جان قربان کر
وے گا۔ اس دنیا میں چلا جائے گا جہاں شعریت ہی شعریت ہے۔
جمیل: دوسرے لفظوں میں مجھے اس دنیا میں جانا پڑے گا جہاں شعریت ہی
شعریت ہے۔

عباس: تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو۔

نیلم: عباس..... خدا کے لیے عباس ایسے بے رحم نہ ہو۔

عباس: اس سے تمہاری محبت کا ثبوت لینا کوئی بے رحمی نہیں..... میں بھی
تو اس بات کا ثبوت دوں گا کہ مجھے تم سے محبت ہے۔
نیلم: کیسے؟

عباس: اس گلاس میں جس میں جمیل شراب پیتا رہا ہے۔ میں زہر کھولنے لگا ہوں (گلاس کی آواز)..... پہلا گھونٹ جمیل پئے گا۔ جب زہر اس کو ہلاک کر دے گا تو دوسرا گھونٹ میں پیوں گا۔

نیلیم: یہ کیسے ہو سکتا ہے عباس..... تمہارا دماغ بہک گیا ہے۔
جمیل: پورا گریں انکار کروں؟

عباس: تو میرا پستول کبھی انکار نہیں کرے گا۔

جمیل: پستول کی گولی سے مرنا شاندار نہیں..... میں زہر ہی پیوں گا مگر مجھے پہلے اس بات کا یقین ہونا چاہیے کہ میری موت کے بعد تمہاری موت بھی ہوگی..... کیا نیلیم مجھے اس بات کا یقین دلا سکتی ہے۔

نیلیم: میں..... میں..... لیکن عباس شاعر ہے۔

جمیل: تو ایسا ہو سکتا ہے کہ پہلے عباس زہر پئے اور اس دنیا کا دروازہ کھٹکھٹائے جہاں شعریت ہی شعریت ہے۔ میں اس کے پیچھے آنے کا وعدہ کرتا ہوں..... اس حوڑے سے وقفے میں مجھے نیلیم کی محبت میں گرفتار ہونے کا موقع بھی مل جائے گا۔

نیلیم: ایسا کیوں نہ ہو کہ یہ سارا زہر میں ہی اپنے حلق سے نیچے اتار لوں..... اور تم پھر سے ایک دوسرے کے دوست بن جاؤ..... ایک دوسرے سے محبت کرنا شروع کر دو۔

عباس: (بلند آواز میں) نہیں..... ہرگز نہیں..... موت کا یہ جال میری مرضی کے مطابق پانی میں ڈالا جائے گا..... پہلے جمیل تم اس جال میں آؤ گے پھر

میں..... اور نیلم زندہ رہے گی..... اس کو زندہ رہنا پڑے گا..... جب زہر تمہارے اندر سرایت کر جائے گا اور موت کا مضبوط ہاتھ تمہیں رسی کے مانند بٹ دے گا تو نیلم کے دل پر تیز سے پڑیں گے اور میں جیوں گا۔ میں جیوں گا اور تم مرو گے (دیوانہ وار ہنستا ہے)..... ہاں ہاں تمہیں مرنا ہوگا..... میں خود مرنے جاؤں گا مگر زندہ ہو کر اور تم مرو گے ادھ موئے ہو کر (ہنستا ہے) برف کے ٹکڑوں سے اپنی تابانی ادھار لینے والی نیلم کے لیے آج کڑی آزمائش کا دن ہے..... اس کی آنکھوں کے سامنے آج اس کے دو چاہنے والے موت کی گہرائیوں میں اتریں گے۔

جمیل: مذاق ختم ہو چکا..... رات بہت گزر چکی ہے عباس..... میں سمجھتا ہوں کہ اب تمنا کے کو بند کر دینا چاہیے..... نیلم برف کی سلوں سے اپنی تابانی ادھار لیتی ہے تم ان سے تھوڑی سی سردی مانگ لو اور خدا کے لیے اس آگ کو بجھاؤ..... میں آگ تاپنے کا عادی نہیں ہوں۔

عباس: (زور سے قہقہہ لگاتا ہے) صرف باتیں ہی بنانے کے عادی ہو..... تم آگ لگا سکتے ہو مگر آگ لگا کر اس کا تماشا دیکھنے کی تاب تم میں نہیں..... نیلم تمہاری ٹھوس چٹان چٹخنا شروع ہو گئی..... بس اب کچھ دم میں ریزہ ریزہ ہوا چاہتی ہے..... (ہنستا ہے)..... تمہیں عورتوں سے کھیلنا پسند ہے مگر زہر کا ایک گھونٹ تم سے نہیں پیاجاتا..... میرے دوست، عورتیں زہر سے زیادہ زہریلی ہوتی ہیں۔

جمیل: ہوں گی مگر ان کے لیے جو ان سے دلچسپی لیتے ہیں۔

نیلیم: عباس..... جمیل ٹھیک کہتا ہے..... اسے مجھ سے صرف اس قدر دلچسپی تھی کہ میں اس کی دلچسپ باتوں میں دلچسپی لوں۔
 عباس: کیا دلچسپ بات ہے..... اور زہر کے یہ گھونٹ بھی کچھ کم دلچسپ نہیں..... کتنے پیو گے۔ میرے لیے تو ایک ہی کافی ہوگا۔
 جمیل: میں نہیں پیوں گا۔

عباس: تمہیں پینا ہوگا..... (گلاس اٹھاتا ہے)..... اسی شراب میں رہے۔ (نیلیم لپک کر ہاتھ سے گلاس گرا دیتی ہے۔ عباس اس کی کلائی پکڑ لیتا ہے۔ نیلیم کی چوڑیاں کھٹکھٹاتی ہیں)..... زہر کی پڑیا واپس دے دو نیلیم..... (نیلیم، عباس کی زبردست گرفت کے باعث کراہتی ہے اور کہتی ہے ”میری کلائی ٹوٹ جائے گی“)..... میرا دل ٹوٹ چکا ہے..... لاؤ..... یہ زہر میرے حوالے کرو۔ (نیلیم کی ہلکی سے چیخ)..... بس اب ایک طرف ہو جاؤ اور ہمارا تماشا دیکھو..... خبردار جمیل..... اپنی جگہ پر کھڑے رہو۔ (گلاس اٹھاتا ہے اور اس میں زہر کی پڑیا گھولتا ہے)..... لو..... اس کا ایک گھونٹ پی جاؤ۔ گلاس ہاتھ میں لو..... ورنہ.....

جمیل: (ڈرتے ہوئے لہجے میں)..... نیلیم..... کیا سچ مجھے یہ زہر پینا پڑے گا۔

نیلیم: حالات کا تقاضا یہی ہے۔

جمیل: حالات کا تقاضا..... حالات کا تقاضا..... مجھے حالات سے کیا واسطہ ہے..... مجھے کسی سے بھی کوئی واسطہ نہیں ہے..... نیلیم یہ کیا ہو رہا ہے..... خدا کے

لیے مجھے اس موت سے بچاؤ۔
 نیلم: گلاس میں سے ایک گھونٹ پی جاؤ..... تم بچ جاؤ گے۔
 عباس: (ہنستا ہے)
 نیلم: پی جاؤ..... میرا منہ کیا دیکھتے ہو..... شہد سمجھ کے پی جاؤ۔
 جمیل: شہد..... شہد.....
 عباس: (بلند آواز میں) پی جاؤ..... ورنہ.....
 نیلم: پی جاؤ تمہیں کچھ نہ ہوگا۔
 جمیل: کیسے۔ کیسے؟
 عباس: پی جاؤ۔
 نیلم: پی جاؤ..... پی جاؤ.....
 عباس: بس ایک گھونٹ..... باقی میری طرف بڑھا دو۔
 نیلم: پی جاؤ۔ ڈرو نہیں۔
 عباس: ہاں..... ہاں..... پی جاؤ۔
 نیلم: پی جاؤ۔
 جمیل: تم بھی پیو گے۔
 عباس: وقت ضائع نہ کرو جمیل۔
 نیلم: ڈرتے کیوں ہو۔
 جمیل: (گلاس میں سے ہر پیتا ہے۔ حلق میں غرغراہٹ پیدا ہوتی ہے۔ پھر
 کھانستا ہے)

نیلیم: بس اتنی سی بات تھی۔

عباس: بس اتنی سی بات تھی..... لاؤ گا اس مجھے دو..... شاہباش.....
ارے تمہارا رنگ اتنی جلدی زد کیوں ہو گیا..... ابھی تو زہر تمہارے اندر ٹھیک طور
سے اتر ابھی نہیں۔

نیلیم: گھبراؤ نہیں جمیل..... حوصلہ رکھو۔

عباس: حوصلہ،..... زہر پی کر یہ کس قسم کا حوصلہ کر سکتا ہے۔ لو دیکھو
..... مٹھیاں بچھنا شروع ہو گئیں۔
جمیل: عباس.....

عباس: عباس کو کیوں پکارتے ہو..... اس کا نام نہ لو ورنہ تمہاری جان اٹک
جائے گی۔

نیلیم: پریشان کیوں ہوتے ہو جمیل..... تم نہیں مرو گے۔
جمیل: نیلیم..... میں.....

عباس: (زور زور سے ہنستا ہے) بابا بابا..... بس پانچ منٹ میں تمہاری لاش
اس فرش پر ہوگی اور کلکیاں بجنھنا رہی ہوں گی۔ تمہارے اس منحوس چہرے پر جو
ابھی سے نیلا پڑ گیا ہے۔

جمیل: نیلا..... تم قاتل ہو..... تم میرے قاتل ہو..... میں شور مچانا شروع
کروں گا..... میں پلانا شروع کروں گا.....

عباس: کچھ فائدہ نہ ہوگا..... چیخنے اور پلانے سے جو کام تم کرنا چاہتے ہو وہ
میں خود کرنے والا ہوں..... اس گا اس کا باقی زہر ابھی میرے اندر چلا جائے

گا..... مگر تمہیں پہلے مرنا ہوگا..... تم میری جاننی کا تماشا نہیں دیکھو گے.....
 اس کا مزہ صرف میں لوں گا (ہنتا ہے) نیلم..... ذرا اس بہادر کی حالت تو دیکھو
 جس کی ٹھوکروں سے تمہیں پیار ہو گیا تھا (ہنتا ہے) بابا..... تم کانپ رہے
 ہو جمیل..... تمہارا رواں رواں کانپ رہا ہے..... زہر نے اپنا اثر دکھانا شروع
 کر دیا..... بس اب تم چند گھڑیوں کے مہمان ہو۔

جمیل: (دیوانہ وار) میں نہیں مرنا چاہتا..... میں نہیں مرنا چاہتا..... کوئی مجھے
 بچائے..... کوئی مجھے بچائے۔

عباس: شریف آدمیوں کی طرح جان دو جمیل..... یوں چپو چلاؤ نہیں.....
 موت بہت حساس ہوتی ہے۔
 جمیل: موت..... موت.....

نیلم: ڈرو نہیں، تم زندہ رہو گے۔

عباس: (ہنتا ہے) تم زندہ رہو گے اس لیے کہ تم اس عورت کے لیے اپنی
 جان دے رہے ہو (ہنتا ہے)..... تمہارا رنگ اب بالکل نیلا پڑ گیا ہے.....
 تمہارے ہونٹ خزاں دیدہ چٹوں کے مانند کانپ رہے ہیں..... تمہاری آنکھیں
 بلبلوں کی طرح ابل رہی ہیں (ہنتا ہے) بس اب تم چند گھڑیوں کے مہمان ہو
 کچھ کہنا ہو تو کہہ لو نیلم سے (ہنتا ہے) کتنا خوش ہوں..... (ہنتا ہے).....
 (قتلیوں کے درمیان جمیل دیوانہ وار چلاتا ہے۔ ”پانی پانی“ نیلم کہتی ہے۔
 ”تمہیں کیا ہو گیا ہے جمیل..... تم تو سچ مجھ مر رہے ہو۔“ عباس ہنتا رہتا ہے
 آخر میں دھڑام سے جمیل زمین پر گر پڑتا ہے.....

عباس: مر گیا..... لو اب میں چلا..... (اسی گلاس میں سے زہر پیتا ہے اور ہونٹ چاٹتا ہے)..... لوگ کہتے ہیں زہر کڑوا ہوتا ہے مگر یہ تو میٹھا تھا۔
 نیلم: جمیل..... جمیل..... جمیل..... عباس: جمیل تو جج مجھ مر گیا۔
 عباس: تو کیا جھوٹ موٹ کی موت مرتا..... نیلم اب اس کا ذکر نہ کرو جو مر کھپ چکا ہے۔ میرے ساتھ باتیں کرو جو ابھی مرانہیں ہے (ہنستا ہے) موت..... موت اور زندگی میں فرق ہی کیا ہے..... زندگی ایک نیند ہے جس میں آنکھیں کھلی رہتی ہیں اور موت ایسی بلند ہے جس میں آنکھیں بند رہتی ہیں۔
 نیلم: (آہ بھر کر) جمیل مر گیا۔

عباس: اور اب میری باری ہے..... ایک مرد جس سے تمہیں محبت تھی موت کی آغوش میں جا چکا ہے..... دوسرا جس کو تم سے محبت ہے جانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔

نیلم: تم غلط کہتے ہو..... مجھے جمیل سے محبت نہیں تھی۔

عباس: پھر کس سے تھی؟

نیلم: اس کی خشک باتوں سے..... تم لوگ اتنی معمولی سی بات کیوں نہیں سمجھتے..... بادلوں میں گھسے ہوئے لوگ کیا صاف آسمان کی خواہش نہیں کرتے..... برف کے تودوں میں دبی ہوئی چیزیں کیا سورج کی تپش کے لیے نہیں تڑپتیں..... زمین پر رہنے والے کیا تاروں کی طرف لپکتی ہوئی نظروں سے نہیں دیکھتے..... کیا فرشتوں نے آسمان چھوڑ کر زمین پر آنے کی غلطی نہیں کی..... شعروں کے نرم و نازک بستر سے نکل کر حقیقت کے پتھروں پر چلنے

پھرنے کی خواہش کیا دل میں پیدا نہیں ہو سکتی..... اور پھر نیلم تو ایک عورت ہے۔

عباس: عورتوں اور چڑیوں کا فلسفہ میری سمجھ سے ہمیشہ اونچا رہا ہے۔
 نیلم: اس لیے کہ تم شاعر زیادہ اور آدمی کم ہو..... عباس ہر شے کو شعریت کی نظروں سے دیکھو مگر عورت کو ہمیشہ اپنی آنکھوں سے دیکھو۔
 عباس: (ہنستا ہے) یہ دونوں آنکھیں اب موت ہمیشہ کے لیے میچ دے گی۔
 (حیرت سے) مگر اس زہر نے مجھ پر اثر کیوں نہیں کیا..... میں..... میں موت کو اپنے قریب محسوس کیوں نہیں کرتا..... میرا حلق بھی تو خشک نہیں ہوا..... میرا رنگ بھی ویسے کاویا ہے۔

نیلم: اس لیے کہ تم نے زہر نہیں پیا۔
 عباس: (حیرت سے) زہر نہیں پیا..... جمیل کیسے مر گیا؟
 نیلم: مر گیا..... اس کی ہوشیاری اور چالاکی اس کی مدد نہ کر سکی.....
 حالانکہ میں نے تم دونوں کو بچانے کے لیے کوشش کی تھی..... زہر کی پڑیا کے بجائے میں نے شکر کی پڑیا پڑی پھرتی سے تمہارے ہاتھ میں دے دی تھی۔
 عباس: پہلیاں بو جھنے کے فن سے میں بالکل کورا ہوں نیلم۔
 نیلم: اسی لیے تم مرے نہیں..... اگر جمیل نے زہر پیا ہوتا تو شاید وہ نہ مرتا۔ مگر شکر نے اس پر زہر کا کام کیا..... اب چھوڑو ان باتوں کو۔

(کھڑکی ہوا کے دباؤ سے کھل جاتی ہے۔ بارش کا شور سنائی دیتا ہے)
 نیلم: کھڑکی بند کرو عباس..... باہر رات کا اندھیرا ایسا محسوس ہوتا ہے گویا

ہمیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے..... ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جمیل کی روح
اس کالی بارش میں نہا رہی ہے..... اف یہ کالی رات کتنی بھیا تک
..... ہے

عباس: اتنی بھیا تک نہیں جتنا تمہارا سفید چہرہ ہے.....
(کھڑکی بند کر دیتا ہے)

تائنگے والے کا بھائی

سید غلام مرتضیٰ جیانی میرے دوست ہیں۔ میرے ہاں اکثر آتے ہیں
..... گھنٹوں بیٹھے رہتے ہیں کافی پڑھ لکھے ہیں۔

ان سے میں نے ایک روز کہا۔

”شاہ صاحب! آپ اپنی زندگی کا کوئی دلچسپ واقعہ تو سنائیے۔“

شاہ صاحب نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا..... ”منلو صاحب
میری زندگی دلچسپ واقعات سے بھری پڑی ہے..... کون سا واقعہ آپ کو
سناؤں۔“

میں نے ان سے کہا۔ ”جو بھی آپ کے ذہن میں آجائے۔“

شاہ صاحب مسکرائے..... ”آپ مجھے بڑا پرہیزگار آدمی سمجھتے ہوں گے
..... آپ کو معلوم نہیں میں نے دس برس تک دن رات شراب پی ہے اور خوب
کھل کھلا ہوں۔ اب چونکہ دل اچاٹ ہو گیا ہے اس لیے میں نے یہ شغل چھوڑ
رکھے ہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”کہیں آپ نے شادی تو نہیں کر لی۔“

”حضرت میں پانچ برس سے لاہور میں ہوں..... اگر میں نے شادی کی
ہوتی تو آپ کو اس کی اطلاع مل جاتی۔“

”تو کیا آپ ابھی تک کنوارے ہیں۔“

”جی ہاں.....“

”بڑے تعجب کی بات ہے۔“

شاہ صاحب نے ایک آہ بھری.....

”چلیے..... آپ کو ایک داستان سنا دوں..... آپ اسے لکھ کر اپنے پیسے کھرے کر بیچے گا۔“

مجھے پیسے کھرے کرنے تو تھے، پھر بھی میں نے ان سے کہا۔ ”نہیں شاہ صاحب..... آپ اپنی داستان سنائیے دیکھئے اس کا افسانہ بنتا بھی ہے کہ نہیں ویسے میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر میں نے آپ کی داستان کو افسانے میں ڈھال لیا تو مجھے جو معاوضہ ملے گا سب کا سب آپ کا ہوگا۔“

شاہ صاحب ہنسے.....

”چھوڑو ریار..... میں اپنی جیتی ہوئی زندگی کے ٹکڑوں کی قیمت وصول نہیں کرنا چاہتا..... تم افسانہ نگار لوگ عجیب ذہن کے ہوتے ہو۔ داستان سن لو..... باقی تم جانو..... مجھے معاوضے وغیرہ سے کوئی سروکار نہیں۔“

شاہ صاحب کے لب و لہجہ سے یہ صاف ظاہر تھا کہ انہیں میری بات پسند نہیں آئی اس لیے میں نے اس کے بارے میں مزید گفتگو کرنا مناسب نہ سمجھی اور ان سے کہا.....

”آپ اپنی داستان بیان کرنا شروع کر دیں۔“

شاہ صاحب نے میرے سگریٹ کیس سے سگریٹ نکال کر ساگایا.....

مجھے بڑا تعجب ہوا۔ اس لیے کہ میں نے انہیں چار پانچ برس کے عرصے میں کبھی سگریٹ پیتے نہیں دیکھا تھا..... میں نے اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے ان

سے کہا۔

”شاہ صاحب آپ سگریٹ پیتے ہیں۔“

شاہ صاحب کے ہونٹوں پر جن میں سگریٹ اڑکا ہوا تھا عجیب قسم کی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”منو صاحب! آپ نے اپنی زندگی میں اتنے سگریٹ نہیں پئے ہوں گے جتنے میں پی چکا ہوں۔۔۔۔۔ آج آپ نے ایسی بات چھیڑ دی کہ خود بخود میرے ہاتھ آپ کے سگریٹ کیس کی طرف اٹھ گئے۔۔۔۔۔ وہی ہے آپ کے پاس۔“

میں نے جواب دیا۔

”جی ہاں۔۔۔۔۔ ہے۔“

”تو!۔۔۔۔۔ ایک پٹیا لہ پیگ۔۔۔۔۔ میں دس برس کا رکھا ہوا روزہ توڑوں گا۔۔۔۔۔ تم نے آج ایسی باتیں کی ہیں کہ میرا سارا جسم ماضی میں چلا گیا ہے۔“

میں نے اچی الماری سے وہی کی بوتل نکالی اور شاہ صاحب کے لیے ایک پٹیا لہ پیگ بنا کر حاضر کر دیا انہوں نے ایک ہی جرے میں گلاس خالی کر دیا آستین سے ہونٹ صاف کرنے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ”ہاں تو اب کہانی سنو۔ لیکن یہ بوتل یہاں سے غائب کرو۔“

میں نے وہی کی بوتل اٹھائی اور اندر جا کر الماری میں رکھ دی واپس آیا تو دیکھا شاہ صاحب دوسرا سگریٹ سلاکارہے ہیں۔

میں کرسی اٹھا کر ان کے پاس بیٹھ گیا۔۔۔۔۔ وہ مسکرائے۔۔۔۔۔ لیکن وہ مسکراہٹ کچھ زخمی سی تھی۔۔۔۔۔ انہوں نے زخمی مسکراہٹ سے کہنا شروع کیا۔۔۔۔۔ ”جو واقعہ میں

اب بیان کرنے والا ہوں..... آج سے قریب قریب دس برس پہلے کا ہے.....
 ہمارا حلقہ احباب زیادہ تر کھاتے پیتے اور کافی مالدار ہندوؤں کا تھا..... بڑے
 اچھے لوگ تھے..... ہر روز پینے پلانے کا شغل رہتا..... اس حلقے میں مجھ سے علاوہ
 کئی اور دوستوں کو شراب کے علاوہ عورتوں کی بھی ضرورت محسوس ہوا کرتی..... وہ
 کسی نہ کسی طرح اپنی ضرورت پوری کرتے..... مجھ سے کہتے کہ تم بھی آؤ..... مگر
 میں انکار کر دیتا..... اپنی مرضی کے خلاف..... میرا دل ویسے چاہتا تھا کہ کسی عورت
 کی قربت نصیب ہو۔“

میں نے شاہ صاحب سے کہا۔

”آپ نے شادی کیوں نہ کر لی۔“

شاہ صاحب نے جواب دیا۔

”میں نے..... سچ پوچھو اس کے متعلق کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔“

”کیوں؟“

”بس کبھی خیال ہی نہ آیا۔“

”خیر..... آپ اپنی داستان جاری رکھیے۔“

شاہ صاحب نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں دبایا۔ ”پیارے منٹو! میں نے
 بہت کوشش کی کہ اپنے دوستوں کے ساتھ شراب نوشی کے سوا کسی اور شغل میں نہ
 پھنسوں..... لیکن ان کم بختوں نے آخر ایک دن مجھے آمادہ کر لیا۔ طے پایا کہ کسی
 دال کے ذریعہ سے خوش شکل لونڈیاں منگوائی جائے۔ ہم چار دوست فلیٹ سے باہر
 نکلے تو ایک تانگے والا جو کہ میرا واقف تھا۔“

مجھے دیکھ کر پکار اٹھا..... ”شاہ جی..... شاہ جی..... آؤ..... آؤ۔“
 ہم چاروں دوست اس کے تانگے پر بیٹھ گئے..... اس وقت میں پورا پورا قائل
 ہو چکا تھا کہ شراب کے ساتھ عورت ضرور ہونی چاہیے۔ چنانچہ میں نے اپنی ساری
 شرافت اپنی جیب میں ڈال کے اس کے کان میں کہا۔ کہ وہ کسی لونڈیا کا بندہ بست
 کر دے۔

جب اس نے یہ سنا تو وہ بھونچکا سا ہو کر رہ گیا..... اس کو یقین نہیں آتا تھا کہ
 میں کبھی ایسی وہابیات بات کروں گا۔ لیکن جب میں نے اس کے کان میں پھر
 کہا کہ مجھے واقعی ایک لڑکی کی اشد ضرورت ہے تو اس نے بڑے ادب سے کہا۔
 ”شاہ جی تمہیں جو حکم دیو..... بندہ حاضر اے..... ایسی ٹکڑی کواری کڑی لے
 کے آؤاں گا کہ ساری عمر یاد رکھو گے۔“

تانگے والا چلا گیا اور ہم واپس اپنے فلیٹ میں آ گئے شام کا وقت تھا جب وہ یہ
 مہم سر کرنے کے لیے گیا تھا..... ہم دیر تک انتظار کرتے رہے طرح طرح کے
 خیالات میرے دل میں آتے تھے وہ کواری لڑکی کس قسم کی ہوگی کہیں کوئی بازاری
 عورت تو نہ نکل آئے۔

ہم جب انتظار کرتے کرتے تھک گئے تو تاش کھیلنا شروع کر دی۔ رات کے
 بارہ بج گئے..... ہم مایوس ہو کر باہر نکلتے تے دیکھا کہ تانگے والا گھوڑے کے چابک
 لگاتا چلا آ رہا ہے۔ کچھلی نشست پر ایک برقع پوش عورت بیٹھی تھی..... میرا دل
 دھک دھک کرنے لگا۔

تانگے والے نے مجھ سے کہا۔

”شاہ جی جو مال میں لینے گیا تھا وہ وسا و رچا گیا ہے..... اب یہ دوسرا مال بڑی کوششوں سے ڈھونڈ کر لایا ہوں۔“

میں نے اس کو پانچ روپے دیئے۔ پھر ہم چاروں دوست سوچنے لگے کہ اس برقع پوش عورت کو کہاں لے جائیں..... اپنے قلیں میں لے جانا ٹھیک نہیں تھا اس لیے کہ محلہ داری تھی..... لوگ چہ میگوئیاں کرتے۔ بات کا بنگلہ بن جاتا..... خواہ مخواہ ایک فحشیتا ہو جاتا..... چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا کہ اپنے دوست رحمان کے پاس چلے۔

رات کے ایک بجے کے قریب ہم اس برقع پوش عورت کے ہمراہ رحمان کے مکان پر پہنچے۔ بہت دیر تک دست دینے کے بعد اس نے دروازہ کھولا کمبل اوڑھے تھا اسے غائب بنا رکھا۔

میں نے اس کو ساری بات دہی زبان میں بتائی تو اس نے بھی دہی زبان ہی میں کہا۔

”شاہ جی..... آپ کو کیا ہو گیا ہے..... میرا مکان حاضر ہے لیکن آپ کو معلوم نہیں کہ اس مہینے کی بیس تاریخ کو میری شادی ہونے والی ہے..... میرا سالا اندر ہے..... اس کی موجودگی میں یہ سلسلہ جو آپ چاہتے ہیں کیسے ہو سکتا ہے۔“

کچھ دیر..... میری سمجھ میں نہ آیا اس سے کیا کہوں..... لیکن جھوڑے سے توقف کے بعد میں نے اس کو ڈانٹا۔

”یا تم نرے کھر بے بے وقوف ہو..... اپنے سالے کو چتا کرو..... ہم اتنی دور سے تمہارے پاس آئے ہیں..... کیا تم میں اتنی مروت بھی باقی نہیں رہی.....“

میں تاریخ کو تمہاری شادی آ رہی ہے ٹھیک ہے..... لیکن آج میری شادی ہے.....
یہ میری دہن برق پہنے تانگے میں بیٹھی ہے..... تمہیں اپنے دوستوں کا کچھ تو
خیال آنا چاہیے۔“

رحمان کو میری حالت پر کچھ ترس آ گیا..... چنانچہ اس نے اپنے سالے کو جگایا
اور اس کو اپنے بخار کے لیے کوئی ضروری دوا لینے کے لیے باہر بھیج دیا شہر میں
قریب قریب کیسٹوں کی سب دکانیں بند تھیں لیکن اس نے اپنے سالے سے کہا۔
”سارے شہر کی دکانیں دیکھو جہاں سے بھی تمہیں یہ دوا ملے کر آؤ۔“
لڑکا بر خور دار قسم کا تھا نسخہ لے کے آنکھیں ملاتا چلا گیا اس غریب کو تانگہ بھی
شاید نظر نہ آیا..... جس میں برق پوش عورت بیٹھی تھی۔

میں نے سوچا..... کہ جہوم ٹھیک نہیں ہوگا..... معلوم نہیں میرے دوست کیا
حرکتیں کریں۔ چنانچہ میں نے ان کو کسی نہ کسی طرح آمادہ کر لیا کہ وہ تانگے میں
واپس ہو جائیں۔ پانچ روپے تانگے والے کو اور دے دیئے مگر اس نے برق پوش
سواری اتاری تو کہا۔

”حضور اس کی فیس تو دیتے جائیے.....“

میں نے پوچھا کتنی ہے۔

”پچیس روپے۔“

میں نے جیب سے نوٹ نکالے اور گن کر پانچ پانچ کے پانچ نوٹ اس کے
حوالے کر دیئے اور اس برق پوش عورت کو اپنے دوست کے مکان میں لے آیا۔
رحمان کو بخار تھا..... وہ علیحدہ کمرہ میں جا کر لیٹ گیا۔ میں بہت دیر تک اس

برقع پوش عورت سے گفتگو کرتا رہا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور نہ اپنے چہرے سے نقاب ہی ہٹایا۔

میں تنک آ گیا۔

اس کو ٹھوٹا..... تو وہ بالکل سپاٹ تھی..... آخر میں نے زبردستی اس کا برقع الٹ دیا۔

میری حیرت کی انتہا نہ رہی..... جب دیکھا کہ وہ عورت نہیں..... پہچانہ تھا.....
نہایت مکروہ قسم کا.....

مجھے سخت غصہ آیا..... میں نے اس سے پوچھا۔

”یہ کیا اہیات پن ہے۔“

اس پہچڑے نے جس کے چہرے پر روؤں کا نیلا نیلا غبار موجود تھا بڑے نسوانی انداز میں جواب دیا۔

”میں..... میں تانگے والے کا بھائی ہوں۔“

شاہ صاحب نے اس کے بعد مجھ سے کہا۔

”منو صاحب اس دن کے بعد مجھے اس سلسلے سے کوئی رغبت نہیں رہی۔“



میں سوچ رہا تھا۔

دنیا کی سب سے پہلی عورت جب ماں بنی تو کائنات کا ردِ عمل کیا تھا؟
دنیا کے سب سے پہلے مرد نے کیا آسمانوں کی طرف تہمتانی آنکھوں سے دیکھ
کر دنیا کی سب سے پہلی زبان میں بڑے فخر کے ساتھ یہ نہیں کہا تھا۔ ”میں بھی
خالق ہوں۔“

ٹیلی فون کی گھنٹی بجنا شروع ہوئی۔ میرے آوارہ خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔
بالکنی سے اٹھ کر میں اندر کمرے میں آیا۔ ٹیلی فون ضدی بچے کی طرح چلائے جا
رہا تھا۔

ٹیلی فون بڑی مفید چیز ہے، مگر مجھے اس سے نفرت ہے۔ اس لیے کہ یہ وقت
بے وقت بننے لگتا ہے..... چنانچہ بہت ہی بددلی سے میں نے ریسپورڈ اٹھایا اور نمبر
بتایا ”فور فور فائیو سیون“

”دوسرے سرے سے بلو بلاو شروع ہوئی میں جھنجھلا گیا۔ ”کون ہے؟“

جواب ملا۔ ”آیا۔“

میں نے آیاؤں کے طرزِ گفتگو میں پوچھا۔ ”کس کو مانگتا ہے؟“

”میم صاحب ہے۔“

”ہے..... تجھرو۔“

ٹیلی فون کا ریسپورڈ ایک طرف رکھ کر میں نے اپنی بیوی کو جو غائبانہ اندر سو رہی

تھی، آواز دی۔ ”میم صاحب..... میم صاحب۔“

آواز سن کر میری بیوی اٹھی اور جمائیاں لیتی ہوئی آئی۔ ”یہ کیا مذاق ہے.....“

میم صاحب، میم صاحب!“

میں نے مسکرا کر کہا۔ ”میم صاحب ٹھیک ہے..... یاد ہے تم نے اپنی پہلی آیا سے کہا تھا کہ مجھے میم صاحب کے بدلے نیگم صاحبہ کہا کرو تو اس نے نیگم صاحبہ بیگن صاحبہ بنا دیا تھا۔“

ایک مسکراتی ہوئی جمائی لے کر میری بیوی نے پوچھا۔ ”کون ہے؟“

”دریافت کر لو۔“

میری بیوی نے ٹیلی فون اٹھایا اور بلو بلا شروع کر دیا..... میں باہر بالکنی میں چلا گیا..... عورتیں ٹیلی فون کے معاملے میں بہت لمبی ہوتی ہیں۔ چنانچہ پندرہ بیس منٹ تک بلو ہوتا رہا۔

میں سوچ رہا تھا۔

ٹیلی فون پر ہر دو تین الفاظ کے بعد بلو کیوں کہا جاتا ہے؟

کیا اس بلو بلو کے عتب میں احساس کمتری تو نہیں؟..... بار بار بلو صرف اسے کرنی چاہیے جسے اس بات کا اندیشہ ہو کہ اس کی ہمل گفتگو سے ٹک آ کر سننے والا ٹیلی فون چھوڑ دے گا..... یا ہو سکتا ہے یہ محض عادت ہو۔

دفعتاً میری بیوی گھبرائی ہوئی آئی۔ ”سعادت صاحب! اس دفعہ معاملہ بہت ہی سیریس معلوم ہوتا ہے۔“

”کون سا معاملہ۔“

معاملے کی نوعیت بتائے بغیر میری بیوی نے کہنا شروع کر دیا۔ ”بات بڑھتے
بڑھتے طاقت تک پہنچ گئی ہے۔۔۔۔۔ پاگل پن کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔۔۔۔۔ میں شرط
لگانے کے لیے تیار ہوں کہ بات کچھ بھی نہیں ہوگی۔ بس پھسری کا بھنگدر بنا ہوگا
۔۔۔۔۔ دونوں سر پھرے ہیں۔“

”اجی حضرت کون؟“

”میں نے بتایا نہیں آپ کو؟۔۔۔۔۔ اوہ۔۔۔۔۔ ٹیلی فون طاہرہ کا تھا۔“

”طاہرہ۔۔۔۔۔ کون طاہرہ؟“

”مسز یزدانی۔“

”اوہ!“ میں سارا معاملہ سمجھ گیا۔ ”کوئی نیا جھڑا ہوا ہے؟“

”نیا اور بہت بڑا۔۔۔۔۔ جانیے یزدانی آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“

”مجھ سے کیا بات کرنا چاہتا ہے؟“

”معلوم نہیں۔۔۔۔۔ طاہرہ سے ٹیلی فون چھین کر مجھ سے فقط یہ کہا۔ بھائی جان!

ڈرامٹو صاحب کو بلائیے۔“

”خواہ مخواہ میرا مقرر چالے گا۔“ یہ کہہ کر میں اٹھا اور ٹیلی فون پر یزدانی سے

مخاطب ہوا۔

اس نے صرف اتنا کہا۔ ”معاملہ بے حد نازک ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ تم اور بھائی جان

ٹیکسی میں فوراً یہاں آ جاؤ۔“

میں اور میری بیوی جلدی جلدی کپڑے تبدیل کر کے یزدانی کی طرف روانہ

ہو گئے۔۔۔۔۔ راستے میں ہم دونوں نے یزدانی اور طاہرہ کے متعلق بے شمار باتیں

کیں۔

طاہرہ ایک مشہور عشق پیشہ موسیقار کی خوبصورت لڑکی تھی۔ عطایز دانی ایک پٹھان آرٹسٹ کا لڑکا تھا۔ پہلے شاعری شروع کی، پھر ڈرامہ نگاری، اس کے بعد آہستہ آہستہ فلمی کہانیاں لکھنے لگا۔ طاہرہ کا باپ اپنے آنکھوں میں مشغول تھا اور عطایز دانی علامہ مشرقی کی خاکسار تحریک کے لیے ”ہیلپ“ نامی ڈرامہ لکھنے میں۔ ایک شام پریڈ کرتے ہوئے عطایز دانی کی آنکھیں طاہرہ کی آنکھوں سے چار ہوئیں۔ ساری رات جاگ کر اس نے ایک خط لکھا اور طاہرہ تک پہنچا دیا۔ چند ماہ تک دونوں میں نامہ و پیام جاری رہا اور آخر کو دونوں کی شادی بغیر کسی حیل و حجت ہو گئی۔ عطایز دانی کو اس بات کا افسوس تھا کہ ان کا عشق ڈرامے سے محروم رہا۔

طاہرہ بھی طبعاً ڈرامہ پسند تھی۔ عشق اور شادی سے پہلے سہیلیوں کے ساتھ باہر شو پنگ کو جاتی تو ان کے لیے مصیبت بن جاتی۔ گئے آدمی کو دیکھتے ہی اس کے ہاتھوں میں کھلی شروع ہو جاتی۔ ”میں اس کے سر پر ایک دھول تو ضرور جماؤں گی، چاہے تم کچھ ہی کرو۔“

ذہین تھی۔ ایک دفعہ اس کے پاس کوہی بیچی کوٹ نہیں تھا۔ اس نے کمرے کے گرد و آوارہ بند باندھا اور اس میں ساڑھی اڑس کر سہیلیوں کے ساتھ چل دی۔ کیا طاہرہ واقعی عطایز دانی کے عشق میں مبتلا ہوئی تھی؟ اس کے متعلق وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ یزدانی کا پہلا عشقیہ خط ملنے پر اس کا رد عمل غالباً یہ تھا کہ کھیل دلچسپ ہے کیا برج ہے کھیل لیا جائے۔ شادی پر بھی اس کا رد عمل کچھ

اسی قسم کا تھا۔ یوں تو مضبوط کردار کی لڑکی تھی، یعنی جہاں تک باعصمت ہونے کا تعلق ہے لیکن کھلنڈری اور یہ جو آئے دن اس کا اپنے شوہر کے ساتھ لڑائی جھگڑا ہوتا تھا، میں سمجھتا ہوں ایک کھیل ہی تھا لیکن جب ہم وہاں پہنچے اور حالات دیکھے تو معلوم ہوا کہ یہ کھیل بڑی خطرناک صورت اختیار کر گیا تھا۔

ہمارے داخل ہوتے ہی وہ شور برپا ہوا کہ سمجھ میں نہ آیا۔ طاہرہ اور یزدانی دونوں اونچے اونچے سروں میں بولنے لگے۔ گئے، شکوے، طعنے مہنے، پرانے مردوں پر نئی لاشیں، نئی لاشوں پر پرانے مردے۔۔۔۔۔ جب دونوں تھک گئے تو آہستہ آہستہ لڑائی کی نوک پلک نکلنے لگی۔

طاہرہ کو شکایت تھی کہ عطا اسٹوڈیو کی ایک واپسات ایکٹرس کو جیکبوں میں لیے لیے پھرتا ہے۔

یزدانی کا بیان تھا یہ سراسر بہتان ہے۔

طاہرہ قرآن اٹھانے کے لیے تیار تھی کہ عطا کا اس ایکٹرس سے ناجائز تعلق ہے۔ جب وہ صاف انکاری ہوا تو طاہرہ نے بڑی تیزی کے ساتھ کہا۔ ”کتنے پارسا بنتے ہو۔۔۔۔۔ یہ آیا جو کھڑی ہے۔ کیا تم نے اسے چومنے کی کوشش نہیں کی تھی۔۔۔۔۔ وہ تو میں اوپر سے آگئی۔“

یزدانی گر جا۔ ”بکو اس بند کرو۔“

اس کے بعد پھر وہی شور برپا ہو گیا۔

میں نے سمجھایا۔ میری بیوی نے سمجھایا مگر کوئی اثر نہ ہوا۔ عطا کو تو میں نے ڈانٹا بھی۔ ”زیادتی سراسر تمہاری ہے۔۔۔۔۔ معافی مانگو اور یہ قصہ ختم کرو۔“

عطا نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ ”سعادت یہ قصہ یوں ختم نہیں ہوگا۔۔۔۔۔۔ میرے متعلق یہ عورت بہت کچھ کہہ چکی ہے، لیکن میں نے اس کے متعلق ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا۔۔۔۔۔۔ عنایت کو جانتے ہو تم؟“

”عنایت؟“

”پلے بیک ٹکر۔۔۔۔۔۔ اس کے باپ کا شاگرد!“

”ہاں۔۔۔۔۔۔ ہاں۔“

”اول درجے کا چھٹا ہوا بد معاش ہے۔۔۔۔۔۔ مگر یہ عورت ہر روز اسے یہاں بلاتی ہے۔۔۔۔۔۔ بہانہ یہ ہے کہ۔۔۔۔۔۔“

طاہرہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”بہانہ وہاں کچھ نہیں۔۔۔۔۔۔ بولو، تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“

عطا نے اتنی نفرت کے ساتھ کہا۔ ”کچھ نہیں۔“

طاہرہ نے اپنے ماتھے پر بالوں کی جھال ایک طرف ہٹائی۔ ”عنایت میرا چاہنے والا ہے۔۔۔۔۔۔ بس۔۔۔۔۔۔“

عطا نے گالی دی۔۔۔۔۔۔ عنایت کو موٹی اور طاہرہ کو چھوٹی۔۔۔۔۔۔ پھر شور مچا رہا ہو گیا۔

ایک بار پھر وہی کچھ دہرایا گیا جو پہلے کئی بار کہا جا چکا تھا۔۔۔۔۔۔ میں نے اور میری بیوی نے بہت تالشی کی مگر نتیجہ وہی صفر۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے عطا اور طاہرہ دونوں اپنے جھگڑے سے مطمئن نہیں۔ لڑائی کے شعلے ایک دم بھڑکتے تھے اور کوئی مرنی نتیجہ پیدا کیے بغیر ٹھنڈے ہو جاتے تھے۔ پھر بھڑکائے جاتے تھے لیکن ہوتا

ہوا تا کچھ نہیں تھا۔

میں بہت دیر تک سوچتا رہا کہ عطا اور طاہرہ چاہتے کیا ہیں مگر کسی نیچے پر نہ پہنچ سکا..... مجھے بڑی الجھن ہو رہی تھی۔ دو گھنٹے سے بک بک اور جھک جھک جاری تھی لیکن انجام خدا معلوم کہاں بھٹک رہا تھا۔ تنگ آ کر میں نے کہا۔ ”بھئی اگر تم دونوں کی آپس میں نہیں سمجھ سکتی تو بہتر یہی ہے کہ علیحدہ ہو جاؤ۔“

طاہرہ خاموش رہی لیکن عطا نے چند لمحات غور کرنے کے بعد کہا۔ ”علیحدگی نہیں..... طلاق۔“

طاہرہ چلائی۔ ”طلاق، طلاق، طلاق..... دیتے کیوں نہیں طلاق..... میں کب تمہارے پاؤں پڑی ہوں کہ طلاق نہ دو۔“

عطا نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”وے دوں گا اور بہت جلد۔“
طاہرہ نے اپنے ماتھے پر سے بالوں کی جھالر ایک طرف ہٹائی۔ ”آج ہی دو۔“

عطا اٹھ کر ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔ ”میں قاضی سے بات کرتا ہوں۔“
جب میں نے دیکھا کہ معاملہ بگڑ رہا ہے تو اٹھ کر عطا کو روکا۔ ”بے وقوف نہ بنو..... بیٹھو آرام سے۔“

طاہرہ نے کہا۔ ”نہیں بھائی جان! آپ مت روکیے۔“
میری بیوی نے طاہرہ کو ڈانٹا۔ ”یکواس بند کرو۔“
”یہ یکواس صرف طلاق ہی سے بند ہوگی۔“ یہ کہہ کر طاہرہ ٹانگ ہلانے لگی۔
”سن لیا تم نے۔“ عطا مجھ سے مخاطب ہو کر پھر ٹیلی فون کی طرف بڑھا لیکن

میں درمیان میں کھڑا ہو گیا۔

طاہرہ میری بیوی سے مخاطب ہوئی۔ ”مجھے طلاق دے کر اس چڑوائی کے پاس سے بیاہ رہ جائے گا۔“

عطا نے طاہرہ سے پوچھا۔ ”اور تو؟“

طاہرہ نے ماتھے پر بالوں کے پسینے میں بھیگی ہوئی جھال رہا تھا سے اوپر کی۔
”میں..... تمہارے اس یوسف ثانی عنایت خاں سے۔“

”بس اب پانی سر سے گزر چکا ہے..... حد ہو گئی ہے..... تم ہٹ جاؤ ایک طرف۔“ عطا نے ڈائریکٹری اٹھائی اور نمبر دیکھنے لگا۔ جب وہ نیلی فون کرنے لگا تو میں نے اسے روکنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے ایک دو مرتبہ ڈائل کیا لیکن نمبر نہ ملا۔ مجھے موقع ملا تو میں نے سارے پرزور الفاظ میں کہا کہ اپنے ارادے سے باز رہے۔ میری بیوی نے بھی اس سے درخواست کی مگر وہ نہ مانا۔ اس پر طاہرہ نے کہا۔ ”صفیہ! تم کچھ نہ کہو..... اس آدمی کے پہلو میں دل نہیں پتھر ہے..... میں تمہیں وہ خط دکھاؤں گی جو شادی سے پہلے اس نے مجھے لکھے تھے..... اس وقت میں اس کے دل کا قراں اس کی آنکھوں کا نور تھی۔ میری زبان سے نکلا ہوا صرف ایک لفظ اس کے تن مردہ میں جان ڈالنے کے لیے کافی تھا..... میرے چہرے کی صرف ایک جھلک دیکھ کر یہ بخوشی مرنے کے لیے تیار تھا..... لیکن آج اسے میری ذرہ برابر پرواہ نہیں۔“

عطا نے ایک بار پھر نمبر ملانے کی کوشش کی۔

طاہرہ بولتی رہی۔ ”میرے باپ کی موتی جی سے بھی اسے عشق تھا..... اس کو

نخر تھا کہ اتنا بڑا آرٹسٹ مجھے اپنی دامادی میں قبول کر رہا ہے۔ شادی کی منظوری حاصل کرنے کے لیے اس نے ان کے پاؤں تک دالے، پر آج اسے ان کا کوئی خیال نہیں۔“

عطا ڈائل گھماتا رہا۔

طاہرہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ”آپ کو یہ بھائی کہتا ہے، آپ کی عزت کرتا ہے..... کہتا تھا جو کچھ بھائی جان کہیں گے میں مانوں گا..... لیکن آپ دیکھ رہے ہیں۔ ٹیلی فون کر رہا ہے قاضی کو..... مجھے طلاق دینے کے لیے۔“
میں نے ٹیلی فون ایک طرف ہٹا دیا۔ ”عطا! اب چھوڑو بھی۔“
”نہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے ٹیلی فون اپنی طرف گھسیٹ لیا۔
طاہرہ بولی۔ ”جائے دیجیے بھائی جان..... اس کے دل میں میرا کیا۔ ٹوٹو کا بھی کچھ خیال نہیں۔“

عطا تیزی سے پلانا۔ ”نام نہ لو ٹوٹو کا۔“

طاہرہ نے نتھنہ پھلا کر کہا۔ ”کیوں نام نہ لوں اس کا۔“

عطا نے ریسیور رکھ دیا۔ ”وہ میرا ہے۔“

طاہرہ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ ”جب میں تمہاری نہیں ہوں تو وہ کیسے تمہارا ہو سکتا ہے..... تم تو اس کا نام بھی نہیں لے سکتے۔“

عطا نے کچھ دیر سوچا۔ ”میں سب بندہ بست کر لوں گا۔“

طاہرہ کے چہرے پر ایک دم زردی چھا گئی۔ ”ٹوٹو کو چھین لو گے مجھ سے؟“

عطا نے بڑے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ”ہاں“

”ظالم۔“

ظاہرہ کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ بے ہوش ہو کر گرنے ہی والی تھی کہ میری بیوی نے اسے تھام لیا۔ عطا پریشان ہو گیا پانی کے چھینٹے یو ڈی کلون، سملنگ سالٹ۔ ڈاکٹروں کو ٹیلیفون..... اپنے بال نوج ڈالے، میض پھاڑ ڈالی..... ظاہرہ ہوش میں آئی تو وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تھپکنے لگا۔ ”جانم ٹو تمہارا ہے۔“

ظاہرہ نے رونا شروع کر دیا۔ ”نہیں وہ تمہارا ہے۔“
عطا نے ظاہرہ کی آنسوؤں بھری آنکھوں کو چومنا شروع کر دیا۔ ”میں تمہارا ہوں۔ تم میری ہو..... ٹو تمہارا بھی ہے، میرا بھی ہے۔“
میں نے اپنی بیوی کو اشارہ کیا۔ وہ باہر نکلی تو میں بھی جھوڑی دیہ کے بعد چل دیا..... ٹیکسی کھڑی تھی، ہم دونوں بیٹھ گئے میری بیوی مسکرا رہی تھی میں نے اس سے پوچھا ”یو ٹو کون ہے؟“

میری بیوی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ”ان کا لڑکا۔“
میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”لڑکا؟“
میری بیوی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
میں نے اور زیادہ حیرت سے پوچھا۔ ”کب پیدا ہوا تھا..... میرا مطلب ہے.....“

”ابھی پیدا نہیں ہوا..... چوتھے مہینے میں ہے۔“
چوتھے مہینے، یعنی اس واقعے کے چار مہینے بعد، میں باہر بالکنی میں بالکل خالی

الذہن بیٹھا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنا شروع ہوئی۔ بڑی بے دلی سے اٹھنے والا تھا کہ آواز بند ہو گئی۔ جموڑی دیر کے بعد میری بیوی آئی۔ میں نے اس سے پوچھا۔
”کون تھا؟“

”یزدانی صاحب۔“

”کوئی نئی لڑائی تھی؟“

”نہیں..... طاہرہ کے لڑکی ہوئی ہے..... مری ہوئی۔“ یہ کہہ کر وہ روتی ہوئی اندر چلی گئی۔

میں سوچنے لگا۔ ”اگر طاہرہ اور عطا کا جھگڑا ہوا تو اسے کون ٹوٹو چکائے گا۔“

ٹھنڈا گوشت

ایشرنگھ جو نبی ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوا، کلونٹ کور پلنگ پر سے اٹھی۔ اپنی تیز تیز آنکھوں سے اس کی طرف گھور کے دیکھا اور دروازے کی چٹختی بند کر دی۔ رات کے بارہ بج چکے تھے، شہر کا مضافات ایک عجیب پر اسرار خاموشی میں غرق تھا۔

کلونٹ کور پلنگ پر آلتی پارٹی مار کر بیٹھ گئی۔ ایشرنگھ جو غالباً اپنے پرانے خیالات کے الجھے ہوئے دماغ کے کھول رہا تھا۔ ہاتھ میں کرپان لیے ایک کونے میں کھڑا تھا۔ چند لمحات اسی طرح خاموشی میں گزر گئے۔ کلونٹ کور کو جموڑی دیر کے بعد اپنا آسن پسند نہ آیا اور دونوں ٹانگیں پلنگ سے نیچے لٹکا کر ہلانے لگی۔ ایشرنگھ پھر بھی کچھ نہ بولا۔

کلونٹ کور بھرے بھرے ہاتھ پیروں والی عورت تھی۔ چوڑے چپکے کولہے، تھل تھل کرنے والے گوشت سے بھرپور، کچھ بہت ہی زیادہ اوپر کواٹھا ہوا سینہ، تیز آنکھیں، بالائی ہونٹ پر بالوں کا سرمئی غبار، ٹھوڑی کی ساخت سے پتہ چلتا تھا کہ بڑے دھڑلے کی عورت ہے۔

ایشرنگھ گومر نیوڑھائے ایک کونے میں چپ چاپ کھڑا تھا۔ سر پر اس کی کس کر باندھی ہوئی پلائی ڈھیلی ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ جو کرپان تھامے ہوئے تھے۔ جموڑے جموڑے لرزاں تھے۔ مگر اس کے قد و قامت اور خد و خال سے پتہ چلتا تھا کہ کلونٹ کور جیسی عورت کے لیے موزوں ترین مرد ہے۔

چند اور لمحات جب اسی طرح خاموشی سے گزر گئے تو کلونت کور چٹک پر پی۔
 لیکن تیز تیز آنکھوں کو نیچا کر وہ صرف اسی قدر کہہ سکی۔ ”ایشرسیاں۔“
 ایشر سنگھ نے گردن اٹھا کر کلونت کور کی طرف دیکھا، مگر اس کی نگاہوں کی
 گولیوں کی تاب نہ لا کر منہ دوسری طرف موڑ لیا۔
 کلونت کور چلائی۔ ”ایشرسیاں“ لیکن فوراً ہی آواز بجھتی لی اور پلنگ پر سے اٹھ
 کر اس کی جانب جاتے ہوئے بولی۔ ”کہاں رہے تم اتنے دن؟“
 ایشر سنگھ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ”مجھے معلوم نہیں۔“
 کلونت کور بھٹائی۔ ”یہ بھی کوئی ماں یا جواب ہے؟“
 ایشر سنگھ نے کرپان ایک طرف پھینک دی اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ ایسا معلوم
 ہوتا تھا کہ وہ کئی دنوں کا بیمار ہے۔ کلونت کور نے پلنگ کی طرف دیکھا۔ جواب ایشر
 سنگھ سے لہلہا بھرا تھا۔ اس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ اس
 کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اس نے بڑے پیار سے پوچھا۔ ”جانی کیا ہوا ہے تمہیں؟“
 ایشر سنگھ چھت کی طرف دیکھ رہا تھا، اس سے نگاہیں ہٹا کر اس نے کلونت کور
 کے مانوس چہرے کو ٹوٹنا شروع کیا۔ ”کلونت!“
 آواز میں درد تھا۔ کلونت کور ساری کی ساری سمٹ کر اپنے بالائی ہونٹ میں آ
 گئی۔ ”ہاں جانی،“ کہہ کر وہ اس کو دانتوں سے کاٹنے لگی۔
 ایشر سنگھ نے پگڑی اتار دی۔ کلونت کور کی طرف سہارا لینے والی نگاہوں سے
 دیکھا، اس کے گوشت بھرے کولے پر زرزر سے دھپا مارا اور سر کو جھٹکا دے کر اپنے
 آپ سے کہا۔ ”یہ کڑی یا دماغ ہی خراب ہے۔“

جھٹکا دینے سے اس کے کیس کھل گئے۔ کلونت کور انگلیوں سے ان میں کنگھی کرنے لگی۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے بڑے پیار سے پوچھا۔ ”ایشریاں کہاں رہے تم اتنے دن۔“

”برے کی ماں کے گھر۔“ ایشرنگھ نے کلونت کور کو گھور کے دیکھا اور ذہناً دونوں ہاتھوں سے اس کے ابھرے ہوئے سینے کو مسلنے لگا۔ ”قسم وا بگورو کی بڑی جاندار عورت ہو۔“

کلونت کور نے ایک اوا کے ساتھ ایشرنگھ کے ہاتھ ایک طرف جھٹک دینے اور پوچھا۔ ”تمہیں میری قسم بتاؤ، کہاں رہے؟ شہر گئے تھے؟“

ایشرنگھ نے ایک ہی لپیٹ میں اپنے بالوں کا جوڑا ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

”نہیں۔“

کلونت کور چہ گئی۔ ”نہیں تم ضرور شہر گئے تھے..... اور تم نے بہت سا روپیہ لوٹا ہے جو حج سے چھپا رہے ہو۔“

”وہ اپنے باپ کا تخم نہ ہو جو تم سے جھوٹ بولے۔“

کلونت کور تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئی، لیکن فوراً ہی بھڑک اٹھی۔ ”لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا، اس رات تمہیں ہوا کیا؟ اچھے بھلے میرے ساتھ لیئے تھے، مجھے تم نے وہ تمام گہنے پہنا رکھے تھے جو تم شہر سے لوٹ کے لائے تھے۔ میری بھینیاں لے رہے تھے، پر جانے ایک دم تمہیں کیا ہوا، اٹھے اور کپڑے پہن کر باہر نکل گئے۔“

ایشرنگھ کا رنگ زرد ہو گیا۔ کلونت کور نے یہ تبدیلی دیکھتے ہی کہا۔ ”دیکھا کیسے

رنگ نیا پڑ گیا..... ایشریاں، قسم وا بگورو کی ہنرور کچھ وال میں کالا ہے؟“
 ”تیری جان کی قسم کچھ بھی نہیں۔“

ایشر سنگھ کی آواز بے جان تھی۔ کلونت کور کا شبہ اور زیادہ مضبوط ہو گیا، بالائی
 ہونٹ بھیچ کر اس نے ایک ایک لفظ زور دیتے ہوئے کہا۔ ”ایشریاں، کیا بات
 ہے تم وہ نہیں ہو جو آج سے آٹھ روز پہلے تھے؟“

ایشر سنگھ ایک دم اٹھ بیٹھا جیسے کیس نے اس پر حملہ کیا تھا۔ کلونت کور کو اپنے تنو
 مند بازوؤں میں سمیٹ کر اس نے پوری قوت کے ساتھ اسے بھنچوڑنا شروع کر
 دیا۔ ”جانی میں وہی ہوں..... گھٹ گھٹ پاتھیاں، تیری نکلے پڈاں دی گرمی
“

کلونت کور نے کوئی مزاحمت نہ کی لیکن وہ شکایت کرتی رہی۔ ”تمہیں اس
 رات ہو کیا گیا تھا؟“

”برے کی ماں کا وہ ہو گیا تھا۔“

”بتاؤ گے نہیں؟“

”کوئی بات ہو تو بتاؤں۔“

مجھے اپنے ہاتھوں سے جلاؤ اگر جھوٹ بولو۔

ایشر سنگھ نے اپنے بازو اس کی گردن میں ڈال دیئے اور ہونٹ اس کے
 ہونٹوں میں گاڑ دیئے۔ مونچھوں کے بال کلونت کور کے نتھنوں میں گھسے تو اسے
 چمینک آ گئی۔ دونوں ہنسنے لگے۔

ایشر سنگھ نے اپنی صدری اتار دی اور کلونت کور کو شہوت بھری نظروں سے دیکھ

چوس چوس کر اس کا سارا سینہ جھوکوں سے لتھیر دیا۔ کلونت کور تپو آنچ پر چڑھی ہوئی بانڈی کی طرح ابلنے لگی۔ لیکن ایشر سنگھ ان تمام حیلوں کے باوجود خود میں حرارت پیدا نہ کر سکا۔ جتنے گر اور جتنے داؤ اسے یاد تھے سب کے سب اس نے پٹ جانے والے پہلو ان کی طرح استعمال کر دیئے۔ پر کوئی کارگر نہ ہوا۔ کلونت کور نے جس کے بدن کے سارے تار تن کر خود بخود بج رہے تھے۔ غیر ضروری چیخڑ چھاڑ سے تنگ آ کر کہا۔ ”ایشرسیاں، کافی پھیٹ چکا ہے، اب پتا بھینک۔“

یہ سنتے ہی ایشر سنگھ کے ہاتھ سے جیسے تاش کی ساری گڈی نیچے پھسل گئی۔ ہانپتا ہوا وہ کلونت کور کے پہلے میں لیٹ گیا اور اس کے ماتھے پر سرد پینے کے لیپ ہونے لگے۔ کلونت کور نے اسے گرمانے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہی، اب تک سب کچھ منہ سے کہے بغیر ہوتا رہا تھا لیکن جب کلونت کور کے منتظر بہ عمل اعضا کو سخت ناامیدی ہوئی تو وہ جھلا کر پلنگ سے نیچے اتر گئی۔ سامنے کھوئی پر چادر پڑی تھی، اس کو اتار کر اس نے جلدی جلدی اوڑھ کر اور نتھنے پھیلا کر پھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ایشرسیاں، وہ کون حرامزادی ہے جس کے پاس تو اتنے دن رہ کر آیا ہے اور جس نے تجھے نچوڑ ڈالا ہے؟“

ایشر سنگھ پلنگ پر لیٹا ہانپتا رہا اور اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

کلونت کور غصے سے ابلنے لگی۔ ”میں پوچھتی ہوں؟ کون ہے وہ چوہہ..... کون ہے وہ لفتی..... کون ہے وہ چور بتا؟“

ایشر سنگھ نے تھکے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”کوئی بھی نہیں کلونت کوئی بھی نہیں۔“

کلونت کور نے اپنے بھرے ہوئے کولہوں پر ہاتھ رکھ کر ایک عزم کے ساتھ کہا۔ ”ایشرسیاں، میں آج جھوٹ سچ جان کے رہوں گی..... کھاوا بگورو کی قسم..... کیا اس کی تہہ میں کوئی عورت نہیں؟“

ایشر سنگھ نے کچھ کہنا چاہا، مگر کلونت کور نے اس کی اجازت نہ دی۔ ”قسم کھانے سے پہلے سوچ لے کہ میں بھی سردار نہال سنگھ کی بیٹی ہوں..... نکالو بیٹی کروں گی، اگر تو نے جھوٹ بولا..... لے اب کھاوا بگورو کی قسم..... کیا اس کی تہہ میں کوئی عورت نہیں؟“

ایشر سنگھ نے بڑے دکھ کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا، کلونت کور بالکل دیوانی ہو گئی، پک کر کونے میں سے کرپان اٹھائی، میان کو سیلے کے چھلکے کی طرح اتار کر ایک طرف پھینکا اور ایشر سنگھ پر وار کر دیا۔

آن کی آن میں لہو کے فوارے چھوٹ پڑے۔ کلونت کور کی اس سے بھی تسلی نہ ہوئی تو اس نے وحشی بلیوں کی طرح ایشر سنگھ کے کیس نوچنے شروع کر دیئے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی نامعلوم سوت کی موٹی موٹی گالیاں دیتی رہی۔ ایشر سنگھ نے جموڑی دیر کے بعد نفاہت بھری التجا کی۔ ”جانے دے اب کلونت! جانے دے۔“

آواز میں بلا کا درد تھا۔ کلونت کور پیچھے ہٹ گئی۔

خون، ایشر سنگھ کے گلے سے اڑا کر اس کی مونچھوں پر گر رہا تھا۔ اس نے اپنے لرزاں ہونٹ کھولے اور کلونت کور کی طرف شکر پیے اور گلے کی ملی جلی نگاہوں سے دیکھا۔

”میری جان! تم نے بہت جلدی کی..... لیکن جو ہوا ٹھیک ہے۔“

کلونت کور کا حسد پھر بھڑکا۔ ”مگر وہ کون ہے توہاری ماں؟“

لہو، ایشر سنگھ کی زبان تک پہنچ گیا، جب اس نے اس کا ذائقہ چکھتا تو اس کے بدن پر جھر جھری سی دوڑ گئی۔

”اور میں..... اور میں..... بھینی یا چھ آرمیوں کو قتل کر چکا ہوں

..... اسی کرپاں سے.....“

کلونت کور کے دماغ میں صرف دوسری عورت تھی۔ ”میں پوچھتی ہوں، کون ہے وہ جرمزادی؟“

ایشر سنگھ کی آنکھیں دھندلا رہی تھیں۔ ایک ہلکی سی چپک ان میں پیدا ہوئی اور اس نے کلونت کور سے کہا۔ ”گالی نہ دے اس بھڑوئی کو۔“

کلونت چلائی۔ ”میں پوچھتی ہوں، وہ ہے کون؟“

ایشر سنگھ کے گلے میں آواز رندھ گئی، بتاتا ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیرا اور اس پر اپنا جتیا جتیا خون دیکھ کر مسکرایا۔ ”انسان ماں یا بھی ایک عجیب چیز ہے۔“

کلونت کور اس کے جواب کی منتظر تھی۔ ”ایشرسیاں تو مطلب کی بات کر۔“

ایشر سنگھ کی مسکراہٹ اس کی لہو بھری مونچھوں میں زیادہ پھیل گئی.....

”مطلب ہی کی بات کر رہا ہوں..... گلا چرا ہے ماں یا میرا..... اب

دھیرے دھیرے ہی ساری بات بتاؤں گا۔“

اور جب وہ بات بتانے لگا تو اس کے ماتھے پر ٹھنڈے پسینے کے لپ ہونے

لگے کلونٹ! میری جان..... میں تمہیں نہیں بتا سکتا، میرے ساتھ کیا ہوا؟
انسان کڑی یا بھی ایک عجیب چیز ہے..... شہر میں لوٹ مچی تو سب کی طرح
میں نے بھی اس میں حصہ لیا..... گھبنے پاتے اور روپے پیسے جو بھی ہاتھ لگے وہ
میں نے تمہیں دے دیئے..... لیکن ایک بات تمہیں نہ بتائی۔

ایشرنگھ نے گھاؤ میں درد محسوس کیا اور کراہنے لگا۔ کلونٹ کور نے اس کی طرف
توجہ نہ دی اور بڑی بے رحمی سے پوچھا۔ ”کون سی بات؟“

ایشرنگھ نے مونچھوں پر جمتے ہوئے لہو کو پھونک کے ذریعے سے اڑاتے
ہوئے کہا۔ ”جس مکان پر..... میں نے دھوا ہوا تھا..... اس میں سات
..... اس میں سات آدمی تھے..... چھ میں نے..... قتل کر دیئے۔
..... اسی کربان سے جس سے تو نے مجھے..... چھوڑا سے..... سن

ایک لڑکی تھی بہت ہی سندر..... اس کو اٹھا کر میں اپنے ساتھ لے آیا۔“
کلونٹ کور خاموش سنتی رہی۔ ایشرنگھ نے ایک بار پھر پھونک مار کے مونچھوں
پر سے لہواڑا لیا۔ ”کلونٹ جانی! میں تم سے کیا کہوں، کتنی سندر تھی..... میں
اسے بھی مار ڈالتا، پر میں نے کہا۔ ”نہیں،“ ایشرسیاں، کلونٹ کور کے تو ہر روز
مزے لیتا ہے، یہ میوہ بھی کچھ دیکھ۔“

کلونٹ کور نے صرف اس قدر کہا۔ ”ہوں.....“

اور میں اسے کندھے پر ڈال کر چل دیا۔ راستے میں..... کیا کہہ رہا تھا
میں؟..... ہاں راستے میں..... نہر کی ہنری کے پاس، جمو ہڑ کی جھاڑیوں
تالے میں نے اسے لٹا دیا..... پہلے سوچا کہ بچہ بیٹوں، لیکن پھر خیال آیا کہ نہیں۔

یہ کہتے کہتے ایشرنگھ کی زبان سوکھ گئی۔

کلونت کور نے جموگ نکل کر اپنا حلق تر کیا اور پوچھا۔ ”پھر کیا ہوا؟“

ایشرنگھ کے حلق سے بمشکل یہ الفاظ نکلے۔ ”میں نے..... میں نے پتا
پھینکا..... لیکن..... لیکن“

اس کی آواز ڈوب گئی۔

کلونت کور نے اسے جھنجھوڑا۔ ”پھر کیا ہوا؟“

ایشرنگھ نے اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھیں کھولیں اور کلونت کور کے جسم کی طرف
دیکھا، جس کی بوٹی بوٹی تھری رہی تھی۔ ”وہ..... وہ مری ہوئی تھی.....

اش تھی..... بالکل ٹھنڈا گوشت..... جانی مجھے اپنا ہاتھ دے.....“

کلونت کور نے اپنا ہاتھ ایشرنگھ کے ہاتھ پر رکھا جو برف سے بھی زیادہ ٹھنڈا

تھا۔

میرٹھی لکیر

اگر سڑک سیدھی ہو..... بالکل سیدھی ہو تو اس پر اس کے قدم منوں بھاری ہو جاتے تھے۔ وہ کہا کرتا تھا یہ زندگی کے خلاف ہے۔ جو پچ درپچ راستوں سے بھری ہے۔ جب ہم دونوں باہر سیر کو نکلتے تو اس دوران میں وہ کبھی سیدھے راستے پر نہ چلتا۔ اسے باغ کا وہ کونا بہت پسند تھا۔ جہاں ہراتی ہوئی روشیں بنی ہوئی تھیں۔ ایک بار اس نے اپنی ٹانگوں کو سینے کے ساتھ جوڑ کر، بڑے دلکش انداز میں مجھ سے کہا تھا۔ ”عباس اگر مجھے اور کوئی کام نہ ہو۔ تو بچہ امیں اپنی ساری زندگی کشمیر کی پہاڑی سڑکوں پر چڑھنے اترنے میں گزار دوں..... کیا سچ ہیں..... ابھی تم مجھے نظر آ رہے ہو اور ایک موڑ مڑنے کے بعد میری نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہو۔ کتنی پر اسرار چیز ہے..... سیدھے راستے پر تم ہر آنے والی چیز دیکھ سکتے ہو مگر یہاں آنے والی چیزیں تمہاری آنکھوں کے سامنے اچانک آ جائیں گی۔ موت کی طرح اچانک..... اس میں کتنا مزہ ہے۔“

وہ ایک دبلا پتلا نوجوان تھا۔ بے حد دبلا۔ اس کو ایک نظر دیکھنے سے اکثر اوقات معلوم ہوتا کہ ہسپتال کے کسی بستر پر سے کوئی زرد رو بیمار اٹھ کر چلا آیا ہے۔ اس کی عمر بمشکل بائیس برس کے قریب ہوگی۔ مگر بعض اوقات وہ اس سے بہت زیادہ عمر کا معلوم ہوتا تھا۔ اور عجیب بات ہے کہ کبھی کبھی اس کو دیکھ کر میں یہ خیال کرنے لگتا کہ وہ بچہ بن گیا ہے۔ اس میں ایسا ایسا قدر تبدیلی ہو جایا کرتی تھی کہ مجھے اپنی نگاہوں کی صحت پر شبہ ہونے لگ جاتا تھا۔

آخری ملاقات سے دس روز پہلے جب وہ مجھے بازار میں ملا تو میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ ہاتھ میں ایک بڑا سیب لیے اسے دانتوں سے کاٹ کر کھا رہا تھا۔ اس کا چہرہ بچوں کے مانند ایک ناقابل بیان خوشی کے باعث تھمٹایا ہوا تھا۔ اس کا سارا چہرہ گواہی دے رہا تھا کہ سیب بہت لذیذ ہے۔

سیب کے رس سے بھرے ہوئے ہاتھوں کو بچوں کی مانند اپنی پتلون سے صاف کر کے اس نے میرا ہاتھ بڑے جوش سے دبایا اور کہا..... ”عباس وہ دو آنے مانگتا تھا مگر میں نے بھی ایک ہی آنے میں خریدا۔“

اس کے ہونٹ ظفر مند انہنی کے باعث تھر تھرانے لگے۔ پھر اس نے جیب سے ایک چیز نکالی۔ اور میرے ہاتھ میں دے کر کہا ”تم نے لٹو بہت دیکھے ہوں گے، پر ایسا لٹو کبھی دیکھنے میں نہ آیا ہو گا..... اوپر کا بٹن دباؤ..... دباؤ..... ارے دباؤ!“

میں سخت متحیر ہو رہا تھا۔ لیکن اس نے میری طرف دیکھے بغیر لٹو کا بٹن دبا دیا۔ جو میری ہتھیلی پر سے اچھل کر سڑک پر لنگڑانے لگا..... اس پر خوشی کے مارے میرے دوست نے اچھلنا شروع کر دیا۔

”دیکھو، عباس، دیکھو اس کا ناچ۔“

میں نے لٹو کی طرف دیکھا جو میرے سر کی مانند گھوم رہا تھا۔ ہمارے ارد گرد بہت سے آدمی جمع ہو گئے تھے شاید وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ میرا دوست وہ انیاں بیچے گا۔

”لٹو اٹھاؤ اور چلیں..... لوگ ہمارا تماشا دیکھنے کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔“

میرے لہجے میں شاید چھوڑی سی تیزی تھی کیونکہ اس کی ساری خوشی ماند پڑ گئی اور اس کے جہرے کی متماہٹ غائب ہو گئی۔ وہ اٹھا اور اس نے میری طرف کچھ اس انداز سے دیکھا کہ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے ایک ننھا مٹا چھ روٹی صورت بنا کر کہہ رہا ہے۔ میں نے تو کوئی بری بات نہیں کی۔ پھر مجھے کیوں جھڑکا گیا ہے؟ اس نے لٹو وہیں سڑک پر چھوڑ دیا اور میرے ساتھ چل پڑا۔ گھر تک میں نے اور اس نے کوئی بات نہیں کی۔ گلی کے نکل پر پہنچ کر میں نے اس کی طرف دیکھا..... اس قلیل میں اس کے چہرے پر انقلاب پیدا ہو گیا تھا۔ وہ مجھے ایک تفلرزوہ بوڑھا نظر آیا۔

میں نے پوچھا۔ ”کیا سوچ رہے ہو؟“
اس نے جواب دیا۔ ”میں یہ سوچ رہا ہوں۔ اگر خدا کو انسان کی زندگی بسر کرنی پڑ جائے تو کیا ہو؟“
وہ اسی قسم کی بے دھنگی باتیں سوچا کرتا تھا بعض لوگ سمجھتے تھے کہ وہ اپنے آپ کو نرالا ظاہر کرنے کے لیے ایسے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ مگر یہ بات غلط تھی۔ دراصل اس کی طبیعت کا رجحان ہی ایسی چیزوں کی طرف رہتا تھا جو کسی اور دماغ میں نہیں آتی تھیں۔

آپ یقین نہیں کریں گے۔ مگر اس کو اپنے جسم پر رستا ہوا زخم بہت پسند تھا۔ وہ کہا کرتا تھا اگر میرے جسم پر ہمیشہ کے لیے کوئی زخم بن جائے تو کتنا اچھا ہو..... مجھے درد میں بڑا مزہ آتا ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اسکول میں ایک روز اس نے میرے سامنے اپنے

بازو کو اسٹری کے تیز بلیڈ سے زخمی کر دیا۔ صرف اس لیے کہ کچھ روز اس میں درد ہوتا رہے۔ نیکہ اس نے کبھی اس خیال سے نہیں لگوا یا تھا کہ اس سے بیٹھے، پلیگ یا ملیس یا کا خوف نہیں رہتا اس کی ہمیشہ یہ خواہش ہوتی تھی کہ دو تین روز اس کا بدن بخار کے باعث تھپتا رہے۔ چنانچہ جب کبھی وہ بخار کو دعوت دیا کرتا تھا تو مجھ سے کہا کرتا تھا۔ ”عباس میرے گھر ایک مہمان آنے والا ہے۔ اس لیے تین روز تک مجھے فرصت نہیں ملے گی۔“

ایک روز میں نے اس سے پوچھا کہ تم آپ دن نیکہ کیوں لگواتے ہو اس نے جواب دیا۔ ”عباس، میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ نیکہ لگوانے سے جو بخار چڑھتا ہے اس میں کتنی شاعری ہوتی ہے..... جب جوڑ جوڑ میں درد ہوتا ہے اور اعضا شکنی ہوتی ہے تو بخدا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم کسی نہایت ہی ضدی آدمی کو سمجھانے کی کوشش کر رہے ہو..... اور پھر بخار بڑھ جانے سے جو خواب آتے ہیں۔ واللہ، کس قدر بے ربط ہوتے ہیں..... بالکل ہماری زندگی کے مانند!..... ابھی تم یہ دیکھتے ہو کہ تمہاری شادی کسی نہایت ہی حسین عورت سے ہو رہی ہے۔ دوسرے لمحے یہی عورت تمہاری آغوش میں ایک قوی نیکل پہلوان بن جاتی ہے۔“

میں اس کی عجیب و غریب باتوں کا عادی ہو گیا تھا لیکن اس کے باوجود ایک روز مجھے اس کے دماغی توازن پر شبہ ہونے لگا۔ گزشتہ مئی میں میں نے اس سے اپنے استاد کا تعارف کرایا۔ جس کی میں بے حد عزت کرتا تھا۔ ڈاکٹر شا کرنے اس کا ہاتھ بڑی گرجوشی سے دبایا اور کہا۔ ”میں آپ سے مل کر بہت خوش ہوا ہوں۔“

”اس کے برعکس مجھے آپ سے مل کر کوئی خوشی نہیں ہوئی۔“ یہ میرے دوست

کا جواب تھا۔ جس نے مجھے بے حد شرمندہ کیا۔ آپ قیاس فرمائیے کہ اس وقت میری کیا حالت ہوئی ہوگی۔ شرم کے مارے میں اپنے استاد کے سامنے گڑا جا رہا تھا۔ اور وہ بڑے اطمینان سے سگریٹ کے کش لگا کر بال میں ایک تصویر دیکھ رہا تھا۔

ڈاکٹر شا کر نے میرے دوست کی اس حالت کو برا سمجھا اور تھپے میں مجھ سے بڑے تیز لہجے میں کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے دوست کا دماغ ٹھکانے نہیں۔“ میں نے اس کی طرف سے معذرت طلب کی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ میں واقعی بے حد شرمندہ تھا کہ ڈاکٹر شا کر کو میری وجہ سے ایسا سخت فتنہ منہا پڑا۔

شام کو میں اپنے دوست کے پاس گیا۔ اس ارادے کے ساتھ کہ اس سے اچھی طرح باز پرس کروں گا اور اپنے دل کی بھڑاس نکال لوں گا۔ وہ مجھے ابھری کے باہر ملا۔ میں نے چھوٹے ہی اس سے کہا۔ ”تم نے آج ڈاکٹر شا کر کی بہت بے عزتی کی۔ معلوم ہوتا ہے تم نے مجلسی آداب کو خیر باد کہہ دیا ہے۔“

وہ مسکرایا۔ ”ارے چھوڑو اس قصے کو..... آؤ کوئی اور کام کی بات کریں۔“ یہ سن کر میں اس پر ہنس پڑا۔ خاموشی سے میری تمام باتیں سن کر اس نے صاف صاف کہہ دیا۔ ”اگر مجھ سے مل کر کسی شخص کو خوشی حاصل ہوتی ہے تو ضروری نہیں کہ اس سے مل کر مجھے بھی خوشی حاصل ہو..... اور پھر پہلی ملاقات پر صرف ہاتھ ملانے سے میں نے اس کے دل میں خوشی پیدا کر دی..... میری سمجھ میں نہیں آتا..... تمہارے ڈاکٹر صاحب نے اس روز 25 آدمیوں سے تعارف کیا ہر شخص سے انہوں نے یہی کہا تھا کہ آپ سے مل کر مجھے بڑی مسرت حاصل

ہو ہی ہے..... کیا یہ ممکن ہے کہ ہر شخص ایک ہی قسم کے تاثرات پیدا کرے۔ تم مجھ سے ایسی فضول باتیں نہ کرو..... آؤ اندر چلیں۔“

میں ایک حیرت زدہ آدمی کی طرح اس کے ساتھ ہولیا۔ اور لاہری کے اندر جا کر اپنا سب غصہ بھول گیا۔ بلکہ یہ سوچنے لگا کہ میرے دوست نے جو کچھ کہا تھا۔ صحیح ہے لیکن فوراً ہی میرے دل میں ایک حسد سا پیدا ہوا۔ کہ اس شخص میں اتنی قوت کیوں ہے کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار بے دھڑک کر دیتا ہے۔ پچھلے دنوں میرے ایک افسر کی دادی مر گئی تھی اور مجھے اس کے سامنے مجبوراً اپنے اوپر غم کی کیفیت طاری کرنی پڑی تھی اور اس سے اپنی مرضی کے خلاف دس پندرہ منٹ تک افسوس ظاہر کرنا پڑا تھا۔ اس کی دادی سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کی موت کی خبر نے میرے دل پر کوئی اثر نہ کیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود مجھے نقلی جذبات تیار کرنے پڑتے تھے۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ میرا کریکٹر اپنے دوست کے مقابلے میں بہت کمزور ہے۔ اس خیال ہی نے میرے دل میں حسد کی چنگاری پیدا کی تھی اور میں اپنے حلق میں ایک ناقابل بیان تلخی محسوس کرنے لگا تھا لیکن یہ ایک وقتی اور ہنگامی جذبہ تھا۔ جو ہوا کے ایک تیز جھونکے کے مانند آیا اور گزر گیا۔ میں بعد میں اس پر بھی نام ہوا۔

مجھے اس سے بے حد محبت تھی لیکن اس محبت میں غیر ارادی طور پر کبھی کبھی نفرت کی جھلک بھی نظر آتی تھی۔ ایک روز میں نے اس کی صاف گوئی سے متاثر ہو کر کہا تھا ”یہ کیا بات ہے کہ بعض اوقات میں تم سے نفرت کرنے لگتا ہوں۔“ اور اس نے مجھے یہ جواب دے کر مطمئن کر دیا تھا۔ تمہارا دل جو میری محبت سے بھرا ہوا

ہے۔ ایک ہی چیز کو بار بار دیکھ کر کبھی کبھی تنگ آ جاتا ہے اور کسی دوسری شے کی خواہش کرنے لگ جاتا ہے..... اور پھر اگر تم مجھ سے کبھی کبھی نفرت نہ کرو تو مجھ سے ہمیشہ محبت بھی نہیں کر سکتے..... انسان اس قسم کی الجھنوں کا مجموعہ ہے۔

میں اور وہ اپنے وطن سے بہت دور تھے۔ ایک ایسے بڑے شہر میں جہاں زندگی تاریک قبر سی معلوم ہوتی ہے۔ مگر اسے کبھی ان گلیوں کی یاد نہ ستاتی تھی۔ جہاں اس نے اپنا بچپن اور اپنے شباب کا زمانہ گزارا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسی شہر میں پیدا ہوا ہے۔ میرے چہرے سے ہر شخص یہ معلوم کر سکتا ہے کہ میں غریب الوطن ہوں۔ مگر میرا دوست ان جذبات سے یکسر عاری ہے۔ وہ کہا کرتا ہے کہ وطن کی یاد بہت بڑی کمزوری ہے۔ ایک جگہ سے خود کو چپک دینا ایسا ہی ہے جیسے ایک آزادی پسند سائنڈ کو کھونٹے سے باندھ دیا جائے۔

اس قسم کے خیالات کے مالک کی جو ہر شے کو ٹیزھی عینک سے دیکھتا ہو اور مروجہ رسوم کے خلاف چلتا ہو۔ باقاعدہ نکاح خوانی ہو، یعنی پرانی رسوم کے مطابق اس کا عقد عمل میں آئے تو کیا آپ کو تعجب نہ ہوگا؟ مجھے یقین ہے کہ ضرور ہوگا۔

ایک روز شام کو جب وہ میرے پاس آیا اور بڑے سنجیدہ انداز میں اس نے مجھے اپنے نکاح کی خبر سنائی۔ تو آپ یقین کریں کہ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس حیرت کا باعث یہ چیز نہ تھی کہ وہ شادی کر رہا ہے۔ نہیں..... مجھے تعجب اس بات پر تھا کہ اس نے لڑکی بغیر دیکھے، پرانے خطوط کے مطابق نکاح کی رسم میں شامل ہونا قبول کیسے کر لیا۔ جبکہ وہ ہمیشہ ان مولویوں کا مستحکم اڑایا کرتا تھا۔ جو لڑکی اور لڑکے کو رشتہ ازدواج میں باندھتے ہیں؟ وہ کہا کرتا تھا ”یہ مولوی مجھے

بڑھے اور گنٹھیا کے مارے پہلوان معلوم ہوتے ہیں۔ جو اپنے اکھاڑے میں چھوٹے چھوٹے لڑکوں کی کشتیاں دیکھ کر اپنی حرص پوری کرتے ہیں۔“
اور پھر ہوشادہی یا نکاح پر لوگوں کے جھگڑے کا بھی تو قائل نہ تھا مگر..... اس کا نکاح پڑھا گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے مولوی نے..... اس مولوی نے جس سے اس کو سخت چڑھتی تھی اور جس کو وہ بوڑھا طوطا کہا کرتا تھا اس کا نکاح پڑھا۔ چھو بارے بانٹے گئے اور میں ساری کارروائیوں دیکھ رہا تھا گویا سوتے میں کوئی سپنا دیکھ رہا ہوں۔

نکاح ہو گیا۔ دوسرے لفظوں میں انہونی بات ہو گئی اور جو تعجب مجھے پہلے پیدا ہوا تھا بعد میں بھی برقرار رہا۔ مگر میں نے اپنے متعلق اپنے دوست سے ذکر نہ کیا۔ اس خیال سے کہ شاید اسے اس دائرے میں لوٹنا پڑا۔ جس میں دوسرے زندگی بسر کر رہے ہیں۔

نکاح کر کے میرا دوست اپنے اصولوں کے ٹیڑھے منار سے بہت بری طرح پھسلا تھا اور اس گڑھے میں سر کے بل آگرا تھا۔ جس کو وہ بے حد غلیظ کہا کرتا تھا۔ جب میں نے یہ سوچا تو میرے جی میں آہی کہ اپنے کج رفتار دوست کے پاس جاؤں اتنا ہنسوں اتنا ہنسوں کہ پیٹ میں بل پڑ جائیں۔ مگر جس روز میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی اسی روز وہ دوپہر کو میرے گھر آیا۔

نکاح کو 3 مہینے گزرے گئے تھے اور اس دوران میں وہ ہمیشہ اداس اداس رہتا تھا۔ اس کا چہرہ چمک رہا تھا اور تاک جو چند روز پہلے بھدی نیام کے اندر چھپی ہوئی تلووار کا نقشہ پیش کرتی تھی۔ اس پر سب سے نمایاں نظر آرہی تھی۔

وہ میرے کمرے کے اندر داخل ہوا اور سگریٹ ساگلا کر میرے پاس بیٹھ گیا
اس کے ہونٹوں کے اختتامی کوٹنے کپکپا رہے تھے۔ ظاہر تھا وہ مجھے بڑی اہم بات
سنانے والا ہے۔ میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔

اس نے سگریٹ کے دھوئیں سے چھلہ بنایا اور اس میں اپنی انگلی گاڑتے
ہوئے مجھ سے کہا۔ ”عباس میں کل یہاں سے جا رہا ہوں۔“
”جا رہے ہو؟“ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔

”میں کل یہاں سے جا رہا ہوں۔ شاید ہمیشہ کے لیے، میں اس خبر سے تمہیں
مطلع کرنے کے لیے نہ آتا۔ مگر مجھے تم سے کچھ روپے لینا ہیں جو تم نے مجھ سے
قرض لے رکھے ہیں۔ کیا تمہیں یاد ہے؟“

میں نے جواب دیا۔ ”یاد ہے، پر تم جا کہاں رہے ہو۔۔۔۔۔ اور پھر ہمیشہ کے
لیے۔۔۔۔۔؟“

بات یہ ہے کہ مجھے اپنی بیوی سے عشق ہو گیا ہے اور کل رات میں اسے بھگا کر
اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں۔۔۔۔۔ وہ تیار ہو گئی ہے۔

یہ سن کر مجھے اس قدر حیرت ہوئی کہ میں بیوقوفوں کی مانند ہنسنے لگا اور دیر تک
ہنستا رہا۔ وہ اپنی منکوحہ بیوی کو جسے وہ جب چاہتا انگلی پکڑ کر اپنے ساتھ لے آ سکتا تھا۔
انگو اکر کے لے جا رہا تھا۔۔۔۔۔ بھگا کر لے جا رہا تھا۔ جیسے۔۔۔۔۔ جیسے۔۔۔۔۔ میں کیا
کہوں کہ اس وقت میں نے کیا سوچا۔۔۔۔۔ دراصل میں کچھ سوچنے کے قابل ہی نہ
رہا تھا۔

مجھے ہنستا دیکھ کر اس نے ملامت بھری نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”عباس، یہ ہنسنے کا موقع نہیں۔ کل رات وہ اپنے مکان کے ساتھ والے باغ میں میرا انتظار کرے گی اور مجھے سفر کے لیے کچھ روپیہ فراہم کر کے اس کے پاس ضرور پہنچنا چاہیے۔ وہ کیا کہے گی۔ اگر میں اپنے وعدہ پر قائم نہ رہا..... تمہیں کیا معلوم، میں نے کن کن مشکلوں کے بعد رسائی حاصل کر کے اس کو اس بات پر آمادہ کیا ہے۔“

میں نے پھر ہنسنا چاہا۔ مگر اس غایت درجہ سنجیدہ و متین دیکھ کر میری ہنسی دب گئی اور مجھے قطعی طور پر معلوم ہو گیا کہ وہ واقعی اپنی منکووحہ بیوی کو بھگا کر لے جا رہا ہے۔ کہاں؟..... یہ مجھے معلوم نہ تھا۔

میں زیادہ تفصیل میں نہ گیا اور اسے وہ روپے ادا کر دینے جو میں نے عرصہ ہوا اس سے قرض لیے تھے اور یہ سمجھ کر ابھی تک نہ دینے تھے کہ وہ نہ لے گا۔ مگر اس نے خاموشی سے نوٹ گن کر اپنی جیب میں ڈالے اور بغیر ہاتھ ملائے رخصت ہونے ہی والا تھا کہ میں نے آگے بڑھ کر اس سے کہا۔ ”تم جا رہے ہو..... لیکن مجھے بھلا نہ دینا۔“

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے مگر اس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں۔

”میں کوشش کروں گا۔“ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ میں بہت دیر تک جہاں کھڑا تھا بت بنا رہا۔

جب ادھر اس کے سرال والوں کو پتہ چلا کہ ان کی لڑکی رات رات میں کہیں غائب ہو گئی ہے تو ایک ہیجان برپا ہو گیا ہے۔ ایک ہفتے تک انہوں نے اسے ادھر ادھر تلاش کیا اور کسی کو اس واقعے کی خبر تک نہ ہونے دی۔ مگر بعد میں لڑکی کے

بھائی کو میرے پاس آنا پڑا اور مجھے اپنا ہمارا بنا کر اسے ساری رام کہانی سنائی پڑی۔

وہ بے چارے یہ خیال کر رہے تھے کہ لڑکی کسی اور آدمی کے ساتھ بھاگ گئی ہے اور لڑکی کا بھائی میرے پاس اس غرض سے آیا تھا کہ ان کی طرف سے میں اپنے دوست کو اس تلخ واقعہ سے آگاہ کر دوں۔ وہ بے چارے شرم کے مارے زمین میں گڑا جا رہا تھا۔

جب میں نے اس کو اصل واقعہ سے آگاہ کیا تو حیرت کے باعث اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس بات سے تو اسے بہت ڈھارس ہوئی کہ اس کی بہن کسی غیر مرد کے ساتھ نہیں گئی بلکہ اپنے شوہر کے پاس ہے۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میرے دوست نے یہ فضول اور نا زیبا حرکت کیوں کی؟

”بیوی اس کی تھی۔ جب چاہتا لے جاتا۔ مگر اس حرکت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے جیسے..... جیسے.....“

وہ کوئی مثال پیش نہ کر سکا۔ اور میں بھی اسے کوئی اطمینان دہ جواب نہ دے سکا۔

کل صبح کی ڈاک سے مجھے اس کا خط ملا جس کو میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کھولا۔ لفافے میں ایک کاغذ تھا۔ جس پر ایک ٹیڑھی لکیر کھینچی ہوئی تھی..... خالی لفافہ ایک طرف رکھ کر میں اس عمود کی طرف دیکھنے لگا..... جو میں نے بورڈ پر چپکے ہوئے کاغذ پر گرایا تھا۔

ٹیوال کا کتا

کئی دن سے طرفین اپنے اپنے مورچے پر جمے ہوئے تھے۔ دن میں ادھر اور ادھر سے دس بارہ فائر ہو جاتے جن کی آواز کے ساتھ کوئی انسانی چیخ بلند نہیں ہوتی تھی۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ ہوا خود رو پھولوں کی مہک میں بسی ہوئی تھی۔ پیاز یوں کی اونچائیوں اور ڈھلوانوں پر جنگ سے بے خبر قدرت اپنے مقررہ اشغال میں مصروف تھی۔ پرندے اسی طرح چھپھاتے تھے۔ پھول اسی طرح کھل رہے تھے اور شہد کی ست روکھیاں اسی پرانے ڈھنگ سے ان پر اوگھ اوگھ کر رس چوستی تھیں۔

جب پیاز یوں میں کسی فائر کی آواز گونجتی تو چھپھاتے ہوئے پرندے چونک کر اڑنے لگتے، جیسے کسی کا ہاتھ ساز کے غلط تار سے جا ٹکرایا ہے اور ان کی سماعت کو صدمہ پہنچانے کا موجب ہوا ہے۔ ستمبر کا انجام اکتوبر کے آغاز سے بڑے گلابی انداز میں بغل گیر ہو رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ موسم سرما اور گرما میں صلح صفائی ہو رہی ہے۔ نیلے نیلے آسمان پر دھنکی ہوئی روئی ایسے پتلے پتلے اور جگمگے جگمگے بادل یوں تیرتے تھے جیسے اپنے سفید بچروں میں تفریح کر رہے ہیں۔

پیازی مورچوں میں دونوں طرف کے سپاہی کئی دن سے بڑی کوفت محسوس کر رہے تھے کہ کوئی فیصلہ کن بات کیوں وقوع پذیر نہیں ہوتی۔ اکتا کر ان کا جی چاہتا تھا کہ موقع بے موقع ایک دوسرے کو شہر سناٹیں۔ کوئی نہ سنے تو ایسے ہی گنگماتے رہیں۔ پتھریلی زمین پر اوندھے یا سیدھے لیٹے رہتے تھے۔ اور جب

حکم ملتا تھا ایک دو فائر کر دیتے تھے۔

دونوں کے مورچے بڑی محفوظ جگہ تھے۔ گولیاں پوری رفتار سے آتی تھیں اور پتھروں کی ڈھال کے ساتھ ٹکرا کر وہیں چت ہو جاتی تھیں۔ دونوں پیڑیاں جن پر یہ مورچے تھے قریب قریب ایک قد کی تھیں۔ درمیان میں چھوٹی سی سبز پوش وادی تھی جس کے سینے پر ایک نالہ موٹے سانپ کی طرح لوٹتا رہتا تھا۔

ہوائی جہازوں کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ توپیں ان کے پاس تھیں نہ ان کے پاس، اس لیے دونوں طرف بے خوف و خطر آگ جلائی جاتی تھی۔ ان سے دھوئیں اٹھتے اور ہوائوں میں گھل مل جاتے۔ رات کو چونکہ بالکل خاموشی ہوتی تھی، اس لیے کبھی کبھی دونوں مورچوں کے سپاہیوں کو ایک دوسرے کے کسی بات پر لگائے ہوئے قہقہے سنائی دے جاتے تھے۔ کبھی کوئی اہر میں آ کے گانے گاتا تو اس کی آواز رات کے سنائے کو جگا دیتی۔ ایک کے پیچھے ایک صدائے بازگشت گونجتی تو ایسا لگتا کہ پیڑیاں آموختہ دہرائی ہیں۔

چائے کا دور ختم ہو چکا تھا۔ پتھروں کے چولہے میں چیر کے ہلکے پھلکے کوئلے قریب قریب سرد ہو چکے تھے۔ آسمان صاف تھا۔ موسم میں خشکی تھی۔ ہوا میں پھولوں کی مہک نہیں تھی جیسے رات کو انہوں نے اپنے عطر دان بند کر لیے تھے، البتہ چیر کے پسینے یعنی بروڑ کی بو تھی مگر یہ بھی کچھ ایسی ناگوار نہیں تھی۔ سب کھل اڑھے سو رہے تھے، مگر کچھ اس طرح کہ ہلکے سے اشارے پر اٹھ کر لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو سکتے تھے۔ جمعہ اور ہر نام سنگھ خود پہرے پر تھا۔ اس کی راسکوپ گھڑی میں دو بجے تو اس نے گنڈا سنگھ کو جگایا اور پہرے پر متعین کر دیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ سو

جائے، پر جب لیٹا تو آنکھوں سے نیند کو اتنا دور پایا جتنے کہ آسمان کے ستارے
تھے۔ جمعدار ہر نام سنگھ چپت لیٹا ان کی طرف دیکھتا رہا..... اور گنگلمانے لگا:
جتی لینی آں ستاریاں والی..... ستاریاں والی..... وے ہر نام سنگھ
ہو یا را، بھاویں تیری مہیں وک جائے
اور ہر نام سنگھ کو آسمان پر ہر طرف ستاروں والے جوتے نکھرے نظر آئے۔ جو
جھلمل جھلمل کر رہے تھے۔

جتی لے دوں ستاریاں والی..... ستاریاں والی..... فی ہر نام کورے
ہو مارے، بھاویں میری مہیں وک جائے
یہ گاکروہ مسکرایا، پھر یہ سوچ کر کہ نیند نہیں آئے گی۔ اس نے اٹھ کر سب کو
جگایا مار کے ذکر نے اس کے دماغ میں ہلچل پیدا کر دی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ واٹ
پٹانگ گفتگو ہو، جس سے اس بولی کی ہر نام کوری کیفیت پیدا ہو جائے۔ چنانچہ
باتیں شروع ہوئیں مگر اکھڑی اکھڑی رہیں۔ بنتا سنگھ جوان سب میں کم عمر اور خوش
آواز تھا، ایک طرف ہٹ کر بیٹھ گیا۔ باقی اپنی بنظاہر پر لطف باتیں کرتے اور
جمائیاں لیتے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد بنتا سنگھ نے ایک دم اپنی پرسوز آواز میں
ہیر گانا شروع کر دی۔

ہیر آکھیا جو گلیا جھوٹھ بولیں، کون روٹھڑے یار مناؤندانی
ایسا کوہی نہ ملایا میں ڈونڈ تھکی جیہڑا گیاں نوں موڑ لیاؤندانی
اک باز تو کانگ نے کوچ کھوئی دیکھاں چپ ہے کہ کراؤندانی
وکھاں والیاں نوں گلاں سکھیاں فی قسے جوڑ جہان سناؤندانی

پھر جموڑے وقفے کے بعد اس نے ہیر کی ان باتوں کا جواب رانجھے کی زبان میں گایا۔

جیہڑے باز توں کانگ نے کونج کھوئی صبر شکر کر باز فناہ ہويا
ایویں حال ہے اس فقیر دانی دھن مال گیا تے تباہ ہويا
کریں صدق تے کم معلوم ہووے تیرا رب رسول گواہ ہويا
دنیا جھڈ اداسیاں پہن لیاں سید وارثوں بہن وارث شاہ ہويا
بننا سنگھ نے جس طرح ایک دم گانا شروع کیا تھا، اسی طرح وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خاکستری پہاڑیوں نے بھی اداسیاں پہن لی ہیں۔
جمعہ ارہرام سنگھ نے جموڑی دیہ کے بعد کسی غیر مرئی چیز کو موٹی سی گالی دی اور لیٹ گیا۔ دفعتاً رات کے آخری پہر کی اس اداس فضا میں کتے کے بھونکنے کی آواز گونجی۔ سب چونک پڑے۔ آواز قریب سے آئی تھی۔ صوبیدار ہرام سنگھ نے بیٹھ کر کہا۔ ”یہ کہاں سے آ گیا بھونگو؟“

کتا پھر بھونکا۔ اب اس کی آواز اور بھی نزدیک سے آئی تھی۔ چند لمحات کے بعد دوڑ جھاڑیوں میں آہٹ ہوئی۔ بننا سنگھ اٹھا اور ان کی طرف بڑھا۔ جب واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک آوارہ کتا تھا جس کی دم ہل رہی تھی۔ وہ مسکرایا۔
”جمعہ ار صاحب، میں ہو کنڑا دھر بوا تو کہنے لگا، میں ہوں چڑچمن جمن!“

سب ہنسنے لگے۔ جمعہ ار ہرام سنگھ نے کتے کو پکارا۔ ”ادھر آ چڑچمن جمن۔“
کتا دم ہلاتا ہرام سنگھ کے پاس چلا گیا اور یہ سمجھ کر شاید کوئی کھانے کی چیز پھینکی گئی ہے، زمین کے پتھر سونگھنے لگا۔ جمعہ ار ہرام سنگھ نے تھمیا احوال کر ایک لمٹ

نکالا اور اس کی طرف پھینکا۔ کتے نے اسے سوگئے کر منہ کھولا، لیکن ہر نام سنگھ نے لپک کر اسے اٹھالیا۔ ”تھہر..... کہیں پاکستانی تو نہیں!“

سب ہنسنے لگے۔ سردار ہننا سنگھ نے آگے بڑھ کر کتے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور جمعدار ہر نام سنگھ سے کہا۔ ”نہیں جمعدار صاحب، چپڑا جھمن جھمن ہندوستانی ہے۔“
جمعدار ہر نام سنگھ ہنسا اور کتے سے مخاطب ہوا۔ ”نشتانی دکھاوے؟“
کتا دم ہلانے لگا۔

ہر نام سنگھ ذرا مکمل کے ہنسا۔ ”یہ کوئی نشتانی نہیں۔ دم تو سارے کتے ہلاتے ہیں۔“

ہننا سنگھ نے کتے کی لرزاں دم پکڑ لی۔ ”شرنا تھی ہے بے چارہ۔“
جمعدار ہر نام سنگھ نے بسکٹ پھینکا کتے نے فوراً دبوچ لیا۔ ایک جوان نے اپنے بوٹ کی ایڑھی سے زمین کھودتے ہوئے کہا۔ ”اب کتوں کو بھی یا تو ہندوستانی ہونا پڑے گا یا پاکستانی!“

جمعدار نے اپنے تھیلے سے ایک بسکٹ نکالا اور پھینکا۔ ”پاکستانیوں کی طرح پاکستانی کتے بھی گولی سے اڑا دیئے جائیں گے!“

ایک نے زور سے نعرہ بلند کیا۔ ”ہندوستان زندہ باد!“
کتا جو بسکٹ اٹھانے کے لیے آگے بڑھا تھا ڈر کے پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی دم ناگوں کے اندر گھس گئی۔ جمعدار ہر نام سنگھ ہنسا۔ ”اپنے نعرے سے کیوں ڈرتا ہے چپڑا جھمن جھمن..... کھا..... لے ایک اور لے۔“ اس نے تھیلے سے ایک اور بسکٹ نکال کر اسے دیا۔

باتوں باتوں میں صبح ہو گئی۔ سورج ابھی نکلنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ چار سو اچالا ہو گیا۔ جس طرح بٹن دبانے سے ایک دم بجلی کی روشنی ہوتی ہے۔ اسی طرح سورج کی شعاعیں دیکھتے ہی دیکھتے اس پہاڑی علاقے میں پھیل گئیں جس کا نام ٹیڈال تھا۔

اس علاقے میں کافی دیر سے لڑائی جاری تھی۔ ایک ایک پہاڑی کے لیے درجنوں جوانوں کی جان جاتی تھی، پھر بھی قبضہ غیر یقینی ہوتا تھا۔ آج یہ پہاڑی ان کے پاس ہے، کل دشمن کے پاس، برسوں پھر ان کے قبضے میں۔ اس سے دوسرے روزہ پھر دوسروں کے پاس چلی جاتی تھی۔

صوبیدار ہر نام سنگھ نے دو زمین لگا کر آس پاس کا جائزہ لیا۔ سامنے پہاڑی سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ چائے وغیرہ تیار ہو رہی ہے ادھر بھی ناشتے کی فکر ہو رہی تھی۔ آگ ساگنی جاری تھی۔ ادھر والوں کو بھی یقیناً ادھر سے دھواں اٹھتا دکھائی دے رہا تھا۔

ناشتے پر سب جوانوں نے جھوڑا جھوڑا کتے کو دیا جو اس نے خوب پیٹ بھر کے کھایا۔ سب اس سے دلچسپی لے رہے تھے جیسے وہ اس کو اپنا دوست بنانا چاہتے ہیں۔ اس کے آنے سے کافی چہل پہل ہو گئی تھی۔ ہر ایک اس کو جھوڑے جھوڑے وقفے کے بعد پکار کر ”چچر جھن جھن“ کے نام سے پکارتا اور اسے پیار کرتا۔

شام کے قریب دوسری طرف پاکستانی مورچے میں صوبیدار ہمت خان اپنی بڑی بڑی مونچھوں کو جن سے بے شمار کہانیاں وابستہ تھیں، مروڑے دے کر ٹیڈال کے نقشے کا بغور مطالعہ کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وائز لیس اوپریٹر بیٹھا تھا اور

صوبیدار ہمت خاں کے لیے پانٹون ممانڈر سے ہدایات وصول کر رہا تھا۔ کچھ دور ایک پتھر سے ٹیک لگائے اور اپنی بندوق لیے بشیر ہو لے ہو لے گنگنارہا تھا۔

چن کتھے گوانی آئی رات وے.....چن کتھے گوانی آئی

بشیر نے مزے میں آ کر آواز ڈرا اونچی کی تو صوبیدار ہمت خاں کی کڑک بلند ہوئی۔ ”اوئے کہاں رہا ہے تو رات بھر؟“

بشیر نے سوالیہ نظروں سے ہمت خاں کو دیکھنا شروع کیا۔ جو بشیر کے بجائے کسی اور سے مخاطب تھا۔ ”ہتا اوئے۔“

بشیر نے دیکھا۔ کچھ فاصلے پر وہ آوارہ کتا پیٹھا تھا جو کچھ دن ہوئے ان کے مورچے میں بن بلائے مہمان کی طرح آیا تھا اور وہیں ٹک گیا تھا۔ بشیر مسکرایا اور کتے سے مخاطب ہو کر بولا۔

”چنے کتھے گوانی آئی رات وے.....چن کتھے گوانی آئی؟“

کتے نے زور سے دم ہلانا شروع کی جس سے پتھریلی زمین پر جھاڑوسی پھرنے لگی۔

صوبیدار ہمت خاں نے ایک کنکراٹھا کر کتے کی طرف پھینکا۔ ”سالے کو دم ہلانے کے سوا اور کچھ نہیں آتا!“

بشیر نے ایک دم کتے کی طرف غور سے دیکھا۔ ”اس کی گردن میں کیا ہے؟“ یہ کہہ کر وہ اٹھا، مگر اس سے پہلے ایک اور جوان نے کتے کو پکڑ کر اس کی گردن میں بندھی ہوئی رسی اتاری۔ اس میں گتے کا ایک ٹکڑا پرویا ہوا تھا۔ جس پر کچھ لکھا تھا۔ صوبیدار ہمت خاں نے یہ ٹکڑہ لیا اور اپنے جوانوں سے پوچھا۔ ”لنڈے ہیں

..... جانتا ہے تم میں سے کوئی پڑھنا۔“

بشیر نے آگے بڑھ کر گتے کا ٹکڑا لیا۔ ”ہاں..... کچھ کچھ پڑھ لیتا ہوں۔“

اور اس نے بڑی مشکل سے حرف جوڑ جوڑ کر یہ پڑھا۔ ”چپ..... چپ..... جھمن..... جھمن..... چپ..... جھمن..... کیا ہوا؟“

صوبیدار ہمت خان نے اپنی بڑی بڑی تاریخی مونچھوں کو زبردست مروڑا دیا۔ ”کوڈ ورڈ ہو گا کوئی۔“ پھر اس نے بشیر سے پوچھا۔ ”کچھ اور لکھا ہے بشیر۔“

بشیر نے جو حروف شناسی میں مشغول تھا جواب دیا۔ ”جی ہاں..... یہ..... ہند..... ہند..... ہندوستانی..... یہ ہندوستانی کتا ہے!“

صوبیدار ہمت خان نے سوچنا شروع کیا۔ ”مطلب کیا ہوا اس کا؟..... کیا پڑھا تھا تم نے..... چپ؟“

بشیر نے جواب دیا۔ ”چپ..... جھمن..... جھمن!“

ایک جوان نے بڑے عاقلانہ انداز میں کہا۔ ”جو بات ہے اسی میں ہے۔“

صوبیدار ہمت خان کو یہ بات معقول معلوم ہوئی۔ ”ہاں کچھ ایسا لگتا ہے۔“

بشیر نے گتے پر لکھی ہوئی پوری عبارت پڑھی۔ ”چپ..... جھمن..... جھمن..... یہ..... ہندوستانی کتا ہے!“

صوبیدار ہمت خان نے وائز لیس سیٹ لیا اور کانوں پر ہیڈ فون جما کر پائلون کمانڈر سے خود اس کتے کے بارے میں بات چیت کی۔ وہ کیسے آتا تھا کس طرح ان کے پاس کئی دن پڑا رہا۔ پھر ایک ایکی غائب ہو گیا اور رات بھر غائب رہا۔ اب

آیا ہے تو اس کے گلے میں رسی نظر آئی جس میں گتے کا ایک ٹکڑا تھا۔ اس پر جو عبارت لکھی تھی وہ اس نے تین چار مرتبہ دہرا کر پالٹون مائٹرو کو سنائی مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

بشیر الگ کتے کے پاس بیٹھ کر اسے کبھی پچکار کر کبھی ڈرا دھمکا کر پوچھتا رہا کہ وہ رات کہاں غائب رہا تھا اور اس کے گلے میں وہ رسی اور گتے کا ٹکڑا کس نے باندھا تھا مگر کوئی خاطر خواہ جواب نہ ملا۔ وہ جو سوال کرتا، اس کے جواب میں کتا اپنی دم ہلا دیتا۔ آخر غصے میں آ کر بشیر نے اسے پکڑ لیا اور زور سے جھٹکا دیا۔ کتا تکلیف کے باعث چاؤں چاؤں کرنے لگا۔

وائٹ لیس سے فارغ ہو کر صوبیدار ہمت خان نے کچھ دیر نقشے کا بغور مطالعہ کیا پھر فیصلہ کن انداز میں اٹھا اور سگریٹ کی ڈبیا کا ڈھکنا کھول کر بشیر کو دیا۔ ”بشیرے لکھ اس پر گور کبھی میں..... ان کیڑے مکوڑوں میں.....“

بشیر نے سگریٹ کی ڈبیا کا گتالیا اور پوچھا۔ ”کیا لکھوں صوبیدار صاحب!“
صوبیدار ہمت خان نے مونچھوں کو مروڑے دے کر سوچنا شروع کیا۔ ”لکھ دے..... بس لکھ دے!“ یہ کہہ اس نے جیب سے پنسل نکال کر بشیر کو دی۔
”کیا لکھنا چاہیے؟“

بشیر پنسل کے منہ کو لب لگا کر سوچنے لگا! پھر ایک دم سوالیہ انداز میں بولا۔
”پٹر سن؟.....“ لیکن فوراً ہی مطمئن ہو کر اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔
”ٹھیک ہے..... چپڑ جھمن جھمن کا جواب پٹر سن ہی ہو سکتا ہے..... کیا یاد رکھیں گے اپنی ماں کے سکھرے۔“

بیشر نے پنسل سگرٹ کی ڈیبا پر جمانی۔ ”پٹر سن؟“
 ”سولہ آنے..... لکھ..... سپ..... پٹر..... سن سن!“ یہ کہہ کر صوبیدار
 ہمت خاں نے زور کا تہقہہ لگایا۔ ”اور آگے لکھ..... یہ پاکستانی کتا ہے!“
 صوبیدار ہمت خاں نے گتا بشیر کے ہاتھ سے لیا۔ پنسل سے اس میں ایک
 طرف چھید کیا اور رسی میں پرو کر کتے کی طرف بڑھا۔ ”لے جا، یہ اپنی اولاد کے
 پاس!“

یہ سن کر سب جوان خوب ہنسے۔ صوبیدار ہمت خاں نے کتے کے گلے میں
 رسی باندھ دی۔ وہ اس دوران میں اپنی دم ہلاتا رہا۔ اس کے بعد صوبیدار نے
 اسے کچھ کھانے کو دیا اور بڑے ناصحانہ انداز میں کہا۔ ”دیکھو دوست خداری مت
 کرنا..... یاد رکھو خداری کی سزا موت ہوتی ہے!“

کتا دم ہلاتا رہا۔ جب وہ اچھی طرح کھا چکا تو صوبیدار ہمت خاں نے رسی
 سے پکڑ کر اس کا رخ پیٹری کی اکلوتی پگڈنڈی کی طرف پھیرا اور کہا۔ ”جاؤ.....
 ہمارا خط و شمنوں تک پہنچاؤ..... مگر دیکھو واپس آ جانا..... یہ تمہارے
 افسر کا حکم ہے، سمجھے؟“

کتے نے اپنی دم ہلائی اور آہستہ آہستہ پگڈنڈی پر جوہل کھاتی ہوئی نیچے
 پیٹری کے دامن میں جاتی تھی چلنے لگا۔ صوبیدار ہمت خاں نے اپنی ہندو اٹھائی
 اور ہوا میں ایک فائر کیا۔

فائر اور اس کی بازگشت دوسری طرف ہندوستانیوں کے مورچے میں سنی گئی۔
 اس کا مطلب ان کی سمجھ میں نہ آیا۔ جمعدار ہرنام سنگھ معلوم نہیں کس بات پر چڑچڑا

ہو رہا تھا، یہ آواز سن کر اور بھی چڑچڑاہو گیا۔ اس نے فابریکاکم دے دیا۔ آدھے گھنٹے تک چنانچہ دونوں مورچوں سے گولیوں کی بیکاربارش ہوتی رہی۔ جب اس شغل سے اکتا گیا تو جمعہ ارہرام سنگھ نے فائر بند کر دیا اور ڈاڑھی میں کنگھا کرنا شروع کر دیا۔ اس سے فارغ ہو کر اس نے جالی کے اندر سارے بال بڑے سلیتے سے جمائے اور بنتا سنگھ سے پوچھا۔ ”اوائے بنتا سیاں! چپڑجھن جھن کہاں گیا؟“ بنتا سنگھ نے چپڑکی شکل لکڑی سے بروزہ اپنے ماتنوں میں جدا کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے نہیں معلوم۔“

”کتے کو کھی ہضم نہیں ہوا؟“ ہرنام سنگھ نے کہا۔
بنتا سنگھ اس محاورے کا مطلب نہ سمجھا۔ ”ہم نے تو اسے کھی کی کوئی چیز نہیں کھلائی تھی۔“

یہ سن کر جمعہ ارہرام سنگھ بڑے زور سے ہنسا۔ ”اوائے ان پڑھ..... تیرے ساتھ تو بات کرنا پچانوئیں کا گھانا ہے!“
اسنے میں وہ سپاہی جو پہرے پر تھا اور دو زمین لگائے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا ایک دم پٹایا۔ ”وہ..... وہ آ رہا ہے!“

سب چونک پڑے۔ جمعہ ارہرام سنگھ نے پوچھا۔ ”کون؟“
پہرے کے سپاہی نے کہا۔ ”کیا نام تھا اس کا؟..... چپڑجھن جھن!“
”چپڑجھن جھن؟“ یہ کہہ کر جمعہ ارہرام سنگھ اٹھا۔ ”کیا کر رہا ہے۔“
پہرے کے سپاہی نے جواب دیا۔ ”آ رہا ہے۔“
جمعہ ارہرام سنگھ نے دو زمین اس کے ہاتھ سے لی اور دیکھنا شروع کیا

دوسرے مورچے میں صوبیدار ہمت خاں نے دور بین میں سے دیکھا کہ کتا پگڈنڈی پر کھڑا ہے۔ ایک اور فائر ہوا تو وہ دم دبا کر اسی طرف بھاگا۔ صوبیدار ہمت خاں کے مورچے کی طرف۔ وہ زور سے پکارا۔ ”بہادر ڈرائیں کرتے..... چل واپس“ اور اس نے ڈرانے کے لیے ایک فائر کیا۔ کتا رگ گیا۔ ادھر سے جمعدار ہر نام سنگھ نے بندوق چلائی۔ گولی کتے کے کان سے سنسناتی ہوئی گزر گئی۔ اس نے اچھل کر زور زور سے دونوں کان پھڑپھڑانے شروع کیے۔ ادھر سے صوبیدار ہمت خاں نے دوسرا فائر کیا جو اس کے اگلے بچوں کے پاس پتھروں میں پیوست ہو گیا۔ بوکھلا کر کبھی وہ ادھر دوڑا، کبھی ادھر۔ اس کی اس بوکھلاہٹ سے ہمت خاں اور ہر نام دونوں بہت مسرور ہوئے اور خوب تہقیر لگاتے رہے۔ کتے نے جمعدار ہر نام سنگھ کے مورچے کی طرف بھاگنا شروع کیا۔ اس نے یہ دیکھا تو بڑے تاؤ میں آ کر موٹی سی گالی دی اور اچھی طرح شست باندھ کر فائر کیا۔ گولی کتے کی ٹانگ میں لگی۔ ایک فلک شکاف چیخ بلند ہوئی۔ اس نے اپنا رخ بدلا۔ لنگڑا لنگڑا کر صوبیدار ہمت خاں نے مورچے کی طرف دوڑنے لگا تو ادھر سے بھی فائر ہوا، مگر وہ صرف ڈرانے کے لیے کیا گیا تھا۔ بہادر پروا نہیں کیا کرتے، زخموں کی

.....کھیل جاؤ اپنی جان پر..... جاؤ..... جاؤ!
کتافار سے گھبرا کر مڑا۔ ایک ٹانگ اس کی بالکل بیکار ہو گئی تھی۔ باقی تین
ٹانگوں کی مدد سے اس نے خود کو چند قدم دوسری جانب گھسیٹا کہ جمعدار ہر نام سنگھ
نے نشانہ تاک کر گولی چلائی جس نے اسے وہیں ڈھیر کر دیا۔
صوبیدار ہمت خاں نے افسوس کے ساتھ کہا۔ ”بیچ بیچ..... شہید ہو گیا
ہے بے چارہ!“
جمعدار ہر نام سنگھ نے بندوق کی گرم گرم ہال اپنے ہاتھ میں لی اور کہا۔ ”وہی
موت مرا جو کتے کی ہوتی ہے!“

۱۰۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء

جسم اور روح

مجیب نے اچانک مجھ سے سوال کیا۔ ”کیا تم اس آدمی کو جانتے ہو۔“
گفتگو کا موضوع یہ تھا کہ دنیا میں ایسے کئی اشخاص موجود ہیں جو ایک منٹ کے
اندرا اندر لاکھوں اور کروڑوں کو ضرب دے سکتے ہیں ان کی تقسیم کر سکتے ہیں۔
آنے پانی کا حساب چشم زدن میں آپ کو بتا سکتے ہیں۔
اس گفتگو کے دوران میں معنی یہ کہہ رہا تھا۔ ”انگلستان میں ایک آدمی ہے جو
ایک نظر دیکھ لینے کے بعد فوراً بتا دیتا ہے کہ اس قطعہ زمین کا طول و عرض کیا ہے
..... رقبہ کتنا ہے..... اس نے اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ وہ اپنی اس
خداداد صلاحیت سے شک آگیا ہے وہ جب بھی کہیں باہر کھلے کھیتوں میں نکلتا ہے
تو ان کی ہر دلکشی، ان کا حسن اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور وہ اس قطعہ
زمین کی پیمائش اپنی آنکھوں کے ذریعہ سے شروع کر دیتا ہے۔ ایک منٹ کے
اندرا اندر وہ اندازہ کر لیتا ہے کہ زمین کا یہ ککڑا کتنا رقبہ رکھتا ہے اس کی لمبائی کتنی ہے
چوڑائی کتنی ہے پھر اسے مجبوراً اپنے اندازے کا امتحان لینا پڑتا ہے۔ فیلڈ ٹیپ کے
ذریعہ سے اس خطہ زمین کو بھانپتا اور وہ اس کے اندازے کے عین مطابق نکلتا اگر
اس کا اندازہ غلط ہوتا تو اسے بہت تسکین ہوتی۔ بعض اوقات فاتح اپنی شکست
سے بھی ایسی لذت محسوس کرتا ہے جو اسے فتح سے نہیں ملتی اصل میں شکست دوسری
شامندار فتح کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔“
میں نے معنی سے کہا۔ ”تم درست کہتے ہو..... دنیا میں ہر قسم کے عجائبات

”موجود ہیں۔“

میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ مجیب جو اس گفتگو کے دوران کافی پی رہا تھا اچانک مجھ سے سوال کیا۔

”کیا تم اس آدمی کو جانتے ہو۔“

میں سوچنے لگا کہ مجیب کس آدمی کے متعلق مجھ سے پوچھ رہا ہے۔ حامد نہیں..... وہ آدمی نہیں میرا دوست ہے۔

میں اس کے متعلق کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہو سکتی تھی۔ شبیر..... اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ آخر یہ کس آدمی کا حوالہ دیا گیا تھا۔ میں نے مجیب سے کہا۔ ”تم کس آدمی کا حوالہ دے رہے ہو۔“

مجبیب مسکرایا۔ ”تمہارا حافظہ بہت کمزور ہے۔“

”بھئی میرا حافظہ تو بچپن سے ہی کمزور ہے۔ تم پہیلیوں میں باتیں نہ کرو..... بناؤ وہ کون آدمی ہے۔ جس سے تم میرا تعارف کرانا چاہتے ہو۔“

مجبیب کی مسکراہٹ میں اب ایک طرح کا اسرار تھا۔ ”بوجھ لو۔“

”میں کیا بوجھوں گا جبکہ وہ آدمی تمہاری پیٹ میں ہے۔“

عارف، اصغر اور مسعود بے اختیار ہنس پڑے عارف نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”وہ آدمی اگر مجیب کے پیٹ میں ہے تو آپ کو اس کی پیدائش کا انتظار کرنا پڑے گا۔“

میں نے مجیب کی طرف ایک نظر دیکھا اور عارف سے مخاطب ہوا۔ ”میں اپنی ساری عمر اس مہدی کی ولادت کا انتظار نہیں کر سکتا ہوں۔“

مسعود نے اپنے سگریٹ کو ایس ٹرے کے قبرستان میں دفن کرتے ہوئے کہا۔ ”دیکھئے صاحبان ہمیں اپنے دوست مجیب کی بات کا مذاق نہیں اڑانا چاہیے۔“ یہ کہہ کر وہ مجیب سے مخاطب ہوا۔ ”مجیب صاحب فرمائیے آپ کو کیا کہنا ہے..... ہم سب بڑے غور سے سنیں گے۔“

مجیب جموڑی دیر خاموش رہا۔ اس کے بعد اپنا بچھا ہوا چرٹ ساگلا کر بولا۔ ”معذرت چاہتا ہوں کہ میں نے اس آدمی کے متعلق آپ سے پوچھا۔ جسے آپ جانتے نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”مجیب تم کیسی باتیں کرتے ہو۔ بہر حال تم اس آدمی کو جانتے ہو۔“

مجیب نے بڑے وثوق کے ساتھ کہا۔ ”بہت اچھی طرح..... جب ہم دونوں برما میں تھے تو دن رات اکٹھے رہتے تھے۔ عجیب و غریب آدمی تھا۔“

مسعود نے پوچھا۔ ”کس لحاظ سے۔“

مجیب نے جواب دیا۔ ”ہر لحاظ سے..... اس جیسا آدمی آپ نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔“

میں نے کہا۔ ”بھائی مجیب اب بتا بھی دو وہ کون حضرت تھے۔“

”وہ بس حضرت ہی تھے۔“

عارف مسکرایا۔ ”پلو قہہ ختم ہوا..... وہ حضرت تھے اور بس.....“

مسعود یہ جاننے کے لیے بے تاب تھا کہ وہ حضرت کون تھے؟ ”بھئی مجیب تمہاری ہر بات نرالی ہوتی ہے۔ تم بتاتے کیوں نہیں ہو کہ وہ کون آدمی تھا۔ جس کا

وہی آنکھ کے نیچے زخم کا نشان ہے۔ آپ نے بھنویں موڑ دی ہوئی ہیں۔ موزے
فلاں ساخت کے پہنے ہوئے تھے میض پوچلین کی تھی مگر گھر میں دھلی ہوئی۔“

یہ سن کر میں نے واقعہ محسوس کیا کہ جس شخص کا ذکر مجیب کر رہا ہے عجیب و
غریب ہستی کا مالک ہے چنانچہ میں نے اس سے کہا۔ ”بڑا معرکہ خیز آدمی تھا۔“

”جی ہاں..... بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ..... اس کو اس بات کا زعم تھا کہ
اگر وہ کوئی منظر، کوئی مرد، کوئی عورت صرف ایک نظر دیکھ لے تو وہ اسے من و عن
اپنے الفاظ میں بیان کر سکتا ہے۔ جو کبھی غلط نہیں ہوں گے اور اس میں کوئی شک
نہیں کہ اس کا اندازہ ہمیشہ درست ثابت ہوتا تھا۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا یہ واقعی درست تھا۔“

”سو فیصد..... ایک مرتبہ میں نے اس سے بازار میں پوچھا۔ یہ لڑکی جو
ابھی ابھی ہمارے پاس سے گزری ہے۔ کیا تم اس کے متعلق بھی تفصیلات بیان کر
سکتے ہو۔“

میں اس لڑکی سے ایک گھنٹہ پہلے مل چکا تھا۔ وہ ہمارے ہمسائے مسٹر لوجوئے
کی بیٹی تھی اور میری بیوی سے سلائی کے مستعار لینے آئی تھی میں نے اسے غور سے
دیکھا۔ اس لیے بغرض امتحان میں نے مجیب سے یہ سوال کیا تھا۔
مجیب مسکرایا۔

”تم میرا امتحان لینا چاہتے ہو۔“

”نہیں..... نہیں..... یہ بات نہیں..... میں..... میں۔“
”نہیں..... تم میرا امتحان لینا چاہتے ہو۔ خیر سنو..... وہ لڑکی جو ابھی

ابھی ہمارے پاس سے گزری ہے اور جسے..... جسے میں اچھی طرح نہیں دیکھ سکا..... مگر لباس کے متعلق کچھ کہنا فضول ہے اس لیے کہ ہر وہ شخص جس کی آنکھیں سلامت ہوں اور ہوش و حواس درست ہوں کہہ سکتا ہے کہ وہ کس قسم کا تھا۔ ویسے ایک چیز جو مجھے اس میں خاص طور پر دکھائی دی وہ اس کے داہنے ہاتھ کی چھنگلیا تھی اس میں کسی قدر خم ہے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کا ناخن مضروب تھا۔ اس کے لپ اسٹک لگے ہونٹوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ آرائش کے فن سے محض کوری ہے۔“

مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ اس نے ایک معمولی سی نظر میں یہ سب چیزیں کیسے بھانپ لیں..... میں ابھی اسی حیرت میں غرق تھا کہ مجیب نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اس میں جو خاص چیز مجھے نظر آئی وہ اس کے داہنے گال کا داغ تھا..... ناٹبالا ہو رسول پھوڑے کا ہے۔“

مجیب کا کہنا درست تھا..... میں نے اس سے پوچھا۔ ”یہ سب باتیں جو تم اتنے وثوق سے کہتے ہو تمہیں کیونکر معلوم ہو جاتی ہیں۔“

مجیب مسکرایا۔ ”میں اس کے متعلق کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اس لیے کہ میں سمجھتا ہوں ہر آدمی کو صلابت نظر ہونا چاہیے۔ صلابت نظر سے میری مراد ہر اس شخص سے ہے جو ایک ہی نظر میں دوسرے آدمی کے تمام خدو خال دیکھ لے۔“

میں نے اس سے پوچھا۔

”خدو خال دیکھنے سے کیا ہوتا ہے؟“

”بہت کچھ ہوتا ہے..... خدو خال ہی تو انسان کا صحیح کردار بیان کرتے ہیں۔“

”کرتے ہوں گے۔ میں تمہارے اس نظریے سے متفق نہیں ہوں۔“

”نہ ہوں..... مگر میرا نظریہ اپنی جگہ قائم رہے گا۔“

”رہے..... مجھے اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے..... ہو سکتا ہے تم غلطی پر ہو۔“

”یا غلطیاں درستوں سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہیں۔“

”یہ تمہارا عجیب فلسفہ ہے۔“

”فلسفہ گائے کا گوبر ہے۔“

”اور گوبر۔“

مجیب مسکرایا۔ ”وہ..... وہ..... اچھا کہہ لیجیے۔ جو ایندھن کے کام آتا ہے۔“

ہمیں معلوم ہوا کہ مجیب ایک لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو گیا ہے پہلی ہی نگاہ میں اس نے اس کے جسم کے ہر خدو خال کا صحیح جائزہ لے لیا تھا۔ وہ لڑکی بہت متاثر ہوئی جب اسے معلوم ہوا کہ دنیا میں ایسے آدمی بھی موجود ہوں جو صرف ایک نظر میں سب چیزیں دیکھ جاتے ہیں تو وہ مجیب سے شادی کرنے کے لیے رضامند ہو گئی۔ ان کی شادی ہو گئی..... دلہن نے کیسے کپڑے پہنے تھے اس کی دائیں کلائی میں کس ڈیزائن کی دست پلچھی تھی..... اس میں کتنے گلینے تھے۔

یہ سب تفصیلات اس نے ہمیں بتائیں۔

ان تفصیلات کا خلاصہ یہ ہے کہ ان دونوں میں طلاق ہو گئی۔

جنگل مینوں کا برش

یہ غالباً آج سے بیس برس پیچھے کی بات ہے۔ میری عمر یہی کوئی کوئی بائیس برس کے قریب ہوگی، یا شاید اس سے دو برس کم۔ کیونکہ تاریخوں اور سنوں کے معاملے میں میرا حافظہ بالکل صفر ہے۔ میری دوستی کا حلقہ ان نوجوانوں پر مشتمل تھا جو عمر میں مجھ سے کافی بڑے تھے۔

حفیظ پینٹر کی دکان میں جو بکلی والے چوک سے بائیس ہاتھ بازار کے پاس ہی واقع تھی، ہم سب بیٹھتے اور گھنٹوں گپ بازی ہوتی رہتی۔ میں پڑھائی وڑھائی قریب قریب چھوڑ چکا تھا۔ اسی طرح مبارک اپنی ملازمت پر اٹ مار کر امرتسر واپس چلا آیا تھا۔ وہ کسی ریاست میں ملازم تھا۔ حفیظ پینٹر کی اپنی باپ سے بچ ہو گئی تھی۔ اس لیے اس نے علیحدہ ایک بڑی دکان جس میں کچھ عرصہ پہلے ایک کمیونسٹ سکھ کی دکان تھی، جو گر امونون ڈیلر تھا۔ خیر دین کی مسجد سے ملحقہ دکان ہال بازار میں تھی، مگر اچھے موقع پر تھی۔ یعنی عین ہال بازار کے وسط میں اور مسجد کے زیر سایہ خرابات مرعہ اصولوں کے ماتحت ہونی ہی چاہیے۔ اس لیے وہ اسے بہت پسند آگئی تھی۔ ادھر اذان ہوتی تو ادھر ریکارڈ بجاتے۔ لیکن کوئی دنگہ فساد اس بات پر وہاں کبھی نہ ہوا۔ البتہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر سینکڑوں خون ہوتے رہتے۔ امرہ پرستی پر، رنڈی بازی پر، گندوں کی دو مخالف پارٹیوں پر، ایسے مسلم مسلم اور مسلم ہندو فساد عام تھے۔ جو ایک دو دن اپنی دھاک بٹھا کر جھاگ کے مانند غائب ہو جاتے۔ گرمی کی پیلی پیلی بھڑوں کے مانند جو اپنے ارد گرد جال اتن لیتی ہیں

اور بظاہر بالکل مردہ ہو جاتی ہیں لیکن معلوم نہیں پھر موافق موسم آنے پر زندہ ہو جاتی ہیں اور بے قصور آدمیوں کو کانٹے کے شغل میں مصروف ہو جاتی ہیں۔

امرتسر ایک عجیب و غریب شہر ہے۔ یہاں ہر ایک قسم کی شے اس زمانے میں پائی جاتی تھی۔ بھگتنوں کی لڑائی سے لے کر گورنمنٹ سے پنچہ کشی کرنے تک۔ لوگ بھی بھانت بھانت کے تھے۔ الے جو اپنی بزاز کی دکانوں پر پادرتے رہتے اور کچھ ایسے من چلے بھی تھے جو چھوٹے چھوٹے پٹا بناتے تھے کہ لوگوں کے دل ایک لمٹے کے لیے دہل جاتے۔ دہشت پسند بھی تھے اور امن پسند بھی۔ نمازی اور پرہیزگار بھی تھے اور اول درجے کے اوباش اور گناہ گار بھی۔ مسخیر تھیں اور مندر بھی۔ ان میں گناہ کے کام بھی ہوتے تھے اور ثواب کے بھی۔

غرض یہ کہ انسانی زندگی کے یہ سب دھارے ساتھ ساتھ متواتر بہا کرتے تھے..... کئی سیاسی تحریکیں ہوئیں۔ کئی گنڈوں کا آپس میں کشت خون ہوا۔ مسلمانوں اور قادیانیوں میں کئی مباہلے ہوئے، جن میں بڑے جفا داری علمائے کرام نے حصہ لیا۔ قحط پڑے، وبائیں آئیں۔ جلیاں والا کاتارینجی حادثہ ہوا، ہزاروں انسان، جن میں مسلمان، سکھ، ہندو سب شامل تھے، موت کے گھاٹ اتارے گئے، لیکن امرتسر جوں کا توں رہا۔

حفیظ جینٹر کی دکان پر یوں تو دنیا بھر کے سیاسی، مجلسی اور معاشی مسائل پر تبادلہ خیالات اور بحث ہوتی رہتی، مگر بڑے خادم انداز میں۔ اصل میں وہ سب کے سب آرٹسٹ تھے۔ گو نیم رس..... ان کو دراصل موسیقی سے شغف تھا۔ کوئی طبلہ کی جوڑی اٹھا لیتا، کوئی ستار، کوئی سارنگی اور کوئی تانپورہ ہاتھ میں لے کر میاں کی

ٹوڈی، مالکوس یا بھاگیری کا الاپ شروع کر دیتا۔

یہاں بھنگ بھی گھوٹی جاتی، جس بھرے سگریت بھی پئے جاتے، شراب کے دورا کٹر چلتے، اس لیے کہ دن اتنا بڑا ہے باک نہیں تھا۔ ساڑھے آٹھ روپے میں ایک پوری بوتل بڑھیا سے بڑھیا اسکاچ و سکی کی آ جاتی تھی۔ حفیظ شام کو اپنی دکان کے بھاری بھر کم کواڑ بند کر دیتا اور ہم چٹائیوں پر بیٹھ کر اس مشروف سے آہستہ آہستہ اطف اندوز ہوتے۔ پھر آدھی رات کو جب آس پاس کی ساری دکانیں بند ہوتیں ہم موسیقی کا دور شروع کر دیتے۔

یہاں قریب قریب سب گوینے، بڑے اور چھوٹے فن کا مظاہرہ کر چکے تھے۔ اس لیے کہ زندہ دل نوجوانوں کی محفل تھی۔ بھلو بازی بھی ہوتی تو کوئی برا نہ مانتا تھا۔

ایک دن میں صبح دس بجے کے قریب حفیظ پیئٹر کی دکان کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اس لیے کہ مجھے ذرا آگے چل کر ایک کیسٹ کی دکان سے اپنے کان کے لیے دو الینا تھی کہ حفیظ نے برش کان میں اڑس کر مجھے با آواز بلند پکارا اور اسی کان میں اڑے ہوئے برش کو نکال کر اس سے مجھے اشارہ کیا، جس کا یہ مطلب تھا کہ میں اس کی بات سنتا جاؤں۔

میں اس کی دکان کے تھڑے کے پاس کھڑا ہو گیا اور اس سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے حفیظ صاحب؟“

حفیظ نے برش پھر کان میں اڑس لیا اور جواب دیا۔ ”بات یہ ہے میری جان کہ آج تو کل کا گانا ہو گا۔ اس کے ساتھ مچھر خان اور بے خان بھی ہوں گے

.....وہ معاملہ بھی ہوگا.....چھ بجے سے پہلے پہلے ہی آ جانا.....میں
نے تمام دوستوں کو اطلاع دے دی ہے۔ تو کل کو میں نے سنا تو نہیں لیکن نئے
خیال کے لوگ اسے بہت پسند کر رہے ہیں۔ نوجوان ہے۔ کہتے ہیں کہ خاں
صاحب کے عاشق کے مانند بے ڈارگاتا ہے اور حق ادا کرتا ہے۔“

میں بہت خوش ہوا۔ ”آؤں گا اور ضرور آؤں گا۔ مگر یہ مجھ پر خاں کیا بلا ہے
.....کیا تم اسے کسی مجھ پر دانی کے اندر بٹھاؤ گے؟“

حفیظ بیٹہ کھلکھلا کر ہنسا۔ ”ارے نہیں یار! اس کی عادت ہے کہ جب کوئی تان
لیتا ہے اور واپس سم پر آتا ہے اور بڑے زور سے اپنی رانوں پر دو ہتھ مارتا ہے
.....اس لیے اس کا نام مجھ پر خاں پڑ گیا ہے۔ جیسے وہ گانٹیں رہا، بلکہ اپنے بدن
پر کانٹے والے مجھ پر مار رہا ہے۔“

میں نے اس سے کہا۔ ”چلو.....اس کا تماشہ بھی دیکھ لیں گے.....پر
اگر اس نے آج رات کوئی مجھ پر نہ مارا تو یہ طے ہے کہ تمہارے آرٹ اسٹوڈیو سے
وہ زندہ باہر نہیں نکلے گا۔“

حفیظ کھلکھلا کر ہنسا، کان میں سے اڑسا ہوا ہر شے نکالا اور سائن بورڈ پینٹ کرنے
لگا۔ ”جاؤ یا جاؤ.....میرا وقت ہرج کر رہے ہو.....مجھے یہ کام وقت پر
مکمل کرنا ہے۔“

میں وہاں سے چلا گیا.....کیسٹ کی دکان سے دو آئی لی۔ باہر نکلا تو شیخ
صاحب جو وہاں کے بہت بڑے رئیس تھے، ان سے دو آدمی دکان کے پاس
کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے شیخ صاحب کو سلام کیا.....انہوں نے

جیسا کہ ان کی عادت تھی، چھڑی بجلی کے کھمبے کے ساتھ ماری۔ جب آواز پیدا ہوئی تو ان کا اطمینان ہو گیا تو وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ”کہو، بھی سعادت کیا حال ہے؟“

میں نے عرض کی۔ ”جناب کی دعا سے سب ٹھیک ہے۔“
 جن دو آدمیوں سے شیخ صاحب باتیں کر رہے تھے، وہ سیاہ فارم تھے، لیکن اچکن کا رنگ ان کے رنگ سے کہیں زیادہ کالا۔
 دہلا، پتلا لیکن چہرے کے نقش تیکھے۔ شیخ صاحب چلنے لگے تو اس آہوی گوشت پوست کے ٹکڑے نے تیزی سے بڑھ کر شیخ صاحب کے کوٹ کی پیٹھ جھاڑنی شروع کی، بڑی نفاست سے، شیخ صاحب نے گرما کر اس سے پوچھا۔
 ”کیا بات تھی؟“

اس آہوی آدمی نے بڑی پتلی آواز میں جواب دیا۔ ”چند بال تھے اور چھوڑی سی گرد۔“
 شیخ صاحب نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا۔ ”اچھا تم کل صبح گھر پہ آنا، اور وہ پھر بجلی کے کھمبے کو اپنی چھڑی سے بجاتے ہوئے غالباً کمپنی باغ کی طرف نکل گئے۔“

ایک دن میں نے پھر اسے دیکھا۔ اپنے کمرے کے بازار میں وہ دو دالوں کی مصاجی میں مصروف تھا۔ اس نے صاف ستھرے کوٹوں پر سے کئی مرتبہ غیر مرئی چیزیں جدا کیں۔ اس دن بھی وہ اپنی کالی اچکن پہنے تھا۔ حالانکہ کالے کپڑے پر گرد و غبار فوراً نمایاں ہوتا ہے، مگر میں نے غور سے دیکھا کہ اس پر ایسی کوئی چیز بھی

نہیں تھی۔ میرا خیال ہے وہ جنٹل مینوں کے برش کے علاوہ اپنا برش خود بھی تھا۔
 مجھے راستے میں ایک دوست مل گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”یہ آبنوی
 آدمی کون ہے؟“
 اس نے حیرت سے پوچھا۔ ”کون سا آبنوی آدمی..... بن مانس سے تھے مگر
 آبنوی کہاں سے تم نے لکھ لیا۔“
 میں نے اس سے ذرا تیز لہجے میں کہا۔ ”ارے یہ آدمی جو ہمارے آگے آگے
 جا رہا ہے..... چغد ہو پر لے درجے کے۔ کیا اتنا بھی نہیں جانتے کہ آبنوس ایک
 لکڑی ہوتی ہے۔“
 ”تو کیا یہ لکڑی ہے جو چل پھر رہی ہے؟“
 ”اے نہیں..... آبنوس کا رنگ کالا ہوتا ہے، چونکہ اس نے کالی اچکن پہنی
 ہے۔“
 اور رنگ بھی اس کا خدا کے فضل و کرم سے خاصا کالا ہے، تو میں نے اسے
 آبنوی آدمی کہہ دیا۔
 میرا دوست ہنسا ”ارے، تم اسے نہیں جانتے، اس کا نام جنٹل مینوں کا برش
 ہے۔“
 ”اتنا تو میں جانتا ہوں۔“
 ”تو اس سے زیادہ تم اور کیا جاننا چاہتے ہو؟“
 میں نے چکر کہا ”یہی کہ اس کا محل وقوع کیا ہے۔۔۔۔ اس کا پیشہ کیا ہے؟“
 میرا دوست مسکرایا ”یہ ذات کا ربانی ہے، جو دربار صاحب میں چوکی کرتے

ہیں۔۔۔ مگر یہ ہاں نہیں جاتا“

”کیوں؟“

”بس اس کو امیروں کی صحبت حاصل ہے ان میں ہی اٹھتا بیٹھتا ہے اور ان کے کوٹوں پر برس کرتا رہتا ہے۔“

میں نے اس سے پوچھا ”کھاتا پیتا کہاں سے ہے؟“

جواب ملا ”جن کی مصاحب داری کرتا ہے۔۔۔ اس کے علاوہ گاتا بہت اچھا ہے۔“

میں نے پوچھا ”تم نے کبھی سنا ہے اس کو؟“

”نہیں، البتہ تعریف بہت سنی ہے“

ہم باتوں میں مشغول پیچھے رہ گئے اور وہ جنٹل مینوں کا آہوشی برش ان دو ایلوں کے کوٹ جھاڑتا بہت دور نکل گیا

جموڑی دیر کے بعد میرا دوست بھی مجھ سے جدا ہو گیا اس کو کوئی ضروری کام تھا ورنہ میں اس شخص کے متعلق کچھ اور معلومات حاصل کرتا۔

اتفاق سے مجھے اپنے بہنوئی (جو امرتسر کے آنریری مجسٹریٹ تھے اور خدا معلوم کیا کیا تھے) کے ساتھ ایک تقریب پر جانا پڑا۔ اب مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ وہ تقریب تھی جو نئے ڈپٹی کمشنر کے تقرر کے سلسلے میں تھی وہ شخص وہی کالی اچکن پنے معزز اور رئیس لوگوں کے ارد گرد چکر لگا رہا تھا اس نے بلا مبالغہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر چن چن کر کئی روسا کے کوٹ صاف کیے۔ اپنی پتلی پتلی انگلیوں سے۔ کسی کے کالر پر سے اس نے بال اٹھائے کسی کے کوٹ کی پیٹھ پر

سے۔۔۔ بعضوں کے کوٹوں کو، جب اس کی سمجھ میں نہ آیا وہ گرد اپنے رومال سے
جھاڑ دی اور ہر ایک سے شکریہ وصول کیا۔

بڑی جرأت سے کام لے کر وہ ڈپٹی کمشنر بہادر کے پاس بھی جا پہنچا، اور اس
کی پتلون صاف کر دی وہ انگریز تھا اس نے جنرل مینوں کے برش کا تہہ دل سے
شکریہ ادا کیا۔

اس کے بعد ایک رات جب کہ ہلکی ہلکی بوند باندی ہو رہی تھی اور حفیظ پینسر کی
دکان میں ہم معشوق علی فونو گرافر سے اس کا گانا سن کر محظوظ ہو رہے تھے، اور ساتھ
ساتھ وہ سکی بھی پی رہے تھے، کہ اچانک دکان کا پھانک نما دروازہ کھلا اور جنرل مینوں
کا برش نمودار ہوا۔ اس نے ہم سے مخاطب ہو کر کہا ”میں ادھر سے گزر رہا تھا کہ
گانے کی آواز سنائی دی۔۔۔ ماشاء اللہ بڑی سریلی تھی۔۔۔ ہے تو یہ تہذیب کے
خلاف کہ میں بن بلائے چلا آیا۔۔۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو کیا جموڑی دیر
کے لیے آپ کی محفل میں شریک ہو سکتا ہوں“

حفیظ پینسر اور معشوق علی فونو گرافر بیک وقت بولے ”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں
تشریف رکھیے۔“

مبارک نے کہا ”سر آنکھوں پر۔۔۔۔۔ یہاں میرے پاس
بیٹھے۔۔۔۔۔ آپ تو خود بڑے معرکے کے گانے والے ہیں۔۔۔ کچھ نوش
فرمائیے گا“

مبارک کی مراد وہ سکی سے تھی، مگر جنرل مینوں کے برش نے بڑی شائستگی سے
کہا ”جی نہیں۔۔۔۔۔ میں اس نعمت سے محروم ہوں“

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

جھوٹی کہانی

کچھ عرصے سے اقلیتیں اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے بیدار ہو رہی تھیں ان کو خواب گراں سے جگانے والی اکثریتیں تھیں جو ایک مدت سے اپنے ذاتی فائدے کے لیے ان پر دباؤ ڈالتی رہی تھیں اس بیداری کی لہر نے کئی انجمنیں پیدا کر دی تھیں ہوٹل کے بیروں کی انجمن، جاموں کی انجمن، بکروں کی انجمن، اخبار میں کام کرنے والے صحافیوں کی انجمن، ہر اقلیت اپنی انجمن یا تو بنا چکی تھی یا بنا رہی تھی تاکہ اپنے حقوق کی حفاظت کر سکے۔

ایسی ہر انجمن کے قیام پر اخباروں میں تبصرے ہوتے تھے اکثریت کے حمایتی ان کی مخالفت کرتے تھے اور اقلیت کے طرف دار موافقت غرضیکہ کچھ عرصے سے ایک اچھا خاصا ہنگامہ برپا تھا جس سے رونق لگی رہتی تھی مگر ایک روز جب اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی کہ ملک کے دس نمبرنی غنڈوں نے اپنی انجمن قائم کی ہے تو اکثریتیں اور اقلیتیں دونوں سنسنی زدہ ہو گئیں۔ شروع شروع میں تو لوگوں نے خیال کیا کہ بے پر کی اڑادی ہے کسی نے پر جب اس انجمن نے اپنے اغراض و مقاصد شائع کیے اور ایک باقاعدہ منشور ترتیب دیا تو پتا چلا کہ یہ کوئی مذاق نہیں۔ غنڈے اور بد معاش واقعی خود کو اس انجمن کے سائے تلے متحد اور منظم کرنے کا پورا پورا تہیہ کر چکے ہیں۔

اس انجمن کی ایک دو مینٹلیس ہو چکی تھیں ان کی روداد اخباروں میں شائع ہو چکی تھی لوگ پڑھتے اور دم بخود ہو جاتے بعض کہتے کہ بس اب قیامت آنے میں

زیادہ دیر باقی نہیں۔

اغراض و مقاصد کی ایک لمبی چوڑی فہرست تھی جس میں یہ کہا گیا تھا کہ غنڈوں اور بد معاشوں کی یہ انجمن سب سے پہلے تو اس بات پر صدائے احتجاج بلند کرے گی کہ معاشرے میں ان کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے وہ بھی دوسروں کی طرح بلکہ ان کے مقابلے میں کچھ زیادہ امن پسند شہری ہیں ان کو غنڈے اور بد معاش نہ کہا جائے اس لیے کہ اس سے ان کی تذلیل و توہین ہوتی ہے وہ خود اپنے لیے کوئی مناسب اور معزز نام تجویز کر لیتے۔ مگر اس خیال سے کہ اپنے منہ میاں مٹھو کی کہاوت ان پر چسپاں نہ ہو، وہ اس کا فیصلہ عوام و خواص پر چھوڑتے ہیں چوری چکاری ڈکیتی اور رہزنی، جیب تراشی اور جعل سازی، پتے بازی اور بلیک مارکیٹنگ وغیرہ، انفعال قبیحہ کے بجائے فنون لطیفہ میں شمار ہونے چاہئیں ان لطیف فنون کے ساتھ اب تک جو براسلوک روا رکھا گیا ہے اس کی مکمل تلافی اس یونین کا نصب العین ہے۔

ایسے ہی کئی اور اغراض و مقاصد تھے جو سننے اور پڑھنے والوں کو بڑے عجیب و غریب معلوم ہوتے تھے بظاہر ایسا تھا کہ چند بے فکرے ظریفوں نے لوگوں کی تفریح کے لیے یہ سب باتیں گھڑی ہیں۔ یہ چٹکلہ ہی تو معلوم ہوتا تھا کہ یونین اپنے ممبروں کی قانونی حفاظت کا ذمہ لے گی اور ان کی سرگرمیوں کے لیے سازگار اور خوشگوار فضا پیدا کرنے کے لیے پوری پوری جدوجہد کرے گی وہ حکام وقت پر زور دے گی کہ یونین کے ہر رکن پر اس کے مقام اور رتبے کے لحاظ سے مقدمہ چلایا جائے اور سزا دیتے وقت بھی اس کو پیش نظر رکھا جائے۔ حکومت لوگوں کو اپنے

گھروں میں چوروں کا برقی الارم نہ لگانے دے اس لیے کہ بعض اوقات یہ ہلاکت خیز ثابت ہوتا ہے جس طرح سیاسی قیدیوں کو جیل میں اسے اور بی کا اس کی مراعات دی جاتی ہیں، اسی طرح اس یونین کے ممبروں کو دی جائیں یونین اس بات کا بھی ذمہ لیتی تھی کہ وہ اپنے ممبروں کو ضعیف اور نا کارہ یا کسی حادثے کا شکار ہو جانے کی صورت میں ہر ماہ گزارے کے لیے معقول رقم دے گی جو ممبر کسی خاص شعبے میں مہارت حاصل کرنے کے لیے باہر کے ممالک میں جانا چاہے گا اسے وظیفہ دے گی وغیرہ وغیرہ۔

ظاہر ہے کہ اخباروں میں اس یونین کے قیام پر خوب تبصرہ بازی ہوئی قریب قریب اس کے خلاف تھے بعض رجعت پسند کہتے تھے کہ یہ کمیونزم کی انتہائی شکل ہے اور اس کے بانیوں کے ڈانڈے کریملن سے ملاتے تھے حکومت سے چنانچہ بار بار درخواست کی جاتی کہ وہ اس فتنے کو فوراً کچل دے، کیونکہ اگر اس کو ذرا بھی پنپنے کا موقع دیا گیا تو معاشرے میں ایسا زہر پھیلے گا کہ اس کا تریاق ماننا مشکل ہو جائے گا۔

خیال تھا کہ ترقی پسند اس یونین کی طرف داری کریں گے کہ اس میں ایک جدت تھی اور پرانی قدروں سے ہٹ کر اس نے اپنے لیے ایک بالکل نیا راستہ تلاش کیا تھا اور پھر یہ کہ رجعت پسند اسے کمیونسٹوں کے اختراع سمجھتے تھے مگر حیرت ہے کہ تقلیدتوں کے یہ سب سے بڑے طرفدار پہلے تو اس معاملے میں خاموش رہے اور بعد میں دوسروں کے ہم نوا ہو گئے اور اس یونین کی حق کنی پر زور دینے لگے۔

اخباروں میں ہنگامہ برپا ہوا تو ملک کے گوشے گوشے میں اس یونین کے قیام

کے خلاف چلے ہوئے گئے۔ قریب قریب ہر پارٹی کے نامی و گرامی لیڈروں نے پلیٹ فارم پر آکر اس ننگ تہذیب و تمدن جماعت کو ملعون قرار دیا اور کہا کہ یہی وقت ہے جب تمام لوگوں کو اپنے آپس کے جھگڑے چھوڑ کر اس فتنہ عظیم کا مقابلہ کرنے کے لیے اتحاد، نظم اور یقین محکم کو اپنا مولو بنا کر ڈٹ جانا چاہیے۔

اس سارے ہنگامے کا جواب یونین کی طرف سے ایک پوسٹر کے ذریعے سے دیا گیا جس میں بڑے اختصار کے ساتھ یہ کہا گیا کہ پریس اکثریت کے ہاتھ میں ہے قانون اس کی پشت پر ہے، مگر انجمن کے حوصلے اور ارادے پست نہیں ہوئے وہ کوشش کر رہی ہے کہ بہت سی رقم دے کر کچھ اخبار خرید لے اور ان کو اپنے حق میں کر لے۔

یہ پوسٹر ملک کے درو دیوار پر نمودار ہوا، تو فوراً بعد کئی شہروں سے بڑی بڑی چوریوں اور ڈکیتیوں کی اطلاعیں وصول ہوئیں۔ اور اس کے چند روز بعد جب ایک اکی دو اخباروں نے دہلی زبان میں غنڈوں اور بدکاروں کی یونین کے اغراض و مقاصد میں اصلاحی پہلو کریدنا شروع کیا تو لوگ سمجھ گئے کہ پس پر وہ کیا ہوا ہے۔

پہلے ان دو اخباروں کی اشاعت ہونے نہ ہونے کے برابر تھی نہایت ہی گھٹیا کانڈ پر چھپتے تھے لیکن دیکھتے دیکھتے ہی کچھ ایسی کایا کلپ ہوئی کہ لوگ دنگ رہ گئے سب سے اچھا ایڈیٹر مل اسٹاف ان دو پرچوں کے پاس تھا دفتر میں ایک کے بجائے دو دو ٹیلی پرینٹر تھے تنخواہ مقررہ وقت سے پہلے مل جاتی تھی بونس الگ ملتا تھا گھر کا الاؤنس ہٹائے گا الاؤنس، سگریٹوں کا الاؤنس، چائے کا الاؤنس، مہنگائی الاؤنس، یہ سب الاؤنس مل کر تنخواہ سے دو گئے ہو جاتے تھے۔ جو دخت رز کے رسیا

تھے، ان کو مفت پر مٹا دیا تھا اور بہترین سکاچ و سکی کنٹروالڈ قیمت پر دستیاب ہوتی تھی عملے کے ہر آدمی سے باقاعدہ کنٹریکٹ کیا گیا تھا جس میں مالک کی طرف سے یہ اقرار تھا کہ اگر اس کے گھر میں کبھی چوری ہوئی، یا اس کی جیب کاٹ لی گئی تو اسے نقصان کے علاوہ ہرجانہ بھی ادا کیا جائے گا۔

ان دو اخباروں کی اشاعت دیکھتے دیکھتے ہزاروں تک پہنچ گئی تعجب ہے کہ پہلے جب ان کی اشاعت کچھ بھی نہیں تھی تو یہ ہر روز کثیر الاشاعت ہونے کے بلند بانگ دعوے کرتے تھے مگر جب ان کی کاپیاں کلپ ہوئی تو اس معاملے میں بالکل خاموش ہو گئے بیک وقت البتہ ان دونوں اخباروں نے کچھ عرصے کے بعد یہ اعلان چھاپا کہ ہماری اشاعت اس حد تک جا پہنچی ہے کہ اگر ہم نے اس سے تجاوز کیا تو تجارتی نقطہ نظر سے نقصان ہی نقصان ہے۔

ان کے علمی و ادبی اڈیشنوں میں عجیب و غریب موضوعات پر مضمون شائع ہوتے تھے، یہ چارپانچ تو بڑے ہی سنسنی خیز تھے۔

بلیک مارکیٹنگ کے فوائد۔۔۔۔۔ معاشیات کی روشنی میں

معاشرتی اور مجلسی دائرے میں خبیہ خانوں کی اہمیت

دروغ گورا حافظہ باشد۔۔۔۔۔ جدید سائنس کا تحقیق

بچوں میں قتل و غارتگری کے فطری رجحانات۔۔۔۔۔ سادیت پر سیر حاصل

تبصرہ دنیا کے خوف ناک ڈاکو اور قہر لیس مذہب

اشتہار بھی کم عجیب و غریب نہیں تھے ان میں مشتہر کا نام اور پتا نہیں ہوتا تھا

سرخیاں دے کر مطلب کی بات مختصر لفظوں میں ادا کر دی جاتی تھی چند سرخیاں

ملاحظہ ہوں۔

چوری کے زیورات خریدنے سے پہلے ہمارا نشان ضرور دیکھ لیا کریں جو
کھرے مال کی ضمانت ہے۔
بلیک مارکیٹ میں صرف اسی فلم کے ٹکٹ فروخت کیے جاتے ہیں جو تفریح کا
بہترین سامان پیش کرتا ہے
دودھ میں کن طریقوں سے ملاوٹ کی جاتی ہے رسالہ دودھ کا دودھ اور پانی کا
پانی مطالعہ فرمائیے۔
ٹوٹے، ٹوٹے، گندے اور تعویذ، عمل ہمزاد اور تسخیر محبوب کے جنتر منتر سب
جھوٹے ہیں خود کو دھوکا دینے کے بجائے معشوق کو دھوکا دیجئے۔
کھانے پینے کو صرف وہ چیزیں خریدیں جن میں ضرر رساں چیزوں کی
ملاوٹ نہ ہو

ایک الگ کالم میں ’بلیک مارکیٹ کے آج کے بھانڈے‘ کے عنوان تلے ان تمام
چیزوں کی کنٹرولڈ قیمت درج ہوتی تھی جو صرف بلیک مارکیٹ سے دستیاب ہوتی
تھیں لوگوں کا کہنا تھا کہ ان قیمتوں میں ایک پانی کی بھی کمی بیشی نہیں ہوتی۔ جو
چھپے چوری، چوری کا خاص نشان لگایا ہوا مال خریدتے تھے ارزاں قیمت پر سولہ
آنے کھر مال ملتا تھا۔

غنڈوں، چوروں اور بدکاروں کی انجمن جب آہستہ آہستہ نیک نامی حاصل
کرنے لگی تو ارباب بست و کشاد کی تشویش وہ چند ہو گئی حکومت نے اپنی طرف
سے خفیہ طور پر بہت کوشش کی کہ اس کے اڈے کا سراغ لگائے مگر کچھ پتہ نہ چلا

یونین کی تمام سرگرمیاں زیر زمین یعنی انڈر گراؤنڈ تھیں اونچی سوسائٹی کے چند اراکین کا خیال تھا کہ پولیس کے بعض بد قماش افسر اس یونین سے ملے ہوئے ہیں بلکہ اس کے باقاعدہ ممبر ہیں اور ہر ماہ اپنی ناجائز ذرائع سے پیدا کی ہوئی آمدن کا بیشتر حصہ بطور جزیے کے دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ قانون کا شتر معاشرے کے اس نہایت ہی مہلک پھوڑے تک نہیں پہنچ سکا۔۔۔۔۔ جتنے منہ اتنی باتیں مگر یہ بات قابل غور تھی کہ عوام میں جو اس یونین کے قیام سے بے چینی پھیلی تھی اب بالکل مفقود تھی متوسط طبقہ اس کی سرگرمیوں میں بڑی دلچسپی لے رہا تھا صرف اونچی سوسائٹی تھی جو دن بدن خائف ہوتی جا رہی تھی۔

اس یونین کے خلاف یوں تو آئے دن تقریریں ہوتی تھیں اور جگہ جگہ جلسے منعقد ہوتے تھے، مگر اب وہ پہلا سا جوش و خروش نہیں تھا چنانچہ اس کو از سر نو شدید بنانے کے لیے ماؤن ہال میں ایک بہت عظیم الشان جلسے کے انعقاد کا اعلان کیا گیا۔ قریب قریب ہر شہر کی معزز ہستیوں کو نمائندگی کے لیے مدعو کیا گیا مقصد اس جلسے کا یہ تھا کہ اتفاق رائے سے غنڈوں، شہدوں اور بدکاروں کی اس یونین کے خلاف مذمت کا ووٹ پاس کیا جائے اور عوام الناس کو ان خونخوار جراثیم سے کماحقہ آگاہ کیا جائے جو اس کے وجود سے معاشری و مجلسی دائرے میں پھیل چکے ہیں اور بڑی سرعت سے پھیل رہے ہیں۔

جلسے کی تیاری پر ہزاروں روپے خرچ کیے گئے مجلس انتظامیہ اور مجلس استقبالیہ نے مندوبین کے آرام و آسائش کے لیے ہر ممکن سہولت مہیا کی کئی اجلاس ہوئے اور بڑے کامیاب رہے ان کی رپورٹ یونین کے پرچوں میں من و عن شائع ہوتی

رہی۔ مذمت کے جتنے ووٹ پاس ہوئے بلا تیسرہ چھپتے رہے دونوں اخباروں میں ان کو نمایاں جگہ دی جاتی تھی۔

آخری اجلاوہ بہت اہم تھا ملک کی تمام مکرم و معظم ہستیاں جمع تھیں امراء و وزراء سب موجود تھے حکومت کے اعلیٰ اعلیٰ افسر بھی مدعو تھے بڑے زوردار الفاظ میں تقریریں ہوئیں اور مذہبی، مجلسی، معاشی، جمالیاتی اور نفسیاتی، غرض کہ ہر ممکن نقطہ نظر سے فنڈوں اور بدمعاشوں کی تنظیم کے خلاف دلائل و براہین پیش کئے گئے اور ثابت کر دیا گیا کہ اس طبقہ اسفل کا وجود حیات انسانی کے حق میں زہر قاتل ہے مذمت کا آخری ریزولیشن جو بڑے با اثر الفاظ پر مشتمل تھا اتفاق رائے سے پاس ہوا تو ہال تالیوں کے شور سے گونج اٹھا جب جموڑا سکون ہوا تو پچھلے پنجوں میں ایک شخص کھڑا ہوا اس نے صدر سے مخاطب ہو کر کہا ”صاحب صدر! اجازت ہو تو میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں“

سارے ہال کی نگاہیں اس آدمی پر جم گئیں صدر نے بڑی تمکنت سے پوچھا ”میں پوچھ سکتا ہوں آپ کون ہیں؟“

اس شخص نے جو بڑے شادہ مگر خوش وضع کپڑوں میں ملبوس تھا تعظیم کے ساتھ کہا ”ملک و ملت کا ایک ادنیٰ ترین خادم“ اور کونش بجا لایا

صدر نے چشمہ لگا کر اسے غور سے دیکھا اور پوچھا ”آپ کیا کہنا چاہتے ہیں“ اس معمر نما مرد نے مسکرا کر کہا ”کہ۔۔۔۔۔ ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں“ اس پر سارے ہال میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں ڈاکس پر خصوصاً سب کے سب معززین اور قائدین سوائیہ نشان بن کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے

صدر نے اپنی تمکنت کو ذرا اور جمکین بنا کر پوچھا ”آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“
 ”میں ابھی عرض کرتا ہوں“ یہ کہہ کر اس نے جیب سے ایک بے داغ سفید
 رو مال نکالا اپنا منہ صاف کیا اور اسے واپس جیب میں رکھ کر بڑے پارلیمانی انداز
 میں گویا ہوا ”صاحب صدر اور معزز حضرات۔۔۔۔۔“ ڈاکس کے ایک طرف دیکھ
 کر وہ رک گیا معافی کا طلب گار ہوں۔۔۔۔۔ محترمہ بیگم مرزا بان خلاف معمول آج
 پچھلے صوفے پر تشریف فرما ہیں۔۔۔۔۔ صاحب صدر، خاتون مکرم اور معزز
 حضرات!

بیگم مرزا بان نے وہ نیشی بیک میں سے آئینہ نکال کر اپنا میک اپ دیکھا اور
 غور سے سننے لگی باقی بھی ہمہ تن گوش تھے۔

اس شخص نے بڑی شائستگی سے کہنا شروع کیا

”حریف مطلب مشکل نہیں فسوں نیاز

دعا قبول ہو یا رب کہ عمر خضر دراز“

کچھ دیر رک کر وہ ایک اداسے مسکرایا ”حضرت غالب!۔۔۔۔۔ اس اجلاس
 میں اور اس سے پہلے مجلسی دائرے کے ایک مفروضہ طبقہ اسفل کے بارے میں جو
 زہرفشانی کی گئی ہے، آپ کے اس خاکسار نے بڑے غور سے سنی ہے۔“

سارے ہال میں کس کس پھسر ہونے لگی صدر کی ناک کے بانسے پر چشمہ پھسل گیا
 ”آپ ہیں کون؟“

سر کے ایک ہلکے سے خم کے ساتھ اس شخص نے جواب دیا ”ملک و ملت“ کا
 ایک ادنیٰ خادم۔۔۔ مجلسی دائرے کے مفروضہ طبقہ اسفل کی جماعت کا ایک رکن

جسے اس کی نمائندگی کا فخر حاصل ہے!

ہال میں کسی نے زور سے ”واہ“ کہا اور تلمای بھائی چوروں، اچکوں اور غنڈوں کی یونین کے نمائندے نے سر کو پھر ہلکی سی جنبش دی اور کہنا شروع کیا ”کیا عرض کروں کچھ کہنا نہیں جاتا۔“

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں
اس اجلاس میں اس جماعت کے خلاف جس کا یہ خاکسار نمائندہ ہے اس قدر
گالیاں دی گئی ہیں اس قدر لعنت ملامت کی گئی ہے کہ صرف اتنا کہنے کو جی چاہتا ہے
لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
صاحب صدر، محترم بیگم مر زبان اور معزز حضرات!

بیگم مر زبان کی لپ اسٹک مسکرائی بولنے والے نے آنکھیں اور سر جھکا کر تسلیم
عرض کیا ”محترم بیگم مر زبان اور معزز حضرات۔۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ یہاں
میری جماعت کا کوئی ہمدرد موجود نہیں آپ میں سے ایک بھی ایسا نہیں جو ہمارا
طرف دار ہو۔“

دوست گر کوئی نہیں ہے جو کرے چارہ گری
نہ سہی ایک تمنائے دوا ہے تو سہی
ڈاکٹر پر ایک اچکن پوش رئیس کھلے میں پان دبا کر بولے ”مکرر!“
صدر نے جب ان کی طرف سرزنش بھری نظروں سے دیکھا تو وہ خاموش ہو
گئے

چوروں اور بدکاروں کی یونین کے نمائندے کے پتلے پتلے ہونٹوں پر شفاف
مسکراہٹ نمودار ہوئی ”میں اپنی مختصر تقریر میں جو شعر بھی استعمال کروں
گا۔۔۔ حضرت غالب کا ہوگا!“

بیگم مرزبان نے بڑے بھولپن سے کہا ”آپ تو بڑے لائق معلوم ہوتے
ہیں“ بولے والا کورنش بجالایا اور مسکرا کر کہنے لگا

”دیکھتے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے!“
سارا حال قہقہوں اور تالیوں سے گونج اٹھا بیگم مرزبان نے اٹھ کر صدر کے
کان میں کچھ کہا جس نے حاضرین کو چپ رہنے کا حکم دیا خاموشی ہوئی تو چوروں
اور لفظوں کی یونین کے نمائندے نے پھر بولنا شروع کیا ”صاحب صدر محترم بیگم
مرزبان اور معزز حضرات“

گرچہ ہے کس کس برائی سے دلے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے
----- لیکن سچ پوچھیے تو اس سے تسلی نہیں ہوتی میں تا سہف کا اظہار
کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس طبقے کے ساتھ جس کی نمائندگی میری جماعت کرتی ہے
نہایت بے انصافی ہوئی ہے اس کو اب تک بالکل غلط رنگ میں دیکھا جاتا رہا ہے
اور یہی کوشش کی جاتی رہی ہے کہ اسے ملعون و مطعون قرار دے کر خارج از سماج
کر دیا جائے میں ان مظہر ہستیوں کو کیا کہوں جنہوں نے اس شریف اور معزز طبقے
کو سنگسار کرنے کے لیے پتھر اٹھائے ہیں۔

آتش کدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے
اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آوے
صدر نے دفعتاً گرج کر کہا ”خاموش۔۔۔ بس اب آپ کو مزید بولنے کی
اجازت نہیں ہے۔“

مقرر نے مسکرا کر کہا ”حضرت غالب کی اسی غزل کا ایک شعر ہے“
دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ شکر
کچھ تجھ کو مزہ بھی مرے آزار میں آوے
ہالِ تالیوں کے شور سے گونج اٹھا صدر نے اجلاسِ برخواست کرنا چاہا مگر لوگوں
نے کہا کہ نہیں چوروں اور فنڈوں کی یونین کے نمائندے کی تقریر ختم ہو جائے تو
کارروائی بند کی جائے۔ صدر اور دوسرے اراکینِ اجلاس نے پہلے آمادگیِ ظاہر نہ کی
لیکن بعد میں رائے عامہ کے سامنے انہیں جھکنا پڑا مقرر کو بولنے کی اجازت مل گئی۔
اس نے صاحبِ صدر کا مناسب و موزوں الفاظ میں شکریہ ادا کیا اور کہنا شروع
کیا ”ہماری یونین کو صرف اس لیے نفرت و تحقیر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے کہ یہ
چوروں، اٹھائی گیروں، رہزنوں اور ڈاکوؤں کی انجمن ہے جو ان کے حقوق کے تحفظ
کے لیے قائم کی گئی ہے میں آپ لوگوں کے جذبات بخوبی سمجھتا ہوں آپ کا فوری رد
عمل کس قسم کا تھا، میں اس کا تصور بھی کر سکتا ہوں، مگر چوروں، ڈاکوؤں اور رہزنوں
کے حقوق کیا نہیں ہوتے؟ یا نہیں ہو سکتے؟ میں سمجھتا ہوں کوئی سلیم الدماغ آدمی ایسا
نہیں سوچ سکتا۔۔۔ جس طرح سب سے پہلے آپ انسان ہیں، بعد میں یہ
صاحب ہیں، رئیسِ اعظم ہیں، میڈیکل کمشنر ہیں، وزیر داخلہ ہیں یا خارجہ اسی طرح وہ

بھی سب سے پہلے آپ ہی کی طرح انسان ہے، چور، ڈاکو، اٹھانی گیرا، جیب کترا اور بلیک مارکیٹر بعد میں ہے۔ جو حقوق دوسرے انسانوں کو اس سقف نیلو فری کے نیچے مہیا ہیں، وہ اسے بھی مہیا ہیں اور ہونے چاہئیں جن نعمتوں سے دوسرے انسان متمتع ہوتے ہیں ان سے وہ بھی مستفیض ہونے کا حق رکھتا ہے۔۔۔۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایک چور یا ڈاکو کیوں شے لطیف سے خالی سمجھا جاتا ہے۔ کیوں اسے ایک ایسا شخص متصور کیا جاتا ہے جو معمولی حیات سے بھی ناری ہے۔۔۔۔ معاف فرمائیے وہ اچھا شعر سن کر اسی طرح پھڑک اٹھتا ہے جس طرح کوئی دوسرا سخن فہم صحیح بنارس اور شام اودھ سے صرف آپ ہی لطف اندوز نہیں ہوتے وہ بھی ہوتا ہے۔ سرتال کی اس کو بھی خبر ہے۔ وہ صرف پولیس کے ہاتھوں ہی گرفتار ہونا نہیں جانتا کسی حسینہ کے دام الفت میں گرفتار ہونے کا سلیقہ بھی جانتا ہے شادی کرتا ہے، بچے پیدا کرتا ہے۔ ان کو چوری سے منع کرتا ہے جھوٹ بولنے سے روکتا ہے۔۔۔۔۔ خدا نخواستہ اگر ان میں سے کوئی مر جائے تو اس کے دل کو صدمہ بھی پہنچتا ہے، یہ کہتے ہوئے اس کی آواز کسی قدر گلوگیر ہو گئی لیکن فوراً ہی اس نے رخ بدلا اور مسکراتے ہوئے کہا ”حضرت غالب کے اس شعر کا جوہ مزہ وہ لے سکتا ہے، معاف کیجئے آپ میں سے کوئی بھی نہیں لے سکتا۔“

نہ لیتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھنکا نہ چوری کا، دعا دیتا ہوں رہزن کو!
سارا ہال شگفتہ ہو کر بننے لگا بیگم مرزبان بھی جو تقریر کے آخری حصے پر کچھ
افسردہ سی ہو گئی تھیں مسکرائیں مقرر نے اسی طرح پتلی پتلی شفاف مسکراہٹ کے

ساتھ کہنا شروع کیا ”مگر اب ایسے دعا دینے والے کہاں!“
 نیگم مر زبان نے بڑے بھولپن کے ساتھ آہ بھر کر کہا ”اور وہ رہزن بھی
 کہاں؟“

مقرر نے تسلیم کیا ”آپ نے بجا ارشاد فرمایا نیگم مر زبان ہمیں اس افسوسناک
 حقیقت کا کامل احساس ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم نے مل کر اپنی انجمن بنا ڈالی ہے
 مروجہ زمانہ کے ساتھ رہزن، چور اور جیب کترے قریب قریب سب اپنی اپنی روش
 اور وضع داری بھول گئے ہیں لیکن مقام مسرت ہے کہ وہ اب بہت تیزی سے اپنے
 اصل مقام کی طرف لوٹ رہے ہیں۔۔۔۔۔ لیکن میں ان حضرات سے جو ان
 غریبوں کی تح کنی میں مصروف ہیں یہ گستاخانہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ اپنی اصلاح
 کے لیے اب تک انہوں نے کیا کیا ہے مجھے کہنا تو نہیں چاہیے مگر تقابل کے لیے
 کہنا پڑتا ہے کہ ہمیں نہایت ذلیل، چور اور سفاک ڈاکو کہا جاتا ہے، مگر وہ لوگ کیا
 ہیں۔۔۔۔۔ کچھ اس مانی مرتبت ڈاکس پر بھی بیٹھے ہیں جو عوام کا مال و متاع دونوں
 ہاتھوں سے لوٹتے رہے ہیں“

بال میں ”شیم شیم“ کے نعرے بلند ہوئے

مقرر نے کچھ توقف کے ساتھ کہنا شروع کیا ”ہم چوری کرتے ہیں، ڈاکے
 ڈالتے ہیں، مگر اسے کوئی اور نام نہیں دیتے یہ معزز ہستیاں بدترین قسم کی ڈاکہ زنی
 کرتی ہیں مگر یہ جائز سمجھی جاتی ہے اپنی آنکھ کے اس طویل و عریض اور بھاری بھر کم
 شہیر کو کوئی نہیں دیکھتا اور نہ دیکھنا چاہتا ہے۔۔۔۔۔ کیوں؟۔۔۔۔۔ یہ بڑا گستاخ
 سوال ہے میں اس کا جواب سننا چاہتا ہوں چاہے وہ اس سے بھی زیادہ گستاخ

ہو۔۔۔۔۔“ تھوڑے توقف کے بعد وہ مسکرایا ”وزیر صاحبان اپنی مسند وزارت کی سان پر استرا تیز کر کے ملک کی ہر روز حجامت کرتے رہیں یہ کوئی جرم نہیں، لیکن کسی کی جیب سے بڑی صفائی کے ساتھ ہٹو چرانے والا قابل تعزیر ہے۔۔۔۔۔ تعزیر کو چھوڑیئے مجھے اس پر کوئی زیادہ اعتراض نہیں۔۔۔۔۔ وہ آپ کی نظروں میں قابل گردن زدنی ہے۔“

ڈاکٹر پر بہت سے حضرات بے چینی اور اضطراب محسوس کرنے لگے۔۔۔۔۔ بیگم زبان سرور تھیں۔

مقرر نے اپنا کلام صاف کیا، پھر کہنا شروع کیا ”تمام محکموں میں اوپر سے لے کر نیچے تک رشوت ستانی کا سلسلہ قائم ہے یہ کسے معلوم نہیں کیا یہ کبھی کوئی راز ہے جس کے انکشاف کی ضرورت ہے کہ خویش پروری اور کنبہ نوازی کی بدولت سخت مابل، خردماغ اور بد قماش بڑے بڑے عہدے سنبھالے بیٹھے ہیں۔ معاف فرمائیے گا ادھر ہمارے طبقے میں ایسے افسوس ناک حالات موجود نہیں ہیں کوئی چور اپنے کسی عزیز کو بڑی چوری کے لیے منتخب نہیں کرے گا ہمارے ہاں لوگ اس قسم کی رعایتوں سے فائدہ اٹھانا بھی چاہیں تو نہیں اٹھا سکتے۔ اس لیے کہ چوری کرنے، جیب کاٹنے یا ڈاکہ ڈالنے کے لیے دل گردے اور مہارت و قابلیت کی ضرورت ہے یہاں کوئی سفارش کام نہیں آتی۔ ہر شخص کا کام ہی خود اس کا امتحان ہوتا ہے جو اس کو فوراً نیچے سے باخبر کر دیتا ہے۔“

ہال میں سب خاموش تھے اور بڑے غور سے تقریر سن رہے تھوڑے سے وقفے کے بعد مقرر کی آواز پھر بلند ہوئی ”میں بدکاری معاف کر سکتا ہوں لیکن خامکاری ہر

گزر ہرگز معاف نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔ وہ لوگ یقیناً قابل مواخذہ ہیں جو نہایت ہی
بھونڈے طریقے پر ملک کی دولت لوٹتے ہیں ایسے بھونڈے طریقے پر کہ ان کے
کرتوتوں کے بھانڈے ہر دوسرے روز چور ہوں میں پھوٹتے ہیں وہ پکڑے
جاتے ہیں مگر بچ نکلتے ہیں کہ ان کے نام دس نمبر کے بستہ الف میں درج ہیں نہ بستہ
ب میں۔۔۔۔۔ یہ کس قدر نا انصافی ہے۔۔۔۔۔ میں تو سمجھتا ہوں بے چارے
انصاف کا۔۔۔۔۔ اندھے انصاف کا خون نہیں پڑتا ہے۔۔۔۔۔ نہیں ایسے اور بھی
کئی مقتل ہیں جہاں انصاف، انسانیت، شرافت و نجابت، تہذیب و طہارت، دین و
دنیا، سب کو ایک ہی پسندے میں ڈال کر ہر روز پھانسی دی جاتی ہے۔۔۔۔۔ میں
پوچھتا ہوں انسانوں کی خام کھالوں کی تجارت کرنے والے ہم ہیں یا
آپ۔۔۔۔۔ میں سوال کرتا ہوں، ازمنہ عتیق کی بربریت کی طرف امن پسند
انسانوں کو کشاں کشاں کھینچ کر لے جانے والے ہم ہیں یا آپ۔۔۔۔۔ اور انتظار
کرتا ہوں کہ دوسری اجناس کی ملاوٹ کر کے اپنے ایمان کو آپ بیچتے ہیں یا ہم؟“
ہال پر قبر کی سی خاموشی طاری تھی مقرر نے جیب سے اپنا سفید سفید رو مال نکال
کر منہ صاف کیا اور اسے ہوا میں ابرا کر کہا ”صاحب صدر، خاتون مکرم اور معزز
حضرات مجھے معاف فرمائیے کہ میں ذرا جذبات کی رو میں بہہ گیا۔۔۔۔۔ عرض
ہے کہ جدھر نظر اٹھائی جائے ایمان فروش ہوتا ہے یا ضمیر فروش، وطن فروش ہوتا ہے
یا ملت فروش سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بھی کوئی فروخت کرنے کی چیزیں ہیں انسان تو
انہیں نہایت مشکل وقت میں بھی ایک لمحے کے لیے گرو نہیں رکھ سکتا مگر میں
انسانوں کی بات کر رہا ہوں معاف کیجئے میرے لہجے میں پھر تفتی پیدا ہو گئی“

رکھو غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف
 آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے
 یہ کہتا وہ ڈانس کی طرف بڑھا "صاحب صدر، محترمہ بیگم مر زبان اور معزز
 حضرات! میں اپنی یونین کی طرف سے آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے
 مجھے لب کشائی کا موقع دیا" ڈانس کے پاس پہنچ کر اس نے صدر کی طرف ہاتھ
 بڑھایا "میں ایک دوست کی حیثیت سے رخصت چاہتا ہوں۔"
 صدر نے ہچکچاتے ہوئے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا اس کے بعد اس نے بیگم مر
 زبان کی طرف ہاتھ بڑھایا "اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو۔۔۔۔۔"
 بیگم مر زبان نے بڑے بھولپن سے اپنا ہاتھ پیش کر دیا باقی معززین اور رؤسا
 سے ہاتھ ملا کر جب فارغ ہوا تو خدا حافظ کہہ کر چلنے لگا لیکن فوراً ہی رک گیا اپنی
 دونوں جیبوں سے اس نے بہت سی چیزیں نکالیں اور صدر کی میز پر ایک ایک کر
 کے رکھ دیں پھر وہ مسکرایا "ایک عرصے سے جیب تراشی چھوڑ چکا ہوں آج کل
 سیف توڑنا میرا پیشہ ہے۔۔۔۔۔ آج صرف ازراہ تفریح آپ لوگوں کی جیبوں
 پر ہاتھ صاف کر دیا" یہ کہہ کر وہ بیگم مر زبان سے مخاطب ہوا "خاتون مکرم معاف
 کیجئے آپ کے وینسٹی بیک سے بھی میں نے ایک چیز نکالی تھی مگر وہ ایسی ہے کہ
 سب کے سامنے آپ کو اپس نہیں کر سکتا۔"
 اور وہ تیزی کے ساتھ ہال سے باہر نکل گیا

8 اکتوبر 1951ء

☆☆☆☆☆☆

جیب کفن

فارغ مجھے نہ جان کہ مانند صبح و مہر
ہے داغ عشق زینت جیب کفن ہنوز
(غالب)

جی چاہتا ہے آج آپ سے اپنی تحریریں پڑھنے والوں سے تمام ”مقدمائی اور
دیباچائی“ تکلفات برطرف رکھ کے باتیں کروں یوں تو میرے افسانوں،
ڈراموں اور نیم افسانوی مضمونوں میں بھی اکثر ایسی باتیں ہوتی ہیں جن کا تعلق
براہ راست دل و دماغ کے اس خانے سے ہوتا ہے جو عام طور پر انسان کی اپنی
ذات کے لیے مخصوص ہوتا ہے لیکن ان پر چوکھٹا چونکہ افسانے کا ہوتا ہے اس لیے
آپ انہیں اسی شکل میں دیکھتے رہے ہیں۔

آج میرا دل بہت افسردہ ہے ایک عجیب سا احتمال اس پر چھایا ہوا ہے چار
ساڑھے چار برس پہلے جب میں نے اپنے دوسرے وطن بمبئی کو خیر باد کہی تھی تو
میرا دل اسی طرح مغموم تھا مجھے وہ جگہ چھوڑنے کا صدمہ تھا جہاں میں نے اپنی
زندگی کے بڑے پر مشقت دن گزارے تھے اس خطہ زمین نے مجھ ایسے آوارہ اور
خاندان کے دھتکارے ہوئے انسان کو اپنے دامن میں جگہ دی تھی اس نے مجھ
سے کہا تھا تم یہاں دو پیسے روزانہ پر بھی خوش رہ سکتے ہو اور دس ہزار روپے روزانہ
پر بھی اگر تم چاہو تو دونوں صورتوں میں دنیا کے مغموم ترین انسان کی زندگی بسر کر
سکتے ہو یہاں تم جو چاہو کرو تمہاری عیب جوئی کوئی نہیں کرے گا یہاں تمہیں کوئی

ناصح بھی نہیں ملے گا ہر کٹھن کام تمہیں خود کرنا ہو گا اپنی زندگی کا ہر اہم فیصلہ تمہیں خود ہی کرنا پڑے گا تم فٹ پا تھ پر رہو یا کسی عالیشان محل میں اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں تم جاؤ یا رہو مجھے اس سے کوئی فرق محسوس نہیں ہو گا میں جہاں ہوں موجود ہوں اور موجود رہوں گی۔

یہاں بارہ برس رہنے کے بعد جو کچھ میں نے سیکھا یہ اسی کا باعث ہے کہ میں یہاں پاکستان میں موجود ہوں یہاں سے کہیں اور چلا گیا تو وہاں بھی موجود رہوں گا میں چلتا پھرتا بمبئی ہوں جہاں بھی قیام کروں گا وہیں میرا اپنا جہان آباد ہو جائے گا۔

بہنے چھوڑنے کے بعد میں افسردہ تھا میرے وہاں دوست تھے جن کی دوستی پر مجھے ناز ہے، وہاں میری شادی ہوئی، وہیں میرا پہلا بچہ ہوا دوسرے نے بھی اپنی زندگی کا پہلا دن وہیں شروع کیا میں نے وہاں چند رہ پوں سے لے کر ہزاروں اور لاکھوں تک کمائے اور خرچ کیے مجھے اس سے محبت تھی اور آج بھی ہے۔

ملک کے بنوارے سے جو انقلاب برپا ہوا اس سے میں ایک عرصے تک باغی رہا اور اب بھی ہوں لیکن بعد میں اس خونناک حقیقت کو میں نے تسلیم کر لیا مگر اس طرح کہ مایوسی کو میں نے اپنے پاس تک نہ آنے دیا۔

میں نے اس خون کے سمندر میں غوطہ لگایا جو انسان نے انسان کی رگوں سے بہایا تھا اور چند موتی چن کر لایا، عرق انفعال کے، مشقت کے جو اس نے اپنے بھائی کے خون کا آخری قطرہ بہانے میں صرف کی تھی ان آنسوؤں کے جو اس جھنجھلاہٹ میں کچھ انسانوں کی آنکھوں سے نکلے تھے کہ وہ اپنی انسانیت کیوں ختم

نہیں کر سکے۔۔۔۔۔ یہ موتی میں نے اپنی کتاب ”سیاہ حاشیے میں پیش کیے۔“
 میں انسان ہوں، وہی انسان جس نے انسانیت کی عصمت دری کی تھی جس
 نے فنا کو بادہ ہر جام بنایا تھا جس نے دوسری اجناس کی طرح انسان کے گوشت
 پوست کو کانوں میں سجا سجا کر بیچا تھا میں وہی انسان ہوں جس نے پیغمبری کا رتبہ
 حاصل کیا اور میں وہی انسان ہوں جس نے پیغمبروں کے خون سے اپنے ہاتھ
 رنگے۔۔۔۔۔ مجھ میں وہ تمام کمزوریاں اور خوبیاں موجود ہیں جو دوسرے
 انسانوں میں ہیں یقین مانئے کہ مجھے اس وقت دکھ ہوا بہت بڑا دکھ جب میرے
 چند معصروں نے میری اس کوشش کا مستحکم اڑایا، مجھے لطیفہ باز، یادہ گو، سبکی، ما
 معقول اور رجعت پسند کہا گیا۔ میرے ایک عزیز دوست نے تو یہاں تک کہا کہ
 میں نے اشوں کی جیبوں میں سے سگریٹ کے کلڑے، انگوٹھیاں اور اسی قسم کی
 دوسری چیزیں نکال نکال کر جمع کی ہیں اس عزیز نے میرے نام ایک کھلی چٹھی بھی
 شائع کی جو وہ بڑی آسانی سے مجھے خود دے سکتے تھے۔ اس میں بھی انہوں نے ”
 سیاہ حاشیے“ کی تضحیک میں کھلے طور پر قلعہ کاری کی۔

میں انسان ہوں مجھے غصہ آیا میں نے اس عالم میں اس کیچڑ کے جواب میں
 ایسی کیچڑ تیار کی جو بہت دیر تک میرے نام نہاد نقادوں کے چہروں پر جمی رہتی لیکن
 میں نے سوچا اور محسوس کیا کہ ایسا کرنا غلطی ہے اینٹ کا جواب پتھر سے دینا انسان
 کی خصلت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں لیکن خاموش رہنا اس کی دانشمندی ہے
 اس کا تھل ہے اس کی بردباری ہے۔

مجھے غصہ تھا اس کا نہیں کہ الف نے مجھے کیوں غلط سمجھا مجھے غصہ تھا اس بات کا

کہ الف نے محض فیشن کے طور پر ایک سقیم و عقیم تحریک کی اٹلی پکار کر بیرونی سیاست کے مصنوعی ابرو کے اشارے پر میری نیت پر شک کیا اور مجھے اس کسوٹی پر پرکھا۔ جس پر صرف 'سرخ' ہی سونا تھی۔

مجھے قصہ تھا کہ ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے یہ کیسے ترقی پسند ہیں جو تنزل کی طرف جاتے ہیں یہ ان کی سرخی کبھی ہے جو سیاہی کی طرف دوڑتی ہے یہ ان کی مزدور دوستی کیا ہے جو مزدور کو پسینہ بہانے سے پہلے ہی مزدوری کے مطالبے پر اکسارہی ہے یہ ان کی سرمائے کے خلاف محنت کی مبارزت کس قسم کی ہے کہ یہ خود سرمائے سے مسلح ہونا چاہتے ہیں اور اپنے محبوب، تھکراور رانچی اور تھوڑا اپنے مخالفوں کے ہاتھ میں دے رہے ہیں یہ ان کا ادب میں کس قسم کا اجتہاد ہے کہ غزل کو مشین اور مشین کو غزل بنانے کے منصوبے سوچے جا رہے ہیں۔

مجھے قصہ تھا ان کے آئے ان کے منشوروں پر، ان کی طویل طویل قراودادوں پر، ان کے مختلف بیانیوں پر جن کا سالہ براہ راست روس کے کریملن سے بمبئی کی کھیت واری میں آتا تھا اور وہاں سے میکوڈروڈ پہنچتا تھا روس کے فلاں شاعر نے یہ کہا ہے روس کے فلاں افسانہ نگار کا یہ بیان ہے روس کے فلاں دانشور نے یہ دانشمندانہ بات کہی ہے مجھے قصہ آتا تھا یہ لوگ اس خطہ ارض کی بات کیوں نہیں کرتے، جس پر کہ خود سانس لیتے ہیں اگر ہم نے دانش ور پیدا کرنے بند کر دیئے ہیں تو اس بانجھ پن کا علاج کیا سرخ تخم ریزی ہی باقی رہ گیا ہے۔

مجھے قصہ تھا اس لیے کہ میری بات کوئی بھی نہیں سنتا تھا تقسیم ملک کے بعد ملک میں افراط و تفریط کا عالم تھا جس طرح لوگ مکان اور ملیں الٹ کر رہے تھے اسی

طرح وہ بلند مقاموں پر بھی قبضہ کرنے کی جدہ جہد میں مصروف تھے کوئی ایک لمبے کے لیے بھی نہیں سوچتا تھا کہ اتنے بڑے انقلاب کے بعد حالات وہ نہیں رہیں گے جو پہلے تھے پرانی پگڈنڈیاں بڑی سڑکیں بنیں گی یا ان کا وجود ہی مٹ جائے گا اس کے متعلق وثوق سے اس وقت کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا تھا غیر کی حکومت اور اپنوں کی حکومت میں کیا فرق ہو گا اس کے بارے میں بھی حتمی طور پر کوئی قیاس آرائی نہیں ہو سکتی تھی فضا کیسی ہوگی۔۔۔۔ اور اس میں خیالات و احساسات کی صحیح نشوونما کیونکر ہوگی۔ ریاست اور حکومت سے فرد اور جماعت کا رشتہ کیا ہو گا یہ ایسی باتیں تھیں جن پر انتہائی غور و فکر کی ضرورت تھی یہ کام ایسا تھا جس میں ہمیں بیرونی دشمنوں پر عمل نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن افسوس کہ ہمارے نام نہاد دانشوروں نے بڑی جلد بازی سے کام لیا اور قیادت کے شوق میں اپنا نیم رس جو ہر پیال میں ڈال دیا۔ جہاں وہ عدم مہمداشت کے باعث گلے مڑنے لگا۔

ادب کے ان ترقی پسند ٹھیکے داروں نے پہلے فیصلہ کیا کہ ان کی جماعت کا کوئی رکن سرکاری پرچے میں کام کرے گا نہ اس کے لیے لکھے گا میں نے اس کی مخالفت کی اور ان کو سمجھایا کہ یہ اقدام صریحاً غلط ہے غلط ہی نہیں بلکہ مستحکمہ خیز ہے اس لیے کہ یہ فیصلہ اس احتمال پر چغلی کھاتا تھا جو ترقی پسند مصنفین کی جماعت کو اپنے ارکان کی غیر ثابت قدمی کے متعلق تھا یا ہو سکتا تھا اس کے علاوہ ایسا فیصلہ تو فریق مخالف کی طرف سے ہونا چاہیے تھا لیکن میں اسے بھی بے ہودہ قرار دیتا کیونکہ کوئی بھی سرکار صرف وہی چیز منتخب کرے گی، جو اس کی منشاء کے مطابق ہو۔ ہماری سرکار نے بھی چنانچہ یہی مستحکمہ خیز بات کی مگر کچھ دیر کے بعد، جب کہ

ترقی پسند اپنی عدم تعاون کی قرار داد کا ڈھول کافی اونچے سروں میں پیٹ چکے تھے۔ ریڈیو کی نشریات اور سرکاری پرچوں کے اوراق ترقی پسندوں کے افکار کے لیے بند کر دیئے گئے۔ بعد میں کچھ ترقی پسند ”امرت اوحار ایکٹ“ کے تحت جیل میں ٹھونس دیئے گئے حکومت حماقت کا دوسرا نام ہے اس لیے جو حماقتیں پے درپے اس سے ترقی پسندوں کو خاموش کرنے کے سلسلے میں سرزد ہوئیں میں ان پر تبصرہ کرنا نہیں چاہتا۔

مجھے افسوس ہے کہ احمد ندیم قاسمی اور ظہیر کاشمیری وغیرہ جو بڑے بے ضرر قسم کے انسان ہیں جن کی دماغی اور جسمانی ساخت لفظ سازش کے صحیح معنوں کی متحمل نہیں ہو سکتی بیکار جیل میں ڈالے گئے ایک کو بھائی بنانے کا شوق ہے دوسرے کو بہنیں معلوم نہیں دونوں کے اس معصوم شغل میں سیاسی ردعمل کی شرارت حکومت کو کہاں سے نظر آگئی۔

غصے میں آکر بغیر سوچے سمجھے حکومت نے ان لوگوں کو جیل میں ڈال دیا۔ ایسے نائی کے سپرد کر دیا گیا جو ان کا حلیہ بگاڑ کے رکھ دے گا کچھ دیر کے بعد جب یہ رہا ہو کر آئیں گے تو کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کس قسم کی مخلوق ہوں گے، ہر سے پاؤں تک منڈے ہوں گے، یا ان پر بال ہی بال ہوں گے۔ غازی کہنا نہیں گے یا شہید، لیدر بن جائیں گے یا بازار میں جمعے لگا کر وہائیاں بچیں گے۔ شاعری اور افسانہ نگاری سے توبہ کر لیں گے یا اس پر مردسمہ پا کی طرح سوار ہو جائیں گے اس میں تنصیک کا کوئی پہلو نہیں اگر مجھے جیل میں ٹھونسا جاتا تو میں اپنے متعلق بھی یہی کہتا بلکہ اس سے کچھ زیادہ۔۔۔۔۔ اس لیے کہ میں بہت ڈکی اُلٹس ہوں۔

حکومت اور ترقی پسند مصنفین کی جماعت دونوں احساس کمتری کا شکار ہوئے۔ مجھے اس کا افسوس تھا اور اب بھی ہے زیادہ افسوس ترقی پسندوں کا تھا جنہوں نے خواہ مخواہ سیاست کے پھٹے میں اپنی ٹانگ اڑائی۔ ادب اور سیاست کا جوشاندہ تیار کرنے والے یہ عطائی کریکلمن کے تجویز کردہ نسخے پر عمل کر رہے تھے مریض جس کے لیے یہ جوشاندہ بنایا جا رہا تھا اس کا مزاج کیسا ہے اس کی نبض کیسی ہے اس کے متعلق کسی نے غور نہ کیا نتیجہ جو ہوا وہ آپ کے سامنے ہے کہ آج سب ادب کے جمود کا رونا رہے ہیں۔

میرا دل آج بہت افسردہ ہے کہ وہ پرچے جو ترقی پسند مصنفین کی جماعت کے نمائندے تھے انہیں اپنے ناخداؤں کے ساتھ کئی انٹی سیدھی زقندیں لگانا پڑیں اور آخر میں اپنے تمام مشوروں اپنے تمام بیانیوں اور اپنی تمام قرار دادوں کو کاغذوں پر سے کھرچنا پڑا اور ان ادیبوں کا دوبارہ تعاون حاصل کرنے کے لیے کئی تاویلیں اور کئی معذرتیں پیش کرنا پڑیں جن کو یہ اپنی سیاہ فہرست میں داخل کر چکے تھے اور اپنی طرف سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ملعون و ملعون قرار دے چکے تھے۔

میرا دل آج بہت افسردہ ہے جب میں سرکار سے عدم تعاون کا فیصلہ کرنے والوں کو اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرتے دیکھتا ہوں انہوں نے کیوں نہ سوچا کہ انسان کی جدوجہد کے وسیع دائرے میں سب سے اہم جدوجہد پیٹ کی ہے ہماری ہمت مردانہ یزداں پر کمند ڈال سکتی ہے، ہمارے جنون کے دشت میں جبریل ایک زبوں صید ہو سکتا ہے، گو یہ چھپی ہوئی حقیقت نہیں کہ ہمیں پیٹ کی خاطر بعض اوقات کسی الو کے پٹھے نواب کی مدح سرائی بھی کرنا پڑتی ہے یہ انسان کا بہت بڑا

المیہ ہے لیکن یہ المیہ ہی انسان کا دوسرا نام ہے۔

میرے دل میں اب سارا غصہ افسردگی میں تبدیل ہو گیا ہے میں بہت ملول اور مغموم ہوں، جو کچھ میں نے دیکھا ہے اور جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں اس سے میری افسردگی متحمل ہوتی جا رہی ہے۔ میری موجودہ زندگی مصائب سے پر ہے دن رات مشقت کرنے کے بعد بمشکل اتنا کماتا ہوں جو میری روزمرہ کی ضروریات کے لیے پورا ہو سکے۔ یہ تکلیف دہ احساس ہر وقت مجھے دیمک کی طرح چاٹتا رہتا ہے کہ اگر آج میں نے آنکھیں میچ لیں تو میری بیوی اور تین کم سن بچیوں کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ میں فحش نویس، دہشت پسند، سبکی، لطیفہ باز اور رجعت پسند تھی لیکن ایک بیوی کا خاوند اور تین لڑکیوں کا باپ ہوں۔۔۔۔۔ ان میں سے اگر کوئی بیمار ہو جائے اور موزوں و مناسب علاج کے لیے مجھے درد کی بھیک مانگنی پڑے تو مجھے بہت کوفت ہوتی ہے میرے دوست بھی ہیں جو مجھ سے زیادہ مفلوک الحال ہیں ہر وقت اگر میں ان کی مدد نہ کر سکوں تو مجھے تکلیف ہوتی ہے دینیوی معاملات میں اگر میں کسی کا یا اپنا سر جھکا ہوا دیکھوں تو خدا کی قسم مجھے دکھ ہوتا ہے لیکن جب میں سوچتا ہوں اگر میری موت کے بعد میری تحریروں پر ریڈیو اور انٹیریو کے دروازے کھول دیئے گئے اور میرے افسانوں کو وہی رتبہ دیا گیا جو اقبال مرحوم کے شعروں کو دیا جا رہا ہے تو میری روح سخت بے چین ہوگی میں اس بے چینی کے پیش نظر اس سلوک سے بے حد مطمئن ہوں جو اب تک مجھ سے روا رکھا گیا ہے خدا مجھے اس دیمک سے محفوظ رکھے جو قبر میں میری سوکھی ہڈیاں چاٹے گی۔

میں آج بہت افسردہ ہوں، جب میں اپنے گرد و پیش نہیں شناسوں کو یہ کہتے سنتا ہوں کہ ادب پر جمود طاری ہو گیا ہے ادب انحطاط پذیر ہے ادب ایک تعطل میں گرفتار ہے یہ گفتار ”اسلام خطرے میں ہے“ کی گفتار یعنی سے ملتی جلتی ہے ادب قائم بالذات ہے جس طرح کہ اسلام ہے، قوت کبھی انحطاط پذیر نہیں ہوتی اس پر کبھی جمود یا تعطل طاری نہیں ہوتا ایٹم کی قوت اس کے انکشاف سے پہلے بھی موجود تھی، اور اس کے انکشاف کے بعد بھی موجود رہے گی اس کا غلط استعمال یا اس کے عدم استعمال کا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ وہ نحیف ہو گئی ہے جان بلب ہے یا مر گئی ہے۔

ادب اسی قوت اسی توانائی، اسی آب و تاب سے زندہ ہے جس طرح کہ وہ منصہ شہود پر آنے سے پہلے زندہ تھا اس پر جمود اور تعطل طاری ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یہ ہمارا اپنا جمود اور تعطل ہے جسے ہم ادب کے جمود اور تعطل سے تعبیر کرتے ہیں۔

اس بحر ان کے اسباب و ملل چنانچہ ہمیں ادب میں نہیں خود اپنے اذہان میں ڈھونڈنے چاہئیں اور یہ کوئی مشکل کام نہیں ادب کے مستقیم راستے سے ہٹ کر اگر ہم ادھر ادھر نکل جائیں تو یہ نہیں کہنا چاہیے کہ راستہ ہمارے آگے سے ہٹ گیا ہے سیاست کا اپنا مقام الگ ہے اس تک پہنچنے کے لیے سیاست کے بیچ در بیچ راستوں پر گامزن ہونا بھی غلطی ہے۔

سوویت روس کے ادب کا لاکھ ڈھنڈہ راپٹا جائے مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ وہ غلی تحریریں جو وہاں لاکھوں سن کاغذوں پر چھپتی ہیں ادب نہیں ہیں، ہرگز نہیں ہیں

ادب، ادب ہے، یا کوئی اور شے ہے۔ جس کا ایک نمونہ روسی ادیبوں کی حالیہ تحریروں کی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

ادب پر کسی کی اجارہ داری ہوئی ہے نہ ہوگی یہ کوئی ایسا کام نہیں جسے ٹھیکے پر دے کر کرالیا جائے ”ادب پر جمود طاری ہے“ یہ ایک ڈھکوسلا ہے ”اسلام خطرے میں ہے“ کی قسم کا اسے کھڑا کرنے والے بھی وہی ہیں جو آج سے چند ماہ پیشتر مٹیوں پر چڑھ کر پکارتے رہے ہیں کہ ترقی پسند مصنفین نے تقسیم ہند کے بعد ادب کی لاج رکھ لی ہے غریب مر رہا تھا، مگر انہوں نے اپنا خون دے کر اسے زندہ کر دیا ہے۔۔۔۔۔ حیرت ہوتی ہے کہ اتنی جلدی ان کے گفتی کے چند ارکان کے مقید ہونے کے فوراً بعد ادب کی زندگی پھر کیوں خطرے میں پڑ گئی؟

میں آج بہت افسردہ ہوں۔۔۔۔۔ پہلے مجھے ترقی پسند تسلیم کیا جاتا تھا بعد میں مجھے ایک دم رجعت پسند بنا دیا گیا۔ اور اب فتوے دینے والے سوچ رہے ہیں اور پھر سے یہ تسلیم کرنے کے لیے آمادہ وہ رہے ہیں کہ میں ترقی پسند ہوں اور فتوؤں پر اپنے فتوے دینے والی سرکار مجھے ترقی پسند یقین کرتی ہے یعنی ایک سرخا۔۔۔۔۔ ایک کمیونسٹ، کبھی کبھی جھنجھلا کر مجھ پر فحش نگاری کا الزام لگا دیتی ہے اور مقدمہ چلا دیتی ہے۔ دوسری طرف یہی سرکار اپنی مطبوعات میں یہ اشتہار دیتی ہے۔۔۔۔۔ کہ سعادت حسن منٹو ہمارے ملک کا بہت بڑا ادیب اور افسانہ نگار ہے جس کا قلم گزشتہ ہنگامی دور میں بھی رواں دواں رہا۔۔۔۔۔ میرا افسردہ دل لرزتا ہے کہ قلمون مزاج سرکار خوش ہو کر ایک تمنغہ میرے کفن سے ٹانک دے گی جو میرے داغ عشق کی بہت بڑی توہین ہوگی۔

ہزارے کے بعد اب تک میں یہ کتابیں ترتیب وار آپ کی خدمت میں پیش کر چکا ہوں ان سے آپ بطریق احسن میری دماغی کیفیات کا جائزہ لے سکتے ہیں۔

- | | | | |
|---|--------------------|---|----------------------|
| 1 | تلخ ہر ش اور شیریں | 2 | لذت سنگ |
| 3 | سیاہ حاشیے | 4 | خالی باتیں، خالی ڈبے |
| 5 | ٹھنڈا گوشت | 6 | نمرود کی خدائی |
| 7 | بادشاہت کا خاتمہ | | |

ان کے بعد افسانوں کا یہ تازہ مجموعہ پیش خدمت ہے اس میں صرف دو افسانے مطبوعہ ہیں ”یزید“ اور ”1919ء کی ایک بات“ باقی غیر مطبوعہ ہیں یہ مجموعہ کتنے عرصے میں لکھا گیا اور کتنے عرصے میں شائع ہو کر آپ تک پہنچا ہے یہ آپ کو متعلقہ تاریخوں سے معلوم ہو سکتا ہے مجموعے کا آخری افسانہ ”ممی“ لکھنا شروع کیا تھا کہ 16 اکتوبر کو خان لیاقت علی خان وزیراعظم پاکستان کے قتل کی خبر موصول ہوئی جس سے دماغ بہت مضطرب رہا اس کے بعد میری منجھلی بچی جیاجی تپ محرقہ میں مبتلا ہو گئی اس کے باعث بھی کئی دن پریشان رہا نتیجتاً اس افسانے کی تکمیل میں تعویق ہو گئی۔

سعادت حسن منٹو

لاہور 28 اکتوبر 1951ء

☆☆☆☆☆☆

چوری

سکول کے تین چار لڑکے الاؤ کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھ گئے اور اس بوڑھے آدمی سے جو ناٹ پر بیٹھا اپنے استخوانی ہاتھ تاپنے کی خاطر الاؤ کی طرف بڑھائے تھا کہنے لگے۔ ”باباجی کوئی کہانی سنائیے؟“

مرد نے جو ناٹ کسی گہری سوچ میں غرق تھا اپنا بھاری سر اٹھایا جو گردن کی انگری کی مچ سے نیچے کو جھکا ہوا تھا ”کہانی! میں خود ایک کہانی ہوں مگر۔۔۔۔۔“ اس کے بعد کے الفاظ اس نے اپنے پو پلے منہ ہی میں بڑبڑائے شاید وہ اس جملے کو لڑکوں کے سامنے ادا کرنا نہیں چاہتا تھا جن کی سمجھ اس قابل نہ تھی کہ وہ فہمیانہ نکات حل کر سکے

کلڑی کے نکلنے کے شور کے ساتھ جل جل کر آتشیں شلم کو پر کر رہے تھے شعلوں کی عنابی روشنی لڑکوں کے معصوم چہروں پر ایک عجیب انداز میں رقص کر رہی تھی۔ ننھی ننھی چنگاریاں سپید راکھ کی نقاب الٹ الٹ کر حیرت میں سر بلند شعلوں کا منہ تک رہی تھیں۔

بوڑھے آدمی نے الاؤ کی روشنی میں لڑکوں کی طرف نگاہیں اٹھا کر کہا ”کہانی۔۔۔۔۔ ہر روز کہانی۔۔۔۔۔ کل سناؤں گا“

لڑکوں کے متمنا تے ہوئے چہروں پر افسردگی چھائی نا امیدی کے عالم میں وہ ایک دوسرے کا منہ تکتے گئے گویا وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہے تھے ”آج رات کہانی سن بغیر سونا ہوگا“ یکا یک ان میں سے ایک لڑکا جو دوسروں کی پابست

بہت ہشیار اور ذہن معلوم ہوتا تھا الاؤ کے قریب سرک کر بلند آواز میں بولا مگر کل آپ نے وعدہ کیا تھا اور وعدہ خلافی کرنا درست نہیں ہے۔۔۔ کیا آپ کو کل والے حامد کا انجام یاد نہیں ہے جو ہمیشہ اپنا کہا بھول جایا کرتا تھا۔

”درست! میں بھول گیا تھا“ بوڑھے آدمی نے یہ کہہ کر اپنا سر جھکا لیا جیسے وہ اپنی بھول پر تادم ہے تھوڑی دیر کے بعد وہ اس دلیر لڑکے کی جرأت کا خیال کر کے مسکرایا ”میرے بچے! مجھ سے غلطی ہو گئی مجھے معاف کر دو مگر میں کون سی کہانی سناؤں؟ پتھر و مجھے یاد کر لینے دو“ یہ کہتے ہوئے وہ سر جھکا کر گہری سوچ میں غرق ہو گیا۔

اسے جن اور پریوں کی الایعنی داستانوں سے سخت نفرت تھی وہ بچوں کو ایسی کہانیاں سنایا کرتا تھا جو ان کے دل و دماغ کی اصلاح کر سکیں اسے بہت سے فضول قصے یاد تھے جو اس نے بچپن میں سنے تھے۔ یا کتابوں میں پڑھے تھے مگر اس وقت وہ اپنے براہِ پیری کے بوسیدہ تارچھیڑ رہا تھا کہ شاید ان میں کوئی خوابیدہ راگ جاگ اٹھے۔

لڑکے باباجی کو خاموش دیکھ کر آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے غالباً اس لڑکے کی بابت جسے کتاب چرانے پر بید کی سزا ملی تھی باتوں باتوں میں ان میں سے کسی نے بلند آواز میں کہا ”ماسٹر جی کے لڑکے نے بھی تو میری کتاب چرائی تھی مگر اسے سزا و زانی“

”کتاب چرائی تھی“ ان چار لفظوں نے جو بلند آواز میں ادا کئے گئے تھے بوڑھے کی خفتہ یاد میں ایک واقعہ کو جگا دیا اس نے اپنا سپید سر اٹھایا اور اپنی آنکھوں

کے سامنے بھولی بھری داستان کو انگڑائیاں لیتے پایا ایک لمحہ کے لیے اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی مگر وہیں غرق ہو گئی اضطراب کی حالت میں اس نے اپنے نحیف جسم کو جنبش دے کر الاؤ کے قریب کیا اس کے چہرے کے تغیر و تبدل سے صاف طور پر عیاں تھا کہ وہ کسی واقعہ کو دوبارہ یاد کر کے بہت تکلیف محسوس کر رہا ہے۔

الاؤ کی روشنی بدستور لڑکوں کے چہروں پر ناچ رہی تھی دفعتاً بوڑھے نے آخری ارادہ کرتے ہوئے کہا ”بیو! آج میں اپنی کہانی سناؤں گا“ لڑکے فوراً اپنی باتیں چھوڑ کر ہمہ تن گوش ہو گئے الاؤ کی چنجی ہوئی لکڑیاں ایک شور کے ساتھ اپنی اپنی جگہ پر ابھر کر خاموش ہو گئیں۔۔۔ ایک لمحہ کے لیے فضا پر مکمل سکوت طاری رہا۔

”بابا جی اپنی کہانی سنائیں گے؟“ ایک لڑکے نے خوش ہو کر کہا باقی سرک کر آگ کے قریب خاموشی سے بیٹھ گئے۔

”ہاں۔۔۔ اپنی کہانی“ یہ کہہ کر بوڑھے آدمی نے اپنی جھکی ہوئی گھٹی بھڑوں میں سے کوٹھڑی کے باہر تاریکی میں دیکھنا شروع کیا چھوڑی دیر کے بعد وہ لڑکوں سے پھر مخاطب ہوا ”میں آج تمہیں اپنی پہلی چوری کی داستان سناؤں گا“ لڑکے حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکتے لگے انہیں اس بات کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ بابا جی کسی زمانہ میں چوری بھی کرتے رہے ہیں بابا جی جو ہر وقت انہیں برے کاموں سے بچنے کے لیے نصیحت کیا کرتے ہیں۔

لڑکا جو ان سب میں دلیر تھا اپنی حیرت نہ چھپا سکا ”پر کیا آپ نے واقعی چوری

”کی؟“

”واقعی“

”آپ اس وقت کس جماعت میں پڑھا کرتے تھے؟“

”نویں میں“

یہ سن کر لڑکے کی حیرت اور بھی بڑھ گئی اسے اپنے بھائی کا خیال آیا جو نویں جماعت میں تعلیم پا رہا تھا وہ اس سے عمر میں دو گنا بڑا تھا اس کی تعلیم اس سے کہیں زیادہ تھی وہ انگریزی کی کئی کتابیں پڑھ چکا تھا اور اسے ہر وقت نصیحتیں کیا کرتا تھا یہ کیوں کر ممکن تھا کہ اس عمر کا اور اچھا پڑھا لکھا لڑکا چوری کرے؟ اس کی عقل اس معمہ کو حل نہ کر سکی چنانچہ اس نے پھر سوال کیا ”آپ نے چوری کیوں کی؟“

اس مشکل سوال نے بڑھے کو جوڑی دیر کے لیے گھبرا دیا۔۔۔ آخر وہ اس کا کیا جواب دے سکتا تھا کہ فلاں کام اس نے کیوں کیا؟ بظاہر اس کا جواب یہی ہو سکتا تھا ”اس لیے کہ اس وقت اس کے دماغ میں یہی خیال آیا“ اس نے دل میں یہی جواب سوچا مگر اس نے ممکن نہ ہو کر یہ بہتر خیال کیا کہ تمام داستان من و عن بیان کر دے۔

”اس کا جواب میری کہانی ہے جو میں اب تمہیں سنائے والا ہوں“

”سنائیے؟“

لڑکے اس بوڑھے آدمی کی چوری کا حال سننے کے لیے اپنی اپنی جگہ پر جم کر بیٹھ گئے جو الاؤ کے سامنے اپنے سپید بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کر رہا تھا اور جسے وہ ایک بہت بڑا آدمی خیال کرتے تھے۔

”ہر شخص خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا اپنی زندگی میں کوئی نہ کوئی ایسی حرکت ضرور کرتا ہے جس پر وہ تمام عمر ماتم رہتا ہے میری زندگی میں سب سے بڑا فعل ایک کتاب کی چوری ہے۔“

یہ کہہ کر وہ رک گیا اس کی آنکھیں جو ہمیشہ چمکتی رہتی تھیں دھندلی پڑ گئیں اس کے چہرے کی تبدیلی سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے زبردست ذہنی تکلیف کا سامنا کر رہا ہے چند لمحات کے توقف کے بعد وہ پھر بولا

”سب سے مکروہ فعل کتاب کی چوری ہے یہ میں نے ایک کتاب فروش کی دکان سے چرائی یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب میں نویں جماعت میں تعلیم پاتا تھا قدرتی طور پر جیسا کہ اب تمہیں کہانی سننے کا شوق ہے مجھے افسانے اور ناول پڑھنے کا شوق تھا۔۔۔۔۔ دوستوں سے مانگ کر یا خود خرید کر میں ہر نئے ایک نیا ایک کتاب ضرور پڑھا کرتا تھا وہ کتابیں عموماً عشق و محبت کی بے معنی داستانیں یا فصول جاسوسی قصے ہوا کرتے تھے یہ کتابیں میں ہمیشہ چھپ چھپ کر پڑھا کرتا تھا والدین کو اس بات کا علم نہ تھا اگر انہیں معلوم ہوتا تو وہ مجھے ایسا ہرگز ہرگز نہ کرنے دیتے اس لیے کہ اس قسم کی کتابیں سکول کے لڑکے کے لیے بہت نقصان دہ ہوتی ہیں میں ان کے مہلک نقصان سے غافل تھا چنانچہ مجھے اس کا نتیجہ جھگڑنا پڑا میں نے چوری کی اور پکڑا گیا“

ایک لڑکے نے حیرت زدہ ہو کر کہا ”آپ پڑے گئے؟“

”ہاں پکڑا گیا چونکہ میرے والدین اس واقعہ سے بالکل بے خبر تھے یہ عادت پکتے پکتے میری طبیعت بن گئی گھر سے جتنے پیسے ملتے میں انہیں جوڑ جوڑ کر بازار سے افسانوں کی کتابیں خریدنے میں صرف کر دیتا سکول کی پڑھائی سے رفتہ رفتہ مجھے نفرت ہونے لگی ہر وقت میرے دل میں یہی خیال سایا رہتا کہ فلاں کتاب جو فلاں ناول نویس نے لکھی ہے ضرور پڑھنی چاہیے یا فلاں کتب فروش کے پاس نئی ناولوں کا جو ذخیرہ موجود ہے ایک نظر ضرور دیکھنا چاہیے شوق کی یہ انتہا دوسرے معنوں میں دیوانگی ہے اس حالت میں انسان کو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیا کرنے والا ہے یا کیا کر رہا ہے۔“ اس وقت وہ بے عقل بچے کی مانند ہوتا ہے جو اپنی طبیعت خوش کرنے یا شوق پورا کرنے کے لئے جلتی ہوئی آگ میں بھی ہاتھ ڈال دیتا ہے۔ اسے یہ پتہ نہیں ہوتا کہ چمکنے والی شے جسے وہ پکڑ رہا ہے اس کا ہاتھ جلادے گی ٹھیک یہی حالت میری تھی فرق اتنا ہے کہ بچہ شعور سے محروم ہوتا ہے اس لیے وہ بغیر سمجھے بوجھے بری سے بری حرکت کر بیٹھتا ہے مگر میں نے عقل کا مالک ہوتے ہوئے چوری ایسے مکروہ جرم کا ارتکاب کیا۔۔۔۔۔ یہ آنکھوں کی موجودگی میں میرے اندھے ہونے کی دلیل ہے میں ہرگز ایسا کام نہ کرتا۔۔۔۔۔ اگر میری عادت مجھے مجبور نہ کرتی۔

ہر انسان کے دماغ میں شیطان موجود ہوتا ہے جو وقتاً فوقتاً اسے برے کاموں پر مجبور کرتا ہے یہ شیطان مجھ پر اس وقت غالب آیا جبکہ سوچنے کے لیے میرے پاس بہت کم وقت تھا خیر۔۔۔۔۔

لڑکے خاموشی سے بوڑھے کے ہلتے ہوئے لبوں کی طرف نگاہیں گاڑے اس

کی داستان سن رہے تھے داستان کا تسلسل اس وقت ٹوٹا دیکھ کر جب کہ اصل مقصد بیان کیا جانے والا تھا وہ بڑی بے قراری سے بقایا تفصیل کا انتظار کرنے لگے۔

”مسعود بیٹا! یہ سامنے والا دروازہ تو بند کر دینا۔۔۔۔۔ سرد ہوا آرہی ہے“
بوڑھے نے اپنا کھبل گھٹنوں پر ڈال لیا
مسعود ”اچھا بابا جی!“ کہہ کر اٹھا اور کوٹھڑی کا دروازہ بند کرنے کے بعد اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

”ہاں تو ایک دن جبکہ والد گھر سے باہر تھے“ بوڑھے نے اپنی داستان کا بقایا حصہ شروع کیا ”مجھے بھی کوئی خاص کام نہ تھا اور وہ کتاب جو میں ان دنوں پڑھ رہا تھا ختم ہونے کے قریب تھی اس لیے میرے جی میں آئی کہ چلو اس کتب فروش تک ہوا آئیں جس کے پاس بہت سی جاسوسی ناولیں پڑی تھیں۔“

میری جیب میں اس وقت اتنے پیسے موجود تھے جو ایک معمولی ناول کے دام ادا کرنے کے لیے کافی ہوں چنانچہ میں گھر سے سیدھا اس کتب فروش کی دکان پر گیا۔۔۔ یوں تو اس دکان پر ہر وقت بہت سی اچھی اچھی ناولیں موجود رہتی تھیں مگر اس دن خاص طور پر بالکل نئی کتابوں کا ایک ڈھیر باہر تختے پر رکھا تھا ان کتابوں کے رنگ برنگ سرورق دیکھ کر میری طبیعت میں ایک ہیجان ساہرپا ہو گیا دل میں اس خوانہ نش نے گدگدی لی کہ وہ تمام میری ہو جائیں۔

میں دکاندار سے اجازت لے کر ان کتابوں کو ایک نظر دیکھنے میں مشغول ہو گیا ہر کتاب کے شوخ رنگ سرورق پر اس قسم کی کوئی نہ کوئی عبارت لکھی ہوئی تھی

”مصور اسرار کا لسانی شاہکار“

”تمثیل! بیجان، زہمان۔۔۔ سب کیجا“

تھوڑی دیر کے بعد دل میں یہ ارادہ کر کے کہ میں دوسرے نشتے ان ناولوں کو دوبارہ دیکھنے آؤں گا میں نے اپنی چٹی ہوئی کتاب اٹھائی۔۔۔ کتاب کا اٹھا ہوا تھا کہ میری نگاہیں ایک مجلد ناول پر گر گئیں سرورق کے کونے پر میرے محبوب ناولسٹ کا نام سرخ لفظوں میں چھپا تھا اس کے ذرا اوپر کتاب کا نام تھا۔

”منتقم شعائیں۔۔۔۔۔ کسی طرح ایک دیوانے ڈاکٹر نے لندن کو تباہ کرنے کا ارادہ کیا۔“

یہ طور پڑھتے ہی میرے اشتیاق میں طغیانی سی آگئی کتاب کا مصنف وہی تھا جس نے اس سے پیشتر مجھ پر راتوں کی نیند حرام کر رکھی تھی ناول کو دیکھتے ہی میرے دماغ میں خیالات کا ایک گروہ داخل ہو گیا۔

”منتقم شعاعیں... دیوانے ڈاکٹر کی ایجاد..... کیا دلچسپ
افسانہ ہوگا“

”لندن تباہ کرنے کا ارادہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟“
 ”اس مصنف نے فلاں فلاں کتابیں کتنی سستی خیر نکھی ہیں“
 ”یہ کتاب ضرور ان سب سے بہتر ہوگی“

میں خاموش اشتیاق کے ساتھ اس کتاب کی طرف دیکھ رہا تھا اور خیالات کیلے
 بعد دیکرے میرے کانوں میں شور برپا کر رہا تھے میں نے اس کتاب کو اٹھایا اور
 کھول کر دیکھا تو پہلے ورق پر یہ عبارت نظر آئی ”مصنف اس کتابی کو اپنی بہترین
 تصنیف قرار دیتا ہے۔“

”ان الفاظ نے میرے اشتیاق میں آگ پر ایندھن کا کام دیا ایک ایسی مکی میرے
 دماغ کے خدا معلوم کس گوشے سے ایک خیال کو دپڑا۔۔۔۔۔۔ وہ یہ کہ میں اس
 کتاب کو اپنے کوٹ میں چھپا کر لے جاؤں میری آنکھیں بے اختیار کتب فروش
 کی طرف مڑیں جو کانڈ پر کچھ لکھنے میں مشغول تھا دکان کی دوسری طرف دو نو جوان
 کھڑے میری طرح کتابیں دیکھ رہے تھے۔۔۔۔۔۔ میں سر سے پیر تک لرز گیا“
 یہ کہتے ہوئے بوڑھے کا نحیف جسم اس واقعہ کی یاد سے کانپا۔۔۔۔۔۔ جموڑی
 دیر تک خاموش رہ کر اس نے پھر اپنی داستان شروع کر دی ”ایک لحظہ کے لیے
 میرے دماغ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ چوری کرنا بہت برا کام ہے مگر ضمیر کی آواز سر
 ورق پر بنی ہوئی لانی لانی شعا عموں میں غرق ہو گئی میرا دماغ ”منعتم
 شعاعیں۔۔۔۔۔۔ منعتم شعاعیں“ کی گردان کر رہا تھا میں نے ادھر ادھر جھانکا اور
 جھٹ سے وہ کتاب کوٹ کے اندر نفل میں دبائی مگر میں کانپنے لگا“

اس حالت پر قابو پا کر میں کتب فروش کے قریب گیا اور اس کتاب کے دام ادا

کر دیئے جو میں نے پہلے خریدی تھی قیمت لیتے وقت اور روپے میں سے باقی پیسے واپس کرنے میں اس نے غیر معمولی تاخیر سے کام لیا میری طرف اس نے گھور کر بھی دیکھا جس سے میری طبیعت سخت پریشان ہو گئی جی میں بھی آئی کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہاں سے بھاگ نکلوں۔

میں نے اس دوران میں کئی بار اس جگہ پر جو کتاب کی وجہ سے ابھری ہوئی تھی نگاہ ڈالی۔۔۔۔ اور شاید اسے چھپانے کی بے سود کوشش بھی کی میری ان عجیب و غریب حرکتوں کو دیکھ کر اسے شک ضرور ہوا اس لیے کہ وہ بار بار کچھ کہنے کی کوشش کر کے پھر خاموش ہو جاتا تھا۔

میں نے باقی پیسے جلدی سے لیے اور وہاں سے چل دیا دو سو قدم کے فاصلے پر میں نے کسی کی آواز سنی مڑ کر دیکھا تو کتب فروش ننگے پاؤں چلا آ رہا تھا اور مجھے ٹھہرنے کے لیے کہہ رہا تھا۔۔۔۔ میں نے اندھا دھند بھاگنا شروع کر دیا۔

مجھے معلوم نہ تھا میں کدھر بھاگ رہا ہوں میرا رخ اپنے گھر کی جانب نہ تھا میں شروع ہی سے اس طرف بھاگ رہا تھا جدھر بازار کا اختتام تھا اس نلٹلی کا مجھے اس وقت احساس ہوا جب دو تین آدمیوں نے مجھے پکڑ لیا

بوڑھا اتنا کہہ کر اضطراب کی حالت میں اپنی خشک زبان لبوں پر پھیرنے لگا کچھ تو قف کے بعد وہ ایک لڑکے سے مخاطب ہوا
 ”مسعود! پانی کا ایک گھونٹ پلو“

مسعود خاموشی سے اٹھا اور کوٹھری کے ایک کونے میں پڑے ہوئے گھڑے سے گلاس میں پانی انڈیل کر لے آیا بوڑھے نے گلاس لیتے ہی منہ سے لگا لیا اور

ایک گھونٹ میں سارا پانی پی گیا اور خالی گلاس زمین پر رکھتے ہوئے کہا ”ہاں میں
کیا بیان کر رہا تھا؟“

ایک لڑکے نے جواب دیا ”آپ بھاگے جا رہے تھے“

میرے پیچھے کتب فروش ”چورچور“ کی آواز بلند کرتا چلا آ رہا تھا جب میں نے
دو تین آدمیوں کو اپنا تعاقب کرتے دیکھا تو میرے ہوش ٹھکانے نہ رہے جیل کی
آہنی سائیں، پولیس اور عدالت کی تصویریں ایک ایک کر کے میری آنکھوں کے
سامنے آگئیں بے عزتی کے خیال سے میری پیشانی عرق آلود ہو گئی میں لڑکھڑایا
اور گر پڑا اٹھنا چاہا تو مانگوں نے جواب دے دیا اس وقت میرے دماغ کی عجیب
حالت تھی ایک تند و تھوڑا سا میرے سینے میں کروٹیں لے رہا تھا آنکھیں فرط خوف
سے ابل رہی تھیں اور کانوں میں ایک زیر دست شور برپا تھا جیسے بہت سے لوگ
آہنی چادریں ہتھوڑوں سے کوٹ رہے ہیں میں ابھی اٹھ کر بھاگنے کی کوشش ہی کر
رہا تھا کہ کتب فروش اور اس کے ساتھیوں نے مجھے پکڑ لیا اس وقت میری کیا
حالت تھی اس کا بیان کرنا بہت دشوار ہے سینکڑوں خیالات پتھروں کی طرح
میرے دماغ سے نکل کر مختلف آوازیں پیدا کر رہے تھے جب انہوں نے مجھے
پکڑا تو ایسا معلوم ہوا کہ آہنی پنچہ نے میرے دل کو مسل ڈالا ہے۔۔۔ میں بالکل
خاموش تھا وہ مجھے دکان کی طرف کشاں کشاں لے گئے۔

جیل خانہ کی کوٹھڑی اور عدالت کا منہ دیکھنا یقینی تھا اس خیال پر میرے ضمیر نے
لعنت ملامت شروع کر دی چونکہ اب جو ہونا تھا ہو چکا تھا اور میرے پاس اپنے
ضمیر کو جواب دینے کے لیے کوئی الفاظ موجود نہ تھے اس لیے میری گرم آنکھوں

میں آنسو تر آئے اور میں نے بے اختیار رو مانا شروع کر دیا۔ یہ کہتے ہوئے بوڑھے کی دھندلی آنکھیں غمناک ہو گئیں۔

”کتب فروش نے مجھے پولیس کے حوالے نہ کیا اپنی کتاب لے لی اور نصیحت کرنے کے بعد چھوڑ دیا“ بوڑھے نے اپنے آنسو کھر دے کمرے سے خشک کیے۔ ”خدا اس کو جزائے خیر دے میں عدالت کے دروازے سے تونچ گیا مگر اس واقعہ کی والد اور سکول کے لڑکوں کو خبر ہو گئی والد مجھ سے سخت خفا ہوئے لیکن انہوں نے بھی آخر میں مجھے معاف کر دیا۔“

دو تین روز مجھے اس ندامت کے باعث بخارا آتا رہا اس کے بعد جب میں نے دیکھا میرا دل کسی کمرے آرام نہیں لیتا اور مجھ میں اتنی قوت نہیں کہ میں لوگوں کے سامنے اپنی دکھیں اٹھا سکوں تو میں شہر چھوڑ کر وہاں سے ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گیا اس وقت سے لے کر اب تک میں نے مختلف شہروں کی خاک چھانی ہے ہزاروں مضائب برداشت کیے ہیں صرف اس کتاب کی چوری کی وجہ سے جو مجھے تادم مرگ نام و شرمسار رکھے گی

”اس آوارہ گروی کے دوران میں، میں نے اور بھی بہت سی چوریاں کیں ڈاکے ڈالے اور ہمیشہ پکڑا گیا مگر ان پر تادم نہیں ہوں مجھے فخر ہے“

بوڑھے کی دھندلی آنکھوں میں پھر پہلی سی چمک نمودار ہو گئی اور اس نے الاء کے شعلوں کو نکلی باندھ کر دیکھنا شروع کر دیا ”ہاں مجھے فخر ہے“ یہ الفاظ اس نے تھوڑے تو قف کے بعد دوبارہ کہے۔

الاء میں آگ کا ایک شعلہ بلند ہوا اور ایک لمحہ فضا میں تھر تھرا کر وہیں سو گیا

بوڑھے نے شعلے کی جرات دیکھی اور مسکرا دیا پھر لڑکوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا ”
 کہانی ختم ہو گئی ہے اب تم جاؤں تمہارے ماں باپ انتظار کرتے ہوں گے“
 مسعود نے سوال کیا ”مگر آپ کو اپنی دوسری چوریوں پر کیوں فخر ہے؟“
 ”فخر کیوں ہے؟“ بوڑھا مسکرا دیا ”اس لیے کہ وہ چوریاں نہیں تھیں اپنی
 مسروقہ چیزوں کو دوبارہ حاصل کرنا چوری نہیں ہوتی میرے عزیز! بڑے ہو کر اچھی
 طرح معلوم ہو جائے گا۔“
 ”میں سمجھا نہیں“

”بروہ چیز جو تم سے چرائی گئی ہے تمہیں حق حاصل ہے کہ اسے ہر ممکن طریقہ
 سے اپنے قبضہ میں لے آؤ پر یاد رہے تمہاری کوشش کامیاب ہونی چاہیے ورنہ ایسا
 کرتے ہوئے پکڑے جانا اور اذیتیں اٹھانا عبث ہے۔“
 لڑکے اٹھے اور باباجی کو شب بخیر کہتے ہوئے کوٹھری کے دروازے سے باہر
 چلے گئے بوڑھے کی نگاہیں ان کو تارکی میں گم ہوتے دیکھتی رہیں جموڑی دیر اسی
 طرح دیکھنے کے بعد وہ اٹھا اور کوٹھڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے بولا
 ”کاش کہ یہ بڑے ہو کر اپنی کھوئی ہوئی چیزیں واپس لے سکیں“ بوڑھے کو خدا
 معلوم ان لڑکوں سے کیا امید تھی۔

☆☆☆☆☆

چو ہے دان

شوکت کو چو ہے پکڑنے میں بہت مہارت حاصل ہے وہ مجھ سے کہا کرتا ہے یہ ایک فن ہے جس کو باقاعدہ سیکھنا پڑتا ہے اور سچ پوچھیے تو جو ترکیبیں شوکت کو چو ہے پکڑنے کے لیے یاد ہیں، ان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کافی محنت کی ہے اگر چو ہے پکڑنے کا کوئی فن نہیں ہے تو اس نے اپنی ذہانت سے اسے فن بنا دیا ہے اس کو آپ کوئی چو ہا دکھا دیجئے وہ فوراً آپ کو بتا دے گا کہ اس ترکیب سے وہ اتنے گھنٹوں میں پکڑا جائے اور اس طریقے سے اگر آپ اسے پکڑنے کی کوشش کریں تو اتنے دن لگ جائیں گے۔

چو ہوں کی نسلوں اور ان کی عادات و اطوار کا شوکت بہت گہرا مطالعہ کر چکا ہے اس کو اچھی طرح معلوم ہے کہ کس ذات کے چو ہے جلدی بچھنس جاتے ہیں اور کس نسل کے چو ہے بڑی مشکلوں کے بعد قابو میں آتے ہیں اور پھر ہر قسم کے چوہوں کو پھانسنے کی ایک سو ایک ترکیب شوکت کو معلوم ہے۔

موئے موئے اصول اس نیا یک روز مجھے بتائے تھے کہ چھوٹی چھوٹی چوہیاں اگر پکڑنا ہوں تو ہمیشہ نیا چو ہے دان استعمال کرنا چاہیے چو ہے دان کی ساخت کسی قسم کی بھی ہو، اس کی کوئی پروا نہیں خیال اس بات کا رکھنا چاہیے کہ چو ہے دان ایسی جگہ پر نہ رکھا جائے جہاں آپ نے چوہیا یا چوہیاں دیکھی تھیں ٹرنگوں کے پیچھے الماریوں کے نیچے، کتیں بھی جہاں آپ نے چوہیا نہ دیکھی ہو۔ چو ہے دان رکھ دیا جائے اور اس میں تلی ہوئی مچھلی کا چھوٹا سا ٹکڑا رکھ دیا جائے ٹکڑا بڑا نہ ہو اگر

چو ہے دان کھٹ سے بند ہونے والا ہے تو اس میں خاص طور پر بڑا نکلز نہیں لگتا چاہیے کہ چو ہیا اندر آ کر اس نکلزے کا کچھ حصہ کتر کر باہر چلی جائے گی نکلز اچھوٹا ہو گا تو وہ اسے اتارنے کی کوشش کرے گی اور یوں جھٹ پٹ پنجرے میں قید ہو جائے گی۔۔۔۔ ایک چو ہیا پکڑنے کے بعد چو ہے دان کو گرم پانی سے دھولینا چاہیے۔ اگر آپ اسے اچھی طرح نہ دھوئیں گے تو پہلی چو ہیا کی بو اس میں رہ جائے گی جو دوسری چو ہیوں کے لیے خطرے کے الارم کا کام دے گی۔ اس لیے اس بات کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے ہر چو ہے یا چو ہیا کو پکڑنے کے بعد چو ہے دان کو دھولینا چاہئے اگر گھر میں زیادہ چو ہے چو ہیاں ہوں اور ان سب کو پکڑنا ہو تو ایک چو ہے دان کام نہیں دے گا تین چار چو ہے دان پاس رکھنے چاہئیں جو بدل بدل کر کام میں لائے جائیں چو ہے کی ذات بڑی سیانی ہوتی ہے اگر ایک ہی چو ہے دان گھر میں رکھا جائے گا تو چو ہے اس سے خوف کھانا شروع کر دیں گے اور اس کے نزدیک تک نہیں آئیں گے بعض اوقات ان تمام باتوں کا خیال رکھنے پر بھی چو ہے چو ہیاں قابو میں نہیں آتیں اس کی بہت سی وجہیں ہوتی ہیں بہت ممکن ہے کہ آپ سے پہلے جو مکان میں رہتا تھا اس نے اسی قسم کا چو ہے دان استعمال کیا تھا جیسا کہ آپ کر رہے ہیں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے چو ہے کو پکڑ کر باہر گلی یا بازار میں چھوڑ دیا ہو اور چند دنوں کے بعد پھر واپس گھر آ گیا ہو۔ ایسے چو ہے جو ایک بار چو ہے دان میں پھنس کر پھر اپنی جگہ پر واپس آ جائیں اس قدر ہوشیار ہو جاتے ہیں کہ بڑی مشکلوں سے قابو میں آتے ہیں یہ چو ہے دوسرے چو ہوں کو بھی خبردار کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آپ کی تمام کوششیں بے

سو دنا بت ہوتی ہیں اور چوہے بڑے اطمینان سے اوٹھرا دھروڑتے رہتے ہیں اور آپ کا اور آپ کے چوہے دان کا منہ چڑاتے رہتے ہیں۔۔۔۔۔ چوہے کے بل کے پاس تو چوہے دان ہرگز ہرگز نہیں رکھنا چاہیے، اس لیے کہ اتنی بڑی چیز اپنے گھر کے پاس دیکھ کر جو پہلے کبھی نہیں ہوتی تھی چوہا فوراً چوہا کنا ہو جاتا ہے۔ اور اس کو دال میں کالا کالا نظر آ جاتا ہے جب کسی حیلے سے چوہے نہ پکڑے جائیں تو گروہ پیش کی فضا کا مطالعہ و مشاہدہ کر کے یہ معلوم کرنا چاہیے کہ اس پاس کے لوگ کیسے ہیں، کس قسم کی چیزیں کھاتے ہیں اور ان کے گھروں کے چوہے کس چیز پر جلدی کرتے ہیں یہ تمام باتیں معلوم کر کے آپ کو تجربے کرنا پڑیں گے اور ایسی ترکیب ڈھونڈنا پڑے گی جس کے ذریعے سے آپ اپنے گھر کے چوہے گرفتار کر سکیں۔

شوکت چوہے پکڑنے کے فن پر ایک طویل لیکچر دے سکتا ہے کتاب لکھ سکتا ہے مگر چونکہ وہ طبعاً خاموشی پسند ہے اس لیے اس کے متعلق زیادہ بات چیت نہیں کرتا صرف مجھے معلوم ہے کہ وہ اس فن میں کافی مہارت رکھتا ہے، محلے کے دوسرے آدمیوں کو اس کی مطلق خبر نہیں، البتہ اس کے پڑوسی اس کے یہاں سے کبھی کبھی چوہے دان عاریتاً ضرور منگایا کرتے ہیں اور اس نے اس غرض کے لیے ایک پرانا چوہے دان مخصوص کر رکھا ہے۔

کچلی برسات کی بات ہے میں شوکت کے یہاں بیٹھا تھا کہ اس کے پڑوسی خواجہ احمد صادق صاحب ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کا بڑا ارشد صادق آیا، میں نے جب اٹھ کر دروازہ کھولا تو اس نے کہنا شروع کیا ”ان کم بخت چوہوں نے

ناک میں دم کر رکھا ہے اباجی سے بار بار کہہ چکا ہوں کہ ہر منگوائے ان کو مارنے کے لیے مگر انہیں اپنے کاموں ہی سے فرصت نہیں ملتی اور یہاں ہر روز میری کتابوں کا ستیا ناش ہو رہا ہے آج الماری کھولی تو یہ بڑا چوہا میرے سر پر آن گرا۔۔۔۔۔ تمہیں کیا بتاؤں ان چوہوں نے مجھے کتنا تنگ کیا ہے کسی کتاب کی جلد سلامت نہیں بعض بڑی کتابوں کی جلد تو اس صفائی سے ان کم بختوں نے کتری ہے کہ معلوم ہوتا ہے کسی نے آری سے کاٹ دی ہے۔“

میں ارشد کو شوکت کے پاس لے گیا اور کہا ”ارشد صاحب تشریف لائے ہیں چوہوں کی شکایت لے کر آئے ہیں“

ارشد کرسی پر بیٹھ گیا اور پیشانی پر سے پسینہ پونچھ کر کہنے لگا ”شوکت صاحب! میں کیا عرض کروں ابھی الماری کی تمام کتابیں باہر نکال کر آیا ہوں یا کبھی تو ان میں ایسی نہیں رہی جس پر چوہوں نے اپنے دانت تیز کیے ہوں باورچی خانہ موجود ہے، دوسری الماریاں ہیں جن میں ہر وقت کھانے پینے کی چیزیں پڑی رہتی ہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ میری کتابیں کترنے میں ان کو کیا مزہ آتا ہے۔۔۔۔۔ یعنی کانڈ اور دفتی بھلا کوئی غذا ہے جی صاحب ایک انبار کترے ہوئے گتے اور دھکے ہوئے کانڈوں کا میں نے الماری سے نکالا ہے“

شوکت مسکرایا ”ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے گھر میں چوہے ہر روز سیندھ لگاتے پھریں۔۔۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

ارشد نے اس مذاق سے لطف نہ اٹھایا اس لیے کہ وہ واقعی بہت پریشان تھا ”شوکت صاحب! وہ معمولی چوہے تھوڑے ہیں مولے مولے سنڈے ہیں جو کھلے

بندوں پھرتے رہتے ہیں میرے سر پر ایک آن پڑا خدا کی قسم ابھی تک دروہو رہا ہے“

شوکت اور میں دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے، ارشد بھی مسکرا دیا ”آپ تو دل لگی کر رہے ہیں اور یہاں قصہ کے مارے برا حال ہو رہا ہے“

شوکت نے اٹھ کر ارشد کو سگریٹ پیش کیا ”اپنے دل کا غبار اس کے دھوئیں کے ساتھ باہر نکالے اور مجھے بتائیے کہ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں“

ارشد نے سگریٹ ساگایا اور کہا ”میں آپ سے چوہے دان مانگنے آیا تھا امی جان نے مجھ سے کہا تھا کہ شوکت کے گھر میں میں نے دو تین پڑے دیکھے ہیں“

شوکت نے فوراً نوکر کو آواز دی اور اس سے کہا ”وہ چوہے دان جو تم نے کل گرم پانی سے دھو کر خوب صاف کیا تھا ارشد صاحب کے گھر دے آؤ اور دیکھو ان کے نوکر سے کہنا کہ اس الماری کے نیچے اس کو نہ رکھے جہاں ارشد صاحب اپنی کتابیں رکھتے ہیں اس الماری سے دور کہیں بھی اس میں مچھلی یا تیل میں تلی ہوئی کسی چیز کا ٹکڑا لگا کر رکھ دیا جائے“ پھر ارشد سے مخاطب ہو کر کہا ”آپ بھی اچھی طرح سن لیجئے گا۔۔۔ بازار سے اگر پکوڑے مل جائیں تو ایک پکوڑا کافی رہے گا اور جب چوہا پکڑا جائے تو خدا کے لیے اسے میرے گھر کے پاس نہ چھوڑ دیجئے گا اور بہت جگہیں آپ کو مل جائیں گی جہاں سے وہ پھر واپس نہ آ سکے“

دیر تک ارشد ہمارے پاس بیٹھا رہا شوکت اس کو مزید ہدایات دیتا رہا جب نوکر چوہے دان اس کے گھر پہنچا کر واپس آ گیا تو اس نے اجازت چاہی اور چلا گیا۔

اس واقعہ کے چار روز بعد ارشد میرے گھر آیا۔ میں اور وہ چونکہ اکٹھے کالج میں پڑھتے رہے ہیں اس لیے وہ میرے بے تکلف دوست ہیں، شوکت سے اس کا تعارف میں نے ہی کرایا تھا آتے ہی اس نے ادھر ادھر دیکھا جیسے مجھ سے کوئی راز کی بات تھیلے میں کہنا چاہتا ہے۔ میں نے پوچھا کیا بات ہے؟ تم اتنے پریشان کیوں ہو؟

”میں تمہیں ایک بڑی دلچسپ بات سنانے آیا ہوں مگر یہاں نہیں سناؤں گا تم باہر چلو“ یہ کہہ کر اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور باہر لے گیا۔

راستے میں اس نے مجھے اپنی داستان سنانا شروع کی ”عجیب و غریب کہانی ہے جو میں تمہیں سنانے آیا ہوں بخدا ایسی بات ہوئی ہے کہ میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی یعنی کسے یقین تھا کہ اتنی ضدی اور نفاست پسند لڑکی ایک چوہے دان کے ذریعہ سے میرے قابو میں آجائے گی۔۔۔۔۔ اسی چوہے دان کے ذریعہ سے جو اس روز تمہارے سامنے میں نے شوکت سے لیا تھا۔“

میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا ”کون سی لڑکی اس چوہے دان میں پھنس گئی۔۔۔۔۔ لڑکی نہ ہوئی چوہیا ہو گئی۔۔۔۔۔ آخر بتاؤ تو سہی لڑکی کون ہے“

”اماں وہی سلیمہ جس کی نفاست پسندیوں کی بڑی دھوم ہے اور جس کی ضدی طبیعت کے بڑے چرے ہیں“

میری حیرت اور زیادہ بڑھ گئی ”سلیمہ۔۔۔۔۔ جھوٹ؟“

”خدا کی قسم۔۔۔۔۔ جھوٹ بولنے والے پر لعنت اور بھلا میں تم سے جھوٹ کیوں کہنے لگا۔۔۔۔۔ یہی سلیمہ، شوکت کے دیئے ہوئے چوہے دان کے ذریعہ سے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ترکیب سوچنے لگا اسے ہاتھ سے پکڑنا تو ظاہر ہے۔۔۔ بالکل محال تھا، میں کسی طریقے سے اس کو مار بھی نہیں سکتا تھا، اس لیے کہ کمرے میں بے شمار فرنیچر اور ٹرنک وغیرہ پڑے تھے میں نے شوکت کے دینے ہوئے چوہے دان کا خیال کیا جس سے اٹھ چوہے ہم لوگ پکڑ چکے تھے مگر شوکت کی ہدایات کے مطابق اس کو گرم پانی سے دھونا ضروری تھا مجھے کوئی کام تو تھا نہیں اور وقت بھی کافی تھا، چنانچہ میں نے خود ہی ساواہر میں پانی گرم کیا اور چوہے دنا کو دھونا شروع کر دیا ابھی میں نے لوٹے سے گرم پانی کی دھار اس کے آہنی تاروں پر ڈالی ہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی دروازہ کھولا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سلیمہ کھڑی ہے میں نے کہا ”آئیے۔۔۔ آئیے“ وہ اندر چلی آئی اور کہنے لگی ”کیا کر رہے ہیں آپ؟“ میں نے جھینپ کر جواب دیا ”جی چوہے دان دھو رہا ہوں“ وہ بے اختیار ہنس پڑی ”چوہے دان دھو رہے ہیں یہ صفائی آخر کس لیے ہو رہی ہے کوئی بڑا چوہا انسپکشن کے لیے تو نہیں آ رہا“ یہ سن کر میری جھینپ دور ہو گئی اور میں نے قہقہہ لگا کر کہا جی ہاں۔۔۔ ایک بہت بڑا چوہا انسپکشن کے لیے آنا چاہتا ہے یہ صفائی اسی سلسلے میں ہو رہی ہے“

یہ کہہ کر ارشد خاموش ہو گیا اس پر میں نے اس سے کہا ”سناتے جاؤ رکھو نہیں تمہاری داستان بہت دلچسپ ہے۔۔۔ ہاں تو پھر سلیمہ نے کیا کہا“

”کچھ نہیں میری بات سن کروہ صحن ہی میں چوکی پر بیٹھ گئی اور کہنے لگی آپ صفائی کیجئے اس صفائی کی انسپکشن میں کروں گی۔۔۔ ہاں یہ تو بتائیے آج یہ سب لوگ کہاں گئے ہیں“ میں نے جواب دیا ”سینما گئے ہیں میں بے کار بیٹھا تھا کہ

ایک چوہا اپنے کمرے میں مجھے نظر آیا میں کیا عرض کروں ہمارے گھر میں کس طرح بڑے بڑے مولے سندے چوہے سیندھ مارتے پھرتے ہیں میری کتابوں کا تو انہوں نے تینا تاس کر دیا ہے اب ان کے قلم و ستم سے میرے اندر ایک انتقامی جذبہ پیدا ہو گیا ہے یہ چوہے دان لے آیا ہوں اس سے ہر روز دو تین چوہے پکڑتا ہوں اور ان کو کالے پانی بھجھ دیتا ہوں، سلیمہ نے میری گفتگو میں دلچسپی ظاہر کی ”خوب۔۔۔ خوب۔۔۔ لیکن یہ تو کہیے کالا پانی یہاں سے کتنی دور ہے“ میں نے کہا ”بہت دور نہیں کو تو انی کے پاس ہی جو گندہ کالا بہتا ہے اس کو فی الحال میں نے کالا پانی بنا لیا ہے چوہوں نے اس پر اعتراض نہیں کیا، کیونکہ اس موری کا پانی کالا ہی ہے۔“ ہم دونوں خوب ہنسے پھر میں نے لونا اٹھا اور چوہے دان کو برش کے ساتھ دھونا شروع کر دیا جب چھینٹے اڑے تو میں نے سلیمہ سے کہا ”آپ یہاں سے اٹھ جائیے، چھینٹے اڑ رہے ہیں ویسے بھی یہ میری بڑی بدتمیزی ہے کہ میں آپ کے سامنے ایسی غلیظ چیز صاف کرنے بیٹھ گیا ہوں“ اس نے فوراً ہی کہا ”آپ تکلیف نہ کیجئے اور اپنا کام کرتے چلے جائیے چھینٹوں کے متعلق بھی آپ کوئی فکر نہ کریں“ جب میں نے چوہے دان اچھی طرح دھو کر صاف کر لیا تو سلیمہ نے پوچھا ”اچھا۔۔۔ اب آپ یہ بتائیے کہ اس کو دھونے کی کیا ضرورت تھی، بغیر دھوئے کیا آپ اس ظالم چوہے کو نہیں پکڑ سکتے“ میں نے کہا ”جی نہیں اس سے پہلے چونکہ اس چوہے دان میں ہم ایک چوہا پکڑ چکے ہیں اور اس کی بو اس میں ابھی تک باقی ہے اس لیے دھونا ضروری ہے گرم پانی سے پہلے چوہے کی بو غائب ہو جائے گی اس لیے دوسرا چوہا آسانی کے ساتھ پھنس جائے گا“ میری یہ بات سن کر سلیمہ

نے بالکل بچوں کی طرح کہا ”اگر چوہے دان میں چوہے کی بورہ جائے تو دوسرا چوہا نہیں آتا“ میں نے سکول ماسٹروں کا سا اندازہ اختیار کر لیا ”بالکل نہیں اس لیے کہ چوہوں کی ناک بڑی تیز ہوتی ہے آپ نے سنا نہیں، عام طور پر یہ کہا کرتے ہیں کہ فلاں آدمی کی تو چوہے کی ناک ہے یعنی اس کی قوت شامہ بڑی تیز ہے۔۔۔ سمجھے آپ؟“ سلیمہ نے میری طرف جب دیکھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے ایک بہت بڑی بات اس سے کہہ دی ہے جس کو سن کر وہ بہت مرعوب ہو گئی ہے اس کی نگاہوں میں مجھے اپنے متعلق قدر و منزلت کی جھلک نظر آئی اس سے مجھے شبہ مل گئی چنانچہ وہ تمام باتیں جو میں نے شوکت سے اس روز سنی تھیں ایک پیکچر کی صورت میں دہرانا شروع کر دیں اور وہ۔۔۔۔۔

میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا ”یہ سب مجھے افسانہ معلوم ہوتا ہے تم جھوٹ کہتے ہو“

”تم بھی عجیب قسم کے منکر ہو“ ارشد نے بگڑ کر کہا ”بھئی قسم خدا کی اس کا ایک ایک لفظ سچ ہے، مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی کیا ہے تمہیں حیرت ضرور ہوگی، اس لیے کہ میں خود بہت متحیر ہوں۔ سلیمہ جیسی پڑھی لکھی اور ذہین لڑکی ایسی فضول باتوں سے متاثر ہو گئی یہ بات مجھے ہمیشہ متحیر رکھے گی مگر بھئی حقیقت سے تو انکار نہیں ہو سکتا کہ اس نے میری اوٹ پٹانگ باتیں بڑے غور سے سنیں جیسے میں اسے دنیا کا کوئی راز نہایت بتا رہا ہوں واللہ یہ ذہین لڑکیاں بھی پرلے درجے کی سادہ لوح ہوتی ہیں سادہ لوح نہیں کہنا چاہیے خدا معلوم کیا ہوتی ہیں تم ان سے کوئی عقل کی بات کہو تو بس بگڑ جائیں گی یہ سمجھیں گی کہ ہم نے ان کی عقل و دانش پر حملہ کر دیا

ہے اور جب ان سے کوئی معمولی سی بات کہو جس سے ذہانت کو دور کا تعلق بھی نہ ہو تو وہ یہ سمجھیں گی کہ ان کی معلومات میں اضافہ ہو رہا ہے تم کسی فلسفہ داں اور بال کی کھال اتارنے والی عورت سے کہا کہ خدا ایک ہے تو وہ نکاتہ چینی شروع کر دے گی اگر اس سے یہ کہو دیکھو میں نے تمہارے سامنے ماچس کی ڈبیہ سے یہ ایک تیلی نکالی ہے، یہ ہوئی ایک تیلی، اب میں دوسری نکالتا ہوں۔ میز پر ان تیلیوں کو پاس پاس رکھ کر جب تم اس سے یہ کہو گے، دیکھو اب یہ دو تیلیاں ہو گئی ہیں تو وہ اس قدر خوش ہوگی کہ اٹھ کر تمہیں چومنا شروع کر دے گی۔“

یہ کہہ کر ارشد خوب ہنسا مجھے بھی ہنسا پڑا اس لیے کہ بات ہی ہنسی پیدا کرنے والی تھی جب ہم دونوں کی ہنسی کم ہوئی میں نے اس سے کہا ”اب تم اپنی بھائیاں کہانی سناؤ اور ہنسی مذاق کو چھوڑو“

”ہنسی مذاق میں کیسے چھوڑ سکتا ہوں بھائی!“ ارشد نے بڑی سنجیدگی سے کہا ”میں تو اس میں ہنسی مذاق ہی میں باتیں کر رہا تھا مگر وہ بڑی سنجیدگی سے سن رہی تھی ہاں تو جب میں نے چوہے پکڑنے کے اصول اس کو بتا دیئے تو اور زیادہ بچہ بن کر اس نے مجھ سے کہا ”ارشد صاحب آپ تو فوراً چوہے پکڑ لیتے ہوں گے؟“ میں نے بڑے فخر کے ساتھ جواب دیا ”جی ہاں۔۔۔۔۔ کیوں نہیں“ اس پر سلیمہ نے بڑے اشتیاق کے ساتھ کہا ”کیا آپ اس چوہے کو جو آپ نے ابھی ابھی دیکھا تھا میرے سامنے پکڑ سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ سلیمہ کا یہ سوال بہت ہی مشکل تھا مگر میں نے فوراً ہی جواب دیا ”اجی یہ بھی کوئی مشکل بات ہے، یوں چنگیوں میں اسے گرفتار کیا جاسکتا ہے“ سلیمہ اٹھ کھڑی ہوئی تو چلیے۔۔۔۔۔ میرے سامنے اسے

گرفتار کیجئے میں سمجھتی ہوں آپ کبھی اس چوہے کو نہیں پکڑ سکیں گے میں یہ سن کر یونہی مسکرا دیا ”آپ غلط سمجھتی ہیں پندرہ منٹ میں وہ چوہا اس چوہے دان میں ہو گا اور آپ کی نظروں کے سامنے بشرطیکہ آپ اتنے عرصہ تک انتظار کر سکیں“ سلیمہ نے کہا ”میں ایک گھنٹے تک یہاں بیٹھنے کے لیے تیار ہوں مگر میں آپ سے پھر کہتی ہوں کہ آپ نام کام رہیں گے؟ وقت مقرر کر کے آپ چوہے کو کیسے پکڑ سکتے ہیں؟“ میں اس وقت عجیب و غریب موڈ میں تھا اگر کوئی مجھ سے یہ کہتا کہ تم خدا دکھا سکتے ہو تو میں فوراً کہتا ہاں دکھا سکتا ہوں، چنانچہ میں نے بڑے فخر یہ لہجہ میں سلیمہ سے کہا ”ہاتھ نکلن کو آرسی کیا۔۔۔ میں ابھی آپ کو وہ چوہا پکڑ کے دکھا دیتا ہوں مگر شرط باندھیے“ اس نے کہا ”میں ہر شرط باندھنے کے لیے تیار ہوں، اس لیے کہ ہاں آپ ہی کی ہوگی“ اس پر خدا معلوم مجھ میں کہاں سے جرأت آگئی جو میں نے اس سے کہا ”تو یہ وعدہ کیجئے کہ اگر میں نے چوہا پکڑ لیا تو آپ سے جو چیز میں طلب کروں گا آپ بخوشی دے دیں گی“ سلیمہ نے جواب دیا ”مجھے منظور ہے“ چنانچہ میں نے کانپتے وئے ہاتھوں سے چوہے دان میں صبح کی تلی ہوئی مچھلی کا ایک ٹکڑا لگایا اور اس کو اپنی کتابوں کی الماری سے دور صوفے کے پاس رکھ دیا شرط و شرط کا مجھے اس وقت کوئی خیال نہیں تھا لیکن میں دل میں یہ دعا ضرور مانگ رہا تھا کہ کوئی نہ کوئی چوہا ضرور پھنس جائے تاکہ میری سرخروئی ہونے جانے کس جذبہ کے ماتحت میں نے گپ ہانک دی بعد میں مجھے افسوس ہوا کہ خواہ مخواہ شرمندہ ہونا پڑے گا، چنانچہ ایک بار میرے جی میں آئی کہ اس سے کہہ دوں، میں تو آپ سے یونہی مذاق کر رہا تھا چوہا پندرہ منٹ میں کیسے پکڑا جا سکتا ہے۔۔۔۔۔ گاندھی جی کا

ستیہ گرہ ہی ہوتا تو اسے جب چاہے پکڑ لیتے مگر یہ تو چوہا ہے آپ خود ہی غور فرمائیں مگر میں اس سے یہ نہ کہہ سکا اس لیے کہ اس میں میری شکست تھی۔
یہ کہہ کر ارشد نے جیب سے سگریٹ نکال کر ساگایا اور مجھ سے پوچھا ”کیا خیال ہے تمہارا اس داستان کے متعلق؟“
میں نے کہا ”بہت دلچسپ ہے مگر اس کا دلچسپ ترین حصہ تو ابھی باقی ہے جلدی جلدی وہ بھی سناؤ“

”کیا پوچھتے ہو دوست! وہ پندرہ منٹ جو میں نے انتظار میں گزارے ساری عمر مجھے یاد رہیں گے میں اور سلیمہ کمرے کے باہر کرسیوں پر بیٹھے تھے وہ خدا معلوم کیا سوچ رہی تھی مگر میری بری حالت تھی سلیمہ نے میری جیب گھڑی اپنی ران پر رکھی ہوئی تھی میں بار بار جھک کر اس میں وقت دیکھ رہا تھا دس منٹ گزر گئے مگر پاس والے کمرے میں چوہے دان بند ہونے کی کھٹ نہ سنائی دی گیارہ منٹ گزر گئے کوئی آواز نہ آئی ساڑھے گیارہ منٹ ہو گئے خاموشی طاری رہی بارہ منٹ گزرنے پر بھی کچھ نہ ہوا سو بارہ منٹ ہو گئے، ساڑھے بارہ ہوئے کہ دفعتاً کھٹ کی آواز بلند ہوئی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ چوہے دان میرے سینے میں بند ہوا ہے ایک لمحہ کے لیے میرے دل کی دھڑکن بند سی ہو گئی، لیکن فوراً ہی ہم دونوں اٹھے دوڑ کر کمرے میں گئے اور چوہے دان کے تاروں میں سے جب مجھے ایک موٹے چوہے کی تھو تھنی اور اس کی لمبی لمبی مونچھیں نظر آئیں تو میں خوشی سے اچھل پڑا۔
پاس ہی سلیمہ کھڑی تھی، اس کی طرف میں نے فتح مند نظروں سے دیکھا اور جھٹ پٹ اس کے حیرت سے کھلے ہوئے ہونٹوں کو چوم لے یہ سب کچھ اس قدر جلدی

میں ہوا کہ سلیمہ چند لمحات تک بالکل خاموش رہی لیکن اس کے بعد اس نے خفگی آمیز لہجہ میں مجھ سے کہا ”یہ کیا بیہودگی ہے؟“ اس وقت خدا معلوم میں کیسے موڈ میں تھا کہ ایک بار میں نے پھر اسی افراتفری میں اس کا بوسہ لے لیا اور کہا ”اجی مولانا آپ نے شرط باری ہے“ اور۔۔۔ اور تیسری مرتبہ اس نے اپنے ہونٹ بوسے کے لیے خود پیش کر دیئے جس طرح چوہا ہاتھ آیا اسی طرح سلیمہ بھی ہاتھ آگئی مگر بھی میں شوکت کا بہت ممنون ہوں اگر میں نے چوہے دان کو گرم پانی سے نہ دھویا ہوتا تو چوہا کبھی نہ بھسناتا۔“

یہ داستان سن کر مجھے بہت لطف آیا لیکن افسوس بھی ہوا، اس لیے کہ شوکت اس لڑکی سلیمہ کی محبت میں بری طرح گرفتار ہے۔

☆☆☆☆☆☆

چور

آصف نے کہا ”کام چور نوکر تو قریب قریب سبھی ہوتے ہیں مگر مصیبت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر باقاعدہ چور ہوتے ہیں“ اور اس نے اپنے ایک نئے نوکر کی داستان سنائی جو بے حد مستعد تھا اس قدر مستعد کہ بعض اوقات آصف کے آواز نہ دینے پر بھی بھاگا بھاگا آتا تھا اور اس سے پوچھتا تھا ”کیوں صاحب آپ نے بلایا مجھے؟“

آصف نے مسکراتے ہوئے کہا ”مجھے نوکروں میں اس قدر پھرتی، چالاکی اور مستعدی پسند نہیں یہی وجہ ہے کہ جب راجہ صاحب نے مجھ سے کہا کہ آسو تم بہت خوش قسمت ہو کہ بیٹھے بٹھائے تمہیں ایسا نوکر مل گیا تو۔۔۔۔۔“

راجہ غلام علی نے بات کاٹ کر کہا ”بھلا مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ کم بخت چور ہو گا!“

آصف راجہ سے مخاطب ہوا ”میرا اپنا اندازہ یہ تھا کہ وہ یا تو چور ہے یا پہنچا ہوا ولی۔۔۔ اس کے بین بین وہ کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا چنانچہ میں نے راجہ صاحب سے کہا، قبلہ اگر آپ اس نوکر کو ایک ایسا دفتینہ سمجھتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے مجھے مل گیا ہے تو میں آپ کی دوستی کی خاطر قربانی دینے کے لیے تیار ہوں۔۔۔۔۔ آپ بڑے شوق سے یہ سوغات اپنے گھر لے جاسکتے ہیں“

راجہ نے کہا ”میں نے انکار نہیں کیا تھا“

”درست ہے!“ آصف مسکرایا ”غلطی میری تھی، اگر میں نے اس وقت وہ

نعمت غیر مترقبہ آپ کو سوئپ دی ہوئی تو جیسا کہ آپ کو معلوم ہے مجھے چالیس روپے اور ایک عدد ریلوے پاس کا داغ مفارقت برداشت نہ کرنا پڑتا۔
 رلجہ ہم سے مخاطب ہوا ”آصف سے ذرا ساری داستان سنو کافی دلچسپ ہے!“

آصف نے کہا ”معاف فرمائیے مجھے یہ داستان غم سنا تے کوئی فرحت حاصل نہیں ہوتی“ یہ کہہ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوا ”بات یہ ہے منٹو۔۔۔۔۔ کہ چغند پن اصل میں میں نے کیا وہ بہت چالاک تھا اس میں کوئی شک نہیں لیکن اپنی ہوشیاری پر مجھے کافی اعتماد تھا صبح سویرے اٹھ کر جب میں نے میز کی ٹرے دیکھی تو اس میں خلاف معمول میرا ریلوے پاس نہیں تھا اس کے خانے میں دس دس کے چار نوٹ تھے۔۔۔۔۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ساتھ ہی غائب تھے نوکر میری توقع کے مطابق موجود تھا چنانچہ میں نے ادھر ادھر تلاش کی میز کے نچلے دراز میں پاس معہ روپوں کے فائلوں کے نیچے موجود تھا میں نے اسے وہیں رکھ دیا۔۔۔۔۔ یہ تم سمجھ سکتے ہو کیوں؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا ”بہت اچھی طرح“
 رلجہ مسکرا کر لگا آصف نے اس کی طرف دیکھا ”رلجہ صاحب مسکرا رہے ہیں۔۔۔۔۔ اس لیے کہ میں نے خود کو چغند ثابت کیا لیکن واقعہ یہ ہے کہ۔۔۔۔۔“
 وہ مجھ سے مخاطب ہوا ”بات یہ ہوئی منٹو کہ میں نے ایک پلان بنایا۔۔۔۔۔ یہ تو صاف ظاہر تھا کہ اس نوکر نے جس کا نام مومن تھا کس نیت سے وہ روپے فائلوں کے نیچے چھپائے تھے اور ناشتے سے فارغ ہو کر وہ بڑے اطمینان سے اپنا کام کرنا

کرتے ہوئے جب مجھے اپنا پلان یاد آیا تو دوڑ کر دوسرے کمرے میں گیا۔۔۔ فائلوں کے نیچے پاس غائب تھا۔۔۔ خدا کی قسم منٹو مجھے ان چالیس روپوں کا افسوس نہیں تھا صدمہ اس بات کا تھا کہ سارا پلان غسل خانے کی بدولت غارت ہو گیا اور پاس ضائع ہو گیا۔“

خولچہ ظمیر جو اس وقت تک خاموش تھا بولا ”آصف صاحب نے اس روز جھنجھلاہٹ میں نکت کے بغیر سفر کیا اور دھڑ لیے گئے۔۔۔ واپسی پر آنے کا پھر ارادہ تھا کہ چار پانچ دوستوں سمیت انتقام لینے کے لیے نکت کے بغیر سفر کریں مگر آپ کی روایتی دوراندیشی کام آگئی اور آپ اس خطرناک عزم سے باز رہے۔“ رلجہ نے سگریٹ ساگایا اور اپنے مولے مولے گدگدے گالوں پر ہاتھ پھیر کر ایک لمبی داستان سنانے کے لیے خود کو تیار کرتے ہوئے کہنا شروع کیا ”چور نوکروں کا ذکر آیا ہے تو مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آگیا۔۔۔“

میں نے ان کی بات کا کافی اتفاق کی بات ہے کہ یہ دلچسپ واقعہ آپ اتنی مرتبہ اس قدر غیر دلچسپ طریقے پر بیان فرما چکے ہیں کہ اب اس غریب کی ساری وقوئیت ختم ہو چکی ہے۔۔۔ اور دلچسپی۔۔۔“

رلجہ کے گال تھر تھرائے ”چلو ہٹاؤ“

خولچہ ظمیر نے مجھ سے اجازت لی ”اگر آپ اجازت دیں تو میں ایک واقعہ سناؤں۔۔۔ ممکن ہے آپ کو اس میں دلچسپی کا کوئی پہلو مل جائے“

خولچہ ظمیر نام طور پر شیطان کی آنت کی طرح لمبی ہونے والی گفتگو میں حصہ نہیں لیا کرتا تھا اور اپنا وہی تجربہ معرض بیان میں لایا کرتا تھا۔ جو اس پر کافی اثر

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

رابعہ نے پوچھا ”آپ کبھی کبھی خود کو یہ دھوکا دینے کے لیے کہ آپ نے ایسی

چوری کی ہے جس کا علم آپ کی بیگم صاحب کو۔۔۔۔۔ آپ۔۔۔۔۔ آپ خود کو یہ
 دھوکا۔۔۔۔۔“ راجہ صاحب نے فترے کو صبح اور با مطلب کرنے کی کوشش کی مگر
 ناکام رہا ”مننو۔۔۔۔۔ تم سمجھ گئے تا میرا مطلب؟“

میرے بجائے خواجہ ظہیر نے جواب دیا ”ایسی چوریاں کون خاوند نہیں
 کرتا۔۔۔۔۔ کبھی کبھی بوقت ضرورت اس جرم کا ارتکاب کرنا ہی پڑتا
 ہے۔۔۔۔۔ لیکن اتفاق کی بات ہے کہ اس موقع پر اس کا شبہ غلط تھا مجھے ضرورت
 تھی اس لیے کہ ایک دوست کو سینما لے جانا تھا لیکن میں نے وہ نوٹ اٹھا کر پھرا
 اس خیال سے وہیں رکھ دیا تھا کہ دو تین روز کے بعد اس کی شدید ضرورت پڑنے
 والی تھی۔۔۔۔۔ میں نے چنانچہ اپنی بیوی کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ مجھے اس
 نوٹ کی چوری کا کوئی علم نہیں۔“

راجہ نے پوچھا ”ان کو یقین آگیا“

”جی نہیں“ خواجہ ظہیر نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا ”وہ بیوی ہی نہیں جسے
 خاوند کی بات پر یقین آجائے۔۔۔۔۔ لیکن پھر بھی میں نے اپنی سی کوشش کی اور
 بالآخر اس کو یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ نوٹ میں نے نہیں چرایا تھا۔
 اب یہ سوال پیدا ہوا کہ چوری اگر میں نے نہیں تو کس نے کی تھی کیونکہ یہ تو مسلمہ
 امر تھا کہ نوٹ خود بخود غائب نہیں ہوا چرایا گیا ہے اور وہ اور وہ چار بنانے سے یہ
 بھی معلوم ہو گیا تھا کہ میرے دفتر جانے کے بعد کسی نے اس پر ہاتھ صاف کیا ہے
 کیونکہ دفتر جاتے ہوئے میں نے اسے چرانے کا خیال کیا تھا اور اسے کسی دوسرے
 وقت پر اٹھا دیا تھا۔“

رلچہ مسکرایا ”بزرگوں نے وہ ٹھیک کہا ہے آج کا کام کل پر نہ چھوڑو۔۔۔۔۔“
 خولچہ ظہیر نے رلچہ کی بات سنی مگر بزرگوں کے اس کہے کے متعلق اپنے خیال کا
 اظہار نہ کیا ”گھر میں دو نوکر تھے، ایک ملازم قادر۔۔۔۔۔ دوسرا
 صادق۔۔۔۔۔ صادق دو دن سے چھٹی پر تھا اس کی ماں بیمار تھی بس ایک غلام قادر ہی
 تھا جس پر شک کیا جاسکتا تھا مگر۔۔۔۔۔“ اس نے براہ راست مجھ سے مخاطب ہو کر
 کہا ”جیسا کہ آپ نے ابھی ابھی فرمایا تھا وہ اچھا خاصا ایمان دار آدمی معلوم ہوتا
 تھا۔۔۔۔۔ کچھ سمجھ نہیں آتا تھا کہ ہم اپنے شک کا اظہار کیسے
 کریں۔۔۔۔۔ نوکروں کو ڈانٹنے ڈپٹنے، مارنے پیٹنے اور ملازمت سے برطرف
 کرنے کا کام میرے ذمے ہے۔“

رلچہ نے ازراہ مذاق کہا ”بڑا اہم پورٹ فولیو آپ کے ذمے ہے“
 ”جی ہاں، بہت اہم۔۔۔۔۔ لیکن بڑا نازک۔۔۔۔۔ وہ ملازم خود رکھتی ہیں
 لیکن برطرف مجھ سے کراتی ہیں“ یہ کہہ کر خولچہ ظہیر مسکرایا
 رلچہ صاحب کے گال بھی مسکرائے ”جس کا کام اسی کو ساجھے۔۔۔۔۔ کوئی اور
 کرے تو خدا معلوم کیا باجے“
 آصف نے کہا ”ڈنکا“

”ڈنکا ہی ہو گا“ جلدی سے کہہ کر وہ خولچہ ظہیر سے مخاطب ہوا ”آپ ذرا
 جلدی اپنی داستان ختم کیجئے۔۔۔۔۔ مجھے اپنی ڈنکا کے ساتھ ایک جگہ جانا ہے۔“
 آصف بے تحاشا ہنسا ”اپنی ڈنکا کے ساتھ؟“
 رلچہ کے گال بوکھلا گئے ”آئی ایم سوری۔۔۔۔۔ اپنی بیوی کے ساتھ!“

سب منہ لگے میں نے خوبہ ظہیر سے کہا ”رہچہ صاحب کو اپنی بیوی کے ساتھ جاتا ہے اس لیے آپ یہ داستان جلدی ختم کر دیجئے تاکہ یہ راستے میں اسے سنا سکے!“

خوبہ مسکرایا ”بہت بہتر۔۔۔۔۔“ پھر چھوڑی دیر رک کر اس نے کہنا شروع کیا ”معاملہ بہت ٹیڑھا تھا غلام قادر کو ملازم ہوئے صرف ایک مہینہ ہوا تھا اس دوران میں اس نے مجھے اور میری بیوی کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا بڑا اطاعت گزار قسم کا آدمی تھا ان دنوں سخت گرمیوں کے باعث برف کی بہت قلت تھی ماتی تھی تو آٹھ آنے سیر مگر غلام قادر دو آنے کی اتنی ساری لے آتا تھا۔۔۔ صادق کو بہت تاؤ آتا تھا جب میری بیوی اس سے کہتی کہ دیکھو غلام قادر کتنا اچھا ہے تم تو اول درجے کے چور ہو تو وہ بھنا جاتا اور اسے گالیاں دیتا کہ وہ یہ سب کچھ اسے نکلوانے کے لیے کرتا ہے۔۔۔۔۔ جب پہلی مرتبہ وہ دو آنے کی توقع سے بہت زیادہ برف لایا تو میں نے اس سے پوچھا کہ اتنی سستی تم کہاں سے لے آئے ہو اس نے جواب دیا کہ صاحب برف والا اپنی دکان بڑھا رہا تھا، جتنی بچی تھی، سب کی سب اس نے مجھے دے دی جواب معقول تھا لیکن دوسرے روز وہ پھر دو آنے کی اتنی ہی برف لایا اور قریب قریب ہر روز لاتا رہا کیونکہ میری بیوی نے اب سودا سلف لانے کا کام اسی کے سپرد کر دیا تھا۔۔۔۔۔ اس کو میرے لڑکے سے بہت محبت تھی ہر دوسرے تیسرے دن اس کو چاکلیٹ وغیرہ لے دیتا تھا دو تین مرتبہ وہ میری بیوی کے لیے چنگیز بھر بھر کے موٹے کے پھول بھی لایا۔۔۔۔۔ اس پر چوری کا شک ہو سکتا تھا، لیکن مشکل یہ تھی کہ اس کا اظہار کیسے کیا جائے اور اس کی

تصدیق کیونکر ہو۔۔۔۔ میں طبعاً نرم ہوں لیکن بیوی کی خاطر مجھے اکثر نوکروں کو
ڈانٹ ڈپٹ کرنی پڑتی ہے۔ جب چوری کا پتہ لگانے کے لیے مجھے بار بار اکرمیا
گیا تو میں نے ایک دن غلام قادر سے پوچھ گچھ کا تہیہ کر لیا۔“
خولچہ نے ڈبیا سے ایک سگریٹ نکالا ریلجہ نے گھڑی میں وقت دیکھا اور کہا
”اللہ بیوی سے بچائے۔۔۔۔۔“

خولچہ نے سگریٹ ساگایا ”چنانچہ میں نے اس کو اپنے کمرے میں بلایا اور کہا،
دیکھو غلام قادر وہ دس روپے کا نوٹ جو تم نے بک شیلٹ کے نیچے سے اٹھایا تھا
واپس کر دو۔“

ریلجہ نے کہا ”یہ طریقہ خوب تھا“
خولچہ ظہیر نے ریلجہ کی بات کی طرف دھیان نہ دیا ”اس نے کسی قدر گھبرا کر
جواب دیا ، صاحب کون سا دس روپے کا نوٹ۔۔۔۔۔ مجھے بالکل معلوم
نہیں۔۔۔۔۔ اس پر میں نے اس کو ڈانٹا مگر وہ پھر بھی نہ قبول جب میں نے محسوس
کیا کہ مجھے شکست ہو رہی ہے تو میں نے زور کا ایک تھپڑ اس کے منہ پر مارا یہ اس کی
توقع کے خلاف تھا ایک دو سیکنڈ کے لیے چنانچہ وہ بالکل مبہوت ہو گیا۔۔۔۔۔ میں
نے ایک اور جڑ دیا اور بڑے سنگین لہجے میں اس سے کہا دیکھو غلام قادر تم نے اگر سچ
نہ بولا تو میں پولیس کے حوالے کر دوں گا اس نے جواب دیا صاحب میں نے
چوری نہیں کی آپ مجھے پولیس کے حوالے کر دیجئے!“

ریلجہ نے اپنی رائے کا اظہار کیا ”بڑا پکار چور تھا“
خولچہ ظہیر نے نفی میں اپنا سر ہلایا ”جی نہیں۔۔۔ وہ پکار چور نہ تھا نہ

کچا۔۔۔ میں نے جب دیکھا کہ میرا اور خالی گیا ہے تو بڑی پریشانی ہوئی کچھ سمجھ
میں نہ آیا کہ اس سے کیا کہوں میں نے آغاز ہی انتہا سے کیا تھا۔۔۔ اب کیا
کرتا۔۔۔ وہ بڑے زمانے کے تھپڑ میں نے اس کو مارے تھے۔۔۔۔۔ وہ
بے گناہ بھی ہو سکتا تھا مجھے بہت افسوس ہوا چنانچہ میں نے صدق دل سے معافی
مانگی اور کہا دیکھو غلام قادر۔۔۔ مجھ سے زیادتی ہوئی ہے لیکن بات یہ ہے کہ وہ
دس روپے کا نوٹ غائب ضرور ہوا ہے میں نے اٹھایا نہیں تم انکار کرتے ہو اس کا
یہ مطلب ہوا کہ یا تو ہم دونوں سچے ہیں یا دونوں جھوٹے۔۔۔۔۔ بیگم صاحبہ
تمہارا کہنا مان لیں گی لیکن مجھ پر ان کا شک بہت مضبوط ہو جائے گا۔۔۔ میں
خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میری نیت تھی وہ نوٹ اٹھانے کی۔۔۔ بلکہ میں نے
اٹھایا بھی تھا مگر پھر وہیں رکھ دیا تھا کہ جب بہت اشد ضرورت ہوگی تو لے لوں
گا۔۔۔۔۔“

میں اسی جذباتی رو میں کچھ اور کہنے والا تھا کہ غلام قادر مضبوط لہجے میں بولا ”وہ
نوٹ میں نے اٹھایا تھا صاحب۔۔۔۔۔“ ایک لمبے کے لیے میں چکرا گیا
رہجہ نے کہا ”بات چکرانے ہی والی تھی!“

خواجہ ظہیر نے سگریٹ فرش پر پھینک کر بوٹ کے تلے سے بھلیا ”تم
نے۔۔۔۔۔ تم نے یہ چوری کیوں کی؟۔۔۔۔۔ غلام قادر نے جواب
دیا۔۔۔ کیا کرتا صاحب۔۔۔۔۔ بیگم صاحبہ نے تنخواہ نہیں دی۔۔۔۔۔ کہتی
تھیں کہ میں ہمیشہ نوکر کی ایک مہینے کی تنخواہ دبا کر رکھا کرتی ہوں تاکہ وہ بھاگ نہ
جائے۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ اس نے رک رک کر کہا۔۔۔ مجھے عادت

☆☆☆☆☆

حامد کا بچہ

لاہور سے بابو ہرگوپال آئے تو حامد گھر کا رہانہ گھاٹ کا انہوں نے آتے ہی حامد سے کہا ”لو بھئی فوراً ایک ٹیکسی کا بندوبست کرو“

حامد نے کہا ”آپ ذرا آرام کر لیجئے اتنا لمبا سفر طے کر کے یہاں آئے ہیں تھکاوٹ ہوگی۔“

بابو ہرگوپال اپنی دھن کے پکے تھے ”نہیں بھائی مجھے تھکاوٹ واوٹ کچھ نہیں میں یہاں سیر کی غرض سے آیا ہوں۔ آرام کرنے نہیں آیا، بڑی مشکل سے دس دن نکالے ہیں یہ دس دن تم میرے ہو جو میں کہوں گا تمہیں ماننا ہو گا میں اب کے عیاشی کی انتہا کر دینا چاہتا ہوں۔۔۔ سو ڈامنگو او“

حامد نے بہت منع کیا کہ دیکھئے بابو ہرگوپال صبح سویرے مت شروع کیجئے مگر وہ نہ مانے کس کھول کر جوئی واکر کی بوتل نکالی اور اسے کھولنا شروع کر دیا۔

”سو ڈامنیں منگو اتے تو لاؤ جھوڑا سا پانی لاؤ۔۔۔۔۔ کیا پانی بھی نہیں دو گے“

بابو ہرگوپال، حامد سے عمر میں بڑے تھے حامد تمیں کا تھا تو وہ چالیس کے تھے حامد ان کی عزت کرتا تھا اس لیے کہ اس کے مرحوم باپ سے بابو صاحب کے مراسم تھے۔ اس نے فوراً سو ڈامنگو او دیا اور بڑی لجاجت سے کہا ”دیکھئے مجھے مجبور نہ کیجئے گا آپ جانتے ہی ہیں کہ میری بیوی بڑی سخت گیر ہے۔“ مگر بابو ہرگوپال کے سامنے اس کی کوئی پیش نہ چلی اور اسے ساتھ دینا ہی پڑا۔

جیسی کہ امید تھی، چار پیگ پینے کے بعد بابو ہرگوپال نے حامد سے کہا ”لو بھئی

اب چلیں گھومنے مگر دکھ کوئی ایسی ٹیکسی پکڑنا جو ذرا شاندار ہو۔ پرائیویٹ ٹیکسی ہوتو بہت اچھا ہے مجھے ان میٹروں سے نفرت ہے۔“

حامد نے پرائیویٹ ٹیکسی کا بندہ بست کر دیا نئی فورڈ تھی ڈرائیور بھی بہت اچھا تھا۔۔۔ بابو ہر گوپال بہت خوش ہوئے ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنا چوڑا بیٹا نکالا، کھول کر دیکھا سوسو کے کئی نوٹ تھے اور اطمینان کا سانس لیا اور اپنے آپ سے کہا ”کافی ہیں۔۔۔ لو بھئی ڈرائیور اب چلو“

ڈرائیور نے اپنے سر پر ٹوپی کو ترچھا کیا اور پوچھا ”کہاں سیٹھ“
بابو ہر گوپال حامد سے مخاطب ہوئے ”بولو بھئی تم“

حامد نے کچھ دیر سوچ کر ایک ٹھکانا بتایا ٹیکسی نے ادھر کا رخ کیا تھوڑی سی دیر کے بعد بمبئی کا سب سے بڑا دلال ان کے ساتھ تھا اس نے مختلف مقامات سے مختلف لڑکیاں نکال نکال کر پیش کیں مگر حامد کو کوئی پسند نہ آئی وہ نفاست پسند تھا صفائی کا شید تھا یہ لڑکیاں سرخی پاؤں کے باوجود اس کو گندی دکھائی دیں اس کے علاوہ ان کے چہرے پر کسویت کی مہر تھی یہ اسے بہت گھٹاؤنی معلوم ہوتی تھی وہ چاہتا تھا کہ عورت کو کسی ہونے پر بھی عورت ہی رہنا چاہیے اپنے عورت پن کو اپنے پیشے کے نیچے دبائیں دینا چاہیے۔ اس کے برعکس بابو ہر گوپال غلامت پسند تھا لاکھوں میں کھیلتا تھا چاہتا تو بمبئی کا پورا شہر صابن پانی سے دھلوا دیتا مگر اپنی ذاتی صفائی کا اسے کچھ خیال نہیں تھا نہ تھا تو بہت ہی تھوڑے پانی سے کئی کئی دن شیو نہیں کرتا تھا گلاس چاہے میلا چمکے ہو، اٹھا کر اس میں فرسٹ کا اس وکی انڈیل دیتا تھا غلیظ بھکارن کو سینے کے ساتھ چمٹا کر سو جاتا تھا اور کہتا تھا، اطف آ

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

پیر آرہی تھی۔۔۔ کاشٹے کا پلو اس کے سر سے کسے کا سیدھی مانگ تھی جب قریب آ کر اس نے ہاتھ جوڑ کر پر نام کیا تو اس کے چمکیلے جوڑے میں حامد نے ایک پتا اڑسا ہوا دیکھا پتے کا رنگ سفیدی مائل تھا مولے جوڑے میں جو بڑی صفائی سے کیا گیا تھا یہ پتا بہت خوبصورت دکھائی دیتا تھا حامد نے پر نام کا جواب اٹھ کر دیا لڑکی شرماتی لباتی ان کے پاس کرسی پر بیٹھ گئی۔

اس کی عمر حامد کے اندازے کے مطابق سترہ برس سے اوپر نہیں تھی قد میانہ، رنگ گورا جس میں ہلکی ہلکی پیازی جھلک تھی جس طرح اس کی ساڑھی نئی تھی اسی طرح وہ خود نئی معلوم ہوتی تھی کرسی پر بیٹھ کر اس نے بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جھکا لیں حامد کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ آہستہ آہستہ اس کے وجود میں سرایت کر رہی ہے۔ لڑکی بڑی صاف ستھری بڑی اجلی تھی۔

بابو ہرگوپال نے حامد سے کچھ کہا تو وہ چونک پڑا جیسے اس کو کسی نے ہنچھوڑ کر جگا دیا ہے ”کیا کہا بابو ہرگوپال؟“
بابو ہرگوپال نے کہا ”بات کرو بھئی“ پھر آواز جیسی کر دی ”مجھے تو کوئی خاص پسند نہیں“

حامد کباب ہو گیا اس نے لڑکی کی طرف دیکھا دھلا ہوا شباب اس کے سامنے بیٹھا تھا کھری ہوئی بے داغ جوانی، ریشم میں لپیٹی ہوئی اس کی نظروں کے سامنے تھی جس کو وہ حاصل کر سکتا تھا ایک رات کے لیے نہیں کئی راتوں کے لئے کیونکہ وہ قیمت دلوا کر کے اپنائی جاسکتی تھی لیکن حامد نے جب یہ سوچا تو اسے دکھ ہوا کہ ایسا کیوں ہے یہ لڑکی بکا و مال ہرگز نہیں ہونی چاہیے تھی پھر اسے خیال آیا کہ اگر ایسا

ہوتا تو اس کو حاصل کیسے کرتا۔

بابو ہرگوپال نے بڑے بھونڈے انداز میں پوچھا ”کیا خیال ہے بھئی“
 ”خیال؟“ حامد پھر چونکا ”آپ کو تو پسند نہیں لیکن میں۔۔۔“ وہ کچھ کہتے کہتے
 رک گیا

بابو ہرگوپال بڑے وہست نواز تھے اٹھے اور دلال سے کاروباری انداز میں
 پوچھا ”بھئی کیا دینا پڑے گا“
 دلال نے جواب دیا ”چھو کرمی دیکھ لیجئے ابھی تازہ تازہ دھندلا شروع کیا ہے“
 بابو ہرگوپال نے اس کی بات کاٹی ”تم اسے چھوڑو معاملے کی بات کرو“
 دلال نے بیڑی ساگائی اور کہا ”سورہ پے ہوں گے پورا دن رکھیے یا پوری
 رات رکھیے ایک ڈیڑھ یا کم نہیں ہوگا“

بابو ہرگوپال حامد سے مخاطب ہوئے ”کیوں بھئی“
 حامد کو بابو ہرگوپال اور دلال کی گفتگو بہت ناگوار گزرا رہی تھی اس کو یوں محسوس
 ہوتا تھا کہ اس لڑکی کی توہین ہو رہی ہے۔۔۔۔۔ سورہ پے میں یہ دھڑکتا ہوا شباب
 یہ دھکتی ہوئی جوانی۔۔۔۔۔ اس کو یہ سن کر بہت کوفت ہوئی کہ مرہٹی حسن کا جو یہ تادر
 نمونہ اس کے سامنے سانس لے رہا تھا اس کی قیمت صرف سو روپے
 ہے۔۔۔۔۔ مگر اس کوفت کے ساتھ ہی اس خیال نے اس کے دل میں چٹکی لی کہ سو
 روپے دے کر آدمی اس کو حاصل کر سکتا ہے ایک دن یا ایک رات کے لیے پھر اس
 نے سوچا ”صرف ایک دن یا ایک رات کے لیے۔۔۔ اس کے ساتھ تو آدمی کو اپنی
 ساری عمر بتا دینی چاہیے۔۔۔ اس کی ہستی میں اپنی ہستی مدفون کر دینی چاہیے۔“

بابو ہر گوپال نے پھر پوچھا ”کیوں بھئی کیا خیال ہے“
 حامد اپنا خیال ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا بابو ہر گوپال مسکرایا جیب سے نوٹ نکالا اور
 سو کا ایک نوٹ دلال کو دے دیا ایک ڈیڑھیا کم نہ ایک ڈیڑھیا زیادہ پھر وہ حامد
 سے مخاطب ہوا ”چلو بھئی۔۔۔۔۔ معاملہ طے ہو گیا“
 حامد خاموش ہو گیا وہ نوں نیچے اتر کر ٹیکسی میں بیٹھے دلال لڑکی لے کر آگیا وہ
 شرماتی لگاتی ان کے ساتھ بیٹھ گئی۔۔۔۔۔ ہوٹل میں ایک کمرے کا بندوبست کر کے
 بابو ہر گوپال اپنے لیے کوئی لڑکی تلاش کرنے چلا گیا۔
 لڑکی پلنگ پر آنکھیں جھکائے بیٹھی تھی حامد کا دل دھک دھک کر رہا تھا بابو ہر
 گوپال و سکی کی بوتل چھوڑ گیا تھا آدھی کے قریب باقی تھی حامد نے سو ڈامنگوا کر
 ایک بہت بڑا پیگ لگایا اس سے اس میں کچھ جرأت پیدا ہوئی اس نے لڑکی کے
 پاس بیٹھ کر پوچھا ”آپ کا نام؟“
 لڑکی نے نگاہیں اٹھا کر جواب دیا ”لٹا منگاؤں کر“
 بڑی پیاری آواز تھی حامد نے ایک بڑا پیگ اپنے اندر اندر لٹا دیا اور لٹا کے سر سے
 کاشے کا پلو ہٹا کر اس کے چمکیلے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ لٹا نے بڑی بڑی سیاہ آنکھیں
 جھپکائیں حامد نے ساڑھی کا پلو بالکل نیچے گرا دیا چست چوٹی کے کھلے گریبان سے
 اس کو لٹا کے سینے کے ابھار کی ننھی سی دھڑکتی ہوئی جھلک دکھائی دی حامد کا سارا وجود
 تھرا گیا اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ چوٹی بن کر لٹا کے ساتھ چٹ
 جائے اس کی میٹھی میٹھی گرمی محسوس کرے اور سو جائے۔
 لٹا ہندوستانی نہیں جانتی تھی اس کو منگاؤں سے آئے صرف دو مہینے ہوئے

تھے مرہٹی بولتی تھی بڑی کرخت زبان ہے لیکن اس کے منہ میں یہ بڑی ملائم ہو گئی تھی وہ ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں حامد کی باتوں کا جواب دیتی تو وہ اس سے کہتا ”نہیں تم مرہٹی میں بات کرو مجھے بہت چانگلی لگتی۔“

لفظ چانگلی سن کر لتا ہنس پڑتی اور صحیح لفظ کو بتاتی لیکن حامد بچے اور سے کی درمیانی آواز پیدا نہ کر سکتا۔ اس پر دونوں جھلکھڑا کر ہنسنے لگتے حامد اس کی باتیں نہ سمجھتا لیکن اس نہ سمجھنے میں اس کو لطف آتا تھا کبھی کبھی وہ اس کے ہونٹ چوم لیتا اور اس سے کہتا ”یہ پیارے پیارے بول جو تم اپنے منہ سے نکال رہی ہو میرے منہ میں ڈال دو میں انہیں پینا چاہتا ہوں“

وہ کچھ نہ سمجھتی اور ہنس دیتی حامد اسے اپنے سینے کے ساتھ لگا لیتا لتا کی باتیں بڑی سڈول اور گوری گوری تھیں ان پر چولی کی چھوٹی چھوٹی آستینیں پھنسی ہوئی تھیں حامد نے ان کو بھی کئی بار چومالتا کا ہر عضو حامد کو پیارا لگتا تھا۔

رات کو نو بجے جب حامد نے لتا کو اس کے گھر چھوڑا تو اپنے اندر ایک خلا سا محسوس کیا اس کے ملائم جسم کا لمس جیسے ایک دم چھال کی طرح اتر کر اس سے جدا ہو گیا ساری رات کروٹیں بدلتا رہا صبح باؤہر گوپال آئے انہوں نے تھیلے میں اس سے پوچھا ”کیوں کیسی رہی؟“

حامد نے صرف اتنا کہا ”ٹھیک تھی“

”چلتے ہو پھر؟“

”نہیں مجھے ایک ضروری کام ہے“

”بکو اس نہ کرو۔۔۔۔۔ میں نے تم سے آتے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ دس دن تم

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

وہ پھرتا کے ساتھ ہوٹل میں لیٹا تھا۔

پندرہ روز تک حامد بلا ٹانہ لٹا کے ہاں جاتا رہا۔۔۔ اس کے بینک اکاؤنٹ سے دو ہزار روپے اڑ چکے تھے کاروبار الگ اس کی غیر موجودگی کے باعث نقصان اٹھا رہا تھا حامد کو اس کا کامل احساس تھا مگر لٹا اس کے دل و دماغ پر بری طرح چھا چکی تھی لیکن حامد نے ہمت سے کام لیا اور ایک دم یہ سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس دوران میں بابو ہرگوپال اپنی میلی اور غلیظ عیاشیاں ختم کر کے لاہور واپس جا چکا تھا حامد نے خود کو زیر دستی اپنے کاروباری کاموں میں مصروف کر دیا اور لٹا کو بھولنے کی کوشش کی۔

چار مہینے گزر گئے حامد ثابت قدم رہا لیکن ایک دن اتفاق سے اس کا گزشتہ جی پارک سے ہوا حامد نے غیر ارادی طور پر ٹیکسی والے سے کہا ”روک لو یہاں“ ٹیکسی رکی حامد سوچنے لگا ”نہیں ٹھیک نہیں۔۔۔ ٹیکسی والے سے کہو چلے!“ مگر دروازہ کھول کر وہ باہر نکلا اور اوپر چلا گیا۔

لٹا آئی تو حامد نے دیکھا کہ وہ پہلے سے موتی ہے چھاتیاں زیادہ بڑی ہیں چہرے پر گوشت بڑھ گیا ہے حامد نے سو روپے دیئے اور اس کو ہوٹل میں لے گیا یہاں اس کو جب معلوم ہوا کہ لٹا حاملہ ہے تو اس کے اوسان خطا ہو گئے سارا نشہ برن ہو گیا گھبرا کر اس نے پوچھا ”یہ۔۔۔ یہ حمل کس کا ہے“

لٹا کچھ نہ سمجھی حامد نے اس کو بڑی مشکل سے سمجھایا تو اس نے سر ہلا کر کہا ”ہم کو مالوم نہیں۔“

حامد پسینہ پسینہ ہو گیا ”تمہیں بالکل معلوم نہیں“

لتا نے سر ہلایا ”نہیں“
 حامد نے تھوک نکل کر پوچھا ”کہیں میرا تو نہیں“
 ”مالوم نہیں“

حامد نے مزید استفسار کیا بہت سی باتیں کہیں تو اسے معلوم ہوا کہ لتا کے لواحقین نے حمل گروانے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئے۔ کوئی دوا اثر نہیں کرتی تھی ایک دوا نے تو اسے بیمار کر دیا چنانچہ ایک مہینہ وہ بستر پر پڑی رہی حامد نے بہت سوچا ایک ہی بات اس کی سمجھ میں آئی کہ کسی اچھے ڈاکٹر سے مشورہ کرے اور بہت جلدی کرے کیونکہ بچے کی خاطر لتا کو گاؤں بھیجا جا رہا تھا۔

حامد نے اس کو گھر چھوڑا اور ایک ڈاکٹر کے پاس گیا جو اس کا دوست تھا اس نے حامد سے کہا ”دیکھو یہ معاملہ بڑا خطرناک ہے زندگی اور موت کا سوال درپیش ہوتا ہے۔“

حامد نے اس سے کہا ”یہاں میری زندگی اور موت کا سوال ہے نطفہ یقیناً میرا ہے میں نے اچھی طرح حساب لگایا ہے اس سے بھی اچھی طرح دریافت کیا ہے خدا کے لیے آپ سوچئے میری پوزیشن کیا ہے۔۔۔۔۔ میری اولاد۔۔۔ میں تو یہ سوچتے ہی کانپ کانپ جاتا ہوں آپ میری مدد نہیں کریں گے تو سوچتا سوچتا پاگل ہو جاؤں گا“

ڈاکٹر نے اس کو دوا دے دی حامد نے لتا کو پہنچا دی مگر کوئی اثر نہ ہوا حامد خوشخبری سننے کے لیے بے قرار تھا مگر لتا نے اس سے کہا کہ اس پر پہلے بھی کسی دوا نے اثر نہیں کیا تھا حامد بڑی مشکلوں سے ایک اور دوا لایا مگر یہ بھی کارگر ثابت نہ

دو انہیں چھوڑ کر لوٹنے لڑکے بھی کیے مگر بیچہ اتنا ہٹ دھرم تھا کہ اپنی جگہ پر قائم

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

سارے بارہ ہوئے تو حامد کو قدموں کی آواز آئی حامد کا دل اس زور سے
 دھڑکنے لگا جیسے سینے سے باہر آ جائے گا دادا کریم اندھیرے میں نمودار ہوا اس کے
 ہاتھوں میں کپڑے کی ایک چھوٹی سی گھڑی تھی پاس آ کر اس نے حامد کے کانپتے
 ہوئے ہاتھوں میں دے دی اور کہا ”میرا کام ختم ہوا۔۔۔ میں چلا“

یہ کہہ کر وہ چلا گیا حامد بہت بری طرح کانپ رہا تھا بچہ کپڑے کے اندر ہاتھ
 پاؤں مار رہا تھا۔ حامد نے اسے زمین پر رکھ دیا چھوڑی دیر اپنے لہرے پر قابو پانے
 کی کوشش کی جب یہ کچھ کم ہوا تو اس نے وزنی پتھر اٹھایا ٹول کر سر دیکھا پتھر زور
 سے پٹکنے ہی لگا تھا کہ اس نے سوچا بچے کو ایک نظر دیکھ لوں پتھر ایک طرف رکھ کر
 اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دیاسمانی نکالی اور ایک تیلی ساگانی یہ اس کی
 انگلیوں ہی میں جل گئی اس کی ہمت نہ پڑی کچھ دیر سوچا دل مضبوط کیا دیا سمانی کی
 تیلی جلانی کپڑا ہٹایا پہلے سرسری نظر سے پھر ایک دم غور سے دیکھا تیلی بھجھ
 گئی۔۔۔ یہ کس کی شکل تھی؟۔۔۔ اس نے کہیں دیکھی تھی کہاں؟۔۔۔ کب؟
 حامد نے جلدی جلدی ایک تیلی جلانی اور بچے کے چہرے کو غور سے دیکھا ایک
 دم اس کی آنکھوں کے سامنے اس مرد کا چہرہ آ گیا جس کے ساتھ تاشیوا جی پارک
 میں رتی تھی۔۔۔ ہمت تیری ایسی کی تھی۔۔۔ ہو بہو وہی شکل۔۔۔ وہی
 خاک نقشہ!

حامد نے بچے کو وہیں چھوڑا اور نقشے لگاتا چلا گیا۔

☆☆☆☆☆

حجامت

”میری تو آپ نے زندگی حرام کر رکھی ہے۔۔۔۔۔ خدا کرے میں مر جاؤں“

”اپنے مرنے کی دعائیں کیوں مانگتی ہو میں مر جاؤں تو سارا قصہ پاک ہو جائے گا۔۔۔۔۔ کہو تو میں ابھی خودکشی کرنے کے لیے تیار ہوں یہاں پاس ہی افیم کا ٹھیکہ ہے ایک تولہ افیم کافی ہوگی۔“

”جاؤ۔۔۔ سوچتے کیا ہو؟“

”جاتا ہوں۔۔۔ تم اٹھو اور مجھے۔۔۔۔۔ معلوم نہیں ایک تولہ افیم کتنے میں آتی ہے تم مجھے اندازاً دس روپے دے دو“

”دس روپے؟“

”ہاں بھئی۔۔۔۔۔ اپنی جان گنوائی ہے۔۔۔۔۔ دس روپے زیادہ تو نہیں“

”میں نہیں دے سکتی“

”ضرور آپ کو افیم کھانے کی مرنا ہے؟“

”سکھیا بھی ہو سکتا ہے“

”کتنے میں آئے گا؟“

”معلوم نہیں۔۔۔ میں نے آج تک کبھی سکھیا نہیں کھایا“

”آپ کو ہر چیز کا علم ہے، بنتے کیوں ہیں؟“

”بنا تم مجھے رہی ہو۔۔۔۔۔ ہمارے مجھے زہروں کی قیمتوں کے متعلق کیا علم ہو سکتا

”آپ کو ہر چیز کا علم ہے“

”تمہارے متعلق تو میں ابھی تک کچھ بھی نہ جان سکا“

”اس لیے کہ آپ نے میرے متعلق کبھی سوچا ہی نہیں“

”یہ صریحاً تمہاری زیادتی ہے۔۔۔ پانچ برس ہو گئے ہیں تم ان میں سے کوئی ایسا دن پیش کرو جب میں نے تمہارے متعلق نہ سوچا ہو“

”ہٹائیے۔۔۔ ان پانچ برسوں کے جتنے دن ہوتے ہیں، ان میں آپ مجھ سے یہی خرافات کہتے رہے ہیں“

”تم حقیقت کو خرافات کہتی ہو؟۔۔۔ میں اب کیا کہوں“

”جو کہنا چاہتے ہیں کہہ ڈالیے۔۔۔ آپ کی زبان میں لگام ہی کہاں ہے“

”پھر تم نے بدزبانی شروع کر دی“

”بدزبان تو آپ ہیں۔۔۔ میں نے ان پانچ برسوں میں، آپ سر پر قرآن اٹھا کر کہیے، کب آپ سے اس قسم کی گستاخی کی ہے؟ گستاخ ہوں گے آپ کے۔۔۔“

”رک کیوں گئی ہو۔۔۔ جو کہنا چاہتی ہو کہہ دو“

”میں کچھ کہنا نہیں چاہتی۔۔۔ آپ سے کوئی کیا کہے۔۔۔ آپ تو یہ چاہتے ہیں کہ آدمی کو تکلیف پہنچے، لیکن وہ اف بھی نہ کرے میں تو ایسی زندگی سے گھبرا گئی ہوں“

”تم چاہتی کیا ہو، یہ بھی تو پتا چلے“

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

”اپنے کو بھی اچھا نہیں سمجھتی؟“

”خدا کی قسم۔۔۔۔۔ آج نہیں“

”کل تو اچھا سمجھو گی“

”مجھے کچھ معلوم نہیں“

”یہ عجیب بات ہے کہ تمہیں سب کچھ معلوم ہوتا ہے۔۔۔۔۔ مگر تمہیں معلوم نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ یہ کیا سلسلہ ہے؟۔۔۔۔۔ تم صاف الفاظ میں یہ کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ تم مجھ سے نفرت کرتی ہو“

”تو سن لیجئے۔۔۔۔۔ میں آپ سے نفرت کرتی ہوں“

”مجھے یہ سن کر بڑا دکھ ہوا ہے۔۔۔۔۔ میں نے تمہاری ہر آسائش کا خیال رکھا۔“

”لیکن ایک بات کا خیال نہیں رکھا“

”کس بات کا؟“

”آپ عقل مند ہیں۔۔۔۔۔ خود سمجھئے۔۔۔۔۔ میں کیوں بتاؤں“

”کوئی اشارہ تو کر دو“

”میں ایسی اشارہ بازیاں نہیں جانتی“

”تم نے ایسی گفتگو کہاں سے سیکھی ہے؟“

”آپ سے“

”مجھ سے۔۔۔۔۔ مجھے حیرت ہے کہ یہ الزام تم نے مجھ پر کیوں لگایا ہے“

”آپ پر تو ہر الزام لگ سکتا ہے“

”مثال کے طور پر؟“

”میں آپ کو مثال نہیں دے سکتی۔۔۔۔۔ خدا کے لیے یہ گنتلو بند کیجئے، میں
 تنگ آگئی ہوں۔۔۔۔۔ بس۔۔۔۔۔ بس میں نے کہہ دیا ہے کہ مجھے۔۔۔۔۔“
 ”کیا؟“
 ”یا اللہ میری تو پہا۔۔۔۔۔ مجھے زیادہ تنگ نہ کیجئے۔۔۔۔۔ میرا جی چاہتا ہے
 اپنے سر کے بال نوچنا شروع کر دوں“
 ”میرا سر موجود ہے۔۔۔۔۔ تم اس کے بال بڑے شوق سے نوچ سکتی ہو“
 ”آپ کو تو اپنے بال بڑے عزیز ہیں“
 ”انسان کو اپنی ہر چیز عزیز ہوتی ہے“
 ”لیکن مردوں کے سر پر بالوں کے چھتے بھڑوں کے چھتے معلوم ہوتے
 ہیں۔۔۔۔۔ آپ معلوم نہیں بال کنوانے سے کیوں پرہیز کرتے ہیں۔“
 ”میں پرہیزی آدمی ہوں“
 ”اس قدر جھوٹ۔۔۔۔۔ ابھی پرسوں آپ نے مجھ سے کہا کہ آپ نے
 ایک پارٹی میں شراب پی تھی۔“
 ”لاحول ولا۔۔۔۔۔ میں نے صرف شیری کا ایک گلاس پیا تھا“
 ”وہ کیا بلا ہوتی ہے؟“
 ”بڑی بے ضرر قسم کی چیز ہے“
 ”تمہاری بدزبانیاں کہیں مجھے بھی بدزبان نہ بنا دیں“
 ”جیسے آپ بدزبان نہیں ہیں“
 ”بدزبان تمہارا باپ تھا۔۔۔۔۔ جانتی ہو۔۔۔۔۔ وہ ہر بات میں مغالطہ

جج اکبر

اتیاز اور صغیر کی شادی ہوئی تو شہر بھر میں دھوم مچ گئی آتش بازیوں کا رواج باقی نہیں رہا تھا مگر دو لہجے کے باپ نے اس پرانی عیاشی پر بے دریغ رو پیہ صرف کیا۔ ”جب صغیر زیوروں سے لدے پھندے سفیق براق کھوڑے پر سوار ہوا تو اس کے چاروں طرف انا رچھوٹ رہے تھے مہتابیاں اپنے رنگ برنگ شعلے بجھیر رہی تھیں پٹاخے چھوٹ رہے تھے صغیر خوش تھا بہت خوش کہ اس کی شادی اتیاز سے طے پا گئی تھی جس سے اس کو بے پناہ محبت تھی۔“

صغیر نے اتیاز کو ایک شادی کی تقریب میں دیکھا اس کی صرف ایک جھلک اسے دکھائی دی تھی مگر وہ اس پر سو جان سے فریفتہ ہو گیا۔ اور اس نے دل میں عہد کر لیا کہ وہ اس کے علاوہ اور کسی کو اپنی رفیقہ حیات نہیں بنائے گا، چاہے دنیا ادھر کی ادھر نہ ہو جائے۔

دنیا ادھر کی ادھر نہ ہوئی صغیر نے اتیاز سے ملنے کے راستے ڈھونڈ لیے شروع شروع میں اس خوب روٹڑ کی کے حجاب آڑے آیا، لیکن بعد میں صغیر کو اس کا التفات حاصل ہو گیا۔

صغیر بہت مخلص دل نوجوان تھا اس میں ریا کاری نام کو بھی نہ تھی اس کو اتیاز سے محبت ہو گئی تو اس نے یہ سمجھا کہ اسے اپنی زندگی کا اصل مقصد حاصل ہو گیا ہے اس کو اس بات کی کوئی فکر نہیں تھی کہ اتیاز اسے قبول کرے گی یا نہیں وہ اس قسم کا آدمی تھا کہ اپنی محبت کے جذبے ہی کے سہارے ساری زندگی بسر کر دیتا۔

اس کو جب امتیاز سے پہلی مرتبہ بات کرنے کا موقع ملا تو اس نے گفتگو کی ابتدا ہی ان الفاظ سے کی ”دیکھو لانی! میں ایک نامحرم آدمی ہوں میں نے مجبور کیا ہے کہ تم مجھ سے ملو۔۔۔۔۔ اب اس ملاپ کا انجام نیک ہونا چاہیے۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ اور خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہارے علاوہ اور کوئی عورت زندگی میں نہیں آئے گی یہ میرے ضمیر اور دل کی اکٹھی آواز ہے۔۔۔ تم بھی وعدہ کرو کہ جب تک میں زندہ ہوں مجھے کوئی آزار نہیں پہنچاؤ گی اور میری موت کے بعد بھی مجھے یاد کرتی رہو گی اس لیے کہ قبر میں بھی میری سوکھی ہڈیاں تمہارے پیار کی بھوکی ہوں گی۔“

امتیاز نے دھڑکتے ہوئے دل سے وعدہ کیا کہ وہ اس عہد پر قائم رہے گی اس کے بعد ان دونوں میں چھپ چھپ کے ملاقاتیں ہوتی ہیں صغیر اس کو نکاح سے پہلے ہاتھ لگانا بہت بڑا گناہ سمجھتا تھا ان ملاقاتوں میں ان کا موضوع عشق و محبت نہیں ہوتا تھا صغیر مطمئن تھا کہ امتیاز اس کی محبت کی دعوت قبول کر چکی ہے اس پر اب اور زیادہ گفتگو کرنے کی کیا ضرورت تھی ویسے وہ اپنی محبوبہ سے ملنا اس لیے ضروری سمجھتا تھا کہ وہ اس کی عادات و خصائل سے واقف ہو جائے اور وہ بھی اس کو اچھی طرح جان پہچان لے تاکہ وہ اس کی جہالت کا اندازہ کر سکے، اور اس کو شکایت کا کوئی موقع نہ دے۔

اس نے ایک دن امتیاز سے بڑے غیر عاشقانہ انداز میں کہا ”تازی میں اب بھی تم سے کہتا ہوں کہ اگر تم نے مجھ میں کوئی خامی دیکھی ہے، اگر میں تمہارے معیار پر پورا نہیں اترتا تو مجھ سے صاف صاف کہہ دو، تم کسی بندھن میں گرفتار نہیں

ہو۔۔۔ تم مجھے دھتکارو تو مجھے کوئی شکایت نہیں ہوگی میری محبت میرے لیے کافی ہے میں اس کے اور ان ملاقاتوں کے سہارے کافی دیر تک جی سکتا ہوں۔“
 اتلیاز اس سے بہت متاثر ہوئی اس کا جی چاہا کہ صغیر کو اپنے گنگے سے لگا کر رونا شروع کر دے، مگر وہ اسے ناپسند کرتا اس لیے اس نے اپنے جذبات اندر ہی اندر مسل ڈالے۔

وہ چاہتی تھی کہ صغیر اس سے فلسفیانہ باتیں نہ کرے لیکن کبھی کبھی اس طور پر بھی اس سے پیش آئے، جس طرح فلموں میں ہیرو، اپنی ہیروئن سے پیش آتا ہے مگر صغیر کو ایسی نامیائہ حرکات سے نفرت تھی۔
 بہر حال ان دونوں کی شادی ہو گئی۔

پہلی رات کو قبلہ عروسی میں جب صغیر داخل ہوا تو اتلیاز چیونک رہی تھی۔ وہ بہت متفکر ہوا اتلیاز کو بلاشبہ زکام ہو رہا تھا، لیکن وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا خاوند اس معمولی سے عارضے کی طرف اتنا متوجہ ہو کہ اس کی تمام امنگوں کو فراموش کر دے۔ وہ سرتاپا سہریل تھی مگر صغیر کو اس بات کی تشویش تھی کہ اتلیاز اس کی جان سے زیادہ عزیز، ہستی علیل ہے، چنانچہ اس نے فوراً ڈاکٹر بلوایا جو وہائیاں اس نے تجویز کیں بازار سے خرید کر لایا اور اپنی نئی نویلی دلہن کو جس کو ڈاکٹر کی آمد سے کوئی دلچسپی تھی نہ اپنے خاوند کی تیمارداری سے، اسے مجبور کیا کہ وہ انجکشن لگوائے اور چار چار گھنٹے کے بعد دو اپنے۔

تنگ آکر ایک دن اس نے اپنے ضرورت سے زیادہ شریف شوہر سے کہا ”آپ چھوڑیے میرے علاج معالجے کو۔۔۔ میں اچھی بھلی ہوں“ پھر اس نے

دعوت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا ”میں دلہن ہوں آپ کے گھر آئی ہوں، اور آپ نے اسے ہسپتال بنا دیا ہے۔“
 صغیر نے بڑے پیار سے اپنی دلہن کا ہاتھ دبایا اور مسکرا کر کہا ”تازی! خدا نہ کرے کہ یہ ہسپتال ہو یہ میرا گھر نہیں تمہارا گھر ہے۔“
 اس کے بعد امتیاز کو جو فوری شکایت تھی رفع ہو گئی اور وہ شیر و شکر ہو کر رہنے لگی صغیر اس سے محبت کرتا تھا، لیکن اس کو ہمیشہ امتیاز کی صحت، اس کے جسم کی خوبصورتیوں اور اس کو تروتازہ دیکھنے کا خیال رہتا۔ وہ اسے کانچ کے تازک پھولدان کی طرح سمجھتا تھا جس کے متعلق ہر وقت یہ خدشہ ہو کہ ذرا سی بے احتیاطی سے ٹوٹ جائے گا۔

امتیاز اور صغیر کا رشتہ دوہرا تھا۔ دو بھائی اصغر حسین اور امجد حسین تھے۔ کھاتے پیتے تا جبر صغیر بڑے بھائی اصغر حسین کا لڑکا تھا، اور امتیاز امجد حسین کی بیٹی اب یہ دونوں میاں بیوی تھے۔ شادی سے پہلے دونوں بھائیوں میں کچھ اختلاف تھے جو اس کے بعد دور ہو گئے تھے۔

امتیاز کی دو بہنیں اور تھیں جو اس پر جان چھڑکتی تھیں۔ امتیاز کا بیاد ہوا تو ان دونوں کی باری قدرتی طور پر آگئی وہ اپنے گھروں میں آباد بہت خوش تھیں کبھی کبھی امتیاز سے ملنے آتیں اور صغیر کے اخلاق سے بہت متاثر ہوتیں ان کی نظر میں وہ آئیڈیل شوہر تھا۔

وہ برس گزر گئے، امتیاز کے ہاں کوئی بچہ نہ ہوا دراصل صغیر چاہتا تھا اتنی چھوٹی عمر میں وہ اولاد کے بکھیروں میں نہ پڑے۔۔۔ ان دونوں کے دن ابھی تک کھیلنے

کوونے کے تھے صغیر اسے ہر روز سینما لے جاتا، باغ کی سیر کراتا، نہر کے کنارے کنارے اس کے ساتھ چہل قدمی کرتا۔ اس کی آسائش کا اسے خیال تھا بہترین سے بہترین کھانے، اچھے سے اچھے باورچی مگر امتیاز کبھی باورچی خانے کا رخ کرتی تو وہ اس سے کہتا۔ ”تازی، انگلیٹھیوں پر پتھر کے کونلے چلتے ہیں ان کی بو بہت بری ہوتی ہے اور صحت کے لیے بھی مضر۔۔۔۔۔ میری جان تم اندر نہ جایا کرو، دو نوکر ہیں کھانے پکانے کا کام جب تم نے ان کے سپرد کر رکھا ہے تو پھر اس زحمت کی کیا ضرورت؟“

امتیاز مان جاتی

سردیوں میں صغیر کا بڑا بھائی اکبر جو نیروبی میں ایک عرصہ سے مقیم تھا اور ڈاکٹر تھا کسی کام کے سلسلے میں کراچی آیا تو اس نے سوچا کہ چلو لاہور صغیر سے مل آئیں۔ بذریعہ ہوائی جہاز پہنچا اور اپنے چھوٹے بھائی کے پاس ٹھہرا وہ صرف چار روز کے لیے آیا کہ ہوائی جہاز میں اس کی سیٹ پانچویں روز کے لیے بک تھی مگر جب اس کی بھابی نے جو اس کی آمد پر بہت خوش ہوئی تھی اصرار کیا تو چھوٹے بھائی صغیر نے اس سے کہا ”بھائی جان! آپ اتنی دیر کے بعد آئے ہیں کچھ دن اور ٹھہر جائیں میری شادی میں آپ شریک نہیں ہوئے تھے، جتنے دن آپ فالٹو ٹھہریں گے، انہیں جرمانہ سمجھ لیجئے گا“

امتیاز مسکرائی اور اکبر سے مخاطبہ وئی ”اب تو آپ کو ٹھہرنا ہی پڑے گا۔۔۔۔۔ اور پھر مجھے آپ نے شادی پر کوئی تحفہ بھی تو نہ دیا میں جب تک وصول نہیں کر لوں گی، آپ کیسے جاسکتے ہیں اور آپ کو میں جانے بھی کب دوں گی“

دوسرے روز اکبر اس کو ساتھ لے کر گیا اور سبھی موتیوں کا ایک بار لے دیا صغیر نے اپنے بھائی کا شکریہ ادا کیا اس لیے کہ بار بہت قیمتی تھا، کم از کم پانچ ہزار روپے کا ہوگا۔

اسی دن اکبر نے واپس نیروبی جانے کا ارادہ ظاہر کیا اور صغیر سے کہا کہ وہ ہوائی جہاز میں اس کا ٹکٹ کا بندوبست کر دے اس لیے کہ اس کی لاہور شہر میں کافی واقفیت تھی اکبر نے اس کو روپے دیئے مگر اس نے برخودارانہ انداز میں کہا ”آپ ابھی اپنے پاس رکھیے میں لے لوں گا“ اور ٹکٹ کا بندوبست کرنے چلا گیا۔ اسے کوئی وقت نہ ہوئی، اس لیے کہ ہوائی سروس کا جنرل منیجر اس کا دوست تھا اس نے فوراً ٹکٹ لے دیا صغیر کچھ دیر اس کے ساتھ بیٹھا گپ لڑاتا رہا اس کے بعد گھر کا رخ کیا۔

موٹر گراج میں بند کر کے وہ اندر داخل ہوا، لیکن فوراً ہا ہر نکل آیا گراج سے موٹر نکالی اور اس میں بیٹھ کر جانے کہاں روانہ ہو گیا۔

اکبر اور امتیاز دیر تک اس کا انتظار کرتے رہے مگر وہ نہ آیا انہوں نے موٹے کے آنے اور گراج بند کیے جانے کی آواز سنی تھی مگر انہوں نے سوچا کہ شاید ان کے کانوں کو دھوکہ ہوا تھا اس لیے کہ صغیر موجود نہ تھا نہ اس کی موٹر مگر وہ غائب کہاں ہو گیا تھا؟

اکبر کو واپس جانا تھا مگر اس نے پورا ایک ہفتہ انتظار کیا ادھر ادھر کئی جگہ پوچھ گچھ کی پولیس میں رپورٹ لکھوائی مگر صغیر کی کوئی سن گن نہ ملی آخری دن جب کہ اکبر جا رہا تھا، پولیس اسٹیشن سے اطلاع ملی کہ پی بی ایل کے 10059 نمبر کی موٹر

کار جس کے ایک خانے میں صغیر اختر کا انسٹنس نکلا ہے، ہوائی اڈے کے باہر کئی
دنوں سے پڑی ہے۔

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اکبر امجد حسین، نام کے ایک آدمی نے آٹھ روز
پہلے ہوائی جہاز میں نیروبی کا سفر کیا ہے۔۔۔۔۔ اکبر کی سیٹ نیروبی کے لیے بک
تھی امتیاز سے رخصت لے کر جب وہ کینیا پہنچا تو اسے بڑی مشکلوں کے بعد
صرف اتنا معلوم ہوا کہ ایک صاحب جن کا نام اکبر امجد تھا ہوائی جہاز کے ذریعے
سے یہاں پہنچے تھے ایک ہوٹل میں دو روز ٹھہرے اس کے بعد چلے گئے۔
اکبر نے بہت کوشش کی مگر پتہ نہ چلا اس دوران میں اس کو امتیاز کے کئی خط
آئے پہلے دو تین خطوں کی تو اس نے رسید بھیجی، اس کے بعد جو بھی خط آتا پھاڑ دیتا
کہ اس کی بیوی نہ پڑھ لے۔

دس برس گزر گئے امجد حسین، یعنی امتیاز کا باپ بہت پریشان تھا بہت لوگوں کا
خیال تھا کہ صغیر مر کھپ چکا ہے مگر امجد کا دل نہیں مانتا تھا کہیں اس کی لاش ہی مل
جاتی خود کشی کرنے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ بڑا نیک، شریف اور پر خور وارز کا تھا امجد
کو اس سے بہت محبت تھی ایک ہی بات اس کی سمجھ میں آتی تھی کہ اس کی بیٹی امتیاز
نے کہیں اس جیسے ذکی افس آدمی کو ایسی شخصیت نہ پہنچائی ہو کہ وہ شکستہ دل ہو کر کہیں
رو پوش ہو گیا ہے چنانچہ اس نے امتیاز سے کئی مرتبہ اس بارے میں پوچھا مگر وہ
صاف منکر ہو گئی خدا اور رسول کی قسمیں کھا کر اس نے اپنے باپ کی تشفی کر دی کہ
اس سے ایسی کوئی حرکت سرزد نہیں ہوئی اکثر اوقات وہ روتی بھی تھی اس کو صغیر یاد
آتا تھا اس کی نرم و نازک محبت یاد آتی تھی اس کا وہ دھیمہ دھیمہ، شیم سحری کا سلوک

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

خوش نصیب انسان سمجھتا۔“

یہ سن کر امتیاز خاموش رہی۔

وہ سر زمین حجاز سے بے نیل و مرام واپس آ گئے۔۔۔ ایک برس اور گزر گیا۔ اس دوران میں امجد حسین بڑی مہلک بیماری، یعنی دل کے عارضے میں گرفتار ہوا اور وفات پا گیا مرتے وقت اس نے اپنی بیٹی سے کچھ کہنا چاہا، مگر وہ بات شاید بڑی اذیت دہ تھی کہ وہ خاموش رہا اور صرف سرزنش بھری نگاہوں سے امتیاز کو دیکھتے دیکھتے مر گیا۔

اس کے بعد امتیاز اپنی بہن ممتاز کے پاس راولپنڈی چلی گئی ان کی کونجی کے سامنے ایک اور کونجی تھی جس میں ایک ادیب عمر کامر جو بہت تھکا تھکا سا دکھائی دیتا تھا دھوپ تاپتا اور کتا میں پڑھتا رہتا تھا۔

ممتاز اس کو ہر روز دیکھتی۔۔ ایک دن اس نے امتیاز سے کہا ”مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے یہ صغیر ہے۔۔۔ کیا تم نہیں پہچان سکتی ہو وہی ناک نقشہ ہے، وہی متانت وہی سنجیدگی۔“

امتیاز نے اس آدمی کی طرف غور سے دیکھا اور ایک دم چلائی ”ہاں ہاں وہی ہے“ پھر فوراً رک گئی ”لیکن وہ کیسے ہو سکتے ہیں وہ تو وفات پا چکے ہیں“ انہی دنوں ان دونوں کی چھوٹی بہن شہناز بھی آگئی ممتاز اور امتیاز نے اس کو یہ قبل از وقت مر جھایا اور افسردہ مرد دکھایا جس کی ڈاڑھی کھجڑی تھی اور اس سے پوچھا ”تم بتاؤ، اس کی شکل صغیر سے ملتی ہے یا کہ نہیں؟“

شہناز نے اس کو بڑی گہری نظروں سے دیکھا اور فیصلہ کن لہجے میں کہا ”شکل

ملتی کیا ہے۔۔۔۔۔ یہ خود صغیر ہے۔۔۔ سو فیصد صغیر“

اور یہ کہہ کر وہ سامنے والی کوٹھی میں داخل ہوئی وہ شخص جو کتاب پڑھنے میں مشغول تھا، چونکا۔ شبناز جس نے شادی کے موقع پر اس کی جوتی چرائی تھی، اسی پرانے انداز میں کہا ”جناب! آپ کب تک چھپے رہیں گے۔“
اس شخص نے شبناز کی طرف دیکھا اور بڑی شبیدگی اختیار کرتے ہوئے پوچھا ”آپ کون ہیں؟“

شبناز طرارتھی اس کے علاوہ اس کو یقین تھا کہ جس سے وہ ہم کلام ہے وہ اس کا بہنوئی ہے چنانچہ اس نے بڑے نوکیلے لہجے میں کہا ”جناب، میں آپ کی سالی شبناز ہوں“
اس شخص نے شبناز کو سخت ناامید کیا اس نے کہا ”مجھے افسوس ہے کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔“

اس کے بعد شبناز نے اور بہت سی باتیں کیں مگر اس نے بڑے ملائم انداز میں اس سے جو چہ کہا، اس کا یہ مطلب تھا کہ تم ناحق اپنا وقت ضائع کر رہی ہو میں تمہیں جانتا ہوں نہ تمہاری بہن کو جس کے متعلق تم کہتی ہو کہ میری بیوی ہے۔۔۔۔۔ میری بیوی، میری اپنی زندگی ہے اور میں ہی اس کا خاوند۔

شبناز اور ممتاز نے لاکھ سر پکا، مکروہ شخص جس کا نام راوہ پنڈی میں کسی کو بھی معلوم نہیں تھا، مانتا ہی نہیں تھا کہ وہ صغیر ہے۔۔۔۔۔ اس کو کسی چیز سے دلچسپی نہیں تھی، ہوائے کتابوں کے۔

لیکن شبناز اور ممتاز کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ امتیاز کے متعلق تمام معلومات

حاصل کرتا ہے ان کو یہ بھی پتہ چل گیا تھا، اس پر اسرار مرد کے نوکر کے ذریعے سے کہ وہ راتوں کو اکثر روتا ہے، نمازیں پڑھتا ہے اور دعائیں مانگتا ہے کہ وہ زندہ رہے۔۔۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کو جواذیت پہنچی ہے اس سے دیر تک لطف اندوز ہوتا رہے۔

نوکر حیران تھا کہ انسان کی زندگی میں ایسی کون سی تکلیف ہو سکتی ہے جس سے وہ لطف اٹھا سکتا ہے۔۔۔۔۔ سب باتیں امتیاز سنتی تھی اور اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ مر جائے چنانچہ اس نے جب یہ سنا کہ وہ شخص جس کو امتیاز اچھی طرح پہچانتی تھی، اس کے نام سے قطعاً آشنا ہے تو اس نے ایک روز تولہ انیم کھائی اور یہ ظاہر کیا کہ اس کے سر میں درد ہے اور اکیلی آرام کرنا چاہتی ہے۔

وہ آرام کرنے چلی گئی۔۔۔ لیکن شہناز نے جب اس کو غنودگی کے عالم میں دیکھا تو اسے کچھ شبہ ہوا اس نے ممتاز سے بات کی اس کا ماتھا بھی ٹھنکا کمرے میں جا کر دیکھا تو امتیاز بالکل بے ہوش تھی اس کو جھنجھوڑا مگر وہ نہ جاگی شہناز دوڑی دوڑی سامنے والی کونٹھی میں گئی اور اس شخص سے جس کا نام روپلہندی میں کسی کو معلوم نہیں تھا، سخت گھبراہٹ میں یہ اطلاع دی کہ اس کی بیوی نے زہر کھالیا ہے اور مرنے کے قریب ہے یہ سن کر صرف اس نے اتنا کہا ”آپ کو غلط فہمی ہے، وہ میری بیوی نہیں ہے۔۔۔۔۔ لیکن میرے ہاں اتفاق سے ایک ڈاکٹر آیا ہوا ہے آپ چلیے میں اسے بھیج دیتا ہوں۔“

شہناز گئی تو وہ اندر کونٹھی میں گیا، اور اپنے بھائی اکبر سے کہا ”یہ کونٹھی جو سامنے ہے اس میں کسی عورت نے زہر کھالیا ہے۔۔۔۔۔ بھائی جان آپ جلدی جائیے

اور کوشش کیجئے کہ بچ جائے“

اس کا بھائی جو نیروبی میں بہت بڑا ڈاکٹر تھا، اتنیا زکونہ بچا سکا۔ دونوں نے جب ایک دوسرے کو دیکھا تو اس کا رد عمل بہت مختلف تھا۔۔۔۔۔ اتنیا ز فوراً امر گئی اور اکبر اپنا بیگ لے کر واپس چلا گیا۔

صغیر نے اس سے پوچھا ”کیا حال ہے مر ایضہ کا؟“

اکبر نے جواب دیا ”مر گئی“

صغیر نے اپنے ہونٹ بھیجنے کر بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔۔۔۔۔ ”میں زندہ رہوں گا“

لیکن ایک دم سنگین فرش پر لڑکھڑانے کے بعد گرا اور۔۔۔ جب اکبر نے اس کی نبض دیکھی تو وہ ساکت تھی۔

☆☆☆☆☆☆

اختتام۔۔۔۔۔ حصہ دوم

فہرست

حسن کی تخلیق
خالی بولتیں خالی ڈبے
خالد میاں
خورشٹ
خوشیا
خوشبو و ارتیل
دس روپے
دھواں
دیوالی کے دیئے
ڈرپوک
رام کھلاوون
رحمت خداوندی کے پھول
رشتوت
ساڑھے تین آنے
بجدہ
سرکنڈوں کے پیچھے
سنترچ
سونے کی انگوٹھی
سہائے
شاروا

حسن کی تخلیق

کالج میں شاہدہ حسین ترین لڑکی تھی اس کو اپنے حسن کا احساس تھا اسی لیے وہ کسی سے سیدھے منہ بات نہ کرتی اور خود کو مغلیہ خاندان کی کوئی شہزادی سمجھتی اس کے خدو خال واقعی مغلی تھے ایسا لگتا تھا کہ نور جہاں کی تصویر جو اس زمانے کے مصوروں نے بنائی تھی اس میں جان پڑ گئی تھی۔

کالج کے لڑکے اسے شہزادی کہتے تھے لیکن اس کے سامنے نہیں پر اس کو معلوم ہو گیا تھا کہ اسے یہ لقب دیا گیا ہے وہ اور بھی مغرور ہو گئی۔

کالج میں مخلوط تعلیم تھی لڑکے زیادہ تھے اور لڑکیاں کم، آپس میں ملتے جلتے، لیکن بڑے تکلف کے ساتھ، شاہدہ الگ الگ رہتی اس لیے کہ اس کو اپنے حسن پر بڑا مانا تھا وہ اپنی ہم جماعت لڑکیوں سے بھی بہت کم گفتگو کرتی تھی کلاس میں آتی تو ایک کونے میں بیٹھ جاتی اور بت سی بنی رہتی۔ بڑا حسین بت۔۔۔۔۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جن پر گھنی پلکوں کی چھانوں رہتی تھی، ساکت و صامت رہتیں۔ لڑکے اسے دیکھتے اور جی جی جی میں بہت کڑھتے کہ یہ حسن خاموش کیوں ہے اس قدر زبردست کس لیے ہے، اسے تو متحرک ہونا چاہیے

اس کا رنگ گورا تھا۔۔۔۔۔ بہت گورا جس میں جھوڑی سی غلط روی بھی گھلی ہوئی تھی اگر یہ نہ ہوتی تو شکر کی بنی ہوئی پتلی تھی جو دیوانی کے تہوار پر بکا کرتی ہیں۔ اس میں مٹھاس تھی، لیکن وہ ظاہر یہ کرنا چاہتی تھی کہ بڑی کڑوی کیسلی ہے۔۔۔۔۔ کالج میں اس کا رویہ ہی کچھ اس قسم کا تھا کہ بروقت نیم کی نبولی بنی رہتی

تھی۔

ایک دن اس کے ایک ہم جماعت لڑکے نے جرأت سے کام لے کر اس سے کہا ”حضور۔۔۔۔۔ خا کساری میں اپنی جگہ دے کر کبھی کسی کو سرفراز تو کریں۔“ اس نے کوئی جواب نہ دیا دوسرے دن اس طالب علم کو پرنسپل نے بلایا اور اسے نکال باہر کیا۔

اس حادثے کے بعد تمام لڑکے محتاط ہو گئے انہوں نے شاہدہ کو دیکھنا ہی چھوڑ دیا کہ مبادا ان کا وہی حشر ہو جو اس طالب علم کا ہوا۔

شاہدہ اب بی اے میں تھی، خوبصورت ہونے کے علاوہ کافی ذہین تھی اس کے پروفیسر اس کی ذہانت اور خوبصورتی سے بڑے مرعوب تھے پرنسپل کی چیٹی تھی، اس لیے کہ وہ اس کی بڑی بہن کے بڑے لڑکے کی بیٹی تھی۔

کالج میں چھ میگوئیاں ہوتی ہی رتی ہیں شاہدہ کے متعلق قریب قریب ہر روز طالب علموں میں باتیں ہوتی تھیں وہ اس کے متعلق کوئی بری رائے قائم نہیں کر پاتے تھے اس لیے کہ اس کا کیریئر بڑا مضبوط تھا۔

نک شاپ میں باتیں ہوتیں اور شاہدہ کا حسن زیر بحث ہوتا سب سوچتے کہ یہ حسین قاعدہ کون سر کرے گا۔

شاہدہ کو، جیسا کہ سب کو معلوم تھا، صرف خوبصورت چیزیں پسند تھیں وہ کسی بد صورت چیز کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

ایک دن کلاس میں ایک لڑکے کی ریٹھ بہہ رہی تھی شاہدہ نے جب اس کی طرف دیکھا تو فوراً اٹھ کر چلی گئی۔

وہ بڑی نفاست پسند تھی اس کو وہ ہر چیز کھلتی تھی جو بد نما ہو۔

کالج میں ایک لڑکی جیلہ تھی۔۔۔۔۔ بڑی بد صورت، مگر شاہدہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ ذہین اس کو وہ نفرت کی نگاہوں سے دیکھتی تھی ویسے وہ اس کی ذہانت کی قائل تھی اور کوئی رشک محسوس نہیں کرتی تھی۔

کالج کے سب لڑکے سوچتے تھے کہ شاہدہ اگر حسین نہ ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔۔۔۔۔ وہ اس سے بات چیت تو کر سکتے مگر وہ اپنے حسن کے غرور میں سرشار رہتی اور کسی کو نہ ہی نہیں لگاتی تھی۔

ایک دن کالج میں ہنگامہ سابر پا ہو گیا۔۔۔۔۔ ایک لڑکا جس کے والد کی تہذیبی ہو گئی تھی، اس کالج میں داخلہ لینے کے لیے آیا لڑکوں اور لڑکیوں نے اسے دیکھا اور ششدر رہ گئے وہ شاہدہ سے زیادہ خوبصورت تھا۔

اس کا نام شاہد تھا۔۔۔۔۔ اس کو داخلہ مل گیا

جس کلاس میں شاہدہ تھی، اسی میں شاہد بھی تھا۔۔۔۔۔ اتفاق کی بات ہے کہ جب شاہد پہلے روز کلاس روم میں آیا تو شاہدہ موجود نہیں تھی اس کو زکام ہو گیا تھا اور اس کے باعث اس نے دو روز کے لیے چھٹی لے لی تھی۔

دو دن کے بعد جب شاہد کالج کے باغ میں ٹہل رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ ایک خوبصورت، مگر بے جان مورت آرہی ہے اس نے اپنی کتابیں بیچ پر رکھیں اور آگے بڑھا۔

شاہدہ نے اسے دیکھا وہ اس کی خوبصورتی سے متاثر ہوئی اور تھوڑی دیر کے لیے اس کے قدم رک گئے زمین گیلی تھی، کچھڑی ہو رہی تھی، شاہد جب اس کی

طرف بڑھا تو وہ گھبراہٹ میں اس گھبراہٹ میں اس کا پاؤں پھسلا اور وہ اونڈھے منہ
زمین پر گر پڑی۔

شاہد نے لپک کر اسے اٹھایا۔۔۔۔۔ شاہد کے نچنے میں موج آگئی تھی مگر
اس نے مسکرا کر کہا ”شکریہ۔۔۔۔۔ آپ کون ہیں؟“

شاہد نے جواب دیا ”ایک خادم!“
”آپ خادم تو دکھائی نہیں دیتے“
”کیا دکھائی دیتا ہوں۔۔۔۔۔ بعض اوقات صحیح شکلیں غلط دکھائی دیا کرتی
ہیں“

شاہد کو یہ بات پسند آئی اس کے نچنے میں بہت درد ہو رہا تھا مگر وہ اسے چند
لمحوں کے لیے بھول گئی ”آپ کا نام؟“
”شاہد!“

شاہد نے سوچا کہ شاید وہ اس کا نام سن چکا ہے اور شرارت کے طور پر شاہد بن
رہا ہے ”آپ غلط کہہ رہے ہیں“

”آپ کالج کے رجسٹر سے اس کی تصدیق کر سکتی ہیں“

”آپ اس کالج میں پڑھتے ہیں؟“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ آپ یہاں کیسے چلی آئیں؟“

”واہ۔۔۔۔۔ میں بھی تو یہیں پڑھتی ہوں“

”کس کلاس میں؟“

”بی اے میں!“

”میں تو بی اے میں ہوں“

”جھوٹ۔۔۔ آپ تو مالی معلوم ہوتے ہیں“

”اس شکل کے آدمی واقعی مالی معلوم ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ لیکن افسوس ہے کہ میں نے ابھی تک کوئی پھول نہیں توڑا“

”پھول کیا توڑنے کے لیے ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ انہیں تو صرف سوگھٹنا چاہیے“

شاہد ایک لٹلے کے لیے خاموش ہو گیا پھر اس نے سنجمل کر کہا ”میں آپ کو سوگھڑ رہا ہوں“

شاہد ہنسنا گئی ”آپ بڑے بدتمیز ہیں“

شاہد نے بیچ پر سے کتابیں اٹھاتے ہوئے مسکرا کر کہا ”میں نے آپ کو توڑا تو نہیں۔۔۔۔۔ صرف سوگھڑ لیا ہے۔۔۔۔۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی پگھڑیوں میں سے غرور کی بو آتی ہے۔۔۔۔۔ وہ معاف کیجئے گا غرور میں کرسکتا ہوں لیکن مردوں کے ساتھ۔۔۔۔۔ میں بھی ایک پھول ہوں، پر آپ کٹی ہیں میں آپ سے مقابلہ نہیں کرسکتا۔“

شاہد اپنا منہ پکڑے بیٹھی تھی ایک دم کرا بنے لگی ”ہائے۔۔۔۔۔ ہائے بڑا دروہور ہوا ہے۔“

شاہد نے اس سے اجازت طلب کی ”کیا میں اسے دبا دوں؟“

”دباہیے۔۔۔۔۔ خدا کے لیے دباہیے“

شاہد نے اس کے موج آئے ہوئے ٹخنے پر اس طور پر مساس کیا کہ چندرہ

منٹ کے اندر اندر شاہدہ کا دروہہ رہو گیا۔

اس واقعے کے بعد کالج میں وہ دونوں خالی پیریدوں میں اکٹھے باہر جاتے اور باغ میں بیٹھ کر جانے کیا باتیں کرتے رہتے شاید وہ یہ کوشش کر رہے تھے کہ دونوں گیلی زمین پر پھسلیں اور ان کے دل کے ٹخنوں میں موج آ جائے اور وہ ساری زندگی ان کو سہلاتے رہیں۔

دونوں نے بے اے پاس کر لیا بڑے اچھے نمبروں پر شاہدہ کے نمبر شاہدہ کے مقابلے میں پانچ زیادہ تھے اس نے اس کا بدلہ لیا چاہا ”شاہدہ! میں یہ پانچ نمبر ابھی لیے لیتا ہوں“
”کیسے؟“

شاہدہ نے اس کو پہلی مرتبہ اپنی گود میں اٹھایا اور اس کو پانچ مرتبہ چوم لیا شاہدہ نے کوئی اعتراض نہ کیا وہ بہت خوش ہوئی لیکن جموڑی دیر کے بعد اس نے شاہدہ سے بڑی سنجیدگی سے کہا ”ہمارے نمبر پورے ہو گئے لیکن آج کے اس واقعے کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آپ کی میری شادی ہو جانی چاہیے۔۔۔۔۔ میں اپنے ہونٹ اب کسی اور کے ہونٹوں سے آلودہ نہیں کروں گی۔“

شاہدہ بہت خوش ہوا۔۔۔۔۔ اسے یقین ہی نہیں تھا کہ اس کی دلی آرزو کبھی پوری ہوگی اس نے اسی خوشی میں پانچ نمبر اور حاصل کر لیے اور شاہدہ سے کہا ”میری جان! میں اسی امید میں تو اب تک جیتا رہا ہوں“
شاہدہ کے والدین نے اس کی شادی کی ایک جگہ بات چیت کی مگر شاہدہ نے

صاف انکار کر دیا کہ وہ کسی بد صورت مرد سے رشتہ ازدواج قائم کرنے کے لیے تیار نہیں۔

بہت جھگڑے ہوئے آخر شاہدہ نے بتا دیا کہ وہ اپنے ہم جماعت شاہد کو جو بہت خوش شکل ہے پسند کرتی ہے اس کے علاوہ کسی اور مرد کو اپنی رفاقت میں نہیں لے گی۔

اس کے ماں باپ شاہد کے والدین سے ملے بڑے شریف اور متمول آدمی تھے۔۔۔ اور روشن خیال بھی۔

شاہد کو جب انہوں نے دیکھا تو بہت خوش ہوئے اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت جا رہا تھا لیکن اس کی خواہش تھی کہ پہلے شادی کر لے اور اپنی بیوی کو ساتھ لے کر جائے تاکہ وہ بھی باہر کی دنیا دیکھے۔

جب والدین رضامند ہو گئے تو ان کی شادی ہو گئی وہ بہت خوش تھے پہلی رات شاہد نے اپنی بیوی سے کہا ”ہمارا بچہ۔۔۔ لڑکی ہو یا لڑکا۔۔۔ جب پیدا ہوگا تو اسے دنیا دیکھنے آئے گی“

شاہدہ نے پوچھا ”کیوں؟“

شاہد ہنسا ”میری جان! تم اتنی حسین ہو۔۔۔ میں بھی کچھ بد شکل نہیں ہمارا بچہ یقیناً ہم دونوں سے کہیں زیادہ خوب صورت ہوگا“

بہنی مون منانے کے لیے وہ سوئٹزرلینڈ چلے گئے وہ یہاں چار مہینے رہے اس کے بعد لندن چلے گئے جہاں شاہد کو پی، ایچ، ڈی کی ڈگری لینا تھی۔

شاہد کے باپ میاں ہدایت اللہ کی وہاں ایک کونٹری تھی، جو ان کی آمد سے پہلے

ہی خالی کرائی گئی تھی۔۔۔۔۔ شاہدہ بہت خوش تھی اور شاہدہ بھی۔۔۔ اس لیے کہ وہ ایک بچے کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔

شاہدہ کہتا تھا ”ہمارا بچہ اتنا حسین اور خوبصورت ہوگا کہ اس کا جواب نہ ہوگا“

شاہدہ کہتی ”خدا انظر بد سے بچائے۔۔۔۔۔ ضرور رگل گو تھنا سا ہوگا“

پورے دن ہوئے تو بچے ہونے کے آثار پیدا ہوئے شاہدہ نے اپنی بیوی کو میسرٹی روم میں داخل کرا دیا۔

لیبر وارڈ کے باہر شاہدہ بڑے اضطراب میں ادھر ادھر چل رہا تھا۔۔۔ اس کی نظروں کے سامنے ایک ایسے بچے کی تصویر تھی جس کے خدو خال اس کے اور اس کی بیوی کے آپس میں بڑے حسین طور پر مدغم ہو گئے ہوں۔

لیبر وارڈ سے نرس باہر آئے شاہدہ نے لپک کر اس سے پوچھا ”خیریت ہے؟“

”جی ہاں“

”لڑکا ہوا یا لڑکی؟“

نرس پریشان سی تھی اس نے صرف اتنا کہا ”پتہ نہیں لڑکا ہے یا لڑکی۔۔۔۔۔ پر ہم نے ایسا بچہ کبھی نہیں دیکھا“

شاہدہ نے خوش ہو کر پوچھا ”بہت خوبصورت ہے نا؟“

نرس نے منہ بنا کر جواب دیا ”بڑا اگلی ہے۔۔۔۔۔ اس کے سر پر ایسا مالوم ہوتا ہے سینگ ہیں دانت بھی ہیں۔۔۔۔۔ تاک بڑی طیرچی ہے۔۔۔۔۔ دو آنکھیں ہیں، پر ایک آنکھ ایسا لگتا ہے مانتے پر بھی ہے۔۔۔۔۔ تم لوگ اتنے خوبصورت ہو کر کیسے بچے پیدا کرتا ہے۔“

شہد اپنے بچے کو دیکھنے کے لیے نہ گیا۔۔۔۔۔ لیکن دوسرے دن میزنی ہوم
میں لکٹ لگا دی گئی کہ جو آدمی چاہے، اس عجیب الخالقیت بچے کو دیکھ سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆



خالی بوتلیں خالی ڈبے

یہ حیرت مجھے اب بھی ہے کہ خاص طور پر خالی بوتلوں اور ڈبوں سے مجروح مردوں کو اتنی دلچسپی کیوں ہوتی ہے؟۔۔۔۔۔ مجروح مردوں سے میری مراد ان مردوں سے ہے جن کو عام طور پر شادی سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔

یوں تو اس قسم کے مرد عموماً سکی اور عجیب و غریب عادات کے مالک ہوتے ہیں لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ انہیں خالی بوتلوں اور ڈبوں سے کیوں اتنا پیار ہوتا ہے؟۔۔۔۔۔ پرندے اور جانور اکثر ان لوگوں کے پالتو ہوتے ہیں یہ میلان سمجھ میں آ سکتا ہے کہ تنہائی میں ان کا کوئی تو مونس ہونا چاہیے لیکن خالی بوتلیں اور خالی ڈبے ان کی کیا نمکساری کر سکتے ہیں؟

سنگ اور عجیب و غریب عادات کا جواز ڈھونڈنا کوئی مشکل نہیں کہ فطرت کی خلاف ورزی ایسے بگاڑ پیدا کر سکتی ہے لیکن اس کی نفسیاتی باریکیوں میں جانا الہتہ بہت مشکل ہے۔

میرے ایک عزیز ہیں عمر آپ کی اس وقت پچاس کے قریب قریب ہے آپ کو کبوتر اور کتے پالنے کا شوق ہے اور اس میں کوئی عجیب و غریب پن نہیں لیکن آپ کو یہ مرض ہے کہ بازار سے ہر روز دودھ کی بالائی خرید کر لاتے ہیں چوبلے پر رکھ کر اس کا روغن نکالتے ہیں اور اس روغن میں اپنے لیے علیحدہ سالن تیار کرتے ہیں اس کا خیال ہے کہ اس طرح خالص گھی تیار ہوتا ہے۔

پانی پینے کے لیے اپنا گھڑا الگ رکھتے ہیں اس کے منہ پر ہمیشہ لمبل کا ٹکڑا بندھا

بوتلوں اور ڈبوں سے دلچسپی ہے، میرے، وہ دھوکے بالائی سے کالیں لگتی تیار کرنے والے عزیز گھر میں جب بھی کبھی کوئی خالی بوتل دیکھیں تو اسے دھو دھا کر اپنی الماری میں سجا دیتے ہیں کہ ضرورت کے وقت کام آئے گی۔ ہائی کورٹ کے ریڈر جن کو ہر جگہ سے ہر وقت بدبو آتی رہتی ہے، صرف ایسی بوتلیں اور ڈبے جمع کرتے ہیں، جن کے متعلق وہ اپنا پورا اطمینان کر لیں کہ اب ان سے بدبو آنے کا کوئی احتمال نہیں رہا۔ جب موقع ملے، نماز پڑھنے والے، خالی بوتلیں آب دست کیلئے اور ٹین کے خالی ڈبے وضو کے لئے درجنوں کی تعداد میں جمع رکھتے ہیں۔

ان کے خیال کے مطابق یہ دونوں چیزیں سستی اور پاکیزہ رہتی ہیں۔۔۔۔۔ قسم قسم کے حقے جمع کرنے والے میجر صاحب کو خالی بوتلیں اور خالی ڈبے جمع کر کے ان کو بیچنے کا شوق ہے اور ریٹائرڈ کرنل صاحب کو صرف و سکی کی خالی بوتلیں جمع کرنے کا۔

آپ کرنل صاحب کے ہاں جائیں تو ایک چھوٹے، صاف ستھرے کمرے میں کئی شیشے کی الماریوں میں آپ کو و سکی کی بوتلیں بھی ہوئی نظر آئیں گی۔۔۔۔۔ پرانے سے پرانے برائڈ کی و سکی کی خالی بوتل بھی آپ کو ان کے اس نادور مجموعے میں مل جائے گی۔ جس طرح لوگوں کو ٹکٹ اور سبکے جمع کرنے کا شوق ہوتا ہے اسی طرح ان کو و سکی کی خالی بوتلیں جمع کرنے اور ان کی نمائش کرنے کا شوق بلکہ خبط ہے۔

کرنل صاحب کا کوئی عزیز رشتہ دار نہیں کوئی ہے تو اس کا مجھے علم نہیں دنیا میں تنہا ہیں لیکن وہ تنہائی بالکل محسوس نہیں کرتے۔۔۔۔۔ دس بارہ کتے ہیں ان کی

دیکھ بھال وہ اس طرح کرتے ہیں جس طرح شفیق باپ اپنی اولاد کی کرتے ہیں۔
سارا دن ان کا ان پالتو حیوانوں کے ساتھ گزر جاتا ہے فرصت کے وقت وہ
المازیوں میں اپنی چیتکی بوتلیں سنوارتے رہتے ہیں۔

آپ پوچھیں گے، خالی بوتلیں تو ہوں گی۔ یہ تم خالی ڈبے کیوں ساتھ لگا
دینے؟۔۔۔۔۔ کیا ضروری ہے کہ تجر و پسند مردوں کو خالی بوتلوں کے ساتھ ساتھ
خالی ڈبوں کے ساتھ بھی دلچسپی ہو۔۔۔۔۔؟ اور پھر ڈبے اور بوتلیں، صرف خالی
کیوں؟ بھری ہوئی کیوں نہیں؟۔۔۔۔۔ میں آپ سے شاید پہلے بھی عرض کر چکا
ہوں کہ مجھے خود اس بات کی حیرت ہے یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے سوال اکثر
میرے دماغ میں پیدا ہو چکے ہیں باوجود کوشش کے میں ان کا جواب حاصل نہیں کر
سکتا۔

خالی بوتلیں اور خالی ڈبے، خلا کا نشان ہیں اور خلا کا کوئی منطقی جوڑ تجر و پسند
مردوں سے غالباً یہی ہو سکتا ہے کہ خود ان کی زندگی میں ایک خلا ہوتا ہے لیکن پھر یہ
سوال پیدا ہوتا ہے کیا وہ اس خلا کو ایک اور خلا سے پر کرتے ہیں۔۔۔۔۔ کتوں
بلیوں خرگوشوں اور بندروں کے متعلق آدمی سمجھ سکتا ہے کہ وہ خالی خولی زندگی کی کمی
ایک حد تک پوری کر سکتے ہیں کہ وہ دل بہا سکتے ہیں تا نخرے کر سکتے ہیں دلچسپ
حرکات کے موجب ہو سکتے ہیں پیار کا جواب بھی دے سکتے ہیں لیکن خالی بوتلیں
اور ڈبے دلچسپی کا کیا سامان ہم پہنچاتے ہیں؟

بہت ممکن ہے آپ کو ذیل کے واقعات میں ان سوالوں کا جواب مل جائے۔
دس برس پہلے میں جب بمبئی گیا تو وہاں ایک مشہور فلم کمپنی کا ایک فلم تقریباً

میں ہفتوں سے چل رہا تھا۔۔۔۔۔ ہیروئن پرانی تھی لیکن ہیرو نیا تھا جو اشتہاروں میں چمپی ہوئی تصویروں میں نوخیز دکھائی دیتا تھا۔۔۔۔۔ اخباروں میں اس کی کردار نگاری کی تعریف پڑھی تو میں نے یہ فلم دیکھا۔۔۔۔۔ اچھا خاصا تھا کہانی جاذب توجہ تھی اور اس نے ہیرو کا کام بھی اس لحاظ سے قابل تعریف تھا کہ اس نے پہلی مرتبہ کمرے کا سامنا کیا تھا۔

پہلے کسی ایکٹریا ایکٹریس کی عمر کا اندازہ لگانا عام طور پر مشکل ہوتا ہے کیونکہ میک اپ جو ان کو بوڑھا اور بوڑھے کو جوان بنا دیتا ہے مگر یہ نیا ہیرو بلاشبہ نوخیز تھا۔۔۔۔۔ کالج کے طالب علم کی طرح تروتازہ اور چاق و چوبند۔۔۔۔۔ خوبصورت تو نہیں تھا مگر اس کے گٹھے ہوئے جسم کا ہر عضو اپنی جگہ پر مناسب و موزوں تھا۔

اس فلم کے بعد ایک ایکٹر کے میں نے اور کئی فلم دیکھے اب وہ منجھ گیا تھا۔ چہرے کے خط و خال کی لطافت نہ نمائش، عمر اور تجربے کی سختی میں تبدیل ہو چکی تھی اس کا شمار اب چوٹی کے اداکاروں میں ہونے لگا تھا۔

فلمی دنیا میں اس کی نڈل عام ہوتے ہیں آئے دن سننے میں آتا ہے کہ فلاں ایکٹر کا فلاں ایکٹریس سے تعلق ہو گیا ہے فلاں ایکٹریس فلاں ایکٹر کو چھوڑ کر فلاں ڈائریکٹر کے پیلو میں چلی گئی ہے قریب قریب ہر ایکٹر اور ہر ایکٹریس کے ساتھ کوئی نہ کوئی رومان جلد یا بدیر وابستہ ہو جاتا ہے لیکن اس نے ہیرو کی زندگی میں جس کامیں ذکر کر رہا ہوں ان بکھیروں سے پاک تھی مگر اخباروں میں اس کا چہ چا نہیں تھا کسی نے بھولے سے حیرت کا بھی اظہار نہیں کیا تھا کہ فلمی دنیا میں رہ کر

رام سروپ کی زندگی جنسی آلائشوں سے پاک ہے۔

میں نے سچ پوچھے تو اس بارے میں کبھی غور ہی نہیں کیا تھا اس لیے کہ مجھے ایکٹروں اور ایکٹریسوں کی نجی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ فلم دیکھا، اس کے متعلق اچھی یا بری رائے قائم کی اور بس۔۔۔۔۔ لیکن جب رام سروپ سے میری ملاقات ہوئی تو مجھے اس کے متعلق بہت ہی دلچسپ باتیں معلوم ہوئیں۔۔۔۔۔ یہ ملاقات اس کا پہلا فلم دیکھنے کے تقریباً آٹھ برس بعد ہوئی۔

شروع شروع میں تو وہ مجھے سے بہت دور ایک گاؤں میں رہتا تھا مگر اب فلمی سرگرمیاں بڑھ جانے کے باعث اس نے شیواجی پارک میں سمندر کے کنارے ایک متوسط درجے کا فلیٹ لے رکھا تھا اس سے میری ملاقات اسی فلیٹ میں ہوئی جس کے چار کمرے تھے، باورچی خانے سمیت۔

اس فلیٹ میں جو کنبہ تھا اس کے آٹھ افراد تھے خود رام سروپ اس کا نوکر جو باورچی بھی تھا تین کتے، دو بندر اور ایک بلی، رام سروپ اور اس کا نوکر مجھ دتے تین کتوں اور ایک بلی کے مقابلے میں ان کی مخالف جنس نہیں تھی۔۔۔۔۔ ایک بندر تھا اور ایک بندر یا دونوں اکثر اوقات ایک جالی دار پنجرے میں بند رہتے تھے۔

ان نصف درجن حیوانوں کے ساتھ رام سروپ کو والہانہ محبت تھی نوکر کے ساتھ بھی اس کا سلوک اچھا تھا مگر اس میں جذبات کا دخل بہت کم تھا لگے بندھے کام تھے جو مقررہ وقت پر مشین کی سی بے روح باقاعدگی کے ساتھ گویا خود بخود ہو جاتے تھے اس کے علاوہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رام سروپ نے اپنے نوکر کو اپنی

زندگی کے تمام قواعد و ضوابط ایک پرچے پر لکھ کر دے دیئے تھے جو اس نے حفظ کر لیے تھے۔

اگر رام سروپ کپڑے اتار کر نیکر پہننے لگے تو اس کا نوکر فوراً تین چار سوڈے اور برف کی فلاسک شیشے والی تپانی پر رکھ دیتا تھا۔۔۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ صاحب رم پی کر اپنے کتوں کے ساتھ کھیلے گے اور جب کسی کا ٹیلی فون آئے گا تو کہہ دیا جائے گا کہ صاحب گھر پر نہیں ہیں۔

رم کی بوتل یا سگریٹ کا ڈبہ جب خالی ہو گا تو اسے پھینک دیا جائے گا بلکہ احتیاط سے اس کمرے میں رکھ دیا جائے گا جہاں خالی بوتلوں اور ڈبوں کے انبار لگے ہیں۔

کوئی عورت ملنے کے لیے آئے گی تو اسے دروازے ہی سے یہ کہہ کر واپس کر دیا جائے گا کہ رات صاحب کی شوٹنگ تھی، اس لیے سو رہے ہیں ملاقات کرنے والی شام کو یا رات کو آئے تو اس سے یہ کہا جاتا تھا کہ صاحب شوٹنگ پر گئے ہیں۔ رام سروپ کا گھر تقریباً ویسا ہی تھا جیسا کہ عام طور پر اکیلے رہنے والے مجرد مردوں کا ہوتا ہے، یعنی وہ سلیقہ، وہ قریب اور رکھ رکھاؤ غائب تھا جو انسانی لمس کا خاصا ہوتا ہے صفائی تھی مگر اس میں کھرا پن تھا۔۔۔۔۔ پہلی مرتبہ جب میں اس کے فلیٹ میں داخل ہوا تو مجھے بہت شدت سے محسوس ہوا کہ میں چڑیا گھر کے اسے حصے میں داخل ہو گیا ہوں جو شیر، چیتے اور دوسرے حیوانوں کے لیے مخصوص ہوتا ہے کیونکہ ایسی ہی بو آرہی تھی۔

ایک کمرہ سونے کا تھا دوسرا بیٹھنے کا تیسرا خالی بوتلوں اور ڈبوں کا، اس میں رم

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

رام سروپ سے ملتے ملتے کئی برس گزر گئے اس دوران میں کئی مرتبہ میں نے اڑتی اڑتی سنی کہ اسے ایک ایکٹرس سے جس کا نام شیلا تھا، عشق ہو گیا ہے۔ مجھے اس انوہ کا بالکل یقین نہ آیا اول تو رام سروپ سے اس کی توقع ہی نہیں تھی دوسرے شیلا سے کسی بھی ہوش مند نوجوان کو عشق نہیں ہو سکتا تھا، کیونکہ وہ اس قدر بے جان تھی کہ دق کی مریض معلوم ہوتی تھی۔۔۔ شروع شروع میں جب وہ ایک دو فلموں میں آئی تھی تو کسی قدر گوارا تھی مگر بعد میں تو وہ بالکل ہی بے کیف اور

رہے رنگ ہو گئی تھی اور صرف تیسرے درجے کے فلموں کے لئے مخصوص ہو کر رہ گئی تھی۔

میں نے صرف ایک مرتبہ اس شیا کے بارے میں رام سروپ سے دریافت کیا تو اس نے مسکرا کر کہا 'میرے لیے کیا یہی رہ گئی تھی'۔

اس دوران میں اس کا سب سے پیارا کتا اسٹالن نمونیہ میں گرفتار ہو گیا رام سروپ نے دن رات بڑی جانفشانی سے اس کا علاج کیا مگر وہ جانبر نہ ہوا اس کی موت سے اسے بہت صدمہ ہوا کئی دن اس کی آنکھیں اشک آلود رہیں اور جب اس نے ایک روز باقی کتے کسی دوست کو دے دیئے تو میں نے خیال کیا کہ اس نے اسٹالن کی موت کے صدمے کے باعث ایسا کیا ہے، وہ ان کی جدائی کبھی برداشت نہ کرتا۔

کچھ عرصے کے بعد جب اس نے بندر اور بندریا کو بھی رخصت کر دیا تو مجھے کسی قدر حیرت ہوئی لیکن میں نے سوچا کہ اس کا دل اب اور کسی کی موت کا صدمہ برداشت نہیں کرنا چاہتا اب وہ نیکر پہن کر رم پیتے ہوئے صرف اپنی لمبی نرگس سے کھیلتا تھا وہ بھی اس سے بہت پیار کرنے لگی تھی کیونکہ رام سروپ کا سارا اہلقات اب اسی کے لیے موقوف ہو گیا تھا۔

اس اس کے گھر سے شیر، چیتوں کی بونیمیں آتی تھی۔ صفائی میں کسی قدر نظر آ جانے والا سلیقہ اور قرینہ بھی پیدا ہو چلا تھا، اس کے اپنے چہرے پر ہلکا سا کھار آ گیا تھا مگر یہ سب کچھ اس قدر آہستہ آہستہ ہوا تھا کہ اس کے نقطہ آغاز کا پتا چلانا بہت مشکل تھا

دن گزرتے گئے رام سروپ کا تازہ فلم ریلیز ہوا تو میں نے اس کی کردار نگاری میں ایک نئی تازگی دیکھی میں نے اسے مبارک باد دی تو وہ مسکرایا ”وسکی پیو“ میں نے تعجب سے پوچھا ”وسکی؟“ اس لیے کہ وہ صرف رم پینے کا عادی تھا۔ پہلی مسکراہٹ کو ہونٹوں کے ذرا سکیڑتے ہوئے اس نے جواب دیا ”رم پی پی کرتنگ آگیا ہوں“

میں نے اس سے اور کچھ نہ پوچھا

آٹھویں روز جب اس کے ہاں شام کو گیا تو وہ قمیض پانچا نہ پہنے رم۔۔۔۔۔۔ نہیں وسکی پی رہا تھا دیر تک ہم تاش کھیلے اور وسکی پیتے رہے اس دوران میں میں نے نوٹ کیا کہ وسکی کا ذائقہ اس کی زبان اور تالو پر ٹھیک نہیں بیٹھ رہا کیونکہ گھونٹ بھرنے کے بعد وہ کچھ اس طرح منہ بناتا تھا جیسے کسی ان چکھی چیز سے اس کا واسطہ پڑا ہوا ہے چنانچہ میں نے اس سے کہا ”تمہاری طبیعت قبول نہیں کر رہی وسکی کو؟“

اس نے مسکرا کر جواب دیا ”آہستہ آہستہ قبول کر لے گی“

رام سروپ کا فلیٹ دوسری منزل پر تھا ایک روز میں ادھر سے گزر رہا تھا کہ دیکھا، نیچے گراج کے پاس خالی بوتلوں اور ڈبوں کے انبار پڑے ہیں سڑک پر وہ چمکڑے کھڑے ہیں جن میں تین چار کباڑیئے ان کو لا رہے ہیں، میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، کیونکہ یہ خزانہ رام سروپ کے علاوہ اور کس کا ہو سکتا تھا۔۔۔۔۔۔ آپ یقین جانئے اس کو جد اہوتے دیکھ کر میں نے اپنے دل میں ایک عجیب قسم کا درد محسوس کیا۔۔۔۔۔۔ دوڑا اوپر گیا گھنٹی بجائی دروازہ کھلا میں نے اندر

داخل ہونا چاہا تو نوکرنے خلاف معمول راستہ روکتے ہوئے کہا ”صاحب! رات شوٹک پر گئے تھے اس وقت سو رہے ہیں“

میں حیرت سے اور غصے سے بوکھلا گیا۔۔۔۔۔ کچھ بڑبڑایا اور چل دیا۔

اسی روز شام کو رام سروپ میرے ہاں آیا۔۔۔ اس کے ساتھ شیا تھی، نئی بناری ساڑھی میں ملبوس۔۔۔۔۔ رام سروپ نے اس کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے کہا ”میری دھرم پتی سے ملو۔“

اگر میں نے وکی کے چار پیگ نہ پہنے ہوتے تو یقیناً یہ سن کر بے ہوش ہو گیا ہوتا۔

رام سروپ اور شیا! صرف تھوڑی دیر بیٹھے اور چلے گئے۔۔۔ میں دیر تک سوچتا رہا کہ بناری ساڑھی میں شیا! کس سے مشابہ تھی۔۔۔۔۔ دبے پتلے بدن پر جگے باوامی رنگ کی کانڈی سی ساڑھی کسی جگہ پھولی ہوئی، کسی جگہ دبلی ہوئی۔۔۔ ایک دم میری آنکھوں کے سامنے ایک خالی بوتل آگئی، باریک کانڈ میں لپٹی ہوئی۔ شیا! عورت تھی۔۔۔۔۔ بالکل خالی لیکن دوستا ہے ایک خلائے دوسرے خلائے کو پر کر دیا ہو۔

☆☆☆☆☆

خالد میاں

ممتاز نے صبح سویرے اٹھ کر حسب معمول تینوں کمروں میں جھاڑو دی۔ کوئے
کھدروں سے سگرنوں کے ٹکڑے، مچاس کی جلی ہوئی تیلیاں اور اسی طرح کی اور
چیزیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالیں۔ جب تینوں کمرے اچھی طرح صاف ہو گئے تو اس
نے اطمینان کا سانس لیا۔

اس کی بیوی باہر صحن میں سو رہی تھی بچہ پنگھوڑے میں تھا ممتاز ہر روز صبح
سویرے اٹھ کر صرف اس لیے خود تینوں کمروں میں جھاڑو دیتا تھا کہ اس کا لڑکا
خالد اب چلتا پھرتا تھا اور عام بچوں کے مانند، ہر چیز جو اس کے سامنے آئے، اٹھا
کر منہ میں ڈال لیتا تھا۔

ممتاز ہر روز تینوں کمرے بڑی احتیاط سے صاف کرتا مگر اس کو حیرت ہوتی
جب خالد فرش پر سے اپنے چھوٹے چھوٹے ناخنوں کی مدد سے کوئی نہ کوئی چیز اٹھا
لیتا۔ فرش کا پلستر کئی جگہ اکھڑا ہوا تھا جہاں کوڑے کرکٹ کے چھوٹے چھوٹے
ڈرے پھنس جاتے تھے ممتاز اپنی طرف سے پوری صفائی کرتا مگر کچھ نہ کچھ باقی رہ
جاتا جو اس کا پلوٹھی کا بیٹا خالد جس کی عمر ابھی ایک برس کی نہیں ہوئی تھی اٹھا کر اپنے
منہ میں ڈال لیتا۔

ممتاز کو صفائی کا خبط ہو گیا تھا اگر وہ خالد کو کوئی چیز فرش پر سے اٹھا کر اپنے منہ
میں ڈالتے دیکھتا وہ خود کو اس کا ملزم سمجھتا اپنے آپ کو دل ہی دل میں کوستا کہ اس
نے کیوں بد احتیاطی کی خالد سے اس کو پیار ہی نہیں عشق تھا لیکن عجیب بات ہے کہ

جوں جوں خالد کی پہلی سالگرہ کا دن نزدیک آتا تھا اس کا یہ وہم یقین کی صورت اختیار کرتا جاتا تھا کہ اس کا بیٹا ایک سال کا ہونے سے پہلے پہلے مر جائے گا۔ اپنے اس خوفناک وہم کا ذکر ممتاز اپنی بیوی سے بھی کر چکا تھا۔ ممتاز کے متعلق مشہور تھا کہ وہ اوہام کا بالکل قائل نہیں اس کی بیوی نے جب پہلی بار اس کے منہ سے ایسی بات سنی تو کہا ”آپ اور ایسے وہم۔۔۔۔۔ اللہ کے فضل و کرم سے ہمارا بیٹا سو سال زندہ رہے گا۔۔۔ میں نے اس کی پہلی سالگرہ کے لیے ایسا اہتمام کیا ہے کہ آپ دنگ رہ جائیں گے۔“

یہ سن کر ممتاز کے دل کو ایک دھک سا لگا تھا وہ کب چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا زندہ نہ رہے لیکن اس کے وہم کا کیا علاج تھا۔۔۔۔۔ خالد بڑا تندرست بچہ تھا۔ سردیوں میں جب نوکری ایک دفعہ اس کو باہر سیر کے لیے لے گیا تھا تو واپس آکر اس نے ممتاز کی بیوی سے کہا تھا ”بیگم صاحب! آپ خالد میاں کے گالوں پر سرخی نہ لگایا کریں۔۔۔۔۔ کسی کی نظر لگ جائے گی“

یہ سن کر اس کی بیوی بہت ہنسی تھی ”بے وقوف مجھے کیا ضرورت ہے سرخی لگانے کی ماشاء اللہ اس کے گال ہی قدر ترقی لال ہیں“

سردیوں میں خالد کے گال بہت سرخ رہتے تھے مگر اب گرمیوں میں کچھ زردی مائل ہو گئے تھے اس کو پانی کا بہت شوق تھا چنانچہ جب وہ انگریزی لے کر اٹھتا اور دودھ کی بوتل پی لیتا تو دفتر جانے سے پہلے ممتاز اس کو پانی کی بالٹی میں کھڑا کر دیتا۔ دیر تک وہ پانی کے چھینے اڑا اڑا کر کھیلتا رہتا ممتاز اور اس کی بیوی خالد کو دیکھتے اور بہت خوش ہوتے لیکن ممتاز کی خوشی میں غم کا ایک برقی دھک سا ضرور

ہوتا۔ وہ سوچتا، خدا میری بیوی کی زبان مبارک کرے لیکن یہ کیا ہے کہ مجھے اس کی موت کا کھٹکا رہتا ہے۔۔۔۔۔۔ یہ وہم کیوں میرے دل و دماغ میں بیٹھ گیا ہے کہ یہ مر جائے گا۔۔۔ کیوں مر جائے گا؟۔۔۔ اچھا بھلا صحت مند ہے اپنی عمر کے بچوں سے کہیں زیادہ صحت مند۔۔۔۔۔۔ میں یقیناً پاگل ہوں اس سے میری حد سے زیادہ بڑھی ہوئی محبت دراصل اس وہم کا باعث ہے۔۔۔۔۔۔ لیکن مجھے اس سے اتنی زیادہ محبت کیوں ہے؟۔۔۔ کیا سارے باپ اسی طرح بچوں سے پیار کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔ کیا ہر باپ کو اپنی اولاد کی موت کا کھٹکا لگا رہتا ہے؟۔۔۔۔۔۔ مجھے آخر ہو کیا گیا ہے؟

ممتاز نے جب حسب معمول تینوں کمرے اچھی طرح صاف کر دیئے تو وہ فرش پر چٹائی بچھا کر لیٹ گیا یہ اس کی عادت تھی صبح اٹھ کر جھاڑو وغیرہ دے کر وہ گرمیوں میں ضرور آدھے گھنٹے کے لئے چٹائی پر لیٹا کرتا تھا بغیر نیکی کے اس طرح اس کو لطف محسوس ہوتا تھا۔

لیٹ کر وہ سوچنے لگا ”پرسوں میرے بچے کی پہلی سالگرہ ہے۔۔۔۔۔۔ اگر یہ بخیر و عافیت گزر جائے تو میرے دل کا سارا بوجھ ہلکا ہو جائے گا یہ میرا وہم بالکل دور ہو جائے گا۔۔۔۔۔۔ اللہ میاں یہ سب تیرے ہاتھ میں ہے۔“

اس کی آنکھیں بند تھیں دفعتاً اس نے اپنے ننگے سینے پر بوجھ محسوس کیا آنکھیں کھولیں تو کیا دیکھا خالد ہے اس کی بیوی پاس کھڑی تھی اس نے کہا ”ساری رات بے چین سارہا ہے سوتے میں جیسے ڈر کے کانپتا رہا ہے۔“

خالد، ممتاز کے سینے پر زور سے کانپا، ممتاز نے اس پر ہاتھ رکھا اور کہا ”خدا

میرے بیٹے کا محافظ ہو۔“

ممتاز کی بیوی نے فحقی آمیز لہجے میں کہا ”تو بہ آپ کو بس وہیوں نے گھیر رکھا ہے پاکسا بخار ہے، انشاء اللہ دو رہو جائے گا“
یہ کہہ کر ممتاز کی بیوی کمرے سے باہر چلی گئی

ممتاز نے ہولے ہولے بڑے پیار سے خالد کو تھپکنا شروع کیا جو اس کی چھاتی پر اوندھالینا تھا اور سوتے میں کبھی کبھی کانپ اٹھتا تھا تھپکنے سے وہ جاگ پڑا آہستہ آہستہ اس نے اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کھولیں اور باپ کو دیکھ کر مسکرایا ممتاز نے اس کا منہ چوما ”کیوں میاں خالد کیا حالت ہے۔۔۔ آپ کانپتے کیوں تھے“
خالد نے مسکرا کر اپنا اٹھا ہوا سر باپ کی چھاتی پر گرا دیا ممتاز نے پھر اس کو تھپکانا شروع کر دیا دل میں وہ دعائیں مانگ رہا تھا کہ اس کے بیٹے کی عمر دراز ہو اس کی بیوی نے خالد کی پہلی سالگرہ کے لیے بڑا اہتمام کیا تھا اپنی ساری ہیلیوں سے کہا تھا کہ وہ اس تقریب پر ضرور آئیں درزی سے خاص طور پر اس کی سالگرہ کے کپڑے سلوائے تھے دعوت پر کیا کیا چیز ہوگی، یہ سب سوچ لیا تھا۔۔۔ ممتاز کو یہ ٹھٹھا پسند نہیں تھا وہ چاہتا تھا کہ کسی کو خبر نہ ہو اور سالگرہ گزر جائے خود اس کو بھی پتا نہ چلے اور اس کا بیٹا ایک برس کا ہو جائے اس کو اس بات کا علم صرف اس وقت ہو جب خالد ایک برس اور کچھ دنوں کا ہو گیا ہو۔

خالد اپنے باپ کی چھاتی پر سے اٹھا ممتاز نے اس سے محبت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا ”خالد بیٹا سام نہیں کرو گے لاجی کو“
خالد نے مسکرا کر ہاتھ اٹھایا اور اپنے سر پر ہاتھ رکھ دیا ممتاز نے اس کو دعا دی ”

گئی ابھی ٹھیک ہو جائے گا“

خالد نے اپنی مرجھائی ہوئی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کھولیں اور اپنے باپ کی طرف دیکھا ممتاز کی ساری دنیا زندہ ہو گئی بڑے ہی درد بھرے پیار سے اس نے خالد سے کہا ”کیوں خالد بیٹا۔۔۔۔۔ یہ کیا ہوا تھا آپ کو؟“

خالد کے ہونٹوں پر تشنج زدہ مسکراہٹ نمودار ہوئی ممتاز نے اس کو گود میں اٹھالیا اور اندر کمرے میں لے گیا لٹانے ہی والا تھا کہ دوسری کنولشن آئی خالد پھر بل کھانے لگا جس طرح مرگی کا دورہ ہوتا ہے تشنج بھی اسی قسم کا تھا ممتاز کو ایسا محسوس ہوتا کہ خالد نہیں بلکہ وہ خود اس اذیت کے شکنجے میں کسا جا رہا ہے۔

دوسرا دورہ ختم ہوا تو خالد اور زیادہ مرجھا گیا اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں دھنس گئیں ممتاز اس سے باتیں کرنے لگا۔

”خالد بیٹے! یہ کیا ہوتا ہے آپ کو؟“

”خالد میاں اٹھو نا۔۔۔۔۔ چلو پھر دو“

”خالدی۔۔۔۔۔ مکھن کھائیں گے آپ؟“

خالد کو مکھن بہت پسند تھا مگر اس نے یہ سن کر بھی اپنا سر ہلا کر ہاں نہ کی لیکن جب ممتاز نے کہا ”بیٹے، گلو کھائیں گے آپ؟“ تو اس نے نحیف انداز میں نہیں کے طور پر اپنا سر ہلایا ممتاز مسکرایا اور خالد کو اپنے گلے سے لگا لیا پھر اس کو اپنی بیوی کے حوالے کیا اور اس سے کہا ”تم اس کا دھیان رکھو میں ڈاکٹر لے کر آتا ہوں“

ڈاکٹر ساتھ لے کر آیا تو ممتاز کی بیوی کے جوش اڑے ہوئے تھے اس کی غیر حاضری میں خالد پر تشنج کے تین اور دورے پڑ چکے تھے ان کے باعث وہ بے جان

سا ہو گیا تھا ڈاکٹر نے اسے دیکھا اور کہا ”تردو کی کوئی بات نہیں ایسی کنولشن بچوں کو
 عموماً آیا کرتی ہے۔۔۔۔۔ اس کی وجہ دانت ہیں۔ حد سے میں کرم وغیرہ ہوں تو وہ
 بھی اس کا باعث ہو سکتے ہیں۔۔۔۔۔ میں دوا لکھ دیتا ہوں آرام آ جائے گا بخار تیز
 نہیں ہے، آپ کوئی فکر نہ کریں“

ممتاز نے دفتر سے چھٹی لے لی اور سارا دن خالد کے پاس بیٹھا ہاڈاکٹر کے
 جانے کے بعد اس کو دوسرا درجہ اور دورے پڑے اس کے بعد وہ ندرصال لینا رہا شام
 ہو گئی تو ممتاز نے سوچا ”شاید اب اللہ کا فضل ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ اتنے عرصے میں
 کوئی کنولشن نہیں آئی۔۔۔۔۔ خدا کرے رات اسی طرح گٹ جائے۔“

ممتاز کی بیوی بھی خوش تھی ”اللہ تعالیٰ نے چاہا تو کل میرا خالد دوڑتا پھرے گا“
 رات کو چونکہ مقررہ وقت پر دوا دینی تھی اس لیے ممتاز چارپائی پر نہ لیٹا کہ شاید
 سو جائے خالد کے پنگھوڑے کے پاس آرام کرسی رکھ کر وہ بیٹھ گیا اور ساری رات
 جاگتا رہا کیونکہ خالد بے چین تھا کانپ کانپ کر بار بار جاگتا تھا حرارت بھی تیز
 تھی۔

صبح سات بجے کے قریب ممتاز نے تھرمامیٹر لگا کے دیکھا تو ایک سو چار ڈگری
 بخار تھا ڈاکٹر بلایا اس نے کہا ”تردو کی کوئی بات نہیں بروڈکائمنٹس ہے میں نسخہ لکھ دیتا
 ہوں تین چار روز میں آرام آ جائے گا۔“

ڈاکٹر نسخہ لکھ کر چلا گیا ممتاز وہ انوالایا خالد کو ایک خوراک پانی مگر اس کو تمکین
 نہ ہوئی دس بجے کے قریب وہ ایک بڑا ڈاکٹر لایا اس نے اچھی طرح خالد کو دیکھا
 اور تسلی دی ”گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا“

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

حد خشک ہو گیا اس نے سوچا اتر کر کسی دکان سے ایک گلاس پانی پی لے لیکن خدا معلوم کہاں سے یہ وہم ایک دم اس کے دماغ میں آن پکا ”دیکھو اگر تم نے پانی پیا تو تمہارا خالدمر جائے گا“

ممتاز کا حلق سوکھ کے لکڑی ہو گیا مگر اس نے پانی نہ پیا ہسپتال کے قریب تانگہ پہنچا تو اس نے سگریٹ ساگایا وہی کش لیے تھے تو اس نے ایک دم سگریٹ پھینک دیا اس کے دماغ میں یہ وہم گونجا تھا ”ممتاز سگریٹ نہ پو تمہارا بچہ مر جائے گا“ ممتاز نے تانگہ ٹھہرایا اس نے سوچا ”یہ کیا حماقت ہے۔۔۔۔۔ یہ وہم سب فضول ہیں۔ سگریٹ پینے سے بچے پر کیا آفت آسکتی ہے“

تانگے سے اتر کر اس نے سڑک پر سے سگریٹ اٹھایا واپس تانگے میں بیٹھ کر جب اس نے کش لینا چاہا تو کسی نامعلوم طاقت نے اس کو روکا ”میں ممتاز! ایسا نہ کرو خالدمر جائے گا۔“

ممتاز نے سگریٹ زور سے پھینک دیا۔۔۔۔۔ تانگے والے نے گھور کے اس کو دیکھا۔ ممتاز نے محسوس کیا کہ جیسے اس کو اس کی دماغی کیفیت کا علم ہے اور وہ اس کا مذاق اڑا رہا ہے اپنی خفت دور کرنے کی خاطر اس نے تانگے والے سے کہا ”خواب ہو گیا تھا سگریٹ“ یہ کہہ کر اس نے جیب سے ایک نیا سگریٹ نکالا ساگایا چاہا مگر ڈر گیا اس کے دل و دماغ میں ہلچل سی مچ گئی اور اک کہتا تھا کہ یہ ابام سب فضول ہیں مگر کوئی ایسی آواز تھی کوئی ایسی طاقت تھی جو اس کی منطق اس کے استدلال، اس کے اور اک پر غالب آجاتی تھی۔

تانگہ ہسپتال کے پھانک میں داخل ہوا تو اس نے سگریٹ انگلیوں میں مسل کر

بچینک دیا اس کو اپنے اوپر بہت ترس آیا کہ وہ ابوہام کا غلام بن گیا ہے۔
ہسپتال والوں نے فوراً ہی خالد کو داخل کر لیا ڈاکٹر نے دیکھا اور کہا ”برونکو
نمونیا ہے حالت مخدوش ہے۔“

خالد بے ہوش تھا ماں اس کے سر ہانے بیٹھی ویران نگاہوں سے اس کو دیکھ رہی
تھی کمرے کے ساتھ غسل خانہ تھا۔ ممتاز کو سخت پیاس لگ رہی تھی تل کھول کر اوک
سے پانی پینے لگا تو پھر وہی وہم اس کے دماغ میں گونجا ”ممتاز یہ کیا کر رہے ہو تم
پانی مت پیو۔۔۔۔۔ تمہارا خالد مر جائے گا۔“

ممتاز نے دل میں اس وہم کو گالی دی اور انتقاماً اتنا پانی پیا کہ اس کا پیٹ ابھر گیا
پانی پی کر غسل خانے سے باہر آیا تو اس کا خالد اسی طرح مرجھایا ہوا بے ہوش
ہسپتال کے مہنی پلنگ پر پڑا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہیں بھاگ جائے۔۔۔۔۔ اس کے
ہوش حواس غائب ہو جائیں۔۔۔۔۔ خالد اچھا ہو جائے اور وہ اس کے بدلے نمونیا
میں گرفتار ہو جائے۔

ممتاز نے محسوس کیا کہ خالد اب پہلے سے زیادہ زرد ہے اس نے سوچا، یہ سب
اس کے پانی پی لینے کا باعث ہے۔۔۔۔۔ اگر وہ پانی نہ پیتا تو ضرور خالد کی
حالت بہتر ہو جاتی۔ اس کو بہت دکھ ہوا اس نے خود کو بہت لعنت ملامت کی مگر پھر
اس کو خیال آیا کہ جس نے یہ بات سوچی تھی وہ ممتاز نہیں کوئی اور تھا۔۔۔۔۔ یہ
اور کون تھا؟۔۔۔۔۔ کیوں اس کے دماغ میں ایسے وہم پیدا ہوتے تھے پیاس لگی
تھی، پانی پی لیا، اس سے خالد پر یا اثر پڑ سکتا ہے۔۔۔۔۔ خالد ضرور اچھا ہو جائے
گا۔۔۔۔۔ پرسوں اس کی سالگرہ ہے ان شاء اللہ خوب ٹھٹھاٹ سے منائی جائے گی۔

لیکن فوراً ہی اس کا دل بیٹھ جاتا کوئی آواز اس سے کہتی ”خالد ایک برس کا ہونے ہی نہیں پائے گا“ ممتاز کا جی چاہتا کہ وہ اس آواز کی زبان پکڑ لے اور اسے گدی سے نکال دے مگر یہ آواز تو خود اس کے دماغ میں پیدا ہوتی تھی خدا معلوم کیسے ہوتی تھی کیوں ہوتی تھی۔

ممتاز اس قدر تنگ آیا کہ اس نے دل ہی دل میں اپنے ابوہام سے گڑ گڑا کر کہا ”خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔۔۔۔۔۔ کیوں تم مجھ غریب کے پیچھے پر گئے ہو“ شام ہو چکی تھی کئی ڈاکٹر خالد کو دیکھ چکے تھے دوا دی جا رہی تھی کئی انجکشن بھی لگ چکے تھے مگر خالد بھی تک بے ہوش تھا دھننا ممتاز کے دماغ میں یہ آواز گونجی ”تم یہاں سے چلے جاؤ۔۔۔۔۔۔ فوراً چلے جاؤ ورنہ خالد مر جائے گا“

ممتاز کمرے سے باہر چلا گیا ہسپتال سے باہر چلا گیا اس کے دماغ میں آوازیں گونجتی رہیں اس نے اپنے آپ کو ان آوازوں کے حوالے کر دیا اپنی ہر جنبش، اپنی ہر حرکت ان کے حکم کے سپرد کر دی۔۔۔۔۔۔ یہ اسے ایک ہوٹل میں لے گئیں انہوں نے اس کو شراب پینے کے لیے کہا شراب آئی تو اسے پھینک دینے کا حکم دیا ممتاز نے ہاتھ سے گلاس پھینک دیا تو اور منگوانے کے لیے کہا دوسرا گلاس آیا تو اسے بھی پھینک دینے کے لیے کہا

شراب اور ٹوٹے ہوئے گلاسوں کے بل ادا کر کے ممتاز باہر نکلا اس کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ چاروں طرف خاموشی ہی خاموشی ہے۔۔۔۔۔۔ صرف اس کا دماغ ہے جہاں شور مچا رہا ہے چلتا چلتا وہ ہسپتال پہنچ گیا خالد کے کمرے کا رخ کیا تو اسے حکم ہوا ”مت جاؤ ادھر۔۔۔۔۔۔ تمہارا خالد مر جائے گا۔“

وہ لوٹ آیا۔۔۔ گھاس کا میدان تھا وہاں ایک بچہ پڑی تھی اس پر لیٹ گیا۔۔۔ رات کے دس بج چکے تھے میدان میں اندھیرا تھا چاروں طرف خاموشی تھی کبھی کبھی موٹر کے ہارن کی آوازیں خاموشی میں خراش پیدا کرتی ہوئی گزر جاتی۔ سامنے اونچی دیوار میں ہسپتال کا روشن کلاک تھا۔۔۔ ممتاز، خالد کے متعلق سوچ رہا تھا ”کیا وہ بچہ جائے گا۔۔۔ یہ بچے کیوں پیدا ہوتے ہیں جنہیں مرنا ہوتا ہے۔۔۔ وہ زندگی کیوں پیدا ہوتی ہے جسے اتنی جلدی موت کے منہ میں پلا جانا ہوتا ہے۔۔۔ خالد ضرور۔۔۔“

ایک دم اس کے دماغ میں ایک وہم پھوٹا بچہ پر سے اتر کر وہ جہدے میں گر گیا حکم تھا اسی طرح پڑے رہو جب تک خالد ٹھیک نہ ہو جائے ممتاز زہدے میں پڑا رہا وہ دعا مانگنا چاہتا تھا مگر حکم تھا کہ مت مانگو ممتاز کی آنکھوں میں آنسو آ گئے وہ خالد کے لیے نہیں، اپنے لیے دعا مانگنے لگا ”خدایا مجھے اس اذیت سے نجات دے۔۔۔ تجھے اگر خالد کو مارنا ہے تو مار دے، یہ میرا کیا حشر کر رہا ہے تو۔۔۔“

دفعتاً اسے آوازیں سنائی دیں اس سے کچھ دور دو آدمی کرسیوں پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے اور آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

”بچہ بڑا خوبصورت ہے“

”ماں کا حال مجھ سے تو دیکھا نہیں گیا“

”بے چاری ہر ڈاکٹر کے پاؤں پڑ رہی تھی“

”ہم نے اپنی طرف سے تو ہر ممکن کوشش کی“

”بچہ نا محال ہے“

”میں نے یہی کہا تھا ماں سے کہ دنا کرو بہن“

ایک ڈاکٹر نے ممتاز کی طرف دیکھا جو سجدے میں پڑا تھا اس کو زور سے آواز دی ”اے کیا کر رہا ہے تو۔۔۔۔۔ ادھر آ“

ممتاز اٹھ کر دونوں ڈاکٹروں کے پاس گیا ایک نے اس سے پوچھا ”کون ہو تم؟“

ممتاز نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر جواب دیا ”جی میں ایک مریض۔۔۔“

ڈاکٹر نے سختی سے کہا ”مریض ہو تو اندر جاؤ۔۔۔۔۔ یہاں میدان میں ڈنٹر کیوں پلٹے ہو۔“

ممتاز نے کہا ”جی میرا بچہ ہے۔۔۔۔۔ ادھر اس وارڈ میں“

”وہ تمہارا بچہ ہے جو۔۔۔۔۔“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ شاید آپ اسی کی باتیں کر رہے تھے۔۔۔۔۔ وہ میرا بچہ ہے۔۔۔۔۔ خالد“

”آپ اس کے باپ ہیں؟“

ممتاز نے اپنا غم و اندوہ سے بھرا ہوا سر ہلایا ”جی ہاں، میں اس کا باپ ہوں“

ڈاکٹر نے کہا ”آپ یہاں بیٹھے ہیں جائے آپ کی وائف بہت پریشان ہیں“

”جی اچھا“ کہہ کر ممتاز وارڈ کی طرف روانہ ہوا سیڑھیاں طے کر کے جب اوپر پہنچا تو کمرے کے باہر اس کا نوکر رہا تھا ممتاز کو دیکھ کر اوپر زیادہ رونے لگا۔

خورشٹ

ہم دلی میں تھے میرا بچہ بیمار تھا میں نے پڑوس کے ڈاکٹر کا پڑیا کو بلا یا وہ ایک کبڑا آدمی تھا بہت پست قدر لیکن بے حد شریف اس نے میرے بچے کا بڑے اچھے طریقے پر علاج کیا اس کو فیس دی اس نے قبول نہ کی یوں تو وہ پارسى تھا لیکن بڑی شستہ و رفتہ اردو بولتا تھا اس لیے کہ وہ دلی ہی میں پیدا ہوا تھا اور تعلیم اس نے وہیں حاصل کی تھی۔

ہمارے سامنے کے فلیٹ میں مسٹر کھیش والا رہتا تھا یہ بھی پارسى تھا اسی کے ذریعے سے ہم نے ڈاکٹر کا پڑیا کو بلا یا تھا تین چار مرتبہ ہمارے یہاں آیا تو اس سے ہمارے تعلقات بڑھ گئے۔ ڈاکٹر کے ہاں میرا اور میری بیوی کا آنا جانا شروع ہو گیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے ہماری ملاقات اپنے لڑکے سے کرائی اس کا نام ساوک کا پڑیا تھا۔ وہ بہت ہی ملسار آدمی تھا رنگ بے حد زرد، ایسا لگتا تھا کہ اس میں خون ہے ہی نہیں سنگرمشین کمپنی میں ملازم تھا ناٹا پانچ چھ سو روپے ماہوار پاتا تھا بہت صاف ستھرا رہتا تھا اس کا گھر جو ہمارے گھر سے کچھ فاصلے پر تھا بہت نفاست سے سجا ہوا تھا مجال ہے کہ گردوغبار کا ایک ذرہ بھی کہیں نظر آجائے۔

جب میں اور میری بیوی شام کو اس کے ہاں جاتے تو وہ اور اس کی بیوی خورشید جس کو پارسیوں کی زبان میں خورشٹ کہا جاتا تھا، بڑے تپاک سے پیش آتے اور ہماری خوب خاطر تواضع کرتے۔

خورشید یعنی خورشٹ لمبے قد کی عورت تھی عام پارسیوں کی طرح اس کی ناک

بد نما نہیں تھی، لیکن خوبصورت بھی نہیں تھی موٹی پکوڑا ایسی ناک تھی، لیکن رنگ سفید تھا اس لیے گوارا ہو گئی تھی بال کئے ہوئے تھے چہرہ گول تھا خوش پوش تھی اس لیے اچھی لگتی تھی میری بیوی سے چند ملاقاتوں ہی میں دوستی ہو گئی چنانچہ ہم ان کے ہاں اکثر جانے لگے وہ دونوں میاں بیوی بھی ہر دوسرے تیسرے روز ہمارے ہاں آ جاتے تھے اور دیر تک بیٹھے رہتے تھے۔

ہم جب بھی ساوک کے ہاں گئے، ایک کدو ان کے ہاں دیکھا یہ کدو ایک تنومند آدمی تھا بہت خوش خلق، ساوک نے مجھے بتایا کہ سردار زور آور سنگھ اس کا بچپن کا دوست ہے دونوں اکٹھے پڑھتے تھے ایک ساتھ انہوں نے بی اے پاس کیا لیکن شکل و صورت کے اعتبار سے سردار زور آور سنگھ، ساوک کے مقابلے میں زیادہ معمر نظر آتا تھا۔ ساوک شاید خون کی کمی کے باعث بہت ہی چھوٹا معلوم ہوتا تھا ایریا لگتا تھا کہ اس کی عمر اٹھارہ برس سے زیادہ نہیں، لیکن سردار زور آور سنگھ چالیس کے اوپر معلوم ہوتا تھا۔

سردار زور آور سنگھ کنوارا تھا۔ جنگ کا زمانہ تھا اس نے گورنمنٹ سے کئی تھیکے لے رکھے تھے اس کا باپ بہت پرانا گورنمنٹ کنٹریکٹر تھا لیکن باپ بیٹے میں غنتی نہیں تھی سردار زور آور سنگھ آزاد خیال تھا لیکن وہ اپنے باپ ہی کے ساتھ رہتا تھا پر وہ ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے تھے البتہ اس کی ماں اس سے بہت پیار کرتی تھی جیسے وہ چھوٹا سا بچہ ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ماں کا اکلوتا لڑکا تھا تین لڑکیاں تھیں، وہ اپنے گھر میں آباد ہو چکی تھیں اب اس کی خواہش تھی کہ وہ شادی کر لے اور اس کے کیچے کو ٹھنڈک پہنچائے، مگر وہ اس کے متعلق بات کرنے کے لیے تیار

ہوئی ہے خدا معلوم مجھے کیوں بال کٹوانے یا ڈنٹیں رہتے۔۔۔۔۔ یہ سلسلہ ہے ہی کچھ واہیات۔۔۔۔۔ ایک گھنٹہ نائی کے سامنے سر نیوٹھائے بیٹھے رہو۔ وہ اپنی خرافات بکتا رہے اور آپ مجبوراً کان سمیٹے سنتے رہیں۔۔۔۔۔ فلاں ایکٹرس ایسی ہے فلاں ایکٹرس ویسی ہے، امریکہ نے ایٹم بم ایجاد کر لیا ہے روس کے پاس اس کا بہت ہی ٹکڑا جواب موجود ہے یہ ایٹلی کون ہے؟ اور وہ مسولینی کہاں گیا؟ اب میں اگر اس سے کہوں کہ جہنم میں گیا ہے تو وہ ضرور پوچھتا کہ صاحب کیسے گیا، کس راستے سے گیا۔ کون سے جہنم میں گیا۔“

میری اتنی لمبی چوڑی بات سن کر سردار زور آور سنگھ نے اپنی سفید پگڑی اتاری۔۔۔۔۔ مجھے سخت حیرت ہوئی اس لیے کہ اس کے کیس نڈا رو تھے ان کے بجائے ہلکے خشخشی بال تھے لیکن وہ پگڑی کچھ اس انداز سے باندھتا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے کیس ہیں اور ثابت و سالم ہیں۔

بڑی صفائی سے پگڑی اتار کر اس نے میری تپائی پر رکھی اور مسکرا کر کہا ”میں تو اس سے بڑے بال کبھی برداشت نہیں کر سکتا“

میں نے اس کے بالوں کے متعلق کوئی بات نہ کی، اس لیے کہ میں نے مناسب خیال نہ کیا۔ اس نے بھی ان کے متعلق کوئی بات نہ چھیڑی پگڑی تپائی پر رکھ دینے کے بعد اس نے صرف اتنا کہا تھا ”میں تو اس سے بڑے بال کبھی برداشت نہیں کر سکتا“ اس کے بعد اس نے گفتگو کا موضوع بدل دیا اور کہا ”منو صاحب! خورشید کے لیے آپ کچھ کھجے؟“

میں کچھ نہ سمجھا ”کون خورشید؟“

سردار زور آور سنگھ نے گلڑی اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لی ”خورشید کا پڑیا کے لیے“

”میں ان کی کیا خدمت کر سکتا ہوں“

”اس کو گانے کا بہت شوق ہے“

”مجھے معلوم نہیں کہ خورشٹ گاتی ہے“ کیا گاتی ہیں؟

سردار زور آور سنگھ نے خورشٹ کی گائیکی کے بارے میں اتنی تعریف کی کہ مجھے سب مبالغہ معلوم ہوا ”منلو صاحب بہت اچھی آواز پاتی ہے۔ خصوصاً خمیری ایسی اچھی گاتی ہے کہ آپ وجد میں آ جائیں گے آپ کو ایسا معلوم ہو گا کہ خان صاحب عبدالکریم کو سن رہے ہیں اور لطف یہ کہ خورشید نے کسی کی شاگردی نہیں کی۔۔۔۔۔ بس جو ملا ہے قدرت سے ملا ہے، آپ آج شام کو آئیے۔۔۔۔۔ مسٹر منلو بھی ضرور تشریف لائیں۔ میں خورشید کو بلاؤں گا آپ ذرا اسے سنیں گے۔“

میں نے کہا ”ضرور۔۔۔۔۔ ضرور۔۔۔۔۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ گاتی ہیں۔“

سردار زور آور سنگھ نے سفارش کے طور پر کہا ”آپ ریڈیو اسٹیشن میں ہیں میں چاہتا ہوں کہ خورشید کو ہر مہینے کچھ پروگرام مل جایا کریں روپے کی اس کو کوئی خواہش نہیں ہے۔“

”لیکن اگر ان کو پروگرام ملے گا تو معاوضہ بھی ضرور ملے گا گورنمنٹ ان کا معاوضہ کس کھاتے میں ڈالے گی؟“

یہ سن کر سردار زور آور سنگھ مسکرایا ”تو ٹھیک ہے لیکن اسے پروگرام ضرور

دلو اپنے گا۔۔۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ سننے والے اسے بہت پسند کریں گے۔“
 اس گفتگو کے بعد ہم تیسرے روز ساوک کے ہاں گئے وہ موجود نہیں تھا لیکن
 ڈرائنگ روم میں سردار زور اور سنگھ سگریٹ پی رہا تھا پارسیوں میں سگریٹ پینا منع
 ہے، سنگھ بھی سگریٹ نہیں پیتے لیکن وہ بڑے اطمینان اور ٹھٹھا سے کش پہ کش لے
 رہا تھا میں اور میری بیوی کمرے میں داخل ہوئے تو اس نے سگریٹ پینا بند کر دیا
 الٹش ٹرے میں اس کی گردن مروڑ کر اس نے ہمیں خالص اسلامی انداز میں سلام
 کیا اور کہا ”خورشید کی طبیعت آج کچھ ساڑھی ہے۔“

خورشید کچھ دیر کے بعد آئی میں نے محسوس کیا کہ اس کی طبیعت قطعاً ساڑھی نہیں
 ہے میں نے اس سے پوچھا تو اس نے اپنے مولے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا کر
 کے کہا ”ذرا زکام تھا“

مگر اس کو زکام نہیں تھا سردار زور اور سنگھ نے بڑے زوردار انداز میں خورشید
 سے اس کا حال پوچھا، زکام کے لیے کم از کم دس دوائیں تجویز کیں، پانچ ڈاکٹروں
 کے حوالے دیئے، مگر وہ خاموش رہی، جیسے وہ اس قسم کی بکواس سننے کی عادی ہے
 اتنے میں خورشید کا خاوند ساوک کا پڑیا آگیا۔ دفتر میں کام کی زیادتی کی وجہ سے
 اسے دیر ہو گئی تھی مجھ سے اور میری بیوی سے اس نے معذرت چاہی، سردار زور
 اور سنگھ سے کچھ دیر مذاق کیا اور ہم سے چند منٹ کی رخصت لے کر اندر چلا گیا
 اس لیے کہ اسے اپنی بچی کو دیکھنا تھا۔

اس کی پلوٹھی کی بچی بہت پیاری تھی میاں بیوی کی بس یہی ایک اولاد تھی قریباً
 ڈیڑھ برس کی تھی۔ رنگ باپ کی طرح زرد۔۔۔۔۔ کچھ نقش ماں پر تھے۔ باقی

معلوم نہیں کس کے تھے بہت ہنس مکھ تھی ساوک اس کو گود میں اٹھا کر لایا اور ہمارے پاس بیٹھ گیا اس کو اپنی پچی سے بے حد پیار تھا دفتر سے واپس آ کر وہ سارا وقت اس کے ساتھ کھیلتا رہتا میرا خیال ہے قریب قریب ہر فتنے وہ اس کے لئے کھلنے لگتا تھا شیشیوں والی بڑی الماری تھی جو ان کھلونوں سے بھری ہوئی تھی۔

سردار زور آور سنگھ کے متعلق بات چھڑی تو ساوک نے اس کی بہت تعریف کی اس نے مجھ سے اور میری بیوی سے کہا ”سردار زور آور میرا بہت پرانا دوست ہے ہم دونوں لنگوئے ہیں اس کے والد صاحب اور میرے والد صاحب اسی طرح لنگوئے تھے دونوں اکٹھے پڑھا کرتے تھے پہلی جماعت سے لے کر اب تک ہم دونوں ہر روز ایک دوسرے سے ملتے رہے ہیں بعض اوقات تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم سکول ہی میں پڑھ رہے ہیں۔“

سردار زور آور سنگھ مسکراتا رہا اس کے سر پر سکھوں کی بہت بڑی پلاڑی تھی، مگر مجھے اس کے ہوتے ہوئے اس کے سر کے ”خنسی بال“ نظر آ رہے تھے اور مجھے اپنے سر پر اپنے بالوں کا بو جھ محسوس ہو رہا تھا۔

سردار زور آور سنگھ کے پیہم اصرار پر خورشید نے باجامنگ کر ہمیں گانا سنایا وہ کن سری تھی لیکن خورشید اس کے خاوند اور سردار زور آور سنگھ کی خاطر مجھے اس کے گانے کی مجبوراً تعریف کرنی پڑی میں نے صرف اتنا کہا ”ماشاء اللہ آپ خوب گاتی ہیں“ سردار زور آور سنگھ نے بڑے زور سے تالی بجائی اور کہا ”خورشید! آج تو تم نے کمال کر دیا ہے“ پھر مجھ سے مخاطب ہوا ”اس کو آفتاب موسیقی کا خطاب مل چکا ہے منو صاحب!“

میں نے تو کچھ نہ کیا لیکن میری بیوی نے پوچھا ”کب؟“
 سردار زور آورنگھ نے کہا ”اخبار کا وہ کٹنگ لانا“
 خورشید اخبار کا کٹنگ لانی کوئی خوشامدی قسم کا رپورٹر تھا جس نے چھ مہینے پہلے
 ایک پرائیویٹ محفل میں خورشید کا گانا سن کر اسے آفتاب موسیقی کا خطاب عطا فرمایا
 تھا میں یہ کٹنگ پڑھ کر مسکرایا اور شرارتنا خورشید سے کہا ”آپ کا یہ خطاب غلط ہے“
 سردار زور آورنگھ نے مجھ سے پوچھا ”کیوں؟“
 میں نے پھر شرارتنا کہا ”عورت کے لیے آفتاب نہیں۔۔۔۔۔ آفتاب ہونا
 چاہیے“

میرا مذاق سب کے سر پر سے گزر گیا میں نے خدا کا شکر کیا، کیونکہ یہ مذاق
 کرنے کے بعد میں نے فوراً ہی سوچا کہ اور کوئی نہیں تو سردار زور آورنگھ ضرور اس
 کو سمجھ جائے گا، مگر وہ مسکرایا ”یہ اخبار والے ہمیشہ غلط بیان لکھتے ہیں آفتاب کی جگہ
 آفتاب ہونا چاہیے تھا آپ بالکل صحیح فرماتے ہیں۔“
 میں نے کچھ اور نہ کہا، اس لیے کہ مجھے احساس تھا کہ کہیں میرا مذاق فاش نہ ہو
 جائے۔

سباک کچھ اور ہی خیالات میں غرق تھا اس کو سردار زور آورنگھ کی دوستی کے
 واقعات یاد آ رہے تھے ”مسٹر منلو! ایسا دوست مجھے کبھی نہیں ملے گا اس نے ہمیشہ
 میری مدد کی ہے ہمیشہ میرے ساتھ انتہائی خلوص برتا ہے پچھلے دنوں میں ہسپتال
 میں بیمار تھا اس نے نرسوں سے بڑھ کر میری خدمت کی میرے گھر بار کا خیال رکھا
 خورشید اکیلی گھر جاتی، مگر اس نے ہر طرح اس کی دلجوئی کی میری بچی کو گھنٹوں کھلاتا

رہا اس کے علاوہ میرے پاس بیٹھ کر کئی اخبار پڑھ کر سناتا رہا میں اس کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔“

یہ سن کر سردار زور آور سنگھ مسکرایا اور خورشید سے مخاطب ہوا ”خورشید آج تمہارا خاوند بہت سنی مینٹل ہو رہا ہے۔۔۔۔ میں نے کیا کہا تھا جو یہ میری اتنی تعریف کر رہا ہے۔“

ساوک نے کہا ”بکواس نہ کرو۔۔۔۔۔ تمہاری تعریف میں کبھی نہیں سکتا میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ تمہاری دوستی پر مجھے ناز ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ بچپن سے لے کر اب تک تم ایک سے رہے ہو۔ میرے ساتھ تمہارے سلوک میں کبھی فرق نہیں آیا“

میں نے سردار زور آور سنگھ کی طرف دیکھا وہ یہ تعریفی کلمات یوں سن رہا تھا جیسے ریڈیو سے خبریں جب ساوک بول چکا تو اس نے مجھ سے پوچھا ”تو خورشید کو پروگرام مل جائیں گے نا؟“

میں نے چونک کر جواب دیا ”جی۔۔۔۔ میں کوشش کروں گا“
سردار زور آور سنگھ نے ذرا حیرت سے کہا ”کوشش؟ یعنی ان کے لئے پروگرام حاصل کرنے کے لیے آپ کو کوشش کرنی پڑے گی آپ بھی کمال کرتے ہیں۔۔۔۔۔ کل صبح ان کو اپنے ساتھ لے جائے میرا خیال ہے ان کا گانا سنتے ہی میوزک ڈائریکٹر اسی مینیجمنٹ میں ان کو کم از کم دو پروگرام دے دے گا۔“

میں نے اس کی دل شکنی مناسب نہ سمجھی اور کہا ”یتھینا!“
لیکن خورشید نے سردار زور آور سے کہا ”میں صبح نہیں جاسکتی بے بی صبح کو

میرے بغیر گھر میں نہیں رہ سکتی دوپہر کو البتہ جاسکتی ہوں“
 سردار زور آورنگھ مجھ سے مخاطب ہوا ”منلو صاحب! واقعی بچی اس کو صبح بہت
 تنگ کرتی ہے میں کسی روز خورشید کو دوپہر کے وقت ریڈیو اسٹیشن لے آؤں گا“
 خورشید کو دوپہر کے وقت ریڈیو اسٹیشن لانے کی نوبت نہ آئی کیونکہ میں نے
 دوسرے روز ہی ایک دم ارادہ کیا کہ میں دلی چھوڑ کر بمبئی چلا جاؤں گا، چنانچہ میں
 اس سے اگلے دن استعفیٰ دے کر بمبئی روانہ ہو گیا میری بیوی مجھ سے کچھ دن بعد
 چلی آئی ہم سبز خورشید کا پڑیا اور سردار زور آورنگھ کو بھول گئے۔

میں ایک فلم کمپنی میں ملازم تھا بیماری کے باعث اتفاق سے ایک روز میں
 وہاں نہ گیا دوسرے روز میں وہاں پہنچا تو گیٹ کیپر نے مجھے ایک کاغذ دیا کہ کل
 ایک صاحب آپ سے ملنے یہاں آئے تھے وہ یہ دے گئے ہیں میں نے رقم پڑھا
 سردار زور آورنگھ کا تھا مختصر سی تحریر تھی، میں اور میری بیوی آپ سے ملنے یہاں
 آئے مگر آپ موجود نہیں تھے۔۔۔ ہم تاج ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔۔۔ اگر آپ
 تشریف لائیں تو ہمیں بڑی خوشی ہوگی۔۔۔ سبز منلو کو ضرور ساتھ لائے گا

کمرے کا نمبر وغیرہ درج تھا میں اور میری بیوی اسی شام ٹیکسی میں تاج ہوٹل
 گئے کمرہ تلاش کرنے میں کوئی وقت نہ ہوئی سردار زور آورنگھ وہاں موجود تھا ہم
 جب اندر کمرے میں داخل ہوئے تو وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہنسی بالوں میں
 کنگھی کر رہا تھا بڑے تپاک سے ملا میری بیوی اس کی بیوی کو دیکھنے کے لئے بے

قرار تھی، چنانچہ اس نے پوچھا ”سردار صاحب! آپ کی سز کہاں ہیں؟“
 سردار زور آورنگھ مسکرایا ”ابھی آتی ہیں۔۔۔ ہاتھ روم میں ہیں“

اس نے یہ کہا اور دوسرے کمرے سے خورشٹ نمودار ہوئی میری بیوی اٹھ کر
 اس سے گھٹلی اور سب سے پہلا سوال اس سے یہ کیا ”پگھی کیسی ہے خورشید!“
 خورشٹ نے جواب دیا ”اچھی ہے“
 ”پھر میری بیوی نے اس سے پوچھا ساوک کہاں ہیں؟“
 خورشٹ نے کوئی جواب نہ دیا جب وہ اور میری بیوی پاس پاس بیٹھ گئیں تو
 میں نے سردار زور اور سنگھ سے پوچھا ”سردار صاحب! آپ اپنی بیوی کو تو باہر
 نکالے“
 سردار زور اور سنگھ مسکرایا ”خورشٹ کی طرف دیکھ کر اس نے کہا“ خورشید میری
 بیوی کو باہر نکالو۔
 خورشٹ میری بیوی سے مخاطب ہو کر مسکرائی ”میں نے سردار زور اور سنگھ سے
 شادی کر لی ہے ہم یہاں نئی مون منانے آئے ہیں“
 میری بیوی نے یہ سنا تو اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کہے اٹھی اور میرا ہاتھ پکڑ
 کر کہا ”چلے سعادت صاحب!“ اور ہم کمرے سے باہر تھے خدا معلوم سردار زور
 اور سنگھ اور خورشٹ نے ہماری اس بد تمیزی کے متعلق کیا کہا ہوگا۔

28 جولائی 1950ء

☆☆☆☆☆☆

خوشیا

خوشیا سوچ رہا تھا

بنواری سے کالے تمباکو والا پان لے کر وہ اس کی دکان کے ساتھ اس سنگین
چبوترے پر بیٹھا تھا جو دن کے وقت مائروں اور موٹروں کے مختلف پرزوں سے بھرا
ہوتا ہے۔ رات کو ساڑھے آٹھ بجے کے قریب موٹر کے پرزے اور مائریں بچنے
والوں کی یہ دکان بند ہو جاتی ہے اور اس کا سنگین چبوترہ خوشیا کے لیے خالی ہو جاتا
ہے۔

وہ کالے تمباکو والا پان آہستہ آہستہ چبا رہا تھا اور سوچ رہا تھا پان کی گاڑھی
تمباکو ملی پیک اس کے دانتوں کی رینخوں سے نکل کر اس کے منہ میں ادھر ادھر پھسل
رہی تھی اور اسے ایسا لگتا تھا کہ اس کے خیال دانتوں تلے پس کر اس کی پیک میں
گھل رہے ہیں شاید یہی وجہ ہے کہ وہ اسے پھینکنا نہیں چاہتا تھا۔

خوشیا پان کی پیک منہ میں پلپلا رہا تھا اور اس واقعہ پر غور کر رہا تھا جو اس کے
ساتھ ابھی ابھی پیش آیا تھا یعنی آدھ گھنٹہ پہلے

وہ اس سنگین چبوترے پر حسب معمول بیٹھنے سے پہلے کھیٹ واڑی کی
پانچویں گلی میں گیا تھا منگھور سے جوئی چھو کر کانتا آئی تھی اس گلی کے نکل پر رہتی
تھی خوشیا سے کسی نے کہا تھا کہ وہ اپنا مکان تبدیل کر رہی ہے چنانچہ وہ اسی بات کا
پتہ لگانے کے لیے وہاں گیا تھا۔

کانتا کی کھولی کا دروازہ اس نے کھٹکھٹایا اندر سے آواز آئی ”کون ہے؟“ اس

پر خوشیا نے کہا ”میں خوشیا“

آواز دوسرے کمرے سے آئی تھی تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا خوشیا اندر داخل ہوا جب کانٹا نے دروازہ اندر سے بند کیا تو خوشیا نے مڑ کر دیکھا اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے کانٹا کو بالکل نیگا دیکھا بالکل نیگا ہی سمجھو کیونکہ وہ اپنے انگ کو صرف ایک تو لیے سے چھپائے ہوئے تھی چھپائے ہوئے بھی نہیں کہا جاسکتا کیونکہ چھپانے کی جتنی چیزیں ہوتی ہیں وہ تو سب کی سب خوشیا کی حیرت زدہ آنکھوں کے سامنے تھیں۔

”کہو خوشیا کیسے آئے؟۔۔۔۔ میں بس اب نہانے والی ہی تھی۔
 ٹیٹو۔۔۔۔۔ ٹیٹو۔۔۔۔۔ باہر والے سے اپنے لیے چائے کے لیے تو کہہ آئے
 ہوتے۔۔۔۔۔ جانتے تو ہو وہ موارا مایہاں سے بھاگ گیا ہے۔“

خوشیا جس کی آنکھوں نے کبھی عورت کو یوں اچانک طور پر نیگا نہیں دیکھا تھا بہت گھبرا گیا اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہے؟ اس کی نظریں جو ایک دم عریانی سے دو چار ہو گئی تھیں اپنے آپ کو کہیں چھپانا چاہتی تھیں۔

اس نے جلدی جلدی صرف اتنا کہا ”جاؤ۔۔۔ جاؤ تم نہالو“ پھر ایک دم اس کی زبان کھل گئی ”پر جب تم نکلی تھیں تو دروازہ کھولنے کی کیا ضرورت تھی؟۔۔۔۔۔ اندر سے کہہ دیا ہوتا میں پھر آ جاتا۔۔۔۔۔ لیکن جاؤ۔۔۔۔۔ تم نہالو“
 کانٹا مسکرائی ”جب تم نے کہا خوشیا ہے تو میں نے سوچا کیا ہرج ہے اپنا خوشیا
 ہی تو ہے آنے دو۔۔۔۔۔“

کانٹا کی یہ مسکراہٹ ابھی تک خوشیا کے دل و دماغ میں تیر رہی تھی اس وقت

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

بھی عورت کے جسم تک پہنچ جاتی ہیں اور جو پر ماتما جانے خیال ہی خیال میں کہاں کہاں پہنچ جاتا ہے۔ لیکن وہ ذرا بھی نہ گھبرائی اور۔۔۔۔۔ اور اس کی آنکھیں ایسا سمجھ لو کہ ابھی لائڈری سے وصل کر آئی ہیں۔۔۔۔۔ اس کو جوڑی سی لاج تو آئی چاہیے تھی ذرا سی سرخی تو اس کے دیدوں میں پیدا ہونی چاہیے مان لیا کسی تھی پر کسبیاں یوں نگلی تو نہیں کھڑی ہو جاتیں۔

دس برس اس کو دلائی کرتے ہو گئے تھے اور ان دس برسوں میں وہ پیشہ کرانے والی لڑکیوں کے تمام رازوں سے واقف ہو چکا تھا مثال کے طور پر اسے یہ معلوم تھا کہ پائے دھونی کے آخری سرے پر جو چھو کری ایک نوجوان لڑکے کو بھائی بنا کر رہتی ہے اس لیے اچھوت کنیا کا ریکارڈ ”کا ہے کرتا مورکھ پیار، پیار، پیار“ اپنے ٹوٹے ہوئے باجے پر بھایا کرتی ہے کہ اسے اشوک مار سے بہت بری طرح عشق ہے کئی مغلپے لوٹے اشوک مار سے اس کی ملاقات کرانے کا جھانسدے کر اپنا الو سیدھا کر چکے تھے اسے یہ بھی معلوم تھا کہ داور میں جو پنچا بن رہتی ہے صرف اس لیے کوٹ پتلون پہنتی ہے کہ اس کے ایک یار نے اس سے کہا تھا کہ تیری ٹانگیں تو بالکل اس انگریز ایکٹریس کی طرح ہیں جس نے ”مرا کو عرف خون تمنا“ میں کام کیا تھا یہ فلم اس نے کئی بار دیکھا اور جب اس کے یار نے کہا کہ مارلین ڈیٹریج اس لیے پتلون پہنتی ہے کہ اس کی ٹانگیں بہت خوبصورت ہیں اور ان ٹانگوں کا اس نے دو لاکھ کا بیمہ کر رکھا ہے تو اس نے بھی پتلون پہننا شروع کر دی جو اس کے چوتروں میں بہت پھنس کر آتی تھی اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ”مزگاؤں“ والی دکھشٹی چھو کری صرف اس لیے کالج کے خوبصورت لوٹڈوں کو پھانستی ہے کہ اسے

ایک خوبصورت بچے کی ماں بننے کا شوق ہے اس کو یہ بھی پتہ تھا کہ وہ کبھی اپنی خواہش پوری نہ کر سکے گی اس لیے کہ بانجھ ہے اور اس کا لی مدراس کی بابت جو ہر وقت کانوں میں ہیرے کی ”بوٹیاں“ پہن رہتی ہے اس کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ اس کا رنگ کبھی سفید نہیں ہوگا اور وہ ان دواؤں پر بیکار رہے یہ برباد کر رہی ہے جو آئے دن خریدتی رہتی ہے۔

اس کو ان تمام چھو کر یوں کا اندر باہر کا حال معلوم تھا جو اس کے حلقے میں شامل تھیں مگر اس کو یہ خبر نہ تھی کہ ایک روز کا دنٹا ماری جس کا اصلی نام اتنا مشکل تھا کہ وہ عمر بھر یاد نہیں کر سکتا تھا اس کے سامنے نگلی کھڑی ہو جائے گی اور اس کو زندگی کے سب سے بڑے تعجب سے دو چار کرائے گی۔

سوچتے سوچتے اس کے منہ میں پان کی پیک اس قدر جمع ہو گئی تھی کہ اب وہ مشکل سے چھالیا کے ان ننھے ننھے ریزوں کو چبا سکتا تھا جو اس کے دانتوں کی رینوں میں سے ادھر ادھر پھسل کر نکل جاتے تھے۔

اس کے نگ مانتے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں نمودار ہو گئی تھیں جیسے ململ میں پنیر کو آہستہ سے دبا دیا گیا ہے۔۔۔۔۔ اس کے مردانہ وقار کو دھکا سا پہنچتا تھا۔ جب وہ کانٹا کے ننگے جسم کو اپنے تصور میں لاتا تھا اسے محسوس ہوتا تھا جیسے اس کا ایمان ہوا ہے۔

ایک دم اس نے اپنے دل میں کہا ”بھئی یہ ایمان نہیں ہے تو کیا ہے۔۔۔۔۔ یعنی ایک چھو کر ی نگ دھڑنگ تمہارے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے اور کہتی ہے کہ اس میں حرج ہی کیا ہے؟ تم خوشیا ہی تو ہو۔۔۔۔۔ خوشیا نہ ہوا،

سالادہ ہلا ہو گیا جو اس کے بستر پر ہر وقت اوتھتا رہتا ہے۔۔۔ اور کیا؟“
 اب اسے یقین ہونے لگا کہ سچ مچ اس کی چٹک ہوئی ہے وہ مرد تھا اور اس کو
 اس بات کی غیر محسوس طریق پر توقع تھی کہ عورتیں خواہ شریف ہوں یا بازاری اس کو
 مرد ہی سمجھیں گی اور اس کے اور اپنے درمیان وہ پردہ قائم رکھیں گی جو ایک مدت
 سے چلا آ رہا ہے وہ تو صرف یہ پتہ لگانے کے لیے کانٹا کے یہاں گیا تھا کہ وہ کب
 مکان تبدیل کر رہی ہے؟ اور کہاں جا رہی ہے؟ کانٹا کے پاس اس کا جانا یکسر
 بونس سے متعلق تھا اگر خوشیاں کانٹا کی بابت سوچتا کہ جب وہ اس کا دروازہ
 کھٹکھٹائے گا تو وہ اندر کیا کر رہی ہوگی تو اس کے تصور میں زیادہ سے زیادہ اتنی
 باتیں آ سکتی تھیں۔

سر پر پٹی باندھے لیٹے رہی ہوگی
 بلے کے بالوں میں سے پسوند کال رہی ہوگی
 اس پوڈر سے اپنی بغلوں کے بال اڑا رہی ہوگی جو اتنی باس مارتا تھا کہ خوشیا
 کی ناک برداشت نہیں کر سکتی تھی
 پلنگ پر اکیلی بیٹھی تاش پھیلائے شینس کھیلنے میں مشغول ہوگی
 بس اتنی چیزیں تھیں جو اس کے ذہن میں آتیں گھر میں وہ کسی کو رکھتی نہیں تھی
 اس لیے اس بات کا خیال ہی نہیں آ سکتا تھا پر خوشیا نے تو یہ سوچا ہی نہیں تھا وہ وکام
 سے وہاں گیا تھا کہ اچانک کانٹا۔۔۔ یعنی کپڑے پہننے والی کانٹا۔۔۔ مطلب
 یہ کہ وہ کانٹا جس کو وہ ہمیشہ کپڑوں میں دیکھا کرتا تھا اس کے سامنے بالکل ننگی
 کھڑی ہو گئی۔۔۔۔۔ بالکل ننگی ہی سمجھو یہ کیونکہ ایک چھوٹا سا تولیہ سب کچھ تو

چھپائیں سنا خوشیا کو یہ نظارہ دیکھ کر ایسا محسوس ہوا تھا جیسے چھٹکا اس کے ہاتھ میں رہ گیا ہے اور کیلے کا گودا پرچ کر اس کے سامنے آگرا ہے نہیں اسے کچھ اور ہی محسوس ہوا تھا جیسے۔۔۔۔۔ جیسے وہ خود نکا ہو گیا ہے اگر بات یہاں تک ہی ختم ہو جاتی تو کچھ بھی نہ ہوتا خوشیا اپنی حیرت کو کسی نہ کسی حیلے سے دور کر دیتا مگر یہاں مصیبت یہ ان پڑی تھی کہ اس لونڈیا نے مسکرا کر کہا تھا ”جب تم نے کہا، خوشیا ہے، تو میں نے سوچا اپنا خوشیا ہی تو ہے، آنے دو“ یہ بات اسے کھائے جا رہی تھی۔

”سانی مسکرا رہی تھی“۔۔۔۔۔ وہ بار بار بربڑاتا جس طرح کانٹا نکلی تھی اسی طرح اس کی مسکراہٹ خوشیا کو نکلی نظر آتی تھی یہ مسکراہٹ ہی نہیں، اسے کانٹا کا جسم بھی اس حد تک نظر آیا تھا گویا اس پر رندا پھیرا ہوا ہے۔

اسے بار بار بچپن کے وہ دن یاد آ رہے تھے جب پڑوس کی ایک عورت اس سے کہا کرتی تھی ”خوشیا بیٹا! جادوڑ کے جا، یہ بانٹی پانی سے بھرا“ جب وہ بانٹی بھر کے لایا کرتا تھا تو وہ دھوتی سے بنائے ہوئے پردے کے پیچھے سے کہا کرتی تھی ”اندر آ کے یہاں میرے پاس رکھ دے میں نے منہ پر صابن ملا ہوا ہے مجھے کچھ جھٹائی نہیں دیتا“ وہ دھوتی کا پردہ ہٹا کر بانٹی اس کے پاس رکھ دیا کرتا تھا اس وقت صابن کے جھاگ میں لپٹی ہوئی نکلی عورت اسے نظر آیا کرتی تھی مگر اس کے دل میں کسی قسم کا پہچان پیدا نہیں ہوتا تھا۔

بھئی میں اس وقت بچہ تھا بالکل بھولا بھالا بچے اور مرد میں بہت فرق ہوتا ہے بچوں سے کون پردہ کرتا ہے مگر اب تو میں پورا مرد ہوں میری عمر اس وقت اٹھائیس برس کے قریب ہے اور اٹھائیس برس کے جوان آدمی کے سامنے تو کوئی بوڑھی

عورت بھی نکلی کھڑی نہیں ہوتی۔

کانتا نے اسے کیا سمجھا تھا؟ کیا اس میں وہ تمام باتیں نہیں تھیں جو ایک نوجوان مرد میں ہوتی ہیں؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ کانتا کو یک بیک تنگ دھڑنگ دیکھ کر بہت گھبرا گیا تھا۔ لیکن چور ٹکا ہوں سے کیا اس نے کانتا کی ان چیزوں کا جائزہ نہیں لیا تھا جو روزانہ استعمال کے باوجود اصلی حالت پر قائم تھیں اور کیا تعجب کہ کے مرد ہوتے ہونے اس کے دماغ میں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ دس روپے میں کانتا بالکل مہنگی نہیں اور دسہرے کے روز بنک کا وہ منشی جو دور روپے کی رعایت نہ ملنے پر واپس چلا گیا تھا بالکل گدھا تھا اور۔۔۔۔۔ ان کے سب کے اوپر، کیا ایک لمسے کے لیے اس کے تمام پٹھوں میں ایک عجیب قسم کا کھنچاؤ پیدا نہیں ہو گیا تھا اور اس نے ایک ایسی انگڑائی نہیں لینا چاہی تھی جس سے اس کی ہڈیاں تک چٹختے لگیں؟ پھر کیا وجہ تھی کہ منگھور کی اس سانولی چھوکری نے اس کو مرد نہ سمجھا اور صرف۔۔۔۔۔ صرف خوشیا سمجھ کر اس کو اپنا سب کچھ دیکھنے دیا؟

اس نے غصے میں آکر پان کی گاڑھی پیک تھوک دی جس نے فٹ پاتھ پر کئی تیل بولے بنا دیئے پیک تھوک کر وہ اٹھا اور آرام میں بیٹھ کر اپنے گھر چلا گیا۔

گھر میں اس نے نہاد تھوکر نئی دھوتی پہنی جس بلڈنگ میں رہتا تھا اس کی ایک دکان میں سیلون تھا اس کے اندر جا کر اس نے آئینے کے سامنے بالوں میں کنگھی کی پھر فوراً ہی کچھ خیال آیا تو کرسی پر بیٹھ گیا اور بڑی سنجیدگی سے اس نے ڈاڑھی مونڈنے کے لیے حجام سے کہا آج چونکہ دوسری مرتبہ وہ ڈاڑھی منڈوا رہا تھا اس لیے حجام نے کہا ”ارے بھی خوشیا بھول گئے کیا؟ صبح میں نے ہی تو تمہاری

ڈاڑھی موندی تھی اس پر خوشیا نے بڑی متانت سے ڈاڑھی پر الٹا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، ”کھوتی اچھی طرح نہیں نکلی۔۔۔“

اچھی کھوتی نکلو کر اور چہرے پر پو ڈر ملو کر وہ سیلون سے باہر نکلا سامنے ٹیکسیوں کا اڈہ تھا جسے کے مخصوص انداز میں اس نے ”اچھی چھی“ کر کے ایک ٹیکسی ڈرائیور کو اپنی طرف متوجہ کیا اور انہی کے اشارے سے اسے ٹیکسی لانے کے لیے کہا۔

جب وہ ٹیکسی پر بیٹھ گیا تو ڈرائیور نے مز کر اس سے پوچھا ”کہاں جانا ہے صاحب!“

ان چار لفظوں نے خاص طور پر ”صاحب“ نے خوشیا کو بہت مسرور کیا مسکرا کر اس نے بڑے دوستانہ لہجے میں جواب دیا ”بتائیں گے پہلے تم“ پسیرا باؤس کی طرف چلو۔۔۔۔۔ ٹیکسٹن روڈ سے ہوتے ہوئے۔۔۔۔۔

ڈرائیور نے میٹر کی لال جھنڈی کا سر نیچے کی طرف دبا دیا سن ہوئی اور ٹیکسی نے ٹیکسٹن روڈ کا رخ کیا ٹیکسٹن روڈ کا جب آخری سرا آ گیا تو خوشیا نے ڈرائیور کو ہدایت دی ”بائیں طرف موڑ لو۔“

ٹیکسی بائیں طرف مڑ گئی ابھی ڈرائیور نے گیز بھی نہ بدلتا تھا کہ خوشیا نے کہا ”یہ سامنے والے کھمبے کے پاس روک لینا ذرا“ ڈرائیور نے عین کھمبے کے پاس ٹیکسی کھڑی کر دی خوشیا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور ایک پان والے کی دکان کی طرف بڑھ گیا یہاں سے اس نے ایک پان لیا اور اس آدمی سے جو کہ دکان کے پاس کھڑا تھا چند باتیں کیں اور اسے اپنے ساتھ ٹیکسی پر بٹھا کر ڈرائیور سے کہا ”سیدھے لے

چلو!

دیر تک ٹیکسی چلتی رہی خوشیا نے جدھر اشارہ کیا ڈرائیور نے اوٹھر بیٹڈل پھیر دیا مختلف پر رونق بازاروں میں سے ہوتے ہوئے ٹیکسی ایک نیم روشن گلی میں داخل ہوئی جس میں آمد و رفت بہت کم تھی کچھ لوگ سڑک پر بستر جمائے لیٹے تھے ان میں سے کچھ بڑے اطمینان سے چپی کر رہے تھے جب ٹیکسی ان چپی کرانے والوں کے آگے نکل گئی اور ایک کاسٹھ کے بگلہ نما مکان کے پاس پہنچی تو خوشیا نے ڈرائیور کو ٹھہرنے کے لیے کہا ”بس اب یہاں رک جاؤ“ ٹیکسی ٹھہر گئی تو خوشیا نے اس آدمی سے جس کو وہ پان والے کی دکان سے اپنے ساتھ لایا تھا آہستہ سے کہا ”جاؤ میں یہاں انتظار کرتا ہوں“

وہ آدمی بیوقوفوں کی طرح خوشیا کی طرف دیکھتا ہوا ٹیکسی سے باہر نکلا اور سامنے چوٹی مکان میں داخل ہو گیا۔

خوشیا جم کر ٹیکسی کے گدے پر بیٹھ گیا ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھ کر اس نے جیب سے بیڑی نکال کر ساگنی اور ایک دوکش لے کر باہر سڑک پر پھینک دی وہ بہت مضطرب تھا اس لیے اسے ایسا لگا کہ ٹیکسی کا انجن بند نہیں ہوا اس کے سینے میں چونکہ پھر پھر اہٹ سی ہو رہی تھی اس لیے وہ سمجھا کہ ڈرائیور نے بل بڑھانے کی غرض سے پٹرول چھوڑ رکھا ہے چنانچہ اس نے تیزی سے کہا ”یوں بیکار انجن چالو رکھ کر تم کتنے پیسے اور بڑھا لو گے؟“

ڈرائیور نے مڑ کر خوشیا کی طرف دیکھا اور کہا ”سیٹھ انجن تو بند ہے“
جب خوشیا کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس کا اضطراب اور بھی بڑھ گیا اور اس

☆☆☆☆☆

خوشبو دار تیل

”آپ کا مزاج اب کیسا ہے؟“

”یہ تم کیوں پوچھ رہی ہو۔۔۔۔۔ اچھا بھلا ہوں۔۔۔۔۔ مجھے کیا تکلیف تھی؟“

”تکلیف تو آپ کو کبھی نہیں ہوئی۔۔۔۔۔ ایک فقط میں ہوں جس کے ساتھ کوئی نہ کوئی تکلیف یا عارضہ چننا رہتا ہے۔“

”یہ تمہاری بد احتیالیوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔۔۔۔۔ ورنہ آدمی کو کم از کم سال بھر میں دس مہینے تو تندرست رہنا چاہیے۔“

”آپ تو بارہ مہینے تندرست رہتے ہیں۔۔۔۔۔ ابھی پچھلے دنوں دو مہینے ہسپتال میں رہے۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے اب پھر آپ کا وہی جانے کا ارادہ ہو رہا ہے۔“

”ہسپتال میں جانے کا ارادہ کون کرتا ہے؟“

”آپ ایسے آدمی۔۔۔۔۔ اور کس کا دماغ پھر ہے کہ وہ بیمار ہو کر وہاں پڑ جائے اور اپنے عزیزوں کی جان کا عذاب بن جائے“

”تو گویا، میں اپنے سب رشتہ داروں کی جان کا عذاب بنا بیٹھا ہوں۔۔۔۔۔ میرا تو یہ نظریہ ہے کہ ہر رشتہ دار خود جان کا بہت بڑا عذاب ہوتا ہے۔“

”آپ کو تو رشتہ داروں کی کوئی پرواہ نہیں۔۔۔۔۔ حالانکہ وہی ہمیشہ آپ کے آڑے وقت میں کام آتے رہتے ہیں“

”کون سے آڑے وقت میں کام آتے رہے ہیں“
 ”پچھلے برس جب آپ بیمار ہوئے۔۔۔ تو کس نے آپ کے علاج پر روپیہ
 خرچ کیا تھا۔“

”مجھے معلوم نہیں۔۔۔ میرا خیال ہے تمہیں نے کیا ہوگا“
 ”آپ کا حافظہ بھی کمزور ہو گیا ہے۔۔۔ یا آپ جان بوجھ کر اپنے رشتہ
 داروں کی مدد کو فراموش کر رہے ہیں“
 ”میں اپنے کسی رشتہ دار کی امداد کا محتاج نہیں رہا اور نہ رہوں
 گا۔۔۔ اچھا خاصہ مالیتا ہوں۔۔۔ کھاتا ہوں۔۔۔ پیتا ہوں“
 جتنا کھا سکتا ہوں کھاتا ہوں۔۔۔ جتنی پی سکتا ہوں پیتا ہوں
 ”آپ کو معلوم نہیں کہ پینا حرام ہے“
 ”معلوم ہے۔۔۔ آج کل تو جینا بھی حرام ہے۔۔۔ مگر چچا غالب
 کہہ گئے ہیں۔“

مے سے غرض نشاط ہے کس رویا کو
 ایک گوند بیخودی مجھے دن رات چاہیے
 ”یہ چچا غالب کون تھے۔۔۔ زندہ ہیں یا مر گئے ہیں۔۔۔ میں نے تو
 آج پہلی مرتبہ ان کا نام سنا ہے“
 ”وہ سب کے چچا تھے۔۔۔ بہت بڑے شاعر“

”شاعروں پر خدا کی لعنت۔۔۔ بیڑا غرق کرتے ہیں لوگوں کا۔۔۔“
 ”ہیکم یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔۔۔ ان ہی کے دم سے تو زندگی کی رونق قائم

ہے۔۔۔۔۔ یہ نہ ہوں تو چاروں طرف خشکی خشکی ہی نظر آئے۔۔۔۔۔ یہ لوگ
پھول ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ صاف و شفاف پانی کے دھارے ہوتے ہیں جو
انسانوں کے ذہن کی آبیاری کرتے ہیں۔۔۔۔۔ یہ نہ ہوں تو ہماری زندگی بے
نمک ہو جائے۔“

”بے نمک ہو جائے۔۔۔۔۔ کیسے بے نمک ہو جائے۔۔۔۔۔ یہاں نمک
کی کوئی کمی ہے۔۔۔۔۔ جتنا چاہے لے لیجئے۔۔۔۔۔ اور وہ بھی سستے داموں
پر۔۔۔۔۔ ان لوگوں کو جنہیں آپ شاعر کہتے ہیں۔۔۔۔۔ میں تو چاہتی ہوں کہ ان کو
کھیوڑے کی کسی کان میں زندہ دفن کر دیا جائے تاکہ وہ بھی نمک بن جائے اور
آپ ان کو چاٹتے رہیں۔“

”یہ آج تم نے کیسے پر پرزے نکال لیے“

”پر پرزوں کے متعلق میں کچھ نہیں جانتی۔۔۔۔۔ میں تو اتنا جانتی ہوں کہ
جب آپ سے کوئی معاملے کی بات کرے تو آپ بھننا جاتے ہیں۔۔۔۔۔ معلوم
نہیں کیوں۔۔۔۔۔ میں نے کبھی آپ کی ذات پر تو حملہ نہیں کیا۔۔۔۔۔ ہمیشہ
سیدھی سادھی بات کر دی۔“

”تمہاری سیدھی باتیں ہمیشہ میزبانی ہوتی ہیں۔۔۔۔۔ میری سمجھ میں نہیں
آتا۔۔۔۔۔ تمہیں ہو کیا گیا ہے۔۔۔۔۔ دو برس سے تم ہر وقت میرے سر پر سوار
رہتی ہو۔“

”ان برسوں میں مجھے آپ نے کیا سکھ پڑایا ہے“

”بھئی معاف کرو مجھے۔۔۔۔۔ میں سونا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔ ساری رات

ہی جاگتا رہا ہوں۔“

”کیا تکلیف تھی آپ کو۔۔۔ مجھے بھی تو کچھ اس کا علم ہو“

”تمہیں اگر اس کا علم بھی ہو جائے۔۔۔ تو اس کا مددوا کیا کرو گی“

”میں تو سخت ماہل ہوں۔۔۔۔۔ کسی کام کی بھی نہیں۔۔۔ بس ایک صرف

آپ ہیں جو دنیا کی ساری حکمت جانتے ہیں“

”بھئی میں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا۔۔۔ لیکن عورت ذات ہمیشہ خود کو افضل سمجھتی ہے۔۔۔۔۔ حالانکہ وہ عام طور پر کم عقل ہوتی ہے۔“

”دیکھئے آپ طعن طرہ و زپر اتر آئے۔۔۔۔۔ یہ کہاں کی عقلمندی ہے“

”میں معافی چاہتا ہوں۔۔۔ تم نے چونکہ مجھے اکسایا تو یہ لفظ میری زبان سے نکل گئے ورنہ تم جانتی ہو کہ میں گفتگو کے معاملے میں بڑا محتاط رہتا ہوں“

”جی ہاں۔۔۔ رہتے ہوں گے۔۔۔۔۔ مجھ سے تو آپ نے ہمیشہ نوکرائیوں کا سلوک کیا۔“

”یہ سراسر بہتان ہے۔۔۔۔۔ تم تو میری ملکہ ہو“

”آپ بادشاہ کیسے بن بیٹھے۔۔۔۔۔ آپ کی سلطنت کہاں ہے“

”میری سلطنت یہ میرا گھر ہے“

”اور آپ یہاں کے شہنشاہ ہیں“

”اس میں کیا شک ہے۔۔۔۔۔ تم نے طعنا کہا ہے لیکن حقیقت میں اس سلطنت کا حکمران میں ہی ہوں“

”حکمران تو میں ہوں۔۔۔ اس لیے کہ اس گھر کا سارا بندوبست مجھے ہی کرنا

پڑتا ہے۔۔۔ سب دیکھ بھال مجھے ہی کرنا پڑتی ہے۔“

”تم میری ملکہ ہو۔۔۔۔۔ اور ملکہ کو ہاتھ پر ہاتھ دھڑے بیٹھا نہیں رہنا چاہیے۔۔۔ اپنی ملکیت کا دھیان رکھنا چاہیے۔۔۔ تم بھی یہاں کی حکمران ہو، اس لیے کہ تم اس کا نظم برقرار رکھتی ہو۔۔۔۔۔ نوکروں کی دیکھ بھال وغیرہ، اچھے سے اچھا کھانا پکوانا سارا دن پلنگ پر لیٹی آرام کرتی رہتی ہو۔“

”میں تو جو آرام کرتی ہو، سو کرتی ہوں۔۔۔۔۔ پر آپ مجھے یہ بتائیے“

”کیا؟“

”کچھ نہیں۔۔۔ آپ اس گھر کے حکمران ہیں۔۔۔۔۔ اب میں آپ سے کیا کہوں“

”تم جو کچھ کہنا چاہتی ہو، بلا خوف و خطر کہو۔۔۔۔۔ تمہیں اندیشہ کس بات کا ہے“

”کہیں جہاں پناہ بگڑ نہ جائیں“

”مذاق برطرف کرو، یہ بتاؤ تم کہنا کیا چاہتی ہو“

”کہنا تو میں بہت کچھ چاہتی ہوں۔۔۔۔۔ مگر آپ میں ٹھنڈے دل سے سننے کا مادہ ہی کہاں ہے۔“

”مادہ تو تم ہو۔۔۔۔۔ میں نہ ہوں“

”اب آپ نے وہابیات قسم کی گفتگو شروع کر دی“

”کبھی کبھی منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے ایسی باتیں بھی کر لینی چاہئیں۔۔۔۔۔ اس لیے کہ طبیعت میں انقباض پیدا نہ ہو“

”آپ کی طبیعت میں کئی دنوں سے انقباض ہے۔۔۔۔۔ سیدھے منہ کوئی بات ہی نہیں کرتے۔“

”میں تو چنگا ہوا ہوں۔۔۔۔۔ مجھے ایسی کوئی شکایت نہیں ہے ہو سکتا ہے کہ تمہارے نخس نے بہت اونچی پرواز کی ہو۔۔۔۔۔ اگر ایسا ہی ہے تو کوئی مسئلہ تجویز کر دے تا کہ تمہاری تشفی ہو جائے۔“

”میں آپ سے بحث کرنا نہیں چاہتی۔۔۔۔۔ صرف اتنا پوچھنا چاہتی ہوں“

”بھئی پوچھ لو جو کچھ پوچھنا ہے۔۔۔۔۔ مجھے اب زیادہ تنگ نہ کرو“

”آپ تو ذرا سی بات پر تنگ آ جاتے ہیں“

”یہ ذرا سی بات ہے کہ تم نے مجھ سے اتنی بکواس کرائی۔۔۔۔۔ یہی وقت میں اور کہیں صرف کرتا تو کچھ فائدہ بھی ہوتا“

”کیا فائدہ ہوتا۔۔۔۔۔ بڑے لاکھوں مالے ہیں آپ نے بغیر اس بکواس کے“

”مائے تو ہیں۔۔۔۔۔ لیکن تم یہ بتاؤ کہ کہنا کیا چاہتی ہو“

”میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ جب سے نئی نوکرائی آئی ہے، آپ کی طبیعت کیوں خراب رہنے لگی ہے۔“

”نئی نوکرائی کو کوئی بیماری ہے“

”جی نہیں۔۔۔۔۔ بیماری تو نہیں۔۔۔۔۔ لیکن میں نے اسے آج رخصت کر دیا ہے“

”کیوں۔۔۔۔۔ وہ تو بڑی اچھی تھی“

”آپ کی نظروں میں ہوگی۔۔۔۔۔ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہ بیس
روپے ماہوار میں اتنے اچھے کپڑے کیسے پہن سکتی تھی۔۔۔ بالوں میں خوشبو دار
تیل کہاں سے ڈالتی تھی۔“

”مجھے کیا معلوم“

”آپ کو سب کچھ معلوم ہے۔۔۔۔۔ آپ کے بالوں سے بھی اسی تیل کی
خوشبو آتی ہے۔۔۔۔۔ معلوم نہیں یہ تیل آپ نے کہاں چھپا رکھا ہے۔“

☆☆☆☆☆☆

دس روپے

وہ گلی کی اس نکل پر چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کے ساتھ کھیل رہی تھی اور اس کی ماں اسے چالی (بڑا مکان جس میں کوئی منزلیں اور کئی چھوٹے چھوٹے کمرے ہوتے ہیں) میں ڈھونڈ رہی تھی کشوری کو اپنی کھولی میں بٹھا کر اور باہر والے سے کافی ملی چائے لانے کے لئے کہہ کر وہ اس چالی کی تینوں منزلوں میں اپنی بیٹی کو تلاش کر چکی تھی مگر جانے وہ کہاں مر گئی تھی سنڈاس کے پاس جا کر بھی اس نے آواز دی ”اے سرتیا۔۔۔ سرتیا!“ مگر وہ تو چالی میں تھی ہی نہیں اور جیسا کہ اس کی ماں سمجھ رہی تھی اب اسے چپش کی شکایت بھی نہیں تھی وہ اپنے بغیر اس کو آرام آپکا تھا اور وہ باہر گلی کے اس نکل پر جہاں کچرے کا ڈھیر پڑا رہتا ہے چھوٹی چھوٹی لڑکیوں سے کھیل رہی تھی اور ہر قسم کے فکر و تر دو سے آزاد تھی۔

اس کی ماں بہت متفکر تھی کشوری اندر کھولی میں بیٹھا تھا اور جیسا کہ اس نے کہا تھا دو سیٹھ باہر بڑے بازار میں موٹر لیے کھڑے تھے لیکن سرتیا کہیں غائب ہی ہو گئی تھی موٹر والے سیٹھ ہر روز تو آتے نہیں، یہ تو کشوری کی مہربانی ہے کہ مہینے میں ایک دو بار موٹی آسامی لے آتا ہے ورنہ ایسے گندے محلے میں جہاں پان کی پکیوں اور جلی ہوئی بیڑیوں کی ملی جلی بو سے کشوری گھبراتا ہے سیٹھ لوگ کیسے آسکتے ہیں کشوری چونکہ ہوشیار ہے اس لیے وہ کسی آدمی کو مکان پر نہیں لاتا بلکہ سرتیا کو کپڑے و پڑے پہنا کر باہر لے جایا کرتا ہے اور ان لوگوں سے کہہ دیتا ہے کہ صاحب آج کل زمانہ بڑا نازک ہے پولیس کے سپاہی ہر وقت گھات میں لگے رہتے ہیں اب

تک دو سو دھندل کرنے والی چھو کریاں پکڑی جا چکی ہیں کورٹ میں میرا بھی ایک کیس چل رہا ہے اس لیے پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔

سرتیا کی ماں کو بہت غصہ آ رہا تھا۔ جب وہ نیچے اتری تو میڑھیوں کے پاس دام دئی بیڑیوں کے پتے کاٹی رہی تھی اس سے سرتیا کی ماں نے پوچھا تو نے سرتیا کو کہیں دیکھا ہے جانے کہاں مر گئی ہے بس آج مجھے مل جائے وہ چار چوٹ کی ماروں کہ بند بند ڈھیلا ہو جائے۔۔۔۔۔ لوٹھا کی لوٹھا ہو گئی ہے پر سارا دن لوٹھوں کے ساتھ کدکڑے لگاتی رہتی ہے۔

رام دئی بیڑیوں کے پتے کاٹ رہی اور اس نے سرتیا کی ماں کو جواب نہ دیا دراصل رام دئی سے سرتیا کی ماں نے خاص طور پر کچھ پوچھا ہی نہیں تھا وہ یونہی بڑبڑاتی ہوئی اس کے پاس سے گزر گئی جیسا کہ اس کا عام دستور تھا ہر دوسرے تیسرے دن اسے سرتیا کو ڈھونڈنا پڑتا تھا اور رام دئی کو جو کہ سارا دن میڑھیوں کے پاس چٹاری سامنے رکھے بیڑیوں پر لال اور سفید دھانگے لپیٹتی رہتی تھی مخاطب کر کے یہی الفاظ دوہرایا کرتی تھی۔

ایک اور بات وہ چالی کی ساری عورتوں سے کہا کرتی تھی ”میں تو اپنی سرتیا کا کسی بابو سے بیاہ کروں گی اس لیے تو اس سے کہتی ہوں کہ کچھ پڑھ لکھ لے“ یہاں پاس ہی ایک سکول منسی پائی ”میو سپائی“ نے کھولا ہے، سو جتی ہوں اس میں سرتیا کو داخل کرا دوں، بہن اس کے پتا کو بڑا شوق تھا کہ میری لڑکی پڑھی لکھی ہو۔۔۔۔۔ اس کے بعد وہ ایک لمبی آہ بھر کر غام طور پر اپنے مرے ہوئے شوہر کا قصہ چھیڑ دیتی تھی جو چالی کی ہر عورت کو زبانی یاد تھا رام دئی سے اگر آپ پوچھیں کہ

اچھا جب سرتیا کے باپ کو جو ریلوانی میں کام کرتا تھا بڑے صاحب نے گالی دی تو کیا ہوا تو رام دانی فوراً آپ کو بتا دے گی کہ سرتیا کے باپ کے منہ میں جھاگ بھرا آیا اور وہ صاحب سے کہنے لگا ”میں تمہارا نوکر نہیں ہوں، سرکار کا نوکر ہوں تم مجھ پر رعب نہیں جما سکتے دیکھو اگر پھر گالی دی تو یہ دونوں جڑے حلق کے اندر کر دوں گا“ بس پھر کیا تھا صاحب تاؤ میں آگیا اور اس نے ایک اور گالی سنا دی اس پر سرتیا کے باپ نے غصے میں آکر صاحب کی گردن پر ایسی دھول جمانی کہ اس کا ٹوپ دس گز پرے جاگرا اور اس کو دن میں تارے نظر آ گئے پھر بھی وہ بڑا آدمی تھا آگے بڑھ کر اس نے سرتیا کے باپ کے پیٹ میں اپنے فوجی بوٹ سے اس زور کی ٹھوکر ماری کہ اس کی تلی پھٹ گئی اور وہیں انہوں کے پاس گر کر اس نے جان دے دی سرکار نے صاحب پر مقدمہ چلایا اور پورے پانچ سو روپے سرتیا کی ماں کو اس سے دلوائے مگر قسمت بری تھی اس کو کھیلنے کی چاٹ پڑ گئی اور پانچ مہینے کے اندر راند رسارا رو پیہر باد ہو گیا۔

سرتیا کی ماں کی زبان پر ہر وقت یہ کہانی جاری رہتی تھی لیکن کسی کو یقین نہ تھا کہ یہ سچ ہے یا جھوٹ، چالی میں سے کسی آدمی کو بھی سرتیا کی ماں سے ہمدردی نہ تھی شاید اس لیے کہ وہ سب کے سب خود ہمدردی کے قابل تھے کوئی کسی کا دوست نہیں تھا اس بلڈنگ میں اکثر آدمی ایسے رہتے تھے جو دن کو سوتے تھے اور رات کو جاگتے تھے کیونکہ انہیں کو پاس والی ٹل میں کام پر جانا ہوتا تھا اس بلڈنگ میں سب آدمی بالکل پاس پاس رہتے تھے لیکن کسی کو ایک دوسرے سے دلچسپی نہ تھی۔

چالی میں قریب قریب سب لوگ جانتے تھے کہ سرتیا کی ماں اپنی جوان بیٹی

سے پیشہ کراتی ہے لیکن چونکہ وہ کسی کے ساتھ اچھا برسلوک کرنے کے عادی ہی نہ تھے اس لیے سرتیا کی ماں کو کوئی جھٹانے کی کوشش نہ کرتا تھا جب وہ کہا کرتی تھی میری بیٹی کو تو دنیا کی کچھ خبر ہی نہیں البتہ ایک روز صبح سویرے مل کے پاس جب ہکا رام نے سرتیا کو چھیڑا تھا تو سرتیا کی ماں بہت چینی چلائی تھی اس مولے گنجے کو تو کیوں سنبھال کے نہیں رکھتی پر ماتما کرے دونوں آنکھوں سے اندھا ہوجائے جن سے اس نے میری کنواری بیٹی کی طرف بری نظروں سے دیکھا۔۔۔۔۔ سچ کہتی ہوں ایک روز ایسا فساد ہوگا کہ اس تیری سوغات کا مارے جو توں کے سر پلپلا کر دوں گی۔۔۔۔۔ باہر جو چاہے جھک مارے پر یہاں اسے بھلے مانسوں کی طرح رہنا ہو گا سنا!

اور یہ سن کر ہکا رام کی بھیگتی بیوی دھوتی باندھتے باندھتے باہر نکل آئی تھی ”خبردار مولیٰ چڑیل جو تو نے ایک لفظ بھی اور زبان سے نکالا۔۔۔۔۔ یہ تیری دیوی تو ہوئل کے چھو کروں سے بھی آنکھ چھو لی کیلانی ہے اور تو کیا ہم سب کو اندھا سمجھتی ہے کیا ہم سب جانتے نہیں کہ تیرے گھر میں نت نئے بابو کس لیے آتے ہیں اور یہ تیری سرتیا آئے دن بن سنور کر باہر کیوں جاتی ہے۔۔۔۔۔ بڑی آئی عزت آبرو والی جا جا دور وفا ہو یہاں سے۔“

ہکا رام کی بھیگتی بیوی کے متعلق بہت سی باتیں مشہور تھیں لیکن یہ خاص طور پر سب لوگوں کو معلوم تھی کہ گھاسلیٹ والا، مٹی کا تیل بیچنے والا، تیل دینے کے لیے آتا ہے تو وہ اسے اندر بلا کر دروازہ بند کر لیا کرتی ہے چنانچہ سرتیا کی ماں نے اس خاص بات پر بہت زور دیا وہ بار بار نفرت بھرے لہجے میں اس سے کہتی ”اور وہ تیرا

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

تیار ہو جا۔۔۔۔۔ اور سن۔۔۔۔۔ وہ نیلی جار جٹ کی ساڑھی پہنیو۔۔۔۔۔ اور دیکھ
یہ تیرے بال بھی بہت بری طرح بکھر رہے ہیں۔۔۔ تو جلدی سے تیار ہو گئی
میں کروں گی۔“

یہ سن کر کہ موٹر والے سیٹھ آئے ہیں سر تیا بہت خوش ہوئی اسے سیٹھ سے اتنی
دلچسپی نہیں تھی جتنی کہ موٹر سے تھی موٹر کی سواری اسے بہت پسند تھی جب موٹر
فرائے بھرتی کھلی کھلی سڑکوں پر چلتی اور اس کے منہ پر ہوا کے طمانچے پڑتے تو اس
کے دل میں ایک ناقابل بیان مسرت ابلنا شروع ہو جاتی موٹر میں بیٹھ کر اس کو ہر
شے ایک ہوائی چکر دکھائی دیتی اور سمجھتی کہ وہ خود ایک گولہ ہے جو سڑکوں پر اڑتا چلا
جا رہا ہے۔

سرتیا کی عمر زیادہ سے زیادہ پندرہ برس کی ہوگی مگر اس میں بچپنا تیرہ برس کی
لڑکیوں کا ساتھ عورتوں سے مانا جانا اور ان سے باتیں کرنا بالکل پسند نہیں کرتی
تھی۔ سارا دن چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کے ساتھ اوٹ چٹانگ کھیلوں میں مصروف
رہتی ایسے کھیل جن کا کوئی مطلب ہی نہ ہو مثال کے طور پر وہ گلی کے کالے لگ
پھرے فرش پر کھڑیا مٹی سے لکیریں کھینچنے میں بہت دلچسپی لیتی تھی اور اس کھیل میں
وہ اس انہماک سے مصروف رہتی جیسے سڑک پر یہ ٹیڑھی لکیریں اگر نہ کھینچی گئیں تو
آمد و رفت بند ہو جائے گی اور پھر کھولی سے پرانے ٹاٹ اٹھا کر وہ اپنی ننھی ننھی
سمیٹیوں کے ساتھ کئی کئی گھنٹے ان کوٹ پاتھ پر جھٹکنے صاف کرنے، بچھانے اور
ان پر بیٹھنے کے غیر دلچسپ کھیل میں مشغول رہتی تھی۔

سرتیا خوبصورت نہیں تھی رنگ اس کا سیاہی مائل گندمی تھا بمبئی کے مرطوب

موسم کے باعث اس کے چہرے کی جلد ہر ممکن چکنی رہتی تھی اور پتلے پتلے ہونٹوں پر جو چیکو کے (ایک پھل جس کا رنگ گندمی ہوتا ہے) چھلکے دکھائی دیتے تھے ہر وقت خفیف سی لرزش طاری رہتی تھی اور پر کے ہونٹ پر پسینے کی تین چار ننھی ننھی بوندیں کپکپاتی رہتی تھیں اس کی صحت اچھی تھی غایظت میں رہنے کے باوجود اس کا جسم سڈول اور متناسب تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس پر جوانی کا حملہ بڑی شدت سے ہوا ہے جس نے مخالف قوتوں کو دبا کر رکھ دیا ہے قد چھوٹا تھا جو اس کی تندرستی میں اضافہ کرتا تھا سرک پر پھرتی سے ادھر ادھر چلتے ہوئے جب اس کی میلی گھکری اوپر کواٹھ جاتی تو کئی راہ چلنے والے مردوں کی نگاہیں اس کی پنڈلیوں کی طرف اٹھ جاتی تھیں جن میں جوانی کے باعث تازہ زندہ کی ہوئی سا گوان کی لکڑی جیسی چمک دکھائی دیتی تھی ان پنڈلیوں پر جو بالوں سے بالکل بے نیاز تھیں مساموں کے ننھے ننھے نشان دیکھ کر ان سنگتروں کے چھلکے یاد آ جاتے تھے جن کے چھوٹے چھوٹے خلیوں میں تیل بھرا ہوتا ہے اور جو تھوڑے سے دباؤ پر فوارے کی طرح اوپر اٹھ کر آنکھوں میں گھس جایا کرتا ہے۔

سرتیا کی باہیں بھی سڈول تھیں کندھوں پر ان کی گولائی موٹی اور بڑے بے ڈھب طریقے پر سلے ہوئے بیاؤز کے باوجود باہر جھانکتی تھی بال بڑے گھنے اور لمبے تھے ان میں سے کھوپرے کے تیل کی بو آتی رہتی تھی ایک مولے کوڑے کے مانند اس کی چوٹی پیٹھ کو تھپکتی رہتی تھی سرتیا اپنے بالوں کی لمبائی سے خوش نہیں تھی کیونکہ کھیل کود کے دوران میں اس کی چوٹی اسے بہت تکلیف دیا کرتی تھی اور اسے مختلف طریقوں سے اس کو قابو میں رکھنا پڑا تھا۔

سرتیا کا دل و دماغ ہر قسم کے فکر و تردد سے آزاد تھا دونوں وقت اسے کھانے کو مل جاتا تھا اس کی ماں گھر کا سب کام کاج کرتی تھی صبح کو سرتیا دو بالٹیاں پانی سے بھر کر اندر رکھ دیتی اور شام کو ہر روز لیمپ میں ایک پیسے کا تیل بھروالاتی۔ کئی برسوں سے وہ یہ کام بڑی باقاعدگی سے کر رہی تھی چنانچہ شام کو عادت کے باعث خود بخود اس کا ہاتھ اس پیالے کی طرف بڑھتا جس میں پیسے پڑے رہتے تھے اور لیمپ اٹھا کر وہ نیچے چلی جاتی۔

کبھی کبھی یعنی مہینے میں چار پانچ بار جب کشوری سیٹھ لوگوں کو لاتا تھا تو ان کے ساتھ ہوٹل میں یا باہر اندھیرے مقاموں پر جانے کو وہ تفریح خیال کرتی تھی اس نے اس باہر جانے کے سلسلے میں دوسرے پہلوؤں پر کبھی غور ہی نہیں کیا تھا شاید یہ سمجھتی تھی کہ دوسری لڑکیوں کے گھر میں بھی کشوری جیسے آدمی ہوتے ہوں گے اور ان کو سیٹھ لوگوں کے ساتھ باہر جانا پڑتا ہوگا اور وہاں رات کو ورنلی کے ٹھنڈے ٹھنڈے بچوں پر یا جو ہو کی گیلی ریت پر جو کچھ ہوتا ہے سب کے ساتھ ہوتا ہوگا۔ چنانچہ اس نے ایک بار اپنی ماں سے کہا تھا ماں اب تو شاننا بھی کافی بڑا ہوگئی اس کو بھی میرے ساتھ بھیج دو تا یہ سیٹھ جواب آئے ہیں مجھے انڈے کھانے کو دیا کرتے ہیں اور شاننا کو انڈے بہت بھاتے ہیں اس پر اس کی ماں نے بات گول مول کر دی تھی، ہاں ہاں کسی روز اس کو بھی تمہارے ساتھ بھیج دوں گی اس کی ماں پونے سے واپس تو آجائے اور سرتیا نے دوسرے روز ہی شاننا کو جب وہ سنڈ اس سے نکل رہی تھی یہ خوشخبری سنائی تھی ”تیری ماں پونا سے آجائے تو سب ٹھیک ہو جائے گا تو بھی میری ساتھ ورنلی جایا کرے گی“ اور اس کے بعد سرتیا نے رات کی

بات اس کو کچھ اس طریقے سے سنا شروع کی تھی جیسے اس نے ایک نہایت ہی پیارا سپنا دیکھا ہے شاننا کو جو سرتیا سے دو برس چھوٹی تھی یہ باتیں سن کر ایسا لگا تھا جیسے اس کے سارے جسم کے اندر ننھے ننھے گھٹنکروں ج رہے ہیں سرتیا کی سب باتیں سن کر بھی اس کو تسلی نہ ہوئی تھی اور اس کا بازو کھینچ کر اس نے کہا تھا ”چل نیچے چلتے ہیں۔۔۔ وہاں باتیں کریں گے“ اور نیچے اس موٹری کے پاس جہاں گردھاری بنیا نے بہت سے ٹانگوں پر کھوپڑے کے میلے ٹکڑے سکھانے کے لئے ڈال رکھے تھے وہ دونوں دیر تک کچکی پیدا کرنے والی باتیں کرتی رہی تھیں اس وقت بھی جبکہ سرتیا دھوتی کے پردے پیچھے نیلی جار جٹ کی ساڑھی پہن رہی تھی کپڑے کے مس ہی سے اس کے بدن پر گدگدی ہو رہی تھی اور موٹر کی سیر کا خیال اس کے دماغ میں پرندوں کی سی پھڑ پھڑا نہیں پیدا کر رہا تھا۔ اب کی باری تھ کیماس ہو گا اور اسے کہاں لے جائے گا یہ اور اسی قسم کے اور سوال کے دماغ میں نہیں آ رہے تھے، البتہ جلدی جلدی کپڑے بدلتے ہوئے اس نے ایک دو مرتبہ یہ ضرور سوچا تھا کہ ایسا نہ ہو موٹر چلے اور چند ہی منٹوں میں کسی ہوٹل کے دروازے پر ٹھہر جائے اور ایک بند کمرے میں سیٹھ شراب پینا شروع کر دے اور اس کا دم گھٹنا شروع ہو جائے، اسے ہوٹلوں کے بند کمرے پسند نہیں تھے جن میں عام طور پر لوہے کی دو چار پائیاں اس طور پر بچھی ہوتی تھیں گویا ان سے پر جی بھر کے سونے کی اجازت ہی نہیں ہے۔

جلدی جلدی اس نے جار جٹ کی ساڑھی پہنی اور اس کی شکنیں درست کرتی ہوئی ایک لمبے کے لئے کشوری کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ ”کشوری، ذرا دیکھو

(بابر بڑے بازار میں جہاں ایک کارخانے کی لمبی سی دیوار دور تک چلی گئی ہے ایک پیلے رنگ کی موٹر ”یہاں پیشاب کرنا منع ہے“ کے چھوٹے سے بورڈ کے پہلو میں کھڑی تھی اور موٹر میں تین حیدر آبادی نوجوان اپنی اپنی ناک پر رومال رکھے کشوری کا انتظار کر رہے تھے) وہ موٹر آگے لے جاتے مگر مصیبت یہ ہے کہ دیوار دور تک چلی گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی پیشاب کا سلسلہ بھی جب گلی کے موڑ

یہ سن کر اس نے جیب میں سے دو روپے نکالے اور کشوری کے ہاتھ میں دے دیا۔ کشوری نے اسے دیکھ کر ہنس کر کہا: ”جائے عیش کرو“۔ کشوری نے سلام کیا اور موٹر اسٹارٹ ہوئی۔

لوگوں کی آمد و رفت بہت زیادہ تھی سر تیا خاموشی سے وہ آدمیوں کے بیچ میں دہکی بیٹھی رہی۔ بار بار اپنی رانوں کو جوڑ کر اوپر ہاتھ رکھ دیتی اور کچھ کہتے کہتے خاموش ہو جاتی وہ دراصل موٹر چلانے والے نوجوان سے کہنا چاہتی تھی ”سیٹھ جلدی جلدی موٹر چلاؤ میرا تو یوں دم گھٹ جائے گا“

بہت دیر تک موٹر میں کسی نے ایک دوسرے سے بات نہ کی موٹر والا موٹر چلاتا اور پچھلی سیٹ پر دونوں حیدر آبادی نوجوان اپنی اپکنوں میں وہ انتظار چھپاتے رہے جو پہلی دفعہ ایک نوجوان لڑکی کو بالکل اپنے پاس دیکھ کر انہیں محسوس ہو رہا تھا ایسی نوجوان لڑکی کو جو کچھ عرصے کے لئے ان کی اپنی تھی یعنی جس سے وہ بلا خوف و خطر چھیڑ چھاڑ کر سکتے تھے۔

وہ نوجوان جو موٹر چلا رہا تھا دوسرے سے ہمکنی میں قیام پذیر تھا اور سر تیا جیسی کئی لڑکیاں دن کے اجالے اور رات کے اندھیرے میں دیکھ چکا تھا اس کی پہلی موٹر میں مختلف رنگ و نسل کی چھوکریاں داخل ہو چکی تھیں اس لیے اسے کوئی خاص بے چینی محسوس نہیں ہو رہی تھی حیدر آباد سے اس کے دو دوست آئے تھے ان میں سے ایک جس کا نام شہاب تھا جو ہمکنی میں پوری طرح سیر و تفریح کرنا چاہتا تھا اس لیے کنایت نے یعنی موٹر کے مالک نے ازراہ دوست نوازی کشوری کے ذریعہ سے سریتا کا انتظام کر دیا تھا دوسرے دوست انور سے کنایت نے کہا تھا کہ بھی تمہارے لیے بھی ایک رہے تو کیا خرچ ہے مگر اس میں چونکہ اخلاقی قوت کم تھی اس لیے شرم کے مارے وہ یہ نہ کہہ سکا کہ ہاں بھی میرے لیے بھی ایک رہے۔

کنایت نے سریتا کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا کیونکہ کشوری بہت دیر کے بعد یہ

نی چھو کر ہی نکال کر لایا تھا لیکن اس نے پن کے باوجود اس نے ابھی تک اس سے دلچسپی نہ لی تھی شاید اس لیے کہ وہ ایک وقت میں صرف ایک کام کر سکتا تھا موٹر چلانے کے ساتھ ساتھ وہ سرتیا کی طرف دھیان نہیں دے سکتا تھا۔

جب شہر ختم ہو گیا اور موٹر مضامقات کی ایک سڑک پر چلنے لگی تو سرتیا اچھل پڑی۔ وہ دباؤ جواب تک اس نے اپنے اوپر ڈال رکھا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں اور اڑتی ہوئی موٹر نے ایک دم اٹھا دیا اور سرتیا کے اندر بجلیاں سی دوڑ گئیں وہ سرتیا پا حرکت بن گئی اس کی مائیں تھرکنے لگیں بازو ہانپنے لگے، انگلیاں کپکپانے لگیں اور وہ اپنے دونوں طرف بھاگتے ہوئے درختوں کو دوڑتی ہوئی دیکھا ہوں سے دیکھنے لگی۔

اب انور اور شہاب آرام محسوس کر رہے تھے شہاب نے جو سرتیا پر اپنا حق سمجھتا تھا ہولے سے اپنا بازو اس کی کمر میں حائل کرنا چاہا ایک دم سرتیا کے گدگدی اٹھی تڑپ کر وہ انور پر جاگری اور پھلی موٹر کی کھڑکیوں میں سے دو رنگ سرتیا کی فہمی بہتی گئی شہاب نے جب ایک بار پھر اس کی کمر کی طرف ہاتھ بڑھایا تو سرتیا دوہری ہو گئی اور ہستے ہستے اس کا ہر حال ہو گیا انور ایک کونے میں دبکا رہا اور منہ میں جھوک پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

شہاب کے دل و دماغ میں شوخ رنگ بھر گئے اس نے کنایت سے کہا ”واللہ بڑی کمراری لونڈیا ہے“ یہ کہہ کر اس نے زور سے سرتیا کی ران میں چٹکی بھری سرتیا نے اس کے جواب میں انور کا ہولے سے کان مروڑ دیا اس لیے کہ وہ اس کے بالکل پاس تھا موٹر میں تھپتھپانے لگے

کنایت بار بار مڑ مڑ کر دیکھتا تھا حالانکہ اسے اپنے سامنے چھوٹے سے آئینے میں سب کچھ دکھائی دے رہا تھا قہقہوں کے زور کا ساتھ دینے کی خاطر اس نے موٹر کی رفتار بھی تیز کر دی۔

سرتیا کا جی چاہا کہ باہر نکل کر موٹر کے منہ پر بیٹھ جائے جہاں لوہے کی اڑتی ہوئی پری لگی تھی وہ آگے بڑھی شہاب نے اسے چھیڑا تو سنبھلنے کی خاطر اس نے کنایت کے گلے میں اپنی باہیں حائل کر دیں کنایت نے غیر ارادی طور پر اس کے ہاتھ چوم لیے ایک سنسنی سی سرتیا کے جسم میں دوڑ گئی اور پھاند کر اگلی سیٹ پر کنایت کے پاس بیٹھ گئی اور اس کی مانی سے کھیلنا شروع کر دیا ”تمہارا نام کیا ہے؟“ اس نے کنایت سے پوچھا

”میرا نام!“ کنایت نے پوچھا ”میرا نام کنایت ہے“ یہ کہہ کر اس نے دس روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ میں دے دیا

سرتیا نے اس کے نام کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور نوٹ اپنی چولی میں اڑس کر بچوں کی طرح خوش ہو کر کہا ”تم بہت اچھے آدمی ہو تمہاری یہ مانی بہت اچھی ہے“ اس وقت سرتیا کو ہر شے اچھی نظر آ رہی تھی وہ چاہتی تھی کہ جو برے بھی ہیں اچھے ہو جائیں اور۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ پھر ایسا ہو، ایسا ہو۔۔۔۔۔ کہ موٹر تیز دوڑتی رہے اور ہر شے ہوائی بگولہ بن جائے۔

ایک دم اس کا جی چاہا کہ گائے چنانچہ اس نے کنایت کی مانی سے کھیلنا بند کر کے گانا شروع کر دیا ہے۔

تمہیں نے مجھ کو پریم سکھایا۔۔۔۔۔ سوئے ہوئے ہر دے کو جگایا

کچھ دیر یہ فلمی گیت گانے کے بعد سرتیا ایک دم پیچھے مڑی اور انور کو خاموش دیکھ کر کہنے لگی ”تم کیوں چپ چاپ بیٹھے ہو کوئی بات کرو کوئی گیت گاؤ“ یہ کہتی ہوئی وہ اچک کر پچھلی سیٹ پر چلی گئی اور شہاب کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگی ”آؤ ہم دونوں گائیں تمہیں یاد ہے وہ گانا جو دیویکا رانی نے گایا تھا“

میں بن کی چڑیا بن کے بن بن بولوں رے۔۔۔۔۔ دیویکا رانی کتنی اچھی ہے یہ کہہ کر اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اپنی جھوڑی کے نیچے رکھ لیے اور آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا ”اشوک سمار اور دیویکا رانی پاس پاس کھڑے تھے۔۔۔ دیویکا رانی کہتی تھی۔۔۔ میں بن کی چڑیا بن کے بن بن بولوں رے۔۔۔ اور اشوک سمار کہتا تھا۔۔۔ تم کہو نا“

سرتیا نے گانا شروع کر دیا۔۔۔۔۔ ”میں بن کی چڑیا بن کے بن بن بولوں رے“

شہاب نے بھدی آواز باند کی ”میں بن کا پیچھی بن کے بن بن بولوں رے“ اور پھر باقاعدہ ڈوٹ شروع ہو گیا کناہیت نے موٹر کا ہارن بجا کر تال کا ساتھ دیا سرتیا نے تالیاں بجانا شروع کر دیں سرتیا کا باریک سر، شہاب کی پچھی ہوئی آواز، ہارن کی پوں پوں، ہوا کی سائیں سائیں اور موٹر کے انجن کی پھڑ پھڑاہٹ، یہ سب مل جل کر ایک آکسٹرا بن گئے۔

سرتیا خوش تھی، شہاب خوش تھا، کناہیت خوش تھا ان سب کو خوش دیکھ کر انور کو بھی خوش ہونا پڑا وہ دل میں بہت شرمندہ تھا کہ خواہ مخواہ اس نے اپنے آپ کو قید کر رکھا ہے۔۔۔ اس کے بازوؤں میں حرکت پیدا ہوئی اس کے سوتے ہوئے جذبات

نے اگڑائیاں لیں اور وہ سرتیا، شہاب اور کناہیت کی شور افشاں خوشی میں شریک ہونے کے لئے تیار ہو گیا۔

گاتے گاتے سرتیا نے انور کے سر پر سے اس کا ہیٹ اتار کر اپنے سر پر پہن لیا اور یہ دیکھنے کے لئے کہ اس کے سر پر کیسا لگتا ہے اچک کر اگلی سیٹ پر چلی گئی اور ننھے سے آنے میں اپنا چہرہ دیکھنے لگی۔۔۔ انور سوچنے لگا کہ کیا موٹر میں وہ شروع ہی سے ہیٹ پہنے بیٹھا تھا؟

سرتیا نے زور سے کناہیت کی موٹی ران پر طمانچہ مارا ”اگر میں تمہاری پتلون پہن لوں اور قمیص پہن کر ایسی مائی لگا لوں تو کیا پورا صاحب نہ بن جاؤں؟“
یہ سن کر شہاب کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کرے چنانچہ اس نے انور کے بازوؤں کو جھجھوڑ دیا ”واللہ تم نرے چغند ہو“ اور انور نے جھوڑی دیر کے لئے محسوس کیا کہ وہ واقعی بہت بڑا چغند ہے۔

کناہیت نے سرتیا سے پوچھا ”تمہارا نام کیا ہے؟“
”میرا نام!“ سرتیا نے ہیٹ کے فیتے کو اپنی ٹھوڑی کے نیچے جماتے ہوئے کہا ”میرا نام سرتیا ہے“

شہاب پچھلی سیٹ سے بولا ”سرتیا تم عورت نہیں پچھڑی ہو“
انور نے کچھ کہنا چاہا مگر سرتیا نے اونچے سروں میں گانا شروع کر دیا
پریم گھر میں بناؤں گی گھر میں
تج کے سب سن سا آ آر
کناہیت اور شہاب کے دل میں بیک وقت یہ خواہش پیدا ہوئی کہ یہ موٹر یونٹی

متعدد دوڑتی چلی گئی کناہیت اور شہاب بھی اس دوڑ میں شامل ہو گئے کھلی فضا میں بے پایاں سمندر کے پاس تاڑ کے اونچے اونچے پیڑوں تلے گیلی گیلی ریت پر سرتیا سمجھ نہ سکی کہ وہ کیا چاہتی ہے اس کا جی چاہتا تھا کہ بیک وقت فضا میں گھل جائے، سمندر میں پھیل جائے اتنی اونچی ہو جائے کہ تاڑ کے درختوں کو اوپر سے دیکھے ساحل کی ریت کی ساری نمی پیڑوں کے ذریعے سے اپنے اندر جذب کر لے اور پھر ----- اور پھر ----- وہی موڑ ہو اور وہی اڑائیں وہی تیز تیز جھونکے اور وہی مسلسل پوں پوں وہ بہت خوش تھی جب تینوں حیدر آبادی نوجوان ساحل کی گیلی گیلی ریت پر بیٹھ کر بیئر پینے لگے تو کناہیت کے ہاتھ سے سرتیا نے بوتل چھین لی ”تھہرہ میں ڈالتی ہوں“

سرتیا نے اس طریقے سے گلاس میں بیئر اندر لپی کہ جھاگ ہی جھاگ پیدا ہو گئے سرتیا یہ تماشا دیکھ کر بہت خوش ہوئی سانولے سانولے جھاگوں میں اس نے اپنی انگلی گھولی اور منہ میں ڈال لی جب کڑوی لگی تو بہت برا منہ بنایا کناہیت اور شہاب بے اختیار ہنس پڑے جب دونوں کی ہنسی بند ہوئی تو کناہیت نے مڑ کر اپنے پیچھے دیکھا انور بھی ہنس رہا تھا۔

بیئر کی چھ بوتلیں، کچھ تو جھاگ بن کر ساحل کی ریت میں جذب ہو گئیں اور کچھ کناہیت شہاب اور انور کے پیٹ میں چلی گئیں سرتیا گاتی رہی۔۔۔۔۔ انور نے ایک بار اس کی طرف دیکھا اور خیال کیا کہ سرتیا بیئر کی بنی ہوئی ہے اس کے سانولے گال سمندر کی نم آلود ہوا کے مس سے گیلے ہو رہے تھے۔۔۔۔۔ وہ بے حد مسرور تھی اب انور بھی خوش تھا اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ

سمندر کا سب پانی ہیٹر بن جائے اور وہ اس میں غوطے کھائے سر تیا بھی ڈالیاں لگائے۔

دو خالی بوتلیں لے کر سر تیا نے ایک دوسرے سے ٹکرا دیں جھنکار پیدا ہوئی سر تیا نے زور زور سے ہنسا شروع کر دیا کناہیت، شہاب اور انور بھی ہنسنے لگے۔
ہنستے ہنستے سر تیا نے کناہیت سے کہا ”آؤ موٹر چلائیں“

سب اٹھ کھڑے ہوئے۔۔۔۔۔ خالی بوتلیں گیلی گیلی ریت پر اونڈھی پڑی رہیں اور وہ سب بھاگ کر موٹر میں بیٹھ گئے۔۔۔۔۔ پھر وہی ہوا کے تیز تیز جھونکے آنے لگے۔۔۔۔۔ وہی مسلسل پوں پوں شروع ہوئی اور سر تیا کے بال پھر دھوئیں کی طرح بکھرنے لگے۔

گیتوں کا سلسلہ پھر شروع ہوا

موٹر ہوا میں آ رہے کی طرح چلتی رہی۔۔۔۔۔ سر تیا گاتی رہی۔۔۔۔۔ پچھلی سیٹ پر شہاب اور انور کے درمیان سر تیا بیٹھی تھی انور اٹھ رہا تھا۔۔۔۔۔ سر تیا نے شرارت سے شہاب کے بالوں میں کنگھی کرنا شروع کر دی مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سو گیا سر تیا نے جب انور کی طرف رخ کیا تو اسے ویسا ہی سویا ہوا پایا ان دونوں کے بیچ میں سے اٹھ کر وہ اگلی سیٹ پر کناہیت کے پاس بیٹھ گئی اور آواز دبا کر ہولے سے کہنے لگی ”آپ کے دونوں دوستوں کو سنا آئی ہوں۔۔۔۔۔ اب آپ بھی سو جائیے۔“

کناہیت مسکرایا ”پھر موٹر کون چلائے گا“
سر تیا بھی مسکرائی ”چلتی رہے گی“

ویر تک کنایت اور سرتیا آپ میں باتیں کرتے رہے۔ اتنے میں وہ ہزار آگیا
جہاں کشوری نے سرتیا کو موٹر کے اندر داخل کیا تھا۔۔۔۔۔ جب وہ دیوار آئی جس
پر یہاں پیشاب کرنا منع ہے کے کئی بورڈ لگے تھے تو سرتیا نے کنایت سے کہا ”بس
یہاں روک لو“

موٹر کی پیشتر اس کے کہ کنایت کچھ سوچنے یہ کہنے پائے سرتیا موٹر سے باہر تھی
اس نے اشارے سے سلام کیا اور چل دی۔۔۔۔۔ کنایت ہینڈل پر ہاتھ رکھے
غالباً سارے واقعہ کو ذہن میں تازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ سرتیا کے قدم رکے
مڑی اور چولی میں سے دس روپے کا نوٹ نکال کر کنایت کے پاس سیٹ پر رکھ
دیا۔

کنایت نے حیرت سے نوٹ کی طرف دیکھا اور پوچھا ”سرتیا یہ کیا؟“
”یہ۔۔۔۔۔ یہ روپے میں کس بات کے لوں؟“ کہہ کر سرتیا پھرتی سے دوڑ
گئی اور کنایت سیٹ کے گدے میں پڑے نوٹ کی طرف دیکھتا رہ گیا۔
اس نے مڑ کر پچھلی سیٹ کی طرف دیکھا شہاب اور انور بھی نوٹ کی طرح سو
رہے تھے۔

☆☆☆☆☆☆

دھواں

وہ جب سکول کی طرف روانہ ہوا تو اس نے راستے میں ایک قصائی دیکھا جس کے سر پر ایک بہت بڑا ٹوکرا تھا اس ٹوکرے میں دو تازہ ذبح کیے ہوئے بکھرے تھے۔ کھالیں اتری ہوئی تھیں اور ان کے ننگے گوشت میں سے دھواں اٹھ رہا تھا جگہ جگہ پر یہ گوشت جس کو دیکھ کر مسعود کے ٹھنڈے گالوں پر گرمی کی لہریں دوڑ جاتی تھیں، پھڑک رہا تھا جیسے کبھی کبھی اس کی آنکھیں پھڑکا کرتی تھیں۔

اس وقت سوانو بجے ہوں گے مگر جھکے ہوئے خاکستری بادلوں کے باعث ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت سویرا ہے سردی میں شدت نہیں تھی لیکن راہ چلتے آدمیوں کے منہ سے گرم گرم سہاوار کی ٹونٹیوں کی طرح گاڑھا سفید دھواں نکل رہا تھا ہر شے بوجھل دکھائی دیتی تھی جیسے بادلوں کے وزن کے نیچے دبئی ہوئی ہے موسم کچھ ایسی ہی کیفیت کا حامل تھا جو ریڑ کے جوتے پہن کر چلتے سے پیدا ہوتی ہے اس کے باوجود کہ بازار میں لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی اور دکانوں میں زندگی کے آثار پیدا ہو چکے تھے آوازیں مدھم تھیں، جیسے سرگوشیاں ہو رہی ہیں، چپکے چپکے، دھیرے دھیرے باتیں ہو رہی ہیں، ہولے ہولے لوگ قدم اٹھا رہے ہیں کہ زیادہ اونچی آواز پیدا ہو۔

مسعود بغل میں بستہ دبائے سکول جا رہا تھا آج اس کی چال بھی سست تھی جب اس نے بے کمال کے تازہ ذبح کیے ہوئے بکروں کے گوشت سے سفید سفید دھواں اٹھتا دیکھا تو اسے راحت محسوس ہوئی اس دھوئیں نے اس کے ٹھنڈے

ٹھنڈے گالوں پر گرم گرم لکڑیوں کا ایک جال سا بن دیا اس گرمی نے اسے راحت پہنچائی اور وہ سوچنے لگا کہ سردیوں میں ٹھنڈے بچ باقموں پر بید کھانے کے بعد اگر یہ دھواں مل جایا کرے تو کتنا اچھا ہو۔

فنا میں اجلا پن نہیں تھا روشنی تھی مگر دھندلی کھر کی ایک پتلی سی تہہ ہر شے پر چڑھی ہوئی تھی جس سے فنا میں گدلا پن پیدا ہو گیا تھا یہ گدلا پن آنکھوں کو اچھا معلوم ہوتا تھا اس لیے کہ نظر آنے والی چیزوں کی نوک پلک کچھ مدھم پر گئی تھی۔ مسعود جب سکول پہنچا تو اسے اپنے ساتھیوں سے یہ معلوم کر کے یہ قطعی طور پر خوشی نہ ہوئی کہ سکول سکتر صاحب کی موت کے باعث بند کر دیا گیا ہے سب لڑکے خوش تھے جس کا ثبوت یہ تھا کہ وہ اپنے بےستے ایک جگہ پر رکھ کر سکول کے صحن میں اوٹ پناگ کھیلوں میں مشغول تھے کچھ چھٹی کا پتہ معلوم کرتے ہی گھر چلے گئے تھے کچھ آ رہے تھے اور کچھ نوٹس بورڈ کے پاس جمع تھے اور بار بار ایک ہی عبارت پڑھ رہے تھے۔

مسعود نے جب سنا کہ سکتر صاحب مر گئے ہیں تو اسے بالکل افسوس نہ ہوا اس کا دل جذبات سے بالکل خالی نہ تھا البتہ اس نے یہ ضرور سوچا کہ پچھلے برس جب اس کے دادا جان کا انتقام ان ہی دنوں میں ہوا تھا تو ان کا جنازہ لے جانے میں بڑی دقت ہوئی تھی اس لیے کہ بارش شروع ہو گئی وہ بھی جنازے کے ساتھ گیا تھا اور قبرستان میں چکنی کیچڑ کے باعث ایسا پھسلا تھا کہ کھدی ہوئی قبر میں گرتے گرتے بچا تھا یہ سب باتیں اس کو اچھی طرح یاد تھیں سردی کی شدت اس کے کیچڑ سے لت پت کپڑے، سرخی مائل نیلے ہاتھ جن کو دبانے سے سفید سفید دھبے پڑ

جاتے تھے تاکہ جو کہ برف کی ڈلی معلوم ہوتی تھی اور پھر آ کر ہاتھ پاؤں دھونے اور کپڑے بدلنے کا مرحلہ۔۔۔ یہ سب کچھ اس کو اچھی طرح یاد تھا چنانچہ جب اس نے سکتر صاحب کی موت کی خبر سنی تو اسے یہ یقین ہوئی باتیں یاد آ گئیں اور اس نے سوچا، جب سکتر صاحب کا جنازہ اٹھے گا تو بارش شروع ہو جائے گی اور قبرستان میں اتنی کچڑ ہو جائے گی کہ کئی لوگ پھسلیں گے اور ان کو ایسی چوٹیں آئیں گی کہ بلبل اٹھیں گے۔

مسعود نے یہ خبر سن کر سیدھا اپنے کمرے کا رخ کیا کمرے میں پہنچ کر اس نے اپنے ڈیسک کا تالا کھولا دو تین کتابیں جو کہ اسے دوسرے روز پھر لانا تھیں، اس میں رکھیں اور باقی بستہ اٹھا کر گھر کی جانب چل پڑا۔

راستے میں اس نے پھر وہی دو تازہ ذبح کیے ہوئے بکریدیکھے ان میں سے ایک کو اب قصابی نے لٹکا دیا تھا دوسرا تختے پر پڑا تھا جب مسعود دکان پر سے گزرا تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ گوشت کو جس میں سے دھواں اٹھ رہا تھا چھو کر دیکھے، چنانچہ آگے بڑھ کر اس نے انگلی سے بکرے کے اس حصے کو چھو کر دیکھا جو ابھی تک پھرک رہا تھا۔ گوشت گرم تھا۔ مسعود کی ٹھنڈی انگلی کو یہ حرارت بہت بھلی معلوم ہوئی قصابی دکان کے اندر چھریاں تیز کرنے میں مصروف تھا۔ چنانچہ مسعود نے ایک بار پھر گوشت کو چھو کر دیکھا اور وہاں سے چل پڑا۔

گھر پہنچ کر اس نے اپنی ماں کو سکتر صاحب کی موت کی خبر سنائی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کے ابا جی انہی کے جنازے کے ساتھ گئے ہیں اب گھر میں صرف دو آدمی تھے ماں اور بڑی بہن، ماں بارچی خانہ میں ٹیلی سائیکل رکھ رہی تھی اور بڑی

”اچھا۔۔۔۔۔“ یہ کہہ کر اس کی ماں چولہے میں ککڑیوں کے کونٹے
 جھاڑنے لگی

”اور یہ گوشت کئی جگہ پر پھڑکتا بھی تھا“

”تو پھر کیا ہوا؟“

”گرم تھا۔۔۔۔۔ اچھا مسعود یہ بتاؤ تم میرا ایک کام کرو گے“

“جئے”

”اؤ۔۔۔۔۔ میرے ساتھ آؤ“

”نہیں پیلے آپ بتائیے، کام کیا ہے؟“

”تم آؤ تو ہی میرے ساتھ“

”جی نہیں۔۔۔ آپ پہلے کام بتائیے“

”دیکھو میری کمر میں بڑا درد ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ میں پلنگ پر لیٹی ہوں، تم ذرا پاؤں سے دبا دینا۔۔۔۔۔ اچھے بھائی جو ہوئے۔۔۔ اللہ کی قسم بڑا درد ہو رہا ہے“ یہ کہہ کر مسعود کی بہن نے اپنی کمر پر مکیاں مارنا شروع کر دیں۔

”یہ آپ کی کمر کو کیا ہو جاتا ہے جب دیکھو درد ہو رہا ہے اور پھر آپ دیوانی بھی مجھ سے ہیں، کیوں نہیں اپنی سیلیوں سے کہتیں“ مسعود اٹھ کھڑا ہوا۔

”چلیے۔۔۔۔۔ لیکن میں یہ آپ سے کہے دیتا ہوں کہ دس منٹ سے زیادہ میں بالکل نہیں دباؤں گا“

”شباباش۔۔۔۔۔ شاباش!“ اس کی بہن اٹھ کھڑی ہوئی اور سرگموں کی کاپی سامنے طاق میں رکھ کر اس کمرے کی طرف روانہ ہوئی جہاں وہ اور مسعود دونوں سوتے تھے۔

صحن میں پہنچ کر اس نے اپنی دھتھی ہوئی کمر سیدھی کی اور اوپر آسمان کی طرف دیکھا میالے بادل جھکے ہوئے تھے ”مسعود! آج ضرور بارش ہوگی“ یہ کہہ کر اس نے مسعود کی طرف دیکھا مگر وہ اندر اپنی چارپائی پر لیٹا تھا۔

جب کلثوم اپنے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹ گئی تو مسعود نے اٹھ کر گھڑی میں وقت دیکھا ”دیکھئے باجی گیارہ بجے میں دس منٹ باقی ہیں میں پورے گیارہ بجے آپ کی کمر دابنا چھوڑ دوں گا۔“

”بہت اچھا۔۔۔۔۔ لیکن تم اب خدا کے لئے زیادہ نحرے نہ بگھا رو۔۔۔۔۔ ادھر میرے پلنگ پر آ کر جلدی کمر دباؤ نہ یاد رکھو بڑے زور سے کان اٹھو گئی“ کلثوم نے مسعود کو ڈانٹ پلائی مسعود نے اپنی بڑی بہن کے حکم کی تعمیل کی اور دیوار

کا سہارا لے کر پاؤں سے اس کی کمر دبا نا شروع کر دی مسعود کے وزن کے نیچے کلثوم کی چوڑی چمکی کمر میں خفیف سا جھکاؤ پیدا ہو گیا جب اس نے پیروں سے دبا نا شروع کیا، ٹھیک اسی طرح جس طرح مزدور مٹی گوندھتے ہیں تو کلثوم نے مزہ لینے کی خاطر ہولے ہولے ہائے ہائے کرنا شروع کیا۔

کلثوم کے کولہوں پر گوشت زیادہ تھا، جب مسعود کا پاؤں اس جیسے پر پڑا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اس بکرے کے گوشت کو دبا رہا ہے جو اس نے قصابی کی دکان میں اپنی انگلی سے چھو کر دیکھا تھا اس احساس نے چند لمحات کے لئے اس کے دل و دماغ میں ایسے خیالات پیدا کیے جن کا کوئی سر تھا نہ پیر، وہ ان کا مطلب نہ سمجھ سکا اور سمجھتا بھی کیسے جبکہ کوئی خیال مکمل نہیں تھا۔

ایک دو بار مسعود نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کے پیروں کے نیچے گوشت کے لوتھڑوں میں حرکت پیدا ہوئی ہے، اسی قسم کی حرکت جو اس نے بکرے کے گرم گرم گوشت میں دیکھی تھی اس نے بڑی بددلی سے کمر دبا نا شروع کر دی تھی مگر اب اسے اس کام میں لذت محسوس ہونے لگی اس کے وزن کے نیچے کلثوم ہولے ہولے کراہ رہی تھی یہ بھٹی بھٹی آواز جو کہ مسعود کے پیروں کی حرکت کا ساتھ دے رہی تھی اس گمنام سی لذت میں اضافہ کر رہی تھی۔

نا تم پیس میں گیارہ بج گئے مگر مسعود اپنی بہن کلثوم کی کمر دبا تا رہا۔ جب کمر اچھی طرح دبائی جا چکی تو کلثوم سیدھی لیٹ گئی اور کہنے لگی ”شاباش مسعود! شاباش لو اب لگے ہاتھوں نا تلئیں بھی دبا دو، بالکل اسی طرح۔۔۔۔۔ شاباش میرے بھائی!“

مسعود نے دیوار کا سہارا لے کر کلثوم کی رانوں پر جب اپنا پورا وزن ڈالا تو اس کے پاؤں کے نیچے مچھلیاں سی ترپ گئیں۔ بے اختیار وہ فہم پڑی اور دہری ہو گئی۔ مسعود گرتے گرتے بچا، لیکن اس کے تلوؤں میں مچھلیوں کی وہ ترپ منجمد سی ہو گئی اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ پھر اسی طرح دیوار کا سہارا لے کر اپنی بہن کی رانیں دبائے چنانچہ اس نے کہا ”یہ آپ نے ہنسنا کیوں شروع کر دیا سیدھی لیٹ جائیے میں آپ کی ٹانگیں دباؤں۔“

کلثوم سیدھی لیٹ گئی رانوں کی مچھلیاں ادھر ادھر ہونے کے باعث جو گدگدی پیدا ہوئی تھی اس کا اثر ابھی تک اس کے جسم میں باقی تھا ”نا بھائی۔۔۔ میرے گدگدی ہوتی ہے تم اوٹ پناٹک طریقے سے دباتے ہو“

مسعود نے خیال کیا کہ شاید اس نے غلط طریقہ استعمال کیا ہے ”نہیں۔۔۔ اب کی دفعہ میں پورا بوجھ آپ پر نہیں ڈالوں گا۔۔۔ آپ اطمینان رکھیے۔ اب ایسی اچھی طرح دباؤں گا کہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔“

دیوار کا سہارا لے کر مسعود نے اپنے جسم کو تولا اور اس انداز سے آہستہ آہستہ کلثوم کی رانوں پر اپنے پیر جمائے کہ اس کا آدھا بوجھ کہیں غائب ہو گیا ہو لے ہو لے بڑی ہوشیاری سے اس نے اپنے پیر چلانے شروع کیے کلثوم کی رانوں میں اکڑی ہوئی مچھلیاں اس کے پیروں کے نیچے دب دب کر ادھر ادھر پھسلنے لگیں مسعود نے ایک بار سکول میں متھے ہوئے رے پر ایک بازی گر کو چلتے دیکھا تھا اس نے سوچا کہ بازی گر کے پیروں کے نیچے تناہوار سا اسی طرح پھسلتا ہو گا۔

اس سے پہلے کئی بار اس نے اپنی بہن کلثوم کی ٹانگیں دبائی تھیں مگر وہ لذت جو

کہ اسے اب محسوس ہو رہی تھی پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی بکرے کے گرم گرم گوشت کا اسے بار بار خیال آتا تھا ایک دم مرتبہ اس نے سوچا ”کلتھوم کو اگر ذبح کر دیا جائے تو کھال اتر جانے پر کیا اس کے گوشت سے بھی دھواں نکلے گا؟“ لیکن ایسی یہودہ باتیں سوچنے پر اس نے اپنے آپ کو مجرم محسوس کیا اور دماغ کو اس طرح صاف کر دیا جیسے وہ سلیٹ کو اسٹینچ سے صاف کیا کرتا تھا۔

”بس۔۔۔۔۔ بس۔۔۔۔۔ بس۔۔۔۔۔“ کلتھوم تھک گئی ”بس۔۔۔۔۔ بس۔۔۔۔۔“

مسعود کو ایک دم شرارت سو جھی وہ پلنگ پر سے نیچے اترنے لگا تو اس نے کلتھوم کی دونوں بغلوں میں گدگدی کرنا شروع کر دی ہنسی کے مارے وہ لوٹ پوٹ ہو گئی اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ مسعود کے ہاتھوں کو پرے جھٹک دے لیکن جب اس نے ارادہ کر کے اس کے لات جمائی چاہی تو مسعود اچھل کر زور سے باہر گیا اور سلپر پہن کر کمرے سے نکل گیا۔

جب وہ صحن میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ ہلکی ہلکی بوند اباندی ہو رہی ہے۔ بادل اور بھی جھک آئے تھے پانی کے ننھے ننھے قطرے آواز پیدا کیے بغیر صحن کی اینٹوں میں آہستہ آہستہ جذب ہو رہے تھے مسعود کا جسم ایک دلنواز حرارت محسوس کر رہا تھا۔ جب ہوا کا ٹھنڈا ٹھنڈا جھونکا اس کے گالوں کے ساتھ مس ہو اور دو تین ننھی ننھی بوندیں اس کی ناک پر پڑیں تو ایک جھری جھری سی اس کے بدن میں لہرا اٹھی سامنے کوٹھے کی دیوار پر ایک کبوتر اور ایک کبوتری پاس پاس پر پھیلائے بیٹھے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں دم پخت کی ہوئی ہنڈیا کی طرح گرم ہیں۔ داؤ دی اور نازبو کے ہرے ہرے پتے اوپر الال گملوں میں نبا

رہے تھے۔ فضا میں نیندیں کھلی ہوئی تھیں ایسی نیندیں جن میں بیداری زیادہ ہوتی ہے اور انسان کے ارد گرد نرم نرم خواب یوں لپٹ جاتے ہیں جیسے اونی کپڑے۔ مسعود ایسی باتیں سوچنے لگا جس کا مطلب اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا وہ ان باتوں کو چھو کر دیکھ سکتا تھا مگر ان کا مطلب اس کی گرفت سے باہر تھا، پھر بھی ایک گمنام سامرہ اس سوچ بچار میں اسے آ رہا تھا۔

بارش میں کچھ دیر کھڑے رہنے کے باعث جب مسعود کے ہاتھ بالکل خشک ہو گئے اور وہ بانے سے ان پر سفید دھبے پڑنے لگے تو اس نے مٹھیاں کس لیں اور ان کو منہ کی بھاپ سے گرم کرنا شروع کیا۔ ہاتھوں کو اس عمل سے کچھ گرمی تو پہنچی مگر وہ نم آلود ہو گئے چنانچہ آگ تاپنے کے لئے وہ باورچی خانہ میں چلا گیا کھانا تیار تھا، ابھی اس نے پہا لقمہ ہی اٹھایا تھا کہ اس کا باپ قبرستان سے واپس آ گیا باپ بیٹے میں کوئی بات نہ ہوئی۔ مسعود کی ماں اٹھ کر فوراً دوسرے کمرے میں چلی گئی اور وہاں دیر تک اپنے خاوند کے ساتھ باتیں کرتی رہی۔

کھانے سے فارغ ہو کر مسعود بیٹھک میں چلا گیا اور کھڑکی کھول کر فرش پر لیٹ گیا بارش کی وجہ سے سردی کی شدت بڑھ گئی تھی کیونکہ اب ہوا بھی چل رہی تھی مگر یہ سردی ناخوشگوار معلوم نہیں ہوتی تھی تا اب کے پانی کی طرح یہ اوپر ٹھنڈی اور اندر گرم تھی۔ مسعود جب فرش پر لیٹا تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اس سردی کے اندر ٹھنس جائے جہاں اس کے جسم کو راحت انگیز گرمی پہنچے۔ دیر تک وہ ایسی شیر گرم باتوں کے متعلق سوچتا رہا جس کے باعث اس کے پٹھوں میں ہلکی ہلکی سی دھکن پیدا ہوئی۔ ایک دو بار اس نے انگڑائی لی تو اسے مزہ آیا اس کے جسم

کے کسی حصے میں، یہ اس کو معلوم نہیں تھا کہ کہا، کوئی چیز انک سی گئی تھی۔ یہ چیز کیا تھی اس کے متعلق بھی مسعود کو علم نہیں تھا البتہ اس انکاؤ نے اس کے سارے جسم میں اضطراب، ایک دبے ہوئے اضطراب کی کیفیت پیدا کر دی تھی اس کا سارا جسم کھنچ کر لمبا ہو جانے کا ارادہ بن گیا تھا۔

دیر تک گدگدے قالین پر کروٹیں بدلنے کے بعد وہ اٹھا اور باورچی خانہ سے ہوتا ہوا صحن میں آکھانہ کوئی باورچی خانہ میں تھا اور صحن میں ادھر ادھر جتنے کمرے تھے سب کے سب بند تھے بارش اب رک گئی تھی مسعود نے ہاکی اور گیند نکالی اور صحن میں کھیلنا شروع کر دیا ایک بار جب اس نے زور سے ہٹ لگائی تو گیند صحن کے دائیں ہاتھ والے کمرے کے دروازے پر لگی اندر سے مسعود کے باپ کی آواز آئی ”کون؟“

”جی میں ہوں مسعود!“

اندر سے آواز آئی ”کیا کر رہے ہو؟“

”جی کھیل رہا ہوں“

”کھیلو۔۔۔۔۔۔“ پھر چوڑے سے توقف کے بعد اس کے باپ نے کہا ”

تمہاری ماں میرا سر دبا رہی ہے۔۔۔۔۔۔ زیادہ شور نہ مچاتا“

یہ سن کر مسعود نے گیند میں پڑی رہنے دی اور ہاکی ہاتھ میں لیے سامنے کمرے کا رخ کیا۔ اس کا ایک دروازہ بند تھا اور دوسرا نیم وا۔۔۔۔۔۔ مسعود کو ایک شرارت سوچھی۔ دبے پاؤں وہ نیم وا دروازے کی طرف بڑھا اور دھماکے کے ساتھ دونوں پٹ کھول دیئے دو چیخیں بلند ہوئیں اور کلثوم اور اس کی سہیلی بملا نے

جو کہ پاس پاس لپٹی تھیں، خوفزدہ ہو کر جھٹ سے لٹاف اوڑھ لیا۔
 ہمارے بلاؤز کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور کلٹوم اس کے عریاں سینے کو گھور رہی
 تھی۔

☆☆☆☆☆

مسعود کچھ سمجھ نہ سکا، اس کے دماغ میں دھواں سا چھا گیا۔ وہاں سے اٹے
 قدم لوٹ کر وہ جب بیٹھک کی طرف روانہ ہوا تو اسے معاً اپنے اندر ایک اٹھارہ
 طاقت کا احساس ہوا جس نے کچھ دیر کے لئے اس کی سوچنے سمجھنے کی قوت بالکل
 کمزور کر دی۔

بیٹھک میں کھڑکی کے پاس بیٹھ کر جب مسعود نے ہاکی کو دونوں ہاتھوں سے
 پکڑ کر گھٹنے پر رکھا تو یہ سوچا کہ ہاکی کا سادباؤ ڈالنے پر ہاکی میں خم پیدا ہو جائے گا، اور
 زیادہ زور لگانے پر ہینڈل چٹاخ سے ٹوٹ جائے گا۔ اس نے گھٹنے پر ہاکی کے
 ہینڈل میں خم تو پیدا کر لیا مگر زیادہ سے زیادہ زور لگانے پر بھی وہ ٹوٹ نہ سکا۔ دیر
 تک وہ ہاکی کے ساتھ کشتی لڑتا رہا جب وہ تھک کر بارگیا تو جھنجھلا کر اس نے ہاکی
 پر سے پھینک دی۔

☆☆☆☆☆

دیوانی کے دیئے

چھت کی منڈیر پر دیوانی کے دیئے ہانپتے ہوئے بچوں کے دل کی طرح
دھڑک رہے تھے۔

منی دوڑتی ہوئی آنی اپنی نخی سی گھگھری کو دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھائے
چھت کے نیچے گلی میں موری کے پاس کھڑی ہو گئی اس کی روتی ہوئی آنکھوں میں
منڈیر پر پھیلے ہوئے دنیوں نے کئی چمکیلے گلینے جڑ دیئے۔۔۔ اس کا ننھا ساسینہ
دینے کی لو کی طرح کانپا، مسکرا کر اس نے اپنی مٹھی کھولی، پسینے سے بھیگا ہوا پیسہ
دیکھا اور بازار میں دیئے لینے کے لئے دوڑ گئی۔

چھت کی منڈیر پر شام کی خشک ہوا میں دیوانی کے دیئے پھڑ پھڑاتے رہے۔
سریندر دھڑکتے ہوئے دل کو پہلو میں چھپائے چوروں کے مانند گلی میں داخل
ہوا اور منڈیر کے نیچے بے قراری سے ٹیلنے لگا۔ اس نے دنیوں کی قطاروں کی
طرف دیکھا۔ اسے ہوا میں اچھلتے ہوئے یہ شعلے اپنی رگوں میں دوڑتے ہوئے
خون کے رقصاں قطرے معلوم ہوئے دفعتاً سامنے والی کھڑکی
کھلی۔۔۔۔ سریندر سر تاپا نگاہ بن گیا۔ کھڑکی کے ڈنڈے کا سہارا لے کر ایک
دو شیزہ نے جھک کر گلی میں دیکھا اور فوراً اس کا چہرہ متمما اٹھا۔

کچھ اشارے ہوئے کھڑکی چوڑیوں کی کھٹکناہٹ کے ساتھ بند ہوئی اور
سریندر وہاں سے مخموری کی حالت میں چل دیا۔

چھت کی منڈیر پر دیوانی کے دیئے دہن کی ساڑھی میں لکے ہوئے تاروں کی

طرح چمکتے رہے۔

سر جو کمہاراٹھی ٹیکتا ہوا آیا اور دم لینے کے لیے ٹھہر گیا بلغم اس کی چھاتی میں
سڑکیں کوٹنے والے انجن کی مانند پھر رہا تھا گلے کی رگیں دسے کے دورے کے
باعث دھوکنی کی طرح پھوٹی تھیں کبھی سکڑ جاتی تھیں اس نے گردن اٹھا کر جگمگ
جگمگ کرتے دنیوں کی طرف اپنی دھندلی آنکھوں سے دیکھا اور اسے ایسا معلوم
ہوا کہ دور۔۔۔۔۔ بہت دور۔۔۔۔۔ بہت سے بچے قطار باندھے کھیل کود میں
مصروف ہیں سر جو مہار کی لاٹھی منوں بھاری ہو گئی بلغم جھوک کر وہ پھر چیونٹی کی چال
چلنے لگا۔

چھت کی منڈیر پر دیوالی کے دیے جگمگاتے رہے۔

پھر ایک مزدور آیا پھٹے ہوئے گریبان میں سے اس کی چھاتی کے بال برباد
گھونسوں کی تیلیوں کے مانند بکھر رہے تھے دنیوں کی قطار کی طرف اس نے سر اٹھا
کر دیکھا اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ آسمان کی گدلی پیشانی پر پسینے کے موٹے
موٹے قطرے چمک رہے ہیں پھر اسے اپنے گھر کے اندھیا رے کا خیال آیا اور
وہ ان تھرتھرتے ہوئے شعلوں کی روشنی کنکھیوں سے دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

چھت کی منڈیر پر دیوالی کے دیے آنکھیں جھپکتے رہے۔

نئے اور چمکیلے بونٹوں کی چہرہ اہٹ کے ساتھ ایک آدمی آیا اور دیوار کے قریب
سکرپٹ ساگانے کے لیے ٹھہر گیا اس کا چہرہ اشرفی پر لگی ہوئی مہر کے مانند جذبات
سے ماری تھا کالر چڑھی گردن اٹھا کر اس نے دنیوں کی طرف دیکھا اور اسے ایسا
معلوم ہوا کہ بہت سی کشالیوں میں سونا پگھل رہا ہے اس کے چہرہ جراتے ہوئے

چمکیے جوتوں پر ناپتے ہوئے شعلوں کا عکس پر ربا تھا وہ ان سے کھیلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

چھت کی منڈیر پر دیوالی کے دیے جلتے رہے
جو کچھ انہوں نے دیکھا، جو کچھ انہوں نے سنا کسی کو نہ بتایا، ہوا کا ایک تیز
جھونکا آیا اور سب دیے ایک ایک کر کے بجھ گئے۔

☆☆☆☆☆☆

میدان بالکل صاف تھا مگر جاوید کا خیال تھا کہ میونسپلٹی کمیٹی کی لائینیں جو دیوار میں گڑی ہے، اس کو گھور رہی ہے بار بار وہ اس چوڑے صحن کو جس پر نائک شاہی اینٹوں کا اونچا نیچا فرش بنا ہوا تھا، طے کر کے اس ٹکڑے والے مکان تک پہنچنے کا ارادہ کرتا جو دوسری عمارتوں سے بالکل الگ تھلگ تھا مگر یہ لائینیں جو مصنوعی آنکھ کی طرح ہر طرف ٹٹکنکی باندھے دیکھ رہی تھی اس کے ارادے کو متزلزل کر دیتی اور وہ اس بڑی موری کے اس طرف ہٹ جاتا، جس کو پھاند کر وہ صحن کو چند قدموں میں طے کر سکتا تھا۔۔۔۔۔ صرف چند قدموں میں۔

جاوید کا گھر اس جگہ سے کافی دور تھا مگر یہ فاصلہ بڑی تیزی سے طے کر کے یہاں پہنچ گیا تھا اس کے خیالات کی رفتار اس کے قدموں کی رفتار سے زیادہ تیز تھی راستے میں اس نے بہت سی چیزوں پر غور کیا وہ بے قوف نہیں تھا اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ایک بیسوا کے پاس جا رہا ہے اور اس کو اس بات کا بھی شعور تھا کہ وہ کس غرض سے اس کے یہاں جانا چاہتا ہے۔

وہ عورت چاہتا ہے عورت، خواہ وہ کسی شکل میں ہو عورت کی ضرورت اس کی زندگی میں یک بیک پیدا نہیں ہوتی تھی ایک زمانے سے یہ ضرورت اس کے اندر آہستہ آہستہ موجود شدت اختیار کرتی رہی تھی اور اب دفعتاً اس نے محسوس کیا تھا کہ عورت کے بغیر وہ ایک لمحہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ عورت اس کو ضرور ملنی چاہیے۔ ایسی عورت جس کی ران پر ہولے سے طمانچہ مار کر وہ اس کی آوازن سکے۔ ایسی عورت

جس سے وہ وہاں ہیات قسم کی گفتگو کر سکے۔

جاوید پڑھا لکھا ہوشمند آدمی تھا ہر باپ کی اونچ نیچ سمجھتا تھا مگر اس معاملے میں مزید غور و فکر کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کے دل میں ایک ایسی خواہش پیدا ہوئی تھی جو اس کے لیے نئی نہ تھی عورت کی قربت حاصل کرنے کی خواہش اس سے پہلے کئی بار اس کے دل میں پیدا ہوئی اور اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے انتہائی کوششوں کے بعد جب اسے ناامیدی کا سامنا کرنا پڑا تو وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کی زندگی میں سالم عورت کبھی نہیں آئے گی اور اگر اس نے اس سالم عورت کی تلاش جاری رکھی تو کسی روز وہ دیوانے کتے کی طرح راہ چلتی عورت کو کاٹ کھائے گا۔

کاٹ کھانے کی حد تک اپنے ارادہ میں نا کام رہنے کے بعد اب دفعتاً اس کے دل میں اس خواہش نے کروٹ بدلی تھی اب کسی عورت کے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کرنے کا خیال اس کے دماغ سے نکل چکا تھا عورت کا تصور اس کے دماغ میں موجود تھا اس کے بال بھی تھے مگر اب اس کی یہ خواہش تھی کہ وہ ان بالوں کو وحشیوں کی طرح کھینچے، نوچے، اکھیڑے۔

اب اس کے دماغ میں سے وہ عورت نکل چکی تھی جس کے ہونٹوں پر وہ اپنے ہونٹ اس طرح رکھنے کا آرزو مند تھا جیسے تلی پھولوں پر بیٹھتی ہے، اب وہ ان ہونٹوں کو اپنے گرم ہونٹوں سے داغنا چاہتا تھا۔ ہولے ہولے سرگوشیوں میں باتیں کرنے کا خیال بھی اس کے دماغ میں نہیں تھا اب وہ بلند آواز میں باتیں کرنا چاہتا تھا ایسی باتیں جو اس کے موجودہ ارادے کی طرح نکلی ہوں۔

اب سالم عورت اس کے پیش نظر نہیں تھی۔۔۔۔۔ وہ ایسی عورت چاہتا تھا جو گھس گھسا کا شکستہ حال مرد کی شکل اختیار کر گئی ہو ایسی عورت جو آدھی عورت ہو آدھی کچھ بھی نہ ہو۔

ایک زمانہ تھا جب جاوید عورت کہتے وقت اپنی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی ٹھنڈک محسوس کرتا تھا جب عورت کا تصور اسے چاند کی ٹھنڈی دنیا میں لے جاتا تھا وہ عورت کہتا تھا بڑی احتیاط سے جیسے اس کو اس بے جان لفظ کے ٹوٹنے کا ڈر ہو۔ ایک عرصہ تک وہ اس دنیا کی سیر کرتا رہا مگر انجام کار اس کو معلوم ہوا کہ عورت جس کی تمنا اس کے دل میں ہے اس کی زندگی کا ایسا خواب ہے جو خراب وعدے کے ساتھ دیکھا جائے۔

جاوید اب خوابوں کی دنیا سے باہر نکل آیا تھا بہت دیر تک جننی طور پر وہ اپنے آپ کو بہاتا رہا مگر اب اس کا جسم خوفناک حد تک بیدار ہو چکا تھا۔ اس کے تصور کی شدت نے اس کی جسمانی حیات کی نوک پلک کچھ اس طور پر نکالی تھی کہ اب زندگی اس کے لئے سویوں کا بستر بن گئی ہر خیال ایک نشتر بن گیا اور عورت اس کی نظروں میں ایسی شکل اختیار کر گئی جس کو وہ بیان بھی کرنا چاہتا تو نہ کر سکتا۔

جاوید کبھی انسان تھا مگر اب انسانوں سے اسے نفرت تھی، اس قدر کہ اپنے آپ سے بھی متنفر ہو چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ خود کو ذلیل کرنا چاہتا تھا اس طور پر کہ ایک عرصہ تک اس کے خوبصورت خیال جن کو وہ اپنے دماغ میں پھولوں کی طرح سجاکے رکھتا رہا تھا غلاظت سے لتھڑے رہیں۔

”مجھے نفاست تلاش کرنے میں ناکامی رہی ہے لیکن غلاظت تو میرے

چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے اب جی یہ چاہتا ہے کہ اپنی روح اور اپنے جسم کے ہر ذرے کو اس غلاظت سے آلودہ کر دوں، میری ناک جو اس سے پہلے خوشبوؤں کی متحسں رہی ہے اب بدبو دار اور متعفن چیزیں سونگھنے کے لئے جیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ میں نے آج اپنے پرانے خیالات کا چھ اتار کر اس مکملے کا رخ کیا ہے جہاں ہر شے ایک پراسرار تعفن میں لپٹی نظر آتی ہے یہ دنیا کس قدر بھیا نک طور پر حسین ہے، ناک شاہی اینٹوں کا ناموار فرش اس کے سامنے تھا الٹین کی بیمار روشنی میں جاوید نے جب اس فرش کی طرف اپنی بدلی ہوئی نظروں سے دیکھا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ بہت سی نکلی عورتیں اوندھی سیدھی لیٹی ہیں جن کی ہڈیاں جا بجا ابھر رہی ہیں۔ اس نے ارادہ کیا کہ اس فرش کو طے کر کے کھڑا لے مکان کی سیڑھیوں تک پہنچ جائے اور کونٹے پر چڑھ جائے مگر میوہل کمیٹی کی الٹین غیر ختم نکلی باندھے اس کی طرف گھور رہی تھی اس کے بڑھنے والے قدم رک گئے اور وہ بھنسا سا گیا ”یہ الٹین مجھے کیوں گھور رہی ہے۔۔۔۔۔ یہ میرے راستے میں کیوں روڑے اٹھا رہی ہے۔“ وہ جانتا تھا کہ یہ محض وہمہ ہے اور اصلیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں لیکن پھر بھی اس کے قدم رک جاتے تھے اور وہ اپنے دل میں تمام بھیا نک ارادے لیے موری کے اس پار کھڑا رہ جاتا تھا وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس کی زندگی کے ستائیس برسوں کی جھجک جو اسے ورثے میں ملی تھی، اس الٹین میں جمع ہو گئی ہے یہ جھجک جس کو پرانی کینپلی کی طرح اتار کر وہ اپنے گھر چھوڑ آیا تھا اس سے پہلے وہاں پہنچ چکی تھی جہاں اسے اپنی زندگی کا سب سے بھدا کھیل کھیلنا تھا۔ ایسا کھیل جو اسے کچھڑ میں لت پت کر دے اس کی روح کو ملوٹ کر دے۔

ایک میلی کنبلی عورت اس مکان میں رہتی تھی اس کے پاس چار پانچ جوان عورتیں تھیں، جو رات کے اندھیرے اور دن کے اجالے میں یکساں بھدے پن سے پیشہ کراتی تھیں یہ عورتیں گندی موری سے فداقت نکالنے والے پمپ کی طرح دن رات چلتی رہتی تھیں جاوید کو اس قحبہ خانے کے متعلق اس کے ایک دوست نے بتایا تھا جو حسن و عشق کی تاش کنی مرتبہ اس قبرستان میں دفن کر چکا تھا جاوید سے وہ کہا کرتا تھا تم عورت عورت پکارتے ہو۔۔۔۔۔ عورت ہے کہاں؟۔۔۔۔۔ مجھے تو اپنی زندگی میں صرف ایک عورت نظر آئی جو میری ماں تھی مستورات البتہ دیکھی ہیں اور ان کے متعلق سنا بھی ہے لیکن جب کبھی عورت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو میں نے مائی جیواں کے کوٹھے کو اپنا بہترین رفیق پایا ہے بخدا مائی جیواں انسان نہیں فرشتہ ہے۔۔۔۔۔ خدا اس کو خضر کی عمر عطا فرمائے۔

جاوید مائی جیواں اور اس کے یہاں کی چار پانچ پیشہ کرانے والی عورتوں کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا اس کو معلوم تھا کہ ان میں سے ایک ہر وقت گہرے رنگ کے شیشوں والا چشمہ پہنے رہتی ہے اس لیے کہ کسی بیماری کے باعث اس کی آنکھیں خراب ہو چکی ہیں ایک کالی کلونی لونڈیا ہے جو ہر وقت ہنستی رہتی ہے اس کے متعلق جاوید جب سوچتا تو عجیب و غریب تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے کھینچ جاتی ”مجھے ایسی ہی عورت چاہیے جو ہر وقت ہنستی ہے ایسی عورتوں کو ہنستے ہی رہنا چاہیے۔۔۔۔۔ جب وہ ہنستی ہوگی تو اس کے کالے کالے ہونٹ یوں کھلتے ہوں گے جیسے بدبودار گندے پانی میں میلے کھیلے بن بن کر پھلتے ہیں۔“

مائی جیواں کے پاس ایک اور چھوکری بھی تھی جو باقاعدہ طور پر پیشہ کرانے سے پہلے گلیوں اور بازاروں میں بھیک مانگا کرتی تھی اب ایک برس سے وہ اس مکان میں تھی جہاں اٹھارہ برسوں سے یہی کام ہو رہا تھا یہ اب پوڈرا اور سرخی لگاتی تھی جاوید اس کے متعلق بھی سوچتا "اس کے سرخی لگے گال بالکل" دانداریبیوں کے مانند ہوں گے۔۔۔۔۔ جو ہر کوئی خرید سکتا ہے۔

ان چار پانچ عورتوں میں سے جاوید کی کسی خاص پر نظر نہیں تھی۔۔۔۔۔" مجھے کوئی بھی مل جائے میں چاہتا ہوں کہ مجھ سے دام لیے جائیں اور کھٹ سے ایک عورت میری بغل میں تھما دی جائے ایک سیکنڈ کی دیر نہ ہونی چاہیے کسی قسم کی گفتگو نہ ہو کوئی نرم و نازک فقرہ منہ سے نکلنے نہ پائے قدموں کی چاپ سنائی دے دروازہ کھلنے کی کھڑکھڑاہٹ پیدا ہو۔۔۔۔۔ روپے کھٹکنائیں اور آوازیں بھی آئیں مگر منہ بند رہے اگر آواز نکلے تو ایسی جو انسانی آواز معلوم نہ ہو ملاقات ہو بالکل حیوانوں کی طرح، تہذیب و تمدن کے صندوق میں تالا لگ جائے۔ جموڑی دیر کے لیے ایک ایسی دنیا آباد ہو جائے جس میں سو گھنٹے، دیکھنے اور سننے کی نازک حیات رنگ لگے استرے کے مانند کند ہو جائیں"

جاوید بے چین ہو گیا ایک الجھن سی اس کے دماغ میں پیدا ہو گئی ارادہ اس کے اندر اتنی شدت اختیار کر چکا تھا کہ اگر پہاڑ بھی اس کے راستے میں ہوتے تو وہ ان سے بھڑ جاتا۔ مگر میونسپل کمیٹی کی ایک اندھی لائین جس کو ہوا کا ایک جھونکا بجھا سکتا تھا، اس کی راہ میں بہت بری طرح حائل ہو گئی تھی۔

اس کی بغل میں پان والے کی دکان کھلی تھی، تیز روشنی میں اس کی چھوٹی سی

دکان کا اسباب اس قدر نمایاں ہو رہا تھا کہ بہت سی چیزیں نظر نہیں آتی تھیں بجلی کے قمتے کے ارد گرد دکھیاں اس انداز سے اڑ رہی تھیں جیسے ان کے پر بوجھل ہو رہے ہیں جاوید نے جب ان کی طرف دیکھا تو اس کی الجھن میں اضافہ ہو گیا وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے کوئی سست رفتار چیز نظر آئے اس کا کرگزر نے کا ارادہ جو وہ اپنے گھر سے لے کر یہاں آیا تھا ان مکھیوں کے ساتھ بار بار نکرایا اور وہ اس کے احساس سے اس قدر پریشان ہوا کہ ایک بلڑسا اس کے دماغ میں مچ گیا "میں ڈرتا ہوں۔۔۔۔ میں خوف کھاتا ہوں اس الٹین سے مجھے ڈر لگتا ہے میرے تمام ارادے اس نے تباہ کر دیئے۔۔۔۔ میں ڈر پوک ہوں۔۔۔۔ میں ڈر پوک ہوں۔۔۔۔ لعنت ہو مجھ پر!"

اس نے کئی لعنتیں اپنے آپ پر بھیجیں مگر خاطر خواہ اثر پیدا نہ ہوا۔ اس کے قدم آگے نہ بڑھ سکے تاکہ شاہی اینٹوں کا ناہموار فرش اس کے سامنے لیٹا رہا۔ گرمیوں کے دن تھے نصف رات گزرنے پر بھی ہوا ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی بازار میں آمدورفت بہت کم تھی گنتی کی صرف چند دکانیں کھلی تھیں فضا خاموشی میں لپی ہوئی تھی البتہ کبھی کبھی کسی کو ٹھٹھے سے ہوا کے گرم جھونکے کے ساتھ تھکی ہوئی موسیقی کا ایک ٹکڑا اڑا کر ادھر پلا آتا تھا اور گاڑھی خاموشی میں گھل جاتا تھا۔

جاوید کے سامنے یعنی مائی جیواں کے فجبہ خانے سے ادھر ہٹ کر بڑے بازار میں جو دکانوں کے اوپر کونٹوں کی ایک قطار تھی اس میں کئی جگہ زندگی کے آغا نظر آ رہے تھے اس کے بالمتبادل کھڑکی میں تیز روشنی کے قمتے کے نیچے ایک سیاہ قام عورت بیٹھی پکھا جھل رہی تھی اس کے سر کے اوپر بجلی کا باب جل رہا تھا اور ایسا

دلکھائی دیتا تھا کہ سفید آگ کا ایک گولا ہے جو پکھل پکھل کر اس ویشیا پر گر رہا ہے۔ جاوید اس سیاہ فام عورت کے متعلق کچھ غور کرنے ہی والا تھا کہ بازار کے اس سرے سے جو اس کی آنکھوں سے اوجھل تھا بڑے بھدے نعروں کی صورت میں چند آوازیں بلند ہوئیں تھوڑی دیر کے بعد تین آدمی جھومتے جھامتے شراب کے نشے میں چور نمودار ہوئے تینوں کے تینوں اس سیاہ فام عورت کے گونچے کے نیچے پہنچ کر کھڑے ہو گئے اور جاوید کے کانوں نے ایسی ایسی واہیات باتیں سنیں کہ اس کے تمام ارادے اس کے اندر سمٹ کر رہ گئے۔

ایک شرابی نے جس کے قدم بہت زیادہ لڑکھڑا رہے تھے، اپنے مونچھوں بھرے ہونٹوں سے بھری بھدی آواز کے ساتھ ایک بوسہ نوچ کر اس کالی ویشیا کی طرف اچھالا اور ایک ایسا فقرہ کما کہ جاوید کی ساری ہمت پست ہو گئی گونچے پر برقی لیمپ کی روشنی میں اس سیاہ فام عورت کے ہونٹ ایک آہستہ قہقہے نے وا کے اور اس نے شرابی کے فقرے کا جواب یوں دیا جیسے نوکری بھر کوڑا نیچے پھینک دیا ہے نیچے غیر مربوط قہقہوں کا ایک فوارہ سا چھوٹ پڑا اور جاوید کے دیکھتے دیکھتے وہ تینوں شرابی گونچے پر چڑھے تھوڑی دیر کے بعد وہ نشست جہاں وہ کالی ویشیا بیٹھی تھی، خالی ہو گئی۔

جاوید اپنے آپ سے اور زیادہ متنفر ہو گیا۔ ”تم۔۔۔۔۔تم۔۔۔۔۔تم کیا ہو؟۔۔ میں پوچھتا ہوں، آخر تم کیا ہو۔۔۔۔۔تم یہ ہو، نہ تم وہ ہو۔۔۔۔۔تم انسان ہو نہ حیوان۔۔۔ تمہاری ذہانت و کاوت آج سب دھڑی کی دھڑی رہ گئی ہے تین شرابی آتے ہیں، تمہاری طرح ان کے دل میں ارادہ نہیں ہوتا لیکن بے

دھڑک اس ویشیا سے وہی باتیں کرتے ہیں اور ہنستے، تھکتے لگاتے کوٹھے پر چڑھ جاتے ہیں گویا پتنگ اڑانے جا رہے ہیں۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ اور تم جو کہ اچھی طرح سمجھتے ہو کہ تمہیں کیا کرنا ہے یوں بے وقوفوں کی طرح بیچ بازار میں کھڑے ہو اور ایک بے جان لاشین سے خوف کھا رہے ہو تمہارا ارادہ اس قدر صاف اور شفاف ہے لیکن پھر بھی تمہارے قدم آگے نہیں بڑھتے۔۔۔۔۔ لعنت ہو تم پر“

جاوید کے اندر ایک لمحے کے لیے خود انتقامی کا جذبہ پیدا ہوا۔ اس کے قدموں میں جنبش ہوئی اور موری پھانڈ کر وہ مانی جیواں کے کوٹھے کی طرف بڑھا۔ قریب تھا کہ وہ لپک کر سیڑھیوں کے پاس پہنچ جائے کہ اوپر سے ایک آدمی اترا۔ جاوید پیچھے ہٹ گیا غیر ارادی طور پر اس نے اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش بھی کی لیکن کوٹھے پر سے نیچے آنے والے آدمی نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔

اس آدمی نے اپنا ملل کا کرتہ اتار کر کاندھے پر دھرا تھا اور داہنی کلائی میں موتیے کے پھولوں کا مسلا ہوا ہار لپٹا تھا اس کا بدن پسینے سے شرابور ہو رہا تھا جاوید کے وجود سے بے خبر وہ اپنے تہہ کو دونوں ہاتھوں سے گھنٹوں تک اونچا کیے تا تک شاہی اینٹوں کا اونچا نیچا فرش طے کر کے موری کے اس پار چلا گیا اور جاوید نے سوچنا شروع کیا کہ اس آدمی نے اس کی طرف کیوں نہیں دیکھا۔

اس دوران میں اس نے لاشین کی طرف دیکھا تو وہ اسے یہ کہتی معلوم ہوئی تم کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کہ تم ڈرپوک ہو یا دہے تمہیں، پچھلے برس برسات میں جب تم نے اس ہندو لڑکی اندر سے اپنی محبت کا

انظہار کرنا چاہا تھا تو تمہارے جسم میں سکت تک نہیں رہی تھی کیسے کیسے بھیا تک خیال تمہارے دماغ میں پیدا ہوئے تھے یاد ہے تم نے ہندو مسلم فساد کے متعلق بھی سوچا تھا اور ڈر گئے تھے اس لڑکی کو تم نے اسی ڈر کے مارے بھلا دیا اور حیدرہ سے تم اس لیے محبت نہ کر سکے کہ وہ تمہاری رشتہ دار تھی اور تمہیں اس بات کا خوف تھا کہ تمہاری محبت کو غلط نظروں سے دیکھا جائے گا کیسے کیسے وہ تمہارے اوپر ان دنوں مسلط تھے۔۔۔۔۔ اور پھر تم نے بالقیس سے محبت کرنا چاہی مگر اس کو صرف ایک بار دیکھ کر تمہارے سب ارادے غائب ہو گئے اور تمہارا دل ویسے کا ویسے بکھر رہا۔۔۔۔۔ کیا تمہیں اس بات کا احساس نہیں کہ ہر بار تم نے اپنی بے لوث محبت کو آپ ہی شک کی نظروں سے دیکھا ہے تمہیں اس بات کا کبھی پوری طرح یقین نہیں آیا کہ تمہاری محبت ٹھیک فطری حالت میں ہے تم ہمیشہ ڈرتے ہو اس وقت بھی تم خائف ہو یہاں گھریلو عورتوں اور لڑکیوں کا سوال نہیں، ہندو مسلم فساد کا بھی اس جگہ کوئی خدشہ نہیں لیکن اس کے باوجود تم کبھی اس کو ٹھٹھے پر نہیں جاسکو گے۔ میں دیکھوں گی تم کس طرح اوپر جاتے ہو جاوید کی رہی سہی ہمت بھی پست ہو گئی اس نے محسوس کیا وہ واقعی پرلے درجے کا ڈرپوک ہے۔۔۔۔۔ بیتے ہوئے واقعات تیز ہوا میں رکھی ہوئی کتاب کے اوراق کی طرح اس کے دماغ میں دیر تک پھر پھڑپھڑاتے رہے اور پہلی مرتبہ اس کو اس بات کا بڑی شدت کے ساتھ احساس ہوا کہ اس کے وجود کی بنیادوں میں ایک ایسی جھجک ٹپلھی ہوئی ہے جس نے اسے قابل رحم حد تک ڈرپوک بنا دیا ہے۔

سامنے میز میوں سے کسی کے اترنے کی آواز آئی تو جاوید اپنے خیالات سے

چونک پڑا وہی جو گہرے رنگ کے شیشوں والی عینک پہنتی تھی اور جس کے متعلق وہ
کئی بار اپنے دوست سے سن چکا تھا سیڑھیوں کے اختتامی چپوترے پر کھڑی تھی،
جاوید گھبرا گیا۔ قریب تھا کہ وہ آگے سرک جائے اس نے بڑے بھدے طریقے پر
اسے آواز دی ”اجی گھبرا جاؤ میری جان گھبراؤ نہیں۔۔۔ آؤ۔۔۔ آؤ۔“ اس کے
بعد اس نے پکارتے ہوئے کہا ”چلے آؤ۔۔۔ آجاؤ۔“

یہ سن کر جاوید کو ایسا محسوس ہوا کہ اگر وہ کچھ دیر وہاں ٹھہرا تو اس کی پیٹھ میں دم
اگ آئے گی جو اس ویشیا کے پککارنے پر ہلنا شروع کر دے گی اس احساس
سمیت اس نے چپوترے کی طرف گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھا مانی جیواں کے
نچہ خانے کی اس عینک چہرہ لوندیا نے کچھ اس طرح اپنے بالائی جسم کو حرکت دی
کہ جاوید کے تمام ارادے پکے ہوئے پیروں کے مانند جھڑ گئے۔ اس نے پھر
پککارا ”آؤ۔۔۔ میری جان! اب آ بھی جاؤ۔“

جاوید اٹھ بھاگا موری پھانڈ کر جب وہ بازار میں پہنچا تو اس نے ایک ایسے
قصبے کی آواز سنی جو خطرناک طور پر بھیا نک تھا وہ کانپ اٹھا۔
جب وہ اپنے گھر کے پاس پہنچا تو اس کے خیالات کے جوم میں سے دفعتاً
ایک خیال رینگ کر آگے بڑھا جس نے اس کو تسکین دی ”جاوید! تم ایک بہت
بڑے گناہ سے بچ گئے خدا کا شکر بجا آؤ۔“

☆☆☆☆☆

رام کھلاون

کھنل مارنے کے بعد میں ٹرنک میں پرانے کاغذات دیکھ رہا تھا کہ سعید بھائی جان کی تصویر مل گئی میز پر ایک خالی فریم پڑا تھا۔۔۔۔۔ میں نے اس تصویر سے اس کو پر کر دیا اور کرسی پر بیٹھ کر ڈھولبی کا انتظار کرنے لگا۔

ہر اتوار کو مجھے اسی طرح انتظار کرنا پڑتا تھا کیونکہ غفے کی شام کو میرے دھلے ہوئے کپڑوں کا اسٹاک ختم ہو جاتا تھا۔۔۔۔۔ مجھے اسٹاک تو نہیں کہنا چاہیے اس لیے کہ مغلی کے زمانے میں میرے پاس صرف اتنے کپڑے تھے جو بمشکل چھ سات دن تک میری وضععداری قائم رکھ سکتے تھے۔

میری شادی کی بات چیت ہو رہی تھی اور اس سلسلے میں پچھلے دو تین اتواروں سے میں ماہم جا رہا تھا ڈھولبی شریف آدمی تھا، یعنی دھلائی نہ ملنے کے باوجود ہر اتوار کو باقاعدگی کے ساتھ پورے دس بجے میرے کپڑے لے آتا تھا لیکن پھر بھی مجھے کھٹکا تھا کہ ایسا نہ ہو، میری مادہ بندگی سے تنگ آ کر کسی روز میرے کپڑے چور بازار میں فروخت کر دے اور مجھے اپنی شادی ک بات چیت میں بغیر کپڑوں کے حصہ لیتا پڑے جو کہ ظاہر ہے بہت ہی معیوب بات ہوتی۔

کھولی میں مرے ہوئے کھملوں کی نہایت ہی کمزور بو پھیلی ہوئی تھی میں سوچ رہا تھا کہ اسے کس طرح دباؤں کہ ڈھولبی آگیا ”صاحب سلام“ کر کے اس نے اپنی گھڑی کھولی اور میرے گنتی کے کپڑے میز پر رکھ دیے ایسا کرتے ہوئے اس کی نظر سعید بھائی جان کی تصویر پر پڑی ایک دم چونک کر اس نے اس کو غور سے

دیکھنا شروع کر دیا اور ایک عجیب و غریب آواز خلق سے نکالی ”ہے ہے ہے ہیں“

میں نے اس سے پوچھا ”کیا بات ہے دھو بی؟“

دھو بی کی نظریں تصویر پر جمی رہیں ”یہ تو ساعید شالیم بالشر ہے؟“

”کون؟“

دھو بی نے میری طرف دیکھا اور بڑے وثوق سے کہا ”ساعید شالیم بالشر“

”تم جانتے ہو انہیں“

دھو بی نے زور سے سر ہلایا ”ہاں۔۔۔۔۔ وہ بھائی ہوتا۔۔۔۔۔ ادھر کوالا میں

ان کا کوٹھی ہوتا۔۔۔۔۔ ساعید شالیم بالشر۔۔۔۔۔ میں ان کا کپڑا دھوتا ہوتا“

میں نے سوچا یہ وہ برس پہلے کی بات ہوگی کیونکہ سعید حسن اور محمد حسن بھائی

جان نے فوجی آئی لینڈ جانے سے پہلے تقریباً ایک برس بمبے میں پریکٹس کی تھی

چنانچہ میں نے اس سے کہا ”دس برس پہلے کی بات کرتے ہو تم“

دھو بی نے زور سے سر ہلایا ”ہاں۔۔۔۔۔ ساعید شالیم بالشر جب گیا تو ہم کو

ایک پکڑی دیا۔۔۔۔۔ ایک دھوتی دیا۔۔۔۔۔ ایک کرتہ دیا۔۔۔۔۔ نیا بہت اچھا

لوگ ہوتا۔۔۔۔۔ ایک کا ڈاڑھی ہوتا۔۔۔۔۔ یہ بڑا“ اس نے ہاتھ سے ڈاڑھی کی لمبائی

بتائی اور سعید بھائی جان کی تصویر کی طرف اشارہ کر کے کہا ”یہ چھوٹا ہوتا۔۔۔۔۔ اس

کا تین باوا لوگ ہوتا وہ لڑکا، ایک لڑکی۔۔۔۔۔ ہمارے سک بہت کھیلتا

ہوتا۔۔۔۔۔ کوالا بے میں کوٹھی ہوتا۔۔۔۔۔ بہت بڑا“

میں نے کہا ”دھو بی یہ میرے بھائی ہیں“

دھو بی نے خلق سے عجیب و غریب آواز نکالی ”ہے ہے ہے ہے“

ہیں۔۔۔۔۔ ساعید شالیم بالشر؟“

میں نے اس کی حیرت دور کرنے کی کوشش کی اور کہا ”یہ تصویر سعید حسن بھائی جان کی ہے۔۔۔ ڈاڑھی والے محمد حسن ہیں۔۔۔ ہم سب سے بڑے“

دھوبی نے میری طرف گھور کے دیکھا، پھر میری کھولی کی غمازت کا جائزہ لیا۔۔۔ ایک چھوٹی سی گھڑی تھی بجلی کی لائن سے محروم، ایک میز تھا ایک کرسی اور ایک ماٹ کی کوٹ جس میں ہزار ہا کھٹل تھے دھوبی کو یقین نہیں آتا تھا کہ میں ساعید شالیم بالشر کا بھائی ہوں لیکن جب میں نے اس کو ان کی بہت سی باتیں بتائیں تو اس نے سر کو عجیب طریقے سے جنبش دی اور کہا ”ساعید شالیم بالشر کو لا بے میں رہتا اور تم اس کھولی میں“

میں نے بڑے فلسفیانہ انداز میں کہا ”دنیا کے یہی رنگ ہیں دھوبی۔۔۔۔۔ کہیں دھوپ کہیں چھاؤں۔۔۔۔۔ پانچ انگلیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں“

”ہاں صاحب۔۔۔۔۔ تم بروہر کہتا ہے“ یہ کہہ کر دھوبی نے گھڑی اٹھائی اور باہر جانے لگا مجھے اس کے حساب کا خیال آیا جیب میں صرف آٹھ آنے تھے جو شادی کی بات چیت کے سلسلے میں ماہم تک جانے کے لئے بمشکل کافی تھے صرف یہ بتانے کے لئے کہ میری نیت صاف ہے میں نے اسے ٹھہرایا اور کہا ”دھوبی۔۔۔۔۔ کپڑوں کا حساب یاد رکھنا۔۔۔۔۔ خدا معلوم کتنی دھالائیں ہو چکی ہیں۔“

دھوبی نے اپنی دھوتی کا لانگ درست کیا اور کہا ”ساب ہم حساب نہیں رکھت۔۔۔۔۔ ساعید شالیم بالشر کا ایک برس کام کیا۔۔۔۔۔ جو دے دیا لے

لیا۔۔۔ ہم حساب جانت ہی ما ہیں“

یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور میں شادی کی بات چیت کے سلسلے میں ماہم جانے کے لیے تیار ہونے لگا۔

بات چیت کامیاب رہی۔۔۔۔۔ میری شادی وہ گئی حالات بھی بہتر ہو گئے اور میں سینڈ پیر خان، اسٹریٹ کی کھولی سے جس کا کرایہ نو روپے ماہوار تھا کلیر روڈ کے ایک فلیٹ میں جس کا کرایہ پینتیس روپے ماہوار تھا، اٹھ آیا اور دھوبی کو ماہ بہ ماہ باقاعدگی سے اس کی دھالائیوں کے دام ملنے لگے۔

دھوبی خوش تھا کہ میرے حالات پہلے کی نسبت بہتر ہیں چنانچہ اس نے میری بیوی سے کہا ”بیگم صاحب۔۔۔۔۔ صاب کا بھائی سعید سلیم بالشر بہت بڑا آدمی ہوتا۔۔۔۔۔ ادھر کو لا بہ میں رہتا ہوتا۔۔۔۔۔ جب گیا تو ہم کو ایک پگڑی، ایک دھوتی، ایک کرتا دیا ہوتا۔۔۔۔۔ تمہارا صاب بھی ایک دن بڑا آدمی بنتا ہوتا۔“ میں اپنی بیوی کو تصویر والا قصہ سنا چکا تھا اور اس کو یہ بھی بتا چکا تھا کہ مغلیں کے زمانے میں کتنی دریا دلی سے دھوبی نے میرا ساتھ دیا تھا۔۔۔۔۔ جب دے دیا جو دے دیا۔ اس نے کبھی شکایت کی ہی نہ تھی۔۔۔۔۔ لیکن میری بیوی کو تمبوڑے عرصے کے بعد ہی اس سے یہ شکایت پیدا ہو گئی کہ وہ حساب نہیں کرتا میں نے اس سے کہا ”چار برس میرا کام کرتا رہا ہے۔۔۔۔۔ اس نے کبھی حساب نہیں کیا۔“ جواب ملا ”حساب کیوں کرتا۔۔۔۔۔ ویسے دو گئے چو گئے وصول کر لیتا ہوگا“ وہ کیسے؟

”آپ نہیں جانتے۔۔۔۔۔ جن کے گھروں میں بیویاں نہیں ہوتیں ان کو

ایسے لوگ بے وقوف بنانا جانتے ہیں“

قریب قریب ہر مہینے دھو بی سے میری بیوی کی چٹائی ہوتی تھی کہ وہ کپڑوں کا حساب الگ اپنے پاس کیوں نہیں رکھتا۔ وہ بڑی سادگی سے صرف اتنا کہہ دیتا ”نیگم صاحب۔۔۔ ہم حساب جانتے ہیں ہم جھوٹے ہیں بولے گا۔۔۔ ساعید شایم بالشر جو تمہارے صاحب کا بھائی ہوتا۔۔۔ ہم ایک برس اس کا کام کیا کرتا۔۔۔ نیگم صاحب بولتا دھو بی تمہارا اتنا پیسہ ہوا۔۔۔ ہم بولتا ٹھیک ہے۔“

ایک مہینے ڈھائی سو کپڑے دھائی میں گئے میری بیوی نے آزمانے کے لیے اس سے کہا ”دھو بی اس مہینے ساٹھ کپڑے ہوئے“ اس نے کہا ”ٹھیک ہے۔۔۔ نیگم صاحب! تم جھوٹے ہیں بولے گا“ میری بیوی نے ساٹھ کپڑوں کے حساب سے جب اس کو دوام دینے تو اس نے ماتھے کے ساتھ روپے چھو کر سلام کیا اور چلنے لگا میری بیوی نے اسے روکا ”ٹھہرو دھو بی۔۔۔ ساٹھ نہیں، ڈھائی سو کپڑے تھے۔۔۔ لو اپنے باقی روپے میں نے مذاق کیا تھا۔“

دھو بی نے صرف اتنا کہا ”نیگم صاحب تم جھوٹے ہیں بولے گا“ باقی کے روپے اپنے ماتھے کے ساتھ چھو کر سلام کیا اور چلا گیا۔

شادی کے دو برس بعد میں دلی چلا گیا۔ ڈیڑھ برس وہاں رہا، پھر واپس بمبئی آ گیا اور ماہم میں رہنے لگا تین مہینے کے دوران میں ہم نے چار دھو بی تبدیل کئے کیونکہ بے حد بے ایمان اور جھوٹے تھے۔ ہر دھائی پر جھڑا کھڑا ہو جاتا تھا کبھی

کپڑے کم نکلتے تھے کبھی دھانی نہایت ذلیل ہوتی تھی۔ ہمیں اپنا پرانا دھوبی یاد آنے لگا ایک روز جب کہ ہم بالکل بغیر دھوبی کے رہ گئے تھے وہ اچانک آگیا اور کہنے لگا صاب کو ہم نے تک دن بس میں دیکھا۔۔۔۔۔ ہم بولا ایسا کیسا۔۔۔۔۔ صاب تو دلی چلا گیا تھا۔۔۔ ہم نے ادھر بانی کھلہ میں تپاس کیا چھاپہ والا بولا، ادھر ماتم میں تپاس کرو۔۔۔۔۔ باجو والی چائی میں صاب کا دوست ہوتا۔۔۔۔۔ اس سے پوچھا اور آگیا۔

ہم بہت خوش ہوئے اور ہمارے کپڑوں کے دن نئی خوشی گزرنے لگے۔
 کانگریس برسر اقتدار آئی تو امتناع شراب کا حکم نافذ ہو گئے انگریزی شراب ملتی تھی لیکن ویسی شراب کی کشید اور فروخت بالکل بند ہو گئی ننانوے فیصدی دھوبی شراب کے عادی تھے۔۔۔۔۔ دن بھر پانی میں رہنے کے بعد شام کو پاؤ آدھ پاؤ شراب ان کی زندگی کا جزو بن چکی تھی۔۔۔۔۔ ہمارا دھوبی بیمار ہو گیا اس بیماری کا علاج اس نے اس زہریلی شراب سے کیا جو ناجائز طور پر کشید کر کے چھپے چوری بکتی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے معدے میں خطرناک گڑ بڑ پیدا ہو گئی جس نے اس کو موت کے دروازے تک پہنچا دیا۔

میں بے حد مصروف تھا صبح چھ بجے گھر سے نکلتا تھا اور رات کو ساڑھے دس بجے لوٹتا تھا میری بیوی کو جب اس کی خطرناک بیماری کا علم ہوا تو وہ نیکیسی لے کر اس کے گھر گئی نوکر اور شوہر کی مدد سے اس کو گاڑی میں بٹھایا اور ڈاکٹر کے پاس لے گئی ڈاکٹر بہت متاثر ہوا چنانچہ اس نے فیس لینے سے انکار کر دیا لیکن میری بیوی نے کہا ”ڈاکٹر صاحب! آپ سارا ثواب حاصل نہیں کر سکتے“

ڈاکٹر مسکرایا ”تو آدھا آدھا کر لیجئے“

ڈاکٹر نے آدھی فیس قبول کر لی

دھوئی کا باقاعدہ علاج ہوا معدے کی تکلیف چند انجکشنوں ہی سیدور ہو گئی
نفاہت تھی وہ آہستہ آہستہ مقوی دواؤں کے استعمال سے ختم ہو گئی چند مہینوں کے
بعد وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھا اور اٹھتے بیٹھتے ہمیں دعائیں دیتا تھا بھگوان صاحب کو
سامید شالیم بالشنر بنائے۔۔۔۔۔ ادھر کوالا بے میں صاب رہنے کو
جائے۔۔۔۔۔ باوالوگ ہوں۔۔۔۔۔ بہت بہت پیسہ ہو۔۔۔۔۔ بیگم صاب دھوئی کو
لینے آیا۔۔۔۔۔ موٹر میں۔۔۔۔۔ ادھر کٹے (قلعے) میں بہت بڑے ڈاکٹر کے پاس
لے گیا جس کے پاس میم ہوتا۔۔۔۔۔ بھگوان بیگم صاب کو خسر رکھے۔۔۔۔۔

کئی برس گزر گئے اس دوران میں کئی سیاسی انقلاب آئے دھوئی بلا ناظرہ اتوار کو
آتا رہا اس کی صحت اب بہت اچھی تھی اتنا عرصہ گزرنے پر بھی وہ ہمارا سلوک نہیں
بھولا تھا ہمیشہ دعائیں دیتا تھا شراب قطعی طور پر چھوٹ چکی تھی شروع میں وہ کبھی
کبھی اسے یاد کرتا تھا پر اب نام تک نہ لیتا تھا سارا دن پانی میں رہنے کے بعد تھکن
دور کرنے کے لیے اب اسے دارو کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔

حالات بہت زیادہ بگڑ گئے بنو ارہ ہوا تو ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے
ہندوؤں کے علاقوں میں مسلمان اور مسلمانوں کے علاقوں میں ہندوؤں کی روشنی
اور رات کی تاریکی میں ہلاک کیے جانے لگے میری بیوی لاہور چلی گئی۔

جب حالات اور زیادہ خراب ہوئے تو میں نے دھوئی سے کہا ”دیکھو دھوئی
اب تم کام بند کرو۔۔۔۔۔ یہ مسلمانوں کا محلہ ہے ایسا نہ ہو کوئی تمہیں مار ڈالے“

دھوبی مسکرایا ”صاب اپن کو کوئی نہیں مارتا“

ہمارے محلے میں کئی وارداتیں ہوئیں مگر دھوبی برابر آتا رہا

ایک اتوار میں گھر میں بیٹا اخبار پڑھ رہا تھا کھیلوں کے صفحے پر کرکٹ کے میچوں کا سکور درج تھا اور پہلے صفحے پر فسادات کے شکار ہندوؤں اور مسلمانوں کے اعداد و شمار۔۔۔ میں ان دونوں کی خوفناک مماثلت پر غور کر رہا تھا کہ دھوبی آ گیا۔ کاپی نکال کر میں نے کپڑوں کی پڑتال شروع کر دی تو دھوبی نے ہنس ہنس کے باتیں شروع کر دیں سامید شالیم بالشر بہت اچھا آدمی ہوتا۔۔۔ یہاں سے جاتا تو ہم کو ایک گلڑی، ایک دھوبی، ایک کرتا دیا ہوتا۔۔۔ تمہارا بیگم صاب بھی ایک دم اچھا آدمی ہوتا۔۔۔ باہر گام گیا ہے نا؟۔۔۔۔۔ اپنے ملک میں؟۔۔۔۔۔ ادھر کا گج لکھو تو ہمارا سلام بولا۔۔۔۔۔ موٹر لے کر آیا ہماری کھولی میں۔۔۔۔۔ ہم کو اتنا جلاب آتا ہوتا ڈاکٹر نے سوئی لگایا۔۔۔۔۔ ایک دم ٹھیک ہو گیا۔۔۔۔۔ ادھر کا گج لکھو تو ہمارا سلام بولا۔۔۔۔۔ بولورام کھلا اون بولتا ہے ہم کو بھی کا گج لکھو۔۔۔۔۔

میں نے اس کی بات کاٹ کا ذرا تیزی سے کہا ”دھوبی۔۔۔۔۔ دارو شروع کرو؟“

دھوبی ہنستا ”دارو؟۔۔۔۔۔ دارو کہاں ملتی ہے صاب؟“

میں نے اور کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا اس نے میلے کپڑوں کی گٹھڑی بنائی اور سلام کر کے چلا گیا۔

چند دنوں میں حالات بہت ہی زیادہ خراب ہو گئے لاہور سے تار پڑتا رآنے

لگے کہ سب کچھ چھوڑو اور جلدی چلے آؤ میں نے ہفتے کے روز ارادہ کر لیا کہ اتوار کو چل دوں گا۔۔۔۔۔ لیکن مجھے صبح سویرے نکل جانا تھا کپڑے دھو بی کے پاس تھے میں نے سوچا کرفیو سے پہلے پہلے اس کے ہاں جا کر لے آؤں، چنانچہ شام کو وکنوریہ لے کر مہاکاشمی روانہ ہو گیا۔

کرفیو کے وقت میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا، اس لیے آمدورفت جاری تھی ٹریمیں چل رہی تھیں میری وکنوریہ پل کے پاس پہنچی تو ایک دم شور برپا ہوا لوگ اندھا دھند بھاگنے لگے ایسا معلوم ہوا جیسے سانڈوں کی لڑائی ہو رہی ہے۔۔۔۔۔ ہجوم چھوڑا ہوا تو دیکھا دو رہتیوں کے پاس بہت سے دھو بی لٹھیاں ہاتھ میں لیے ناچ رہے ہیں اور طرح طرح کی آوازیں نکال رہے ہیں مجھے ادھر ہی جانا تھا مگر وکنوریہ والے نے انکار کر دیا میں نے اس کو کرایہ ادا کیا اور پیدل چل پڑا۔۔۔۔۔ جب دھو بیوں کے پاس پہنچا تو وہ مجھے دیکھ کر خاموش ہو گئے۔

میں نے آگے بڑھ کر ایک دھو بی سے پوچھا ”رام کھلاؤن کہاں رہتا ہے؟“
ایک دھو بی جس کے ہاتھ میں لٹھی تھی جھومتا ہوا اس دھو بی کے پاس آیا جس سے میں نے سوال کیا تھا ”کیا پوچھت ہے؟“

”پوچھت ہے رام کھلاؤن کہاں رہتا ہے؟“
شراب سے دھت دھو بی نے قریب قریب میرے اوپر چڑھ کر پوچھا ”تم کون ہے؟“

”میں؟۔۔۔۔۔ رام کھلاؤن میرا دھو بی ہے“
”رام کھلاؤن تبار دھو بی ہے۔۔۔۔۔ تو کس دھو بی کا بچہ ہے“

ایک چلایا ”ہندو دھوبی کا یا مسلمین دھوبی کا“

تمام دھوبی جو شراب کے نشے میں چور تھے کتے تانتے اور لٹھیاں گھماتے
میرے ارد گرد جمع ہو گئے مجھے ان کے صرف ایک سوال کا جواب دینا تھا مسلمان
ہوں یا ہندو؟۔۔۔۔۔ میں بے حد خوفزدہ ہو گیا بھاگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا
تھا کیونکہ میں ان میں گھرا ہوا تھا نر دیک کوئی پولیس والا بھی نہیں تھا جس کو مدد کے
لیے پکارتا۔۔۔۔۔ اور کچھ سمجھ میں نہ آیا تو بے جوڑ الفاظ میں ان سے گفتگو شروع کر
دی ”رام کھلاون ہندو ہے۔۔۔۔۔ ہم پوچھتا ہے وہ کدھر رہتا ہے۔۔۔۔۔ اس کی
کھوٹی کہاں ہے۔۔۔۔۔ دس برس سے وہ ہمارا دھوبی ہے۔۔۔۔۔ بہت بیمار
تھا۔۔۔۔۔ ہم نے اس کا علاج کرایا تھا۔۔۔۔۔ ہماری بیگم۔۔۔۔۔ ہماری میم
صاحب یہاں موٹر لے کر آئی تھی۔۔۔۔۔“ یہاں تک میں نے کہا تو مجھے اپنے اوپر
بہت ترس آیا دل ہی دل میں بہت خفیف ہوا کہ انسان اپنی جان بچانے کے لئے
کتنی نیچی سطح پر اتر آتا ہے اس احساس نے جرأت پیدا کر دی چنانچہ میں نے ان
سے کہا ”میں مسلمین ہوں“

”مارڈالو۔۔۔۔۔ مارڈالو۔۔۔۔۔“ کا شور بلند ہوا

وہ دھوبی جو کہ شراب کے نشے میں دھست تھا ایک طرف دیکھ کر چلایا ”
ٹھہرو۔۔۔۔۔ اسے رام کھلاون مارے گا“

میں نے پیٹ کر دیکھا رام کھلاون مونا ڈنڈا ہاتھ میں لیے لڑکھڑایا تھا۔ اس
نے میری طرف دیکھا اور مسلمانوں کو اپنی زبان میں گالیاں دینا شروع کر دیں
ڈنڈا سر تک اٹھا کر گالیاں دیتا ہوا وہ میری طرف بڑھا میں نے تھکامانہ لہجے میں

کہا ”رام کلاؤن“

رام کلاؤن دھاڑا ”چپ کر بے رام کلاؤن کے۔۔۔۔۔“

میری آخری امید بھی ڈوب گئی جب وہ میرے قریب آ پہنچا تو میں نے خشک گٹے سے ہولے سے کہا ”مجھے پہچانتے نہیں رام کلاؤن؟“

رام کلاؤن نے وار کرنے کے لیے ڈنڈا اٹھایا۔۔۔ ایک دم اس کی آنکھیں سکڑیں، پھر پھیلیں، پھر سکڑیں، ڈنڈا ہاتھ سے گر کر اس نے قریب آ کر مجھے غور سے دیکھا اور پکارا ”صاب!“ پھر وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا ”یہ مسلمین نہیں۔۔۔ یہ میرا صاب ہے۔۔۔ نیگم صاب کا صاب۔۔۔۔۔ وہ موڑ لے کر آیا تھا۔۔۔۔۔ ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔۔۔ جس نے میرا جلاب ٹھیک کیا تھا“

رام کلاؤن نے اپنے ساتھیوں کو بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانے۔۔۔۔۔ سب شرابی تھے تو تو میں میں شروع ہو گئی کچھ دھوبی رام کلاؤن کی طرف ہو گئے اور ہاتھ پائی پر نوبت آ گئی میں نے موقع غنیمت سمجھا اور وہاں سے کھسک گیا۔

دوسرے روز صبح نوبت بچے کے قریب میرا سامان تیار تھا صرف جہاز کے ٹکٹوں کا انتظار تھا جو ایک دوست بلیک مارکیٹ سے حاصل کرنے گیا تھا۔

میں بہت بے قرار تھا دل میں طرح طرح کے جذبات ابل رہے تھے جی چاہتا تھا کہ جلدی ٹکٹ آ جائیں اور میں بندرگاہ کی طرف چل دوں مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اگر وہیں ہو گئی تو میرا فلیٹ مجھے اپنے اندر قید کرے گا۔

دروازے پر دستک ہوئی میں نے سوچا ٹکٹ آ گئے دروازہ کھولا تو باہر دھوبی کھڑا تھا۔

”صاب سلام“

”سلام“

میں اندر آ جاؤں

”آؤ“

وہ خاموشی سے اندر داخل ہوا گٹھڑی کھول کر اس نے کپڑے پلنگ پر رکھے
دھوتی سے اپنی آنکھیں پونچھیں اور گلوگیر آواز میں کہا ”آپ چارپے ہیں صاب؟“
”ہاں“

اس نے رونا شروع کر دیا ”صاب! مجھے ماف کر دو۔۔۔۔۔۔ یہ سب دارو کا
قصور تھا۔۔۔۔۔۔ اور دارو۔۔۔۔۔۔ دارو آج کل مفت ملتی ہے۔۔۔۔۔۔ سینٹھ لوگ
بانٹتا ہے کہ پی کر مسلمین کو مارو۔۔۔۔۔۔ مفت کی دارو کون چھوڑتا ہے
صاب۔۔۔۔۔۔ ہم کو ماف کر دو۔۔۔۔۔۔ ہم پنے لانا تھا۔۔۔۔۔۔ سامعید
شالیم بالفطر ہمارا بہت مہربان ہوتا۔۔۔۔۔۔ ہم کو ایک گٹھڑی، ایک دھوتی، ایک کرتا
دیا ہوتا تمہارا بیگم صاب ہمارا جان بچایا ہوتا۔۔۔۔۔۔ جلاب سے ہم مرنا
ہوتا۔۔۔۔۔۔ وہ موٹر لے کر آتا ڈاکٹر کے پاس لے جاتا اتنا پیسہ خرچ
کرتا۔۔۔۔۔۔ تم ملک جاتا۔۔۔۔۔۔ بیگم صاب سے مت بولنا، رام کھلاؤں۔۔۔۔۔۔“
اس کی آواز گلے میں رندھ گئی گٹھڑی کی چادر کا ندھے پر ڈال کر چلنے لگا تو میں
نے روکا ”ٹھہرو رام کھلاؤں“

لیکن وہ دھوتی کا لانگ سنبھالتا تیزی سے نکل گیا۔

☆☆☆☆☆☆

رحمت خداوندی کے پھول

”زمیندار“ اخبار میں جب ڈاکٹر راتھر پر رحمت خداوندی کے پھول بہتے تھے تو یار دوستوں نے غلام رسول کا نام ڈاکٹر راتھر رکھ دیا تھا معلوم نہیں کیوں، اس لیے کہ غلام رسول کو ڈاکٹر راتھر سے کوئی نسبت نہیں تھی اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایم بی بی ایس میں تین بار فیل ہو چکا تھا مگر کہاں ڈاکٹر راتھر، کہاں غلام رسول۔

ڈاکٹر راتھر ایک اشتہاری ڈاکٹر تھا جو اشتہاروں کے ذریعے سے قوت مردی کی دوائیں بیچتا تھا خدا اور اس کے رسول کی قسمیں کھا کھا کر اپنی دواؤں کو مجرب بناتا تھا اور یوں سینکڑوں روپے کماتا تھا غلام رسول کو ایسی دواؤں سے کوئی دلچسپی نہ تھی وہ شادی شدہ تھا اور اس کی قوت مردی بڑھانے والی چیزوں کی کوئی حاجت نہیں تھی لیکن پھر بھی اس کے یار دوست اس کو ڈاکٹر راتھر کہتے تھے۔ اس کا یا کلب کو اس نے تسلیم کر لیا تھا اس لیے کہ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا اس کے دوستوں کو یہ نام پسند آ گیا تھا اور یہ ظاہر ہے کہ غلام رسول کے مقابلے میں ڈاکٹر راتھر کہیں زیادہ ماڈرن ہے۔

اب غلام رسول کو ڈاکٹر راتھر ہی کے نام سے یاد کیا جائے گا اس لیے کہ زبان خلق کو تقارہ خدا سمجھنا چاہیے۔

ڈاکٹر راتھر میں بے شمار خوبیاں تھیں سب سے بڑی خوبی اس میں یہ تھی کہ وہ ڈاکٹر نہیں تھا اور نہ بننا چاہتا تھا وہ ایک اطاعت مند بیٹے کی طرح اپنے ماں باپ کی خواہش کے مطابق میڈیکل کالج میں پڑھا تھا اتنے عرصے سے کہ اب کالج کی

عمارت اس کی زندگی کا ایک جزو بن گئی تھی وہ یہ سمجھنے لگا تھا کہ اس کے کسی بزرگ کا گھر ہے جہاں اس کو ہر روز سلام عرض کرنے کے لئے جانا پڑتا ہے۔

اس کے والدین مصر تھے کہ وہ ڈاکٹری پاس کرے اس کے والد کو یقین تھا کہ وہ ایک کامیاب ڈاکٹر کی صلاحیتیں رکھتا ہے اپنے بڑے لڑکے کے متعلق مولوی صباح الدین نے اپنی بیوی سے پیش گوئی کی تھی کہ وہ بیرسٹر ہوگا، چنانچہ جب اس کو ایل ایل بی پاس کر کے لندن بھیجا گیا تو وہ بیرسٹر بن کر ہی آیا یہ علیحدہ بات ہے کہ اس کی پریکٹس دوسرے بیرسٹروں کے مقابلے میں بہت ہی کم تھی۔

گوڈاکٹر راتھر تین مرتبہ ایم بی بی ایس کے امتحان میں فیل ہو چکا تھا مگر اس کے باپ کو یقین تھا کہ وہ انجام کار بہت بڑا ڈاکٹر بنے گا اور ڈاکٹر راتھر اپنے باپ کا اس قدر فرماہر دار تھا کہ اس کو بھی یقین تھا کہ ایک روز وہ لندن کے ہارلے اسٹریٹ میں بیٹھا ہوگا اور اس کی ساری دنیا میں دھوم مچی ہوگی۔

ڈاکٹر راتھر میں بے شمار خوبیاں تھیں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ سادہ لوح تھا لیکن سب سے بڑی برائی اس میں یہ تھی کہ پیتا تھا اور اکیلا پیتا تھا شروع شروع میں تو اس نے بہت کوشش کی کہ اپنے ساتھ کسی اور کو نہ ملائے لیکن یار دوستوں نے اس کو تنگ کرنا شروع کر دیا ان کو اس کا ٹھکانا معلوم ہو گیا، سیوائے بار، میں شام کو سات بجے پہنچ جاتے مجبوراً ڈاکٹر راتھر کو انہیں اپنے ساتھ پانا پڑتی۔ یہ لوگ اس کا گن گاتے، اس کے مستقبل کے متعلق بڑی حوصلہ افزا باتیں کرتے راتھر نشے کی ترنگ میں بہت خوش ہوتا اور اپنی جیب خالی کر دیتا۔

پانچ چھ مہینے اسی طرح گزر گئے اس کو اپنے باپ سے دوسروں سے ماہوار ملتے

تھے رہتا الگ تھا، مکان کا کرایہ بیس روپے ماہانہ تھا وہ اچھے تھے ورنہ راتھر کی بیوی کو فائدے کچھ نہ پڑتے لیکن پھر بھی اس کا ہاتھ تنگ ہو گیا اس لیے کہ راتھر کو دوسروں کو پلانا پڑتی تھی۔

ان دنوں شراب بہت سستی تھی آٹھ روپے کی ایک بوتل، ادھار چار روپے آٹھ آنے میں ملتا تھا مگر ہر روہ ز ایک ادھار لینا، یہ ڈاکٹر راتھر کی بساط سے باہر تھا اس نے سوچا کہ گھر میں پیا کرے مگر یہ کیسے ممکن تھا اس کی بیوی فوراً طلاق لے لیتی اس کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کا خاوند شراب کا عادی ہے۔ اس کے علاوہ اس کو شرابیوں سے سخت نفرت تھی، نفرت ہی نہیں ان سے بہت خوف آتا تھا کسی کی سرخ آنکھیں دیکھتی تو ڈر جاتی ”ہائے ڈاکٹر صاحب، کتنی ڈراؤنی آنکھیں تھیں اس آدمی کی۔۔۔۔۔ ایسا لگتا تھا کہ شرابی ہے۔“

اور ڈاکٹر راتھر دل ہی دل میں سوچتا کہ اس کی آنکھیں کیسی ہیں، کیا پی کر آنکھوں میں سرخ ڈورے آتے ہیں؟ کیا اس کی بیوی کو اس کی آنکھیں ابھی تک سرخ نظر نہیں آئیں؟ کب تک اس کا راز راز رہے گا؟ منہ سے بو تو ضرور آتی ہو گی۔۔۔۔۔ کیا وجہ ہے کہ اس کی بیوی نے کبھی نہیں سونگھی پھر وہ یہ سوچتا ”نہیں“ میں بہت احتیاط برتا ہوں میں نے ہمیشہ منہ پرے کر کے اس سے بات کی ہے ایک دفعہ اس نے پوچھا تھا کہ آپ کی آنکھیں آج سرخ کیوں ہیں تو میں نے اس سے کہا تھا، وٹول پڑ گئی ہے اسی طرح ایک بار اس نے دریافت کیا تھا، یہ بو کیسی ہے، تو میں نے یہ کہہ کر مال دیا تھا۔ آج۔۔۔۔۔ گار پیا تھا۔۔۔۔۔ بہت بو ہوتی ہے کم بخت میں

ڈاکٹر راقمراکھراکیلا اپنے کاغذی تھا اس کو ساتھی نہیں چاہیے تھے وہ کنجوس تھا اس کے علاوہ اس کی جیب بھی اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ دوستوں کو پالائے اس نے بہت سوچا کہ ایسی ترکیب کیا ہو سکتی ہے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاشی بھی نہ لوٹے یعنی یہ مسئلہ کچھ اس طرح حل ہو کہ وہ گھر میں پیا کرے جہاں اس کے دوستوں کو شرکت کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔

ڈاکٹر راقمراکھرا، پورا ڈاکٹر تو نہیں تھا لیکن اس کو ڈاکٹری کی چند چیزوں کا علم ضرور تھا وہ اتنا جانتا تھا کہ دوائیں بوتلوں میں ڈال کر دی جاتی ہیں اور ان پر اکثر یہ لکھا ہوتا ہے۔ ”ٹھیک دی بوتل بی فور یوز“ اس نے اتنے علم پر اپنی ترکیب کی دیواریں استوار کیں آخر میں بہت سوچ بچار کے بعد اس نے سوچا کہ وہ گھر ہی میں پیا کرے گا سانپ بھی مر جائے گا اور لاشی بھی نہیں لوٹے گی وہ دوا کی بوتل میں شراب ڈلو کر گھر رکھ دے گا بیوی سے کہے گا کہ اس کے سر میں درد ہے اور اس کے استاد ڈاکٹر سید رمضان علی شاہ نے اپنے ہاتھ سے یہ نسخہ دیا ہے اور کہا ہے کہ شام کو ہر پندرہ منٹ کے بعد ایک خوراک پانی کے ساتھ پیا کرے، انشاء اللہ شفا ہو جائے گی۔

یہ ترکیب تلاش کر لینے پر ڈاکٹر راقمراکھرا بے حد خوش ہوا اپنی زندگی میں پہلی بار اس نے یوں محسوس کیا جیسے اس نے امریکہ دریافت کر لیا ہے، چنانچہ صبح سویرے اٹھ کر اس نے اپنی بیوی سے کہا ”نسیم، آج میرے سر میں بڑا درد ہو رہا ہے۔۔۔ ایسا لگتا ہے پھٹ جائے گا۔“

نسیم نے بڑے تردد سے کہا ”کالج نہ جائے آج“

ڈاکٹر راتھر مسکرایا ”بھئی! آج تو مجھے ضرور جانا چاہیے۔۔۔۔۔ ڈاکٹر سید
رمضان علی شاہ صاحب سے پوچھوں گا ان کے ہاتھ میں بڑی شفا ہے“
”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ ضرور جانیے۔۔۔۔۔ میرے متعلق بھی ان سے بات
کیجئے گا“

نسیم کو سیان الرحم کی شکایت تھی جس سے ڈاکٹر راتھر کو کوئی دلچسپی نہیں تھی، مگر
اس نے کہا ”ہاں بات کروں گا۔۔۔۔۔ مگر مجھے یقین ہے کہ وہ میرے لیے کوئی
نہایت ہی کڑوی اور بدبودار دوا تجویز کر دیں گے“
”آپ خود ڈاکٹر ہیں وہ انہیں مٹھائیاں تو نہیں ہوتیں“
”ٹھیک ہے، لیکن بدبودار دواؤں سے مجھے نفرت ہے“
”آپ دیکھئے تو سہی کیسی دوا دیتے ہیں ابھی سے کیوں ایسی رائے قائم کر
رہے ہیں آپ؟“

”اچھا“ کہہ کر ڈاکٹر راتھر اپنے سر کو دباتا کالج چلا گیا شام کو وہ دوا کی بوتل
میں وسکی ڈلو کر لے آیا اور اپنی بیوی سے کہا ”میں نے تم سے کہا تھا کہ ڈاکٹر سید
رمضان علی شاہ ضرور کوئی ایسی دوا لکھ کر دیں گے جو بے حد کڑوی اور بدبودار ہو
گی۔۔۔۔۔ لہذا اسے سونگھو“ بوتل کا کارک اتار کر اس نے بوتل کا منہ اپنی بیوی کی
ناک کے ساتھ لگا دیا اس نے سونگھا اور ایک دم ناک ہٹا کر کہا ”بہت واپیات سی ہو
ہے“

”اب ایسی دوا کون پئے؟“

”نہیں نہیں۔۔۔۔۔ آپ ضرور پیئیں گے۔۔۔۔۔ سر کا درد کیسے دور ہوگا“

بیوی نے بڑے پیار سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”نہیں۔۔۔ بی بی جانیئے۔۔۔ ناک بند کر لیجئے۔۔۔ میں اسی طرح فیور رکچھر پھا کرتی ہوں۔“

ڈاکٹر راتھر نے بڑے نخرہ کے ساتھ شام کا پہلا پیگ پیا، بیوی نے اس کو شاباش دی اور کہا ”پندرہ منٹ کے بعد دوسری خوراک خدا کے فضل و کرم سے درو یوں چنگیوں سے دو رہو جائے گا“

ڈاکٹر راتھر نے سارا ڈھونگ کچھ ایسے خلوص سے رچایا تھا کہ اس کو محسوس ہی نہ ہوا کہ اس نے وہاں کے بجائے شراب پی ہے، لیکن جب ہلکا سا سرور اس کے دماغ میں نمودار ہوا تو وہ دل ہی دل میں خوب ہنساتر کیب خوب تھی اس کی بیوی نے عین پندرہ منٹ کے بعد دوسری خوراک گلاس میں انڈیلی اس میں سوڈا والا اور ڈاکٹر راتھر کے پاس لے آئی ”یہ لیجئے دوسری خوراک۔۔۔ کوئی ایسی بری بو تو نہیں ہے۔“

ڈاکٹر راتھر نے گلاس پکڑ کر بڑی بد دلی سے کہا ”تمہیں پینا پڑے تو معلوم ہو۔۔۔ خدا کی قسم شراب کی سی بو ہے۔۔۔ ذرا سو گتھ کر تو دیکھو“

”آپ تو بالکل میری طرح ضد کرتے ہیں“

”نسیہ! خدا کی قسم ضد نہیں کرتا۔۔۔ خدا کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے لیکن۔۔۔ خیر، ٹھیک ہے“ یہ کہہ کر ڈاکٹر راتھر نے گلاس منہ سے لگایا اور شراب کا دوسرا پیگ غناخت چڑھا گیا۔

تین خوراکیں ختم ہو گئیں ڈاکٹر راتھر نے کسی قدر افاقہ محسوس کیا لیکن دوسرے روز پھر سر میں درد عود کر آیا ڈاکٹر راتھر نے اپنی بیوی سے کہا ”ڈاکٹر سید رمضان علی شاہ نے کہا ہے کہ یہ مرض آہستہ آہستہ دور ہو گا لیکن وہاں کا استعمال برابر جاری رہنا چاہیے خدا معلوم کیا نام لیا تھا انہوں نے بیماری کا۔۔۔ کہا تھا معمولی سر کا درد

ہوتا تو دو خورا کوں ہی سے دور ہو جاتا مگر تمہارا کیس ذرا سیریس ہے۔“
 یہ سن کر نسیم نے تر دوسے کہا ”تو آپ کو دوا اب باقاعدہ پینی پڑے گی“
 ”میں نہیں جانتا۔۔۔ تم وقت پر دے دیا کرو گی تو قہر درویش برجان
 درویش پی لیا کروں گا۔“

نسیم نے ایک خوراک سوڈے میں حل کر کے اس کو دی اس کی بوتاک میں
 گھسی تو متلی آنے لگی مگر اس نے اپنے خاوند پر کچھ ظاہر نہ ہونے دیا کیونکہ اس کو ڈر
 تھا کہ وہ پینے سے انکار کر دے گا۔

ڈاکٹر راتھر نے تین خوراکیں اپنی بیوی کے بڑے اصرار پر پیں وہ بہت خوش
 تھی کہ اس کا خاوند اس کا کہا مان رہا ہے، کیونکہ بیوی کی بات ماننے کے معاملے
 میں ڈاکٹر بہت بدنام تھا۔

کئی دن گزر گئے خوراکیں پینے اور پلانے کا سلسلہ چلتا رہا ڈاکٹر راتھر بڑا
 مسرور تھا کہ اس کی ترکیب سو و مند ثابت ہوئی اب اسے دوستوں کا کوئی خدشہ نہیں
 تھا ہر شام گھر میں بسر ہوتی ایک خوراک پیتا اور لیٹ کر کوئی افسانہ پڑھنا شروع کر
 دیتا دوسری خوراک عین پندرہ منٹ کے بعد اس کی بیوی تیار کر کے لے آتی۔ اسی
 طرح تیسری خوراک اس کو بن مانگے مل جاتی۔۔۔ ڈاکٹر راتھر بے حد مطمئن تھا
 اتنے دن گزر جانے پر اس کے اور اس کی بیوی کے لیے یہ دو اکا سلسلہ ایک معمول
 ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر راتھر اب ایک پوری بوتل لے آیا تھا اس کا لیبل وغیرہ اتار کر اس نے
 اپنی بیوی سے کہا تھا ”کیسٹ میرا دوست ہے اس نے مجھ سے کہا آپ ہر روز تین

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

نسیمہ کھلکھلا کر ہنسی ”چو ہے۔۔۔۔۔ آپ یہ چو ہے کیوں نہیں کھاتے؟“
 ڈاکٹر راتھر نے بڑے تعجب سے پوچھا ”کیا ہو گیا ہے تمہیں“
 نسیمہ نے سنجیدگی اختیار کر کے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور اپنے خاوند سے کہا
 ”میں۔۔۔ میں۔۔۔ سر میں درد تھا میرے۔۔۔ آپ کی دوا کی دو
 خ۔۔۔ خ۔۔۔ خوراکیں پی ہیں۔۔۔۔۔ چو ہے۔۔۔۔۔ چو ہے بہت
 ستاتے ہیں۔۔۔۔۔ ان کو مارنے والی گولیاں لے آئے۔۔۔۔۔ کھانا؟ نکالتی
 ہوں کھانا“
 ڈاکٹر راتھر نے اپنی بیوی سے صرف اتنا کہا ”تم سو جاؤ، میں کھانا کھا چکا
 ہوں“

نسیمہ زور سے ہنسی ”میں نے جھوٹ تو نہیں کہا تھا“
 ڈاکٹر راتھر نے جب دوسرے کمرے میں جا کر مضطرب حالت میں
 زمیندار ”کاتازہ پرچہ کھولا تو اس کو ایک خبر کی سرخی نظر آئی ”ڈاکٹر راتھر پر رحمت
 خداوندی کے پھول“ اس کے نیچے یہ درج تھا کہ پولیس نے اس کو دھوکا دہی کے
 سلسلے میں گرفتار کر لیا ہے۔
 غلام رسول عرف ڈاکٹر راتھر نے یہ خبر پڑھ کر یوں محسوس کیا کہ اس پر رحمت
 خداوندی کے پھول برس رہے ہیں۔

25 جولائی 1950ء

☆☆☆☆☆

رشوت

احمد دین کھاتے پیتے آدمی کا لڑکا تھا۔۔۔۔۔ اپنے ہم عمر لڑکوں میں سب سے زیادہ خوش پوش مانا جاتا تھا۔۔۔۔۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ بالکل خستہ حال ہو گیا۔

اس نے بی اے کیا اور اچھی پوزیشن حاصل کی۔۔۔۔۔ وہ بہت خوش تھا۔۔۔۔۔ اس کے والد خان بہادر عطاء اللہ کا ارادہ تھا کہ اسے اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت بھیجیں گے۔۔۔۔۔ پاسپورٹ لے لیا گیا تھا۔۔۔۔۔ سوٹ وغیرہ بھی بنوا لیے گئے تھے کہ اچانک خان بہادر عطاء اللہ نے جو بہت شریف آدمی تھے کسی دوست کے کہنے پر سڑکھیلنا شروع کر دیا۔

شروع میں انہیں اس کھیل میں کافی منافع ہوا۔۔۔۔۔ وہ خوش تھے کہ چلو میرے بیٹے کی اعلیٰ تعلیم کا خرچ ہی نکل آیا۔۔۔۔۔ مگر لالچ بڑی بلا ہے انہوں نے یہ سمجھا کہ ان کی پشت پر چوگنی ہے۔۔۔۔۔ جتنے ہی چلے جائیں گے۔

ان کا وہ دوست جس نے ان کو اس راستے پر لگایا تھا بار بار ان سے کہتا تھا ”خان صاحب۔۔۔۔۔ ماشاء اللہ آپ قسمت کے دہنی ہیں۔۔۔۔۔ مٹی میں بھی ہاتھ ڈالیں تو سونا بن جائے“

اور وہ اس قسم کی چالو سیوں کے ذریعہ خان بہادر سے سو دو سو روپے اینٹھ لیتا خان بہادر کو بھی تکلیف محسوس نہ ہوتی اس لیے کہ انہیں بغیر محنت کے ہزاروں روپے مل رہے تھے۔

احمد دین ذہین اور باشعور لڑکا تھا۔۔۔۔۔ اس نے ایک دن اپنے باپ سے
 کہا
 ”اباجی۔۔۔۔۔ یہ آپ نے جو سٹہ بازی شروع کی ہے۔۔۔۔۔ معاف
 کیجئے گا اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا“
 خان بہادر نے تیز لہجے میں اس سے کہا
 ”برخوردار تمہیں میرے کاموں میں دخل دینے کی جرأت نہیں ہونی چاہیے
 میں جو کچھ کر رہا ہوں ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ جتنا روپیہ آ رہا ہے وہ میں اپنے ساتھ قبر
 میں لے کر نہیں جاؤں گا یہ سب تمہارے کام آئے گا“
 احمد دین نے بڑی مصومیت سے پوچھا
 ”لیکن اباجی یہ کب تک آتا رہے گا۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے کل کو یہ جانے بھی
 گئے“

خان بہادر اور بھٹنا گئے
 ”حکومت۔۔۔۔۔ آتا ہی رہے گا“
 روپیہ آتا رہا
 لیکن ایک روز خان بہادر نے کئی ہزار روپے کی رقم داؤ پر لگا دی۔۔۔۔۔ لیکن
 نتیجہ صفر نکلا۔۔۔۔۔ دس ہزار ہاتھ سے دینے پڑے۔
 تاؤ میں آکر انہوں نے بیس ہزار روپے کا سٹہ کھیا۔۔۔۔۔ ان کو یقین تھا کہ
 ساری کسر پوری ہو جائے گی۔۔۔۔۔ لیکن صبح جب انہوں نے اخبار دیکھا تو معلوم ہوا
 کہ یہ بیس ہزار بھی گئے۔

خان بہادر ہمت ہارنے والے نہیں تھے انہوں نے اپنا ایک مکان گروی رکھ کر
پچاس ہزار روپے لیے اور سب کے سب اللہ کا نام لے کر چاندی کے سٹے پر لگا
دیئے۔

اللہ کا نام تو خیر اللہ کا نام ہے۔۔۔۔۔ وہ چاندی اور سونے کی مارکیٹ پر کیا
کنٹرول کر سکتا ہے۔۔۔۔۔ صبح ہوئی تو خان بہادر کو معلوم ہوا کہ چاندی کا بھاؤ ایک دم
گر گیا ہے۔۔۔۔۔ ان کو اس قدر صدمہ ہوا کہ دل کے دورے پڑنے لگے۔
احمد دین نے ان سے کہا

”اباجی۔۔۔۔۔ چھوڑ دیجئے اس کو اس کو“

خان بہادر نے بڑے غصہ میں اپنے بیٹے سے کہا
”تم کو اس مت کرو۔۔۔۔۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں ٹھیک ہے“
احمد دین نے مودبانہ کہا

”لیکن اباجان۔۔۔۔۔ یہ جو آپ کو دل کی تکلیف شروع ہو گئی ہے اس کی وجہ کیا
ہے؟“

”مجھے کیا معلوم۔۔۔۔۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔۔۔۔۔ ایسے عارضے انسان کو
ہوتے ہی رہتے ہیں۔“

احمد دین نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا

”جی ہاں۔۔۔۔۔ انسان کو ہر قسم کے عارضے ہوتے رہتے ہیں لیکن ان کی
کوئی وجہ بھی تو ہوتی ہے مثال کے طور پر اگر آپ کوئی ایسی چیز کھالیں جس میں
پینے کے جراثیم ہوں تو۔۔۔۔۔“

کر دیتی ہیں“

پندرہ دن بستر پر لیٹے اور علاج کراٹنے کے بعد جب وہ کسی قدر بہی تندرست ہوئے تو انہوں نے اپنا ایک اور مکان بیچ دیا۔۔۔۔۔ یہ پچیس ہزار روپے میں بکا خان صاحب نے یہ سب روپے سٹے پر لگا دیئے ان کو پوری امید تھی کہ وہ اپنی اگلی پچھلی کسر پوری رک لیں گے مگر قسمت نے یاوری نہ کی اور وہ ان پچیس ہزار روپوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔

احمد دین بیچ و تاب کھا کے رہ گیا۔۔۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔۔۔ کہ اپنے باپ کو کس طرح سمجھائے۔۔۔۔۔ وہ اس کی کوئی بات سنتے ہی نہیں تھے۔

احمد دین نے آخری کوشش کی۔

اور ایک دن جب اس کا باپ اپنے کمرے میں حقہ پی رہا تھا اور معلوم نہیں کس سوچ میں غرق تھا کہ اس سے ڈرتے ڈرتے مخاطب ہوا

”اباجی۔۔۔۔“

خان بہادر صاحب سوچ میں اس قدر غرق تھے کہ انہوں نے اپنے لڑکے کی آواز ہی نہیں سنی۔

احمد دین نے آواز کو ڈرا بلند کیا

”اباجی۔۔۔۔۔ اباجی۔۔۔۔“

خان بہادر چوٹے

”کیا ہے؟“

احمد دین کانپ گیا
 ”کچھ نہیں اباجی۔۔۔۔۔ مجھے۔۔۔۔۔ مجھے آپ سے ایک بات کہنا تھی“
 خان بہادر نے حقے کی نری اپنے منہ سے جدا کی
 ”کہو کیا کہنا ہے“
 احمد دین نے بڑی لجاجت سے کہا
 ”مجھے یہ عرض کرنا ہے۔۔۔۔۔ یہ درخواست کرنا تھی۔۔۔۔۔ کہ۔۔۔۔۔ آپ
 سڑکھیلنا بند کر دیں۔“
 حقے کا ایک زوردار کش لے کر وہ احمد دین پر برس پڑے
 ”تم کون ہوتے ہو مجھے نصیحت کرنے والے۔۔۔۔۔ میں جانوں میرا کام،
 کیا اب تک تمہارے ہی مشورے سے میں سارے کام کرتا رہا ہوں۔۔۔۔۔ دیکھو
 میں تم سے کہے دیتا ہوں کہ آئندہ میرے معاملے میں کبھی دخل نہ دینا۔۔۔۔۔ مجھے
 یہ گستاخی برگزیند نہیں۔۔۔۔۔ سمجھئے۔۔۔۔۔“
 احمد دین کی گردن جھکی ہوئی تھی۔
 ”جی میں سمجھ گیا“
 اور یہ کہہ کر وہ اپنے باپ کے کمرے سے نکل گیا
 سٹے کی لت شراب کی عادت سے بھی کہیں زیادہ بری ہوتی ہے۔۔۔۔۔ خان
 بہادر اس میں کچھ ایسے گرفتار ہوئے کہ جتنی جائیداد تھی۔۔۔۔۔ سب کی سب اس
 خطرناک کھیل کی نذر ہو گئی۔
 مرحوم بیوی کے زیور تھے۔۔۔۔۔ وہ بھی بک گئے۔۔۔۔۔ اور نتیجہ اس کا یہ

اس کی ماں کو مرے اتنے ہی برس ہو گئے تھے جتنے اس کو جیتے، احمد دین نے حالانکہ اس کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔۔۔۔۔ نہ اس کو دووہ پٹنا نصیب ہوا

تھا۔۔۔۔۔ پھر بھی وہ اکثر اس کو یاد کر کے آنسو بہاتا رہتا۔
 احمد دین نے ملازمت حاصل کرنے کی انتہائی کوشش کی۔۔۔۔۔ مگر
 کامیابی نہ ہوئی۔۔۔ اتنے بے روزگار اور بے کار آدمی تھے کہ وہ خود کو اس بے
 روزگاری اور بے کاری کے سمندر میں ایک قطرہ سمجھتا تھا۔
 لیکن اس احساس کے باوجود اس نے ہمت نہ ہاری۔۔۔۔۔ اور اپنی
 تنگ و دو جاری رکھی۔
 بہت دنوں کے بعد اسے معلوم ہوا کہ اگر کسی افسر کی مٹھی گرم کی جائے تو
 ملازمت ملنے کا امکان پیدا ہو سکتا ہے لیکن وہ مٹھی گرم کرنے کا مصالحہ کہاں سے
 لاتا۔
 ایک دفتر میں جب وہ ملازمت کے سلسلے میں گیا تو ہیڈ کلرک نے اس سے
 شفیقانہ انداز میں کہا۔
 ”دیکھو بر خوردار۔۔۔۔۔ یوں خالی خالی کام نہیں چلے گا۔۔۔۔۔ جس آسامی
 کے لیے تم نے درخواست دی ہے اس کے لیے پہلے ہی دو سو پچاس درخواستیں
 وصول ہو چکی ہیں۔۔۔ میں بڑا صاف گوا آدمی ہوں۔۔۔۔۔ پانچ سو روپے اگر
 تم دے سکتے ہو تو یہ ملازمت تمہیں یقیناً مل جائے گی۔“
 اب احمد دین پانچ سو روپے کہاں سے لاتا۔۔۔۔۔ اس کے پاس بمشکل
 بیس یا تیس روپے تھے۔
 چنانچہ اس نے ہیڈ کلرک سے کہا
 ”جناب میرے پاس اتنے روپے نہیں۔۔۔۔۔ آپ ملازمت دلوا

دیکھتے تنخواہ میں سے آدھی رقم آپ لے لیا کریں“

ہینڈلرک ہنسا

”تم ہمیں بے وقوف بناتے ہو جاؤ چلتے پھرتے بنو“

احمد دین بہت دیر تک چلتا پھرتا را۔۔۔ مگر اسے اطمینان سے کہیں بیٹھنے کا موقع نہ ملا۔

جہاں جاتا رشوت کا سوال سامنے۔۔۔۔۔ دنیا شاید رشوت ہی کی وجہ سے عالم وجود میں آئی ہے۔

شاید خدا کو کسی نے رشوت دی ہو اور اس نے یہ دنیا بنا دی ہو

احمد دین کے پاس جب ایک پیسہ بھی نہ رہا تو مزدوری شروع کر دی بوجھ اٹھاتا اور روز ایک دو روپے مالیتا۔

مہنگائی کا زمانہ تھا۔۔۔۔۔ گو دونوں وقت کا کھانا بھلیا رخانے میں کھاتا لیکن اسے کافی خرچ برداشت کرنا پڑتا۔

زیادہ سے زیادہ ایک آنہ بچ رہتا۔

احمد دین مزدوری کرتا۔۔۔۔۔ مگر اس کے دل و دماغ پر رشوت کا چکر گھومتا

رہتا تھا۔۔۔ یہ ایک بہت بڑی اعنت تھی۔۔۔۔۔ اور وہ چاہتا تھا کہ اس سے کسی طرح

نجات حاصل کرے۔۔۔۔۔ اور مزدوری چھوڑ کر کوئی ایسی ملازمت اختیار کرے جو

اس کے شایان شان ہو۔۔۔۔۔ آخر وہ بی اے پاس تھا۔۔۔۔۔ فرسٹ کلاس فرسٹ

اس نے سوچا کہ نماز پڑھنا شروع کر دے۔۔۔۔۔ خدا سے دعا مانگے کہ وہ

اس کی سنے۔۔۔۔۔ چنانچہ اس نے باقاعدہ پانچ وقت کی نماز شروع کر دی یہ سلسلہ

ایک وقت تک جاری رہا مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

اس دوران میں اس کے پاس تیس روپے جمع ہو چکے تھے صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد وہ ڈاک خانے گیا تیس روپے کا پوسٹل آرڈر لیا اور ایک لفافے میں ڈال کر ساتھ ہی ایک رقعہ بھی رکھ دیا۔۔۔۔۔ جس کا مضمون کچھ اس قسم کا تھا۔

”اللہ میاں۔۔۔۔۔ میں سمجھتا ہوں تم بھی رشوت لے کر کام کرتے ہو میرے پاس تیس روپے ہیں جو تمہیں بھیج رہا ہوں۔۔۔۔۔ مجھے کہیں اچھی سی ملازمت دلوا دو۔۔۔۔۔ بوجھ اٹھا اٹھا کر میری کمر دوہری ہو گئی ہے۔“

لفافے پر اس نے پتہ لکھا

”بخدمت جناب اللہ میاں۔۔۔۔۔ مالک کائنات“

چند روز بعد احمد دین کو ایک خط مولوی جو کائنات اخبار کے ایڈیٹر کی طرف سے تھا اس کا نام محمد میاں تھا۔۔۔۔۔ اس نے احمد دین کو بلایا تھا۔ وہ کائنات کے دفتر گیا جہاں اس کو مترجم کی حیثیت سے سو روپیہ ماہوار پر رکھ لیا گیا۔

احمد دین نے سوچا۔۔۔۔۔ آخر رشوت کام آہی گئی۔

ساڑھے تین آنے

”میں نے قتل کیوں کیا۔ ایک انسان کے خون میں اپنے ہاتھ کیوں رنگے، یہ ایک لمبی داستان ہے۔ جب تک میں اس کے تمام عواقب و عواطف سے آپ کو آگاہ نہیں کروں گا، آپ کو کچھ پتہ نہیں چلے گا۔ مگر اس وقت آپ لوگوں کی گفتگو کا موضوع جرم اور سزا ہے۔ انسان اور جیل..... چونکہ میں جیل میں رہ چکا ہوں، اس لیے میری رائے درست نہیں ہو سکتی۔ مجھے منلو صاحب سے پورا اتفاق ہے کہ جیل، مجرم کی اصلاح نہیں کر سکتی۔ مگر یہ حقیقت اتنی بار دہرائی جا چکی ہے کہ اس پر زور دینے سے آدمی کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کسی محفل میں ہزار بار سنایا ہوا لطیفہ بیان کر رہا ہے..... یہ لطیفہ نہیں کہ اس حقیقت کو جانتے پہنچاتے ہوئے بھی ہزار ہا جیل خانے موجود ہیں۔ ہتھکڑیاں اور وہ تنگ انسانیت بیڑیاں..... میں قانون کا یہ زیور پہن چکا ہوں۔“

یہ کہہ کر رضوی نے میری طرف دیکھا اور مسکرایا۔ اس کے مولے مولے حشیوں کے سے ہنوٹ عجیب انداز میں پھڑکے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی مخمور آنکھیں، جو قاتل کی آنکھیں لگتی تھیں چمکیں۔ ہم سب چونک پڑے تھے جب اس نے یکا یک ہماری گفتگو میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ وہ ہمارے قریب کرسی پر بیٹھا کریم ملی ہوئی کافی پی رہا تھا۔ جب اس نے خود کو متعارف کیا تو ہمیں وہ تمام واقعات یاد آ گئے جو اس کی قتل کی واردات سے وابستہ تھے۔ وعدہ معاف گواہ بن کر اس نے بڑی صفائی سے اپنی اور اپنے دوستوں کی گردن پھانسی کے پھندے

سے بچانی تھی۔

وہ اسی دن رہا ہو کر آیا تھا۔ بڑے شانستہ انداز میں وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔
 ”معاف کیجیے گا ممنو صاحب..... آپ لوگوں کی گفتگو سے مجھے دلچسپی ہے۔ میں
 ادیب تو نہیں لیکن آپ کی گفتگو کا جو موضوع ہے اس پر اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں
 کچھ نہ کچھ ضرور کہہ سکتا ہوں۔“ پھر اس نے کہا۔ ”میرا نام صدیق رضوی ہے
 لنڈا بازار میں جو قتل ہوا تھا، میں اس سے متعلق تھا۔“

میں نے اس قتل کے متعلق صرف سرسری طور پر پڑھا تھا لیکن جب رضوی نے
 اپنا تعارف کرایا تو میرے ذہن میں خبروں کی تمام سرخیاں ابھر آئیں۔
 ہماری گفتگو کا موضوع یہ تھا کہ آیا جیل مجرم کی اصلاح کر سکتی ہے۔ میں خود
 محسوس کر رہا تھا۔ ہم ایک باسی روٹی کھا رہے ہیں۔ رضوی نے جب یہ کہا۔ ”یہ
 حقیقت اتنی بار دہرائی جا چکی ہے کہ اس پر زور دینے سے آدمی کو یوں محسوس ہوتا
 ہے۔ جیسے وہ کسی محفل میں ہزار بار سنایا ہوا الطیفہ بیان کر رہا ہے۔“ تو مجھے بڑی
 تسکین ہوئی۔ میں نے یہ سمجھا جیسے رضوی نے میرے خیالات کی ترجمانی کر دی
 ہے۔

کریم ملی ہوئی کافی کی پیالی ختم کر کے رضوی نے اپنی چھوٹی چھوٹی مخمور
 آنکھوں سے مجھے دیکھا اور بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”ممنو صاحب آدمی جرم کیوں
 کرتا ہے..... جرم کیا ہے، سزا کیا ہے..... میں نے اس کے متعلق غور کیا ہے۔
 میں سمجھتا ہوں کہ ہر جرم کے پیچھے ایک ہسٹری ہوتی ہے..... زندگی کے واقعات کا
 ایک بہت بڑا ٹکڑا ہوتا ہے بہت الجھا ہوا، ٹیڑھا میٹرھا..... میں نفسیات کا ماہر نہیں

..... لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ انسان سے خود جرم سرزد نہیں ہوتا۔ حالات سے ہوتا ہے۔“

نصیر نے کہا۔ ”آپ نے بالکل درست کہا ہے۔“

رضوی نے ایک اور کافی کا آرڈر دیا اور نصیر سے کہا۔ ”مجھے معلوم نہیں جناب! لیکن میں نے جو کچھ عرض کیا ہے اپنے مشاہدات کی بنا پر عرض کیا ہے۔ ورنہ یہ موضوع بہت پرانا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وکٹر ہیوگو..... فرانس کا ایک مشہور ناولسٹ تھا..... شاید کسی اور ملک کا ہو..... آپ تو خیر جانتے ہی ہوں گے۔ جرم اور سزا پر اس نے کافی لکھا ہے..... مجھے اس کی ایک تصنیف کے چند فقرے یاد ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”منٹو صاحب! غالباً آپ ہی کا ترجمہ تھا..... کیا تھا؟ وہ میٹرھی اتار دو جو انسان کو جرائم اور مصائب کی طرف لے جاتی ہے..... لیکن میں سوچتا ہوں کہ وہ میٹرھی کون سی ہے۔ اس کے کتنے زینے ہیں۔ کچھ بھی ہو، یہ میٹرھی ضرور ہے، اس کے زینے بھی ہیں لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں، بے شمار ہیں، ان کو گننا، ان کا شمار کرنا ہی سب سے بڑی بات ہے..... منٹو صاحب! حکومتیں رائے شماری کرتی ہیں، حکومتیں اعداد و شماری کرتی ہیں، حکومتیں ہر قسم کی شماری کرتی ہیں..... اس میٹرھی کے زینوں کی شماری کیوں نہیں کرتیں..... کیا یہ ان کا فرض نہیں..... میں نے قتل کیا..... لیکن اس میٹرھی کے کتنے زینے طے کر کے کیا..... حکومت نے مجھے وعدہ معاف گواہ بنالیا، اس لیے کہ قتل کا ثبوت اس کے پاس نہیں تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ میں اپنے گناہ کی معافی کس سے مانگوں..... وہ حالات جنہوں نے مجھے قتل کرنے پر مجبور کیا تھا۔ اب

میرے نزدیک نہیں ہیں، ان میں اور مجھ میں ایک برس کا فاصلہ ہے۔ میں اس فاصلے سے معافی مانگوں یا ان حالات سے جو بہت دور کھڑے میرا منہ چڑا رہے ہیں۔“

ہم سب رضوی کی باتیں بڑے غور سے سن رہے تھے۔ وہ بظاہر تعلیم یافتہ معلوم نہیں ہوتا تھا لیکن اس کی گفتگو سے ثابت ہوا کہ وہ پڑھا لکھا ہے اور بات کرنے کا سلیقہ جانتا ہے۔ میں نے اس سے کچھ کہا ہوتا لیکن میں چاہتا تھا کہ وہ باتیں کرتا جائے اور میں سنتا جاؤں۔ اسی لیے میں اس کی گفتگو میں حائل نہ ہوا۔

اس کے لیے نئی کافی آگئی تھی۔ اسے بنا کر اس نے چند گھنٹ پئے اور کہنا شروع کیا۔ ”خدا معلوم میں کیا بکواس کرتا رہا ہوں لیکن میرے ذہن میں ہر وقت ایک آدمی کا خیال رہا ہے۔۔۔۔۔ اس آدمی کا، اس بھنگی کا جو ہمارے ساتھ جیل میں ہے۔ اس کو ساڑھے تین آنے چوری کرنے پر ایک برس کی سزا ہوئی تھی۔“

نصیر نے حیرت سے پوچھا۔ ”صرف ساڑھے تین آنے چوری کرنے پر؟“ رضوی نے بخ آلود جواب دیا۔ ”جی ہاں۔۔۔۔۔ صرف ساڑھے تین آنے کی چوری پر۔۔۔۔۔ اور جو اس کو نصیب نہ ہوئے، کیونکہ وہ پکڑا گیا۔۔۔۔۔ یہ رقم خزانے میں محفوظ ہے اور پھلو بھنگی غیر محفوظ ہے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے وہ پھر پکڑا جائے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے اس کا پیٹ پھر اسے مجبور کر دے، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس سے گول موت صاف کرانے والے اس کی تنخواہ نہ دے سکیں، کیونکہ ہو سکتا ہے اس کی تنخواہ دینے والوں کو اپنی تنخواہ نہ ملے۔۔۔۔۔ یہ ہو سکتا ہے کا سلسلہ منٹو صاحب عجیب و غریب ہے۔ سچ پوچھیے تو دنیا میں سب کچھ ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔ رضوی سے قتل بھی ہو سکتا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ تھوڑے عرصے کے لیے خاموش ہو گیا۔ نصیر نے اس سے کہا۔
 ”آپ بھگو بھنگی بات کر رہے تھے؟“

رضوی نے اپنی چھدری مونچھوں پر سے کافی رومال کے ساتھ پونچھی۔ ”جی ہاں..... بھگو بھنگی چور ہونے کے باوجود یعنی وہ قانون کی نظروں میں چور تھا لیکن ہماری نظروں میں پورا ایماندار..... خدا کی قسم میں نے آج تک اس جیسا ایماندار آدمی نہیں دیکھا، ساڑھے تین آنے اس نے ضرور چرائے تھے، اس نے صاف صاف عدالت میں کہہ دیا تھا کہ یہ چوری میں نے ضرور کی ہے، میں اپنے حق میں کوئی گواہی پیش نہیں کرتا چاہتا..... میں دو دن کا بھوکا تھا، مجبوراً مجھے کریم درزی کی جیب میں ہاتھ ڈالنا پڑا۔ اس سے مجھے پانچ روپے لینے تھے..... دو مہینوں کی تنخواہ..... حضور اس کا بھی کچھ قصور نہیں تھا۔ اس لیے کہ اس کے کئی گاہکوں نے اس کی سلامتی کے پیسے مارے ہوئے تھے..... حضور! میں پہلے بھی چوریاں کر چکا ہوں۔ ایک دفعہ میں نے دس روپے ایک میم صاحب کے بٹوے سے نکال لیے تھے۔ مجھے ایک مہینے کی سزا ہوئی تھی۔ پھر میں نے ڈپٹی صاحب کے گھر سے چاندی کا ایک کھلونا چرا لیا تھا۔ اس لیے کہ میرے بچے کو نمونیا تھا اور ڈاکٹر بہت فیس مانگتا تھا..... حضور میں آپ سے جھوٹ نہیں کہتا۔ میں چور نہیں ہوں..... کچھ حالات ہی ایسے تھے کہ مجھے چوریاں کرنی پڑیں..... اور حالات ہی ایسے تھے کہ میں پکڑا گیا..... مجھ سے بڑے بڑے چور موجود ہیں لیکن وہ ابھی تک پکڑے نہیں گئے..... حضور! اب میرا بچہ بھی نہیں ہے۔ بیوی بھی نہیں ہے..... لیکن حضور افسوس ہے کہ میرا پیٹ ہے یہ مر جا ہے تو سارا جھنجھٹ ہی ختم ہو جائے، حضور مجھے معاف کر دو

..... لیکن حضور نے اس کو معاف نہ کیا اور عادی چور سمجھ کر اس کو ایک برس قید
بامشقت کی سزا دے دی۔“

رضوی بڑے بے تکلف انداز میں بول رہا تھا۔ اس میں کوئی تصنع، کوئی بناوٹ
نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ الفاظ خود بخود اس کی زبان پر آتے اور بہتے چلے جا رہے
ہیں۔ میں بالکل خاموش تھا۔ سگریٹ پہ سگریٹ پی رہا تھا اور اس کی باتیں سن رہا
تھا۔ نصیر پھر اس سے مخاطب ہوا۔ ”آپ پھگو کی ایمانداری کی بات کر رہے تھے؟“
”جی ہاں.....“ رضوی نے جیب سے بیڑی نکال کر سلاگائی۔ ”میں نہیں
جانتا۔ قانون کی نگاہوں میں ایمانداری کیا چیز ہے لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ میں
نے بڑی ایمانداری سے قتل کیا تھا اور میرا خیال ہے پھگو بھگتی نے بھی بڑی
ایمانداری سے ساڑھے تین آنے چرائے تھے..... میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ
ایمانداری کو صرف اچھی باتوں سے کیوں منسوب کرتے ہیں اور سچ پوچھیے تو میں
اب یہ سوچنے لگا ہوں کہ اچھائی اور برائی ہے کیا۔ ایک چیز آپ کے لیے اچھی ہو
سکتی ہے، میرے لیے بری۔ ایک سوسائٹی میں ایک چیز اچھی سمجھی جاتی ہے، دوسری
میں بری..... ہمارے مسلمانوں میں بغلوں کے بال بڑھانا گناہ سمجھا جاتا ہے لیکن
سکھ اس سے بے نیاز ہیں۔ اگر یہ بال بڑھانا واقعی گناہ ہے تو خدا ان کو مزا کیوں
نہیں دیتا۔ اگر کوئی خدا ہے تو میری اس سے درخواست ہے کہ خدا کے لیے تم یہ
انسانوں کے قوانین توڑ دو، ان کی بنائی ہوئی جیلیں ڈھا دو..... اور آسمانوں پر اپنی
جیلیں خود بناؤ۔ خود اپنی عدالت میں ان کو سزا دو، کیونکہ اور کچھ نہیں تو کم از کم خدا تو
ہو۔“

تھے۔“

”جی ہاں.....“ یہ کہہ کر اس نے میرا پیش کیا ہوا سگریٹ ساگایا۔ ”منٹو صاحب! قانون کی نظروں میں وہ عادی چور تھا۔ بیڑیوں کے لیے ایک دفعہ اس نے آٹھ آنے چرائے تھے۔ بڑی مشکلوں سے دیوار پھاند کر جب اس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی تو اس کے ٹخنے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ قریب قریب ایک برس تک وہ اس کا علاج کراتا رہا تھا مگر جب میرا ہم الزام دوست جرجی بیس بیڑیاں اس کی معرفت بھیجتا تو وہ سب کی سب پولیس کی نظریں بچا کر میرے حوالے کر دیتا۔ وعدہ معاف گواہوں پر بہت کڑی نگرانی ہوتی ہے لیکن جرجی نے پھلو کو اپنا دوست اور ہمراز بنا لیا تھا۔ وہ بھنگی تھا، لیکن اس کی فطرت بہت خوشبودار تھی۔ شروع شروع میں جب وہ جرجی کی بیڑیاں لے کر میرے پاس آیا تو میں نے سوچا، اس حرامزادے چور نے ضرور ان میں سے کچھ غائب کر لی ہوں گی۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ قطعی طور پر ایماندار تھا..... بیڑی کے لیے اس نے آٹھ آنے چراتے ہوئے اپنے ٹخنے کی ہڈی تڑوا لی تھی مگر یہاں جیل میں جہاں اس کو تباہا کو کہیں سے بھی نہیں مل سکتا تھا، وہ جرجی کی دی ہوئی بیڑیاں تمام و کمال میرے حوالے کر دیتا تھا، جیسے وہ امانت ہوں..... پھر وہ کچھ دیر پچکپانے کے بعد مجھ سے کہتا، بابو جی، ایک بیڑی تو دیجیے اور میں اس کو صرف ایک بیڑی دیتا..... انسان بھی کتنا کمینہ ہے۔“

رضوی نے کچھ اس انداز سے اپنا سر جھٹکا جیسے وہ اپنے آپ سے قنفر ہے۔
”جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں مجھ پر بہت کڑی پابندیاں عائد تھیں۔ وعدہ معاف

گواہوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے جرجی البتہ میرے مقابلے میں بہت آزاؤ تھا۔ اس کو رشوت دے دلا کر بہت آسانیاں مہیا تھیں۔ کپڑے مل جاتے تھے۔ صابن مل جاتا تھا۔ بیڑیاں مل جاتی تھیں۔ جیل کے اندر رشوت دینے کے لیے روپے بھی مل جاتے تھے..... پھلو بھٹکی کی سزا ختم ہونے میں صرف چند دن باقی رہ گئے تھے، بے جب اس نے آخری بار جرجی کی دی ہوئی بیڑیاں مجھے لا کر دیں۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ جیل سے نکلنے پر خوش نہیں تھا۔ میں نے جب اس کو مبارکباد دی تو اس نے کہا۔ ”بابو جی! میں پھر یہاں آ جاؤں گا..... بھوکے انسان کو چوری کرنی ہی پڑتی ہے..... بالکل ایسے ہی جیسے ایک بھوکے انسان کو کھانا کھانا ہی پڑتا ہے.....“ بابو جی آپ بڑے اچھے ہیں، مجھے اتنی بیڑیاں دیتے رہے..... خدا کرے آپ کے سارے دوست بری ہو جائیں۔ جرجی بابو آپ کو بہت چاہتے ہیں۔“

نصیر نے یہ سن کر غالباً اپنے آپ سے کہا۔ ”اور اس کو صرف ساڑھے تین آنے چرانے کے جرم میں سزا ملی تھی۔“

رضوی نے گرم کافی کا ایک گھونٹ پی کر ٹھنڈے انداز میں کہا۔ ”جی ہاں صرف ساڑھے تین آنے چرانے کے جرم میں..... اور وہ بھی خزانے میں جمع ہیں..... خدا معلوم ان سے کس پیٹ کی آگ بجھے گی۔“ رضوی نے کافی کا ایک اور گھونٹ پیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”ہاں منٹو صاحب! اس کی رہائی میں صرف ایک دن رہ گیا تھا۔ مجھے دس روپوں کی اشد ضرورت تھی..... میں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ مجھے یہ روپے ایک سلسلے میں سنتری کو رشوت کے طور پر دینے

تھے میں نے بڑی مشکلوں سے کاغذ پٹیل مہیا کر کے جرجی کو ایک خط لکھا تھا اور پھلو
 کے ذریعہ سے اس تک پہنچوایا تھا کہ وہ مجھے کسی نہ کسی طرح دس روپے بھیج دے۔
 پھلو ان پر ہوا تھا۔ شام کو وہ مجھ سے ملا۔ جرجی کا رقعہ اس نے مجھے دیا۔ اس میں دس
 روپے کا سرخ پاکستانی نوٹ قید تھا میں نے رقعہ پڑھا۔ یہ لکھا تھا۔ رضوی پیارے
 دس روپے بھیج تو رہا ہوں مگر ایک عادی چور کے ہاتھ، خدا کرے تمہیں مل جائیں
 کیونکہ یہ کل ہی جیل سے رہا ہو کر جا رہا ہے۔“ میں نے یہ تحریر پڑھی تو پھلو بھنگی کی
 طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اس کو ساڑھے تین آنے چرانے کے جرم میں ایک برس کی
 سزا ہوئی تھی۔ میں سوچنے لگا اگر اس نے دس روپے چرانے ہوئے تو ساڑھے تین
 آنے فی برس کے حساب سے اس کو کیا سزا ملتی؟
 یہ کہہ کر رضوی نے کافی کا آخری گھونٹ پیا اور رخصت مانگے بغیر کافی باؤس
 سے باہر چلا گیا۔

۲۶ جولائی ۱۹۵۰ء

تجدد

گاس پر بوتل جھکی تو ایک دم حمید کی طبیعت پر بو جھ سا پڑ گیا۔ ملک جو اس کے سامنے تیسرا پیک پی رہا تھا فوراً تار گیا کہ حمید کے اندر روحانی کشمکش پیدا ہو گئی ہے۔ وہ حمید کو سات برس سے جانتا تھا اور ان سات برسوں میں کئی بار حمید پر ایسے دورے پڑ چکے تھے جن کا مطلب اس کی سمجھ سے ہمیشہ بالاتر رہا تھا لیکن وہ اتنا ضرور سمجھتا تھا کہ اس کے اندر دوست کے سینے پر کوئی بو جھ جس کا احساس شراب پینے کے دوران میں کبھی کبھی حمید کے اندریوں پیدا ہوتا ہے جیسے بے دھیان بیٹھے ہوئے آدمی کی پسلیوں میں کوئی زور سے ٹھوکا دے دے۔

حمید بڑا خوش باش انسان تھا۔ فنی مذاق کا عادی، حاضر جواب، بذلہ سنج، اس میں بہت سی خوبیاں تھیں جو زیادہ نزدیک آکر اس کے دوست ملک نے معلوم کی تھیں۔ مثال کے طور پر سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ بے حد مخلص تھا، اس قدر مخلص کہ بعض اوقات اس کا اخلاص ملک کے لیے عہد عتیق کا رومانی افسانہ بن جاتا تھا۔

حمید کے کردار میں ایک عجیب و غریب بات جو ملک نے نوٹ کی یہ تھی کہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے نا آشنا تھیں۔ یوں تو ملک بھی رونے کے معاملے میں بڑا بخیل تھا مگر وہ جانتا تھا کہ جب کبھی رونے کا موقع آئے گا وہ ضرور رو دے گا۔ اس پر غم افزا باتیں اثر ضرور کرتی تھیں مگر وہ اس اثر کو اتنی دیر اپنے دماغ پر بیٹھنے کی اجازت دیتا تھا جتنی دیر کھوڑا اپنے تئیں ہوئے جسم پر رکھی کو۔

نہوں سے دور رہنے والے اور ہر وقت ہنسی مذاق کے عادی حمید کی زندگی میں نہ جانے ایسا کون سا واقعہ الجھا ہوا تھا کہ وہ کبھی کبھی قبرستان کی طرح خاموش ہو جاتا تھا۔ ایسے لمحات جب اس پر طاری ہوتے تو اس کا چہرہ ایسی رنگ اختیار کر لیتا تھا جو تین دن کی باسی شراب میں بے جان سوڈا گھولنے سے پیدا ہوتی ہے۔

سات برس کے دوران میں کئی بار حمید پر ایسے دورے پڑ چکے تھے مگر ملک نے آج تک اس سے ان کی وجہ دریافت نہ کی تھی۔ اس لیے نہیں کہ ان کی وجہ دریافت کرنے کی خواہش اس کے دل میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔ دراصل بات یہ ہے کہ ملک پر لے درجے کا ست اور کابل واقع ہوا تھا۔ اس خیال سے بھی وہ حمید کے ساتھ اس معاملے پر بات چیت نہیں کرتا تھا کہ ایک طول طویل کہانی اسے سننا پڑے گی اور اس کے چوتھے پیک کا سارا سفر و غارت ہو جائے گا۔ شراب پی کر لمبی چوڑی آپ بیتیاں سننا یا سناتا اس کے نزدیک بہت بڑی بد ذوقی تھی۔ اس کے علاوہ وہ کہانیاں سننے کے معاملے میں بہت ہی خام تھا۔ اسی خیال کی وجہ سے کہ وہ اطمینان حمید کی داستان نہیں بن سکے گا اس نے آج تک اس سے ان دوروں کی بابت دریافت نہیں کیا تھا۔

کرپا رام نے حمید کے گلاس میں تیسرا پیک ڈال کر بوتل میز پر رکھ دی اور ملک سے مخاطب ہوا۔ ”ملک! اسے کیا ہو گیا ہے۔“

ملک خاموش رہا لیکن حمید مضطرب ہو گیا۔ اس کے متنے ہوئے اعصاب زور سے کانپ اٹھے۔ کرپا رام کی طرف دیکھ کر اس نے مسکرائے کی کوشش کی۔ اس میں جب ناکامی ہوئی تو اس کا اضطراب اور بھی زیادہ ہو گیا۔

حمید کی یہ بہت بڑی کمزوری تھی کہ وہ کسی بات کو چھپا نہیں سکتا تھا اور اگر چھپانے کی کوشش کرتا تو اس کی وہی حالت ہوتی جو آندھی میں صرف ایک کپڑے میں لپٹی ہوئی عورت کی ہوتی ہے۔

ملک نے اپنا تیسرا پیک ختم کیا اور اس فضا کو جو کچھ عرصہ پہلے طرب افزا باتوں سے گونج رہی تھی اپنی بے محل ہنسی سے خوشگوار بنانے کے لیے اس نے کرپا رام سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”کرپا..... تم مان لو اسے اشوک مار کا فلمی عشق ہو گیا ہے.....“
 بھئی یہ اشوک مار بھی عجیب چیز ہے۔ پردے پر عشق کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کاسٹرائل پی رہا ہے۔“

کرپا رام، اشوک مار کو اتنا ہی جانتا تھا جتنا کہ مہاراجہ اشوک اور اس کی مشہور آنٹی اٹھو کو۔ فلم اور تاریخ سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی، البتہ وہ ان کے فوائد سے ضرور آگاہ تھا۔ کیونکہ وہ عام طور پر کہا کرتا تھا۔ ”مجھے اگر کبھی شب خوابی کا عارضہ لاحق ہو جائے تو میں یا تو فلم دیکھنا شروع کر دوں گا یا چکرورتی کی لکھی ہوئی تاریخ پڑھنا شروع کر دوں گا۔“

وہ ہمیشہ حساب داں چکرورتی کو مورخ بنا کر اپنی مسرت کے لیے ایک بات پیدا کر لیا کرتا تھا۔

کرپا رام چار پیک پی چکا تھا۔ چار پیالہ پیک، نشہ اس کے دماغ کی آخری منزل تک پہنچ چکا تھا۔ آنکھیں سکیڑ کر اس نے حمید کی طرف اس انداز سے دیکھا جیسے وہ کیمرے کا نوکس کر رہا ہے۔ ”تمہارا گلاس ابھی تک ویسے کا ویسا پڑا ہے۔“
 حمید نے دوسرے مرینس کی سی شکل بنا کر کہا۔ ”بس..... اب مجھ سے زیادہ

نہیں پی جائے گی۔“

”تم چغد ہو..... نہیں چغد نہیں کچھ اور ہو..... تمہیں پینا ہوگی..... سمجھے، یہ گلاس اور اس بوتل میں جتنی پڑی ہے سب کی سب تمہیں پینا ہوگی۔ شراب سے جو انکار کرے وہ انسان نہیں حیوان ہے..... حیوان بھی نہیں، اس لیے کہ حیوانوں کو اگر انسان بنا دیا جائے تو وہ بھی اس خوبصورت شے کو کبھی نہ چھوڑیں۔ تم سن رہے ہو ملک..... میں نے اگر یہ ساری شراب اس کے حلق میں نہ اندرل دی تو میرا نام کرپا رام نہیں گھسینا رام آرٹسٹ ہے۔“

گھسینا رام آرٹسٹ سے کرپا رام کو سخت نفرت تھی صرف اس لیے کہ آرٹسٹ ہو کر اس کا نام گھسینا رام تھا۔

ملک کا منہ سوڈا ملی وکی سے بھرا ہوا تھا۔ کرپا رام کی بات سن کر وہ بے اختیار ہنس پڑا جس کے باعث اس کے منہ سے ایک فوارہ سا چھوٹ پڑا۔ ”کرپا رام خدا کے لیے تم گھسینا رام آرٹسٹ کا نام نہ لیا کرو۔ میری انٹرویو میں ایک طوفان سا مچ جاتا ہے..... لا حول والا..... میری پتلون کا ستیا ناس ہو گیا ہے..... لو بھئی، حمید، اب تو تمہیں پینا ہی پڑے گی۔ کرپا رام، گھسینا رام بنے یا نہ بنے لیکن میں ضرور کرپا رام بن جاؤں گا اگر تم نے یہ گلاس خالی نہ کیا..... لو بیو..... پی جاؤ..... ارے، میرا منہ کیا دیکھتے ہو..... یہ تمہارے چہرے پر قیامت کیسی برس رہی ہے..... کرپا رام اٹھو..... لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانا کرتے۔ زبردستی کرنا ہی پڑے گی۔“

کرپا رام اور ملک دونوں اٹھے اور حمید کو زبردستی پلانے کی کوشش کرنے لگے۔ حمید کو روحانی کوفت تو ویسے ہی محسوس ہو رہی تھی، جب کرپا رام اور ملک نے اس کو

جھنجھوڑنا شروع کیا تو اس کو جسمانی اذیب بھی پہنچی جس کے باعث وہ بے حد پریشان ہو گیا۔

اس کی پریشانی سے کرپا رام اور ملک بہت محفوظ ہوئے۔ چنانچہ انہوں نے ایک کھیل سمجھ کر حمید کو اور زیادہ تنگ کرنا شروع کیا۔ کرپا رام نے گلاس پکڑ کر اس کے سر میں جموڑی سی شراب ڈال دی۔ اور مانیوں کے انداز میں جب اس نے حمید کا سر ہلایا تو وہ اس قدر پریشان ہوا کہ اس کی آنکھوں میں موئے موئے آنسو آ گئے۔ اس کی آواز بھرا گئی۔ اس کے سارے جسم میں تشنج سا پیدا ہوا اور ایک دم کا ندھے ڈھیلے کر کے اس نے روٹی اور مردہ آواز میں کہا۔ ”میں بیمار ہوں..... خدا کے لیے مجھے تنگ نہ کرو۔“

کرپا رام اسے بہانہ سمجھ کر حمید کو اور زیادہ تنگ کرنے کے لیے کوئی نیا طریقہ سوچنے ہی والا تھا کہ ملک نے ہاتھ کے اشارے سے اسے پرے ہٹا دیا۔ ”کرپا، اس کی طبیعت واقعی خراب ہے..... دیکھو رو رہا ہے۔“

کرپا رام نے اپنی موٹی کمر جھکا کر غور سے دیکھا۔ ”ارے..... تم تو سچ مچ رو رہے ہو۔“

حمید کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ جس پر سوالوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں؟..... خیر تو ہے؟“

”یہ تم رو کیوں رہے ہو؟“

”بھئی حد ہو گئی..... ہم تو صرف مذاق کر رہے تھے۔“

”کچھ سمجھ میں بھی تو آئے..... کیا تکلیف ہے تمہیں؟“
 ملک اس کے پاس بیٹھ گیا۔ ”بھئی مجھے معاف کر دو اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی
 ہو۔“

حمید نے جیب سے رومال نکال کر اپنے آنسو پونچھے اور کچھ کہتے کہتے خاموش
 ہو گیا۔ جذبات کی شدت کے باعث اس کی قوت گویائی جواب دے گئی۔
 تیسرے پیک سے پہلے اس کے چہرے پر رونق تھی، اس کی باتیں سوڈے
 کے بلبلوں کی طرح تروتازہ اور شگفتہ تھیں مگر اب وہ باسی شراب کی طرح بے رونق
 تھا۔ وہ سکڑ سا گیا تھا۔ اس کی حالت ویسی ہی تھی جیسی بیگلی ہوئی پتلون کی ہوتی
 ہے۔

کرسی پر وہ اس انداز سے بیٹھا تھا گویا وہ اپنے آپ سے شرمندہ ہے۔ اپنے
 آپ کو چھپانے کی بھونڈی کوشش میں وہ ایک ایسا بے جان لطیفہ بن کے رہ گیا تھا
 جو بڑے ہی خام انداز میں سنایا گیا ہو۔

ملک کو اس کی حالت پر بہت ترست آیا۔ ”حمید، لو اب خدا کے لیے چپ ہو
 جاؤ..... واللہ تمہارے آنسوؤں سے مجھے روحانی تکلیف ہو رہی ہے۔ مزہ تو سب
 کر کر رہا ہو ہی گیا تھا مگر یوں تمہارے ایک ایک آنسو بہانے سے میں بہت مغموم ہو
 گیا ہوں..... خدا جانے تمہیں کیا تکلیف ہے؟.....“

”کچھ نہیں، میں بہت جلد ٹھیک ہو جاؤں گا۔ کبھی کبھی مجھے ایسی تکلیف ہو جاتی
 کرتی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھا۔ ”اب میں اجازت چاہتا ہوں۔“
 کرپا رام بوتل میں بچی ہوئی شراب کو دیکھتا رہا اور ملک یہ ارادہ کرتا رہا کہ حمید

سے آج پوچھ ہی لے کہ وقتاً فوقتاً سے یہ دورے کیوں پڑتے ہیں مگر وہ جا چکا تھا۔
حمید گھر پہنچا تو اس کی حالت پہلے سے زیادہ خراب تھی۔ کمرے میں چونکہ اس
کے سوا اور کوئی نہیں تھا اس لیے وہ رو بھی نہ سکتا تھا۔ اس کی آنسوؤں سے لبالب
بھری ہوئی آنکھوں کو کرسیاں و ارمیزیں نہیں چھلکا سکتی تھیں۔

اس کی خواہش تھی کہ اس کے پاس کوئی آدمی موجود ہو جس کے چھیڑنے سے
وہ جی بھر کے رو سکے۔ مگر ساتھ ہی اس کی یہ بھی خواہش تھی کہ وہ بالکل اکیلا ہو.....
ایک عجیب کشمکش اس کے اندر پیدا ہو گئی تھی۔

وہ کرسی پر اس انداز سے اکیلا بیٹھا تھا جیسے شطرنج کا پنا ہوا مہرہ بساط سے بہت
دور پڑا ہے۔ سامنے میز پر اس کی ایک پرانی تصویر چمکدار فریم میں جڑی رکھی تھی۔
حمید نے اس کا ہونے سے اس کی طرف دیکھا تو سات برس اس تصویر اور اس
کے درمیان تھان کی طرح کھلتے چلے گئے۔

ٹھیک سات برس پہلے برسات کے انہی دنوں میں رات کو وہ ریلوے
رہسٹوران میں ملک عبدالرحمن کے ساتھ بیٹھا تھا..... اس وقت کے حمید اور اس
وقت کے حمید میں کتنا فرق تھا..... کتنا فرق تھا۔ حمید نے یہ فرق اس شدت سے
محسوس کیا کہ اسے اپنی تصویر میں ایک ایسا آدمی نظر آیا جس سے ملے اس کو ایک
زمانہ گزر گیا ہے۔

اس نے تصویر کو غور سے دیکھا تو اس کے دل میں یہ تلخ احساس پیدا ہوا کہ
انسانیت کے لحاظ سے وہ اس کے مقابلے میں بہت پست ہے۔ تصویر میں جو حمید
ہے اس حمید کے مقابلے میں بدرجہا افضل و برتر ہے جو کرسی پر سر نیوڑھائے بیٹھا

ہے۔ چنانچہ اس احساس نے اس کے دل میں حسد بھی پیدا کر دیا۔

ایک سجدے..... صرف ایک سجدے نے اس کا ستیاناس کر دیا تھا۔

آج سے ٹھیک سات برس پہلے کا ذکر ہے۔ برسات کے یہی دن تھے۔ رات کو وہ ریلوے ریسٹوران میں اپنے دوست ملک عبدالرحمن کے ساتھ بیٹھا تھا۔ حمید کو یہ شرارت سوچھی تھی کہ بغیر بو کی شراب جن کا ایک پورا پیگ لیمونیز میں ملا کر اس کو پلا دے اور جب وہ پی جائے تو آہستہ سے اس کے کان میں کہے۔ ”مولانا ایک پورا پیگ آپ کے ٹوالوں بھرے پیٹ میں داخل ہو چکا ہے۔“

بیرے سے مل ملا کر اس نے اس بات کا انتظام کر دیا تھا کہ آرڈر دینے پر لیمونیز کی بوتل میں جن کا ایک پیگ ڈال کر ملک کو دیا جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حمید نے وکی پی اور ملک بظاہر بے خبری کی حالت میں جن کا پورا پیگ چڑھا گیا۔ حمید چونکہ تین پیگ پینے کا ارادہ رکھتا تھا اس لیے ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اس نے پوچھا۔ ”ملک صاحب، آپ یوں بیکار نہ بیٹھئے۔ میں تیسرا پیگ بڑی عیاشی سے پیا کرتا ہوں۔ آپ ایک اور لیمونیز منگوا لیجئے۔“

ملک رضا مند ہو گیا، چنانچہ ایک اور لیمونیز آ گیا۔ اس میں بیرے نے اپنی طرف سے جن کا ایک پیگ ملا دیا تھا۔

ملک سے حمید کی نئی نئی دوستی ہوئی تھی۔ چاہیے تو یہ تھا کہ حمید اس شرارت سے باز رہتا مگر ان دنوں وہ اس قدر زندہ دل اور شرارت پسند تھا کہ جب بیرا ملک کے لیے لیمونیز کا دوسرا گلاس لایا اور اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا تو وہ اس خیال سے بہت خوش ہوا کہ ایک کے بجائے دو پیگ ملک کے پیٹ کے اندر چلے جائیں

گئے۔

ملک آہستہ آہستہ لیمونیزڈ ملی جن پیتا رہا اور حمید دل ہی دل میں اس کیوتڑ کی طرح گنگنا تا رہا جس کے پاس ایک کیوتڑی آ بیٹھی ہو۔
اس نے جلدی جلدی اپنا تیسرا پیگ ختم کیا اور ملک سے پوچھا۔ ”اور بیٹیں گے آپ۔“

ملک نے غیر معمولی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔ ”نہیں۔“ پھر اس نے بڑے روکھے انداز میں کہا۔ ”اگر تمہیں ارہ پیتا ہے تو پیو، میں جاؤں گا۔ مجھے ایک ضروری کام ہے۔“

اس مختصر گفتگو کے بعد دونوں اچھے۔ حمید نے دوسرے کمرے میں جا کر بل ادا کیا۔ جب وہ ریسٹوران سے باہر نکلے تو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ حمید کے دل میں یہ خواہش چمکیاں لینے لگی کہ وہ ملک پر اپنی شرارت واضح کر دے مگر اچھے موقع کی تلاش میں کافی وقت گزر گیا۔ ملک بالکل خاموش تھا اور حمید کے اندر پھلجھڑی سی چھوٹ رہی تھی۔ بے شمار خنخی خنخی خوبورت اور شوخ و شنگ باتیں اس کے دل و دماغ میں پیدا ہو کر بچھ رہی تھیں۔ وہ ملک کی خاموشی سے پریشان ہو رہا تھا اور جب اس نے اپنی پریشانی کا اظہار نہ کیا تو آہستہ آہستہ اس کی طبیعت پر ایک افسردگی سی طاری ہو گئی۔ وہ محسوس کرنے لگا کہ اس کی شرارت اب دم کئی گلہری بن کر رہ گئی ہے۔

دیر تک دونوں بالکل خاموش چلتے رہے۔ جب کہنی باغ آیا تو ملک ایک بچہ پر منظر انداز میں بیٹھ گیا۔ چند لمحات ایسی خاموشی میں گزرے کہ حمید کے دل میں

وہاں سے اٹھ بھاگنے کی خواہش پیدا ہوئی مگر اس وقت زیادہ دیر تک دبے رہنے کے باعث اس کی تمام تیزی اور طراری مانند چڑچلی تھی۔

ملک بچ پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”حمید، تم نے آج مجھے روحانی تکلیف پہنچائی ہے..... تمہیں یہ شرارت نہیں کرنی چاہیے تھی۔“ اس کی آواز میں اور درد پیدا ہو گیا۔ ”تم نہیں جانتے کہ تمہاری شرارت سے مجھے کس قدر روحانی تکلیف پہنچی ہے۔ اللہ تمہیں معاف کرے۔“

یہ کہہ کر وہ پلا گیا اور حمید اپنے آپ کو بڑی شدت سے گناہگار محسوس کرنے لگا۔ معافی مانگنے کا خیال اس کو آیا تھا مگر ملک باغ سے نکل کر باہر سڑک پر پہنچ چکا تھا۔

ملک کے چلے جانے کے بعد حمید گناہ اور ثواب کے چکر میں پھنس گیا۔ شراب کے حرام ہونے کے متعلق اس نے جتنی باتیں لوگوں سے سنی تھیں سب کی سب اس کے کانوں میں جھنجھٹانے لگیں۔

”شراب اخلاق بگاڑ دیتی ہے..... شراب، خانہ خراب ہے، شراب پی کر آدمی بے ادب اور بے حیا ہو جاتا ہے۔ شراب اسی لیے حرام ہے۔ شراب صحت کا ستیا ناس کر دیتی ہے۔ اس کے پینے سے پیچھے پھڑے چھلنی ہو جاتے ہیں..... شراب.....“

شراب، شراب کی ایک لامتناہی گردان حمید کے دماغ میں شروع ہو گئی اور اس کی تمام برائیاں ایک ایک کر کے اس کے سامنے آ گئیں۔

”سب سے بڑی برائی تو یہ ہے۔“ حمید نے محسوس کیا۔ ”کہ میں نے بے ضرر

شرارت سمجھ کر ایک شریف آدمی کو دھوکے سے شراب پلا دی ہے۔ ممکن ہے وہ پکا نمازی اور پرہیزگار ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غلطی میری ہے اور سارا گناہ میرے ہی سر ہوگا مگر اسے جو روحانی تکلیف پہنچی ہے اس کا کیا ہوگا؟ واللہ باللہ میرا یہ مقصد نہیں تھا کہ اسے تکلیف پہنچے..... میں اس سے معافی مانگ لوں گا اور..... لیکن اس سے معافی مانگ کر بھی تو میرا گناہ ہلکا نہیں ہوگا۔ ایک میں نے شراب پی اوپر سے اس کو دھوکا دے کر پلائی۔“

وسکی کا نشہ اس کے دماغ میں جمائیاں لینے لگا جس سے اس کا احساس گناہ گھٹا ورنہ شکل اختیار کر گیا۔ ”مجھے معافی مانگنی چاہیے۔ مجھے شراب چھوڑ دینی چاہیے..... مجھے گناہوں سے پاک زندگی بسر کرنی چاہیے۔“

اس کو شراب شروع کیے صرف دو برس ہوئے تھے۔ ابھی تک وہ اس کا عادی نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے گھر لوٹتے ہوئے راتے میں دوسری باتوں کے ساتھ اس پر بھی غور کیا۔ ”میں شراب کو ہاتھ تک نہیں لگاؤں گا۔ یہ کوئی ضروری چیز نہیں۔ میں اس کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہوں..... دنیا کہتی ہے..... دنیا کہتی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ منہ سے لگی ہوئی یہ چھٹ ہی نہیں سکتی میں اسے بالکل چھوڑ دوں گا..... میں اس خیال کو غلط ثابت کر دوں گا۔“

یہ سوچتے ہوئے حمید نے خود کو ایک ہیر و محسوس کیا۔ پھر ایک دم اس کے دماغ میں خدا کا خیال آیا جس نے اسے تباہی سے بچالیا تھا۔ ”مجھے شکر بجالانا چاہیے کہ میرے سینے میں نور پیدا ہو گیا ہے۔ میں نہ جانے کتنی دیر تک اس کھائی میں پڑا رہتا۔“

وہ اپنی گلی میں پہنچ چکا تھا۔ اوپر آسمان پر گد لے بادلوں میں چاند صابن کے
 جھاگ لگے گالوں کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ ہوا خشک تھی۔ فضا بالکل خاموش تھی.....
 حمید پر خدا کے رعب اور شراب نوشی سے بچ جانے کے احساس نے رقت طاری کر
 دی۔ اس نے شکر اے کا سجدہ کرنا چاہا۔ وہیں پتھریلی زمین پر اس نے گھٹنے ٹیک کر
 اپنا ماتھا گرنا چاہا۔ اس خیال سے کہ اسے کوئی دیکھ لے گا وہ کچھ دیر کے لیے ٹھٹک
 گیا مگر فوراً ہی یہ سوچ کر کہ یوں خدا کی نگاہوں میں اس کی وقعت بڑھ جائے گی وہ
 ڈبکی لگانے کے انداز میں جھکا اور اپنی پیشانی گلی کے ٹھنڈے ٹھنڈے پتھر پہ
 فرش کے ساتھ جوڑ دی۔

جب وہ اٹھا تو اس نے اپنے آپ کو ایک بہت بڑا آدمی محسوس کیا۔ اس نے
 جب آس پاس کی اونچی دیواروں کو دیکھا تو وہ اسے اپنے قدم کے مقابلے میں بہت
 پست معلوم ہوئیں۔

اس واقعہ کے ڈیڑھ مہینے بعد اسی کمرے میں جہاں اب حمید بیٹھا اپنی سات
 برس کی پرانی تصویر پر رشک کھا رہا تھا، اس کا دوست ملک آیا۔ اندر آتے ہی اس
 نے اپنی جیب سے بلیک اینڈ وائٹ کا ادھانکا لا اور زور سے میز پر رکھ کر کہا۔ ”حمید
 آؤ..... آج پیکیں اور خوب پیکیں..... یہ ختم ہو جائے گی تو اور لائیں گے۔“

حمید اس قدر متحیر ہوا کہ وہ اس سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ ملک نے دوسری جیب
 سے سوڈے کی بوتل نکالی، تپانی پر سے گلاس اٹھا کر اس میں شراب اندر ملی ہوڈے
 کی بوتل اگلوٹھے سے کھولی، اور حمید کی متحیر آنکھوں کے سامنے وہ دو پیگ غنائف
 پی گیا۔

حمید نے تلاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن..... لیکن..... اس روز تم نے مجھے اتنا
برا بھلا کہا تھا.....“

ملک نے ایک قہقہہ باند کیا۔ ”تم نے مجھ سے شرارت کی میں نے بھی اس کے
جواب میں تم سے شرارتنا کچھ کہہ دیا..... مگر بھی ایمان کی بات ہے جو مزہ اس
روز جن کے دو پیک پینے میں آیا ہے زندگی بھر کبھی نہیں آئے گا..... لو اب چھوڑو
اس قصے کو..... و سکی پیو۔ جن ون کو اس ہے۔ شراب پینی ہو تو و سکی پینی
چاہیے۔“

یہ سن کر حمید کو ایسا محسوس ہوا تھا کہ جو سجدہ اس نے گلی میں کیا تھا ٹھنڈے فرش
سے نکل کر اس کی پیشانی پر چپک گیا ہے۔

یہ سجدہ بھوت کی طرح حمید کی زندگی سے چٹ گیا تھا۔ اس نے اس سے
نجات حاصل کرنے کے لیے پھر پینا شروع کی مگر اس سے بھی کچھ فائدہ نہ ہوا۔

ان سات برسوں میں جو اس کی پرانی تصویر اور اس کے درمیان کھلے ہوئے
تھے یہ ایک سجدہ بے شمار مرتبہ حمید کو اس کی اپنی نگاہوں میں ذلیل و رسوا کر چکا تھا۔
اس کی خودی، اس کی تخلیقی قوت، اس کی زندگی وہ حرارت جس سے حمید اپنے ماحول
کو گرم کر کے رکھنا چاہتا تھا اس سجدے نے قریب قریب سرد کر دی تھی۔ یہ سجدہ اس کی
زندگی میں ایک ایسی خراب بریک بن گئی تھی جو کبھی کبھی اپنے آپ اس کے چلتے
ہوئے پہیوں کو ایک دھچکے کے ساتھ ٹھہرا دیتی تھی۔

سات برس کی پرانی تصویر اس کے سامنے میز پر پڑی تھی۔ جب سارا واقعہ
اس کے دماغ میں پوری تفصیل کے ساتھ دہرایا جا چکا تو اس کے اندر ایک ناقابل

بیان انتظار پیدا ہو گیا۔ وہ ایسا محسوس کرنے لگا جیسے اس کو قے ہونے والی ہے۔

وہ گھبرا کر اٹھا اور سامنے کی دیوار کے ساتھ اس نے اپنا ماتھا گرڑنا شروع کر دیا جیسے وہ اس سجدے کا نشان منانا چاہتا ہے۔ اس عمل سے اسے جب جسمانی تکلیف پہنچی تو وہ پھر کرسی پر بیٹھ گیا..... سر جھکا کر اور کاندھے ڈھیلے کر کے اس نے تنگی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اے خدا، میرا سجدہ مجھے واپس دے دے.....“

سرکنڈوں کے پیچھے

کون سا شہر تھا۔ اس کے متعلق جہاں تک میں سمجھتا ہوں، آپ کو معلوم کرنے اور مجھے بتانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ وہ جگہ جو اس کہانی سے متعلق ہے پشاور کے مضافات میں تھی۔ سرحد کے قریب اور جہاں وہ عورت رہتی تھی اس کا گھر جھونپڑا نما تھا..... سرکنڈوں کے پیچھے!

گھنی باڑھ سی تھی، جس کے پیچھے اس عورت کا مکان تھا۔ کچی مٹی کا بنا ہوا، چونکہ یہ باڑھ سے کچھ فاصلے پر تھا، اس لیے سرکنڈوں کے پیچھے چھپ سا گیا تھا کہ باہر کچی سڑک پر سے گزرنے والا کوئی بھی اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔

سرکنڈے بالکل سوکے ہوئے تھے مگر وہ کچھ اس طرح زمین میں گڑے تھے کہ ایک دبیز پردہ بن گئے تھے۔ معلوم نہیں اس عورت نے خود وہاں پوست کیے تھے یا پہلے ہی سے موجود تھے۔ بہر حال کہنا یہ ہے کہ وہ اپنی قسم کے پردہ پوش تھے۔ مکان کہہ لیجیے، یا مٹی کا جھونپڑا، صرف چھوٹی چھوٹی تین کوٹھڑیاں تھیں مگر صاف ستھری۔ سامان مختصر تھا مگر اچھا..... پچھلے کمرے میں ایک بہت بڑا نواڑی پلنگ تھا..... اس کے ساتھ ایک طاقتہ تھا جس میں سرسوں کے تیل کا دیارات بھر جلتا رہتا تھا..... مگر یہ طاقتہ بھی صاف ستھرا رہتا تھا اور وہ دیا بھی جس میں ہر روز نیا تیل اور بتی ڈالی جاتی تھی۔

اب میں آپ کو اس عورت کا نام بتا دوں جو اس مختصر سے مکان میں، جو سرکنڈوں کے پیچھے چھپا رہتا تھا، اپنی جوان بیٹی کے ساتھ رہائش پذیر تھی۔

مختلف روایتیں ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ اس کی بیٹی نہیں تھی۔ ایک یتیم لڑکی تھی جس کو اس نے بچپن سے گود لے کر پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ اس کی ناجائز لڑکی تھی۔ کچھ ایسے بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ وہ اس کی سگی بیٹی تھی..... حقیقت جو کچھ بھی ہے اس کے متعلق وثوق سے کچھ کہنا نہیں جاسکتا۔ یہ کہانی پڑھنے کے بعد آپ خود بخود کوئی نہ کوئی رائے قائم کر لیجیے گا۔

دیکھئے میں آپ کو اس عورت کا نام بتانا بھول گیا..... بات دراصل میں یہ ہے کہ اس کا نام کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کا نام آپ کچھ بھی سمجھ لیجیے..... گلشن یا کوئی اور۔ آخر نام میں کیا رکھا ہے لیکن آپ کی سہولت کی خاطر میں اسے سردار کہوں گا۔

یہ سردار، ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ کسی زمانے میں یقیناً خوبصورت ہوگی۔ اس کے سرخ و سفید گالوں پر گوشتی قد رجھریاں پڑ گئی تھیں، مگر پھر بھی وہ اپنی عمر سے کئی برس چھوٹی دکھائی دیتی تھی۔ مگر ہمیں اس کے گالوں سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کی بیٹی (معلوم نہیں وہ اس کی بیٹی تھی یا نہیں) شباب کا بڑا دلکش نمونہ تھی۔ اس کے خدوخال میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکے کہ وہ فاحشہ ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس کی ماں اس سے پیشہ کراتی تھی اور خوب دولت کما رہی تھی اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس لڑکی کو جس کا نام پھر آپ کی سہولت کی خاطر نواب رکھے دیتا ہوں، اس پیشے سے نفرت نہیں تھی۔ اصل میں، اس نے آبادی سے دور ایک ایسے مقام پر پرہش پائی تھی کہ اس کو صحیح ازدواجی زندگی کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ جب سردار نے اس سے پہلا مرد بستر پر..... اس نواڑی پلنگ پر

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

نام ہی نہیں لیتے تھے۔ کچھ ساری رات جاگتے رہتے اور صبح موٹر میں سوار ہو کر بھاگ جاتے تھے۔

سردار، بے فکر تھی۔ اس کو اپنی بیٹی پر، یا جو کچھ بھی وہ تھی، پورا اعتماد تھا کہ وہ گاہکوں کو سنبھال سکتی ہے، اس لیے وہ افیم کی ایک گولی کھا کر کھٹاٹ پر سوئی رہتی تھی۔ کبھی کبھار جب اس کی ضرورت پڑتی..... مثال کے طور پر جب کسی گاہک کی طبیعت زیادہ شراب پینے کے باعث ایک دم خراب ہو جائے، تو وہ غنودگی کے عالم میں اٹھ کر نواب کو ہدایات دے دیتی تھی کہ اس کو اچار کھلا دے یا کوشش کرے کہ وہ نمک ملا گرم گرم پانی پلا کر قے کرادے اور بعد میں تھپکیاں دے کر سلا دے۔

سردار اس معاملے میں بڑی محتاط تھی کہ جو نہی کوئی گاہک آتا وہ اس سے نواب کی فیس پہلے ہی وصول کر کے اپنے نیپے میں محفوظ کر لیتی تھی اور اپنے مخصوص انداز میں دعائیں دے کر، کہ تم آرام سے جھولے جھولو، افیم کی ایک گولی ڈیا میں سے نکال کر منہ میں ڈال کر سو جاتی۔

جو روپیہ آتا اس کی مالک سردار تھی۔ لیکن جو تحفے تحائف وصول ہوتے وہ نواب ہی کے پاس رہتے تھے۔ چونکہ اس کے پاس آنے والے لوگ دولت مند ہوتے، اس لیے وہ بڑھیا سے بڑھیا کپڑا پہنتی اور قسم قسم کے پھل اور مٹھائیاں کھاتی تھی۔

وہ خوش تھی..... مٹی سے لپے پتے اس مکان میں جو صرف تین چھوٹی چھوٹی کوٹڑیوں پر مشتمل تھا۔ وہ اپنی دانست کے مطابق بڑی دلچسپ اور خوشگوار زندگی

بسر کر رہی تھی..... ایک فوجی افسر نے اسے گراموفون اور بہت سے ریکارڈ لادینے
تھے۔ فرصت کے اوقات میں وہ ان کو بجا بجا کر فلمی گانے سنتی اور ان کی نقل
اتارنے کی کوشش کیا کرتی تھی..... اس کے گلے میں کوئی رس نہیں تھا۔ مگر شاید وہ
اس سے بے خبر تھی..... سچ پوچھنے تو اس کو کسی بات کی خبر نہیں تھی اور نہ اس کو
اس بات کی خواہش تھی کہ وہ کسی چیز سے باخبر ہو۔ جس راستے پر وہ ڈال دی گئی
تھی، اس کو اس نے قبول کر لیا تھا۔ بڑی بے خبری کے عالم میں۔

سرکنڈوں کے اس پار کی دنیا کیسی ہے، اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔
سوائے اس کے کہ ایک کچی سڑک ہے، جس پر ہر دوسرے تیسرے دن ایک موٹر
دھواں اڑاتی ہوئی آتی ہے اور رک جاتی ہے۔ بارن بچتا ہے۔ اس کی ماں یا جو کوئی
بھی وہ تھی۔ کھنیا پر سے اٹھتی ہے اور سرکنڈوں کے پاس جا کر موٹر والے سے کہتی
ہے کہ موٹر ذرا دیر کھڑی کر کے اندر آ جائے۔ اور وہ اندر آ جاتا ہے اور نوٹری پلنگ
پر اس کے ساتھ بیٹھ کر میٹھی میٹھی باتوں میں مشغول ہو جاتا ہے۔

اس کے ہاں آنے جانے والوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ یہی پانچ چھ ہوں
گے مگر یہ پانچ چھ مستقل گاہک تھے اور سردار نے کچھ ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ ان کا
باہم تصادم نہ ہو۔ بڑی ہوشیار عورت تھی..... وہ ہر گاہک کے لیے خاص دن مقرر
کر دیتی اور ایسے پہلے سے کہ کسی کو شکایت کا موقع نہ ملتا تھا۔

اس کے علاوہ ضرورت کے وقت اس کا بھی انتظام کرتی رہتی کہ نواب ماں نہ
بن جائے۔ جن حالات میں نواب اپنی زندگی گزار رہی تھی ان میں اس کا ماں بن
جانا یقینی تھا۔ مگر سردار وہ ڈھائی برس سے بڑی کامیابی کے ساتھ اس قدر ترقی

خاطرے سے ٹپ رہی تھی۔

سرکنڈوں کے پیچھے یہ سلسلہ دو ڈھائی برس سے بڑے ہموار طریقے سے چل رہا تھا۔ پولیس والوں کو بالکل علم نہیں تھا۔ بس صرف وہی لوگ جانتے تھے جو وہاں آتے تھے۔ یا پھر سردار تھی اور اس کی بیٹی نواب یا جو کوئی بھی وہ تھی۔

سرکنڈوں کے پیچھے، ایک دن مئی کے اس مکان میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا۔ ایک بہت بڑی موٹر جو غائب ہو جاتی تھی وہاں آ کے رکی۔ بارن بجا۔ سردار باہر آئی تو اس نے دیکھا کوئی اجنبی ہے۔ اس نے اس سے کوئی بات نہ کی۔ اجنبی نے بھی اس سے کچھ نہ کہا۔ موٹر دوڑ کھڑی کر کے وہ اتر اور سیدھا ان کے گھر میں گھس گیا جیسے برسوں کا آنے جانے والا ہے۔

سردار بہت شہنائی لیکن دروازہ کی دہلیز پر نواب نے اس اجنبی کا بڑی پیاری مسکراہٹ سے خیر مقدم کیا اور اسے اس کمرے میں لے گئی جس میں نوٹری پلنگ تھا۔ دونوں اس پر ساتھ ساتھ بیٹھے ہی تھے کہ سردار آ گئی..... ہوشیار عورت تھی۔ اس نے دیکھا کہ اجنبی کسی دولت مند گھرانے کا آدمی ہے۔ خوش شکل ہے، صحت مند ہے..... اس نے اندر کوٹھڑی میں داخل ہو کر سلام کیا اور پوچھا۔ ”آپ کو ادھر کا راستہ کس نے بتایا؟“

اجنبی مسکرایا اور بڑے پیار سے نواب کے گوشت بھرے گالوں میں اپنی انگلی چبھو کر کہا۔ ”اس نے؟“

نواب تڑپ کر ایک طرف ہٹ گئی، ایک ادا کے ساتھ کہا۔ ”ہائیں..... میں تو کبھی تم سے ملی بھی نہیں۔“

اجنبی کی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر اور زیادہ پھیل گئی۔ ”ہم تو کئی بار تم سے مل چکے ہیں۔“

نواب نے پوچھا۔ ”کہاں..... کب؟“ حیرت کے عالم میں اس کا چھوٹا سا منہ کچھ اس طور پر وا ہوا کہ اس کے چہرے کی دکاشی میں اضافے کا موجب ہو گیا۔ اجنبی نے اس کا گدگدایا ہوا کھنکھارہ اور سردار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم یہ باتیں ابھی نہیں سمجھ سکتے..... اپنی ماں سے پوچھو۔“

نواب نے بڑے بھولپن کے ساتھ اپنی ماں سے پوچھا کہ یہ شخص اس سے کب اور کہاں ملا تھا۔ سردار سارا معاملہ سمجھ گئی کہ وہ لوگ جو اس کے یہاں آتے ہیں، ان میں سے کسی نے اس کے ساتھ نواب کا ذکر کیا ہوگا اور سارا اتنا بتا دیا ہو گا۔ چنانچہ اس نے نواب سے کہا۔ ”میں بتا دوں گی تمہیں۔“

اور یہ کہہ کر وہ باہر چلی گئی۔ کھنکھارہ پر بیٹھ کر اس نے ڈبیا میں سے افیم کی گولی نکالی اور لیٹ گئی۔ وہ مطمئن تھی کہ آدمی اچھا ہے۔ گڑبڑ نہیں کرے گا۔

وٹوق سے اس بارے میں کچھ کہا نہیں جاسکتا، لیکن اغلب یہی ہے کہ اجنبی جس کا نام ہیبت خان تھا اور ضلع ہزارہ کا بہت بڑا رئیس تھا، نواب کے الہ پین سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے رخصت ہوتے وقت سردار سے کہا کہ آئندہ نواب کے پاس اور کوئی نہ آیا کرے۔ سردار ہوشیار عورت تھی۔ اس نے ہیبت خان سے کہا۔ ”خان صاحب یہ کیسے ہو سکتا ہے..... کیا آپ اتنا روپیہ دے سکیں کہ.....“

ہیبت خان نے سردار کی بات کاٹ کر جیب میں ہاتھ ڈالا اور سوسو کے نوٹوں

کی ایک موٹی گڈی نکالی اور نواب کے قدموں میں پھینک دی۔ پھر اس نے اپنی ہیرے کی انگلی سے نکالی اور نواب کو پہنا کر تیزی سے سر کندوں کے اس پار چلا گیا۔

نواب نے نوٹوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ بس دیر تک اپنی ہی ہونٹیں انگلی کو دیکھتی رہی جس پر کافی بڑے ہیرے سے رنگ رنگ کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ موٹر اسٹارٹ ہوئی اور دھول اڑاتی چلی گئی۔ اس کے بعد وہ چوکی اور سر کندوں کے پاس آئی، مگر اب گرد و غبار کے سوا سڑک پر کچھ بھی نہیں تھا۔

سردار نوٹوں کی گڈی اٹھا کر انہیں گن چکی تھی ایک نوٹ اور ہوتا تو پورے ہزار تھے۔ مگر اس کو اس کا افسوس نہیں تھا۔ سارے نوٹ اس نے اپنی گھیرے دار شلواری کے نیپے میں بڑی صفائی سے اڑے اور نواب کو چھوڑ کر اپنی کھٹیا کی طرف بڑھی اور ڈبیا میں سے افیم کی ایک بڑی گولی نکال کر اس نے منہ میں ڈالی اور بڑے اطمینان سے لیٹ گئی اور دیر تک سوئی رہی۔

نواب بہت خوش تھی۔ بار بار اپنی اس انگلی کو دیکھتی تھی جس میں ہیرے کی انگلی پڑی تھی..... تین چار روز گزر گئے۔ اس دوران میں اس کا ایک پرانا گاہک آیا جس سے سردار نے کہہ دیا کہ پولیس کا خطرہ ہے۔ اس لیے اس نے یہ دھندا بند کر دیا ہے۔ یہ گاہک جو خاصا دولت مند تھا، بے ٹیل و مرام واپس چلا گیا۔ سردار کو ہیبت خان نے بہت متاثر کیا تھا۔ اس نے افیم کھا کر پینگ کے عالم میں سوچا تھا کہ اگر آمدن اتنی ہی رہے جتنی کہ پہلے تھی اور آدمی صرف ایک ہو تو بہت اچھا ہے۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ باقیوں کو آہستہ آہستہ یہ کہہ کر خادے لگی کہ

پولیس والے اس کے پیچھے ہیں۔ اور وہ یہ نہیں دیکھ سکتی کہ ان کی عزت خطرے میں پڑے۔

ہیبت خان ایک ہفتے کے بعد نمودار ہوا۔ اس دوران میں سردار دو دو گاہوں کو منع کر چکی تھی کہ وہ اب ادھر کا رخ نہ کریں۔

وہ اسی شان سے آیا، جس شان سے پہلے روز آیا تھا۔ آتے ہی اس نے نواب کو اپنی چھاتی کے ساتھ بچھینچ لیا۔ سردار نے اس سے کوئی بات نہ کی۔ نواب اسے بلکہ یوں کہیے کہ ہیبت خان اسے اس کوٹھڑی میں لے گیا جہاں نوٹری پانگ تھا۔ اب کی سردار اندر نہ آئی اور اپنی کھٹیا پر افیم کی گولی کھا کر اوجھستی رہی۔

ہیبت خان بہت محظوظ ہوا۔ اس کو نواب کا الہڑ پن اور بھی زیادہ پسند آیا۔ وہ پیشہ ور رنڈیوں کے چلتروں سے قطعاً ناواقف تھی۔ اس میں وہ گھریلو پن بھی نہیں تھا جو عام گھریلو عورتوں میں ہوتا ہے۔ اس میں کوئی ایسی بات تھی جو خود اس کی اپنی تھی دوسروں سے بالکل مختلف۔ وہ بستر میں اس کے ساتھ اس طرح لیٹتی تھی جس طرح بچہ اپنی ماں کے ساتھ لیٹتا ہے۔ اس کی چھاتیوں پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ اس کی ناک کے نتھنوں میں انگلیاں ڈالتا ہے، اس کے بال نوچتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ سو جاتا ہے۔

ہیبت خان کے لیے یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ اس کے لیے عورت کی یہ قسم بالکل نرالی، دلچسپ اور فرحت بخش تھی۔ وہ اب ہفتے میں دو بار آنے لگا تھا۔ نواب، اس کے لیے ایک بے پناہ کشش بن گئی تھی۔

سردار خوش تھی کہ اس کے نیپے میں اڑسنے کے لیے کافی نوٹ مل جاتے ہیں

..... لیکن نواب اپنے الہڑ پن کے باوجود بعض اوقات سوچتی تھی کہ ہیبت خان ڈرا ڈرا سا کیوں رہتا ہے۔ اگر کچی سڑک پر سے ہر کندوں کے اس پار کوئی لاری یا موٹر گزرتی ہے تو وہ کیوں ہم سا جاتا ہے۔ کیوں اس سے الگ ہو کر باہر جاتا ہے اور چھپ چھپ کر دیکھتا ہے کہ کون تھا۔

ایک رات بارہ بجے کے قریب سڑک پر سے کوئی لاری گزری ہیبت خان اور نواب دونوں ایک دوسرے سے گتھے ہوئے سو رہے تھے کہ ایک دم ہیبت خان بڑے زور سے کانپا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ نواب کی نیند بڑی ہلکی تھی وہ کانپا تو دوسرے سے پیر تک یوں لرزی جیسے اس کے اندر زلزلہ آ گیا ہے۔ چیخ کر اس نے پوچھا۔
”کیا ہوا؟“

ہیبت خان اب کسی قدر سنبھل چکا تھا۔ اس نے خود کو اور زیادہ سنبھال کر اس سے کہا۔ ”کوئی بات نہیں..... میں..... میں شاید خواب میں ڈر گیا تھا۔“
لاری کی آواز دور سے رات کی خاموشی میں ابھی تک آرہی تھی۔
نواب نے اس سے کہا۔ ”نہیں خان..... کوئی اور بات ہے۔ جب بھی کوئی موٹر یا لاری سڑک پر سے گزرتی ہے، تمہاری یہی حالت ہوتی ہے۔“
ہیبت خان کی شاید یہ دیکھتی رگ تھی جس پر نواب نے ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اس نے اپنا مردانہ وقار قائم رکھنے کے لیے بڑے تیز لہجے میں کہا۔ ”بکتی ہو تم..... موٹروں اور لاریوں سے ڈرنے کی کیا عیب ہو سکتی ہے؟“

نواب کا دل بہت نازک تھا۔ ہیبت خان کے تیز لہجے سے اس کے پٹھیں لگی اور اس نے ہلکے ہلکے کر رونا شروع کر دیا۔ ہیبت خان نے جب اس کو چپ کرایا تو وہ

اپنی زندگی کے ایک لطیف ترین خط سے آشنا ہوا اور اس کا جسم نواب جسم سے اور زیادہ قریب ہو گیا۔

بیٹ خان اچھے قد کاٹھ کا آدمی تھا۔ اس کا جسم کٹھا ہوا تھا۔ خوبصورت تھا۔ اس کی بانہوں میں نواب نے پہلی بار بڑی پیاری حرارت محسوس کی تھی اس کو جسمانی لذت کی الف بے اسی نے سکھائی تھی۔ وہ اس سے محبت کرنے لگی تھی۔ یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ شے جو محبت ہوتی ہے اس کے معانی اب اس پر آشکار ہو رہے تھے۔ وہ اگر ایک ہفتہ غائب رہتا تو نواب گراموفون پر دردیلے گیتوں کے ریکارڈ لگا کر خود ان کے ساتھ گاتی اور آہیں بھرتی تھی۔ مگر اس کو اس بات کی بڑی الجھن تھی کہ بیٹ خان موٹروں اور لاریوں کی آمد و رفت سے کیوں گھبراتا ہے۔

مہینوں گزر گئے۔ نواب کی سپردگی اور اس کے انتہات میں اضافہ ہوتا گیا۔ مگر ادھر اس کی الجھن بڑھتی گئی کہ اب بیٹ خان چند گھنٹوں کے لیے آتا اور انفرادی کے عالم میں واپس چلا جاتا تھا۔ نواب محسوس کر سکتی تھی کہ یہ سب کسی مجبوری کی وجہ سے ہے، ورنہ بیٹ خان کا جی چاہتا ہے کہ وہ زیادہ دیر ٹھہرے۔

اس نے کئی مرتبہ اس سے اس بارے میں پوچھا، مگر وہ گول کر گیا۔ ایک دن صبح سویرے اس کی ڈوج سرکنڈوں کے پارر کی۔ نواب سو رہی تھی۔ بارن بجا تو چونک کر اٹھی۔ آنکھیں ماتی ماتی باہر آئی۔ اس وقت بیٹ خان اپنی موٹر دوڑا کر کھڑی کر کے مکان کے پاس پہنچ چکا تھا۔ نواب دوڑ کر اس سے پٹ گئی۔ وہ اسے اٹھا کر اندر اس کمرے میں لے گیا جہاں نواب کا پلنگ تھا۔

دیر تک دونوں باتیں کرتے رہے۔ پیار محبت کی باتیں..... معلوم نہیں نواب

کے دل میں کیا آئی کہ اس نے اپنی زندگی کی پہلی فرمائش کی۔ ”خان.....
مجھے سونے کے کڑے ادا دو۔“

بیٹ خان نے اس کی موٹی موٹی گوشت بھری سرخ و سفید کلائیوں کو کئی مرتبہ
چوما اور کہا۔ ”کل ہی آ جائیں گے۔ تمہارے لیے تو میری جان حاضر ہے۔“
نواب نے ایک ادا کے ساتھ مگر اپنے مخصوص الہز انداز میں کہا۔ ”خان
صاحب..... جانے دیجیے..... جان تو مجھے ہی دینی پڑے گی۔“
بیٹ خان یہ سن کر کئی بار اس کے صدقے ہوا..... اور بڑا پر لطیف وقت
گزار کے چلا گیا اور وعدہ کر گیا کہ وہ دوسرے دن آئے گا اور سونے کے کڑے
اس کے نرم نرم ہاتھوں میں خود پہنائے گا۔

نواب خوش تھی۔ اس رات وہ دیر تک مسرت بھرے رویکار ڈبجا بجا کر اس
چھوٹی کوٹھڑی میں ناچتی رہی جس میں نواڑی پلنگ تھا..... سردار بھی خوش تھی۔ اس
رات اس نے پھر اپنی دنیا سے افیم کی ایک بڑی گولی نکالی اور اسے نگل کر سونگئی۔
دوسرے دن نواب اور زیاہ خوش تھی کہ سونے کے کڑے آنے والے ہیں اور
بیٹ خان خود اس کو پہنانے والا ہے۔ وہ سارا دن منتظر رہی پر وہ نہ آیا۔ اس نے
سوچا، شاید موڈ خراب ہو گئی ہو..... شاید رات ہی کو آ جائے۔ مگر وہ ساری رات
جاگتی رہی اور بیٹ خان نہ آیا۔ اس کے دل کو، جو بہت نازک تھا بڑی ٹھیس پہنچی۔
اس نے اپنی ماں کو، یا جو کچھ بھی وہ تھی، بار بار کہا۔ ”دیکھو، خان نہیں آیا، وعدہ کر
کے پھر گیا ہے۔“ لیکن پھر وہ سوچتی اور کہتی۔ ”ایسا نہ ہو، کچھ ہو گیا ہو۔“ اور وہ سہم
سی جاتی۔

کئی باتیں اس کے دماغ میں آتی تھیں۔ موٹر کا حادثہ، اچانک بیماری، کسی ڈاکو کا حملہ..... لیکن بار بار اس کو لاریوں اور موٹروں کی آوازوں کا خیال آتا تھا۔ جن کو سن کر بیت خان ہمیشہ بوکھلا جاتا تھا..... وہ اس کے متعلق پیروں سوچتی تھی، مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس دوران میں اس کا کوئی پرانا گاڑا بھی نہ آیا۔ اس لیے کہ سرداران سب کو منع کر چکی تھی۔ تین چار لاریاں اور دو موٹریں البتہ اس کچی سڑک پر سے دھول اڑاتی گزریں۔ نواب کا ہر بار یہی جی چاہا کہ دوڑتی ہوئی ان کے پیچھے جائے اور ان کو آگ لگا دے۔ اس کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہی وہ چیزیں ہیں جو بیت خان کے یہاں آنے میں رکاوٹ کا باعث ہیں مگر پھر سوچتی کہ موٹریں اور لاریاں رکاوٹ کا کیا باعث ہو سکتی ہیں اور اپنی کم عقلی پر ہنستی۔

لیکن یہ بات اس کے فہم سے بالاتر تھی کہ بیت خان جیسا تنومند مردان کی آواز سن کر سہم کیوں جاتا ہے۔ اس حقیقت کو اس کے دماغ کی پیدا کی ہوئی کوئی دلیل جھٹلانی نہیں سکتی تھی اور جب ایسا ہوتا تو بے حد رنجیدہ اور مغموں ہو جاتی اور گراموفون پر درویلے ریکارڈ لگا سننا شروع کر دیتی اور اس کی آنکھیں نمناک ہو جاتیں۔

ایک ہفتے کے بعد دو پہر کو جب نواب اور سردار کھانا کھا کر فارغ ہو چکی تھیں اور کچھ دیر آرام کرنے کی سوچ رہی تھیں کہ اچانک باہر سڑک پر سے موٹر کے ہارن کی آواز سنائی دی۔ دونوں یہ آواز سن کر چونکیں۔ کیونکہ یہ بیت خان کی ڈوج کے ہارن کی آواز نہیں تھی..... سردار باہر لپکی کہ دیکھے کون ہے۔ پرانا آدمی ہو تو اسے

ٹر خادے۔ مگر جب وہ سرکنڈوں کے پاس پہنچی تو اس نے دیکھا کہ ایک نئی موٹر میں بیٹ خان بیٹھا ہے پچھلی نشست پر ایک خوش پوش اور خوبصورت عورت ہے۔ بیٹ خان نے موٹر کچھ دور کھڑی کی اور باہر نکلا۔ اس کے ساتھ ہی پچھلی نشست سے وہ عورت..... دونوں ان کے مکان کی طرف بڑھے سردار نے سوچا کہ یہ کیا سلسلہ ہے۔ عورت کے لیے تو بیٹ خان اتنی دور سے چل کر یہاں آتا، پھر یہ عورت جو اتنی خوبصورت ہے، جوان ہے، قیمتی کپڑوں میں ملبوس ہے، اس کے ساتھ یہاں کیا کرنے آئی ہے۔

وہ ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ بیٹ خان اس خوبصورت عورت کے ساتھ جس نے بیش قیمت زیور پہنے ہوئے تھے، مکان داخل ہو گیا۔ وہ ان کے پیچھے پیچھے چلی۔ اس کی طرف ان دونوں میں سے کسی نے دھیان ہی نہیں دیا تھا۔

جب وہ اندر گئی تو بیٹ خان، نواب اور وہ عورت تینوں فوراً ہی پلنگ پر بیٹھے تھے اور خاموشی طاری تھی..... عجیب قسم کی خاموشی۔ زیوروں سے لدی پھندی عورت البتہ کسی قدر مضطرب نظر آتی تھی کہ اس کی ایک ٹانگ بڑے زور سے مل رہی تھی۔

سردار دلیز کے پاس ہی کھڑی ہو گئی۔ اس کے قدموں کی آہٹ سن کر جب بیٹ خان نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے سلام کیا..... بیٹ خان نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سخت بوکھلایا ہوا تھا۔

اس عورت کی ٹانگ بلنا بند ہوئی اور وہ سردار سے مخاطب ہوئی۔ ”ہم آئے ہیں۔ کھانے پینے کا تو بندوبست کرو۔“

سردار نے سرتاپا مہمان نواز بن کر کہا۔ ”جو تم کہو، ابھی تیار ہو جاتا ہے۔“
 اس عورت نے جس کے خدو خال سے صاف مترشح تھا کہ بڑی دھڑلے کی
 عورت ہے سردار سے کہا۔ ”تو چلو تم باورچی خانے میں..... چولہا ساگاد..... بڑی
 دیکھی ہے گھر میں؟“

”ہے!“ سردار نے اپنا وزنی سر ہلایا۔

”تو جاؤ، اس کو دھو کر صاف کرو۔ میں ابھی آئی۔“ وہ عورت پلنگ پر سے اٹھی
 اور گراموفون کو دیکھنے لگی۔

سردار نے معذرت بھرے لہجے میں اس سے کہا۔ ”گوشت وغیرہ تو یہاں نہیں
 ملے گا۔“

اس عورت نے ایک ریکارڈ پر سوئی رکھی۔ ”مل جائے گا۔ تم سے جو کہا ہے وہ
 کرو..... اور دیکھو آگ کافی ہو۔“

سردار یہ احکام لے کر چلی گئی۔ اب وہ خوش پوش عورت مسکرا کر نواب سے
 مخاطب ہوئی۔ ”نواب ہم تمہارے لیے سونے کے کڑے لے آئے ہیں۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنا وزنی بیگ کھولا اور اس میں سے باریک سرخ کانڈ میں
 لپٹے ہوئے کڑے نکالے جو کافی وزنی اور خوبصورت تھے۔

نواب، اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے خاموش جیت خان کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے
 کڑوں کو ایک نظر دیکھا اور اس سے بڑی نرم و نازک مگر سبھی ہوئی آواز میں

پوچھا۔ ”خان، یہ کون ہے؟“

اس کا اشارہ اس عورت کی طرف تھا۔

وہ عورت کڑوں سے کھیلنے ہوئے بولی۔ ”میں کون ہوں؟..... میں ہیبت خان کی بہن ہوں۔“ اور یہ کہہ کر اس نے ہیبت خان کی طرف دیکھا جو اس کے اس جواب پر سکڑ سا گیا تھا۔ پھر وہ نواب سے مخاطب ہوئی۔ ”میرا نام ہلاکت ہے۔“ نواب کچھ نہ سمجھی۔ مگر وہ اس عورت کی آنکھوں سے خوف کھا رہی تھی جو یقیناً خوبصورت تھیں۔ مگر بڑے خوفناک طور پر کھلی۔ ان میں سے جیسے آگ برس رہی تھی۔

وہ آگے بڑھی اور اس نس سمٹی ہوئی، سمٹی ہوئی نواب کی کلاہیاں پکڑیں اور ان میں کڑنے ڈالنے لگی۔ لیکن اس نے اس کی کلاہیاں چھوڑ دیں اور ہیبت خان سے مخاطب ہوئی۔ ”تم جاؤ ہیبت خان..... میں اسے اچھی طرح سجا بنا کر تمہاری خدمت میں پیش کرنا چاہتی ہوں۔“

ہیبت خان مبہوت تھا۔ جب وہ نہ اٹھا تو وہ عورت جس نے اپنا نام ہلاکت بتایا تھا، ذرا تیزی سے بولی۔ ”جاؤ..... تم نے سنا نہیں؟“ ہیبت خان، نواب کی طرف دیکھتا ہوا باہر چلا گیا۔ وہ بہت مضطرب تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہاں جائے اور کیا کرے۔

مکان کے باہر جو برآمدہ سا تھا اس کے ایک کونے میں ٹاٹ لگا ہوا رچی خانہ تھا۔ جب وہ اس کے پاس پہنچا تو اس نے دیکھا کہ سردار آگ سا لگا چکی ہے۔ اس نے اس سے کوئی بات نہ کی اور سر کندھوں کے اس پار سڑک پر چلا گیا..... اس کی حالت نیم دیوانوں کی سی تھی۔ ذرا سی آہٹ پر بھی وہ چونک اٹھتا تھا۔ جب اس کو دور سے ایک لاری آتی دکھائی دی تو اس نے سوچا کہ وہ اسے

روک لے اور اس میں بیٹھ کر وہاں سے غائب ہو جائے۔ مگر جب وہ پاس آئی تو ایسی دھول اڑی کہ وہ اس میں غائب ہو گیا۔ اس نے آوازیں دیں، مگر گرد کے باعث اس کا حلق اس قابل ہی نہیں تھا کہ بلند آواز نکال سکے۔

گرد و غبار کم ہوا تو بیبت خان نیم مردہ تھا..... اس نے چاہا کہ سر کندوں کے پیچھے اس مکان میں جائے جہاں اس نے کئی دن اور کئی راتیں نواب کے الہرا پہلو میں گزاری تھیں مگر وہ نہ جا سکا۔ اس کے قدم ہی نہیں اٹھتے تھے۔

وہ بہت دیر تک کچی سڑک پر کھڑا سوچتا رہا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ وہ عورت جو اس کے ساتھ آئی تھی۔ اس کے ساتھ اس کے کافی پرانے تعلقات تھے۔ صرف اس بناء پر کہ بہت دیر ہوئی۔ وہ اس کے خاوند کی موت کا افسوس کرنے گیا تھا جو اس کا نگوٹیا تھا۔ مگر اتفاق سے یہ ماتم پری ان دونوں کے باہمی تعلق میں تبدیل ہو گئی۔ خاوند کی موت کے دوسرے ہی دن وہ اس کے گھر میں تھا۔ اور اس عورت نے اس کو ایسے تحکم سے اندر بلا کر اپنا آپ اس کے سپرد کیا تھا جیسے وہ اس کا نوکر ہے۔

بیبت خان عورت کے معاملے میں بالکل کورا تھا۔ جب شاہینہ نے اس کے آگے اپنے عجیب و غریب تحکم بھرے التفات کا اظہار کیا تو اس کے لیے یہی بہت بڑی بات تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہینہ کے پاس بے اندازہ دولت تھی۔ کچھ اپنی اور کچھ اپنے مرحوم خاوند کی، مگر اسے اس دولت سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس کو شاہینہ سے صرف یہی دلچسپی تھی کہ وہ اس کی زندگی کی سب سے پہلی عورت تھی۔ وہ اس کے تحکم کے نیچے شاید اس لیے دب کے رہ گیا تھا کہ وہ بالکل اناڑی

تھا۔

بہت دیر تک وہ کچی سڑک پر کھڑا سوچتا رہا۔ آخر اس سے نہ رہ گیا۔ سر کندوں کے پیچھے مکان کی طرف بڑھا تو اس نے برآمدے میں ٹاٹ لگے باورچی خانے میں سردار کو کچھ بھونٹتے ہوئے دیکھا اندر اس کمرے کی طرف گیا جہاں نواز کا پلنگ تھا تو دروازہ بند پایا۔ اس نے ہولے سے دستک دی۔

چند لمحات کے بعد دروازہ کھلا۔ کپے فرش پر اس کو سب سے پہلے خون ہی خون نظر آیا۔ وہ کانپ اٹھا۔ پھر اس نے شاہینہ کو دیکھا جو دروازہ کے پٹ کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس نے بیبت خان سے کہا۔ ”میں نے تمہاری نواب کو سچا بنا دیا ہے۔“

بیبت خان نے اپنے خشک گٹے کو جموک سے کسی قدر ترک کر کے اس سے پوچھا۔ ”کہاں ہے؟“

شاہینہ نے جواب دیا۔ ”کچھ تو اس پلنگ پر ہے۔۔۔۔۔ لیکن اس کا بہترین حصہ باورچی خانے میں ہے۔“

بیبت خان پر اس کا مطلب سمجھے بغیر بیبت طاری ہو گئی۔ وہ کچھ کہہ نہ سکا۔ وہیں دہلیز کے پاس کھڑا رہا۔ مگر اس نے دیکھا کہ فرش پر گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی ہیں اور۔۔۔۔۔ اور ایک تیز چھری بھی پڑی ہے اور نوازی پلنگ پر کوئی لیٹا ہے جس پر خون آلود چادر پڑی ہے۔

شاہینہ نے مسکرا کر کہا۔ ”چادر اٹھا کر دکھاؤں۔۔۔۔۔ تمہاری بچی بنی نواب ہے! میں نے اپنے ہاتھوں سے سکھار کیا ہے۔۔۔۔۔ لیکن تم پہلے کھانا کھا لو۔ بہت بھوک لگی

ہوگی تمہیں۔ سردار بڑا لذیذ گوشت بھون رہی ہے۔ اس کی بوٹیاں میں نے خود اپنے ہاتھ سے کاٹی ہیں۔“

ہیبت خان کے پاؤں لڑکھڑائے..... زور سے چلایا۔ ”شاہینہ تم نے یہ کیا کیا؟“

شاہینہ مسکرائی۔ ”جان من یہ پہلی مرتبہ نہیں..... دوسری مرتبہ ہے۔ میرا خاوند اللہ اسے جنت نصیب کرے، تمہاری طرح ہی بے وفا تھا۔ میں نے خود اس کو اپنے ہاتھوں سے مارا تھا اور اس کا گوشت پکا کر چیلوں اور کوؤں کو کھلایا تھا..... تم سے مجھے پیار ہے، اس لیے میں نے تمہارے بجائے.....“

اس نے فقرہ مکمل نہ کیا اور پلنگ پر سے خون آلودہ چادر ہٹا دی..... ہیبت خان کی چیخ اس کے حلق کے اندر ہی پھنسی رہی اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ جب اسے ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ شاہینہ کار پلا رہی ہے اور وہ غیر علاقتے میں ہیں۔

سنترپش

میں لاہور کے ایک اسٹوڈیو میں ملازم ہوا..... جس کا مالک میرا بھتیجی کا دوست تھا..... اس نے میرا استقبال کیا..... میں اس کی گاڑی میں اسٹوڈیو پہنچا تھا بغل گیر ہونے کے بعد اس نے اپنی شرافت بھری مونچھوں کو جو غالباً کئی دنوں سے ماتر اشیدہ تھیں..... تھرکا کر کہا۔
 ”کیوں خوبہ چھوڑ دی۔“

میں نے جواب دیا
 ”چھوڑنی پڑی۔“

اسٹوڈیو کا مالک جو اچھا فلم ڈائریکٹر بھی ہے (میں اسے سہولت کی خاطر گیا ہوں گا) مجھے اپنے خاص کمرے میں لے گیا..... ادھر ادھر کی بے شمار باتیں کرنے کے بعد اس نے چائے منگوائی جو نہایت ذلیل تھی..... زبردستی پانی..... کئی سگریٹ اس دوران خود پھونکے اور مجھ سے پھنکوائے۔
 مجھے ایک ضروری کام سے جانا تھا..... چنانچہ میں نے اس سے کہا۔
 ”یار چھوڑو اب چائے کی بجائے اس کو..... مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے آج اتنے برسوں کے بعد یاد کیسے کر لیا۔“

”بس ایک دن اچانک یاد آ گئے..... بلا لیا..... بتاؤ اب صحت کیسی ہے۔“
 ”تمہاری دعا سے ٹھیک ہے۔“ میرے لہجے میں دوستانہ طنز تھا..... وہ ہنسا۔
 ”واہ میرے مولوی صاحب..... میرا خیال ہے کہ جب سے تم خشک خشک

ہوئے ہو۔۔۔ تمہاری ہر وقت شگفتہ رہنے والی طبیعت ٹھہرے پانی کی طرح ٹھہر گئی ہے۔“

”ہوگا ایسا ہی۔“

”ہوگا کیا۔۔۔ ہے ہی ایسا معاملہ۔۔۔ لیکن خدا نہ کرے ایسا ذہانت جس کے سب معترف ہیں۔۔۔ اس کا بھی یہی حشر ہو۔۔۔ کیا تم اب بھی فلمی کہانی کا ڈھانچہ تیار کر سکتے ہو۔۔۔ فرسٹ کلاس کہانی۔“

میں نے اس سے کہا۔

”فرسٹ، سیکنڈ، انٹر اور تھرڈ میں نہیں جانتا۔۔۔ البتہ کہانی ضرور ہوگی۔۔۔ تم سوچتے ہو فرسٹ کی کہانی وہ اسکرین پر آتے ہی تھرڈ بن جائے۔۔۔ یا تھرڈ جس کو تم نے ڈیو میں بند کر کے گودام میں رکھ چھوڑا تھا۔۔۔ وہ گولڈن جلی فلم ثابت ہوا۔۔۔ کیا درست نہیں۔۔۔ خیر ان باتوں کو چھوڑو تم یہ بتاؤ کہ چاہتے کیا ہو۔“

اس نے مجھے ایک سگریٹ ساگایا اور بچیدگی سے کہا۔

”دیکھو منٹو۔۔۔ میں ایک کہانی چاہتا ہوں۔۔۔ بڑا دلچسپ رومان ہو اور تم مجھے اس کا مفصل اسکیچ ایک ہفتہ کے اندر اندر دو۔۔۔ کیونکہ میں فلم ڈسٹری بیوٹر سے کنٹریکٹ کر چکا ہوں تم بتاؤ کتنی دیر میں لکھ لو گے۔۔۔“

اس نے مجھے ایک سگریٹ ساگایا اور بچیدگی سے کہا۔

”دیکھو منٹو۔۔۔ میں ایک کہانی چاہتا ہوں۔۔۔ بڑا دلچسپ رومان ہو اور تم مجھے اس کا مفصل اسکیچ ایک ہفتہ کے اندر اندر دو۔۔۔ کیونکہ میں فلم ڈسٹری بیوٹر سے

کنٹریکٹ کر چکا ہوں تم بتاؤ کتنی دیر میں لکھ لو گے.....“
”فراغت سے ایک مہینہ کے بعد۔“

سردیوں کا موسم تھا اس نے اپنے ہاتھ میں ایک دوسرے کے ساتھ بڑے زور کے ساتھ ملے..... اس کے اس عمل سے دو چیزیں ظاہر ہوتی تھیں۔ اول یہ کہ اس کے ہاتھ گرم ہو گئے ہیں..... دوم یہ کہ اس کے سر کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے کہ اس کو کہانی وقت پر مل جائے گی اور وہ جو کہ میری طرح بڑی تیزی سے کام کرنے والا ہے اسے وقت مقررہ کے اندر انڈر ڈائریکٹ کر کے اس کے پرنٹ ڈسٹری بیوٹر کے حوالے کر دے گا اور کنٹریکٹ کی رو سے جو بقایا رقم اس کے نام نکلتی تھی اسی وقت میز پر دھروالے گا۔

اس نے چند لمحات غور کیا۔

”کل ہی کام شروع کر دے گا۔“

میں نے جواب دیا۔

”کام تو میں شروع کر دوں..... لیکن یہاں میرے لیے کوئی علیحدہ کمرہ ہونا

چاہیے۔“

”ہو جائے گا۔“

”اور ایک اسٹنٹ.....“

”مل جائے گا..... تو کل سے آنا شروع کر دو گے۔“

میں نے اس سے کہا۔

”دیکھو گیلانی..... میرے گھر سے اور تمہارے اسٹوڈیو تک کا فاصلہ کافی ہے

..... تاکے میں آؤں تو قریب قریب ڈیڑھ گھنٹہ..... بس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

اس نے پوچھا۔
”کیوں؟“

”یعنی اس کا انتظار کرنا پڑتا ہے..... بس اسٹینڈ پر کھڑے رہو..... خدا خدا کر کے پانچ نمبر کی بس آگئی..... مسافروں سے بھری ہوئی اور وہ بغیر ٹھہرے چل دی اور تم خود کو دنیا کا کم ترین انسان محسوس کرتے ہو..... جی میں آتا ہے کہ خودکشی کر لو..... یا پھر دنیا والوں کی بے رخی سے نجات حاصل کرنے کے لیے سنیاں و سار لو۔“

گیانی نے اپنی شرارت بھری مونچھیں تھرکانیں۔
”میں شرط بدنے کے لیے تیار ہوں کہ تم کبھی دنیا تیاگ نہیں سکتے جس دنیا میں کہ ہر قسم کی شراب ماتی ہے..... اور خوبصورت عورتیں بھی۔“
میں نے چڑ کر کہا۔

”عورتیں جائیں جہنم میں..... تم اچھی طرح جانتے ہو کہ بمبئی کے ہراسٹوڈیو میں جہاں مس نے کام کیا۔ ان سے دور ہی رہا۔ تم تو خیر اپنے وقت کے ڈون جوڈران ہو (Don Jyan)۔“

”مذاق اڑاتے ہو تم خولہ میرا۔“
میں نے سنجیدگی کے ساتھ اس سے کہا۔
”نہیں گیانی۔“

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا.....

یا یوں کہہ لو

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشند خدائے بخشندہ
گیانی مسکرایا۔

”خدائے بخشندہ تو بڑے عرصہ سے تمہیں مرحوم و مغفور کر چکا ہے..... تم بخشی
ہوئی روح ہو۔“

میں نے کہا۔

”اس سے کیا ہوتا ہے..... میں اپنے گناہوں کی سزا بھگتنا چاہتا ہوں۔“
”فلسفہ مت بگھاو یا..... یہ بتاؤ کیا ابھی تک تمہارے پاس وہ اردو ٹائپ
رائٹر موجود ہے۔“

”اچھا تو یہ بتاؤ کہ تم وہ ایکٹریس جس سے تم نے کلکتے میں شادی کی تھی ابھی
تک تمہارے پاس موجود ہے۔“

گیانی نے فخریہ انداز میں جواب دیا۔

”موجود کیوں نہیں ہوگی..... گویا تمہاری نظر میں ایکٹریس اور ٹائپ رائٹر میں
کوئی فرق نہیں۔“

میں نے اس سے کہا۔

”کیا فرق ہے..... ایک فلم پر ٹائپ کرتی ہے..... دوسری کانڈ پر.....
دونوں کسی وقت بھی بگڑ سکتی ہیں۔“

گیانی میری ان باتوں سے تنگ آ گیا تھا۔۔۔ آخر میں نے اس کو دل اسہ دیا۔
 ”یار یہ سب مذاق تھا۔۔۔ تو میں کل آ جاؤں۔۔۔ میرا مطلب ہے تم گاڑی بھیج
 دو گے۔“

گیانی صوفے پر سے اٹھا۔۔۔ اس کے ساتھ میں بھی۔۔۔ اس نے کہا۔
 ”ہاں۔۔۔ ہاں بھئی۔۔۔ کب چاہیے تمہیں گاڑی۔“
 ”کوئی بھی وقت مقرر کر لو۔۔۔ ساڑھے نو بجے صبح۔“
 ”ٹھیک ہے۔“

”تم کاغذ وغیرہ آج ہی منگوالیں۔۔۔ تاکہ میں اسٹوڈیو پہنچتے ہی کام شروع کر
 دوں۔۔۔ اور تم سے یہ النانہ سنوں کہ دیکھو تم نے مجھے لیٹ ڈاؤن کر دیا۔ میرا اتنے
 ہزار روپے کا نقصان ہو گیا ہے۔“
 گیانی نے بڑے پیار سے کہا۔

”کیا جانتے ہو یار۔۔۔ میں تمہاری طبیعت سے کیا واقف نہیں۔۔۔ کبھی کبھی تم
 ڈبکی لگا جایا کرتے ہو۔“
 میں نے اس کو یقین دلایا۔

”نہیں ایسا نہیں ہوگا۔۔۔ تم مطمئن رہو۔۔۔ ہاں میرا مائپ رائٹر یہاں محفوظ تو
 رہے گا۔“

گیانی کی عادت ہے کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر چڑھتا ہے۔
 ”محفوظ نہیں رہے گا تو کیا غنڈے انگو اکرنے آ جائیں گے۔ اپنے کسی عاشق
 کے ساتھ تمہاری مشین بھاگ نکلتی گی۔“

میں بہت ہنسا۔

ہنستے ہنساتے ہم وہ دنوں نے اسٹوڈیو کا چکر لگایا..... اس کے بعد اس نے مجھے
الوداع کہی اور میں اسی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا..... جہاں پہنچتے ہی میں نے
اپنے ٹائپ رائٹر کی جھاڑ پونچھ کی..... اس لیے کہ ایک مدت سے میں نے اسے
استعمال نہیں کیا تھا..... کیونکہ فلمی کہانی لکھنے کا اس دوران میں کوئی موقع ہی میسر نہ
آیا۔

بگڑا ہو ملکینک یا مسٹری آرٹسٹ بن جاتا ہے یہ میرا اپنا ذاتی اختراع کردہ
محاورہ ہے۔

گیلانی شروع شروع میں ملکینک تھا..... بگڑ کر وہ آرٹسٹ بن گیا پر وہ مہنتی تھا۔
جب وہ مسٹری تھا تو اسے زیادہ سہولتیں میسر نہیں تھیں لیکن جب کیمرہ قلی سے
ترقی کرتا کرتا کیمرہ مین بن گیا تو اس نے کیمرے کے ہر پیچ کے متعلق اپنی
خداداد ذہانت اور جستجو طلب طبیعت کی بدولت یہ دریافت کر لیا کہ ان کا لوہے کے
اس چوکھٹے میں اپنی اپنی جگہ کیا مصرف ہے۔

کیمرے کو وہ الٹا کرتا..... کبھی سیدھا..... کبھی اس کا گیٹ کھول کر بیٹھ جاتا اور
گھنٹوں اس سے اپنے مختلف سائز کے پیچ پر زوں کے ذریعہ سے بوسہ کنار میں
مشغول رہتا۔

فرصت کے اوقات..... یعنی جب شوٹنگ نہیں ہوتی تھی..... وہ اپنی سائیکل پر
شہر پہنچتا اور سارا دن کباڑیوں کی دکانوں پر صرف کرتا..... اس کو دنیا کے تمام
کباڑیوں سے محبت ہے اور ان کے کباڑ خانوں کو وہ بڑی مقدس جگہیں تصور کرتا

تھا۔

وہ ان دکانوں میں بیٹھ کر منصوبہ تیار کرتا رہتا کہ سلائی مشین کا ہینڈل جو بیکار پڑا ہے اگر لوہے کے فلاں نکلے کے ساتھ ویلڈ کر دیا جائے اور اس کے فلاں کے اندر چھوٹے پٹکے جو نکلنے والی دکان میں موجود ہیں لگا دیئے جائیں تو فرسٹ کلاس دھوکنی بن سکتی ہے۔

حد معلوم وہ کیا کیا سوچتا تھا..... ان دنوں دراصل ذہنی ورزش کر رہا تھا..... یہ وہ تیاری تھی جو وہ اپنے منصوبوں کی تکمیل کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا۔
اس نے ایڈیٹنگ بھی اسی طرح سیکھی..... آس پاس کی ہر ننھی سے ننھی شے کا مطالعہ کیا اور آخر ایک دن اس نے اسٹوڈیو کی ایک فلم کی ایسی عمدہ ایڈیٹنگ کی کہ لوگ دنگ رہ گئے۔

سینٹھ نے سوچا..... کہ اچھے کیمرہ مین تو مل جائیں گے مگر ایسا بامال ایڈیٹر جو سیلو لائیڈ کے چھوٹے بڑے فیتے کے ٹکڑوں کو اس چابکدستی سے جوڑتا ہے کہ پھر اس میں مزید کٹر بیونت ہو ہی نہیں سکتی..... چنانچہ ایڈیٹنگ ڈیپارٹمنٹ کا ہیڈ بنا دیا۔ تنخواہ اس کی وہی رہی جو بحیثیت کیمرہ مین تھی۔

وہ اپنا کام بڑی محنت اور تندہی سے کرتا رہا..... لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں وہ لیبارٹری سے بھی دلچسپی لیتا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں اس نے اس کے کل پڑوں میں چند اصلاحات اور ترکیبیں پیش کیں جو بڑی رد و کد کے بعد قبول کر لی گئیں..... نتیجہ دیکھا گیا تو بڑا حوصلہ افزا تھا۔

سیٹھ نے ایک دن سوچا۔

”کیوں نہ گیانی کو ایک فلم ڈائریکٹ کرنے کا موقع دیا جائے۔“

جب اس سے پوچھا۔

”تم کوئی فلم ڈائریکٹ کر لو گے۔“

تو اس نے بڑی خود اعتمادی سے جواب دیا۔

”ہاں سیٹھ..... پر اس میں کوئی دخل نہ دے۔“

کہانی آدھی گیانی نے خود بنائی..... آدھی ادھر ادھر کے منشیوں سے لکھائی اور اللہ کا نام لے کر شوٹنگ شروع کر دی..... یہ فلم ختم ہوا اور نمائش کے لیے مقامی سینما ہاؤس میں پیش کیا گیا تو اس نے اگلے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔

اس کے بعد اس نے لاہور میں دو فلم بنائے..... یہ بھی سلور جوبلی ہٹ ثابت ہوئے..... ایک کلکتے جا کر پھر بنایا وہ بھی کامیاب تھا۔ یہاں سے وہ بمبئی پہنچا..... کیونکہ وہاں کے فلم سازوں نے بڑی تیزی تیزی آفریں بھیجی تھیں..... چنانچہ ایک جگہ اس نے آفر قبول کر کے کنٹریکٹ پر دستخط کر دیئے اور کہانی چن وے کا منظر نامہ خود لیا گیا..... فلم بن گیا..... اور اتنا بڑا ہٹ کہ اس آفس ثابت نہ ہوا۔

شاید اس لیے کہ بنوارے کے باعث دوسرے شہروں کے مانند بمبئی میں بھی فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے۔ جس طرح دوسرے مسلمان ہجرت کر رہے تھے اس طرح گیانی بھی بمبئی چھوڑ کر کراچی چلا گیا..... یہاں سے وہ لاہور پہنچا اور ایک اسٹوڈیو کی داغ بیل رکھی..... ساؤنڈ ریوڈسٹ سے لے کر کیلیں ٹشو مکنے والے تک کو اس کی ذاتی نگرانی میں کام کرنا پڑتا تھا۔ قصہ مختصر کہ اسٹوڈیو تیار ہو گیا۔

لاہور کے مسلمان ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے۔

جب یہ اسٹوڈیو بنا تو ان کی جان میں جان آئی۔ چنانچہ یہاں شوٹنگ شروع ہو گئی۔ اس کے بعد یہ چل نکلا۔۔۔۔۔ گیلانی اس دوران میں اسٹیج اور دھڑا دھڑا کے متعلقہ سامان کو درست اور مرمت کرانے میں مشغول رہا اس کا دست راست لاہوری کا ایک نوجوان سراج دین تھا۔ جو قریب قریب آٹھ برس سے اس کے ساتھ تھا۔۔۔۔۔ نے کہا نائپ رائٹروں کی دال لے کر کھالو۔ اس کے بعد گیلانی نے خود میرے نائپ رائٹر کا معائنہ کیا اور فیصلہ صادر کر دیا کہ مشین میں کوئی نقص نہیں۔

مگر سراج اپنے تجربے کے بل بوتے پر مصر تھا۔

”نہیں حضور۔۔۔۔۔ یہ اب مرمت طلب ہو چکی ہے۔۔۔۔۔ بڑے اور چھوٹے رولر سب نئے لگوانے پڑیں گے۔۔۔۔۔ اور ہالنگ ہوگی۔۔۔۔۔ اس کا کتا بھی ناقص ہو چکا ہے۔ وہ بھی پڑے گا۔“

”تمہاری ٹانگوں پر۔۔۔۔۔“

”آپ میرا مذاق نہ اڑائیے۔۔۔۔۔ اچھا۔۔۔۔۔ خیر آپ ہی صحیح کہتے ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ اپنے گنجر پر ٹوپی درست کرتا ہوا چلا گیا۔

گیلانی نے اپنا خاص ٹول بکس منگوا یا اور مشین کے سب پرزے الگ الگ کر کے رکھ دیئے۔ کوئی پرزہ پتھر پر گھسایا۔۔۔۔۔ کوئی ریگ مار پر۔۔۔۔۔ کسی کے سریش لگائی۔۔۔۔۔ کسی کو تیل اور ان کو دو بارہ فٹ کر کے فٹمنڈ انداز میں میری طرف دیکھا اور کہا۔

”کیوں صاحب ٹھیک ہو گئی یا نہیں۔“

میں نے ایسے ہی کہہ دیا۔

”ہاں اب ٹھیک ہے۔“

گیانی نے اپنے پاس کھڑے اسٹنٹ کو بلایا۔

”جاؤ اس الو کے چٹھے ایکسپریٹ سراج کو بلا کر لاؤ۔“

چند منٹ میں سراج حاضر ہو گیا۔

اس نے مشین چلائی تو دس پندرہ بارنپ ٹپ کرن کے بعد ہی خاموش ہو گئی۔

سراج نے گیانی سے کچھ نہ کہا۔

تھوڑے وقفہ کے بعد گیانی بڑے تحکمانہ لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔

”اچھا تم اسے بناؤ دیکھیں تم کیا تیر مارتے ہو۔“

مجھے اپنی پندرہ سالہ عزیز مشین کی اس درگت پر ترس آ رہا تھا..... مگر اب کیا ہو

سکتا ہے..... جب اس کراچر پنجر ڈھیلے ہوئے میری آنکھوں کے سامنے پڑے تھے۔

دوسرے دن سراج نے اپنا ٹول بکس ریکارڈنگ میں سے منگوا لیا اور میری

مشین پر اپنی ماہرانہ سرجری شروع کر دی۔

ضروری پرزے نکال کر اس نے علیحدہ رکھ لیے اور باقی حصے پٹرول میں ڈال

دیئے۔

اب ان کی چٹا جانے کے لیے صرف ماچس کی ایک تیلی ہی کافی تھی۔

میں خاموش رہا۔

یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔

کتے کے جڑوں کو ایک پاس کے ساتھ زور سے پکڑا اور میری طرف کرتے

ہوئے بولا۔

”لو دیکھ لو..... میں نہ کہتا تھا..... کتنا کام نہیں کر رہا..... اس کا تو سنتر بیج ہی

خراب ہے۔“

”سنتر بیج.....“

”ہاں.....“

اور سراج ایک بار پھر اس کا سنتر بیج ٹھیک کرنے لگا۔

سونے کی انگوٹھی

”چھتے کا ہتھ بندہ ہو گیا آپ کے سر پر..... میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بال نہ کٹوانا کہاں کا فیشن ہے؟“

”فیشن ویشن کچھ نہیں..... تمہیں اگر بال کٹوانے پڑیں تو قدرِ عافیت معلوم ہو جائے۔“

”میں کیوں بال کٹواؤں۔“

”کیا عورتیں کٹواتی نہیں..... ہزاروں بلکہ لاکھوں ایسی موجود ہیں جو اپنے بال کٹواتی ہیں..... بلکہ اب تو یہ فیشن بھی چل نکلا ہے کہ عورتیں مردوں کی طرح چھوٹے چھوٹے بال رکھتی ہیں۔“

”اعت ہے ان پر.....“

”کس کی؟“

”خدا کی اور کس کی..... بال تو عورت کی زینت ہیں..... سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ عورتیں کیوں اپنے بال مردوں کی مانند بنوا لیتی ہیں پھر پتلون میں پہنتی ہیں۔ نہ رہے ان کا وجود دنیا کے تختے پر.....“

”جو وہ تو خیر آپ کی اس بد دعا سے ان نیک بخت عورتوں کا دنیا کے اس تختے سے کسی حالات میں بھی غائب نہیں ہوگا..... ویسے ایک چیز سے مجھے تم سے کئی اتفاق ہے کہ عورت کو پتلون جسے سلیکس کہتے ہیں..... نہیں پہننی چاہیے..... اور سگریٹ بھی نہیں پینے چاہئیں۔“

”اور آپ ہیں کہ دن میں پورا ایک ڈیڑھ پھونک ڈالتے ہیں۔“

”اس لیے کہ میں مرد ہوں..... مجھے اس کی اجازت ہے۔“

”کس نے دی تھی یہ اجازت آپ کو..... میں اب آئندہ سے ہر روز صرف ایک ڈیڑھ منٹ کر دیا کروں گی۔“

”اور وہ جو تہہ باری سہلیاں ہیں ان کو سگریٹ کہاں سے ملیں گے؟“

”وہ کب پیتی ہیں؟“

”اتنا سفید جھوٹ نہ بولا کرو..... ان میں سے جب بھی کوئی آتی ہے تم میرا سگریٹ کا ڈبہ اٹھا کر اندر لے جاتی ہو..... ساتھ ہی ماچس بھی..... آخر مجھے آواز دے کر تمہیں بلانا پڑتا ہے اور میرا ڈبہ مجھے واپس مل جاتا ہے اس میں سے پانچ چھ سگریٹ غائب ہوتے ہیں۔“

”پانچ چھ سگریٹ.....؟ جھوٹ تو آپ بول رہے ہیں..... وہ تو بے چاریاں مشکل سے ایک سگریٹ پیتی ہیں۔“

”ایک سگریٹ پینے میں انہیں مشکل کیا محسوس ہوتی ہے۔“

”میں آپ سے بحث کرنا نہیں چاہتی..... آپ کو تو اور کوئی کام ہی نہیں سوائے بحث کرنے کے۔“

”ہزاروں کام ہیں..... تم کون سے مل چلاتی ہو..... سارا دن پڑی سوئی رہتی ہو۔“

”جی ہاں..... آپ تو چوبیس گھنٹے جاگتے اور وظیفہ کرتے رہتے ہیں۔“

”وہ نظیفے کی بات غلط ہے..... البتہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں صرف رات کو چھ

گھٹنے سوتا ہوں۔“

”اور دن کو۔“

”کبھی نہیں..... بس آنکھیں بند کر کے تین چار گھنٹے لیٹا رہتا ہوں کہ اس سے آدمی کو بہت آرام ملتا ہے..... ساری تھکن دور ہو جاتی ہے۔“

”یہ تھکن کہاں سے پیدا ہوتی ہے۔ آپ کون سی مزدوری کرتے ہیں؟“

”مزدوری ہی تو کرتا ہوں..... صبح سویرے اٹھتا ہوں..... اخبار پڑھتا ہوں..... ایک نہیں سپر..... پھر ناشتہ کرتا ہوں..... نہاتا ہوں اور پھر تمہاری روزمرہ کی چیچ چیچ کے لیے تیار ہو جاتا ہوں۔“

”یہ مزدوری ہوئی؟ اور آپ یہ بتائیے کہ روزمرہ کی چیچ چیچ کا الزام کہاں تک درست ہے۔“

”جہاں تک اسے ہونا چاہیے..... شروع شروع میں..... میرا مطلب شادی کے بعد دو برس تک بڑے سکون میں زندگی گزرتی رہی تھی لیکن پھر ایک دم تم پر کوئی ایسا دورہ پڑا کہ تم نے ہر روز مجھ سے لڑنا جھگڑنا معمول بنالیا..... پتہ نہیں اس کی وجہ کیا ہے؟“

”وجہ ہی تو مردوں کی سمجھ سے ہمیشہ بالاتر رہتی ہے..... آپ لوگ سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔“

”مگر تم سمجھنے کی مہلت بھی دو..... ہر روز کسی نہ کسی بات کا شوشہ چھوڑ دیتی ہو..... بھلا آج کیا بات تھی جس پر تم نے اتنا چیخنا چلانا شروع کر دیا۔“

”گویا یہ کوئی بات ہی نہیں کہ آپ نے پچھلے چھ مہینوں سے بال نہیں کٹوائے

اپنی اچکنوں کے کالرو کیھئے..... میلے چکٹ ہو رہے ہیں۔“
 ”ڈرائی کلین کرالوں۔“

”پیلے اپنا آپ ڈرائی کلین کرایئے..... وحشت ہوتی ہے اللہ قسم آپ کے بالوں کو دیکھ کر..... جی چاہتا ہے مٹی کا تیل ڈال کر ان کو آگ لگا دوں۔“
 ”تا کہ میرا خاتمہ ہی ہو جائے..... لیکن مجھے تمہاری اس خواہش پر کوئی بھی اعتراض نہیں..... لاؤ باورچی خانے سے مٹی کے تیل کی بوتل..... آہستہ آہستہ میرے سر میں ڈالو اور ماچس کی تیلی جلا کر اس کو آگ دکھا دو..... خس کم جہاں پاک۔“

”یہ کام آپ خود ہی کیجیے..... میں نے آگ لگائی تو آپ یقیناً کہیں گے کہ تمہیں کسی کام کا سلیقہ نہیں۔“

”یہ تو حقیقت ہے کہ تمہیں کسی بات کا سلیقہ نہیں..... کھانا پکانا نہیں جانتیں، سینا پرونا تمہیں نہیں آتا..... گھر کی صفائی بھی تم اچھی طرح نہیں کر سکتیں، بچوں کی پرورش ہے تو اس کا تو اللہ ہی حافظ ہے۔“

”جی ہاں..... بچوں کی پرورش تو اب تک ماشاء اللہ آپ ہی کرتے آئے ہیں میں تو بالکل ہی ٹکمی ہوں۔“

”میں اس معاملے میں کچھ اور نہیں کہنا چاہتا..... تم خدا کے لیے اس بحث کو بند کرو۔“

”میں بحث کہاں کر رہی ہوں..... آپ تو معمولی باتوں کو بحث کا نام دے دیتے ہیں۔“

”تمہارے نزدیک یہ معمولی باتیں ہوں گی، مگر خدا کی قسم! تم نے میرا دماغ
چاٹ لیا ہے۔۔۔۔۔ میرے سر پر ہمیشہ اتنے ہی بال رہے ہیں۔۔۔۔۔ اور تم اچھی طرح
جانتی ہو کہ مجھے اتنی فرصت نصیب نہیں ہوتی کہ جام کے پاس جاؤں۔“
”جی ہاں۔۔۔۔۔ آپ کو اپنی عیاشیوں سے فرصت ہی کہاں ملتی ہے۔“
”کن عیاشیوں سے۔“
”آپ کام کیا کرتے ہیں۔۔۔۔۔ کہاں ملازم ہیں۔۔۔۔۔ کیا تنخواہ پاتے
ہیں۔“
”ملازمت کیا ضروری ہے میں تو اس کو بہت بڑی اعنت سمجھتا ہوں۔“
”آپ کو تو ہر وہ کام بہت بڑی اعنت معلوم ہوتا ہے جس میں آپ کو محنت
مشقت کرنی پڑے۔“
”میں کیا محنت مشقت نہیں کرتا۔۔۔۔۔ ابھی پچھلے دنوں ایشیئیں پانی کرنے کا
میں نے جو ٹھیکہ کیا تھا جانتی ہو میں نے دن رات ایک کر دیا تھا۔“
”گدھے کام کر رہے ہیں آپ تو سوتے رہے ہوں گے۔“
”گدھوں کا زمانہ گیا۔۔۔۔۔ لاریاں کام کر رہی تھیں۔۔۔۔۔ اور مجھے ان کی
نگرانی کرنا پڑتی تھی۔۔۔۔۔ دس کروڑ اینٹوں کا ٹھیکہ تھا۔۔۔۔۔ مجھے ساری
رات جاگنا پڑتا تھا۔“
”میں مان ہی نہیں سکتی کہ آپ ایک رات بھی جاگ سکیں۔“
”اب اس کا کیا علاج ہے کہ تم نے میرے متعلق ایسی غلط رائے قائم کر لی
ہے۔۔۔۔۔ اور میں جانتا ہوں کہ تم ہزار رشوت دینے پر بھی مجھ پر یقین نہیں کرو

گی۔“

”میرا یقین آپ پر سے عرصہ ہوا اٹھ گیا ہے آپ پر لے درجے کے جھوٹے

ہیں۔“

”بہتان تراشی میں تمہاری ہم پلہ اور کوئی عورت نہیں ہو سکتی۔۔۔۔۔ میں نے
اپنی زندگی میں کبھی جھوٹے نہیں بولا“

”تھہرائیے۔۔۔۔۔ پرسوں آپ نے مجھ سے کہا کہ آپ کسی دوست کے
ہاں گئے تھے لیکن جب شام کو آپ نے تھوڑی سی پی۔۔۔۔۔ تو چپک چپک کر
مجھے بتایا کہ آپ ایک ایکٹریس سے مل کر آئے ہیں“

”وہ ایکٹریس بھی تو اپنی دوست ہے۔۔۔۔۔ دشمن تو نہیں۔۔۔۔۔ میرا مطلب
ہے اپنے ایک دوست کی بیوی ہے۔“

”آپ کے دوستوں کی بیویاں عموماً ایکٹریسیں ہوتی ہیں، یا طوائف“

”اس میں میرا کیا تصور۔۔۔۔۔“

”سارا تصور ہی آپ کا ہے“

”وہ کیسے؟“

”ایسے کہ میں نے آپ سے شادی کر لی۔۔۔۔۔ میں ایکٹریس ہوں، یا طوائف“

”مجھے ایکٹریسوں اور طوائفوں سے سخت نفرت ہے۔۔۔۔۔ مجھے ان سے کوئی

دلچسپی نہیں۔۔۔۔۔ وہ عورتیں نہیں سلیمیں ہیں جن پر کوئی بھی چہر حروف یا لمبی

چوڑی عبارت لکھ کر مناسکتا ہے۔“

”تو اس روز آپ کیوں اس ایکٹریس کے پاس گئے“

”میرے دوست نے بلایا۔۔۔۔۔ میں چلا گیا۔۔۔۔۔ اس نے ایک
ایکٹریس سے جو پہلے چار شادیاں کر چکی تھیں نیا نیا بیاہ رچایا تھا مجھے اس سے
متعارف کرایا گیا۔“
”کیسی تھی؟“

”چار شادیوں کے بعد بھی وہ خاصی جوان دکھائی دیتی تھی۔۔۔۔۔ بلکہ
میں تو یہ کہوں گا کہ وہ عام کنواری جوان لڑکیوں کے مقابلے میں ہر لحاظ سے اچھی
تھی۔“

”وہ ایکٹریسیں کس طرح خود کو چست اور جوان رکھتی ہیں“
”مجھے اس کے متعلق کوئی زیادہ علم نہیں۔۔۔۔۔ بس اتنا سنا ہے کہ وہ اپنے
جسم اور جان کی حفاظت کرتی ہیں۔“

”میں نے تو سنا ہے کہ بڑی بدکردار ہوتی ہیں اول درجے کی فاحشہ۔۔۔۔۔“
”اللہ بہتر جانتا ہے۔۔۔۔۔ مجھے اس کے بارے میں کوئی علم نہیں“
”آپ ایسی باتوں کا جواب ہمیشہ گول کر جاتے ہیں“
”جب مجھے کسی خاص چیز کے متعلق کچھ علم ہی نہ ہو تو میں جواب کیا
دوں۔۔۔۔۔ میں تمہارے مزاج کے متعلق بھی وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا
گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ۔۔۔۔۔“

”دیکھئے آپ میرے متعلق کچھ نہ کہا کیجئے۔۔۔۔۔ آپ ہمیشہ میری بے عزتی
کرتے رہتے ہیں میں یہ برداشت نہیں کر سکتی“
”میں نے تمہاری بے عزتی کب کی ہے“

”یہ بے عزتی نہیں کہ پندرہ برسوں میں آپ میرا مزاج نہیں جان سکے اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں مضبوط الحواس ہوں نیم پاگل ہوں، جاہل ہوں، اجڑ ہوں“

”یہ تو خیر تم نہیں ہو۔۔۔۔۔۔ لیکن تمہیں سمجھنا بہت مشکل ہے ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ تم نے میرے بالوں کی بات کس غرض سے شروع کی۔۔۔۔۔۔ اس لیے کہ جب بھی تم کوئی بات شروع کرتی ہو تو اس کے پیچھے کوئی خاص بات ضرور ہوتی ہے۔“

”خاص بات کیا ہوگی۔۔۔۔۔۔ بس آپ سے صرف یہی کہنا تھا کہ بال اتنے بڑھ گئے ہیں کتوا دیجئے۔۔۔۔۔۔ حجام کی دکان یہاں سے کتنی دور ہے زیادہ سے زیادہ دو سو گز کے فاصلے پر ہوگی۔۔۔۔۔۔ جائیے۔۔۔۔۔۔ میں پانی گرم کراتی ہوں“

”جاتا ہوں۔۔۔۔۔۔ میں ذرا ایک سگریٹ پی لوں“

سگریٹ و سگریٹ آپ نہیں پیئیں گے۔۔۔۔۔۔ صبح سے اب تک۔۔۔۔۔۔ ٹھہریئے میں ڈپہ دیکھ لوں۔۔۔۔۔۔ میرے اللہ۔۔۔۔۔۔ بس سگریٹ پھونک چکے ہیں آپ۔۔۔۔۔۔ بس۔۔۔۔۔۔

”یہ تو کچھ زیادہ نہ ہوئے۔۔۔۔۔۔ بارہ بجنے والے ہیں“

”زیادہ باتیں مت کیجئے۔۔۔۔۔۔ سیدھے حجام کے پاس جائیے۔۔۔۔۔۔ اور یہ اپنے سر کا بوجھ اتروائیے“

”جاتا ہوں۔۔۔۔۔۔ کوئی اور کام ہو تو بتا دو“

”میرا کوئی کام نہیں۔۔۔۔۔۔ آپ اس بہانے سے مجھے ماننا چاہتے ہیں“

”اچھا تو میں چاہا“

”تھہرئیے“

”تھہر گیا۔۔۔۔۔ فرمائیے“

”آپ کے ہنرے میں کتنے روپے ہوں گے“

”پانچ سو کے قریب“

”تو یوں کیجئے۔۔۔۔۔ ہال کٹوانے سے پہلے امارکلی سے سونے کی ایک
انگوٹھی لے آئیے۔۔۔۔۔ آج میری ایک سہیلی کی سالگرہ ہے۔۔۔۔۔ دو ڈھائی سو
روپے کی ہو“

”میری تو وہیں امارکلی ہی میں حجامت ہو جائے گی۔۔۔۔۔ میں جاتا ہوں۔“

☆☆☆☆☆

سہائے

یہ مت کہو کہ ایک لاکھ ہندو اور ایک لاکھ مسلمان مرے ہیں۔۔۔۔۔ یہ کہو کہ دو لاکھ انسان مرے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ اور یہ اتنی بڑی ٹریجڈی نہیں کہ دو لاکھ انسان مرے ہیں، ٹریجڈی اصل میں یہ ہے کہ مارنے اور مرنے والے کسی بھی کھاتے میں نہیں گئے ایک لاکھ ہندو مار کر مسلمانوں نے یہ سمجھا ہوگا کہ ہندو مذہب مر گیا ہے لیکن وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا اسی طرح ایک لاکھ مسلمان قتل کر کے ہندوؤں نے بغلیں بھائی ہوں گی کہ اسلام ختم ہو گیا ہے، مگر حقیقت آپ کے سامنے ہے کہ اسلام پر ایک ہلکی سی خراش بھی نہیں آئی۔۔۔۔۔ وہ لوگ بے وقوف ہیں جو سمجھتے ہیں کہ ہندوؤں سے مذہب شکا کیے جاسکتے ہیں۔۔۔۔۔ مذہب، دین، ایمان، دھرم، یقین، عقیدت۔۔۔۔۔ یہ جو کچھ بھی ہے ہمارے جسم میں نہیں، روح میں ہوتا ہے۔۔۔۔۔ چھرے، چاقو اور گولی سے یہ کیسے فنا ہو سکتا ہے؟

ممتاز اس روز بہت ہی پر جوش تھا ہم صرف تین تھے جو اسے جہاز پر چھوڑنے کے لئے آئے تھے۔۔۔۔۔ وہ ایک غیر متعین عرصے کے لئے ہم سے جدا ہو کر پاکستان جا رہا تھا۔۔۔۔۔ پاکستان، جس کے وجود کے متعلق ہم میں سے کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔

ہم تینوں ہندو تھے۔ مغربی پنجاب میں ہمارے رشتہ داروں کو بہت مانی اور جانی نقصان اٹھانا پڑا تھا، غالباً یہی وجہ تھی کہ ممتاز ہم سے جدا ہو رہا تھا جگل کو لاہور سے خط ملا کہ فسادات میں اس کا چچا مارا گیا ہے تو اس کو بہت صدمہ ہوا، چنانچہ اسی

ممتاز نے اس سے پوچھا ”کیا کرو گے؟“

یہ سن کر ممتاز باہل خاموش ہو گیا اور اس کی یہ خاموشی تقریباً آٹھ روز تک قائم رہی اور اس وقت ٹوٹی جب اس نے اچانک ہمیں بتایا کہ وہ پونے چار بجے سمندر میں جہاز سے کراچی جا رہا ہے۔

ہم تینوں میں سے کسی نے اس کے اس ارادے کے متعلق بات چیت نہ کی
جغل وک اس بات کا شدید احساس تھا کہ ممتاز کی روانگی کا باعث اس کا یہ جملہ
”میں سوچ رہا ہوں بہت ممکن ہے، میں تمہیں مارڈالوں“ غالباً وہ اب تک یہی
سوچ رہا تھا کہ وہ مشتعل ہو کر ممتاز کو مار سکتا ہے یا نہیں۔۔۔۔۔ ممتاز کو جو کہ اس کا
جگری دوست تھا۔۔۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہم تینوں میں سب سے زیادہ خاموش
تھا لیکن عجیب بات ہے کہ ممتاز غیر معمولی طور پر باتونی ہو گیا تھا۔۔۔۔۔ خاص طور
پر روانگی سے چند گھنٹے پہلے۔

صبح اٹھتے ہی اس نے پینا شروع کر دی اسباب وغیرہ کچھ اس انداز سے باندھا اور بندھوا یا جیسے وہ کہیں سیر و تفریح کے لئے جا رہا ہے۔۔۔۔۔ خود ہی بات کرتا تھا اور خود ہی ہنستا تھا۔ کوئی اور دیکھتا تو سمجھتا کہ وہ بمبئی چھوڑنے میں نا قابل بیان مسرت محسوس کر رہا ہے لیکن ہم تینوں اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ صرف اپنے

جذبات چھپانے کے لیے ہمیں اور اپنے آپ کو دھوکا دینے کی کوشش کر رہا ہے۔
میں نے بہت چاہا کہ اس سے اس کی ایک لخت روانگی کے متعلق بات کروں
اشارہ میں نے جگل سے بھی کہا کہ وہ بات چھیڑے مگر ممتاز نے ہمیں کوئی موقع ہی
نہ دیا۔

جگل تین چار پیگ پی کر اور بھی زیادہ خاموش ہو گیا اور دوسرے کمرے میں
لیٹ گیا میں اور برج موہن اس کے ساتھ رہے۔ اسے کئی بل ادا کرنے تھے
ڈاکٹروں کی فینیس دینی تھیں لائڈی سے کپڑے لانے تھے۔۔۔۔۔ یہ سب کام
اس نے ہنستے کھیلتے کیے، لیکن جب اس نے تاک کے کے ہوٹل کے بازو والی دکان
سے ایک پان لیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے برج موہن کے کاندھے پر ہاتھ
رکھ کر وہاں سے چلتے ہوئے اس نے ہولے سے کہا ”یاد ہے برج۔۔۔۔۔ آج
سے دس برس پہلے جب ہمارا حال بہت پتا تھا، گوبند نے ہمیں ایک روپیہ اوصا
ر دیا تھا۔“

راستے میں ممتاز خاموش رہا، مگر گھر پہنچتے ہی اس نے پھر باتوں کا لامتناہی
سلسلہ شروع کر دیا، ایسی باتوں کا جن کا سر تھا نہ پیر، لیکن وہ کچھ ایسی پر خلوص تھیں
کہ میں اور برج موہن برابر ان میں حصہ لیتے رہے جب روانگی کا وقت قریب آیا
تو جگل بھی شامل ہو گیا لیکن جب ٹیکسی بندرگاہ کی طرف چلی تو سب خاموش ہو
گئے۔

ممتاز کی نظریں بمبئی کے وسیع اور کشادہ بازاروں کو الوداع کہتی رہیں، حتیٰ کہ
ٹیکسی اپنی منزل مقصود تک پہنچ گئی بے حد بھیڑ تھی ہزار بار رینگو جی جا رہے تھے

خوشحال بہت کم اور بد حال بہت زیادہ۔۔۔۔۔ بے پناہ هجوم تھا لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اکیلا ممتاز جا رہا ہے ہمیں چھوڑ کر ایسی جگہ جا رہا ہے جو اس کی دیکھی بھائی نہیں جو اس کے مانوس بنانے پر بھی اجنبی رہے گی لیکن یہ میرا اپنا خیال تھا میں نہیں کہہ سکتا کہ ممتاز کیا سوچ رہا تھا۔

جب کیمین میں سارا سامان چلا گیا تو ممتاز ہمیں عرشے پر لے گیا۔۔۔۔۔ ادھر جہاں آسمان اور سمندر آپس میں مل رہے تھے ممتاز دیر تک دیکھتا رہا، پھر اس نے جگل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا ”یہ محض فریب نظر ہے۔۔۔۔۔ آسمان اور سمندر کا آپس میں ملنا۔۔۔۔۔ لیکن یہ فریب نظر کس قدر دلکش ہے۔۔۔۔۔ یہ ملاپ!“

جگل خاموش رہا غالباً اس وقت بھی اس کے دل و دماغ میں اس کی یہ کہی ہوئی بات چمکیاں لے رہی تھی ”میں سوچ رہا ہوں بہت ممکن ہے میں تمہیں مار ڈالوں“ ممتاز نے جہاز کی بار سے برائڈی منگوائی کیونکہ وہ صبح سے یہی پنی رہا تھا۔۔۔۔۔ ہم چاروں گلاس ہاتھ میں لیے جنگل کے ساتھ کھڑے تھے ریشو جی دھڑا دھڑا جہاز میں سوار ہو رہے تھے اور قریب قریب ساکن سمندر پر آبی پرندے منڈلا رہے تھے۔

جگل نے دفعتاً ایک ہی جرسے میں اپنا گلاس ختم کیا اور نہایت ہی جھوٹے انداز میں ممتاز سے کہا ”مجھے معاف کر دینا ممتاز۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے میں نے اس روز تمہیں دکھ پہنچایا تھا۔“

ممتاز نے چھوڑے توقف کے بعد جگل سے سوال کیا ”جب تم نے کہا تھا میں

سوچ رہا ہوں۔۔۔۔۔ بہت ممکن ہے میں تمہیں مار ڈالوں۔۔۔۔۔ کیا اس وقت واقعی تم نے یہی سوچا تھا۔۔۔۔۔ نیک دلی سے اسی نتیجے پر پہنچے تھے۔“

جگل نے اثبات میں سر ہلایا ”لیکن مجھے افسوس ہے“

”تم مجھے مار ڈالنے تو تمہیں زیادہ افسوس ہوتا“ ممتاز نے بڑے فلسفیانہ انداز میں کہا ”لیکن صرف اس صورت میں اگر تم نے غور کیا ہوتا کہ تم نے ممتاز کو۔۔۔۔۔ ایک مسلمان کو۔۔۔۔۔ ایک دوست کو نہیں بلکہ ایک انسان کو مارا ہے۔۔۔۔۔ وہ اگر حرامزادہ تھا تو تم نے اس کی حرامزادگی کو نہیں بلکہ خود اس کو مار ڈالا ہے۔۔۔۔۔ وہ اگر مسلمان تھا تو تم نے اس کی مسلمانی کو نہیں اس کی ہستی کو ختم کیا ہے۔۔۔۔۔ اگر اس کی لاش مسلمانوں کے ہاتھ آتی تو قبرستان میں ایک قبر کا اضافہ ہو جاتا لیکن دنیا میں ایک انسان کم ہو جاتا۔“

تھوڑی دیر خاموش رہنے اور کچھ سوچنے کے بعد اس نے پھر بولنا شروع کیا ”ہو سکتا ہے، میرے ہم مذہب مجھے شہید کہتے لیکن خدا کی قسم اگر ممکن ہوتا تو میں قبر پھاڑ کر چلانا شروع کر دیتا، مجھے شہادت کا یہ رتبہ قبول نہیں۔۔۔۔۔ مجھے یہ ڈگری نہیں چاہیے جس کا امتحان میں نے دیا ہی نہیں۔۔۔۔۔ لاہور میں تمہارے چچا کو ایک مسلمان نے مار ڈالا۔۔۔۔۔ تم نے یہ خبر بمبئی میں سنی اور مجھے قتل کر دیا۔۔۔۔۔ بتاؤ، تم اور میں کس تمغے کے مستحق ہیں؟۔۔۔۔۔ اور لاہور میں تمہارا چچا اور اس کا قاتل کس خلعت کا حقدار ہے۔۔۔۔۔ میں تو یہ کہوں گا، مرنے والے کتے کی موت مرے اور مارنے والوں نے بیکار۔۔۔۔۔ بالکل بیکار اپنے ہاتھ خون سے رنگے۔۔۔۔۔“

باتیں کرتے کرتے ممتاز بہت زیادہ جذباتی ہو گیا لیکن اس زیادتی میں خلوص برابر کا تھا میرے دل پر خصوصاً اس کی اس بات کا بہت اثر ہوا کہ مذہب، دین، ایمان، یقین، دھرم، عقیدت۔۔۔۔۔ یہ جو کچھ بھی ہے ہمارے جسم کے بجائے روح میں ہوتا ہے جو چھڑے، چاقو اور گولی سے فنا نہیں کیا جاسکتا چنانچہ میں نے اس سے کہا ”تم بالکل ٹھیک کہتے ہو“

یہ سن کر ممتاز نے اپنے خیالات کا جائزہ لیا اور قدرے بے چینی سے کہا ”نہیں بالکل ٹھیک نہیں۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ یہ سب ٹھیک تو ہے لیکن شاید میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، اچھی طرح ادا نہیں کر سکا۔۔۔۔۔ مذہب سے میری مراد یہ مذہب نہیں، یہ دھرم نہیں، جس میں ہم میں سے ننانوے فی صد جتنا ہیں۔۔۔۔۔ میری مراد اس خاص چیز سے ہے وجہ ایک انسان کو دوسرے انسانوں کے مقابلے میں جداگانہ حیثیت بخشی ہے۔۔۔۔۔ وہ ہر چیز جو انسان کو حقیقت میں انسان ثابت کرتی ہے۔۔۔۔۔ لیکن یہ چیز کیا ہے؟۔۔۔۔۔ افسوس ہے کہ میں اسے ہتھیلی پر رکھ کر نہیں دکھا سکتا“ یہ کہتے کہتے ایک دم اس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی اور اس نے جیسے خود سے پوچھنا شروع کیا ”لیکن اس میں وہ کون سی خاص بات تھی۔۔۔۔۔ کٹر ہندو تھا۔۔۔۔۔ پیشہ نہایت ہی ذلیل لیکن اس کے باوجود اس کی روح کس قدر روشن تھی؟“

میں نے پوچھا ”کس کی؟“

ایک بھڑوے کی

ہم تینوں چونک پڑے ممتاز کے لہجے میں کوئی تکلف نہیں تھا، اس لیے میں نے

سجیدگی سے پوچھا ”ایک بھڑوے کی؟“

ممتاز نے اثبات میں سر ہلایا ”مجھے حیرت ہے کہ وہ کیسا انسان تھا اور زیادہ حیرت اس بات کی ہے کہ وہ عرف عام میں ایک بھڑوا تھا۔۔۔ عورتوں کا دال۔۔۔ لیکن اس کا ضمیر بہت صاف تھا۔“

ممتاز جوڑی دیر کے لیے رک گیا، جیسے وہ پرانے واقعات اپنے دماغ میں تازہ کر رہا ہے۔۔۔۔۔ چند لمحات کے بعد اس نے پھر بولنا شروع کیا ”اس کا پورا نام مجھے یاد نہیں۔۔۔ کچھ سہائے تھا۔۔۔۔۔ بنارس کا رہنے والا بہت ہی صفائی پسند وہ جگہ جہاں وہ رہتا تھا گو بہت ہی چھوٹی تھی مگر اس نے بڑے سلیقے سے اسے مختلف خانوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔۔۔۔۔ پردے کا معقول انتظام تھا چار پائیاں اور پلنگ نہیں تھے لیکن گدیلے اور گاؤں کیلے موجود تھے چادریں اور غلاف وغیرہ ہمیشہ اچلے رہتے تھے نوکر موجود تھا مگر صفائی وہ خود اپنے ہاتھ سے کرتا تھا۔۔۔۔۔ صرف صفائی ہی نہیں، ہر کام۔۔۔۔۔ اور دوسرے بلاوجہ کبھی نہیں مالتا تھا دھوکا اور فریب نہیں کرتا تھا۔۔۔۔۔ رات زیادہ گزر گئی ہے اور آس پاس سے پانی ملی شراب ملتی ہے تو وہ صاف کہہ دیتا تھا کہ صاحب اپنے پیسے ضائع نہ کیجئے۔۔۔۔۔ اگر کسی لڑکی کے متعلق اسے شک ہے تو وہ چھپاتا نہیں تھا۔۔۔۔۔ اور تو اور اس نے مجھے یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ تین برس کے عرصے میں بیس ہزار روپے مہا چکا ہے۔۔۔۔۔ ہر دس میں سے ڈھائی کمیشن کے لے لے کر۔۔۔۔۔ اسے صرف دس ہزار اور بنانے تھے۔۔۔۔۔ معلوم نہیں صرف دس ہزار کیوں، زیادہ کیوں نہیں۔۔۔۔۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ تیس ہزار روپے پورے کر کے وہ واپس بنارس چلا جائے گا اور

بزازی کی دکان کھولے گا۔۔۔ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ صرف بزازی ہی کی دکان کھولنے کا آرزو مند کیوں تھا۔“

میں یہاں تک سن چکا تو میرے منہ سے نکلا ”عجیب و غریب آدمی تھا“ ممتاز نے اپنی گفتگو جاری رکھی ”میرا خیال تھا کہ وہ سر تاپا بناوٹ ہے۔۔۔۔ ایک بہت بڑا فراڈ ہے کون یقین کر سکتا ہے کہ وہ ان تمام لڑکیوں کو جو اس کے دھندے میں شریک تھیں اپنی بیٹیاں سمجھتا تھا یہ بھی اس وقت میرے لیے بعید از فہم تھا کہ اس ن ہر لڑکی کے نام پر پوسٹ آفس میں سیونگ اکاؤنٹس کھول رکھا تھا اور ہر مہینے کل آمدنی وہاں جمع کراتا تھا اور یہ بات تو بالکل ناقابل یقین تھی کہ وہ دس بارہ لڑکیوں کے کھانے پینے کا خرچ اپنی جیب سے ادا کرتا ہے۔۔۔۔۔ اس کی ہر بات مجھے ضرورت سے زیادہ بناوٹی معلوم ہوتی تھی۔۔۔۔ ایک دن میں اس کے یہاں گیا تو اس نے مجھ سے کہا امینہ اور سکیونہ دونوں چھٹی پر ہیں۔۔۔۔ میں ہر دفعے ان دونوں کو چھٹی دے دیتا ہوں تاکہ باہر جا کر کسی ہوٹل میں ماس وغیرہ کھا سکیں۔۔۔۔ یہاں تو آپ جانتے ہیں سب ویشنو ہیں۔۔۔۔۔ میں یہ سن کر دل ہی دل میں مسکرایا کہ مجھے بتا رہا ہے ایک دن اس نے مجھے بتایا کہ احمد آباد کی اس ہندو لڑکی نے جس کی شادی اس نے ایک مسلمان گاہک سے کرادی تھی اماں اور سے خط لکھا ہے کہ وانا صاحب کے دربار میں اس نے ایک منت مانی تھی جو پوری ہوئی اب اس نے سہائے کے لیے منت مانی ہے کہ جلد ہی جلدی اس کے تئیں ہزار روپے پورے ہوں اور وہ بنارس جا کر بزازی کی دکان کھول سکے یہ سن کر تو میں ہنس پڑا میں نے سوچا چونکہ میں مسلمان ہوں اس

لے مجھے خوش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔“

میں نے ممتاز سے پوچھا ”تمہارا خیال غلط تھا؟“

”بالکل۔۔۔۔ اس کے قول و فعل میں کوئی بعد نہیں تھا۔۔۔۔ ہو سکتا ہے اس میں کوئی خامی ہو بہت ممکن ہے اس سے اپنی زندگی میں کئی اغزشیں سرزد ہوئی ہوں۔۔۔۔ مگر وہ ایک بہت ہی عمدہ انسان تھا۔“

جگل نے سوال کیا ”یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“

”اس کی موت پر“ یہ کہہ کر ممتاز کچھ عرصے کے لئے خاموش ہو گیا جموڑی دیر کے بعد اس نے ادھر دیکھنا شروع کیا جہاں آسمان اور سمندر ایک دھندلی سی آغوش میں سمٹے ہوئے تھے ”فسادات شروع ہو چکے تھے۔۔۔۔ میں علی الصبح اٹھ کر جھنڈی بازار سے گزر رہا تھا۔۔۔۔ کر فیو کے باعث بازار میں آمد و رفت بہت ہی کم تھی ٹریم بھی نہیں چل رہی تھی۔۔۔۔ ٹیکسی کی تلاش میں چلتے چلتے جب میں جے جے ہسپتال کے پاس پہنچا تو فٹ پاتھ پر ایک آدمی کو میں نے بڑے سے نوکرے کے پاس گھڑی سی بنے ہوئے دیکھا۔ میں نے سوچا کوئی پائی والا (مزدور) سو رہا ہے۔۔۔۔ لیکن جب میں نے پتھر کے ٹکڑوں پر خون کے لوتھرے دیکھے تو رک گیا۔۔۔۔ واردات قتل کی تھی، میں نے سوچا اپنا راستہ لوں، مگر لاش میں حرکت پیدا ہوئی۔۔۔۔ میں پھر رک گیا اس پاس کوئی نہ تھا میں نے جبک کر اس کی طرف دیکھا مجھے سہائے کا جانا پچھا ناچہرہ نظر آیا مگر خون کے دھبوں سے بھرا ہوا میں اس کے پاس فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا اور غور سے دیکھا۔۔۔۔ اس کی ٹول کی سفید قمیص جو ہمیشہ بے داغ ہوا کرتی تھی لہو سے لتھڑی ہوئی تھی زخم شاید پسلیوں کے پاس تھا

اس نے ہولے ہولے کرنا شروع کیا تو میں نے احتیاط سے اس کا کندھا پکڑ کر ہلایا جیسے کسی سوتے کو جگایا جاتا ہے ایک دو بار میں نے اس کو نامکمل نام سے بھی پکارا۔۔۔۔۔ میں اٹھ کر جانے ہی والا تھا کہ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔۔۔۔۔ دیر تک وہ ان ادھ کھلی آنکھوں سے ٹنگلی باندھے مجھے دیکھتا رہا۔۔۔۔۔ پھر ایک دم سارے بدن میں تنج کی سی کیفیت پیدا ہوئی اور اس نے مجھے پہچان کر کہا ”آپ۔۔۔ آپ۔۔۔۔۔“

میں نے اس سے تلے اوپر بہت سی باتیں پوچھنا شروع کر دیں وہ کیسے ادھر آیا کس نے اس کو زخمی کیا کب سے وہ فٹ پاتھ پر پڑا ہے۔۔۔۔۔ سامنے ہسپتال ہے، کیا میں وہاں اطلاع دوں۔

اس میں بولنے کی طاقت نہیں تھی جب میں نے سارے سوال کر ڈالے تو کراہتے ہوئے اس نے بڑی مشکل سے یہ الفاظ کہے ”میرے دن پورے ہو چکے تھے۔۔۔۔۔ بھگوان کو یہی منظور تھا۔“

بھگوان کو جانے کیا منظور تھا، لیکن مجھے یہ منظور نہیں تھا کہ میں مسلمان ہو کر، مسلمانوں کے علاقے میں ایک آدمی کو جس کے متعلق میں جانتا تھا کہ ہندو ہے، اس احساس کے ساتھ مرتے دیکھوں کہ اس کو مارنے والا مسلمان تھا اور آخری وقت میں اس کی موت کے سر ہانے جو آدمی کھڑا تھا، وہ بھی مسلمان تھا۔۔۔۔۔ میں ڈرپوک تو نہیں لیکن اس وقت میری حالت ڈرپوکوں سے بدتر تھی ایک طرف یہ خوف و امن گیر تھہ ممکن ہے میں ہی پکڑا جاؤں، دوسری طرف یہ ڈر تھا کہ پکڑا نہ گیا تو پوچھ گچھ کے لیے دھریا جاؤں گا۔۔۔۔۔ ایک بار یہ خیال آیا اگر میں اسے

ہسپتال لے گیا تو کیا پتا ہے اپنا بدلہ لینے کی خاطر مجھے پھنسا دے، سوچے، مرنا تو ہے کیوں نہ اسے ساتھ لے کر مروں۔۔۔ اسی قسم کی باتیں سوچ کر میں چلنے ہی والا تھا۔۔۔ بلکہ یوں کہنے کہ بھاگنے والا تھا کہ سہائے نے مجھے پکارا۔۔۔ میں ٹھہر گیا۔۔۔ نہ ٹھہرنے کے ارادے کے باوجود میرے قدم رک گئے۔۔۔ میں نے اس کی طرف اس انداز سے دیکھا گویا اس سے کہہ رہا ہوں، جلدی کرو میاں مجھے جانا ہے۔۔۔ اس نے درد کی تکلیف سے دوہرا ہوتے ہوئے، بڑی مشکلوں سے اپنی قمیص کے بٹن کھولے اور اندر ہاتھ ڈالا مگر جب کچھ اور کرنے کی اس میں ہمت نہ رہی تو مجھ سے کہا۔۔۔ ”نیچے بندی ہے۔۔۔ ادھر کی جیب میں کچھ زیور اور بارہ سو روپے ہیں۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ سلطانہ کا مال ہے۔۔۔ میں نے۔۔۔ میں نے ایک دوست کے پاس رکھا ہوا تھا۔۔۔ آج اسے۔۔۔ آج اسے بھینے والا تھا۔۔۔ کیونکہ۔۔۔ کیونکہ آپ جانتے ہیں خطرہ بہت بڑھ گیا ہے۔۔۔ آپ اسے دے دیجئے گا اور۔۔۔ کہیے گا فوراً چلی جائے۔۔۔ لیکن۔۔۔ اپنا خیال رکھیے گا۔“

ممتاز خاموش ہو گیا لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی آواز سہائے کی آواز میں جو بے جے ہسپتال کے سامنے فٹ پاتھ پر ابھری تھی، دور، ادھر جہاں آسمان اور سمندر ایک دھندلی سی آغوش میں مدغم تھے حل ہو رہی ہے۔

جہاز نے وسل دیا، ممتاز نے کہا ”میں سلطانہ سے ملا۔۔۔ اس کو زیور اور روپیہ دیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔“

جب ہم ممتاز سے رخصت ہو کر نیچے اترے تو وہ عرش پر جنگل کے ساتھ کھڑا
تھا۔۔۔۔۔ اس کا دہننا ہاتھ مل رہا تھا۔۔ میں جنگل سے مخاطب ہوا ”کیا تمہیں
ایسا معلوم نہیں ہوتا کہ ممتاز سہائے کی روح کو بلا رہا ہے۔۔ ہم سفر بنانے کے
لیے؟“

جنگل نے صرف اتنا کہا ”کاش میں سہائے کی روح ہوتا“

☆☆☆☆☆☆

شاردا

مذیر بلیک مارکیٹ سے وکی کی بوتل لانے گیا بڑے ڈاک خانے سے کچھ آگے بندرگاہ کے پھانک سے کچھ ادھر سگریٹ والے کی دکان سے اسکوچ مناسب داموں پر مل جاتی تھی جب اس نے پینتیس روپے ادا کر کے کاغذ میں لپی ہوئی بوتل لی تو اس وقت گیارہ بجے تھے دن کے یوں تو وہ رات کو پینے کا عادی تھا مگر اس روز موسم خوشگوار ہونے کے باعث وہ چاہتا تھا کہ صبح ہی سے شروع کر دے اور رات تک پیتا رہے۔

بوتل ہاتھ میں پکڑے وہ خوش خوش گھر کی طرف روانہ ہوا اس کا ارادہ تھا کہ بلوری بندر کے اسٹینٹ سے ٹیکسی لے گا ایک پیک اس میں بیٹھ کر پئے گا اور ہلکے ہلکے سرو میں گھر پہنچ جائے گا بیوی منع کرے گی تو وہ اس سے کہے گا ”موسم دیکھ کتنا اچھا ہے“ پھر وہ اسے ہبھونڈ اس اشعر سنائے گا۔

کی فرشتوں کی راہ ایر نے بند
جو گناہ کیجئے ثواب ہے آج
وہ کچھ دیر ضرور بچ کرے گی، لیکن بالآخر خاموش ہو جائے گی اور اس کے کہنے پر قیے کے پراٹھے بنانا شروع کر دے گی۔

دکان سے وہ بیس بچیس گز دور گیا ہوگا کہ ایک آدمی نے اس کو سلام کیا مذیر کا حافظہ کمزور تھا اس نے سلام کرنے والے آدمی کو نہ پہچانا لیکن اس پر یہ ظاہر نہ کیا کہ وہ اس کو نہیں جانتا، چنانچہ بڑے اخلاق سے کہا ”کیوں بھئی کہاں ہوتے ہو بھئی“

نظر ہی نہیں آئے۔“

اس آدمی نے مسکرا کر کہا ”حضور! میں تو یہیں ہوتا ہوں آپ ہی کبھی تشریف نہیں لائے؟“

نذیر نے اس کو پھر بھی نہ پہچانا ”میں اب جو تشریف لے آیا ہوں“
”تو چپے میرے ساتھ“

نذیر اس وقت بڑے اچھے موڈ میں تھا ”چلو“
اس آدمی نے نذیر کے ہاتھ میں بوتل دیکھی اور معنی خیز طریقے پر مسکرایا ”باقی سامان تو آپ کے پاس موجود ہے“
یہ فقرہ سن کر نذیر نے فوراً ہی سوچا کہ وہ دالال ہے ”تمہارا نام کیا ہے؟“
”کریم۔۔۔۔۔ آپ بھول گئے تھے“

نذیر کو یاد آ گیا کہ شادی سے پہلے ایک کریم اس کے لیے اچھی اچھی لڑکیاں لایا کرتا تھا بڑا ایماندار دالال تھا اس کو غور سے دیکھا تو صورت جانی پہچانی معلوم ہوئی پھر پچھلے تمام واقعات اس کے ذہن میں ابھر آئے کریم سے اس نے معذرت چاہی ”میں نے تمہیں پہچانا نہیں تھا میرا خیال ہے غالباً چھ برس ہو گئے ہیں تم سے ملے ہوئے“

”جی ہاں“

”تمہارا ڈھونڈو پہلے گرانٹ روڈ کاٹا کا ہوا کرتا تھا؟“

کریم نے بیڑی ساگانی اور ذرا فخر سے کہا ”وہ میں نے چھوڑ دیا آپ کی دعا سے اب یہاں ایک ہوٹل میں دھندلا شروع کر رکھا ہے۔“

نذیر نے اس کو داد دی ”یہ بہت اچھا کیا ہے تم نے؟“
 کریم نے اور زیادہ فخر یہ لہجے میں کہا ”دس چھو کریاں ہیں۔۔۔ ایک بالکل
 نئی ہے“

نذیر نے اس کو چھیڑنے کے انداز میں کہا ”تم لوگ یہی کہا کرتے ہو“
 کریم کو برا لگا ”قسم قرآن کی، میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا سو رکھاؤں اگر وہ
 چھو کری بالکل نئی نہ ہو“ پھر اس نے اپنی آواز جیسی کی اور نذیر کے کان کے ساتھ
 منہ لگا کر کہا ”آٹھ دن ہوئے ہیں جب پیلا ٹینجر آیا تھا جھوٹ بولوں تو میرا منہ کالا
 ہو“

نذیر نے پوچھا ”کنواری تھی؟“
 ”جی ہاں۔۔۔ دوسو روپے لیے تھے اس ٹینجر سے؟“
 نذیر نے کریم کی پسلیوں میں ایک ٹھونکا دیا ”لو۔۔۔ یہیں بھاؤ پکا کرنے
 گئے“

کریم کو نذیر کی یہ بات پھر بری لگی ”قسم قرآن کی، سو رہو جو آپ سے بھاؤ
 کرے آپ تشریف لے چلے آپ جو بھی دیں گے مجھے قبول ہوگا کریم نے آپ کا
 بہت نمک کھایا ہے۔“

نذیر کی جیب میں اس وقت ساڑھے چار سو روپے تھے موسم تھا چھاؤ بھی
 اچھا تھا وہ چھ برس پیچھے کے زمانے میں چلا گیا بن پے مسرور تھا ”چلو یا آج تمام
 عیاشیاں رہیں۔۔۔ ایک بوتل کا اور بندہ بست ہو جاتا چاہیے۔“
 کریم نے پوچھا ”آپ کتنے میں لائے ہیں یہ بوتل؟“

”پنیتیس رو پے میں“

”کون سا برانڈ ہے؟“

”جانی واکر“

کریم نے چھاتی پر ہاتھ مار کر کہا ”میں آپ کو میں میں لا دوں گا“
 نذیر نے دس دس کے تین نوٹ نکالے اور کریم کے ہاتھ میں دے دیے ”نیکی
 اور پوچھ پوچھ چھ----- یہ لو مجھے وہاں بٹھا کر تم پر ہا کام یہی کرنا تم جانتے
 ہو، میں ایسے معاملوں پر اکیلا نہیں پیا کرتا۔“

کریم مسکرایا ”اور آپ کو یاد ہو گا میں ڈیڑھ پیگ سے زیادہ نہیں پیا کرتا“
 نذیر کو یاد آ گیا کہ کریم واقعی آج سے چھ برس پہلے صرف ڈیڑھ پیگ لیا کرتا
 تھا یہ یاد کر کے نذیر بھی مسکرایا ”آج دور ہیں“
 ”جی نہیں۔۔۔۔۔ ڈیڑھ سے زیادہ ایک قطرہ بھی نہیں“

کریم ایک تھرڈ کلاس بلڈنگ کے پاس ٹھہر گیا جس کے ایک کونے میں
 چھوٹے سے میلے بورڈ پر میرینا ہوٹل لکھا تھا م تو خوبصورت تھا مگر عمارت نہایت
 ہی غلیظ تھی سیڑھیاں شکستہ نیچے سو دھوڑ پٹھان بڑی بڑی شلواریں پہنے کھانوں پر
 لیٹے ہوئے تھے پہلی منزل پر کرچن آباد تھے دوسری منزل پر جہاز کے بے شمار
 خلاصی، تیسری منزل ہوٹل کے مالک کے پاس تھی چوتھی منزل پر کونے کا ایک کمرہ
 کریم کے پاس تھا جس میں کئی لڑکیاں مرغیوں کی طرح اپنے ڈربے میں بیٹھی
 تھیں۔

کریم نے ہوٹل کے مالک سے چابی منگوائی ایک بڑا لیکن بے بنام سا کمرہ

کھولا جس میں لوہے کی ایک چارپائی، ایک کرسی اور ایک تپائی پڑی تھی، تین اطراف سے یہ کمرہ کھلا تھا یعنی بے شمار کھڑکیاں تھیں، جن کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے اور کچھ ٹکڑے لیکن ہوا کی بہت افراط تھی۔

کریم نے آرام کرسی جو کہ بے حد میلی تھی، ایک اس سے زیادہ میلے کپڑے سے صاف کی اور نذیر سے کہا ”تشریف رکھیے لیکن میں یہ عرض کروں اس کمرے کا کرایہ دس روپے ہوگا“

نذیر نے کمرے کو اب ذرا غور سے دیکھا ”دس روپے زیادہ ہیں یا را“
کریم نے کہا ”بہت زیادہ ہیں لیکن کیا کیا جائے سالانہ ہٹل کا مالک ہی نیا ہے ایک پیسہ کم نہیں کرتا اور نذیر صاحب موج شوق کرنے والے آدمی بھی زیادہ کی پروا نہیں کرتے۔“

نذیر نے کچھ سوچ کر کہا ”تم ٹھیک کہتے ہو۔۔۔۔۔ کرایہ پیشگی دے دوں؟“
”جی نہیں۔۔۔۔۔ آپ پہلے چھو کری تو دیکھئے“ یہ کہہ کر وہ اپنے ڈربے میں چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک نہایت ہی شرمیلی لڑکی تھی گھریلو قسم کی ہندو لڑکی سفید دھوتی باندھے تھی عمر چودہ برس کے لگ بھگ ہوگی خوش شکل تو نہیں تھی لیکن بھونی بھانی تھی۔

کریم نے اس سے کہا ”بیٹھ جاؤ یہ صاحب میرے دوست ہیں بالکل اپنے آدمی ہیں“

لڑکی نظریں نیچی کیے لوہے کی چارپائی پر بیٹھ گئی کریم یہ کہہ کر چلا گیا ”اپنا

اطمینان کر لیجئے نذیر صاحب! میں گلاس اور سو ڈالنا ہوں“

نذیر آرام کرسی پر سے اٹھ کر لڑکی کے پاس بیٹھ گیا وہ سمٹ کر ایک طرف ہٹ گئی نذیر نے اس سے چہرہ برس پہلے کے انداز میں پوچھا ”آپ کا نام!“

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا نذیر نے آگے سرک کر اس کے ہاتھ پکڑے اور پھر پوچھا ”آپ کا نام کیا ہے جناب!“

لڑکی نے ہاتھ چپڑا کر کہا ”شکنتا“

اور نذیر کو شکنتا یاد آ گئی جس پر رولہ و شنیت عاشق ہوا تھا ”میرا نام و شنیت ہے“

نذیر مکمل عیاشی پر تلا ہوا تھا لڑکی نے اس کی بات سنی اور مسکرا دی اتنے میں کریم آ گیا اس نے نذیر کو سو ڈے کی چار بوتلیں دکھائیں جو ٹھنڈی ہونے کے باعث پسینہ چھوڑ رہی تھیں ”مجھے یاد ہے کہ آپ کو رولہ و شنیت کا سو ڈا پسند ہے برف میں لگا ہوا لے کر آیا ہوں“

نذیر بہت خوش ہوا ”تم کمال کرتے ہو“ پھر وہ لڑکی سے مخاطب ہوا ”جناب آپ بھی شوق فرمائیں گی؟“

لڑکی نے کچھ نہ کہا کریم نے جواب دیا ”نذیر صاحب! یہ نہیں چیتی آٹھ دن تو ہوئے ہیں اس کو یہاں آئے ہوئے“

یہ سن کر نذیر کو افسوس سا ہوا ”یہ تو بہت بری بات ہے“

کریم نے وٹکی کی بوتل کھول کر نذیر کے لیے ایک بڑا پیگ بنایا اور اس کو آنکھ مار کر کہا ”آپ راضی کر لیجئے اسے“

نذیر نے ایک ہی جرسے میں گلاس ختم کیا کریم نے آدھا پیگ پیا فوراً ہی اس کی آواز نشر آلود ہو گئی ذرا جھوم کر اس نے نذیر سے پوچھا ”چھو کری پسند ہے نا آپ کو؟“

نذیر نے سوچا کہ لڑکی اسے پسند ہے کہ نہیں لیکن وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا اس نے شکنتا کی طرف غور سے دیکھا اگر اس کا نام شکنتا نہ ہوتا تو بہت ممکن ہے وہ اسے پسند کر لیتا وہ شکنتا جس پر رلہ و شنیت شکار کھیلتے کھیلتے عاشق ہوا تھا بہت ہی خوبصورت تھی کم از کم کتابوں میں تو یہی درج تھا کہ وہ چندے آفتاب چندے مابتاب تھی آہو چشم تھی نذیر نے ایک بار پھر اپنی شکنتا کی طرف دیکھا اس کی آنکھیں بری نہیں تھیں آہو چشم تو نہیں تھی لیکن اس کی آنکھیں اس کی اپنی آنکھیں تھیں کالی کالی اور بڑی بڑی اس نے اور کچھ نہ سوچا اور کریم سے کہا ”ٹھیک ہے یار۔۔۔۔۔ بولو معاملہ کہاں طے ہوتا ہے؟“

کریم نے آدھا پیگ اپنے لیے اور انڈیا اور کہا ”سورہ پے!“
نذیر نے سوچنا بند کر دیا ”ٹھیک ہے“

کریم اپنا دوسرا آدھا پیگ پی کر چلا گیا نذیر نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا شکنتا کے پاس بیٹھا تو وہ گھبرا سی گئی نذیر نے اس کا پیار لینا چاہا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی نذیر کو اس کی یہ حرکت ناگوار محسوس ہوئی لیکن اس نے پھر کوشش کی بازو سے پکڑ کر اس کو اپنے پاس بٹھا یا زبردستی اس کو چوما بہت ہی بے کیف سلسلہ تھا البتہ و سکی کا نشہ اچھا تھا وہ اب تک چھ پیگ پی چکا تھا اور اس کو افسوس تھا کہ اتنی مہنگی چیز باکل بے کار ہو گئی ہے اس لیے کہ شکنتا باکل الہر تھی اس کو ایسے معاملوں کے آداب کی کوئی

واقفیت ہی نہیں تھی نذیر اک اناری تیراک کے ساتھ ادھر ادھر بے کار ہاتھ پاؤں
 مارتا رہا آخر اکتا گیا دروازہ کھول کر اس نے کریم کو آواز دی جو اپنے ڈربے میں
 مرغیوں کے ساتھ بیٹھا تھا آواز سن کر دوڑا آیا ”کیا بات ہے نذیر صاحب!“
 نذیر نے بڑی ناامیدی سے کہا ”کچھ نہیں یار! یہ اپنے کام کی نہیں ہے؟“
 کیوں؟

”کچھ سمجھتی ہی نہیں“

کریم نے شکنتا کو الگ لے جا کر بہت سمجھایا مگر وہ نہ سمجھ سکی، شرمائی، لجائی،
 دھوتی سنبھالتی کمرے سے باہر نکل گئی کریم نے اس پر کہا ”میں ابھی حاضر کرتا
 ہوں“

نذیر نے اسے روکا ”جانے دو۔۔۔ کوئی اور لے آؤ“، لیکن اس نے فوراً ہی
 ارادہ بدل لیا ”وہ جو تمہیں روپے دیئے تھے، اس کی بوتل لے آؤ اور شکنتا کے سوا
 جتنی لڑکیاں اس وقت موجود ہیں انہیں یہاں بھیج دو۔۔۔ میرا مطلب ہے جو
 بیٹی ہیں آج اور کوئی سلسلہ نہیں ہوگا ان کے ساتھ پیٹھ کر باتیں کروں گا اور بس!“
 کریم، نذیر کو اچھی طرح سمجھتا تھا اس نے چار لڑکیاں کمرے میں بھیج دیں
 نذیر نے ان سب کو سرسری نظر سے دیکھا، کیونکہ وہ اپنے دل میں فیصلہ کر چکا تھا
 کہ پروگرام صرف پینے کا ہوگا چنانچہ اس نے ان لڑکیوں کے لیے گلاس منگوائے
 اور ان کے ساتھ پینا شروع کر دی وہ پہر کا کھانا ہوٹل سے منگو آکر کھایا اور شام کے
 چھ بجے تک ان لڑکیوں سے باتیں کرتا رہا بڑی فضول قسم کی باتیں لیکن نذیر خوش تھا
 جو کوفت شکنتا نے پیدا کی تھی وہ رہ گئی تھی۔

آدھی بوتل باقی تھی وہ ساتھ لے کر چلا گیا چند روز کے بعد پھر موسم کی وجہ سے اس کا جی چاہا کہ سارا دن پی جائے سگریٹ والے کی دکان سے خریدنے کے بجائے اس نے سوچا کیوں نہ کریم سے ملوں، وہ تمیں میں لے دے گا چنانچہ وہ اس کے ہوٹل میں پہنچا اتفاق سے کریم مل گیا اس نے ملتے ہی بہت ہولے سے کہا ”مذیر صاحب! شکنتا کی بڑی بہن آئی ہوئی ہے آج صبح کی گاڑی سے پہنچی ہے۔۔۔۔۔ بہت غصیلی ہے مگر آپ اس کو ضرور راضی کر لیں گے“

مذیر کچھ سوچ نہ سکا اس نے اپنے دل میں اتنا کہا ”چلو دیکھ لیتے ہیں“ لیکن اس نے کریم سے کہا ”تم پہلے یارو سکی لے آؤ“ یہ کہہ کر اس نے تمیں روپے جیب سے نکال کر کریم کو دیئے۔

کریم نے نوٹ لے کر مذیر سے کہا ”میں لے آتا ہوں آپ اندر کمرے میں بیٹھئے۔“

مذیر کے پاس صرف دس روپے تھے لیکن وہ کمرے کا دروازہ کھلوا کر بیٹھ گیا اس نے سوچا تھا کہ وہ سکی کی بوتل لے کر ایک نظر شکنتا کی بہن کو دیکھ کر چل دے گا، جاتے وقت دو روپے کریم کو دے دے گا۔

تین طرف سے کھلے ہوئے ہوا دار کمرے میں نہایت ہی میلی کرسی پر بیٹھ کر اس نے سگریٹ ساگایا اور سامنے اپنی ٹانگیں پٹنگ پر رکھ دیں جموڑی ہی دیر کے بعد آہٹ ہوئی کریم داخل ہوا اس نے مذیر کے کان کے ساتھ منہ لگا کر ہولے سے کہا ”مذیر صاحب آرہی ہے لیکن آپ ہی رام کیجئے گا اسے“

یہ کہہ کر وہ چلا گیا پانچ منٹ کے بعد ایک لڑکی جس کی شکل صورت قریب

قریب شگفتا سے ملتی تھی تیوری چڑھائے شگفتا کے سے انداز میں سفید دھوئی پہنے کمرے میں داخل ہوئی بڑی بے پروائی سے اس نے ماتھے کے قریب ہاتھ لے جا کر ”آداب“ کہا اور ہولے سے پلنگ پر بیٹھ گئی نذیر نے یوں محسوس کیا کہ وہ اس سے لڑنے آئی ہے چھ برس پیچھے کے زمانے میں ڈبکی لگا کر وہ اس سے مخاطب ہوا ”آپ شگفتا کی بہن ہیں“

اس نے بڑے تیکھے اور خفگی آمیز لہجے میں کہا ”جی ہاں“
نذیر جموڑی دیر کے لیے خاموش ہو گیا اس کے بعد اس لڑکی کو جس کی عمر شگفتا سے غالباً تین برس بڑی تھی بڑے غور سے دیکھا نذیر کی یہ حرکت اس کو بہت ناگوار محسوس ہوئی وہ بڑے زور سے مانگ ہلا کر اس سے مخاطب ہوئی ”آپ مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں“

نذیر کے ہونٹوں پر چھ برس پیچھے کی مسکراہٹ نمودار ہوئی ”جناب آپ اس قدر ناراض کیوں ہیں؟“

وہ برس پڑی ”میں ناراض کیوں نہ ہوں۔۔۔ یہ آپ کا کریم میری بہن کو جے پور سے اڑا لایا ہے بتائیے آپ میرا خون نہیں کھولے گا مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کو بھی وہ پیش کی گئی تھی؟“

نذیر کی زندگی میں ایسا معاملہ کبھی نہیں آیا تھا کچھ دیر سوچ کر اس نے اس لڑکی سے بڑے خلوص کے ساتھ کہا ”شگفتا کو دیکھتے ہی میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ لڑکی میرے کام کی نہیں بہت الہڑ ہے مجھے ایسی لڑکیاں بالکل پسند نہیں آپ شاید برا مانیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں ان عورتوں کو بہت زیادہ پسند کرتا ہوں جو مرد کی

ضروریات کو سمجھتی ہوں“

اس نے کچھ نہ کہا نذیر نے اس سے دریافت کیا ”آپ کا نام“

شکنتار کی بہن نے مختصر کہا ”شاروا“

نذیر نے پھر اس سے پوچھا ”آپ کا وطن“

”جے پور“ اس کا لہجہ بہت ٹیکھا اور خفگی آلود تھا

نذیر نے مسکرا کر اس سے کہا ”دیکھئے آپ کو مجھ سے ناراض ہونے کا کوئی حق نہیں۔۔۔ کریم نے اگر کوئی زیادتی کی ہے تو آپ اس کو سزا دے سکتی ہیں لیکن میرا کوئی قصور نہیں“ یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اس کو اچانک اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر اس کے ہونٹوں کو چوم لیا وہ کچھ کہنے بھی نہ پائی تھی کہ نذیر اس سے مخاطب ہوا ”یہ قصور البتہ میرا ہے اس کی سزا میں بھگتتے کے لیے تیار ہوں۔“

لڑکی کے ماتھے پر بے شمار تہدیلیاں نمودار ہوئیں اس نے تین چار مرتبہ زمین پر جمو کا ٹالبا گالیاں دینے والی تھی لیکن چپ ہو گئی اٹھ کھڑی ہوئی تھی لیکن فوراً ہی بیٹھ گئی نذیر نے چاہا کہ وہ کچھ کہے ”بتائیے آپ مجھے کیا سزا دینا چاہتی ہیں“ وہ کچھ کہنے والی تھی کہ ڈر بے سے کسی بچے کے رونے کی آواز آئی لڑکی اٹھی نذیر نے اسے روکا ”کہاں جا رہی ہیں آپ؟“

وہ ایک دم ماں بن گئی ”مئی رو رہی ہے، وہ دھکے لے“ یہ کہہ کر وہ چلی گئی نذیر نے اس کے بارے میں سوچنے کی کوشش کی مگر کچھ سوچ نہ سکا اسنے میں کریم و سکی کی بوتل اور سوڈا لے کر آگیا اس نے نذیر کے لیے چھوٹا ڈالا اپنا گلاس ختم کیا اور نذیر سے راز دارانہ لہجے میں پوچھا ”کچھ باتیں ہوئیں شاروا

سے۔۔۔۔ میں نے تو سمجھا تھا کہ آپ نے پٹالیا ہوگا؟“

نذیر نے مسکرا کر جواب دیا ”بڑی غصیلی عورت ہے“

”جی ہاں۔۔۔۔ صبح آئی ہے، میری جان کھا گئی ہے آپ ذرا اس کو رام کریں۔۔۔۔ شکنتلا! خود یہاں آئی تھی اس لیے کہ اس کا باپ اس کی ماں کو چھوڑ چکا ہے اور اس شاردوا کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے اس کا بچہ شادی کے فوراً بعد ہی اس کو چھوڑ کر خد معلوم کہاں چلا گیا تھا اب اکیلی اپنی بچی کے ساتھ ماں کے پاس رہتی ہے۔۔۔۔ آپ منا لیجئے نا اس کو؟“

نذیر نے اس سے کہا ”منانے کی کیا بات ہے؟“

کریم نے اس کو آنکھ ماری ”سالی مجھ سے تو مانتی نہیں جب سے آئی ہے ڈانٹ رہی ہے۔“

اسنے میں شاردوا اپنی ایک سال کی بچی کو گود میں اٹھائے اندر کمرے میں آئی کریم کو اس نے غصے سے دیکھا اس نے آدھا پیک پیا اور باہر چلا گیا۔

منی کو بہت زکام تھا تاک بہت بری طرح بہہ رہی تھی نذیر نے کریم کو بلایا اور اس کو پانچ کانوٹ دے کر کہا ”جاؤ ایک وکس کی بوتل لے آؤ“

کریم نے پوچھا ”وہ کیا ہوتی ہے؟“

نذیر نے اس سے کہا ”زکام کی دوا ہے“ یہ کہہ کر اس نے ایک پرزے پر اس دوا کا نام لکھ دیا ”کسی بھی اسٹور سے مل جائے گی“

”جی اچھا“ کہہ کر کریم چلا گیا نذیر منی کی طرف متوجہ ہوا اس کو بچے بہت اچھے تہتے تھے منی خوش شکل نہیں تھی لیکن کم سنی کے باعث نذیر کے لیے دلکش تھی

شاروا مسکرائی ”لائے میں اس کو اندر چھوڑ آؤں“

شمار و خاموش رہی نذر نے اٹھ کر ایک پیگ پیا، تو شمار نے تاک سکڑ کر اس سے کہا ”مجھے اس چیز سے نفرت ہے“

”تو آج سے نہیں رہے گی۔۔۔۔۔ یہ بیچے،“ یہ کہہ کر اس نے گلاب شاد کی طرف بڑھا دیا۔

میں ہرگز نہیں پیوں گی

”میں کہتا ہوں تم ہرگز انکار نہیں کرو گی“

شاروانے گلاس پکڑ لیا جموڑی دیر تک اس کو عجیب نگاہوں سے دیکھتی رہی، پھر
نیز کی طرف مظلومانہ نگاہوں سے دیکھا اور تاک انگلیوں سے بند کر کے سارا

گلاس غناٹ پی گئی تے آئے کوئی مگر اس نے روک لی دھوقی کے پلو سے اپنے
آنسو پونچھ کر اس نے نذیر سے کہا ”یہ پہلی اور آخری بار ہے لیکن میں نے کیوں
پی؟“

نذیر نے اس کے گیلے ہونٹ چومے اور کہا ”یہ موت پونچھو“ یہ کہہ کر اس نے
دروازہ بند کر دیا۔

شام کو سات بجے اس نے دروازہ کھولا کریم آیا تو شاردا نظریں جھکائے باہر
چلی گئی کریم بہت خوش تھا اس نے نذیر سے کہا ”آپ نے مال کر دیا آپ سے سو
تو نہیں مانگتا، پیاس دے دیجئے۔“

نذیر شاردا سے بے حد مطمئن تھا اس قدر مطمئن کہ وہ گزشتہ تمام عورتوں کو بھول
چکا تھا وہ اس کے جنسی سوالات کا سو فیصدی صحیح جواب تھی اس نے کریم سے کہا ”
میں کل ادا کروں گا ہوٹل کا کرایہ بھی کل چکاؤں گا آج میرے پاس وکی منگل نے
کے بعد صرف دس روپے باقی تھے“

کریم نے کہا ”کوئی بات نہیں ہے۔۔۔ میں تو اس بات سے بہت خوش ہوں
کہ آپ نے شاردا سے معاملہ طے کر لیا حضور! میری جان کھا گئی تھی اب شکنتلا
سے وہ کچھ نہیں کہہ سکتی۔“

کریم چلا گیا شاردا آئی اس کی گود میں منی تھی نذیر نے اس کو پانچ روپے دیئے
لیکن شاردا نے انکار کر دیا اس پر نذیر نے اس سے مسکرا کر کہا ”میں اس کا باپ
ہوں تم یہ کیا کر رہی ہو“

شاردا نے روپے لے لیے بڑی خاموشی کے ساتھ شروع شروع میں وہ بہت

باتوں کی معلوم ہوتی تھی ایسا لگتا تھا کہ باتوں کے دریا بہا دے گی مگر اب وہ بات کرنے سے گریز کرتی تھی نذیر نے اس کی بچی کو گود میں لے کر پیار کیا اور جاتے وقت شاردہ سے کہا ”لو بھئی شاردہ! میں پیلا کل نہیں تو پرسوں ضرور آؤں گا“

لیکن نذیر دوسرے روز ہی آ گیا شاردہ کے جسمانی خلوص نے اس پر جادو سا کر دیا تھا اس نے کریم کو پچھلے روپے ادا کیے ایک بوتل منگوائی اور شاردہ کے پاس بیٹھ گیا اس کو پینے کے لیے کہا تو وہ بولی ”میں نے کہہ دیا تھا کہ وہ پہلا اور آخری گلاس تھا۔“

نذیر اکیلا پیتا رہا صبح گیارہ بجے سے وہ شام کے سات بجے تک ہوٹل کے اس کمرے میں شاردہ کے ساتھ رہا۔۔۔۔۔ جب گھر لوٹا تو وہ بے حد مطمئن تھا پہلے روز سے بھی زیادہ مطمئن شاردہ اپنی واجبی شکل و صورت اور کم گوئی کے باوجود اس کے شہوانی حواس پر چھا گئی تھی نذیر بار بار سوچتا تھا ”یہ کیسی عورت ہے۔۔۔۔۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسی خاموش مگر جسمانی طور پر ایسی پرگو عورت نہیں دیکھی۔“

نذیر نے ہر دوسرے دن شاردہ کے پاس جانا شروع کر دیا اس کو روپے پیسے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی نذیر ساتھ روپے کریم کو دیتا تھا اس روپے ہوٹل والے جاتا تھا باقی پچاس میں سے قریباً تیرہ روپے کریم اپنی کمیشن کے وضع کر لیتا تھا۔ مگر شاردہ نے اس کے متعلق نذیر سے کبھی ذکر نہیں کیا تھا۔

دو مہینے گزر گئے نذیر کے بھٹ نے جواب دے دیا اس کے علاوہ اس نے بڑی شدت سے محسوس کیا کہ شاردہ اس کی ازدواجی زندگی میں بہت بری طرح حائل ہو

رہی ہے وہ بیوی کے ساتھ سوتا ہے تو اس کو ایک کی محسوس ہوتی ہے وہ چاہتا ہے کہ اس کے بجائے شاردہ ہو یہ بہت بری بات تھی نذیر کو چونکہ اس کا احساس تھا اس لیے اس نے کوشش کی کہ شاردہ کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح ختم ہو جائے چنانچہ اس نے شاردہ ہی سے کہا ”شاردہ میں شادی شدہ آدمی ہوں میری جتنی جمع پونجی تھی ختم ہو گئی ہے سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں تمہیں چھوڑ بھی نہیں سکتا، حالانکہ چاہتا ہوں کہ اوہر کا کبھی رخ نہ کروں۔“

شاردہ نے یہ سنا تو خاموش ہو گئی پھر تھوڑی دیر کے بعد کہا ”جتنے روپے میرے پاس ہیں آپ لے سکتے ہیں صرف مجھے بے پور کا کرایہ دے دیجئے تاکہ میں ٹکنتا کو لے کر واپس چلی جاؤں“

نذیر نے اس کا پیار لیا اور کہا ”بکو اس نہ کرو تم میرا مطلب نہیں سمجھیں بات یہ ہے کہ میرا وہ پیہ بہت خرچ ہو گیا ہے بلکہ یوں کہو کہ تم ہو گیا ہے میں یہ سوچتا ہوں کہ تمہارے پاس کیسے آسکوں گا۔“

شاردہ نے کوئی جواب نہ دیا نذیر ایک دوست سے قرض لے کر جب دوسرے روز ہوٹل میں پہنچا تو کریم نے بتایا کہ وہ بے پور جانے کے لیے تیار بیٹھی ہے نذیر نے اس کو بلایا مگر وہ نہ آئی کریم کے ہاتھ اس نے بہت سے نوٹ بھجوائے اور یہ کہا ”آپ یہ روپے لے لیجئے اور مجھے اپنا ایڈریس دے دیجئے“

نذیر نے کریم کو اپنا ایڈریس لکھ کر دے دیا اور روپے واپس کر دیئے شاردہ آئی گود میں منی تھی اس نے آداب عرض کیا اور کہا ”میں آج شام کو بے پور جا رہی ہوں“

نذیر نے پوچھا ”کیوں؟“

شاردا نے یہ مختصر جواب دیا ”مجھے معلوم نہیں“ اور یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

نذیر نے کریم سے کہا کہ اسے بلا کر لائے مگر وہ نہ آئی نذیر چلا گیا اس کو یوں محسوس ہوا کہ اس کے بدن کی حرارت چلی گئی اس کے سوال کا جواب چلا گیا ہے۔ وہ چلی گئی، واقعی چلی گئی کریم کو اس کا بہت افسوس تھا اس نے نذیر سے شکایت کے طور پر کہا ”نذیر صاحب آپ نے کیوں اس کو جانے دیا؟“

نذیر نے اس سے کہا ”بھائی! میں کوئی سیٹھ تو ہوں نہیں ہر دوسرے روز پچاس ایک، دس ہوٹل کے، تیس بوتل کے اور اوپر کا خرچ علیحدہ میرا تو دیوالہ پٹ گیا ہے۔۔۔۔۔ خدا کی قسم مقروض ہو گیا ہوں۔“

یہ سن کر کریم خاموش ہو گیا نذیر نے اس سے کہا ”بھئی میں مجبور تھا، کہاں تک یہ قصہ چلاتا“

کریم نے کہا ”نذیر صاحب اس کو آپ سے محبت تھی“

نذیر کو معلوم نہیں تھا کہ محبت کیا ہوتی ہے وہ فقط اتنا جانتا تھا کہ شاردا میں جسمانی خلوص ہے وہ اس کے مردانہ سوالات کا بالکل صحیح جواب ہے اس کے علاوہ وہ شاردا کے متعلق اور کچھ نہیں جانتا تھا، البتہ اس نے مختصر الفاظ میں اس سے یہ ضرور کہا تھا کہ اس کا خاندان عیاش تھا اور اس کو صرف اس لیے چھوڑ گیا تھا کہ دو برس تک اس کے ہاں اولاد نہیں ہوئی تھی لیکن جب وہ اس سے علیحدہ ہوا تو نو مہینے کے بعد منی پیدا ہوئی جو بالکل اپنے باپ پر ہے۔

شکنتا کو وہ اپنے ساتھ لے گئی وہ اس کا بیاہ کرنا چاہتی تھی اس کی خواہش تھی کہ

وہ شریفانہ زندگی بسر کرے کریم نے نذیر کو بتایا تھا کہ وہ اس سے بہت محبت کرتی ہے کریم نے بہت کوشش کی تھی کہ شکنتا سے پیشہ کرائے کئی مہینے آتے تھے ایک رات کے دو دو سو روپے دینے کے لیے تیار تھے مگر شاردانہ میں ماننی تھی کریم سے لڑنا شروع کر دیتی تھی کریم اس سے کہتا تھا ”تم کیا کر رہی ہو؟“ وہ جواب دیتی ”اگر تم سچ میں نہ ہوتے تو میں ایسا کبھی نہ کرتی نذیر صاحب کا ایک پیسہ خرچ نہ ہونے دیتی۔“

شاردانہ نذیر سے ایک بار اس کا فوٹو مانگا تھا جو اس نے گھر سے لا کر اس کو دے دیا تھا یہ اپنے ساتھ جے پور لے گئی تھی اس نے نذیر سے کبھی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔۔۔۔۔ جب دونوں بستر پر لیٹے ہوتے تو وہ بالکل خاموش رہتی نذیر اس کو بولنے پر اکساتا مگر وہ کچھ نہ کہتی لیکن نذیر اس کے جسمانی خلوص کا قائل تھا جہاں تک اس بات کا تعلق تھا وہ اخلاص کا مجسمہ تھی۔

وہ چلی گئی نذیر کے سینے کا بوجھ ہٹا دیا کیونکہ وہ اس کی گھریلو زندگی میں بہت بری طرح حائل ہو گئی تھی اگر وہ کچھ دیر اور رہتی تو بہت ممکن تھا کہ نذیر اپنی بیوی سے بالکل غافل ہو جاتا کچھ دن گزرے تو وہ اپنی اصلی حالت پر آنے لگا شاردانہ کا جسمانی لمس اس کے جسم سے آہستہ آہستہ دور ہونے لگا۔

ٹھیک پندرہ دن کے بعد جب کہ نذیر گھر میں بیٹھا دفتر کا کام کر رہا تھا اس کی بیوی نے صبح کی ڈاک لا کر اسے دی سارے خط وہی کھولا کرتی تھی ایک خط اس نے کھولا اور دیکھ کر نذیر سے کہا ”معلوم نہیں کجراتی ہے یا ہندی“ نذیر نے خط لے کر دیکھا اس کو معلوم نہ ہو سکا کہ ہندی ہے یا کجراتی الگ ٹرے میں رکھ دیا اور

اپنے کام میں مشغول ہو گیا جموڑی دیر کے بعد نذیر کی بیوی نے اپنی چھوٹی بہن نعیمہ کو آواز دی وہ آئی تو وہ خط اٹھا کر اسے دیا ”ذرا پڑھو تو کیا لکھا ہے تم تو ہندی اور کجراتی پڑھ سکتی ہو۔“

نعیمہ نے خط دیکھا اور کہا ”ہندی ہے“ اور یہ کہہ کر پڑھنا شروع کیا ”جے پور۔۔۔۔۔ پر یہ نذیر صاحب!“ اتنا پڑھ کر وہ رک گئی نذیر چونکا نعیمہ نے ایک سطر اور پڑھی ”آداب! آپ تو مجھے بھول چکے ہوں گے مگر جب سے میں یہاں آئی ہوں، آپ کو یاد کرتی رہتی ہوں“ نعیمہ کا رنگ سرخ ہو گیا اس نے کاغذ کا دوسرا رخ دیکھا ”کوئی شاردانے“

نذیر اٹھا جلدی سے اس نے نعیمہ کے ہاتھ سے خط لیا اور اپنی بیوی سے کہا ”خدا معلوم کون ہے۔۔۔۔۔ میں باہر جا رہا ہوں اس کو پڑھا کر اردو میں لکھوا لاؤں گا“ اس نے بیوی کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دیا اور چلا گیا ایک دوست کے پاس جا کر اس نے پہلے شاردانے کے خط جیسے کاغذ منگوائے اور ہندی میں ویسی ہی روشنائی سے ایک خط لکھوایا پہلے فقرے وہی لکھے مضمون یہ تھا کہ ہم نے سنٹرل پر شاردانے سے ملی تھی اس کو اتنے بڑے مصور سے مل کر بہت خوشی ہوئی تھی وغیرہ وغیرہ۔

شام کو گھر آیا تو اس نے نیا خط اپنی بیوی کو دیا اور اردو کی نقل پڑھ کر سنا دی بیوی نے شاردانے کے متعلق اس سے دریافت کیا تو اس نے کہا ”عرصہ ہوا میں ایک دوست کو چھوڑنے گیا تھا شاردانے کو یہ دوست جانتا تھا وہاں پلیٹ فارم پر میرا تعارف ہوا مصوری کا اسے بھی شوق تھا۔“

بات آئی گئی ہو گئی لیکن دوسرے روز شاردانے کا ایک اور خط آ گیا اس کو بھی نذیر

نے اسی طریقے سے گول کیا اور فوراً اشارہ دیا کہ وہ خط لکھنا بند کر دے اور اس کے نئے پتے کا انتظار کرے ڈاک خانے جا کر اس نے متعلقہ پوسٹ مین کو تاکید کر دی کہ جے پور کا خط وہ اپنے پاس رکھے صبح آ کر وہ اس سے پوچھ لیا کرے گا تین خط اس نے اس طرح وصول کیے اس کے بعد اشارہ اس کو اس کے دوست کے پتے سے خط بھیجنے لگی۔

شاردا بہت کم گو تھی لیکن خط بہت لمبے لکھتی تھی اس نے نذیر کے سامنے کبھی اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن خط اس اظہار سے پر ہوتے تھے گلے شکوے، ہجر و فراق، اس قسم کی عام باتیں جو عشقیہ خطوں میں ہوتی ہیں نذیر کو شاردا سے وہ محبت نہیں تھی جس کا ذکر افسانوں اور ناولوں میں ہوتا ہے اس لیے اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ جواب میں کیا لکھے، اس لیے یہ کام اس کا دوست ہی کرتا تھا ہندی میں جواب لکھ کر وہ نذیر کو سنا دیتا تھا اور نذیر کہہ دیتا تھا ”ٹھیک ہے“

شاردا ہمیشہ آنے کے لیے بے قرار تھی لیکن وہ کریم کے پاس نہیں ٹھہرنا چاہتی تھی نذیر اس کی رہائش کا اور کہیں بندوبست نہیں کر سکتا تھا کیونکہ مکان ان دونوں ملتے ہی نہیں تھے اس نے ہوٹل کا سوچا مگر خیال آیا ایسا نہ ہو راز فاش ہو جائے، چنانچہ اس نے شاردا کو لکھوایا کہ وہ ابھی کچھ دیر انتظار کرے۔

اتنے میں فرقہ وارانہ فساد شروع ہو گئے ہزارے سے پہلے عجیب افراتفری تھی اس کی بیوی نے کہا کہ وہ لاہور جانا چاہتی ہے ”میں کچھ دیر وہاں رہوں گی اگر حالات ٹھیک ہو گئے تو واپس آ جاؤں گی، ورنہ آپ بھی وہیں چلے آئیے گا“

نذیر نے کچھ دیر اسے روکا مگر جب اس کا بھائی لاہور جانے کے لیے تیار ہوا تو

وہ اور اس کی بہن اس کے ساتھ چلی گئیں اور وہ اکیلا رہ گیا اس نے شاردہ کو سرسری طور پر لکھا کہ وہ اب اکیلا ہے جواب میں اس کا تار آیا کہ وہ آرہی ہے اس تار کے مضمون کے مطابق وہ جے پور سے چل پڑی تھی نذیر بہت سٹپٹایا مگر اس کا جسم بہت خوش تھا وہ شاردہ کے جسم کا خلوص چاہتا تھا وہ دن پھر سے مانگتا تھا جب وہ شاردہ کے ساتھ چٹنا ہوتا تھا صبح گیارہ بجے سے لے کر شام کے ساتھ بجے تک اب روپے کے خرچ کا سوال نہیں تھا کریم بھی نہیں تھا ہوٹل بھی نہیں تھا اس نے سوچا ”میں اپنے نوکر کو رازدار بنالوں گا سب ٹھیک ہو جائے گا دس پندرہ روپے اس کا منہ بند کر دیں گے میری بیوی واپس آئی تو وہ اس سے کچھ نہیں کہے گا“

دوسرے روز وہ انٹیشن پہنچا فرنیچر میل آئی مگر شاردہ اتلاش کے باوجود اسے نہ ملی اس نے سوچا، شاید کسی وجہ سے رک گئی ہے دوسرا تار بھیجے گی اس سے اگلے روز وہ حسب معمول صبح کی ٹرین سے اپنے دفتر روانہ ہوا وہ مہا لکشمی اترتا تھا گاڑی وہاں رکی تو اس نے دیکھا کہ پلیٹ فارم پر شاردہ اکھڑی ہے اس نے زور سے پکارا ”شاردہ!“

شاردہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا ”نذیر صاحب!“

”تم یہاں کہاں؟“

شاردہ نے شکایتاً کہا ”آپ مجھے لینے نہ آئے تو میں یہاں آپ کے دفتر پہنچی پتا چلا کہ آپ ابھی تک نہیں آئے یہاں پلیٹ فارم پر اب آپ کا انتظار کر رہی تھی“

نذیر نے کچھ دیر سوچ کر اس سے کہا ”تم یہاں ٹھہرو میں دفتر سے جھمی لے کر ابھی آتا ہوں“

شاردا کو بچہ پر بٹھا کر نذیر جلدی جلدی دفتر گیا ایک عرضی لکھ کر وہاں چڑھ اسی کو
 دے آیا اور شاردا کو اپنے گھر لے گیا راستے میں دونوں نے کوئی بات نہ کی لیکن ان
 کے جسم آپس میں گفتگو کرتے رہے ایک دوسرے کی طرف کھینچتے رہے۔
 گھر پہنچ کر نذیر نے شاردا سے کہا ”تم نہا لو میں ناشتے کا بندوبست کرتا
 ہوں“

شاردا نہانے لگی نذیر نے نوکر سے کہا ”کہ اس کے ایک دوست کی بیوی آئی
 ہے جلدی ناشتہ تیار کر دے“ اس سے یہ کہہ کر نذیر نے الماری سے بوتل نکالی ایک
 پیگ جو دو کے برابر تھا گلاس میں انڈیا اور پانی ملا کر پی گیا وہ اسی بوتل والے
 ڈھنگ سے شاردا سے اختلاط چاہتا تھا۔

شاردا نہا دھوکہ بھر نکلی اور ناشتہ کرنے لگی اس نے ادھر ادھر کی بے شمار باتیں
 کہیں نذیر نے محسوس کیا جیسے وہ بدل گئی ہے وہ پہلے بہت کم گوئی اکثر خاموش رہتی
 تھی مگر اب وہ بات بات پر اپنی محبت کا اظہار کرتی تھی نذیر نے سوچا ”یہ محبت کیا
 ہے۔۔۔ اگر یہ اس کا اظہار نہ کرے تو کتنا اچھا ہے مجھے اس کی خاموشی زیادہ
 پسند تھی اس کے ذریعے سے مجھ تک بہت سی باتیں پہنچ جاتی تھیں مگر اب اس کو
 جانے کیا ہو گیا ہے باتیں کرتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے اپنے عشق پر خطہ پڑھ کر سنا
 رہی ہے۔“

ناشتہ ختم ہوا تو نذیر نے ایک پیگ تیار کیا اور شاردا کو پیش کیا لیکن اس نے
 انکار کر دیا نذیر نے اصرار کیا تو شاردا نے اس کو خوش کرنے کی خاطر، ناک بند کر
 کے وہ پیگ پی لیا برا سامنے بنایا پانی لے کر کھلی کی نذیر کو افسوس سا ہوا کہ شاردا نے

کیوں پی اس کے اصرار پر بھی انکار کیا ہوتا تو زیادہ اچھا ہوتا مگر اس کے بارے میں زیادہ غور نہ کیا نوکر کو بہت دور ایک کام پر بھیجا دروازہ بند کیا اور شاردا کے ساتھ بستر پر لیٹ گیا ”تم نے لکھا تھا کہ وہ دن پھر کب آئیں گے لو آگئے ہیں پھر وہی دن بلکہ راتیں بھی ان دنوں راتیں نہیں ہوتی تھیں صرف دن ہوتے تھے ہوٹل کے میلے کھیلے دن یہاں ہر چیز اجلی ہے ہر چیز صاف ہے ہوٹل کا کرایہ بھی نہیں کریم بھی نہیں یہاں ہم اپنے مالک آپ ہیں۔“

شاردا نے اپنے فراق کی باتیں شروع کر دیں یہ زمانہ اس نے کیسے کاٹا وہی کتابوں اور افسانوں والی فضول فضول باتیں، گلے، شکوے، آہیں، راتیں تارے گن گن کر کاٹنا نذیر نے ایک اور پیک بیا اور سوچا کون تارے گنتا ہے گن کیسے سنا ہے اتنے سارے تاروں کو۔۔۔ بالکل فضول ہے، بے ہودہ بکواس ہے۔

یہ سوچتے ہوئے اس نے شاردا کو اپنے ساتھ لگا لیا بستر صاف تھا شاردا صاف تھی وہ خود صاف تھا کمرے کی فضا بھی صاف تھی لیکن کیا مجھے تھی نذیر کے دل و دماغ پر وہ کیفیت طاری نہیں ہوتی تھی جو اس غلیظ ہوٹل میں لوہے کی چارپائی پر شاردا کی قربت میں ہوتی تھی۔

نذیر نے سوچا شاید اس نے کم پی ہے اٹھ کر اس نے ایک پیگ بنایا اور ایک ہی مرتبہ ختم کر کے شاردا کے ساتھ لیٹ گیا شاردا نے پھر وہی لاکھ مرتبہ کہی ہوئی باتیں شروع کر دیں وہی جبر و فراق کی باتیں وہی گلے شکوے، نذیر اکتا گیا اور اس اکتاہٹ نے اس کے جسم کو کند کر دیا اس کو محسوس ہونے لگا کہ شاردا کی سان گھس کر بیکار ہو گئی ہے اس کے جسم کے جذبات اب وہ تیز نہیں کر سکتی لیکن وہ پھر بھی

اس کے ساتھ دیر تک لیٹا رہا۔

فارغ ہوا تو اس کا جی چاہا کہ ٹیکسی پکڑے اور اپنے گھر چلا جائے اپنی بیوی کے پاس مگر جب اس نے سوچا کہ وہ تو اپنے گھر میں ہے، اور اس کی بیوی لاہور میں تو دل ہی دل میں بہت جھنجھلایا اس کو یہ خواہش ہوئی کہ اس کا گھر ہوٹل بن جائے وہ دس روپے کرائے کے دے کر ایم کو پچاس روپے ادا کرے اور چلا جائے۔

شاردا کے جسم کا خلوص بدستور برقرار تھا مگر وہ فضا نہیں تھی وہ سودے بازی نہیں تھی اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے والی بات نہیں تھی ہوٹل کی وہ غلامت نہیں تھی یہ سب چیزیں مل ملا کر جو ایک ماحول بناتی تھیں وہ نہیں تھا نذیر اپنے گھر میں تھا اس بستر پر تھا جس پر اس کی سادہ لوح بیوی اس کے ساتھ سوتی تھی یہ احساس اس کے تحت اشعور میں تھا اسی لیے وہ سمجھ نہ سکتا تھا کہ معاملہ کیا ہے کبھی وہ یہ سوچتا تھا کہ وہ کی خراب ہے، کبھی یہ سوچتا تھا کہ شاردا نے التفات نہیں برتا اور کبھی یہ خیال کرتا تھا کہ وہ خاموش رہتی تو سب ٹھیک ہوتا پھر وہ یہ سوچتا اتنی دیر کے بعد ملی ہے دل کی بھڑاس تو نکالنا تھی بے چاری کو ایک دو دن میں ٹھیک ہو جائے گی، وہی پرانی شاردا بن جائے گی۔

چند دن گزر گئے، مگر نذیر کو شاردا، وہ پرانی ہوٹل والی شاردا محسوس نہ ہوئی اس کی بچی بے پور میں تھی ہوٹل میں وہ اس کے ساتھ ہوتی تھی نذیر اس کے زکام کے لیے اس کی پھنسیوں کے لیے، اس کے گلے کے لیے دوائیں منگوایا کرتا تھا اب یہ چیز نہیں تھی وہ بالکل اکیلی تھی نذیر اس کی اور اس کی منی کو بالکل ایک سمجھتا تھا۔

ایک بار شاردا کی دودھ سے بھری ہوئی چھاتیوں پر دباؤ ڈالنے کے باعث

مذہب بالوں بھرے سینے پر دودھ کے کئی قطر چٹ گئے تھے اور اس نے ایک عجیب قسم کی لذت محسوس کی تھی اس نے سوچا تھا ماں جتنا کتنا اچھا ہے۔۔۔۔ اور یہ دودھ مردوں میں یہ کتنی بڑی کمی ہے کہ وہ کھانی کر سب ہضم کر جاتے ہیں عورتیں کھاتی ہیں اور کھلاتی بھی ہیں۔۔۔۔ کسی کو پالنا اپنے بچے ہی کو ہی، کتنی شاندار چیز ہے۔

اب منی شادوا کے ساتھ نہیں تھی وہ نامکمل تھی اس کی چھاتیاں بھی نامکمل تھیں اب ان میں دودھ نہیں تھا وہ سفید سفید آب حیات، مذہب اب اس کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچتا تھا تو وہ اس کو منع نہیں کرتی تھی شادوا اب وہ شادوا نہیں تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ شادوا وہی شادوا تھی بلکہ اس سے کچھ زیادہ تھی یعنی اتنی دیر جدا رہنے کے بعد اس کا جسمانی خلوص تیز ہو گیا تھا وہ روحانی طور پر بھی مذہب کو چاہتی تھی لیکن مذہب کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شادوا میں اب وہ پہلی ہی کشش یا جو بھی کچھ تھا نہیں رہا۔

پندرہ دن لگا تا اس کے ساتھ گزارے پر وہ اسی نتیجے پر پہنچا پندرہ دن دفتر سے غیر حاضری بہت کافی تھی اس نے اب دفتر جانا شروع کر دیا صبح اٹھ کر دفتر جاتا اور شام کو لوٹتا شادوا نے بالکل بیویوں کی طرح اس کی خدمت شروع کر دی بازار سے اون خرید کر ان کے لیے ایک سویٹر بن دیا شام کو دفتر سے آتا تو اس کے لیے سوڈے منگوا کر رکھے ہوتے برف، تھرموس میں ڈالی ہوتی صبح اٹھ کر اس کا شیو کا سامان میز پر رکھتی پانی گرم کر کے اس کو دیتی وہ شیو کر چلتا تو سارا سامان صاف کرتی گھر کی صفائی کرتی خود جھاڑو دیتی مذہب اور بھی زیادہ اکتا گیا۔

رات کو وہ اکٹھے سوتے تھے مگر اب اس نے یہ بہانہ کیا کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے

اس لیے اکیلا سونا چاہتا ہے شاردادوسرے پلنگ پر سونے لگی مگر یہ نذیر کے لیے ایک اور الجھن ہو گئی وہ گہری نیند سوئی ہوتی اور وہ جاگتا رہتا اور سوچتا کہ آخر یہ سب کچھ ہے کیا یہ شاردایہاں کیوں ہے؟ کریم کے ہوٹل میں اس نے اس کے ساتھ چند دن بڑے اچھے گزارے تھے مگر یہ اس کے ساتھ کیوں چٹ گئی ہے آخر اس کا انجام کیا ہوگا۔۔۔۔۔۔ محبت وغیرہ سب بکواس ہے جو ایک چھوٹی سی بات ہے وہ اب نہیں رہی اس کو واپس بے پور جانا چاہیے۔

کچھ دنوں کے بعد اس نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ وہ گناہ کر رہا ہے وہ کریم کے ہوٹل میں بھی کرتا تھا اس نے شادی سے پہلے بھی ایسے بے شمار گناہ کیے تھے مگر ان کا احساس ہی نہیں تھا لیکن اب اس نے بڑی شدت سے محسوس کرنا شروع کیا تھا کہ وہ اپنی بیوی سے بے وفائی کر رہا ہے اپنی سادہ لوح بیوی سے جس کو اس نے کئی بار شارداد کے خطوط کے سلسلے میں چکمہ دیا تھا شارداد اب اور بھی زیادہ بے کشش ہو گئی وہ اس سے روکھا سیرتا ذکر کرنے لگا مگر اس کے التفات میں کوئی فرق نہ آیا وہ اتنا جانتی تھی کہ آرٹسٹ لوگ موجدی ہوتے ہیں اسی لیے وہ اس سے اس کی بے التفاتی کا گلہ نہیں کرتی تھی۔

پورا ایک مہینہ ہو گیا جب نذیر نے دن گئے تو اس کو بہت الجھن ہوئی ”یہ عورت کیا پورا ایک مہینہ یہاں رہی ہے۔۔۔ میں کس قدر ذلیل آدمی ہوں۔۔۔ اور ادھر ہر روز میں اپنی بیوی کو خط لکھتا ہوں جیسے بڑا وفادار شوہر ہوں۔۔۔ جیسے مجھے اس کا بہت خیال ہے جیسے اس کے بغیر میری زندگی اجیرن ہے میں کتنا بڑا فراڈ ہوں ادھر اپنی بیوی سے غداری کر رہا ہوں ادھر شارداد سے، میں کیوں اس سے

صاف صاف نہیں کہہ دیتا کہ بھئی اب مجھے تم سے لگاؤ نہیں رہا لیکن سوال یہ ہے کہ مجھے لگاؤ نہیں رہا یا شاردا میں وہ پہلی سی بات نہیں رہی؟“

وہ اس کے متعلق سوچتا مگر اسے کوئی جواب نہ ملتا اس کے ذہن میں عجیب افراتفری پھیلی تھی وہ اب اخلاقیات کے متعلق سوچتا تھا بیوی سے جو وہ غداری کر رہا تھا اس کا احساس ہر وقت اس پر غالب رہتا تھا کچھ دن اور گزرے تو یہ احساس اور بھی زیادہ شدید ہو گیا اور نذیر کو خود سے نفرت ہونے لگی ”میں بہت ذلیل ہوں یہ عورت میری دھڑکیوں کیوں بن گئی ہے مجھے اس کی کب ضرورت تھی یہ کیوں میرے ساتھ چپک گئی ہے میں نے کیوں اس کو یہاں آنے کی اجازت دی جب اس نے تا رہیجا تھا لیکن وہ تا رایسے وقت پر ملا تھا کہ میں اس کو روک ہی نہیں سکتا تھا“ پھر وہ سوچتا کہ شاردا جو کچھ کرتی ہے، بناوٹ ہے، وہ اس کو بناوٹ سے اپنی بیوی سے جدا کرنا چاہتی ہے اس سے اس کی نظروں میں شاردا اور بھی گر گئی اس سے نذیر کا سلوک اور زیادہ روکھا ہو گیا اس روکھے پن کو دیکھ کر شاردا بہت زیادہ ملانم ہو گئی اس نے نذیر کے آرام و آسائش کا زیادہ خیال رکھنا شروع کر دیا لیکن نذیر کو اس کے روینے سے بہت الجھن ہوئی وہ اس سے بے حد نفرت کرنے لگا۔

ایک دن اس کی جیب خالی تھی بینک سے روپے نکلوانے اس کو یاد نہیں رہے تھے۔ دفتر بہت دیر سے گیا، اس لیے کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی جاتے وقت شاردا نے اس سے کچھ کہا تو وہ اس پر برس پڑا ”بکو اس نہ کرو میں ٹھیک ہوں بینک سے روپے نکلوانے بھول گیا ہوں اور سگریٹ میرے سارے ختم ہیں۔“

دفتر کے پاس کی دکان سے اس کو گولڈ فلک کا ڈبہ ملایا سگریٹ اس کو نا پسند تھے

مگر اوصار مل گئے تھے اس لیے دو تین مجبور اپنے پڑے شام کو گھر آیا تو دیکھا، تپائی پر اس کا من بھاتا سگریٹ کا ڈبہ پڑا ہے خیال کیا کہ خالی ہے پھر سوچا شاید ایک دو اس میں پڑے ہوں کھول کر دیکھا تو بھرا ہوا تھا شاردہ سے پوچھا ”یہ ڈبہ کہاں سے آیا؟“

شاردہ نے مسکرا کر جواب دیا ”اندر الماری میں پڑا تھا“
 نذیر نے کچھ نہ کہا اس نے سوچا شاید میں نے کھول کر اندر الماری میں رکھ دیا تھا اور بھول گیا لیکن دوسرے دن پھر تپائی پر سالم ڈبہ موجود تھا نذیر نے جب شاردہ سے اس کی بابت پوچھا تو اس نے مسکرا کر وہی جواب دیا ”اندر الماری میں پڑا تھا“

نذیر نے بڑے غصے کے ساتھ کہا ”شاردہ تم کو اس کرتی ہو تمہاری یہ حرکت مجھے پسند نہیں میں اپنی چیزیں خود خرید سکتا ہوں میں بھکاری نہیں ہوں جو تم میرے لیے ہر روز سگریٹ خرید کر دو۔“

شاردہ نے بڑے پیار سے کہا ”آپ بھول جاتے ہیں اسی لیے میں نے دو مرتبہ گستاخی کی۔“

نذیر نے بے وجہ اور زیادہ غصے سے کہا ”میرا دماغ خراب ہے لیکن مجھے یہ گستاخی ہرگز پسند نہیں۔“

شاردہ کا لہجہ بہت ہی ملائم ہو گیا ”میں آپ سے معافی مانگتی ہوں“
 نذیر نے ایک لٹلے کے لیے خیال کیا کہ شاردہ کی کوئی غلطی نہیں اسے آگے بڑھ کر اس کا منہ چوم لینا چاہیے اس لیے کہ وہ اس کا اتنا خیال رکھتی تھی مگر فوراً ہی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

فہرست

شادی
شائق
شغل
شکاری عورتیں
شو شو
شہ نشین پر
قاسم
قبض
کالی شلوار
کیبڑوں والا سائیں
گرم سوٹ
گولی
گورکھ سنگھ کی وصیت
ال ٹین
انسنس
ما تھی جلسہ
مجید کاماشی
مجمودہ
مسز ڈی کوشا
مسٹر حمیدہ

جیل بولکلا گیا ”نومینے“

لڑکی نے اپنے بریدہ بالوں والی سر ہلایا۔۔۔ جیل نے لفٹ کا رخ کیا۔
یہ نومینے کا سلسلہ خوب تھا۔۔۔ نومینے۔۔۔ اتنی مدت کے بعد تو عورت گل
گو تھنا بچہ پیدا کر کے ایک طرف رکھ دیتی ہے۔۔۔ نومینے۔۔۔ نومینے تک
اس چھوٹی سی چٹ کو سنبھالے رکھو۔۔۔ اور یہ بھی کون و ثوق سے کہہ سکتا ہے کہ نو
مینے تک آدمی یا درکھ سکتا ہے کہ اس نے ایک قلم مرمت کے لیے دیا تھا۔۔۔ ہو
سکتا ہے اس دوران میں وہ کم بخت مرکھپ ہی جائے۔

جیل نے سوچا، یہ سب ڈھکوسلا ہے۔۔۔۔۔ قلم میں معمولی سی خرابی تھی کہ
اس کا فیڈ ضرورت سے زیادہ روشنائی سپلائی کرتا تھا اس کے لیے اسے امریکہ
کے ہسپتال میں بھیجنا صریحاً چاہا جی تھی۔۔۔۔۔ مگر پھر اس نے سوچا، لعنت بھیجو
جی اس قلم پر۔۔۔۔۔ امریکہ جائے یا افریقہ اس میں شک نہیں کہ اس نے یہ بلیک
مارکیٹ سے ایک سوچے سمجھے روپے میں خریدا تھا۔۔۔۔۔ مگر اس نے ایک برس اسے
خوب استعمال بھی کیا تھا۔۔۔۔۔ ہزاروں صفحے کالے کر ڈالے تھے۔۔۔۔۔
چنانچہ وہ قنوطی سے ایک دم رجائی بن گیا اور رجائی بنتے ہی اسے خیال آیا کہ وہ
فورٹ میں ہے اور فورٹ میں شراب کی بے شمار دکانیں و سکی تو ظاہر ہے نہیں ملے
گی لیکن فرانس کی بہترین کوئک برانڈی تو مل جائے گی، چنانچہ اس نے قریب والی
شراب کی دکان کا رخ کیا۔

برانڈی کی ایک بوتل خریدا کروہ لوٹ رہا تھا کہ گرین ہوٹل کے پاس آ کے رک
گیا ہوٹل کے نیچے قدر آدمیشوں کا بنا ہوا قالیوں کا شوروم تھا یہ جیل کے دوست

پیر صاحب کا تھا۔

اس نے سوچا چلو اندر چلیں چنانچہ چند لمحات کے بعد ہی وہ شوروم میں تھا اور اپنے دوست پیر سے جو عمر میں اس سے کافی بڑا تھا ہنسی مذاق کی گفتگو کر رہا تھا۔ برائڈی کی بوتل باریک کانڈ میں لپٹی دبیز ایرانی قالین پر لیٹی ہوئی تھی پیر صاحب نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جمیل سے کہا ”یار اس دلہن کا گھونٹ تو کھولو۔۔۔ ذرا اس سے چھیڑ خانی تو کرو۔“ جمیل مطلب سمجھ گیا ”تو پیر صاحب گلاس اور سوڈے منگوائے پھر دیکھئے کیا رنگ جمتا ہے۔“

فورا گلاس اور پنچ بستہ سوڈے آگئے پہلا دور ہوا دوسرا دور شروع ہونے ہی والا تھا کہ پیر صاحب کے ایک کجراتی دوست اندر چلے آئے اور بڑی بے تکلفی سے قالین پر بیٹھ گئے اتفاق سے ہوٹل کا چھوکرادو کے بجائے تین گلاس اٹھا لیا تھا پیر صاحب کے کجراتی دوست نے بڑی صاف اردو میں چند ادھر ادھر کی باتیں کیں اور گلاس میں یہ بڑا پیک ڈال کر اس کو سوڈے سے لبا لب بھر دیا تین چار لمبے لمبے گھونٹ لے کر انہوں نے رومال سے اپنا منہ صاف کیا ”سگریٹ نکالو یا را“ پیر صاحب میں ساتوں عیب شرعی تھے مگر وہ سگریٹ نہیں پیتے تھے جمیل نے جیب سے اپنا سگریٹ کیس نکالا اور قالین پر رکھ دیا ساتھ ہی لائٹر۔۔۔۔۔

اس پر پیر صاحب نے جمیل سے اس کجراتی کا تعارف کرایا ”مسٹر تنور الال۔۔۔۔۔ آپ مور تہوں کی دلالی کرتے ہیں“

جمیل نے ایک لمٹے کے لیے سوچا، کونکوں کی دلالی میں تو انسان کا منہ کالا ہوتا

ہے۔۔۔۔۔ موتیوں کی دالائی میں۔۔۔۔۔

پیر صاحب نے جمیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”مسٹر جمیل۔۔۔۔۔ مشہور
سوگ رائٹر۔۔۔۔۔“

دونوں نے ہاتھ ملایا اور برائڈی کا نیا دو شروع ہوا اور ایسا شروع ہوا کہ بوتل
خالی ہو گئی۔

جمیل نے دل میں سوچا یہ کم بخت موتیوں کا دالال بلا کا پینے والا
ہے۔۔۔۔۔ میری پیاس اور سرور کی ساری برائڈی چڑھا گیا خدا کرے اسے
موتیا بند ہو۔۔۔۔۔

مگر جو نبی آخری دور کے پیک نے جمیل کے پیٹ میں اپنے قدم جمائے،
اس نے نوروال کو معاف کر دیا آخر میں اس سے کہا ”مسٹر نور، اٹھیے ایک بوتل
اور ہو جائے“

نور فوراً اٹھا اپنے سفید ڈگلے کی شکنیں درست کیں دھونی کی لانگ ٹھیک کی
اور کہا ”چلیے!“

جمیل پیر صاحب سے مخاطب ہوا ”ہم ابھی حاضر ہوتے ہیں“

جمیل اور نور نے باہر نکل کر ٹیکسی لی اور شراب کی دکان پر پہنچے جمیل نے ٹیکسی
روکی مگر نور نے کہا ”مسٹر جمیل۔۔۔۔۔ یہ دکان ٹھیک نہیں۔۔۔۔۔ ساری
چیزیں مہنگی بیچتا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ ٹیکسی ڈرائیور سے مخاطب ہوا ”دیکھو کوالا بہ چلو!“

کوالا بہ پہنچ کر نور، جمیل کو شراب کی ایک چھوٹی سی دکان میں لے گیا جو برائڈ
جمیل نے فورٹ سے لیا، وہ تو نمل سکا ایک دوسرا مل گیا جس کی نور نے بہت

تعریف کی کہ نمبروں چیز ہے۔

یہ نمبروں چیز خرید کر دونوں باہر نکلے۔۔۔۔۔ ساتھ ہی ہارتھی نور رک گیا ”مسٹر جمیل، کیا خیال ہے آپ کا ایک دو پیگ ہمیں سے پی کر چلتے ہیں“
جمیل کو کوئی اعتراض نہیں تھا اس لیے کہ اس کا نشہ حالت نزع میں تھا چنانچہ دونوں بار کے اندر داخل ہوئے معاً جمیل کو خیال آیا کہ بار والے تو کبھی باہر کی شراب پینے کی اجازت نہیں دیا کرتے ”مسٹر نور آپ یہاں کیسے پی سکتے ہیں یہ لوگ اجازت نہیں دیں گے“

نور نے زور سے آنکھ ماری ”سب چتا ہے“

اور یہ کہہ کر وہ ایک کیبن کے اندر گھس گیا جمیل بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔۔۔۔۔ نور نے بوتل سنگین تپائی پر رکھی اور بیرے کو آواز دی۔۔۔۔۔ جب وہ آیا تو اس کو بھی آنکھ ماری ”دیکھو اور سوڈے رو جر ز۔۔۔۔۔ ٹھنڈے۔۔۔۔۔ اور دو گلاس ایک دم صاف“

بیرا یہ حکم سن کر چلا گیا اور فوراً سوڈے اور گلاس حاضر کر دیئے، اس پر نور نے اسے دوسرا حکم دیا ”فسٹ گلاس چپس اور ٹو مینٹوس اور فیسٹ گلاس کٹس!“
بیرا چلا گیا نور جمیل کی طرف دیکھ کر ایسے ہی مسکرایا بوتل کا کارک نکالا اور جمیل کے گلاس میں اس سے پوچھے بغیر ایک ڈبل ڈال دیا۔ خود اس سے کچھ زیادہ سوڈا حل ہو گیا تو دونوں نے اپنے گلاس نکرائے۔

جمیل پیسا تھا ایک ہی جرے میں اس نے آدھا گلاس ختم کر دیا سوڈا چونکہ بہت ٹھنڈا اور تیز تھا اس لیے پھوں پھوں کرنے لگا۔

وہ پندرہ منٹ کے بعد چپس اور کٹلس آ گئے۔۔۔۔۔ جمیل صبح گھر سے مامیہ کر کے نکلا تھا لیکن برانڈی نے اسے بھوک لگا دی چپس گرم گرم تھے، کٹلس بھی وہ پل پر۔۔۔۔۔ نونو نے اس کا ساتھ دیا چنانچہ دو منٹ میں دونوں پلٹیں صاف!

دوپلٹیں اور منگوانی گئیں جمیل نے اپنے لیے چوپس بھی منگوائے دو گھنٹے اسی طرح گزر گئے بوتل کی تین چوتھائی غائب ہو چکی تھی جمیل نے سوچا کہ اب پھر صاحب کے پاس جانا بیکار ہے۔

نشے خوب جم رہے تھے سرور خوب گھٹ رہے تھے نونو راور جمیل دونوں ہوا کے گھوڑوں پر سوار تھے ایسے سواروں کو عام طور پر ایسی واویوں میں جانے کی بڑی خواہش ہوتی ہے، جہاں انہیں عریاں بدن حسین عورتیں ملیں وہ ان کی کمر میں ہاتھ ڈال کر گھوڑے پر بٹھالیں اور یہ جاوہ جا!

جمیل کا دل و دماغ اس وقت کسی ایسی ہی واوی کے متعلق سوچ رہا تھا جہاں اس کی کسی ایسی خوبصورت عورت سے مڈ بھٹڑ ہو جائے جس کو وہ اپنے پتے ہوئے سینے کے ساتھ بھینچ لے، اس زور سے کہ اس کی ہڈیاں تک جھج جائیں۔

جمیل کو اتنا تو معلوم تھا کہ وہ ایسی جگہ پر ہے۔۔۔۔۔ مطلب ہے ایسے علاقے میں ہے جو اپنے برہنہ تھلڑ (قحبہ خانے) کی وجہ سے ساری بمبئی میں مشہور ہے جنہیں عیاشی کرنا ہوتی ہے وہ ادھر کارخ کرتے ہیں شہر سے بھی جس لڑکی کو لک چھپ کر پیشہ کرنا ہوتا ہے یہیں آتی ہے ان معلومات کی بناء پر اس نے نونو سے کہا ”میں نے کہا۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے، ادھر کوئی چھو کری وہ کری نہیں ماتی؟“

نور نے اپنے گلاس میں ایک بڑا پیگ انڈیا اور ہنسا ”مسٹر جمیل! ایک نہیں،
ہزاروں۔۔۔۔۔ ہزاروں۔۔۔۔۔ ہزاروں۔۔۔۔۔“

یہ ہزاروں کی گروان جاری رہتی اگر جمیل نے اس کی بات کافی نہ ہوتی ”ان
ہزاروں میں سے آج ایک ہی مل جائے تو ہم تجھیں کہ نور بھائی نے مال کر دیا۔“
نور بھائی مزے میں تھے جھوم کر کہا ”جمیل بھائی۔۔ ایک نہیں
ہزاروں۔۔۔۔۔ چلو اس کو ختم کرو“

دونوں نے بوتل میں جو کچھ بچا تھا آدھے گھنٹے کے اندر اندر ختم کر دیا بل ادا
کرنے اور بیرے کو ٹکڑی ٹپ دینے کے بعد دونوں باہر نکلے، اندر اندر ہیرا تھا، باہر
دھوپ چمک رہی تھی جمیل کی آنکھیں چند صیّا گئیں ایک لُٹلے کے لیے اسے کچھ نظر
نہ آیا۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں تیز روشنی کی عادی ہوئیں تو اس نے نور سے کہا
”چلو بھئی!“

نور نے تلاشی لینے والی نگاہوں سے جمیل کی طرف دیکھا ”مال پانی ہے؟“
جمیل کے ہونٹوں پر نشیلی مسکراہٹ نمودار ہوئی نور کی پسلیوں میں کہنی سے
ٹھوکا دے کر اس نے کہا ”بہت۔۔۔۔۔ نور بھائی، بہت“ اور اس نے جیب سے
پانچ نوٹ سو سو کے نکالے ”کیا اتنے کافی نہیں؟“

نور کی باچھیں کھل گئیں ”کافی۔۔۔؟ بہت زیادہ ہیں۔۔۔۔۔ چلو آؤ، پہلے
ایک بوتل خرید لیں، وہاں ضرورت پڑے گی۔“

جمیل نے سوچا، بات بالکل ٹھیک ہے وہاں ضرورت نہیں پڑے گی تو کیا کسی
مسجد میں پڑے گی چنانچہ فوراً ایک بوتل خرید لی گئی ٹیکسی کھڑی تھی دونوں اس میں

بیٹھ گئے اور اس راوی کی سیاحتی کرنے لگے۔

سینکڑوں برہمنوں تھے ان میں سے بیس پچیس کا جائزہ لیا گیا، مگر جمیل کو کوئی عورت پسند نہ آئی سب میک اپ کی موٹی اور شوخ تہوں کے اندر چھپی ہوئی تھیں جمیل چاہتا تھا کہ ایسی لڑکی ملے جو مرمت شدہ مکان معلوم نہ ہو جس کو دیکھ کر یہ احساس نہ ہو کہ جگہ جگہ اکھڑے ہوئے پلستر کے ٹکڑوں پر بڑے اٹاری پن سے سرخی اور چونہ لگایا گیا ہے۔

نٹورنگ آگیا اس کے سامنے جو بھی عورت آتی تھی، وہ جمیل کا کندھا پکڑ کر کہتا ”جمیل بھائی، چلے گی!“

مگر جمیل بھائی اٹھ کھڑا ہوتا ”ہاں چلے گی۔۔۔۔۔ اور ہم بھی چلیں گے!“
دو جگہیں اور دیکھی گئیں مگر جمیل کو مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا وہ سوچتا تھا کہ ان عورتوں کے پاس کون آتا ہے، جو سور کے سوکھے ہوئے گوشت کے ٹکڑوں کی طرح دکھائی دیتی تھیں ان کی ادائیں کتنی مکروہ ہیں اٹھنے بیٹھنے کا اندازہ کتنا فحش ہے اور کہنے کو یہ پرائیویٹ ہیں، یعنی ایسی عورتیں جو درپردہ پیشہ کراتی ہیں۔۔۔ جمیل کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ پردہ ہے کہاں جس کے پیچھے یہ دھندا کرتی ہیں۔

جمیل سوچ ہی رہا تھا کہ اب پروگرام کیا ہوتا چاہیے کہ نٹور نے ٹیکسی رکوائی اور اتر کر چلا گیا کہ ایک دم اسے ایک ضروری کام یاد آگیا تھا۔

اب جمیل اکیلا تھا ٹیکسی میں میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہی تھی اس وقت ساڑھے چار بج چکے تھے۔۔۔ اس نے ڈرائیور سے پوچھا ”یہاں کوئی بھڑوا ملے گا؟“

ڈرائیور نے جواب دیا ”اے گا جناب!“

”تو چلو اس کے پاس!“

ڈرائیور نے دو تین موڑ کھوسے اور ایک پیارٹی بنگلہ نما بلڈنگ کے پاس گاڑی کھڑی کر دی دو تین مرتبہ ہارن بجایا۔

جمیل کا سر نشے کے باعث سخت بوجھل ہو رہا تھا آنکھوں کے سامنے دھند سی چھائی ہوئی تھی۔۔۔ اسے معلوم نہیں کیسے اور کس طرح، مگر جب اس نے ڈرا دماغ کو جھٹکا تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک پلنگ پر بیٹھا ہے اور اس کے پاس ہی ایک جوان لڑکی جس کی ناک کی پھٹنگ پر چھوٹی سی پھنسی تھی، اپنے بریدہ بالوں میں کنگھی کر رہی ہے۔

جمیل نے اس کو غور سے دیکھا سو پنے ہی ہاتھ اٹھا کہ وہ یہاں کیسے پہنچا مگر اس کے شعور نے اس کو مشورہ دیا کہ دیکھو یہ سب عبث ہے جمیل نے سوچا، یہ ٹھیک ہے لیکن پھر بھی اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر اندر ہی اندر نوٹ گن کر اور پاس پڑی ہوئی تپائی پر برانڈی کی سالم بوتل دیکھ کر اپنی تشفی کرنی کہ سب خیریت ہے اس کا نشانہ کسی قدر نیچے اتر گیا۔

اٹھ کر وہ اس گیسو بریدہ لڑکی کے پاس گیا اور، اور تو کچھ سمجھ میں نہ آیا مسکرا کر اس سے کہا ”کیسے مزاج کیسا ہے؟“

اس لڑکی نے کنگھی میز پر رکھی اور کہا ”کہیے، آپ کا کیسا ہے؟“

”ٹھیک ہوں!“ یہ کہہ کر اس نے اس لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈالا۔۔۔ ”آپ کا

نام؟“

”ہنا تو پہلی ایک دفعہ۔۔۔۔۔ آپ کو میرا خیال ہے یہ بھی یاد نہ رہا ہوگا کہ آپ ٹیکسی میں یہاں آئے۔۔۔ جانے کہاں کہاں گھومتے رہتے ہوں گے کہ بل اڑتیں روپے بنا جو آپ نے ادا کیا اور ایک شخص جس کا نام شاید نہ ہو رہا تھا، آپ نے اس کو بے شمار گالیاں دیں۔“

جمیل اپنے اندر ڈوب کر سارے معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرنے ہی والا تھا کہ اس نے سوچا کہ فی الحال اس کی ضرورت نہیں، میں بھول جایا کرتا ہوں۔۔۔۔۔ یا یوں سمجھئے کہ مجھے بار بار پوچھنے میں مزہ آتا ہے۔۔۔۔۔ وہ صرف اتنا یاد کر سکا کہ اس نے ٹیکسی والے کا بل جو کہ اڑتیں روپے بنتا تھا ادا کیا تھا۔

لڑکی بنگ پر بیٹھ گئی ”میرا نام تارہ ہے!“

جمیل نے اس کو لٹا دیا اور اس سے مصنوعی قسم کا پیار کرنے لگا
تھوڑی دیر کے بعد اس کو پیاس محسوس کی تو اس نے تارہ سے کہا ”دو بج بستہ سوڈے اور گلاس۔“

تارہ نے یہ دونوں چیزیں فوراً حاضر کر دیں جمیل نے بوتل کھولی اپنے لیے ایک پیگ ڈال کر اس نے دوسرا تارہ کے لیے ڈالا۔۔۔۔۔ پھر دونوں پینے لگے۔

تین پیگ پینے کے بعد جمیل نے محسوس کیا کہ اس کی حالت بہتر ہو گئی ہے تارہ کو چوڑے چائے کے بعد اس نے سوچا کہ اب قصہ مختصر ہو جانا چاہیے ”کپڑے اتار دو!“

”سارے؟“

”ہاں سارے!“

تارہ نے کپڑے اتار دیئے اور لیٹ گئی جمیل نے اس کے نئے جسم کو ایک نظر دیکھا اور یہ رائے قائم کی کہ اچھا جیسا کے ساتھ ہی خیالات کا ایک تانتا بندھ گیا جمیل کا نکاح ہو چکا تھا اس نے اپنی بیوی کو دو تین مرتبہ دیکھا تھا۔

اس کا بدن کیسا ہو گا۔۔۔ کیا وہ تارہ کی طرح اس کے ایک مرتبہ کہنے پر اپنے سارے کپڑے اتار کر اس کے ساتھ لیٹ جائے گی؟
کیا وہ اس کے ساتھ برانڈی پئے گی؟
کیا اس کے بال کٹے ہوئے ہیں؟

پھر فوراً اس کا ضمیر جاگا جس نے اس کو اعنت ملامت شروع کر دی نکاح کا یہ مطلب تھا کہ اس کی شادی ہو چکی تھی صرف ایک مرحلہ باقی تھا، کہ وہ اپنی سسرال جائے اور لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر لے آئے۔۔۔۔۔ کیا اس کے لیے یہ واجب تھا کہ ایک بازاری عورت کو اپنے آغوش کی زینت بنائے۔۔۔۔۔ خم کے خم لٹڑھاتا پھرے۔

جمیل بتہ خفیف ہوا اور اسی خفت میں اس کی آنکھیں منہ نہ شروع ہو گئیں اور وہ سو گیا تارہ بھی جموڑی دیر کے بعد خواب غفلت کے مزے لینے لگی۔
جمیل نے کئی بے ربط، اوٹ پٹا خواب دیکھے۔۔۔۔۔ کوئی دو گھنٹے کے بعد جب کہ ایک بہت ہی ڈراما خواب دیکھ رہا تھا وہ ہڑبڑا کے اٹھا جب اچھی طرح آنکھیں کھلیں تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک اجنبی کمرے میں ہے اور اس کے ساتھ ایک الف نگلی لڑکی لیٹی ہے لیکن جموڑی دیر کے بعد واقعات آہستہ آہستہ اس کے

دماغ کی دھند چیر کر نمودار ہونے لگے۔

وہ خود بھی الف بنگا تھا بولکھلاہٹ میں اس نے الٹا پانچامہ پہن لیا، مگر اس کو اس کا احساس نہ ہوا، کرتہ پہن کر اس نے اپنی جینیں ٹولیں نوٹ سب کے سب موجود تھے اس نے سوڈا کھولا اور ایک پیگ بنا کر پیا پھر اس نے تارہ کو ہولے سے جھنجھوڑا ”اٹھو!“

تارہ آنکھیں ملتی اٹھی جمیل نے اس سے کہا ”کپڑے پہن لو!“
تارہ نے کپڑے پہن لیے۔۔۔۔۔ باہر گہری شام رات بننے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ جمیل نے سوچا اب کوچ کرنا چاہیے لیکن وہ تارہ سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا، کیونکہ بہت سی باتیں اس کے ذہن سے نکل گئی تھیں ”کیوں تارہ جب ہم لیٹے۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے جب میں نے تم سے کپڑے اتارنے کو کہا تو اس کے بعد کیا ہوا؟“

تارہ نے جواب دیا ”کچھ نہیں۔۔۔۔۔ آپ نے اپنے کپڑے اتارے اور میرے بازو پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے سو گئے“
”بس؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ لیکن سونے سے پہلے آپ دو تین مرتبہ بڑبڑائے اور کہا ”میں گنہگار ہوں۔۔۔۔۔ میں گنہگار ہوں۔“ یہ کہہ کر تارہ اٹھی اور اپنے بال سنوارنے لگی“
جمیل بھی اٹھا گناہ کا احساس دبانے کے لیے اس نے ڈبل پیگ اپنے حلق میں جلدی جلدی انڈیا بوتل کو کانڈ میں لپیٹا اور دروازے کی طرف بڑھا۔
تارہ نے پوچھا ”چلے؟“

”ہاں، پھر کبھی آؤں گا“ یہ کہہ کر وہ لوہے کی بیچ دار سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا
بڑے بازار کی طرف اس کے قدم اٹھنے ہی والے تھے کہ ہارن بجا اس نے مڑ کر
دیکھا تو ایک نیکی کھڑی تھی اس نے کہا چلو اچھا ہوا، یہیں مل گئی پیدل چلنے کی
زحمت سے بچ گئے۔

اس نے ڈرائیور سے پوچھا ”کیوں بھائی خالی ہے؟“
ڈرائیور نے جواب دیا ”خالی ہے کا کیا مطلب۔۔۔۔۔۔ لگی ہوئی ہے!“
”تو پھر۔۔۔“ یہ کہہ کر جمیل مزے لیکر ڈرائیور نے اس کو پکارا ”کدھر جاتا ہے
سیٹھ؟“

جمیل نے جواب دیا ”کوئی اور نیکی دیکھتا ہوں“
ڈرائیور باہر نکل آیا ”مستک تو نہیں پھرے!۔۔۔۔۔۔ یہ نیکی تمہیں نے تو
لے رکھی ہے!“

جمیل بوکھلا گیا ”میں نے؟“
ڈرائیور نے بڑے گنوار لہجے میں اس سے کہا ”ہاں تو نے۔۔۔۔۔۔ سالہ
دارو پی کر سب کچھ بھول گیا۔“

اس پر تو تو میں میں شروع ہوئی ادھر ادھر سے لوگ اکٹھے ہو گئے جمیل نے نیکی
کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گیا ”چلو!“
ڈرائیور نے نیکی چائی ”کدھر؟“
جمیل نے کہا ”پولیس اسٹیشن!“

ڈرائیور نے اس پر جانے کیا وہی تباہی مچی۔۔۔۔۔۔ جمیل سوچ میں پڑ گیا جو

ٹیکسی اس نے لی تھی اس کا بل جو کہ اڑتیس روپے کا تھا اس نے ادا کر دیا تھا اب یہ نئی ٹیکسی کہاں سے آن چکی گو وہ نشے کی حالت میں تھا مگر وہ یقینی طور پر کہہ سکتا تھا کہ یہ وہ ٹیکسی نہیں تھی اور نہ یہ ڈرائیور وہ ڈرائیور، جو اسے یہاں لایا تھا۔

پولیس اسٹیشن پہنچے جمیل کے قدم بہت بری طرح لڑکھڑا رہے تھے سب انسپکٹر جو کہ اس وقت ڈیوٹی پر تھا فوراً بھانپ گیا کہ معاملہ کیا ہے، اس نے جمیل کو کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا

ڈرائیور نے اپنی داستان شروع کر دی جو سرتاپا غلط تھی جمیل یقیناً اس کی تردید کرتا مگر اس میں زیادہ بولنے کی ہمت نہیں تھی سب انسپکٹر سے مخاطب ہو کر اس نے کہا ”جناب! میری سمجھ میں نہیں آتا، یہ کیا قصہ ہے جو ٹیکسی میں نے لی تھی، اس کا کرایہ میں نے اڑتیس روپے ادا کر دیا تھا اب معلوم نہیں یہ کون ہے اور مجھ سے کیا کرایہ مانگتا ہے۔“

ڈرائیور نے کہا، ”حنورا انسپکٹر بہادر، یہ دارو پئے ہے“ اور ثبوت کے طور پر اس نے جمیل کی برائڈی کی بوتل میز پر رکھ دی۔

جھنجھلا گیا ”ارے بھئی کون سو رہتا ہے کہ اس نے نہیں پی۔۔۔۔۔ سوال تو یہ ہے کہ آپ کہاں سے تشریف لے آئے؟“

سب انسپکٹر شریف آدمی تھا کرایہ ڈرائیور کے حساب سے بیالیس روپے بنتا تھا اس نے پندرہ روپے میں فیصلہ کر دیا ڈرائیور بہت چیخا چلایا مگر سب انسپکٹر نے اس کو ڈانٹ ڈپٹ کر تھانے سے نکلوا دیا پھر اس نے ایک سپاہی سے کہا کہ وہ دوسری ٹیکسی بلائے ٹیکسی آئی تو اس نے ایک سپاہی جمیل کے ساتھ کر دیا کہ وہ اسے گھر

چھوڑ آئے جمیل نے لکنت بھرے لہجے میں اس کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور پوچھا ”جناب کیا یہ گرانٹ روڈ پولیس اسٹیشن ہے؟“
 سب انسپکٹر نے زور کا قہقہہ لگایا اور پیٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ”مسٹر، اب ثابت ہو گیا کہ تم نے خوب پی رکھی ہے۔۔۔۔۔ یہ کوالا پولیس اسٹیشن ہے۔۔۔۔۔ جاؤ اب گھر جا کر سو جاؤ۔“
 جمیل گھر جا کے کھانا کھائے اور کپڑے اتارے بغیر سو گیا۔۔۔۔۔ برانڈی کی بوتل بھی اس کے ساتھ سوئی رہی۔

دوسرے روز وہ دس بجے کے قریب اٹھا جوڑ جوڑ میں درو تھا سر میں جیسے بڑے بڑے وزنی پتھر تھے منہ کا ڈانکھ خراب اس نے اٹھ کا دو تین گلاس فروٹ سالٹ کے پے، چار پانچ پیالے چائے کے کہیں شام کو جا کر طبیعت کسی قدر بحال ہوئی اور اس نے خود کو گزشتہ واقعات کے متعلق سوچنے کے قابل محسوس کیا۔
 بہت لمبی زنجیر تھی ان میں سے بعض کڑیاں تو سامت تھیں، مگر بعض غائب واقعات کا تسلسل شروع سے لے کر گرین ہوٹل اور وہاں سے کوالا تک بالکل صاف تھا۔ اس کے بعد جب نو ر کے ساتھ خاص وادی کی سیاحی شروع ہوئی تھی معاملہ گنڈ ہو جاتا تھا چند جھلمکیاں دکھائی دیتی تھیں، بڑی واضح، مگر فوراً مبہم پر چھائیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔

وہ کیسے اس لڑکی کے گھر پہنچا۔۔۔ اس کا نام جمیل کے حافضے سے پچھل کر جانے کس کھد میں جا گرا تھا۔۔۔ اس کی شکل و صورت اسے الہتہ بڑی اچھی طرح یاد تھی۔

وہ اس کے گھر کیسے پہنچا تھا؟۔۔۔۔۔ یہ جاننا بہت اہم تھا اگر جمیل کا حافظہ اس کی مدد کرتا تو بہت سی چیزیں صاف ہو جاتیں مگر بعد کوشش وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔

اور یہ ٹیکسیوں کا کیا سلسلہ تھا اس نے پہلی کو تو چھوڑ دیا تھا، مگر دوسری کہاں سے ٹپک پڑی تھی؟

سوچ سوچ کے جمیل کا دماغ پاش پاش ہو گیا اس نے محسوس کیا کہ جتنے وزنی پتھر اس میں پڑے تھے، سب آپس میں ٹکرائے اور چور چور ہو گئے ہیں۔ رات کو اس نے برانڈی کے تین پیگ پئے، تھوڑا سا ہلکا کھانا کھایا اور گزشتہ واقعات کے متعلق سوچتا سوچتا سو گیا۔

وہ ٹکڑے جو گم ہو گئے تھے ان کو تلاش کرنا اب جمیل کا شغل ہو گیا تھا وہ چاہتا تھا کہ جو کچھ اس روز ہوا، ان وعین اس کی آنکھوں کے سامنے آجائے اور یہ روز روز کی مغز پاشی دور ہو۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ اس کو اس بات کا بھی بڑا قلق تھا کہ اس کا گناہ نامکمل رہ گیا وہ سوچتا تھا، یہ اوتھورا گناہ چائے گا کس کھاتے میں وہ چاہتا تھا کہ بس ایک دفعہ اس کی بھی تکمیل ہو جائے۔

مگر تلاش بسیار کے باوجود وہ پیاڑی بنگلوں جیسا مکان جمیل کی آنکھوں سے اوجھل رہا۔ جب وہ تھک ہار گیا تو اس نے ایک دن سوچا، کیا یہ سب خواب ہی تو نہیں تھا۔

مگر خواب کیسے ہو سکتا تھا خواب میں آدمی اتنے روپے تو خرچ نہیں کرتا۔۔۔۔۔ اس روز اس کے کم از کم ڈھائی سو روپے خرچ ہوئے تھے۔

پیر صاحب سے اس نے نور کے متعلق پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ وہ اس روز کے بعد دوسرے دن ہی سمندر پار کہیں چلا گیا ہے غالباً موتیوں کے سلسلے میں جیل نے اس پر ہزار نعمتیں بھیجیں اور اپنی تلاش شروع کر دی۔

اس نے جب اپنے حافظے پر بتہ زور دیا تو ہنگے کی دیوار کے ساتھ پیتل کی ایک پلیٹ نظر آئی۔۔۔۔۔ اس پر کچھ لکھا تھا۔۔۔۔۔ غالباً۔۔۔۔۔ ڈاکٹر۔۔۔۔۔ ڈاکٹر بیرام جی۔۔۔۔۔ آگے جانے کیا۔۔۔۔۔

ایک دن کو لاہور کی گلیوں میں چلتے چلتے آخر وہ ایک ایسی گلی میں پہنچا جو اس کو جانی پہچانی معلوم ہوئی۔۔۔۔۔ وہ یہاں اسی قسم کی نگلہ نما عمارتیں تھیں ہر عمارت کے باہر چھوٹے چھوٹے پیتل کے بورڈ لگے تھے۔ کسی پر چار، کسی پر پانچ۔۔۔۔۔ کسی پر تین۔

وہ ادھر ادھر غور سے دیکھتا چلا جا رہا تھا، مگر اس کے دماغ میں وہ خط گھوم رہا تھا جو صبح اس کی سانس کی طرف سے موصول ہوا تھا کہ اب انتظار کی حد ہو گئی ہے میں نے تاریخ مقرر کر دی ہے، آؤ اور اپنی دہن کو لے جاؤ۔

اور وہ ادھر ایک مکمل گناہ کو مکمل بنائے کی کوشش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ جیل نے کہا، بٹاؤ جی اس وقت۔۔۔۔۔ پھر نے دو مارا مارا۔۔۔۔۔ ایک دم اس نے اپنے واسنے ہاتھ پیتل کا ایک چھوٹا سا بورڈ دیکھا۔۔۔۔۔ اس پر لکھا تھا۔۔۔۔۔ ڈاکٹر ایم بیرام جی۔۔۔۔۔ ایم ڈی۔

جیل کا پنے لگا یہ وہی بلند گ۔۔۔۔۔ بالکل وہی۔۔۔۔۔ وہی رنگ، وہی بل کھاتی ہوئی مہنی سیڑھیاں جیل بے دھڑک اوپر چلا گیا اس کے لیے اب ہر چیز

جانی پہچانی تھی کوری ڈور سے نکل کر اس نے سامنے والے دروازے پر دستک دی۔

ایک لڑکے نے دروازہ کھولا۔۔۔۔۔ اسی لڑکے نے جو اس روز سوڈا اور برف لایا تھا۔ جمیل نے جوتوں پر مصنوعی مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے اس سے پوچھا ”بیٹا، ہائی جی ہیں؟“

لڑکے نے اثبات میں سر ہلایا ”جی ہاں!“
 ”جاؤ، ان سے کہو، صاحب ملنے آئے ہیں،“ جمیل کے لہجے میں بے تکلفی تھی۔

لڑکا دروازہ بھیڑ کر اندر چلا گیا
 تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا اور تارہ نمودار ہوئی اس کو دیکھتے ہی جمیل نے پہچان لیا کہ وہی لڑکی ہے، مگر اب اس کی ناک پر پھنسی نہیں تھی ”نمستے!“
 ”نمستے، کہیے مزاج کیسے ہیں؟“ یہ کہہ کر اس نے اپنے کئے ہوئے بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دیا۔

جمیل نے جواب دیا ”اتھتھے ہیں۔۔۔۔۔ میں پچھلے دنوں بہت مصروف رہا، اس لیے آندہ۔۔۔۔۔ کہو، پھر کیا ارادہ ہے؟“

تارہ نے بڑی سنجیدگی سے کہا ”معاف کیجئے، میری شادی ہو چکی ہے“
 جمیل بوکھلا گیا ”شادی؟۔۔۔۔۔ کب؟“

تارہ نے اسی سنجیدگی سے جواب دیا ”جی، آج صبح۔۔۔۔۔ آئیے میں آپ کو اپنے پتی سے ملاؤں۔“

شائقی

دونوں پیرے ترین ڈیری کے باہر بڑے دھاریوں والے چھاتے کے نیچے
 کرسیوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ادھر سمندر تھا جس کی لہروں کی گنگناہٹ
 سنائی دے رہی تھی۔ چائے بہت گرم تھی اس لیے دونوں آہستہ آہستہ گھونٹ بھر
 رہے تھے سامنے موٹی بھوؤں والی یہودوں کی جانی پہچانی صورت تھی۔ یہ بڑا گول
 منول چہرہ تکیلی ہاک موٹے موٹے بہت ہی زیادہ سرخی لگے ہونٹ شام کو ہمیشہ
 درمیان والے دروازے کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھی دکھائی دیتی تھی مقبول نے
 ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور بلراج سے کہا ”بیٹھی ہے جال پھینکنے“
 بلراج موٹی بھوؤں کی طرف دیکھے بغیر بولا ”پھنس جائے گی کوئی نہ کوئی
 مچھلی“

مقبول نے ایک پیٹری منہ میں ڈالی ”یہ کاروبار بھی عجیب کاروبار ہے کوئی
 دکان کھول کر بیٹھتی ہے کوئی چل پھر کے سودا بیچتی ہے۔ کوئی اس طرح
 ریستورانوں میں گاہک کے انتظار میں بیٹھی رہتی ہے۔۔۔ جسم بیچنا بھی ایک
 آرٹ ہے اور میرا خیال ہے بہت مشکل آرٹ ہے۔۔۔ یہ موٹی بھوؤں والی
 کیسے گاہک کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے کیسے کسی مرد کو یہ بتاتی ہوگی کہ وہ بکاؤ ہے۔“
 بلراج مسکرایا ”کسی روز وقت نکال کر کچھ دیر یہاں بیٹھو تمہیں معلوم ہو جائے گا
 کہ نکا ہوں ہی نکا ہوں میں کیونکر سودے ہوتے ہیں اس جنس کا بھانڈو کیسے چکتا ہے“
 یہ کہہ کر اس نے ایک دم مقبول کا ہاتھ پکڑا ”ادھر دیکھو، ادھر“

مقبول نے موٹی یہودن کی طرف دیکھا بلراج نے اس کا ہاتھ دبایا ”نہیں
یار۔۔۔ ادھر کونے کے چھاتے کے نیچے دیکھو“

مقبول نے ادھر دیکھا ایک دہلی پتلی، گوری چٹی لڑکی کرسی پر بیٹھ رہی تھی بال
کٹے ہوئے تھے تاک نقشہ ٹھیک تھا ہلکے زرد رنگ کی چار جٹ کی ساڑھی میں ملبوس
تھی مقبول نے بلراج سے پوچھا ”کون ہے یہ لڑکی؟“
بلراج نے اس لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا ”اماں وہی ہے جس
کے بارے میں تم سے کہا تھا کہ بڑی عجیب و غریب ہے۔“
مقبول نے کچھ دیر سوچا پھر کہا ”کون سی یار تم تو جس لڑکی سے بھی ملتے ہو
عجیب و غریب ہی ہوتی ہے۔“

بلراج مسکرایا ”یہ بڑی خاص الخاص ہے۔۔۔ ذرا غور سے دیکھو“
مقبول نے غور سے دیکھا بریدہ بالوں کا رنگ بھوسا تھا ہلکے بنسنتی رنگ کی
ساڑھی کے نیچے چھوٹی آستینوں والا بلاؤز پتلی پتلی بہت ہی گوری بانہیں لڑکی نے
اپنی گردن موڑی تو مقبول نے دیکھا کہ اس کے باریک ہونٹوں پر سرخی پھیلی ہوئی
سی تھی ”میں اور تو کچھ نہیں کہہ سکتا مگر تمہاری اس عجیب و غریب لڑکی کو سرخی استعمال
کرنے کا سلیقہ نہیں ہے۔۔۔ اب اور غور سے دیکھا ہے تو ساڑھی کی پہناوٹ
میں بھی خامیاں نظر آتی ہیں۔ بال سنوارنے کا انداز بھی ستھرا نہیں۔“
بلراج ہنسا ”تم صرف خامیاں ہی دیکھتے ہو اچھائیوں پر تمہاری نگاہ کبھی نہیں
پڑتی۔“

مقبول نے کہا ”جو اچھائیاں ہیں وہ اب بیان فرما دیجئے لیکن پہلے یہ بتا دیجئے

کہ آپ اس لڑکی کو ذاتی ور پر جانتے ہیں یا۔۔۔۔۔“

لڑکی نے جب بلراج کو دیکھا تو مسکرائی مقبول رک گیا ”مجھے جواب مل گیا

اب آپ محترمہ کی خوبیاں بتا دیجئے“

”سب سے پہلی خوبی اس لڑکی میں یہ ہے کہ بہت صاف گو ہے کبھی جھوٹ

نہیں بولتی جو اصول اس نے اپنے لیے بنا رکھے ہیں ان پر بڑی پابندی سے عمل

کرتی ہے پرسنل ہائی جین کا بہت خیال رکھتی ہے محبت و محبت کی بالکل قائل نہیں

اس معاملے میں دل اس کا ہرف ہے۔“

بلراج نے چائے کا آخری گھونٹ پیا ”کہیے کیا خیال ہے؟“

مقبول نے لڑکی کو ایک نظر دیکھا ”جو خوبیاں تم نے بتائی ہیں ایک ایسی عورت

میں نہیں ہونی چاہئیں جس کے پاس مرد صرف اس خیال سے جاتے ہیں کہ وہ ان

سے اصلی نہیں تو مصنوعی محبت ضرور کرے گی۔۔۔۔۔ خود فریبی میں اگر یہ لڑکی کسی

مرد کی مدد نہیں کرتی تو میں سمجھتا ہوں بڑی بے وقوف ہے۔“

”یہی میں نے سوچا تھا۔۔۔۔۔ میں تم سے کیا بیان کروں، روکھے پن کی حد

تک صاف گو ہے اس سے باتیں کرو تو کئی بار دھکے سے لگتے ہیں۔۔۔۔۔ ایک

گھنٹہ ہو گیا تم نے کوئی کام کی بات نہیں کی۔۔۔۔۔ میں چلی اور یہ جا وہ

جا۔۔۔۔۔ تمہارے منہ سے شراب کی بو آتی ہے، جاؤ چلے جاؤ۔۔۔۔۔ سارچی کو ہاتھ

مت لگاؤ میلی ہو جائے گی“ یہ کہہ کر بلراج نے سگریٹ ساگایا ”عجیب و غریب لڑکی

ہے پہلی دفعہ جب اس سے ملاقات ہوئی تو میں ہائی گوڈ چکرا گیا چھوٹے ہی مجھ

سے کہا فحش سے ایک پیسہ کم نہیں ہوگا جیب میں ہیں تو چلو ورنہ مجھے اور کام ہیں۔“

لڑکی نے کہا، ”ففتی روپےز۔۔۔۔۔یس اور نو؟“

یہ دوسرا ریا تھا مگر مقبول نے اپنے قدم جمالیے ”چلیے“
 مقبول نے چائے کا بل ادا کیا دونوں اٹھ کر ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف روانہ ہوئے
 راستے میں اس نے کوئی بات نہ کی لڑکی بھی خاموش رہی ٹیکسی میں بیٹھے تو اس نے
 مقبول سے پوچھا ”کہاں جائے گا تم؟“
 مقبول نے جواب دیا ”جہاں تم لے جاؤ گی“
 ”ہم کچھ نہیں جانتا۔۔۔۔۔ تم لو کو کدھر جائے گا“
 مقبول کو کوئی اور جواب نہ سوچا تو کہا ”ہم کچھ نہیں جانتا“
 لڑکی نے ٹیکسی کا دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ”تم کیسا آدمی
 ہے۔۔۔۔۔ خالی پیلی جوک کرتا ہے۔“
 مقبول نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ”میں مذاق نہیں کرتا۔۔۔۔۔ مجھے تم سے صرف
 باتیں کرنی ہیں۔“
 وہ بگڑ کر بولی ”کیا۔۔۔۔۔ تم تو بولا تھا ففٹی روپیز لیس“
 مقبول نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دس دس کے پانچ نوٹ نکال کر اس کی
 طرف بڑھا دیئے ”یہ لو گھبراتے کیوں ہو“
 اس نے نوٹ لے لیے ”تم جائے گا کہاں؟“
 مقبول نے کہا ”تمہارے گھر“
 ”نہیں“
 ”کیوں نہیں“
 ”تم کو بولا ہے نہیں۔۔۔۔۔ ادھر ایسی بات نہیں ہوگی“

مقبول مسکرایا ”ٹھیک ہے ایسی بات ادھر نہیں ہوگی“

کچھ متحیر سی ہوئی ”تم کیسا آدمی ہے“

”جیسا میں ہوں تم نے بولا ففٹی رو پیز لیس کہو۔۔۔۔۔۔ میں نے کہا لیس اور نوٹ تمہارے حوالے کر دیئے تم نے بولا ادھر ایسی بات نہیں ہوگی میں نے کہا بالکل نہیں ہوگی۔۔۔۔۔۔ اب اور کیا چاہتی ہو“

لڑکی سوچنے لگی مقبول مسکرایا ”دیکھو شائقِ بات یہ ہے کل تم کو دیکھا ایک دوست نے تمہاری کچھ باتیں سنائیں جو مجھے دلچسپ معلوم ہوئیں آج میں نے تمہیں پکڑ لیا اب تمہارے گھر چلتے ہیں وہاں کچھ دیر تم سے باتیں کروں گا اور چلا جاؤں گا۔۔۔۔۔۔ کیا تمہیں یہ منظور نہیں۔“

”نہیں۔۔۔۔۔۔ یہ لو اپنے ففٹی رو پیز۔۔۔۔۔۔“ لڑکی کے چہرے پر جھنجھلاہٹ تھی۔

”تمہیں بس ففٹی رو پیز کی پڑی ہے۔۔۔۔۔۔ روپے کے علاوہ کچھ دنیا میں اور بہت سی چیزیں ہیں۔۔۔۔۔۔ چلو، ڈرائیور کو اپنا ایڈریس بتاؤ۔۔۔۔۔۔ میں شریف آدمی ہوں تمہارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کروں گا“ مقبول کے انداز گفتگو میں صداقت تھی لڑکی متاثر ہوئی اس نے کچھ دیر سوچا پھر کہا ”چلو۔۔۔۔۔۔ ڈرائیور، ہار بنی روڈ“

ٹیکسی چلی تو اس نے نوٹ مقبول کی جیب میں ڈال دیئے ”یہ میں نہیں لوں گی“

مقبول نے اصرار نہ کیا ”تمہاری مرضی“

ٹیکسی ایک پانچ منزلہ بلڈنگ کے پاس رکی پہلی اور دوسری منزل پر مساس خانے تھے تیسری، چوتھی اور پانچویں منزل ہوٹل کے لیے مخصوص تھی بڑی تنگ و تنگ جگہ تھی چوتھی منزل پر سیڑھیوں کے سامنے والا کمرہ شائق کا تھا۔ اس نے پرس سے چابی نکال کر دروازہ کھولا بہت مختصر سامان تھا لوہے کا ایک پلنگ جس پر اچلی چادر بچھی تھی کونے میں ڈریسنگ ٹیبل ایک سٹول اس پر ٹیبل فین چادر ٹرک تھے وہ پلنگ کے نیچے دھڑے تھے۔

مقبول کمرے کی صفائی سے بہت متاثر ہوا ہر چیز صاف ستھری تھی تکیے کے غلاف عام طور پر میلے ہوتے ہیں مگر اس کے دونوں تکیے بے داغ غلافوں میں ملفوف تھے مقبول پلنگ پر بیٹھنے لگا تو شائق نے اسے روکا "نہیں۔۔۔۔۔ ادھر بیٹھنے کا اجازت نہیں۔۔۔۔۔ ہم کسی کو اپنے بستر پر نہیں بیٹھنے دیتا کرسی پر بیٹھو" یہ کہہ کر وہ خود پلنگ پر بیٹھ گئی مقبول مسکرا کر کرسی پر ٹک گیا۔

شائق نے اپنا پرس تکیے کے نیچے رکھا اور مقبول سے پوچھا "بولو۔۔۔۔۔ کیا باتیں کرنا چاہتے ہو؟"

مقبول نے شائق کی طرف غور سے دیکھا "پہلی بات تو یہ ہے کہ تمہیں ہونٹوں پر لپ اسٹک لگانی بالکل نہیں آتی"

شائق نے برائہ ماہ صرف اتنا کہا "مجھے مالوم ہے"

"اٹھو۔۔۔۔۔ مجھے لپ اسٹک دو میں تمہیں سکھاتا ہوں" یہ کہہ کر مقبول نے اپنا رومال نکالا۔

شائق نے اس سے کہا "ڈریسنگ ٹیبل پر پڑا ہے، اٹھا لو"

مقبول نے لپ اسٹک اٹھائی اسے کھول کر دیکھا ”ادھر آؤ، میں تمہارے ہونٹ پونچھوں“

”تمہارے رومال سے نہیں۔۔۔۔۔ میرا لہو“ یہ کہہ کر اس نے ٹرنک کھولا اور ایک دھلا ہوا رومال مقبول کو دیا مقبول نے اس کے ہونٹ پونچھے بڑی نفاست سے نئی سرخی ان پر لگائی پھر کنگھی سے اس کے بال ٹھیک کیے اور کہا ”لو اب آئینہ دیکھو“

شائق اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہو گئی بڑے غور سے اس نے اپنے ہونٹوں اور بالوں کا معائنہ کیا پسندیدہ نظروں میں تبدیلی محسوس کی اور پلٹ کر مقبول سے صرف اتنا کہا ”اب ٹھیک ہے“ پھر پلنگ پر بیٹھ کر پوچھا ”تمہارا کوئی بیوی ہے؟“

مقبول نے جواب دیا ”نہیں“

کچھ دیر خاموش رہی مقبول چاہتا تھا باتیں ہوں چنانچہ اس نے سلسلہ کلام شروع کیا ”اتنا تو مجھے معلوم ہے کہ تم کشمیر کی رہنے والی ہو تمہارا نام شائق ہے یہاں رہتی ہو۔۔۔۔۔ یہ بتاؤ تم نے ففٹی روپیز کا معاملہ کیوں شروع کیا؟“

شائق نے یہ بے تکلف جواب دیا ”میرا قادر سری نگر میں ڈاکٹر ہے۔۔۔۔۔ میں وہاں ہو پسی ٹل میں نرس تھا ایک لڑکے نے مجھ کو خراب کر دیا۔۔۔۔۔ میں بھاگ کر ادھر کو آ گئی یہاں ہم کو ایک آدمی ملا۔ وہ ہم کو ففٹی روپیز دیا۔۔۔۔۔ بولا ہمارے ساتھ چلو ہم گیا بس کام چالو ہو گیا۔۔۔۔۔ ہم یہاں ہو ٹل میں آ گیا۔۔۔۔۔ پر ہم ادھر کسی سے بات نہیں کرتی۔۔۔۔۔ سب رنڈی لوگ

ہے۔۔۔ کسی کو یہاں نہیں آنے دیتی۔“

مقبول نے کرید کرید کر تمام واقعات معلوم کرنا مناسب خیال نہ کیا کچھ اور باتیں ہوئیں جن سے اسے پتا چلا کہ شافی کو جنسی معاملے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی جب اس کا ذکر آیا تو اس نے برا سامنہ بنا کر کہا ”آئی ڈونٹ لانک ویٹ از بید“ اس کے نزدیک ففنی روپیز کا معاملہ کاروباری معاملہ تھا سرینگر کے ہسپتال میں جب کسی لڑکے نے اس کو خراب کیا تو جاتے وقت دس روپے دینا چاہے شافی کو بہت غصہ آیا نوٹ پھاڑ دیا اس واقعے کا اس کے دماغ پر یہ اثر ہوا کہ اس نے باقاعدہ کاروبار شروع کر دیا پچاس روپے فیس خود بخود مقرر ہو گئی اب لذت کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا۔۔۔ چونکہ نرس رہ چکی تھی اس لیے بڑی محتاط رہتی تھی۔

ایک برس ہو گیا تھا اسے بھئی آئے ہوئے اس دوران میں اس نے دس ہزار روپے بچائے ہوتے مگر اس کو ریس کھیلنے کی لت پڑ گئی پچھلی ریسوں پر اس کے پانچ ہزار اڑ گئے لیکن اس کو یقین تھا کہ وہ نئی ریسوں پر ضرور جیتے گی ”ہم اپنا لوس پورا کر لے گا۔“

اس کے پاس کوڑی کوڑی کا حساب موجود تھا۔ سو روپے رو زانہ مالتی تھی جو فوراً بنگ میں جمع کر دینے جاتے تھے۔ سو سے زیادہ نہیں مانا جاتا تھی اس کو اپنی صحت کا بہت خیال تھا۔

دو گھنٹے گزر گئے تو اس نے اپنی گھڑی دیکھی اور مقبول سے کہا ”اب تم جاؤ ہم کھانا کھائے گا اور سو جائے گا“ مقبول اٹھ کر جانے لگا تو اس نے کہا ”باتیں

کرنے آؤ تو صبح کے ٹائم آؤ شام کے ٹائم ہمارا نقصان ہوتی ہے۔“

مقبول نے ”اچھا“ کہا اور چل دیا

دوسرے روز صبح دس بجے کے قریب مقبول شائق کے پاس پہنچا اس کا خیال تھا کہ وہ اس کی آمد پسند نہیں کرے گی مگر اس نے کوئی ناگواری ظاہر نہ کی مقبول دیر تک اس کے پاس بیٹھا رہا اس دوران میں شائق کو صحیح طریقے پر ساڑھی پہننی سکھائی لڑکی ذہین تھی، جلدی سیکھ گئی۔

کپڑے اس کے پاس کافی تعداد میں اور اچھے تھے یہ سب کے سب اس نے مقبول کو دکھائے اس میں بچپنا تھا نہ بڑھاپا شباب بھی نہیں تھا وہ جیسے کچھ بنتے بنتے ایک دم رک گئی تھی، ایک ایسے مقام پر ٹھہر گئی تھی جس کے موسم کا تعین نہیں ہو سکتا وہ خوبصورت تھی۔ نہ بد صورت، عورت تھی نہ لڑکی، وہ پھول تھی نہ کلی، شاخ تھی نہ تنا اس کو دیکھ کر بعض اوقات مقبول کو بہت الجھن ہوتی تھی وہ اس میں وہ نقطہ دیکھنا چاہتا تھا جہاں اس نے غلط ملط ہونا شروع کیا تھا۔

شائق کے متعلق اور زیادہ جاننے کے لیے مقبول نے اس سے ہر دوسرے تیسرے روز ملنا شروع کر دیا۔ وہ اس کی کوئی خاطر مدارت نہیں کرتی تھی لیکن اب اس نے اس کو اپنے صاف ستھرے بستر پر بیٹھنے کی اجازت دے دی تھی ایک دن مقبول کو بہت تعجب ہوا جب شائق نے اس سے کہا ”تم کوئی لڑکی مانتا؟“

مقبول لینا ہوا تھا چونک کر اٹھا ”کیا کہا؟“

شائق نے کہا ”ہم پوچھتی تم کوئی لڑکی مانتا تم ہم الا کر دیتا“

مقبول نے اس سے دریافت کیا کہ یہ بیٹھے بیٹھے اسے کیا خیال آیا کیوں اس

نے یہ سوال کیا تو وہ خاموش ہو گئی مقبول نے اصرار کیا تو شائق نے بتایا کہ مقبول سے ایک بیکار عورت سمجھتا ہے اس کو حیرت ہے کہ مرد اس کے پاس کیوں آتے ہیں جبکہ وہ اتنی ٹھنڈی ہے مقبول اس سے صرف باتیں کرتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ وہ اسے کھلونا سمجھتا ہے۔ آج اس نے سوچا، مجھ جیسی ساری عورتیں تو نہیں۔ مقبول کو عورت کی ضرورت ہے۔ کیوں نہ وہ اسے ایک منکاوے۔

مقبول نے پہلی بار شائق کی آنکھوں میں آنسو دیکھے ایک دم وہ اٹھی اور چلانے لگی ”ہم کچھ بھی نہیں ہے۔۔۔ جاؤ چلے جاؤ۔۔۔۔۔ ہمارے پاس کیوں آتا ہے تم۔۔۔ جاؤ“

مقبول نے کچھ نہ کہا خاموشی سے اٹھا اور چلا گیا

متواتر ایک ہفتہ وہ پیرے ٹرین ڈبیری جاتا رہا مگر شائق دکھائی نہ رہا آخر ایک صبح اس نے اس کے ہوٹل کا رخ کیا۔ شائق نے دروازہ کھول دیا مگر کوئی بات نہ کی مقبول کرسی پر بیٹھ گیا۔۔۔۔۔ شائق کے ہونٹوں پر سرخی پرانے بھدے طریقے پر لگی تھی۔ بالوں کا حال بھی پرانا تھا۔ ساڑھی کی پہناوٹ تو اور زیادہ بدزیب تھی مقبول اس سے مخاطب ہوا ”مجھ سے ناراض ہو اتم؟“

شائق نے جواب نہ دیا اور پلنگ پر بیٹھ گئی مقبول نے تند لہجے میں پوچھا ”بھول گئیں جو میں نے سکھایا تھا؟“

شائق خاموش رہی مقبول نے غصے میں کہا ”جواب دو ورنہ یاد رکھو ماروں گا“

شائق نے صرف اتنا کہا ”مارو“

مقبول نے اٹھ کر ایک زور کا چاٹنا اس کے منہ پر جڑ دیا۔۔۔ شائق لہلہا اٹھی

اس کی حیرت زدہ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ مقبول نے جیب سے اپنا رو مال نکالا غصے میں اس کے ہونٹوں کی بھدی سرخی پوچھی۔ اس نے مزاحمت کی لیکن مقبول اپنا کام کرتا رہا لپ اسٹک اٹھا کر نئی سرخی لگائی کتھے سے اس کے بال سنوارے، پھر اس نے تھکمان لہجے میں کہا ”ساڑھی ٹھیک کرو اپنی۔“

شانتی انھی اور ساڑھی ٹھیک کرنے لگی مگر ایک دم اس نے پھوٹ پھوٹ کر روتا شروع کر دیا اور روتی روتی خود کو بستر پر گرا دیا مقبول جموڑی دیر خاموش رہا جب شانتی کے رونے کی شدت کچھ کم ہوئی تو اس کے پاس جا کر کہا ”شانتی اٹھو۔۔۔ میں جا رہا ہوں۔“

شانتی نے تڑپ کر کروٹ بدلی اور چلائی ”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔ تم نہیں جاسکتے“ اور دونوں بازو پھیلا کر دروازے کے درمیان کھڑی ہو گئی ”تم گیا تو مار ڈالوں گی۔“

وہ بانپ رہی تھی اس کا سینہ جس کے متعلق مقبول نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا جیسے گہری نیند سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مقبول کی حیرت زدہ آنکھوں کے سامنے شانتی نے تلے اوپر بڑی سرعت سے کئی رنگ بدلے۔ اس کی نمناک آنکھیں چمک رہی تھیں سرخی لگے باریک ہونٹ ہولے ہولے لرز رہے تھے ایک دم آگے بڑھ کر مقبول نے اس کو اپنے سینے کے ساتھ بچھتی لیا۔

دونوں پلنگ پر بیٹھے تو شانتی نے اپنا سر نیوڑھا کر مقبول کی گود میں ڈال دیا۔ اس کے آنسو بند ہونے ہی میں نہ آتے تھے مقبول نے اس کو پیار کیا رونا بند کرنے کے لیے کہا تو وہ آنسوؤں میں انک انک کر بولی ”ادھر سر ینگر میں۔۔۔ ایک

آدمی نے۔۔۔۔۔ ہم کو مار دیا تھا۔۔۔۔۔ ادھر ایک آدمی نے۔۔۔۔۔ ہم کو زندہ
کر دیا۔“

دو گھنٹے کے بعد جب مقبول جانے لگا تو اس نے جیب سے پچاس روپے نکال
کر شانتی کے ہانگ پر رکھے اور مسکرا کر کہا ”یہ لو اپنے ففٹی روپیہ“
شانتی نے بڑے غصے اور بڑی نفرت سے نوٹ اٹھائے اور پھینک دیئے پھر
اس نے تیزی سے اپنی ڈرائیونگ ٹیبل کا ایک دراز کھولا اور مقبول سے کہا ”ادھر
دیکھو۔۔۔ دیکھو یہ کیا ہے؟“

مقبول نے دیکھا دراز میں سو سو کے کئی نوٹوں کے نکلے پڑے تھے مٹی بھر
کے شانتی نے اٹھائے اور ہوا میں اچھالے ”ہم اب یہ نہیں مانگتا“
مقبول مسکرایا ہولے سے اس نے شانتی کے گال پر چھوٹی سی چپت لگائی اور
پوچھا ”اب تم کیا مانگتا ہے؟“

شانتی نے جواب دیا ”تم کو“ یہ کہہ کر وہ مقبول کے ساتھ چپٹ گئی اور رونا
شروع کر دیا۔

مقبول نے اس کے بال سنوارتے ہوئے بڑے پیار سے کہا ”روؤ
نہیں۔۔۔۔۔ تم نے جو مانگا ہے وہ تمہیں مل گیا ہے۔“

☆☆☆☆☆

شغل

یہ پچھلے دنوں کی بات ہے جب ہم برسات میں سڑکیں صاف کر کے اپنا پیٹ پال رہے تھے۔

ہم میں سے کچھ کسان تھے اور کچھ مزدوری پیشہ، چونکہ پہاڑی دیہاتوں میں روپے کا منہ دیکھنا بہت کم نصیب ہوتا ہے اس لیے ہم سب خوشی خوشی چھ آنے روز پر سارا دن پتھر ہٹاتے رہتے تھے جو بارشوں کے زور سے ساتھ والی پہاڑیوں سے لڑھک کر سڑک پر آ کر گر گرتے تھے۔ پتھروں کو سڑک پر سے ہٹانا تو خیر ایک معمولی بات تھی ہم تو اس اجرت پر ان پہاڑیوں کو ڈھانے پر بھی تیار تھے جو ہمارے گرد و پیش سیاہ اور ڈراؤنے دیوں کی طرح اکڑی کھڑی تھیں دراصل ہمارے بازو سخت سے سخت مشقت کے غاوی تھے اس لیے یہ کام ہمارے لیے بالکل معمولی تھا البتہ جب کبھی ہمیں سڑک کو چوڑا کرنے کے لیے پتھر کاٹنا ہوتے تو رات کو ہمیں بہت تنکان محسوس ہوتی تھی پٹھے اکڑ جاتے اور صبح کو بیدار ہوتے وقت ایسا محسوس ہوتا کہ وہ تمام پتھر جنہیں ہم گزشتہ روز کاٹتے اور پھوڑتے رہے ہیں ہمارے جسموں پر بوجھ ڈالے ہوئے ہیں مگر ایسا کبھی کبھی ہوتا تھا۔

ہمارا کام ہر روز صبح سات بجے شروع ہوتا تھا۔ جب طلوع ہوتے ہوئے سورج کی طمانی کرنیں چیر کے دراز قد درختوں سے چھن چھن کر ہمارے پاس والے نالے کے خشم آلود پانی سے اٹکیلیاں کر رہی ہوتیں اور اس پاس کی جھاڑیوں میں ننھے ننھے پرندے اپنے گلے پھیلا پھیلا کر بچ رہے ہوتے یوں کہیے کہ

ہم قدرت کو اپنے خواب سے بیدار ہوتا دیکھتے تھے صبح کی ہلکی پھلکی ہوا میں شبنم آلود سبز جھاڑیوں کی دلوں سے سراپا ہٹ، نالے میں سنگریزوں سے کھیلے ہوئے کف آلود پانی کا شور اور برسات کے پانی میں بھیگی ہوئی مٹی کی بھینی بھینی خوشبو، چند ایسی چیزیں تھیں جو ہمارے سنگین سینوں میں ایک ایسی لطافت پیدا کر دیتی تھیں جو زندگی کے اس دوزخ میں بھی بہشت کے خواب دکھانے لگتی۔

ہمیں ہر روز بارہ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا۔ یعنی سارا دن ہم سڑک کی موریوں اور پتھروں کو صاف کرتے رہتے تھے یہ کام دلچسپ نہ تھا مگر ہم نے اس کی ناخوشگوار ایک آہنگی کو دور کرنے کے لیے ایک طریقہ ایجاد کر لیا تھا جب ہم سب اس پہاڑی کے نیچے جمع شدہ بلے کو اپنے بلیوں سے ہٹا رہے ہوتے جس کے سنگریزے ہر وقت سڑک پر گرتے رہتے تھے تو ہم ایک سر میں کوئی پہاڑی گیت شروع کر دیتے بلے کے پتھروں سے ٹکرا کر ہمارے بلیوں کی جینے کا اس گیت کی تال کا کام دیتی تھی یہ گیت اس افسردگی کو دور کر دیتا جو یہ غیر دلچسپ کام کرنے سے ہمارے دلوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ جب تک اس کے سر ہماری چوڑی چھاتیوں میں سے نکلتے رہتے۔ ہم محسوس تک نہ کرتے کہ اس دوران میں ہم نے بلے کے ایک بہت بڑے ڈھیر کو صاف کر لیا ہے۔

موٹر لاریوں کی آمد و رفت سے بھی ہمارا دل بہا رہتا تھا جو رنگ برنگ مسافروں کو کشمیر سے واپس یا کشمیر کی طرف لے جاتی رہتی تھیں جب کبھی کوئی لاری ہمارے پاس سے گزرتی تو ہم کچھ عرصہ کے لیے اپنی جھکی ہوئی کمریں سیدھی کر کے سڑک کے ایک طرف کھڑے ہو جاتے اور زمین پر اپنے نیپلے ٹیک کر اس کو سامنے

والے موڑ کے عقب میں گم ہوتے دیکھتے رہتے۔ ان لاریوں کو اتنی دور تک دیکھتے رہنے کا مقصد یہ تھا کہ ہم چھوڑا سٹالیں مگر بعض اوقات ان لاریوں کی شاندار اسباب سے لدی ہوئی چھتیں اور ان کی کھڑکیوں سے مافروں کے لہراتے ہوئے ریشمی کپڑوں کی جھلک ہمارے دلوں میں ایک ناقابل بیان تلخی پیدا کر دیتی تھی اور ہم اپنے آپ کو ان پتھروں کی طرح فضول اور ناکارہ تصور کرنے لگتے تھے جن کو ہمارے ہتھکڑیوں کے دھکے اور اڈھر پٹکتے رہتے تھے ان مسافروں کے طرح طرح کے لباس دیکھ کر جن پر یقیناً بہت سے روپے صرف آئے ہوں گے ہم غیر ارادی طور پر اپنے کپڑوں کی طرف دیکھنا شروع کر دیتے تھے۔

ہم میں سے اکثر کا لباس پنو کے تنگ پانچامے، گاڑھے کی قمیص اور لدھیانے کی صدری پر مشتمل تھا سب کے پانچامے یا تو گھٹنوں پر سے گھس گھس کر اتنے باریک ہو گئے تھے کہ ان میں سے جسم کے بالوں کی پوری نمائش ہوتی تھی یا بالکل چھپے ہوئے تھے۔

قمیصوں اور صدریوں کی بھی یہی حالت تھی ان پر جگہ جگہ مختلف رنگ کے پیوند لگے ہوئے تھے قریب قریب ہم سب کی قمیصوں کے بٹن غائب تھے، اس لیے سینے عام طور پر کھلے رہتے تھے اور کام کرتے وقت ان پر پسینے کی بوندیں صاف نظر آ سکتی تھیں۔

بارہ بجے کے قریب ہم کام چھوڑ کر کھانا کھانے کے لیے سڑک کے نیچے اتر کر پیڑ کے سائے تلے بیٹھ جاتے تھے یہ کھانا ہم صبح کپڑے میں باندھ کر اپنے ساتھ لاتے تھے تین ”ڈھوڑے“ (کلی کی موٹی روٹیاں) اور عام طور پر سرسوں کا ساگ

ہوتا تھا جس کو ہم اپنے بھوکے پیٹ میں ڈالتے تھے کھانے کے بعد ہم پانی عموماً
نالے سے پیا کرتے اور جس روز بارش کی زیادتی کے باعث اس کا پانی زیادہ گدا
ہو جائے تو ہم دوسرے رک کے اس پار چلے جایا کرتے تھے جہاں صاف پانی کا ایک
چشمہ پھوٹتا ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر ہم فوراً کام شروع کر دیا کرتے تھے گو ہمارا جی چاہتا
تھا کہ نرم نرم گھاس پر لیٹ کر چھوڑی دیر ستالیں اور پھر کام شروع کریں مگر یہ کیونکر
ہو سکتا تھا جب کہ ہمیں ہر وقت اس بات کا خیال رہتا تھا کہ پورا کام کیے بغیر
اجرت نہ ملے گی۔

ہمارا سطح نظر کام کرنا اور اس حیلے سے اپنا پیٹ پالنا تھا اور چونکہ ہمیں معلوم تھا
کہ ہم میں سے کسی نے اگر اپنے کام میں ذرا سی ست رفتاری یا بے دلی کا اظہار کیا
تو تماش کی گڈی سے ناکارہ جو کر کی طرح باہر نکال کر پھینک دیا جائے گا۔ اس لیے
ہم دل لگا کر کام کیا کرتے تھے تاکہ ہمارے افسروں کو شکایت کا موقع نہ ملے اس
کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہمارے افسر ہم پر بہت خوش تھے یہ کیونکر ہو سکتا ہے وہ بڑے
آدمی تھہرے اس لیے ان کا جائز و ناجائز طور پر خفا ہونا بھی درست ہوتا ہے کبھی کبھی
یہ لوگ ایسے ہی ہمارے کام کا معائنہ کرتے وقت اپنی بے اطمینانی کا اظہار کرتے
ہوئے ہم پر برس پڑتے تھے لیکن ہم جو ان کی بڑائی کو بخوبی سمجھتے تھے مہاراج،
مہاراج کہہ کر ان کا غصہ سرد کر دیا کرتے تھے ہم جانتے تھے کہ ان کا غصہ بالکل
بے جا ہے لیکن یہ احساس ہمارے دلوں میں نفرت کے جذبات پیدا نہیں کرتا تھا
شاید اس لیے کہ کورنشوں نے ہم کو بالکل مردہ بنا رکھا ہے یا پھر اس کی وجہ یہ بھی ہو

سکتی ہے کہ ہم کو یہ خوف دامنگیر رہتا تھا کہ اگر ہم اپنے موجودہ کام سے ہٹا دینے گئے تو ہماری روزی بند ہو جائے گی۔

ہم اپنے کام سے مطمئن تھے اور یہی وجہ ہے کہ ہم تھوڑی مزدوری اور زیادہ کام کے مسئلے پر بہت کم غور کیا کرتے تھے اس کی ضرورت بھی کیا ہے اس لیے کہ یہ کام پڑھ لکھے آدمیوں کا ہے اور ہم بالکل ان پڑھ اور جاہل تھے دراصل بات یہ ہے کہ ہماری دنیا بالکل الگ تھلگ تھی جس کی سرحدیں پتھر توڑنے یا ان کو ہٹانے، بارہ بجے روٹی کھانے اور پھر کام کرنے اور اس کے بعد اپنے اپنے ڈیروں میں سو جانے تک ختم ہو جاتی تھیں۔ ہمیں ان حد و دے کے باہر کسی شے سے کوئی سروکار نہ تھا۔ دوسرے الفاظ میں اپنا اور اپنے متعلقین کا پیٹ پالنے کے دھندے میں ہم کچھ ایسی بری طرح بھنس کر رہ گئے تھے کہ اس کے باہر نکل کر ہم کسی اور شے کی خواہش کرنا ہی بھول گئے تھے۔

ہمارے کام پر سڑکوں کے محکمے کی طرف سے ایک نگران مقرر تھا جو دن کا بیشتر حصہ سڑک کے ایک طرف چارپائی بچھا کر بیٹھے رہنے میں گزار دیتا یہ ذات کا پنڈت تھا اونچے طبقے کا امتیازی نشان سیندور کے تلک کی صورت میں ہر وقت اس کی سفید پیشانی پر چمکتا رہتا تھا ہم اپنے نگران کو احترام اور عزت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اول اس لیے کہ وہ بہمن تھا اور دوسرے اس لیے کہ ہم اس کے ماتحت تھے چنانچہ ادھر ادھر کے دوسرے کاموں کے علاوہ ہم باری باری دن میں کئی بار اس کے پینے کے لیے حقہ تازہ کیا کرتے تھے اور آگ بنا کر اس کی چلیں بھرا کرتے تھے۔

پنڈت کا کام صرف یہ تھا کہ صبح چارپائی پر اپنے گیسوے رنگ کی کلف لگی
گپڑی اور ریشمی کوٹ اتار کر اپنے گنجدے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ہماری حاضری
لگائے اور پھر ایک بڑے سے رجسٹر میں کچھ درج کرنے کے بعد ادھر ادھر بٹلتا
رہے یا حقہ پیتا رہے۔ وہ اپنے کام میں بہت کم دلچسپی لیتا تھا البتہ جب کبھی
معائنے کے لیے کسی افسر کی موٹر ادھر سے گزر رہی ہوتی تھی تو وہ اپنی چارپائی اٹھوا کر
ہمارے پاس کھڑا ہو جایا کرتا تھا اس کی اس چالاکی پر ہم دل ہی دل میں بہت ہنسا
کرتے تھے۔

ایک روز جبکہ صبح سے بلکی بلکی پھوار پڑ رہی تھی اور ہم بارہ بجے کھانا کھانے سے
فارغ ہو کر حسب معمول اپنے کام میں مشغول تھے موٹر کے ہارن نے ہمیں چونکا
دیا لاریوں کی بہ نسبت ہم موٹروں کے دیکھنے کے بہت شائق تھے اس لیے کہ ان
میں ہماری بھوکی نظروں کے دیکھنے کے لیے عجیب و غریب چیزیں نظر آتی تھیں ہم
کمریں سیدھی کر کے کھڑے ہو گئے اتنے میں موٹر کے عتب سے سبز رنگ کی ایک
چھوٹی موٹر نمودار ہوئی جب یہ ہمارے قریب پہنچی تو ہم نے دیکھا کہ اس کی باڈی
بارش کے ننھے ننھے قطروں کے نیچے چمک رہی ہے بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھی
شاید اس لیے کہ پچھلی سیٹ پر جو وہ صاحب بیٹھے ہوئے تھے ان میں ایک اپنی
رانوں پر گراموں فون رکھے بجا رہے تھے جب یہ موٹر ہمارے مقابل آئی تو ریکارڈ
کی آواز سڑک کی ساتھ والی پیازوں کے پتھروں سے ٹکرا کر فضا میں گونجی کوئی گاربا
تھا:

نہ میں کسی کا نہ کوئی میرا

چھایا چاروں اور اندھیرا
اب کچھ سوچت ناہیں
موہے، اب کچھ۔۔۔۔۔

آواز میں بے حد درد تھا۔ ایک لمبے کے لیے ایسا معلوم ہوا کہ ہم شاید بحر
ظلمات میں ڈوب گئے ہیں جب موٹر اپنی نیم وا کھڑکیوں سے اس گیت کے درد
ناک سر بکھیرتی ہوئی ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی تو ہم سب نے ایک آہ بھر کر
اپنا کام شروع کر دیا۔

شام کے قریب جب سورج کی سرخ اور گرم نکلیا پھلے ہوئے تانبے کا رنگ
اختیار کر کے ایک سیاہ پیٹری کے پیچھے چھپ رہی تھی اور اس کی عنابی کرنیں دراز
قد درختوں کی چونٹیوں سے کھیل رہی تھیں سبز رنگ کی وہی موٹر اس طرف سے
واپس آتی دکھائی دی جدھر وہ دو پہر کو گئی تھی جب ہم نے اس کے ہارن کی آواز سنی
تو کام چھوڑ کر اس کو دیکھنے لگے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی وہ ہمارے آگے سے گزر گئی
اور پھر دفعتاً ہم سے آدھی جریب کے فاصلے پر کھڑی ہو گئی وہ باجا جو اس میں بچ رہا
تھا خاموش ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد پچھلی سیٹ سے ایک نوجوان دروازہ کھول کر باہر نکلا اور
اپنی پتلون کو کمر پر سے درست کرتا ہوا ہمارے پاس سے گزرا اور آہستہ آہستہ اس
پل کی طرف روانہ ہو گیا جو سامنے والے پر بندھا ہوا تھا یہ خیال کر کے کہ وہ نالے
کے پانی کا نظارہ کرنے کے لیے گیا ہے جیسا کہ نام طور پر ادھر سے گزرنے والے
مسافر کے اگرتے تھے ہم اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

ابھی ہمیں اپنا کام شروع کیے پانچ منٹ سے زیادہ عرصہ گزرا ہو گا کہ پل کی طرف سے تالی کی آواز بلند ہوئی ہم نے مڑ کر دیکھا پتلون پوش نوجوان پل پر سے سڑک کے ساتھ پتھروں سے چنی ہوئی دیو کے پاس کھڑا غالباً موٹر میں اپنے ساتھیوں کو متوجہ کر رہا تھا سنگین منڈیر پر اس نوجوان سے کچھ دور ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔

ہم میں سے ایک نے اپنے بیٹے کو بڑے زور سے موری کی گیلی مٹی میں گاڑتے ہوئے کہا ”یہ رام دانی ہے“
کالو نے جو اس کے پاس کھڑا تھا دریافت کیا ”رام دانی؟“

”سنتو چمار کی لڑکی اور کون!“ اس کے لہجے میں بیٹے کے لوہے ایسی سختی تھی۔
ہم باقی چار حیران تھے کہ اس گفتگو کا مطلب کیا ہے۔ اگر وہ لڑکی جو منڈیر پر بیٹھی ہے سنتو چمار کی لڑکی ہے تو کون سی اہم بات ہے کہ ہمارا ساتھی اس قدر تیز بول رہا ہے ہم غور کر رہے تھے کہ فضل نے جو ہم سب سے عمر میں بڑا تھا اور نماز روزے کا بہت پابند تھا اپنی ڈاڑھی کو کھجاتے ہوئے نہایت ہی متفکرانہ لہجے میں کہا:

”دنیا میں ایک اندھیر مچا ہے۔۔۔۔۔ خدا معلوم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟“
یہ سن کر ہم باقی تین اصل معاملے سے آگاہ ہو کر سب کچھ سمجھ گئے اور اس احساس نے ہمارے دلوں پر غم اور غصے کی ایک عجیب و غریب کیفیت طاری کر دی۔

تالی کی آواز سن کر موٹر کی پچھلی نشست سے پتلون پوش کے ساتھی نے اپنا سر

باہر نکالا اور یہ دیکھ کر کہ اس کا دوست اسے بلا رہا ہے دروازہ کھول کر باہر نکلا اور ہمارے قریب سے گزرتا ہوا پل کی جانب روانہ ہو گیا۔ ہم یہ قیوف بکریوں کی طرح اسے اپنے دوست کے پاس جاتا دیکھتے رہے۔

جب پتلون پوش نوجوان کا دوست اس کے پاس پہنچ گیا تو وہ دونوں لڑکی کی طرف بڑھے اور اس سے باتیں کرنا شروع کر دیں یہ دیکھ کر کالو پیچ و تاب کھا کر رہ گیا اور خشم آلود لہجے میں بولا
”بد معاش۔۔۔۔۔“

فضل نے سر دھڑکھڑائی اور مغموم لہجے میں کہنے لگا ”جب سے یہ سڑک بنی ہے ایسے بابوؤں کی آمد و رفت زیادہ ہو گئی ہے یہاں کے تمام علاقوں میں گندگی پھیل گئی ہے لوگ کہتے ہیں کہ یہ سڑک بننے سے بہت آرام ہو گیا ہے ہوگا، مگر اس قسم کے بے بشری کے نظارے پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آئے تھے خدا بچائے۔“

اس دوران میں پتلون پوش کے ساتھی نے لڑکی کو بازو سے پکڑ لیا اور خائبانہ اس کو اٹھ کر چلنے کے لیے کہا مگر وہ اپنی جگہ پر بیٹھی رہی یہ دیکھ کر کالو سے نہ رہا گیا اور اس نے رام پر شاد سے کہا ”آئیے لوگ تو اب دست درازمی کر رہے ہیں۔“

کالو یہ کہہ کر اکیلا ہی اس جانب بڑھے کو تھا کہ ہم نے اسے روک دیا اور یہ مشورہ دیا کہ تمام معاملہ پنڈت کے گوش گزار کر دیا جائے جو چار پانی پر سو رہا ہے اور پھر جو وہ کہے اس پر عمل کیا جائے اس تجویز کو معقول خیال کر کے ہم سب پنڈت کے پاس گئے اور اسے جگا کر سارا قصہ سنا دیا اس نے ہماری گفتگو کو بڑی بے پروائی سے سنا جیسے کوئی بات ہی نہیں اور ان دونوں جوانوں کی طرف دیکھ کر جواب

رام دئی کو خدا معلوم کس طریقے سے منا کر اپنے ساتھ لارہے تھے کہا ”جاؤ تم اپنا کام کرو میں ان سے خود دریافت کر لوں گا“

جب پنڈت رام دئی اور دو نو جوان ہمارے پاس سے گزرے تو ہم نے دیکھا کہ نو جوانوں کے چہروں پر ایک حیوانی جھلک مائج رہی ہے اور پنڈت بڑے ادب سے ان کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے رام دئی کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔

موٹر کے پاس پہنچ کر پنڈت نے آگے بڑھ کر اس کا دروازہ کھولا پہلے پتلون پوش پھر رام دئی اور اس کے بعد دوسرا نو جوان موٹر میں داخل ہو گئے ہمارے دیکھتے دیکھتے موٹر چلی اور نظروں سے اوجھل ہو گئی اور ہم آنکھیں جھپکتے رہ گئے۔

”شیطان! مردود!“ کالو نے بڑے اضطراب سے یہ دو لفظ ادا کیے۔

اتنے میں پنڈت آگیا اور ہم کو مضطرب دیکھ کر مصنوعی آواز میں کہنے لگا ”میں نے ان سے دریافت کیا ہے کوئی بات نہیں، وہ لڑکی کو ذرا موٹر کی سیر کرانا چاہتے تھے انسپکٹر صاحب کے مہمان ہیں اور ڈاک بنگلے میں ٹھہرے ہوئے ہیں تموڑی دور لے جا کر اسے چھوڑ دیں گے۔۔۔۔۔ امیر آدمی ہیں ان کے شغل اسی قسم کے ہوتے ہیں۔“ یہ کہہ کر پنڈت چلا گیا۔

ہم دیر تک خدا معلوم کن گہرائیوں میں غرق رہے کہ دفعتاً فضل کی آواز نے ہمیں چونکا دیا وہ مرتبہ زور سے جھوک کر اس نے اپنے ہاتھوں کو گیلیا کے اور نیپے کو سنگریزوں کے ڈھیر میں گاڑتے ہوئے کہا ”اگر امیر آدمیوں کے یہی شغل ہیں تو ہم غریبوں کی ہوسنیٹیوں کا اللہ بلی ہے۔“

☆☆☆☆☆☆

شکاری عورتیں

میں آج آپ کو چند شکاری عورتوں کے قصے سنائوں گا میرا خیال ہے کہ آپ کو بھی کبھی ان سے واسطہ پڑا ہوگا۔

میں بمبئی میں تھا فلمستان سے عام طور پر برقی ٹرین سے چھ بجے گھر پہنچ جایا کرتا تھا لیکن اس روز مجھے دیر ہوگئی اس لیے کہ ”شکاری“ کی کہانی پر بحث مباحثہ ہوتا رہا۔

میں جب بمبئی سنٹرل کے اسٹیشن پر اترا، تو میں نے ایک لڑکی کو دیکھا جو تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ سے باہر نکلی اس کا رنگ گہرا سا نوا تھا تاک نقشہ ٹھیک تھا جوان تھی، اس کی چال بڑی انوکھی سی تھی ایسا لگتا تھا کہ وہ فلم کا منظر نامہ لکھ رہی ہے۔

میں اسٹیشن سے باہر آیا اور پل پر وکٹوریا گاڑی کا انتظار کرنے لگا میں تیز چلنے کا عادی ہوں اس لیے میں دوسرے مسافروں سے بہت پہلے باہر نکل آیا تھا۔

وکٹوریا آئی اور میں اس میں بیٹھ گیا میں نے کوچوان سے کہا کہ آہستہ آہستہ چلے اس لیے کہ فلمستان میں کہانی پر بحث کرتے کرتے میری طبیعت مکدر ہوگئی تھی موسم خوشگوار تھا وکٹوریا والا آہستہ آہستہ پل پر سے اترنے لگا۔

جب ہم سیدھی سڑک پر پہنچے تو ایک آدمی سر پر ٹاٹ سے ڈھکا ہوا مڑکا اٹھائے صدا لگ ا رہا تھا ”قلنی۔۔۔ قلنی!“

جانے کیوں میں نے کوچوان سے وکٹوریا روک لینے کے لیے کہا، اور اس قلنی بیچنے والے سے کہا کہ ایک قلنی دو۔۔۔ میں اصل میں اپنی طبیعت کا مکدر کسی نہ

کسی طرح دور کرنا چاہتا تھا۔

اس نے مجھے ایک دو نے میں قلفی دی میں کھانے ہی والا تھا کد چانک کوئی دھم سے وکٹوریا میں آن گما کافی اندھیرا تھا میں نے دیکھا تو وہی گہرے رنگ کی سانولی لڑکی تھی۔

میں بہت گھبرایا۔۔۔ وہ مسکرا رہی تھی وہ نے میں میری قلفی پھلانا شروع ہو گئی

اس نے قلفی والے سے بڑے بے تکلف انداز میں کہا ”ایک مجھے بھی دو“

اس نے دے دی

گہرے سانولے رنگ کی لڑکی نے اسے ایک منٹ میں چٹ کر دیا اور وکٹوریا والے سے کہا ”چلو“

میں نے اس سے پوچھا ”کہاں؟“

”جہاں بھی تم چاہتے ہو“

”مجھے تو اپنے گھر جانا ہے“

”تو گھر ہی چلو“

”تم ہو کون؟“

”کتے بھولے بنتے ہو“

میں سمجھ گیا کہ وہ کس قماش کی لڑکی ہے چنانچہ میں نے اس سے کہا ”گھر جانا

ٹھیک نہیں۔۔ اور یہ وکٹوریا بھی غلط ہے۔۔ کوئی ٹیکسی لے لیتے ہیں“

وہ میرے اس مشورے سے بہت خوش ہوئی۔۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا

کہ اس سے نجات کیسے حاصل کروں۔۔۔۔۔ اسے دھکا دے کر باہر نکالتا تو اودھم مچ جاتا پھر میں نے یہ سوچا کہ عورت ذات ہے اس سے فائدہ اٹھا کر کہیں وہ یہ واویلا نہ مچا دے کہ میں نے اس سے ناشائستہ مذاق کیا ہے۔

وکتوریا چلتی رہی اور میں سوچتا رہا کہ یہ مصیبت کیسے ٹل سکتی ہے آخر ہم بے بی ہسپتال کے پاس پہنچ گئے وہاں چیکیوں کا اڈہ تھا میں نے وکتوریا والے کو اس کا کرایہ ادا کیا اور ایک ٹیکسی لے لی ہم دونوں اس میں بیٹھ گئے ڈرائیور نے پوچھا ”کدھر جانا ہے صاحب!“

میں اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا تھوڑی دیر سوچنے کے بعد میں نے اس سے زیر لب کہا ”مجھے کہیں بھی نہیں جانا ہے۔۔۔۔۔ یہ لو دس روپے۔۔۔ اس لڑکی کو تم جہاں بھی لے جانا چاہو لے جاؤ“ وہ بہت خوش ہوا۔

دوسرے موڑ پر اس نے گاڑی ٹھہرائی اور مجھ سے کہا ”صاحب آپ کو سگریٹ لینے تھے۔۔۔ اس ایرانی کے ہوٹل سے سٹے مل جائیں گے“ میں فوراً دروازہ کھول کر باہر نکلا گھرے رنگ کی لڑکی نے کہا ”فونیکٹ لانا“ ڈرائیور اس سے مخاطب ہوا ”تین لے آئیں گے“ اور اس نے موٹر اسٹارٹ کی اور یہ جاہ جا

☆☆☆☆

بمبئی ہی کا واقعہ ہے میں اپنے فلیٹ میں اکیلا بیٹھا تھا میری بیوی شاپنگ کے لیے گئی ہوئی تھی کہ ایک گھاشن جو بڑے تیکھے نقوش والی تھی بے دھڑک اندر چلی

آئی میں نے سوچا شاید نوکری کی تلاش میں آئی ہے مگر وہ آتے ہی کرسی پر بیٹھ گئی۔۔۔۔۔ میرے سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ نکالا اور اسے ساگا کر مسکرانے لگی۔

میں نے اس سے پوچھا ”کون ہو تم؟“

”تم پہچانتے نہیں“

”میں نے آج پہلی دفعہ تمہیں دیکھا ہے“

”سالا جھوٹ مت بولا۔۔۔۔۔ تو روز دیکھتا ہے“

میں بڑی الجھن میں گرفتار ہو گیا۔۔۔۔۔ لیکن جموڑی دیر کے بعد میرا نوکر فضل دین آ گیا۔۔۔۔۔ اس نے اس تیکھے نکتوں والی گھانٹن کو اپنی تحویل میں لے لیا۔

☆☆☆☆☆

یہ واقعہ لاہور کا ہے

میں اور میرا ایک دوست ریڈیو اسٹیشن جا رہے تھے جب ہمارا ٹانگہ اسمبلی ہال کے پاس پہنچا تو ایک ٹانگہ ہمارے عقب سے نکل کر آگے آ گیا اس میں ایک برقع پوش عورت تھی جس کے نقاب نیم وا تھی۔

میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں عجیب قسم کی شرارت مچنے لگی میں نے اپنے دوست سے جو کچھ چلی نشست پر بیٹھا تھا کہا ”یہ عورت بد چلن معلوم ہوتی ہے“

”تم ایسے فیصلے ایک دہمت دیا کرو“

”بہت اچھا جناب! میں آئندہ احتیاط سے کام لوں گا“
 برقع پوش عورت کا تانگہ ہمارے تانگے کے آگے آگے تھا وہ تکتلی لگائے ہمیں
 دیکھ رہی تھی میں بڑا بزدل ہوں، لیکن اس وقت مجھے شرارت سوچھی اور میں نے
 اسے ہاتھ کے اشارے سے آداب عرض کر دیا۔
 اس کے آدھ دھکے چہرے پر مجھے کوئی رد عمل نظر نہ آیا جس سے مجھے بڑی
 مایوسی ہوئی

میرا دوست کہنے لگا اس کو میری اس ناکامی سے بڑی مسرت ہوئی لیکن جب
 ہمارا تانگہ شملہ پہاڑی کے پاس پہنچ رہا تھا تو برقع پوش عورت اپنا تانگہ ٹھہرایا اور
 (میں زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا) وہ نیم اٹھی ہوئی نقاب کے اندر مسکراتی ہوئی
 آئی اور ہمارے تانگے میں بیٹھ گئی۔۔۔۔۔ میرے دوست کے ساتھ
 میری سمجھ میں نہ آیا کیا کیا جائے میں نے اس برقع پوش عورت سے کوئی بات
 نہ کی، اور تانگے والے سے کہا کہ وہ ریڈیو اسٹیشن کا رخ کرے۔

میں اسے اندر لے گیا۔۔۔۔۔ ڈائریکٹر صاحب سے میرے دوستانہ مراسم
 تھے میں نے ان سے کہا ”یہ خاتون ہمیں رستے میں پڑی ہوئی مل گئی آپ کے
 پاس لے آیا ہوں، اور درخواست کرتا ہوں کہ انہیں یہاں کوئی کام دلوا دیجئے“
 انہوں نے اس کی آواز کا امتحان کرایا جو کافی اطمینان بخش تھا جب وہ آڈیشن
 دے کر آئی تو اس نے برقع اتار رہا تھا میں نے اسے غور سے دیکھا اس کی عمر پچیس
 کے قریب ہوگی رنگ گورا آنکھیں بڑی بڑی لیکن اس کا جسم ایسا معلوم ہوتا تھا،
 جیسے شکر قندی کی طرح بھوبل میں ڈال کر باہر نکالا گیا ہے۔

ہم باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں چڑا سی آیا اس نے کہا کہ باہر ایک تانگہ والا کھڑا ہے، وہ کرایہ مانگتا ہے میں نے سوچا شاید زیادہ عرصہ گزرنے پر وہ تنگ آگیا ہے، چنانچہ میں باہر نکلا میں نے اپنے تانگے والے سے پوچھا ”بھئی کیا بات ہے ہم کہیں بھاگ تو نہیں گئے“

وہ بڑا حیران ہوا ”کیا بات ہے سرکار!“

”تم نے کہا بیجا ہے کہ میرا کرایہ ادا کرو“

”میں نے جناب کسی سے کچھ بھی نہیں کہا“

اس کے تانگے کے ساتھ ہی ایک دوسرا تانگہ کھڑا تھا اس کا کوچوان جو کھڑے کو گھاس کھلا رہا تھا، میرے پاس آیا اور کہا ”وہ عورت جو آپ کے ساتھ گئی تھی، کہاں ہے؟“

”اندر ہے۔۔۔۔۔ کیوں؟“

”جی اس نے دو گھنٹے مجھے خراب کیا ہے۔۔۔۔۔ کبھی ادھر جاتی تھی، کبھی ادھر۔۔۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اسے کہاں جانا ہے“

”اب تم کیا چاہتے ہو؟“

”جی میں اپنا کرایہ چاہتا ہوں“

”میں اس سے لے کر آتا ہوں“

”میں اندر گیا۔۔۔ اس برقع پوش عورت سے جو اپنا برقع اتار چکی تھی کہا“

تمہارا تانگے والا کرایہ مانگتا ہے

وہ مسکرائی ”میں دے دوں گی“

میں نے اس کا پرس جو صوفے پر پڑا تھا اٹھایا اس کو کھولا۔۔۔ مگر اس میں ایک پیسہ بھی نہیں تھا بس کے چند ٹکٹے تھے اور وہ بالوں کی بنیس۔۔۔ اور ایک واپیات قسم کی لپ اسٹک۔

میں نے وہاں ڈائریکٹر کے دفتر میں کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا ان سے رخصت طلب کی باہر آ کر اس کے تانگے والے کو دو گھنٹوں کا کرایہ ادا کیا، اور اس عورت کو اپنے دوست کی موجودگی میں کہا ”تمہیں اتنا تو خیال ہونا چاہیے کہ تم نے تانگہ لے لیا ہے اور تمہارے پاس ایک کوڑی بھی نہیں۔“

وہ کھسیانی ہو گئی ”میں۔۔۔ میں۔۔۔ آپ بڑے اچھے آدمی ہیں“
 ”میں بہت برا ہوں۔۔۔ تم بڑی اچھی ہو۔۔۔ کل سے ریڈیو اسٹیشن آنا شروع کر دو۔۔۔ تمہاری آمدن کی صورت پیدا ہو جائے گی یہ کہو اس جو تم نے شروع کر رکھی ہے اسے ترک کر دو۔“

میں نے اسے مزنگ کے پاس چھوڑ دیا۔۔۔ میرا دوست واپس چلا گیا۔۔۔ اتفاقاً مجھے ایک کام سے وہاں جانا پڑا۔
 دیکھا کہ میرا دوست اور وہ عورت اکٹھے جارہے تھے۔

☆☆☆☆

یہ بھی لاہوری کا واقعہ ہے

چند روز ہوئے میں نے اپنے دوست کو مجبور کیا کہ وہ مجھے دس روپے دے اس دن بنگ بند تھے اس نے معذوری کا اظہار کیا لیکن جب میں نے اس پر زور دیا کہ وہ کسی نہ کسی طرح یہ دس روپے پیدا کرے اس لیے کہ مجھے اپنی ایک ملت

پوری کرتا ہے، جس سے تم بخوبی واقف ہو، تو اس نے کہا ”اچھا“ میرا ایک دوست ہے وہ غالباً اس وقت کافی باؤس میں ہو گا وہاں چلتے ہیں امید ہے کام بن جائے گا۔

ہم دونوں تانگے میں بیٹھ کر کافی باؤس پہنچے مال روڈ پر بڑے ڈاک خانے کے قریب ایک تانگہ جا رہا تھا اس میں سواری رنگ کا برقع پہنے ایک عورت بیٹھی تھی اس کی نقاب پوری کی پوری انھی ہوئی تھی۔۔۔۔۔۔ وہ تانگے والے سے بڑے بے تکلف انداز میں گفتگو کر رہی تھی ہمیں اس کے الفاظ سنائی نہیں دئی لیکن اس کے ہونٹوں کی جنبش سے جو کچھ مجھے معلوم ہوتا تھا ہو گیا۔

ہم کافی باؤس پہنچے تو عورت کا تانگہ بھی وہیں رگ گیا میرے دوست نے اندر جا کر دس روپوں کا بندو بست کیا اور باہر نکلا۔۔۔۔۔۔ وہ عورت سواری برقعے میں جانے کس کی منتظر تھی۔

ہم واپس گھر آنے لگے تو رستے میں خربوزوں کے ڈھیر نظر آ گئے ہم دونوں تانگے سے اتر کر خربوزے پر کھنے لگے۔

ہم نے باہم فیصلہ کیا کہ اچھے نہیں نکلیں گے کیونکہ ان کی شکل و صورت بڑی بے ڈھنگی تھی۔۔۔ جب اٹھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہی نسوانی برقع تانگے میں بیٹھا خربوزے دیکھ رہا ہے۔

میں نے اپنے دوست سے کہا ”خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے۔۔۔۔۔۔ آپ نے ابھی تک یہ سواری رنگ نہیں پکڑا“
اس نے کہا ”ہٹاؤ جی۔۔۔ یہ سب بکواس ہے“

ہم وہاں سے اٹھ کر تانگے میں بیٹھے میرے وقت کو قریب ہی ایک کیمسٹ کے
ہاں جاتا تھا وہاں دس منٹ لگے باہر نکلے تو دیکھا کہ سواری برقع اسی تانگے میں
بیٹھا جا رہا تھا۔

میرے دوست کو بڑی حیرت ہوئی ”یہ کیا بات ہے؟ یہ عورت کیوں بیکار گھوم
رہی ہے؟“

ہمارا تانگہ ہال روڈ کو مڑنے ہی والا تھا کہ وہ سواری برقع پھر نظر آیا میرے
دوست گوکنوارے ہیں لیکن بڑے زاہدان کو جانے کیوں اکساہٹ پیدا ہوئی کہ
اس سواری برقعے سے بڑی بلند آواز میں کہا ”آپ کیوں آوارہ پھر رہی
ہیں۔۔۔ آئیے ہمارے ساتھ“

اس کے تانگے نے فوراً رخ بدلا اور میرا دوست سخت پریشان ہو گیا جب وہ
سواری برقع ہم کلام ہوا تو اس نے اس سے کہا ”آپ کو تانگے میں آوارہ گردی
کرنے کی کیا ضرورت ہے میں آپ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں“
میرے دوست نے اس سواری برقعے سے شادی کر لی۔

☆☆☆☆☆☆

شوشو

گھر میں بڑی چہل پہل تھی تمام کمرے لڑکے لڑکیوں، بچے بچیوں اور عورتوں سے بھرے تھے اور وہ شور برپا ہو رہا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی اگر اس کمرے میں دو تین بچے اپنی مائوں سے لپٹے دو دھپنے کے لیے بلبل رہے ہیں تو دوسرے کمرے میں چھوٹی چھوٹی لڑکیاں ڈھونڈنے کے لیے بے سہارا تھیں اڑا رہی ہیں۔ نہ تال کی خبر ہے نہ لے کی بس گائے جا رہی ہیں نیچے ڈیوڑھی سے لے کر بالائی منزل کی شیشیوں تک مکان مہمانوں سے کھینچا کھینچا بھرا تھا۔

کیوں نہ ہو ایک مکان میں وہ بیاہ رہے تھے میرے دونوں بھائی اپنی چاندی دہنیں بیاہ کر لائے تھے۔

رات کے 11 بجے کے لگ بھگ دونوں ڈولیاں آئیں اور گلی میں اس قدر شور برپا ہوا کہ الامان مگر وہ نظارہ بڑا روح افزا تھا جب گلی کی سب شوشو و شنگ لڑکیاں باہر نکل آئیں اور تیتڑیوں کی طرح اوٹھراوٹھرا پھڑپھڑانے لگیں۔

سازھیوں کی ریشمیں سرسراہٹ، کلف لگی شلواریوں کی کھڑکھڑاہٹ اور چوڑیوں کی کھٹکناہٹ ہوا میں تیرنے لگی۔ متمتاتے ہوئے مکھڑوں پر بار بار گرتی ہوئی الٹیں ننھے ننھے سینوں پر زور دے کر نکالی ہوئی بلند آوازیں اونچی اڑ رہی تھیں کہ بوٹوں پر تھرتھرتی ہوئی ٹانگیں، لچکتی ہوئی انگلیاں، دھڑکتے ہوئے لہجے، پھڑکتی ہوئی رگیں اور پھر ان الہ لڑکیوں کی آپس میں سرگوشیاں۔۔۔ یہ سب کچھ دیکھ دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ گلی کے پتھر یلے فرش پر حسن و شباب اپنے قلم سے اپنے معانی لکھ رہا

ہے۔

عباس میرے پاس کھڑا تھا ہم دونوں عورتوں کے ہجوم میں گھرے تھے دفعتاً عباس نے گلی کے ٹکڑے پر نظریں گاڑ کر کہا ”شو شو کہاں ہے؟“ میں نے جواب دیا ”مجھے اس وقت تمہارے سوال کا جواب دینے کی فرصت نہیں ہے“

میں اس ہجوم میں اس بھونرے کی مانند کھڑا تھا جو پھولوں بھری کیاری دیکھ کر یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ کس پھول پر بیٹھے۔

عباس نے رونی آواز میں کہا ”وہ نہیں آئی“

”تو کیا ہوا۔۔۔۔۔ باقی تو سب موجود ہیں۔۔۔۔۔ ارے۔۔۔۔۔ دیکھو تو وہ

نیلی ساڑھی میں کون ہے؟۔۔۔۔۔ شو شو“ میں نے عباس کا ہاتھ دبایا

عباس نے غور سے دیکھا ”نیلی ساڑھی میں۔۔۔۔۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے مخصوص انداز میں میری طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھ کر کہا ”علاج کراؤ اپنی آنکھوں کا۔۔۔۔۔ چغندر کہیں کے، یہ شو شو ہے؟“

”کیوں وہ نہیں ہے کیا؟“ میں نے پھر نیلی ساڑھی کی طرف غور سے دیکھا اور ایسا کرتے ہوئے میری نگاہیں ایک ایسی لڑکی کی نگاہوں سے ٹکرائیں کچھ اس طور پر کہ اس کو ایک دھکا سا لگا۔ وہ سنہیلی اور فوراً ہی منہ سے الال جیب نکال کر میرا منہ چڑیا اپنی سہیلی کے کان میں کچھ کہا۔

اس سہیلی نے کنگھیوں سے میری طرف دیکھا۔۔۔۔۔ میرے ماتھے پر پسینہ آ

گیا

عباس نے جو اپنا اطمینان کرنے کے لیے ایک بار پھر اس کی طرف دیکھ رہا تھا بلند آواز میں کہا ”بجدا تم اس کی توہین کر رہے ہو۔۔۔ گدھے کہیں کے۔۔۔ عورت کے معاملے میں نرے احمق ہو۔۔۔ کاٹھ کی کوئی پتلی نیلے رنگ میں لپیٹ لپاٹ کر تمہارے سامنے رکھ دی جائے تم اسی کی بلائیں لینا شروع کر دو گے۔“

یہ الفاظ اتنی اونچی آواز میں ادا کئے گئے تھے کہ اس نیلی ساڑھی والی نے سن لیے جب وہ ہمارے پاس سے گزرنے لگی تو خود بخود ٹھٹھکی گئی ایک لٹلے کے لیے اس کے قدم رکے گویا ہم میں سے کسی نے اس کو مخاطب کیا ہے پھر فوراً ہی اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس احساس کی پیدا کی ہوئی خفت دور کرنے کے لیے اس نے یونہی پیچھے مڑ کر دیکھا اور کہا ”ارے۔۔۔ آئینہ تو کہاں اڑ گئی؟“

مجھے موقع ملا میں نے جھٹ سے عباس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے اچھی طرح دبا کر اس سے کہا ”آپ سے مل کر مجھے بہت خوشی حاصل ہوئی مگر میرا نام محمد امین ہے۔۔۔ مجھے نیل کنٹھ بھی کہتے ہیں“

جل ہی تو گئی مگر ہم زیر لب مسکراتے آگے بڑھ گئے چند ہی قدم چلے ہوں گے کہ عباس نے اضطراب بھرے لہجے میں کہا ”شو شو ابھی تک نہیں آئی“

”تو میں کیا کروں۔۔۔۔۔ میرے سر پر مددہ باندھ دیجئے تو میں ابھی سرکار کے لیے اسے تلاش کر کے لے آتا ہوں۔۔۔ آخر یہ کیا حماقت ہے بھی تم تماشا بھی دیکھنے دو گے کہ نہیں؟ اور پھر جناب یہ تو بتائیے اگر وہ یہاں موجود بھی ہو تو آپ اس سے ملاقات کیونکر کر سکتے ہیں۔۔۔ آپ کوئی امریکی ماہل تو نہیں پڑھ رہے

کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہے۔“

عباس میری بات فوراً سمجھ گیا وہ اتنا بیوقوف نہیں تھا چنانچہ ہم دونوں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے گلی سے نکل کر بازار میں چلے گئے موڑ پر رام بھروسے پناڑی کی دکان کھلی تھی وہ بجلی کے قمتے کے نیچے سر جھکائے اونگھ رہا تھا ہم نے اس سے دوپان بنوائے اور وہیں بازار میں کرسیوں پر بیٹھ کر باتیں کرنے میں مشغول ہو گئے دیر تک ہم ہندوستان میں مرد عورت کے درمیان اجنبیت چلی آ رہی ہے اس کے بارے میں گفتگو کرتے رہے جب ایک بچ گیا تو عباس جمانی لے کر اٹھا اور کہنے لگا ”بھئی اب نیند آ رہی ہے۔۔۔۔۔ اس حسرت کو ساتھ لیے جا رہا ہوں کہ شو شو کونہ دیکھ سکا سچ کہتا ہوں امین وہ لڑکی۔۔۔۔۔ میں اب تمہیں کیا بتاؤں کہ وہ کیا ہے؟“

عباس نے اپنے گھر کا رخ کیا اور میں نے اپنے گھر کا راستہ میں سوچتا رہا کہ عباس نے شو شو جیسی معمولی لڑکی میں ایسی کون سی غیر معمولی چیز دیکھی ہے جو ہر وقت اس کا ذکر کرتا رہتا ہے۔ عباس کے مذاق کے متعلق میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ بڑا اونچا ہے مگر یہاں اسے کیا ہو گیا تھا؟۔۔۔۔۔ شو شو۔۔۔۔۔ شو شو۔۔۔۔۔ ارے یہ کیا ہے؟۔۔۔۔۔ دو تین بار اس کا نام میری زبان پر آیا تو میں نے یوں محسوس کیا کہ پیپر منٹ کی گولیاں چوس رہا ہوں۔۔۔۔۔ شو شو۔۔۔۔۔ ایک دو مرتبہ آپ بھی دہرائیے۔۔۔۔۔ ذرا جلدی جلدی۔۔۔۔۔ کیا آپ کولڈت محسوس ہوئی؟۔۔۔۔۔ ضرور ہوئی ہوگی مگر کیوں؟ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں عباس کی محبوبہ شو شو کے بارے میں خواہ مخواہ کیوں غور کرنے لگا ہوں اس

میں کوئی ایسی چیز ہے ہی نہیں جو غور افروز ہو مگر۔۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔ یہ شوشو نام میں
دلچسپی ضرور تھی اور کیا کہا تھا میں نے لذت بھی!

شوشو میں بانجو کے تھرکتے ہوئے تاروں کی جھنجھکاری پائی جاتی تھی آپ یہ نام
پکارتے تو ایسا معلوم ہوگا کہ آپ نے کسی ساز کے سنے ہوئے تاروں پر زور سے
گزر پھیر دیا ہے۔

شوشو۔۔۔۔۔ سوشیا کا دوسرا نام ہے یعنی اس کی بگڑی ہوئی شکل مگر اس کے
باوجود اس میں کتنی موسیقی
ہے۔۔۔۔۔ سوشیا!۔۔۔۔۔ شوشو!۔۔۔۔۔ سوشیا!۔۔۔۔۔ غلط
۔۔۔۔۔ سوشیا! میں شوشو کی سی موسیقیت ہرگز نہیں ہو سکتی۔

فرنگی شاعر بابر نکلیل تھا مگر اس میں وہ کون سی شے تھی جو عورتوں کے سینے
میں بیجان برپا کر دیتی تھی؟ اس کا لٹلڑا کر چلنا گرینا گاربو قطعاً خوش شکل نہیں ہے
مگر اس میں کون سی چیز ہے جو فلمی تماشاویوں پر جادو کا کام کرتی ہے؟۔۔۔۔۔ اس
کا ذرا بگڑے ہوئے انگریزی لہجے میں باتیں کرنا۔۔۔۔۔ یہ کیا بات ہے کہ بعض
اوقات اچھی بھلی شے کو بگاڑنے سے اس میں حسن پیدا ہو جاتا ہے؟

سوشیا! چند رہ سولہ برس کی ایک معمولی لڑکی ہے جو ہمارے پڑوس میں رتی ہے
اس عمر میں وہ ان تمام چیزوں کی مالک ہے جو عام نوجوانوں کے سینے میں پلچل
پیدا کرنے کے لیے کافی ہوتی ہیں مگر عباس کی نظروں میں یہ کوئی خوبی نہ تھی عام
نوجوانوں کی طرح عباس کا دل گھاس کی پتی کی مانند نہیں تھا جو ہوا کے ہلکے سے
جھونکے کے ساتھ ہی کانپنا شروع کر دیتی ہے۔۔۔۔۔ خدا جانے وہ اس کی کس

اوپر مرتا تھا جو میرے ذہن سے بالائے تھی۔

میں نے سوشیا کی شکل و صورت اور اس کی صنائع قدر و قیمت کے متعلق کبھی غور نہیں کیا تھا مگر نہ جانے میں اس روز اس کے متعلق کیوں سوچتا رہا بار بار وہ میرے ذہن میں آ رہی تھی اور ہر بار میں سوشیا کو چھوڑ کر اس کے مختصر نام شوشو کی موسیقی میں گم ہو جاتا تھا انہی خیالات میں غرق گلی کے موڑ پر پہنچ گیا اور مجھے اس چیز کا احساس اس وقت ہوا جب میں نے دفعتاً وہاں کی فضا کو غیر معمولی طور پر خاموش پایا مکان میری نظروں کے سامنے تھا اس کے باہر گلی کی دیوار کے ساتھ ایک برقی ققمہ لٹک رہا تھا جس کی چوندھیا دینے والی روشنی ساری گلی میں بکھری ہوئی تھی۔۔۔۔۔ مجھے اس ققمہ کے ”تجرّد“ پر بڑا ترس آیا گلی بالکل سنسان تھی اور وہ ققمہ متحیر سا معلوم ہوتا تھا۔

گھر میں داخل ہوا تو وہاں بھی خاموشی تھی البتہ کبھی کبھار کسی بچے کے رونے کی لرزاں صدا اور پرہہ ساتھ ہی اس کی ماں کی خوب آلود آواز سنائی دیتی تھی ڈیوڑھی کے ساتھ والا کمرہ کھول کر میں صوفے پر بیٹھ گیا پاس ہی تپائی پر ”رومان“ پڑا تھا اس کو اٹھا کر میں نے ورق گردانی شروع کر دی ورق الٹے الٹے اختر کی غزل پر نظریں جم گئیں مطلع کس قدر حسین تھا۔

نہ بھولے گا تیرا راتوں کو شرماتے ہوئے آنا
ریلی انکمٹریوں سے نیند برساتے ہوئے آنا
مجھے نیند آگئی کاک کی طرف دیکھا تو چھوٹی سوئی دو کے ہند سے کے پاس پہنچ
چکی تھی اور اس کا اعلان کرنے کے لیے ارتعاش پیدا ہو رہا تھا ٹن ٹن۔۔۔۔۔ ٹن

نن نن --- نن

”دو بج گئے“ میں اٹھا اور سونے کے ارادے سے سیڑھیاں طے کر کے اپنی خوابگاہ میں پہنچا بہار کے دن تھے اور موسم خشک میری خواب گاہ کی ایک کھڑکی باہر گلی کی طرف کھلتی ہے جس کے پیاز کی رنگ کے ریشمی پردے میں ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے بڑی پیاری لہریں پیدا کر رہے تھے۔

میں نے شب خوابی کا لباس پہنا اور سبز رنگ کا قمقمہ روشن کر کے بستر پر لیٹ گیا۔

میری پلکیں آپس میں ملنے لگیں ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں دھنکی ہوئی روئی کے بہت بڑے انبار میں دھنسا جا رہا ہوں نیند اور بیداری کے درمیان صرف ایک لمحہ باقی رہ گیا تھا کہ اچانک میرے کانوں میں کسی کے بولنے کی گنگناہٹ آئی اس پر ماتی ہوئی پلکیں کھل گئیں اور میں نے غنودگی دور کرتے ہوئے غور سے سننا شروع کیا ساتھ والے کمرے میں کوئی بول رہا تھا یا کسی کی دلکش ہنسی کی مترنم آواز بلند ہوئی اور پچھلجھڑی کے نورانی تاروں کے مانند پرسکوت فضا میں بکھر گئی۔

میں بستر پر سے اٹھا اور دروازے کے ساتھ کان لگا کر کھڑا ہو گیا

”دو نوں ڈہنیں ماشاء اللہ بڑی خوبصورت ہیں“

”چندرے آفتاب، چندے مابتاب“

خانا بدلو لڑکیاں آپس میں باتیں کر رہی تھیں ان کے موضوع نے میری دلچسپی کو بڑھا دیا اور میں نے زیادہ غور سے سننا شروع کیا۔

”تیلہ الی ساڑھی میں زمرس کتنی بھلی معلوم ہوتی تھی۔۔۔۔۔ گورے گورے

گالوں پر بکھری ہوئی متیش۔۔۔۔۔ جی چاہتا تھا، بڑھ کر بانیں لے لوں۔“

”بجاری سمٹی جا رہی تھی“

”سرتو اٹھایا ہی نہیں اس نے۔۔۔۔۔ پر۔۔۔“

”پر یہ شرم و حیا کب تک رہے گی۔۔۔ آج رات۔۔۔“

”آج رات۔۔۔۔۔“

”اوائی اللہ۔۔۔۔۔ تو کیسی باتیں کر رہی ہے شوشو“ اس کے ساتھ ہی کپڑے کی سرسراہٹ سنائی دی میرے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی۔۔۔ شوشو۔۔۔ تو ان میں سے ایک سوشیا تھی میری دلچسپی اور بھی بڑھ گئی اور میں نے دروازے میں کوئی دراڑ تلاش کرنا شروع کر دی کہ ان کی گفتگو سننے کے ساتھ ساتھ ان کو دیکھ بھی سکوں ایک کواڑ کے نچلے تختے سے چھوٹی سی گانٹھ نکل گئی تھی اور اس طرح چوٹی کے برابر سوراخ پیدا ہو گیا تھا گھٹنوں کے بل بیٹھ کر میں نے آنکھ جمادی۔

شوشو قالین پر بیٹھی بسکٹ رنگ کی ساڑھی سے اپنی نگلی پنڈلی کو ڈھانک رہی تھی اس کے پاس ہی عنفت شرمائی ہوئی سی گاؤ تکیے پر دونوں کہنیاں ٹیکے لیٹی تھی۔

”اس وقت ان گوری چٹی داہنوں پر کیا بیت رہی ہو گی؟“ شوشو یہ کہہ کر رک گئی اور اپنی آواز دبا کر اس نے عنفت کی چوڑیوں کو چھیڑ کر ان میں کھٹکناہٹ پیدا کرتے ہوئے کہا ”ذرا سوچو تو؟“

عنفت کے گال ایک لمبے کے لیے تھر تھرائے ”کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو شوشو“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ گویا ان باتوں سے دلچسپی ہی نہیں میری بنو کولس میں ہو تو

ابھی سے اپنی شادی رچا لو“

عنّت نے سوشیا کی بات کاٹ دی ”پر یہ دہنوں کو کہاں لے گئے ہیں شو شو؟“
 ”کہاں لے گئے ہیں؟“ شو شو مسکرائی ”سمندر کی تہہ میں جہاں جل پر یوں کا
 راج ہے۔۔۔ کوہ قاف کے غاروں میں جہاں سینٹوں والے جنگ رہتے ہیں“
 چند لمحات کے لیے ایک پر اسرار سکوت طاری رہا اس کے بعد شو شو پھر بولی
 ”کہاں لے گئے ہیں؟۔۔۔۔۔ لے گئے ہوں گے اپنے اپنے کمروں میں“
 ”بے چاریوں کو نیند کیسے آئے گی؟“ ایک لڑکی جو ابھی تک خاموش بیٹھی تھی
 اور جس کا نام میں نہیں جانتا تھا اپنا اندیشہ بیان کیا۔
 شو شو کہنے لگی ”بے چاریاں۔۔۔۔۔ کوئی ذرا ان کے دل سے جا کر پوچھے کہ
 ان کی آنکھیں اس رت جلے کے لیے کتنی بے قرار تھیں“
 ”تو بہت خوش ہوں گی؟“

”اور کیا؟“

”پر میں نے سنا ہے کہ یہ لوگ بہت ستایا کرتے ہیں؟“ عنّت سوشیا کے
 پاس سرک آئی

”میں پوچھتی ہوں تمہیں اندیشہ کس بات کا ہو رہا ہے؟۔۔۔۔۔ جب
 تمہارے وہ ستانے لگیں گے تو نہ ستانے دینا انہیں۔۔۔۔۔ ہاتھ پیر باندھ دینا ان
 کے۔۔۔۔۔ ابھی سے فکر میں کیوں گھلی جا رہی ہو“

”ہائیں ہائیں“ عنّت نے تیزی سے کہا ”تم کیسی باتیں کر رہی ہو شو شو، دیکھو
 میرا دل کتنے زور سے دھڑکنے لگا ہے؟“ عنّت نے سوشیا کا ہاتھ اٹھا کر اپنے دل

شو شو یو لی "تو جاب کہہ بھی دو"

شوشو نے یو جھپا ”بس کہہ چکیں؟“

”میری دعا ہے کہ پر ماتما تمہیں ایسا ہی پتی عطا فرمائیں“ سو شیا! اکا چہرہ بڑا
 سنجیدہ تھا اور لہجہ ایسا تھا جیسے مندر میں کوئی مقدس منتر پڑھ رہی ہے۔
 وہ لڑکی جو اس گفتگو میں بہت کم حصہ لیتی تھی بولی ”غفت! اب شو شو کی باری
 ہے“

عفت جوشو کی سارہمی کا ایک کنارہ پکڑ کر اپنی انگلی کے گرد لپیٹ رہی تھی کہنے لگی ”بھئی اب تم بتاؤ ہم نے تو اپنے دل کی بات تم سے کہہ دی۔“

شوشو نے جواب دیا ”دن کے کیا کرو گی؟۔۔۔۔۔۔ میرے خیالات تم سے بالکل مختلف ہیں۔“

”مختلف ہوں یا ملتے ہوں، پر ہم نے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔“
 ”میں۔۔۔۔۔“ سو شیا نے چھت کی طرف دیکھا اور کچھ دیر خاموش رہنے
 کے بعد کہنے لگی ”میں۔۔۔۔۔ پر تم مذاق اڑاؤ کی عفت!“
 ”ارے۔۔۔۔۔ تم سناؤ تو؟“

سو شیا نے ایک آہ بھری ”میرے سنے عجیب و غریب ہیں
 عفت۔۔۔۔۔ یہ میرے دماغ میں صابن کے رنگ برنگے بلبلوں کی طرح
 پیدا ہوتے ہیں اور آنکھوں کے سامنے ناچ کر غائب ہو جاتے
 ہیں۔۔۔۔۔ میں سوچتی ہوں۔۔۔۔۔ اور پھر سوچتی ہوں کہ میں کیوں سوچا
 کرتی ہوں انسان جو کچھ چاہتا ہے اگر ہو جایا کرے تو کتنی اچھی بات
 ہے۔۔۔۔۔ لیکن پھر زندگی میں کیا رہ جائے گی۔۔۔۔۔ خواہشیں اور تمنائیں
 کہاں سے پیدا ہوں گی۔۔۔۔۔ ہم جس طرح جی رہے ہیں ٹھیک ہے جانتی ہوں
 کہ جو کچھ مانگ رہی ہوں نہیں ملے گا مگر دل میں مانگ تو رہے گی کیا زندہ رہنے
 کے لیے یہی کافی نہیں؟“

عفت اور دوسری لڑکی خاموش بیٹھی تھیں

شو شو نے پھر کہنا شروع کیا ”میں اپنا جیون ساتھی ایک ایسے نوجوان کو بنانا
 چاہتی ہوں جو صرف عمر کے لحاظ سے ہی جوان نہ ہو بلکہ اس کا دل، اس کا
 دماغ۔۔۔۔۔ اس کا رواں رواں جوان ہو۔۔۔۔۔ وہ شاعر ہو۔۔۔۔۔ میں
 شکل و صورت کی قائل نہیں۔۔۔۔۔ مجھے شاعر چاہیے جو میری محبت میں گرفتار
 ہو کہ میرا پا محبت بن جائے جس کو میری ہر بات میں حسن نظر آئے۔۔۔۔۔ جس

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

”آؤاب سوئیں“

یہ خواب آلود اور دہشتی آواز عفت کی تھی اس کے ساتھ ہی کپڑوں کی سرسراہٹ
 بھی سنائی دی اور میں خیالات کے گہرے سمندر میں غوطہ لگا گیا۔
 گندمی رنگ کی خمی سی گڑیا، اپنے چھوٹے سے دماغ میں کیسے کیسے انوکھے
 خیالات کی پرورش کر رہی تھی۔۔۔۔۔ اور وہ کون سا تھا اپنے دامن نسوانیت
 میں چھپائے بیٹھی تھی جو آج تک کوئی عورت مرد کو پیش نہیں کر سکی؟
 میں نے سوراخ میں سے دیکھے شو شو اور عفت دونوں ایک دوسری کے گلے
 میں باہیں ڈالی سو رہی تھیں شو شو کے چہرے پر بال بکھرے ہوئے تھے اور اس کے
 سانس سے ان میں خفیف سا ارتعاش پیدا ہو رہا تھا وہ کس قدر تروتازہ معلوم ہوتی
 تھی۔۔۔۔۔ واقعی وہ اس قابل تھی کہ اس پر شہر کبے جائیں۔۔۔۔۔ لیکن
 عباس تو شاعر نہیں تھا؟ پھر۔۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔۔

☆☆☆☆☆☆

شہ نشین پر

وہ سفید سلمہ لگی ساڑھی میں شہ نشین پر آئی اور ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے نقرئی تاروں والا اتار چھوڑ دیا ہے ساڑھی کے تھرکتے ہوئے ریشمی کپڑے پر جب جگہ جگہ سلمہ کا کام ٹنٹنہ لگتا تو مجھے اپنا جسم پر وہ ٹنٹنہ نہیں گدگدی کرتی محسوس ہوتیں۔۔۔۔۔ وہ خود ایک عرصہ سے میرے لیے گدگدی بنی ہوئی تھی۔

میں اس کو تقریباً دو سو مرتبہ دیکھ چکا ہوں اور ان تمام درشنوں کے نقوش علیحدہ علیحدہ میرے دل و دماغ میں مرتب ہیں ایک بار میں نے اسے صحن میں تیزی کے پیچھے دوڑتے دیکھا تھا ایک لمبے کے لیے وہ میری نگاہوں کے سامنے آئی اور گزر گئی اور جب کبھی میں اس واقعہ کو یاد کرتا ہوں تو مجھے اپنے دل میں ایک ایسے پرندے کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے جو ڈر کر ایک انکی اڑ جائے اسی طرح ایک روز میں نے اسے اسی شہ نشین پر دھوپ میں اپنے گیلے بال جھٹکتے دیکھا تھا اور اب میں جس وقت اس تصویر کو اپنے ذہن کے پردے پر کھینچتا ہوں تو مجھے کبھی سیاہی نظر آتی ہے اور کبھی اجالا۔

میں اس کو اتنا دیکھ چکا ہوں کہ اب میں اس کے سامنے آئے بغیر اسے جب چاہوں دیکھ سکتا ہوں پہلے پہل مجھے اس کام میں وقت محسوس ہوتی تھی مگر اب کوئی مشکل پیش نہیں آئی ابھی کل شام کو جب مجھے ایک دوست کے یہاں بیٹھے بیٹھے اسے دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی تو میں نے آنکھیں بند کیے بغیر اسے اپنے سامنے! کھڑا تھا۔ وہ جو بہوہیسی تھی جیسی کہ وہ ہے اور اس بات کا نہ میرے دوست کو پتہ

پلا اور نہ اس کی بہن کو جو میرے سامنے کرسی پر بیٹھی تھی میں نے ایک لمحے کے لیے اسے اپنے ذہن کی ڈبیا میں سے نکال کر دیکھا اور فوراً ہی وہیں بند کر دیا کسی کو معلوم تک نہ ہوا کہ میں نے کیا کر دیا ہے اس کو دیکھنے کے بعد میں نے یوں سلسلہ کلام شروع کیا گویا میرا ذہن ایک لمحے کے لئے بھی غیر حاضر نہ ہوا تھا ”جی ہاں سوکھی ہوئی مچھلیوں سے سخت بو آتی ہے نہ جانے یہ لوگ انہیں کھاتے کس طرح ہیں میری تو ناک۔۔۔“ اور اس کے بعد مختلف قسم کی ناکوں پر گفتگو شروع ہو گئی تھی۔

اس کی ناک مجھے بہت پسند ہے میرے پاس ہلکے گلابی رنگ کا ٹی سیٹ ہے جو مجھے صرف اس لیے عزیز ہے کہ اس کی پیالیوں کی دتی اس کی ناک سے ملتی جلتی ہے آپ نہیں گے مگر ایک روز صبح کو جب میں نے اسے قریب سے دیکھا تو میرے دل میں عجیب و غریب خواہش پیدا ہوئی کہ اس کی ناک پکڑ کر اس کے ہونٹوں کا رس پی لوں۔

اس کے ہونٹ مجھے پیارے لگتے تھے شاید اس لیے کہ وہ ہر وقت خم آلود رہتے تھے یہ نمی ان میں سکترے کی لڑیوں کی مانند چمک پیدا کر دیتی تھی ان کے چومنے کی خواہش اگر میرے دل میں پیدا ہوئی تھی تو اس کا باعث یہ نہ تھا کہ میں نے کتابوں میں پڑھا تھا اور لوگوں سے سنا تھا کہ عورتوں کے ہونٹ چومے جاتے ہیں، نہیں۔۔۔۔۔ اگر مجھے یہ علم نہ ہوتا تو بھی میرے دل میں ان کو چومنے کی خواہش پیدا ہوتی اس کے ہونٹ ہی کچھ اس قسم کے تھے کہ وہ ایک نامکمل بوسہ معلوم ہوتے تھے۔

وہ میرے ہمسائے ڈاکٹر کی بیٹی تھی سارا دن وہ نیچے اپنے باپ کی

ڈپنسری میں بیٹھی رہتی کبھی کبھی جب میں اسے بازار سے گزرتے ہوئے شیشوں میں دوانیوں کی الماری کے پاس کھڑی دیکھتا تو مجھے وہ ایک لمبی گردن والی بوتل دکھائی دیتی جس میں کوئی خوش رنگ سیال مادہ ابل رہا ہو ایک روز میں ڈپنسری میں ڈاکٹر صاحب سے دوا لینے کے لیے گیا مجھے زکام کی شکایت تھی ڈاکٹر صاحب نے اس سے کہا ”بیٹا ان کے رومال پر یوکلپٹس آئل کے چند قطرے چکا دو۔“

اس نے میرا رومال لیا اور الماری میں سے ایک چھوٹی سی بوتل نکال کر دوا کے قطرے چکانے لگی۔ اس وقت میرے جی میں آئی کہ اٹھ کر اس کا ہاتھ تمام لوں اور کہوں اس شیشی کو بند کر دیجئے اگر آپ اپنی آنکھوں کا ایک آنسو مجھے عنایت فرما دیں تو میری بہت سی بیماریاں دور ہو جائیں لیکن میں خاموش بیٹھا دوا کے ان سفید قطروں کی طرف دیکھتا رہا جو میرے رومال میں جذب ہو رہے تھے۔

جب سے میں نے اسے دیکھنا شروع کیا ہے میری دلی خواہش رہی ہے کہ وہ روئے اور میں اس کی آنکھوں میں آنسو تیرتے ہوئے دیکھوں۔ میں نے تصور میں کئی مرتبہ اس کی آنکھوں کو نمناک دیکھا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ میں اسے سچ مچ روتا دیکھنا چاہتا ہوں اس کی گھنی پلکوں میں پھنسے ہوئے آنسو بہت اچھے معلوم ہوں گے جتن پر سے جب بارش کے قطرے رک رک کر نیچے پھسل رہے ہوں تو کتنے دلفریب دکھائی دیا کرتے ہیں۔

ممکن ہے کہ عورت کی آنکھوں میں آپ آنسو ضروری خیال نہ کریں پر میں آنسوؤں کو ہٹا کر عورت کی آنکھوں کا تصور ہی نہیں کر سکتا آنسو آنکھوں کا پسینہ ہے مزدور کی پیشانی صرف اسی صورت میں مزدور کی پیشانی ہو سکتی ہے جب اس پر

پینے کے قطرے چمک رہے ہوں اور عورت کی آنکھ صرف اسی صورت میں عورت کی آنکھیں ہو سکتی ہیں جب آنسوؤں سے ڈبڈبائی رہتی ہوں۔

وہ سفید سلمہ لگی ساڑھی میں شہ نشین پر آئی اور ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے فقر کی تاروں والا انا رچھوڑ دیا ہے ساڑھی کے تھرکتے ہوئے ریشمی کپڑے پر جگہ جگہ سلمے کا کام ٹنمارہا تھا اور مجھے اپنے جسم پر گدگدی سی محسوس ہو رہی تھی اس نے ایک ایک کی پٹ کر میری طرف دیکھا گویا اس کو فوراً ہی اس بات کا احساس ہوا کہ اس کے علاوہ رات کی خاموشی میں کوٹھے پر کوئی اور تنفس بھی ہے۔۔۔ اس کی آنکھیں۔۔۔۔۔ اس کی آنکھیں دو موتی رول رہی تھیں۔۔۔۔۔ وہ رو رہی تھی وہ۔۔۔۔۔ وہ رو رہی تھی۔۔۔۔۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اور قبل اس کے کہ میں کچھ کر سکوں، اس کی آنکھوں سے اس کے شباب کے پہلے پینے کے قطرے چھلکے اور سنگین فرش پر پھیل گئے وہ میری خلل انداز فکا ہوں کی تاب نہ لاسکے وہ دراصل چپ چاپ دوسروں کو خبر کیے بغیر نوزائیدہ بچوں کی مانند محوڑی دیران دو نرم و نازک ہنگوروں میں لیٹے رہنا چاہتے تھے، مگر میری فکا ہوں کے شور سے وہ چل گئے وہ رو رہی تھی پر میں خوش تھا اس کی نم آلود آنکھیں کہہ رہے ہیں لپٹی ہوئی جھیلیں معلوم ہوتی تھیں بڑی پر اسرار، بڑی فکر خیز، پانی کی پتلی سی تہہ کے نیچے اس کی آنکھوں کی سفیدی اور سیاہی، ان ننھی ننھی مچھلیوں کی مانند جھلما رہی تھی جو پانی کے اوپر آنے سے ڈرتی ہوں۔

میں نے اس کو دیکھنا چھوڑ کر اس کی آنکھوں کو دیکھنا شروع کر دیا جس طرح دبھر کی سرد اور گیلی رات میں کھلی فضا کے اندر دو دیئے جل رہے ہوں اس کی

وہ جانتی تھی کہ میں کون ہوں اور یہ پوچھتے ہوئے کہ میں کون ہوں وہ میرے بارے میں کچھ دریافت نہ کر رہی تھی بلکہ وہ پوچھ رہی تھی کہ وہ خود کون ہے میں نے جواب دیا ”تم شیلہ ہو؟“

اس کے بچنے ہوئے ہونٹ ایک خفیف ارتعاش کے ساتھ کھلے اور سکیوں میں کہنے لگی ”شیا۔۔۔۔۔ شیا۔۔۔۔۔ شیا“ وہ شہنشین پر بیٹھ گئی وہ تھکی ہوئی معلوم ہوتی تھی لیکن ایک ایسی اسے کچھ خیال آیا اور جو خواب وہ دیکھ رہی تھی اسے اپنے دماغ سے جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئی اور گھبرائے ہوئے لہجے میں کہنے لگی۔۔۔۔۔“

میں۔۔۔۔۔ میں کیا کہہ رہی تھی؟۔۔۔۔۔ مجھے کچھ نہیں ہوا۔۔۔۔۔ میں اچھی ہوں۔۔۔۔۔ اور میں یہاں کیسے چلی آئی؟“

میں نے اسے بڑے تسلی آمیز لہجے میں کہا ”گھبراؤ نہیں شیلا۔۔۔۔۔ تم نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔۔۔۔۔ ایسی باتیں نہ کہی جاتی ہیں اور نہ سنی جاتی ہیں“

شیا! نے اس انداز سے میری جانب دیکھا گویا میں نے اس کو کوئی چوری پکڑ لی ہے۔ ”کیسی باتیں؟۔۔۔۔۔ کیسی باتیں؟۔۔۔۔۔ کوئی بات بھی تو ہو۔“

میں نے اس سے کہا ”پرسوں جب تم نیچے ڈپنٹری میں الال لال جیب نکال کر ٹوٹے سے کھیل رہی تھیں اور تمہاری بلوریں انگلیاں بوتلوں سے نکرا کر ایک عجیب قسم کی جھینکار پیدا کر رہی تھی اس وقت تم ایک نامکمل عورت تھیں، پر آج جب کہ تمہاری آنکھیں رو رہی ہیں تم مکمل عورت بن گئی ہو کیا تمہیں یہ فرق محسوس نہیں ہوتا؟ ہوتا ہے، ضرور ہوتا ہے، وہ چیز جو کل تھی آج تم میں نہیں ہے اور جو آج ہے کل نہ رہے گی پر وہ داغ جو سرت کا گرم لوہا تمہارے دل پر لگا گیا ہے ہمیشہ ویسے کاویا رہے گا۔۔۔۔۔ یہ کتنی اچھی بات ہے۔۔۔۔۔ تمہاری زندگی میں ایک ایسی چیز تو ہوگی جو ساری کی ساری تمہاری ہوگی۔۔۔۔۔ ایک ایسی چیز جس کی ملکیت پر کسی کو شک نہیں ہو سکتا کاش میرا دل تمہارا دل ہوتا۔۔۔۔۔ کسی عورت کا دل ہوتا۔۔۔۔۔ جو ایک ہی داغ کو کافی سمجھتا ہے۔۔۔۔۔ عورت کے دل کی آبادی میں کئی ویرانے ساکتے ہیں۔۔۔۔۔ ویرانوں کا یہ جہوم بجائے خود ایک آبادی ہے۔۔۔۔۔ تم خوش قسمت ہو۔۔۔۔۔ وہ دن جس کے لیے تمہیں انتظار کرنا پڑتا تم نے بہت جلد دیکھ لیا۔۔۔۔۔ تم خوش قسمت ہو۔“

وہ میری طرف اس مرفی کی طرح حیرت سے دیکھنے لگی جس نے پہلی بار انڈیا دیا ہو وہ اپنے کوٹنوں کے لگی ”خوش قسمت!۔۔۔۔۔ میں خوش قسمت۔۔۔۔۔ وہ کیسے؟۔۔۔۔۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟“

میں نے جواب دیا ”جب پتنگ کٹ جائے اور کوٹنوں پر چڑھے ہوئے

لوٹے ڈور لوٹنے کے لئے شور مچانا شروع کر دیں تو کسی کے ہٹانے کی حاجت نہیں رہتی۔۔۔۔۔ کہ پتنگ کٹ گیا ہے۔۔۔۔۔ جو پتنگ تم نے ہوا کی بلند یوں میں اڑایا تھا کہاں ہے؟۔۔۔۔۔ کل تک اس کی ڈور تمہارے ہاتھ میں تھی، پر آج نظر نہیں آتی۔“

اس کی آنکھوں سے پپا آنسو گرنے لگے
 ”میں خوش قسمت ہوں“ آنسوؤں میں بھیکے ہوئے لفظ اس کے منہ سے نکلے ”میں خوش قسمت ہوں۔۔۔۔۔ آپ ان لوٹوں سے جو ڈور لوٹنے کے لئے کوٹھوں پر چڑھے رہتے ہیں کم شور نہیں مچا رہے۔“

آنسو زیادہ تیزی سے بہنے لگے اس نے میری طرف اس بارش میں سے دیکھا اور کہا ”میری آنکھوں سے آنسو نکال کر آپ کس کا حلق تر کرنا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔ میں سب جانتی ہوں یہ سوئیاں آپ مجھے کیوں چھو رہے ہیں۔“
 اس نے نفرت سے منہ پھیر لیا اس کی عقل اس وقت اس چاقو کے پھل کی مانند تھی جسے ضرورت سے زیادہ سان پر لگایا گیا ہو۔

میں نے اس سے بڑے اطمینان سے کہا ”جو کچھ ہو چکا ہے اس کا مجھے علم ہے اور اگر اس وقت میں تم سے یہ سب کچھ بھول جانے کے لیے کہتا تم سے معافی الفاظ میں ہمدردی کرتا داریوں کے مانند ایک ہاتھ میں تمہارا سارا غم لے کر چھو منتر کے ذریعے سے غائب کر دیتا تو تم یقیناً مجھے اپنا دوست مانتیں، پر میں ایسا نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔ دل تمہارا ہے اور جو اس پر گزرا ہے وہ بھی تمہارا ہے، میں کیوں تمہارے دل کو دولت سے محروم کروں، کیوں تمہیں اس درد کو بھول جانے کے لئے

کہوں جو تمہارا سرمایہ حیات ہے۔ اس درد پر، اسی دکھ دینے والے واقعہ پر جو بیت چکا ہے تمہیں اپنی زندگی کے آنے والے دنوں کی بنیادیں استوار کرنا ہوں گی۔۔۔۔۔ میں جھوٹ نہیں بولنا چاہتا شیلا، پر اگر تم چاہتی ہو تو تمہاری تسکین کے لیے میں یہ بھی کر سکتا ہوں بولو میں کیا کہوں؟“

یہ سن کر اس نے تیزی سے کہا ”مجھے کسی کی ہمدردی کی ضرورت نہیں؟“
 ”میں جانتا ہوں۔۔۔۔۔ ایسے حالات میں کسی ہمدردی کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔۔۔۔۔ آگ کے اندر کودنے والے کھیل میں ہدایت دینے والے کی کیا ضرورت؟۔۔۔۔۔ پریم کی ارحمی کو دوسرے کے کاندھوں سے کیا سروکار، یہ لاش تو زندگی بھر ہمیں اپنے ہی کاندھوں پر اٹھائے اٹھائے پھرنا ہوگی۔۔۔۔۔“

وہ سچ میں بول اٹھی ”اٹھاؤں گی۔۔۔۔۔ آپ کو اس بات سے کیا۔۔۔ ایسی ایسی بھیا تک باتیں سنا کر آپ مجھے کس لیے ڈرانا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔ میں نے اس سے محبت کی۔۔۔ اور کیا میں اب بھی اس سے محبت نہیں کرتی۔۔۔۔۔ اس نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ میرے ساتھ فریب کیا ہے پر یہ فریب، یہ دھوکا بھی تو اسی نے دیا ہے جس سے میں محبت کرتی ہوں۔۔۔۔۔ میں جانتی ہوں کہ اس نے میری زندگی برباد کر دی ہے مجھے کہیں کا نہیں رکھا لیکن پھر کیا ہوا۔۔۔۔۔ میں ایک بازی کھیلی اور ہار گئی۔۔۔۔۔ آپ مجھے ڈرانا چاہتے ہیں مجھے طعنہ دینا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔ مجھے۔۔۔۔۔ مجھے۔۔۔۔۔ جسے اب موت تک کی پروا نہیں رہی۔۔۔۔۔ میں نے موت کا نام لیا ہے اور۔۔۔۔۔ اور دیکھئے آپ کے بدن پر کپکپی دوڑ گئی ہے، آپ موت سے ڈرتے ہیں مگر میری

طرف دیکھئے، میں موت سے نہیں ڈرتی۔“

میں نے اس کی طرف دیکھا اس کے لبوں پر ایک زبردستی کی مسکراہٹ ناچ رہی تھی اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی پتلی تہہ کے نیچے ایک عجیب قسم کی روشنی جھلما رہی تھی اور وہ خود کانپ رہی تھی ہولے ہولے۔

میں نے اس کو دوبارہ غور سے دیکھا اور کہا ”میں موت سے ڈرتا ہوں اس لیے کہ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں تم موت سے نہیں ڈرتی، اس لیے کہ تمہیں زندہ رہنا نہیں آتا جو شخص زندہ رہنے کا سلیقہ نہیں جانتا اس کے لیے زندہ رہنا بھی موت کے برابر ہے۔۔۔۔۔ اگر تم مرنا چاہتی ہو تو بڑے شوق سے مر جاؤ۔“

وہ حیرت سے میرا منہ تکتے لگی میں نے کہنا شروع کیا ”تم مرنا چاہتی ہو اس لیے کہ تم سمجھتی ہو کہ دکھ کے اس پہاڑ کا بوجھ جو ایک ایسی تم پر لوٹ پڑا ہے تم سے نہ اٹھایا جائے گا۔۔۔۔۔ یہ غلط ہے۔۔۔۔۔ جب تم محبت کرنے کی طاقت رکھتی ہو تو اس کی شکست کے صدمے برداشت کرنے کی بھی قوت رکھتی ہو۔۔۔۔۔ وہ لذت، وہ حظ، وہ مسرت جو تم نے اس سے محبت کر کے حاصل کی، تمہاری زندگی کا عرق ہے اسے سنبھال کر رکھو اور باقی تمام عمر ان چند گھنٹوں پر بسر کرو۔۔۔۔۔ وہ مرد جس سے تم نے محبت کی، اتنا ضروری، اتنا اہم نہیں ہے، جتنی کہ تمہاری محبت ہے، جو اس سے تم کو ہے۔۔۔۔۔ اس مرد کو بھول جاؤ لیکن اپنی محبت کو یاد رکھو اس کی یاد پر جبکہ۔۔۔۔۔ ان لمحات کی یاد پر جن کو حاصل کرنے کے لیے تم نے اپنی زندگی کی سب سے قیمتی شے توڑ ڈالی۔۔۔۔۔ کیا تم ان لمحات کو بھول سکتی ہو، جس کی قیمت میں تم نے ایک بیش بہا موتی دیا ہے۔۔۔۔۔ ہرگز نہیں۔۔۔۔۔ مرد

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

☆☆☆☆☆☆

قاسم

باورچی خانہ کی مٹ میلی فضا میں بکلی کا اندھا سا باب کمزور روشنی پھیلا رہا تھا
سٹو وپر پانی سے بھری ہوئی کیتلی دھری تھی پانی کا کھولاؤ اور سٹو و کے حلق سے نکلتے
ہوئے شعلے جل کر مسلسل شور برپا کر رہے تھے انگلیٹھیوں میں آگ کی آخری
چنگاریاں راکھ میں سو گئی تھیں دو رکونے میں قاسم گیارہ برس کا لڑکا برتن مانگنے میں
مصروف تھا یہ ریلوے انسپکٹر صاحب کا بوائے تھا۔

برتن صاف کرتے وقت یہ لڑکا کچھ گنگنا رہا تھا یہ الفاظ ایسے تھے جو اس کی
زبان سے بغیر کسی کوشش کے نکلے رہے تھے

”جی آیا صاحب! جی آیا صاحب! بس ابھی صاف ہو جاتے ہیں صاحب!“
ابھی برتنوں کو راکھ سے صاف کرنے کے بعد انہیں پانی سے دھو کر فرینے سے
رکھنا بھی تھا اور یہ کام جلدی سے نہ ہو سکتا تھا لڑکے کی آنکھیں نیند سے بند ہوئی جا
رہی تھیں سر سخت بھاری ہو رہا تھا مگر کام کیے بغیر آرام۔۔۔۔۔ یہ کیوں کر ممکن تھا۔
سٹو و بدستور ایک شور کے ساتھ نیلے شعلوں کو اپنے حلق سے اگل رہا تھا کیتلی کا
پانی اسی انداز میں کل کل کھلا کر نہس رہا تھا۔

دھنلا لڑکے نے نیند کے ناقابل مغلوب حملے کو محسوس کر کے اپنے جسم کو ایک
جنہش دی اور ”جی آیا صاحب!“ گنگناتا پھر کام میں مشغول ہو گیا۔

دیوار گیروں پر چنے ہوئے برتن سوئے ہوئے تھے پانی کے ٹل سے پانی کی
بوندریں نیچے میلی سل پر لٹک رہی تھیں اور اداس آواز پیدا کر رہی تھیں ایسا معلوم ہوتا

تھا کہ فضا پر غنودگی سی طاری ہے دفعتاً آواز بلند ہوئی

”قاسم۔۔۔۔۔ قاسم!“

”جی آیا صاحب!“ لڑکا جو انہی الفاظ کی گردان کر رہا تھا بھاگا بھاگا اپنے آقا کے پاس گیا۔

انسپکٹر صاحب نے گرج کر کہا ”بیوقوف کے بچے آج پھر یہاں صراحی اور گلاس رکھنا بھول گیا ہے۔“

”ابھی لایا صاحب۔۔۔۔۔ ابھی لایا صاحب!“

کمرے میں صراحی اور گلاس رکھنے کے بعد وہ ابھی برتن صاف کرنے کے لیے بیٹھا ہی تھا کہ پھر اسی کمرے سے آواز آئی

”قاسم۔۔۔۔۔ قاسم!“

”جی آیا صاحب!“ قاسم بھاگتا ہوا پھر اپنے آقا کے پاس گیا

”بہن کا پانی کس قدر خراب ہے جاؤ پارسی کے ہوٹل سے سوڈا لے کر آؤ بس بھاگے جاؤ سخت پیاس لگ رہی ہے“

”بہت اچھا صاحب!“

قاسم بھاگا بھاگا گیا اور پارسی کے ہوٹل سے جو گھر سے قریباً نصف میل کے فاصلے پر تھا سوڈے کی بوتل لے آیا اور اپنے آقا کو گلاس میں ڈال کر دے دی۔

”اب تم جاؤ مگر اس وقت تک کیا کر رہے ہو؟ برتن صاف نہیں ہوئے کیا؟“

”ابھی صاف ہو جاتے ہیں صاحب!“

”برتن صاف کرنے کے بعد میرے دونوں کالے شوپاش کر دینا مگر دیکھنا

احتیاط رہے چہڑے پر کوئی خراش نہ آئے ورنہ۔۔۔۔۔“

”قاسم کو ”ورنہ“ کا جملہ بخوبی معلوم تھا“ بہت اچھا صاحب کہہ کر وہ باورچی خانے میں پلا گیا اور برتن صاف کرنے شروع کر دیئے۔

اب نیند اس کی آنکھوں میں مٹی چلی آرہی تھی پلکیں آپس میں ملی جا رہی تھیں سر میں پگھلا ہوا سیدہ اتر رہا تھا یہ خیال کرتے ہوئے کہ صاحب کے بوٹ بھی ابھی پالش کرنے ہیں قاسم نے اپنے سر کو زور سے جنبش دی اور وہی راگ الاپنا شروع کر دیا

”جی آیا صاحب! جی آیا صاحب! بوٹ ابھی صاف ہو جاتے ہیں صاحب!“

مگر نیند کا طوفان ہزار بند باندھنے پر بھی نہ رکا اب اسے محسوس ہوا کہ نیند ضرور غلبہ پا کے رہے گی پر ابھی برتنوں کو دھو کر انہیں اپنی جگہ پر رکھنا باقی تھا جب اس نے یہ سوچا تو ایک عجیب و غریب خیال اس کے دماغ میں آیا ”بھاڑ میں جائیں برتن اور چوبلے میں جائیں شو۔۔۔۔۔ کیوں نہ تھوڑی دیر اسی جگہ پر سو جاؤں اور پھر چند لمحہ آرام کرنے کے بعد۔۔۔۔۔“

اس خیال کو باغیانہ تصور کر کے قاسم نے ترک کر دیا اور برتنوں پر جلدی جلدی راکھ ماننا شروع کر دی۔

تھوڑی دیر کے بعد جب نیند پھر غالب آئی تو اس کے جی میں آئی کہ اہلتا ہوا پانی سر پر اندیل لے لے اور اس طرح اس غیر مرئی طاقت سے جو اس کے کام میں حارج ہو رہی تھی نجات پا جائے۔۔۔۔۔ مگر پانی اتنا گرم تھا کہ اس کے نیچے تک کو پگھلا دیتا۔ چنانچہ منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار مار کر اس نے باقی ماندہ برتن

صاف کیے یہ کام کرنے کے بعد اس نے اطمینان کا سانس لیا اب وہ آرام سے سو سکتا تھا اور نیند۔۔۔۔۔ وہ نیند جس کے لیے اس کی آنکھیں اور دماغ اس شدت سے انتظار کر رہے تھے اب بالکل نزدیک تھی۔

باورچی خانے کی روشنی گل کرنے کے بعد قاسم نے باہر برآمدے میں اپنا بستر بچھالیا اور لیٹ گیا اس سے پہلے کہ نیند اسے اپنے نرم نرم بازوؤں میں تھام لے اس کے کان ”شو“ کی آواز سے گونج اٹھے

”بہت اچھا صاحب! ابھی پالش کرتا ہوں“ قاسم ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا ابھی قاسم شو کا ایک پیر بھی اچھی طرح پالش کرنے نہ پایا تھا کہ نیند کے غلبے نے اسے ہیں سلا دیا۔

سورج کی لال لال کرنیں مکان کے شیشوں سے نمودار ہوئیں مگر قاسم سویا رہا جب انسپکٹر صاحب نے اپنے نوکر کو باہر برآمدے میں اپنے کالے جوتوں کے پاس سویا دیکھا تو اسے ٹھوکر مار کے جگاتے ہوئے کہا ”یہ سور کی طرح یہاں بے ہوش پڑا ہے اور مجھے خیال تھا کہ اس نے شو صاف کر لیے ہوں گے۔۔۔۔۔ نمک حرام!۔۔۔۔۔ اے قاسم“

”جی آیا صاحب!“

قاسم فوراً اٹھ بیٹھا ہاتھ میں جب اس نے پالش کرنے کا پرش دیکھا اور رات کے اندھیرے کی بجائے دن کی روشنی دیکھی تو اس کی جان خطا ہو گئی۔

”میں سو گیا تھا صاحب! مگر۔۔۔۔۔ مگر شو ابھی پالش ہو جاتے ہیں صاحب!“

“قاسم!”

”جی آیا صاحب!“

”بہت بہتر صاحب!“

٤٠

ڈیڑھ گھنٹے کی انتھک محنت کے بعد اس نے باورچی خانہ کا سارا کام ختم کر دیا اور ہاتھ پاؤں صاف کرنے کے بعد جھاڑن لے کر ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ وہ ابھی کرسیوں کو جھاڑن سے صاف کر رہا تھا کہ اس کے تھکے ہوئے دماغ میں ایک تصویر سی کھینچ گئی کیا دیکھتا ہے کہ اس کے گرد برتن ہی برتن پڑے ہیں اور پاس ہی راکھ کا ایک ڈھیر لگ رہا ہے ہوا زوروں پر چل رہی ہے جس سے وہ راکھ

اڑاڑ کر فضا کو خاکستری بنا رہی ہے یکا یک اس ظلمت میں ایک سرخ آفتاب نمودار
ہوا جس کی کرنیں سرخ بر چھیبوں کی طرح ہر برتن کے سینے میں گھس گھس گئیں زمین
خون سے شرابور ہو گئی۔

قاسم دہشت زدہ ہو گیا اور اس وحشت ناک تصور کو دماغ سے جھٹک کر ”جی
آیا صاحب! جی آیا صاحب!“ کہتا پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔
تھوڑی دیر کے بعد اس کے تصور میں ایک اور منظر رقص کرنے لگا۔ چھوٹے
چھوٹے لڑکے آپس میں کوئی کھیل کھیل رہے تھے دفعتاً آندھی چلنے لگی جس کے
ساتھ ہی ایک بدنما اور بھیا تک دیو نمودار ہوا یہ دیوان سب لڑکوں کو نگل گیا قاسم
نے خیال کیا کہ وہ دیو اس کے آقا کے ہم شکل تھا گو کہ قد و قامت کے لحاظ سے وہ
اس سے کہیں بڑا تھا اب اس دیو نے زور زور سے ڈکارنا شروع کیا۔۔۔۔۔ قاسم
سر سے پیر تک لرز گیا۔

ابھی تمام کمرہ صاف کرنا تھا اور وقت بہت کم رہ گیا تھا چنانچہ قاسم نے جلدی
جلدی کرسیوں پر جھاڑن مارنا شروع کیا کرسیوں کا کام ختم کرنے کے بعد وہ میز
صاف کرنے کے لیے بڑھا تو اسے خیال آیا ”آج مہمان آرہے ہیں خدا معلوم
کتنے برتن صاف کرنا پڑیں گے نیند کمبخت پھر ستائے گی مجھ سے تو کچھ بھی نہ ہو سکے
گا۔“

وہ یہ سوچ رہا تھا اور میز پر رکھی ہوئی چیزوں کو پونچھ رہا تھا اچانک اسے قلمدان
کے پاس ایک کھلا ہوا چاقو نظر آیا۔۔۔۔۔ وہی چاقو جس کے متعلق اس کے آقا
نے کہا تھا بہت تیز ہے، چاقو کا دیکھنا تھا کہ اس کی زبان پر یہ لفظ خود بخود جاری ہو

گئے ”چاقو تیز دھار چاقو! یہی تمہاری مصیبت ختم کر سکتا ہے۔“
 کچھ اور سوچے بغیر قاسم نے تیز دھار چاقو اٹھا کے اپنی انگلی پر پھیر
 لیا۔۔۔۔۔ اب وہ شام کو برتن صاف کرنے کی زحمت سے بہت دور تھا اور
 نیند۔۔۔۔۔ پیاری نیند اسے با آسانی نصیب ہو سکتی تھی۔
 انگلی سے خون کی سرخ دھار بہہ رہی تھی سامنے والی دیوار کے سامنے روشنائی
 سے کہیں چمکیلی قاسم اس خون کی دھار کو مسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا اور منہ
 میں گنگنا رہا تھا ”نیند۔۔۔۔۔ نیند۔۔۔۔۔ پیاری نیند۔۔۔۔۔“
 تھوڑی دیر بعد وہ بھاگا ہوا اپنے آقا کی بیوی کے پاس گیا جو زنا خانہ میں بیٹھی
 سلائی رک رہی تھی اور اپنی انگلی دکھا کر کہنے لگی ”دیکھئے بی بی جی!“
 ”ارے قاسم! یہ تو نے کیا کیا؟ کمبخت، صاحب کے چاقو کو چھیڑا ہو گا تو
 نے؟“

قاسم مسکرا دیا ”بی بی جی! بس میرا صاف کر رہا تھا کہ اس نے کاٹ کھایا“
 ”سوراب ہنستا ہے، ادھر آ، میں اس پر کپڑا باندھ دوں پر اب یہ تو بتا کہ آج یہ
 برتن تیرا باپ صاف کرے گا؟“

قاسم اپنی فتح پر جی جی میں بہت خوش ہوا۔
 انگلی پر پٹی بندھوا کر قاسم پھر کمرے میں چلا آیا میز پر سے خون کے دھبے
 صاف کرنے کے بعد اس نے خوشی خوشی اپنا کام ختم کر دیا سامنے طوٹے کا ہنجرہ
 لٹک رہا تھا اس کی طرف دیکھ کر قاسم نے مسرت بھرے لہجے میں کہا ”اب اس نمک
 حرام باورچی کو برتن صاف کرنے ہوں گے اور ضرور صاف کرنے ہوں گے کیوں

میاں مٹھو؟“

شام کے وقت مہمان آئے اور چلے گئے باورچی خانے میں جھولے برتنوں کا ایک طومار سا لگ گیا انسپکٹر صاحب قاسم کی انگلی دیکھ کر بہت بر سے اور جی کھول کر اسے گالیاں دیں مگر اسے مجبور نہ کر سکے۔۔۔۔۔ شاید اس وجہ سے کہ ایک بار ان کی اپنی انگلی میں قلم تراش چبھ جانے پر بہت درد ہوا تھا۔

آقا کی انگلی آنے والی مسرت نے بھلا دی اور قاسم کو دتا پھاندتا اپنے بستر پر جا لیٹا۔ تین چار روز تک وہ برتن صاف کرنے کی زحمت سے بچا رہا مگر اس کے بعد انگلی کا زخم بھر آیا۔۔۔۔۔ اب وہی مصیبت پھر نمودار ہو گئی۔

”قاسم۔۔۔۔۔ صاحب کی جراثیمیں اور مینس دھو ڈالو“

”بہت اچھا بی بی جی!“

”قاسم اس کمرے کا فرش کتنا میلا ہو رہا ہے پانی لا کر ابھی صاف کرو دیکھنا کوئی داغ دھبہ باقی نہ رہے۔“

”بہت اچھا صاحب!“

”قاسم، شیشے کے گلاس کتنے چکنے ہو رہے ہیں انہیں نمک سے بھی ابھی صاف کرو“

”ابھی کرتا ہوں بی بی جی!“

”قاسم! ابھی بھنگن آرہی ہے تم پانی ڈالتے جاؤ وہ میڑھیاں دھو ڈالے گی“

”بہت اچھا صاحب!“

”قاسم ذرا بھاگ کر ایک آنہ کا دی تو لے آتا“

”ابھی چلائی بی جی!“

پانچ چھ روز اس قسم کے احکام سننے میں گزر گئے قاسم کام کی زیادتی اور آرام کے قحط سے تنگ آ گیا ہر روز اسے نصف شب تک کام کرنا پڑتا پھر بھی علی الصبح چار بجے کے قریب بیدار ہو کر ناشتے کے لیے چائے تیار کرنا پڑتی۔ یہ کام قاسم کی عمر کے لڑکے کے لیے بہت زیادہ تھا۔

ایک روز انسپکٹر صاحب کی میز صاف کرتے وقت اس کا ہاتھ خود بخود چاقو کی طرف بڑھا اور ایک لمحہ کے بعد اس کی انگلی سے خون بہنے لگا انسپکٹر صاحب اور ان کی بیوی قاسم کی اس حرکت پر سخت خفا ہوئے چنانچہ سزا کی صورت میں اسے شام کا کھانا نہ دیا گیا مگر قاسم خوش تھا ”ایک وقت روٹی نہ ملی انگلی پر معمولی سا زخم آ گیا مگر برتنوں کا انبار صاف کرنے سے تو نجات مل گئی یہ سودا کیا برا ہے۔“

چند دنوں کے بعد اس کی انگلی کا زخم ٹھیک ہو گیا اب پھر کام کی وہی بھرمار تھی پندرہ بیس روز گدھوں کی سی مشقت میں گزر گئے اس عرصہ میں قاسم نے بار بار ارادہ کیا کہ چاقو سے پھر اپنی انگلی زخمی کر لے مگر اب میز پر سے وہ چاقو اٹھالیا گیا تھا اور باورچی خانے والی چھری کند تھی۔

ایک روز باورچی بیمار پڑ گیا اب قاسم کو ہر وقت باورچی خانے میں رہنا پڑا کبھی مرچیں پیتا، کبھی آنا گوندھتا، کبھی کونسلے ساگاتا، غرض صبح سے لے کر شام تک اس کے کانوں میں ”ابے قاسم یہ کر! ابے قاسم وہ کر!“ کی صدا گونجتی رہتی۔

باورچی دو روز تک نہ آیا۔۔۔۔۔ قاسم کی ننھی سی جان اور ہمت جواب دے گئی مگر سوائے کام کے اور چارہ ہی کیا تھا۔

ایک روز انسپٹر صاحب نے اسے الماری صاف کرنے کو کہا جس میں ادویات کی شیشیاں اور مختلف چیزیں پڑی تھیں الماری صاف کرتے وقت اسے ڈاڑھی موٹنے کا ایک بلیڈ نظر آیا بلیڈ پکڑتے ہی اس نے اپنی انگلی پر پھیر لیا دھار تھی بہت تیز انگلی میں دو رتک چلی گئی جس سے بہت بڑا زخم بن گیا۔

قاسم نے بہت کوشش کی کہ خون ٹکنا بند ہو جائے مگر زخم کا منہ بڑا تھا سیروں خون پانی کی طرح بہہ گیا یہ دیکھ کر قاسم کا رنگ کاغذ کی مانند سپید ہو گیا بھاگا ہوا انسپٹر صاحب کی بیوی کے پاس گیا

”بی بی جی! میری انگلی میں صاحب کا اسٹرا لگ گیا ہے“

جب انسپٹر صاحب کی بیوی نے قاسم کی انگلی کو تیسری مرتبہ زخمی دیکھا تو فوراً معاملے کو سمجھ گئی چپ چاپ اٹھی اور کپڑا نکال کر اس کی انگلی پر باندھ دیا اور کہا ”قاسم! اب تم ہمارے گھر میں نہیں رہ سکتے۔“

”کیوں بی بی جی!“

”یہ صاحب سے پوچھنا“

”صاحب کا نام سنتے ہی قاسم کا رنگ اور پیلا پڑ گیا۔“

چار بجے کے قریب انسپٹر صاحب دفتر سے لوٹے اور اپنی بیوی سے قاسم کی نئی حرکت سن کر اسے فوراً اپنے پاس بلایا۔

”کیوں میاں یہ انگلی ہر روز زخمی کرنے کے کیا معنی؟“

قاسم خاموش کھڑا رہا

”تم نوکر لوگ یہ سمجھتے ہو کہ ہم اندھے ہیں اور ہمیں بار بار دھوکا دیا جا سکتا ہے

اپنا بوریا بستر دبا کر تاک کی سیدھ میں یہاں سے بھاگ جاؤ ہمیں تم جیسے لوگ کروں
کی ضرورت نہیں ہے سمجھو۔“
”مگر۔۔۔۔۔ مگر صاحب!“

”صاحب کا بچہ۔۔۔ بھاگ جا یہاں سے تیری بقایا تنخواہ کا ایک پیسہ بھی نہیں
دیا جائے گا اب میں اور کچھ نہیں سننا چاہتا۔“
قاسم کا افسوس نہ ہوا بلکہ اسے خوشی محسوس ہوئی کہ چلو کام سے کچھ دیر کے لیے
چھٹی مل گئی گھر سے نکل کر وہ اپنی زخمی انگلی سے بے پروا سیدھا چوپائی پہنچا، اور
وہاں ساحل کے پاس ایک بیچ پر لیٹ گیا اور خوب سویا۔

چند دنوں کے بعد اس کی انگلی کا زخم بد احتیاطی کے باعث سپٹک ہو گیا سارا
ہاتھ سوج گیا جس دوست کے پاس وہ ٹھہرا تھا اس نے اپنی دانست کے مطابق
اس کا بہتر علاج کیا مگر تکلیف بڑھتی گئی آخر قاسم خیراتی ہسپتال میں داخل ہو گیا
جہاں اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔

اب جب کبھی قاسم اپنا کٹا ہوا ٹنڈ منڈ ہاتھ بڑھا کر فلورافاؤنٹین کے پاس
لوگوں سے بھیک مانگتا ہے تو اسے وہ بلیڈ یاد آ جاتا ہے جس نے اسے بہت بڑی
مصیبت سے نجات دلائی اب وہ جس وقت چاہے سر کے نیچے اپنی گڈڑی رکھ کر
فٹ پاتھ پر سو سکتا ہے اس کے پاس ٹین کا ایک چھوٹا سا سمجھ کا ہے جس کو کبھی نہیں
مانجھتا اس لیے کہ اسے انسپکٹر صاحب کے گھر کے وہ برتن یاد آ جاتے تھے جو کبھی ختم
ہونے میں نہیں آتے تھے۔

☆☆☆☆☆☆

قبض

نے لکھے ہوئے مکالمے کا گنڈمیرے ہاتھ میں تھا، یکٹر اور ڈائریکٹر کمرے کے پاس سامنے کھڑے تھے شوٹنگ میں ابھی کچھ دیر تھی اس لیے کہ اسٹوڈیو کے ساتھ والا صابن کا کارخانہ چل رہا تھا ہر روز اس کارخانے کے شور کی بدولت ہمارے سیٹھ صاحب کا کافی نقصان ہوتا تھا کیونکہ شوٹنگ کے دوران جب ایک ایسی اس کارخانے کی کوئی مشین چلنا شروع ہو جاتی تو کئی کئی ہزار فٹ فلم کا ٹکڑا بیکار ہو جاتا اور ہمیں نئے سرے سے کئی سینوں کی دوبارہ شوٹنگ کرنا پڑتی۔

ڈائریکٹر صاحب ہیرو اور ہیروئن کے درمیان کمرے کے پاس کھڑے سگریٹ پی رہے تھے اور میں ستانے کی خاطر کرسی پر ناگوں سمیت بیٹھا تھا وہ یوں کہ میری دونوں نائلیں کرسی کی نشست پر تھیں اور میرا بوجھ نشست کی بجائے ان پر تھا میری اس عادت پر بہت لوگوں کو اعتراض ہے مگر یہ واقعہ ہے کہ مجھے اصلی آرام صرف اسی طریقے پر بیٹھنے سے ملتا ہے۔

میںنا جس کی دونوں آنکھیں بھیگی تھیں ڈائریکٹر صاحب کے پاس آیا اور کہنے لگا ”صاحب! وہ بولتا ہے کہ جموڑا کا مہاتی رہ گیا ہے پھر شور بند ہو جائے گا“

یہ روزمرہ کی بات تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ ابھی آدھ گھنٹے تک کارخانے میں صابن کٹتے اور ان پر ٹھسے کتے رہیں گے چنانچہ ڈائریکٹر صاحب ہیرو اور ہیروئن سمیت اسٹوڈیو سے باہر چلے گئے میں وہیں کرسی پر بیٹھا رہا۔

سفٹی لیپ کی کافی روشنی میں سیٹ پر جو چیزیں پڑی تھیں ان کا درمیانی

فاصلہ اصلی فاصلے سے کچھ زیادہ دکھائی دے رہا تھا اور گیسوے رنگ کے تھری پلائی وڈ کے تختے جو دیواروں کی صورت میں کھڑے تھے پست قد دکھائی دیتے تھے میں اس تبدیلی پر غور کر رہا تھا کہ پاس ہی سے آواز آئی ”السلام علیکم“ میں نے جواب دیا ”وعلیکم السلام“ اور مڑ کر دیکھا تو مجھے ایک نئی صورت نظر آئی میری آنکھوں میں ”تم کون ہو؟“ کا سوال تیر نے لگا آدمی ہوشیار تھا، فوراً کہنے لگا ”جناب میں آج ہی آپ کی کمپنی میں داخل ہوا ہوں۔۔۔۔۔ میرا نام عبدالرحمن ہے خاص دہلی شہر کا رہنے والا ہوں۔۔۔۔۔ آپ کا وطن بھی تو شاید دہلی ہی ہے۔“

میں نے کہا ”جی نہیں۔۔۔۔۔ میں پنجاب کا باشندہ ہوں“
عبدالرحمن نے جیب سے عینک نکالی ”معاف فرمائیے گا، چونکہ ڈائریکٹر صاحب نے عینک اتار دینے کا حکم دیا تھا اس لیے۔۔۔۔۔“

اس دوران میں نے عینک بڑی صفائی سے کانوں میں اٹکالی اور میری طرف پسندیدہ نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیا ”واللہ! میں تو یہی سمجھا تھا کہ آپ دہلی کے ہیں، یعنی آپ کی زبان میں قطعاً پنجابیت نہیں۔۔۔۔۔ ماشاء اللہ کیا مکالمہ نکلتا ہے۔۔۔۔۔ قلم توڑ دیا ہے واللہ۔۔۔۔۔ یہ سنو ری بھی تو آپ ہی نے لکھی ہے؟“
عبدالرحمن نے جب یہ باتیں کہیں تو اس کا قد بھی میری نظر میں تھری پلائی وڈ کے تختوں کی طرح پست ہو گیا میں نے روکھے پن کے ساتھ کہا ”جی نہیں“

وہ اور زیادہ چلکلا ہو گیا ”عجیب زمانہ ہے صاحب، جو اہلیتوں کے مالک ہیں ان کو کوئی پوچھتا ہی نہیں۔۔۔۔۔ یہ بمبئی شہر بھی تو میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا جب اوٹ پناگ زبان بولتے ہیں یہاں کے لوگ، پندرہ دن مجھے یہاں آئے ہو گئے

میں مگر کیا عرض کروں سخت پریشان ہو گیا ہوں۔۔۔۔۔ آج آپ سے ملاقات ہو گئی۔۔۔۔۔“ اس کے بعد اس نے اپنے ہاتھ سے مل کر اس روغن کی مروڑیاں بنانا شروع کر دیں جو چہرے پر لگاتے وقت اس کے ہاتھوں پر رہ گیا تھا۔

میں نے جواب میں صرف ”جی ہاں“ کر دیا اور وہ خاموش ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے کافد کھولا اور رواروی میں لکھے ہوئے مکالموں پر نظر ثانی شروع کر دی چند غلطیاں تھیں جن کو درست کرنے کے لیے میں نے اپنا قلم نکالا عبدالرحمن ابھی تک میرے پاس کھڑا تھا مجھے اس کے کھڑے ہونے کے انداز سے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہے چنانچہ میں نے پوچھا ”فرمائیے“

اس نے بڑی لجاجت کے ساتھ کہا ”میں ایک بات عرض کروں“

”بڑے شوق سے“

”آپ اس طرح باتیں اوپر کر کے نہ بیٹھا کریں“

”کیوں؟“

اس نے جھک کر کہا ”بات یہ ہے کہ اس طرح بیٹھنے سے قبض ہو جایا کرتا ہے“

”قبض؟“

میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی ”قبض کیسے ہو سکتا ہے“ یہ کہہ کر میرے جی میں آئی کہ اس سے کہوں ”میاں ہوش کی دوا کرو۔۔۔۔۔ گھاس تو نہیں کھا گئے۔۔۔۔۔ مجھے اس طرح بیٹھتے بیس برس ہو گئے۔۔۔۔۔ آج کیا تمہارے کہنے سے مجھے قبض ہو جائے گا“ مگر میں یہ سوچ کر چپ ہو گیا کہ بات بڑھ جائے گی اور مجھے بیکار کی مغز دردی کرنا پڑے گی۔

وہ مسکرایا عینک کے شیشوں کے پیچھے اس کی آنکھوں کے آس پاس کا گوشت
 سکڑ گیا ”آپ نے مذاق سمجھا ہے حالانکہ صحیح بات یہی ہے کہ ٹائٹلیں جوڑ کر پیٹ
 کے ساتھ لگا کر بیٹھنے سے معدے کی حالت خراب ہو جاتی ہے۔۔۔ میں نے تو
 اپنی ناجیز رائے پیش کی ہے مائیں نہ مائیں یہ آپ کو اختیار ہے۔“

میں جب مشکل میں پھنس گیا اس کو اب میں کیا جواب دیتا قبض۔۔۔۔۔ یعنی
 قبض ہو جائے گا، بیس برس کے دوران میں مجھے قبض نہ ہوا لیکن آج اس مسخرے
 کے کہنے سے مجھے قبض ہو جائے گا قبض کھانے پینے سے ہوتا ہے نہ کہ کرسی یا کوچ پر
 بیٹھنے سے جس طرح میں کرسی پر بیٹھتا ہوں اس سے تو آدمی کو راحت ہوتی ہے
 دوسروں کو نہ سہی لیکن مجھے تو اس سے آرام ملتا ہے۔ اور یہ سچی بات ہے کہ مجھے
 ٹائٹلیں جوڑ کر سینے کے ساتھ لگا کر دینے سے ایک خاص قسم کی فرحت حاصل ہوتی
 ہے اسٹوڈیو میں عام طور پر شوٹنگ کے دوران میں کھڑا رہنا پڑتا ہے جس سے آدمی
 تھک جاتا ہے دوسرے نامعلوم کس طریقے سے اپنی تھکن دور کرتے ہیں مگر میں تو
 اسی طریقے سے دور کرتا ہوں کسی کے کہنے پر میں اپنی یہ عادت کبھی نہیں چھوڑ سکتا
 خواہ قبض کے بجائے مجھے سرسام ہو جائے۔ یہ ضد نہیں، دراصل بات یہ ہے کہ
 کرسی پر اس طرح بیٹھنے کا اندازہ میری عادت نہیں بلکہ میرے جسم کا ایک جائز
 مطالبہ ہے۔

جیسا کہ میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں اکثر لوگوں کو میرے اس طرح
 بیٹھنے کے انداز پر اعتراض رہا ہے اس اعتراض کی وجہ نہ میں نے ان لوگوں سے
 کبھی پوچھی ہے اور نہ انہوں نے کبھی خود بتائی ہے اعتراض کی وجہ خواہ کچھ بھی ہو

میں اس معاملے میں اچھی سے اچھی دلیل سننے کے لیے بھی تیار نہیں کوئی آدمی مجھے قائل نہیں کر سکتا۔

جب عبدالرحمن نے مجھ پر نکتہ چینی کی تو میں ہنسنا گیا اور ان کا یوں شکر یہ ادا کیا جیس کوئی یہ کہے ”لعنت ہو تم پر“

اس شکرینے کی رسید کے طور پر اس نے اپنے مولے ہونٹوں پر میلی سی مسکراہٹ پیدا کی اور خاموش ہو گیا اتنے میں ڈائریکٹر بیرہ اور ہیروئن آگئے اور شوٹنگ شروع ہو گئی میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ چلو اسی بہانے سے عبدالرحمن کے قبض سے نجات حاصل ہوئی۔

اس کی پہلی ملاقات پر ذیل کی باتیں میرے دماغ میں آئیں

- 1 یہ ایکسٹرا جو کمپنی میں نیا بھرتی ہوا ہے بہت بڑا چغند ہے۔
- 2 یہ ایکسٹرا جو کمپنی میں نیا بھرتی ہوا ہے سخت بدتمیز ہے۔
- 3 یہ ایکسٹرا جو کمپنی نے نیا بھرتی کیا ہے پر لے درجے کا مغز چاٹ ہے۔
- 4 یہ ایکسٹرا جو کمپنی میں نیا داخل ہوا ہے مجھے اس سے بے حد نفرت پیدا ہو گئی ہے۔

اگر مجھے کسی شخص سے نفرت پیدا ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی زندگی کچھ عرصے کے لیے زیادہ متحرک ہو جائے گی میں نفرت کرنے کے معاملے میں کافی مہارت رکھتا ہوں آپ پوچھیں گے بھلا نفرت کرنے میں مہارت کی کیا ضرورت ہے، لیکن میں آپ سے کہوں گا کہ ہر کام کرنے کے لیے ایک خاص سلیقے

کی ضرورت ہوتی ہے اور نفرت میں چونکہ شدت زیادہ ہے اس لیے اس کے حامل کا ماہر ہونا اشد ضروری ہے محبت ایک عام چیز ہے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر ماسٹر ٹارک سب محبت کرتے آئے ہیں مگر نفرت بہت کم لوگوں نے کی ہے اور جنہوں نے کی ہے ان میں سے اکثر کو اس کا سلیقہ نہیں آیا نفرت محبت کے مقابلے میں بہت زیادہ لطیف اور شفاف ہے محبت میں محاسن ہے جو اگر زیادہ دیر تک قائم رہے تو دل کا ذائقہ خراب ہو جاتا ہے مگر نفرت میں ایک ایسی ترشی ہے جو دل کا قوام درست رکھتی ہے۔

میں تو اس بات کا قائل ہوں کہ نفرت اس طریقے سے کرنا چاہیے کہ اس میں محبت کرنے کا مزہ ملے شیطان سے نفرت کرنے کا جو سبق ہمیں مذہب نے سکھایا ہے مجھے اس سے سو فیصدی اتفاق ہے یہ ایک ایسی نفرت ہے جو شیطان کی شان کے خلاف نہیں اگر دنیا میں شیطان نام کی کوئی ہستی موجود ہے تو وہ یقیناً اس نفرت سے جو کہ اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے خوش ہوتی ہوگی اور کچھ پوچھیے تو یہ عالمگیر نفرت ہی شیطان کی زندگی کا ثبوت ہے اگر ہمیں اس سے نہایت ہی بھونڈے طریقے پر نفرت کرنا سکھایا جاتا تو دنیا ایک بہت بڑی ہستی کے تصور سے خالی ہوتی۔

میں نے عبدالرحمن سے نفرت کرنا شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میری اور اس کی دونوں کی زندگی میں حرکت پیدا ہو گئی اسٹوڈیو میں اور اسٹوڈیو کے باہر جہاں کہیں اس سے میری ملاقات ہوتی میں اس کی خیریت دریافت کرتا اور اس سے دیر تک باتیں کرتا رہتا۔

عبدالرحمن خوش تھا کہ چند ہی دنوں میں وہ اتنا مقبول ہو گیا اور میں خوش تھا کہ دوسرے ایکسٹرا اس سے حسد کرنے لگے ہیں میں نے موقع دیکھ کر سیٹھ سے سفارش کی چنانچہ تیسرے مہینے اس کی تنخواہ میں دس روپے کا اضافہ بھی ہو گیا اس کا

یہ نتیجہ ہوا کہ کمپنی کے پچیس ایکسٹراؤں کی آنکھوں میں وہ خاربہن کے کھٹکنے لگا اطف یہ ہے کہ عبدالرحمن کو اس بات کی مطلق خبر نہ تھی کہ میری وجہ سے اس کی تنخواہ میں اضافہ ہوا ہے اور میری سفارشوں کے باعث کمپنی کے دوسرے ڈائریکٹر اس سے کام لینے لگے ہیں۔

فلم کمپنی میں کام کرنے کے علاوہ وہاں کے ایک مقامی ہفتہ وار اخبار کو بھی ایڈیٹ کرتا ہوں ایک روز میں نے اپنا اخبار عبدالرحمن کے ہاتھ میں دیکھا جب وہ میرے قریب آیا تو مسکرا کر اس نے پرچے کی ورق گردانی شروع کر دی ”منشی صاحب۔۔۔۔۔ یہ رسالہ آپ ہی۔۔۔۔۔“

میں نے فوراً ہی جواب دیا ”جی ہاں“

ماشاء اللہ، کتنا خوبصورت پرچہ نکالتے ہیں آپ۔۔۔۔۔ کل رات اتفاق سے یہ میرے ہاتھ آگیا۔۔۔۔۔ بہت دلچسپ ہے، اب میں ہر ہفتے خرید کر پڑھوں گا۔

یہ اس نے اس انداز میں کہا جیسے مجھ پر احسان کر رہا ہے میں نے اس کا شکریہ ادا کر دیا، چنانچہ بات ختم ہو گئی۔

کچھ دنوں کے بعد جبکہ میں اسٹوڈیو کے باہر نیم کے پیڑ تلے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھا اپنے اخبار کے لیے ایک کالم لکھ رہا تھا عبدالرحمن آیا اور بڑے ادب کے ساتھ ایک طرف کھڑا ہو گیا میں نے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا فرمائیے

”آپ فارغ ہو جائیں تو میں۔۔۔۔۔“

”میں فارغ ہوں۔۔۔۔۔ فرمائیے آپ کو کیا کہنا ہے؟“

اس کے جواب میں اس نے ایک رنگین لفافے کو کھولا اور اپنی تصویر میری طرف بڑھادی تصویر ہاتھ میں لیتے ہی جب میری نظر اس پر پڑی تو مجھے بے اختیار ہنسی آگئی یہ ہنسی چونکہ بے اختیار آئی تھی اس لیے میں اسے روک نہ سکا بعد میں جب مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ عبدالرحمن کو یہ ناگوار معلوم ہوئی ہوگی تو میں نے کہا ”عبدالرحمن صاحب اتفاق دیکھئے میں صبح سے پریشان تھا کہ ٹائل جج کے بعد کا صفحہ کیسے پر ہوگا دو تصویروں کے ہلاک مل گئے تھے مگر ایک کی کمی تھی۔۔۔ اس وقت بھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ آپ نے اپنا فوٹو میری طرف بڑھادیا۔۔۔ بہت اچھا فوٹو ہے ہلاک بھی اس کا خوب بنے گا۔“

عبدالرحمن نے اپنے موٹے ہونٹ اندر کی طرف سکیڑ لیے ”آپ کی بڑی عنایت ہے۔۔۔ تو۔۔۔ تو کیا یہ تصویر چھپ جائے گی؟“

میں نے تصویر کو ایک نظر اور دیکھا اور مسکرا کر کہا ”کیوں نہیں۔۔۔ اس ہفتے ہی کے لیے تو میں یہ کہہ رہا تھا“

اس پر عبدالرحمن نے دوبارہ شکریہ ادا کیا ”پرچے میں تصویر کے ساتھ ایک چھوٹا سا نوٹ نکل جائے تو میں اور بھی ممنون ہوں گا۔۔۔ جیسا آپ مناسب خیال فرمائیں۔۔۔ تو۔۔۔ تو۔۔۔ معاف کیجئے۔ میں آپ کے کام میں خلل ہو رہا ہوں“

یہ کہہ کر وہ اپنے ہاتھ آہستہ آہستہ ملتا ہوا چلا گیا۔

میں نے اب تصویر کو غور سے دیکھا آری مانگ نکلی ہوئی تھی، ایک ہاتھ میں بمبئی کی بھاری بھر کم ڈائریکٹری تھی جس پر چھپے ہوئے حروف بتا رہے تھے کہ سن

سولہ کی یہ کتاب فوٹو گرافر نے اپنے گاہکوں کو تعلیم یافتہ دکھانے کے لیے ایک یاد دہانے میں خریدی ہوگی دوسرے ہاتھ میں جو اوپر کواٹھا ہوا تھا ایک بہت بڑا پائپ تھا اس پائپ کی ٹوٹی عبدالرحمن نے اس انداز سے اپنے منہ کی طرف بڑھائی تھی کہ معلوم ہوتا تھا چائے کا پیالہ پکڑے ہے۔ لبوں پر چائے کا گھونٹ پیتے وقت جو ایک خفیف سا ارتعاش پیدا ہوا کرتا ہے وہ تصویر میں اس کے ہونٹوں پر جما ہوا دکھائی دیتا تھا آنکھیں کیمرے کی طرف دیکھنے کے باعث کھل گئی تھیں، ناک کے نتھنے تھوڑے پھول گئے تھے سینے میں ابھار پیدا کرنے کی کوشش راہیگا نہیں گئی تھی کیونکہ وہ اچھا خاصا کارٹون بن گیا تھا۔ یاد رہے کہ عبدالرحمن انگریزی لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتا اور تمباکو سے پرہیز کرتا ہے۔

میں نے اپنی گرہ سے دام خرچ کر کے اس کے فوٹو کا بلاک بنوایا اور وعدے کے مطابق ایک تعریفی نوٹ کے ساتھ پرچے میں چھوپا دیا۔

دوسرے روز دس بجے کے قریب میں کمپنی کے غلیظ ریسٹوران میں بیٹھا کڑوی چائے پی رہا تھا کہ عبدالرحمن تازہ پرچہ جس میں اس کی تصویر چھپی تھی ہاتھ میں لیے داخل ہوا اور آداب عرض کر کے میری کرسی کے پاس کھڑا ہو گیا اس کے ہونٹ اندر کی طرف سمٹ رہے تھے، آنکھوں کے آس پاس کا گوشت سکڑ رہا تھا، جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ممنون ہو رہا ہے بغل میں پرچہ دبا کر اس نے ہاتھ بھی ملنے شروع کر دیئے شکرینے کے کئی فقرے اس نے دل ہی دل میں بنائے ہوں گے مگر ناموزوں سمجھ کر انہیں منسوخ کر دیا ہو گا جب میں نے اسے اس ادھیڑ بن میں دیکھا تو ماتم پرسی کے انداز میں اس سے کہا ”تصویر چھپ گئی آپ

کی۔۔۔۔۔؟“نوٹ بھی پڑھ لیا آپ نے۔۔۔۔۔؟

”جی ہاں۔۔۔۔۔آپ کی بڑی نوازش ہے۔“

ایک دم میرے سینے میں درد کی ٹیس اٹھی میرا رنگ پیلا پڑ گیا یہ درد بہت پرانا ہے جس کے دورے مجھے اکثر پڑتے رہتے ہیں میں اس کے دفعے کے لیے سینکڑوں علاج کر چکا تھا مگر لا حاصل چائے پیتے پیتے یہ درد ایک دم اٹھا اور سارے سینے میں پھیل گیا عبدالرحمن نے میری طرف غور سے دیکھا اور گھبرائے ہوئے لہجہ میں کہا ”آپ کے دشمنوں کی طبیعت ما ساز معلوم ہوتی ہے۔“

میں اس وقت ایسے موڈ میں تھا کہ دشمنوں کو بھی اس موڈی مرض کا شکار ہوتے نہ دیکھ سکتا، چنانچہ میں نے بڑے روکھے پن کے ساتھ کہا ”کچھ نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں“

”جی نہیں، آپ کی طبیعت ما ساز ہے۔۔۔۔۔“وہ سخت گھبرا گیا ”میں۔۔۔۔۔

میں۔۔۔۔۔میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں، آپ مطلق فکر نہ کریں۔۔۔۔۔سینے میں معمولی سا درد ہے، ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔“

”سینے میں درد ہے۔۔۔۔۔“یہ کہہ کر تھوڑی دیر کے لیے سوچ میں پڑ گیا ”سینے میں درد ہے تو۔۔۔۔۔تو اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ کو قبض ہے اور قبض۔۔۔۔۔“

قریب تھا کہ میں بھنا کر اس کو دو تین گالیاں سنا دوں مگر میں نے ضبط سے کام لیا۔ ”آپ۔۔۔۔۔حد کرتے ہیں آپ۔۔۔۔۔سینے کے درد سے قبض کو کیا

تعلق؟“

”جی نہیں۔۔۔ قبض ہو تو ایک سو ایک بیماری پیدا ہو جاتی ہے اور سینے کا درد تو یقیناً قبض ہی کا نتیجہ ہے۔۔۔ آپ کی آنکھوں کی زردی صاف ظاہر کرتی ہے کہ آپ کو پرانا قبض ہے اور جناب قبض کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ کو ایک دو روز تک اجابت نہ ہو، جی نہیں، آپ جس کو با فراغت اجابت سمجھتے ہیں ممکن ہے وہ قبض ہو۔۔۔۔۔ سینہ اور پیٹ تو پھر بالکل پاس پاس ہیں قبض سے تو سر میں درد شروع ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ آپ۔۔۔۔۔ دراصل آپ کی کمزوری کا باعث بھی یہی قبض ہے۔“

عبدالرحمن چند لمحات کے لئے بالکل خاموش ہو گیا لیکن فوراً ہی اس نے اپنے لہجہ میں زیادہ چکناہٹ پیدا کر کے کہا ”آپ نے کئی ڈاکٹروں کا علاج کیا ہو گا۔۔۔۔۔ ایک معمولی سا علاج میرا بھی کر دیکھئے۔۔۔۔۔ خدا کے حکم سے یہ مرض بالکل دور ہو جائے گا۔“

میں نے پوچھا ”کون سا مرض؟“

عبدالرحمن نے زور زور سے ہاتھ ملے ”یہی۔۔۔۔۔ یہی قبض“

لاحول و لا، اس بیوقوف سے کس نے کہہ دیا کہ مجھے قبض ہے، صرف میرے سینے میں درد ہے جو کہ بہت پرانا ہے اور سب ڈاکٹروں کی متفقہ رائے ہے کہ اس کا باعث اعصاب کی کمزوری ہے مگر یہ نیم حکیم خطرہ جان برابر کہے جا رہا ہے کہ مجھے قبض ہے، قبض ہے، قبض ہے، کہیں ایسا نہ ہو میں اس کے سر پر غصے میں آ کر چائے کا پیالہ دے ماروں عجب نامعقول آدمی ہے، اپنی طبابت کا پتارہ کھول بیٹھا ہے اور

کسی کو سنتا ہی نہیں۔

غصے کے باعث میں بالکل خاموش ہو گیا اس خاموشی کا عبدالرحمن نے فائدہ اٹھایا اور قبض کا علاج بتانا شروع کر دیا خدا معلوم اس نے کیا کیا کچھ کہا۔۔۔۔۔

”بات یہ ہے کہ پیٹ میں آپ کے سدے پڑ گئے ہیں آپ کو روز اجابت تو ہو جاتی ہے مگر یہ سدے باہر نہیں نکلتے معدے کا فعل چونکہ درست نہیں رہا اس لیے انتڑیوں میں خشکی پیدا ہو گئی ہے۔ رطوبت یعنی وہ لیس وار مادہ جو فضلہ کو نیچے پھسلنے میں مدد دیتا ہے آپ کے اندر بہت کم ہو گیا ہے اس لیے میرا خیال ہے کہ رفع حاجت کے وقت آپ کو ضرورت سے زیادہ زور لگانا پڑتا ہوگا قبض کھولنے کے لیے عام طور پر جو انگریزی مسہل دوائیں بازار میں بکتی ہیں بجائے فائدے کے نقصان پہنچاتی ہیں اس لیے کہ ان سے عادت پڑ جاتی ہے اور جب عادت پڑ جائے تو آپ خیال فرمائیے کہ ہر روز پاخانہ لانے کے لیے آپ کو دو تین آنے خرچ کرنے پڑیں گے۔۔۔ یونانی دوائیں اول تو ہم لوگوں کے مزاج کے موافق ہیں دوسرے۔۔۔۔۔“

میں نے تنک آ کر اس سے کہا ”آپ چائے پیئیں گے؟“ اور اس کا جواب سنے بغیر ہٹل والے کو آرڈر دیا ”گلاب، ان کے لیے ایک ڈبل چائے لاؤ“

چائے فوراً ہی آگئی، عبدالرحمن کرسی گھسیٹ کر بیٹھا تو میں اٹھ کھڑا ہوا ”معاف کیجئے گا، مجھے ڈائریکٹر صاحب کے ساتھ ایک سمن کے متعلق بات چیت کرنا ہے۔۔۔ پھر کبھی گفتگو ہوگی۔“

یہ سب کچھ اس قدر جلد ہی میں ہوا کہ قبض کی باقی داستان عبدالرحمن کی زبانی پر

منجھد ہو گئی اور میں ریسٹوران سے باہر نکل گیا اور شروع ہونے کے باعث میری طبیعت خراب ہو گئی تھی، اس کی باتوں نے اس تکرار میں اور بھی اضافہ کر دیا میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیوں اس بات پر مصر ہے کہ مجھے قبض ہے میری صحت دیکھ کر وہ کہہ سکتا تھا کہ میں مدقوق ہوں جیسا کہ عام لوگ میرے متعلق کہتے آئے ہیں وہ یہ کہہ سکتا تھا کہ مجھے سل ہے میری انٹریوں میں ورم ہے، میرے معدے میں رسولی ہے، میرے دانت خراب ہیں مجھے گھسیا ہے مگر بار بار اس کا اس بات پر زور دینا کیا معنی رکھتا تھا کہ مجھے قبض ہو رہا ہے یعنی اگر مجھے واقعی قبض تھا تو اس کا احساس مجھے پہلے ہونا چاہیے تھا نہ کہ حافظ عبدالرحمن کو؟۔۔۔۔۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ خواہ مخواہ مجھے قبض کا بیمار کیوں بنا رہا تھا۔

ہوٹل سے نکل کر میں ڈائریکٹر صاحب کے کمرے میں چلا گیا وہ کرسی پر بیٹھے ہیرو، ولن اور تین چار ایکسٹراؤں کے ساتھ نہیں ہانک رہے تھے آؤٹ ڈور شوٹنگ چونکہ بادلوں کے باعث ملتوی کر دی گئی تھی اس لیے سب کو چھٹی تھی مجھے جب ہیرو کے پاس بیٹھے تین چار منٹ گزر گئے تو معلوم ہوا کہ حافظ عبدالرحمن کی باتیں ہو رہی ہیں میں ہمد تن گوش ہو گیا ایک ایکسٹرا نے اس کے خلاف کافی زہر لگایا دوسرے نے اس کی مختلف عادات کا مشککہ اڑایا تیسرے نے اس کے مکالمہ ادا کرنے کی نقل اتاری ہیرو کو حافظ عبدالرحمن کے خلاف یہ شکایت تھی کہ وہ اس کی بول چال میں زبان کی غلطیاں نکالتا رہتا ہے ولن نے ڈائریکٹر صاحب سے کہا ”بڑاواہیات آدمی ہے صاحب، کل ایک آدمی سے کہہ رہا تھا کہ میرا ایکٹنگ بالکل فضول ہے آپ اس کو ایک بار ڈراؤنٹ بنا دیجئے۔“

ڈاکٹر یکٹر صاحب مسکرا کر کہنے لگے ”تم سب کو اس کے خلاف شکایت ہے مگر اسے میرے خلاف ایک زبردست شکایت ہے“

تین چار آدمیوں نے اسے پوچھا ”وہ کیا؟“

ڈاکٹر یکٹر صاحب نے پہلی مسکراہٹ کو طویل بنا کر کہا ”وہ کہتا ہے کہ مجھے دائمی قبض ہے جس کے علاج کی طرف میں نے کبھی غور نہیں کیا میں اس کو کئی بار یقین دلا چکا ہوں کہ مجھے قبض و ابض نہیں ہے لیکن وہ مانتا نہیں ابھی تک اس بات پر اڑا ہوا ہے کہ مجھے قبض ہے کئی علاج مجھے بتا چکا ہے میں سمجھتا ہوں کہ وہ مجھے اس طرح ممنون کرنا چاہتا ہے“

میں نے پوچھا ”وہ کیسے“

”یہ کہنے سے کہ مجھے قبض ہے اور پھر اس کا علاج بتانے سے۔۔۔۔۔ وہ مجھے ممنون ہی تو کرنا چاہتا ہے اور نہ پھر اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔؟ بات دراصل یہ ہے کہ اسے صرف اسی مرض کا علاج معلوم ہے یعنی اس کے پاس چند ایسی دوائیں موجود ہیں جن سے قبض دور ہو سکتا ہے چونکہ مجھے وہ خاص طور پر ممنون کرنا چاہتا ہے اس لیے ہر وقت اس تاک میں رہتا ہے کہ جو بھی مجھے قبض ہو وہ فوراً علاج شروع کر کے مجھے ٹھیک کر دے۔۔۔۔۔ آدمی دلچسپ ہے۔“

ساری بات میری سمجھ میں آگئی اور میں نے زور زور سے ہنسا شروع کر دیا۔“

ڈاکٹر یکٹر صاحب۔۔۔۔۔ آپ کے علاوہ حافظ صاحب کی نظر عنایت خاکسار پر بھی ہے۔۔۔۔۔ میں نے کل ان کا فونو اپنے پرچے میں چھپوایا ہے اس احسان کا بدلہ اتارنے کے لیے ابھی ابھی ہوٹل میں انہوں نے مجھے یقین دلانے کی کوشش

کی کہ مجھے زبردست قبض ہو رہا ہے۔۔۔ خدا کا شکر ہے کہ میں ان کے اس حملے سے بچ گیا اس لیے کہ مجھے قبض نہیں ہے۔“

اس گفتگو کے چوتھے روز مجھے قبض ہو گیا، یہ قبض ابھی تک جاری ہے یعنی اس کو پورے دو مہینے ہو گئے ہیں میں کئی پیسٹ دوائیں استعمال کر چکا ہوں مگر ابھی تک اس سے نجات حاصل نہیں ہوئی اب میں سوچتا ہوں کہ حافظ عبدالرحمن کو اپنی خواہش پوری کرنے کا ایک موقع دے دیں کیا حرج ہے۔۔۔۔۔ مجھے اس سے محبت تو ہے نہیں۔

☆☆☆☆☆☆

کالی شلوار

دہلی آنے سے پہلے وہ انبالہ چھاؤنی میں تھی جہاں کئی گورے اس کے گاہک تھے ان گوروں سے ملنے جلنے کے باعث وہ انگریزی کے دس پندرہ جملے سیکھ گئی تھی ان کو وہ عام گفتگو میں استعمال نہیں کرتی تھی لیکن جب وہ دہلی میں آئی اور اس کا کاروبار نہ چلا تو ایک روز اس نے اپنی پڑوسن طمنچہ جان سے کہا ”دس لیف۔۔۔۔۔ ویری بیڈ“ یعنی یہ زندگی بہت بری ہے جبکہ کھانے ہی کو نہیں ملتا۔

انبالہ چھاؤنی میں اس کا دھندا بہت اچھی طرح چلتا تھا چھاؤنی کے گورے شراب پی کر اس کے پاس آ جاتے تھے اور وہ تین چار گھنٹوں ہی میں آٹھ دس گوروں کو نمنا کر بیس تیس روپے پیدا کر لیا کرتی تھی یہ گورے اس کے ہم وطنوں کے مقابلے میں بہت اچھے تھے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایسی زبان بولتے تھے جس کا مطلب سلطانہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر ان کی زبان سے یہ اعلیٰ اس کے حق میں بہت اچھی ثابت ہوتی تھی اگر وہ اس سے کچھ رعایت چاہتے تو وہ سر ہلا کر کہہ دیا کرتی تھی ”صاحب! ہماری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آتا“ اور اگر وہ اس سے ضرورت سے زیادہ چھیڑ چھاڑ کرتے تو وہ ان کو اپنی زبان میں گالیاں دینا شروع کر دیتی تھی وہ حیرت سے اس کے منہ کی طرف دیکھتے تو وہ ان سے کہتی ”صاحب! تم ایک دم الو کا پٹھا ہے حرامزادہ ہے۔۔۔۔۔ سمجھا“ یہ کہتے وقت وہ اپنے لہجہ میں تختی پیدا نہ کرتی بلکہ بڑے پیار کے ساتھ ان سے باتیں کرتی یہ گورے ہنس دیتے اور ہنستے وقت وہ سلطانہ کو بالکل الو کے چٹھے دکھائی دیتے۔

ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینوں میں۔۔۔۔۔ بیس روپے ماہوار تو اس کو چھے کا کرایہ تھا جس کو مالک مکان انگریزی زبان میں فلیٹ کہتا تھا اس فلیٹ میں اپنا پانخانہ تھا جس میں زنجیر کھینچنے سے ساری گندگی پانی کے زور سے ایک دم نیچل میں غائب ہو جاتی تھی اور بڑا شور ہوتا تھا شروع شروع میں تو اس شور نے

خدا بخش اور سلطانہ کا آپس میں کیسے سمبندھ ہوا ایک لمبی کہانی ہے خدا بخش راولپنڈی کا تھا انفرنس پاس کرنے کے بعد اس نے لاری چلانا سیکھا، چنانچہ چار

برس تک وہ راولپنڈی اور کشمیر کے درمیان لاری چلانے کا کام کرتا رہا اس کے بعد کشمیر میں اس کی دوستی ایک عورت سے ہو گئی اس کو بھگا کر وہ لاہور لے آیا لاہور میں چونکہ اس کو کوئی کام نہ ملا اس نے عورت کو پیشے بٹھا دیا دو تین برس تک یہ سلسلہ جاری رہا اور وہ عورت کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی خدا بخش کو معلوم ہوا کہ وہ انبالے میں ہے وہ اس کی تلاش میں انبالے آیا جہاں اس کو سلطانہ مل گئی سلطانہ نے اس کو پسند کیا چنانچہ دونوں کو سمبندھ ہو گیا۔

خدا بخش کے آنے سے ایک دم سلطانہ کا کاروبار چمک اٹھا۔ عورت چونکہ نوعیت الاعتقاد تھی اس لیے اس نے سمجھا کہ خدا بخش بڑا بھگوان ہے جس کے آنے سے اتنی ترقی ہو گئی چنانچہ اس خوش اعتقادی نے خدا بخش کی وقعت اس کی نظروں میں اور بھی بڑھادی۔

خدا بخش آدمی مخفی تھا سارا دن ہاتھ پر ہاتھ دھڑک رہتا پسند نہیں کرتا تھا چنانچہ اس نے ایک فوٹو گرافر سے دوستی پیدا کی جو ریلوے اسٹیشن کے باہر منٹ کیمرے سے فوٹو کھینچتا تھا اس سے اس نے فوٹو کھینچنا سیکھ لیا پھر سلطانہ سے ساتھ روپے لے کر کیمرہ بھی خرید لیا آہستہ آہستہ ایک پردہ بنوایا دو کرسیاں خریدیں اور فوٹو دھونے کا سب سامان لے کر اس نے علیحدہ اپنا کام شروع کر دیا۔

کام چل نکلا چنانچہ اس نے جموڑی ہی دیر کے بعد اپنا اڈا انبالے چھانوئی میں قائم کر دیا یہاں وہ گوروں کے فوٹو کھینچتا رہتا ایک مہینے کے اندر اندر اس کی چھانوئی کے متعدد گوروں سے واقفیت ہو گئی، چنانچہ وہ سلطانہ کو وہیں لے گیا یہاں چھانوئی میں خدا بخش کے ذریعہ سے کئی گورے سلطانہ کے مستقل گاہک بن گئے اور اس کی

آمدنی پہلے سے دوگنی ہوگئی۔

سلطانہ نے کانوں کے لئے بندے خریدے، ساڑھے پانچ تولے کی آنٹھ کٹنیاں بھی بنوالیں دس پندرہ اچھی اچھی ساڑھیاں بھی جمع کر لیں گھر میں فرنیچر وغیرہ بھی آگیا قصہ مختصر یہ کہ انبالہ چھاؤنی میں وہ بڑی خوش حال تھی مگر ایک ایسی نہ جانے خدا بخش کے دل میں کیا سائی کہ اس نے وہی جانے کی ٹھان لی سلطانہ انکار کیسے کرتی جبکہ خدا بخش کو اپنے لیے بہت مبارک خیال کرتی تھی اس نے خوشی خوشی وہی جانا قبول کر لیا بلکہ اس نے یہ بھی سوچا کہ اتنے بڑے شہر میں جہاں لائٹ صاحب رہتے ہیں اس کا وحندا اور بھی اچھا چلے گا اپنی سہیلیوں سے وہ وہی کی تعریف سن چکی تھی پھر وہاں حضرت نظام الدین اولیاء کی خانقاہ تھی جس سے اسے بے حد عقیدت تھی، چنانچہ جلدی جلدی گھر کا بھاری سامان سچے باج کر وہ خدا بخش کے ساتھ وہی آگئی یہاں پہنچ کر خدا بخش نے بیس روپے ماہوار پر ایک چھوٹا سا فلیٹ لے لیا جس میں وہ دونوں رہنے لگے۔

ایک ہی قسم کے نئے مکانوں کی لمبی سی قطار سڑک کے ساتھ چلی گئی تھی میونسپل کمیٹی نے شہر کا یہ حصہ خاص کسبیوں کے لئے مقرر کر دیا تھا تا کہ وہ شہر میں جگہ جگہ اپنے اڈے نہ بنائیں نیچے دکانیں تھیں اور اوپر وہ منزلہ رہائشی فلیٹ چونکہ سب عمارتیں ایک ہی ڈیزائن کی تھیں اس لئے شروع شروع میں سلطانہ کو اپنا فلیٹ تلاش کرنے میں بہت وقت محسوس ہوتی تھی پر جب نیچے لائڈری والے نے اپنا بورڈ گھر کی پیشانی پر لگا دیا تو اس کو ایک کچی نشانی مل گئی ”یہاں میلے کپڑوں کی دھلائی کی جاتی ہے“ یہ بورڈ پڑھتے ہی وہ اپنا فلیٹ تلاش کر لیا کرتی تھی اسی طرح

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

گا بک تھا جس سے تین روپے میں سودا طے ہوا اس کے بعد پانچ اور آئے یعنی تین مہینے میں چھ، جن سے سلطانہ نے صرف ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کیے۔
 تین روپے ماہوار تو فلیٹ کے کرایہ میں چلے جاتے تھے، پانی کا ٹیکس اور بجلی کا بل جدا تھا اس کے علاوہ گھر کے دوسرے خرچ تھے کھانا پینا، کپڑے لٹے، دوا دارو اور آمدن کچھ بھی نہیں تھی ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینوں میں آئیں تو اسے آمدن تو نہیں کہہ سکتے سلطانہ پریشان ہو گئی ساڑھے پانچ تو لے کی آٹھ گنتیاں جو اس نے انبالے میں بنوائی تھیں آہستہ آہستہ بک گئیں آخری کنگنی کی جب باری آئی تو اس نے خدا بخش سے کہا ”تم میری سنو اور چلو واپس انبالے میں یہاں کیا دھرا ہے۔۔۔؟“ بھی ہوگا، پر ہمیں تو یہ شہر اس نہیں آیا تمہارا کام بھی وہاں خوب چلتا تھا چلو، وہیں چلتے ہیں جو نقصان ہو اس کو اپنا سر صدقہ سمجھو اس کنگنی کو بیچ کر آؤ، میں اسباب وغیرہ باندھ کر تیار رکھتی ہوں آج رات کی گاڑی یہاں سے چل دیں گے۔“

خدا بخش نے کنگنی سلطانہ کے ہاتھ سے لے لی اور کہا ”نہیں جان من! انبالہ اب نہیں جائیں گے، یہیں وہی میں رہ کر مانگیں گے یہ تمہاری چوڑیاں سب کی سب یہیں واپس آئیں گی اللہ پر بھروسہ رکھو وہ بڑا کارساز ہے یہاں بھی وہ کوئی نہ کوئی اسباب بنا ہی دے گا۔“

سلطانہ چپ ہو رہی، چنانچہ آخری کنگنی بھی ہاتھ سے اتر گئی بچے ہاتھ دیکھ کر اس کو بہت دیکھ ہوا تھا پر کیا کرتی، پیٹ بھی تو آخر کسی حیلے سے بھرنا تھا۔
 جب پانچ مہینے گزر گئے اور آمدن خرچ کے مقابلے میں چوتھائی سے بھی کچھ کم

رہی تو سلطانہ کی پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی خدا بخش بھی سارا دن اب گھر سے غائب رہنے لگا تھا سلطانہ کو اس کا بھی دکھ تھا اس میں کوئی شک نہیں کہ پڑوس میں اس کی دو تین ملنے والیاں موجود تھیں جن کے ساتھ وہ اپنا وقت کاٹ سکتی تھی پر ہر روز ان کے یہاں جانا اور گھنٹوں بیٹھے رہنا اس کو بہت برا لگتا تھا چنانچہ آہستہ آہستہ اس نے ان سہیلیوں سے ماننا جانا بالکل ترک کر دیا سارا دن وہ اپنے سنان مکان میں بیٹھی رہتی کبھی چھالیا کالتی رہتی، کبھی پرانے اور پھٹے ہوئے کپڑوں کو سستی رہتی اور کبھی بالکونی میں آ کر جھنگے کے ساتھ کھڑی ہو جاتی اور سامنے ریلوے شید میں ساکت اور متحرک انجنوں کی طرف گھنٹوں بے مطلب دیکھتی رہتی۔

سڑک کی دوسری طرف مال گودام تھا جو اس کو نے سے اس کو نے تک پھیلایا ہوا تھا وہاں ہاتھ کولو ہے کی چھت کے نیچے بڑی بڑی گانٹھیں پڑی رہتی تھیں اور ہر قسم کے مال اسباب کے ڈھیر سے لگے رہتے تھے ہائیں ہاتھ کو کھلا میدان تھا جس میں بے شمار ریل کی پٹریاں بچھی ہوئی تھیں دھوپ میں لوہے کی یہ پٹریاں چمکتیں تو سلطانہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی جن پر نیلی نیلی رگیں بالکل ان پٹریوں کی طرح ابھری رہتی تھیں اس لمبے اور کھلے میدان میں ہر وقت انجن اور گاڑیاں چلتی رہتی تھیں، کبھی اوپر کبھی ادھر، ان انجنوں اور گاڑیوں کی چمک چمک پھمک سدا گونجتی رہتی تھی صبح سویرے جب وہ اٹھ کر بالکونی میں آتی تو ایک عجیب سا اسے نظر آتا دھندلے میں انجنوں کے منہ سے گاڑھا گاڑھا دھواں نکلتا تھا اور گدے آسمان کی جانب مولے اور بھاری آدمیوں کی طرح اٹھتا دکھائی دیتا تھا۔ بھاپ کے بڑے بڑے بادل بھی ایک شور کے ساتھ پٹریوں سے اٹھتے تھے اور

آنکھ جھپکنے کی دیر میں ہوا کے اندر گھل مل جاتے تھے پھر کبھی کبھی جب وہ گاڑی کے کسی ڈبے کو جسے انجن نے دھکا دے کر چھوڑ دیا ہوا کیلے پٹریوں پر چلتا دیکھتی تو اسے اپنا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ اسے بھی کسی نے زندگی کی پٹری پر دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے اور وہ خود بخود جارہی ہے دوسرے لوگ کانٹے بدل رہے ہیں اور وہ چلی جارہی ہے۔۔۔۔۔ نہ جانے کہاں؟ پھر ایک روز ایسا آئے گا جب اس دھکے کا زور آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گا اور وہ کہیں رک جائے گی کسی ایسے مقام پر جو اس کا دیکھا بھالا نہ ہوگا۔

یوں تو وہ بے مطلب گھنٹوں ریل کی ان میز جی بانکی پٹریوں اور ٹھہرے اور چلتے ہوئے انجنوں کی طرف دیکھتی رہتی تھی پر طرح طرح کے خیال اس کے دماغ میں آتے رہتے تھے انبالہ چھاؤنی میں جب وہ رہتی تھی تو اسٹیشن کے پاس ہی اس کا مکان تھا مگر وہاں اس نے کبھی ان چیزوں کو ایسی نظروں سے نہیں دیکھا تھا اب تو کبھی کبھی اس کے دماغ میں یہ بھی خیال آتا کہ یہ جو سامنے ریل کی پٹریوں کا جال سا بچھا ہے اور جگہ جگہ سے بھاپ اور دھواں اٹھ رہا ہے ایک بہت بڑا پدکلہ ہے بہت سی گاڑیاں ہیں جن کو چند موٹے موٹے انجن ادھر ادھر دھکیلتے رہتے ہیں سلطان کو تو بعض اوقات یہ انجن سیٹھ معلوم ہوتے جو کبھی کبھی انبالہ میں اس کے ہاں آیا کرتے تھے پھر کبھی کبھی جب وہ کسی انجن کو آہستہ آہستہ گاڑیوں کی قطار کے پاس سے گزرتا دیکھتی تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ کوئی آدمی چپکے کے کسی بازار میں سے اوپر کونٹوں کی طرف دیکھتا جا رہا ہے۔

سلطانہ سمجھتی تھی کہ ایسی باتیں سوچنا دماغ کی خرابی کا باعث ہے، چنانچہ جب

اس قسم کے خیال اس کو آنے لگے تو اس نے بالکونی میں جانا چھوڑ دیا خدا بخش سے اس نے بار بار کہا ”دیکھو، میرے حال پر رحم کرو یہاں گھر میں رہا کرو میں سارا دن یہاں بیماروں کی طرح پڑی رہتی ہوں“ مگر اس نے ہر بار سلطانہ سے یہ کہا کہ اس کی تشفی کر دی ”جان من۔۔۔۔۔ میں باہر کچھ ممانے کی فکر کر رہا ہوں اللہ نے چاہا تو چند دنوں ہی میں بیڑا پار ہو جائے گا۔“

پورے پانچ مہینے ہو گئے تھے مگر ابھی تک نہ سلطانہ کا بیڑا پار ہوا تھا نہ خدا بخش کا۔

محرم کا مہینہ سر پر آ رہا تھا مگر سلطانہ کے پاس کالے کپڑے بنوانے کے لیے کچھ بھی نہ تھا مختار نے ہیڈی ہینملٹن کی ایک نئی وضع کی قمیص بنوائی تھی جس کی آستینیں کالی جارجٹ کی تھیں اس کے ساتھ بیچ کرنے کے لیے اس کے پاس کالی سائن کی شلوار تھی جو کاجل کی طرح چمکتی تھی انوری نے ریشمی جارجٹ کی ایک بڑی نفیس ساڑھی خریدی تھی اس نے سلطانہ سے کہا تھا کہ وہ اس ساڑھی کے نیچے سفید بوسکی کا بیڑا کوٹ پہنے گی کیونکہ یہ نیا فیشن ہے اس ساڑھی کے ساتھ پہننے کو انوری کالی جمل کا ایک جوتا لائی تھی جو بڑا نازک تھا سلطانہ نے جب یہ تمام چیزیں دیکھیں تو اس کو اس احساس نے بہت دکھ دیا کہ وہ محرم منانے کے لیے ایسا لباس خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتی۔

انوری اور مختار کے پاس یہ لباس دیکھ کر جب وہ گھر آئی تو اس کا دل بہت مغموم تھا اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چھوڑا سا اس کے اندر پیدا ہو گیا ہے گھر بالکل خالی تھا خدا بخش حسب معمول باہر تھا دیر تک وہ درمی پرگاؤ تک یہ سر کے نیچے رکھ کر لینی

رہی، پر جب اس کی گردن اونچائی کے باعث اکڑ سی گئی تو اٹھ کر باہر بالکونی میں چلی گئی تاکہ غم افزا خیالات کو اپنے دماغ میں سے نکال دے۔

سامنے میز یوں پر گاڑیوں کے ڈبے کھڑے تھے پر انجن کوئی بھی نہ تھا شام کا وقت تھا چمڑ کاؤ ہو چکا تھا اس لیے گردوغبار دب گیا تھا بازار میں ایسے آدمی چلنے شروع ہو گئے تھے جو تاک جھانک کرنے کے بعد چپ چاپ گھروں کا رخ کرتے ہیں ایسے ہی ایک آدمی نے گردن اونچی کر کے سلطانہ کی طرف دیکھا سلطانہ مسکرا دی اور اس کو بھول گئی کیونکہ اب سامنے میز یوں پر ایک انجن نمودار ہو گیا تھا سلطانہ نے غور سے اس کی طرف دیکھا شروع کیا اور آہستہ آہستہ یہ خیال اس کے دماغ میں آیا کہ انجن نے بھی کالا لباس پہن رکھا ہے یہ عجیب و غریب خیال دماغ میں سے نکالنے کی خاطر جب اس نے سڑک کی جانب دیکھا تو اسے وہی آدمی بیل گاڑی کے پاس کھڑا نظر آیا جس نے اس کی طرف الپائی نظروں سے دیکھا تھا سلطانہ نے ہاتھ سے اسے اشارہ کیا اس آدمی نے ادھر ادھر دیکھ کر ایک لطیف اشارے سے پوچھا، کدھر سے آؤں، سلطانہ نے اسے راستہ بتا دیا وہ آدمی جموڑی دیر کھڑا رہا مگر پھر بڑی پھرتی سے اوپر چلا آیا۔

سلطانہ نے اسے درمی پر بٹھایا جب وہ بیٹھ گیا تو اس نے سلسلہ گفتگو شروع کرنے کے لیے کہا ”آپ اوپر آتے ڈر رہے تھے“ وہ آدمی یہ سن کر مسکرایا ”تمہیں کیسے معلوم ہوا۔۔۔ ڈرنے کی بات ہی کیا تھی؟“ اس پر سلطانہ نے کہا ”یہ میں نے اس لیے کہا کہ آپ دیر تک وہیں کھڑے رہے اور پھر کچھ سوچ کر ادھر آئے“ وہ یہ سن کر پھر مسکرایا ”تمہیں غلط فہمی ہوئی میں تمہارے اوپر والے فلیٹ کی طرف

دیکھ رہا تھا وہاں کوئی عورت کھڑی ایک مرد کو ٹھیکہ کا دکھا رہی تھی مجھے یہ منظر پسند آیا پھر بالکونی میں سبز باب روشن ہوا تو میں کچھ دیر کے لیے ٹھہر گیا سبز روشنی مجھے پسند ہے آنکھوں کو بہت اچھی لگتی ہے“ یہ کہہ کر اس نے کمرے کا جائزہ لیتا شروع کر دیا پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا سلطانہ نے پوچھا ”آپ جا رہے ہیں؟“ اس آدمی نے جواب دیا ”نہیں، میں تمہارے اس مکان کو دیکھنا چاہتا ہوں چلو مجھے تمام کمرے دکھاؤ“

سلطانہ نے اس کو تینوں کمرے ایک ایک کر کے دکھائے اس آدمی نے بالکل خاموشی سے ان کمروں کا معائنہ کیا جب وہ دونوں پھر اسی کمرے میں آگئے جہاں پہلے بیٹھے تھے تو اس آدمی نے کہا ”میرا نام شکر ہے“

سلطانہ نے پہلی بار غور سے شکر کی طرف دیکھا وہ متوسط قد کا معمولی شکل و صورت کا آدمی تھا مگر اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر صاف اور شفاف تھیں کبھی کبھی ان میں ایک عجیب قسم کی چمک بھی پیدا ہوتی تھی گٹھلیا اور کسرتی بدن تھا کنپٹیوں پر اس کے بال سفید ہو رہے تھے خاکستری رنگ کی گرم پتلون پہنے تھا سفید قمیص تھی جس کا کالر گردن پر سے اوپر کواٹھا ہوا تھا۔

شکر کچھ اس طرح درمی پر بیٹھا تھا کہ معلوم ہوتا تھا شکر کے بجائے سلطانہ گاہک ہے اس احساس نے سلطانہ کو قدرے پریشان کر دیا چنانچہ اس نے شکر سے کہا ”فرمائیے۔۔۔۔۔“

شکر بیٹھا تھا، یہ سن کر لیٹ گیا ”میں کیا فرماؤں، کچھ تم ہی فرماؤ، بلایا تمہیں نے ہے مجھے“ جب سلطانہ کچھ نہ بولی تو وہ اٹھ بیٹھا ”میں سمجھا، لو اب مجھ سے سنو، جو کچھ تم نے سمجھا، غلط ہے، میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کچھ دے کر جاتے

ہیں ڈاکٹروں کی طرح میری بھی فیس ہے مجھے جب بلایا جائے تو فیس دینا ہی پڑتی ہے۔“

سلطانہ یہ سن کر چکرا گئی مگر اس کے باوجود اسے بے اختیار ہنسی آگئی ”آپ کام کیا کرتے ہیں؟“

شکر نے جواب دیا ”یہی جو تم لوگ کرتے ہو“

”کیا؟“

”تم کیا کرتی ہو؟“

”میں۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ میں کچھ بھی نہیں کرتی“

”میں بھی کچھ نہیں کرتا“

سلطانہ نے بھنا کر کہا ”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔۔۔۔۔ آپ کچھ نہ کچھ تو ضرور کرتے ہوں گے۔“

شکر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا ”تم بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرتی ہوگی“

”جھک مارتی ہوں“

”میں بھی جھک مارتا ہوں“

”تو آؤ وہ نون جھک ماریں“

”میں حاضر ہوں مگر جھک مارنے کے دام میں کبھی نہیں دیا کرتا“

”ہوش کی دو اکرو۔۔۔۔۔ یہ لٹکر خانہ نہیں“

”اور میں بھی والنیر نہیں ہوں“

سلطانہ یہاں رک گئی اس نے پوچھا ”یہ والنیر کون ہوتے ہیں“

شکر نے جواب دیا ”الو کے پٹھے“

”میں بھی الو کی پٹھی نہیں“

”مگر وہ آدمی خدا بخش جو تمہارے ساتھ رہتا ہے ضرور الو کا پٹھا ہے“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ وہ کئی دنوں سے ایک ایسے خدا رسیدہ فقیر کے پاس اپنی قسمت کھلانے کی خاطر جا رہا ہے جس کی اپنی قسمت زنگ لگے تا لے کی طرح بند ہے“
یہ کہہ کر شکر ہنسا

اس پر سلطانہ نے کہا ”تم ہندو ہو، اسی لیے ہمارے ان بزرگوں کا مذاق اڑاتے ہو۔“

شکر مسکرایا ”ایسی جگہوں پر ہندو مسلم سوال پیدا نہیں ہوا کرتے، چنڈت مالویہ اور مسٹر جناح اگر یہاں آئیں تو وہ بھی شریف آدمی بن جائیں“

”جانے تم کیا اوٹ چنا لگ باتیں کرتے ہو۔۔۔۔۔ بولور ہو گے؟“

”اسی شرط پر جو میں پہلے بتا چکا ہوں“

سلطانہ اٹھ کھڑی ہوئی ”تو جاؤ رستہ پکڑو“

شکر آرام سے اٹھا پتلون کی جیبوں میں اس نے اپنے ہاتھ ٹھونسنے اور جاتے ہوئے کہا ”میں کبھی کبھی اس بازار سے گزرا کرتا ہوں جب بھی تمہیں میری ضرورت ہو بلا لینا۔۔۔۔۔ میں بہت کام کا آدمی ہوں“

شکر چلا گیا اور سلطانہ کا لے لباس کو بھول کر دیر تک اس کے متعلق سوچتی رہی اس آدمی کی باتوں نے اس کے دکھ کو بہت ہلکا کر دیا تھا اگر وہ انبالے میں آیا ہوتا

جہاں کہ وہ خوشحال تھی تو اس نے کسی اور ہی رنگ میں اس آدمی کو دیکھا ہوتا اور بہت ممکن ہے کہ اسے دیکھنے دے کر باہر نکال دیا ہوتا مگر یہاں چونکہ وہ بہت ادا اس رہتی تھی اس لیے شکر کی باتیں اسے پسند آئیں۔

شام کو جب خدا بخش آیا تو سلطانہ نے اس سے پوچھا ”تم آج سارا دن کدھر غائب رہے ہو؟“

خدا بخش تھک کر چور چور ہو رہا تھا، کہنے لگا ”پرانے قلعہ کے پاس سے آ رہا ہوں وہاں ایک بزرگ کچھ دنوں سے ٹھہرے ہوئے ہیں انہی کے پاس ہر روز جاتا ہوں کہ ہمارے دن پھر جائیں۔۔۔۔۔“

”کچھ انہوں نے تم سے کہا؟“

”نہیں ابھی وہ مہربان نہیں ہوئے۔۔۔۔۔ پر سلطانہ، میں جوان کی خدمت کر رہا ہوں وہ اکارت کبھی نہیں جائے گی، اللہ کا فضل شامل حال رہا تو ضرور وارے نیارے ہو جائیں گے۔“

سلطانہ کے دماغ میں محرم منانے کا خیال سلایا ہوا تھا، خدا بخش سے روئی آواز میں کہنے لگی ”سارا سارا دن باہر غائب رہتے ہو۔۔۔۔۔ میں یہاں پنجرے میں قید رہتی ہوں، نہ کہیں جاسکتی ہوں نہ آسکتی ہوں محرم سر پر آگیا ہے، کچھ تم نے اس کی بھی فکر کی کہ مجھے کالے کپڑے چاہئیں گھر میں پھوٹی کوڑی تک نہیں گئیں تھیں سو وہ ایک ایک کر کے بگ گئیں، اب تم ہی بتاؤ کیا ہوگا؟۔۔۔۔۔ یوں فقیروں کے پیچھے کب تک مارے مارے پھرا کر رہ گئے مجھے تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ یہاں وہابی میں خدا نے بھی ہم سے منہ موڑ لیا ہے میری سنو تو اپنا کام شروع کر دو کچھ تو

سہارا ہو ہی جائے گا۔“

خدا بخش دری پر لیٹ گیا اور کہنے لگا ”پر یہ کام شروع کرنے کے لیے بھی تو
تھوڑا بہت سرمایہ چاہیے۔۔۔۔۔ خدا کے لیے اب ایسی دکھ بھری باتیں نہ کرو
مجھ سے اب برداشت نہیں ہو سکتیں میں نے سچ مچ انبالہ چھوڑے میں سخت غلطی
کی، پر جو کرتا ہے اللہ ہی کرتا ہے اور ہماری بہتری ہی کے لیے کرتا ہے، کیا پتا ہے
کہ کچھ دیر اور تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد ہم۔۔۔۔۔“

سلطانہ نے بات کاٹ کر کہا ”تم خدا کے لیے کچھ کرو چوری کرو یا ڈاکہ مارو، پر
مجھے ایک شلوار کا کپڑا ضرور لا دو میرے پاس سفید بو سکی کی ایک قمیص پڑی ہے،
اس کو میں کالا رنگوا لوں گی سفید نیون کا ایک نیا دوپٹہ بھی میرے پاس موجود ہے،
وہی جو تم نے مجھے دیوالی پر لا کر دیا تھا، یہ بھی قمیص کے ساتھ ہی کالا رنگوا لیا جائے
گا۔ ایک صرف شلوار کی کسر ہے، سو وہ تم کسی نہ کسی طرح پیدا کر دو۔۔۔۔۔ دیکھو
تمہیں میری جان کی قسم، کسی نہ کسی طرح ضرور لا دو۔۔۔۔۔ میری بھتی کھاؤ
اگر نہ لاؤ“

خدا بخش اٹھ بیٹھا ”اب تم خواہ مخواہ زور دینے چلی جا رہی ہو۔۔۔۔۔ میں
کہاں سے لاؤں گا۔۔۔۔۔ افیم کھانے کے لیے تو میرے پاس پیسہ نہیں“
”کچھ بھی کرو مگر مجھے ساڑھے چار گز کالی ساٹن لا دو“
”وہا کرو کہ آج رات ہی اللہ دو تین آدمی بھیج دے“

”لیکن تم کچھ نہیں کرو گے۔۔۔۔۔ تم اگر چاہو تو ضرور اتنے پیسے پیدا کر سکتے ہو
جنگ سے پہلے یہ ساٹن بارہ چودہ آنے گز مل جاتی تھی اب سوارو پے گز کے حساب

سے ملتی ہے ساڑھے چار گزوں پر کتنے روپے خرچ ہو جائیں گے؟“
 ”اب تم کہتی ہو تو میں کوئی حیلہ کروں گا“ یہ کہہ کر خدا بخش اٹھا ”لو اب ان
 باتوں کو بھول جاؤ، میں ہوٹل سے کھانا لے آؤں“

ہوٹل سے کھانا آیا دونوں نے مل کر زہر مار کیا اور سو گئے صبح ہوئی خدا بخش
 پر اپنے قلعے والے فقیر کے پاس چلا گیا اور سلطانہ کیلے رہ گئی کچھ دیر لیٹی رہی، کچھ
 دیر سوئی رہی ادھر ادھر کمروں میں شہتی رہی، دوپہر کا کھانا کھایا کھانے کے بعد اس
 نے اپنا سفید نینون کا وہ پلہ اور سفید بوسکی کی قمیص نکالی اور نیچے لانڈی والے کورنگٹنے
 کے لیے دے آئی کپڑے دھونے کے علاوہ وہاں رنگٹنے کا کام بھی ہوتا تھا۔

یہ کام کرنے کے بعد اس نے واپس آ کر فلموں کی کتابیں پڑھیں جن میں اس
 کے کئی دیکھے ہوئے فلموں کی کہانی اور گیت چھپے ہوئے تھے یہ کتابیں پڑھتے
 پڑھتے وہ سو گئی، جب اٹھی تو چار بج چکے تھے کیونکہ دھوپ آگن میں موری کے
 پاس پہنچ چکی تھی نہادھو کر فارغ ہوئی تو گرم چادر واڑھ کر بالکونی میں آکھڑی ہوئی
 قریباً ایک گھنٹہ سلطانہ بالکونی میں کھڑی رہی اب شام ہو گئی تھی بتیاں روشن ہو رہی
 تھیں نیچے سڑک میں رونق کے آثار نظر آنے لگے تھے سردی میں جموڑی سی شدت
 ہو گئی تھی مگر سلطانہ کو یہ ناگوار معلوم نہ ہوئی وہ سڑک پر آتے جاتے ناگلوں اور
 موٹروں کی طرف ایک عرصہ سے دیکھ رہی تھی دفعتاً اسے شکر نظر آیا مکان کے نیچے
 پہنچ کر اس نے گردن اونچی کی اور سلطانہ کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا سلطانہ نے غیر
 ارادی طور پر ہاتھ کا اشارہ کیا اور اسے اوپر بلا لیا۔

جب شکر اوپر آ گیا تو سلطانہ بہت پریشان ہوئی کہ اس سے کیا کہے دراصل

اس نے ایسے ہی باسو پے سمجھے اسے اشارہ کر دیا تھا شکر بے حد مطمئن تھا جیسے اس کا اپنا گھر ہے، چنانچہ بڑی بے تکلفی سے پہلے روز کی طرح وہ گاؤں تک سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا جب سلطانہ نے دیر تک اس سے کوئی بات نہ کی تو اس نے کہا ”تم مجھے سو دفعہ بلا سکتی ہو اور سو دفعہ کہہ سکتی ہو کہ چلے جاؤ۔۔۔۔۔ میں ایسی باتوں پر ناراض نہیں ہوا کرتا“

سلطانہ شش و پنج میں گرفتار ہو گئی، کہنے لگی ”نہیں بیٹو، تمہیں جانے کو کون کہتا ہے“
شکر اس پر مسکرا دیا ”تو میری شرطیں تمہیں منظور ہے“
”کیسی شرطیں؟“ سلطانہ نے ہنس کر کہا ”کیا نکاح کر رہے ہو مجھ سے؟“
”نکاح اور شادی کیسی؟۔۔۔۔۔ نہ تم عمر بھر میں کسی سے نکاح کرو گی نہ میں یہ رسمیں ہم لوگوں کے لیے نہیں۔۔۔ چھوڑو ان فضولیات کو، کوئی کام کی بات کروں“

”بولو کیا بات کروں؟“

”تم عورت ہو۔۔۔۔۔ کوئی ایسی بات شروع کرو جس سے دو گھڑی دل بہل جائے اس دنیا میں صرف دکا نداری ہی دکا نداری نہیں، کچھ اور بھی ہے۔“
سلطانہ ذہنی طور پر اب شکر کو قبول کر چکی تھی کہنے لگی ”صاف صاف کہو، تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔“

”جو دوسرے چاہتے ہیں“ شکر اٹھ کر بیٹھ گیا

”تم میں اور دوسروں میں پھر فرق ہی کیا رہا“

”تم میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں ان میں اور مجھ میں زمین و آسمان کا فرق

ہے ایسی بہت سی باتیں ہوتی ہیں جو پوچھنا نہیں چاہئیں خود سمجھنا چاہئیں“
 سلطانہ نے تھوڑی دیر تک شکر کی اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی پھر کہا ”میں سمجھ
 گئی ہوں“

”تم کہو، کیا ارادہ ہے؟“
 ”تم جیتے، میں باری، پر میں کہتی ہوں آج تک کسی نے ایسی بات قبول نہ کی
 ہوگی۔“

”تم غلط کہتی ہو۔۔۔۔۔ اسی محلے میں تمہیں ایسی سادہ لوح عورتیں بھی مل
 جائیں گی جو کبھی یقین نہیں کریں گی کہ عورت ایسی ذلت قبول کر سکتی ہے جو تم بغیر
 کسی احساس کے قبول کرتی رہی ہو لیکن ان کے نہ یقین کرنے کے باوجود تم
 ہزاروں کی تعداد میں موجود ہو۔۔۔۔۔ تمہارا نام سلطانہ ہے نا؟“
 ”سلطانہ ہے ہے“

شکر اٹھ کھڑا ہوا اور ہنسنے لگا ”میرا نام شکر ہے۔۔۔۔۔ یہ نام بھی جب اوٹ
 پٹا لگ ہے، چلو آؤ اندر چلیں“

☆☆☆☆☆

شکر اور سلطانہ دری والے کمرے میں واپس آئے تو دونوں ہنس رہے تھے نہ جانے
 کس بات پر جب شکر جانے لگا تو سلطانہ نے کہا ”شکر میری ایک بات مانو گے؟“
 شکر نے جواباً کہا ”پہلے بات بتاؤ“
 سلطانہ کچھ چھینپ سی گئی ”تم کہو گے کہ میں دام وصول کرنا چاہتی ہوں مگر“
 ”کہو، کہو۔۔۔۔۔ رک کیوں گئی ہو“

سلطانہ نے جرات سے کام لے کر کہا ”بات یہ ہے کہ محرم آ رہا ہے اور میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ میں کالی شلوار بنواسکوں۔۔۔۔۔ یہاں کے سارے دکھڑے تو تم مجھ سے سن ہی چکے ہو قیص اور دوپٹہ میرے پاس موجود تھا جو میں نے آج رنگوانے کے لیے دے دیا ہے۔“

شکر نے یہ سن کر کہا ”تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں کچھ روپے دے دوں جو تم یہ کالی شلوار بنواسکو۔“

سلطانہ نے فوراً ہی کہا ”نہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ اگر ہو سکے تو تم مجھے ایک کالی شلوار بنا دو۔“

شکر مسکرایا ”میری جیب میں تو اتفاق ہی سے کبھی کچھ ہوتا ہے، بہر حال میں کوشش کروں گا محرم کی پہلی تاریخ کو تمہیں یہ شلوار مل جائے گی اے بس اب خوش ہو گئیں“ سلطانہ کے بندوں کی طرف دیکھ کر شکر نے پوچھا ”کیا یہ بندے تم مجھے دے سکتی ہو؟“

سلطانہ نے ہنس کر کہا ”تم انہیں کیا کرو گے چاندی کے معمولی بندے ہیں زیادہ سے زیادہ پانچ روپے کے ہوں گے۔“

اس پر شکر نے کہا ”میں نے تم سے بندے مانگے ہیں۔ ان کی قیمت نہیں پوچھی بولو دیتی ہو۔“

”لے لو“ یہ کہہ کر سلطانہ نے بندے اتار کر شکر کو دے دیئے اس کو بعد میں افسوس ہوا مگر شکر چاچکا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

سلطان کو قطعاً یقین نہیں تھا کہ شکر اپنا وعدہ پورا کرے گا مگر آٹھ روز کے بعد محرم کی پہلی تاریخ کو صبح نو بجے دروازے پر دستک ہوئی سلطان نے دروازہ کھولا تو شکر کھڑا تھا اخبار میں لپٹی ہوئی چیز اس نے سلطان کو دی اور کہا ”سائن کی کالی شلوار ہے۔۔۔۔۔ دیکھ لینا شاید لمبی ہو۔۔۔۔۔ اب میں چتا ہوں“

شکر شلوار روئے کر چلا گیا اور کوئی بات اس نے سلطان سے نہ کی اس کی پتلون میں شکنیں پڑی ہوئی تھیں بال بکھرے ہوئے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی سوکراٹھا ہے اور سیدھا دھڑی چلا آیا ہے۔

سلطان نے کانڈ کھولا سائن کی کالی شلوار تھی ایسی ہی جیسی کہ وہ انوری کے پاس دیکھ کر آئی تھی سلطان بہت خوش ہوئی بندوں اور اس سودے کا جو افسوس اسے ہوا تھا اس شلوار نے اور شکر کی وعدہ ایفائی نے دور کر دیا۔

وہ سپر کوہ نیچے لاندی والے سے اپنی رگی قمیص اور وہ پٹہ لے کر آئی تینوں کالے کپڑے اتنے جب پہن لیے تو دروازے پر دستک ہوئی سلطان نے دروازہ کھولا تو انوری اندر داخل ہوئی اس نے سلطان کے تینوں کپڑوں کی طرف دیکھا اور کہا ”قمیص اور وہ پٹہ تو رنکا ہوا معلوم ہوتا ہے، پر یہ شلوار نئی ہے۔۔۔۔۔ کب بنوائی؟“

سلطان نے جواب دیا ”آج ہی درزی لایا ہے“ یہ کہتے ہوئے اس کی نظریں انوری کے کانوں پر پڑیں ”یہ بندے تم نے کہاں سے لیے؟“

انوری نے جواب دیا ”آج ہی منگوائے ہیں“

اس کے بعد دونوں کو تھوڑی دیر تک خاموش رہنا پڑا۔

☆☆☆☆☆

کبوتروں والا سائیں

پنجاب کے ایک سردیہات کے تھکے میں مائی جیواں صبح سویرے ایک غلاف چڑھی قبر کے پاس زمین کے اندر کھدے ہوئے گڈھے میں بڑے بڑے ایلوں سے آگ ساگر رہی ہے صبح کے سرد اور غیالے دھندلے میں جب وہ اپنی پانی بھری آنکھوں کو سکیر کر اور اپنی کمر کو دہرا کر کے منہ قریب قریب زمین کے ساتھ لگا کر اوپر تلے رکھے ہوئے ایلوں کے اندر پھونک گھسیڑنے کی کوشش کرتی ہے تو زمین پر سے جھوڑی سی راکھ اڑتی ہے اور اس کے آدھے سفید اور آدھے کالے بالوں پر جو کہ گھسے ہوئے کمبل کا نمونہ پیش کرتے ہیں بیٹھ جاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بالوں میں جھوڑی سی سفیدی اور آگنی ہے۔

ایلوں کے اندر آگ سلگتی ہے اور یوں جو جھوڑی سی لال لال روشنی پیدا ہوتی ہے مائی جیواں کے سیاہ چہرے پر جھریوں کو اور نم لیاں کر دیتی ہے۔

مائی جیواں یہ آگ کئی مرتبہ ساگا چکی ہے یہ تکیہ یا چھوٹی سی خانقاہ جس کے اندر بنی ہوئی قبر کی بابت اس کے پرداوانے لوگوں کو یہ یقین دلایا تھا کہ وہ ایک بہت بڑے پیر کی آرام گاہ ہے، ایک زمانے سے ان کے قبضہ میں تھی گاما سائیں کے مرنے کے بعد اب اس کی ہوشیار بیوی اس تکیے کی مجاور تھی، گاما سائیں سارے گاؤں میں ہر دھڑیز تھا ذات کا وہ کمبار تھا مگر چونکہ اسے تکیے کی دیکھ بھال کرنا ہوتی تھی اس لیے اس نے برتن بنانے چھوڑ دیئے تھے، لیکن اس کے ہاتھ کی بنائی ہوئی کوئدیاں اب بھی مشہور ہیں بھنگ گھونٹنے کے لیے وہ سال بھر میں چھ کوئدیاں

میں آیا کرتا تھا اور گاماسائیں کے ہاتھ کا بنا ہوا پیالہ سردائی کا ضرور پیا کرتا تھا لیکن اب وہ بات نہ رہی تھی جب وہ گیارہ برس کا تھا تو مائی جیواں اس کے نام میں تھا نیدار کی بوسوگتہ سکتی تھی مگر جب اس نے بارہویں سال میں قدم رکھا تو اس کی حالت ہی بگڑ گئی خاصاً ٹکڑا جوانت صابر نہ جانے کیا ہوا کہ بس ایک دو برسوں میں ہی سچ مچ کا سائیں بن گیا تاکہ سے ریٹھ بننے لگا اور چپ چپ رہنے لگا۔ سر پہلے ہی سے چھوٹا تھا پر اب کچھ اور بھی چھوٹا ہو گیا اور منہ سے ہر وقت اعاب سانس نکلتے لگا پہلے پہل ماں کو اپنے بچے کی اس تبدیلی پر بہت صدمہ ہوا مگر جب اس نے دیکھا کہ اس کی تاک سے ریٹھ اور منہ سے اعاب بہتے ہی گاؤں کے لوگوں نے اس سے غیب کی باتیں پوچھنا شروع کر دی ہیں اس کی ہر جگہ خوب آؤ بھگت کی جاتی ہے تو اسے ڈھارس ہوتی کہ چلو یوں بھی تو سما ہی لے گا مانا مانا کیا تھا عبدالغفار جس کو اب کیوڑوں والا سائیں کہتے تھے، گاؤں میں پھر پھر آکر آنا چاول اکٹھا کر لیا کرتا تھا۔ وہ بھی اس لیے کہ اس کی ماں نے اس کے گھگھے میں ایک جھوٹی لٹکا دی تھی جس میں لوگ کچھ نہ کچھ ڈال دیا کرتے تھے کیوڑوں والا سائیں اسے اس لیے کہا جاتا تھا کہ اسے کیوڑوں سے بہت پیار تھا بٹکے میں جتنے کیوڑے تھے ان کی دیکھ بھال ابو پہلو ان سے زیادہ یہی کیا کرتا تھا۔

اس وقت وہ سامنے کوٹھڑی میں ایک ٹوٹی ہوئی کھاٹ پر اپنے باپ کا میلا کچیا لٹاف اوڑھے سو رہا تھا باہر اس کی ماں آگ ساگاری تھی۔۔۔۔۔

چونکہ سردیاں اپنے جو بن پر تھیں اس لیے گاؤں ابھی تک رات اور صبح کے دھوئیں میں لپٹا ہوا تھا یوں تو گاؤں میں سب لوگ بیدار تھے اور اپنے کام و چندوں

میں مصروف تھے مگر تکیہ جو کہ گاؤں سے فاصلہ پر تھا ابھی تک آباد نہ ہوا تھا، الہ تہ دور
 کو نے میں مائی جیواں کی بکری زور زور سے میار ہی تھی۔

مائی جیواں آگ ساگا کر بکری کے لیے چارہ تیار کرنے ہی لگی تھی کہ اسے اپنے
 پیچھے آہٹ سنائی دی مڑ کر دیکھا تو اسے ایک اجنبی سر پر ٹھانا اور مونا سا کھل
 اوڑھے نظر آیا پگڑی کے ایک پلو سے اس آدمی نے اپنا چہرہ آنکھوں تک چھپا رکھا
 تھا جب اس نے موٹی آواز میں ”مائی جیواں السلام علیکم“ کہا تو پگڑی کا کھر درا
 کپڑا اس کے منہ پر تین چار مرتبہ سکڑا اور پھینکا۔

مائی جیواں نے چارہ بکری کے آگے رکھ دیا اور اجنبی کو پہچاننے کی کوشش کیے
 بغیر کہا ”وعلیکم السلام! آؤ بھائی بیٹھو آگ تاپو“

مائی جیواں کمر پر ہاتھ رکھ کر اس گڑھے کی طرف بڑھی جہاں ہر روز آگ سلگتی
 رہتی تھی اجنبی اور وہ دونوں پاس پاس بیٹھ گئے جھوڑی دیر ہاتھ تپ کر اس آدمی نے
 مائی جیواں سے کہا ”ماں! اللہ بخشے گا ماسائیں مجھے باپ کی طرح چاہتا تھا اس کے
 مرنے کی خبر ملی تو مجھے بہت صدمہ ہوا مجھے آسپ ہو گیا تھا، قبرستان کا جن ایسا چمٹا
 تھا کہ اللہ کی پناہ، گا ماسائیں کے ایک ہی تعویذ سے یہ کالی بلا دور ہو گئی۔“

مائی جیواں خاموشی سے اجنبی کی باتیں سنتی رہی جو کہ اس کے شوہر کا بہت ہی
 معتقد نظر آتا تھا اس نے ادھر ادھر کی اور بہت سی باتیں کرنے کے بعد بڑھیا سے
 کہا ”میں بارہ کوس سے چل کر آیا ہوں ایک خاص بات کہنے کے لئے“ اجنبی نے
 رازداری کے انداز میں اپنے چاروں طرف دیکھا کہ اس کی بات کوئی اور تو نہیں
 سن رہا اور بچھے ہوئے لہجہ میں کہنے لگا ”میں سندرڈا کو کے گروہ کا آدمی ہوں پرسوں

رات ہم لوگ اس گاؤں پر ڈاکہ ڈالنے والے ہیں خون خرابہ ضرور ہوگا، اس لیے میں تم سے یہ کہنے آیا ہوں کہ اپنے لڑکوں کو دور ہی رکھنا میں نے سنا ہے کہ گاما سائیں مرحوم نے اپنے پیچھے دو لڑکے چھوڑے ہیں جو ان آدمیوں کا لہو ہے بابا، ایسا نہ ہو کہ جوش مارا ٹھے اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔۔۔۔۔ تم ان کو پرسوں گاؤں سے کہیں باہر بھیج دو تو ٹھیک رہے گا۔۔۔۔۔ بس مجھے یہی کہنا تھا میں نے اپنا حق ادا کر دیا ہے۔۔۔۔۔ السلام علیکم!“

اجنبی اپنے ہاتھوں کو آگ کے الاؤ پر زور زور سے مل کر اٹھا اور جس راستے سے آیا تھا اسی راستے باہر چلا گیا۔

سندر جاٹ بہت بڑا ڈاکو تھا اس کی دہشت اتنی تھی کہ مائیں اپنے بچوں کو اسی کانام لے کر ڈرایا کرتی تھیں بے شمار گیت اس کی بہادری اور بے باکی کے گاؤں کی جوان لڑکیوں کو یاد تھے اس کانام سن کر بہت سی کنواریوں کے دل دھڑکنے لگتے تھے سندر جاٹ کو بہت کم لوگوں نے دیکھا تھا مگر جب چوپال میں لوگ جمع ہوتے تھے تو ہر شخص اس سے اپنی اچانک ملاقات کے من گھڑت قصے سنانے میں ایک خاص لذت محسوس کرتا تھا اس کے قد و قامت اور ڈیل ڈول کے بارے میں مختلف بیان تھے بعض کہتے تھے کہ وہ بہت قد آور جوان ہے، بڑی بڑی مونچھوں والا ان مونچھوں کے بالوں کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ دو بڑے بڑے لیموں انکی مدد سے اٹھا سکتا ہے بعض لوگوں کا یہ بیان تھا کہ اس کا قد معمولی ہے مگر بدن اس قدر گٹھا ہوا ہے کہ گینڈے کا بھی نہ ہوگا بہر حال سب متفقہ طور پر اس کی طاقت اور بے باکی کے معترف تھے۔

جب مائی جیواں نے یہ سنا کہ سندرجاٹ ان کے گاؤں پر ڈاکہ ڈالنے کے لیے آ رہا ہے تو اس کے آئے اوسان خطا ہو گئے اور وہ اس انجینی کے سلام کا جواب تک نہ دے سکی اور نہ اس کا شکریہ ہی ادا کر سکی مائی جیواں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ سندرجاٹ کا ڈاکہ کیا معنی رکھتا ہے پچھلی دفعہ جب اس نے ساتھ والے گاؤں پر حملہ کیا تھا تو سکھی الہ مہاجن کی ساری جمع پونجی غائب ہو گئی تھی اور گاؤں کی سب سے سندرا اور چنچل چھو کری بھی ایسی گم ہوئی تھی کہ اب تک اس کا پتہ نہیں ملتا تھا یہ بلا اب ان کے گاؤں پر نازل ہونے والی تھی اور اس کا علم سوائے مائی جیواں کے گاؤں میں کسی اور کو نہ تھا مائی جیواں نے سوچا کہ وہ اس آنے والے بھونچال کی خبر کس کس کو دے۔۔۔۔۔ چودھری کے گھر خبر کر دے۔۔۔۔۔ لیکن نہیں وہ تو بڑے کمینے لوگ تھے پچھلے دنوں اس نے حمور اساساگ ان سے مانگا تھا تو انہوں نے انکار کر دیا تھا گھسیٹا رام حلوانی کو متنبہ کر دے۔۔۔ نہیں، وہ بھی ٹھیک آدمی نہیں تھا۔ وہ دیر تک ان ہی خیالات میں غرق رہی گاؤں کے سارے آدمی وہ ایک ایک کر کے اپنے دماغ میں لائی اور ان میں سے کسی ایک کو بھی اس نے مہربانی کے قابل نہ سمجھا اس کے علاوہ اس نے سوچا اگر اس نے کسی سے ہمدردی کے طور پر اس راز سے آگاہ کر دیا تو وہ کسی اور پر مہربانی کرے گا اور یوں سارے گاؤں والوں کو پتہ چل جائے گا جس کا نتیجہ اچھا نہیں ہو گا آخر میں وہ یہ فیصلہ کر کے اٹھی کہ اپنی ساری جمع پونجی نکال کر وہ سبز رنگ کی غلاف چڑھی قبر کے سر ہانے گاڑ دے گی اور رحمن کو پاس والے گاؤں میں بھیج دے گی۔

جب وہ سامنے والی کوٹھڑی کی طرف بڑھی تو دلیز میں اسے عبدالغفار یعنی

کبوتروں والا سائیں کھڑا نظر آیا۔ ماں کو دیکھ کر وہ ہنس اس کی یہ ہنسی آج خلاف معمول معنی خیز تھی مائی جیواں کو اس کی آنکھوں میں شہیدگی اور متانت کی جھلک بھی نظر آئی جو کہ ہوشمندی کی نشانی ہے۔

جب وہ کپڑی کے اندر جانے لگی تو عبدالغفار نے پوچھا ”ماں، یہ صبح سویرے کون آدمی آیا تھا؟“

عبدالغفار اس قسم کے سوال عام طور پر پوچھا کرتا تھا، اس لیے اس کی ماں جواب دینے بغیر اندر چلی گئی اور اپنے چھوٹے لڑکے کو جگانے لگی ”ارے رحمن، ارے رحمن اٹھ، اٹھ“

بازو جھنجھوڑ کر مائی جیواں نے اپنے چھوٹے لڑکے رحمان کو جگایا اور وہ جب آنکھیں مل کر اٹھ بیٹھا اور اچھی طرح ہوش میں آ گیا تو اس کی ماں نے اس کو ساری بات سنا دی رحمن کے تو اوسان خطا ہو گئے وہ بہت ڈر پوک تھا گو اس کی عمر اس وقت بائیس برس کی تھی اور کافی طاقتور جوان تھا مگر اس میں ہمت اور شجاعت نام تک کو نہ تھی سندر جاٹ!۔۔۔ اتنا بڑا ڈاکو، جس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ چھوٹا پھینکتا تھا تو پورے بیس گز کے فاصلے پر جا کر گرتا تھا، پرسوں ڈاکہ ڈالنے اور لوٹ مار کرنے کے لیے آ رہا تھا۔ وہ فوراً اپنی ماں کے مشورے پر راضی ہو گیا بلکہ یوں کہیے کہ وہ اسی وقت گاؤں چھوڑنے کی تیاریاں کرنے لگا۔

رحمن کو نیتی چمارن یعنی عنایت سے محبت تھی جو کہ گاؤں کی ایک بے باک شوخ اور چنچل لڑکی تھی گاؤں کے سب جوان لڑکے شباب کی یہ پوٹلی حاصل کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے مگر وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی بڑے بڑے

ہوشیار لڑکوں کو وہ باتوں باتوں میں اڑا دیتی تھی۔ چودھری دین محمد کے لڑکے فضل دین کو کلائی پکڑنے میں مائل حاصل تھا۔ اس فن کے بڑے بڑے ماہر دور دور سے اس کو نیچا دکھانے کے لیے آئے تھے مگر اس کی کلائی کسی سے بھی نہ مڑی تھی وہ گاہوں میں اکڑ اکڑ کر چلتا تھا مگر اس کی یہ ساری اکڑفوں نمیتی نے ایک ہی دن میں غائب کر دی جب اس نے دھان کے کھیت میں اس سے کہا ”فے! گنڈا سنگھ کی کلائی مروڑ کر تو اپنے من میں یہ مت سمجھ کہ بس اب تیرے مقابلے میں کوئی آدمی ہی نہیں رہا۔۔۔۔۔ آ، میرے سامنے بیٹھ، میری کلائی پکڑ، ان دو انگلیوں کی ایک ہی جھمکی سے تیرے دونوں ہاتھ نہ چھڑا دوں تو نمیتی نام نہیں۔۔۔۔۔“

فضل دین اس کو محبت کی نگاہوں سے دیکھتا تھا اور اسے یقین تھا کہ اس کی طاقت اور شہزوری کے رعب اور دبے میں آکر وہ خود بخود ایک روز رام ہو جائے گی اگر وہ انکار کرتا ہے تو نمیتی اور بھی سر پر چڑھ جاتی ہے اور اگر وہ اس کی دعوت قبول کرتا ہے تو لوگ یہی کہیں گے عورت ذات سے مقابلہ کرتے شرم تو نہیں آتی مرد کو اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کیا کرے چنانچہ اس نے نمیتی کی دعوت قبول کر لی تھی اور جیسا کہ لوگوں کا بیان ہے اس نے جب نمیتی کی گد رانی ہوئی کلائی اپنے ہاتھوں میں لی تو وہ سارے کا سارا کانپ رہا تھا نمیتی کی موٹی موٹی آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈھنس گئیں، ایک نعرہ بلند ہوا اور نمیتی کی کلائی فضل کی گرفت سے آزاد ہو گئی۔۔۔۔۔ اس دن سے لے کر اب تک فضل نے پھر کبھی کسی کی کلائی نہیں پکڑی۔

ہاں، تو اس نمیتی سے رحمن کو محبت تھی، جیسا کہ وہ آپ ڈرپوک تھا اسی طرح اس

رحمن کو بھی اس افتاد کا یقین تھا مگر اس کا ڈر پوک دل ہمیشہ اسے ڈھارس دیا کرتا تھا کہ نہیں، نیتی آخر تیری ہی باندی بنے گی اور وہ یوں خوش ہو جایا کرتا تھا۔ جب رحمن دس کوس طے کر کے دوسرے گاؤں میں پہنچنے کے لیے تیار ہو کر سکیے سے باہر نکلا تو اسے راستے میں نیتی کا خیال آیا مگر اس وقت اس نے یہ نہ سوچا کہ سندرجاٹ وصالہ والے والا ہے وہ دراصل نیتی کے تصور میں اس قدر رگن تھا اور اکیلے میں اس کے ساتھ من ہی من میں اتنے زوروں سے پیار و محبت کر رہا تھا کہ اسے کسی اور بات کا خیال ہی نہ آیا البتہ جب وہ گاؤں سے باہر کوس آگے نکل گیا

تو ایک اکیلی اس نے سوچا کہ نیتی کو تو بتا دینا چاہیے تھا کہ سندر جاٹ آ رہا ہے لیکن اب واپس کون جاتا۔

عبدالغفار یعنی کبوتروں والا سائیں تنکے سے باہر نکلا اس کے منہ سے لعاب نکل رہا تھا جو کہ میلے کرتے پر گر کر دیر تک گلیسرین کی طرح چمکتا رہتا تھا تنکے سے نکل کر سیدھا کھیتوں کا رخ کیا کرتا تھا اور سارا دن وہیں گزرتا تھا۔ شام کو جب ڈھور ڈنگر واپس گاؤں کو آتے تو ان کے چلنے سے جو دھول اڑتی ہے اس کے پیچھے کبھی کبھی غفار کی شکل نظر آ جاتی تھی گاؤں اس کو پسند نہیں تھا اجڑا اور سسٹان جگہوں سے اسے غیر محسوس طور پر محبت تھی یہاں بھی لوگ اس کا پیچھا نہ چھوڑتے تھے اور اس سے طرح طرح کے سوال پوچھتے تھے جب برسات میں دیر ہو جاتی تو قریب قریب سب کسان اس سے درخواست کرتے تھے کہ وہ پانی بھرے بادلوں کے لیے دعا مانگے اور گاؤں کے عشق پیشہ جوان اس سے اپنے دل کا حال بیان کرتے اور پوچھتے کہ وہ کب اپنے متعصب میں کامیاب ہوں گے، نو جوان چھوکر یاں بھی چپکے چپکے دھڑکتے ہوئے دلوں سے اس کے سامنے اپنی محبت کا اعتراف کرتی تھیں اور یہ جاننا چاہتی تھیں کہ ان کے ”ماہیا“ کا دل کیا ہے عبدالغفار ان سوالیوں کو اوٹ پٹا نگ جواب دیا کرتا تھا اس لیے کہ اسے غیب کی باتیں کہاں معلوم تھیں، لیکن لوگ جو اس کے پاس سوال لے کر آتے تھے اس کی بے ربط باتوں میں اپنا مطلب ڈھونڈ لیا کرتے تھے۔

عبدالغفار مختلف کھیتوں میں سے ہوتا ہوا اس کنویں کے پاس پہنچ گیا جو کہ ایک زمانے سے پیکار پڑا تھا اس کنویں کی حالت بہت اتر تھی اس بوڑھے برگد کے

نمیتی کی ہے۔

گاتی گاتی نمیتی کنویں کی طرف آنکلی غفار کو دیکھ کر وہ دوڑتی ہوئی اس کے پاس آئی اور کہنے لگی ”اوہ غفار سائیں۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ اوہ، مجھے تم سے کتنی باتیں پوچھنا ہیں۔۔۔ اور اس وقت یہاں تمہارے اور میرے سوا اور کوئی بھی نہیں دیکھو میں تمہارا منہ بیٹھا کراؤں گی اگر تم نے میرے دل کی بات بوجھ لی اور۔۔۔۔۔ لیکن تم تو سب کچھ جانتے ہو۔۔۔۔۔ اللہ والوں سے کسی کے دل کا حال چھپا چھوڑی رہتا ہے۔“

وہ اس کے پاس زمین پر بیٹھ گئی اور اس کے میلے کرتے پر ہاتھ پھیرنے لگی۔
خلاف معمول کیوڑوں والا سائیں مسکرایا مگر نمیتی اس کی طرف دیکھ نہیں رہی تھی اس کی ٹکائیں گاڑھے کے تانے بانے پر بغیر کسی مطلب کے تیر رہی تھیں کھر درے کپڑے پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے اس نے گردن اٹھائی اور آہوں میں کہنا شروع کیا۔ ”غفار سائیں تم اللہ میاں سے محبت کرتے ہو اور میں۔۔۔۔۔ میں ایک آدمی سے محبت کرتی ہوں تم میرے دل کا حال کیا سمجھو گے۔۔۔۔۔ اللہ میاں کی محبت اور اس کے بندے کی محبت ایک جیسی تو ہونی نہیں سکتی۔ کیوں غفار سائیں۔۔۔۔۔ ارے تم بولتے کیوں نہیں کچھ بولو۔۔۔۔۔ کچھ کہو۔۔۔۔۔ اچھا تو میں ہی بولے جاؤں گی۔۔۔۔۔ تم نہیں جانتے کہ آج میں کتنی دیر بول سکتی ہوں۔۔۔۔۔ تم سنتے سنتے تھک جاؤ گے پر میں نہیں تھکوں گی۔۔۔۔۔“ یہ کہتے کہتے وہ خاموش ہو گئی اور اس کی سنجیدگی زیادہ بڑھنے لگی اپنے من و غوٹ لگانے کے بعد جب وہ ابھری تو اس نے ایک ایسی عبدالغفار سے پوچھا ”

سائیں۔۔۔۔۔ میں کب تھکوں گی؟“

عبدالغفار کے منہ سے اعاب نکلتا ہند ہو گیا اس نے کنویں کے اندر جھک کر دیکھتے ہوئے جواب دیا ”بہت جلد“

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اس پر نعمتی نے اس کے کرتے کا دامن پکڑ لیا اور گھبرا کر پوچھا ”کب؟۔۔۔۔۔ کب؟۔۔۔۔۔ سائیں کب؟“

عبدالغفار نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور بول کے جھنڈ کی طرف بڑھنا شروع کر دیا نعمتی کچھ دیر کنویں کے پاس سوچتی رہی پھر تیز قدموں سے جدھر سائیں گیا تھا اوھر چل دی۔

☆☆☆☆☆

وہ رات جس میں سندر جاٹ گاؤں پر ڈاکہ ڈالنے کے لیے آ رہا تھا مانی جیواں نے آنکھوں میں کافی ساری رات وہ اپنی کھاٹ پر لحاف اوڑھے جاگتی رہی وہ بالکل اکیلی تھی رحمن کو اس نے دوسرے گاؤں بھیج دیا اور عبدالغفار نہ جانے کہاں سو گیا تھا ابو پہلوان کبھی تکلیف میں آگ تاپتا تاپتا وہیں الاؤ کے پاس سو جلیا کرتا تھا مگر وہ صبح ہی سے دکھائی نہیں دیا تھا، چنانچہ کپوتروں کو واند مانی جیواں ہی نے کھلایا تھا۔

تکلیف گاؤں کے اس سرے پر واقع تھا جہاں سے لوگ گاؤں کے اندر داخل ہوتے تھے مانی جیواں ساری رات جاگتی رہی مگر اس کو ہلکی سی آہٹ بھی سنائی نہ دی جب رات گزر گئی اور گاؤں کے مرغوں نے آذانیں دینا شروع کر دیں تو وہ سندر جاٹ کی بات سوچتی سوچتی سو گئی۔

چونکہ رات کو وہ بالکل نہ سوتی تھی اس لیے صبح بہت دیر کے بعد جاگی کوٹھڑی سے نکل کر جب وہ باہر آئی تو اس نے دیکھا کہ ابو پہلوان کیبوتروں کو دانہ دے رہا ہے اور دھوپ سارے تنکے پر پھیلی ہوئی ہے اس نے باہر نکلتے ہی اس سے کہا ”ساری رات مجھے نیند نہیں آئی یہ مواہڑ صاپا تنگ کر رہا ہے صبح سوئی ہوں اور اب انھی ہوں۔۔۔۔۔۔ ہاں تم سناؤ کل کہاں رہے؟“

ابو نے جواب دیا ”گاؤں میں“

اس پر مانی جیواں نے کہا ”کوئی تازہ خبر سناؤ“

ابو نے جھولی کے سب دانے زمین پر گرا کر جھپٹ کر ایک کیبوتر کو بڑی صفائی سے اپنے ہاتھ میں دبو پتے ہوئے کہا ”آج صبح چوپال پر ہتھاسنگھ کہہ رہا تھا کہ گام چمارہ کی وہ لونڈیا۔۔۔۔۔۔ کیا نام ہے اس کا۔۔۔۔۔۔؟ ہاں وہ نیستی کہیں بھاگ گئی ہے۔۔۔۔۔۔ میں تو کہتا ہوں اچھا ہوا۔۔۔۔۔۔ حرامزادی نے سارا گاؤں سر پر اٹھا رکھا تھا۔“

”کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے یا کوئی اٹھا کر لے گیا ہے؟“

”جانے میری بلا۔۔۔۔۔۔ لیکن میرے خیال میں تو وہ خود ہی کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔“

مانی جیواں کو اس گفتگو سے اطمینان نہ ہوا سندرجاٹ نے ڈاکہ نہیں ڈالا تھا پر ایک چھوکری تو غائب ہو گئی تھی اب وہ چاہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح نیستی کا غائب ہو جانا سندرجاٹ سے متعلق ہو جائے چنانچہ وہ ان تمام لوگوں سے نیستی کے بارے میں پوچھتی رہی جو کہ تنکے میں آتے جاتے رہے لیکن جو کچھ ابو نے بتایا تھا اس سے

زیادہ اسے کوئی بھی نہ بتا سکا۔

شام کو رخصت ہو کر آیا اس نے آتے ہی ماں سے سندر جاٹ کے ڈاکہ کے متعلق پوچھا اس پر مائی جیواں نے کہا ”سندر جاٹ تو نہیں آیا بیٹا پر قیمتی غائب ہو گئی ہے۔۔۔ ایسی کہ کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔“

رخصت کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کی ناگوں میں دس کوس اوچلنے کی تھکاوٹ پیدا ہو گئی ہے وہ اپنی ماں کے پاس بیٹھ گیا اس کا چہرہ خوفناک طور پر زرد تھا۔ ایک دم یہ تبدیلی دیکھ کر مائی جیواں نے تشویشناک لہجے میں اس سے پوچھا ”کیا ہوا بیٹا!“

رخصت نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور کہا ”کچھ نہیں ماں۔۔۔۔۔ تھک گیا ہوں۔“

”اور قیمتی کل مجھ سے پوچھتی تھی، میں کب تھکوں گی؟“

رخصت نے پاپٹ کر دیکھا تو اس کا بھائی عبدالغفار آستین سے اپنے منہ کا اعاب پونچھ رہا تھا رخصت نے اس کی طرف گھور کر دیکھا اور پوچھا ”کیا کہا تھا اس نے تجھ سے؟“

عبدالغفار اداؤ کے پاس بیٹھ گیا ”کہتی تھی کہ میں تھکتی ہی نہیں۔۔۔۔۔ پر اب وہ تھک جائے گی۔“

رحمان نے تیزی سے پوچھا ”کیسے؟“

غفار سائیں کے چہرے پر ایک بے معنی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی ”مجھے کیا معلوم۔۔۔۔۔؟ سندر جاٹ جانے اور وہ جانے“

یہ سن کر رحمن کے چہرے پر اور زیادہ زردی چھا گئی اور مانی جیواں کی جھریاں
زیادہ گہرائی اختیار کر گئیں۔

☆☆☆☆☆☆



گرم سوٹ

گنڈا سنگھ نے چونکہ ایک زمانے سے اپنے کپڑے تبدیل نہیں کیے تھے اس لیے پسینے کے باعث ان میں ایک عجیب قسم کی بو پیدا ہو گئی تھی جو زیادہ شدت اختیار کرنے پر اب گنڈا سنگھ کو کبھی کبھی اس کو اس بد بو نے کبھی اتنا تنگ نہیں کیا تھا جتنا کہ اب اس کے گرم سوٹ نے اسے تنگ کر رکھا تھا۔

اپنے کسی دوست کے کہنے پر وہ امرتسر چھوڑ کر دہلی چلا آیا تھا جب اس نے امرتسر کو خیر باد کہا تو گرمیوں کا آغاز تھا لیکن اب کہ گرمی اپنے پورے جوہن پر تھی، گنڈا سنگھ کو یہ گرم سوٹ بہت ستا رہا تھا۔

اس کے پاس صرف چار کپڑے تھے۔ گرم پتلون، گرم کوٹ، گرم واسٹ اور ایک سوئی قمیض، یہ گرم سوٹ اسے اس لیے دہلی کی شدید گرمیوں میں پہننا پڑتا تھا کہ اس کے پاس کوئی اور کپڑا ہی نہیں تھا اور سوٹ کے ساتھ ہی واسٹ اسے اس لیے پہننا پڑتی تھی کہ اس کے پاس کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں وہ اسے احتیاط یا بد احتیاطی سے رکھ سکتا یوں تو وہ اس واسٹ کو یا کوٹ ہی کو دریہ کلاں میں اپنے دوست کی دکان میں رکھ دیتا مگر وہاں اس نے پہلے روز ہی کئی چوہے دیکھے تھے دہلی آنے کے دوسرے روز چاندنی چوک میں اس نے رس گئے کھائے تھے ان کا شیرہ جا بجا کوٹ اور واسٹ پر گر پڑا تھا۔ اگر وہ یہ دونوں چیزیں اس دکان میں رکھ دیتا تو ظاہر ہے کہ جہاں جہاں شیرہ گرا تھا چوہے کپڑا کتر جاتے اور گنڈا سنگھ نہیں چاہتا تھا کہ یہ سوٹ جو اسے 3 ستمبر 1939ء یعنی اس جنگ کے ابتدائی روز ملا تھا یوں

بیکار چوہوں کی نذر ہو جائے اس سوٹ کے ساتھ اتفاقیہ طور پر ایک ایسا دن منسوب ہو گیا تھا جو تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

گنڈا سنگھ کو چنانچہ اس لیے بھی اپنا سوٹ عزیز تھا امرتسر میں جب اس نے اپنا یہ تاریخی سوٹ پہنا تھا تو دربار صاحب کے آس پاس اس کے جتنے باقی دانت کا کام کرنے والے دوست رہتے تھے متحیر ہو گئے تھے بلیر نے جب اسے بازار میں دیکھا تو متحرک خراہ کو روک کر زور سے آواز دی تھی ”گنڈا سیال۔۔۔۔۔ گنڈا سیال ذرا ادھر تو آ۔۔۔۔۔ یہ آج تجھے کیا ہو گیا ہے؟“

گنڈا سنگھ لباس کے معاملے میں از حد بے پروا تھا بلکہ یوں کہیے کہ اپنے لباس کی طرف اس نے کبھی توجہ ہی نہ دی تھی وہ پتلون اسی طرح پہنتا تھا جس طرح کچھ پہنی جاتی ہے یعنی بغیر کسی تکلف کے اس کے متعلق اس کے دوستوں میں یہ بات عام مشہور تھی کہ اگر تن ڈھکنا ضروری نہ ہوتا تو گنڈا سنگھ بالکل ننگا رہتا۔

چھ مہینے تک وہ نہاتا نہیں تھا بعض اوقات اس کے پیروں پر اس قدر میل جم جاتا تھا کہ اور میل جمنے کی گنجائش ہی نہیں رہتی تھی دور سے اگر آپ اس کے میلے پیروں کو دیکھتے تو یہی معلوم ہوتا کہ گنڈا سنگھ نے موزے پہن رکھے ہیں۔

گنڈا سنگھ کی غلاظت پسندی کی انتہا یہ تھی کہ وہ صبح کا ناشتہ منہ ہاتھ دھوئے بغیر کرتا تھا اور سردیوں میں ایک ایسا لحاف اوڑھ کر سوتا تھا کہ اگر کوئی اسے گھورے پر پھینک دیتا تو صبح جب بھنگی کوڑا کرکٹ اٹھانے آتا تو یہ لحاف دیکھ کر اس کو بھی گھن آ جاتی، پر اطف یہ ہے کہ اس کی ان تمام غلاظتوں کے باوجود لوگ اسے پسند کرتے تھے اور امرتسر میں تو آپ کو ایسے کئی آدمی مل جائیں گے جو اس کو محبت کی حد تک

پسند کرتے ہیں۔

گنڈا سنگھ کی عمر زیادہ سے زیادہ پچیس برس ہے ڈاڑھی اور مونچھوں کے بھوسلے بال اس کے چہرے کے دو تہائی حصے پر موہل آئل میں بھیکے ہوئے چیتھرے کی طرح پھیلے رہتے ہیں پگڑی کے نیچے اس کے کیسوں کی بھی یہی حالت رہتی ہے کبھی کبھی جب اس کی پنڈلیاں کپڑا اٹھ جانے کے باعث ننگی ہو جاتی ہیں تو اس پر میل کھرنڈوں کی شکل میں جا بجا نظر آتا ہے مگر لوگ اب تمام میلی اور گندی حقیقتوں سے باخبر ہونے پر بھی گنڈا سنگھ کو اپنے پاس بٹھاتے ہیں اور اس سے کئی کئی گھنٹے باتیں کرتے ہیں۔

امر تر چھوڑ کر جب گنڈا سنگھ اپنے گرم سوٹ سمیت دہلی آیا تو اسے غیر شعوری طور پر معلوم تھا کہ یہاں بھی خود بخود اس کے دوست پیدا ہو جائیں گے اگر اس کو اپنی غایت پسند یوں کا احساس ہوتا تو بہت ممکن ہے یہ احساس رکاوٹ بن جاتا اور دہلی میں اس کا کوئی دوست نہ بنتا۔

چند ہی دنوں میں بظاہر کسی وجہ کے بغیر آٹھ دس آدمی گنڈا سنگھ کے دوست بن گئے اور گنڈا سنگھ کو اس بات کا مطلق احساس نہ ہوا کہ اگر یہ آٹھ دس آدمی اس کے دوست نہ بنتے تو دہلی شہر میں وہ بھوکوں مرتا روٹی کے مسئلے پر دراصل گنڈا سنگھ نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا اور نہ اس نے کبھی یہ جاننے کی تکلیف کی تھی کہ دوسرے اس کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں کھانا، پینا اور سونا، یہ تین چیزیں ایسی تھیں جو گنڈا سنگھ کو چلتے پھرتے کہیں نہ کہیں ضرور مل جاتی تھیں اور ایک زمانے سے چونکہ یہ چیزیں اسے بڑی باقاعدگی کے ساتھ مل رہی تھیں اس لیے ان کے متعلق وہ کبھی

سوچتا ہی نہیں تھا۔

چاؤڑی میں ہر ہنس سے ملنے گیا تو وہاں صبح کا ناشتہ مل گیا ہر ہنس کے یہاں سے آیا تو راستے میں احمد علی نے اپنی دکان پر بٹھرا لیا اور کہا گندہ اسگھ، بجھی تم خوب وقت پر آئے، میں نے دھنا مل سے کچھ چاٹ منگوائی ہے کھا کے جانا احمد علی کی دکان پر چاٹ کھانے کے بعد گندہ اسگھ کے دل میں خیال آیا کہ چلو ہم چندر سے ملنے چلیں ہم چندر بہت اچھا افسانہ نگار ہے اور گندہ اسگھ کے دل میں اس کی بہت عزت ہے، چنانچہ جب اس سے ملاقات ہوئی تو باتوں باتوں میں دوپہر کے کھانے کا وقت آگیا دعوت دینے اور دعوت قبول کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوا کھانا آیا اور دونوں نے مل کر کھالیا یہاں سے جب گندہ اسگھ تمار پور کی طرف روانہ ہوا تو راستے میں باغ آگیا دھوپ چونکہ بہت کراری تھی، اس لیے گندہ اسگھ جب کچھ دیر سنانے کے لیے نکلے باغ کے ایک بچہ پر لیٹا تو پاؤں بچے وہیں وہیں سویا رہا آنکھیں مل کر اٹھا اور آہستہ آہستہ تمار پور کا رخ کیا جہاں اس کا دوست عبد المجید رہتا تھا چھ بچے کے قریب گندہ اسگھ عبد المجید کے گھر پہنچا وہاں جنگ کی باتیں شروع ہوئیں چنانچہ آٹھ بج گئے عبد المجید بہت ہوشیار آدمی تھا ہندوستان کے ترقی پسند لٹریچر کے بارے میں اس کی معلومات کافی وسیع تھیں مگر جنگ کے متعلق اسے کچھ معلوم نہیں تھا کوشش کرنے کے باوجود وہ چین اور جاپان، جاپان اور روس، روس اور جرمنی اور فرانس کے جغرافیائی رشتے کو نہ سمجھ سکا تھا جب کبھی وہ دنیا کا نقشہ کھول کر اپنے سامنے رکھتا تو اس کی نگاہوں میں نقشے پر پھیلے ہوئے شہر اور ملک ایک ایسے الجھاؤ کی صورت اختیار کر لیتے جو اکثر اوقات پتنگ اڑانے کے

دوران میں اس کی ڈور میں پیدا ہو جایا کرتے تھے مگر گنڈا سنگھ کو دنیا کے جغرافیہ پر کافی عبور حاصل تھا ایک بار اخبار پڑھ لینے کے بعد جنگ کا صحیح نقشہ اس کے ذہن میں آ جاتا تھا اور وہ بڑے سہل انداز میں لوگوں کو سمجھا سکتا تھا کہ جنگ کے میدان میں کیا ہو رہا ہے۔

عبدالحمید طبعاً انفاست پسند تھا، اس کو گنڈا سنگھ کی غلطیوں بہت گھلٹی تھیں مگر وہ مجبور تھا اس لیے کہ گنڈا سنگھ ہی ایک ایسا آدمی تھا جو اسے جنگ کے تازہ حالات سمجھا سکتا تھا اگر عبدالحمید کو جنگی خبریں سننے اور ان پر تفصیلی بحث کرنے کی عادت نہ ہوتی جو ایک بہت بڑی کمزوری کی شکل اختیار کر چکی تھی تو وہ یقیناً اس آدمی سے کبھی مانا پسند نہ کرتا جو کھانا کھانے کے بعد سالن سے بھرے ہوئے ہاتھ اس کے کمرے میں لٹکے ہوئے پردوں سے صاف کرتا تھا ایک دفعہ عبدالحمید نے پردوں کو اس کے حملے سے محفوظ رکھنے کی خاطر اپنا تولیہ آگے بڑھا دیا اور کہا ”لو گنڈا سنگھ، اس سے ہاتھ صاف کر لو کچھ دیر اگر ٹھہر سکو تو پانی اور صابن آ رہا ہے“

گنڈا سنگھ نے اس انداز سے تولیہ عبدالحمید سے لیا جیسے اس کی ضرورت ہی نہیں تھی اور ایک منٹ میں اپنا ہاتھ صاف کر کے اسے ایک طرف پھینک دیا ”پانی وانی کی کوئی ضرورت نہیں، ہاتھ صاف ہی تھے۔“

عبدالحمید نے جب زہر کے گھونٹ پی کر اپنے تولیے کی طرف دیکھا تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ منہ ہاتھ صاف کرنے کے بجائے کسی نے اس کے ساتھ سائیکل کی چین صاف کی ہے۔

عبدالحمید کی بیوی کو گنڈا سنگھ کی یہ مکروہ عادات سخت نا پسند تھیں مگر وہ بھی مجبور

تھی اس لیے کہ جس روگنڈا سنگھ نہیں آتا تھا عبد المجید اسے اپنے پاس بٹھا کر جنگ کے تازہ حالات پر ایک طویل لیکچر دینا شروع کر دیتا تھا جو اس امن پسند عورت کو طوعاً و کرہاً سارے کا سارا سننا ہی پڑتا تھا۔

گنڈا سنگھ ذہین آدمی تھا ادب اور سیاست کے بارے میں اس کی معلومات اوسط آدمی سے بہت زیادہ تھیں امرتسر میں اس کے اس گرم سوٹ کا سودا بھی ان معلومات کے ذریعے ہی سے ہوا تھا محمد عمر ٹیلر ماسٹر کو جنگی خبریں سننے کا خبط تھا، چنانچہ گنڈا سنگھ نے جنگ کے ابتدائی حالات سننا کر محمد عمر کو اس قدر مرعوب کیا کہ اس نے یہ گرم سوٹ (جو کہ کسی گاہک نے 37ء میں تیار کرایا تھا اور دو برس سے اس کے پاس بیکار پڑا تھا چونکہ اس گاہک نے پھر کبھی شکل ہی نہیں دکھائی تھی) گنڈا سنگھ کے جسم پر فٹ کر دیا اور اس کے ساتھ پانچ روپے ماہوار کی چھ قسطیں مقرر کر لیں۔

ان چھ قسطوں میں سے صرف تین قسطیں گنڈا سنگھ نے ادا کی تھیں باقی تین قسطوں کے لئے محمد عمر کئی بار تقاضا کر چکا تھا مگر ان رسمی تقاضوں کے علاوہ محمد عمر نے گنڈا سنگھ پر کبھی دباؤ نہیں ڈالا تھا اس لیے کہ جنگ کے حالات دن بدن دلچسپ ہوتے جا رہے تھے۔

گنڈا سنگھ نے امرتسر کیوں چھوڑا یہ ایک لمبی کہانی ہے وہی میں جو اس کے نئے دوست بنے تھے ان کو صرف اتنا معلوم تھا کہ امرتسر میں ایک پرانے دوست کے کہنے پر وہ یہاں چلا آیا تھا کہ ملازمت تلاش کرے۔

وہی آکر گنڈا سنگھ ملازمت کی جستجو کرتا مگر یہ کم بخت گرم سوٹ اسے چین نہیں

لینے دیتا تھا اس قدر گرمی پڑ رہی تھی کہ ذیل انداز چھوڑ دے کچھ دنوں سے تو گرمی کی انتہا ہو گئی تھی لوگ سن سڑوک سے مر رہے تھے گند اسٹکھ کو موت کا اتنا خیال نہیں تھا جتنا کہ اسے اس تکلیف کا خیال تھا جو گرمی کی شدت کے باعث اسے اٹھانا پڑ رہی تھی بازاروں میں دھوپ پکھلی ہوئی آگنی کی طرح پھیلی رہتی تھی لو اس غضب سے چلتی تھی کہ منہ پر آگ کے چائے سے پڑتے تھے لک پھری سر کیس توے کے مانند تھتی رہتی تھیں ان سب کے اوپر فنا کی وہ گرم گرم اداسی تھی جو گند اسٹکھ کو بہت پریشان کرتی تھی۔

اگر اس کے پاس یہ گرم سوٹ نہ ہوتا تو الگ بات تھی، شدید گرمیوں کا یہ موسم کسی نہ کسی جیلے کٹ ہی جاتا پر اس سوٹ کی موجودگی میں جس کا رنگ اس کی بھوسلی ڈاڑھی سے بھی زیادہ گہرا تھا اب ایک دن بھی دہلی میں رہنا اسے دشوار معلوم ہوتا تھا اس سوٹ کا رنگ سردیوں میں بہت خوشگوار معلوم ہوتا تھا پر اب گند اسٹکھ کو اس سے ڈر لگتا تھا۔

سوٹ کا کپڑا بہت کھردرا تھا، کوٹ کا کالر گھسنے کے باعث بالکل ریگ مار کی صورت اختیار کر گئے تھا اس سے گند اسٹکھ کو بہت تکلیف ہوتی تھی، یہ گھسا ہوا کالر ہر وقت اوپر نیچے ہو کر اس کی گردن کے بال موڑتا رہتا تھا۔

ایک دو دفعہ جب غضب کی گرمی پڑی تو گند اسٹکھ کے جی میں آئی کہ یہ گرم سوٹ اتار کر کسی ایسی جگہ پھینک دے کہ پھر اسے نظر نہ آئے مگر یہ سوٹ اگر وہ اتار دیتا تو اس کی جگہ پہنتا کیا اس کے پاس تو اس سوٹ کے سوا اور کوئی کپڑا ہی نہیں تھا یہ مجبوری گرمی کے احساس میں اور زیادہ اضافہ کر دیتی تھی اور بے چارہ گند اسٹکھ تلملا

کے رہ جاتا تھا۔

وہی میں اس کے چند دوستوں نے اس سے پوچھا تھا۔ ”بھئی گنڈا سنگھ! تم یہ گرم سوٹ کیوں نہیں اتارتے کیا تمہیں گرمی نہیں لگتی؟“ گنڈا سنگھ چونکہ ذہین آدمی تھا اس لیے اس نے یوں جواب دیا تھا۔ گرم کپڑا گرمی کی شدت کو روکتا ہے اسی لیے یہ گرم سوٹ پہنتا ہوں۔ سن اسٹروک کا اثر ہمیشہ گردن کے نچلے حصے پر پڑتا ہے جہاں حرام مغز ہوتا ہے۔ اگر جسم کے اس حصے پر گرم کپڑے کی ایک موٹی سی تہہ جمی رہے تو سورج کے اس حملے کا بالکل خدشہ نہیں رہتا۔ افریقہ کے پتے ہوئے صحراؤں میں انگریز و غیرہ سولر ہیٹ کے پچھلے حصے کے ساتھ ایک کپڑا لٹکا دیتے ہیں کہ لو سے بچے رہیں۔ عرب میں سر کے لیے ایک خاص پہناؤ امر وچ ہے۔ ایک بڑا سا رو مال ہوتا ہے جو گردن کو ڈھانپے رہتا ہے۔ ہندوستان کے ان حصوں میں جہاں شدید گرمی پڑتی ہے پگڑی کا استعمال اب تک چلا آ رہا ہے۔ شملہ چھوڑنے کا اصل مطلب یہی تھا کہ گردن کو سے محفوظ رہے۔ مگر اب لوگوں نے شملہ چھوڑنا قریب قریب ترک کر دیا ہے اس لیے کہ اسے فضول سمجھا گیا ہے اور بغیر شملہ چھوڑے پگڑی باندھنا جدید فیشن بن گیا ہے۔ میں خود اس فیشن کا شکار ہوں۔“

یہ فاضلانہ جواب سن کر اس کے دوست بہت مرعوب ہوئے تھے چنانچہ پھر کبھی انہوں نے گنڈا سنگھ سے اس کے سوٹ کے بارے میں استفسار نہ کیا تھا۔ گنڈا سنگھ جس کو اپنی معلومات کا مظاہرہ کرنے کا شوق تھا اس وقت یہ جواب دے کر بہت مسرور ہوا تھا مگر یہ مسرت فوراً ہی ایک سوٹ کی تکلیف دہ گرمی نے غائب کر دی

تھی۔

عبدالحمید تمار پور یعنی شہر کے مضافات میں رہتا تھا جہاں کھلی فضا میسر آ سکتی ہے۔ ایک رات جب تازہ جنگلی حالات پر تبصرہ کرتے کرتے دیر ہو گئی تو عبدالحمید نے گنڈا سنگھ کے لیے برآمدے کے باہر ایک چارپائی بچھوا دی کوٹ اور واسکٹ اتار کر وہ پتلون سمیت اس چارپائی پر صبح چھ بجے تک سویا رہا۔ رات بڑے آرام میں کئی۔ کھلی فضا تھی اس لیے ساری رات خنک ہوا کے جھونکے آتے رہے۔ گنڈا سنگھ کو یہ جگہ پسند آئی چنانچہ اس نے شام کو دیر سے آنا شروع کر دیا۔

عبدالحمید کی بیوی نے دس بارہ روز تک گنڈا سنگھ کا وہاں سونا برداشت کیا لیکن اس کے بعد اس سے رہنا نہ گیا۔ عبدالحمید سے اس نے صاف صاف کہہ دیا ”اصغر کے ابا باب پانی سر سے گزر چکا ہے۔ اس موئے گنڈا سنگھ کا یہاں آنا بالکل پسند نہیں کرتی۔ مکان ہے یا سرائے ہے؟..... یعنی وہ عین کھانے کے وقت آ جاتا ہے اور اڑھار دھڑکی باتیں آپ سے کرتا ہے اور چارپائی بچھوا کر سو جاتا ہے۔ میں اس کی غائبالتیں برداشت کر سکتی ہوں مگر اس کا یہاں سونا بالکل برداشت نہیں کر سکتی۔“

سنا

عبدالحمید کو خود گنڈا سنگھ کا وہاں سونا برا معلوم ہوتا تھا اس لیے کہ اس کی بیوی پر لی طرف آنگن میں اکیلی پڑی رہتی تھی مگر وہ کیا کرتا جبکہ جنگ کی دلچسپ باتیں کرتے کرتے دیر ہو جاتی تھی اور گنڈا سنگھ بغیر کسی تکلف کے جیسے کہ اس کا روزانہ کا معمول ہو۔ اس سے کہہ دیتا تھا بھائی عبدالحمید اب تم سو جاؤ..... صبح اٹھ کر تازہ اخبار دیکھیں گے تو نئے حالات کا کچھ پتہ چلیگا۔“ یہ کہہ کر وہ برآمدے میں سے

چارپائی نکالتا اور باہر بچھا کر سو جاتا۔

جب عبدالحمید کی بیوی اس پر بہت برسی تو اس نے کہا ”جان من! میں خود حیران ہوں کہ اس کو کس طرح منع کروں۔ یہاں وہلی میں اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ مجھے تو اب اس بات کا خوف لاحق ہو رہا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے میرے مکان کو اپنا اڈا بنا لے گا۔ آدمی بے حد اچھا ہے، ذہین ہے پر..... کوئی ایسی ترکیب سوچو کہ سانپ بھی مر جائے اور انٹھی بھی نہ ٹوٹے۔“

یہ سن کر عبدالحمید کی بیوی نے کہا ”تو یہ ترکیب تم ہی سوچو..... میں تو صاف گو ہوں اور اگر مجھے کہو گے تو میں کھلے لفظوں میں اس سے کہہ دوں گی کہ تمہارا یہاں رہنا مجھے بہت ناگوار معلوم ہوتا ہے۔“

عبدالحمید نے اسی وقت تہیہ کر لیا کہ وہ گنڈا سنگھ سے اپنی مشکلات اور مجبوریوں صاف لفظوں میں بیان کر دیگا چنانچہ جب شام کو گنڈا سنگھ آیا تو جنگ کے تازہ حالات پر بحث شروع کرنے کے بجائے عبدالحمید نے اس سے کہا ”گنڈا سنگھ! مس تم سے ایک بات کہوں برا تو نہیں مانو گے۔“

گنڈا سنگھ نے ہمہ تن گوش ہو کر جواب دیا ”برامانے کی بات ہی کیا ہے۔ آپ کہیے۔“

اس پر عبدالحمید نے ایک مختصر سی رسمی تمہید شروع کی پھر اسکے آخر میں کہا ”بات یہ ہے کہ سردیوں میں ایک سے زیادہ آدمیوں کی رہائش کا انتظام کیا جاسکتا ہے اس لیے کہ اس موسم میں گنجائش نکل آتی ہے مگر ان گرمیوں میں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ مردوں کو اتنی نہیں ہوتی جتنی کہ مستورات کو ہو جاتی ہے۔ تم خود سمجھ سکتے ہو۔“

گنڈا سنگھ مطلب سمجھ گیا چنانچہ اس نے پہلی مرتبہ اپنی تلکیں بیان کرنا شروع کیں۔ ”بھائی عبدالعجید میں تمہاری مہربانیوں کا بہت شکر گزار ہوں۔ رات کاٹنے کے لیے یوں تو مجھے بہت جگہیں مل سکتی ہیں مگر مصیبت یہ ہے کہ ایسی کھلی ہوا کہیں نہیں ملتی۔ سارا دن اس گرم سوٹ میں پکھلتا رہتا ہوں۔ چند راتیں جو میں نے تمہارے یہاں بسر کی ہیں میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ مجھے تمہاری مجبور یوں اور تلکیں کا احساس اب ہوا ہے۔ اس لیے جو آرام مجھے یہاں رات کو ملتا تھا اس قدر خوشگوار تھا کہ میں نے دوسرے پہلو پر کبھی غور ہی نہ کیا۔ تم میرے دوست ہو کوئی ایسی ترکیب نکالو کہ اس گرم سوٹ سے مجھے نجات مل جائے اس طور پر کہ یہ گرم سوٹ بھی میرے پاس رہے اور گرمیوں کا موسم بھی کٹ جائے کیونکہ دو تین مہینے کے بعد پھر سردیاں آنے والی ہیں اور مجھے پھر اس سوٹ کی ضرورت ہوگی..... سچ پوچھو تو اب میں دیوانگی کی حد تک اس سوٹ کی گرمی سے بیزار آ گیا ہوں..... تم خود سمجھتے ہو۔“

عبدالعجید سب سمجھ گیا جب گنڈا سنگھ رخصت ہوا تو عبدالعجید نے اپنی بیوی سے بات چیت کی۔ دونوں دیر تک اس مسئلے پر گفتگو کرتے رہے۔ آخر میں اس کی بیوی نے کہا ”صرف ایک بات میرے ذہن میں آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ گنڈا سنگھ کو کسی ایسی جگہ بھیج دیا جائے جہاں گرمی نہ ہو۔“

یہ سن کر عبدالعجید نے کہا ”ٹھیک ہے پر اس کے لیے رقم کی ضرورت ہے اگر میرے پاس فالتو روپے ہوتے تو کیا میں نے اسے ٹھنڈے کپڑے نہ بنوا دیے ہوتے۔“

اس پر عبد المجید کی بیوی نے کہا ”تم پوری بات تو سن لیا کرو۔ میں نے یہ سوچا ہے کہ اسے شملہ بھیج دیا جائے میرا بھائی نصیر کل آنے والا ہے۔ اس سے کہہ دیں گے وہ گنڈا سنگھ کو بغیر ٹکٹ کے وہاں پہنچا دے گا۔۔۔ ایک دو بار وہ تمہیں بھی تو شملہ لے گیا تھا۔“

عبد المجید یہ بات سن کر اس قدر خوش ہوا کہ اس نے اپنی بیوی کا منہ چوم لیا۔
 ”بھی کیا ترکیب سوچی ہے۔۔۔ یعنی سوٹ گنڈا سنگھ کے جسم پر ہی رہے گا اور وہ شملہ پہنچ جائے گا۔۔۔ اس سے بہتر اور کیا چیز ہو سکتی ہے۔“
 دوسرے روز شام کو گنڈا سنگھ آیا تو عبد المجید نے شملہ جانے کی رائے پیش کی۔
 یہ سن کر وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے قطعاً سوچا کہ شملہ جا کر وہ بغیر روپے پیسے کے کس طرح گزارہ کرے گا۔ دراصل ایسی باتوں پر اس نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔
 تیسرے دن نصیر نے گنڈا سنگھ کو گاڑی پر سوار کرا دیا اور گاڑی نے جو کہ اس کا دوست تھا کہہ دیا تھا کہ وہ اسے بحفاظت تمام شملہ پہنچا دے۔

گولی

شفقت دو پہر کو دفتر سے آیا تو گھر میں مہمان آئے ہوئے تھے۔ عورتیں تھیں جو بڑے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ شفقت کی بیوی عائشہ ان کی مہمان نوازی میں مصروف تھی۔ جب شفقت صحن میں داخل ہوا تو اس کی بیوی باہر نکلی اور کہنے لگی ”عزیز صاحب کی بیوی اور ان کی لڑکیاں آئی ہیں۔“

شفقت نے سیٹ اتار کر ماتھے کا پسینہ پونچھا ”کون عزیز صاحب۔“
عائشہ نے آواز دبا کر جواب دیا ”ہائے آپ کے باجی کے دوست!“
”اوہ..... عزیز چچا۔“

”ہاں..... ہاں وہی۔“

شفقت نے ذرا حیرت سے کہا ”مگر وہ تو افریقہ میں تھے۔“
عائشہ نے منہ پر انگلی رکھی ”ذرا آہستہ بات کیجیے۔ آپ تو چلاانا شروع کر دیتے ہیں..... وہ افریقہ میں تھے لیکن جو افریقہ میں ہو کیا واپس نہیں آ سکتا۔“
”لو..... اب تم لگیں مین میخ کرنے۔“

”آپ تو لڑنے لگے۔“ عائشہ نے ایک نظر اندر کمرے میں ڈالی ”عزیز صاحب افریقہ ہی میں ہیں لیکن ان کی بیوی اپنی لڑکی شادی کرنے آئی ہیں۔ کوئی اچھا برڈ سوئڈ رہی ہیں۔“

اندر سے عزیز کی بیوی کی آواز آئی ”عائشہ تم نے روک کیوں لیا شفقت کو..... آنے دو..... آؤ شفقت جینا آؤ..... تمہیں دیکھے اتنی مدت ہو گئی ہے۔“

”آیا چچی جان! شفقت نے ہیٹ اسٹینڈ کی کھوٹی پر رکھا اور اندر کمرے میں داخل ہوا۔ ”آداب عرض چچی جان!“۔

عزیز کی بیوی نے اٹھ کر اس کو دعائیں دیں۔ سر پر ہاتھ پھیرا اور بیٹھ گئی شفقت بیٹھنے لگا تو اس نے دیکھا کہ سامنے صوفے پر دو گوری گوری لڑکیاں بیٹھی ہیں۔ ایک چھوٹی تھی، دوسری بڑی۔ دونوں کی شکل آپس میں ملتی تھی۔ عزیز صاحب بڑے وجہ آدمی تھے۔ ان کی یہ جاہت لڑکیوں میں بڑے دلکش طور پر تقسیم ہوئی تھی۔ آنکھیں ماں کی تھیں۔ نیلی۔ بھال بھورے اور کافی لمبے۔ دونوں کی دو چوٹیاں تھیں چھوٹی کا چہرہ بڑی کے مقابلے میں زیادہ نکھرا ہوا تھا۔ بڑی کا چہرہ ضرورت سے زیادہ بنجیدہ تھا۔ ان کی ماں ان سے مخاطب ہوئی ”بیٹا سلام کرو بھائی کو“۔

چھوٹی نے اٹھ کر شفقت کو آداب عرض کیا۔ بڑی نے بیٹھے بیٹھے ذرا جھک کر کہا ”تسلیمات“۔

شفقت نے مناسب و موزوں جواب دیا۔ اس کے بعد عزیز صاحب اور افریقہ کے متعلق باتوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ نیروبی، تانگانیکا، دارالسلام، کراتینا، یوگنڈا ان سب کی باتیں ہوئی۔ کہاں کا موسم اچھا ہے؟ کہاں کا خراب ہے پھل کہاں اچھے ہوتے ہیں..... پھلوں کا ذکر چھیڑا تو چھوٹی نے کہا ”یہاں ہندوستان میں تو نہایت ہی ذلیل پھل ملتے ہیں“۔

”جی نہیں..... بڑے اچھے پھل ملتے ہیں۔ بشرطیکہ موسم ہو“۔ شفقت نے اپنے ہندوستان کی آبرو بچانا چاہی۔

”غلط ہے“ چھوٹی نے ناک چڑھائی۔ ”امی جان! یہ جوکل آپ نے مارکیٹ سے مالے لیے تھے کیا وہاں کے چنگوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔“

لڑکیوں کی ماں بولی ”شفقت بیٹا یہ صحیح کہتی ہے یہاں کے مالے وہاں کے چنگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔“

عائشہ نے چھوٹی سے پوچھا ”طلعت! یہ چڑگا کیا ہوتا ہے..... نام تو بڑا عجیب و غریب ہے۔“

طلعت مسکرائی ”آپا ایک پھل ہے۔ مالے اور میٹھے کی طرح..... اتنا لذیذ ہوتا ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتی..... رس..... ایک نچوڑیے..... یہ گلاس جو تپائی پر پڑا ہے لبا لب بھر جائے۔“

شفقت نے گلاس کی طرف دیکھا اور اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ وہ پھل کتنا بڑا ہوگا۔ ”ایک چنگے سے اتنا بڑا گلاس بھر جاتا ہے۔“

طلعت نے بڑے فخر یہ انداز میں کہا ”جی ہاں۔“

شفقت نے یہ سن کر کہا ”تو پھل یقیناً بہت بڑا ہوگا۔“

طلعت نے سر ہلایا ”جی نہیں..... بڑا ہوتا ہے نہ چھوٹا..... بس آپ کے یہاں کے بڑے مالے کے برابر ہوتا ہے۔ یہی تو اس کی خوبی ہے کہ رس ہی رس ہوتا ہے اس میں..... اور امان جان وہاں کا اناس..... بڑی روٹی کے برابر اس کی ایک قاش ہوتی ہے۔“

ویرنک اناس کی باتیں ہوتی رہیں۔ طلعت بہت باتونی تھی۔ افریقہ سے اس کو عشق تھا۔ وہاں کی ہر چیز اس کو پسند تھی۔ بڑی جس کا نام نگہت تھا بالکل خاموش

بیٹھی رہی۔ اس نے گفتگو میں کوئی حصہ نہ لیا۔ شفقت کو جب محسوس ہوا کہ وہ خاموش بیٹھی ہوئی ہے تو وہ اس سے مخاطب ہوا ”آپ غالباً ان باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں“۔

گفت نے اپنے ہونٹ کھولے ”جی نہیں..... سنتی رہی ہوں بڑی دلچسپی سے“۔

شفقت نے کہا ”لیکن آپ بولیں نہیں“۔

عزیز کی بیوی نے جواب دیا ”شفقت جینا اس کی طبیعت ہی کچھ ایسی ہے“۔
شفقت نے ذرا بے تکلفی سے کہا ”چچی جان..... اس عمر میں لڑکیوں کو خاموش پسند نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بھی کوئی بات ہے کہ منہ میں کھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہوں۔“
پھر وہ گفت سے مخاطب ہوا ”جناب آپ کو بولنا پڑے گا“۔

گفت کے ہونٹوں پر ایک شرمیلی مسکراہٹ پیدا ہوئی ”بول تو رہی ہوں بھائی جان!“

شفقت مسکرایا ”تصویروں میں دلچسپی ہے آپ کو“۔

گفت نے نگاہیں نیچی کر کے جواب دیا ”جی ہے“۔

”تو اٹھیے میں آپ کو الہم دکھاؤں..... دوسرے کمرے میں ہے“۔ یہ کہہ کر شفقت اٹھا ”چلیے“۔

ناشر نے شفقت کا ہاتھ دبایا۔ پلٹ کر اس نے اپنی بیوی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس نے آنکھوں آنکھوں میں کوئی اشارہ کیا جسے شفقت نہ سمجھ سکا۔ وہ متحیر تھا کہ خدا معلوم کیا بات تھی کہ اس کی بیوی نے اس کا ہاتھ دبایا اور اشارہ

بھی کیا۔ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ طاعت کھٹ سے اٹھی۔ ”چلیے بھائی جان..... مجھے دوسروں کے الہم دیکھنے کا بہت شوق ہے..... میرے پاس بھی ایک کونکیشن ہے۔“
شفقت طاعت کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ نگہت خاموش بیٹھی رہی۔ شفقت طاعت کو تصویریں دکھاتا رہا حسبِ عادت طاعت بولتی رہی۔ شفقت کا دماغ کسی اور طرف تھا۔ وہ نگہت کے متعلق سوچ رہا تھا کہ وہ اس قدر خاموش کیوں ہے۔ تصویریں دیکھنے اس کے ساتھ کیوں نہ آئی۔ جب اس نے اس کو چلنے کے لیے کہا تو عائشہ نے اس کا ہاتھ کیوں دبایا۔ اس اشارے کا کیا مطلب تھا جو اس نے آنکھوں کے ذریعے کیا تھا۔

تصویریں ختم ہو گئیں۔ طاعت نے الہم اٹھایا اور شفقت سے کہا۔ ”باجی کو دکھاتی ہوں۔ ان کو بہت شوق ہے تصویریں جمع کرنے کا۔“

شفقت پوچھنے ہی والا تھا کہ اگر ان کو شوق ہے تو وہ اس کے ساتھ کیوں نہ آئیں مگر طاعت الہم اٹھا کر کمرے سے نکل گئی۔ شفقت بڑے کمرے میں داخل ہوا تو نگہت بڑی دلچسپی سے الہم کی تصویریں دیکھ رہی تھی۔ ہر تصویر اس کو مسرت پہنچاتی تھی۔

عائشہ لڑکیوں کی ماں سے باتیں کرنے میں مشغول رہی تھی۔ شفقت نکلیوں سیدھیٹا رہا۔ اس کا چہرہ جو پہلے ضرورت سے زیادہ سنجیدگی کی دھند میں لپٹا تھا۔ اب بٹاش تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ تصویریں جو آرٹ کا بہترین نمونہ تھیں اس کو راحت بخش رہی ہیں۔ اس کی آنکھوں میں اب چمک تھی۔ لیکن جب ایک گھوڑے اور صحت مند عورت کی تصویر آئی تو یہ چمک ماند پڑ گئی۔ ایک ہلکی سی آہ اس کے سینے

میں لرزی اور وہیں دب گئی۔

تصویریں ختم ہوئیں تو نگہت نے شفقت کی طرف دیکھا اور بڑے پیار سے انداز میں کہا ”بھائی جان شکریہ“۔

شفقت نے الہم نگہت کے ہاتھ سے لیا اور مینٹل پیس پر رکھ دیا۔ اس کے دماغ میں کھد بد ہو رہی تھی۔ اس کو ایسا لگتا تھا کہ کوئی بہت بڑا سر اس لڑکی کی زندگی کے ساتھ ہے۔ اس نے سوچا شاید کوئی نامکمل رومان ہو یا کوئی نفسیاتی حادثہ۔ چائے آئی تو شفقت نگہت سے مخاطب ہوا۔ ”اٹھیے۔۔۔ چائے بنائے۔۔۔ یہ پرونچ لیڈرز کا ہے۔“

نگہت خاموش رہی لیکن طلعت پھدک کر اٹھی ”بھائی جان میں بناتی ہوں۔“ نگہت کا چہرہ پھر دھند میں ملغوف ہو گیا۔ شفقت کا تجسس بڑھتا گیا۔ ایک بار جب اس نے غیر ارادی طور پر نگہت کو گھور کے دیکھا تو وہ شہنشاہی گئی۔ شفقت کو دل ہی دل میں اس بات کا افسوس ہوا کہ اس نے کیوں ایسی نازیبا حرکت کی۔

چائے پرا دھڑا دھڑکی بے شمار باتیں ہوئی۔ طلعت نے ان میں سب سے زیادہ حصہ لیا۔ ٹینس کا ذکر آیا تو اس نے شفقت کو بڑے فخریہ انداز میں جوشیلی کی حد تک جا پہنچا تھا، بتایا کہ وہ نیروبی میں نمبر ون ٹینس پلیئر تھی اور پندرہ بیس کپ جیت چکی تھی۔ نگہت بالکل خاموش رہی اس کی خاموشی بڑی اداس تھی۔ صاف عیاں تھا کہ اس کو اس بات کا احساس ہے کہ وہ خاموش ہے۔

ایک بات جو شفقت نے خاص طور پر نوٹ کی یہ تھی کہ عزیز کی بیوی کی ممتا کا رخ زیادہ تر نگہت کی طرف تھا۔ اس نے خود اٹھ کر بڑے پیار محبت سے اس کو کریم

روا دیے۔ منہ پونچھنے کے لیے رو مال دیا۔ اس سے کوئی بات کرتی تھی تو اس میں
پیار بھی ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ باتوں کے ذریعے بھی اس کے سر پر محبت بھرا
ہاتھ پھیر رہی ہے یا اس کو چوکا رہی ہے۔

رخصت کا وقت آیا تو عزیز کی بیوی انھی برقع اٹھایا عائشہ سے گلے ملی۔ شفقت
کو دعائیں دیں اور نگہت کے پاس جا کر آنکھوں میں آنسو ڈلا دینے والے پیار
سے کہا ”چلو بیٹا چلیں۔“

طاعت پھدک کر انھی۔ عزیز کی بیوی نے نگہت کا ایک بازو تھام دوسرا بازو
طاعت نے پکڑا۔ اس کو اٹھایا گیا۔ شفقت نے دیکھا کہ اس کا منچا دھڑ بالکل بیجان
ہے۔ ایک لٹلے کے لیے شفقت کا دل و دماغ ساکت ہو گیا جب وہ سنبھلا تو اسے
اپنے اندر ایک ٹیس سی اٹھتی محسوس ہوئی۔

لڑکھرائی ناگوں ماں اور بہن کا سہارا لیے نگہت غیر یقینی قدم اٹھا رہی تھی۔ اس
نے ماتھے کے قریب ہاتھ لے جا کر شفقت اور عائشہ کو آداب عرض کیا۔ کتنا پیارا
انداز تھا۔ مگر اس کے ہاتھ نے شفقت کے دل پر جیسے گھونسا مارا..... سارا اسرار اس
پروا خ ہو گیا تھا۔ سب سے پہلا خیال اس کے دماغ میں یہ آیا ”قدرت کیوں اتنی
بے رحم ہے..... ایسی پیاری لڑکی اور اس کے ساتھ یہ ظالمان اور یہیانا سلوک.....
اس معصوم کا آخر گناہ کیا تھا۔ جس کی سزا اتنی کڑی دی گئی؟“

سب چلے گئے۔ عائشہ ان کو باہر تک چھوڑنے لگی۔ شفقت ایک فلسفی بن کر
سوچتا رہ گیا۔ اتنے میں شفقت کے دوست آگئے اور وہ بھی اپنی بیوی سے نگہت
کے بارے میں کوئی بات نہ کر سکا..... اپنے دوستوں کے ساتھ تاش کھیلنے میں ایسا

مشغول ہوا کہ نگہت اور اس کے روگ کو بھول گیا۔ جب رات ہو گئی اور عائشہ نے اسے نوکر کے ذریعے سے کھانے پر بلوایا تو اسے افسوس ہوا کہ اس نے محض کھیل کی خاطر نگہت کو فراموش کر دیا۔ چنانچہ اس کا ذکر اس نے عائشہ سے بھی کیا، لیکن اس نے کہا ”آپ کھانے کھائیے مفصل باتیں پھر ہو جائیں گی۔“

میاں بیوی دونوں اکٹھے سوتے تھے۔ جب سے ان کی شادی ہوئی تھی وہ کبھی رات کو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوئے تھے۔ اور ان کی شادی کو قریب قریب چھ برس ہو گئے تھے۔ مگر اس دوران میں کوئی بچہ نہ ہوا تھا۔ ڈاکٹروں کا یہ کہنا تھا کہ عائشہ میں کچھ قصور ہے جو آپریشن سے دور ہو سکتا ہے مگر وہ اس سے بہت خائف تھی۔ میاں بیوی بہت پیار محبت کی زندگی گزار رہے تھے۔ انکے درمیان کوئی رنجش نہیں تھی۔

رات کو وہ اکٹھے لیٹتے۔ حسب معمول جب ایک دوسرے کے ساتھ لیٹے تو شفقت کو نگہت کی یاد آئی۔ اس نے ایک آہ بھر کر اپنی بیوی سے پوچھا ”عائشہ نگہت بے چاری کو کیا روگ ہے؟“

عائشہ نے بھی آہ بھری اور بڑے افسوسناک لہجے میں کہا ”تین برس کی ننھی منی بچی تھی کہ تب محرقہ ہوا۔ بچا دھڑمفلوج ہو گیا۔“

شفقت کے دل میں نگہت کے لیے ہمدردی کا بے پناہ جذبہ پیدا ہوا۔

اس نے اپنی بیوی کی پیٹھ کو اپنے سینے سے لگا لیا اور کہا ”عائشہ کیوں خدا اتنا ظالم ہے؟“

عائشہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ شفقت کو دن بھر کے واقعات یاد آنے لگے

”جب میں نے اس سے کہا تھا کہ چلو میں تمہیں الہم دکھاتا ہوں تو تم نے میرا ہاتھ اسی لیے دبایا تھا کہ.....“

”ہاں.....ہاں.....اور کیا؟ آپ تو بار بار.....“

”خدا کی قسم مجھے معلوم نہیں تھا۔“

”اس کو اس کا بہت احساس ہے کہ وہ اپنا جج ہے۔“

”تم نے یہ کہا ہے تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے سینے میں کسی نے تیرا مارا ہے۔“

”جب وہ آئی تو خدا کی قسم مجھے بہت دکھ ہوا..... بے چاری کو پیشاب کرتا تھا۔ مان اور چھوٹی بہن ساتھ گئیں۔ ازار بند کھولا..... پھر بند کیا.....“

”کتنی خوبصورت ہے..... بیٹھی..... ہو تو خدا کی قسم بالکل پتہ نہیں چلتا کہ فالج زدہ ہے۔“

”بڑی ذہین لڑکی ہے۔“

”اچھا؟“

”ماں کہتی تھی کہ اس نے کہا تھا کہ امی جان میں شادی نہیں کروں گی۔ کنواری رہوں گی۔“

شفقت تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے انتہائی دکھ محسوس کرتے ہوئے کہا ”تو اس کو اس بات کا احساس ہے کہ اس سے شادی کرنے کے لیے کوئی رضامند نہیں ہوگا۔“

عائشہ نے شفقت کی چھاتی کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے کہا

..... ”شفقت صاحب کون شادی کرے گا ایک پانچ سے۔“
 ”نہیں نہیں ایسا نہ ہو عائشہ۔“
 ”اتنی بری قربانی کون کر سکتا ہے شفقت صاحب؟“
 ”تم ٹھیک کہتی ہو۔“
 ”خوبصورت ہے، اچھے کھاتے پیتے ماں باپ کی لڑکی ہے۔۔۔۔۔ سب ٹھیک ہے
 مگر۔۔۔۔۔“
 ”میں سمجھتا ہوں۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔“
 ”مردوں کے دل میں رحم کہاں؟“
 شفقت نے کروٹ بدلی ”ایسا نہ ہو عائشہ۔“
 عائشہ نے بھی کروٹ بدلی۔ دونوں رو برو ہو گئے۔ ”میں سب جانتی ہوں کوئی
 ایسا مرد ڈھونڈے جو اس بے چاری سے شادی کرنے پر آمادہ ہو۔“
 ”مجھے معلوم نہیں لیکن۔۔۔۔۔“
 ”بڑی بہن ہے غریب کو کتنا دکھ ہوتا ہے کہ اس کی چھوٹی بہن کی شادی کی
 بات چیت ہو رہی ہے۔“
 ”صحیح کہتی ہو تم۔“
 عائشہ نے ایک لمبی آہ بھری ”کیا بے چاری اسی طرح ساری عمر کڑھتی رہے
 گی۔“
 ”نہیں“ یہ کہہ کر شفقت اٹھ کر بیٹھ گیا۔
 عائشہ نے پوچھا ”کیا مطلب؟“

”تمہیں اس سے ہمدردی ہے؟“

”کیوں نہیں؟“

”خدا کی قسم کھا کر کہو۔“

”ہائے..... یہ بھی کوئی قسم کھلانے کی بات ہے ہر انسان کو اس سے ہمدردی ہونی چاہیے۔“

شفقت نے چند لمحات خاموش رہنے کے بعد کہا ”تو میں نے ایک بات سوچی ہے۔“

عائشہ نے خوش ہو کر کہا ”کیا؟“

”مجھے ہمیشہ اس بات کا خیال رہا ہے تم بہت بلند خیال عورت ہو۔ آج تم نے میرے اس خیال کو ثابت کر دیا ہے..... میں نے..... خدا میرے اس ارادے کو استقامت بخشے..... میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ میں گتہ سے شادی کر لوں گا..... سارا ثواب تمہیں ملے گا.....“

تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر ایک دم جیسے گولہ پھٹا.....

”شفقت صاحب میں آپ کو گولی مار دوں گی اگر آپ نے اس سے شادی کی.....“

شفقت نے ایسا محسوس کیا کہ اسے زیر دست گولی لگی ہے اور وہ مر کر اپنی بیوی کی آغوش میں دفن ہو گیا ہے.....

۲۳ جولائی ۱۹۵۰

☆☆☆

گورکھ سنگھ کی وصیت

پہلے چھرا بھونکنے کی اکا دکا واردات ہوتی تھی۔ اب دونوں فریقوں میں باقاعدہ لڑائی کی خبریں آنے لگی تھیں جن میں چاقو چھروں کے علاوہ کمر پائیں تلواریں اور بندوقیں عام استعمال کی جاتی تھیں کبھی کبھی ویسی ساخت کے بم پھٹنے کی اطلاع بھی ملتی تھی۔

امرتسر میں قریب قریب ہر ایک کا یہی خیال تھا کہ یہ فرقہ وارانہ فسادات دیر تک جاری نہیں رہیں گے۔ جوش ہے جو نبی ٹھنڈا ہوا فضا پھر اپنی اصلی حالت پر آ جائے گی۔ اس سے پہلے ایسی کئی فساد امرتسر میں ہو چکے تھے جو دیر پا نہیں تھے۔ دس پندرہ روز تک مار کٹائی کا ہنگامہ رہتا تھا پھر خود بخود فرو ہو جاتا تھا۔ چنانچہ پرانے تجربے کی بنا پر لوگوں کا یہی خیال تھا کہ یہ آگ جموڑی دیر کے بعد اپنا زور ختم کر کے ٹھنڈی ہو جائے گی۔ مگر ایسا نہ ہوا..... بلووں کا زور رون بدن بڑھتا ہی گیا۔ ہندوؤں کے محلے میں جو مسلمان رہتے تھے بھاگنے لگے۔ اسی طرح وہ ہندو جو مسلمانوں کے محلے میں تھے اپنا گھر بار چھوڑ کے محفوظ مقاموں کا رخ کرنے لگے۔ مگر یہ انتظام سب کے نزدیک عارضی تھا۔ اس وقت تک کے لیے جب فضا فسادات کے تکرر سے پاک ہو جانے والی تھی۔

میاں عبدالحی ریٹائرڈ سب جج کو تو سو فیصد یقین تھا کہ صورت حال بہت جلد درست ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زیادہ پریشان نہیں تھے ان کا ایک لڑکا تھا گیارہ برس کا۔ ایک لڑکی تھی سترہ برس کی۔ ایک پرانا ملازم تھا جس کی عمر ستر کے

لگ بھگ تھی مختصر سا خاندان تھا۔ جب فسادات شروع ہوئے تو میاں صاحب نے بطور حفظ ماتقدم کافی راشن گھر میں جمع کر لیا تھا۔ اس طرف سے وہ بالکل مطمئن تھے کہ اگر خدا نخواستہ حالات کچھ زیادہ بگڑ گئے اور دکانیں وغیرہ بند ہو گئیں تو انہیں کھانے پینے کے معاملے میں تر دو نہیں کرنا پڑے گا لیکن ان کی جوان لڑکی صغریٰ بہت متمدن تھی۔ ان کا گھر تین منزلہ تھا۔ دوسری عمارتوں کے مقابلے میں کافی اونچا۔ اس کی ممتی سے شہر کا تین چوتھائی حصہ بنوئی نظر آتا تھا۔ صغریٰ اب کئی دنوں سے دیکھ رہی تھی کہ نزدیک دور کہیں نہ کہیں آگ لگی ہوتی ہے۔ شروع شروع میں تو فائر بریگیڈ کی ٹن ٹن سنائی دیتی تھی پر اب وہ بھی بند ہو گئی تھی اس لیے کہ جگہ جگہ آگ بھڑکنے لگی تھی۔

رات کو اب کچھ اور ہی سماں ہوتا۔ گھپ اندھیرے میں آگ کے بڑے بڑے شعلے اٹھتے جیسے دیو ہیں جو اپنے منہ سے آگ کے فوارے چھوڑ رہے ہیں۔ پھر عجیب عجیب سی آوازیں آتیں جو ہر بہر مہادیو اور اللہ اکبر کے نعرے کے ساتھ مل کر بہت ہی وحشت ناک بن جاتیں۔

صغریٰ باپ سے اپنے خوف و ہراس کا ذکر نہیں کرتی تھی۔ اس لیے کہ وہ ایک بار گھر میں کہہ چکے تھے کہ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ میاں صاحب کی باتیں اکثر درست ہوا کرتی تھیں۔ صغریٰ کو اس سے ایک گونہ اطمینان تھا۔ مگر جب بجلی کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور ساتھ ہی نلوں کا پانی آنا بند ہو گیا تو اس نے میاں صاحب سے اپنی تشویش کا اظہار کیا اور ڈرتے ڈرتے رائے دی تھی کہ چند روز کے لیے شریف پورے اٹھ جائیں جہاں اڑوس پڑوس کے سارے

مسلمان آہستہ آہستہ جا رہے تھے۔ میاں صاحب نے اپنا فیصلہ نہ بدلا اور کہا ”بیچارہ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں حالات بہت جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔“

مگر حالات بہت جلدی ٹھیک نہ ہوئے اور دن بدن بگڑتے گئے۔ وہ محلہ جس میں میاں عبدالحی کا مکان تھا مسلمانوں سے خالی ہو گیا۔ اور خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ میاں صاحب پر ایک روز چانک فوج گرا جس کے باعث وہ صاحب فرار ہو گئے۔ ان کا لڑکا بشارت بھی جو پہلے گھر میں اکیلا گھر میں اوپر نیچے طرح طرح کے کھیلوں میں مصروف رہتا تھا اب باپ کی چار پائی کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا اور حالات کی نزاکت کو سمجھنے لگا۔

وہ بازار جوان کے مکان کیساتھ ملحق تھا سنان پڑا تھا۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ کی ڈپنٹری مدت سے بند پڑی تھی۔ اس سے کچھ دور ہٹ کر ڈاکٹر گوراندا تامل تھے۔ صغریٰ نے شہ نشین سے دیکھا تھا کہ ان کی دکان میں بھی تالے پڑے ہیں۔ میاں صاحب کی حالت بہت ہی مخدوش تھی۔ صغریٰ اس قدر پریشان تھی کہ اس کے ہوش و حواس بالکل جواب دے گئے تھے۔ بشارت کو الگ لے جا کر اس نے کہا ”خدا کے لیے تم ہی کچھ کرو میں جانتی ہوں کہ باہر نکلتا خطرے سے خالی نہیں مگر تم جاؤ..... کسی کو بھی بلاؤ اباجی کی حالت بہت خطرناک ہے۔“

بشارت گیا مگر فوراً ہی واپس آ گیا۔ اس کا چہرہ بلدی کی طرح زرد تھا۔ چوک میں اس نے ایک لاش دیکھی تھی۔ خون سے تر ہتر..... اور پاس ہی بہت سے آدمی ٹھائے باندھے ایک دکان لوٹ رہے تھے۔ صغریٰ نے اپنے خوفزدہ بھائی کو اپنے سینے سے لگایا اور صبر شکر کر کے بیٹھ گئی۔ مگر اس سے اپنے باپ کی حالت دیکھی نہیں

جاتی تھی۔ میاں صاحب کے جسم کا دابنا حصہ بالکل سن ہو گیا تھا جیسے اس میں جان ہی نہیں۔ گویائی میں بھی فرق پڑ گیا تھا اور وہ زیادہ تر اشاروں ہی سے باتیں کرتے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ صغریٰ گھبرانے کی کوئی بات نہیں خدا کے فضل و کرم سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔

کچھ بھی ٹھیک نہ ہوا۔ روزے ختم ہونے والے تھے۔ صرف دورہ گئے۔ میاں صاحب کا خیال تھا کہ عید سے پہلے پہلے فضا بالکل صاف ہو جائے گی مگر اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید عید ہی کا روز روز قیامت ہو کیونکہ مٹی پر سے اب شہر کے قریب قریب ہر حصے سے دھوئیں کے بادل اٹھتے دکھائی دیتے تھے۔ رات کو بم پھٹنے کی ایسی ہولناک آوازیں آتی تھیں کہ صغریٰ اور بشارت ایک لٹلے کے لیے بھی نہیں سو سکتے تھے۔ صغریٰ کو تو یوں بھی باپ کی تیمارداری کے لیے جاگنا پڑتا تھا۔ مگر اب یہ دھماکے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دماغ کے اندر رہ رہے ہیں۔ کبھی وہ اپنے مفلوج باپ کی طرف دیکھتی اور کبھی اپنے وحشت زدہ بھائی کی طرف..... ستر برس کا ایک بڑا ملازم اکبر تھا جس کا وجود ہونے نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ سارا دن لوہا ساری رات پڑا اپنی کوٹھڑی میں کھانسی کھنکھارتا اور بلغم نکالتا رہتا تھا۔ ایک روز تنگ آ کر صغریٰ اس پر برس پڑی ”تم کس مرض کی دوا ہو۔ دیکھتے نہیں ہو میاں صاحب کی کیا حالت ہے۔ اصل میں تم پر لے درجے کے نمک حرام ہو۔ اب خدمت کا موقع آیا ہے تو دے کا بہانہ کر کے یہاں پڑے رہتے ہو..... وہ بھی خادم تھے جو آقا کے لیے اپنی جان تک قربان کر دیتے تھے۔“

صغریٰ اپنا جی ہا کا کر کے چلی گئی۔ بعد میں افسوس ہوا کہ ناحق اس غریب کو اتنی

اعت ملاست کی۔ رات کا کھانا تھا۔ میں لگا کر اس کی کوٹھڑی میں گئی تو دیکھا خالی ہے بشارت نے ادھر ادھر تلاش کیا مگر وہ نہ ملا۔ باہر کے دروازے کی کنڈی کھلی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ میاں صاحب کے لیے کچھ کرنے گیا ہے۔ صغریٰ نے بہت دعائیں مانگیں کہ خدا اسے کامیاب کرے لیکن دو دن گزر گئے اور وہ نہ آیا۔

شام کا وقت تھا۔ ایسی کئی شامیں صغریٰ اور بشارت دیکھ چکے تھے جب عید کی آمد آمد کے ہنگامے برپا ہوتے تھے۔ جب آسمان پر چاند دیکھنے کے لیے ان کی نظریں جمی رہتی تھیں۔ دوسرے روز عید تھی۔ صرف چاند کو اس کا اعلان کرنا تھا۔ دونوں اس اعلان کے لیے کتنے بے تاب ہوا کرتے تھے۔ آسمان پر چاند والی جگہ پر اگر بادل کا کوئی ہلیا کھڑا جم جاتا تو کتنی کوفت ہوتی تھی انہیں مگر اب چاروں طرف دھوئیں کے بادل تھے۔ صغریٰ اور بشارت دونوں مٹی پر چڑھے۔ دور کہیں کہیں کوٹھوں پر لوگوں کے سایے دھبوں کی صورت میں دکھائی دیتے تھے۔ مگر معلوم نہیں یہ چاند کو دیکھ رہے تھے یا جگہ جگہ سلگتی اور بھڑکتی ہوئی آگ۔

چاند بھی کچھ ایسا ڈھیٹ تھا کہ دھوئیں کی چادر میں سے بھی نظر آ گیا۔ صغریٰ نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی کہ خدا اپنا فضل کرے اور اس کے باپ کو تندرستی عطا فرمائے۔ بشارت دل ہی دل میں کوفت محسوس کر رہا تھا کہ گڑبڑ کے باعث ایک اچھی بھلی عید نارت ہو گئی۔

دن ابھی پوری طرح ڈھانڈھ نہیں تھا۔ یعنی شام کی سیاہی ابھی گہری نہیں ہوئی تھی۔ میاں صاحب کی چارپائی چھڑکاؤ کیے ہوئے صحن میں بکھی تھی۔ وہ اس پر بے حس

وحرکت لیٹے تھے اور دروہ آسمان پر نکلیں جمائے جانے کیا سوچ رہے تھے۔ عید کا چاند دیکھ کر جب صغریٰ نے پاس آ کر انہیں سلام کیا تو انہوں نے اشارے سے جواب دیا۔ صغریٰ نے سر جھکایا تو انہوں نے وہ بازو جو ٹھیک تھا اٹھایا اور اس پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ صغریٰ کی آنکھوں سے آنسو پپ گرنے لگے تو میاں صاحب کی آنکھیں بھی نمناک ہو گئیں مگر انہوں نے تسلی دینے کی خاطر بمشکل اپنی نیم مفلوج زبان سے یہ الفاظ نکالے ”اللہ تبارک و تعالیٰ سب ٹھیک کر دے گا۔“

عین اسی وقت باہر دروازے پر دستک ہوئی۔ صغریٰ کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اس نے بشارت کی طرف دیکھا۔ جس کا چہرہ کاغذ کی طرح سفید ہو گیا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ میاں صاحب صغریٰ سے مخاطب ہوئے ”دیکھو کون ہے۔“

صغریٰ نے سوچا شاید بڑھا اکبر ہو۔ اسی خیال میں اس کی آنکھیں تہمتا تھیں۔

بشارت کا بازو پکڑ کر اس نے کہا ”جاؤ دیکھو..... شاید اکبر آیا ہے۔“

یہ سن کر میاں صاحب نے نفی میں یوں سر ہلایا جیسے وہ یہ کہہ رہے ہیں ”نہیں یہ اکبر نہیں ہے۔“

صغریٰ نے کہا ”تو اور کون ہو سکتا ہے اباجی!“

میاں عبدالجی نے اپنی قوت گویائی پر زور دے کر کچھ کہنے کی کوشش کی کہ

بشارت آ گیا وہ سخت خوفزدہ تھا۔ ایک سانس اوپر ایک نیچے صغریٰ کو میاں صاحب کی چارپائی سے ایک طرف ہٹا کر اس نے ہولے سے کہا ”ایک سکھ ہے۔“

صغریٰ کی چیخ نکل گئی ”سکھ؟ کیا کہتا ہے؟“

بشارت نے جواب دیا ”کہتا ہے دروازہ کھولو“۔

صغریٰ نے کانپتے ہوئے بشارت کو کھینچ کر اپنے ساتھ چٹا لیا اور باپ کی چارپائی پر بیٹھ گئی اور اپنے باپ کی طرف ویران نظروں سے دیکھنے لگی۔
میاں عبدالحی کے پتلے پتلے بے جان ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ ”جاؤ گورکھ سنگھ ہے“۔

بشارت نے نفی میں سر ہلا دیا ”نہیں کوئی اور ہے“۔

میاں صاحب نے فیصلہ کن انداز میں کہا ”جاؤ صغریٰ وہی ہے“۔
صغریٰ اٹھی۔ وہ گورکھ سنگھ کو جانتی تھی۔ پنشن لینے سے کچھ دیر پہلے اس کے باپ نے اس نام کے ایک سکھ کا کوئی کام کیا تھا۔ صغریٰ کو اچھی طرح یاد نہیں تھا۔ شاید اس کو ایک جھوٹے مقدمے سے نجات دلائی تھی۔ جب سے وہ ہر چھوٹی عید سے ایک دن پہلے رومانی سویوں کا ایک تھیلا لے کر آیا کرتا تھا۔ اس کے باپ نے کئی مرتبہ اس سے کہا تھا۔ ”سردار جی آپ تکلف نہ کیا کریں“۔ مگر وہ ہاتھ جوڑ کر جواب دیا کرتا تھا ”میاں صاحب وا بگورو جی کی کرپا سے آپ کے پاس سب کچھ ہے۔ یہ تو ایک تحفہ ہے جو میں جناب کی خدمت میں ہر سال لے کر آتا ہوں۔ مجھ پر جو آپ نے احسان کیا تھا اس کا بدلہ تو میری سو پشت بھی نہیں چکا سکتی..... خدا آپ کو خوش رکھے“۔

سردار گورکھ سنگھ کو ہر سال عید سے ایک روز پہلے سویوں کا تھیلا لاتے اتنا عرصہ ہو گیا تھا کہ صغریٰ کو حیرت ہوئی کہ اس نے دستک سن کر یہ کیوں خیال نہ کیا کہ وہی ہوگا، مگر بشارت بھی تو اس کو سینکڑوں مرتبہ دیکھ چکا تھا، پھر اس نے کیوں کہا کوئی

اور ہے۔۔۔ اور کون ہو سکتا ہے۔ یہ سوچتی صغریٰ ڈیوڑھی تک پہنچی۔ دروازہ کھولے
یا اندر ہی سے پوچھے اس کے متعلق ابھی وہ فیصلہ ہی کر رہی تھی کہ دروازے پر زور
سے دستک ہوئی۔ صغریٰ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ بمشکل تمام اس نے حلق
سے آواز نکالی ”کون ہے؟“

بشارت پاس کھڑا تھا۔ اس نے دروازے کی ایک درز کی طرف اشارہ کیا۔ اور
صغریٰ سے کہا ”اس میں سے دیکھو۔“

صغریٰ نے درز میں سے دیکھا۔ گورکھ سنگھ نہیں تھا وہ تو بہت بوڑھا تھا لیکن یہ جو
باہر تھڑے پر کھڑا تھا جوان تھا۔ صغریٰ ابھی درز پر آنکھ جمائے اس کا جائزہ لے رہی
تھی کہ اس نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ صغریٰ نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں کانڈکا
ایک تھیلا ہے وہ یہاں جیسا گورکھ سنگھ لایا کرتا تھا۔

صغریٰ نے درز سے آنکھ ہٹائی اور ذرا بلند آواز میں دستک والے سے پوچھا
”کون ہیں آپ؟“

باہر سے آواز آئی ”جی۔۔۔ جی میں۔۔۔ میں سردار گورکھ سنگھ کا بیٹا ہوں۔۔۔۔۔
سنتو کھ۔“

صغریٰ کا خوف بہت حد تک دور ہو گیا۔ بڑی شائستگی سے اس نے پوچھا
”فرمائیے۔۔۔ آپ کیسے آئے ہیں۔“

باہر سے آواز آئی ”جی۔۔۔۔۔ جی صاحب کہاں ہیں۔“

صغریٰ نے جواب دیا ”بیار ہیں“

سردار سنتو کھ سنگھ نے افسوس آمیز لہجے میں کہا ”اوہ۔۔۔۔۔ پھر اس نے کانڈکا

تھیا کھڑکھڑایا ”جی یہ سویاں ہیں..... سردار جی کا دیہانت ہو گیا ہے..... وہ مر گئے ہیں۔“

صغریٰ نے جلدی سے پوچھا ”مر گئے ہیں۔“

باہر سے آواز آئی ”جی ہاں..... ایک مہینہ ہو گیا ہے..... مرنے سے پہلے انہوں نے مجھے تاکید کی تھی کہ دیکھو بیٹا! میں حج صاحب کی خدمت میں پورے دس برس سے ہر چھوٹی عید پر سویاں لے جاتا رہا ہوں..... یہ کام میرے مرنے کے بعد اب تمہیں کرنا ہوگا..... میں نے انہیں وچن دیا تھا۔ جو میں پورا کر رہا ہوں..... لے لیجیے سویاں۔“

صغریٰ اس قدر متاثر ہوئی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے تھوڑا سا دروازہ کھولا۔ سردار گورکھ سنگھ کے لڑکے نے سویوں کا تھیا آگے بڑھا دیا جو صغریٰ نے پکڑ لیا اور کہا ”خدا سرور جی کو جنت نصیب کرے۔“

گورکھ سنگھ کا لڑکا کچھ توقف کے بعد بولا ”حج صاحب بیمار ہیں۔“

صغریٰ نے جواب دیا ”جی ہاں۔“

”کیا بیماری ہے؟“

”قلج۔“

”اوہ سردار جی زندہ ہوتے تو انہیں یہ سن کر بہت دکھ ہوتا..... مرتے دم تک انہیں حج صاحب کا احسان یاد تھا۔ کہتے تھے وہ انسان نہیں دیوتا ہیں..... اللہ میاں انہیں زندہ رکھے..... انہیں میرا سلام کہنا۔“

اور یہ کہہ کر وہ تھڑے سے اتر گیا..... صغریٰ سوچتی ہی رہ گئی کہ وہ اسے ٹھہرائے

اور کہے کہ جج صاحب کے لیے کسی ڈاکٹر کا بندہ بہت کر دے۔
 سردار گورکھ سنگھ کا لڑکا سنتو کھج صاحب کے مکان کے تھڑے سے اتر کر چند
 گز آگے بڑھا تو چار ٹھانا باندھے ہوئے آدمی اس کے پاس آئے دو کے پاس
 جلتی مشعلیں تھیں اور وہ کے پاس مٹی کے تیل کے کنسترو اور کچھ دوسری آتش خیز
 چیزیں۔ ایک نے سنتو کھ سے پوچھا ”کیوں سردار جی اپنا کام کر آئے؟“
 سنتو کھ نے سر ہلا کر جواب دیا ”ہاں کر آیا۔“
 اس آدمی نے ٹھانے کے اندر دھنس کر پوچھا ”تو کر دیں معاملہ ٹھنڈا جج
 صاحب کا۔“
 ”ہاں..... جیسے تمہاری مرضی“۔ یہ کہہ کر سردار گورکھ سنگھ کا لڑکا چل دیا۔

۱۵ اکتوبر ۱۹۵۱ء

☆☆☆

لال ٹین

میرا قیام ”بؤت“ میں گونجتا تھا لیکن گونا گوں روحانی مسرتوں سے پر۔ میں نے اس کی صحت افزا فضا میں جتنے دن گزارے ہیں ان کی کچھ ہر لمحہ کی یاد میرے ذہن کا ایک جزو بن کے رہ گئی ہے۔ جو بھلائے نہ بھولے گی..... کیا دن تھے..... بار بار میرے دل کی گہرائیوں سے یہ آواز بلند ہوتی ہے اور میں کئی کئی گھنٹے اس کے زیر اثر بے خود و مدہوش رہتا ہوں۔ کسی نے ٹھیک کہا: ایک انسان اپنی گزشتہ زندگی کے کھنڈروں پر مستقبل کی دیواریں استوار کرتا ہے۔ ان دنوں میں بھی یہی کر رہا ہوں یعنی بیتے ہوئے ایام کی یاد کو اپنی مضحکہ خیز زندگی بخش انجکشن کے طور پر استعمال کر رہا ہوں۔

جوکل ہوا تھا اسے اگر آج دیکھا جائے تو اس کے اور ہمارے درمیان صدیوں کا فاصلہ نظر آئے گا اور جوکل ہوتا ہے اس کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے اور نہ جان سکتے ہیں۔ آج سے پورے چار مہینے کی طرف دیکھا جائے تو بؤت میں میری زندگی ایک افسانہ معلوم ہوتی ہے۔ ایسا افسانہ جس کا مسودہ صاف نہ کیا گیا ہو۔ اس کھوئی ہوئی چیز کو حاصل کرنا دوسرے انسانوں کی طرح میرے بس میں بھی نہیں۔ جب میں استقبال کے آئینہ میں اپنی آنے والی زندگی کا عکس دیکھنا چاہتا ہوں تو اس میں مجھے حال ہی کی تصویر نظر آتی ہے اور کبھی کبھی اس تصویر کے پس منظر میں ماضی کی کچھ دھندلے نقوش نظر آ جاتے ہیں۔ ان میں بعض نقش اس قدر تیکھے اور شوخ رنگ ہیں کہ شاید ہی انہیں زمانہ کا ہاتھ مکمل طور پر مٹا سکے۔

زندگی کے اس کھوئے ہوئے نکلڑے کو میں اس وقت زمانہ کے ہاتھ میں دیکھ رہا ہوں جو شرمیلے بچے کی طرح مجھے بار بار اس کی جھلک دکھا کر اپنی پیٹھ پیچھے چھپا لیتا ہے..... اور میں اس کھیل ہی سے خوش ہوں۔ اس کو نینمست سمجھتا ہوں۔

ایسے واقعات کو جن کی یاد میرے ذہن میں اب تک تازہ ہے میں عام طور پر دہراتا رہتا ہوں تاکہ ان کی تمام شدت برقرار رہے اور اس غرض کے لیے میں کئی طریقے استعمال کرتا ہوں۔ بعض اوقات میں یہ بیٹے ہوئے واقعات اپنے دوستوں کو سنا کر اپنا مطلب حل کر لیتا ہوں۔ اگر آپ کو میرے ان دوستوں سے ملنے کا اتفاق ہو تو وہ آپ سے یقیناً یہی کہیں گے کہ میں قصہ گوئی اور آپ بیتیاں سنانے کا بالکل سلیقہ نہیں رکھتا۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ داستان سنانے کے دوران مجھے سامعین کے تیوروں سے ہمیشہ اس بات کا احساس ہوا ہیکہ میرا بیان غیر مربوط ہے اور میں جانتا ہوں کہ چونکہ میری داستان ہمواری کم اور جھٹکے زیادہ ہوتے ہیں اس لیے میں اپنے محسوسات کو اچھی طرح کسی کے دماغ میں منتقل نہیں کر سکتا اور مجھے اندیشہ ہے کہ شاید میں ایسا ہی کر سکوں۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ میں اکثر اوقات اپنی داستان سنا تے سنا تے جب ایسے مقام پر پہنچتا ہوں جس کی یاد میرے ذہن میں موجود نہ تھی اور وہ خیالات کی رو میں خود بخود بہہ کر چلی آتی تھی تو میں غیر ارادی طور پر اس نئی یاد کی گہرائیوں میں گم ہو جاتا ہوں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میرے بیان کا تسلسل ایک لخت منتشر ہو جاتا ہے اور جب میں ان گہرائیوں سے نکل کر داستان کے ٹوٹے ہوئے دھماکے کو جوڑنا چاہتا ہوں تو غجالت میں وہ ٹھیک طور سے نہیں جڑتا۔

کبھی کبھی میں یہ داستانیں رات کو سوتے وقت اپنے ذہن میں زبانی خود سنتا ہوں لیکن اس دوران میں مجھے بہت تکلیف اٹھانا پڑتی ہے۔ میرے ذہن کی زبان بہت تیز ہے اور اس کو قابو میں رکھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات چھوٹے چھوٹے واقعات اتنی تفصیل کے ساتھ خود بخود بیان ہونا شروع ہو جاتے ہیں کہ طبیعت اکتا جاتی ہے اور بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک واقعہ کسی دوسرے واقعہ کی یاد تازہ کر دیتی ہے اور اس کا احساس کسی دوسرے احساس کو اپنے ساتھ لے آتا ہے اور پھر احساسات و افکار کی بارش زوروں پر شروع ہو جاتی ہے اور اتنا شور مچتا ہے کہ نیند حرام ہو جاتی ہے۔ جس روز صبح کو میری آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے نظر آئیں آپ سمجھ لیا کریں کہ ساری رات میں اپنے ذہن کی قصہ گوئی کا شکار رہا ہوں۔

جب مجھے کسی بیتے ہوئے واقعہ کو اس کی تمام شدتوں سمیت محفوظ کرنا ہوتا ہے تو میں قلم اٹھاتا ہوں اور کسی گوشے میں بیٹھ کر کاندھ پر اپنی زندگی کی اس کلڑے کی تصویر کھینچ دیتا ہوں یہ تصویر بھدی ہوتی ہے یا خوبصورت اس کے متعلق کچھ کہہ نہیں سکتا اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ ہمارے ادبی نقاد میری ان قلمی تصویروں کے متعلق کیا رائے مرتب کرتے ہیں۔ دراصل مجھے ان لوگوں سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ اگر میری تصویر کشی سقیم اور خام ہے تو ہوا کرے مجھے اس سے کیا اور اگر یہ ان کے مقرر کردہ معیار پر پوری اترتی ہے تو بھی مجھے اس سے کیا سروکار ہو سکتا ہے۔ میں یہ کہانیاں صرف اس لیے لکھتا ہوں کہ مجھے کچھ لکھنا ہوتا ہے۔ جس طرح عادی شراب خور دن ڈھلے شراب خانہ کا رخ کرتا ہے ٹھیک اسی طرح میری

انگلیاں بے اختیار قلم کی جانب بڑھتی ہیں اور میں لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔ میرا
روئے سخن یا تو اپنی طرف ہوتا ہے یا ان چند افراد کی طرف جو میری تحریروں میں
دلچسپی لیتے ہیں۔ میں ادب سے دور اور زندگی سے نزدیک تر ہوں۔
زندگی..... زندگی!!..... آہ زندگی!!

میں زندگی زندگی پکارتا ہوں مگر مجھ میں زندگی کہاں؟ اور شاید یہی وجہ ہے کہ
میں اپنی عمر کی پٹاری کھول کر اس کی ساری چیزیں باہر نکالتا ہوں اور جھاڑ پونچھ کر
بڑے قریب سے ایک قطار میں رکھتا ہوں اور اس آدمی کی طرح جس کے گھر میں
تھوڑا سا سامان ہو ان کی نمائش کرتا ہوں۔ بعض اوقات مجھے اپنا یہ فعل برا معلوم ہوتا
ہے لیکن میں کیا کروں۔ مجبور ہوں۔ میرے پاس اگر زیادہ نہیں ہے تو اس میں میرا
کیا قصور ہے۔ اگر مجھ میں سفلہ پن پیدا ہو گیا ہے تو اس کا ذمہ دار میں کیسے ہو سکتا
ہوں۔ میرے پاس تھوڑا بہت جو کچھ بھی ہے قیمت ہے۔ دنیا میں تو ایسے لوگ بھی
ہوں گے جن کی زندگی چٹیل میدان کی طرح خشک ہے اور میری زندگی کے
ریگستان پر تو ایک بار بارش ہو چکی ہے۔

گو میرا شباب ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکا ہے مگر میں ان دنوں کی یاد پر جی
رہا ہوں جب میں جوان تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ سہارا کبھی کسی روز جواب دے
جائے گا اور اس کے بعد جو کچھ ہو گا میں بتا نہیں سکتا لیکن اپنے موجودہ انتشار کو دیکھ
کر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرا انجام چشم فلک کو بھی نمناک کر دے گا۔ آہ!
خراپہ فکر کا انجام۔

وہ شخص جسے انجام کار اپنے ذہنی افکار کے نیچے پس جاتا ہے یہ سطور لکھ رہا ہے

اور مزے کی بات ہے کہ وہ ایسی اور بہت سی سطر میں لکھنے کی تمنا اپنے دل میں رکھتا ہے۔

میں ہمیشہ مغموم و ملول رہا ہوں لیکن شبیر جانتا ہے کہ بٹوت میں میری آہوں کی زردی اور تپش کے ساتھ ساتھ ایک خوش گوار مسرت کی سرخی اور ٹھنڈک بھی تھی۔ وہ آب و آتش کے اس باہمی ملاپ کو دیکھ کر متعجب ہوتا تھا اور غالباً یہی چیز تھی جس نے اس کی نگاہوں میں میرے وجود کو ایک مہمہ بنا دیا تھا۔ کبھی کبھی وہ مجھے سمجھنے کی کوشش کرتا تھا اور اس کوشش میں وہ میرے قریب بھی آ جاتا تھا۔ مگر دفعتاً کوئی ایسا حادثہ وقوع پذیر ہوتا جس کے باعث اسے پھر پرے ہٹا پڑتا تھا اور اس طرح وہ نئی شدت سے مجھے پر اسرار اور کبھی پر قنع انسان سمجھنے لگتا۔

اکرم صاحب حیران تھے کہ بٹوت جیسی غیر آباد اور غیر دلچسپ دیہات میں پڑے رہنے سے میرا کیا مقصد ہے۔ وہ ایسا کیوں سوچتے تھے؟ اس کی وجہ میرے خیال میں صرف یہ ہے کہ ان کے پاس سوچنے کے لیے اور کچھ نہیں تھا۔ چنانچہ وہ اسی مسئلے پر غور و فکر کرتے رہتے تھے۔

وزیر کا گھرانہ کے بنگلے کے سامنے بلند پہاڑی پر تھا اور جب انہوں نے اپنے نوکر کی زبانی یہ سنا کہ میں اس پہاڑی لڑکی کے ساتھ پہروں باتیں کرتا رہتا ہوں تو انہوں نے یہ سمجھا کہ میری دھتکتی ہوئی رگ ان کے ہاتھ آگئی ہے اور انہوں نے ایک ایسا راز معلوم کر لیا ہے جس کے افشا پر تمام دنیا کے دروازے مجھ پر بند ہو جائیں گے۔ لوگوں سے وہ جب اس مسئلے پر باتیں کرتے تھے تو یہ کہا کرتے تھے کہ میں تعیش پسند ہوں اور ایک بھولی بھالی لڑکی کو پھانس رہا ہوں اور ایک بار جب

انہوں نے مجھ سے بات کی تو کہا۔ دیکھیے یہ پہاڑی لونڈیا بڑی خطرناک ہے۔ ایسا نہ ہو آپ اس کے جال میں پھنس جائیں۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انہیں یا کسی اور کو میرے معاملات سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ وزیر کا کریکٹر بہت خراب تھا اور میرا کریکٹر بھی کوئی خاص اچھا نہیں تھا لیکن سوال یہ ہے کہ لوگ کیوں میری فکر میں مبتلا تھے اور پھر جوان کے من میں تھا صاف صاف کیوں نہیں کہتے تھے۔ وزیر پر میرا کوئی حق نہیں تھا اور نہ وہ میرے دباؤ میں تھی۔ اکرام صاحب یا کوئی اور صاحب اگر اس سے دوستانہ ماحول پیدا کرنا چاہتے تو مجھے اس میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ دراصل ہماری تہذیب و معاشرت ہی کچھ اس قسم کی ہے کہ عام طور پر صاف گوئی کو معیوب خیال کیا جاتا ہے۔ مکمل کربات ہی نہیں کی جاتی اور کسی کے متعلق اگر اظہار خیال کیا بھی جاتا ہے تو غلاف چڑھا کر۔

میں نے صاف گوئی سے کام لیا اور اس پہاڑی لونڈیا سے جسے بڑا خطرناک کہا جاتا تھا اپنی دلچسپی کا اعتراف کیا۔ لیکن چونکہ یہ لوگ اپنے دل کی آواز کو دل ہی میں دبا کر رکھنے کے عادی تھے اس لیے میری سچی باتیں ان کو بالکل جھوٹی معلوم ہوئیں اور ان کا شک بدستور قائم رہا۔

میں انہیں کیسے یقین دلانا کہ میں اگر وزیر میں دلچسپی لیتا ہوں تو اس کا باعث یہ ہے کہ میرا ماضی و حال تاریک ہے۔ مجھے اس سے محبت نہیں تھی۔ اسی لیے میں اس سے زیادہ وابستہ تھا۔ وزیر سے میری دلچسپی اس محبت کا ریسرسل تھی جو میرے دل میں اس عورت کے لیے موجود ہے جو ابھی میری زندگی میں نہیں آئی۔ میری

زندگی کی اگلی میں وزیر ایک چھوٹا سا گھینہ تھی لیکن یہ گھینہ مجھے بڑا عزیز تھا اس لیے اس کی تراش خراش اس کا ماپ بالکل اس اصلی گھینہ کے مطابق تھا جس کی تلاش میں میں ہمیشہ ماکام رہا ہوں۔

وزیر سے میری دل بستگی بے غرض نہیں تھی اس لیے میں غرض مند تھا وہ شخص جو اپنے غم افزا ماحول کو کسی کے وجود سے رونق بخشنا چاہتا ہو اس سے زیادہ خود غرض اور کون ہو سکتا ہے؟ اس لحاظ سے میں وزیر کا ممنون بھی تھا اور خدا گواہ ہے کہ میں جب کبھی اس کو یاد کرتا ہوں تو بے اختیار میرا دل اس کا شکریہ ادا کرتا ہے۔

شہر میں مجھے صرف ایک کام تھا..... اپنے ماضی حال اور مستقبل کے کھپ اندھیرے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہنا اور بس..... مگر بیوت میں اس تاریکی کے اندر روشنی کی ایک شعاع تھی وزیر کی لال ٹین!

بھمیارے کے ہاں رات کو کھانا کھانے کے بعد میں اور شبیر ٹہلتے ٹہلتے اکرام صاحب کے بنگلے کے پاس پہنچ جاتے۔ یہ بنگلہ ہوٹل سے قریباً تین جریب کے فاصلے پر تھا۔ رات کی خنک اور نیم مرطوب ہوا میں اس چہل قدمی کا بہت اطف آتا تھا۔ سڑک کے دائیں بائیں پہاڑیوں اور ڈھلوانوں پر کئی کے کھیت رات کے دھندلکے میں خاکستری رنگ کے بڑے بڑے قالین معلوم ہوتے تھے اور جب ہوا کے جھونکے مکئی کے پودوں میں لرزش پیدا کر دیتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ آسمان سے بہت سی پریاں ان قالینوں پر اتر آئی ہیں اور ہولے ہولے ناچ رہی ہیں۔

آوصار راستہ طے کرنے پر جب ہم سڑک کے بائیں ہاتھ ایک چھوٹے سے دو منزلہ چوٹی مکان کے قریب پہنچتے تو شبیر اپنے مخصوص دھن میں یہ شعر گاتا:

ہر قدم فتنہ ہے قیامت ہے
آسمان تیری چال کیا جانے

یہ شعر گانے کی ایک خاص وجہ تھی۔ اس چوٹی مکان کے رہنے والے اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ میرے اور وہ زیر کے تعلقات اخلاقی نقطہ نگاہ سے ٹھیک نہیں تھے حالانکہ وہ اخلاق کے معانی سے بالکل نا آشنا تھے۔ یہ لوگ مجھ سے اور شبیر سے بہت دلچسپی لیتے تھے اور میری نقل و حرکت پر خاص طور پر نگہ رانی کرتے تھے، وہ تفریح کی غرض سے ہوتے آئے ہوئے تھے اور انہیں تفریح کا کافی سامان مل گیا تھا۔ شبیر اور وہ الا شعر گانے کی تفریح میں مزید اضافہ کیا کرتا تھا۔ اس کو چھیڑ چھاڑ میں خاص لطف آتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کی رہائش گاہ کے سین سامنے پہنچ کر اس کو یہ شعر یاد آ جاتا تھا اور وہ فوراً اسے بلند آواز میں گایا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ اس کا عادی ہو گیا تھا۔

یہ شعر کسی خاص واقعے یا تاثر کے متعلق نہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ اسے صرف یہی شعر یاد تھا یا ہو سکتا ہے کہ وہ صرف اسی شعر کو گاسکتا تھا اور نہ کوئی وجہ تھی کہ وہ بار بار یہی شعر دہراتا۔

شروع شروع میں اندھیری راتوں میں سسنان سڑک پر ہماری چہل قدمی چوٹی مکان کے چوٹی سائیکوں پر (وہ غیر معمولی طور پر اجڑا اور گنوار واقع ہوئے تھے) کوئی اثر پیدا نہ کر سکی۔ مگر کچھ دنوں کے بعد ان کے بالائی کمرے میں روشنی نظر آنے لگی اور وہ ہماری آمد کے منتظر رہنے لگے اور جب ایک روز ان میں سے ایک نے اندھیرے میں ہمارا رخ معلوم کرنے کے لیے بیٹری روشن کی تو میں نے

شبیر سے کہا ”آج ہمارا رومان مکمل ہو گیا ہے“۔ مگر میں نے دل میں ان لوگوں کی قابل رحم حالت پر بہت افسوس کیا، کیونکہ وہ بیکار دو دو تین تین گھنٹے جاگتے رہتے تھے۔

حسب معمول ایک رات شبیر نے اس مکان کے پاس پہنچ کر شعر گایا اور ہم آگے بڑھ گئے۔ بیڑی کی روشنی حسب معمول چمکی اور ہم باتیں کرتے ہوئے اکرام صاحب کے بنگے کے پاس پہنچ گئے۔ اس وقت رات کے دس بجے ہوں گے ہو کا عالم تھا ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی آسمان ہم پر مرتبان کی طرح جھکا ہوا تھا۔ اور میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ ہم کسی بوتل میں چل پھر رہے ہیں۔ سکوت اپنی آخری حد تک پہنچ کر منکلم ہو گیا تھا۔

بنگے کے باہر برآمدے میں ایک چھوٹی سی میز پر لیپ جل رہا تھا اور پاس ہی پلنگ پر اکرام صاحب لیٹے کسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھے۔ شبیر نے دور سے ان کی طرف دیکھا اور دفعتاً سا دھوؤں کا مخصوص نعرہ مستانہ ”الکھڑنجن“ بلند کیا۔ اس غیر متوقع شور نے مجھے اور اکرام صاحب دونوں کو چونکا دیا۔ شبیر کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ پھر ہم دونوں برآمدے میں داخل ہو کر اکرام صاحب کے پاس بیٹھ گئے۔ میرا منہ سڑک کی جانب تھا۔ عین اس وقت جب میں نے حقہ کی نے منہ میں دبائی مجھے سامنے سڑک کے اوپر تاریکی میں روشنی کی ایک جھلک دکھائی دی۔ پھر ایک متحرک سایہ نظر آیا اور اس کے بعد روشنی ایک جگہ ساکن ہو گئی۔ میں نے خیال کیا کہ شاید وزیر کا بھائی اپنے کتے کو ڈھونڈ رہا ہے۔ چنانچہ اوٹھ کر دیکھنا چھوڑ کر میں شبیر اور اکرام صاحب کے ساتھ باتیں کرنے میں مشغول ہو گیا۔

دوسرے روز شبیر کے نعرہ بلند کرنے کے بعد پھر اخروٹ کے درخت کے عقب میں روشنی نمودار ہوئی اور سایہ حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔ تیسرے روز بھی ایسا ہوا۔ چوتھے روز صبح کو میں اور شبیر چشمے پر غسل کو جا رہے تھے کہ اوپر سے ایک کنکر گرا میں نے اور شبیر نے بیک وقت سرک کے اوپر جھاڑیوں کی طرف دیکھا۔ وزیر سر پر پانی کا گھڑا اٹھائے ہماری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنسی اور شبیر سے کہنے لگی ”کیوں جناب آپ نے کیا دتیرہ اختیار کیا ہے کہ ہر روز ہماری نیند خراب کریں۔“

شبیر حیرت زدہ ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔ میں وزیر کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ شبیر نے اس سے کہا ”آج آپ پہیلیوں میں بات کر رہی ہیں۔“

وزیر نے سر پر گھڑے کا توازن قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”میں اتنی اتنی دیر تک لال ٹین جلا کر اخروٹ کے نیچے ٹینھی رتی ہوں اور آپ سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ پھوٹے منہ سے شکریہ ہی ادا کر دیں۔ بھلا آپ کی جوتی کو کیا غرض پڑی ہے..... یہ چوکیداری تو میرے ہی ذمے ہے..... آپ ٹیلنے کو نکلیں اور اکرام صاحب کے بنگلے میں گھنٹوں باتیں کرتے رہیں اور میں لال ٹین لیے اونگھتی رہوں۔“

شبیر نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ”یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ بھی میں تو کچھ نہ سمجھا یہ کس دھن میں الاپ رہی ہیں؟“

میں نے شبیر کو جواب نہ دیا اور وزیر سے کہا ”ہم کئی دنوں سے رات گئے اکرام صاحب کے یہاں آتے ہیں۔ دو تین مرتبہ میں نے اخروٹ کے پیچھے تمہارے

لال ٹین دیکھی پر مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تم خاص ہمارے لیے آتی ہو۔۔۔ اس کی کیا ضرورت ہے۔۔۔ تم ناحق اپنی نیند کیوں خراب کرتی ہو؟“

وزیر نے شبیر کو مخاطب کر کے کہا ”آپ کے دوست بڑے ہی ناشکرے ہیں ایک تو میں ان کی حفاظت کروں اور اوپر سے یہی مجھ پر اپنا احسان جتانیں۔ ان کو اپنی جان پیاری نہ ہو۔۔۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی اور بات کا رخ یوں بدل دیا ”آپ تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہاں ان کے بہت سے دشمن پیدا ہو گئے ہیں۔ پھر آپ انہیں کیوں نہیں سمجھاتے کہ رات کو باہر نہ نکالیں۔“

وزیر کو واقعی میری بہت فکر تھی۔ بعض اوقات وہ مجھے بالکل بچہ سمجھ کر میری حفاظت کی تدبیریں سوچا کرتی تھی جیسے وہ خود محفوظ مامون ہے اور میں بہت سی بلاؤں میں گھرا ہوا ہوں۔ میں نے اسے کبھی نہ ٹوکا تھا اس لیے میں نہیں چاہتا کہ اسے اس شغل سے باز رکھوں جس سے وہ لطف اٹھاتی ہے اس کی اور میری حالت ایک جیسی تھی ہم دونوں ایک ہی منزل کی طرف جانے والے مسافرتھے جو ایک لق و دق صحرا میں ایک دوسرے سے مل گئے تھے۔ اسے میری ضرورت تھی اور مجھے اس کی۔ تاکہ ہمارا سفر اچھی طرح کٹ سکے میرا اور اس کا صرف یہ رشتہ تھا جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

ہم ہر شب مقررہ وقت پر ٹہلنے کو نکلتے۔ شبیر چوٹی مکان کے پاس پہنچ کر شعر گاتا، پھر اکرام صاحب کے بنگلے سے کچھ دور کھڑے ہو کر نعرہ بلند کرتا وزیر لال ٹین روشن کرتی اور اس کی روشنی کو ہوا میں ہرا کر ایک جھاڑی کے پیچھے بیٹھ جاتی۔ شبیر اور اکرام صاحب باتیں کرنے میں مشغول ہو جاتے اور میں لال ٹین کی

روشنی میں اس روشنی کے ذرے ڈھونڈتا رہتا جس سے میری زندگی منور ہو سکتی تھی۔
وزیر جہازیوں کے پیچھے پیٹھی نہ جانے کیا سوچتی رہتی؟
☆☆☆



السنس

ابو کو چوان بڑا چھیل چھبیا تھا۔ اس کا تانگہ گھوڑا بھی شہر میں نمبرون تھا۔ کبھی معمولی سواری نہیں بٹھاتا تھا۔ اس کے نگے بندھے گا بک تھے جن سے اس کو روزانہ دس پندرہ روپے وصول ہو جاتے تھے جو ابو کے لیے کافی تھے۔ دوسرے کو چوانوں کی طرح نشر پانی کی اسے عادت نہیں تھی۔ لیکن صاف ستھرے کپڑے پہننے اور ہر وقت بانٹا بنے رہنے کا اسے بے حد شوق تھا۔

جب اس کا تانگہ کسی سڑک پر سے گھٹکھرو بھاتا گزرتا تو لوگوں کی آنکھیں خود بخود اس کی طرف اٹھ جاتیں..... ”وہ بانٹا ابو جا رہا ہے..... دیکھو تو کس بٹھاٹ سے بیٹھا ہے۔ ذرا پکڑی تو دیکھو کسی ترچی بندھی ہے۔“

ابو لوگوں کی فکاہوں سے یہ باتیں سنتا تو اس کی گردن میں ایک بڑا بانٹا خم پیدا ہو جاتا اور اس کے گھوڑے کی چال اور زیادہ پرکشش ہو جاتی۔ ابو کے ہاتھوں نے گھوڑے کی باگیں کچھ اس انداز سے پکڑی ہوتی تھیں جیسے ان کو اسے پکڑنے کی ضرورت نہیں۔ ایسا لگتا تھا کہ گھوڑا اشاروں کے بغیر چلا جا رہا ہے۔ اس کو اپنے مالک کے حکم کی ضرورت نہیں۔ بعض اوقات تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ابو اور اس کا گھوڑا جتنی دونوں ایک ہیں۔ بلکہ سارا تانگہ ایک ہستی ہے اور وہ ہستی ابو کے سوا اور کون ہو سکتی تھی۔

وہ سواریاں جن کو ابو قبول نہیں کرتا تھا دل ہی دل میں اس کو گالیاں دیتی تھیں۔ بعض بدعاب بھی دیتی تھیں۔ ”خدا کرے اس کا گھمنڈ ٹوٹے..... اس کا تانگہ گھوڑا

کسی دریا میں جا گرے۔“

ابو کے ہونٹوں پر جو ہلکی ہلکی مونچھوں کی چھاؤں میں رہتے تھے خود اعتمادی
مسکراہٹ ماحیتی رہتی تھی۔ اس کو دیکھ کر کئی کوچو ان جل بھن جاتے تھے۔ ابو کی
دیکھا دیکھی چند کوچوانوں نے ادھر ادھر سے قرض لے کرتا گئے بنوائے۔ ان کو
پیتل کے ساز و سامان سے سجایا مگر پھر بھی ابو کی سی شان پیدا نہ ہو سکی۔ ان کو وہ
گاہک نصیب نہ ہو سکے جو ابو اور اس کے تانگے گھوڑے کے شیدا تھے۔

ایک دن دو پہر کو ابو درخت کی چھاؤں میں تانگے پر بیٹھا اونگھ رہا تھا کہ ایک
آواز اس کے کانوں میں بجھنٹائی۔ ابو نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ ایک عورت
تانگے کے بپ کے پاس کھڑی تھی۔ ابو نے اسے بمشکل ایک نظر دیکھا مگر اس کی
تیکھی جوانی ایک دم اس کے دل میں کھب گئی۔ وہ عورت نہیں جوان لڑکی تھی۔ سولہ
سترہ برس کی۔ دہلی پتلی لیکن مضبوط رنگ سانولا مگر چمکیلا۔ کانوں میں چاندی کی
چھوٹی چھوٹی بالیاں سیدھی مانگ ستواں ناک اس کی پہننگ پر ایک چھوٹا سا چمکیلا
تعل..... لمبا کرتا اور نیلا اچاسر پر چدیریا۔

لڑکی نے کنواری آواز میں ابو سے پوچھا ”ویرائیش کا کیا لوگے؟“

ابو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ شرارت اختیار کر گئی ”کچھ نہیں۔“

لڑکی کے چہرے کی سنو لائٹ سرخی مائل ہو گئی ”کیا لوگے ٹیشن کا۔“

ابو نے اس کو اپنی نظروں میں سموتے ہوئے کہا ”تجھ سے کیا لینا ہے بھاگ

بھریے..... چل آ بیٹھتا گئے میں۔“

لڑکی نے گھبرائے ہوئے ہاتھوں سے اپنے مضبوط سینے کو ڈھانکا حالانکہ وہ

ڈھکا ہوا تھا ”کیسی باتیں کرتے ہو تم“۔

ابو مسکرایا ”چل آ..... اب بیٹھ بھی جا..... لے لیں گے جو تو دے دے گی۔“
لڑکی نے کچھ دیر سوچا پھر پائیدان پر پاؤں رکھ کر تانگے میں بیٹھ گئی ”جلدی
لے چل ٹیشن“۔

ابو نے پیچھے مڑ کر دیکھا ”بڑی جلدی ہے تجھے سوئیے۔“
”ہائے ہائے تو تو.....“ لڑکی کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

تانگہ چل پڑا..... اور چلتا رہا..... کئی سڑکیں گھوڑے کے سموں کے نیچے سے
نکل گئیں۔ لڑکی سہی ہوئی بیٹھی تھی۔ ابو کے ہونٹوں پر شرارت بھری مسکراہٹ ناچ
رہی تھی۔ جب بہت دیر ہو گئی تو لڑکی نے ڈرتی ہوئی آواز میں پوچھا ”ٹیشن نہیں
آیا ابھی تک۔“

ابو نے معنی خیز انداز میں جواب دیا ”آجائے گا..... تیرا میرا ٹیشن ایک ہی
ہے۔“

”کیا مطلب؟“

ابو نے پلٹ کر لڑکی کی طرف دیکھا اور کہا ”اہڑے..... کیا تو اتنا بھی نہیں سمجھتی
۔ تیرا میرا ٹیشن ایک ہی ہے۔ اسی وقت ایک ہو گیا تھا جب ابو نے تیری طرف
دیکھا تھا..... تیری جان کی قسم تیرا غلام جھوٹ نہیں بولتا۔“

لڑکی نے سر پر پلوٹھیک کیا۔ اس کی آنکھیں صاف بتا رہی تھیں وہ ابو کا مطلب
سمجھ چکی ہے۔ اس کے چہرے سے اس بات کا بھی پتہ چلتا تھا کہ اس نے ابو کی
بات کا برا نہیں مانا لیکن وہ اس کشمکش میں تھی کہ دونوں کا ٹیشن ایک ہو یا نہ ہو۔ ابو

بانکا جھپٹا تو ہے لیکن کیا وفادار بھی ہے۔ کیا وہ اپنا ٹیشن چھوڑ دے جہاں اس کی گاڑی پتا نہیں کب کی جا چکی ہے۔

ابو کی آواز نے اسے چونکا دیا ”کیا سوچ رہی ہے بھاگ بھریے؟“
گھوڑا مست خرامی سے دلی چل رہا تھا۔ ہوا تھک تھی۔ سرک کے دورو یہ اگے ہوئے درخت بھاگ رہے تھے۔ ان کی ٹہنیاں جھوم رہی تھیں۔ گھٹکھروؤں کی ایک آہنگ جھنجھناہٹ کے سوا اور کوئی آواز نہیں تھی۔ ابو گروں موڑے لڑکی کے سانولے حسن کو دل ہی دل میں چوم رہا تھا..... کچھ دیر کے بعد اس نے گھوڑے کی باگیں جنگل کی ساخ کے ساتھ باندھ دیں اور اچک کر پچھلی سیٹ پر لڑکی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ وہ خاموش رہی۔ ابو نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے ”وے دے اپنی باگیں میرے ہاتھ میں۔“

لڑکی نے صرف اتنا کہا ”چھوڑ بھی دے“ لیکن وہ فوراً ہی ابو کے بازوؤں میں تھی۔ اس کے بعد اس نے مزاحمت نہ کی۔ اس کا دل البتہ زور زور سے پھڑپھڑا رہا تھا جیسے خود کو چپڑا کر اڑ جانا چاہتا ہو۔

ابو ہولے ہولے پیار بھرے لہجے میں اس سے کہنے لگا ”یہ تانگہ گھوڑا مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز تھا لیکن قسم گیا رہویں والے پیر کی یہ بیچ دوں گا اور تیرے لیے سونے کے کڑے بنواؤں گا..... آپ پھٹے پرانے کپڑے پہنوں گا لیکن تجھے شہزادی بنا کر رکھوں گا۔ قسم وحدہ لا شریک کی زندگی میں یہ میرا پہلا پیارا ہے..... تم میری نہ بنیں تو میں تیرے سامنے اپنا گلا کاٹ لوں گا۔“ پھر اس نے لڑکی کو اپنے سے علیحدہ کر دیا۔ ”جانے کیا ہو گیا ہے مجھے..... چلو تمہیں ٹیشن چھوڑ آؤں۔“

لڑکی نے ہولے سے کہا ”نہیں..... اب تم مجھے ہاتھ لگا چکے ہو۔“
 ابو کی گردن جھک گئی ”مجھے معاف کر دو مجھ سے غلطی ہو گئی۔“
 ”بھالو گے اس غلطی کو؟“

لڑکی کے لہجے میں چیلنج تھا۔ جیسے کسی نے ابو سے کہا ہو ”لے جاؤ گے اپنا تانگہ اس کے تانگے سے آگے نکال کے“ اس کا جھکا ہوا سر اٹھا۔ آنکھیں چمک اٹھیں۔
 ”بھاگ بھریے.....“ یہ کہہ کر اس نے اپنے مضبوط سینے پر ہاتھ رکھا ”ابو اپنی جان دے دے گا۔“

لڑکی نے اپنا ہاتھ بڑھایا ”تو یہ ہے میرا ہاتھ۔“
 ابو نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ”قسم اپنی جوانی کی ابو تیرا غلام ہے۔“
 دوسرے روز ابو اور اس لڑکی کا نکاح ہو گیا وہ ضلع کجرات کی موچن تھی نام اس کا عنایت یعنی نیتی تھا۔ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ آئی تھی وہ اسٹیشن پر اسکا انتظار کر رہے تھے کہ ابو اور اس کی مڈ بھیڑ ہو گئی جو فوراً ہی محبت کی ساری منزلیں طے کر گئی۔ دونوں بہت خوش تھے۔ ابو نے تانگہ گھوڑا بچھ کر تو نیتی کے لیے سونے کے کڑے نہیں بنوائے تھے لیکن اپنے جمع کیے ہوئے پیسوں سے اس کو سونے کی بالیاں خرید دی تھیں۔ کئی ریشمی کپڑے بھی بنوا دیے تھے۔

لس لس کرتے ہوئے ریشمی لاپے میں جب نیتی ابو کے سامنے آتے تو اس کا دل ہچکنے لگتا ”قسم بچ تن پاک کی دنیا میں تجھ جیسا سندر اور کوئی نہیں۔“ اور یہ کہہ کر وہ اس کو اپنے سینے کے ساتھ لگا لیتا ”تو میرے دل کی رانی ہے۔“
 دونوں جوانی کی مستیوں میں غرق تھے۔ گاتے تھے ہنستے تھے سیریں کرتے

تھے ایک دوسرے کی بلائیں لیتے تھے۔ ایک مہینہ اسی طرح گزر گیا کہ دفعتاً ایک روز پولیس نے ابو کو گرفتار کر لیا نیتی بھی پکڑی گئی۔ ابو پر اغوا کا مقدمہ چلا۔ نیتی ثابت قدم رہی لیکن پھر بھی ابو کو دس برس کی سزا ہو گئی۔ جب عدالت نے حکم سنایا تو نیتی ابو کے ساتھ لپٹ گئی۔ روتے روتے اس نے صرف اتنا کہا ”میں اپنے ماں باپ کے پاس کبھی نہیں جاؤں گی۔۔۔ گھر بیٹھ کر تیرا انتظار کروں گی۔“

ابو نے اس کی پیٹھ پر تھکی دی ”جیتی رہ۔۔۔ تا نگہ گھوڑا میں نے دینے کے سپرد کیا ہوا ہے۔۔۔ اس سے کرایہ وصول کرتی رہنا۔“

نیتی کے ماں باپ نے بہت زور لگایا مگر وہ ان کے ساتھ نہ گئی۔ تھک ہار کر انہوں نے اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ نیتی اکیلی رہنے لگی۔ دینا اسے شام کو پانچ روپے دے جاتا تھا جو اس کے خرچ کے لیے کافی تھے۔ اس کے علاوہ مقدمے کے دوران میں روزانہ پانچ روپے کے حساب سے جو کچھ جمع ہوا تھا وہ بھی اس کے پاس تھا۔

نفتے میں ایک بار نیتی اور ابو کی ملاقات جیل میں ہوتی تھی جو کہ ان دونوں کے لیے بہت ہی مختصر تھی۔ نیتی کے پاس جتنی جمع پونجی تھی وہ ابو کو آسائش پہنچانے میں صرف ہو گئی۔ ایک ملاقات میں ابو نے نیتی کے بچے کانوں کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

”بالیاں کہاں گئیں نیتی؟“

نیتی مسکرا دی اور سنتری کی طرف دیکھ کر ابو سے کہا ”گم ہو گئیں کہیں۔“

ابو نے قدرے غصے ہو کر کہا ”تم میرا اتنا خیال نہ رکھا کرو۔۔۔ جیسا بھی ہوں

ٹھیک ہوں۔“

نیتی نے کچھ نہ کہا۔ وقت پورا ہو چکا تھا۔ مسکراتی ہوئی وہاں سے چل دی مگر گھر جا کر بہت روئی۔ گھٹنوں آنسو بہائے کیونکہ ابو کی صحت بہت گر رہی تھی اس ملاقات میں تو وہ اسے پہچان نہیں سکی تھی۔ گرانڈیل ابواب کل کل کر آدھا ہو گیا تھا۔ نیتی سوچتی کہ اس کو اس کا نم کھا رہا ہے۔ اس کی جدائی نے ابو کی یہ حالت کر دی ہے لیکن اس کو معلوم نہیں تھا کہ وہ دق کا مریض ہے اور یہ مرض اسے ورثے میں ملا ہے۔ ابو کا باپ ابو سے کہیں زیادہ گرانڈیل تھا۔ لیکن دق نے چند ہی دنوں میں اسے قبر کے اندر پہنچا دیا۔ ابو کا بڑا بھائی کڑیل جو ان تھا مگر عین جوانی میں اس مرض نے اسے دبوچ لیا تھا۔ خود ابو اس حقیقت سے غافل تھا چنانچہ جیل کے ہسپتال میں جب کہ وہ آخری سانس لے رہا تھا اس نے افسوس بھرے لہجے میں نیتی سے کہا ”مجھے معلوم ہوتا کہ میں اتنی جلدی مری جاؤں گا تو قسم وحدہ لا شریک کی تجھے کبھی اپنی بیوی نہ بناتا۔۔۔۔۔ میں نے تیرے ساتھ بہت ظلم کیا۔۔۔۔۔ مجھے معاف کر دے۔۔۔۔۔ اور دیکھ میری ایک نشانی ہے میرا تانگہ گھوڑا۔۔۔۔۔ اس کا خیال رکھنا۔۔۔۔۔ اور چنی بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہنا ابو نے تجھے پیار بھیجا ہے۔“

ابو مر گیا۔۔۔۔۔ نیتی کا سب کچھ مر گیا۔ مگر وہ حوصلے والی عورت تھی۔ اس صدمے کو اس نے برداشت کر ہی لیا۔ گھر میں تن تنہا پڑی رہتی تھی۔ شام کو دینا آتا تھا اور اسے دم والا سادیتا تھا اور کہتا تھا ”کچھ فکر نہ کرو بھابھی! اللہ میاں کے آگے کسی کی پیش نہیں چلتی۔۔۔۔۔ ابو میرا بھائی تھا۔۔۔۔۔ مجھ سے جو ہو سکتا ہے خدا کے حکم سے کروں گا۔“

شروع شروع میں تو نیتی نہ کبھی پر جب اس کے عدت کے دن پورے ہوئے تو
وینے نے صاف لفظوں میں کہا کہ وہ اس سے شادی کر لے۔ یہ سن کر نیتی کے جی
میں آئی کہ وہ اس کو دھکا دے کر باہر نکال دے مگر اس نے صرف اتنا کہا ”بھائی
مجھے شادی نہیں کرنی“۔

اس دن سے وینے کے رویے میں فرق آ گیا۔ پہلے شام کو بلانا نہ پانچ روپے
ادا کرتا تھا۔ اب کبھی چار روپے لگا کبھی تین بہانہ یہ کہ بہت مندرا ہے۔ پھر دو تین
تین دن غائب رہنے لگا۔ بہانہ تھا کہ بیمار تھا یا تانگے کا کوئی کل پرزہ خراب ہو گیا
تھا۔ اس لیے جو نہ سکا۔ جب پانی سر سے نکل گیا تو نیتی نے وینے سے کہا ”بھائی
وینے اب تم تکلیف نہ کرو۔ تانگہ گھوڑا میرے حوالے کرو“۔

بڑی لیت و عمل کے بعد بالآخر وینے نے بادل نا خواست تانگہ گھوڑا نیتی کی
تحویل میں دے دیا۔ اس نے مانجھے کے سپرد کر دیا جو ابو کا دوست تھا اسنے بھی کچھ
دنوں کے بعد شادی کی درخواست کی۔ نیتی نے انکار کر دیا تو اس کی آنکھیں بدل
گئیں۔ ہمدردی وغیرہ سب ہوا ہو گئی۔ نیتی نے اس سے تانگہ گھوڑا واپس لے لیا
اور ایک انجانے کو چوان کے حوالے کر دیا۔ اسنے تو حد ہی کر دی ایک شام پیسے
دینے آیا تو شراب میں دھست تھا۔ ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی نیتی پر ہاتھ ڈالنے کی
کوشش کی۔ نیتی نے اس کو خوب سنائیں اور کام سے ہٹا دیا۔

آٹھ دس روز تانگہ گھوڑا بیکار طویلے میں پڑا رہا۔ گھاس دانے کا خرچ علیحدہ
طویلے کا کر یہ علیحدہ۔ نیتی عجیب الجھن میں گرفتار تھی۔ کوئی شادی کی درخواست
کرتا تھا۔ کوئی اس کی عصمت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتا تھا کوئی پیسے مار لیتا تھا۔

باہر نکلتی تھی تو لوگ بری نگاہوں سے گھورتے تھے۔ ایک رات اس کا ہمسایہ دیوار
بھاند کے آگیا اور دراز دتی کرنے لگا۔ قیمتی سوچ سوچ کر پاگل ہو گئی کہ کیا
کرے۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے خیال آیا ”کیوں نہ تانگہ میں آپ ہی جوتوں۔ آپ ہی
چلاؤں“۔ ابو کے ساتھ جب وہ سیر کو جایا کرتی تھی تو تانگہ خود ہی چلاتی تھی۔ شہر
کے راستوں سے بھی واقف تھی لیکن پھر اس نے سوچا ”لوگ کیا کہیں گے؟“۔
اس کے جواب میں اس کے دماغ نے کئی دلیلیں دیں۔ ”کیا حرج ہے..... کیا
عورتیں محنت مزدوری نہیں کرتیں..... یہ کونٹے والیاں..... یہ دفتروں میں جانے
والی عورتیں..... گھر میں بیٹھ کر کام کرنے والیاں تو ہزاروں ہوں گی..... پیٹ کسی
حیلے سے پالنا ہی ہے۔“

قیمتی نے کچھ دن سوچ بچار کیا۔ آخر میں فیصلہ کر لیا کہ وہ تانگہ خود ہی چلائے گی
اس کو خود پر پورا اعتماد تھا۔ چنانچہ اللہ کا نام لے کر وہ طویلے پہنچ گئی..... تانگہ جو تنے
لگی تو سارے کوچوان ہکا بکارہ گئے۔ بعض مذاق سمجھ کر ہنسے۔ جو بزرگ تھے انہوں
نے قیمتی کو سمجھایا کہ ایسا نہ کرو۔ یہ مناسب نہیں مگر قیمتی نہ مانی۔ تانگہ ٹھیک ٹھاک کیا
۔ پتیل کا سارا سامان اچھی طرح چکایا۔ گھوڑے کو خوب پیار کیا اور ابو سے دل ہی
دل میں پیار کی باتیں کرتی طویلے سے باہر نکل گئی۔ کوچوان حیرت زدہ تھے کیونکہ
قیمتی کے ہاتھ رواں تھے جیسے وہ تانگہ چلانے کے فن پر حاوی ہے۔

شہر میں ایک تہلکہ برپا ہو گیا کہ ایک خوبصورت عورت تانگہ چلا رہی ہے۔ ہر
جگہ اسی بات کا چرچا تھا لوگ سنتے تھے تو اس وقت کا انتظار کرتے تھے جب وہ ان

کی سرک پر سے گزرے گا۔

شروع شروع میں تو مرد سواریاں جھجکتی تھیں مگر یہ جھجک جموڑی دیر میں دور ہو گئی اور خوب آمدن ہونے لگی۔ ایک منٹ کے لیے بھی نمیتی کا تا نگہ بیکار نہ رہتا تھا۔ ادھر سواری اتری ادھر ٹٹلی۔ آپس میں سوار یوں کی کبھی کبھی لڑائی ہو جاتی تھی۔ اس بات پر کہ نمیتی کو پہلے کس نے بلایا تھا۔

جب کام زیادہ ہو گیا تو نمیتی نے تا نگہ جو تنے کے اوقات مقرر کر دیے صبح سات بجے سے بارہ بجے تک۔ دوپہر دو بجے سے چھ بجے تک۔ یہ سلسلہ بڑا آرام دہ ثابت ہوا۔ چنی بھی خوش تھا مگر نمیتی محسوس کر رہی تھی کہ اکثر لوگ صرف اس کی قربت حاصل کرنے کے لیے اس کے تا نگے بیٹھے بے مطلب بے مقصد اسے ادھر ادھر پھراتے تھے۔ آپس میں گندے گندے مذاق بھی کرتے تھے۔ صرف اس کے سنانے کے لیے آپس میں باتیں کرتے تھے۔ اس کو ایسا لگتا تھا کہ وہ خود کو نہیں بچتی لیکن لوگ چپکے چپکے اسے خرید رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ شہر کے سارے کوچوان اس کو برا سمجھتے ہیں۔ ان تمام احساسات کے باوجود مضطرب نہیں تھی۔ اپنی خود اعتمادی کے باعث وہ پرسکون تھی۔

ایک دن کمیٹی والوں نے نمیتی کو بلایا اور اس کا انٹرنس ضبط کر لیا۔ جب یہ بتائی کہ عورت تا نگہ نہیں چلا سکتی۔ نمیتی نے پوچھا ”جناب عورت تا نگہ کیوں نہیں چلا سکتی؟“

جواب ملا ”بس..... نہیں چلا سکتی۔ تمہارا انٹرنس ضبط ہے۔“

نیتی نے کہا ”حضور! آپ گھوڑا تانگہ بھی ضبط کر لیں مجھے یہ تو بتائیں کہ عورت تانگہ کیوں نہیں جوت سکتی عورتیں چرخہ چلا کر اپنا پیٹ پال سکتی ہیں۔ عورتیں نوکری ڈھونڈ کر روزی ماسکتی ہیں عورتیں لینوں پر کونکے چن چن کر اپنی روٹی پیدا کر سکتی ہیں..... میں تانگہ کیوں نہیں چلا سکتی..... مجھے اور کچھ آتا ہی نہیں..... تانگہ گھوڑا میرے خاندان کا ہے..... میں اسے کیوں نہیں چلا سکتی۔ میں اپنا گزارہ کیسے کروں گی؟..... حضور آپ رحم کریں..... محنت مزدوری سے کیوں روکتے ہیں مجھے؟..... میں کیا کروں بتائیے نا مجھے۔“

افسر نے جواب دیا ”جاؤ بازار میں جا کر بیٹھو وہاں زیادہ کمائی ہے۔“
یہ سن کر نیتی کے اندر جو اصل نیتی تھی جل کر راکھ ہو گئی..... ہولے سے ”اچھا جی“ کہہ کر وہ چلی گئی۔ اونے پونے داسوں تانگہ گھوڑا بیچا اور سیدھی ابو کی قبر پر گئی۔ ایک لٹلے کے لیے خاموش کھڑی رہی۔ اس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں۔ جیسے بارش کے بعد چلچلاتی دھوپ نے زمین کی ساری نمی چوس لی تھی۔ اس کے بچنے ہوئے ہونٹ وا ہوئے اور وہ قبر سے مخاطب ہوئی ”ابو..... تیری نیتی آج کمیٹی کے دفتر میں مر گئی۔“

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ دوسرے دن عرضی دی..... اس کو اپنا جسم بیچنے کا انٹرنس مل گیا۔

☆☆☆

ماتمی جلسہ

رات رات میں یہ خبر شہر کے اس کونے سے اس کونے تک پھیل گئی کہ اتاترک کمال مرگیا ہے۔ ریڈیو کی تھر تھراتی ہوئی زبان سے یہ سنسنی پھیلانے والی خبر ایرانی ہونٹوں میں سٹے بازوں نے سنی جو چائے کی پیالیاں سامنے رکھے آنے والے نمبر کے بارے میں قیاس دوڑا رہے تھے اور وہ سب کچھ بھول کر کمال اتاترک کی بڑائی میں گم ہو گئے۔

ہوٹل میں سفید پتھر والے میز کے پاس بیٹھے ہوئے ایک سنوری نے اپنے ساتھی سے یہ خبر سن کر لرزاں آواز میں کہا ”مصطفیٰ کمال مرگیا ہے۔“ اس کے ساتھی کے ہاتھ سے چائے کی پیالی گرتے گرتے بجی ”کیا کہا مصطفیٰ کمال مرگیا ہے۔“

اس کے بعد دونوں میں اتاترک کمال کے متعلق بات چیت شروع ہو گئی۔ ایک نے دوسرے سے کہا ”بڑے افسوس کی بات ہے اب ہندوستان کا کیا ہوگا؟ میں نے سنا تھا یہ مصطفیٰ کمال یہاں حملہ کرنے والا ہے..... ہم آزاد ہو جاتے مسلمان قوم آگے بڑھ جاتی..... افسوس تھدیر کے ساتھ کسی کی پیش نہیں چلتی!“ دوسرے نے جب یہ بات سنی تو اس کے روئیں بدن پر چیونٹیوں کے مانند سرکنے لگے۔ اس پر ایک عجیب و غریب کیفیت طاری ہو گئی۔ اس کے دل میں جو پہلا خیال آیا یہ تھا ”مجھے کل جمعہ سے نماز شروع کر دینی چاہیے.....“ اس خیال کو بعد میں اس نے مصطفیٰ کمال پاشا کی شاندار مسلمانی اور اس کی

بڑائی میں تحلیل کر دیا۔

بازار کی ایک تنگ گلی میں دو تین کوکین فروش کھاٹ پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ایک نے پاس کی پیک بڑی صفائی سے بکلی کے کھمبے پر پھینکی اور کہا ”میں مانتا ہوں مصطفیٰ کمال بہت بڑا آدمی تھا لیکن محمد بھی کسی سے کم نہیں تھا۔ یہاں بمبئی میں تین چار ہولوں کا نام اسی پر رکھا گیا ہے۔“

دوسرے نے جو اپنی نگلی پنڈلیوں پر سے ایک کھر درے چاقو سے میل اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا ”محمد علی کی موت پر تو بڑی شاندار ہڑتال ہوئی تھی۔۔۔۔۔“

ہاں بھی تو کل ہڑتال ہو رہی ہے کیا؟“ تیسرے نے ایک کی پسلیوں میں کہنی سے ٹھوکا دیا۔ اس نے جواب دیا ”کیوں نہ ہوگی۔۔۔۔۔ ارے اتنا بڑا مسلمان مر جائے اور ہڑتال نہ ہو۔“

یہ بات ایک راہ گزرنے سن لی اس نے دوسرے چوک میں اپنے ساتھیوں سے کی اور ایک گھنٹے میں ان سب لوگوں کو جو دن کو سونے اور رات کو بازاروں میں جاگتے رہنے کے عادی ہیں۔ معلوم ہو گیا کہ صبح ہڑتال ہو رہی ہے۔

ابو قسانی رات کے دو بجے اپنی کھولی میں آیا۔ اس نے آتے ہی طاق میں سے بہت سی چیزوں کو ادھر ادھر پٹ کرنے کے بعد ایک پڑیا نکالی اور ایک دیکھی میں پانی بھر کر اس کو اس میں گھولنا شروع کر دیا۔

اس کی بیوی جو دن بھر کی تھکی مامدی ایک کونے میں ٹاٹ پر سو رہی تھی۔ برتن کی رگڑ سن کر جاگ پڑی۔ اس نے لیٹے لیٹے کہا ”آگئے ہو؟“

”ہاں آگیا ہوں“ یہ کہہ کر ابو نے قمیص اتار کر دیکچی میں ڈال دی اور اسے پانی کے اندر مسانا شروع کر دیا۔

اس کی بیوی نے پوچھا ”پر یہ تم کر کیا رہے ہو؟“ مصطفیٰ مال مر گیا ہے کل ہڑتال ہو رہی ہے۔“ اس کی بیوی یہ سن کر گھبراہٹ کے مارے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”کیا مارا ماری ہوگی..... میں تو ان ہر روز کے فسادوں سے بڑی تنگ آگئی ہوں۔“ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ میں نے تجھ سے ہزار مرتبہ کہا ہے کہ تو ہندوؤں کے اس محلے سے اپنا مکان بدل ڈال پر نہ جانے تو کب سنے گا۔“

ابو جواب میں ہنسنے لگا ”اری بھئی..... یہ ہندو مسلمانوں کا فساد نہیں ہے۔ مصطفیٰ مال مر گیا ہے..... وہی جو بہت بڑا آدمی تھا..... کل اس کے سوگ میں ہڑتال ہوگی۔“

”جانے میری بلا یہ بڑا آدمی کون ہے..... پر تو یہ کر کیا رہا ہے؟“ بیوی نے پوچھا ”سو تا کیوں نہیں ہے۔“

”قمیص کو کالا رنگ دے رہا ہوں۔ صبح ہمیں ہڑتال کرانے جانا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے قمیص کو نیچوڑ کر دو کیلوں کے ساتھ لٹکا دی جو دیوار میں گڑی ہوئی تھیں۔

دوسرے روز صبح کو سیاہ پوش مسلمانوں کی ٹولیاں کالے جھنڈے لیے بازاروں میں چکر لگا رہی تھیں۔ یہ سیاہ پوش مسلمان دکانداروں کی دکانیں بند کر رہے تھے اور یہ نعرے لگا رہے تھے ”انقلاب زندہ آباد انقلاب زندہ باد“۔

ایک ہندو نے جو اپنی دکان کھولنے کے لیے جا رہا تھا یہ نعرے سنے اور نعرے لگانے والوں کو دیکھا تو چپ چاپ رُام میں بیٹھ کر وہاں سے کھسک گیا۔ دوسرے

ہندو اور پارسی دکانداروں نے جب مسلمانوں کے ایک گروہ کو چیتنے چلاتے اور
نعرے مارتے دیکھا تو انہوں نے جھٹ پٹ اپنی دکان میں بند کر دیں۔

دس پندرہ سیاہ پوش گیمیں ہانکتے ایک بازار سے گزر رہے تھے۔ ایک نے اپنے
ساتھی سے کہا ”دوست ہڑتال ہوئی تو خوب ہے پرویسی نہیں ہوئی جیسی محمد علی کے
ٹیم پر ہوئی تھی..... ٹرائیں تو اسی طرح چل رہی ہیں۔“

اس ٹولی میں جو سب سے زیادہ جوشیلا تھا اور جس کے ہاتھ میں سیاہ جھنڈا تھا
تک کر بولا۔ ”آج بھی نہیں چلیں گی۔“ یہ کہہ کر وہ ٹرام کی طرف بڑھا جو ککڑی کے
ایک شیڈ کے نیچے مسافروں کو اتار رہی تھی۔ ٹولی کے باقی آدمیوں نے اس کا
ساتھ دیا اور ایک لمحہ کے اندر سب کے سب ٹرام کی سرخ گاڑی کے ارد گرد تھے۔
سب مسافر زبردستی اتار دیے گئے۔

شام کو ایک وسیع میدان میں ماتمی جلسہ ہوا۔ شہر کے سب ہنگامہ پسند جمع تھے۔
خوانچہ فروش اور پان بیڑی والے چل پھر کر اپنا سودا بیچ رہے تھے۔ جلسہ گاہ کے
باہر عارضی دکانوں کے پاس ایک میلہ لگا ہوا تھا۔ چاٹ کے چنوں اور ابلے ہوئے
آلوؤں کی خوب بکری ہو رہی تھی۔

جلسہ گاہ کے اندر اور باہر بہت بھیڑ تھی۔ کھوے سے کھوا چمکتا تھا۔ اس جھوم
میں کئی آدمی ایسے بھی چل رہے تھے جو یہ معلوم کرنے کی کوشش میں مصروف تھے
کہ اتنے آدمی کیوں جمع ہو رہے ہیں۔ ایک صاحب گلے میں دو رہین لکائے ادھر
ادھر چکر کاٹ رہے تھے۔ دور سے اتنی بھیڑ دیکھ کر اور یہ سمجھ کر کہ پہلوانوں کا دنگل
ہو رہا ہے۔ وہ ابھی ابھی اپنے گھر سے نئی دو رہین لے کر دوڑے دوڑے آ رہے

تھے اور اس کا امتحان لینے کے لیے بیتاب ہو رہے تھے۔ میدان کے آگے جنگل کے پاس دو آدمی کھڑے تھے آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔ ایک نے اپنے ساتھی سے کہا ”بھئی یہ مصطفیٰ کمال تو واقعی کوئی بہت بڑا آدمی معلوم ہوتا ہے..... میں جو صابن بنانے والا ہوں اس کا نام مال سوپ رکھوں گا..... کیوں کیسا رہے گا؟“

دوسرے نے جواب دیا ”وہ بھی برا نہیں تھا جو تم نے پہلے سوچا تھا جناح سوپ..... یہ جناح مسلم لیگ کا بہت بڑا لیڈر ہے۔“

”نہیں نہیں مال سوپ اچھا رہے گا بھائی مصطفیٰ کمال اس سے بڑا آدمی ہے“

”یہ کہہ کر اس نے اپنے ساتھی کے کاندھے پر ہاتھ رکھا“ ”آؤ چلیں جلسہ شروع ہونے والا ہے۔“ وہ دونوں جلسہ گاہ کی طرف چل دیے۔

جلسہ شروع ہوا۔

آغاز میں نظمیں گائی گئیں جن میں مصطفیٰ کمال کی بڑائی کا ذکر تھا۔ پھر ایک صاحب تقریر کرنے کے لیے اٹھے۔ آپ نے مال انا ترک کی عظمت بڑے بلند بانگ لفظوں میں بیان کرنا شروع کی۔ حاضرین جلسہ اس تقریر کو خاموشی سے سنتے رہے۔ جب کبھی مقرر کے یہ الفاظ گونجتے ”مصطفیٰ کمال نے ورہ دانیال سے انگریزوں کو لات مار کے باہر نکال دیا۔“ یا ”مال نے یونانی بھیڑوں کو اسلامی خنجر سے ذبح کر ڈالا“ تو ”اسلام زندہ باد“ کے نعروں سے میدان کانپ کانپ اٹھتا۔

یہ نعرے مقرر کی قوت گوئی اور تیز کر دیتے اور وہ زیادہ جوش سے انا ترک مال کی عظیم الشان شخصیت پر روشنی ڈالنا شروع کر دیتا۔

مقرر کا ایک ایک لفظ حاضرین جلسہ کے دلوں میں ایک جوش و خروش پیدا کر رہا تھا۔

”جب تک تاریخ میں گیلی پولی کا واقعہ موجود ہے۔ برطانیہ کی گردن ترکی کے سامنے خم رہے گی۔ صرف ترکی ہی ایک ایسا ملک ہے جس نے برطانوی حکومت کا کامیاب مقابلہ کیا اور صرف مصطفیٰ کمال ہی ایسا مسلمان ہے جس نے غازی صلاح الدین ایوبی کی سپاہیانہ عظمت کی یاد تازہ کی۔ اس نے بے شک شمشیر یورپی ممالک سے اپنی طاقت کا لوہا منوایا۔ ترکی کو یورپ کا مرد بیمار کہا جاتا تھا۔ مگر کمال نے اسے صحت اور قوت بخش کر مرد آہن بنا دیا۔“

جب یہ الفاظ جلسہ گاہ میں بلند ہوئے تو انقلاب زدہ باوانقلاب زندہ باد کے نعرے پانچ منٹ تک متواتر بلند ہوتے رہے۔

اس سے مقرر کا جوش بہت بڑھ گیا۔ اس نے اپنی آواز کو اور بلند کر کے کہنا شروع کیا ”کمال کی عظمت مختصر الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی۔ اس نے اپنے ملک کے لیے وہ وہ خدمات انجام دی ہیں جس کو بیان کرنے کے لیے کافی وقت چاہیے۔ اس نے ترکی میں جہالت کا دیوالہ نکال دیا۔ تعلیم عام کر دی۔ نئی روشنی کی شعاعوں کو پھیلایا۔ یہ سب کچھ اس نے تلوار کے زور سے کیا۔ اس نے دین کو جب علم سے علیحدہ کیا تو بہت سے قدامت پسندوں نے اس کی مخالفت کی مگر ہر بازار پچائی پر لٹکا دیے گئے۔ اس نے جب یہ فرمان جاری کیا کہ کوئی ترک رومی ٹوپی نہ پہنے تو بہت سے جاہل لوگوں نے اس کے خلاف آواز اٹھانا چاہی مگر یہ آواز ان کے گٹھے ہی میں دبا دی گئی۔ اس نے جب یہ حکم دیا کہ اذان ترکی زبان

میں ہوتو بہت سے ملاؤں نے حکم عدویٰ کی گروہ قتل کرویے گئے۔“
”یہ کفر بکتا ہے“ جلسہ گاہ میں ایک شخص کی آواز بلند ہوئی اور فوراً ہی سب لوگ
منضرب ہو گئے۔

”یہ کافر جھوٹ بولتا ہے۔“ کے نعروں میں مقرر کی آواز گم ہو گئی۔ پیشتر اس
کے کہ وہ اپنا مافی الضمیر بیان کرتا اس کے ماتھے پر ایک پتھر لگا اور وہ چکرا کر اسٹیج پر
گر پڑا۔۔۔۔۔ جلسے میں ایک بھگدڑ مچ گئی۔

اسٹیج پر مقرر کا ایک دوست اس کے ماتھے پر سے خون پونچھ رہا تھا اور جلسہ گاہ
ان نعروں سے گونج رہی تھی ”مصطفیٰ مال زندہ باد“ ”مصطفیٰ مال زندہ باد“۔

☆☆☆

مجید کا ماضی

مجید کی ماہانہ آمدن ڈھائی ہزار روپے تھی۔ موٹر تھی ایک عالی شان کوٹھی تھی۔ بیوی تھی۔ اس کے علاوہ دس پندرہ عورتوں سے میل جول تھا۔ مگر جب کبھی وہ وہی کے تین چار پیگ پی لیتا تو اسے اپنا ماضی یاد آ جاتا۔ وہ سوچتا کہ اب وہ اتنا خوش نہیں جتنا کہ پندرہ برس پہلے تھا۔ جب اس کے پاس رہنے کو کوٹھی تھی نہ سواری کے لیے موٹر۔ بیوی تھی نہ کسی عورت سے اس کی شناسائی تھی۔ ڈھائی ہزار روپے تو ایک اچھی خاصی رقم ہے۔ ان دنوں اس کی آمدن صرف ساٹھ روپے ماہوار تھی۔ ساٹھ روپے جو اسے بڑی مشکل سے ملتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ خوش تھا۔ اس کی زندگی افتان و خیزان حالات کے ہوتے ہوئے بھی ہموار تھی۔

اب اسے بے شمار تفکرات سامنے تھے۔ کوٹھی کے بیوی کے بچوں کے ان عورتوں کے جن سے اس کا میل جول تھا۔ اکم ٹیکس کا ٹنٹا الگ تھا۔ سیلز ٹیکس کا جھڑا جدا۔ اس کے علاوہ اور بہت سی الجھنیں تھیں جن سے مجید کو کبھی نجات ہی نہیں ملتی تھی۔ چنانچہ اب وہ اس زمانے کو اکثر یاد کیا کرتا تھا جب اس کی زندگی ایسے تفکرات اور ایسی الجھنوں سے آزاد تھی۔ وہ ایک بڑی غریبی کی لیکن بڑی خوشگوار زندگی بسر کرتا تھا۔

اکم ٹیکس زیادہ لگ گیا ہے۔ ماہروں سے مشورہ کرو۔ آفیسروں سے ملو۔ ان کو رشوت دو۔ سیلز ٹیکس کا جھڑا چکاؤ۔ بلیک مارکیٹ کرو۔ یہاں سے جو کماؤ اس کو وائٹ کرو۔ جھوٹی رسیدیں بناؤ۔ مقدموں کی تاریخیں جھگتو۔ بیوی کی فرمائشیں

پوری کرو۔ بچوں کی نگہداشت کرو۔ یوں تو مجید کا کام بڑی مستعدی سے کرتا تھا اور وہ اپنی اس نئی ہنگامہ خیز زندگی میں رچ مچ گیا تھا لیکن اس کے باوجود ناخوش تھا۔ یہ ناخوشی اسے کاروباری اوقات میں محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس کا احساس اس کو صرف اس وقت ہوتا تھا جب وہ فرصت کے اوقات میں آرام سے بیٹھ کر وکیل کے تین چار پیکیں پیتا تھا۔ اس وقت جیتا ہوا زمانہ اس کے دل و دماغ میں ایک دم انگڑائیاں لیتا ہوا بیدار ہو جاتا اور وہ بڑا سکون محسوس کرتا لیکن جب اس بیٹے ہوئے زمانے کی تصویر اس کے دل و دماغ میں محو ہو جاتی تو وہ بہت مضطرب ہو جاتا۔ پر یہ مضطرب دیر پا نہیں ہوتا تھا کیونکہ فوراً ہی اپنی کاروباری الجھنوں میں گرفتار ہو جاتا تھا۔

مجید نے جو کچھ کمایا تھا اپنی محنت و مشقت سے بنایا تھا۔ کوٹھی اس کا ساز و سامان موٹر غرضیکہ ہر چیز اسکے گاڑھے پسینے کی کمائی تھی۔ اس کو اس بات کا بہت مان تھا کہ آسائش کے جتنے سامان ہیں سب اس نے خود بنائے ہیں۔ اس نے کسی سے مدد نہیں لی لیکن تفکرات اب زیادہ ہو گئے تھے۔

وہ جو دس پندرہ عورتیں تھیں اس کے لیے وبال جان بن گئی تھیں۔ ایک سے ملو تو دوسری ناراض ہو جاتی تھی۔ ٹیلی فون پر ٹکی فون آرہے ہیں۔ بیوی کا ڈرائنگ کاروبار کی فکر جدا عجیب جھنجھٹ تھا۔ مگر وہ دن بھی تھے جب مجید کو صرف دو روپے روزانہ ملتے تھے۔ ساٹھ روپے ماہوار جو اسے بڑی مشکل سے ملتے تھے مگر دن عجیب انداز میں گزرتے تھے۔ بڑے دلچسپ تھے وہ دن۔ بڑی دلچسپ تھیں وہ راتیں جو کلڑی کے ایک پنجہ پر گزرتی تھیں جس میں ہزار ہا کھٹل تھے خدا معلوم کتنے

عمر رسیدہ کیونکہ وہ بچہ بہت پرانی تھی۔ اس کے مالک نے دس برس پہلے اس کو ایک دکاندار سے لیا تھا جو اپنا کاروبار تھمیت رہا تھا۔ اس دکاندار نے گیارہ برس پہلے اس کا سودا ایک کباڑی سے کیا تھا۔

مجید کو جو مزاج و لطف اس کھٹملوں سے بھری ہوئی بچہ پر سونے میں آتا تھا اب اسے اپنے پر تکلف سپرنگوں والے پٹنگ پر سونے میں نہیں آتا تھا۔ اب اسے ہزاروں کی فکر ہوتی تھی۔ اس وقت صرف دو روپے روزانہ کی۔ ان دنوں اس کے پاس کیڑوں کے دو بوتل تھے اب سینکڑوں تھے۔ مگر وہ بات نہیں تھی۔ ہر روز دن کے کام سے فارغ ہو کر جب وہ اپنے دفتر کی بچہ پر سونے لگتا تو بوتل اتار کر اس پر بیلنگو ملاتا۔ صبح اٹھ کر حمام میں آگئی دے کر نہاتا۔ شیو کرتا۔ سامنے ہوٹل میں باہر والے سے کہتا کہ اس کا ناشتہ لے آئے۔ ایک مکھن لگا براؤن ایک پیانی چائے لطف آجاتا۔ ناشتہ کر کے وہ پانسک شوکا سگریٹ پیتا۔ ایک پان کھاتا اور کام شروع کر دیتا۔

دوپہر کا کھانا وہ بھنڈی بازار میں حاجی کے ہوٹل میں کھاتا۔ یہ ہوٹل اتنا اچھا تھا۔ کھڑی وال کچی میں بگھاری ہوئی کتنی مزیدار ہوتی تھی۔ کھارا گوشت تو بے حد لذیذ ہوتا تھا۔ پھر برف کا ٹھنڈا پانی۔ پانسک شوکا ایک سگریٹ اس کا سارا وجود ہشاش بشاش ہو جاتا۔

کھانے کے بعد جموڑا سا آرام کیا۔ پھر کام شروع کیا۔ شام کو چھ بجے فارغ ہوئے۔ ایک آندھ ٹیم پر خرچا اور سیدھے اپالو بندر پہنچ گئے۔ ٹھنڈی ہوا۔ بھانت بھانت کے آدمی۔ بھانت بھانت کی بولیاں۔ بڑی بڑی مالیشان عمارتیں۔ وسیع و

عریض سمندر اونچی اونچی لہریں۔ کشتیاں موڑیں سناٹھلیں خوبصورت عورتیں، کجراتی عورتیں، مرہٹی عورتیں تیکھی تیکھی ناک والی۔ اینگلو انڈین اور یورپین عورتیں۔ یہ سب اس کے پاس سے گزرتیں۔ وہ ان کو دیکھتا تو اس کے دل و دماغ کو فرحت پہنچتی۔ اس کو کبھی یہ خواہش نہ ہوتی کہ ان سے کوئی اس کی ہو جائے گی لیکن اس بیوی کے علاوہ دس پندرہ عورتوں سے اس کا جنسی میل جول تھا۔ اب وہ ہر خوبصورت عورت کو شہوانی نظروں سے دیکھتا تھا، تریکیں سوچتا تھا کہ کس طرح ان کو حاصل کیا جائے۔

اب بھی وہ سیر کرتا تھا۔ باغوں میں گھومتا تھا مگر پھول اتنے خوبصورت دکھائی نہیں دیتے تھے جتنے کہ اس زمانے میں دکھائی دیتے تھے۔ اب سینکڑوں پھول اس کے گلہ انوں میں پرے رہتے تھے جو مرجھا جانے پر پھینک دیے جاتے تھے۔ اس کی نگاہ ان پر پڑتی ہی نہیں تھی۔ پڑتی بھی ہوگی تو وہ ان میں کوئی کشش محسوس نہیں کرتا تھا۔

ایک دن اپا لو بندر گئے دوسرے دن چوپاٹی چلے گئے۔ وہی بڑے اور چاٹ کھائی۔ گیلی ریت پر بیٹھے سمندر کا نظارہ کرتے رہے۔ دو وحد نگاہ تک پھیلا سمندر دھوپ میں چاندنی کی طرح چمکتی ہوئی لہریں۔ کشتیوں کے سفید سفید بادبان یاہس سے جی اکٹایا تو ماا باربل چلے گئے۔ ہنگام گارڈنز۔ کیا فرحت بخش مقام تھا۔

اس زمانے میں اس کا کوئی دشمن نہیں تھا۔ اس کو ساری دنیا دوست نظر آتی تھی۔ ٹریم اس کی دوست تھی۔ کھلا آسمان اس کا دوست تھا۔ مڑکیں اور فٹ پاتھ اس

کے دوست تھے۔ کھٹملوں سے بھری ہوئی بچہ پر سونے سے پہلے وہ فٹ پاتھوں پر سویا کرتا تھا۔۔۔۔۔ ہر چیز اس کو اپنی محسوس ہوتی تھی مگر اب اپنے بھی پرائے لگتے تھے۔ سینکڑوں حریف تھے کاروبار میں عشق بازیوں میں ہر جگہ ہر مقام پر اس کا کوئی نہ کوئی حریف موجود ہوتا تھا۔

وہ زندگی عجیب و غریب تھی۔ یہ زندگی بھی عجیب و غریب تھی مگر دونوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ وہ تفکر سے آزاد تھی۔ یہ تفکر سے پر۔ چھوٹی سے چھوٹی خوشی اس کے دل و دماغ میں ایک عرصے تک موجود رہتی۔ ایک عرصے تک اس کو شاداں و فرحاں رکھتی۔ چھ آنے دے کر ایک میل ٹیکسی میں بیٹھے تو یہ ایک بہت بڑی عیاشی تھی۔ بھکاری کو ایک پیسہ دیا تو بڑی روحانی مسرت محسوس کی۔ اب وہ سینکڑوں کی خیرات کرتا تھا اور کوئی روحانی مسرت محسوس نہیں کرتا تھا اس لیے کہ یہ محض نمائش کی خاطر ہوتی تھی۔

اس زمانے میں اس کی عیاشیاں بڑی چھوٹی چھوٹی مگر بڑی دلچسپ ہوتی تھیں خود کو خوش کرنے کے لیے وہ بڑے بڑے نرالیے لٹا کر لیتا تھا۔ الیکٹرک ٹرین میں بیٹھے اور کسی گاؤں میں جا کر تار پی پی لگے۔ پتنگ لایا اور چو پانی پر بچوں کے ساتھ اڑانے لگے۔

داورائیشن پر صبح سویرے چلے گئے اور سکول جانے والی لڑکیاں تار تے رہے۔۔۔۔۔ پل کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ ایگلو انڈین لڑکیاں اسکرٹ پہنے اوپر چڑھیں تو ان کی نگلی ٹانگیں نظر آئیں۔ اس انفارے سے اس کو بڑی طفلانہ مسرت محسوس ہوتی۔

کبھی کبھی طویل فاصلے پیدل طے کرنا۔ گھر پہنچتا تو اسے خوشی ہوتی کہ اس نے
اکٹی یا دو فی بچانی ہے۔ یہ اکٹی یا دو فی کسی ایسی چیز پر خرچ کرتا جو اس کے روزانہ
پر وگرام میں نہیں ہوتی تھی۔

کسی لڑکی کو محبت بھر خط لکھا اور جو پتا دماغ میں آیا لکھ کر پوسٹ کر دیا اور اس
حماقت پر دل ہی دل میں خوب ہنسے۔

ایک اٹلی کا ناخن بڑھالیا اور کسی دکان سے ٹسٹ کرنے کے بہانے اس پر
کیوکس لگایا۔

ایک دن صرف دوسروں سے مانگ مانگ کے سگریٹ پئے اور بے حد
شرارت بھری خوشی محسوس کی۔

دفتر میں بیچ کے کھملوں نے زیادہ تنگ کیا تو ساری رات بازاروں میں گھومتے
رہے اور بجائے کوفت کے راحت محسوس کی۔

جیب میں پیسے کم ہوئے تو وہ پیر کا کھانا گول کر دیا اور یہ محسوس کیا کہ وہ کھانا چکا
ہے۔

اب یہ باتیں نہیں تھیں۔ دفتر سے اس نے روپے کمانے کے ڈھنگ سیکھے۔
دولت آنے لگی تو یہ سب باتیں آہستہ آہستہ غائب ہو گئیں۔ اس کی یہ ننھی ننھی
مسرتمیں سب سونے اور چاندی کے نیچے دب گئیں۔

اب رقص و سرود کی محفلیں جمتی تھیں۔ مگر ان سے وہ لطف حاصل نہیں ہوتا تھا۔
جو پل کے نیچے کھڑے ہو کر ایک خاص زاویے سے تنگی محسوس کرنا تھیں دیکھنے سے
محسوس ہوتا تھا۔ اس کی راتیں بالکل تنہا گزرتی تھیں۔ اب کوئی نہ کوئی عورت اس

کے آغوش میں ہوتی مگر وہ سکون غائب تھا۔ وہ کنوارا سکون جس میں وہ رات بھر
ملغوف رہتا تھا۔ اب اسے یہ فکر دامن گیر ہوتی تھی کہ کہیں اس کی بیوی کو پتہ نہ چل
جائے کہیں یہ عورت حاملہ نہ ہو جائے۔ کہیں اس کو بیماری نہ لگ جائے۔ کہیں اس
عورت کا خاوند نہ آن دھمکے۔ پہلے ایسے تفکرات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اب اس کے پاس ہر قسم کی شراب موجود رہتی تھی مگر وہ مزہ دہر دہر جو اسے پہلے
ہر روز شام کو چائیاں کی بنی ہوئی اب ہی بیسر پینے کا آتا تھا بالکل غائب ہی ہو گیا تھا۔

اس کا معمول تھا کہ دفتر سے فارغ ہو کر چوپانی یا پالو بندر کی سیر کرے۔ خوب
گھومے پھرے۔ نظاروں کا مزہ لیا آٹھ بجے تو گھر کا رخ کیا۔ کسی محل سے منہ
دھویا اور بانی کھلے پل کے پاس والی بار میں داخل ہو گئے۔ پارسی سیٹھ کو جو بہت ہی
مونا اور اس کی ناک بڑی بے ہنگام تھی۔ صاحب جی کہا ”کہم سیٹھ سوں حال
چھتھے؟“

اس کو بس صرف اتنی کجراتی آتی تھی مگر جب وہ کہتا تو اسے بڑی خوشی ہوتی کہ
وہ اتنے الفاظ بول سکتا ہے۔ سیٹھ مسکراتا اور کہتا ”سارو چے سارو چھتھے۔“

پھر وہ پارسی سیٹھ کے کاؤنٹر کے پاس کھڑے ہو کر جنگ کی باتیں چھیڑ دیتا۔
تھوڑی دیر کے بعد وہ یہاں سے ہٹ کر وہ کونے والی میز کے پاس بیٹھ جاتا۔ یہ
اس کی محبوب میز تھی۔ اس کے اوپر کا حصہ سنگ مرمر کا تھا۔ پیرا اسے گیلے کپڑے
سے صاف کرتا اور مجید سے کہتا ”بولو سیٹھ۔“

یہ سن کر مجید خود کو واقعی سیٹھ سمجھتا۔ اس وقت اس کی جیب میں ایک روپے چار

آنے ہوتے۔ وہ بیرے کی طرف دیکھ کر بڑی شان سے مسکراتا اور کہتا ”ہر روز تم مجھ سے پوچھتے ہو سب جانتے ہو..... لے آؤ جو پیا کرتا ہوں۔“

بیر اپنی عادت کے مطابق جانے سے پہلے گیلے کپڑے سے میز صاف کرتا۔ پونچھ کر ایک گلاس رکھتا۔ ایک پلیٹ میں کالٹی چنے دوسری میں کھاری سینک یعنی نمک لگی مونگ پھلی لاتا۔ مجید اس سے کہتا ”پاپڑا لاتا تم ہمیشہ بھول جاتے ہو۔“

یہ چیزیں گزک کے طور پر بیر کے ساتھ مفت ملی تھیں۔ مجید نے یہ طریقہ ایجاد کیا تھا کہ بیرے سے کالٹی چنوں کی ایک اور پلیٹ منگوا لیتا تھا۔ چنے کافی بڑے بڑے ہوتے تھے نمک اور کالٹی مرچ سے بہت مزیدار بن جاتے تھے۔ مونگ پھلی کی پلیٹ ہوتی تھی۔ یہ سب ملا کر مجید کارات کا کھانا بن جاتا تھا۔

بیز آتی تو وہ بڑے پرسکون انداز میں اس کو گلاس میں اٹھاتا۔ آہستہ آہستہ گھونٹ بھرتا۔ ٹھنڈی بیز اس کے حلق کے نیچے اترتی تو ایک بڑی عجیب فرحت اس کو محسوس ہوتی۔ اس کو ایسا لگتا کہ ساری دنیا کی ٹھنڈک اس کے دل و دماغ میں جمع ہو گئی ہے..... مولے پارسی کی طرف دیکھتا اور سوچتا۔ یہ پارسیوں کی ناک کیوں اتنی موٹی ہوتی ہے۔ اس قوم نے کیا تصور کیا ہے کہ خدا ان کی ناکوں سے بالکل غافل ہے..... پرسوں ٹرین میں جو پارسن بیٹھی تھی بڑا سڈول بدن، خوبصورت آنکھیں ابھرا ہوا سینہ بے داغ سفید رنگ۔ ماتھا کشادہ پتلے پتلے ہونٹ لیکن یہ بری طوطے ایسی ناک اس کو دیکھ کر مجید کو بہت ترس آیا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ آیا ایسی کوئی ترکیب نہیں ہو سکتی کہ اس کی ناک ٹھیک ہو جائے..... پھر اس کے دماغ میں مختلف اوقات پر دیکھی ہوئی خوبصورت اور جوان لڑکیاں تیرنے لگتی

تھیں۔ اس کو ایسا لگتا تھا کہ وہ ان کا شباب بیڑ میں گھول کر پی رہا ہے۔
 دیر تک وہاں بیٹھا وہ اپنی زندگی کے حسین لمحات کو دہراتا رہتا۔
 پندرہ دن ہوئے اپنا لو بندر پر جب تیز ہوا میں ایک یہودن لڑکی کا ریشمی
 سکرٹ اٹھا تھا تو کتنی متناسب اور حسین مانگوں کی جھلک دکھائی دی تھی۔
 پچھلے اتوار ایرانی کے ہوٹل کے پائے کا شور بہ کتنا نڈیہ تھا۔ کیسے ہٹکارے
 لے لے کر اس نے اس میں گرم گرم مان بھگو کر کھایا تھا۔
 رنگین فلم کتنا اچھا تھا۔ رقص کتنا دل فریب تھا ان عورتوں کا۔
 آج صبح ناشتے کے بعد سگریٹ پی کر اطف آگیا۔ ایسا لطف ہر روز آیا کرے تو
 مزے آجائیں۔
 وہ میاں بیوی جو اس نے دائر اسٹیشن پر دیکھے تھے آپ میں کتنے خوش تھے۔
 کبوتر اور کبوتری کی طرح گنگ رہے تھے۔
 کیکی مسٹری بڑا اچھا آدمی تھا۔ کل میں نے اسپرو مانگی تو اس نے مفت دے
 دی کہنے لگا ”اس کے دام کیا لوں گا آپ سے“۔ پچھلے ماہ اس نے وقت پر میری
 مدد بھی کی تھی پانچ روپے ادھار مانگے فوراً دے دیے اور کبھی تنہا نہ کیا۔
 ٹریم میں جب میں نے اس روزمرہٹی لڑکی کو اپنی سیٹ دی تو اس نے کتنی
 پیاری شکرگزاری سے کہا تھا ”تھینک یو“۔
 پھر وہ موٹے پارسی کی طرف دیکھتا۔ اس کے چہرے پر یہ بڑی ناک اس کو نظر
 آتی۔ مجید پھر سوچتا ”یہ کیا بات ہے ان پارسیوں کی ناکوں کے ساتھ اتنا بڑا سلوک
 کیوں کیا گیا ہے..... کتنی کوفت ہو رہی ہے اس ناک سے فوراً ہی یہ خیال آتا کہ یہ

پاری بڑا نیک آدمی ہے کیونکہ وہ پاس کو ادھار دے دیتا تھا۔ جب اس کی جیب میں پیسے نہ ہوتے تو وہ کاؤنٹر کے پاس جاتا اور اس سے کہتا ”سیٹھ آج مال پانی نہیں..... بکل۔“

بیسز کی بوتل چودہ آنے میں آتی تھی۔ اس کو خالی کر کے اور پلٹیں صاف کر کے وہ ہاتھ کے بڑے خوبصورت اشارے سے پیرے سے پیرے ”باقی دو آنے تم اپنے پاس رکھو۔“

بیر اسلام کرتا۔ مجید بے حد مسرور اور شاد ماں اٹھتا اور پاری سیٹھ کو ”صاحب جی“ کہہ کر دفتر کی طرف روانہ ہو جاتا۔ وہاں پہنچتے ہی اس کے قدم رک جاتے۔ پڑوس کی گلی میں ایک چھوٹی سی تارک کھولی میں مس لینا رہتی تھی۔ کسی زمانے میں بڑی مشہور ڈانس تھی مگر اب بوڑھی ہو چکی تھی۔ یہ وہ تھی۔ اس کی دولڑکیاں تھیں۔ الیتھر اور ہیلن الیتھر سولہ برس کی تھی اور ہیلن تیرہ برس کی۔ دونوں رات کو اپنی ماں کے پاس ایک لمبا کرتہ پہنے لیٹی ہوتی تھیں۔ صرف ایک پلنگ تھا۔ مس لینا فرش پر چٹائی بچھا کر سوتی تھی۔

رات کو بیسز پی کر مس لینا کے ہاں جانا مجید کا معمول بن گیا تھا۔ وہ باہر ہوٹل والے کو تین چائے کا آرڈر دے کر گلی میں داخل ہوتا اور مس لینا کی کھولی میں پہنچ جاتا۔ اندر ٹین کی کچی جل رہی ہوتی۔ الیتھر اور ہیلن قریب قریب نیم برہنہ ہوتیں۔ مجید پہنچتا تو زور سے پکارتا ”السلام علیکم“۔

ماں بیٹیاں ٹھیٹھ عربی لہجے میں ”علیکم السلام“ کہتیں اور وہ لوہے کی کرسی پر بیٹھ جاتا اور مس لینا سے کہتا ”چائے کا آرڈر دے آیا ہوں۔“

البتھر باریک آواز میں کہتی ”تھینک یو“۔ چھوٹی بستر پر لوٹیں لگاتار شروع کر دیتی۔ مجید کو اس کی آڑو آڑو جتنی چھاتیوں اور نگلی ناگوں کی کئی جھلکیاں دکھائی دیتیں جو اس کے مسرورہ مخمور دماغ کو بڑی فرحت بخشیتیں۔

باہر والا چائے لے کر آتا تو ماں بیٹیاں پینا شروع کر دیتیں۔ مجید خاموش بیٹھا رہتا۔ اس تنگ و تار ماحول میں ایک عجیب و غریب سکون اس کو محسوس ہوتا۔ وہ چاہتا کہ ان تینوں کا شکریہ ادا کرے۔ اس دھواں دینے والی کچی کا بھی شکریہ ادا کرے جو دھیمی دھیمی روشنی پھیلا رہی ہے۔ وہ لوہے کی اس کرسی کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ جس نے اس کو نشست پیش کی ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ ماں بیٹیاں کے پاس بیٹھتا۔ دونوں لڑکیاں خوبصورت تھیں۔ ان کی خوبصورتی مجید کی آنکھوں میں بڑی پیاری نیند لے کر آتی۔ رخصت لے کر وہ اٹھتا اور جھومتا جھامتا اپنے دفتر پہنچ جاتا اور کپڑے بدل کر بیچ پر لیٹا اور لیٹتے ہی خوشگوار اور پرسکون نیند کی گہرائیوں میں اتر جاتا۔

فرصت کے اوقات میں و سکی کے تین چار پیگ پی کر جب مجید اس زمانے کو یاد کرتا تو کچھ عرصے کے لیے یہ سب کچھ بھول کر اس میں محو ہو جاتا۔ نشہ کم ہوتا تو وہ بلیک مارکیٹ کے متعلق سوچنے لگتا۔ روپیہ مانے کے نئے ڈھنگ تخلیق کرتا۔ ان عورتوں کے متعلق غور کرتا جن سے وہ جنسی رشتہ قائم کرنا چاہتا تھا۔

مجید کا ماضی جنگ سے پہلے کی فضل میں گم ہو چکا تھا..... ایک مدھوسی لکیر رہ گئی تھی جس کو مجید اب دولت سے پیٹ رہا تھا۔



محمودہ

مستقیم نے محمودہ کو پہلی مرتبہ اپنی شادی پر دیکھا۔ آرسی مصحف کی رسم ادا ہو رہی تھی کہ اچانک اس کو وہ بڑی بڑی غیر معمولی طور پر بڑی آنکھیں دکھائی دیں یہ محمودہ کی آنکھیں تھیں جو ابھی تک کنواری تھیں۔

مستقیم عورتوں اور لڑکیوں کے جھرمٹ میں گھرا تھا محمودہ کی آنکھیں دیکھنے کے بعد اسے قطعاً محسوس نہیں ہوا کہ آرسی مصحف کی رسم کب شروع ہوئی اور کب ختم ہوئی۔ اس کی دلہن کیسی تھی۔ یہ بتانے کے لیے اس کو موقع دیا گیا۔ مگر محمودہ کی آنکھیں اس کی دلہن اور اس کے درمیان ایک سیاہ غمیل پر دے کے مانند حائل ہو گئیں۔

اس نے چوری چوری کئی مرتبہ محمودہ کی طرف دیکھا۔ اس کی ہم عمر لڑکیاں سب چچہا رہی تھیں۔ مستقیم سے بڑے زوروں کی چھیڑ خانی ہو رہی تھی۔ مگر وہ الگ تھلک کھڑکی کے پاس گھنٹوں پر ٹھوڑی جمائے خاموش بیٹھی تھی۔

اس کا رنگ گورا تھا۔ بال تختیوں پر لکھنے والی سیاہی کے مانند کالے اور چمکیلے تھے۔ اس نے سیدھی مانگ نکال رکھی تھی جو اس کے بیضوی چہرے پر بہت جمتی تھی۔ مستقیم کا اندازہ یہ تھا کہ اس کا قد چھوٹا ہے چنانچہ جب وہ اٹھی تو اس کی تصدیق ہو گئی۔

لباس بہت معمولی قسم کا تھا۔ وہ پٹہ جب اس کے سر سے ڈھکا کا اور فرش تک جا پہنچا تو مستقیم نے دیکھا کہ اس کا سینہ بہت ٹھوس اور مضبوط ہے۔ بھر ابھرا جسم تیکھی

ناک چوڑی پیشانی چھوٹا سالب دہان..... اور آنکھیں..... جو دیکھنے والے کو سب سے پہلے دکھائی دیتی تھیں۔

مستقیم اپنی دہن گھر لے آیا..... دو تین مہینے گزر گئے۔ وہ خوش تھا اس لیے کہ اس کی بیوی بہت خوبصورت اور باسیلتہ تھی..... لیکن وہ محمودہ کی آنکھیں نہیں بھول سکا تھا۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ اس کے دل و دماغ پر مرسم ہو گئی ہیں۔

مستقیم کو محمودہ کا نام نہیں معلوم تھا..... ایک دن اس نے اپنی بیوی کلثوم سے برسیل تذکرہ پوچھا ”وہ..... وہ لڑکی کون تھی ہماری شادی پر..... جب آرسی مصحف کی رسم ادا ہو رہی تھی وہ ایک کونے میں کھڑکی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔“

کلثوم نے جواب دیا ”میں کیا کہہ سکتی ہوں..... اس وقت کئی لڑکیاں تھیں۔ معلوم نہیں آپ کس کے متعلق پوچھ رہے ہیں۔“

مستقیم نے کہا ”وہ..... وہ جس کی یہ بڑی بڑی آنکھیں تھیں۔“

کلثوم سمجھ گئی۔ ”اوہ..... آپ کا مطلب محمودہ سے ہے..... ہاں واقعی اس کی آنکھیں بہت بڑی ہیں، لیکن بری نہیں لگتیں..... غریب گھرانے کی لڑکی ہے۔ بہت کم گواہ و شریف ہے۔ کل ہی اس کی شادی ہوئی ہے۔“

مستقیم کو غیر ارادی طور پر ایک دھچکا سا لگا ”اس کی شادی ہو گئی کل؟“

”ہاں..... میں کل وہیں تو گئی تھی..... میں نے آپ سے نہیں کہا تھا کہ میں نے اس کو ایک اگلی دی ہے۔“

”ہاں ہاں..... مجھے یاد آ گیا..... لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تم جس سہیلی کی شادی پر جا رہی ہو وہی لڑکی ہے بڑی بڑی آنکھوں والی..... کہاں شادی ہوئی ہے

اس کی؟“

کلوٹوم نے گوری بنا کر اپنے خاوند کو دیتے ہوئے کہا ”اپنے عزیزوں میں.....
خاوند اس کا ریلوے ورکشاپ میں کام کرتا ہے ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار تنخواہ ہے.....
سنا ہے بے حد شریف آدمی ہے۔“
مستقیم نے گوری کھلے کے نیچے دبائی ”چلو اچھا ہو گیا..... لڑکی بھی جیسا کہ تم
کہتی ہو شریف ہے۔“

کلوٹوم سے رہا نہ گیا۔ اسے تعجب تھا کہ اس کا خاوند محمودہ میں اتنی دلچسپی کیوں
لے رہا ہے ”حیرت ہے آپ نے اس کو محض ایک نظر دیکھنے پر بھی یاد رکھا۔“
مستقیم نے کہا ”اس کی آنکھیں ہی کچھ ایسی ہیں کہ آدمی بھول نہیں سکتا..... کیا
میں جھوٹ کہتا ہوں؟“

کلوٹوم دوسرا پان بنا رہی تھی۔ چھوڑے سے توقف کے بعد وہ اپنے خاوند سے
مخاطب ہوئی ”میں اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتی۔ مجھے تو اس کی آنکھوں میں کوئی
کشش نظر نہیں آتی..... مرد جانے کن لگا ہوں سے دیکھتے ہیں۔“

مستقیم نے مناسب خیال کیا کہ اس موضوع پر اب مزید گفتگو نہیں ہونی
چاہیے چنانچہ جواب میں مسکرا کر وہ اتھا اور اپنے کمرے میں چلا گیا..... تو ارکی
چھٹی تھی حسب معمول اسے اپنی بیوی کے ساتھی میٹنی شو دیکھنے جانا چاہیے تھا مگر
محمودہ کا ذکر چھیڑ کر اس نے اپنی طبیعت مکرر کر لی تھی۔

اس نے آرام دہ کرسی میں لیٹ کر تپائی پر سے سے ایک کتاب اٹھائی جسے وہ
دو مرتبہ پڑھ چکا تھا۔ پہلا ورق نکالا اور پڑھنے لگا۔ مگر حروف گڈمڈ ہو کر محمودہ کی

آنکھیں بن جاتے۔ مستقیم نے سوچا ”شاید کلثوم ٹھیک کہتی تھی کہ اسے محمودہ کی آنکھوں میں کوئی کشش نظر نہیں آتی۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے کسی اور مرد کو بھی نظر نہ آئے۔۔۔۔۔ ایک صرف میں ہوں جسے دکھائی دی ہے۔۔۔۔۔ پر کیوں؟۔۔۔۔۔ میں نے ایسا کوئی ارادہ نہیں کیا تھا۔۔۔۔۔ میری ایسی کوئی خواہش نہیں تھی کہ وہ میرے لیے پرکشش بن جائیں۔۔۔۔۔ ایک لٹلے کی تو بات تھی۔ بس میں نے ایک نظر دیکھا اور وہ میرے دماغ پر چھا گئیں۔ اس میں نہ ان آنکھوں کا قصور ہے نہ میری آنکھوں کا جن سے میں نے انہیں دیکھا۔“

اس کے بعد مستقیم نے محمودہ کی شادی کے متعلق سوچنا شروع کیا ”تو ہو گئی اس کی شادی۔۔۔۔۔ چلو اچھا ہوا۔۔۔۔۔ لیکن دوست کیا بات ہے کہ تمہارے دل میں ہلکی سی ٹیس اٹھتی ہے۔۔۔۔۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اس کی شادی نہ ہو۔۔۔۔۔ سدا کنواری رہے کیونکہ تمہارے دل میں اس سے شادی کرنے کی خواہش تو کبھی پیدا نہیں ہوئی تم نے اس کے متعلق کبھی ایک لٹلے کے لیے بھی نہیں سوچا پھر یہ جلن کیسی؟۔۔۔۔۔ اتنی دیر تمہیں اسے دیکھنے کا بھی خیال نہ آیا پر اب تم کیوں اسے دیکھنا چاہتے ہو۔۔۔۔۔ بفرض محال دیکھ بھی لو تو کیا کر لو گے۔ اسے اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لو گے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں کوچ کر اپنے بنوے میں ڈال لو گے۔ بولونا کیا کرو گے؟“

مستقیم کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اصل میں اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اگر کچھ چاہتا بھی ہے تو کیوں چاہتا ہے۔ محمودہ کی شادی ہو چکی تھی اور وہ بھی صرف ایک روز پہلے۔ یعنی اس وقت

جب کہ مستقیم کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا محمودہ یقیناً دہانوں کے لباس میں یا تو اپنے میکے یا اپنی سسرال میں شرمائی لپائی بیٹھی تھی۔۔۔۔۔ وہ خود شریف تھی اس کا شوہر بھی شریف تھا ریلوے ورکشاپ میں ملازم تھا اور ڈیڑھ سو روپے ماہوار تنخواہ پاتا تھا۔۔۔۔۔ بڑی خوشی کی بات تھی۔ مستقیم کی دلی خواہش تھی کہ وہ خوش رہے۔۔۔۔۔ ساری عمر خوش رہے۔۔۔۔۔ لیکن اس کے دل میں نہ جانے کیوں ایک ٹیس سی اٹھتی تھی اور اسے بے قرار بناتی تھی۔

مستقیم آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ سب بکواس ہے۔ اسے محمودہ کے متعلق قطعاً سوچنا نہیں چاہیے۔۔۔۔۔ دو برس گزر گئے۔ اس دوران میں اسے محمودہ کے متعلق کچھ معلوم نہ ہوا اور نہ اس نے معلوم کرنے کی کوشش کی حالانکہ وہ اور اس کا خاوند بہن میں ڈونگری کی ایک گلی میں رہتے تھے۔ مستقیم گوڈونگری سے بہت دور ماتم میں رہتا تھا لیکن اگر وہ چاہتا تو بڑی آسانی سے محمودہ کو دیکھ سکتا تھا۔

ایک دن کلثوم ہی نے اس سے کہا ”آپ کی اس بڑی بڑی آنکھوں والی محمودہ کے نصیب بہت برے نکلے۔“

چونکہ مستقیم نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا ”کیوں؟ کیا ہوا؟“
 کلثوم نے کلوری بناتے ہوئے کہا ”اس کا خاوند ایک دم مولوی ہو گیا ہے۔“
 ”تو اس سے کیا ہوا؟“

”آپ سن تو لیجیے۔۔۔۔۔ ہر وقت مذہب کی باتیں کرتا رہتا ہے۔۔۔۔۔ لیکن بڑی اوٹ پٹانگ قسم کی۔ وہ ٹیپے کرتا ہے چلے کاٹتا ہے اور محمودہ کو مجبور کرتا ہے کہ وہ بھی ایسا ہی کرے۔ فقیروں کے پاس گھنٹوں بیٹھا رہتا ہے گھر بار سے بالکل غافل ہو

گیا ہے۔۔۔۔۔ ڈاڑھی بڑھالی ہے۔ ہاتھ میں ہر وقت تسبیح ہوتی ہے کام پر کبھی جاتا ہے کبھی نہیں جاتا۔۔۔۔۔ کئی کئی دن غائب رہتا ہے۔۔۔۔۔ وہ بے چارے کڑھتی رہتی ہے۔ گھر میں کھانے کو کچھ ہوتا نہیں اس لیے فاقے کرتی ہے۔ جب اس سے شکایت کرتی ہے تو آگے سے جواب یہ ملتا ہے۔۔۔۔۔ فاقہ کشی اللہ تبارک و تعالیٰ کو بہت پیاری ہے۔“ کلثوم نے یہ سب کچھ ایک سانس میں کہا۔

مستقیم نے پند نیا سے تھوڑی سی چھالیا اٹھا کر منہ میں ڈالی ”کہیں دماغ تو نہیں چل گیا اس کا؟“

کلثوم نے کہا ”محمودہ کا تو یہی خیال ہے۔۔۔۔۔ خیال کا اس کا یقین ہے۔۔۔۔۔ گٹے میں بڑے بڑے منکوں والی مالا ڈالے پھرتا ہے کبھی کبھی سفید رنگ کا چوڑا بھی پہنتا ہے۔“

مستقیم گلوری لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور آرام کرسی پر لیٹ کر سوچنے لگا ”یہ کیا ہوا۔۔۔۔۔ ایسا شوہر تو وبال جان ہوتا ہے۔۔۔۔۔ غریب کس مصیبت میں پھنس گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ پاگل پن کے جراثیم اس کے شوہر میں شروع ہی سے موجود ہوں گے جو یہ اب ایک دم ظاہر ہوئے ہیں۔۔۔۔۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اب محمودہ کیا کرے گی۔ اس کا یہاں کوئی رشتہ دار بھی نہیں۔ کچھ شادی کرنے لاہور سے آئے تھے اور واپس چلے گئے تھے۔ کیا محمودہ نے اپنے والدین کو نکلا ہوا گا؟۔۔۔۔۔ نہیں نہیں اس کے ماں باپ تو جیسا کہ کلثوم نے ایک مرتبہ کہا تھا اس کے بچپن ہی میں مر گئے تھے۔ شادی اسکے چچا نے کی تھی۔ ڈوگری۔۔۔۔۔ ڈوگری میں شاید اس کی جان پہچان کا کوئی ہو۔۔۔۔۔ نہیں جان پہچان کا کوئی ہوتا تو وہ فاقے

کیوں کرتی..... کلثوم کیوں نہ اسے اپنے یہاں لے آئے..... پاگل ہوئے ہو
مستقیم..... ہوش کے ناخن لو۔“

مستقیم نے ایک بار پھر ارادہ کر لیا کہ وہ محمودہ کے متعلق نہیں سوچے گا۔ اس
لیے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ بیکار کی مغز پاشی تھی۔

بہت دنوں کے بعد کلثوم نے ایک روز اسے بتایا کہ محمودہ کا شوہر جس کا نام
جمیل تھا قریب قریب پاگل ہو گیا ہے۔“

مستقیم نے پوچھا ”کیا مطلب؟“

کلثوم نے جواب دیا ”مطلب یہ کہ رات کو ایک سیکنڈ کے لیے نہیں سوتا۔
جہاں کھڑا ہے بس وہیں گھنٹوں خاموش کھڑا رہتا ہے..... محمودہ غریب روتی رہتی
ہے۔ میں کل اس کے پاس گئی تھی..... بے چاری کو کئی دن کا فائدہ تھا میں بیس
روپے دے آئی تھی کیونکہ میرے پاس اتنے ہی تھے۔“

مستقیم نے کہا ”اچھا کیا تم نے..... جب تک اس کا خاوند ٹھیک نہیں ہو جاتا
کچھ نہ کچھ دے آیا کرو تا کہ غریب کو فاقوں کی نوبت نہ آئے۔“

کلثوم نے جموڑے توقف کے بعد عجیب و غریب لہجے میں کہا ”اصل میں بات
کچھ اور ہے۔“

”کیا مطلب“

”محمودہ کا خیال ہے کہ جمیل نے محض ایک ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ وہ پاگل
واگل ہرگز نہیں..... بات یہ ہے کہ وہ.....“

”وہ کیا؟“

”وہ..... عورت کے قابل نہیں..... یہ نفص دو رکرنے کے لیے وہ فقیروں اور
سنیاسیوں سے ٹونے ٹونے لیتا رہتا ہے۔“

مستقیم نے کہا ”یہ بات تو پاگل ہونے سے زیادہ افسوسناک ہے..... محمودہ
کے لیے تو یہ سمجھو کہ ازدواجی زندگی ایک خلا بن کر رہ گئی ہے!

مستقیم اپنے کمرے میں چلا گیا اور بیٹھ کر محمودہ کی حالت زار کے متعلق سوچنے
لگا۔ ایسی عورت کی زندگی کیا ہوگی جس کا شوہر بالکل صفر ہو..... کتنے ارمان ہوں
گے اس کے سینے میں۔ اس کی جوانی نے کتنے کپکپا دینے والے خواب دیکھے ہوں
گے..... اس نے اپن سہیلیوں سے کیا کچھ نہیں سنا ہوگا..... کتنی ناامیدی ملی ہوگی
غریب کو جب اسے چاروں طرف خلا ہی خلا نظر آیا ہوگا..... اس نے اپنی گود بھری
ہونے کے متعلق بھی کئی بار سوچا ہوگا..... جب ڈونگری میں کسی کے ہاں..... بچہ
پیدا ہونے کی اطلاع اسے ملتی ہوگی تو بچاری کے دل پر ایک گھونسا سا لگتا ہوگا.....
اب کیا کرے گی..... ایسا نہ ہو خود کشی کر لے..... دو برس تک اس نے کسی کو یہ راز
نہ بتایا مگر اس کا سینہ پھٹ پڑا خدا اس کے حال پر رحم کرے۔“

بہت دن گزر گئے۔ مستقیم اور کلثوم چھٹیوں میں شیخ گنی چلے گئے۔ دونوں
ڈھائی مہینے رہے واپس آئے تو ایک مہینے کے بعد کلثوم کے ہاں لڑکا پیدا ہوا..... وہ
محمودہ کے ہاں نہ جاسکی..... لیکن ایک دن اس کی ایک سہیلی جو محمودہ کو جانتی تھی اس
کو مبارکباد دینے کے لیے آئی..... اس نے باتوں باتوں میں کلثوم سے کہا ”کچھ
سنا تم نے..... وہ محمودہ ہے مابڑی بڑی آنکھوں والی۔“
کلثوم نے کہا ”ہاں ہاں..... ڈونگری میں رہتی ہے۔“

”خاوند کی بے پروائی نے غریب کو بری باتوں پر مجبور کر دیا“ کلثوم کی سہیلی کی آواز میں درد تھا۔

کلثوم نے بڑے دکھ سے پوچھا ”کیسی بری باتوں پر؟“
 ”اب اس کے یہاں غیر مردوں کا آنا جانا شروع ہو گیا ہے۔“
 ”جھوٹ“ کلثوم کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

کلثوم کی سہیلی نے کہا ”میں کلثوم میں جھوٹ نہیں بولتی..... میں پرسوں اس سے ملنے گئی تھی دروازے پر دستک دینے ہی والی تھی کہ اندر سے ایک نوجوان مرد جو مہین معلوم ہوتا تھا باہر نکلا اور تیزی سے نیچے اتر گیا۔ میں نے اس سے مانا مناسب نہ سمجھا اور واپس چلی آئی۔“

”یہ تم نے بہت بری خبر سنائی..... خدا اس کو گناہ کے راستے سے بچائے رکھے..... ہو سکتا ہے وہ مہین اس کے خاوند کا کوئی دوست ہو“۔ کلثوم نے خود کو فریب دیتے ہوئے کہا۔

اس کی سہیلی مسکرائی ”دوست چوروں کی طرف دروازہ کھول کر بھاگا نہیں کرتے“۔

کلثوم نے اپنے خاوند سے بات کی تو اسے بہت دکھ ہوا۔ وہ کبھی نہیں رویا تھا پر جب کلثوم نے یہ اندہ بنا کہ بات بتائی کہ محمودہ نے گناہ کا راستہ اختیار کر لیا ہے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے اسی وقت تہیہ کر لیا کہ محمودہ ان کے یہاں رہے گی چنانچہ اس نے اپنی بیوی سے کہا ”یہ بڑی خوفناک بات ہے..... تم ایسا کرو ابھی جاؤ اور محمودہ کو یہاں لے آؤ“۔

کلثوم نے بڑے روکھے پن سے کہا ”میں اسے اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتی“۔
 ”کیوں؟“ مستقیم کے لہجے میں حیرت تھی۔

”بس میری مرضی..... وہ میرے گھر میں کیوں رہے..... لیے کہ آپ کو اس کی آنکھیں پسند ہیں؟“ کلثوم کے بولنے کا انداز بہت زہریلا اور طنزیہ تھا۔
 مستقیم کو بہت غصہ آیا مگر پی گیا۔ کلثوم سے بحث کرنا فسنول تھا۔ ایک صرف یہی ہو سکتا تھا کہ وہ کلثوم کو نکال کر محمودہ کو لے آئے..... مگر وہ ایسے اقدام کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ مستقیم کی نیت قطعاً نیک تھی۔ اس کو خود اس کا احساس تھا۔
 دراصل اس نے کسی گندے زاویہ نگاہ سے محمودہ کو دیکھا ہی نہیں تھا..... البتہ اس کی آنکھیں واقعی اس کو پسند تھیں اتنی کہ وہ بیان نہیں کر سکتا تھا۔

وہ گناہ کا راستہ اختیار کر چکی تھی۔ ابھی اس نے صرف چند قدم اٹھائے تھے۔
 اس کو تباہی کے غار سے بچایا جا سکتا تھا..... مستقیم نے کبھی نماز نہیں پڑھی تھی کبھی روزہ نہیں رکھا تھا کبھی خیرات نہیں دی تھی..... خدا نے اس کو کتنا اچھا موقع دیا تھا کہ وہ محمودہ کو گناہ کے رستے پر سے گھسیٹ کر لے آئے اور طلاق وغیرہ دلو کر اس کی کسی اور سے شادی کرادے..... مگر وہ یہ ثواب کا کام نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے کہ وہ بیوی کا دیبل تھا۔

بہت دی تک مستقیم کا ضمیر اس کو سرزنش کرتا رہا۔ ایک دو مرتبہ اس نے کوشش کی کہ اس کی بیوی رضامند ہو جائے۔ مگر جیسا کہ مستقیم کو معلوم تھا ایسی کوشش لا حاصل تھی۔
 مستقیم کا خیال تھا کہ اور کچھ نہیں تو کلثوم محمودہ سے ملنے ضرور جائے گی۔ مگر اس کو ناامیدی ہوئی۔ کلثوم نے اس روز سے محمودہ کا نام تک نہ لیا۔

اب کیا ہو سکتا ہے..... مستقیم خاموش ہو رہا۔

قریب قریب دو برس گزر گئے۔ ایک دن گھر سے نکل کر مستقیم ایسے ہی تفریحا
فٹ پاتھ پر چہل قدمی کر رہا تھا کہ اس نے قصائیوں کی بلڈنگ کی گراؤنڈ فلور کی
کھولی کے باہر تھڑے پر محمودہ کی آنکھوں کی جھلک دیکھی۔ مستقیم دو قدم آگے نکل
گیا تھا۔ فوراً مڑ کر اس نے غور سے دیکھا..... محمودہ ہی تھی۔ وہی بڑی بڑی
آنکھیں۔ وہ ایک یہودی کے ساتھ جو اس کھولی میں رہتی تھی باتیں کرنے میں
مصروف تھی۔

اس یہودن کو سارا ماہم جانتا تھا۔ ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ اس کا کام عیاش
مردوں کے لیے جوان لڑکیاں مہیا کرنا تھا۔ اس کی اپنی دو جوان بیٹیاں تھیں جن
سے وہ پیشہ کراتی تھی۔ مستقیم نے جب محمودہ کا چہرہ نہایت ہی بے ہودہ میک اپ کیا
ہوا دیکھا تو وہ لرز اٹھا۔ زیادہ دیر تک یہ اندہ ہناک منظر دیکھنے کی تاب اس میں نہیں
تھی..... وہاں سے فوراً چل دیا۔

گھر پہنچ کر اس نے کلثوم سے اس واقعے کا ذکر نہ کیا..... کیونکہ اس کی اب
ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ محمودہ اب مکمل عصمت فروش عورت بن چکی
تھی..... مستقیم کے سامنے جب بھی اس کا بے ہودہ اور فحش طور پر میک اپ کیا ہوا
چہرہ آتا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ اس کا ضمیر اس سے کہتا، مستقیم جو کچھ
تم نے دیکھا ہے اس کے باعث تم ہو..... کیا ہوا تھا اگر تم اپنی بیوی کی چند روز کی
ماراضگی اور خفگی برداشت کر لیتے۔ زیادہ سے زیادہ جس میں وہ اس وقت وحشی
ہوتی ہے..... کیا تمہاری نیت نیک نہیں تھی..... اگر تم سچائی پر رہتے تو کلثوم ایک نہ

ایک دن اپنے آپ ٹھیک ہو جاتی۔۔۔ تم نے بڑا ظلم کیا۔۔۔ بہت بڑا گناہ کیا۔۔۔
مستقیم اب کیا کر سکتا تھا۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔۔۔ پانی سر سے گزر چکا تھا۔ چڑیاں
سارا کھیت چک گئی تھیں۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ مرتے ہوئے مریض کو دم
آخر میں اوکسیجن سلگمانے والی بات تھی۔

چھوڑے دنوں بعد بمبئی کی فضا فرقہ وارانہ فسادات کے باعث بڑی خطرناک
ہو گئی۔ ہوا رے کے باعث ملک کے طول و عرض میں تباہی اور نارتھری کا بازار
گرم تھا۔ لوگ دھڑا دھڑا ہندوستان چھوڑ کر پاکستان جا رہے تھے۔ کلثوم نے مستقیم
کو مجبور کیا کہ وہ بھی بمبئی چھوڑ دے۔۔۔ چنانچہ جو پہلا جہاز ملا اس کی سیٹیں بک کر
کے میاں بیوی کراچی پہنچ گئے اور چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر دیا۔

ڈھائی برس بعد یہ کاروبار ترقی کر گیا اس لیے مستقیم نے ملازمت کا خیال ترک کر
دیا۔۔۔ ایک روز شام کو دکان سے اٹھ کر وہ ٹہلتا ٹہلتا صدر جا کا۔۔۔ جی چاہا کہ ایک پان
کھائے۔ بیس میں قدم کے فاصلے پر اسے ایک دکان نظر آئی جس پر کافی بھیڑ تھی۔
آگے بڑھ کر وہ دکان کے پاس پہنچا۔۔۔ کیا دیکھتا ہے کہ محمود بیٹھی پان لگا رہی تھی۔
جھلے ہوئے چہرے پر اسی قسم کا فکس میک اپ ہے۔ لوگ اسے گندے گندے مذاق کر
رہے ہیں اور وہ ہنس رہی ہے۔۔۔ مستقیم کے ہوش و ہواں غائب ہو گئے۔ قریب تھا کہ
وہاں سے بھاگ جائے کہ محمود نے اسے پکارا ”ادھر آؤ دو لہما میاں۔۔۔ تمہیں ایک
فٹ کلاس پان کھلائیں۔۔۔ ہم تمہاری شادی میں شریک تھے۔“
مستقیم بالکل پتھر ا گیا۔



مسز ڈی کوسا

نومینے پورے ہو چکے تھے۔

میرے پیٹ میں اب پہلی سی گڑگڑ نہیں تھی۔ پر مسز ڈی کوسا کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ وہ بہت پریشان تھی۔ چنانچہ آنے والی حادثے کی تمام انجانی تکلیفیں بھول گئی تھی اور مسز ڈی کوسا کی حالت پر رحم کھانے لگی تھی۔

مسز ڈی کوسا میری پڑوسن تھی۔ ہمارے فلیٹ کی بالکونی اور اس کے فلیٹ کی بالکنی میں صرف ایک چوٹی تختہ حائل تھا جس میں بے شمار ننھے ننھے سوراخ تھے۔ ان سوراخوں میں سے میں اور اللہ بخشے میری ساس ڈی کوسا کے سارے خاندان کو کھانا کھاتے دیکھا کرتے تھے۔ لیکن جب ان کے ہاں سکھائی ہوئی جھینگا مچھلی پکتی اور اس کی ناقابل برداشت بو ان سوراخوں میں سے چھن چھن کر ہم تک پہنچ جاتی تو میں اور میری ساس بالکنی کا رخ نہ کرتے تھے۔ میں اب بھی کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ اتنی بدبودار چیز کھائی کیونکر جاسکتی ہے۔ پر بابا کیا کہا جائے انسان بری چیزیں کھا جاتا ہے۔ کون جانے انہیں ناقابل برداشت بو ہی میں لطف آتا ہو۔

مسز ڈی کوسا کی عمر چالیس یا لیس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کے کٹے ہوئے بال جو اپنی سیاہی کھو چکے تھے اور جن میں بے شمار سفید دھاریاں پڑ چکی تھیں۔ اس کے چھوٹے سے سر پر گھسے ہوئے نمدے کی ٹوپی کی صورت میں پریشان رہتے تھے۔ کبھی کبھی جب وہ نیا بھڑکیلے رنگ کا بہت بھونڈے طریقے سے سلا ہوا فراک پہنتی تھی تو سر پر الال الال بند کیوں والا جال بھی لگ لیتی تھی۔ جس سے اس کے

چندرے بال اس کے سر کے ساتھ چپک جاتے تھے۔ اس حالت میں وہ درزیوں کا ایسا ماڈل دکھائی دیتی تھی جو نیلام گھر میں پڑا ہو۔

میں نے کئی بار اسے اپنے انہیں بالوں میں لہریں پیدا کرنے کی کوشش میں بھی مصروف دیکھا ہے۔ اپنے چار بیٹوں کو جن میں سے ایک تازہ تازہ فوج میں بھرتی ہوا تھا اور اپنے آپ کو ہندوستان کے حکمرانوں کی فہرست میں شامل سمجھتا تھا اور دوسرا جو ہر روز اپنی کلف لگی پتلون استری کر کے پہنتا تھا اور نیچے آ کر چھوٹی چھوٹی کرچیں لڑکیوں کے ساتھ میٹھی میٹھی باتیں کیا کرتا تھا۔۔۔ ناشتہ کرا دیا کرتی تھی اور اپنے بڑھے خاوند کو جو ریلوے میں ملازم تھا بالکنی سے نکل کر ہاتھکے اشارے سے بائے کرنے کے بعد فارغ ہو جاتی تھی تو اپنے سر کے ناقابل گرفت بالوں میں لہریں پیدا کرنے والے کلب لگا دیا کرتی تھی اور ان کپڑوں سمیت سوچا کرتی تھی کہ میری یہاں بچہ کب پیدا ہوگا۔

وہ خود آدھے درجن بچے پیدا کر چکی تھی جن میں سے پانچ زندہ تھے۔ ان کی پیدائش پر بھی وہ یونہی دن گنا کرتی تھی یا چپ چاپ بیٹھی رہتی تھی اور بچے خود بخود پیدا ہونے کے لیے چھوڑ دیتی تھی۔ اس کے متعلق مجھے کچھ علم نہیں لیکن مجھے اس بات کا تلخ تجربہ ضرور ہے کہ جو کچھ میرے پیٹ میں تھا۔ اس سے مسز ڈی کو سنا کہ جس کا دایہنا بیچر اور اس کے اوپر کا حصہ کسی بیماری کے باعث ہمیشہ سو جھار رہتا تھا۔ بہت گہری دلچسپی تھی۔ چنانچہ دن میں کئی مرتبہ بالکنی سے جھانک کر وہ مجھے آواز دیا کرتی تھی اور گراٹر سے بے نیاز انگریزی میں جس کا نہ بولنا اس کے نزدیک شاید ہندوستان کے موجودہ حکمرانوں کی جگہ تھی۔ مجھ سے کہا کرتی تھی ”میں بولی آج

تم کدھر گیا تھا.....“

جب میں اسے بتاتی تھی کہ میں اپنے خاوند کیساتھ شاپنگ کرنے گئی تھی تو اس کے چہرے پر پاناامیدی کے آثار پیدا ہو جاتے اور وہ انگریزی بھول کر بمبئی کی اردو میں گفتگو کرنا شروع کر دیتی۔ جس کا مقصد مجھ سے صرف اس کا پتہ لینا ہوتا تھا کہ میرے خیال کے مطابق بچے کی پیدائش میں کتنے دن باقی رہ گئے ہیں۔

مجھے اس بات کا علم ہوتا تو میں یقیناً اسے بتا دیتی۔ اس میں حرج ہی کیا تھا۔ اس بے چاری کو خواہ مخواہ کی الجھن سے نجات مل جاتی اور مجھے بھی ہر روز اس کے منت نئے سوالوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ بچوں کی پیدائش اور اس کے متعلقات کا کچھ علم ہی نہیں تھا۔ مجھے صرف اتنا معلوم تھا کہ نومینے ہو جانے کے بعد بچہ پیدا ہو جایا کرتا ہے۔

مسز ڈی کو سنا کے حساب کے مطابق نومینے ہو چکے تھے۔ میری ساس کا خیال تھا کہ ابھی کچھ دن باقی ہیں لیکن یہ نومینے کہاں سے شروع کر کے پورے کر دیے گئے تھے میں نے بہتیرا اپنے ذہن پر زور دیا پر سمجھ نہ سکی۔

بچہ میرے پیدا ہونے والا تھا شادی میری ہوئی تھی۔ لیکن سارا بھی کھانا مسز ڈی کو سنا کے پاس تھا۔ کئی بار مجھے خیال آیا کہ یہ میری اپنی غفلت کا نتیجہ ہے اگر میں نے کسی چھوٹی سی نوٹ بک میں چھوٹی سی نوٹ بک میں نہ ہی اس کا پی پی میں جو دھوپی کے حساب کے لیے مخصوص تھی۔ سب تاریخیں لکھ چھوڑی ہوتیں تو کتنا اچھا تھا۔

اتنا تو مجھے یاد تھا کہ میری شادی ۲۶ اپریل کو ہوئی یونی ۲۶ کی رات کو میں اپنے

گھر کے بجائے اپنے خاوند کے گھر میں تھی لیکن اس کے بعد کے واقعات کچھ اس قدر غلط ملط ہو گئے تھے کہ اس بات کا پتہ لگانا بہت مشکل تھا اور مجھے تعجب ہے کہ مسز ڈی کو سنانے یہ اندازہ لگالیا تھا کہ نو مہینے پورے ہو چکے ہیں اور بچہ لیٹ ہو گیا تھا۔

ایک روز اس نے میری ساس سے انتظار اب بھرے لہجے میں کہا ”تمہارے ڈائٹران لاکا بچہ لیٹ ہو گیا ہے۔ پچھلے ایک ہفتے میں پیدا ہونا مانگتا تھا۔“
 می اندر صوفے پر لیٹی تھی اور آنے والے حادثے کے متعلق قیاس آرائیاں کر رہی تھی۔ مسز ڈی کو سنا کی یہ بات سن کر مجھے بڑی ہنسی آئی اور ایسا لگا کہ مسز ڈی کو سنا اور میری ساس دونوں پلیٹ فارم پر کھڑی ہیں اور جس گاڑی کا انہیں انتظار تھا لیٹ ہو گئی ہے۔

اللہ بخشے میری ساس کو اتنی شدت کا انتظار نہیں تھا۔ چنانچہ وہ کئی مرتبہ مسز ڈی کو سنا سے کہہ چکی تھیں ”کوئی فکر کی بات نہیں خدا اپنا فضل کرے گا۔ کچھ دن اوپر ہو جایا کرتے ہیں۔“ مگر ڈی کو سنا نہیں مانتی تھی جو حساب وہ لگا چکی تھی غلط کیسے ہو سکتا تھا۔ جب مسز ڈی سلوا کے ہاں بچہ پیدا ہونے والا تھا تو اس نے دور ہی سے دیکھ کر کہہ دیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ لگے گا۔ چنانچہ چوتھے ہی روز مسز ڈی سلوا ہسپتال جاتی نظر آئی اور خود اس نے چھ بچے جنے تھے جن میں سے ایک بھہ لیٹ نہ ہوا تھا اور پھر وہ نرس تھی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اس نے کسی ہسپتال میں دایہ گیری کی تعلیم حاصل نہیں کی تھی مگر سب لوگ اسے نرس کہتے تھے۔ چنانچہ ان کے فلیٹ کے باہر چھوٹی سی چوٹی تختی پر ”نرس ڈی کو سنا“ لکھا رہتا تھا۔ اسے بچوں کی

پیدائش کے اوقات معلوم نہ ہوتے تو اور کس کو ہوتے۔

جب کمرہ نمبر ۷ کے رہنے والے مسٹر نذیر کی ناک سو جھگی تھی تو مسز ڈی کو سنا نے بازار سے روٹی کا بندل منگوا کر اور پانی گرم کر کے ٹکڑی کی تھی۔ بار بار وہ اس واقعے کو سند کے طور پر پیش کیا کرتی تھی۔ چنانچہ مجھے بار بار کہنا پڑتا تھا ”ہم کتنے خوش قسمت ہیں کہ ہمارے پڑوس میں ایسی عورت رہتی ہے جو خوش خلق ہونے کے علاوہ اعلیٰ نرس بھی ہے۔“ یہ سن کر وہ بہت خوش ہوتی تھی اور اس کو یوں خوش کرنے سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ جب صاحب کو تیز بخار چڑھتا تھا تو مسز ڈی کو سنا نے برف لگانے والی ریڑ کی تھیلی فوراً مجھے لاد دی تھی۔ یہ تھیلی ایک ہفتہ ہمارے یہاں پڑی رہی اور ملیسریا کے مختلف شکاروں کے استعمال میں آتی رہی۔ یوں بھی مسز ڈی کو سنا بڑی خدمت گزار تھی لیکن اس کی اس رضاکاری میں اس کی متجسس طبیعت کو کافی دخل تھا۔ دراصل وہ اپنے تمام پڑوسیوں کے ان رازوں سے بھی واقف ہونے کی آرزو مند تھی جو سینہ بہ سینہ چلے آتے ہیں۔

مسز ڈی سلوا چونکہ مسز ڈی کو سنا کی ہم ندم تھی۔ اس لیے اس کی بہت سی کمزوریاں اس کو معلوم تھیں۔ مثلاً وہ جانتی تھی کہ اس کی شادی کرمس پر ہوئی اور بچہ جولائی میں پیدا ہوا۔ جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ اس کی اصلی شادی بہت پہلے ہو چکی تھی۔ اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ مسز ڈی سلوا ناچ گھروں میں جاتی ہے اور یوں بہت سارے پیہماتی ہے اور اب وہ اتنی خوبصورت نہیں رہی تھی جتنی پہلے تھی۔ چنانچہ اس کی آمدنی بھی پہلے کی نسبت کم ہو گئی ہے۔

ہمارے سامنے جو یہودی رہتے تھے۔ ان کے متعلق مسز ڈی سلوا کے مختلف

بیان تھے۔ کبھی وہ کہتی تھی کہ موٹی موذیل جو رات کو دیر سے گھر آتی ہے۔ سڑکیلیاتی ہے اور وہ صبح ٹھنڈا سا بڈھا جو اپنی پتلون کے گیسٹون میں انگوٹھے اٹکائے اور کوٹ کا ندھے پر رکھے صبح گھر سے نکل جاتا ہے اور شام کو لوٹتا ہے موذیل کا پرانا دوست ہے۔ اس بڈھے کے متعلق اس نے یہ کھوج لگا کر معلوم کیا تھا کہ صابن بناتا ہے جس میں تیجی بہت زیادہ ہوتی ہے۔

ایک دن اس نے ہمیں بتایا کہ موذیل نے اپنی لڑکی کی جو بہت خوبصورت ہے اور ہر روز نیلے رنگ کا جم پین کر سکول جاتی ہے اس آدمی سے منگنی کر رکھی ہے جو ہر روز ایک پارسی کو موٹر میں لیکر آتا ہے۔ اسی پارسی کے متعلق میں اتنا جانتی ہوں کہ اس کی موٹر ہمیشہ نیچے کھڑی رہتی تھی اور وہ موذیل کی لڑکی کے منگیتر سمیت رات وہیں بسر کرتا تھا۔ مسز ڈی کو سنا کا بیان یہ تھا کہ موذیل کی لڑکی فلوری کا منگیتر پارسی کا موٹر ڈرائیور ہے اور یہ پارسی اپنے موٹر ڈرائیور کی بہن لٹی کا عاشق ہے جو اپنی چھوٹی بہن وانٹ سمیت اسی فلیٹ میں رہتی تھی۔ وانٹ کے متعلق مسز ڈی کو سنا کی رائے بہت خراب تھی۔ وہ کہا کرتی تھی کہ یہ لونڈیا جو ہر وقت ایک ننھے بچے کو اٹھائے رہتی ہے۔ بہت برے کریکٹر کی ہے اور اس ننھے بچے کے متعلق اس نے ایک دن ہمیں یہ خبر سنائی تھی کہ جیسا مشہور کیا گیا ہے وہ کسی پارسن کا لاوارث بچہ نہیں بلکہ خود وانٹ کی بہن لٹی کا ہے اور جو لٹی ہے بس مجھے اتنا ہی یاد رہا ہے کیونکہ جو شجرہ مسز ڈی کو سنا نے تیار کیا تھا اتنا لمبا تھا کہ شاید ہی کسی کو دو بارہ یاد رہ سکے۔

صرف آس پاس کی عورتوں اور پردوں کے مردوں تک مسز ڈی کو سنا کی معلومات محدود نہیں تھیں۔ اسے دوسرے محلے کے لوگوں کے متعلق بھی بہت سی

باتیں معلوم تھیں چنانچہ جب وہ اپنے سوچے ہوئے پیر کا علاج کرانے کی غرض سے باہر جاتی تو گھر لوٹتے ہوئے دوسرے محلوں کی بہت سی خبریں لاتی تھی۔

ایک روز جب مسز ڈی کو سامیرے بچے کی پیدائش کا انتظار کر کے تھک چکی تھی۔ میں نے اسے باہر پھانک کے قریب دو بڑے لڑکوں ایک لڑکی اور پڑوس کی دو عورتوں کے ساتھ باتوں میں مصروف دیکھا۔ یہی خیال کر کے جی ہی جی میں بہت کڑھی کہ میرے بچے کے لیٹ ہو جانے کے متعلق باتیں ہو رہی ہوں گی۔

چنانچہ جب اس نے گھر کا رخ کیا تو میں جنگلے سے پرے ہٹ گئی مگر اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ سیدھی اوپر چلی آئی۔ میں نے دروازہ کھول کر اسے باہر بالکنی ہی میں مونڈھے پر بٹھا دیا۔ مونڈھے پر بیٹھتے ہی اس نے ہمہنی کی اردو اور گرائمر سے بے نیاز انگریزی میں کہنا شروع کیا ووٹم نے کچھ سنا؟..... مہاتما گاندھی نے کیا کیا..... الی کا گرس ایک نیا قانون پاس کرنا مانگی ہے۔ میرا فریڈرک خبر لایا ہے کہ ہمہنی میں پروفیشن ہو جائے گی۔ تم سمجھتا ہے پروفیشن کیا ہوتی ہے؟

میں نے اعلیٰ کا اظہار کیا کیونکہ جتنی انگریزی مجھے آتی تھی اس میں پروفیشن کا لفظ نہیں تھا۔ اس پر مسز ڈی کو سنانے کہا ”پروفیشن شراب بند کر دینے کو کہتے ہیں ہم پوچھتا ہے کہ اس کا گرس کا ہم نے کیا بگاڑا ہے کہ شراب بند کر کے ہم کو تنگ کرنا مانگی ہے۔ یہ کیسی گونمنٹ ہے۔ ہم کو ایسی بات ایک دم اچھی نہیں لگتی۔

ہمارا تہوار کیسے چلے گا۔ ہم کیا کریں گے۔ سکی ہمارے تہواروں میں ہونا ہی مانگتا ہے۔ تم سمجھتی ہونا؟ کرمس کیسے ہوگا؟..... کرچین لوگ تو اس لاء کو نہیں مانے گا۔ کیسے مان سکتا ہے۔ میرے گھر میں چوبیس کلاک (گھنٹے) برانڈی کی ضرورت

رتتی ہے۔ یہ لاء پاس ہو گیا تو کام کیسے چلے گا..... ب کچھ گاندھی کر رہا ہے.....
گاندھی جو محمد ن لوگ کا ایک دم پیری ہے..... سال آپ تو پیتا نہیں اور دھروں کو
پینے سے روکتا ہے اور تمہیں مالوم ہے یہ ہم لوگوں کا میرا مطلب ہے گورنمنٹ کا
بہت بڑا ایجنسی (ڈٹمن) ہے۔“

اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انگلستان کا سارا تپہ مسز ڈی کو سنا کے اندر رہا گیا
ہے۔ وہ گوا کی رہنے والی کالے رنگ کی کرچین عورت تھی مگر جب اس نے یہ
باتیں کیں تو میرے تصور نے اس پر سفید چمڑی منڈھ دی۔ چند لمحات کے لیے وہ
یورپ سے آئی ہوئی تازہ تازہ انگریز عورت دکھائی دی جسے ہندوستان اور اس کے
مہاتما گاندھی سے کوئی واسطہ نہ ہو۔

سمندر کے پانی سے نمک بنانے کی تحریک مہاتما گاندھی نے شروع کی تھی۔
چونکہ چرچہ چلا نا اور کھل کر پہننا بھی اسی نے لوگوں کو سکھایا تھا۔ اس قسم کی اور بہت
سی اوٹ پناگ باتیں وہ کر چکا تھا۔ شاید اسی لیے مسز ڈی کو سنانے یہ سمجھا تھا کہ
بہینی میں شراب صرف اس لیے بند کی جا رہی ہے کہ انگریز لوگوں کو تکلیف ہو۔ وہ
کانگریس اور مہاتما گاندھی کو ایک ہی چیز سمجھتی تھی یعنی لٹوئی۔

مہاتما گاندھی اور اس کی ہشت پشت پر لعنتیں بھیج کر مسز ڈی کو سنا اصل بات
کی طرف متوجہ ہوئی ”اور ہاں یہ تمہارا بچہ کیوں پیدا نہیں ہوتا۔ چلو میں تمہیں کسی
ڈاکٹر کے پاس لے چلوں۔“

میں نے اس وقت بات مال دی۔ مگر مسز ڈی کو سنا گھر جاتے ہوئے پھر مجھ
سے کہا ”دیکھو تم کو کچھ ایسا ویسا بات ہو گیا تو پھر ہم کونہ بولنا۔“

اس سے دوسرے روز کا واقعہ ہے کہ صاحب بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ مجھے خیال آیا کئی دنوں سے میں نے مسز کاظمی کو ٹیلیفون نہیں کیا۔ اس کو بھی بچے کی پیدائش کا بہت خیال ہے۔ اس وقت فرصت ہے اور مذیر صاحب کا دفتر جوان کے گھر کے ساتھ ہی ملحق ہے بالکل خالی ہو گا کیونکہ چھ بج چکے تھے۔ اٹھ کر ٹیلیفون کر دینا چاہیے۔ یوں میٹرھیاں اترنے اور چڑھنے سے ڈاکٹر صاحب اور تجربہ کار عورتوں کے مشورہ پر عمل بھی ہو جائے گا۔ جو یہ تھا کہ چلنے پھرنے سے بچ آسانی کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ میں اپنے پیدا ہونے والے بچے سمیت اٹھی اور آہستہ آہستہ میٹرھیاں چڑھنے لگی۔ جب پہلی منزل پر پہنچی تو مجھے زس ڈی کوٹا کا بورڈ نظر آیا اور بیشتر اس کے کہ میں اس کے فلیٹ کے دروازے سے گزر کر دوسری منزل کے پہلے زینے پر قدم رکھوں۔ مسز ڈیکوٹا باہر نکل آئی اور مجھے گھر لے گئی۔

میرا دم پھولا ہوا تھا اور پیٹ میں آتشیں سی پیدا ہو گئی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ریز کی گیند ہے جو کہیں انگ گئی ہے۔ اس سے بڑی الجھن پیدا ہو رہی تھی۔ میں نے ایک بار اس تکلیف کا ذکر اپنی ساس سے کیا تھا تو اس نے مجھے بتایا تھا کہ بچے کی مانگ ادھر ادھر بھنس جایا کرتی ہے۔ چنانچہ یہ مانگ مانگ ہی بٹنے سے کہیں بھنس گئی تھی۔ جس کے باعث مجھے بڑی تکلیف ہو رہی تھی۔

میں نے مسز ڈی کوٹا سے کہا مجھے ایک ضروری ٹیلیفون کرنا ہے۔ اسی لیے میں آپ کے یہاں نہیں بیٹھ سکتی اور بہت سے چھوٹے بہانے میں نے پیش کیے۔ مگر وہ نہ مانی اور میرا بازو پکڑ کر اس نے زبردستی مجھے اس صوفے پر بٹھا دیا جس کا کپڑا بہت میلا ہو رہا تھا۔

مجھے صوفے پر بٹھا کر جلدی جلدی اس نے دوسرے کمرے سے اپنے وہ چھوٹے لڑکوں کو باہر نکالا۔ اپنی کنواری جوان لڑکی کو جو مہاتما گاندھی کی لنگوٹی سے کچھ بڑی نیکر پہنتی تھی۔ اس نے باہر بھیج دیا اور مجھے خالی کمرے میں لے گئی۔ اندر سے دروازہ بند کر کے اس نے میری طرف افریقی جاوے کی طرح دیکھا جس نے الہ دین کا چچا بن کر اسے غار میں بند کر دیا تھا۔

یہ سب کچھ اس نے اتنی پھرتی سے کیا کہ مجھے وہ بہت پر اسرار دکھائی دے رہی تھی۔ سوچے ہوئے دیر کے باعث اس کی چال میں خفیف سا انگڑاپن پیدا ہو گیا تھا جو مجھے اس وقت بہت بھیا تک دکھائی دیا۔

میری طرف گھور کر دیکھنے کے بعد اس نے ادھر دیوار کی تینوں کھڑکیاں بند کر دیں۔ ہر کھڑکی چٹختی چڑھتا کر اس نے میری طرف اس انداز سے دیکھا گویا اسے اس بات کا ڈر ہے کہ میں اٹھ کر بھاگوں گی۔

ایمان کی کہوں اس وقت میرا جی چاہتا تھا کہ دروازہ کھول کر بھاگ جاؤں اس کی خاموشی اور اس کے کھڑکیاں دروازے بند کرنے سے میں بہت پریشان ہو گئی تھی آخر اس کا مطلب کیا تھا؟ وہ چاہتی کیا تھی؟ اتنے زبردست تھپے کی کیا ضرورت تھی؟ اور پھر..... وہ لاکھ پڑوسن تھی اس کے ہم پر کئی احسان تھے لیکن آخر وہ تھی تو ایک غیر عورت اور اس کے بیٹے..... وہ موافجی اور وہ کھف لگی پتلون والا جو چھوٹی چھوٹی کرچین لڑکیوں سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا تھا..... اپنے اپنے ہوتے ہیں اور پر پائے پر پائے..... میں کئی عشقیتاؤلوں میں کنینوں کا حال پڑھ چکی تھی۔ اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ وہ نرس ورس بالکل نہیں ہے۔ بلکہ بہت

بڑی کتنی ہے۔ کھڑکیاں اور دروازے بند ہونے کے باعث کمرے میں جس کے اندر لوہے کے چار پلنگ پڑے تھے کافی اندھیرا ہو گیا تھا۔ جس سے مجھے اور بھی وحشت ہوئی۔ مگر اس نے فوراً ہی ہٹن دبا کر روشنی کر دی۔

”سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ میرے ساتھ کیا کرے گی۔ پر اسرار طریقے سے اس نے آتش دان سے ایک بوتل اٹھائی جس میں سفید رنگ کا سیال مادہ تھا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگی ”اپنا بلاؤ زاتارہ..... میں کچھ دیکھنا چاہتی ہوں۔“

میں گھبرا گئی ”کیا دیکھنا چاہتی ہو؟“

اوپر سے سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ پھر بلاؤ زاتروانے کا کیا مطلب تھا اور اسے کیا حق حاصل تھا کہ وہ دوسری عورتوں کو یوں گھر کے اندر بلا کر بلاؤ زاتروانے پر مجبور کرے۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا ”مسز ڈی کو سنا میں بلاؤ زاتر گز نہیں آتا رہوں گی“ میرے لہجے میں گھبراہٹ کے علاوہ تیزی بھی تھی۔

”مسز ڈی کو سنا کارنگ زرد پڑ گیا۔“ تو..... تو..... ہم کو معلوم کیسے ہو گا کہ تمہارے گھر میں بچہ کب ہو گا..... اس بوتل میں کھوپرے کا تیل ہے۔ یہ ہم تمہارے پیٹ پر گر کر دیکھے گا..... اس سے ایک دم معلوم ہو جائے گا کہ بچہ کب ہو گا..... لڑکی ہوگی یا لڑکا۔“

میری گھبراہٹ دور ہو گئی۔ مسز ڈی کو سنا مجھے مسز ڈی کو سنا نظر آنے لگیں۔

کھوپری کا تیل بڑی بے ضرر چیز ہے۔ پیٹ پر اگر اس کی پوری بوتل بھی انڈیل دی جاتی تو کیا حرج تھا اور پھر ترکیب کتنی دلچسپ تھی۔ اس کے علاوہ اگر میں نہ مانتی تو مسز ڈی کو سنا کو کتنی بڑی ناامیدی کا سامنا کرنا پڑتا مجھے ویسی بھی کسی

کی دل شکنی منظور نہیں ہوتی چنانچہ میں مان گئی۔ بلاؤز اور قمیص اتارنے میں مجھے کافی کوفت ہوئی۔ مگر میں نے برداشت کر لی غیر عورت کی موجودگی میں جب میں نے اپنا پھولا ہوا پیٹ دیکھا جس کے نچلے حصے پر اس طرح کے ال ال نشان بنے ہوئے تھے جیسے رشی کپڑے میں چرمیں پڑ پڑ جائیں تو مجھے ایک عجیب قسم کا حجاب محسوس ہوا۔ میں نے چاہا کہ فوراً کپڑے پہن لوں اور وہاں سے چل دوں۔ لیکن سز ڈی کو سنا کا وہ ہاتھ جس میں کھوپرے کے تیل کی بوتل تھی اٹھ چکا تھا۔ میرے پیٹ پر ٹھنڈے تیل کی ایک گلیمر دوڑ گئی۔ سز ڈی کو سنا خوش ہو گئی۔ میں نے جب کپڑے پہن لیے تو اس نے مضمئن لہجہ میں کہا ”آج کیا ڈیٹ ہے؟ گیارہ گیارہ بس پندرہ کو بچہ ہو جائے گا اور لڑکا ہوگا۔“

بچہ ۲۵ تاریخ کو ہوا لیکن تھا لڑکا اب جب کبھی وہ میرے پیٹ پر اپنے ننھے ننھے ہاتھ رکھتا ہے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سز ڈی کو سنا نے کھوپرے کے تیل کی ساری بوتل انڈیل دی ہے۔

☆☆☆

مسٹر حمیدہ

رشید نے پہلی مرتبہ اسے بس اسٹینڈ پر دیکھا..... جہاں وہ شید کے نیچے کھڑی
بس کا انتظار کر رہی تھی..... رشید نے جب اسے دیکھا تو ایک لمبے کے لیے حیرت
میں گم ہو گیا..... اس سے قبل اس نے کوئی ایسی لڑکی نہیں دیکھی تھی جس کے چہرے
پر مردوں کی مانند ڈاڑھی اور مونچھیں ہوں۔

پہلے رشید نے سوچا کہ شاید اس کی ڈکاہوں نے غلطی کی ہے۔ عورت کے
چہرے پر بال کیسے اگ سکتے ہیں..... پر جب اس نے غور سے دیکھا تو اس لڑکی
نے باقاعدہ شیو کر رکھی تھی اور سر منی غبار اس کے گالوں اور ہونٹوں پر موجود تھا۔

رشید سمجھا کہ شاید مہجڑہ ہو مگر نہیں..... وہ مہجڑہ نہیں تھی..... اس لیے کہ اس میں
مہجڑوں کی سی مصنوعی نسوانیت کے کوئی آثار نہیں تھے..... وہ مکمل عورت تھی.....
ناک نقشہ بہت اچھا تھا..... کوہلے چوڑے چکلے..... کمر پتلی سینہ جوانی سے
بھرپور..... بازو سڈول..... غرضیکہ اس کے جسم کا ہر عضو اپنی جگہ پر نسوانیت کا عمدہ
نمونہ تھا۔

ایک طرف اس کی ڈاڑھی اور مونچھوں نے سب کچھ غارت کر دیا تھا..... رشید
سوچنے لگا..... قدرت کی یہ کیا قسم ظریفی ہے کہ ایک اچھی بھلی نوجوان خوبصورت
لڑکی کو بد نما بنا دیا۔

رشید کے دماغ میں کئی خیال اوپر تلے آئے اور وہ بوکھلا گیا۔
وہ سوچتا تھا۔

”کیا اس لڑکی کی زندگی اجیرن ہو کے نہیں رہ گئی؟“

”صبح اٹھ کر جب اسے استرا پکڑ کر شیو کرنا پڑتی ہوگی تو اسے کیا محسوس ہوتا ہو گا..... کیا اس وقت اس کے جی میں جھنجھلا کر انتقامی خواہش پیدا نہ ہوتی ہوگی کہ وہ گھس گھس کی طرح اپنے گال اور ہونٹ چھیل ڈالے۔“

ایک عورت کے لیے یہ کتنا بڑا عذاب ہے کہ خار پشت کی مانند اس کے گالوں پر دوسرے روز نوکیلے بال اگ آئیں۔

اگر مردوں کی مانند عورتوں کے بھی ڈاڑھی مونچھ آگئی تو کوئی حرج نہیں تھا پر یہاں ازل سے عورتیں ان بالوں سے بے نیاز ہی رہی ہیں۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں..... عورتوں کے چہرے پر بالوں کا ہونا کوئی معیوب چیز نہیں..... لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ ہم لوگ دیکھنے کے عادی نہیں۔

صنف مازک آخر صنف مازک ہے..... اس میں کوئی شک نہیں..... اس لڑکی میں نسوانیت کے تمام جوہر موجود ہیں۔ پھر یہ ڈاڑھی مونچھ کس لیے اگ آئی ہے..... نظر بنو کے طور پر..... اس کی کوئی تشریح و توضیح تو ہونی چاہیے بیکار میں ایک خوبصورت شے کو بھونڈا بنا دیا..... یہ کہاں کی شرافت ہے۔

اب ایسی لڑکی سے شادی کون کرے گا۔ جو ہر روز صبح سویرے اٹھ کر استرا ہا تھ میں پکڑ کر شیو کر رہی ہو۔

اگر یہ لڑکی مونچھیں نہ مونڈے اور انہیں بڑھالے..... سے خوف نہیں آئے گا..... آپ بے ہوش نہ ہوں لیکن چند لمحات کے لیے آپ کے ہوش و حواس ضرور جواب دے جائیں گے..... آپ اپنے ہونٹوں پر انگلیاں پھیریں گے جہاں

موچھیں منڈی ہوں گی..... مگر آپ کی صنف مقابل اپنی موچھوں کو تاؤ دے رہی ہوگی۔

تھوڑی دیر کے بعد جب وہ لڑکی وک ایک نظر دیکھنے کیلئے پلانا تو وہ موجود نہیں تھی۔

اس کا ذہن اس قدر مضطرب تھا کہ اس نے اپنا کام ملتوی کر دیا اور گھر چلا آیا اپنے کمرے میں بستر پر لیٹ کر اس نے مزید سوچ و چار شروع کر دی۔

اس کو اس لڑکی پر بہت ترس آ رہا تھا..... بار بار وہ قدرت کی بے رحمی پر لعنتیں بھیجتا تھا کہ اس نے کیوں نسوانیت کے اتنے اچھے اور خوبصورت نمونے کو خود ہی بنا کر اس پر سیاہی کا لپ کر دیا..... آخر اس میں کیا مصلحت تھی..... اب اس شکل میں اس سے شادی کون کرے گا..... قدرت نے کیا کوئی ایسا مرد پیدا کر رکھا ہے جو اسے قبول کر لے گا..... لیکن وہ سوچتا کہ قدرت اتنی دور اندیش نہیں ہو سکتی۔

اس کی بہن آئی..... دوپہر ہو چکی تھی..... اس نے رشید سے کہا۔
”بھائی جان..... چلیے کھانا کھا لیجیے۔“

رشید نے اس کی طرف غور سیدیکھا اور یوں محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر بھی بال ہیں۔

”سلیم.....“

”جی.....“

”کچھ نہیں..... لیکن میں ٹھہرو..... کیا تمہاری موچھیں ہیں۔“

سلیمہ جھینپ گئی۔

”جی ہاں..... بال اگتے ہیں۔“

رشید نے اس سے پوچھا ”تو..... میرا مطلب ہے تمہیں الجھن نہیں ہوتی ان بالوں سے۔“

سلیمہ نے اور زیادہ جھینپ کر جواب دیا ”ہوتی ہے بھائی جان۔“

”تو انہیں تم صاف کیسے کرتی ہو..... بلیڈ سے۔“

”جی نہیں..... ایک چیز ہے جسے بے نی ٹیج کہتے ہیں..... اس کو جموڑی دیر ہونتوں پر گھسانا پڑتا ہے۔“

”تو بال اڑ جاتے ہیں۔“

”اڑتے وڑتے خاک بھی نہیں..... دوسرے تیسرے روز پھر نمودار ہو جاتے ہیں بڑی مصیبت ہے..... بعض اوقات آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔“

رشید نے پوچھا۔

”وہ کیوں؟“

سلیمہ نے دردناک لہجے میں جواب دیا۔

”تکلیف ہوتی ہے بہت..... جب بال اکھڑتے ہیں تو چھینکیں آتی ہیں..... اور چھینکوں کے ساتھ آنکھوں میں پانی اتر آتا ہے..... معلوم نہیں اللہ میاں مجھ سے کن گناہوں کی سزا لے رہا ہے۔“

رشید نے جموڑے توقف کے بعد اپنی بہن سے پوچھا ”تمہاری کسی اور سہیلی کی بھی ڈارھی اور مونچھیں ہیں۔“

”موچھیں تو کئی لڑکیوں کی دیکھی ہیں پر ڈارھسی میں کبھی کسی عورت کے چہرے پر نہیں دیکھی..... ایک دو بال ٹھوڑی پر دیکھنے میں آئے ہیں جو وہ موچنے یا ہاتھ سے اکھاڑ پھینکتی ہیں..... یہ آپ نے کیسی گفتگو شروع کر دی..... چلیے کھانا کھا لیجیے۔“

رشید نے کچھ دیر سوچا۔

”نہیں..... میں آج کھانا نہیں کھاؤں گا..... میرا معدہ ٹھیک نہیں ہے۔“
رشید کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس نے بالوں کی پڈنگ کھانی ہے جو ہضم ہونے میں ہی نہیں آتی..... اس کے سارے جسم پر تیز تیز نوکیلے بال یوں رینگ رہے تھے جیسے خاردار جیوٹنیاں۔

جب سلیمہ چلی گئی تو رشید نے پھر سوچنا شروع کر دیا..... لیکن سوچنے سے کیا ہو سکتا تھا..... اس لڑکی کے چہرے کے بال تو وہ نہیں ہو سکتے تھے اس امر کا رشید کو کامل یقین تھا لیکن پھر بھی وہ سوچے چلا جا رہا تھا..... جیسے وہ کوئی بہت بڑا معمہ حل کر رہا ہو۔

رشید کو داغی کی درخواست دینا تھی..... اس نے بی کا امتحان راولپنڈی سے پاس کیا تھا۔ اب وہ چاہتا تھا کہ لاہور کے کسی کالج میں داخل ہو جائے اور ایم اے کی ڈگری حاصل کرے اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان چلا جائے جہاں اس کے والد پر اٹھری کونسل میں پریکٹس کرتے ہیں۔

اس روز موچھوں اور ڈارھسی والی لڑکی کے باعث نہ جا سکا۔ دوسرے روز وہ بس سینڈ کے بجائے ٹانگے میں گیا..... اس نے چونکہ بی اے کا امتحان اچھے

نمبروں سے پاس کیا تھا اس لیے اسے داخلے میں کوئی وقت محسوس نہ ہوئی۔
وہ ڈاڑھی مونچھوں والی لڑکی اب رشید کے دل و دماغ سے قریب قریب محو ہو
چکی تھی..... لیکن ایک دن اس نے اس کو کالج میں دیکھا..... لڑکے اس کا مذاق اڑا
رہے تھے۔

ایک نے آواز نہ کرا۔

”مسٹر حمیدہ.....“

دوسرے نے کہا۔

”ایک ٹکٹ میں دو مزے ہیں..... عورت کی عورت اور مرد کا مرد.....“

تیسرے نے قہقہہ لگایا۔

”عجائب گھر میں رہنا چاہیے تھا ایسی شخصیت کو.....“

اور وہ بیچاری خفیف ہو رہی تھی..... اس کی پیشانی پسینے سے تر تھی..... رشید کو
اس پر بہت ترس آیا..... اس کے جی میں آئی کہ آگے بڑھ کر ان تمام لڑکوں کا سر
پھوڑ دے جو اس کا مذاق اڑا رہے تھے مگر وہ کسی مصلحت کی بنا پر خاموش رہا۔
جب لڑکے چلے گئے اور اس لڑکی نے اپنے دوپٹے سے آنکھوں میں اندے
ہوئے آنسو خشک کیے تو وہ جرات سے کام لے کر اس کے پاس گیا اور بڑے ملائم
لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔

”آپ یہاں کس کلاس میں پڑھتی ہیں؟“

اس نے تھک آ کر کہا۔

”کیا آپ بھی میرا مذاق اڑانے آئے ہیں؟“

رشید نے اپنا لہجہ اور ملائم کر دیا..... ”جی نہیں..... آپ مجھے اپنا دوست سمجھ کر یقین کیجیے۔“

اس نے جس کا نام حمیدہ تھا..... نفرت کی نگاہوں سے رشید کو دیکھا۔
”مجھے کسی دوست کی ضرورت نہیں۔“

”یہ آپ کی زیادتی ہے..... ہر شخص کو دوست اور ہمدرد کی ضرورت ہوتی ہے..... میں اس وقت مناسب نہیں سمجھتا کہ آپ کے مضطرب دماغ کو اپنی باتوں سے اور زیادہ مضطرب کر دوں..... ویسے میں آپ سے پھر درخواست کرتا ہوں کہ مجھے اپنا دوست سمجھ کر یقین کیجیے۔“
یہ کہہ کر رشید چلا گیا۔

اس کے بعد متعدد مرتبہ اس نے حمیدہ کو دیکھا۔ جو بی اے میں پڑھتی تھی سارے کالج میں اس کی ڈاڑھی مونچھوں کے چرچے تھے..... لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ لڑکوں کی آوازہ بازی کی عادی ہو چکی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب میں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ اس کے چہرے پر کوئی ہل نہیں ہے۔
وہ ہوٹل میں رہتی تھی۔ ایک دفعہ وہ شدید طور پر بیمار ہو گئی دس پندرہ دن تک بستر پر لیٹا پڑا..... رشید نے کئی بار ارادہ کیا کہ اس کی بیمار پرستی کے لیے جائے مگر اس کو یہ خطرہ لاحق تھا کہ وہ مشتعل ہو جائے گی کیونکہ اسے کسی کی ہمدردی پسند نہ تھی۔

وہ چاہتی تھی کہ اس کی کشتی ٹوٹی پھوٹی جیسی بھی ہے اسے اس کے سوا اور کوئی کھینے والا نہ ہو..... لیکن ایک دن مجبور ہو کر اس نے چڑا سی کے ہاتھ ایک رقعہ رشید

کے نام بھیجا..... جس میں چند یہ الفاظ مرقوم تھے۔
”رشید صاحب!“

میں بیمار ہوں..... کیا آپ چند لمحات کے لیے میرے کمرے میں تشریف لا
سکتے ہیں۔ ممنون و مشکور ہوں گی.....“
حمیدہ رشید یہ رقعہ ملتے ہی ہوشل پلا گیا..... بڑی مشکل سے حمیدہ کا کمرہ
تلاش کیا۔

اندر داخل ہوا تو اس نے پہلے یہ سمجھا کہ کوئی مرد جس نے کئی دنوں سے شیونیس
کی..... کمبل اوڑھے لیٹا ہے..... مگر اس نے اپنا رد عمل ظاہر نہ ہونے دیا۔
چارپائی کے ساتھ ہی کرسی پر بیٹھی تھی۔ رشید اس پر بیٹھ گیا۔
حمیدہ مسکرائی۔

”میں نے آپ کو اس لیے تکلیف دی ہے کہ مجھے بخار کے باعث نقاہت ہو
گئی ہے اور شیونیس کر سکی..... کیا آپ میرے لیے یہ زحمت برداشت کریں
گے۔“

رشید نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا..... شیونیکا سامان کھڑکی کی سل پر موجود
تھا۔

کینٹین سے گرم پانی لا کر اس نے حمیدہ کے چہرے کے بال نرم کیے صابن
ملا..... اچھی طرح جھاگ پیدا کیے اور پھر پانچ منٹ کے اندر اندر شیونیکا بنا ڈالی۔
پھر تو لیے سے اس کا چہرہ خشک کیا اور شیونیکا سامان صاف کرنے کے بعد وہیں
رکھ دیا جہاں سے اٹھایا تھا۔

حمیدہ نے اپنا نجف ہاتھ گالوں پر پکیرا..... اور پھر رشید سے کہا۔
”شکریہ.....“

اب دونوں ایک دوسرے کے دوست ہو گئے۔
رشید نے ایم اے اور حمیدہ نے بی اے پاس کر لیا..... رشید کو فوراً بڑی اچھی
ملازمت مل گئی۔

اب وہ ایک تیس روزانہ دوشیو بناتا تھا۔

☆☆☆

اختتام..... حصہ چہارم

فہرست

مصری کی ڈلی
مد بھائی
ممی
منتر
موم بتی کے آنسو
موچنا
موسم کی شرارت
میر اور اس کا انتقام
میرا ہم سفر
میرٹھ کی قینچی
نامکمل تحریر
نعرہ
نکلی
نگلی آوازیں
نیا سال
نیا قانون
وہ لڑکی
وہ خط جو پوسٹ نہ کیے گئے
ہتک
ہینڈ

مصری کی ڈلی

پچھلے دنوں میری روح اور میرا جسم دونوں علییل تھے۔ روح اس لیے کہ میں نے دفعتاً اپنے ماحول میں خوفناک ویرانی کو محسوس کیا تھا اور جسم اس لیے کہ میرے تمام پٹھے سردی لگ جانے کے باعث چوٹی تختے کے مانند اکڑ گئے تھے۔ دس دن تک میں اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹا رہا۔ پلنگ..... اس چیز کو پلنگ ہی کہہ لیجیے جو لکڑی کے چار بڑے بڑے پائیوں پندرہ بیس چوٹی ڈنڈوں اور ڈیڑھ من وزنی مستطیل آہنی چادر پر مشتمل ہے۔ لوہے کی بھاری بھر کم چادر نواز اور سوتلی کا کام دیتی ہے۔ اس پلنگ کا فائدہ یہ ہے کہ کھٹل دور رہتے ہیں اور یوں بھی کافی مضبوط ہے یعنی صدیوں تک قائم رہ سکتا ہے۔

یہ پلنگ میرے پڑوسی سلیم صاحب کا عنایت کردہ ہے۔ میں زمین پر سوتا تھا چنانچہ انہوں نے مجھے یہ پلنگ جو انہیں کمرے کے ساتھ ہی ملا تھا مجھے دے دیا تاکہ میں سخت فرش پر سونے کے بجائے لوہے کی چادر پر آرام کروں۔ سلیم صاحب اور ان کی بیوی کو میرا بہت خیال ہے اور میں انکا بہت ممنون ہوں۔ اگر میں معمولی سے معمولی چار پائی بھی بازار سے لیتا تو کم از کم چار پانچ روپے خرچ ہو جاتے۔

خیر چھوڑیے! اس قصے کو۔ میں یہ بات کر رہا تھا کہ پچھلے دنوں میری روح اور میرا جسم دونوں علییل تھے۔ دس دن اور دس راتیں میں نے جیسے خلا میں بسر کیں۔ جس کی تفصیل میں بیان ہی نہیں کر سکتا۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں ہونے اور نہ

ہونے کے سچ میں کہیں لٹکا ہوا ہوں۔ لوہے کے پلنگ پر لیٹے لیٹے یوں بھی میرا جسم بالکل شل ہو گیا تھا۔ دماغ ویسے ہی منجمد تھا جیسے یہ کبھی تھا ہی نہیں۔ میں کیا عرض کروں میری کیا حالت تھی۔

دس دن اس بیہوش ناک خلا میں رہنے کے بعد میرے جسم کی علالت دور ہو گئی۔

دس کا عمل تھا۔ دھوپ سامنے کا رخانے کی بلند چمنی سے پہلو بچاتی کمرے کے فرش پر لیٹ رہی تھی۔ میں لوہے کے پلنگ پر سے اٹھا۔ تھکے ہوئے جسم میں انگڑائی سے حرکت پیدا کرنے کی کوشش کی بعد جب میں نے کمرے میں نگاہ دوڑائی تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کمرہ وہ نہیں تھا جو پہلے ہوا کرتا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ دائیں ہاتھ کوٹنے میں ڈریسنگ ٹیبل تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسا میز ہمارے کمرے میں ہوا کرتا تھا مگر اس کا پالش اتنا چمکیا ابھی نہیں تھا اور بناوٹ کے اعتبار سے بھی اس میں اتنی خوبیاں ہیں نے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ کمرے کے وسط میں پڑا میز رہتا تھا۔ وہ بھی مجھے نامانوس معلوم ہوا۔ اس کا بالائی ہشت پہلو تختہ چمک رہا تھا۔ دیوار پر پانچ چھ تصویریں آویزاں تھیں جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔

ان میں سے ایک تصویر پر میری نگاہیں جم گئیں۔ میں بڑھا اور اس کے قریب سے دیکھا۔ جدید فوٹو گرافی کا بہت عمدہ نمونہ تھا۔ بال کٹے ہوئے تھے اور کانوں پر سے ادھر کواڑ رہے تھے۔ سینہ سامنے ناف کے ننھے سے دباؤ تک نکلا تھا۔ اس نرم و نازک عریانی کو اس کی گوری بانیں جو اس کے چہرے تک اٹھی ہوئی تھیں چھپانے

کی دلچسپ کوشش کر رہی تھیں۔ پتلی پتلی لمبے ناخنوں والی انگلیوں میں سے چہرے کی حیا چھن چھن کر باہر آرہی تھی۔ کہنیوں نے ننھے سے پیٹ کے اختتامی خط آپس میں جڑ کر ایک دل کش تکون بنا دی تھی جس میں سے ناف کا گدگدا گدّا جھانک رہا تھا۔ اگر اس چھوٹے سے گڈھے میں ڈنڈی گاڑی دی جاتی تو اس کا پیٹ سیب کا بالائی حصہ بن جاتا۔

میں دیر تک اس نیم عریاں و نیم مستور شباب کو دیکھتا رہا۔ مجھے حیرت تھی کہ یہ تصویر کہاں سے آگئی۔ اسی حیرت میں غرق غسل خانے کی طرف بڑھا۔ کمرے کے چوتھے کونے میں ٹل کے نیچے فرش کی سل لگی ہوئی تھی اس کے ایک طرف چھوٹی سی منڈیر بنا دی گئی ہے۔ یہ جگہ جہاں جست کی ایک بائنی صابن دانی، دانتوں کے دو برش، ڈاڑھی مونڈنے کے دو اسٹری، صابن لگانے کی دو کوچیاں، منجن کی بوتل اور پانچ چھ استعمال شدہ اور زنگ آلود بلیڈ پڑے رہتے ہیں۔ ہمارا غسل خانہ ہے۔ منڈیر صاحب جن کا یہ کمرہ ہے علی الصبح بیدار ہونے کے عادی ہیں۔ چنانچہ ڈاڑھی مونڈ کر وہ فوراً ہی غسل سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ میں سویا رہتا ہوں اور وہ مزے سے ننگے نہاتے رہتے ہیں۔

اس غسل خانے کی طرف جاتے ہوئے میں نے ایک بار پھر تمام چیزوں پر نگاہ دوڑائی۔ اب مجھے وہ کسی قدر مانوس معلوم ہوئیں۔ منڈیر پر میرا اسٹراگھسا ہوا برش اسی طرح پڑا تھا جس طرح میں روز دیکھتا تھا۔ بائنی بھی بلا شک و شبہ وہی تھی جو ہر روز نکلا ہوں کے سامنے آتی تھی۔ اس میں ڈونگا بھی وہی تھا جس میں جابجا گڈھوں میں میل جمارہتا تھا۔

منڈیر پر بیٹھ کر جب میں نے برش سے دانت گھسنے شروع کیے تو میں نے سوچا کمرہ وہی ہے جس میں ایک سو بیس راتیں گزار چکا ہوں..... راتیں میں نے غور کیا..... معاملہ صاف ہو گیا۔ کمرے اور اس کی اشیاء کے ماناؤں ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ میں نے اس میں صرف ایک سو بیس راتیں گزاری تھیں۔ صبح سات یا آٹھ بجے جلدی جلدی کپڑے بدل کر جو میں ایک دفعہ باہر نکل جاتا تو پھر رات کو گیارہ بارہ بجے کے قریب ہی لوٹنا ہوتا تھا۔ اس صورت میں یہ کیوں ممکن تھا کہ مجھے کمرے کی ساخت اور اس میں پڑی ہوئی چیزوں کو دیکھنے کا موقع ملتا اور پھر نہ کمرہ میرا ہے اور نہ اس کی کوئی چیز میری ملکیت ہے اور یہ بھی تو سچی بات ہے کہ بڑے شہر انسانیت کے مرقعہ مدفن ہوتے ہیں۔

میں جس ماحول میں چار مہینے سے زندگی بسر کر رہا ہوں اس قدر یکساں اور یک آہنگ ہے کہ طبیعت بار بار اکتا گئی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ یہ شہر چھوڑ کر کسی ویرانے میں چلا جاؤں۔ صبح جلدی جلدی نہانا۔ پھر غلات میں کپڑے پہن کر دفتر میں کاغذ کالے کرتے رہنا وہاں سے شام کو فارغ ہو کر ایک اور دفتر میں چھ سات گھنٹے اسی اکتا دینے والے کام میں مصروف رہنا اور رات کے گیارہ بجے اندھیرے ہی میں کپڑے اتار کر کریم کے دیے ہوئے ہنسی پلنگ پر سونے کی کوشش کرنا..... کیا یہ زندگی ہے؟

زندگی کیا ہے؟..... یہ بھی میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اونی جراب ہے جس کے دھاگے کا ایک سرا ہمارے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے۔ ہم اس جراب کو ادھیڑتے رہتے ہیں۔ جب ادھیڑتے ادھیڑتے دھاگے کا دوسرا سرا

ہمارے ہاتھ میں آجائے تو یہ طلسم جسے زندگی کہا جاتا ہے ٹوٹ جائے گا۔

جب زندگی کے لمحات محسوس ہوں اور حافظے کی تختی پر کچھ نقش چھوڑ جائیں تو اس کا یہ مطلب ہے کہ آدمی زندہ ہے اور اگر مہینوں یہ محسوس تک نہ ہو کہ مہینے گزر گئے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ انسان کی حیات مردہ ہو گئی ہیں۔ زندگی کی کتاب میں اگر اوپر تلے خالی اوراق ہی شامل ہوتے چلے جائیں تو کتنا دکھ ہوتا ہے۔ دوسروں کو بھی اس کا احساس ہوتا ہے یا کہ نہیں اس کی بابت کچھ کہا نہیں جاسکتا لیکن میں تو اس معاملے میں بہت حساس ہوں۔ زندگی کا یہ خالی کاپی جو ہمارے ہاتھ میں تھمائی گئی ہے آخر اسی لیے تو ہے کہ اس کے ہر ورق کو ہم استعمال کریں۔ اس پر کچھ لکھیں لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ مجھے کوئی ایسی بات ہی نہیں ملتی جس کے متعلق کچھ لکھوں۔ لے دے کے میری اس کاپی میں صرف دو تین ورق ایسے ہیں جس پر نقش و نگار بنے دیکھتا ہوں..... یہ ورق مجھے کتنے عزیز ہیں۔ اگر آپ ان کو نوچ کر باہر نکال دیں تو میری زندگی ایک بیابان بن جائے گی۔ آپ یقین کیجیے میری زندگی واقعی ایک چینل میدان کی طرح ہے۔ جس میں ان بیتے دنوں کی یاد ایک خوبصورت قبر کی طرح لیٹی ہوئی ہے۔ چونکہ میں نہیں چاہتا کہ اچھے دنوں کی یہ سہانی یاد مٹ جائے اس لیے میں اس قبر پر ہر وقت مٹی کا لپ کرنا رہتا ہوں۔

میرے سامنے دیوار پر ایک پرانا گلنڈ رنگ رہا ہے جس کے میلے کانڈ پر چیر کے لائے لائے درختوں کی تصویر چھپی ہے۔ میں اسے ایک عرصے سے ٹنگی باندھے دیکھ رہا ہوں۔ اس کے پیچھے دو بہت دور مجھے اپنی زندگی کے اس کھوئے ہوئے نکلنے کی جھلک نظر آرہی ہے۔

میں ایک پھاڑی کے دامن میں چیزوں کی چھاؤں میں بیٹھا ہوں۔ بیگو
بڑے بھولے پن سے گھٹنے ٹیک کر اپنا سر میرے قریب لاتی ہے اور کہتی ہے ”آپ
مانتے ہی نہیں..... سچ میں بوڑھی ہو گئی ہوں۔ اب بھی یقین نہ آئے گا یہ لیجیے
میرے سر میں سفید بال دیکھ لیجیے۔“

چودہ برس کی دیہاتی فضا میں پٹی ہوئی جوان لڑکی مجھ سے کہہ رہی تھی کہ میں
بوڑھی ہو گئی ہوں۔ معلوم نہیں وہ کیوں اس بات پر زور دینا چاہتی تھی۔ اس سے
پہلے بھی وہ کئی مرتبہ مجھ سے یہی بات کہہ چکی تھی۔ میرا خیال ہے کہ جوان آدمیوں کو
شباب کے دائرے سے نکل کر بڑھاپے کے دائرے میں داخل ہونے کی بڑی
خواہش ہوتی ہے۔ یہ میں اس لیے کہتا ہوں کہ میرے دل میں بھی اس قسم کی
خواہش کئی بار پیدا ہو چکی ہے۔ میں نے متعدد بار سوچا ہے کہ میری کنپٹیوں پر اگر
سفید بال نمودار ہو جائیں تو چہرے کی متانت اور سنجیدگی میں اضافہ ہو جائے گا۔
کنپٹیوں پر اگر سفید بال نمودار ہو جائیں تو چاندی کے مہین مہین تاروں کی طرح
چمکتے ہیں اور دوسرے سیاہ بالوں کے درمیان بہت بھلے دکھائی دیتے ہیں ممکن ہے
بیگو کو یہی چاہو کہ اس کے بال سفید ہو جائیں اور وہ اپنی کم عمری کے باوجود بڑھی
دکھائی دے۔

میں نے اس کے خشک مگر نرم بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنا شروع کی اور کہا
”تم کبھی بوڑھی نہیں ہو سکتیں۔“

اس نے سر اٹھا کر مجھ سے پوچھا ”کیوں؟“ میں کیوں بوڑھی نہیں ہو
سکتی۔“

”اس لیے کہ تم آس پاس کے درختوں پہاڑوں اور ان میں بہتے ہوئے
تالوں کی ساری جوانی جذب ہو گئی ہے۔“

وہ زریب سرک آئی اور کہنے لگی ”جانے آپ کیا اوٹ پناگ باتیں کرتے
ہیں..... بھئی میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا..... درختوں اور پہاڑوں کی بھی کبھی
جوانی ہوتی ہے۔“

”تمہاری سمجھ میں آئے نہ آئے میں نے تو جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا۔“
”بہت اچھا کیا آپ نے..... پر آپ میرے بالوں میں اس طرح کرتے
رہیں۔“

بیکو نے ہاتھ سے سر کو کھجاتے ہوئے کہا ”مجھے بڑا مزہ آتا ہے۔“
”بہت اچھا جناب!“ کہہ کر میں نے انگلیوں سے اس کے بالوں میں کنگھی
کرنا شروع کر دی اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس کو تو مزہ آ ہی رہا تھا مجھے خود مزہ آنے
لگا۔ میں یہ محسوس کرنے لگا کہ اس کے بال میرے الجھے ہوئے خیال ہیں جن کو
میں اپنے ذہن کی انگلیوں سے ٹول رہا ہوں۔

دیر تک میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا وہ خاموشی سے سر جھکائے
مزہ لیتی رہی پھر اس نے اپنی خمار آلود نگاہیں میری طرف اٹھائیں اور نیند میں بیگی
ہوئی آواز میں کہا ”میں اگر سو گئی تو؟“
”میں جاگتا رہوں گا۔“

نیم خوابیدہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پیدا ہوئی اور وہ زمین پر وہیں میرے
سامنے لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر بعد نیند نے اس کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

بیگوسو رہی تھی مگر اس کی جوانی جاگ رہی تھی۔ جس طرح سمندر کی پرسکون سطح کے نیچے گرم لہریں دوڑتی رہتی ہیں اسی طرح اس کے مخو خواب جسم کی رگوں میں اس کی گرم گرم جوانی دوڑ رہی تھی۔ بائیں بازو کو سر کے نیچے رکھے اور ٹانگوں کو اکٹھا کیے وہ سو رہی تھی۔ اس کا ایک بازو میری جانب سرکا ہوا تھا۔ میں اس کی پتلی انگلیوں کی خروچی تراش دیکھ رہا تھا کہ ان میں خفیف سی کپکپاہٹ پیدا ہوئی جیسے مٹر کی پھلیاں ارتعاش پذیر ہو جائیں۔ یہ ارتعاش اس کی انگلیوں سے شروع ہوا اور اس کے سارے جسم میں پھیل گیا۔ جس طرح تالاب میں پھینکی ہوئی کنکری اس کی آبی سطح پر چھوٹا سا بھنور پیدا کرتی ہے اور یہ بھنور دائرے بناتا ہوا پھیلتا جاتا ہے اسی طرح وہ کپکپاہٹ اس کی انگلیوں سے شروع ہو کر اس کے سارے جسم پر پھیل گئی۔ نہ جانے اس کی جوانی کیسے ارتعاش پیدا کرنے والے خواب دیکھ رہی تھی۔

اس کے نچلے ہونٹ کے کونوں میں خفیف سی تھر تھراہٹ کتنی بھلی معلوم ہوئی تھی۔ اس کے سینے کے ابھار میں دل کی دھڑکنیں زندگی پیدا کر رہی تھیں۔ گریبان کے نیچے دو بٹن کھلے تھے اس طرح جسم سے تھوڑی سی نقاب اٹھ گئی تھی اور وہ نہایت ہی پیاری قوسیں باہر جھانک رہی تھیں۔ سینے کی ننھی سی واوی میں دونوں طرف کے ابھار بڑی خوبصورتی سے آپس میں مل گئے تھے۔

میری نگاہ اس کے سینے پر کرتے کی ایک طرف بنی ہوئی جیب پر رک گئی۔ اس میں خدا معلوم کیا کیا بیگو نے ٹھونس رکھا تھا کہ وہ ایک گیندی بن گئی تھی۔ میرے دل میں دفعتاً یہ معلوم کرنے کا اشتیاق پیدا ہوا کہ اس میں کیا کیا چیزیں ہیں۔ آہستہ سے اس کی جیب کی تلاشی لینے کا ارادہ جب میں نے کیا تو وہ جاگ پڑی۔

سیدھی لیٹ کر اس نے دھیرے دھیرے اپنی آنکھیں کھولیں۔ لمبی لمبی پلکیں جو آپس میں ملی ہوئی تھیں تھرا تھرائیں۔ اس نے نیم باز آنکھوں سے میری طرف دیکھا پھر اس کے ہونٹوں پر ہلکے سے تبسم نے انگڑائی لی اور کہا ”آپ بڑے وہ ہیں۔“

”کیوں؟..... میں نے کیا کیا ہے؟“

وہ اٹھ بیٹھی ”ابھی آپ نے کچھ کیا ہی نہیں۔ میں سچ مچ سو گئی اور آپ نے مجھے جگانے تک کی تکلیف نہ کی۔ میں اگر ایسے ہی شام تک سوئی رہتی تو؟“ اس نے آنکھوں کی پتلیاں نہچائیں اور دفعتاً کچھ یاد کر کے کہا ”ہائے میرے اللہ..... میں اپنی جان ہیر کو بھول ہی گئی۔“

سامنے پہاڑی پر اگی ہوئی سبز جھاڑیوں کی طرف جب اس نے دیکھا تو اطمینان کا سانس لے کر کہنے لگی ”کتنی اچھی ہے میری ہیر۔“

اس کو اپنی بھینس کی فکر تھی جو ہمارے سامنے پہاڑی پر گھاس چر رہی تھی۔

میں نے اس سے پوچھا ”تمہاری ہیر تو موجود ہے پر رانجھا کہاں ہے۔“

”رانجھا؟“ اس کے لب مسکراہٹ کے ساتھ کھلے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں

اس نے مجھے کچھ بتانے کی کوشش کی اور پھر کل کھلا کر ہنس پڑی ”رانجھا.....

رانجھا..... رانجھا.....“ اس نے یہ لفظ کئی مرتبہ دہرایا۔ ”میری ہیر کا رانجھا..... مجھے

کیا معلوم لگوڑا کہاں ہے؟“

میں نے کہا ”تمہاری ہیر کا کوئی نہ کوئی رانجھا تو ضرور ہوگا۔ مجھ سے چھپنا

چاہتی ہو تو الگ بات ہے۔“

اس میں چھپانے کی بات ہی کیا ہے، بیگو نے آنکھیں مٹا کر کہا ”اور اگر کوئی ہے بھی تو ہیر کو معلوم ہو گا۔۔۔۔۔ جائے اس سے پوچھ لیجئے۔ پر کان میں کہیے گا۔ آہستہ سے کہیے گا۔ بتاؤ تو تمہارا رانجھا کہاں ہے؟“

”میں نے پوچھ لیا۔“

”کیا جواب ملا؟“

”بولی بیگو سے پوچھو وہی سب کچھ جانتی ہے۔“

”جھوٹ۔۔۔۔۔ جھوٹ اس کا اول جھوٹ اور اس کا آخر جھوٹ“ بیگو بچوں کی طرح اچھل اچھل کر کہنے لگی ”میری ہیر تو بڑی شرمیلی ہے۔ ایسے سوالوں کا وہ کبھی جواب دی ہی نہیں سکتی۔۔۔۔۔ آپ جھوٹ بولتے ہیں۔ اس نے تو آپ کو غصے میں یہ کہا تھا چلو ہٹو کنواریوں سے ایسی باتیں کرتے تمہیں شرم نہیں آتی۔“

”یہی کہا تھا اور اس کا جواب اس کو یوں ملا تھا یہ تمہارا تباہ کنچھڑا کہاں سے آ گیا ہے کیا آسمان سے ٹپک پڑا تھا۔“

بیگو یہ منچھڑے والی دلیل سن کر لا جواب ہو گئی۔ مگر چونکہ وہ لا جواب ہونا نہیں چاہتی تھی اس لیے اس نے بیکار پلانا شروع کر دیا ”جی ہاں آسمان سے ٹپکا تھا اور سب چیزیں آسمان ہی سے تو آتی ہیں۔۔۔۔۔ نہیں میں بھولی۔۔۔۔۔ اس منچھڑے کو تو میری ہیر نے گود لیا ہے یہ اس کا بچہ نہیں کسی اور کا ہے۔۔۔۔۔ اب بتائیے آپ کے پاس کیا جواب ہے؟“

میں نے ہار مان لی اس لیے کہ میری نگاہیں پھر اس کی ابھری ہوئی جیب پر پڑیں جس میں خدا معلوم کیا کیا پھنسا ہوا تھا ”میں ہار گیا۔۔۔۔۔ آپ کی ہیر کنواری

ہے دنیا کی سب بھینسیں اور گائیں کنواریاں میں کنوارا ہوں آپ کنواری ہیں لیکن
یہ تو بتائیے کہ آپ کی اس کنواری جیب کو کیا ہوا ہے؟“

اس نے اپنی پھولی ہوئی جیب دیکھی تو دانتوں میں انگلی دبا کر میری طرف
ملامت بھری نظروں سے دیکھ کر کہا ”آپ کو شرم نہیں آتی..... کیا ہوا ہے میری
جیب کو میری چیزیں پڑی ہیں اس میں۔“

”چیزیں..... اس سے تمہارا کیا مطلب۔“

”آپ تو بال کی کھال نکالتے ہیں۔ چیزیں پڑی ہیں میرے کام کی اور کیا میں
نے پتھر ڈال رکھے ہیں۔“

”تو جیب میں تمہارے کام کی چیزیں پڑی ہیں۔ میں پوچھ سکتا ہوں یہ کام کی
چیزیں کیا ہیں؟“

”آپ ہرگز نہیں پوچھ سکتے۔ اور اگر آپ پوچھیں گے بھی تو میں نہیں بتاؤں گی
اس واسطے کہ آپ نے مجھے اپنے چمڑے کے تھیلے کی چیزیں کب دکھائی ہیں۔ میں
اگر آپ سے کہوں بھی تو آپ کبھی نہ دکھائیں گے۔“

”میں ایک ایک چیز دکھانے کے لیے تیار ہوں..... یہ رہا تھیلیا۔“ میں نے اپنا
چمڑی تھیلیا اس کے سامنے کر دیا۔ ”خود کھول کر دیکھ لو پر یاد رہے مجھے اپنی جیب کی
چیزیں تمہیں دکھانا پڑیں گی۔“

”پہلے میں اس تھیلے کی تلاشی تو لے لوں“ یہ کہہ کر اس نے میرا تھیلیا کھولا اور
اس کی سب چیزیں ایک ایک کر کے باہر نکالنا شروع کیں۔ انگریزی کا ایک ناول،
کاغدوں کا پیڈ، دو پنسلیں، ایک ربڑ، دس بارہ لفافے، آٹھ ایک ایک آنے والے

اسٹامپ دس بارہ خالی لفافے اور لکھے ہوئے کاغذوں کا ایک پلندہ..... یہ میری چیزیں تھیں۔

جب وہ ایک ایک چیز اچھی طرح دیکھ چکی تو میں نے اس سے کہا ”اب اپنی جیب کا منہ اوٹھ کرو“۔

اس نے میری بات کا جواب نہ دیا۔ تھیلے میں تمام چیزیں رکھنے کے بعد اس نے مجھ سے تحکمانہ لہجے میں کہا ”اب اپنی جیب دکھائیے“۔

میں نے اپنی جیب کا منہ کھول دیا اور اس نے ہاتھ ڈال کر اس میں جو کچھ بھی تھا باہر نکال لیا۔ ایک ہنڈی اور چابیوں کا گچھا تھا جس میں ایک چھوٹا سا چاقو بھی شامل تھا۔ یہ چاقو اس نے گچھے سے نکال کر زمین پر رکھ دیا اور باقی چیزیں مجھے واپس دے دیں۔ ”یہ چاقو میں نے لے لیا ہے کھیرے کاٹنے کے کام آئے گا“۔

”لے لو پر مجھے مارنے کی کوشش نہ کرو..... میں جب تک تمہاری جیب کی ایک ایک چیز نہ دیکھ لوں چھوڑوں گا نہیں“۔

”اگر میں نہ دکھاؤں تو؟“

”لڑائی ہو جائے گی“۔

”ہو جائے..... میں ڈرھوڑی جاؤں گی“۔ یہ کہہ کر وہ فوراً ہی اپنے دوپٹے کا تئبو پٹا کر اس میں چھپ گئی اور جیب سے کچھ نکالنے لگی۔ اس پر میں نے رعب دار آواز میں کہا ”دیکھو یہ ٹھیک بات نہیں تم کچھ چھپا رہی ہو“۔

”آپ مان لیجیے میں سب کچھ دکھا دوں گی..... اللہ کی قسم سب چیزیں ایک ایک کر کے دکھا دوں گی..... یہ تو میں اپنے من سمجھوتے کے لیے کچھ کر رہی

ہوں۔“

میں نے پھر رعب دار آواز میں کہا ”کیا کر رہی ہو میں تمہاری سب چالاکیاں سمجھتا ہوں۔ سیدھے من سے تمام چیزیں دکھا دو ورنہ میں زبردستی سب کچھ دیکھ لوں گا۔“

تھوڑی دیر بعد وہ دوپٹے سے باہر نکل آئی اور آگے بڑھ کر کہنے لگی ”دیکھ لیجیے۔“

میں اس کی جیب میں ہاتھ ڈالنے ہی والا تھا کہ اس کے ہتے ہوئے سینے کو دیکھ کر رک گیا..... ”تم خود ہی ایک ایک چیز نکال کر مجھے دکھاتی جاؤ..... لو اتنا لحاظ میں تمہارا کیے دیتا ہوں۔ یوں تمہاری ایمانداری بھی معلوم ہو جائے گی۔“

”نہیں..... آپ خود نکالتے جائیے بعد میں آپ کہیں گے کہ میں نے سب چیزیں نہیں دکھائیں۔“

”میں دیکھ جو رہا ہوں تم نکالتی جاؤ۔“

”جیسے آپ کی مرضی“ یہ کہہ کر اس نے آہستہ سے اپنی جیب میں دو انگلیاں ڈالیں اور سرخ رنگ کے ریشمیں کپڑے کا ایک ٹکڑا باہر نکالا۔ اس پر میں نے پوچھا ”کپڑے کا یہ بیکار سا ٹکڑا تم ساتھ ساتھ کیوں لیے پھرتی ہو؟“

”اجی آپ کو کیا معلوم یہ بہت بڑھیا کپڑا ہے میں اس کا رومال بناؤں گی۔ جب بن جائے گا تو پھر آپ دیکھیے گا جی ہاں.....“ یہ کہہ کر اس نے کپڑے کا ٹکڑا اپنی جھولی میں رکھ لیا۔ پھر جیب سے کچھ نکالا اور بند مٹھی میرے قریب لا کر کھول دی۔ سلوائیڈ کے تین مستعمل کپ ایک چابی اور سیپ کے دو بٹن اس کی ہتھیلی پر

مجھے نظر آئے۔

میں نے اس سے کہا ”یہ اب اپنی جھولی میں رکھ لو اور باقی چیزیں جلدی جلدی نکالو۔“

اس نے جیب میں جلدی جلدی ہاتھ ڈال کر باری باری یہ چیزیں نکالیں۔ سفید دھاگے کی گولی۔ اس میں پھنسی ہوئی رنگ آلود سونی لکڑی کی میلی کچلی کنگھی چھوٹا سا ٹونا ہوا آئینہ اور ایک پیسہ۔

میں نے اس سے پوچھا ”کوئی اور چیز باقی تو نہیں رہی؟“
”جی نہیں“ اس نے اپنے سر کو جنبش دی میں نے سب چیزیں آپ کے سامنے رکھ دی ہیں اب کوئی باقی نہیں رہی۔“

”غلط“ میں نے اپنا لہجہ بدل کر کہا ”تم جھوٹ بولتی ہو اور جھوٹ بھی ایسا بولتی ہو جو بالکل کچا ہوا بھی ایک چیز باقی ہے“ جو نہیں یہ لفظ میرے منہ سے اگلے غیر ارادی طور پر اس کی نگاہیں یک لخت اپنے دوپٹے کی طرف مڑیں۔ میں نے تاڑ لیا کہ اس نے کچھ چھپایا ہوا ہے۔ ”بیگوسیدھے من سے یہ چیز دکھا دو جو تم نے چھپائی ہے ورنہ یاد رکھو وہ تنگ کروں گا کہ عمر بھر یاد رکھو گی گد گدی ایسی چیز ہے کہ۔۔۔“

گد گدی کے تصور ہی نے اس کے جسم کو اکٹھا کر دیا۔ وہ سکرسی گئی۔ اس پر میں نے ہوا میں اپنے ہاتھوں کی انگلیاں نچائیں۔ ”یہ انگلیاں ایسی گد گدی کر سکتی ہیں کہ جناب کو پہروں ہوش نہ آئے گا۔“

وہ کچھ اس طرح سٹی جیسے کسی نے بلندی سے ریشمی کپڑے کا تھان کھول کر نیچے پھینک دیا ہے ”نہیں نہیں۔۔۔ خدا کے لیے ایسا کر بھی نہ دیجیے گا۔۔۔ میں مر

جاؤں گی۔

جب میں سچ مچ اپنے ہاتھ اس کے کندھوں تک لے گیا تو وہ بے تحاشا چیختی
ہنستی اور تمنّتی سمٹاتی اٹھی اور بھاگ گئی..... دوپٹے میں سے کوئی چیز گری جو میں
نے دوڑ کر اٹھائی..... مصری کی ایک ڈلی تھی جو وہ مجھ سے چھپا رہی تھی..... جانے
کیوں؟

☆☆☆

مد بھائی

فارس روڈ سے آپ اس طرف گلی میں چلے جائیے جو سفید گلی کہلاتی ہے تو اس کے آخری سرے پر آپ کو چند ہوٹل ملیں گے۔ یوں تو بمبئی میں قدم قدم پر ہوٹل اور ریسٹوران ہوتے ہیں مگر یہ ریسٹوران اس لحاظ سے بہت دلچسپ اور منفرد ہیں کہ یہ اس علاقے میں واقع ہیں جہاں بھانت بھانت کی رندیاں بستتی ہیں۔ ایک زمانہ گزر چکا ہے۔ بس آپ یہی سمجھیے بیس برس کے قریب جب میں ان ریسٹورانوں میں چائے پیا کرتا تھا اور کھانا کھایا کرتا تھا۔ سفید گلی کے آگے نکل کر پلے ہاؤس آتا ہے احمد روڈ بھر ہاؤس ہو رہی ہے۔ سینما کے شو دن بھر چلتے تھے چمپیاں ہوتی تھیں سینما گھر غائب چار تھے۔ ان کے باہر گھنٹیاں بجا بجا کر بڑے سماعت پاش طریقے پر لوگوں کو مدعو کرتے تھے۔

”آؤ آؤ..... دو آنے میں..... فیسٹ کلاس کھیل..... دو آنے میں۔“

بعض اوقات یہ گھنٹیاں بجائے والے زبردستی لوگوں کو اندر دھکیل دیتے تھے کرسیوں پر تپتی کرانے والے بیٹھے ہوتے تھے جن کی کھوپڑیوں کی مرمت بڑے سائنٹفک طریقے سے کی جاتی تھی۔ ماش اچھی چیز ہے لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ بمبئی کے رہنے والے اس کے اتنے گرویدہ کیوں ہیں۔ دن کو اور رات کو ہر وقت انہیں تیل ماش کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ آپ اگر چاہیں تو رات کے تین بجے بڑی آسانی سے تیل ماشیا بلا سکتے ہیں۔ یوں بھی ساری رات خواہ آپ بمبئی کے کسی کونے میں ہوں یہ آواز آپ یقیناً سنتے رہیں گے

”پی۔۔۔ پی۔۔۔ پی۔۔۔“

یہ پی چینی کا مخفف ہے۔

فارس روڈیوں تو ایک سڑک کا نام ہے لیکن دراصل یہ اس پورے علاقے سے منسوب ہے جہاں بیسوائیں بستی ہیں۔ یہ بہت بڑا علاقہ ہے۔ اس میں کئی گلیاں ہیں جن کے مختلف نام ہیں لیکن سہولت کے طور پر اس کی ہر گلی کو فارس روڈ یا سفید گلی کہا جاتا ہے۔ اس میں سینکڑوں جنگلاگلی دکانیں ہیں جن میں مختلف رنگ و سن کی عورتیں بیٹھ کر اپنا جسم بیچتی ہیں۔ مختلف دامنوں پر آٹھ آنے سے آٹھ سو روپے تک آٹھ سو روپے سے سو روپے تک۔ ہر دامن کی عورت آپ کو اس علاقے میں مل سکتی ہے۔

یہودی پنجابی مرہٹی کشمیری کجراتی بنگالی ایٹکو انڈین فرانسیسی چینی جاپانی غرضیکہ ہر قسم کی عورت آپ کو یہاں دستیاب ہو سکتی ہے۔۔۔۔۔ یہ عورتیں کیسی ہوتی ہیں۔۔۔۔۔ معاف کیجیے گا اس کے متعلق آپ مجھ سے کچھ نہ پوچھیے۔۔۔۔۔ بس عورتیں ہوتی ہیں۔۔۔۔۔ اور ان کو گاہک بھی مل ہی جاتے ہیں۔

اس علاقے میں بہت سے چینی بھی آباد ہیں۔ معلوم نہیں کیا کاروبار کرتے ہیں مگر رہتے اسی علاقے میں ہیں۔ بعض تو ریسٹوران چلاتے ہیں جن کے باہر بورڈوں پر اوپر نیچے کپڑوں کی شکل میں کچھ لکھا ہوتا ہے۔۔۔۔۔ معلوم نہیں کیا۔۔۔۔۔

اس علاقے میں بزنس مین اور برقوم کے لوگ آباد ہیں۔ ایک گلی ہے جس کا نام عرب سین ہے۔ وہاں کے لوگ اسے عرب گلی کہتے ہیں۔ اس زمانے میں جس

کی میں بات کر رہا ہوں اس گلی میں غالباً پچیس عرب رہتے تھے جو خود کو موتیوں کے بیو پاری کہتے تھے۔ باقی آبادی چٹائیوں..... اور رام پوریوں پر مشتمل تھی۔ اس گلی میں مجھے ایک کمرہ مل گیا تھا جس میں سورج کی روشنی کا داخلہ بند تھا ہر وقت بجلی کا باب روشن رہتا تھا۔ اس کا کرایہ ساڑھے نو روپے ماہوار تھا۔

آپ کا اگر بمبئی میں قیام نہیں رہا تو شاید آپ مشکل سے یقین کریں کہ وہاں کسی کو کسی سے سروکار نہیں ہوتا۔ اگر آپ اپنی کھولی میں مریں تو آپ کو کوئی نہیں پوچھے گا۔ آپ کے پڑوس میں قتل ہو جائے مجال ہے جو آپ کو اس کی خبر ہو جائے۔ مگر وہاں عرب گلی میں صرف ایک شخص ایسا تھا جس کو اڑوس پڑوس کے ہر شخص سے دلچسپی تھی۔ اس کا نام ممد بھائی تھا۔

ممد بھائی رام پور کا رہنے والا تھا۔ اول درجے کا بحلیت، گتے اور بنوٹ کے فن میں یکتا۔ میں جب عرب گلی آیا تو ہولوں میں اس کا نام اکثر سننے میں آیا لیکن ایک عرصے تک اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔

میں صبح سویرے اپنی کھولی سے نکل جاتا تھا اور بہت رات گئے لوٹتا تھا لیکن ممد بھائی سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ کیونکہ اس کے متعلق عرب گلی میں بے شمار داستانیں مشہور تھیں۔ کہ بیش پچیس آدمی اگر لائیوں سے مسلح ہو کر اس پر نوٹ پڑیں تو وہ اس کا بال تک بیکانہیں کر سکتے۔ ایک منٹ کے اندر اندر وہ سب کو چت کر دیتا ہے۔ اور یہ کہ اس جیسا چھری مار بمبئی میں نہیں مل سکتا۔ ایسے چھری مارتا ہے کہ جس کے لگتی ہے اسے پتا بھی نہیں چلتا۔ سو قدم بغیر احساس کے چتا رہتا ہے اور آخر ایک دم ڈھیر ہو جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ اس کے ہاتھ کی صفائی ہے۔

میرمی کھولی کے ساتھ ایک اور کھولی تھی جس میں مارواڑ کا ایک مسلمان رقص رہتا تھا۔ اس نے مجھے مد بھائی کی سینکڑوں کہانیاں سنائیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ مد بھائی ایک لاکھ روپے کا آدمی ہے۔ اس کو ایک مرتبہ ہیضہ ہو گیا تھا۔ مد بھائی کو

پتہ چلا تو اس نے فارس روڈ کے تمام ڈاکٹر اس کی کھولی میں اکٹھے کر دیے اور ان سے کہا ”دیکھو اگر عاشق حسین کو کچھ ہو گیا تو میں سب کا صفایا کر دوں گا“۔ عاشق حسین نے بڑے عقیدت مندانہ لہجے میں مجھ سے کہا ”منلو صاحب! مدد بھائی فرشتہ ہے..... فرشتہ..... جب اس نے ڈاکٹروں کو دھمکی دی تو وہ سب کاپٹنے لگے۔ ایسا لگ کے علاج کیا کہ میں وہ دن میں ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔“

مدد بھائی کے متعلق میں عرب گلی کے گندے اور وہابیات ریستورانوں میں اور بھی بہت کچھ سن چکا تھا۔ ایک شخص جو غائب اس کا شاگرد تھا اور خود کو بہت بڑا پھلکیت سمجھتا تھا مجھ سے یہ کہا تھا کہ مدد دادا اپنے نیٹے میں ایک ایسا آبدار خنجر ہمیشہ اس کے رکھتا ہے جو اسٹری کی طرح شیو بھی کر سکتا ہے اور یہ خنجر نیام میں نہیں ہوتا۔ کھلا رہتا ہے۔ بالکل ننگا اور وہ بھی اس کے پیٹ کے ساتھ۔ اس کی نوک اتنی تیکھی ہے کہ اگر باتیں کرتے ہوئے جھکتے ہوئے اس سے ذرا سی غلطی ہو جائے تو مدد بھائی کا ایک دم کام تمام ہو کے رہ جائے۔

ظاہر ہے کہ اس کو دیکھنے اور اس سے ملنے کا اشتیاق دن بدن میرے دل و دماغ میں بڑھتا گیا۔ معلوم نہیں میں نے اپنے تصور میں اس کی شکل و صورت کا کیا نقشہ تیار کیا تھا۔ بہر حال اتنی مدت کے بعد مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں ایک قوی نیکل انسان کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتا تھا جس کا نام مدد بھائی تھا اس قسم کا آدمی جو ہر کوئیس سائیکلوں پر اشتہار کے لیے دیا جاتا ہے۔

میں صبح سویرے اپنے کام پر نکل جاتا تھا اور رات کو دس بجے کے قریب کھانے والے سے فارغ ہو کر واپس آ کر فوراً سو جاتا۔ اس دوران میں مدد بھائی سے کیے

ملاقات ہو سکتی تھی۔ میں نے کئی مرتبہ سوچا کہ کام پر نہ جاؤں اور سارا دن عرب گلی میں گزار کر ممد بھائی کو دیکھنے کی کوشش کروں مگر افسوس کہ میں ایسا نہ کر سکا۔ اس لیے کہ میری ملازمت ہی بڑی واپسات قسم کی تھی۔

ممد بھائی سے ملاقات کرنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک انفلونزا نے مجھ پر زبردست حملہ کیا۔ ایسا حملہ کہ میں بوکھلا گیا۔ خطرہ تھا کہ یہ بگڑ کر نمونیا میں تبدیل ہو جائے گا۔ کیونکہ عرب گلی کے ایک ڈاکٹر نے یہی کہا تھا۔ میں بالکل تنہا تھا۔ میرے ساتھ ایک آدمی رہتا تھا جس کو پونہ میں نوکری مل گئی تھی اس لیے اس کی رفاقت بھی نصیب نہیں تھی۔ میں بخار میں پھنکا جا رہا تھا۔ اس قدر پیاس تھی کہ جو پانی کھولی میں رکھا تھا وہ میرے لیے نا کافی تھا اور دوست یا کوئی پاس نہیں تھا جو میری دیکھ بھال کرتا۔

میں بہت سخت جان ہوں دیکھ بھال کی مجھے عموماً ضرورت محسوس نہیں ہوا کرتی۔ مگر معلوم نہیں کہ وہ کس قسم کا بخار تھا انفلونزا تھا ملیریا تھا یا اور کیا تھا۔ لیکن اس نے میری ریڑھ کی ہڈی توڑ دی۔ میں بلبلانے لگا۔ میرے دل میں پہلی مرتبہ خواندہش پیدا ہوئی کہ میرے پاس کوئی ہو جو مجھے دلا سہ دے۔ دلا سہ نہ دے تو کم از کم ایک سیکنڈ کے لیے اپنی شکل دکھا کے چلا جائے۔ تاکہ مجھے یہ احساس ہو کہ مجھے پوچھنے والا بھی کوئی ہے۔

دو دن تک میں بستر میں پڑا تکلیف بھری کروٹیں بدلتا رہا مگر کوئی نہ آیا..... آتا بھی کسے تھا..... میری جان پہچان کے آدمی ہی کتنے تھے..... دو تین چار..... اور وہ اتنی دور رہتے تھے کہ ان کو میری موت کا علم بھی نہیں ہو سکتا تھا..... اور پھر وہاں بہینی

میں کون کس کو پوچھتا ہے..... کوئی جئے یا مرے..... ان کی بلا سے.....
 میری بہت بری حالت تھی۔ عاشق حسین ڈانسر کی بیوی بیمار تھی اس لیے وہ
 اپنے وطن جا چکا تھا۔ یہ مجھے ہوٹل کے چھوکرے نے بتایا تھا۔ اب میں کس کو
 بلاتا.....

بڑی نڈھال حالت میں تھا اور سوچ رہا تھا کہ خود نیچے اتروں اور کسی ڈاکٹر کے
 پاس جاؤں کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے خیال کیا کہ ہوٹل کا چھوکرہ جسے
 بمبئی کی زبان میں باہروالا کہتے ہیں ہوگا بڑی مریل آواز میں کہا آ جاؤ۔
 دروازہ کھلا اور ایک چھریرے بدن کا آدمی جس کی مونچھیں مجھے سب سے
 پہلے دکھائی دیں اندر داخل ہوا۔

اس کی مونچھیں ہی سب کچھ تھیں۔ میرا مطلب ہے کہ اگر اس کی مونچھیں نہ
 ہوتیں تو بہت ممکن ہے وہ کچھ بھی نہ ہوتا۔ اس کی مونچھوں ہی نے ایسا معلوم ہوتا تھا
 کہ اس کے سارے وجود کو زندگی بخش رکھی تھی۔

وہ اندر آیا اور اپنی قیصر ولیم جیسی مونچھوں کو ایک انگلی سے ٹھیک کرتے ہوئے
 میری کھانٹ کے قریب آیا۔ اس کے پیچھے پیچھے تین چار آدمی تھے عجیب و غریب
 وضع قطع کے۔ میں بہت حیران تھا کہ یہ کون ہیں اور میرے پاس کیوں آئے ہیں۔
 قیصر ولیم جیسی مونچھوں اور چھریرے بدن والے آدمی نے مجھ سے بڑی نرم و
 نازک آواز میں کہا ”مونسو صاحب! آپ نے حد کر دی۔ سالانہ مجھے اطلاع کیوں نہ
 دی؟“ مونسو کا مونسو بن جانا میرے لیے کوئی نئی بات نہ تھی..... اس کے علاوہ میں
 اس موڈ میں بھی تھا کہ میں اس کی اصلاح کرتا میں نے اپنی نحیف آواز میں اس کی

موٹھجوں سے صرف اتنا کہا ”آپ کون ہیں؟“

اس نے مختصر سا جواب دیا ”مد بھائی“۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا ”مد بھائی..... تو..... تو آپ مد بھائی ہیں..... مشہور دادا“
میں نے یہ کہہ کر دیا لیکن فوراً مجھے اپنے بینڈے پن کا احساس ہوا اور رک گیا..... مد بھائی نے چھوٹی انگلی سے اپنی موٹھجوں کے کرخت بال ذرا اوپر کیے اور مسکرایا ”ہاں وٹو بھائی..... میں مد ہوں..... یہاں کا مشہور دادا..... مجھے باہر والے سے معلوم ہوا کہ تم بیمار ہو..... سالانہ بھی کوئی بات ہے تم نے مجھے خبر نہ کی..... مد بھائی کا مستک پھر جاتا ہے جب کوئی ایسی بات ہوتی ہے“۔

میں جواب میں کچھ کہنے والا تھا کہ اس نے اپنے ساتھیوں میں سے ایک سے مخاطب ہو کر کہا ”ارے کیا نام ہے تیرا..... جا بھاگ کے جا اور کیا نام ہے اس ڈاکٹر کا..... سمجھ گئے نا اس سے کہہ کہ مد بھائی تجھے بلاتا ہے..... ایک دم جلدی آ..... ایک دم..... سب کام چھوڑ دے اور جلدی..... اور دیکھ سالے سے کہنا سب دوائیں لیتا آئے“۔

مد بھائی نے جس کو حکم دیا تھا وہ ایک دم پلا گیا۔ میں سوچ رہا تھا۔ میں اس کو دیکھ رہا تھا..... وہ تمام داستانیں میرے بخار آلودہ دماغ میں چل پھر رہی تھیں جو میں اسکے متعلق لوگوں سے سن چکا تھا..... لیکن گلد صورت میں کیونکہ بار بار اسکو دیکھنے کی وجہ سے اس کی موٹھجیں سب پر چھا جاتی تھیں..... بڑی خوف ناک مگر بڑی خوبصورت موٹھجیں تھیں لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کے چہرے کو جس کے خدو خال بڑے ملائم اور نرم و نازک ہیں صرف خوف ناک بنانے کے لیے یہ موٹھجیں

رکھی گئی ہیں۔ میں نے اپنے بنار آلود دماغ میں سوچا کہ یہ شخص درحقیقت اتنا خوفناک نہیں جتنا کہ اس نے خود کو ظاہر کر رکھا ہے۔

کھولی میں کوئی کرسی نہیں تھی۔ میں نے مدد بھائی سے کہا کہ وہ میری چارپائی پر بیٹھ جائے مگر اس نے انکار کر دیا اور بڑے روکھے لہجے میں کہا ”ٹھیک ہے..... ہم کھڑے رہیں گے۔“

پھر اس نے ٹپکتے ہوئے..... حالانکہ اس کھولی میں اس عیاشی کی کوئی گنجائش نہیں تھی کرتے کا دامن اٹھا کر پاٹھامے کے نیپے سے ایک خنجر نکالا..... میں سمجھا چاندی کا ہے۔ اس قدر لشکر رہا تھا کہ میں آپ سے کیا کہوں یہ خنجر نکال کر پہلے اس نے اپنی کلائی پر پھیرا۔ جو بال اسکی زو میں آئے سب صاف ہو گئے۔ اس نے اس پر اپنے اطمینان کا اظہار کیا اور ناخن تراشنے لگا۔

اس کی آمد ہی سے میرا بخار کئی درجے نیچے اتر آیا تھا۔ میں اب کسی قدر ہوش مند حالت میں اس سے کہا ”مدد بھائی..... یہ چھری تم اس طرح اپنے..... نیپے میں..... یعنی بالکل اپنے پیٹ کے ساتھ رکھتے ہو..... اتنی تیز ہے کیا تمہیں خوف محسوس نہیں ہوتا؟“

مدد نے خنجر سے اپنے ناخن کی ایک قاش بڑی صفائی سے اڑاتے ہوئے جواب دیا ”وٹو بھائی..... یہ چھری دوسروں کے لیے ہے۔ یہ اچھی طرح جانتی ہے سالی اپنی چیز ہے مجھے نقصان کیسے پہنچائے گی؟“

چھری سے جو رشتہ اس نے قائم کیا تھا وہ ایسے ہی تھا جیسے کوئی ماں یا باپ کہے کہ یہ میرا بیٹا ہے یا بیٹی ہے اس کا ہاتھ مجھ پر کیسے اٹھ سکتا ہے۔

ڈاکٹر آگیا..... اس کا نام پنو تھا اور میں وٹو..... اس نے مدد بھائی کو اپنے
 کرچین انداز میں سلام کیا اور پوچھا معاملہ کیا ہے۔ جو معاملہ تھا وہ مدد بھائی نے
 بیان کر دیا۔ مختصر لیکن کڑے الفاظ میں جن میں تحکم تھا کہ دیکھو اگر تم نے وٹو بھائی
 کا علاج اچھی طرح نہ کیا تو تمہاری خیر نہیں۔

ڈاکٹر پنو نے فرماں بردار لڑکے کی طرح اپنا کام کیا۔ میری نبض
 دیکھی..... شیٹھو سکوپ لگا کر میرے سینے اور پیٹھ کا معائنہ کیا۔ بلڈ پریشر دیکھا اور
 مجھ سے میری بیماری کی تمام تفصیل پوچھی۔ اس کے بعد اس نے مجھ سے نہیں مدد
 بھائی سے کہا ”کوئی فکر کی بات نہیں..... ملیریا ہے..... میں انجکشن لگا دیتا ہوں۔“
 مدد بھائی مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس نے ڈاکٹر پنو کی بات سنی اور خنجر
 سے اپنی کلائی سے بال اڑاتے ہوئے کہا ”میں کچھ نہیں جانتا انجکشن دینا ہے تو
 دے دو لیکن اگر اسے کچھ ہو گیا تو.....“

ڈاکٹر پنو کانپ گیا ”نہیں مدد بھائی..... سب ٹھیک ہو جائے گا۔“
 مدد بھائی نے خنجر اپنے نیپے میں اڑس لیا ”تو ٹھیک ہے۔“
 ”تو میں انجکشن لگاتا ہوں“ ڈاکٹر نے اپنا بیگ کھولا اور سرنج نکالی.....
 ”ٹھہرو..... ٹھہرو.....“

مدد بھائی گھبرا گیا تھا۔ ڈاکٹر نے سرنج فوراً بیگ میں واپس رکھ دی اور میا تے
 ہوئے مدد بھائی سے مخاطب ہوا ”کیوں؟“
 ”بس..... میں کسی کے سوئی گتے نہیں دیکھ سکتا۔“ یہ کہہ کر وہ کھوئی سے باہر
 چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ساتھی بھی چلے گئے۔

ڈاکٹر پنو نے میرے کونین کا انجکشن لگایا۔ بڑے سلیقے سے ورنہ ملیریا کا یہ انجکشن بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ جب وہ فارغ ہوا تو میں نے فیس پوچھی..... اس نے کہا دس روپے میں تنکے کے نیچے سے اپنا بٹوم نکال رہا تھا کہ مدم بھائی اندر آ گیا۔ اس وقت میں دس روپے کا نوٹ ڈاکٹر پنو کو دے رہا تھا۔

مدم بھائی نے غضب آلود نگاہوں سے مجھے اور ڈاکٹر کو دیکھا اور گرج کر کہا ”یہ کیا ہو رہا ہے؟“

میں نے کہا ”فیس دے رہا ہوں۔“

مدم بھائی ڈاکٹر پنو سے مخاطب ہوا ”سالے فیس کہی لے رہے ہو۔“

ڈاکٹر پنو بوکھلا گیا ”میں کب لے رہا ہو..... یہ دے رہے تھے۔“

”سالہ..... ہم سے فیس لیتے ہو..... واپس کرو یہ نوٹ۔“ مدم بھائی کے لہجے میں خنجر ایسی تیزی تھی۔

ڈاکٹر پنو نے مجھے نوٹ واپس کر دیا اور بیگ بند کر کے مدم بھائی سے معذرت طلب کرتے ہوئے چلا گیا۔

مدم بھائی نے ایک انگلی سے اپنی کانٹوں ایسی مونچھوں کو تادیا اور مسکرایا ”بھئی بھائی..... یہ بھی کوئی بات ہے کہ اس علاقے کا ڈاکٹر تم سے فیس لے..... تمہاری قسم اپنی مونچھیں منڈوا دیتا اگر اس سالے نے فیس لی ہوتی..... یہاں سب تمہارے غلام ہیں۔“

جموڑے توقف کے بعد میں نے اس سے پوچھا ”مدم بھائی! تم مجھے کیسے جانتے ہو؟“

ممد بھائی کی مونچھیں تھر تھرائیں ”ممد بھائی کسے نہیں جانتا..... ہم یہاں کے بادشاہ ہیں پیارے..... اپنی رعایا کا خیال رکھتے ہیں۔ ہماری سی آئی ڈی ہے وہ ہمیں بتاتی رہتی ہے..... کون آیا ہے کون گیا ہے کون اچھی حالت میں ہے کون بری حالت میں..... تمہارے متعلق ہم سب کچھ جانتے ہیں۔“

میں نے ازراہ تغن پوچھا ”کیا جانتے ہیں آپ؟“
 ”سالا! ہم کیا نہیں جانتے..... تم امرتسر کا رہنے والا ہے..... کشمیری ہے..... یہاں اخباروں میں کام کرتا ہے..... تم نے بسم اللہ ہوٹل کے دس روپے دینے ہیں۔ اسی لیے تم ادھر سے نہیں گزرتے..... بھنڈی بازار میں ایک پان والا تمہاری جان کو رہتا ہے۔ اس سے تم بیس روپے دس آنے کے سیکریٹ لے کر پھونک چکے ہو۔“

میں پانی پانی ہو گیا۔

ممد بھائی نے اپنی کرخت مونچھوں پر ایک انگلی پھیری اور مسکرا کر کہا ”وہو بھائی! کچھ فکر نہ کرو۔ تمہارے سب قرض چکا دیے گئے ہیں۔ اب تم نئے سرے سے معاملہ شروع کر سکتے ہو۔ میں نے ان سالوں سے کہہ دیا ہے کہ خیر وارا اگر وہو بھائی کو تم نے تنگ کیا..... اور ممد بھائی تم سے کہتا ہے کہ انشاء اللہ کوئی تمہیں تنگ نہیں کرے گا۔“

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس سے کیا کہوں بیمار تھا، کونین کا ٹیکہ لگ چکا تھا۔ جس کے باعث کانوں میں شائیں شائیں ہو رہی تھیں۔ اس کے علاوہ اس کے خلوص کے نیچے اتنا دب چکا تھا کہ اگر مجھے کوئی نکالنے کی کوشش کرتا تو اسے بہت

محنت کرنی پڑتی..... میں صرف اتنا کہہ سکا ”مدد بھائی! خدا تمہیں زندہ رکھے..... تم خوش رہو“۔

مدد بھائی نے اپنی مونچھوں کے بال ذرا اوپر کیے اور کچھ کہے بغیر پلا گیا۔
ڈاکٹر پنو ہر روز صبح شام آتا تھا۔ میں نے اس سے کئی مرتبہ فیس کا ذکر کیا مگر اس نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا ”نہیں مسٹر منٹو! مدد بھائی کا معاملہ ہے۔ ایک ڈیڑھ صیا بھی نہیں لے سکتا“۔

میں نے سوچا یہ مدد بھائی بہت بڑا آدمی ہے یعنی خوفناک قسم کا جس سے ڈاکٹر پنو بڑا خسیس قسم کا آدمی ہے ڈرتا ہے اور مجھ سے فیس لینے کی جرات نہیں کرتا۔
حالانکہ وہ اپنی جیب سے انجکشنوں پر خرچ کر رہا ہے۔

بنیادی کے دوران میں مدد بھائی بھی بلا ناغہ آتا رہا۔ کبھی صبح آتا کبھی شام کو۔
اپنے چہرے سات شاگردوں کے ساتھ اور مجھے ہر ممکن طریقے سے ڈھارس دیتا رہا کہ معمولی ملیریا ہے۔ تم ڈاکٹر پنو کے علاج سے انشا ء اللہ بہت جلد ٹھیک ٹھاک ہو جاؤ گے۔

چند روز کے بعد میں ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ اس دوران میں مدد بھائی کے ہر خدو خال کو اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔

جیسا کہ میں اس سے پیشتر کہہ چکا ہوں وہ چہریرے بدن کا آدمی تھا۔ عمر یہی بچپس تیس کے درمیان ہوگی۔ پتلی پتلی بانٹیں، نالٹیں بھی ایسی ہی تھیں۔ ہاتھ بلا کے پھر تیلے تھے۔ ان سے جب وہ چھوٹا سا تیز دھار چاقو کسی دشمن پر پھینکتا تھا تو وہ سیدھا اسکے دل میں کھینٹا تھا یہ مجھے عرب گلی کے لوگوں نے بتایا تھا۔

اس کے متعلق بے شمار باتیں مشہور تھیں۔ اس نے کسی کو قتل کیا تھا۔ میں اس کے متعلق ہر شے سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ چھری ماروہ اول درجے کا تھا۔ نوٹ اور گینکے کا ماریوں سب کہتے تھے کہ وہ سینکڑوں قتل کر چکا ہے مگر میں یہ اب بھی ماننے کو تیار نہیں۔

لیکن جب میں اس کے خنجر کے متعلق سوچتا ہوں تو میرے تن بدن میں جھرجھری سی طاری ہو جاتی ہے۔ یہ خوفناک ہتھیار وہ کیوں ہر وقت اپنی شلواری کے نیچے میں اڑے رہتا ہے؟.....

میں جب اچھا ہو گیا تو ایک دن عرب گلی کے ایک تھرڈ کلاس چینی ریستوران میں اس سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ اپنی وہی خوفناک خنجر نکال کر اپنے ناخن کاٹ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا ”مد بھائی..... آج کل بندوق پستول کا زمانہ ہے..... تم یہ خنجر کیوں لیے پھرتے ہو؟“

مد بھائی نے اپنی کرخت مونچھوں پر ایک انگلی پھیری اور کہا ”وہو بھائی بندوق پستول میں کوئی مزہ نہیں۔ انہیں کوئی بچہ بھی چلا سکتا ہے۔ گھوڑا دوایا اور ٹھاہ..... اس میں کیا مزہ ہے.....؟ یہ چیز..... یہ خنجر..... یہ چھری..... یہ چاقو..... مزہ آتا ہے نا خدا کی قسم..... یہ وہ ہے..... تم کیا کہا کرتے ہو؟..... ہاں..... آرٹ..... اس میں آرٹ ہوتا ہے میری جان..... جس کو چاقو یا چھری چلانے کا آرٹ نہ آتا ہو وہ ایک دم کندم ہے۔ پستول کیا ہے..... کھلونا ہے..... جو نقصان پہنچا سکتا ہے..... پر اس میں کیا لطف آتا ہے..... کچھ بھی نہیں..... تم یہ خنجر دیکھو..... اس کی تیز دھار دیکھو“۔ یہ کہتے ہوئے اس نے انگوٹھے پر لب لگایا اور اس کی دھار پر پھیرا

”اس سے کوئی دھماکہ نہیں ہوتا..... بس یوں پیٹ کے اندر داخل کرو..... اس صفائی سے کہ سارے کو معلوم تک نہ ہو..... بندوق پستول سب بکواس ہے۔“

مدد بھائی سے اب ہر روز کسی نہ کسی ملاقات ہو جاتی تھی۔ میں اس کا ممنون احساس تھا..... لیکن جب میں اس کا ذکر کرتا تو وہ ناراض ہو جاتا۔ کہتا تھا کہ میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ یہ تو میرا فرض تھا۔

جب میں نے کچھ تفتیش کی تو مجھے معلوم ہوا کہ فارس روڈ کے علاقے کا وہ ایک قسم کا حاکم تھا۔ ایسا حاکم جو ہر شخص کی خبر گیری کرتا تھا۔ کوئی بیمار ہو، کسی کے کوئی تکلیف ہو، مدد بھائی اس کے پاس پہنچ جاتا تھا اور یہ اس کی سی آئی ڈی کا کام تھا جو اس کو ہر چیز سے باخبر رکھتی تھی۔

وہ دوا تھا یعنی ایک غنڈہ ناک غنڈہ لیکن میری سمجھ میں اب بھی نہیں آتا کہ وہ کس لحاظ سے غنڈہ تھا۔ خدا واحد شاہد ہے کہ میں نے اس میں کوئی غنڈہ پن نہیں دیکھا ایک صرف اس کی مونچھیں تھیں جو اس کو بہت ناک بنائے رکھتی تھیں۔ لیکن اس کو ان سے پیار تھا۔ وہ ان کی ہر طرح پرورش کرتا تھا جس طرح کوئی اپنے بچے کی کرے۔

اس کی مونچھوں کا ایک ایک بال کھڑا تھا جیسے خار پشت کا..... مجھے کسی نے بتایا تھا کہ مدد بھائی ہر روز اپنی مونچھوں کو بالائی کھلاتا ہے۔ جب کھانا کھا لیتا ہے تو سائن بھری انگلیوں سے اپنی مونچھیں ضرور مروڑتا ہے کہ بزرگوں کے کہنے کے مطابق یوں بالوں میں طاقت آتی ہے۔

میں اس سے پیشتر غالباً کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ اس کی مونچھیں بڑی خوفناک

تھیں۔ دراصل مونچھوں کا نام ہی مدد بھائی تھا۔۔۔۔۔ یا اس خنجر کا جو اس کی تنگ گھیرے کی شلواری کے نیچے میں ہر وقت موجود رہتا تھا۔۔۔۔۔ مجھے ان دونوں چیزوں سے ڈر لگتا تھا نہ معلوم کیوں۔۔۔۔۔

مدد بھائی یوں تو اس علاقے کا بہت بڑا دادا تھا لیکن وہ سب کا ہمدرد تھا۔ معلوم نہیں اس کی آمدنی کے کیا ذرائع تھے پر وہ ہر حاجت مند کی ہر وقت مدد کرتا تھا۔ اس علاقے کی تمام رہنمائی اس کو اپنا پیر مانتی تھیں۔ چونکہ وہ ایک مانا ہوا غنڈہ تھا اس لیے لازم تھا کہ اس کا تعلق وہاں کی کسی طوائف سے ہوتا مگر مجھے معلوم ہوا کہ اس قسم کے سلسلے سے اس کا وہر کا بھی تعلق نہیں رہا تھا۔

میری اس کی بڑی دوستی ہو گئی۔ ان پڑھ تھا لیکن جانے کیوں وہ میری اتنی عزت کرتا تھا کہ عرب گلی کے تمام آدمی رشک کھاتے تھے۔ ایک دن صبح سویرے دفتر جاتے وقت میں نے چینی ہوٹل سے سنا کہ مدد بھائی گرفتار کر لیا گیا ہے۔ مجھے بہت تعجب ہوا اس لیے کہ تمام تھانے والے اس کے دوست تھے۔ کیا وجہ ہو سکتی تھی؟۔۔۔۔۔ میں نے اس آدمی سے پوچھا کہ کیا بات ہوئی جو مدد بھائی گرفتار ہو گیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اسی عرب گلی میں ایک عورت رہتی ہے جس کا نام شیریں بانی ہے۔ اس کی ایک جوان لڑکی ہے۔ اس کو کل ایک آدمی نے خراب کیا۔ یعنی اس کی عصمت دری کر دی۔ شیریں بانی روتی ہوئی مدد بھائی کے پاس آئی اور اس سے کہا ”تم یہاں کے دادا ہو۔ میری بیٹی سے فلاں آدمی نے یہ برا کیا ہے۔۔۔۔۔ لعنت ہے تم پر کہ تم گھر میں بیٹھے ہو“۔ مدد بھائی نے یہ موٹی گالی اس بڑھیا کو دی اور کہا ”تم چاہتی کیا ہو؟“ اس نے کہا ”میں یہ چاہتی ہوں کہ تم اس حرام زادے کا پیٹ چاک

کر دو۔“

مدد بھائی اس وقت ہوٹل میں بیس پاؤں کے ساتھ قیمہ کھا رہا تھا۔ یہ سن کر اس نے اپنے نیپے سے خنجر نکالا۔ اس پر اٹھ کھڑا پھیر کر اس کی دھار دیکھی۔ اور بڑھیا سے کہا ”جا..... تیرا کام ہو جائے گا۔“

اور اس کا کام ہو گیا..... دوسرے معنوں میں جس آدمی نے اس بڑھیا کی لڑکی کی عصمت دری کی تھی آدھ گھنٹے کے اندر اندر اس کا کام تمام ہو گیا۔ مدد بھائی گرفتار تو ہو گیا تھا۔ مگر اس نے کام اتنی ہوشیاری اور چال بازی سے کیا تھا کہ اس کے خلاف کوئی شہادت نہیں تھی۔ اس کے علاوہ اگر کوئی عینی شاہد موجود بھی ہوتا تو وہ کبھی عدالت میں بیان نہ دیتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔

دو دن حوالات میں رہا مگر اس کو وہاں کوئی تکلیف نہ تھی۔ پولیس کے سپاہی انسپکٹر سب انسپکٹر سب اس کو جانتے تھے لیکن جب وہ ضمانت پر رہا ہو کر باہر آیا تو میں نے محسوس کیا کہ اسے اپنی زندگی کا سب سے بڑا دھچکا پہنچا ہے۔ اس کی مونچھیں جو خوفناک طور پر اوپر کواٹھی ہوئی تھیں اب کسی قدر جھکی ہوئی تھیں۔

چینی ہوٹل میں اس سے میری ملاقات ہوئی۔ اس کے کپڑے جو ہمیشہ اجلے ہوتے تھے میلے تھے۔ میں نے اس سے قتل کے متعلق کوئی بات نہ کی لیکن اس نے خود کہا ”وہ صاحب مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ سالادیر سے مرا..... چھری مارنے میں مجھ سے غلطی ہو گئی ہاتھ میڑھا پڑا..... لیکن وہ بھی اس سالے کا قصور تھا..... ایک دم مڑ گیا۔ اس وجہ سے سارا معاملہ کنڈم ہو گیا..... لیکن مڑ گیا..... ذرا

تکلیف کے ساتھ جس کا مجھے افسوس ہے۔“

آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ یہ سن کر میرا رد عمل کیا ہوگا۔ یعنی اس کو افسوس تھا کہ وہ اسے بطریق احسن قتل نہ کر سکا۔ اور یہ کہ مرنے میں اسے ذرا تکلیف ہوئی ہے۔

مقدمہ چلنا تھا..... اور مدد بھائی اس سے بہت گھبراتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں عدالت کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ معلوم نہیں اسے اس سے پہلے بھی قتل کیے تھے کہ نہیں لیکن جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے وہ مجسٹریٹ وکیل اور گواہ کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا اس لیے کہ اس کا سابقہ ان لوگوں سے کبھی پرہی نہیں تھا۔ وہ بہت فکر مند تھا۔ پولیس نے جب کیس پیش کرنا چاہا اور تاریخ مقرر ہو گئی تو مدد بھائی بہت پریشان ہو گیا۔ عدالت میں مجسٹریٹ کے سامنے کیسے حاضر ہوا جاتا ہے اس کے متعلق اس کو قطعاً معلوم نہیں تھا۔ بار بار وہ اپنی کرحشت مونچھوں پر انگلیاں پھیرتا تھا اور مجھ سے کہتا تھا ”وٹو صاحب میں مر جاؤں گا پر کورٹ نہیں جاؤں گا..... ساری معلوم نہیں کیسی جگہ ہے۔“

عرب گلی میں اس کے کئی دوست تھے۔ انہوں نے اس کو ڈھارس دی کہ معاملہ سنگین نہیں ہے۔ کوئی گواہ موجود نہیں ایک صرف اس کی مونچھیں ہیں جو مجسٹریٹ کے دل میں اس کے خلاف کوئی مخالف جذبہ پیدا کر سکتی ہیں۔ جیسا کہ میں اس سے پیشتر کہہ چکا ہوں کہ اس کی صرف مونچھیں ہی تھیں جو اس کو خوف ناک بناتی تھیں..... اگر یہ نہ ہوتیں تو وہ ہرگز ہرگز دادا دکھائی نہ دیتا۔ اس نے بہت غور کیا۔ اس کی ضمانت تھانے ہی میں ہو گئی تھی۔ اب اسے

عدالت میں پیش ہونا تھا۔ مجسٹریٹ سے وہ بہت گھبراتا تھا۔ ایرانی ہوٹل میں جب میری اس سے ملاقات ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت پریشان ہے اس کو اپنی مونچھوں کے متعلق بڑی فکر تھی۔ وہ سوچتا تھا کہ ان کے ساتھ اگر وہ عدالت میں پیش ہوا تو بہت ممکن ہے اسکو سزا ہو جائے۔

آپ سمجھتے ہیں کہ یہ کہانی ہے مگر واقعہ ہے کہ وہ بہت پریشان تھا۔ اس کے تمام شاگرد حیران تھے۔ اس لیے کہ کبھی حیران و پریشان نہیں ہوا تھا۔ اس کو مونچھوں کی فکر تھی۔ کیونکہ اس کے بعض قریبی دوستوں نے اس سے کہا تھا ”مم بھائی..... کورٹ میں جانا ہے تو ان مونچھوں کیساتھ کبھی نہ جانا..... مجسٹریٹ تم کو اندر کر دے گا۔“

اور وہ سوچتا تھا..... ہر وقت سوچتا تھا کہ اس کی مونچھوں نے اس آدمی کو قتل کیا ہے یا اس نے..... لیکن کسی نتیجے پر پہنچ نہیں سکتا تھا۔ اس نے اپنا خیر معلوم نہیں جو پہلی مرتبہ خون آشنا ہوا تھا اس سے پہلے کئی مرتبہ ہو چکا تھا اپنے نیپے سے نکالا اور ہوٹل کے باہر گلی میں پھینک دیا۔ میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا ”مم بھائی..... یہ کیا؟“

”کچھ نہیں وٹو بھائی..... بہت گھومنا ہو گیا ہے۔ کورٹ میں جانا ہے..... یار دوست کہتے ہیں کہ تمہاری مونچھیں دیکھ کر وہ ضرور تم کو سزا دے گا..... اب بولو میں کیا کروں؟“

میں کیا بول سکتا تھا۔ میں نے اس کی مونچھوں کی طرف دیکھا جو واقعی بڑی خوفناک تھیں۔ میں نے اس سے صرف اتنا کہا ”مم بھائی! بات تو ٹھیک ہے

..... تمہاری مونچھیں مجسٹریٹ کے فیصلے پر ضرور اثر انداز ہوں گی..... سچ پوچھو تو جو کچھ ہوگا تمہارے خلاف نہیں..... مونچھوں کے خلاف ہوگا۔“
 ”تو میں منڈوا دوں؟“ مدد بھائی نے اپنی چپتی مونچھوں پر بڑے پیار سے انگلی پھیری.....

میں نے اس سے پوچھا ”تمہارا کیا خیال ہے؟“
 ”میرا خیال کچھ بھی ہے وہ تم نہ پوچھو..... لیکن یہاں ہر شخص کا یہی خیال ہے کہ میں انہیں منڈوا دوں تاکہ وہ سالا مجسٹریٹ مہربان ہو جائے۔ تو منڈوا دوں وہ تو بھائی.....؟“

میں نے کچھ توقف کے بعد اس سے کہا ”ہاں اگر تم مناسب سمجھتے ہو تو منڈوا دو..... عدالت کا سوال ہے اور تمہاری مونچھیں واقعی بڑی خوفناک ہیں۔“
 دوسرے دن مدد بھائی نے اپنی مونچھیں..... اپنی جان سے عزیز مونچھیں منڈوا ڈالیں۔ کیونکہ اس کی عزت خطرے میں تھی..... لیکن صرف دوسروں کے مشورے پر.....

مجسٹریٹ ایف ایچ ٹیل کی عدالت میں اس کا مقدمہ پیش ہوا۔ مونچھوں کے بغیر مدد بھائی پیش ہوا۔ میں بھی وہاں موجود تھا اس کے خلاف کوئی شہادت موجود نہیں تھی۔ لیکن مجسٹریٹ صاحب نے اس کو خطرناک غنڈہ قرار دیتے ہوئے تڑی پار یعنی صوبہ بدر کر دیا۔ اس کو صرف ایک دن ملا تھا جس میں اسے اپنا تمام حساب کتاب طے کر کے بمبئی چھوڑ دینا تھا۔

عدالت سے باہر نکل کر اس نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ اس کی چھوٹی بڑی

انگلیاں بار بار بالائی ہونٹ کی طرف بڑھتی تھیں..... مگر وہاں کوئی بال ہی نہیں تھا۔
 شام کو جب اسے بمبئی چھوڑ کر کہیں اور جانا تھا میری اس سے ملاقات ایرانی
 کے ہوٹل میں ہوئی۔ اس کے دس بیس شاگرد اس پاس کرسیوں پر بیٹھے چائے پی
 رہے تھے۔ جب میں اس سے ملا تو اس نے مجھ سے کوئی بات نہ کی..... مونچھوں
 کے بغیر وہ بہت شریف آدمی دکھائی دے رہا تھا لیکن میں نے محسوس کیا وہ بہت
 مغموم ہے۔

اس کے پاس کرسی پر بیٹھ کر میں نے اس سے کہا ”کیا بات ہے مدد بھائی؟“
 اس نے جواب میں ایک بہت بڑی گالی خدا معلوم کس کو دی اور کہا ”میں اب
 مدد بھائی ہی نہیں رہا۔“

مجھے معلوم تھا کہ وہ صوبہ بدر کیا جا چکا ہے ”کوئی بات نہیں مدد بھائی..... یہاں
 نہیں تو کسی اور جگہ ہی.....“

اس نے تمام جگہوں کو بے شمار گالیاں دیں ”حالانکہ..... اپن کو یہ نعم نہیں.....
 یہاں رہیں یا کسی اور جگہ رہیں..... یہ سالہ مونچھیں کیوں منڈوائیں؟“
 پھر اس نے ان لوگوں کو جنہوں نے اس کو مونچھیں منڈوانے کا مشورہ دیا تھا
 ایک کروڑ گالیاں دیں اور کہا ”سالہ! اگر مجھے تڑی پار ہی ہوتا تھا تو مونچھوں کے
 ساتھ کیوں نہ ہوا.....“

مجھے ہنسی آگئی۔ وہ آگ بگولا ہو گیا ”سالہ! تم کیسا آدمی ہے ورنہ..... ہم سچ کہتا
 ہے خدا کی قسم..... ہمیں پھانسی لگا دیتے..... پر..... یہ بے وقوفی تو ہم نے خود کی
 آج تک کسی نے نہ ڈرا تھا..... سالہ! اپنی مونچھوں سے ڈر گیا۔“ یہ کہہ کر اس

نے دو تہتر اپنے منہ پر مارا۔ ”ممد بھائی اعلیٰ ہے تجھ پر..... سال..... اپنی مونچھوں
سے ڈر گیا..... اب جا اپنی ماں کے.....“
اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے جو اس کے مونچھوں بغیر چہرے پر کچھ عجیب
دلکھائی دیتے تھے۔

☆☆☆

ممی

نام اس کا مسز سنیدا جیکسن تھا مگر سب اسے ممی کہتے تھے۔ درمیانے قدر کی
اوہیز عمر تھی۔ اس کا خاوند جیکسن کچیلی سے کچیلی جنگ عظیم میں مارا گیا تھا اس کی
پنشن سنیدا کو قریب قریب دس برس سے مل رہی تھی۔

وہ پونہ کیسے آئی۔ کب سے وہاں تھی۔ اس کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں۔
دراصل میں نے اس کے محل وقوع کے متعلق جاننے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ وہ
اتنی دلچسپ عورت تھی کہ اس سے مل کر سوائے اس کی ذات کے اور کسی چیز سے
دلچسپی نہیں رہتی تھی۔ اس سے کون وابستہ ہے اس کے بارے میں کچھ جاننے کی
ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی اس لیے کہ وہ پونہ کے ہر ذرے سے وابستہ تھی۔
ہو سکتا ہے یہ ایک حد تک مبالغہ ہو۔ مگر پونہ میرے لیے وہی پونہ ہے۔ اور اس کے
وہی ذرے اس کے تمام ذرے ہیں جن کے ساتھ میری چند یادیں منسلک ہیں
..... اور ممی کی عجیب و غریب شخصیت ان میں سے ہر ایک میں موجود ہے۔

اس سے میری ملاقات پونے ہی میں ہوئی..... میں نہایت سست الوجود
انسان ہوں۔ یوں تو سیر و سیاحت کی بڑی بڑی انگلیں میرے دل میں موجود ہیں
۔ آپ میری باتیں سنیں تو آپ سمجھنے لگے گا کہ میں غنقریب کنچن چنگا ہمالہ کی اسی قسم
کے نام کی کسی اور چوٹی کو سر کرنے کے لیے نکل جانے والا ہوں۔ ایسا ہو سکتا ہے۔
مگر یہ زیادہ اغلب ہے کہ میں یہ چوٹی سر کر کے وہیں کا ہو رہوں۔

خدا معلوم کتنے برس سے بمبئی میں تھا۔ آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ

جب پونے گیا تو میری بیوی میرے ساتھ تھی۔ ایک لڑکا ہو کر اس کو مرے قریب قریب چار برس ہو چکے تھے۔ اس دوران میں..... ٹھہریے حساب لگا لوں..... آپ یہ سمجھ لیجیے کہ آٹھ برس سے بہنئی میں تھا۔ مگر اس دوران میں مجھے وہاں کا وکٹوریہ کارڈنز اور میوزیم دیکھنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی تھی۔ یہ تو محض اتفاق تھا کہ میں ایک دم پونہ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ جس فلم کمپنی میں ملازم تھا اس کے مالکوں سے ایک نکلی سی بات پر دل میں ناراضی پیدا ہوئی اور میں نے سوچا کہ یہ تکدر دور کرنے کے لیے پونہ آؤں۔ وہ بھی اس لیے کہ پاس تھا اور وہاں میرے چند دوست رہتے تھے۔

مجھے پر بھات نگر جانا تھا جہاں میرا فلموں کا پرانا ساتھی رہتا تھا۔ اسٹیشن کے باہر مجھے معلوم ہوا کہ یہ جگہ کافی دور ہے۔ مگر اس وقت ہم تانگہ لے چکے تھے۔ ست رو چیزوں سے میری طبیعت سخت گھبراتی ہے۔ مگر میں اپنے دل سے کدورت دور کرنے کے لیے آیا تھا۔ اس لیے مجھے پر بھات نگر پہنچنے میں کوئی غلٹ نہیں تھی۔ تانگہ بہت واہیات قسم کا تھا۔ علی گڑھ کے اکوں سے بھی زیادہ واہیات۔ ہر وقت گرنے کا خطرہ رہتا ہے۔ گھوڑا آگے چتا ہے اور سواریاں پیچھے۔ ایک دو گرد سے اٹے ہوئے بازار افتاں و خیزاں طے ہوئے تو میری طبیعت گھبرا گئی۔ میں نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا اور پوچھا کہ ایسی صورت میں کیا کرنا چاہیے۔ اس نے کہا کہ دھوپ تیز ہے۔ میں نے جو اور تانگے دیکھے ہیں وہ بھی اسی قسم کے ہیں۔ اگر اسے چھوڑ دیا تو پیدل چلنا ہو گا جو ظاہر ہے کہ اس سواری سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ میں نے اس سے اختلاف مناسب نہ سمجھا..... دھوپ واقعی تیز

تھی۔

گھوڑا ایک فرانگ آگے بڑھا ہو گا کہ پاس سے اسی ہونق نانپ کا نانگہ گزرا۔ میں نے سرسری طور پر دیکھا۔ ایک دم کوئی چیخا ”اوائے منلو کے گھوڑے!“ میں چونک پڑا۔ چپہ تھا۔ ایک گھسی ہوئی میم کے ساتھ۔ دونوں ساتھ ساتھ جڑ کے بیٹھے تھے۔ میرا پہلا رد عمل انتہائی افسوس کا تھا کہ چڑے کی جمالیاتی حس کہاں گئی جو ایسی الال لگائی کے ساتھ بیٹھا ہے۔ عمر کا ٹھیک اندازہ تو میں نے اس وقت نہیں کیا تھا مگر اس عورت کی جھریاں پاؤڈر اور روج کی تہوں میں سے بھی صاف نظر آرہی تھیں۔ اتنا شوخ میک اپ تھا کہ بصارت کو سخت کوفت ہوتی تھی۔

چڑے کو ایک عرصے کے بعد میں نے دیکھا تھا۔ وہ میرا بے تکلف دوست تھا۔ ”اوائے منلو کے گھوڑے“ کے جواب میں یقیناً میں نے کچھ اسی قسم کا نعرہ بلند کیا ہوتا مگر اس عورت کو اس کے ساتھ دیکھ کر میری ساری بے تکلفی جھریاں جھریاں ہو گئی۔

میں نے اپنا تانگہ رکوا لیا۔ چڑے نے بھی کوچوان سے کہا کہ ٹھہر جائے۔ پھر اسے اس عورت سے مخاطب ہو کر انگریزی میں کہا ”ممی جسٹ اے منٹ“ ہانگے سے کود کر وہ میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے چیخا ”تم؟ تم؟ تم یہاں کیسے آئے؟“ پھر اپنا بڑھا ہوا ہاتھ بڑی بے تکلفی سے میری پر تکلف بیوی سے ملاتے ہوئے کہا ”بھابی جان..... آپ نے سال کر دیا..... اس گل محمد کو آخر آپ کھینچ کر یہاں لے آئیں۔“

میں نے اس سے پوچھا ”تم کہاں جا رہے ہو؟“

چڑے نے اونچے سروں میں کہا ”ایک کام سے جا رہا ہوں..... تم ایسا کرو سیدھے.....“ وہ ایک دم پلٹ کر میرے تانگے والے سے مخاطب ہوا ”دیکھو صاحب کو ہمارے گھر لے جاؤ..... کرایہ و رایہ مت لینا ان سے“ ادھر سے فوراً ہی فارغ ہو کر اس نے نپٹنے کے انداز میں مجھ سے کہا ”تم جاؤ..... نوکرو ہاں ہوگا..... باقی تم دیکھ لینا“۔

اور وہ پھدک کر اپنے تانگے میں اس بوڑھی میم کے ساتھ بیٹھ گیا۔ جسکو اس نے ممی کہا تھا۔ اس سے مجھے ایک گونہ تسکین ہونی تھی۔ بلکہ یوں کہیے کہ وہ بو جھ جو ایک دم دونوں کو ساتھ دیکھ کر میرے سینے پر آ پڑا تھا کافی حد تک ہلکا ہو گیا تھا۔ اس کا تانگہ چل پڑا۔ میں نے اپنے تانگے والے سے کچھ نہ کہا۔ تین یا چار فراانگ چل کر وہ ایک ڈاک بنگلہ نما عمارت کے پاس رکا اور نیچے اتر گیا ”بھئیے صاحب.....“

میں نے پوچھا ”کہاں؟“

اس نے جواب دیا ”چڑھ صاحب کا مکان یہی ہے۔“

”اوہ“ میں نے سوالیہ نظروں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ اس کے تیروں نے مجھے بتایا کہ وہ چڑے کے مکان کے حق میں نہیں تھی۔ سچ پوچھیے تو وہ پونہ کے حق میں نہیں تھی۔ اس کو یقین تھا کہ مجھے وہاں پینے پلانے والے دوست مل جائیں گے۔ سکھر دور کرنے کا بہانہ پہلے ہی سے موجود ہے اس لیے دن رات اڑے گی..... میں تانگے سے اتر گیا۔ چھوٹا سا اٹیچی کیس تھا وہ میں نے اٹھایا اور اپنی بیوی سے کہا ”چلو!“

وہ غالباً میرے تیوروں سے پہچان گئی تھی کہ اسے ہر حالت میں میرا فیصلہ قبول کرنا ہوگا۔ چنانچہ اس نے جیل و جت نہ کی اور خاموش میرے ساتھ چل پڑی۔ بہت معمولی قسم کا مکان تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ملٹری والوں نے عارضی طور پر ایک چھوٹا سا بنگلہ بنایا تھا۔ تھوڑی دیر اسے استعمال کیا اور چھوڑ کر چلتے بنے۔ چونے اور گچ کا کام بڑا کچا تھا۔ جگہ جگہ سے پلستر اکھڑا ہوا تھا اور گھر کا اندرونی حصہ ویسا ہی تھا جیسا کہ ایک بے پروا کنوارے کا ہو سکتا ہے جو فلموں کا ہیرو ہو اور ایسی کمپنی میں ملازم ہو جہاں ماہانہ تنخواہ ہر تیسرے مہینے ملتی ہے اور وہ بھی کئی قسطوں میں۔

مجھے اس کا پورا احساس تھا کہ وہ عورت جو میری بیوی ہے ایسے گنبے ماحول میں یقیناً پریشانی اور گھٹن محسوس کرے گی۔ مگر میں نے یہ سوچا تھا کہ چپڑہ آجائے تو اس کے ساتھ ہی بھات نگر چلیں گے۔ وہاں جو میرا فلموں کا پرانا ساتھی رہتا تھا اس کی بیوی اور بال بچے بھی تھے۔ وہاں کے ماحول میں میری بیوی قبر درویش برجان درویش دو تین دن گزر سکتی تھی۔

نوکر بھی عجیب الاہالی آدمی تھا۔ جب ہم گھر میں داخل ہوئے تو سب دروازے کھلے تھے مگر وہ موجود نہیں تھا۔ جب آیا تو اس نے ہماری موجودگی کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ جیسے ہم ساہا سال سے وہیں بیٹھے تھے اور اسی طرح بیٹھے رہنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

جب وہ کمرے میں داخل ہو کر ہمیں دیکھے بغیر پاس سے گزر گیا تو میں سمجھا کہ شاید کوئی معمولی ایکٹر ہے جو چپڑہ کے ساتھ رہتا ہے۔ پر جب میں نے اس سے

نوکر کے بارے میں استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ وہی ذات شریف چٹہ صاحب کے چہیتے ملازم تھے۔

مجھے اور میری بیوی دونوں کو پیاس لگ رہی تھی۔ اس سے پانی لانے کو کہا تو وہ گلاس ڈھونڈنے لگا۔ بڑی دیر بعد اس نے ایک ٹوٹا ہوا لگ الماری سے نیچے سے نکالا اور بڑبڑایا ”رات ایک درجن گلاس صاحب نے منگوائے تھے معلوم نہیں کدھر گئے۔“

میں نے اس کے ہاتھ میں پڑے ہوئے شکستگ کی طرف اشارہ کیا ”کیا آپ اس میں تیل لینے جا رہے ہیں؟“

تیل لینے جانا۔ بمبئی کا ایک خاص محاورہ ہے۔ میری بیوی اس کا مطلب نہ سمجھی مگر ہنس پڑی۔ نوکر کسی قدر بوکھلا گیا۔ ”نہیں صاحب..... میں..... تپاس کر رہا تھا کہ گلاس کہاں ہیں؟“

میری بیوی نے اس کو پانی لانے سے منع کر دیا۔ اس نے وہ ٹوٹا ہوا لگ الماری کے نیچے اس انداز سے رکھا کہ جیسے وہی اس کی جگہ تھی۔ اگر اسے کہیں اور رکھ دیا جاتا تو یقیناً گھر کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ اس کے بعد وہ یوں کمرے سے باہر نکلا جیسے اس کو معلوم تھا کہ ہمارے منہ میں کتنے دانت ہیں۔

میں پلنگ پر بیٹھا تھا جو غالباً چٹے کا تھا۔ اس سے کچھ دور رہتے کر دو آرام دہ کرسیاں تھیں۔ ان میں سے ایک پر میری بیوی بیٹھی پہلو بدل رہی تھی۔ کافی دیر تک ہم دونوں خاموش رہے۔ اتنے میں چٹہ آگیا۔ وہ اکیلا تھا۔ اس کو اس بات کا قطعاً احساس نہیں تھا کہ ہم مہمان ہیں اور اس لحاظ سے ہماری خاطر داری اس پر

لازم تھی۔ کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی اس نے مجھ سے کہا ”ویٹ از ویٹ..... تو تم آگئے اولڈ بوائے..... چلو ذرا اسٹوڈیو تک ہو آئیں۔ تم ساتھ ہو گے تو ایڈوانس ملنے میں آسانی ہو جائے گی..... آج شام کو.....“ میری بیوی پر اس کی نظر پڑی تو وہ رک گیا اور کھلکھلا کر ہنسنے لگا ”بھابی جان کہیں آپ نے اسے مولوی تو نہیں بنا دیا“ پھر اور زور سے ہنسا ”مولویوں کی ایسی قیمتی اٹھو منٹو بھابی جان یہاں بیٹھی ہیں ہم ابھی آجائیں گے!“

میری بیوی جل کر پہلے کونہ تھی اب تو بالکل راکھ ہو گئی تھی۔ میں اٹھا اور چڑھ کید ساتھ بولیا۔ مجھے معلوم تھا کہ تصویریں دیر بیچ و تاب کھا کر وہ سو جائے گی چنانچہ یہی ہوا۔ اسٹوڈیو پاس ہی تھا۔ افراتفری میں مہتہ جی کے سر چڑھ کر چڑے نے مبلغ دو سو روپے وصول کیے اور ہم پون گھنٹے بعد جب واپس آئے تو دیکھا کہ وہ آرام کرسی پر بڑے آرام سے سو رہی تھی۔ ہم نے اسے بے آرام کرنا مناسب نہ سمجھا اور دوسرے کمرے میں چلے گئے جو کباڑ خانے سے ملتا جلتا تھا۔ اس میں جو چیز تھی حیرت انگیز طریقے سے ٹوٹی ہوئی تھی کہ سب مل کر ایک سالمگی اختیار کر گئی تھیں۔

ہر شے گرد آلود تھی اور اس آلودگی میں ایک ضروری پن تھا۔ جیسے اس کی موجودگی اس کمرے کی بو بھی فضا کی تکمیل کے لیے لازمی تھی۔ چڑے نے فوراً ہی اپنے نوکر کو ڈھونڈ نکالا اور اسے سو روپے کا نوٹ دے کر کہا ”چین کے شہزادے..... دو بوتلیں تھرڈ کلاس روم کی لے آؤ..... میرا مطلب ہے تھری ایکس روم کی اور نصف درجن گلاس“۔

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا نوکر صرف چین کا ہی نہیں دنیا کے ہر بڑے

ملک کا شہزادہ تھا۔ چڈے کی زبان پر جس ملک کا نام آتا وہ اسی کا شہزادہ بن جاتا تھا..... اس وقت چین کا شہزادہ سوکانوٹ انگلیوں سے کھڑکھڑاتا چلا گیا۔

چڈے نے ٹوٹے ہوئے سپرنگوں والے پلنگ پر بیٹھ کر اپنے ہونٹ تھری ایکس ریم کے استقبال میں چٹارتے ہوئے کہا ”دیٹ از دیٹ..... تو آفر آل تم ادھر آ ہی ٹھلے.....“ لیکن ایک دم متفکر ہو گیا ”یار بھابی کا کیا ہو..... وہ تو گھبرا جائے گی۔“

چڈہ بغیر بیوی کے تھا مگر اس کو دوسروں کی بیویوں کا بہت خیال رہتا تھا۔ وہ ان کا اس قدر احترام کرتا تھا کہ ساری عمر کنوارا رہنا چاہتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا ”یہ احساس کمتری ہے جس نے مجھے ابھی تک اس نعمت سے محروم رکھا ہے۔ جب شادی کا سوال آتا ہے تو فوراً تیار ہو جاتا ہوں لیکن بعد میں یہ سوچ کر کہ میں بیوی کے قابل نہیں ہوں ساری تیاری کو لند سٹور تیج میں ڈال دیتا ہوں۔“

رم فوراً ہی آگئی۔ اور گلاس بھی۔ چڈے نے چہ منگوائے تھے۔ اور چین کا شہزادہ تین لایا تھا۔ بقایا تین راستے میں ٹوٹ گئے تھے۔ چڈے نے ان کی کوئی پروا نہ کی اور خدا کا شکر کیا کہ بوتلمیں سلامت رہیں۔ ایک بوتل جلدی جلدی کھول کر اسنے گلاسوں میں رم ڈالی اور کہا ”تمہارے پونے آنے کی خوشی میں۔“

ہم دونوں نے لمبے لمبے گھونٹ بھرے اور گلاس خالی کر دیے۔

دوسرا دور شروع کر کے چڈہ اٹھا اور دوسرے کمرے میں دیکھ آیا میری بیوی ابھی تک سو رہی ہے۔ اس کو بہت ترس آیا اور کہنے لگا ”میں شور کرتا ہوں ان کی فیند کھل جائے گی..... پھر ایسا کریں گے..... ٹھہرو..... پہلے میں چائے منگواتا

ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے رم کا ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا اور نوکر کو آواز دی ”جیہکا کے شہزادے۔“

جیہکا کا شہزادہ فوراً ہی آگیا۔ چڑے نے اس سے کہا ”دیکھو مومی سے کہو ایک دم فسٹ کلاس چائے تیار کر کے بھیج دے..... ایک دم!“

نوکر چلا گیا۔ چڑے نے اپنا گلاس خالی کیا اور شریفانہ پیک ڈال کر کہا ”میں فی الحال زیادہ نہیں پیوں گا۔ پہلے چار پیک مجھے بہت جذباتی بنا دیتے ہیں۔ مجھے بھائی کو چھوڑنے تمہارے ساتھ پر بھات نگر جانا ہے۔“

آدھے گھنٹے کے بعد چائے آگئی۔ بہت صاف برتن تھے اور بڑے سلیقے سے ٹرے میں چنے ہوئے تھے۔ چڑے نے ٹی کو زری اٹھا کر چائے کی خوشبو سونگھی اور مسرت کا اظہار کیا ”مومی از اے جیول.....!“ پھر اس نے ایتھوپیا کے شہزادے پر برسن شروع کر دیا۔ اتنا شور مچایا کہ میرے کان بلبلا اٹھے۔ اس کے بعد اس نے ٹرے اٹھائی اور مجھ سے کہا ”آؤ۔“

میری بیوی جاگ رہی تھی۔ چڑے نے ٹرے بڑی صفائی سے شکستہ تپائی پر رکھی اور مودبانہ کہا ”چائے حاضر ہے بیگم صاحب۔“

میری بیوی کو یہ مذاق پسند نہیں آیا لیکن چائے کا سامان چونکہ صاف ستھرا تھا اس لیے اس نے انکار نہ کیا اور دو پیالیاں پی لیں۔ ان سے اس کو کچھ فرحت پہنچی اور اس نے ہم دونوں سے مخاطب ہو کر معنی خیز لہجے میں کہا ”آپ اپنی چائے تو پہلے ہی پی چکے ہیں!“

میں نے جواب نہ دیا مگر چڑے نے جھک کر بڑے ایماندارانہ طور پر کہا ”جی

ہاں یہ غلطی ہم سے سرزد ہو چکی ہے لیکن ہمیں یقین تھا کہ آپ ضرور معاف کر دیں گی۔“

میری بیوی مسکرائی تو وہ کھلکھلا کے ہنسا ”ہم دونوں بہت اونچی نسل کے سو رہے ہیں..... جن پر حرام شے حلال ہے!..... چلیے اب ہم آپ کو مسجد چھوڑ آئیں!“

میری بیوی کو پھر چڑے کا یہ مذاق پسند نہ آیا۔ دراصل اس کو چڑے ہی سے نفرت نہ تھی بلکہ یوں کہیے کہ میرے ہر دوست سے نفرت تھی۔ اور چڑہ بالخصوص اسے بہت کھلتا تھا۔ اس لیے کہ وہ بعض اوقات بے تکلفی کی حدود بھی پھاند جاتا تھا مگر چڑے کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ میرا خیال ہے اس نے کبھی اس بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ ایسی فضول باتوں میں دماغ خرچ کرنا ایک ایسی اندر و گیم سمجھتا تھا جو لوڈو سے کئی گنا لالچنی ہے۔ اس نے میری بیوی کے جلے بھنے تیروں کو بڑی ہشاش بشاش آنکھوں سے دیکھا اور نوکر کو آواز دی ”کہا بہتان کے شہزادے..... ایک عدد تانگہ لاؤ۔ رولز رائس قسم کا۔“

کہا بہتان کا شہزادہ چلا گیا اور ساتھ ہی چڑہ۔ وہ غالباً دوسرے کمرے میں گیا تھا۔ تخیلہ ملا تو میں نے اپنی بیوی کو سمجھایا کہ کہاب ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ انسان کی زندگی میں ایسے لمحات بھی آ جی جایا کرتے ہیں۔ جو وہ گمان میں بھی نہیں ہوتے۔ ان کو بسر کرنے کے لیے سب سے اچھا طریقہ یہی ہے کہ ان کو گزر جانے دیا جائے۔ لیکن حسب معمول اس نے میری اس کفنیو شہساز نہ نصیحت کو پلے نہ باندھا اور بڑبڑاتی رہی۔ اتنے میں کہا بہتان کا شہزادہ رولز رائس قسم کا تانگہ لے کر آ گیا۔ ہم پر بھات نگر رہا نہ ہو گئے۔

بہت ہی اچھا ہوا کہ میرا فلموں کا پرانا ساتھی گھر میں موجود نہیں تھا۔ اس کی بیوی تھی چڈے نے میری بیوی اس کے پیرو کی اور کہا ”خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ پڑتا ہے بیوی بیوی کو دیکھ کر رنگ پڑتی ہے۔ یہ ہم ابھی حاضر ہو کے دیکھیں گے۔“ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا ”چلو منلو! اسٹوڈیو میں تمہارے دوست کو پکڑیں۔“

چڈہ کچھ ایسی افراتفری مچا دیا کرتا تھا کہ مخالف قوتوں کو کچھ سوچنے کا موقع کم ملتا تھا۔ اس نے میرا زو پکڑا اور باہر لے گیا میری بیوی سوچتی رہ گئی۔ تانگے میں سوار ہو کر چڈے نے اب کچھ سوچنے کے انداز میں کہا ”یہ تو ہو گیا..... اب کیا پروگرام ہے؟“ پھر کھلکھا کر ہنسا ”ممی..... گریت ممی!“

میں اس سے پوچھنے ہی والا تھا یہ ممی کس توخ مامون کی اولاد ہے کہ چڈے نے باتوں کا کچھ ایسا سلسلہ شروع کر دیا کہ میرا استفسار غیر ملکی موت مر گیا۔

تانگہ واپس اس ڈاک بنگلہ نما کوٹھی پر پہنچا جس کا نام سعیدہ کاٹج تھا۔ مگر چڈہ اس کا کبیدہ کاٹج کہتا تھا۔ اس لیے کہ آئیں رہنے والے سب کے سب کبیدہ خاطر رہتے تھے۔ حالانکہ یہ غلط تھا جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔

اس کاٹج میں کافی آدمی رہتے تھے حالانکہ بادی النظر میں یہ جگہ بالکل غیر آباد معلوم ہوتی تھی۔ سب کے سب اسی فلم کمپنی کے ملازم تھے جو ممین کی تحواہ ہر سہ ماہی کے بعد ہی دیتی تھی اور وہ بھی کئی قسطوں میں۔ ایک ایک کر کے جب اس کے ساکنوں سے میرا تعارف ہوا تو پتا چلا کہ سب اسٹنٹ ڈائریکٹر تھے۔ کوئی چیف اسٹنٹ ڈائریکٹر کوئی اس کا نائب کوئی نائب در نائب ہر دوسرا کسی پہلے کا

اسٹنٹ تھا اور اپنی ذاتی فلم کمپنی کی بنیادیں استوار کرنے کے لیے سرمایہ فراہم کر رہا تھا۔ پوشش اور وضع قطع کے اعتبار سے ہر ایک ہیرو معلوم ہوتا تھا۔ کنٹرول کا زمانہ تھا۔ مگر کسی کے پاس راشن کارڈ نہیں تھا۔ وہ چیزیں جو جوڑی سی تکلیف کے بعد آسانی سے کم قیمت پر دستیاب ہو سکتی تھیں یہ لوگ بلیک مارکیٹ سے خریدتے تھے پکڑے ہوئے دیکھتے تھے۔ ریس کا موسم ہو تو ریس کھلتے تھے ورنہ سڑ جیتے شاذ و نادر تھے مگر ہارتے ہر روز تھے۔

سعیدہ کاٹیج کی آبادی بہت گنجان تھی۔ چونکہ جگہ کم تھی اس لیے موٹر گراج بھی رہائش کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس میں ایک فیملی رہتی تھی۔ شیریں نام کی ایک عورت تھی جس کا خاوند شاید محض یکسانیت توڑنے کے لیے اسٹنٹ ڈائریکٹر نہیں تھا۔ وہ اسی فلم کمپنی میں ملازم تھا مگر موٹر ڈرائیور تھا۔ معلوم نہیں وہ کب آتا تھا..... اور کب جاتا تھا کیونکہ میں نے اس شریف آدمی کو وہاں کبھی نہیں دیکھا..... شیریں کے بطن سے ایک چھوٹا سا لڑکا تھا جس کو سعیدہ کاٹیج کے تمام ساکن فرصت کے اوقات میں پیار کرتے تھے۔ شیریں جو قبول صورت تھی اپنا بیشتر وقت گراج کے اندر گزارتی تھی۔

کاٹیج کا معزز حصہ چڑے اور اس کے دو ساتھیوں کے پاس تھا۔ یہ دونوں بھی ایکٹرتھے مگر ہیرو نہیں تھے۔ ایک سعیدہ تھا جس کا فلمی نام رنجیت مار تھا..... چڑہ کہا کرتا تھا ”سعیدہ کاٹیج اسی خروافات کے نام کی رعایت سے مشہور ہے ورنہ اس کا نام کبیدہ کاٹیج ہی تھا“۔ خوش شکل تھا اور بہت کم گو۔ چڑہ کبھی کبھی اسے کچھوا کہا کرتا تھا اس لیے کہ وہ ہر کام بہت آہستہ آہستہ کرتا تھا۔

دوسرے ایکٹر کا نام معلوم نہیں کیا تھا مگر سب اسے غریب نواز کہتے تھے۔
 حیدر آباد کے ایک متمول گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ ایکٹنگ کا شوق میں یہاں چلا
 آیا تھا۔ تنخواہ ڈھائی سو روپے ماہوار مقرر تھی۔ ایک برس ہو گیا تھا ملازم ہوئے مگر
 اس دوران می اس نے صرف ایک دفعہ ڈھائی سو روپے بطور ایڈوانس لیے تھے وہ
 بھی چڑے کے لیے کہ اس پر ایک بڑے خونخوار پٹھان کے قرض کی ادائیگی لازم
 ہو گئی تھی۔ ”ادب لطیف“ قسم کی عبارت میں فلمی کہانیاں لکھنا اس کا شغل تھا۔ کبھی
 کبھی شعر بھی موزوں کر لیتا تھا۔ کانچ کا ہر شخص اس کا مقروض تھا۔

تکلیل اور عقیل دو بھائی تھے۔ دونوں کسی اسٹنٹ ڈائریکٹر کے اسٹنٹ
 تھے اور برعکس نام نہند نام زنگی با کافور کی ضرب المثل کے ابطال کی کوشش میں ہمہ
 تن مصروف رہتے تھے۔

بڑے تین یعنی چڑہ سعید اور غریب نواز شیریں کا بہت خیال رکھتے تھے لیکن
 تینوں اکٹھے گراج میں نہیں جاتے تھے۔ مزاج پرسی کا کوئی وقت بھی مقرر نہیں تھا۔
 تینوں جب کانچ کے بڑے کمرے میں جمع ہوتے تو ان میں سے ایک اٹھ کر گراج
 میں چلا جاتا اور کچھ دیروہاں بیٹھ کر شیریں سے گھریلو معاملات پر بات چیت کرتا
 رہتا۔ باقی دو اپنے اشغال میں مصروف رہتے۔

جو اسٹنٹ قسم کے لوگ تھے وہ شیریں کا ہاتھ بنایا کرتے تھے۔ کبھی بازار
 سے اس کو سودا سلف لادیا۔ کبھی لائڈری میں اس کے کپڑے دھلنے دے آئے اور
 کبھی اس کے روتے بچے کو بہا دیا۔

ان میں سے کبیدہ خاطر کوئی بھی نہ تھا۔ سب کے سب مسرور تھے۔ شاید اپنی

کبیدگی پر وہ اپنے حالات کی نامساعدت کا ذکر بھی کرتے تھے تو بڑے شاداں و
فرحان انداز میں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی زندگی بہت دلچسپ تھی۔

ہم کالج کے گیٹ میں داخل ہونے والے تھے کہ غریب نواز صاحب باہر آ
رہے تھے۔ چڑے نے ان کی طرف غور سے دیکھا اور اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر
نوٹ نکالے۔ بغیر گنے اس نے کچھ غریب نواز کو دیے اور کہا ”چار بولٹیں اس کالج
کی چاہئیں۔ کمی آپ پوری کر دیجیے گا۔ بیشی ہو تو وہ مجھے واپس مل جائے۔“

غریب نواز کے حیدر آبادی ہونٹوں پر گہری سانولی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔
چڑہ کھلکھلا کر ہنسا اور میری طرف دیکھ کر اس نے غریب نواز سے کہا ”یہ مسٹرون ٹو
ہیں..... لیکن ان سے مفصل ملاقات کی اجازت اس وقت نہیں مل سکتی۔ یہ ریم پے
ہیں۔ شام کو اس کالج آجائے تو..... لیکن آپ جانیے۔“

غریب نواز چلا گیا۔ ہم اندر داخل ہوئے۔ چڑے نے ایک زور کی جمائی لی
اور روم کی بوتل اٹھائی جو نصف سے زیادہ خالی ہو چکی تھی۔ اس نے روشنی میں مقدار
کا سرسری اندازہ کیا اور نوکر کو آواز دی ”قرآنستان کے شہزادے“۔ جب وہ نمودار
نہ ہوا تو اس نے اپنے گلاس میں ایک بڑا پیگ ڈالتے ہوئے کہا ”زیادہ پی گیا ہے
کم بخت!“

یہ گلاس ختم کر کے وہ کچھ فکر مند ہو گیا ”یار بھابی کو تم خواہ مخواہ یہاں لائے.....
خدا کی قسم مجھے اپنے سینے پر ایک بوجھ سا محسوس ہو رہا ہے۔“ پھر اس نے خود ہی
اپنے آپ کو تسکین دی ”لیکن میرا خیال ہے کہ یو نہیں ہوں گی وہاں؟“
میں نے کہا ”ہاں وہاں رہ کر وہ میرے قتل کا فوری ارادہ نہیں کر سکتی۔“ اور میں

نے اپنے گلاس میں رم ڈالی جس کا ذائقہ بے ہونے لڑکی طرح تھا۔
 جس کباڑ خانے میں ہم بیٹھے تھے اس میں سلاخوں والی دو کھڑکیاں تھیں جن
 سے باہر کا غیر آباد حصہ نظر آتا تھا۔ ادھر کسی نے با آواز بلند چڑھ کا نام لے کر پکارا۔
 میں چونک پڑا۔ دیکھا کہ میوزک ڈائریکٹرون کترے ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا
 کہ وہ کس نسل کا ہے۔ منگولی ہے جیسی ہے آریہ ہے یا کیا بایا ہے۔ کبھی کبھی اس کے
 خدو خال کو دیکھ کر آدمی کسی نتیجے پر پہنچے ہی والا ہوتا تھا کہ اس کے مقابل میں کوئی ایسا
 نقش نظر آ جاتا کہ فوراً ہی نئے سرے سے غور کرنا پڑ جاتا۔ ویسے وہ مر جہ تھا مگر شیوا
 جی کی تیکھی ناک کے بجائے اس کے چہرے پر بڑے حیرت ناک طریقے پر مڑی
 ہوئی چوٹی ناک تھی جو اس کے خیال کے مطابق ان سروں کے لیے بہت ضروری
 تھی۔ جن کا تعلق براہ راست ناک سے ہوتا ہے۔ اس نے مجھے دیکھا تو چلایا ”
 منٹو..... منٹو سیٹھ۔“

چڑے نے اس سے زیادہ اونچی آواز میں کہا ”سیٹھ کی ایسی کی تیسری..... چل
 اندر آ۔“

وہ فوراً اندر آ گیا۔ اپنی جیب سے اس نے ہنستے ہوئے رم کی ایک بوتل نکالی
 اور تپائی پر رکھ دی ”میں سالہا ادھر مٹی کے پاس گیا وہ بولا تمہارا فرینڈ آئے لا.....
 میں بولا سالہا یہ فرینڈ کون ہونے کو سکتا ہے..... سالہا مالوم نہ تھا سالہا منٹو ہے۔“
 چڑے نے ون کترے کے کدو ایسے سر پر ایک دھول جمانی ”اب چپ کر
 سالے کے..... تو رم لے آیا..... بس ٹھیک ہے“ ون کترے نے اپنا سر ہلایا اور
 میرا خالی گلاس اٹھا کر اپنے لیے پیک تیار کیا۔ ”منٹو..... یہ سالہا آج ملتے ہی کہنے

لگا۔ آج پینے کو جی چاہتا ہے..... میں ایک دم کڑکا..... سوچا کیا کروں.....“
چڑے نے ایک اور دھپا اس کے سر پر جمایا ”بیٹھ بے جیسے تو نے کچھ سوچا ہی
ہوگا۔“

”سوچا نہیں تو سالہا یہ اتنی بڑی بائلی کہاں سے آیا..... تیرے باپ نے دیا مجھ
کو۔“

ون کترے نے ایک ہی جرے میں رم ختم کر دی۔ چڑے نے اس کی بات
سنی اس سنی کر دی اور اس سے پوچھا ”تو یہ تو بتا کہ می کیا بولی..... بولی تھی؟.....
موزیل کب آئے گی؟..... ارے ہاں..... وہ پلیٹنم بلونڈ!“

ون کترے نے جواب میں کچھ کہنا چاہا مگر چڑے نے میرا بازو پکڑ کر کہنا
شروع کر دیا ”منٹو..... خدا کی قسم کیا چیز ہے..... سنا کرتے تھے کہ ایک شے پلیٹنم
بلونڈ بھی ہوتی ہے مگر دیکھنے کا اتفاق کل ہوا..... بال ہیں جیسے چاندی کے مہین مہین
تار..... گریت..... خدا کی قسم منٹو بہت گریت..... ممی زندہ باد!“ پھر اس نے قہر
آلود لٹکا ہوں سے ون کترے کی طرف دیکھا اور کڑک کر کہا۔ ”کن کترے کے
بچے..... نعرہ کیوں نہیں لگاتا..... ممی زندہ باد!“

چڑے اور ون کترے دونوں نے مل کر ”ممی زندہ باد“ کے کئی نعرے لگائے
اس کے بعد ون کترے نے چڑے کے سوالوں کا جواب دینا چاہا مگر اس نے
اسے خاموش کر دیا ”چھوڑو یا ر..... میں جذباتی ہو گیا ہوں..... اس وقت یہ سوچ
رہا ہوں کہ عام طور پر معشوق کے بال سیاہ ہوتے ہیں جنہیں کالی گھٹنا سے تھپیہ دی
جاتی ہے مگر یہاں کچھ اور ہی سلسلہ ہو گیا ہے.....“ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا ”منٹو

..... بڑی گڑبڑ وہ گئی ہے اس کے بال چاندی کے تاروں جیسے ہیں..... چاندی کا رنگ بھی نہیں کہا جاسکتا..... معلوم نہیں پلیٹنم کا رنگ کیسا ہوتا ہے کیونکہ میں نے ابھی تک یہ وصات نہیں دیکھی..... کچھ عجیب سا ہی رنگ ہے..... فولا د اور چاندی دونوں کو ملا دیا جائے.....“

ون کترے نے دوسرا پیک ختم کیا اور اس میں تھوڑی سی ایکس ریم کس کر دی جائے۔“

چڈے نے بھنا کر اس کو ایک فرہ اندام گالی دی..... ”بکواس نہ کر“ پھر اس نے بڑی رحم انگیز نظروں سے میری طرف دیکھا ”یار..... میں واقعی جذباتی ہو گیا ہوں..... ہاں..... وہ رنگ..... خدا کی قسم لا جواب رنگ ہے..... وہ تم نے دیکھا ہے..... وہ جو مچھلیوں کے پیٹ پر ہوتا ہے..... نہیں نہیں ہر جگہ ہوتا ہے..... پومفریٹ مچھلی..... اس کے وہ کیا ہوتے ہیں؟..... نہیں نہیں..... سانپوں کے..... وہ ننھے ننھے کچرے..... ہاں..... کچرے..... بس ان کا رنگ کچرے..... یہ لفظ مجھے ایک ہند ستوڑے نے بتایا تھا..... اتنی خوبصورت چیز اور ایسا وہابیات نام..... پنجابی میں ہم انہیں چانے کہتے ہیں..... اس لفظ میں چنچنا ہٹ ہے..... وہی بالکل وہی جو اس کے بالوں میں ہے..... لئیں ننھی ننھی سنپولیاں معلوم ہوتی ہیں جو لوٹ لگا رہی ہوں.....“ وہ ایک دم اٹھا ”سنپولیوں کی ایسی قسمی“ میں جذباتی ہو گیا ہوں۔“

ون کترے نے بڑے بھولے انداز میں پوچھا ”وہ کیا ہوتا ہے؟“

چڈے نے جواب دیا ”سنی منل..... لیکن تو کیا سمجھے گا بالاجی باجی راؤ اور نا

فرنولیس کی اولاد.....“

ون کترے نے اپنے لیے ایک اور پیگ بنایا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ”یہ سال چڑھ سمجھتا ہے میں انگلش نہیں سمجھتا۔ میٹری کو لیت ہوں..... سال میرا باپ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا..... اس نے.....“

چڑے نے چڑھ کر کہا ”اسنے تجھے تان سین بنا دیا..... تیری ناک مروڑ دی کہ نگوڑے سر آسانی سے تیرے اندر سے نکل سکیں..... بچپن ہی میں اس نے تجھے دھڑپ کا سکھا دیا تھا۔ اور وہ دھڑپنے تو میاں کی ٹوڈی میں رویا کرتا تھا اور پیشاب کرتے وقت اڑانہ میں..... اور تو نے پہلی بات چٹ دھکی میں کی تھی۔ اور تیرا باپ جلت استاد تھا۔ بجو باؤرے کے بھی کان کاٹا تھا..... اور تو آج اس کے کان کاٹا ہے۔ اسی لیے تیرا نام کن کترے ہے!“ اتنا کہہ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوا ”مننو..... یہ سال جب بھی پیتا ہے اپنے باپ کی تعریفیں شروع کر دیتا ہے..... وہ اس سے محبت کرتا تھا تو مجھ پر اس نے کیا احسان کیا اور اس نے اسے میٹری کو لیت بنا دیا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اپنی بی اے کی ڈگری چھاڑ کے پھینک دوں۔

ون کترے نے اس بو چھاڑ کی مدافعت کرنا چاہی مگر چڑے نے اس کو وہیں دبا دیا ”چپ رہ..... میں کہہ چکا ہوں کہ سنٹی منغل ہو گیا ہوں..... ہاں وہ رنگ..... پومفریٹ مچھلی کے..... نہیں نہیں..... سانپ کے ننھے ننھے کپھرے..... بس انہی کا رنگ..... مئی نے خدا معلوم اپن بین پر کون سا راگ بجا کر اس ناگن کو باہر نکالا؟“

ون کترے سوچنے لگا ”چیئ منگاؤ میں بجاتا ہوں۔“

چڈہ کھلکھلا کر ہنسنے لگا ”ہینہ بے میٹری کو لیٹ کے چاکو لیٹ.....“ اس نے رم کی بوتل میں سے رم کے باقیات اپنے گلاس میں انڈیلے اور مجھ سے کہا ”منٹو اگر یہ پلیٹنم بلونڈ نہ پٹی تو مسٹر چڈہ ہمالیہ پیمار کی کسی اونچی چوٹی پر دھونی مار کر بیٹھ جائے گا.....“ اور اس نے گلاس خالی کر دیا۔

ون کترے نے اپنی لائی ہوئی بوتل کھولنی شروع کی ”منٹو ملکی ایک دم جاگلی ہے.....“
میں نے کہا ”دیکھ لیں گے۔“

”آج ہی..... آج رات میں ایک پارٹی دے رہا ہوں۔ یہ بہت ہی اچھا ہوا کہ تم آگے اور شری ایک سو آٹھ مہتا جی نے تمہاری وجہ سے مجھے وہ ایڈوانس دے دیا ورنہ بڑی مشکل ہو جاتی..... آج کی رات..... آج کی رات.....“ چڈے نے بڑے جھونڈے سروں میں گانا شروع کر دیا۔

آج کی رات سازدرون چھیڑ!

ون کترے بیچارہ اس کی اس زیادتی پر صدائے احتجاج بلند کرنے ہی والا تھا کہ غریب نواز اور رنجیت مار آگئے۔ دونوں کے پاس سکاچ کی دو دو بوتلیں تھیں۔ یہ انہوں نے میز پر رکھیں۔ رنجیت مار سے میرے خاصے اچھے مراسم تھے مگر بے تکلف نہیں۔ اس لیے ہم دونوں نے تھوڑی سی آپ کب آئے آج ہی آیا ایسی رمی گفتگو کی اور گلاس کرا کر پینے میں مشغول ہو گئے۔

چڈہ واقعی بہت جذباتی ہو گیا تھا۔ ہر بات میں اس پلیٹنم بلونڈ کا ڈکر لے آتا تھا۔ رنجیت مار دوسری بوتل کا چوتھائی حصہ چڑھا گیا تھا۔ غریب نواز نے سکاچ کے

تین پیک پیے تھے۔ نشے کے معاملے میں اب ان سب کی سطح ایک ایسی تھی۔ میں چونکہ زیادہ پینے کا عادی ہوں اس لیے میرے جذبات معتدل تھے۔ میں نے ان کی گفتگو سے اندازہ لگایا کہ وہ چاروں اس نئی لڑکی پر بہت فریفتہ تھے۔ جو می نے کہیں سے پیدا کی تھی۔ اس نایاب دانے کا نام فی لس تھا۔ پونے میں کوئی ہینر ڈرینگ سیلون تھا جہاں وہ ملازم تھی۔ اس کے ساتھ عام طور پر ایک بچہ رہتا تھا۔ رہتا تھا۔ لڑکی کی عمر چودہ پندرہ برس کے قریب تھی۔ غریب نواز تو یہاں تک اس پر گرم تھا کہ وہ حیدرآباد میں اپنے حصے کی جائیداد بیچ کر بھی اس واؤں پر لگانے کے لیے تیار تھا۔ چڈے کے پاس تپ کا صرف ایک پتا تھا اپنا قبول صورت ہوتا۔ وہ کترے کا بزم خود یہ خیال تھا کہ اس کی بیٹی سن کر وہ پری ضرور شیشے میں اتر آئے گی۔ اور رنجیت مار جا رہا نہ اقدام کو ہی کارگر سمجھتا تھا..... لیکن سب آخر میں یہی سوچتے تھے کہ دیکھیے می کسی پر مہربان ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس پلیٹنم بلونڈی فی لس کو وہ عورت جسے میں نے چڈے کے ساتھ ٹانگے میں دیکھا تھا کسی کے بھی حوالے کر سکتی تھی۔

فی لس کی باتیں کرتے کرتے چڈے نے اچانک اپنی گھڑی دیکھی اور مجھ سے کہا ”جہنم میں جائے یہ لونڈیا..... چلو یار..... بھائی وہاں کباب ہو رہی ہوگی..... لیکن مصیبت ہے کہ میں کہیں وہاں بھی سینٹی منخل نہ ہو جاؤں..... خیر تم سنبھال لینا.....“ اپنے گاہکوں کے چند آخری قطرے حلق میں ڈپکا کر اس نے نوکر کو آواز دی ”میوں کے ملک مصر کے شہزادے“۔

میوں کے ملک کا شہزادہ آنکھیں ملتا ہوا نمودار ہوا جیسے کسی نے اسے صدیوں

کے بعد کھود کھا دکر نکالا ہے۔ چڈے نے اس کے چہرے پر رم کے چھینٹے مارے اور کہا ”دو عدد نائگے لاؤ..... جو صری رتھ معلوم ہوں۔“

نائگے آگئے۔ ہم سب ان پر لد کر پر بھات نگر روانہ ہو گئے..... میرا پرانا فلموں کا ساتھی ہریش گھر پر موجود تھا۔ اور دو دراز جا پہنچا اس نے میری بیوی کی خاطر مدارت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ چڈے نے آنکھ کے اشارے سے اس کو سارا معاملہ سمجھا دیا۔ چنانچہ یہ بہت کارآمد ثابت ہوا۔ میری بیوی نے غیض و غضب کا اظہار نہ کیا۔ اس کا وقت وہاں کچھ اچھا ہی کٹا تھا۔ ہریش نے جو عورتوں کی نفسیات کا ماہر تھا۔ بڑی پر لطف باتیں کیں اور آخر میں میری بیوی سے درخواست کی کہ وہ اس کی شوٹنگ دیکھنے چلے جو اس روز ہونے والی تھی۔ میری بیوی نے پوچھا ”کوئی گانا فلما رہے ہیں آپ؟“

ہریش نے جواب دیا ”جی نہیں..... وہ کل کا پروگرام ہے..... میرا خیال ہے آپ کل چلیے گا۔“

ہریش کی بیوی شوٹنگ دیکھ دیکھ کر اور دکھا دکھا کر عاجز آئی ہوئی تھی اس نے فوراً ہی میری بیوی سے کہا ”ہاں کل ٹھیک رہے گا..... آج تو انہیں سفر کی تھکن بھی ہے۔“

ہم سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ ہریش نے پھر کچھ دیر تک پر لطف باتیں کیں۔ آخر میں مجھ سے کہا ”چلو یا..... تم میرے ساتھ چلو۔“ اور میرے تین ساتھیوں کی طرف دیکھا ”ان کو چھوڑو..... سیٹھ صاحب تمہاری کہانی سننا چاہتے ہیں۔“

میں نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور ہریش سے کہا ”ان سے اجازت لے لو۔“

میری سادہ لوح بیوی جال میں پھنس چکی تھی۔ اس نے ہریش سے کہا ”میں نے ہمیں سے چلتے وقت ان سے کہا بھی تھا کہ اپنا ڈوکیومنٹ کیس ساتھ لے چلیے پر انہوں نے کہا کوئی ضرورت نہیں..... اب یہ کہانی کیا سنائیں گے۔“

ہریش نے کہا ”زبانی سنا دے گا“ پھر اس نے میری طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہے کہ ہاں کہہ جلدی۔

میں نے اطمینان سے کہا ”ہاں ایسا ہوسکتا ہے!“۔

چڈے نے اس ڈرامے میں تکمیلی ٹچ دیا ”تو بھی ہم چلتے ہیں“۔ اور وہ تینوں اٹھ کر سلام خمستے کر کے چلے گئے۔ جھوڑی دیر کے بعد میں اور ہریش نکلے.....

پر بھات نگر کے باہر مانگے کھڑے تھے۔ چڈے نے ہمیں دیکھا تو زور کا نعرہ بلند کیا ”رہہ ہریش چندر زندہ باد.....“

ہریش کے سوا ہم سب مٹی کے گھر روانہ ہو گئے۔ اس کو اپنی ایک کھپلی سے ملنے جانا تھا۔

یہ بھی ایک کاٹج تھی شکل و صورت اور ساخت کیا تبار سے سعیدہ کاٹج جیسی..... مگر بہت صاف ستھری جس سے مٹی کے سلیتے اور قرینے کا پتا چلتا تھا۔ فرنیچر معمولی تھا مگر جو چیز جہاں تھی ہوئی تھی۔ پر بھات نگر سے چلتے وقت میں نے سوچا تھا کہ کوئی فتبہ خانہ ہو گا مگر اس گھر کی کسی چیز سے بھی بصارت کو ایسا شک نہیں ہوتا تھا۔ وہ ویسا ہی شریفانہ تھا جیسا کہ ایک اوسط درجے کے عیسائی کا ہوتا ہے لیکن مٹی

کی عمر کے مقابلے میں وہ جان دکھائی دیتا تھا۔ اس پر وہ میک اپ نہیں تھا جو میں نے ممی کے جھڑیوں والے چہرے پر دیکھا تھا۔ جب ممی ڈرائنگ روم میں آئی تو میں نے سوچا کہ گروڈ پیش کی جتنی چیزیں ہیں وہ آج کی نہیں بہت برسوں کی ہیں۔ صرف ممی آگے نکل کر بوڑھی ہو گئی ہے۔ اور وہ ویسی کی ویسی ہی پڑی رہی ہیں..... ان کی جو عمر تھی وہ وہ ہیں کی وہیں رہی ہے..... لیکن جب میں نے اس کے گہرے اور شوخ میک اپ کی طرف دیکھا تو میرے دل میں نہ جانے کیوں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ بھی اپنے گروڈ پیش کے ماحول کی طرح سنجیدہ و متین طور پر جوان بن جائے۔

چڈے نے میرا تعارف کروایا جو بہت مختصر تھا۔ اور اختصار ہی کے ساتھ اس نے ممی کے متعلق مجھ سے یہ کہا ”یہ ممی ہے..... دی گریت ممی“

ممی اپنی تعریف سن کر مسکرا دی اور میری طرف دیکھ کر اس نے چڈے سے انگریزی میں کہا ”تم نے چائے منگوائی تھی حسب معمول نہایت افراتفری میں..... معلوم نہیں پسند بھی آئی ہو گی یا نہیں“۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی ”مسٹر منمو میں بہت شرمندہ ہوں..... اصل میں سارا قصور تمہارے دوست چڈے کا ہے..... جو میرا ناقابل اصلاح لڑکا ہے“۔

میں نے مناسب و موزوں الفاظ میں چائے کی تعریف کی اور اس کا شکریہ ادا کیا۔

ممی نے مجھے فضول کی تعریف سے منع کیا اور چڈے سے کہا ”رات کا کھانا تیار ہے..... یہ میں نے اس لیے کیا ہے کہ تم عین وقت کے وقت میرے سر پر سوار ہو

جاؤ گے۔۔۔۔۔“

چڈے نے ممی کو نگے سے لگا لیا ”یو آ ر اے جیول ممی۔۔۔۔۔ یہ کھانا اب ہم کھائیں گے۔“

ممی نے چونک کر پوچھا ”کیا؟۔۔۔۔۔ نہیں ہرگز نہیں۔“

چڈے نے اسے بتایا ”مسز منٹو کو ہم پر بھارت نگر چھوڑ آئے ہیں۔“

ممی چلائی ”خدا تمہیں غارت کرے۔۔۔۔۔ یہ تم نے کیا کیا۔۔۔۔۔“

چڈہ کھلکھا کر ہنسا ”آج پارٹی جو ہونے والی تھی۔“

وہ تو میں نے مسز منٹو کو دیکھتے ہی اپنے دل میں کینسل کر دی تھی، ممی نے اپنا سگریٹ ساگایا۔

چڈے کا دل ڈوب گیا ”خدا اب تمہیں غارت کرے۔۔۔۔۔ اور یہ سب پان ہم

نے صرف اس پارٹی کے لیے بنایا تھا۔“ وہ کرسی پر یاس زدہ ہو کر بیٹھ گیا اور کمرے

میں ہر ذرے سے مخاطب ہو کر کہنے لگا ”لو سارے خواب ملایا میٹ ہو گئے۔۔۔۔۔“

پلیٹی نم بلونڈ۔۔۔۔۔ اوندھے سانپ کے ننھے ننھے کچھروں جیسے رنگ والے بال۔۔۔۔۔“

ایک دم اس نے اٹھ کر ممی کو بازوؤں سے پکڑ لیا ”کینسل کی تھی۔۔۔۔۔ اپنے دل میں

کینسل کی تھی ہا۔۔۔۔۔ لو اس پر صاف بنا دیتا ہوں۔“ اور اس نے ممی کے دل کے مقام

پر انگلی سے ایک بہت بڑا صاف بنا دیا اور با آواز بلند پکارا ہرے۔۔۔۔۔“

ممی متعلقہ لوگوں کو اطلاع پہنچا چکی تھی کہ پارٹی منسوخ ہو چکی ہے۔ لیکن میں

نے محسوس کیا کہ وہ چڈے کو دلیکھ کر نہیں چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے بڑی شفقت

سے اس کے گال تھپتھپائے اور کہا ”تم فکر نہ کرو۔۔۔۔۔ میں ابھی انتظام کرتی ہوں۔“

وہ انتظام کرنے باہر چلی گئی۔ چڈے نے خوشی کا نعرہ بلند کیا اور ون کترے سے کہا ”جنرل ون کترے..... جاؤ ہیڈ کوارٹر سے ساری توپیں لے آؤ۔“
 ون کترے نے سیلوٹ کیا اور حکم کی تعمیل کے لیے چلا گیا۔ سعیدہ کا ٹیچ بالکل پاس تھی، دس منٹ کے اندر اندر وہ بوتلیں لے کر واپس پہنچا۔ ساتھ اس چڈے کا نوکر تھا۔ چڈے نے اس کو دیکھا تو اس کا استقبال کیا ”آؤ آؤ..... میرے کوہ قاف کے شہزادے..... وہ..... وہ سانپ کے کچھروں جیسے رنگ کے بالوں والی لونڈیا آ رہی ہے تم بھی قسمت آزمائی کر لینا۔“

رنجیت سمار اور غریب نواز دونوں چڈے کی یہ صلائے عام ہے یا ران نکتہ واں کے لیے والی بات بہت ناگوار معلوم ہوئی۔ دونوں نے مجھ سے کہا یہ چڈے کی بہت بے ہودگی ہے۔ اس بے ہودگی کو انہوں نے محسوس کیا تھا۔ چڈہ حسب عادت اپنی بانٹا رہا اور وہ خاموش ایک کونے میں بیٹھے آہستہ آہستہ رم پی کر ایک دوسرے سے اپنے دکھ کا اظہار کرتے رہے۔

میں مئی کے متعلق سوچتا رہا۔ ڈرائنگ روم میں غریب نواز رنجیت سمار اور چڈہ بیٹھے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ان کی ماں باہر کھلونا لینے گئی ہے۔ یہ سب منتظر ہیں۔ چڈہ مطمئن تھا کہ سب سے بڑھیا اور اچھا کھلونا اسے ملے گا۔ اس لیے کہ وہ اپنی ماں کا چہیتا ہے۔ باقی دو کا غم چونکہ ایک جیسا تھا۔ اس لیے وہ ایک دوسرے کے مونس بن گئے تھے..... شراب اس ماحول میں دودھ معلوم ہوتی تھی اور وہ پلیٹیم بلونڈ..... اس کا تصور ایک چھوٹی سی گڑیا کے مانند دماغ میں آتا تھا..... ہر فضا ہر ماحول کی اپنی موسیقی ہوتی ہے..... اس وقت جو موسیقی

میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی اس میں کوئی سر اشتعال انگیز نہیں تھا۔ ہر شے ماں اور اس کے بچے اور ان کے باہمی رشتے کی طرح قابل فہم اور یقینی تھی۔

میں نے جب اس کو تانگے میں چڑے کے ساتھ دیکھا تھا تو میری جمالیاتی حس کو صدمہ پہنچا تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میرے دل میں ان دونوں کے متعلق وہابیات خیال پسند ہوا لیکن یہ چیز مجھے بار بار ستا رہی تھی کہ وہ اتنا شوخ میک اپ کیوں کرتی ہے جو اس کی جھڑیوں کی توہین ہے۔ اس ممتا کی تضحیک ہے جو اس کے دل میں چڑے غریب نواز اور ون کترے کے لیے موجود ہے۔ اور خدا معلوم کس کس کے لیے.....

باتوں باتوں میں چڑے سے میں نے پوچھا ”یار یہ تو بتاؤ تمہاری ممتا اتنا شوخ میک اپ کیوں کرتی ہے؟“

”اس لیے کہ دنیا ہر شوخ چیز کو پسند کرتی ہے..... تمہارے اور میرے جیسے الو اس دنیا میں بہت کم بستے ہیں جو مدھم مدھم سر اور مدھم رنگ پسند کرتے ہیں۔ جو جوانی کو بچپن کے روپ میں نہیں دیکھنا چاہتے اور..... اور جو بڑھاپے پر جوانی کا طمع پسند نہیں کرتے..... ہم جو خود کو آڑٹ کہتے ہیں الو کے پٹھے ہیں..... میں تمہیں ایک دلچسپ واقعہ سناتا ہوں..... بیساکھی کا میلہ تھا..... تمہارے ام تر میں..... رام باغ کے اس بازار میں جہاں ٹلھیا نیاں رہتی ہیں..... جاٹ گزر رہے تھے..... ایک صحت مند جوان نے..... خالص دودھ اور مکھن پر پلے ہوئے جوان نے جس کی نئی جوتی اس کی لٹھی پر بازی گری کر رہی تھی اوپر ایک کوٹھے کی طرف دیکھا اور نہایت وہابیات رنگوں میں لپی تپی ایک سیاہ قام ٹلھیا نیاں کی طرف دیکھا جس کی

تیل میں چڑی ہوئی بہریاں اس کے ماتھے پر بڑے بدنما طریقے پر جمی ہوئی تھیں اور اپنے ساتھی کی پسلیوں پر ٹھوکا دے کر کہا..... اونے لہنا سیاں..... وینج اونے اوپر وینج..... اسی تے پنڈ وینج مجھاں ای.....“ آخر لفظ وہ خدا معلوم کیوں گول کر گیا حالانکہ وہ شائستگی کا بالکل قائل نہیں تھا۔ کھلکھلا کر ہنسنے لگا اور میرے گلاس میں رم ڈال کر بولا ”اس جاٹ کے لیے وہ چڑیل ہی اس وقت کوہ کاف کی پری تھی..... اور اس کے گاؤں کی حسین و جمیل میاںیں بے ڈول بھینسیں..... ہم سب چغد ہیں..... درمیانے درجے کے..... اس لیے کہ اس دنیا میں کوئی چیز اول درجے کی نہیں..... تیسرے درجے کی ہے یا درمیانے درجے کی..... لیکن..... لیکن فی لس..... خاص الخاص درجے کی چیز ہے..... وہ سانپ کے کپڑوں.....“

ون کترے نے اپنا گلاس اٹھا کر چڑے کے سر پر انڈیل دیا ”کچھرے..... کچھرے..... تمہارا مستک بھر گیا ہے۔“

چڑے نے ماتھے سے رم کے ٹپکتے ہوئے قطرے زبان سے چائے شروع کر دیے اور ون کترے سے کہا ”لے اب سنا..... تیرا باپ سا اچھ سے کتنی محبت کرتا تھا..... میرا دامغ اب کافی ٹھنڈا ہو گیا ہے۔“

ون کترے بہت سنجیدہ ہو کر مجھ سے مخاطب ہوا ”بائی گاڈ..... وہ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا..... میں فضیلت امر کا تھا کہ اس نے میری شادی بنا دی۔“

چڈ و زور سے ہنسا ”تمہیں کارٹون بنا دیا اس سالے نے..... بھگوان اسے سو رگ میں کیریل کی پیٹ دے کروہاں بھی اسے بجا بجا کر تمہاری شادی کے لیے کوئی خوبصورت حور ڈھونڈتا رہے۔“

ون کترے اور بھی سنجیدہ ہو گیا ”مننو..... میں جھوٹ نہیں کہتا..... میری
 وائف ایک دم بیوی نفل ہے..... ہماری فیملی میں.....“
 ”تمہاری فیملی کی ایسی کی تھی..... فی لس کی بات کرو..... اس سے زیادہ اور
 کوئی خوبصورت نہیں ہو سکتا“ چڈے نے غریب نواز اور رنجیت مہار کی طرف دیکھا
 جو کونے میں بیٹھے فی لس کے حسن کے متعلق اپنی اپنی رائے کا اظہار ایک دوسرے
 سے کرنے والے تھے ”گن پاؤڈر پلوٹ کے بانیو..... سن لو تمہاری کوئی سازش
 کامیاب نہیں ہوگی..... میدان چڈے کے ہاتھ میں رہے گا..... کیوں ویلز کے
 شہزادے؟“

ویلز کا شہزادہ رم کی خالی ہوتی ہوئی بوتل کی طرف حسرت بھری نظروں سے
 دیکھ رہا تھا۔ چڈے نے قہقہہ لگایا اور اس کا ادھا گلاس بھر کر دے دیا۔
 غریب نواز اور رنجیت مہار ایک دوسرے سے فی لس کے بارے میں مکمل مل
 کے باتیں تو کر رہے تھے مگر اپنے دماغ میں وہ اسے حاصل کرنے کی مختلف سکیمیں
 علیحدہ طور پر بنا رہے تھے۔ یہ ان کے طرز گفتگو سے صاف عیاں تھا۔
 ڈرائنگ روم میں بجلی کے بلب روشن تھے۔ کیونکہ شام گہری ہو چلی تھی۔ چڈہ
 مجھ سے بیسے کی فلم انڈسٹری کے تازہ حالات سن رہا تھا کہ باہر برآمدے میں مٹی کی
 تیز تیز آواز سنائی دی۔ چڈے نے نعرہ بلند کیا اور باہر چلا گیا۔ غریب نواز نے
 رنجیت مہار کی طرف اور رنجیت مہار نے غریب نواز کی طرف معنی خیز نظروں سے
 دیکھا۔ پھر دونوں دروازے کی جانب دیکھنے لگے۔

مٹی چبکتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ چار پانچ اینگلو انڈین لڑکیاں

تھیں۔ مختلف قد و قامت اور خطوط اوزان کی۔ پونی ڈولی کٹی لیدیا اور تھیلما..... اور وہ بچہ نما لڑکا..... اس کو چپہ سہی کہہ کر پکارتا تھا۔ فی لس سب سے آخر میں نمودار ہوئی اور وہ بھی چپہ کے ساتھ۔ اس کا ایک بازو اس پلیٹنم بلونڈ کی پتلی کمر میں حائل تھا۔ میں نے غریب نواز اور رنجیت مار کا رد عمل نوٹ کیا۔ ان کو چپہ کے کی یہ نمائشی فتح مند اندر حرکت پسند نہیں آئی۔

لڑکیوں کے نازل ہوتے ہی ایک شور برپا ہو گیا۔ ایک دم اتنی انگریزی رہی کہ وہ کترے میسری کو لینٹن امتحان میں کئی بار فیل ہوا۔ مگر اس نے کوئی پروا نہ کی اور برابر بولتا رہا۔ جب اس سے کسی نے التفات نہ برتا تو وہ لیدیا کی بڑی بہن تھیلما کے ساتھ ایک صوفے پر الگ بیٹھ گیا اور پوچھنے لگا کہ اس نے ہندوستانی ڈانس کے کتنے نئے ٹوڑے سیکھے ہیں۔ وہ ادھر دھانی ماکت اور تاتھی تھئی کی ون ڈو تھری بنا بنا کر اس کو توڑے بتا رہا تھا اور چپہ باقی لڑکیوں کے جھرمٹ میں انگریزی کے نئے نئے لہجے لہرک سنا رہا تھا۔ جو اس کو ہزاروں کی تعداد میں زبانی یاد تھے..... مٹی سوڈے کی بوتلیں اور گزک کا سامان منگوا رہی تھی۔ رنجیت مار سگریٹ کے کش لگا کر تنگی باندھے فی لس کی طرف دیکھ رہا تھا اور غریب نواز مٹی سے بار بار کہتا کہ روپے کم ہوں تو وہ اس سے لے لے۔

اسکاچ کھلی اور پہلا دور شروع ہوا۔ فی لس کو جب شامل ہونے کے لیے کہا گیا تو اس نے اپنی پلیٹی نم بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دیکر اٹکار کر دیا اور وہ وہی نہیں پیا کرتی۔ سب نے اسرار کیا مگر وہ نہ مانی۔ چپہ نے بدولی کا اظہار کیا تو مٹی نے فی لس کے لیے ہکا سا مشروب تیار کیا اور گلاس اس کے ہونٹوں کے ساتھ

لگا کر بڑے پیار سے کہا ”بہادر لڑکی بنو اور اپنی جاؤ۔“

فی لس انکار نہ کر سکی۔ چہ نہ خوش ہو گیا اور اس نے خوشی میں بیس پچیس اور لمرگ سنائے۔ سب مزے لیتے رہے۔۔۔۔۔ میں نے سوچا عریانی سے تنگ آکر انسان نے ستر پوشی اختیار کی ہوگی یہی وجہ ہے کہ وہ اب ستر پوشی سے اتنا کرکھی کبھی عریانی کی طرف دوڑنے لگتا ہے۔ شائستگی کا رد عمل یقیناً شائستگی ہے۔ اس فرار کا قطعی طور پر ایک دلکش پہلو بھی ہے۔ آدمی کو اس سے ایک مسلسل ایک آہنگی کی کوفت سے چند گھڑیوں کے لیے نجات مل جاتی ہے۔۔۔۔۔

میں نے مئی کی طرف دیکھا جو بہت ہشاش بشاش جوان لڑکیوں میں گھلی ملی چڑے کے ننھے ننھے لمرگ سن کر ہنس رہی تھی اور قہقہے لگا رہی تھی۔۔۔۔۔ اس کے چہرے پر وہی واہیات میک اپ تھا۔ اس کے نیچے اس کی جھریاں صاف نظر آرہی تھیں مگر وہ بھی مسرور تھیں۔۔۔۔۔ میں نے سوچا آخر لوگ کیوں فرار کو برا سمجھتے ہیں۔۔۔۔۔ وہ فرار جو میری آنکھوں کے سامنے تھے اس کا ظاہر گو بد نما تھا لیکن باطن اس کا بے حد خوبصورت تھا۔ اس پر کوئی بناؤ سنگھار کوئی نازہ کوئی ابھنا نہیں تھا۔

پولی تھی وہ ایک کونے میں رنجیت مہار کے ساتھ کھڑی تھی۔ اپنے نئے فرائد کے بارے میں بات چیت کر رہی تھی اور اسے بتا رہی تھی کہ صرف اپنی ہوشیاری سے اس نے بڑے ستے داموں ایسی عمدہ چیز تیار کرائی ہے۔ دو ٹکڑے تھے جو بظاہر بے کار معلوم ہوتے تھے مگر اب وہ ایک خوبصورت پوشاک میں تبدیل ہو گئے تھے۔۔۔۔۔ اور رنجیت مہار بڑے خلوص سے اس کو دو نئے ڈریس بنوا دینے کا وعدہ کر رہا تھا۔ حالانکہ اسے فلم کمپنی سے اتنے روپے ایک مشت ملنے کی ہرگز ہرگز امید

نہ تھی۔ ڈوٹی تھی وہ غریب نواز سے کچھ قرض مانگنے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کو یقین دلارہی تھی کہ دفتر سے تنخواہ ملنے پر وہ یہ قرض ضرور ادا کر دے گی۔ غریب نواز قطعی طور پر معلوم تھا کہ وہ یہ روپیہ حسب معمول کبھی واپس نہیں دے گی مگر وہ اس کے وعدے پر اتنا بار کیے جا رہا تھا۔ تھیلدا ون کترے سے تاخیر مانج کیے بڑے مشکل توڑ سیکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ون کترے کو معلوم تھا کہ ساری عمر اس کے پیر کبھی ان کے بول ادا نہیں کر سکیں گے مگر وہ اس کو بتائے جا رہا تھا اور تھیلدا بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ بیکار اپنا اور ون کترے کا وقت ضائع کر رہی ہے مگر بڑے شوق اور انتہاک سے سبق یاد کر رہی تھی۔ ایڈا اور کٹی دونوں پٹے جا رہی تھیں اور آپس میں کسی آنوی کی بات کر رہی تھیں جس نے پچھلی ریس میں ان دونوں کو خد معلوم کب کا بدلہ لینے کی خاطر غلط ٹپ دی تھی۔ اور چڈہ فی اس کے سانپ کے کھیرے ایسے رنگ کے بالوں کو گھٹلے ہوئے سونے کے رنگ کی کچھل میں ملا ملا کر پنی رہا تھا۔ فی لی کا ہتھوڑا نما دوست بار بار جیب سے نکلتا تھا اور اپنے بال سنوارتا تھا۔ ممی کبھی اس سے بات کرتی کبھی اس سے کبھی سوڈا کھلاتی تھی۔ کبھی ٹوٹے ہوئے گلاس کے ٹکڑے اٹھواتی تھی..... اس کی نگاہ سب پر تھی اس بلی کی طرح جو بظاہر آنکھیں بند کیے ستاتی ہے مگر اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پانچوں پٹے کہاں ہیں اور کیا کیا شراکت کر رہے ہیں۔

اس دلچسپ تصویر میں کون سا رنگ کون سا خط غلط تھا؟..... ممی کا وہ بھڑکیلا اور شوخ میک اپ بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس تصویر کا ایک ضروری جزو ہے۔ غالب کہتا ہے:

قید حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

قید حیات و بندِ غم جب اصلاً ایک ہیں تو یہ کیا فرض ہے کہ آدمی موت سے پہلے
تھوڑی دیر کے لیے نجات حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے..... اس نجات کے
لیے کون ملک الموت کا انتظار کرے..... کیوں آدمی چند لمحات کے لیے خود فریبی
کے دلچسپ کھیل میں حصہ نہ لے۔

ممی سب کی تعریف میں رطب اللسان تھی۔ اس کے پہلو میں ایسا دل تھا۔ جس
میں ان سب سب کے لیے ممتا تھی..... میں نے سوچا شاید اس لیے اس نے اپنے
چہرے پر رنگ مل لیا ہے کہ لوگوں کو اس کی اصلیت معلوم نہ ہو..... اس میں شاید
اتنی جسمانی قوت نہیں تھی کہ وہ ہر ایک کی ماں بن سکتی..... اس نے اپنی شفقت اور
محبت کے لیے چند آدمی چن لیے تھے اور باقی ساری دنیا کو چھوڑ دیا تھا۔

ممی کو معلوم نہیں تھا۔ چہاں ایک تگڑا پیک فی لس کو پا چکا تھا..... چوری چھپے نہیں
سب کے سامنے مگر ممی اس وقت اندر باورچی خانے میں پوٹینو چپس تل رہی تھی
..... فی لس نشے میں تھی ہلکے ہلکے سرور میں۔ جس طرح اس کے پالش کیے ہوئے
نواں دے رنگ کے بال آہستہ آہستہ لہراتے تھے اس طرح وہ خود بھی لہراتی تھی۔

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ دن کترے تھیمہ کو توڑے سکھا سکھا کر اب اسے
بتا رہا تھا کہ اس کا باپ سالہا اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ چائلڈ ہڈی میں اس نے
اس کی شادی بنا دی تھی۔ اس کی وائف بہت بیوفی فل ہے..... اور غریب نواز
ڈوبی کو قرض دیکر بھول بھی چکا تھا۔ رنجیت مار پو لی کو اپنے ساتھ کہیں باہر لے گیا

تھا۔ ایڈما اور کئی دونوں جہاں بھر کی باتیں کر کے اب تھک گئی تھیں اور آرام کرنا چاہتی تھیں..... تپائی کے ارد گرد فی لس کا بیچر انما ساتھی اور می بیٹھے تھے۔ چڑھ اب جذباتی نہیں تھا۔ فی لس اس کے پہلو میں بیٹھی تھی جس نے پہلی دفعہ شراب کا سرور چکھا تھا..... اس کو حاصل کرنے کا عزم اس کی آنکھوں میں صاف موجود تھا مئی اس سے ناغل نہیں تھی۔

تھوڑی دیر بعد فی لس کا بیچرہ نما دوست اٹھ کر صوفے پر دراز ہو گیا اور اپنے بالوں میں کنگھی کرتے کرتے سو گیا..... غریب نواز اور ایڈما اٹھ کر کہیں چلے گئے۔ ایڈما اور کتی آپس میں کسی مارگریٹ کے متعلق باتیں کرتے ہوئے مئی سے رخصت لی اور چلی گئیں..... ون کترے نے آخری بار اپنی بیوی کی خوبصورتی کی تعریف کی اور فی لس کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا پھر تھیدا جو اس کے پاس بیٹھی تھی اس کو بازو سے پکڑ کر چاند دکھانیکے لیے باہر میدان میں لے گیا۔

ایک دم جانے کیا ہوا کہ چڑے اور مئی میں گرم گرم باتیں شروع ہو گئیں۔ چڑے کی زبان لڑکھڑاہی تھی۔ وہ ایک ناخلف بچے کی طرح مئی سے بدزبانی کرنے لگا..... فی لس دونوں میں مصالحت کی مہین مہین کوشش کر رہی تھی مگر چڑھ ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا۔ وہ فی لس کو اپنے ساتھ سعیدہ کا بیچ میں لے جانا چاہتا تھا۔ مئی اس کے خلاف تھی۔ وہ اس کو بہت دیر تک سمجھاتی رہی کہ وہ اس ارادے سے باز آئے مگر وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ بار بار مئی سے کہہ رہا تھا ”تم دیوانی ہو گئی ہو..... بوڑھی دلالہ..... فی لس میری ہے..... پوچھ لو اس سے“۔

مئی نے بہت دیر تک اس کی گالیاں سنیں آخر میں بڑے سمجھانے والے انداز

میں اس سیبا ”چڈہ مائی سن..... تم کیوں نہیں سمجھتے..... شی از یگ..... شی از ویری
یگ!“

اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ ایک التجا تھی ایک سرزنش تھی۔ ایک بڑی
بھیا نک تصویر تھی۔ مگر چڈہ بالکل نہ سمجھا۔ اس وقت اس کے پیش نظر صرف فی لس
اور اس کا حصول تھا۔ میں نے فی لس کی طرف دیکھا اور میں نے پہلی دفعہ بڑی
شدت سے محسوس کیا کہ وہ بہت چھوٹی عمر کی تھی بمشکل پندرہ برس کی..... اس کا
سفید چہرہ فترتی بالوں میں گھرا ہوا بارش کے پہلے قطرے کی طرح لرز رہا تھا۔
چڈے نے اس کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور فلموں کے ہیرو کے انداز
میں اسے اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا..... مئی نے احتجاج کیچ باند کی ”چڈہ چھوڑ
دو..... فو گاڈ سیک..... چھوڑ دو اسے۔“

جب چڈے نے فی لی کو اپنے چوڑے سینے سے جدا نہ کیا تو مئی نے اس کے
منہ پر ایک چائنا مارا ”گٹ آؤٹ..... گٹ آؤٹ!“
چڈہ بھونچکا رہ گیا۔ فی لس کو جدا کر کے اس نے دھکا دیا اور مئی کی طرف قہر آلود
نکابوں سے دیکھتا ہوا باہر چلا گیا۔ میں نے اٹھ کر رخصت لی اور چڈے کے پیچھے
چلا گیا۔

سعیدہ کاٹج پہنچ کر میں نے دیکھا کہ وہ پتلون قمیص اور بوٹ سمیت پلنگ پر
اوندھے منہ لیٹا تھا۔ میں نے اس سے کوئی بات نہ کی اور دوسرے کمرے میں جا کر
بڑے میز پر سو گیا۔

صبح دیر سے اٹھا۔ گھڑی میں دس بج رہے تھے۔ چڈہ صبح ہی صبح اٹھ کر باہر چلا

گیا تھا۔ کہاں یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ میں جب غسل خانے سے باہر نکل رہا تھا تو میں نے اس کی آواز سنی جو گراج کے باہر سے آرہی تھی۔ میں رگ گیا وہ کسی سے کہہ رہا تھا ”وہ لا جواب عورت ہے۔۔۔۔۔ خدا کی قسم وہ لا جواب عورت ہے۔۔۔۔۔ دنا کرو کہ اس کی عمر کو پہنچ کر تم بھی ویسی ہی گرہٹ ہو جاؤ۔“

اس کے لہجے میں ایک عجیب و غریب تلخی تھی۔۔۔۔۔ معلوم نہیں اس کا رخ اس کی اپنی ذات کی جانب تھا یا اس شخص کی جانب جس سے وہ مخاطب تھا۔۔۔۔۔ میں نے زیادہ دیر وہاں رکے رہنا مناسب نہ سمجھا اور اندر چلا گیا۔ نصف گھنٹے کے قریب میں نے اس کا انتظار کیا۔ جب وہ نہ آیا تو میں پر بھات نگر روانہ ہو گیا۔

میری بیوی کا مزاج معتدل تھا۔۔۔۔۔ ہریش گھر پر نہیں تھا۔ اس کی بیوی نے اس کے متعلق استفسار کیا تو میں نے کہہ دیا کہ وہ ابھی تک سو رہا ہے۔ پونے میں کافی تفریح ہو گئی تھی۔ اس لیے میں نے ہریش کی بیوی سے کہا کہ ہمیں اجازت دیجیے۔ رسما اتنے ہمیں روکنا چاہا لیکن میں نے سعیدہ کاٹنج ہی سے فیصلہ کر کے چلا تھا کہ رات کا واقعہ میرے لیے ذہنی جگالی کے واسطے بہت کافی ہے۔۔۔۔۔

ہم چل دیے۔۔۔۔۔ راستے میں مٹی کی باتیں ہوئیں جو کچھ ہوا تھا میں نے اس کو من و عنن سنا دیا۔ اس کا رد عمل یہ تھا کہ فی لس اس کی کوئی رشتہ دار ہوگی۔ یا وہ اسے کسی اچھی آسامی کو پیش کرنا چاہتی تھی۔ جیسی اس نے چڈے سے لڑائی لی۔۔۔۔۔ میں خاموش ہو گیا۔ اس کی تردید کی نیتاً نہ تھی۔

کئی دن گزرنے پر چڈے کا خط آیا جس میں اس رات کے واقعے کا سرسری ذکر تھا۔ اور اس نے اپنے متعلق یہ کہا تھا ”میں اس روز حیوان بن گیا تھا۔۔۔۔۔ لعنت

ہو مجھ پر!“

تین مہینے بعد مجھے ایک ضروری کام سے پونے جانا پڑا۔ سیدھا سعیدہ کاٹج پہنچا۔ چڑھ ہو جو نہیں تھا۔ غریب نواز سے اس وقت میری ملاقات ہوئی۔ جب ہو گراج سے نکل کر شیریں کے شیرخوار بچے کو پیار کر رہا تھا۔ وہ بڑے تپاک سے ملا۔ جموڑی دیر بعد رنجیت مارا گیا کچھوے کی چال چلتا اور خاموش بیٹھ گیا۔ میں اگر اس سے کچھ پوچھتا تو وہ بڑے اختصار سے جواب دیتا۔ اس سے باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ چڑھ اس رات کے بعد مئی کے پاس نہیں گیا اور نہ وہ کبھی یہاں آئی ہے۔ فی لس کو اس نے دوسرے ہی روز اپنے ماں باپ کے پاس بھجوا دیا تھا۔ وہ اس ہجرہ نمائز کے کے ساتھ گھر سے بھاگ کر آئی ہوئی تھی..... رنجیت مارا کو یقین تھا کہ اگر وہ کچھ دن اور پونے میں رہتی تو وہ ضرور اسے لے اڑتا۔ غریب نواز کو ایسا کوئی زخم نہیں تھا۔ اسے صرف یہ افسوس تھا کہ وہ چلی گئی۔

چڑے کے متعلق یہ پتا چلا کہ وہ تین روز سے اس کی طبیعت نا ساز ہے..... بخار رہتا ہے مگر وہ کسی ڈاکٹر سے مشورہ نہیں لیتا..... سارا دن ادھر ادھر گھومتا رہتا ہے۔ غریب نواز نے جب مجھے یہ باتیں بتانا شروع کیں تو رنجیت مارا اٹھ کر چلا گیا۔ میں نے سناخوں والی کھڑکی سے دیکھا اس کا رخ گراج کی طرف تھا۔ میں غریب نواز سے گراج والی شیریں کے متعلق کچھ پوچھنے کے لیے خود کو تیار ہی کر رہا تھا کہ ون کترے سخت گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ چڑے کو سخت بخار ہے۔ وہ اسے مانگے میں یہاں لارہا تھا کہ راستے میں بے ہوش ہو گیا..... میں اور غریب نواز باہر دوڑے مانگے والے نے بے ہوش چڑے

کو سنبھالا ہوا تھا۔ ہم سب نے مل کر اسے اٹھایا اور کمرے میں پہنچا کر بستر پر لٹا دیا۔ میں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا واقعی بہت تیز بخار تھا۔ ایک سوچھ ڈگری سے قطعاً کم نہ ہوگا۔

میں نے غریب نواز سے کہا کہ فوراً ڈاکٹر کو بلانا چاہیے۔ اس نے ون کترے سے مشورہ کیا۔ وہ ”ابھی آتا ہوں“ کہہ کر چلا گیا۔ جب واپس آیا تو اس کے ساتھ ممی تھی جو ہانپ رہی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے چڈے کی طرف دیکھا اور قریب قریب چیخ کر پوچھا ”کیا ہوا میرے بیٹے کو؟“

ون کترے نے جب اسے بتایا کہ چڈہ کئی دن سے بیمار تھا تو ممی نے بڑے رنج اور غصے کے ساتھ کہا ”تم کیسے لوگ ہو..... مجھے اطلاع کیوں نہ دی“۔ پھر اس نے غریب نواز مجھے اور ون کترے کو مختلف ہدایات دیں۔ ایک کو چڈے کے پاؤں سہلانے کی دوسرے کو برف لانے کی اور تیسرے کو پنکھا کرنے کی۔ چڈے کی حالت دیکھ کر اس کی اپنی حالت بہت غیر ہو گئی تھی۔ لیکن اس نے تحمل سے کام لیا اور ڈاکٹر بلانے چلی گئی۔

معلوم نہیں رنجیت سمار کو گراج میں کیسے پتا چلا۔ ممی کے جانے کے بعد فوراً وہ گھبرایا ہوا آیا۔ جب اس نے استفسار کیا تو ون کترے نے اس کے بے ہوش ہونے کا واقعہ بیان کر دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ ممی ڈاکٹر کے پاس گئی ہیں۔ یہ سن کر رنجیت سمار کا اضطراب کسی حد تک دور ہو گیا۔

میں نے دیکھا کہ وہ تینوں بہت مضمئن تھے جیسے چڈے کی صحت کی ساری ذمہ داری ممی نے اٹھنے سے لے لی ہے۔

اس کی ہدایات کے مطابق چڑے کے پاؤں پہلائے جا رہے تھے۔ سر پر برف کی پٹیاں رکھی جا رہی تھیں۔ جب مٹی ڈاکٹر لے کر آئی تو وہ کسی قدر ہوش میں آ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے معائنے میں کافی دیر لگا دی۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ چڑے کی زندگی کمرے میں ہے۔ معائنے کے بعد ڈاکٹر نے مٹی کو اشارہ کیا اور وہ کمرے سے باہر چلے گئے۔ میں نے سلاخوں والی کھڑکی میں سے دیکھا گرجا کے ٹاٹ کا پردہ ہل رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد مٹی آئی۔ غریب نواز ون کترے اور رنجیت مار سے اس نے فردا فردا کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ چڑہ اب آنکھیں کھول کر سن رہا تھا۔ مٹی کو اس نے حیرت کی نگاہوں سے نہیں دیکھا تھا لیکن وہ الجھن سی محسوس کر رہا تھا۔ چند لمحات کے بعد جب وہ سمجھ گیا کہ مٹی کیوں اور کیسے آئی ہے تو اس نے مٹی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور دبا کر کہا ”مٹی یو آر گریت!“

مٹی اس کے پاس پلنگ پر بیٹھ گئی۔ وہ شفقت کا مجسمہ تھی۔ چڑے کے تپتے ہوئے ماتھے پر ہاتھ پھیر کر اس نے مسکراتے ہوئے صرف اتنا کہا ”میرے بیٹے۔۔۔۔۔ میرے غریب بیٹے“

چڑے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے لیکن فوراً ہی اس نے ان کو جذب کرنے کی کوشش کی اور کہا ”نہیں۔۔۔۔۔ تمہارا بیٹا اول درجے کا کاونڈرل ہے۔۔۔۔۔ جاؤ اپنے مرحوم خاوند کا پستول لاؤ اور اس کے سینے پر داغ دو۔“

مٹی نے چڑے کے گال پر ہولے سے طمانچہ مارا ”فصل بکواس نہ کرو“ پھر وہ چست و چالاک نرس کی طرح اٹھی اور ہم سے مخاطب ہو کر کہا ”لوگو۔۔۔۔۔ چڑہ بیمار

ہے اور مجھے ہسپتال لے جانا ہے اسے..... سمجھے؟“

سب سمجھ گئے۔ غریب نواز نے فوراً ٹیکسی کا بندوبست کر دیا۔ چڈے کو اٹھا کر اس میں ڈالا گیا۔ وہ بہت کہتا رہا کہ اتنی کون سی آفت آگئی ہے کہ جو اس کو ہسپتال کے سپرد کیا جا رہا ہے۔ مگر مئی یہی کہتی رہی کہ بات کچھ بھی نہیں۔ ہسپتال میں ذرا آرام رہتا ہے۔ چڈہ بہت ضدی تھا۔ مگر نفسیاتی طور پر وہ اس وقت مئی کی کسی بات سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔

چڈہ ہسپتال میں داخل ہو گیا..... مئی نے اکیلے میں مجھے بتایا کہ مرض بہت خطرناک ہے یعنی پلگ..... یہ سن کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ خود مئی بھی بہت پریشان تھی۔ لیکن اس کو امید تھی کہ یہ بائٹل جائے گی اور چڈہ بہت جلد تندرست ہو جائے گا۔

علاج ہوتا رہا۔ پرائیویٹ ہسپتال تھا۔ ڈاکٹروں نے چڈے کا علاج بہت توجہ سے کیا مگر کئی پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ اس کی جلد جگہ جگہ سے پھٹنے لگی اور بخار بڑھتا گیا۔ ڈاکٹروں نے بالآخر یہ رائے دی کہ اسے بمبئی لے جاؤ۔ مگر مئی نہ مانی۔ اس نے چڈے کو اسی حالت میں اٹھوایا اور اپنے گھر لے گئی۔

میں زیادہ دیر پونے میں نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ واپس بمبئی آیا تو میں نے ٹیلی فون کے ذریعے کئی مرتبہ اس کا حال دریافت کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ پلگ کے حملے سے جانبر نہیں ہو سکے گا۔ مگر مجھے معلوم ہوا کہ آہستہ آہستہ اس کی حالت سنبھل رہی ہے۔ ایک مقدمے کے سلسلے میں مجھے لاہور جانا پڑا۔ وہاں سے پندرہ روز کے بعد لوٹا تو میری بیوی نے چڈے کا ایک خط دیا۔ جس میں صرف یہ لکھا تھا ”عظیم المرتبت“

مئی نے اپنے ناخلف بیٹے کو موت کے منہ سے بچا لیا ہے۔“
 ان چند لفظوں میں بہت کچھ تھا۔ جذبات کا ایک پورا سمندر تھا۔ میں نے اپنی
 بیوی سے اس کا ذکر خلاف معمول بڑے جذباتی انداز میں کیا تو اس نے متاثر ہو کر
 صرف اتنا کہا ”ایسی عورتیں عموماً خدمت گزار ہو کر تہی ہیں۔“
 میں نے چڑے کو دو تین خط لکھے جن کا جواب نہ آیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس
 کو تبدیلی آب و ہوا کی خاطر اپنی ایک سہیلی کے ہاں لوٹاؤ لے بھجوا دیا تھا۔ چڑہاں
 بمشکل ایک مہینہ رہا اور اکتا کر چلا آیا۔ جس روز وہ پونے پہنچا اتفاق سے میں
 وہیں تھا۔

پلیک کے زیر دست حملے کے باعث وہ بہت کمزور ہو گیا تھا۔ مگر اس کی غونا
 پسند طبیعت اسی طرح زوروں پر تھی۔ اپنی بیماری کا اس نے اس انداز میں ذکر کیا
 جس طرح آدمی سائیکل کے معمولی حادثے کا ذکر کرتا ہے۔ اب جبکہ وہ جانبر ہو
 گیا تھا۔ اپنی خطرناک علالت کے متعلق تفصیلی گفتگو سے بیکار معلوم ہوتی تھی۔
 سعیدہ کاٹچ میں چڑے کی غیر حاضری کے دوران میں چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں
 ہوتی تھیں۔ ایل برادران یعنی عقیل اور نگیل کہیں اور اٹھ گئے تھے۔ کیونکہ انہیں اپنی
 ذاتی فلم کمپنی قائم کرنے کے لیے سعیدہ کاٹچ کی فضا مناسب و موزوں معلوم نہیں
 ہوتی تھی۔ ان کی جگہ ایک بنگالی میوزک ڈائریکٹر آ گیا تھا۔ اس کا نام مین تھا۔ اس
 کے ساتھ لاہور سے بھاگا ہوا ایک لڑکا رام سنگھ رہتا تھا۔ سعیدہ کاٹچ والے سب
 اس سے کام لیتے تھے۔ طبیعت کا بہت شریف اور خدمت گزار تھا۔ چڑے کے
 پاس اس وقت آیا تھا جب وہ مئی کے کہنے پر لوٹاؤ لے جا رہا تھا۔ اس نے غریب نواز

اور رنجیت مار سے کہہ دیا تھا کہ اسے سعیدہ کاٹج میں رکھ دیا جائے۔ سین کے کمرے میں کیونکہ خالی جگہ رہتی تھی اس لیے اس نے وہیں اپنا ڈیرہ جما دیا تھا۔ رنجیت مار کو کمپنی کی نئی فلم میں ہیرو منتخب کر لیا گیا تھا اور اس کے ساتھ وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر فلم کامیاب ہوئی تو اس کو دوسری فلم ڈائریکٹ کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ چھ اپنی دو برس کی جمع شدہ تنخواہ میں سے صرف ڈیڑھ ہزار روپیہ ایک مشق حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس نے رنجیت مار سے کہا تھا۔ میری جان اگر کچھ وصول کرنا ہے تو پلیک میں بتانا ہو جاؤ..... ہیرو اور ڈائریکٹر بننے سے تو میرا خیال ہے یہی بہتر ہے۔“

غریب نواز تازہ تازہ حیدر آباد سے واپس آیا تھا۔ اس لیے سعیدہ کاٹج کسی قدر مرعہ الحال تھی۔ میں نے دیکھا کہ گراج سے باہر ایسی قیصیں اور شلواریں لٹک رہی تھیں جن کا کپڑا اچھا اور قیمتی تھا۔ شیریں کے خورد و سال بچے کے پاس نئے کھلونے تھے۔

مجھے پونے میں پندرہ روز رہنا پڑا۔ میرا پرانا فلموں کو ساتھی اب نئی فلم کی ہیروئن کی محبت میں گرفتار ہونے کی کوشش میں مصروف تھا۔ مگر ڈرتا تھا۔ کیونکہ یہ ہیروئن پنجابی تھی اور اس کا خاوند بڑی بڑی مونچھوں والا ہٹا کنا مثلنڈ تھا۔ چڑے نے اس کو حوصلہ دیا تھا۔ کچھ پروانہ کر وہ اس سالے کی..... جس پنجابی ایکٹریس کا خاوند بڑی بڑی مونچھوں والا پہلوان ہو وہ عشق کے میدان میں ضرور چاروں شانے چت کرتا ہے..... بس اتنا کرو کہ سورہ پے فی گالی کے حساب سے مجھ سے پنجابی کی دس بیس بڑی ہیوی ویٹ قسم کی گالیاں سیکھ لو۔ یہ تمہاری خاص

مشکلوں میں کام آیا کریں گی۔

بریش نے ایک بوتل فی گالی کے حساب سے چھ گالیاں پنجاب کے مخصوص لب ولہجے میں یاد کر چکا تھا۔ مگر ابھی تک اسے اپنے عشق کے راسخے میں کوئی ایسی خاص مشکل درپیش نہیں آئی تھی جو وہ ان کی تاثیر کا امتحان لے سکتا۔

ممی کے گھر حسب معمول محفلیں جیتی تھیں۔ پولی ڈولی ایذا تھیدا وغیرہ سب آتی تھیں۔ ون کترے بدستور تھیدا کو کتھاکلی اور تانڈیوناچ کی تاتھنی اور دھانی ناکت کی ون ٹو تھری بنا بنا کر بتاتا تھا۔ اور وہ اسے سیکھنے کی پر خلوص کوشش کرتی تھی۔ غریب نواز حسب توفیق قرض دے رہا تھا اور رنجیت سمار جس کو اب کمپنی کی نئی فلم کے ہیرو کا چانس مل رہا تھا ان میں سے کسی ایک کو باہر کھلی ہوا میں لے جاتا تھا۔ چڑے کے ننکے ننکے لمرگ سن کر اسی طرح تھتھے برپا ہوتے تھے۔ ایک صرف وہ نہیں تھی۔ وہ جس کے بالوں کے رنگ کے لیے صحیح تشبیہ ڈھونڈنے میں چڑے کا کافی وقت صرف کیا تھا۔ مگر ان محفلوں میں چڑے کی نگاہیں اسے ڈھونڈتی نہیں تھیں۔ پھر بھی چڑے کی نظریں جب ممی کی نظروں سے ٹکرا کر جھک جاتی تھیں تو میں محسوس کرتا تھا کہ اس کو اپنی اس رات کی دیوانگی کا افسوس ہے۔ ایسا افسوس جس کی یاد سے اس کو تکلیف ہوتی ہے۔ چنانچہ چوتھے پیگ کے بعد کسی وقت اسی قسم کا جملہ اس کی زبان سے بے اختیار نکل جاتا ”چڑھ..... یو آراے ڈیمڈ بروٹ“۔

یہ سن کر ممی زیر لب مسکرا دیتی تھی جیسے وہ اس مسکراہٹ کی شیرینی میں لپیٹ لپیٹ کر یہ کہہ رہی ہو ”ڈونٹ ٹوک روٹ“۔

ون کترے سے بدستور اس کی چچ چلتی تھی۔ سرور میں آ کر جب بھی وہ اپنے باپ کی تعریف یا اپنی بیوی کی خوبصورتی کے متعلق کچھ کہنے لگتا تو وہ اس کی بات بہت بڑے گند اسے سے کاٹ ڈالتا۔ وہ غریب چپ ہو جاتا اور اپنا میٹرکولیشن سٹوفلیٹ تہہ کر کے جیب میں ڈال لیتا۔

مئی وہی مئی تھی پولی کی مئی ڈوہلی کی مئی چڈے کی مئی رنجیت کمار کی مئی۔ سوڈے کی بوتلوں گزک کی چیزوں اور محفل جمانے کے دوسرے ساز و سامان کے انتظام میں وہ ایسی پر شفقت انہماک سے حصہ لیتی تھی۔ اس کے چہرے کا میک اپ ویسا ہی واپیات ہوتا تھا۔ اس کے کپڑے اسی طرح کے شوخ و شنگ تھے۔ نازے اور سرخی کی تہوں سے اس کی جھریاں اسی طرح جھانکتی تھیں۔ مگر اب مجھے یہ مقدس دکھائی دیتی تھیں۔ اتنی مقدس کہ پلگ کے کیڑے ان تک نہ پہنچ سکتے تھے۔ ڈر کر سٹ کر وہ دوڑ گئے تھے۔ چڈے کے جسم سے بھی نکل بھاگے تھے کہ ان پر ان جھریوں کا سایہ تھا۔۔۔۔۔ ان مقدس جھریوں کا جو ہر وقت نہایت واپیات رگوں میں اتھڑی رہتی تھیں۔

ون کترے کی خوبصورت بیوی کے جب اسے قاطع ہوا تھا تو مئی ہی کی ہر وقت امداد سے اس کی جان بچی تھی۔ تھیمما جب ہندوستانی رقص سیکھنے کے شوق میں مارہاڑ کے ایک کتھک کے ہتھے چڑھ گئی تھی اور اس سوڈے میں ایک روز جب اس کو اچانک معلوم ہوا تھا کہ اس نے ایک مرض خرید لیا ہے تو مئی نے اس کو بہت ڈانٹا تھا اور اس کو جہنم پہرہ کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس سے قطع تعلق کرنے کا تہیہ کر لیا تھا مگر اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس کا دل پسچ گیا تھا۔ اس نے اسی روز شام کو

اپنے بیٹوں کو ساری بات سنا دی تھی اور ان سے درخواست کی تھی کہ وہ تھیلما کا علاج کرائیں۔ کئی کواکب معاملہ کرنے کے سلسلے میں پانچ سو روپے کا انعام ملا تھا تو اس نے مجبور کیا تھا کہ وہ کم از کم اس کے آدھے روپے غریب نواز کو دے دے کیونکہ اس غریب کا ہاتھ تنگ ہے۔ اس نے کئی سے کہا ”تم اس وقت اسے دے دو..... بعد میں لیتی رہنا“۔ اور مجھ سے اس نے پندرہ روپے قیام کے دوران میں کئی مرتبہ میری مسز کے بارے میں پوچھا تھا۔ اور تشویش کا اظہار کیا تھا کہ پہلے بچے کی موت کو اتنے برس ہو گئے ہیں۔ دوسرا بچہ کیوں نہیں ہوا۔ رنجیت سمار سے زیادہ رغبت سے بات نہیں کرتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی نمائش پسند طبیعت اس کو اچھی نہیں لگتی۔ میرے سامنے اس کا اظہار وہ ایک دوسرے لفظوں میں بھی کر چکی تھی۔ میوزک ڈائریکٹر سمین سے وہ نفرت کرتی تھی۔ چچہ اس کو اپنے ساتھ لاتا تھا تو وہ اس سے کہتی تھی ”ایسے ذلیل آدمی کو یہاں مت لایا کرو“ چچہ اس سے چہ پوچھتا تو وہ بڑی سنجیدگی سے جواب دیتی ”مجھے یہ آدمی اوپر اوپر اس معلوم ہوتا ہے..... فٹ نہیں بیٹھتا میری نظروں میں“ یہ سن کر چچہ ہنس دیتا۔

مئی کے گھر کی محفلوں کی پر خلوص گرمی لیے میں واپس بمبئی چلا گیا۔ ان محفلوں میں رندی تھی بلا نوشی تھی جنسیاتی رنگ تھا مگر کوئی الجھاؤ نہیں تھا۔ بظاہر اس طرح کڈھب بینڈی اور دیکھنے والے کو گولہ کی حالت میں ڈالنے والی۔ مگر اصل میں بڑی صحیح با سلیقہ اور اپنی جگہ پر قائم۔

دوسرے روز صبح کے اخباروں میں یہ پڑا کہ سعیدہ کاٹج میں بنگالی ڈائریکٹر سمین مارا گیا ہے۔ اس کو قتل کرنے والا کوئی رام سنگھ ہے جس کی عمر چودہ پندرہ برس

کے قریب بتائی جاتی ہے۔ میں نے فوراً پونے فون کیا مگر کوئی نہ مل سکا۔ ایک ہفتے بعد چڈے کا خط آیا جس میں حادثہ قتل کی پوری تفصیل تھی۔ رات کو سب سوئے تھے کہ چڈے کے پلنگ پر اچانک کوئی گرا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔ روشنی کی تو دیکھا کہ سین ہے۔ خون میں لت پت۔ چڈہ اچھی طرح اپنے ہوش و ہواس سنبھالنے بھی نہ پایا تھا کہ دروازے پر رام سنگھ نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں چھری تھی۔ فوراً ہی غریب نواز اور رنجیت مار بھی آگئے۔ ساری سیدہ کانچ بیدار ہو گئی۔ رنجیت مہار اور غریب نواز نے رام سنگھ کو پکڑ لیا اور چھری اسکے ہاتھ سے چھین لی۔ چڈے نے سین کو اپنے پلنگ پر لٹایا اور اس کے زخموں کے متعلق پوچھنے ہی والا تھا کہ اس نے آخری ہنگلی لی اور ٹھنڈا ہو گیا۔

رام سنگھ غریب نواز اور رنجیت مہار کی گرفت میں تھا۔ مگر وہ دونوں کانپ رہے تھے۔ سین مر گیا تو رام سنگھ نے چڈے سے پوچھا ”بھاپا جی..... مر گیا؟“ چڈے نے اثبات میں جواب دیا تو رام سنگھ نے رنجیت مہار اور غریب نواز سے کہا ”مجھے چھوڑ دیجیے میں بھاگوں گا نہیں۔“

چڈے کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے فوراً نوکر بھیج کر می کو بلوایا۔ می آئی تو سب مطمئن ہو گئے کہ معاملہ سلجھ جائے گا۔ اس نے رام سنگھ کو آواز کر دیا اور تھوڑی دیر بعد اپنے ساتھ پولیس سٹیشن لے گئی جہاں اس کا بیان درج کرا دیا گیا۔ اس کے بعد چڈہ اور اس کے ساتھی کئی دن تک سخت پریشان رہے۔ پولیس کی پوچھ گچھ اور بیانات پھر عدالت میں مقدمے کی پیروی۔ می اس دوران میں بہت دوڑ دھوپ کرتی رہی۔ چڈہ کو یقین تھا کہ رام سنگھ بری ہو جائے گا۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ماتحت عدالت نے اسے صاف بری کر دیا۔ عدالت میں اس کا وہی بیان تھا جو اس نے تھانے میں دیا تھا مگر اس نے اس سے کہا تھا ”میں گھبراؤ نہیں جو کچھ ہوا ہے سچ سچ بتا دو۔“ اور اس نے تمام واقعات من و عن بیان کر دیے تھے۔ کہ سین نے اسکو پلے بیک سنگر بنا دینے کا لالچ دیا تھا۔ اس کو خود بھی موتی قبی بے بڑا لگاؤ تھا اور سین بہت اچھا گانے والا تھا۔ وہ اس چکر میں آ کر اس کی شہوانی خواہشات پوری کرتا رہا۔ مگر اس کو اس سے سخت نفرت تھی۔ اس کا دل بار بار اسے لعنت ملامت کرتا تھا۔ آخر میں وہ اس قدر تنگ آ گیا تھا کہ اس نے سین سے کہہ بھی دیا تھا کہ اگر اس نے پھر اسے مجبور کیا تو وہ اسے جان سے مار ڈالے گا۔ چنانچہ وارادات کی رات کو یہی ہوا۔

عدالت میں اس نے یہی بیان دیا تھا۔ مگر موجودگی۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ رام سنگھ کو دلاسا دیتی رہی کہ گھبراؤ نہیں جو سچ ہے کہہ دو۔ سچ کی ہمیشہ فتح ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہارے ہاتھوں نے خون کیا ہے مگر ایک بڑی نجس چیز کا۔ ایک خباثت کا۔ ایک غیر فطری سودے کا۔

رام سنگھ نے بڑی سادگی بڑے بھولے پن اور برے معصومانہ انداز میں سارے واقعات بیان کیے۔ محسوس ہے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے رام سنگھ کو بری کر دیا۔ چڑے نے کہا ”اس جھوٹے زمانے میں یہ صداقت کی حیرت انگیز فتح ہے۔۔۔۔۔ اور اس کا سہرا میری بڑھی مٹی کے سر ہے!“

چڑے نے مجھے اس جملے میں بلایا جو رام سنگھ کی رہائی کی خوشی میں سعیدہ کاٹنج والوں نے کیا تھا۔ مگر میں مصروفیت کے باعث اس میں شریک نہ ہو سکا۔ ایل

برادرزہ شکل اور عقل دونوں واپس سعیدہ کاٹچ آ گئے تھے۔ باہر کی فضا بھی ان کی ذاتی فلم کمپنی کی تائیس بتیس کے لیے راس نہ آئی تھی۔ اب وہ پھر اپنی پرانی فلم کمپنی میں کسی اسٹنٹ کے اسٹنٹ ہو گئے تھے۔ ان دونوں کے پاس سرمایے میں سے چند سو باقی بچے تھے جو انہوں نے اپنی فلم کمپنی کی بنیادوں کے لیے فراہم کیا تھا۔ چڈے کے مشورے پر انہوں نے سب روپیہ جلے کو کامیاب بنانے کے لیے دے دیا۔ چڈے نے ان سے کہا تھا ”اب میں چار پیک پی کر دنا کروں گا کہ وہ تمہاری ذاتی فلم کمپنی فوراً کھڑی کر دے“۔

چڈے کا بیان تھا کہ اس جلسے میں ون کترے نے شراب پی کر اپنے سالے باپ کی تعریف نہ کی اور نہ اپنی خوبصورت بیوی کا ذکر کیا۔ غریب نواز نے کئی کی فوری ضروریات کے پیش نظر اس کو دوسروں پر قرض دیے اور نجیت سمار سے اس نے کہا تھا ”تم ان بچاری لڑکیوں کو یونہی جھانسنے نہ دیا کرو..... ہو سکتا ہے کہ تمہاری نیت صاف ہو مگر لینے کے معاملے میں ان کی نیت اتنی صاف نہیں ہوتی..... کچھ نہ کچھ دے دیا کرو!“

ممی نے اس جلسے میں رام سنگھ کو بہت پیار کیا اور سب کو یہ مشورہ دیا کہ اسے گھر واپس جانے کے لیے کہا جائے۔ چنانچہ وہیں فیصلہ ہوا اور دوسرے روز غریب نواز نے اس کے گلٹ کا بندہ بست کر دیا..... شریں نے سفر کے لیے اس کو کھانا پکا کر دیا۔ اسٹیشن پر سب چھوڑنے گئے۔ ٹرین چلی تو وہ دیر تک ہاتھ ہلاتے رہے۔

یہ چھوٹی چھوٹی باتیں مجھے اس جلسے کے دس روز بعد معلوم ہوئیں جب مجھے ایک ضروری کام سے پو نے جانا پڑا۔ سعیدہ کاٹچ میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی

تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسا پڑاؤ ہے جس کی شکل و صورت ہزار ہا قافلوں کے ٹھہرنے سے بھی تبدیل نہیں ہوتی۔ وہ کچھ ایسا جگہ تھی جو اپنا خلا خود ہی پر کر دیتی تھی۔ میں جس روز سے وہاں پہنچا شیرینی بٹ رہی تھی۔ شیریں کے گھر ایک اور لڑکا ہوا تھا۔ ون کترے کے ہاتھ میں گلیکسو کا ڈبہ تھا۔ ان دنوں یہ بڑی مشکل سے دستیاب ہوتا تھا۔ اس نے اپنے بچے کے لیے کہیں سے دو پیدا کیے تھے۔ ان میں سے ایک وہ شیریں کے نوزائیدہ لڑکے کے لیے آیا تھا۔ چڑے نے آخری دو لڈو اس کے منہ میں ٹھونسنے اور کہا ”تو یہ گلیکسو کا ڈبہ لے آیا ہے۔۔۔۔۔۔ بڑا مال کیا ہے تو نے۔۔۔۔۔۔ اپنے سالے باپ اور اپنی سالی بیوی کی دیکھنا ہرگز کوئی بات نہ کرنا۔“ ون کترے نے بڑے بھولپن کے ساتھ کہا ”سالے میں اب کوئی اپنی لاہوں۔۔۔۔۔۔ وہ تو دارو بولا کرتی ہے۔۔۔۔۔۔ ویسے بانی گاڈ۔۔۔۔۔۔ میری بیوی بڑی بینڈ سم ہے۔۔۔۔۔۔“

چڑے نے اس قدر بے تحاشہ تہقیر لگایا کہ ون کترے کو اور کچھ کہنے کا موقع نہ ملا۔ اس کے بعد چڑہ غریب نواز اور رنجیت مار مجھ سے متوجہ ہوئے اور اس کہانی کی باتیں شروع ہو گئیں جو میں اپنے پرانے فلموں کے ساتھی کے ذریعے سے وہاں کے ایک پروڈیوسر کے لیے لکھ رہا تھا۔ پھر کچھ دیر شیریں کے نوزائیدہ لڑکے کا نام مقرر ہوتا رہا۔ سینکڑوں نام پیش ہوئے مگر چڑے کو پسند نہ آئے آخر میں نے کہا کہ جائے پیدائش یعنی سعیدہ کاٹج کی رعایت سے لڑکا مولود مسعود ہے۔ اس لیے مسعود نام بہتر رہے گا۔ چڑے کو پسند نہیں تھا لیکن اس نے عارضی طور پر قبول کر لیا۔

اس دوران میں میں نے محسوس کیا کہ چڑھ غریب نواز اور رنجیت مہارتنوں کی طبیعت کسی قدر بھیجھی بھجھی سی تھی۔ میں نے سوچا کہ شاید یہ خزاں کے موسم کی وجہ سے ہے۔ جب آدمی خواہ مخواہ تھکاوٹ محسوس کرتا ہے۔ شیریں کا نیا بچہ بھی اس خفیف اضمحلال کا باعث ہو سکتا تھا لیکن یہ شبہ استدلال پر پورا نہیں اترتا تھا۔ سین کے قتل کی ٹریجڈی؟..... معلوم نہیں کیا وجہ تھی..... لیکن میں نے قطعی طور پر محسوس کیا تھا کہ وہ سب افسردہ تھے بظاہر ہنستے تھے بولتے تھے مگر اندرونی طور پر مضطرب تھے۔

میں پر بھات نگر میں اپنے پرانے فلمی ساتھی کے گھر میں کہانی لکھتا تھا یہ مصرعیت پورے سات دن جاری رہی۔ مجھے بار بار خیال آتا کہ اس دوران میں چڑے نے خلل اندازی کیوں نہیں کی۔ دن کترے بھی کہیں غائب تھا۔ رنجیت کمار سے میرے کوئی اتنے مراسم نہیں تھے کہ وہ میرے پاس اتنی دور آتا۔ غریب نواز کے متعلق میں نے سوچا کہ شاید حیدر آباد چلا گیا ہو اور میرا پرانا فلموں کا ساتھی اپنے نئے فلم کی ہیروئن سے اس کے گھر میں اس سے بڑی بڑی مونچھوں والے خاوند کی موجودگی میں عشق لڑانے کا مصمم ارادہ کر رہا تھا۔

میں اپنی کہانی کے ایک بڑے دلچسپ باب کا منظر نامہ تیار کر رہا تھا کہ چڑھ بلائے گا کہانی کی طرح نازل ہوا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے مجھ سے پوچھا ”اس کو اس کا تم نے کچھ وصول کیا ہے؟“

اس کا اشارہ میری اس کہانی کی طرف تھا جس کے معاوضے کی دوسری قسط میں نے دو روز ہوئے وصول کی تھی..... ”ہاں..... دوسرا ہزار پرپسوں لیا ہے۔“

”کہاں ہے یہ ہزار؟“ یہ کہتا چڑھ میرے کوٹ کی طرف بڑھا۔

”میری جیب میں“۔

چڈے نے میری جیب میں ہاتھ ڈالا۔ سوسو کے چار نوٹ نکالے اور مجھ سے کہا ”آج شام کومی کے ہاں پہنچ جانا..... ایک پارٹی ہے!“
میں اس پارٹی کے متعلق کچھ دریافت کرنے ہی والا تھا کہ وہ چلا گیا۔ وہ افسردگی جو میں نے چند روز پہلے محسوس کی تھی بدستور موجود تھی۔ وہ کچھ مضطرب بھی تھا..... میں نے اس کے متعلق سوچنا چاہا مگر دماغ مائل نہ ہوا کہانی کے دلچسپ باب کا منظر نامہ اس میں بری طرح پھنسا تھا۔

اپنے پرانے فلموں کے ساتھی کی بیوی سے اپنی بیوی کی باتیں کر کے شام کو ساڑھے پانچ بجے کے قریب میں وہاں سے روانہ ہو کر سات بجے سعیدہ کاٹج پہنچا۔ گراج کے باہر لگنی پر گیلے گیلے پورے لٹک رہے تھے۔ اور ٹل کے پاس ایل برادران شیریں کے بڑے لڑکے کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ گراج کے ماٹ کا پردہ ہٹا ہوا تھا اور شیریں ان سے نا لبامی کی باتیں کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ چپ ہو گئے۔ میں نے چڈے کے متعلق پوچھا تو عقیل نے کہا کہ وہ مئی کے گھر مل جائے گا۔

میں وہاں پہنچا تو ایک شور برپا تھا۔ سب ناچ رہے تھے۔ غریب نواز پوٹی کے ساتھ رنجیت مارکٹی اور ایڈما کے ساتھ اوروں کترے تھیڈما کے ساتھ۔ وہ اس کو کھٹھا کلی کے مدرے بتا رہا تھا۔ چڈہ مئی کو گود میں اٹھائے ادھر ادھر کو دو رہا تھا..... سب نشے میں تھے..... ایک طوفان مچا ہوا تھا۔ اندر داخل ہوئے تو سب سے پہلے چڈے نے نعرہ لگایا۔ اس کے بعد دیسی اور بدیشی آوازوں کا ایک گولہ سا پھٹا جس

کی گونج دیر تک کانوں میں سرسراتی رہی۔ مٹی برے تپاک سے ملی۔۔۔۔۔ ایسے تپاک سے جو بے تکلفی کی حد تک بڑھا ہوا تھا۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس نے کہا ”کس مٹی ڈیر!“۔

لیکن اس نے خود ہی میرا ایک گال چوم لیا اور گھسیٹ کر مٹا چنے والوں کے جھر مٹ میں لے گئی۔ چٹہ ایک دم پکارا ”بند کرو۔۔۔۔۔ اب شراب کا دور چلے گا۔“۔ پھر اس نے نوکر کو آواز دی ”اسکاٹ لینڈ کے شہزادے۔۔۔۔۔ وکی کی نئی بوتل لاؤ۔“۔ اسکاٹ لینڈ کا شہزادہ نئی بوتل لے آیا۔ نشے میں دھست تھا۔ بوتل کھولنے لگا تو ہاتھ سے گری اور چکنا چور ہو گئی۔ مٹی نے اس کو ڈانٹنا چاہا تو چپے سے روک دیا اور کہا ”ایک بوتل ٹوٹی ہے مٹی۔۔۔۔۔ جانے دو یہاں دل ٹوٹے ہوئے ہیں۔“۔

محفل ایک دم سونی ہو گئی۔ لیکن فوراً ہی چٹے نے اس لحاقی افسردگی کو اپنے قہقروں سے درہم برہم کر دیا۔ نئی بوتل آئی۔۔۔۔۔ ہر گلاس میں گرانڈیل پیگ ڈالا گیا۔ چٹے نے بے راباطی تقریر شروع کر دی ”لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔۔۔۔۔ آپ سب جہنم میں جائیں۔۔۔۔۔ منگو ہمارے درمیان موجود ہے بڑے خود بہت بڑا افسانہ نگار بنتا ہے۔ انسانی نفسیات کی وہ کیا کہتے ہیں عمیق ترین گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔۔۔۔۔ مگر میں کہتا ہوں کہ سب بکو اس ہے۔۔۔۔۔ کنویں میں اترنے والے۔۔۔۔۔ کنویں میں اترنے والے“ اس نے ادھر ادھر دیکھا ”افسوس یہاں کوئی ہندستور نہیں۔ ایک حیدر آبادی ہے جو قاف کو خوف کہتا ہے اور جس سے دس برس پیچھے ملاقات ہوئی تو کہے گا۔ پرسوں آپ سے ملا تھا۔۔۔۔۔ لعنت ہو اس نظام حیدر آباد پر جس کے پاس کئی لاکھ ٹن سونا ہے۔ کروڑ ہا جواہرات ہیں۔ لیکن ایک مٹی نہیں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ وہ

کنویں میں اترنے والے..... میں نے کیا کہا تھا کہ سب بکواس ہے..... چنباہی میں جنہیں ٹوبے کہتے ہیں..... وہ غوطہ لگانے والے۔ وہ اس کے مقابلے میں انسانی نفسانیت کو بدرجہا بہتر سمجھتے ہیں..... اس لیے میں کہتا ہوں.....“

سب نے زندہ باد کا نعرہ لگایا۔ چپڑہ چنباہی سب سازش ہے..... منٹو کی سازش ہے ورنہ میں نے ہٹلر کی طرح تم لوگوں کو مردہ باد کے نعرے کا اشارہ کیا تھا۔ تم سب مردہ باد..... لیکن پہلے میں..... میں..... وہ جذباتی ہو گیا..... میں جس نے اس رات اس..... سانپ کے پیٹ کے کپڑوں ایسے رنگ کے بالوں والی ایک لڑکی کے لیے اپنی مٹی کو تاراض کر دیا..... میں خود کو خدا معلوم کہاں کا ڈون جو آن سمجھتا تھا..... لیکن نہیں..... اس کو حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ مجھے اپنی جوانی کی قسم۔ ایک ہی بو سے میں اس پلیٹنم بلونڈ کے کنوارے بچے کا سارا عرق اپنے ان موٹے موٹے ہونٹوں سے چوس سکتا تھا..... لیکن یہ ایک..... یہ ایک نامناسب حرکت تھی..... وہ کم عمر تھی..... اتنی کم عمر اتنی کمزور اور اتنی کریکٹریس اتنی..... اس نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا بتاؤ یا اسے اردو فارسی یا عربی میں کیا کہیں گے..... کریکٹریس..... لیڈر اینڈ جنٹلمین..... وہ اتنی چھوٹی اتنی کمزور اور اتنی لا کر دار تھی کہ اس رات گناہ میں شریک ہو کر یا تو وہ ساری عمر پچھتاتی رہتی یا اسے قطعاً بھول جاتی..... ان چند گھڑیوں کی لذت کی یاد کے سہارے جینے کا سلیقہ اس کو قطعی طور پر نہ آتا..... مجھ اس کا دکھ ہوتا..... اچھا ہوا کہ مٹی نے اسی وقت میرا حقہ پانی بند کر دیا..... میں اب اپنی بکواس بند کرتا ہوں میں نے اصل میں ایک بہت لمبی چوڑی تقریر کرنے کا ارادہ کیا تھا مگر مجھ سے کچھ بولانا نہیں جاتا.....

میں ایک پیگ اور پیتا ہوں۔“

اس نے ایک پیگ اور پیٹا۔ تقریر کے دوران میں سب خاموش تھے۔ اس کے بعد بھی خاموش رہے۔ مئی نہ معلوم کیا سوچ رہی تھی۔ غارے اور سرخی کی تہوں کے نیچے اس کی جھریاں بھی ایسا دکھائی دیتا تھا کہ غور و فکر میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ بولنے کے بعد چٹہ جیسے خالی سا ہو گیا تھا۔ ادھر ادھر گھوم رہا تھا جیسے کوئی چیز کھونے کے لیے ایسا کونہ ڈھونڈ رہا ہے جو اس کے ذہن میں اچھی طرح محفوظ رہے میں نے اس سے ایک بار پوچھا ”کیا بات ہے چٹے؟“

اس نے قہقہہ لگا کر جواب دیا ”کچھ نہیں..... بات یہ ہے کہ آج وہی میرے دماغ کے چوتروں پر جما کے لات نہیں مار رہی۔“

اس کا قہقہہ کھوکھلا تھا۔

ون کترے نے تھیدا کو اٹھا کر اپنے پاس بٹھالیا اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اپنے باپ کی تعریف شروع کر دی کہ وہ بڑا گنی آدمی تھا۔ ایسا ہارمونیم بجاتا تھا کہ لوگ دم بخود رہ جاتے تھے۔ پھر اس نے اپنی بیوی کی خوبصورتی کا ذکر کیا اور بتایا کہ بچپن ہی میں اس کے باپ نے یہ لڑکی چن کر اس سے بیاہ دی تھی۔ بنگالی میوزک ڈائریکٹر سمن کی بات نقلی تو اس نے کہا ”مسٹر منٹو..... وہ ایک دم ہلکتا آدمی تھا..... کہتا تھا میں خاں صاحب عبدالکریم خاں کا شاگرد ہوں..... جھوٹ با اکل جھوٹ..... وہ تو بنگال کے کسی بھڑوے کا شاگرد تھا.....“

گھڑی نے وہ بجائے چٹے نے جھربگ بند کیا۔ کئی کو دھکا دے کر ایک طرف گرایا بڑھ کر ون کترے کے سر پر دھپا مار کر بولا ”بکواس بند کر بے..... انھ

..... اور کچھ گا..... لیکن خبردار اگر تو نے کوئی پکاراگ گایا۔“

ون کترے نے فوراً گانا شروع کر دیا۔ آواز اچھی نہیں تھی مریکوں کی نوک پلک واضح طور پر اس کے گئے سے نہیں نکلتی تھی لیکن جو کچھ گاتا تھا۔ پورے خلوص سے گاتا تھا۔ مالکوس میں اس نے اوپر تلے دو فلمی گانے گائے جن سے فضا بہت اداس ہو گئی..... ممی اور چڈہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تھے اور نظریں کسی اور سمت بنا لیتے تھے..... غریب نواز اس قدر متاثر ہوا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے چڈے نے زور کا قہقہہ بلند کیا اور کہا ”حیدر آبا دوالوں کی آنکھ کا مشانہ بہت کمزور ہوتا ہے..... موقع بے موقع چپکنے لگتا ہے۔“

غریب نواز نے آنسو پونچھے اور ایلمانے ناچنا شروع کر دیا۔ ون کترے نے گراموفون کے توڑے پر کارڈ رکھ کر سوئی لگا دی۔ گھسی ہوئی بیون بجنے لگی۔ چڈے نے ممی کو پھر گود میں اٹھا لیا اور کود کود کر شور مچانے لگا۔ اس کا گلا بیٹھ گیا۔ ان میراثوں کی طرح جو شادی بیاہ کے موقع پر اونچے سروں میں گا گا کر اپنی آواز کا ماس مار لیتی ہیں۔

اس اچھل کود اور چیخ و دھاڑ میں چار بج گئے۔ ممی ایک دم خاموش ہو گئی۔ پھر اس نے چڈے سے مخاطب ہو کر کہا ”بس اب ختم!“

چڈے نے بوتل سے منہ لگایا اسے خالی کر کے ایک طرف پھینک دیا اور مجھ سے کہا ”چلو منٹو چلیں!“

میں نے اٹھ کر ممی سے اجازت لینی چاہی کہ چڈے نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔

”آج کوئی الوداع نہیں کہے گا۔“

ہم دونوں باہر نکل رہے تھے کہ میں نے ون کترے کے رونے کی آواز سنی۔
میں نے چڑے سے کہا ”تھبرو دیکھیں کیا بات ہے“ مگر وہ مجھے دھکیل کر آگے
لے گیا ”اس سالے کی آنکھوں کا مٹا نہ بھی خراب ہے۔“
ممی کے گھر سے سعیدہ کاٹھج بالکل نزدیک تھی۔ رات میں چڑے نے کوئی
بات نہ کی سونے سے پہلے میں نے اس عجیب و غریب پارٹی کے متعلق استفسار کرتا
چاہا تو اس نے کہا ”مجھے سخت نیند آرہی ہے اور بستر پر لیٹ گیا۔“
صبح اٹھ کر میں غسل خانے میں گیا۔ باہر نکلتا تو دیکھا کہ غریب نواز گراج کے
ٹاٹ کے ساتھ لگ کر کھڑا ہے اور رو رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ آنسو پونچھتا وہاں سے
ہٹ گیا۔ میں نے پاس جا کر اس کے رونے کی وجہ دریافت کی تو اس نے کہا ”ممی
چلی گئی۔“

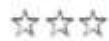
”کہاں؟“

”معلوم نہیں“ یہ کہہ کر غریب نواز نے سڑک کا رخ کیا۔
چڑہ بستر پر لیٹا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک لمبے کے لیے بھی نہیں سویا
تھا۔ میں نے اس سے ممی کے بارے میں پوچھا تو اس نے مسکرا کر کہا ”چلی گئی.....“
صبح کی گاڑی سے اسے پونہ چھوڑا تھا۔
میں نے پوچھا ”مگر کیوں؟“

چڑے کے لہجے میں تلخی آ گئی ”حکومت کو اس کی ادائیں پسند نہیں تھیں.....“
اس کی وضع قطع پسند نہیں تھی۔ اس کے گھر کی مہفلیں اس کی نظر میں قابل اعتراض
تھیں۔ اس لیے کہ پولیس اس کی محبت اور شفقت بطور یہ حال کے لینا چاہتی

تھی۔ وہ اسے ماں کہہ کر ایک دلالہ کا کام لینا چاہتے تھے۔ ایک عرصے سے اس کا کیس زیرِ تفتیش تھا۔ آخر حکومت پولیس کی تحقیقات سے مطمئن ہو گئی اور اس کو ترمی پار کر دیا۔ شہر بدر کر دیا۔ وہ اگر تجھ تھی دلالہ تھی۔ اس کا وجود سوسائٹی کے لیے مہلک تھا تو اس کا خاتمہ کر دینا چاہیے تھا۔ پونے کی غلاظت سے یہ کیوں کہا گیا کہ تم یہاں سے چلی جاؤ اور جہاں چاہو ڈھیر ہو سکتی ہو۔ چڈے نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا اور تھوڑی دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے بڑے جذبات بھرے لہجے میں کہا ”مجھے افسوس ہے منو کہ اس غلاظت کے ساتھ ایک ایسی پاکیزگی چلی گئی ہے جس نے اس رات میری ایک بڑی غلط اور نجس ترنگ کو میرے دل و دماغ سے دھو ڈالا۔ لیکن مجھے افسوس نہیں ہوتا چاہیے۔ وہ پونے سے چلی گئی ہے۔ مجھ ایسے جوانوں میں ایسی نجس اور غلط ترغیبات بھی پیدا ہوں گی جہاں وہ اپنا گھر بنائے گی۔ میں اپنی مٹی ان کے سپرد کرتا ہوں۔ زندہ باد مٹی۔ زندہ باد۔ چلو غریب نواز کو ڈھونڈیں۔ رورو کر اس نے اپنی جان ہاکان کر لی ہوگی۔ ان حیدر آبادیوں کی آنکھوں کا مٹانا بہت کمزور ہوتا ہے۔ وقت بے وقت چکنے لگتا ہے۔“

میں نے دیکھا چڈے کی آنکھوں میں آنسو اس طرح تیر رہے تھے جس طرح مقتولوں کی اشیں۔



منظر

نکھارام۔ نکھار تو تھا لیکن شرارتوں کے لحاظ سے بہت بڑا تھا۔ چہرے پر بے حد بھولا بھالا معلوم ہوتا تھا کوئی خط نقش ایسا نہیں تھا جو شوشی کا پتا دے اس کے جسم کا ہر عضو بھدے پن کی حد تک مولا تھا۔ جب چٹا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فٹ بال لڑھک رہا ہے۔ عمر بمشکل آٹھ برس کی ہوگی مگر بلا کا ذہین اور چالاک تھا لیکن اس کی ذہانت اور چالاکی کا پتا اس کے سر پا سے لگانا بہت مشکل تھا مسٹر راماشنکر اچاریہ ایم اے، ایل ایل بی، رام کے پتا کہا کرتے تھے کہ ”منہ میں رام رام اور بغل میں چھری“، دانی مثال اسی رام کے لیے بنائی گئی ہے۔

رام کے منہ سے رام رام تو کسی نے سنا ہی نہیں تھا مگر اس کی بغل میں چھری کے بجائے ایک چھوٹی سی چھڑی ضرور رہا کرتی تھی جس سے وہ کبھی کبھی ڈگس فیر ڈنگس یعنی بغدادی چور کی تیغ زنی کی نقل کیا کرتا تھا۔

جب رام کی ماں یعنی مسز راماشنکر اچاریہ اس کو کان سے پکڑ کر اس کے باپ کے سامنے لائیں تو وہ بالکل خاموش تھا آنکھیں خشک تھیں۔ اس کا ایک کان جو اس کی ماں کے ہاتھ میں تھا۔ دوسرے کان سے بڑا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ مسکرا رہا تھا مگر اس مسکراہٹ میں بایا کا بھولا پن تھا۔ اس کی ماں کا چہرہ غصے سے متمایا ہوا تھا۔ مگر اس کے چہرے سے پتا چلتا تھا کہ وہ اپنی ماں سے کھیل رہا ہے اور اپنے کان کو ماں کے ہاتھ میں دے کر ایک خاص قسم کا لطف اٹھا رہا ہے جس کو دوسروں پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔

جب رام مسٹر شکر اچار یہ کے سامنے لایا گیا تو وہ آرام کرسی پر جم کر بیٹھ گئے کہ اس نالائق کے کان کھینچیں حالانکہ وہ اس کے کان کھینچ کھینچ کر کافی زیادہ لمبے کر چکے تھے اور اس کی شرارتوں میں کوئی فرق نہ آنے پایا تھا۔ وہ عدالت میں قانون کے زور پر بہت کچھ کر لیتے تھے مگر یہاں اس چھوٹے سے لوٹڈے کے سامنے ان کی کوئی پیش نہ چلتی تھی۔

ایک مرتبہ مسٹر رام شکر اچار یہ نے کسی شرارت پر اس کو پرمیشور کے نام سے ڈرانے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا ”دیکھ رام تو اچھا لڑکا بن جاو نہ مجھے ڈر ہے پرمیشور تجھ سے خفا ہو جائیں گے۔“

رام نے جواب دیا ”آپ بھی تو خفا ہو جایا کرتے ہیں اور میں آپ کو منالیتا ہوں۔“ اور پھر جھوڑی دیر سوچنے کے بعد اس نے یہ پوچھا ”باپو جی یہ پرمیشور کون ہیں؟“

مسٹر شکر اچار یہ نے اسے سمجھانے کے لیے جواب دیا تھا ”جگلو ان اور کون اور ہم سب سے بڑے۔“

”اس مکان جتنے“

”اس سے بھی بڑے دیکھو اب تو کوئی شرارت نہ کچو۔ ورنہ وہ تمہیں مار ڈالیں گے۔“ مسٹر شکر اچار یہ نے اپنے بیٹے پر بیت طاری کرنے کے لیے پرمیشور کو اس سے زیادہ ڈراؤنی شکل میں پیش کرنے کے بعد یہ خیال کیا تھا کہ اب رام سدھر جائے گا اور کوئی شرارت نہ کرے گا مگر رام جو اس وقت خاموش بیٹھا تھا۔ اپنے ذہن کے ترازو میں پرمیشور کو تول رہا تھا کچھ دیر غور کرنے کے بعد اس نے بڑے

بھولپن سے کہا تھا ”باپو جی! آپ مجھے پرمیشور دکھا دیجیے“ تو مسٹر راماشنکر اچار یہ
کی ساری قانون دانی اور وکالت دھڑکی کی دھڑکی رہ گئی تھی۔

کسی مقدمے کا حوالہ دینا ہوتا تو وہ اس کو فائل نکال کر دکھا دیتے یا اگر کوئی
تعزیرات ہند کی کسی دفعہ کے متعلق سوال کرتا تو وہ اپنی میز پر سے وہ موٹی کتاب
اٹھا کر کھولنا شروع کر دیتے۔ جس کی جلد پر ان کے اس لڑکے نے چاقو سے نیل
بونے بنا رکھے تھے۔ مگر وہ پرمیشور کو پکڑ کر کہاں سے لاتے جس کے متعلق انہیں
خود اچھی طرح معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا ہے کہاں رہتا ہے اور کیا کرتا ہے۔

جس طرح ان کو یہ معلوم تھا کہ دفعہ ۳۷۹ چوری کے فعل پر عائد ہوتی ہے۔ اسی
طرح ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ مارنے اور پیدا کرنے والے کو پرمیشور کہتے ہیں اور
جس طرح ان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ جس کے قانون سے بنے ہوئے ہیں۔ اس
کی اصلیت کیا ہے ٹھیک اسی طرح ان کو ایشور کی اسات معلوم نہ تھی۔ وہ ایم اے
ایل ایل بی تھے مگر یہ ڈگری انہوں نے ایسی الجھنوں میں چھیننے کے لیے نہیں بلکہ
دولت ماننے کے لیے حاصل کی تھی۔

وہ رام کو پرمیشور نہ دکھا سکے اور نہ ہی اس کو کوئی معقول جواب دے سکے۔ اس
لیے کہ یہ سوال ہی کچھ اس طرح اچانک طور پر کیا گیا تھا کہ ان کا دماغ بالکل خالی
ہو گیا تھا۔ وہ صرف اس قدر کہہ سکے تھے کہ ”جارام..... جا میرا دماغ نہ چاٹ مجھے
بہت کام کرتا ہے۔“

اس وقت انہیں کام واقعی بہت کرتا تھا مگر وہ پرانی شکستوں کو بھول کر فوراً ہی
اس نے مقدمے کا فیصلہ کر دینا چاہتے تھے۔

انہوں نے رام کی طرف خشم آلود نگاہوں سے دیکھ کر اپنی دھرم پتی سے کہا
 ”آج اسے کون سی نئی شرارت کی ہے مجھے جلدی بتاؤ میں آج اسے ڈبل سزا دوں
 گا۔“

سزا چاریہ نے رام کا کان چھوڑ دیا اور کہا ”اس مولے نے تو زندگی وبال کر
 رکھی ہے جب دیکھو تا چنا تھر کنا کو دنا نہ آئے کہ شرم نہ گئے کا لحاظ۔ صبح سے مجھے ستار
 با ہے۔ کئی بار پیٹ چکی ہوں مگر یہ اپنی شرارتوں سے بازی نہیں آتا۔ نعمت خانے
 مٹس سے دو کپے ٹماٹر نکال کر کھا گیا ہے۔ اب میں سلا دو میں اس کا سر ڈالوں۔“

یہ سن کر مسٹر راماشنکر اچار یہ کو ایک دھکا سا لگا۔ وہ خیال کر رہے تھے کہ رام کے
 خلاف کوئی سنگین الزام ہو گا۔ مگر یہ سن کر کہ اس نے نعمت خانے سے صرف دو کپے
 ٹماٹر نکال کر کھائے ہیں۔ انہیں سخت ناامیدی ہوئی۔ رام کو جھڑکنے اور کوسنے کے
 لیے ان کی سب تیاری ایک ایسا کی سرور پڑ گئی۔ ان کو ایسا محسوس ہوا کہ ان کا سینہ ایک دم
 خالی ہو گیا ہے جیسے ایک دفعہ ان کے موٹر کے پمپس کی ساری ہوا نکل گئی تھی۔

ٹماٹر کھانا کرنی جرم تو نہیں۔ اس کے علاوہ ابھی کل ہی مسٹر راماشنکر اچار یہ کے
 ایک دوست نے جو جرمنی سے طب کی اعلیٰ سند لے کر آئے تھے ان سے کہا تھا کہ
 اپنے بچوں کو کھانے کے ساتھ کپے ٹماٹر ضرور دیا کیجیے۔ کیونکہ اس میں کثرت سے
 منامنز ہوتے ہیں۔ مگر اب چونکہ وہ رام کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے لیے تیار ہو گئے
 تھے اور ان کی بیوی کی بھی یہی خواہش تھی اس لیے انہوں نے جموڑی دیو غور کرنے
 کے بعد ایک قانونی تکیہ سوچا اور اس انکشاف پر دل ہی دل میں خوش ہو کر اپنے
 بیٹے سے کہا ”میرے نزدیک آ اور جو کچھ میں تجھ سے پوچھوں سچ بچتا۔“

مسٹر راماشنکر اچار یہ چلی گئیں اور رام خاموشی سے اپنے باپ کے پاس کھڑا ہو گیا۔ مسٹر راماشنکر اچار یہ نے پوچھا ”تو نے نعمت خانے سے دو کپے ٹماٹر نکال کر کیوں کھائے؟“

رام نے جواب دیا ”وہ کہاں تھے ماما جی جھوٹ بولتی ہیں۔“
”تو ہی بتا کتنے تھے؟“

”ڈیڑھ ایک اور آدھا“ رام نے یہ الفاظ انگلیوں سے آدھے کا نشان بنا کر ادا کیے ”دوسرے آدھے سے ماما جی نے دو پہر کو چٹنی بنائی تھی۔“
”چلو ڈیڑھ ہی تھی پر تو نے یہ ہاں سے اٹھائے کیوں؟“
رام نے یہ جواب دیا ”کھانے کے لیے۔“

”ٹھیک ہے مگر تو نے چوری کی“ مسٹر راماشنکر اچار یہ نے قانونی نکتے کو پیش کیا۔

”چوری باپو جی میں نے چوری نہیں کی ٹماٹر کھائے ہیں مگر چوری کیسے ہوئی؟“
یہ کہتا ہوا وہ فرش پر بیٹھ گیا اور غور سے اپنے باپ کی طرف دیکھنے لگا۔
یہ چوری تھی دوسرے کی چیز کو اس کی اجازت کے بغیر اٹھا لینا چوری ہوتی ہے
”مسٹر راماشنکر اچار یہ نے اپنے بچے کو یوں سمجھایا اور خیال کیا کہ ان کا منہ بوم اچھی طرح سمجھ گیا ہے۔ رام نے فوراً ہی کہا ”مگر ٹماٹر تو ہمارے تھے میری ماما جی کے۔“
مسٹر راماشنکر اچار یہ سٹپا کر رہ گئے۔ مگر رو رہی اپنا مطلب واضح کرنے کی کوشش کی۔ ”تیری ماما جی کے تھے ٹھیک ہے پر وہ تیرے تو نہیں ہوئے۔ جو چیز ان کی ہے وہ تیری کیسے ہو سکتی ہے۔ دیکھ سامنے میز پر تیرا کھلو ہا پڑا ہے۔ اٹھا لا میں

تجھے اچھی طرح سمجھاتا ہوں۔“ رام اٹھا اور دوڑ کر ککڑی کا گھوڑا اٹھا لیا اور اپنے باپ کے ہاتھ میں دیدیا۔

”یہ لیجیے۔“

مسٹر راماشنکر اچار یہ بولے ”ہاں تو دیکھ یہ گھوڑا تیرا ہے؟“

”جی ہاں۔“

”اب اگر میں اسے تیری اجازت کے بغیر اٹھا کر اپنے پاس رکھ لوں تو یہ چوری ہوگی۔“ پھر مسٹر راماشنکر نے مزید وضاحت سے کام لیتے ہوئے کہا ”اور میں چور۔“

”نہیں پتا جی..... آپ اسے اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔ میں آپ کو چور نہیں کہوں گا۔ میرے پاس کھیلنے کیلئے ہاتھی جو ہے۔ کیا آپ نے ابھی تک دیکھا نہیں۔ کل ہی منشی دادا نے لا کر دیا ہے۔ ٹھہریے میں آپ کو دکھاتا ہوں“ یہ کہہ کر وہ تالیاں بجاتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا اور مسٹر راماشنکر اچار یہ آنکھیں جھپکتے رہ گئے۔

دوسرے روز مسٹر راماشنکر اچار یہ کو ایک خاص کام سے پوتا جانا پڑا۔ ان کی بڑی بہن وہیں رہتی تھی۔ ایک عرصے سے وہ چھوٹے رام کو دیکھنے کے لیے بے قرار تھی۔ چنانچہ ایک پنتھ دو کاج کے پیش نظر راماشنکر اچار یہ نے اپنے بیٹے کو بھی ساتھ لے گئے۔ مگر اس شرط پر کہ وہ راستے میں کوئی شرارت نہیں کرے گا۔ ننھا رام اس شرط پر بوری بندر انیمیشن کے پلیٹ فارم تک قائم رہ سکا۔ ادھر دکن کوٹمین چلی اور ادھر رام کے ننھے سے سینے میں شرارتیں مچلانا شروع ہو گئیں۔

مسٹر راماشنکر اچار یہ سیکنڈ کلاس اپارٹمنٹ کی چوڑی سیٹ پر بیٹھے اپنے ساتھ والے مسافر کا اخبار پڑھ رہے تھے اور سیٹ کے آخری حصے پر رام کھڑکی میں سے باہر جھانک رہا تھا اور ہوا کا دباؤ دیکھ کر یہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اسے لے اڑے تو کتنا مزہ آئے۔

مسٹر راماشنکر اچار یہ نے اپنی عینک کے گوشوں سے رام کی طرف دیکھا اور اس کو بازو سے پکڑ کر نیچے بٹھا دیا۔ ”تو چین بھی لینے دے گا یا نہیں آرام سے بیٹھ جا۔“ یہ کہتے ہوئے ان کی نظر رام کی نئی ٹوپی پر پڑی جو اس کے سر پر چمک رہی تھی ”اسے اتار کر رکھنا لائق ہوا اسے لے کر اڑ جائے گی۔“

انہوں نے رام کے سر پر سے ٹوپی اتار کر اس کی گود میں رکھ دی۔ مگر چوڑی دیر کے بعد ٹوپی پھر رام کے سر پر تھی اور وہ کھڑکی کے باہر سر نکالے روڑتے ہوئے درختوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ درختوں کی بھاگ دوڑ رام کے ذہن میں آنکھ پھولی کے دلچسپ کھیل کا نقشہ کھینچ رہی تھی۔

ہوا کے جھونکے سے اخبار دوہرا ہو گیا اور مسٹر راماشنکر اچار یہ نے اپنے بیٹے کے سر کو پھر کھڑکی کے باہر پایا۔ غصے میں انہوں نے اس کا بازو کھینچ کر اسے اپنے پاس بٹھالیا اور کہا۔ ”اگر تو یہاں سے ایک انچ بھی ہلاتو تیری خیر نہیں۔“ یہ کہہ کر انہوں نے ٹوپی اتار کر اس کی ٹانگوں پر رکھ دی۔

اس کام سے فارغ ہو کر انہوں نے اخبار اٹھایا اور وہ ابھی اس میں وہ سطر ہی ڈھونڈ رہے تھے جہاں سے انہوں سے پڑھنا چھوڑا تھا کہ رام نے کھڑکی کے پاس سرک کر باہر جھانکنا شروع کر دیا۔ ٹوپی اس کے سر پر تھی۔ یہ دیکھ کر مسٹر راماشنکر

اچار یہ کو سخت غصہ آیا۔ ان کا ہاتھ بھوکی چیل کی طرح ٹوپی کی طرف بڑھا اور چشم زدن میں وہ ان کی سیٹ کے نیچے تھی۔ یہ سب کچھ اس قدر تیزی سے ہوا کہ رام کو سمجھنے کا موقع ہی نہ ملا۔ مڑ کر اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا مگر ان کے ہاتھ خالی نظر آئے۔ اسی پریشانی میں اس نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا تو اسے ریل کی مٹری پر بہت پیچھے ایک خاکی کاغذ کا ٹکڑا اڑتا نظر آیا۔ اس نے خیال کیا کہ یہ میری ٹوپی ہے۔

اس خیال کے آتے ہی اس کے دل کو ایک دھکا سا لگا۔ باپ کی طرف ملامت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے اسے کہا ”باپو جی میری ٹوپی!“ مسٹر راماشنکر اچار یہ خاموش رہے۔

”ہائے میری ٹوپی“ رام کی آواز بلند ہوئی۔

مسٹر راماشنکر اچار یہ کچھ نہ بولے۔

رام نے روتی ہوئی آواز میں کہا ”میری ٹوپی“ اور اپنے باپ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ مسٹر راماشنکر اچار یہ نے اس کا ہاتھ جھٹک کر کہا ”گرا دی ہوگی تو نے اب روتا کیوں ہے؟“ اس پر رام کی آنکھوں میں دو موٹے موٹے آنسو تیرنے لگے۔

”پر دھکا تو آپ ہی نے دیا تھا“ اس نے اتنا کہا اور رونے لگا۔

مسٹر راماشنکر اچار یہ نے ڈراڈنٹ بتائی تو رام نے اور زیادہ رونا شروع کر دیا۔ انہوں نے اسے چپ کرانے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئے۔ رام کا رونا صرف ٹوپی ہی بند کر سکتی تھی۔ چنانچہ راماشنکر اچار یہ نے تھک ہار کر اس سے کہا ”ٹوپی واپس آجائے گی مگر شرط یہ ہے کہ تو اسے پہنے گا نہیں۔“

رام کی آنکھوں میں سے آنسو فوراً خشک ہو گئے جیسے تپتی ہوئی ریت میں بارش کے قطرے جذب ہو جائیں۔ سرک کر آگے بڑھ آیا ”اسے واپس لائے۔“
 مسٹر راماشنکر اچاریہ نے کہا ”ایسے جموڑی واپس آ جائے گی منتر پڑھنا پڑے گا۔“
 کمپارٹمنٹ میں سب مسافر باپ بیٹے کی گفتگو سن رہے تھے۔
 ”منتر یہ کہتے ہوئے رام کو فوراً ہی وہ قصہ یاد آ گیا جس میں ایک لڑکے نے منتر کے ذریعے سے دوسروں کی چیزیں غائب کرنا شروع کر دی تھیں ”پڑھیے پتا جی۔“

یہ کہہ کر وہ خوب غور سے اپنے باپ کی طرف دیکھنے لگا۔ گویا منتر پڑھتے وقت راماشنکر اچاریہ کے گنجلے سر پر سینک اگ آئیں گے۔
 مسٹر راماشنکر اچاریہ نے اس منتر کے بول یاد کرتے ہوئے جوانہوں نے بچپن میں ”اندر جال مکمل“ سے زبانی یاد کیا تھا ”تو پھر شرارت تو نہ کرے گا؟“
 ”نہیں باپو جی“ رام نے جو منتر کی گہرائیوں میں ڈوب رہا تھا۔ اپنے باپ سے شرارت نہ کرنے کا وعدہ کر لیا۔

مسٹر راماشنکر اچاریہ کو منتر کے بول یاد آ گئے اور انہوں نے دل ہی دل میں اپنے حافظے کی داد دے کر اپنے لڑکے سے کہا ”لے اب تو آنکھیں بند کر لے۔“
 رام نے آنکھیں بند کر لیں اور مسٹر راماشنکر اچاریہ نے منتر پڑھنا شروع کر دیا۔
 ”اوم نمہ کامیشری مد مدیش او تمادے بھرینگ پراسواہ“ مسٹر راماشنکر اچاریہ کا ایک ہاتھ سیٹ کے نیچے گیا اور ”سواہ“ کے ساتھ ہی رام کی ٹوپی اس گدگدی رانوں پر آ گری۔

رام نے آنکھیں کھول دیں۔ ٹوپی اسکی چپٹی ناک کے نیچے پڑی تھی اور مسٹر رام
شکر اچاریہ کی ٹیلی ناک کا بانسہ عینک کی سنہری گرفت کے نیچے تھر تھرا رہا تھا۔
عدالت میں مقدمہ جیتنے کے بعد ان پر یہی کیفیت طاری ہوا کرتی تھی۔

”ٹوپی آگئی“ رام نے صرف اتنا کہا اور چپ ہو رہا اور مسٹر رام شکر اچاریہ رام
کو خاموش بیٹھنے کا حکم دے کر اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ ایک خبر کافی
دلچسپ اور اخباری زبان میں بے حد سنسنی تھی۔ چنانچہ وہ منتر وغیرہ سب کچھ بھول
کر اس میں کھو گئے۔ دکن کوئین بجلی کے پروں پر پوری تیزی سے اڑ رہی تھی۔ اس
کے آہنی پہیوں کی ایک آہنگ گڑ گڑا ہٹ اخبار کی سنسنی پیدا کرنے والی خبر کی ہر سطر
کو صوتی مد بخش رہی تھی۔ مسٹر شکر اچاریہ یہ خبر پڑھ رہے تھے۔

عدالت پر سنا نا چھایا ہوا تھا۔ صرف ٹائپ رائٹر کی ٹک ٹک سنائی دیتی تھی۔ ملزم
ایکا ایکلی چلایا ”باپو جی“۔

عین اس وقت رام نے اپنے باپ کو زور سے آواز دی ”باپو جی“ اور مسٹر رام شکر
اچاریہ کو یوں معلوم ہوا کہ زیر نظر سطر کے آخری الفاظ کاغذ پر اچھل پڑے ہیں۔
رام کے تھر تھرا تے ہونٹ بتا رہے تھے کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔

مسٹر رام شکر اچاریہ نے ذرا تیزی سے کہا ”کیا ہے؟“ اور عینک کے ایک
گوشے میں سے ٹوپی کو سیٹ پر پڑا دیکھ کر اطمینان کر لیا۔

رام آگے سرک آیا اور کہنے لگا ”باپو جی وہی منتر پڑھیے“۔
”کیوں؟“ یہ کہتے ہوئے مسٹر رام شکر اچاریہ نے رام کی ٹوپی کی طرف
غور سے دیکھا جو سیٹ کے کونے میں پڑی تھی۔

آپ کے کاغذ جو یہاں پڑے تھے میں نے باہر پھینک دیے ہیں۔“
 رام نے اس کے آگے کچھ اور بھی کہا مگر مسٹر راماشنکر اچاریہ کی آنکھوں کے
 سامنے اندھیرا چھا گیا۔ بکلی کی سی سرعت کے ساتھ اٹھ کر انہوں نے کھڑکی سے
 باہر جھانک کر دیکھا۔ مگر ریل کی پٹری کے ساتھ تیلیوں کی طرح پھڑپھڑاتے
 ہوئے کاغذ کے پرزوں کے سوا اور کچھ نظر نہ آیا۔

”تو نے وہ کاغذات پھینک دیے ہیں جو یہاں پڑے تھے؟“ انہوں نے
 اپنے واسطے ہاتھ سے سیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
 رام نے اثبات میں سر ہلادیا ”آپ وہی منتظر پڑھیے؟“

مسٹر راماشنکر اچاریہ کو ایسا کوئی منتظر یا دن تھا جو جج جج کی کھوئی ہوئی چیزوں کو
 واپس لاسکے۔ وہ سخت پریشان تھے۔ وہ کاغذات جو ان کے بیٹے نے پھینک دیے
 تھے ایک نئے مقدمے کی مثل تھی جس میں چالیس ہزار کی مالیت کے قانونی کاغذ
 پڑے تھے۔ مسٹر راماشنکر اچاریہ ایم اے ایل ایل بی کی بازی ان کی اپنی چال ہی
 سے مات ہو گئی تھی۔ ایک لمبے کے اندر اندر ان کے قانونی دماغ میں کاغذات کے
 بارے میں سینکڑوں خیالات آئے۔ ظاہر ہے مسٹر راماشنکر اچاریہ کے موکل کا
 نقصان ان کا اپنا نقصان تھا۔ مگر اب وہ کیا کر سکتے تھے۔ صرف یہ کہ اگلے اسٹیشن پر
 اتر کر ریل کی پٹری کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیں اور دس پندرہ میل تک ان
 کاغذوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہیں۔ ملیں نہ ملیں تو ان کی قسمت۔
 ایل لمبے کے اندر سینکڑوں باتیں سوچنے کے بعد آخر میں انہوں نے اپنے دل
 میں فیصلہ کر لیا کہ اگر تلاش پر کاغذ نہ ملے تو موکل کے سامنے سرے سے ہی انکار کر

دیں گے کہ اسے ان کو کبھی کاغذات دیے تھے۔ اخلاقی اور قانونی طور پر سراسر ناجائز تھا مگر اس کے علاوہ اور کچھ بھی کیا سکتا تھا۔

اس تسلی بخش خیال کے باوجود مسٹر راماشنکر اچاریہ کے حلق میں تلخی سی پیدا ہو رہی تھی۔ ایک ایسی ان کے دل میں آئی کہ کاغذوں کی طرح وہ رام کو بھی اٹھا کر گاڑی سے باہر پھینک دیں مگر اس خواہش کو سینے میں ہی دبا کر انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔

رام کے ہونٹوں پر ایک عجیب و غریب سا تبسم نمودار ہوا تھا۔
اس نے ہولے سے کہا ”باپو جی! منتظر ہے۔“

”آرام سے بیٹھا رہو ورنہ یاد رکھو گا گھونٹ دوں گا۔“ مسٹر راماشنکر اچاریہ بھنا گئے۔ اس مسافر کے لبوں پر جو غور سے باپ بیٹے کی گفتگو سن رہا تھا ایک معنی خیز مسکراہٹ مچ رہی تھی۔

رام آگے سرک آیا ”باپو جی آپ آنکھیں بند کر لیجیے میں منتظر پڑھتا ہوں۔“
مسٹر راماشنکر اچاریہ نے آنکھیں بند نہ کیں لیکن رام نے منتظر پڑھنا شروع کر دیا ”اوٹک میاٹک شیاٹک لدمداگا۔۔۔ فرود ما۔۔۔ سوہا۔“ اور سوہا کے ساتھ ہی مسٹر راماشنکر اچاریہ کی گوشت بھری رانوں پر کاغذوں کا ایک پلندہ آگرا۔
ان کی ناک کا بانسہ عینک کی سنہری گرفت کے نیچے سے زور سے کانپا۔
رام کی چپٹی ناک کے گول اور لال لال نتھنے بھی کانپ رہے تھے۔

☆☆☆

موم بتی کے آنسو

غلیظ طاق پر جو شکستہ دیوار میں بنا تھا موم بتی ساری رات روتی رہی تھی۔
موم پگھل پگھل کر کمرے کے اگیلے فرش پر اوس کے ٹھٹھرے ہوئے دھندلے
قطروں کی مانند بکھر رہا تھا۔ ننھی لاجو موتیوں کا بار لینے پر ضد کرنے اور رونے لگی تو
اس کی ماں نے موم بتی کے ان جھپٹے ہوئے آنسوؤں کو ایک کپے دھاگے میں پرو کر
اس کو بار بنا دیا۔ ننھی لاجو اس بار کو پہن کر خوش ہو گئی اور تالیاں بجاتی ہوئی باہر چلی
گئی۔

رات آئی..... میل بھرے طاقتے میں نئی موم بتی روشن ہوئی اور اس کی کافی
آنکھ اس کمرے کی تاریکی دیکھ کر ایک لمسے کے لیے حیرت سے چمک اٹھی۔ مگر
تھوڑی دیر کے بعد جب وہ ماحول کی عادی ہو گئی تو اس نے خاموشی سے ٹکٹکی باندھ
کر اپنے گرد و پیش کو دیکھنا شروع کر دیا۔

ننھی لاجو ایک چھوٹی سی کھٹیا پر سو رہی تھی اور خواب میں اپنی پہیلی بندو سے لڑ
رہی تھی کہ وہ اپنی گڑیا کا بیاہ اس کے گڈے سے کبھی نہیں کرے گی۔ اس لیے کہ وہ
بہت بد صورت ہے۔

لاجو کی ماں کھڑکی کے ساتھ لگی خاموش اور نیم روشن سڑک پر پھیلی ہوئی کچڑا کو
حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ کھڑکی کے اس طرف لوہے کے کھمبے پر
ایک لائین دبیر کی سردی میں مجبور سنتری کی طرح اونگھ رہی تھی۔ سامنے بھٹیوارے
کی بندو کان کے باہر چہترے پر انگلیٹھی میں سے کونکلوں کی چنگاریاں ضدی

بچوں کی طرح چل چل کر نیچے گر رہی تھیں۔ گھنٹہ گھر نے غنودگی میں بارہ بجائے
بارہ کی آخری پکار دسمبر کی سردرات میں تھوڑی دیر کا بقیہ رہی اور پھر خاموشی کا ایک
لحاف اوڑھ کر سو گئی! اجو کی ماں کے کانوں میں نیند کا بڑا سہانا پیغام گنگنا یا مگر اس کی
انتزیاں اس کے دماغ تک کوئی اور ہی بات پہنچا چکی تھیں۔

دفعۃً سرد ہوا کے جھونکے سے گھٹکھروؤں کی مدھم جھنجھناہٹ اس کے کانوں
تک پہنچی۔ اس نے یہ آواز اچھی طرح سننے کے لیے کانوں میں اپنی بصارت کی
طاقت بھرنا شروع کر دی۔

گھٹکھرو رات کی خاموشی میں مرتے ہوئے آدمی کے حلق میں اگلے سانس کی
طرح بجنا شروع ہو گئے۔ اجو کی ماں اطمینان سے بیٹھ گئی۔ گھوڑے کی تھکی ہوئی
ہنہناہٹ نے رات کی خاموشی میں ارتعاش پیدا کر دیا اور ایک تانگہ الاٹین کے
کھمبے کی بغل میں آکھڑا ہوا۔ تانگے والا نیچے اترا۔ گھوڑے کی پیٹھ پر تھپکی دے کر
اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا..... چق اٹھی ہوئی تھی اور تخت پر ایک دھندلا سایہ
بھی نظر آ رہا تھا۔

اپنے کھردرے کمر کو جسم کے گرد اچھی طرح لپیٹ کر تانگے والے نے اپنی
جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ساڑھے تین روپے کا کریانہ تھا اس میں سے اس نے ایک
روپیہ چار آنے اپنے پاس رکھ لیے اور باقی پیسے تانگے کی اگلی نشست کا گدااٹھا کر اس
کے نیچے چھپا دیے۔ یہ کام کرنے کے بعد وہ کونچے کی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔

اجو کی ماں چند منیا رہی اٹھی اور دروازہ کھول دیا۔
مادھوتا تانگے والا اندر داخل ہو گیا اور دروازے کی رنجیر چڑھا کر اس نے چندو

سنیاری کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

بھگوان جانتا ہے مجھے تم سے کتنا پریم ہے..... اگر جوانی میں تجھ سے ملاقات ہو
تو یاروں کا تانگہ گھوڑا ضرور بکٹا یہ کہہ کر اس نے ایک روپیہ اس کی ہتھیلی میں دبا دیا۔
چند سنیاری نے پوچھا ”بس؟“

”یہ لے..... اور“ مادھو نے چاندی کی چوٹی اس کی دوسری ہتھیلی پر جما دی۔
تیری جان کی قسم بس یہی کچھ تھا میرے پاس۔“
رات کی سردی میں گھوڑا بازار میں کھڑا ہنہناتا رہا۔ لائین کا کھمبا ویسے ہی
اوٹھتا رہا۔

سامنے ٹولے ہوئے پلنگ پر مادھو بے ہوش لیٹا تھا۔ اس کی بغل میں چند
سنیاری آنکھیں کھولے پڑی تھی اور پچھلے ہوئے موم کے ان قطروں کو دیکھ رہی تھی
جو گیلے فرش پر گر کر چھوٹے چھوٹے دانوں کی صورت میں جم رہے تھے۔ وہ ایک
ایکی دیوانہ وار اٹھی اور لا جو کی کھنیا کے پاس بیٹھ گئی۔ نخعی لا جو کے سینے پر موم کے
دانے دھڑک رہے تھے۔

چند سنیاری کی دھندلی آنکھوں کو ایسا معلوم ہوا کہ موم بتی کے ان جے ہوئے
قطروں میں اس کی نخعی لا جو کی جوانی کے آنسو کہیں چھپ کر بیٹھ گئے۔ اس کا کانپتا
ہوا ہاتھ بڑھا اور لا جو کے گلے سے وہ ہار جدا ہو گیا۔

پچھلے ہوئے موم پر سے موم بتی کا جلتا ہوا دھوا کا پھسل کر نیچے فرش پر گرنا اور اس
کی آغوش میں سو گیا..... کمرے میں خاموشی کے علاوہ اندھیرا بھی چھا گیا۔

☆☆☆

موچنا

نام اس کا مایا تھا۔ تالے قد کی عورت تھی۔ چہرہ بالوں سے بھرا ہوا تھا بالائی لب پر تو بال ایسے تھے کہ جیسے آپ کی اور میری مونچھوں کے۔ ماتھا بہت تنگ تھا وہ بھی بالوں سے بھرا ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو موچنے کی ضرورت اکثر پیش آتی تھی۔

وہ راولپنڈی کیا ایک معمولی گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ جس سے قلع تعلق کیے اسے ایک زمانہ گزر چکا تھا۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ ہیں اس کی شادی ہوئی۔ جب اس کی عمر سولہ برس کے قریب تھی۔ دو برس ہونے کو آئے تو اس کے خاوند کو اس پر شک گزرا کہ مایا کا چال چلن خراب ہے۔ محلے کے وہ ایک نہیں تین آدمیوں سے بیک وقت عشق لڑ رہی تھی۔

اس گنڈے عشق کے دوران مین مایا کو احساس ہوا کہ اس کا ماتھا تنگ ہے۔ اس کے بالائی لب اور تھوڑی پر بال ہیں جو بڑے بدنما معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس نے ایک موچنا خرید لیا اور ان غیر ضروری بدنما بالوں کا علاج کر دیا۔ لیکن وہ ایک مصیبت میں گرفتار ہو گئی۔ اس کا خیال تھا کہ ایک دفعہ بال نوچنے کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے ان سے نجات حاصل کر لے گی۔ اس کو موچنے سے ماتھے ٹھوڈی اور بالائی لب کے بال اکھیرنے میں بڑی محنت کرنا پڑتی تھی۔ ایک ایک کر کے ہر بال کو موچنے کی گرفت میں لینا اور پھر اسے ایک ہی جھٹکے سے باہر نکالنا بہت مشکل کرم تھا۔ مگر مایا دھن کی کچی تھی۔ یہ کام گو خود اس کے اپنے ہاتھ کر رہے تھے لیکن

اس کے باوجود وہ درد کے مارے بلبل اٹھتی تھی۔

جب سارا میدان صاف ہو گیا تو اس نے اطمینان کا بہت لمبا سانس لیا۔ مگر اسے کیا معلوم تھا کہ وہ کمبخت دوسرے ہی روز پھر نمودار ہو جائیں گے۔ چنانچہ جب انہوں نے اس کے چہرے کی جلد سے اپنا سر نکالا تو مایوس پکار کے بیٹھ گئی۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ ہر چوتھے پانچویں روز اپنے غیر ضروری بالوں کا صفائی کیا کرے۔ آہستہ آہستہ موچنا اس کی زندگی کا اہم ترین جزو بن گیا۔ وہ جہاں بھی جاتی موچنا اس کے ساتھ ہوتا۔ لیکن اس کے استعمال میں اسے ان دنوں سخت وقت محسوس ہوتی جب کہ وہ کسی دوسرے کے گھر پر ہوتی۔ اپنے گھر پر بھی اسے سب سے نظریں بچا کر کسی ایسی جگہ بال نوچنے پڑتے تھے جہاں کس کے گزر کا امکان نہ ہو۔ پھر بھی کوئی پتا کھڑکتا تھا تو وہ بھڑک اٹھتی تھی جیسے کوئی بہت بڑا گناہ کر رہی ہے۔

”منلو صاحب میں اب سوچتا ہوں کہ اس سے ایسا کون سا گناہ سرزد ہوا تھا جو خدا نے اس کے موچنے اور ڈاڑھی اگا دی تھی۔ اس کا ما تھا اس قدر تنگ کر دیا تھا کہ اس کی گھنی بھوؤں کے ساتھ آگے مل گیا تھا۔ اس کے سارے بدن پر بھی بال ہی بال تھے۔ معلوم نہیں کیوں۔۔۔۔۔ بال۔۔۔۔۔ روئیں نہیں۔۔۔۔۔ اچھے ٹکڑے بال۔۔۔۔۔ سیاہ۔ آپ یقیناً کہیے گا کہ پھر اس میں ایسی کون سی جاذیبیت تھی کہ تم اس پر لٹو ہو گئے اور بہت دیر تک لٹو رہے۔ سو عرض ہے کہ میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔“

میں نے تکلیل کی طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا۔

”آپ اتنے بڑے شاعر ہیں جب وہ آپ کے پاس تھی تو آپ نے بڑی

خوبصورت غزلیں اور نظمیں لکھیں۔ جن مایا کا پر تو لفظ لفظ میں ملتا ہے۔ جب وہ چلی گئی تو آپ نے پھر بڑی زہریلی زہریلی غزلیں اور نظمیں لکھیں۔ ان میں بھی مایا کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ حیرت ہے کہ آپ کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ آپ کا اس پر لٹو ہونے کا باعث کیا تھا؟“

نکلیل نے ماتھے کا پسینہ نچل سیاحیک طرف ہٹا کر صاف کیا۔

”مایا..... صرف مایا..... اور..... مایا کیا تھی..... یہ خدا کی قسم میں نہیں جان سکا۔ میری شاعری پر اعلیٰ کیجئے کیونکہ وہ محض جذباتی تھی..... اس میں بھی وہی مایا کارفرما تھی۔ جس پر میں بظاہر بے وجہ لٹو ہوا تھا..... لیکن.....“ نکلیل ایک لمحے کے لیے مناسب موزوں الفاظ تلاش کرنے کے لیے رک گیا۔

”وہ بستر کی بہترین رفیق تھی۔“

جہاں تک میں سمجھتا ہوں نکلیل کا یہ بیان بہت حد تک درست تھا۔ مایا ایک نجی ہوئی مرغی تھی۔ اس کے مقابلے میں نکلیل کی سہرے جلوؤں کی بیباکی ہوئی عورت پٹھانی حسن کا بہترین نمونہ تھی..... گو وہ بچوں کی ماں مگر شاید وہ بستر کی اچھی رفیق نہیں تھی۔

مایا شادی شدہ تھی مگر اولاد سے محروم۔ اس کے راویپنڈی میں کئی سلسلے ہو چکے تھے۔ مگر ان سے بھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا..... اس کے ماتھے اس کے بالائی لب اور اس کی ٹھوڈی کے بال بڑھتے جا رہے تھے اور موچنے کے کام میں اسی تناسب سے اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ راویپنڈی میں جب اس نے کھیل کھیلنا شروع کیا تو اس کا خاوند جو کہ ایک شریف آدمی تھا متوسط درجے کا دکاندار غربت کا

مالک اور ہٹ کا پکا تو اس نے ایک دن مایا کو گھر سے باہر نکال دیا۔ مایا نے کوئی لڑائی جھگڑا نہ کیا۔ البتہ دوسرے دن میکے سے اپنے شوہر کو خط لکھا کہ وہ مہربانی کر کے اس کا موچنا سچ دے۔

اس کے شوہر گنڈا سنگھ نے بعد مشکل موچنا تلاش کیا اور آئینہ سمیت مایا کو بھجوایا۔ مایا کے زیور وغیرہ جو اس کے پاس رہتے تھے اسی کے پاس رہے۔ مایا نے ان کا مطالبہ بھی نہ کیا۔

اس کے چاہنے والوں کی کمی نہ تھی۔ چنانچہ دوسرے ہی روز وہ ایک مسلمان گھڑی ساز کیساتھ رہنے لگی۔ وہ اس پر جان چھڑکتا تھا۔ ایک برس کے اندر اندر اس نے مایا کو کئی زیور بنوا دیے۔ ایک گھڑی جو کسی گاہک کی تھی اس کی کلائی پر باندھ دی۔ یہ بہت بیش قیمت گھڑی تھی۔ جب گاہک نے اس کا مطالبہ کیا تو صاف مکر گیا..... اس نے یہ کہا آپ کو صریحاً غلطی ہوئی ہے یہ شہاب الدین کی دکان ہے۔

وہ عورت جس کی یہ گھڑی تھی کوئی شریف عورت تھی۔ یہ سن کر خاموش ہو کر چلی گئی۔ شہاب الدین باوجود اس کے کہ اس کا ضمیر ملامت کر رہا تھا زبردستی خوش ہونے کی کوشش کرتا۔ جب گھر پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ مایا دیوی جس کا اسمی نام اس نے حسب توفیق اور بقدر جذبات صغریٰ رکھا ہوا تھا پڑوس کے گھر میں ہے جو شہر کا چھٹا ہوا بد معاش تھا۔

اب شہاب الدین گھڑی ساز کے گھر سے مایا کا تبادلہ ہو گیا۔ وہ پڑوس میں امین پڑنگ کے یہاں چلی گئی معمولی سا جھگڑا ہوا۔ مایا کے سارے کپڑے وہیں

پڑے رہے لیکن وہ اپنا موچنا ساتھ لیتی گئی۔

امین پڑنگ بڑا غریب قسم کا آدمی تھا۔ اس نے مایا سے صاف صاف کہہ دیا ”دیکھو اگر تم نے پھر کوئی ایسا ویسا معاملہ کیا تو یا درکھو تمہاری گردن چاقو سے کاٹ ڈالوں گا۔“

وہ ہر وقت اپنی جیب میں ایک بڑا خونخوار کمانی والا چاقو رکھتا تھا۔ مگر مایا اس سے بالکل خائف نہ ہوتی۔ امین پڑنگ کا ایک نوجوان لڑکا یوسف تھا جو کالج میں پڑھتا تھا۔ چند ہی دنوں میں اس نے اس نوجوان کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ امین کام پر جاتا تو یوسف کالج سے غیر حاضر ہو کر وہاں پہنچ جاتا..... آخر ایک روز بھانڈا پھوٹ گیا۔ باپ بیٹے کی مڈ بھیسز ہوئی۔ قریب تھا کہ وہ اس کے پیٹ میں اپنی ممانی والا چاقو بھونک کر اس کا خاتمہ کر دے کہ مایا نے حکمت عملی سے کام لے کر چھ بچاؤ کر دیا اور تین کپڑوں میں وہاں سے نکل گئی۔

سنائے کہ امین پڑنگ اس کے جانے کے بعد بہت دیر مغموم رہا..... دوستوں میں وہ ہر وقت اس کی باتیں کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اگر مایا سے اس کی اتفاقی ملاقات ہو جاتی تو اسے کسی قیمت پر بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہوتا۔ کپڑے رنگتے چھو کر وہ سارا دن وارث شاہ کی ”ہیر“ سنا کرتا تھا۔

مجھے صرف یہاں تک مایا کے متعلق معلوم تھا۔ چنانچہ مزید معلومات کے لیے میں نے نکلیل سے جو کہ اپنی داستان بیان کر رہا تھا پوچھا۔

”امین پڑنگ کے بعد وہ کس کے پاس گئی؟“

نکلیل نے زبردست کے ساتھ جواب دیا ”ہزاروں کے پاس..... لاری

ڈرائیور ہر ہنس سگھ کے پاس سینما پر بیٹر مکند لال کے پاس..... دیال سگھ کالج کے
ایک پروفیسر کے پاس..... سٹار بیکری کے مالک حسین بخش کے پاس..... ایکسٹرا
سپائرٹا محمد کے پاس۔

تکلیل کے ہونٹوں پر ابھی تک وہ زہر موجود تھا ”ایک برس میں..... جو کہ اس
نیک بخت کے لیے بہت بڑا عرصہ تھا..... اور“ اس نے میری طرف بری معنی خیز
نظروں سے دیکھا جو کہ زخم خوردہ تھیں ”آپ کو معلوم ہے کہ ہر مرتبہ اپنے نئے یار
سے جدا ہونے کے بعد اس نے ایک رقعہ لکھا جس میں یہ درخواست تھی کہ اس کا
موچنا اس کو بھیج دیا جائے۔“

میں کباب ہو گیا..... موچنے میں آخر ایسی کون سی بات تھی کہ مایا اور تمام
چیزیں چھوڑ کر صرف اسی کی واپسی کی درخواست کرتی تھی۔ چنانچہ میں نے تکلیل
سے پوچھا۔

”یہ موچنا سونے کا تھا..... جڑاؤ تھا؟“

تکلیل مسکرایا ”جی نہیں..... معمولی لوہے کا تھا۔ زیادہ سے زیادہ اس کی قیمت
چار آنے ہوگی۔ مگر وہ اس کا دائمی رفیق بن گیا تھا۔ کم بخت نے کسی مرد کو دائمی رفیق
نہیں بنایا تھا۔ مگر یہ موچنا اس کا بیون ساتھی تھا۔“

امین پڑنگ کو معلوم تھا کہ موچنا کہاں پڑا ہے۔ اس نے پہلے سوچا کہ گول کر
وے اور لڑکے کے ایک دھول رسید کر کے رخصت کر دے..... یا اس کے سر پر
استرا پھر وا کر واپس بھیج دیکہ موچنے نے اتنا کام کیا ہے کہ وہ اب کسی کے کام کا
نہیں رہا..... مگر پھر جانے اسے کیا خیال آیا کہ اس نے کانٹس پر سے موچنا

اٹھایا..... اس کے دانتوں سے مایا کی بھوؤں کے چند بال نکالے اور ایک طرف پھینک دیے۔ امین پڑنگ باہ جو اس کے بہت بڑا غنڈہ تھا مومپنے کو دیکھ کر موم ہو گیا۔ اور اس نے قاصد لڑکے کے سر منڈوانے کا خیال ترک کر دیا۔

مجھے یہ معلوم کرنے کی جستجو تھی کہ وہ امین پڑنگ کے بعد کس کے پاس گئی۔ لیکن نکلیل نے مجھے فوراً ہی بتا دیا ”منٹو صاحب وہ ایک مرد کی عورت نہ تھی لیکن شاید یہ کہنا بھی درست نہیں۔ وہ ایسی میل تھی جو ہر اسٹیشن پر کونلہ پانی چاہتی ہے..... امین کے بعد وہ اسٹنٹ فلم ڈائریکٹر ہرنس سنگھ کے پاس تین مہینے رہی۔ پھر ساؤنڈ ریکارڈسٹ پی این آہیچہ کے پاس ایک ماہ اور چند دن..... ایک کے بعد..... اس کے بعد۔“

میں نے پوچھا ”کس کے پاس؟“
نکلیل نے شرما کر جواب دیا۔ ”آپ کے اس خاکسار کے پاس جسے داراشکوہ المعروف نکلیل کہتے ہیں..... لعنت ہو اس پر ہزار بار۔“

میں نے دریافت کیا ”آپ اس لعنت میں کیسے گرفتار ہوئے؟“
نکلیل نے ٹھٹ پٹاوری لہجے میں کہا ”منٹو صاحب..... وہ لعنت ایسی ہے کہ اس میں گرفتار ہوئے بنا کوئی نہیں رہ سکتا..... آپ بڑے مہنی قسم کے مرد بنے پھرتے ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر آپ اسے دیکھتے تو یقیناً اپنی ساری افسانہ نگاری بھول جاتے..... اگر نہ بھولتے تو قلم کے بجائے مومپنے سے افسانے لکھتے۔ یوں کہیے کہ آپ ادب کی مونچھوں کے بال اکھیڑنے میں ساری عمر صرف کر دیتے۔“

ہو سکتا ہے ایسا ہی ہوتا کیونکہ میں بھی امین نکلیل اور گنڈا سنگھ کی طرح ایک انسان ہوں لیکن میں سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ موپن میں کیا خصوصیت تھی کہ وہ مایا کی زندگی کے ساتھ ایسی بری طرح چپک گیا تھا۔

میں نے نکلیل سے کہا ”تمارا اس کا سلسلہ کتنی دیر تک قائم رہا؟“
نکلیل نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے سگریٹ ساگایا ”قریب قریب دو برس تک“ اور..... وہ بے حد سنجیدہ ہو گیا ”منو صاحب آپ یقین مانیے دنیا و مافیہا کو بھول گیا۔“

میں نے سوال کیا ”کیوں؟“
نکلیل سوچنے لگا..... ”کچھ کہہ نہیں سکتا شاید..... شاید اس کی مونچھوں کے بال..... جو موپن کے استعمال سے بڑے کھر درے ہو گئے تھے..... وہ..... وہ..... بڑی حرارت پیدا کرتے تھے..... اور اس کا جسم جو سر سے پیر تک بالوں سے بھرا ہوا تھا منو صاحب میں شاعر ہوں۔ میں نے ہمیشہ نرم اور پکنے بدن کی تعریف کی ہے جس پر سے آدمی پھسل پھسل جائے۔ مگر مایا کی دوستی کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ سب کو اس بے سارا مڑا تک آنک جانے میں ہے..... بس میں صرف اتنا ہی جانتا ہوں۔“

میں سوچنے لگا۔ پھسل پھسل جانے اور آنک آنک جانے میں واقعی بہت بڑا نفسیاتی فرق ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ اسے خود سمجھ سکتے ہیں..... اگر نہیں سمجھ سکتے تو اس بکھیرے میں نہ پڑیے۔

نکلیل صاحب کی گفتگو کے انداز سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ مایا کو قریب قریب

بھول چکے ہیں مگر پھر بھی اس کی یاد تازہ رکھنا چاہتے ہیں میں نے ان سے کہا۔
 ”تکلیل صاحب..... وہ برس تک آپ کا اور مایا کا سلسلہ رہا.....“
 تکلیل نے میری بات کاٹ کر کہا ”جی ہاں..... وہ برس تک.....“ میں نے
 اپنی بیوی کو چھوڑ دیا..... اپنے بچوں سے منہ موڑ لیا اور مایا کو سینے سے لگا لیا.....
 لیکن وہ برس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ بے وفا ہے..... ریا کار ہے۔“
 میں نے پوچھا ”یہ آپ نے کیسے جانتا؟“
 تکلیل نے زہر آلود لہجے سے کہا ”جناب..... وہ میرے ہمسایے شیخ اسماعیل
 گورنمنٹ کنٹریکٹر سے اپنا نیا سلسلہ قائم کر رہی تھی۔ مجھے اور کسی بات پر غصہ نہیں تھا
 منو صاحب لیکن وہ سالہا پچاس برس کا بڑھا..... سات جوان لڑکیوں کا باپ۔ وہ
 بیویوں کا خاوند..... لیکن حیرت اس سالی پر بھی ہے کہ اسے کیا سوچھی؟“
 تکلیل نے یہ کہہ کر سگریٹ ساگانے کی کوشش کی مگر اس سے سلگ نہ سکا۔ اس
 لیے کہ اس کے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے۔ میں نے اس کے ہاتھ سے
 سگریٹ لیا اور ساگا کر اس کو دیا ”وہ چلی گئی۔“
 ”جی ہاں میں نے اسے دھکے مار کر باہر نکال دیا“ تکلیل نے زور کا ایک کش لیا
 اور کانپتی ہوئی انگلیوں سے پنسل پکڑ کر ایک نئی نظم لکھنے کے لیے تیار ہونے لگا جو
 غالباً مایا کی یاد کے بارے میں ہونے والی تھی۔
 ”جی ہاں وہ چلی گئی..... وہ اپنا موچنا چھوڑ گئی۔“
 میں نے پوچھا ”اس نے اس کی واپسی کا مطالبہ کیا؟“
 تکلیل نے ایک اور کش لیا ”ایک نہیں سینکڑوں مرتبہ..... لیکن میں نے اسے

واپس نہیں کیا..... اس لیے کہ ایک صرف یہی چیز ہے جو اس کے اور میرے
درمیان رہ گئی ہے۔ جب تک یہ موچنا میرے پاس ہے وہ ہمیشہ مجھ سے خط و
کتابت کرتی رہے گی۔“

☆☆☆



موسم کی شرارت

شام کو سیر کے لیے نکلا اور ٹہلتا ٹہلتا اس سڑک پر ہولیا جو کشمیر کی طرف جاتی ہے۔

سڑک کے چاروں طرف چیر اور دیو دار کے درخت اونچی اونچی پہاڑیوں کے دامن میں کالے فیتے کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی ہوا کے جھونکے اس فیتے میں ایک کپکپاہٹ سی پیدا کر دیتے میرے دائیں ہاتھ کو ایک اونچا ٹیلا تھا۔ جس کے ڈھلوانوں میں گندم کے ہرے پودے نہایت ہی مدھم سرسراہٹ دے رہے تھے۔ یہ سرسراہٹ کانوں کو بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ آنکھیں بند کر لوں تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ تصور کے گدگدے قالینوں پر کئی کنواریاں ریشمی ساڑھی پہنے چل رہی ہوں۔ ان ڈھلوانوں کے بہت اونچے اونچے درختوں کا ایک جھوم تھا۔ بائیں طرف سڑک کے نیچے ایک چھوٹا سا مکان تھا جس کو جھاڑیوں نے گھیر رکھا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر پست قد جھونپڑے تھے جیسے کسی حسین چہرے پر تل۔

ہوا گیلی اور پہاڑی گھاس کی بھینی بھینی ہاس سے لدی ہوئی تھی۔ مجھے اس سیر میں ایک ناقابل بیان لذت محسوس ہو رہی تھی۔

سامنے ٹیلے پر دو بکریاں بڑے پیار سے ایک دوسری کو اپنے ننھے ننھے سینگوں سے ریل رہی تھیں۔ ان سے کچھ فاصلے پر کتے کا ایک پلا جو کہ جسامت میں میرے بوٹ کے برابر تھا۔ ایک بھاری بھر کم بھینس کی ٹانگ سے لپٹ لپٹ کر

اسے ڈرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ شاید بھونکتا بھی تھا۔ کیونکہ اس کا منہ بار بار کھلتا تھا۔ مگر اس کی آواز میرے کانوں تک نہیں پہنچتی تھی۔

میں یہ تماشا دیکھنے کے لیے ٹھہر گیا۔ کتے کا پلا دیسک بھینس کی ناگوں پر اپنے پنجے مارتا رہا۔ مگر اس کی ان دھمکیوں کا اثر نہ ہوا۔ جواب میں بھینس نے دوسرے اپنی دم ہلا دی اور بس..... لیکن ایک ایسی جگہ پر حملے کے لیے آگے بڑھ رہا تھا بھینس نے زور سے اپنی دم ہلائی۔ کسی سیاہ سی چیز کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ اس انداز سے اچھلا کہ مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔

میں ان کو چھوڑ کر آگے بڑھا۔

آسمان پر بادل کے سفید ٹکڑے پھیلے ہوئے بادبان معلوم ہوتے تھے۔ جن کو ہوا ادھر سے ادھر دھکیل رہی تھی۔ سامنے پہاڑ کی چوٹی پر ایک قد آور درخت بڑے باوقار انداز میں سنتری کی طرح اکڑا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے بادل کا ایک ٹکڑا جھوم رہا تھا۔ بادل یہ دراز قد درخت اور پہاڑی..... تینوں مل کر بہت بڑے جہاز کا منظر پیش کر رہے تھے۔

میں نیچے کی تصویر کشی کو بے خود ہو کر دیکھ رہا تھا۔ کہ دفعتاً لاری کے ہارن نے مجھے چونکا دیا۔ خیالوں کی دنیا سے اتر کر میں آوازوں کی دنیا میں آ گیا۔ من کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ مساموں کے کان کھل گئے۔ میں فوراً سڑک کے ایک طرف مہٹ گیا۔

لاری پر کار کی طرح بڑی تیزی سے موڑ کے نصف دائرے پر گھومی اور ہانپتی ہوئی میرے پاس سے گزر گئی۔

ایک اور لاری گزرنے پر موڑ کے عتب سے پانچ چھ کاریں نمودار ہوئیں جو میرے
لٹکائے ہوئے ہوئے چل رہی تھیں۔ میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ جب یہ میرے آگے
سے گزر گئیں تو میں نے قدم اٹھایا اور موڑ کی جانب بڑھا۔

چند گزوں کا فاصلہ طے کرنے پر جب میں سڑک کے بائیں ہاتھ والے ٹیلے
کے ایک بہت بڑے پتھر سے آگے نکل گیا۔ جو موڑ سنگین پردے کا کام دے کر
سڑک کے دوسرے حصے کو بالکل اوجھل کیے ہوئے تھا تو میری نظریں ایک خود رو
پودے سے دوچار ہوئیں۔

وہ جوان تھی اس گائے کی طرح جوان جس کے پٹھے جوانی کے جوش سے
پھڑک رہے تھے اور جو اس کے پاس اپنے اندر ہزاروں کپکپاہٹیں لیکر گزر رہی
تھی..... میں تھہر گیا۔

وہ ایک ننھے سے پھڑے کو بانٹ رہی تھی۔ دو تین قدم چل کر پھڑا پھڑ گیا اور
ایسا جھکا کہ بٹنے کا نام نہ لیا۔ لڑکی نے بہتیرا زور لگایا اکھچتن کیے وہ ایک قدم آگے
نہ بڑھا اور کان سمیٹ کر ایسا خاموش ہوا۔ گویا وہ کسی کی آواز ہی نہیں سنتا یہ تو روکھی
کر لڑکی نے اپنی چھڑی سے کام لینا چاہا۔ مگر چیز کی پتلی سی ٹہنی کا آمد ثابت نہ
ہوئی۔ تھک ہار کر اس نے بڑی مایوسی اور انتہائی غصے کی ملی جلی حالت میں اپنے
دونوں پاؤں زمین پر زور سے مارے اور کاندھوں کو جنبش دے کر اس انداز سے
کھڑی ہو گئی گویا اس حیوان سے کہنا چاہتی ہو ”لو اب ہم یہاں سے ایک انچ نہ
ہلیں گے۔“

میں ابھی لڑکی کی اس پیاری حرکت کو مزہ لینے کی خاطر اپنے ذہن میں دہرانے

ہی والا تھا کہ دفعتاً نکھڑا خود بخود ہاتھ بھاگا۔ وہ اس تیزی سے دوڑ رہا تھا کہ اس کی کمزور ٹانگیں میز کے ڈھیلے پایوں کی طرح لڑکھڑا رہی تھیں۔

لڑکی نکھڑے کی اس شرارت پر بہت خشم ناک ہوئی۔ نہ جانے میں کیوں خوش ہوا کہ اسی اثنا میں اس نے میری طرف دیکھا اور میں نے اسکی طرف۔ ہم دونوں بیک وقت ہنس پڑے۔ فضا پر تاروں کا چھڑکاؤ سا ہو گیا۔

یہ سب کچھ ایک لمبے کے اندر اندر ہوا۔ اس نے پھر میری طرف دیکھا۔ مگر اس دفعہ سوال کرنے والی لال بھری آنکھوں سے..... شاید اس کو اب اس بات کا احساس ہوا تھا کہ اس کی مسکراہٹ کسی غیر مرد کے ہنس سے جا بگرائی ہے۔

وہ گہرے سبز رنگ کا ڈوپٹہ اوڑھے ہوئے تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس پاس کی ہریا دل نے اپنی سبزی اسی سے مستعار لی ہے۔ اس کی شلو اور بھی اسی رنگ کی تھی۔ اگر وہ کرتہ بھی اسی قسم کا پہنے ہوتی تو وہ رے دیکھنے والے یہی سمجھتے کہ مراد کے درمیان ایک چھوٹا سا درخت لگ رہا ہے۔

ہوا کے ملائم جھونکے اس کے سبز ڈوپٹے میں بڑی پیاری پیاری لہریں پیدا کر رہے تھے خود کو بیکار کھڑی دیکھ کر اور مجھ کو اپنی طرف گھورتے پا کر وہ بے چین سی ہو گئی اور ادھر ادھر یونہی دیکھا کہ جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہو۔ پھر اپنے ڈوپٹے کو سنوار کر اس نے اس طرف کا رخ کیا جدھر گائیں آہستہ آہستہ جا رہی تھیں۔

میں اس سے کچھ فاصلے پر بائیں ہاتھ پتھروں کے پاس کھڑا تھا۔ جو مراد کے کنارے دیوار کی شکل میں چنے ہوئے تھے۔

جب وہ میرے قریب آئی تو غیر ارادی طور پر اس نے میری طرف نگاہیں

اٹھائیں لیکن فوراً سر کو جھٹک کر نیچے جھکا لیں۔ کو لپے دکاتی اور چٹری ہلاتی میرے پاس سے یوں گزری جیسے کبھی کبھی میرا خیال میرے ذہن سے اپنا کاندھا گڑ گڑ کر گزرجایا کرتا ہے۔

اس کے سلیپر جو غائب اس کے پاؤں میں کھلے تھے۔ سڑک پر ٹکھینے سے شور پیدا کر رہے تھے۔ جھوڑی دور جا کر اس نے اپنے قدم تیز کیے اور پھر دوڑنا شروع کر دیا۔ بیس پچیس گز کے فاصلے پر وہ پتھروں سے چنی ہوئی دیوار پر پھرتی سے چڑھی اور مجھے ایک نظر دیکھ کر دوسری طرف کو دو گئی۔ پھر دوڑ کر ایک جھونپڑے کی چھت پر چڑھ کر منڈیر پر بیٹھ گئی۔

اس کی یہ حرکات..... یعنی..... یعنی..... میری طرف اس کا تین بار مڑ کر دیکھنا..... کیا اس کی مسکراہٹ کے ساتھ میرے تبسم کے کچھ ذرے تو چٹ کر نہیں رہ گئے تھے؟“

اس خیال نے میری نبض کی دھڑکن تیز کر دی۔ جھوڑی دیر بعد مجھے تھکاوٹ سی محسوس ہونے لگی۔ میرے پیچھے جھاڑیوں میں جنگل کے تنچھی گیت برسا رہے تھے..... ہوا میں کھلی ہوئی موسیقی مجھے کس قدر پیاری معلوم ہوئی۔ نہ جانے میں کتنے گھونٹ اس راگ ملی ہوا کے غنا غٹ پی گیا۔

جھونپڑے سے کچھ دور جھاڑیوں کے پاس لڑکی کی گائیں گھاس چر رہی تھیں۔ ان سے پرے پتھر ملی پلڈنڈی پر ایک کشمیری مزدور گھاس کا گٹھا کمر پر لادے اور پر چڑھ رہا تھا دور..... بہت دور ایک ٹیلے سے دھواں بل کھاتا ہوا آسمان کی نیلاہٹ میں گل مل گیا رہا تھا۔ میرے گرد و پیش پہاڑیوں کی بلند یوں پر بڑے بڑے

چیزوں اور سانولے پتھروں کے چوڑے چٹکے سینوں پر ڈوبتے ہوئے سورج کی
زریں کرنیں سیاہ اور انہرے رنگ کے خلوط سایے بکھیر رہی تھیں۔ کتنا سندر بہانہ
سماں تھا۔

میں نے اپنے آپ کو ایک عظیم الشان محبت میں گھرا ہوا پایا۔
وہ جوان تھی۔ اس کی ناک اس پنسل کی طرح سیدھی اور ستواں تھی۔ جس سے
میں یہ سطرین لکھ رہا ہوں۔ اس کی آنکھیں..... میں نے اس جیسی آنکھیں بہت کم
دیکھی ہیں۔ اس پہاڑی علاقے کی ساری گہرائیاں ان میں سمٹ کر رہ گئی تھیں۔
پلمکیں گھنی اور لمبی تھیں۔ جب وہ میرے پاس سے گزر رہی تھی تو دھوپ کی ایک
لرزاں شعاع اس کی پلمکوں میں الجھ گئی تھی۔

اس کا سینہ مضبوط اور کشادہ تھا۔ اس میں جوانی سانس لیتی تھی۔ کاندھے
چوڑے باہیں گول اور گدراہٹ سے بھرپور کانوں میں چاندی کے لمبے لمبے
بندے تھے۔ بال دیہاتیوں کی طرح سیدھی مانگ نکال کر گندھے ہوئے تھے جس
سے اس کے چہرے پر وقار پیدا ہو گیا تھا۔

وہ چھوٹے کی میانی چھت پر بیٹھی اپنی چھڑی سے منڈیر کو کوٹ رہی تھی اور
میں مڑک پر کھڑا تھا۔

”کس قدر بیوقوف ہوں“ دفعتاً میں نے ہوش سنبھالا اور اپنے دل میں کہا
”اگر کوئی مجھے اس کو گھورتا ہوا دیکھ لے تو کیا کہے..... اس کے علاوہ یہ کیونکر ہو سکتا
ہے؟“

”یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟“ جب میں نے ان الفاظ پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ میں

کسی اور ہی خیال میں تھا۔ اس احساس پر مجھے ہنسی آگئی اور یونہی ایک بار اس کو اور دیکھ کر سڑک پر چلنے کے قصد سے آگے بڑھا۔ وہی قدم چل کر مجھے خیال آیا کہ یہاں بٹوت میں مجھے صرف چند روز قیام کرنا ہے کیوں نہ رخصت ہوتے وقت اس کو سلام کر لوں۔ اس میں ہرج ہی کیا شاید میرے سلام کا ایک آدھ ذرہ اس کے حافظے پر ہمیشہ کے لیے جم جائے۔

میں ٹھہر گیا اور کچھ دیر منتظر رہنے کے بعد میں نے سچ مچ اس کو سلام کرنے کے لیے اپنا ہاتھ ماتھے کی طرف بڑھا دیا۔ مگر فوراً ہی احمقانہ حرکت سے باخبر ہو کر ہاتھ کو یونہی ہوا میں ہلادیا اور سیٹی بجاتے ہوئے قدم تیز کر دیے۔

مئی کا گرم دن شام کی خنکی میں آہستہ آہستہ گھل رہا تھا۔

سامنے پہاڑیوں پر ہلکا سا دھواں چھا گیا تھا۔ جیسے خوشی کے آنسو آنکھوں کے آگے ایک چادری تان دیتے ہیں۔ اس دھندلکے میں چڑ کے درخت تحت شعور میں چھپے ہوئے خیالات معلوم ہوئے۔ یہ ایک ہی قطار میں پھلتے چلے گئے تھے۔

میرے پاس ہی ایک جھاڑی پر مونسا سا کوا اپنے سیاہ اور چمکیلے پر پھیلائے سستا رہا تھا۔ ہوا کا ہرجونکا میرے جسم کے ان حصوں کے ساتھ چھو کر جو کپڑوں سے آزاد تھے ایک ایسی محبت کا پیغام دے رہا تھا جس سے میرا دل اس سے قبل بالکل نا آشنا تھا۔

میں نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائیں اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ میری طرف حیرت سے دیکھ کر یہ کہنا چاہتا ہے 'سوچتے کیا ہو..... جاؤ محبت کریؤ'۔

میں سڑک کے کنارے پتھروں کی دیوار پر بیٹھ گیا اور اس..... اس کی طرف

ڈرتے ڈرتے دیکھا کہ مبادا کوئی رہگزر سارا معاملہ تار جائے۔ وہ اسی طرح سر جھکائے اپنی جگہ پر بیٹھی تھی۔ اسے اس کھیل میں کیا لطف آتا ہے؟ وہ ابھی تھکی نہیں؟ کیا اس نے واقعی وہ بار میری طرف مڑ کر دیکھا؟ کیا وہ جانتی ہے کہ میں اس کی محبت میں گرفتار ہوں؟..... آخری سوال کس قدر مضحکہ خیز تھا..... میں جیسے پگیا لیکن اس کے باوجود اس کو دیکھنے سے خود کو باز نہ رکھ سکا۔

ایک مرتبہ جب میں نے اس کو دیکھنے کے لیے گردن موڑی تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس کا منہ میری طرف ہے اور وہ مجھے دیکھ رہی ہے..... میں غمور ہو گیا۔ میرے اس کے درمیان گوفاصلہ کافی تھا مگر میری آنکھیں جن میں میرے دل کی بصارت بھی چلی آتی تھی محسوس کر رہی تھی کہ وہ پہنوں کا گھونگھٹ کاڑھے میری طرف دیکھ رہی ہے..... میری طرف..... میری طرف۔

میرے سینے سے بے اختیار آہ نکل گئی..... عجیب بات ہے کہ سکھ اور چین کا ہاتھ بھی درد بھرے تاروں ہی پر پڑتا ہے..... اس آہ میں کتنی راحت تھی..... کتنا سکون تھا۔ اس لڑکی نے جو میرے سامنے جھونپڑے کی چھت پر بیٹھی تھی۔ میرے شباب کے ہر رنگ کو شوخ کر دیا تھا۔ میرے رونمیں سے محبت پھوٹ رہی تھی۔ شعریت جو میرے سینے کے کسی نامعلوم کونے میں سوئی پڑی تھی اب بیدار ہو چکی تھی..... کیا دوشیزگی اور شعریت تو ام نہیں ہیں؟

اگر اس وقت وہ مجھ سے ہم کلام ہوتی تو میں ایک لفظ تک اپنی زبان سے نہ نکالتا خاموشی میری ترجمان ہوتی..... میری گوئی زبان کتنی باتیں اس تک پہنچا دیتی۔ میں اس کو اپنی خاموشی میں لپیٹ لیتا..... وہ ضرور متحیر ہوتی اور اس حالت

میں بڑی پیاری معلوم ہوتی۔

اس خیال سیکہ راستے میں یوں بے کار کھڑے رہنا ٹھیک نہیں میں دیوار پر سے اٹھا۔ میرے سامنے ٹیلے پر جانے کے لیے ایک پگڈنڈی تھی۔ اوپر ٹیلے کے کسی پتھر پر بیٹھ کر میں اس کو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ چنانچہ درختوں کی جڑوں اور جھاڑیوں کا سہارا لے کر میں نے اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ راستے میں دو تین بار میرا پاؤں پھسلا اور نوکیلے پتھروں پر گرتے گرتے بچا۔

ٹیلے پر جہاں پتھر نہیں تھے کہیں کہیں زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں آلو بوئے ہوئے تھے۔ اسی قسم کے ایک ننھے سے کھیت کو طے کر کے میں ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور ٹوپی اتار کر ایک طرف رکھ دی۔ میرے دائیں ہاتھ کو زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تھا۔ جس میں گندم اگ رہی تھی۔

چڑھائی کی وجہ سے میرا دم پھول گیا۔ مگر شام کی ٹھنڈی ہوائ نے یہ تکان فوراً ہی دور کر دی اور میں جس کام کے لیے آیا تھا مشغول ہو گیا۔

اب وہ جھونپڑے کی چھت پر کھڑی تھی اور خدا معلوم کیسی کیسی آوازیں نکال رہی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ ان دونوں بکریوں کو سڑک پر چڑھنے سے روک رہی تھی جو گھاس چرتی ہوئی آہستہ آہستہ اوپر کا رخ کر رہی تھیں۔

ہوا تیز تھی۔ گندم کے پکے ہوئے خوشے خرخر کرتی ہوئی لمبی کی مونچھوں کی طرح تھر تھرا رہے تھے۔ جھاڑیوں میں ہوا کی سیٹیاں شام کی خاموش فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔

مٹی لے ڈھیلوں کے ساتھ کھیلتا ہوا میں اس کی طرف بہت دیر تک دیکھتا رہا

وہ اب جھونپڑے کی چھت پر بڑے عجیب انداز سے ٹہل رہی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے اپنے سر کو جنبش دی تو میں سمجھا کہ وہ میری موجودگی سے باخبر ہے..... مجھے دیکھ رہی ہے..... میری ہستی کے سارے دروازے کھل گئے۔

جانے کتنی دیر تک وہاں بیٹھا رہا..... ایک ایک بدلیاں گھر آئیں اور بارش شروع ہو گئی۔ میرے کپڑے بھیگ رہے تھے۔ لیکن میں وہاں سے کیونکہ جاسکتا تھا جبکہ وہ..... وہیں چھت پر کھڑی تھی۔ اس خیال سے مجھے بڑی مسرت حاصل ہوئی کہ وہ صرف میری خاطر بارش میں بھیگ رہی ہے۔

ایک بارش تیز ہو گئی وہ اٹھی اور میری طرف دیکھے بغیر..... ہاں میری طرف نگاہ اٹھائے بغیر چھت پر سے نیچے اتری اور دوسرے جھونپڑے میں داخل ہو گئی..... مجھے ایسا افسوس ہوا کہ بارش کی بوندیں میری ہڈیوں تک پہنچ گئیں۔

پانی سے بچاؤ کے لیے میں نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں۔ مگر پتھر اور جھاڑیاں پناہ کا کام نہیں دے سکتی تھیں۔

ڈاک بنگلے تک پہنچتے پہنچتے میرے کپڑے اور خیالات سب بھیگ گئے..... جب وہاں سے سیر کو نکلا تو ایک خشک آدمی تھا۔ راستے میں موسم نے شاعر بنا دیا واپس آیا تو بھیگا ہوا آدمی..... صرف بھیگا ہوا آدمی..... بارش ساری شاعری بہا کر لے گئی تھی۔

☆☆☆

میر اور اس کا انتقام

گھر میں میرے سوا اور کوئی موجود نہیں تھا چنانچہ کچھری میں تھے اور شام سے پہلے کبھی گھر آنے کے عادی نہ تھے۔ ماما جی لاہور میں تھیں اور بملا میری بہن اپنی کسی سہیلی کے ہاں گئی تھی میں تنہا اپنے کمرے میں بیٹھا کتاب لیے اور لکھ رہا تھا کہ صدر دروازے پر دستک ہوئی۔ اٹھ کر دروازہ کھولا تو دیکھا کہ پاربتی ہے۔ دروازے کی دہلیز پر کھڑے کھڑے اس نے مجھ سے پوچھا ”موہن صاحب! بملا اندر ہے کیا؟“

جواب دینے سے پیشتر ایک لمبے کے لیے پاربتی کی تمام شوخیاں میری ٹکا ہوں میں پھر گئیں اور جب میں نے سوچا کہ گھر میں کوئی تنہا نہیں ہے تو مجھے ایک شرارت سوچھی میں نے جھوٹ بولتے ہوئے بڑی بے پروائی کے انداز سے کہا۔

”اپنے کمرے میں بلاؤ نہ تاک رہی ہے۔“

یہ کہہ کر میں دروازے سے باہر گلی میں نکل آیا۔ بملا کا کمرہ بالائی منزل پر تھا جب میں نے گلی کے روشن دان سے پاربتی کو سڑکیاں چڑھتے دیکھا تو جھٹ سے دروازے میں داخل ہو کر اس کو بند کر دیا اور کنڈی چڑھا کر وہ قفل لگا دیا جو پاس ہی دیوار پر ایک کیل سے لٹک رہا تھا۔ دروازے پر تالا لگانے کے بعد میں اپنے کمرے میں چلا آیا اور صوفے پر لیٹ کر اپنے دل کی دھڑکنوں کو سنتا رہا۔ پاربتی کے کردار کا ہلکا سا نقشہ یوں کھینچا جاسکتا ہے۔

وہ بیک وقت ایک شوخ چنپل اور شرمیلی لڑکی تھی۔ اگر اس گھڑی آپ سے بڑی بے تکلفی سے بات کر رہی ہے تو تھوڑے ہی عرصے میں آپ اسے بہت مختلف پائیں گے۔ شرارت اس کی رگ رگ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے لیکن بعض اوقات اتنی بخیلہ اور متین ہو جاتی ہے کہ اس سے بات کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ محلے بھر میں وہ اپنی قسم کی واحد دلہن کی ہے۔ لڑکوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے میں اسے خاص لطف آتا ہے اگر کوئی لڑکا جواب میں معمولی سا بھی مذاق کر دے تو اسے سخت ناگوار گزرتا ہے۔ گلی کے نوجوان کے نازک جذبات سے کھیلنے میں اسے خاص لطف آتا ہے۔ بلی کی طرح وہ چاہتی ہے کہ چوہا اس کے پنجوں کے نیچے دبکا رہے اور وہ اس کو ادھر ادھر بٹخ کر کھیلتی رہے۔ جب اکٹا جائے تو چھوڑ کر چلی جائے۔ کوٹھے پر چڑھ کر محلے کے لڑکوں کے پتنگ توڑنے میں اسے خاص مہارت حاصل ہے۔

ہمارے گھر میں اکثر آنا جاتا تھا۔ اس لیے میں اس کی شوخ طبیعت سے ایک حد تک واقف تھا۔ میرے ساتھ وہ کئی مرتبہ نوک جھونک کر چکی تھی مگر میں دوسروں کی موجودگی میں جھینپ کر رہ جاتا تھا۔ مجھے اس سے نفرت نہ تھی۔ اس لیے کہ اس میں کوئی شے بھی ایسی نہ تھی جس سے نفرت کی جاسکے۔ البتہ اس کی طبیعت کسی قدر الجھی ہوئی تھی اور اس کی حد سے زیادہ شوخی بعض اوقات میرے جذبات پر بہت گراں گزرتی تھی۔ اگر میں سب کے سامنے اس کی پھلجھڑی ایسی زبان کو جس سے کبھی تیز و تند اور کبھی نرم و نازک شرارے نکلتے تھے اپنی گویائی کی قوت پر زور دے کر بند کر سکتا تو مجھے یہ شکایت ہرگز نہ ہوتی بلکہ اس میں خاص لطف بھی حاصل ہوتا

مگر یہاں موجود نظام کی موجودگی میں اس قسم کے خواب کیونکر پورے ہو سکتے ہیں۔

پابندی کے متناسب جسم میں جملہ خوبیاں بھری پڑی تھیں۔ دوشیزگی اس کے ہر عضو میں سانس لیتی تھی۔ آنکھوں میں دھوپ اور بارش کے تصادم ایسی چمک گدرائے ہوئے جو بن کا دلکش ابھار آواز میں صبح کی خاموش فضا میں مندر کی گھنٹیوں کی صدا ایسی حاوت اور چال..... ایسے الفاظ نہیں کہ ان کے خرام کا نقشہ پیش کیا جاسکے۔

گھر خالی تھا دوسرے لفظوں میں میدان صاف تھا۔ اس لیے میں نے موقع بہت مناسب خیال کیا اور اس سے انتقام لینے کی شان لی۔ میری عرصے کی خواہش تھی کہ اس پھسل جانے والی مچھلی کو ایک بار پکڑ کر اتنا ستاؤں اتنا ستاؤں کہ رووے اور کچھ عرصے کے لیے اپنی تمام شوخیاں بھول جائے۔

میں کمرے میں بیٹھا ہوا تھا وہ حسب توقع گھبرائی ہوئی آئی اور کہنے لگی۔
”دروازے میں تالا لگا ہوا ہے۔“

میں بناوٹی حیرت سے مضطرب ہو کر یکایک اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
”کیا کہا؟“

”صدر دروازے پر تالا لگا ہوا ہے۔“

”باہر گلی سے ان گندے لوٹروں نے تالا لگا دیا ہوگا۔“

یہ کہتا ہوا میں اسکے پاس آ گیا۔

اس پر پارہی نے کہا ”نہیں نہیں تالا تو اندر سے لگا ہوا ہے۔“

”اندھر سے؟ اور کہاں ہے؟“

”اپنے کمرے میں تو نہیں ہے کونے کونے میں دیکھ آئی ہوں۔ کہیں بھی نہیں ملی۔“

”تو پھر اسی نے یہ شرارت کی ہے۔ جاؤ دیکھو باورچی خانے غسل خانے میں یا ادھر ادھر کہیں بھی چھپی ہوگی تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔“
یہ کہہ کر میں واپس مڑ کر صوفے پر لیٹ گیا اور وہ بمولہ کو ڈھونڈنے چلی گئی۔
پندرہ بیس منٹ کے بعد پھر آئی اور کہنے لگی۔

”میں نے تمام گھر چھان مارا ہے پر ماتا جانے کہاں چھپی ہے آج میرے ساتھ اس نے اس قسم کی شرارت نہیں کی لیکن آج جانے اسے کیا سوچھی ہے؟“
پارتی صوفے کے پیچھے کھڑی تھی۔ میں نے اس کی بات سنی اور پاس پڑے ہوئے اخبار کے اوراق کھولتے ہوئے کہا۔
”مجھے خود تعجب ہو رہا ہے۔ صحن کے ساتھ والے کمرے میں جا کر تلاش کرو۔ وہیں کسی پلنگ کے نیچے چھپی بیٹھی ہوگی۔“
یہ سن کر پارتی یہ کہتی ہوئی چلی گئی۔

”اسے میری شرارتوں کا علم نہیں خیر سوسنا ایک لوہار کی۔“
اس کو مضطرب دیکھ کر میرا جی باغ باغ ہو رہا تھا۔ اس تیزی کو اپنی ہوشیاری پر کتنا ناز تھا میں ہنسنا اس لیے کہ اس کے پھڑ پھڑانے والے پر میری گرفت میں تھے اور میں بڑے مزے سے اس اضطراب کا تماشا کر رہا تھا۔
میں اپنے ذہن میں اس ہونے والے ڈرامے کا تمام پلاٹ تیار کر چکا تھا اور

اس پر عمل کر رہا تھا۔ جموڑی دیر بعد وہ پھر آئی۔ اس مرتبہ سخت جھٹائی ہوئی تھی واسپے کان سے بہت نیچے بالوں کا ایک گچھا کلپ کی گرفت سے آزاؤ ہو کر ڈھلک آیا تھا۔ ساڑھی سر پر سے اتر گئی تھی اور وہ بار بار اپنے گرد بھرے ہاتھوں کو ایک ننھے رو مال سے پونچھ رہی تھی۔ کمرے میں داخل ہو کر میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں نے اس سے لیے لیے دریافت کیا ”کیوں کامیابی ہوئی کیا!“ اس نے تھکی ہوئی آواز میں جواب دیا ”نہیں میں اب یہاں بیٹھ کر اس کا انتظار کرتی ہوں۔“

”ہاں بیٹھو میں ذرا اوپر ہو آؤں۔“

یہ کہہ کر میں اٹھا اور اوپر چلا آیا۔

بالائی منزل کی چھت پر میں پندرہ بیس منٹ تک ٹہماتا رہا۔ چابی میری جیب میں تھی۔ اس لیے مجھے معلوم تھا کہ پارٹی کسی صورت میں بھی گھر سے باہر نہیں جا سکتی اور یہ احساس میرے دل میں ایک ناقابل بیان مسرت پیدا کر رہا تھا۔ میدان بالکل صاف تھا اور میں اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا میری سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ پارٹی کی دوسروں پر ہنسنے والی آنکھوں کی چمک ایک لمحے کے لیے مانند چڑ جائے اور اس کو معلوم ہو جائے کہ مرد کے پاس نسوانی شراتوں کا بہت کڑا جواب موجود ہے۔

یہ کھیل بہت خطرناک تھا کیونکہ اس بات کا ڈر تھا کہ وہ پتاجی ماتاجی یا بھلا کو تمام بتیے ہوئے واقعات سنا دے گی۔ اس صورت میں گھروالوں کی نگاہوں میں میرے وقار کی تذلیل پڑتی تھی۔ مگر چونکہ میرے سر پر اس دلچسپ انتقام کا بھوت

سوار تھا جو میں نے اس شوخ لڑکی کے لیے تجویز کیا تھا۔ اس لیے کچھ عرصے کے لیے یہ تمام چیزیں میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئی تھیں۔ میں اپنے دل سے سوال کرتا تھا کہ کی نتیجہ ہوگا لیکن اس کا جواب میری پوزیشن کی صحیح تصویر دکھانے کی بجائے شکست خوردہ پارٹی کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھینچ دیتا تھا۔ میں بے حد مسرور تھا۔

کچھ عرصہ بالائی منزل پر ٹہلنے کے بعد میں نیچے آیا۔ پارٹی کرسی پر بیٹھی سخت اضطراب کی حالت میں اپنی خوبصورت مانگ ہلارہی تھی جس پر ریشمی ساڑھی کا کپڑا ادھر ادھر تھرک رہا تھا۔

میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس سے پوچھا ”کیوں بملا ملی“۔
 ”نہیں“ میں نے ایک بار پھر سب کمرؤں کو چھان مارا ہے لیکن وہ ایسی غائب ہوئی ہے جیسے گدھے کے سر سے سینک۔“

میں مسکرایا ”چلو ہم دونوں مل کر اس کو ڈھونڈیں تم اس گھبراہٹ ہو تم تو بڑی نڈر اور بے باک لڑکی ہو۔“

”گھبرانے کی کوئی بات نہیں لیکن مجھے بہت جلد گھر واپس جانا تھا“ پارٹی کے لبوں پر ایک نہایت ہی پیارا تہم پیدا ہوا۔

ہم دونوں ایک عرصے تک نیچے صحن میں پائلوں کے نیچے چار پائیوں کے پیچھے میزوں کے ادھر ادھر پردوں و ہٹا ہٹا کر بملا کر تلاش کرتے رہے مگر وہ گھر پر ہوتی تو ملتی۔ آخر کار میں نے خود کو سخت متعجب ظاہر کرتے ہوئے پارٹی سے کہا ”خیریت ہے تم ہی بتاؤ آخر بملا گئی کہاں؟“

پاربتی جو بار بار جھکنے اٹھنے اور بیٹھنے سے بہت تھک گئی تھی اپنی پیشانی سے پسینہ کے ننھے ننھے قطرہوں کو پونچھتی ہوئی بولی!

”میں کیا جانوں زمین کھا گئی یا بھوت پریت اٹھا کر لے گئے۔ یہ آپ ہی کی بہن کی کارستانی ہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ میں بھی ایسا ستاؤں گی کہ عمر بھر یاد رکھے گی۔ بملا ہزار ہو مجھ سے اڑ کر کہاں جائے گی۔“

میں خاموش رہا اور اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس وقت ہم ماتا جی کے کمرے میں تھے۔ پاربتی میرے سامنے مائیلٹ میز کے قریب کھڑی تھی۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ قطعی طور پر خالی الذہن ہے۔ غیر ارادی طور پر وہ بار بار میز کے گول آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ رہی تھی اور ناگوں سے اپنی سازھی کی شکلیں درست کر رہی تھی۔ دفعتاً کمرے میں مکمل سکوت سے باخبر ہو کر وہ سخت مضطرب ہو گئی اور کہنے لگی۔

”موہن صاحب! مجھے گھر جانا ہے جتنا جلد جانا چاہتی ہوں اتنی دیر ہوتی جاتی ہے۔ بملا کے اب پر لگ گئے ہیں۔ شاید میرے ہاتھوں اس کی شامت آتی ہے۔“

”ہاں..... ہاں..... مگر میں کیا کر سکتا ہوں۔ آپ جانیں اور وہ اس میں میرا کیا قصور ہے اور اگر آپ کو سچ مچ جلدی جانا ہے تو کہیے میں آپ کی کمر میں رسی باندھ کر چھت سے لٹکا دوں کہیے تو تالا توڑ دوں؟ اب آپ کی جو رائے ہو؟“

ایک لمحے کے لیے اس نے سوچا اور جواب دیا ”مجبوری ہے تالا توڑنا ہی پڑے گا۔“

لیکن میں نے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے کہا ”تالا بہت بڑا ہے اور اس کو توڑنے کے لیے بہت سی دقتیں پیش آئیں گی۔ اس کے علاوہ ہتھوڑے کی چوٹوں کی آواز سن کر لوگ کیا کہیں گے؟“

یہ سن کر وہ سنجیدہ ہو گئی اور کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی ”لیکن مجھے گھر تو جانا ہی ہے لوگ کیا کہیں گے کہ ہم کسی غیر کے گھر سینڈھ جھوڑی لگا رہے ہیں۔ اپنے گھر کا تالا توڑ رہے ہیں۔ ہے ہے آج میں کس ساعت سے آئی تھی۔ اب کیا ہوگا میں کس طرح گھر جاؤں ہائے رام کس بلا میں پھنس گئی۔“

میرا وار خالی گیا۔ دراصل میں یہ چاہتا تھا کہ وہ اس ماحول کی نزاکت سے اچھی طرح آگاہ ہو جائے جس میں کہ وہ اس وقت موجود تھی۔ چنانچہ میں نے بات کو ذرا وضاحت سے بیان کیا ”ماتا جی لاہور گئی ہیں اور پتا جی باہر ہیں اور بڑا غائب ہے اس صورت میں.....“ میں یہ کہتے کہتے رک گیا اور پھر اس فقرے کو یوں پورا کر دیا ”تالا توڑنا اچھا معلوم نہیں ہوتا۔“

اب کی دفعہ تیرنشانے پر بیٹھا۔ پارہی کے سپید چہرے پر ہلکی سی سرخی چھا گئی اور ایک لمبے کے لیے ایسا معلوم ہوا کہ اس کے گالوں پر گلاب کی پیتاں بکھر گئی ہیں۔ وہ اپنی ریشمی ساڑھی میں کٹنی کانپی اور تھرائی پارے کی طرح تڑپتی اور کچھ کہتی کہتی خاموش ہو گئی۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

”تم خود سوچ سکتی ہو ویسے مجھے کوئی عذر نہیں۔“

وہ تھوڑا سا تپک کر رہ گئی۔ میں اس کو مضطرب دیکھ کر بہت مسرور ہو رہا تھا۔ کل کی چلبلی شوخ و شنگ اور طرارڑ کی جو بادلوں سے آنکھ چوٹی کیلاتی ہوئی بجلی کی طرح

چپکا کرتی تھی آج دیے کی لوہن کر رہ گئی تھی جو میری پھونک کے رحم پر تھی۔
ساحل کے پتھروں سے نکل کر پلٹتی ہوئی لہر کی طرح اس نے اپنے آپ میں نئی
تازگی پیدا کر کے کہا۔

”میری تو جان پر بنی ہوئی ہے اور آپ ہیں کہ چپا چپا کر باتیں کیے جا رہے
ہیں۔“

”کون سی بات؟“

”یہی یہی کہ لوگ کیا کہیں گے؟“ اس نے اپنے شرمیلے جذبات پر پوری
قوت سے قابو پاتے ہوئے کہا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا اور زیر لب گنگنا لگا۔
”ماتا جی لاہور گئی ہیں۔ پتا جی گھر سے باہر ہیں اور بملا گم ہے۔“
”آپ کون سی نئی بات بتا رہے ہیں۔ یہ تو مجھے بھی معلوم ہے۔ سوال تو یہ ہے
کہ بملا کہاں ہے؟“

”اوپر ہوگی اور کہاں؟“

”اوپر؟ اوپر کی خوب کہی میں اوپر پر چپے چپے ڈھونڈ آئی ہوں۔“
”تم اسے نیچے ڈھونڈتی ہوگی تو وہ دوسری میڑھیوں سے اوپر چلی جاتی ہوگی
جب تم اوپر جاتی ہوگی تو وہ نیچے آ جاتی ہوگی۔ یہ بات میرے ذہن میں آئی ہے
اور۔“

”اس کا ایک علاج ہو سکتا ہے“ پاربتی نے داہنے گال پر انگلی سے ایک نہایت
دلکش گڑھا بناتے ہوئے کہا ”میں اوپر جاتی ہوں اور آپ ایسا کیجیے کہ دوسری
میڑھیوں میں کھڑے ہو جائیں اور جو نہیں وہ نیچے اترے اسے پکڑ لیجیے۔“

میں نے اس تجویز کو سنا اور کہا ”لیکن شاید وہ اصل میں یہاں موجود ہی نہ ہو۔“

”ہاں ہو سکتا ہے..... اس لیے اگر ہوتی تو مل نہ جاتی؟“

”کیا ہو سکتا ہے کہ وہ یہاں موجود نہ ہو تو پھر دروازے کو تالا کس نے لگایا ہے۔ یہ کہیں آپ کی شرارت تو نہیں سچ کہیے؟“

”مجھے کیا معلوم میرا خیال ہے کہ بلا اپنی کسی سہیلی کے ہاں گئی ہوگی یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ صبح وہ اپنی ساڑھی استری کر رہی تھی۔“

”آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ پاربتی کی حیرت ہر لحظہ بڑھ رہی تھی ”اگر وہ کسی سہیلی کے ہاں گئی ہے تو پھر تالا کس نے لگایا ہے یہ کیا شرارت ہے؟“

حیران ہونے کی کوئی بات نہیں مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ اپنی سہیلی ہی کے ہاں گئی ہے۔ اس لیے کہ جاتے وقت وہ سنتو کو ہمراہ لیتی گئی تھی۔ اب مجھے یاد آیا۔

باقی رہا میں تو آپ ہی بتائیے میں آپ کو کیوں قید کرنے لگا۔ پر اتنا ضرور کہوں گا بڑی دلچسپ مچھلی جال میں پھنسی ہے۔“

”آپ کیا کہہ رہے ہیں..... تو پھر..... تو پھر..... یہ شرارت.....“ وہ اپنے فقرے کو پورا نہ کر سکی۔

”ہاں یہ شرارت میں بھی تو کر سکتا ہوں“ میں نے مسکرا کر جواب دیا ”یا آپ کا خیال ہے کہ میں اس کا اہل نہیں؟ شاید میں نے آپ سے کسی وقت کا بدلہ لیا ہو؟“

پاربتی کی حالت عجیب و غریب تھی بند بھاپ کی طرح وہ باہر نکلنے کے لیے بے قرار ہو رہی تھی۔ اس نے میری طرف تیز نگاہوں سے دیکھا۔ جیسے میرے سینے پر

امرار کرنا چاہتی ہے لیکن میں ایک کامیاب ایکٹر کی طرح اپنا پارٹ نبھا رہا تھا۔
اس نے اپنی آنکھوں کی پتلوں کو نچاتے ہوئے دریافت کیا ”لیکن شرارت کی
وجہ؟“

”مجھے معلوم نہیں۔“

وہ خاموش ہو گئی پھر یکا یک جیسے اسے کچھ یاد آ گیا کہنے لگی۔

”موہن صاحب! مجھے گھر جانا ہے۔“

”مجھے معلوم ہے پر یہ تو بتائیے کیا کسی نے آپ کا ہاتھ پکڑا ہے؟“

”تو دروازہ کھول دیجیے۔“ یہ کہنے کے بعد اس نے کچھ سوچا اور کہا ”لیکن آپ

کس طرح کہہ رہے ہیں کہ لا آپ نے لگایا ہے کیا بملا واقعی یہاں نہیں ہے؟“
”مجھے یقین ہے کہ وہ یہاں نہیں ہے اس لیے کہ میں خود اسے رام گلی میں چھوڑ
کر آیا ہوں اور میں نے ان ہاتھوں سے قتل لگایا ہے“ میری گفتگو کا انداز نہایت
متین اور بنجیدہ تھا۔

”آپ نے قتل کیوں لگایا؟“ پارٹی نے نہایت تیزی سے دریافت کیا

”دیکھا میں نہ کہتی تھی کہ یہ آپ کی کارستانی ہے۔“

”کیوں لگایا اس لیے کہ میں نے لگا دیا اور میں نے نہیں لگایا میرے ہاتھوں

نے لگایا ہے۔“

”یہ بھی کوئی بات ہے؟“

میں کرسی پر سے اٹھا اور جھانکی لے کر کہا ”رات کو دیر تک باہر رہنے سے پوری

نیند نہیں کر سکا میرا خیال ہے اب سونا چاہیے۔“

”چابی دے دیجیے پھر آپ سو سکتے ہیں ورنہ میں قیامت برپا کروں گی۔“
پارتی نے سخت اضطراب کی حالت میں اپنا ہاتھ چابی کے لیے میری طرف
بڑھا دیا۔

”چابی..... چابی“ میں نے اپنی قمیص میں ہاتھ ڈال کر کہا ”مگر وہ تو گم ہو گئی
نہ معلوم کسے اڑن چھو کر ڈالی اب کیا ہوگا۔“
یہ سن کر پارتی خشم آلود ہو کر بولی ”گم ہو گئی ہوگی یعنی آپ کو پہلے ہی سے معلوم
تھا کہ گم ہو جائے گی۔ مومن صاحب! وہ اپنے ہاتھ سے چابی نکال دیجیے یہ شرارتیں
جوان لڑکیوں سے اچھی معلوم نہیں ہوتیں ورنہ میرا نام پارتی ہے پارتی مجھے کوئی
ایسی ویسی لڑکی نہ سمجھیے گا۔“

”چابی واقعی گم ہے۔“ میں نے پہلی سی متانت کے ساتھ جواب دیا ”اور تمہیں
اس قدر تیز ہونے کی ضرورت نہیں بیکار تم مجھ پر اس قدر گرم ہو رہی ہو۔“
”چابی گم کہاں ہوئی مجھے بھی تو کچھ معلوم ہو۔“ پارتی اب ہوا سے لڑنا چاہتی
تھی ”آخر آپ کی جیب سے کوئی جنات لے گیا۔“

اگر تمہیں معلوم ہو جائے تو کیا کر لو گی دروازہ بند ہے اور میں نے اسے گلی میں
پھینک دیا ہے۔ لو اب صاف سنو میں نے دروازے کی دراز سے دیکھا کہ جب
میں نے چابی گلی میں پھینکی تو کتے نے ہڈی سمجھ کر منہ میں دبوچ لی اور نگل گیا۔ اب
وہ کتا ڈھونڈا جائے اس کا پیٹ چیرا جائے تب کہیں ملے۔“

یہ سن کر وہ جھلائی اور زیادہ تیز آواز میں کہا ”آپ کو اس شرارت کا جواب دینا
ہوگا۔“

”کسے؟“

”یہ بعد میں معلوم ہوگا۔“

میں نے اطمینان کا سانس لیا اور کہا ”تو پھر یہ بعد کی بات ہے اس وقت دیکھا جائے گا۔ اب ہمیں حال پر غور کرنا ہے اور کتے کے پیٹ میں کہیں کتنی کھل نہ گئی ہو۔“

وہ خاموش ہو گئی اور میں بھی چپ ہو گیا۔ اس نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا ”دیکھیے مجھے نہ ستائیں ورنہ اس کا انجام اچھا نہ ہوگا۔“

”میرے پاس چابی نہیں اس لیے مجبور ہوں ہاں الہ تہ شام کو دروازہ کھولا جاتا ہے اس لیے کہ شاید اس وقت تلاش کرنے پر مل جائے۔“

”اور میں اس وقت تک یہیں قید رہوں گی۔“

”نہیں تم بڑی خوشی سے صحن میں کمروں میں کوٹھوں پر جہاں چاہو کود سکتی ہو سکتی ہو مجھے کوئی عذر نہیں۔“

”پر مانتا جانے آپ کو کیا ہو گیا ہے۔“ وہ میری گفتگو کے انداز پر سخت حیرت زدہ تھی۔

”میں اچھا بھلا ہوں لیکن کبھی کبھی تفریح بھی تو ہونی چاہیے۔ کیا تم اس کی قائل نہیں ہو کیا تم کبھی ایسا تفریح مذاق نہیں کرتیں۔“

”مجھے گھر جانا چاہیے موبن صاحب“ اس نے میرے سوال کا جواب دیا۔

”تم بالکل صحیح کہہ رہی ہو میں گھر جانا چاہیے۔ گھر گیا پانی سے بھر اور اس میں بڑے بڑے کچھوؤں کا ڈر؟ لیکن بتاؤ میں کیا کر سکتا ہوں؟“

”چاہی دے دیجیے بہت ستا چکا اب نہ ستائیے۔“

”دیوی جی مجھے افسوس ہے کہ وہ کمبخت ناشدنی گم ہو گئی ہے۔“

”گم ہو گئی ہے گم ہو گئی ہے آپ نے یہ کیا رٹ لگا رکھی ہے آپ چاہی کیوں نہیں دیتے؟“

”میرے پاس نہیں ہے سرکار کتے کے پیٹ میں ہے۔“

”موہن صاحب لڑکیوں سے اس طرح کا مذاق روا نہیں ہے کتے کا پیٹ آپ کی جیب میں ہے۔“

”اچھا تو یونہی ہوگا۔“

”یونہی کیا ہوگا چاہی ایسے میں جانا چاہتی ہوں۔“

”میں ایک بار نہیں سو بار کہہ چکا ہوں کہ چاہی میرے پاس نہیں ہے نہیں ہے نہیں ہے۔“

”چاہی آپ کے پاس ہے آپ کے پاس ہے۔“

”میرے پاس نہیں نہیں نہیں ہے۔“

”نہیں آپ ہی کے پاس ہے ہے اس نے ہے کو سو مرتبہ دہراتے ہوئے کہا۔“

”اچھا نہیں تھی تو ہے۔“

”تو ایسے جیب سے نکال لے۔“

”میں نہیں دوں گا۔“

”آپ کو دینا پڑے گی۔“

”کوئی زور ہے؟“

”میں چاہتا شروع کر دوں گی“ اس نے مجھ پر رعت گانٹھا۔

”بصد شوق!“ میں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا ”مگر تم کو یہ معلوم کرنا چاہیے کہ ناحق اپنا گلا پھاڑو حلق تھکاؤ گی کچھ بھی نہ ہو گا رو پیٹ کے دیکھ لو۔ میں جھوٹے نہیں کہتا۔ اس کمرے میں کوئی روشن دان نہیں ہے۔ دروازوں پر جتنے پردے لٹک رہے ہیں۔ سب کے سب دیز ہیں مجھے بچپن ہی میں اس کا کئی مرتبہ تجربہ ہو چکا ہے کہ یہاں سے باند سے باند آہ از بھی باہر نہیں جاسکتی۔ میں اس مار سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے زور زور سے پھلایا کرتا تھا کہ پتا جی میری آواز سن لیں گے مگر بے سود تم بیکار چلاؤ گی۔“

پارتی میری بات سن کر بارے ہوئے انسان کی طرح کہا ”لیکن آپ چابی نہیں دیں گے؟“

”مجھے افسوس ہے یہ کہنا پڑتا ہے کہ نہیں۔“

”کیوں؟ اس کا سبب؟“

”پھر وہی مہمل سوال“

”آپ کا مذاق حد سے زیادہ بڑھ رہا ہے“ اس نے اپنی ساڑھی کے گرتے ہوئے پلو کو سنبھالتے ہوئے کہا ”میں یہ سب معاملہ حرف بحرف جیسے کا تیسرا بملا کو سنا دوں گی۔“

”بڑے شوق سے میں آج شام کو وہی جا رہا ہوں۔ اس کے علاوہ بملر بے چاری بھی کای سکے گی؟“

”وہ آپ کے پتا جی سے شکایت کرے گی۔“

”میری ایک خشم آلود جھڑکی اس کی زبان بند کرنے کے لیے کافی ہوگی۔“

”تو میں خود ان سے سب کچھ کہہ دوں گی۔“

”جو دل میں آئے کہہ لیں اس وقت اس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔“

میں نے کہنے کو تو کہہ دیا۔ مگر دل میں بہت ڈرا پتا جی گو نرم دل تھے مگر اس قسم کی شرارت کا حال سن کر ان کا رنجیدہ ہونا لازم تھا۔ بہر حال میں نے سوچ رکھا تھا کہ اگر اس پارتنی نے ان سے کہہ دیا تو میں سر جھکا کر ان کی لعن طعن سن لوں گا۔ دراصل میں کسی قیمت پر بھی اس ادھر ادھر کی چیزیں کتر کر جھٹ سے اپنے بل میں گھس جانے والی چوبیا کو اپنے دام انتقام سے باہر نہیں نکالنا چاہتا تھا۔

مجھے خاموش دیکھ کر وہ میرے فرض سے آگاہ کرنے کی خاطر بولی ”آپ کو معلوم ہونا چاہیے مجھے گھر جانا ہے۔ بس دل لگی ہو چکی۔ آپ کتنی سیدھے من سے نکالے۔“

”تم نہیں جاسکتی ہو۔“

”یہ بھی عجیب سکھا شاہی ہے۔“

”ہاں اس مکان میں میرا راج ہے اور سامنے والے مکان پر تمہارا۔ اپنے مکان کی چھت پر تم سیوا جی ہو اور ہم تمہاری حکومت تسلیم کرتے رہے ہیں۔ تم نے ہزاروں مرتبہ چڑھے ہوئے پتنگوں کو کئی کئی ریل ڈور سمیت توڑ لیا ہے اور ہم خاموش رہے۔ آج تم ہماری بادشاہت میں ہو۔ اس لیے تمہیں دم مارنے کی مجال نہیں ہونی چاہیے۔“

”میں نے آپ کے پتنگ کبھی نہیں توڑے آپ غلط کہہ رہے ہیں۔“

”تم جھوٹ بول رہی ہو پارٹی تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس وقت میرے ہاتھ بڑے بڑے اختیارات کی باگ ڈور ہے مردوں سے بات بات پر ٹوک جھونک کرنا تمہاری فطرت میں داخل ہے مگر شاید تمہیں معلوم نہیں کہ ہم لوگ بہت سخت گیر ہوتے ہیں بری طرح بدلہ لیتے ہیں سمجھیں۔“

یہ سن کر وہ اور بھی گھبرا گئی ”میں جانتی ہوں۔“

وہ دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ میں نے دوڑ کر دہلیز میں اس کا راستہ روک لیا ”تم کمرے یہ میں رہو گی۔“

”پئے! مجھے جانے دیجیے“ اس نے میرے بازو کو جھٹکا۔

میں وہیں جم رہا۔ یہ دیکھ کر وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی اور سخت غصے کی حالت میں کہا ”آپ زبردستی کر رہے ہیں۔“

”ابھی تم نے اس زبردستی کا نصف بھی نہیں دیکھا۔“

”آپ مجھے نہیں جانے دیں گے۔“

”نہیں۔“

”میں رو دوں گی موہن صاحب میں سر پیٹ لوں گی اپنا“ اور اس کی آنکھوں سے واقعی آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ اسی حالت میں روتی ہوئی آواز میں دھمکیاں دیتی ہوئی آگے بڑھی مجھے دھکا دے کر اس نے دروازے سے باہر نکلنا چاہا۔ اس کٹکٹش اور پریشانی میں مضطرب دیکھ کر مجھے اس پر ترس آ گیا اور جب وہ تازہ حملے کے لیے آگے بڑھی تو میں نے بڑے آرام سے اس کے گیلے ہونٹوں کو

اپنے لبوں سے چھولیا۔

میرے لبوں کا اس کے ہونٹوں کو چھوتا تھا کہ آفت برپا ہو گئی۔ یہ سمجھتے کہ کسی نے آتش بازی کی چھوٹ کو آگ دکھا دی ہے۔ اس نے مجھ کو ہموٹی موٹی گالیاں دیں کہ تو بہ بھلی اور میرے سینے کو دھڑا دھڑا اپنے ہاتھوں سے پیٹنا شروع کر دیا۔ لطف یہ ہے کہ آپ روتی جاتی تھی۔ آخر کار جب مجھے مار مار کر تھک گئی تو زمین پر بیٹھ کر اپنے سر کو گھٹنوں میں چھپا کر اور بھی زیادہ زور سے رونا شروع کر دیا۔

نصف گھنٹے کی منت سماجت کے بعد اس نے اپنی آنکھوں سے آنسو بہانے بند کیے اس کے بعد میں نے جیب سے چابی نکالی اور صدر دروازے کی طرف جاتے ہوئے کہا ”دروازہ کھلا ہے اب آپ جا سکتی ہیں۔“

اس روز شام کو میں وہی چلا گیا اور پندرہ روز کے بعد واپس آیا۔ چونکہ گھر میں کسی نے شرارت کے متعلق مجھ سے استفسار نہ کیا۔ اس لیے معلوم ہوا کہ پارٹی نے میرا چیلنج قبول کر لیا ہے ظاہر تھا کہ وہ انتقام ضرور لے گی۔

ایک روز میں نے میز کا دراز کھول کر اپنی بڑی تصویر نکالی۔ اس لیے کہ مجھے اس کا فریم بنانا تھا۔ یہ فوٹو خاکستری رنگ کے بڑے لفافے میں بند تھا۔ چنانچہ میں اس کو کھول کر دیکھے بغیر فریم ساز کے ہاں لے گیا۔ اس کی دکان پر میں نے ڈیڑھ گھنٹے کے غور فکر کے بعد فریم کے لیے ایک نکلڑی انتخاب کی اور کچھ ہدایات دینے کے بغیر تصویر والا لفافہ دکاندار کو دیدیا۔ اس نے جب اس کو کھول کر دیکھا تو کھٹکھٹا کر ہنس پڑا۔ ناک پر ایک سیاہ گولا سا رکھا ہے اور چشمے کے شیشے بالکل سیاہ

کر دیے گئے ہیں۔ یہ تصویر میری شبیہ تھی مگر اس مسخ حالت میں اس کو پہچاننا بہت
دشوار تھا۔ پہلے پہل تو میں بہت متحیر ہوا کہ یہ کس کی حرکت ہے مگر فوراً ہی سب
معاملہ صاف ہو گیا سیوا جی میری غیر حاضری میں اپنی ہمسایہ سلطنت پر نہایت
کامیابی سے چھاپہ مار گئے تھے۔

☆☆☆



میرا ہم سفر

پلیٹ فارم پر شہاب سعید اور عباس نے ایک شور مچا رکھا تھا۔ ہی سب دوست مجھے اسٹیشن چھوڑنے کے لیے آئے تھے گاڑی پلیٹ فارم کو چھوڑ کر آہستہ آہستہ چل رہی تھی کہ شہاب نے بڑھ کر پائے دان پر چڑھتے ہوئے مجھ سے کہا۔

”عباس کہتا ہے کہ گھر جا کر اپنی ”ان“ کی خدمت میں سلام ضرور کہنا۔“

”وہ تو پاگل ہے..... اچھا خدا حافظ۔“ میں نے ان نیکی دوستوں سے پیچھا چھڑاتے ہوئے یہ الفاظ جلدی میں ادا کیے اور شہاب سے ہاتھ ملا کر دروازہ بند کرنے کے بعد اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

علی گڑھ اور اس کی حسین علی فضا جس میں میں اس سے کچھ عرصے پہلے سانس لے رہا تھا۔ اب مجھ سے ایک طویل عرصہ کے لیے دور ہو رہی تھی۔ میرا دل سخت مغموم تھا۔ شہاب اگرچہ کالج میں بہت تنگ کرتا تھا مگر اس کے جدا ہونے کا مجھے اب احساس ہوا۔ جب میں نے دفعتاً خیال کیا کہ امرتسر میں مجھے اس ایسا دوست میسر نہ آ سکے گا۔ اسی خیال کے غم افزا اثر کے تحت میں نے سر کو جنبش دیتے ہوئے اور اس عمل سے گویا اپنے ذہن سے اس تاریکی کو جھٹکتے ہوئے جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی اور اس میں سے ایک سگریٹ نکال کر اس کو ساگایا اور اطمینان نشست پر ٹھکانے سے بیٹھ کر اپنے سامان کا جائزہ لیا اور پھر اپنے ساتھی کی طرف جو سیٹ کے آخری حصے پر بیٹھا تھا پیٹھ کر کے سگریٹ سے دھوئیں کے چھلے بنانے کی بے سود کوشش میں مصروف ہو گیا۔

میں بالکل خالی الذہن تھا۔ معلوم نہیں کیوں؟ سگریٹ کا دھواں جس کو میں اپنے منہ سے چھلوں کی صورت میں نکالنے کی کوشش کرتا تھا۔ ہوا کے تندر جھونکوں کی تاب نہ لا کر کھڑکی کے راستے کسی تھرکتی ہوئی رقصہ کی طرح تڑپ کر باہر نکل رہا تھا۔ میں بہت عرصہ تک سگریٹ کے اس دھوئیں کو بڑے غور سے دیکھتا رہا۔۔۔۔۔ یہ رقص کی ایک تکمیل تھی۔

”رقص کی تکمیل“ یہ الفاظ دفعتاً میرے دماغ میں پیدا ہوئے اور میں اپنے اس اچھوتے خیال پر بہت مسرور ہوا۔

”کیا میں پاگل ہوں؟“

گاڑی پلیٹ فارم کو چھوڑ کر کھلے میدانوں میں دوڑ رہی تھی۔ آہنی پٹریوں کا بچھا ہوا جال بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ پتھریلی روش کے آس پاس اگے ہوئے درخت ایک دوسرے کا تعاقب کرتے محسوس ہوتے تھے۔ ”رقص کی تکمیل“ اور ان درختوں کی بھاگ دوڑ کا مشاہدہ کر رہا تھا کہ ان حیران کن الفاظ نے مجھے چونکا دیا جو نانا بامیر نے اس ہم سفر نے ادا کیے تھے جو سیٹ کے آخری کونے میں بیٹھا تھا۔

اس نے یقیناً یہ عجیب سا سوال مجھ سے ہی پوچھا تھا۔

”کیا آپ مجھ سے دریافت فرما رہے ہیں؟“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ کیا میں پاگل ہوں؟“ اس نے ایک بار پھر مجھ سے دریافت کیا۔

ٹرین کی روانگی پر جب میں نے شہاب سے یہ کہا تھا ”وہ تو پاگل ہے۔۔۔۔۔ اچھا خدا حافظ!“ تو شاید اس شریف آدمی نے یہ خیال کر لیا تھا کہ میں نے اسی کو پاگل کہا

ہے..... میں کھل کھلا کر ہنس پڑا اور نہایت مودبانہ لہجہ میں کہا۔

”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے حضرت! گاڑی چلتے وقت شاید میں نے اپنے کسی دوست کو پاگل کے نام سے پکارا تھا..... وہ تو ہے ہی پاگل! میں معافی چاہتا ہوں کہ آپ کو خواہ مخواہ تکلیف ہوئی۔“

یہ معقول دلیل سن کر میرا ہم سفر جو غالباً کچھ اور کہنے کے لیے ذرا آگے سرگ رہا تھا خاموش ہو گیا۔ یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہو گیا کہ معاملہ نہیں بڑھا۔ اتفاق سے میری طبیعت کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ عموماً مجھے ٹکمی سے ٹکمی باتوں پر طیش آ جایا کرتا ہے۔ چونکہ اس سے قبل میری کئی مرتبہ دوران سفر میں میرا مسافروں سے جھگڑا ہو چکا تھا اور میں اس کے تلخ نتائج سے اچھی طرح واقف تھا اس لیے لازمی طور پر اس معاملہ کو اتنی جلدی بغیر و خوبی انجام پاتے دیکھ کر میں بہت خوش ہوا چنانچہ میں نے اس مسافر سے خوشگوار تعلقات پیدا کرنے کے لیے اس سے ایسے ہی گفتگو شروع کی..... رہی گفتگو جو عام طور پر گاڑیوں میں مسافروں سے کی جاتی ہے۔

”آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟“ میں نے اس سے دریافت کیا۔

”میں.....“ یہ کہتے ہوئے وہ کونے سے سر کرتا ہوا اٹھ کر میرے مقابل والی سیٹ پر بیٹھ گیا ”میں وہی جا رہا ہوں..... آپ کہاں اتریں گے؟“

”مجھے کافی طویل سفر کرنا ہے..... امرتسر جا رہا ہوں۔“

”امرتسر.....“

”جی ہاں.....“

”مجھے یہ شہر دیکھنے کا کئی مرتبہ اتفاق ہوا ہے۔ اچھی بارونق جگہ ہے۔ کپڑے کی تجارت کا مرکز ہے۔ کیا آپ وہاں کسی کالج میں پڑھتے ہیں؟“

”جی ہاں!“ میں نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ کیونکہ اس کا سوال میرے نزدیک بہت غیر دلچسپ تھا۔ اس کے علاوہ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر میں نے اپنے ہم سفر سے یہ کہا ہوتا کہ میں علی گڑھ یونیورسٹی میں پڑھتا ہوں تو وہ کالج کی دلچسپیوں اس کی ثمارت اور اس کے خدا معلوم کن کن حصوں اور شعبوں کے متعلق مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ شروع کر دیتا۔ اس سے قبل میرے ساتھ اس قسم کا واقعہ پیش آ چکا تھا جب میرے ایک رفیق سفر نے سوال پوچھتے پوچھتے رات کی نیند مجھ پر حرام کر دی تھی۔

”کون سے کالج میں..... میرے خیال میں وہاں کئی کالج ہیں“ اس نے مجھ سے دریافت کیا۔

میں نے جھٹ سے جواب دیا ”خالصہ کالج میں“۔

”اچھا..... وہی جو اینڈرسن نے تعمیر کرایا ہے“۔

”اینڈرسن نے..... مگر وہ سکھوں کا کالج ہے حضرت“ میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

”مجھے معلوم ہے مسٹر! یہ اینڈرسن سکھ ہو گیا تھا..... آپ نے غالباً سکھ ہسٹری کا مطالعہ نہیں کیا“۔

”شاید“۔

یہ کہہ کر میں نے گفتگو کو دلچسپ نہ پاتے ہوئے منہ موڑ لیا اور کھڑکی سے باہر کی

طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ گاڑی اب یو پی کے وسیع میدانوں میں دندناتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ لوہے کے پہیوں کی وزنی چھٹکارا اور چوٹی شہتیروں کی کھٹاکھٹ فضا میں ایک عجیب یک آہنگ شور برپا کر رہی تھی۔ اس شور کی صدائے بازگشت نے آس پاس کے دوڑتے ہوئے کھمبوں اور درختوں سے ٹکرا کر شام کی خنک ہوا میں ایک ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔ میں نے ایسے ہی کھڑکی میں سے اپنا بازو باہر نکالا۔ منہ زور گاڑی کی تیز رفتار کی وجہ سے ہوا کے زیر دست دھکے نے میرے بازو کو ریادے کر پیچھے دبا دیا۔ میں نے ٹھنڈی ہوا کے اس دباؤ کو بہت پیارا محسوس کیا۔ چنانچہ میں کھیل میں مصروف ہو گیا اور اپنے ہم سفر اور اس کی گفتگو کو بالکل بھول گیا۔ ہوا کے دباؤ کی دلنوازی بہت مسرور کن تھی۔

تھوڑی دیر بعد میں اپنے اس کھیل سے اکتا گیا۔ دراصل بار بار ہوا کو چیرنے سے میرا بازو تھک گیا تھا۔ اب میں نے مڑ کر میدانوں کی وسعت کا نظارہ کرنا شروع کر دیا۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخ..... آتشیں سرخ کرنیں میدان کے گڑھوں میں بارش کے جمع شدہ پانیوں پر زرنکاری کا کام کر رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خاکستری زمین کے سینے پر کسی نے بڑے بڑے آئینے آویزاں کر دیے ہیں۔ بجلی کے تاروں اور کھمبوں پر نیل کنٹھ اور ابا بلیں پھدک رہی تھیں۔ یہ منظر بہت سہانا تھا۔

”کیا میں پاگل ہوں؟“

ان الفاظ نے ایک بار پھر ان رنگوں کو منتشر کر دیا جو میرے دل و دماغ پر ایک نہایت ہی پیاری تصویر کھینچ رہے تھے۔ میں چونک پڑا۔ میرے اسی ہم سفر نے مجھ

سے یہ سوال دریافت کیا تھا۔ میں مڑا۔ وہ میری طرف مستفسر انداز میں دیکھ رہا تھا۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ شاید میرے کانوں کو دھوکا ہوا ہے میں نے کہا۔

”کیا ارشاد فرمایا آپ نے؟“

وہ ایک لمحہ خاموش رہا پھر اپنے سر کو جھٹکتے ہوئے کہا ”کچھ بھی نہیں شاید آپ بتا نہ سکیں گے۔“

اب میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی عمر غالباً بیس بائیس برس کے قریب ہوگی۔ ڈاڑھی مال صغانی سے موڑی ہوئی تھی اس کے گال گوشت سے بھرے ہوئے تھے۔ ان کی مونائی میں بہت خفیف سافرق تھا۔ جو صرف مجھ ایسا باریک بین ہی دیکھ سکتا ہے۔ بال جن میں سے کسی اچھے اور بڑھیا تیل کی خوشبو آ رہی تھی پیچھے کی طرف کنگھی کیے گئے تھے۔ جس سے اس کی پیشانی بہت کشادہ ہو گئی تھی۔ وہ معمولی قسم کے کشمیرے کا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ کلف شدہ کالر قمیص کے ساتھ لگا ہوا تھا مگر مانی موجود نہ تھی..... یہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

میں ابھی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ پھر بولا!

”میں آپ سے کچھ دریافت کرنا چاہتا ہوں۔“

میں اس کے رازدارانہ لہجہ سے بہت متحیر ہوا۔ آخر وہ مجھ سے کیا دریافت کرنا چاہتا ہے؟ یہ خیال کرتے ہوئے میں نے جھک کر گویا اس کے سوال کا جواب دینے کے لیے تیار ہو کر کہا ”بصد شوق..... فرمائیے۔“

”کیا میں پاگل ہوں؟“

میری حیرت اور بھی بڑھ گئی۔ میں سمجھ نہ سکا کہ کیا جواب دوں۔ آپ ہی

فرمائیے میں اس شخص کو کیا جواب دے سکتا تھا جو بظاہر نہایت ہی ہوشمند انسان معلوم ہوتا تھا..... بالکل میری اور آپ کی طرح۔

”آپ..... آپ.....“ میں نے تنہا تے ہوئے کہا۔

”ہاں..... ہاں میں آپ فرمائیے نا؟“ اس نے بڑی سنجیدگی سے مجھ سے دریافت کیا۔

”مگر کیوں؟ آپ بڑے ہوشمند انسان ہیں۔“

”آپ اپنی رائے مرتب کرنے میں جلدی سے کام نہ لیجیے پھر غور فرما کر جواب دیجیے کیا میں واقعی پاگل ہوں؟“

اس میں غور کرنے والی بات ہی کوئی نہ تھی لیکن پھر بھی میں نے اپنے ہم سفر کے چہرے کی طرف غور سے دیکھنا شروع کیا۔ دراصل میں دو چیزیں معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اولاً یہ کہ کہیں وہ مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہا۔ ثانیاً یہ کہ شاید اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ ظاہر کر دے کہ وہ کچھ پاگل ہی ہے۔ میں نے اپنے ایک دوست سے سنا تھا کہ عام طور پر پاگلوں کی آنکھوں میں سرخ ڈورے ابھرے ہوتے ہیں۔ مگر وہ آنکھیں جو میری طرف دیکھ رہی تھیں غیر معمولی طور پر سفید تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سفید چینی کی بنی ہوئی ہیں۔ میں کچھ معلوم نہ کر سکا۔

”آپ کو کسی نے بہت غلط طور پر شک میں ڈال دیا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے خیال کیا کہ شاید کسی ڈاکٹر نے اس کو وہم میں ڈال دیا ہے۔ کیونکہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ آج کل کے سستے اور جاہل ڈاکٹر بغیر سوچے سمجھے نبض پر ہاتھ رکھ کر کسی کو دیوانہ کسی کو مدقوق اور کسی کو ضعیف اعصاب کا مریض ٹھہرا دیتے ہیں۔

”میرا بھی یہی خیال ہے..... مگر آپ کو قطعی طور پر یقین ہے کہ میں واقعی پاگل نہیں ہوں۔“ اس نے کہا۔
 ”قطعی طور پر..... جس شخص نے آپ کو اس وہم میں مبتلا کیا ہے میرے خیال میں وہ خود پاگل ہے۔“
 ”خیر وہ تو پاگل نہیں اچھا بھلا ہے۔“
 ”وہ کون بزرگ ہیں؟“
 ”میرا پنا باپ۔“
 ”آپ کا باپ؟“

”جی ہاں..... وہ کہتا ہے کہ میں پاگل ہوں حالانکہ میں خود میں اس قسم کی کوئی علامت نہیں پاتا۔ آج سے ایک سال قبل اس کی نظروں میں میں پاگل نہ تھا۔ لیکن جوئی میری شادی ہوئی میرے باپ نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ موہن دیوانہ ہے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سسرال والوں نے ڈر کے مارے اپنی لڑکی کو گھر بلوایا۔ اب وہ اس کو میرے حوالے نہیں کرتے۔ یہ کس قدر رنج افزا بات ہے کہ مجھے اپنی بیوی کے ساتھ دس پندرہ دن بھی بسر کرنے میںسر نہیں ہوئے۔“

یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ واقعی بہت مغموم ہے۔ میں بھی متاثر ہوا لیکن مجھے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کے باپ نے اسے خواہ مخواہ پاگل بنا کر اس کی زندگی کیوں تلخ کر دی ہے۔

”مگر آپ کے والد صاحب نے یہ حرکت کیا کی؟“ میں نے اس کی داستان میں گہری دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

”مسٹر! وہ یہودی ہے..... پکا یہودی۔ اس کو صرف اپنے طوائف سکوں سے غرض ہے اور بس..... میں اس کے خون کا ایک حصہ ہوں مگر یہ چیز اس کے دل پر اثر نہیں کر سکتی ہے۔ اگر اس نے مجھے پاگل بنایا ہے تو اس میں بھی کوئی بڑا راز مضمر ہے۔ وہ اس قدر نفس پرست ہے کہ مرنے کے بعد بھی وہ یہ نہیں چاہتا کہ اس کی جائیداد اس کے اپنے لڑکے کے ہاتھوں میں چلی جائے۔ دیکھیے میں نے تین سال ہوئے بی اے پاس کیا ہے یہ علیحدہ بات ہے کہ میں نوکری حاصل نہیں کر سکا ہوں مگر میرے باپ کو یہ چاہیے کہ وہ مجھے اچھا خرچ دے۔“

”یقیناً“ میں نے پرزور تاکید کی۔

”لیکن وہ مجھے صرف پانچ روپے ماہوار دیتا ہے..... حقیقت تو یہ ہے کہ اس نے میرے شباب کی تمام رنگینیوں پر اپنی ہوس پرستیوں کی سیاہی الٹ دی ہے میں آگرہ میں پڑھتا ہوں میری بیوی دہلی میں ہے۔ میرے اس یہودی باپ نے میرے اور اس کے درمیان ایک خلیج حائل کر دی ہے۔ میں اس سے بے حد محبت کرتا ہوں۔ وہ خوبصورت اور پڑھتی لکھتی ہے مگر وہ مجبور ہے..... ہو سکتا ہے کہ وہ بھی مجھے پاگل سمجھتی ہو۔ اب میں اس کا فیصلہ کر دینا چاہتا ہوں میں نے اپنی تین پتلونیں اور تین کوٹ نیچ دیے ہیں اب میں دہلی جا رہا ہوں دیکھا جائے گا جو ہو گا۔“

”آپ اپنی بیوی کے پاس جا رہے ہیں“ میں نے دریافت کیا۔

”جی ہاں..... میں گھر میں بغیر اجازت لیے داخل ہو جاؤں گا اور وہاں سے اپنی بیوی کو لیے بغیر ہرگز نہ ٹلوں گا۔“

”اگر میں پاگل ہوں تو ہوں..... مگر مجھے یقین ہے کہ سوشیا! (یہ کہتے ہوئے وہ ذرا سا جھینپ گیا) میرے ساتھ چلنے کو تیار ہوگی۔ میں نے اس کے لیے نمائش میں سے ایک اونی سوٹر خریدا ہے۔ وہ اس کو یقیناً پسند کرے گی۔ کیا آپ اسے دیکھنا پسند فرمائیں گے؟“

”اگر آپ کو ٹرنک وغیرہ کھولنے کی زحمت نہ اٹھانا پڑے“ میں نے جواب دیا۔
 ”نہیں صاحب یہ تو میں نے قمیص کے اندر خود پہن رکھا ہے“ یہ کہہ کر وہ اٹھا اور کوٹ اتار دیا پھر قمیص کو پتلون کی گرفت سے آزاد کر کے اس نے اسے بھی اتار دیا..... وہ واقعی ایک رنگ برنگی فیتوں والا زمانہ سوٹر پہنے ہوئے تھا۔

”کیا آپ کو پسند ہے؟ میں نے یہ اس لیے پہن لیا ہے کہ اگر سوشیا! نے اسے لینے سے انکار کر دیا تو میں اسے پہنے ہی رہوں گا۔“

اس زمانہ سوٹر میں وہ کس قدر عجیب معلوم ہوتا تھا۔

☆☆☆

میرٹھ کی قینچی

”چل چل رے نوجوان“ کی ناکامی کا صدمہ ہمارے دل و دماغ سے قریب قریب مندرجہ ہو چکا تھا۔ گیان مگر جی فلمستان کے لیے ایک پراپیگنڈہ کہانی لکھنے میں ایک عرصہ سے مصروف تھے۔

کہانی لکھنے اور اسے پاس کرنے سے بیشتر تلمی جیونت اور اس کے شوہر و ریندر ڈیہائی (جس سے وہ اب طلاق لے چکی ہے) میں کنٹریکٹ ہو چکا تھا۔ غالباً پچیس ہزار روپے میں۔ ایک سال اس معاہدے کی معیاد تھی۔ مسٹر شوہر مگر جی پروڈکشن کنٹرولر حسب عادت سوچ بچار میں دس مہینے گزار چکے تھے۔ کہانی کا ڈھانچہ تھا کہ تیار ہونے میں نہیں آتا تھا۔ بصد مشکل جوں توں کر کے ایک خاکہ معرض وجود میں آیا جسے گیان مگر جی اپنے چرمی تھیلے میں ڈال کر دہلی روانہ ہو گئے۔ تاکہ زبانی طور پر اس میں کچھ اور باتیں ڈال کر حکومت سے پاس کرا لیں۔

خاکہ پاس ہو گیا جب شوٹنگ کا مرحلہ آیا تو و ریندر ڈیہائی نے یہ مطالبہ کیا کہ اس کے ساتھ ایک برس کا اور کنٹریکٹ کیا جائے اس لیے کہ پہلے معاہدے کی معیاد ختم ہو رہی تھی۔ رائے بہادر چونی لال منجنگ ڈائریکٹر بڑے اکھڑ قسم کے آدمی تھے۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ مقدمے بازی ہوئی۔ فیصلہ و ریندر ڈیہائی اس کی خور و بیوی تلمی کے حق میں ہوا۔ اس طرح پراپیگنڈہ فلم جس کی کہانی کا ابھی صرف غیر مکمل خاکہ ہی بنا تھا۔ پچیس ہزار روپے کے بوجھ تلے آ گئی۔

رائے بہادر کو بہت غلت تھی کہ فلم جلد تیار ہو۔ کیونکہ بہت وقت ضائع ہو چکا تھا

جلدی جلدی وہی صاحب کو بلا کر ان کی بیوی ممتاز شافقی سے کنٹریکٹ کیا گیا اور اس کو چودہ ہزار روپے بطور پیشگی ادا کر دیے گئے۔ بلینک یعنی رسید کے بغیر۔ دو دن شوٹنگ ہوئی۔ ممتاز شافقی اور اشوک مار کے درمیان مختصر سام کا لمحہ تھا جو بڑی مین شیخ کے بعد فلمایا گیا۔ مگر جب پردے کے ٹکرے پر اس کو دیکھا تو سب نے ممتاز شافقی کو ناپسند کیا۔ اس ناپسندیدگی میں اس بات کا بھی بڑا دخل تھا کہ ممتاز شافقی برقع پہن کر آتی تھی اور ولی صاحب نے صاف الفاظ میں مگر جی سے کہہ دیا تھا کہ اس کے جسم کو کوئی ہاتھ نہ لگائے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ممتاز شافقی کو فلم سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اس بہانے سے کہ جو کردار اسے ادا کرنا ہے اس کے لیے وہ مناسب و موزوں نہیں ہے۔ کیونکہ ایسے کئی مقام آئیں گے جہاں ہیروئن کو اپنے جسم کے بعض حصوں کی نمائش کرنا پڑے گی۔۔۔۔۔۔ قصہ مختصر یہ کہ چودہ ہزار بھی گئے۔

اب کہانی کا نامکمل ڈھانچہ انتالیس ہزار روپے کے نیچے دبا پڑا تھا۔ رائے بہادر چونی لال لال پیلے ہو رہے تھے۔ ”چل چل رے نوجوان“ کی ناکامی نے کمپنی کی حالت بہت تپکی کر دی تھی۔ مارواڑیوں سے قرض لے لے کر گزرا رہ بڑی مشکل سے ہو رہا تھا۔ رائے بہادر کی خفگی اور پریشانی بجا تھی۔

ایک دن میں ”داجا“ پائی اور اشوک اسٹوڈیو کے باہر کرسیوں پر بیٹھے کمپنی کی ان ہی جماعتوں کا ذکر کر رہے تھے جن کے باعث اتنا وقت اور اتنا روپیہ ضائع ہوا کہ اشوک نے یہ انکشاف کیا کہ جو چودہ ہزار روپے رائے بہادر نے ممتاز شافقی کو دیے تھے وہ انہوں نے اس سے قرض لیے تھے۔ اشوک نے یہ انکشاف اپنی کالی

پنڈی کھجاتے ہوئے کچھ اس انداز سے کیا کہ ہم سب بے اختیار ہنس پڑے لیکن فوراً چپ ہو گئے۔

سامنے بھری ہنسی ہوئی روش پر ایک اجنبی عورت ہماری بھاری بھر کم ہنیر ڈریسر کے ساتھ میک اپ روم کی طرف جا رہی تھی۔

دتا رام پانی نے اپنے کالے موٹے اور بد شکل ہونٹ کھولے اور خوفناک طور پر آگے بڑھے ہوئے اونڈھے سیدھے میلے دانتوں کی نمائش کی اور واچا کو کہنی کا ٹھوکا دے کر اشوک سے مخاطب ہوا ”یہ..... یہ کون ہے؟“
واچا نے پانی کے سر پر ایک دھول جمانی ”سارے تو کون ہوتا ہے پوچھنے والا؟“

پانی بدلہ لینے کے لیے اٹھا تو واچا نے اس کی کلائی پکڑ لی ”بیٹھ جا سارے مت جا اوھر تیری شکل دیکھتے ہی بھاگ جائے گی۔“

پانی اپنے اونڈھے سیدھے دانت پیتا رہ گیا۔ اشوک جو ابھی تک خاموش بیٹھا تھا بولا ”گڈ لکنگ ہے۔“

میں نے ایک لمحہ کے لیے غور سے اس عورت کو دیکھا اور کہا ”ہاں نظروں پر گراں نہیں گزرتی۔“

اشوک میرا مطلب نہ سمجھا ”کہاں سے نہیں گزرتی؟“

میں ہنسا ”میرا مطلب تھا کہ جو عورت یہاں سے گزر کر گئی ہے اسے دیکھ کر آنکھوں پر بو جھ نہیں پڑتا۔ بڑی صاف ستھری..... لیکن قد کی ذرا چھوٹی ہے۔“

پانی نے پھر اپنے بد نما دانتوں کی نمائش کی ”ارے! چلے گی..... کیوں واچا؟“

واچا پانی کے بجائے اشوک سے مخاطب ہوا ”واوا منی تم جانتے ہو یہ کون ہے؟“

اشوک نے جواب دیا ”زیادہ نہیں جانتا مگر جی سے صرف اتنا معلوم ہوا تھا کہ ایک عوامی ٹیسٹ کے لیے آج آنے والی ہے۔“

کیمرہ اور ساؤنڈ ٹیسٹ کیا گیا۔ جسے ہم نے پردے پر دیکھا اور سنا اور اپنی اپنی رائے دی۔ مجھے اشوک اور واچا کو وہ بالکل پسند نہ آئی۔ اس لیے کہ اس کی جسمانی حرکات چوٹی تھیں۔ اس کے اعضا کی ہر جنبش میں تشعشع تھا۔ مکالمہ ادا کرتے وقت اس کے ابرو پیشہ و رقاصوں کی طرح تاپتے تھے۔ مسکراہٹ بھی غیر دلکش تھی۔ لیکن پانی اس پر پلٹو ہو گیا۔ چنانچہ اس نے کئی مرتبہ اپنے بد نما دانتوں کی نمائش کی اور مگر جی سے کہا ”ونڈ رفل اسکرین فیس“ ہے۔

داتا رام پانی فلم ایڈیٹر تھا۔ اپنے کام کا ماہر۔ فلمستان چونکہ ایسا ادارہ ہے جہاں ہر شعبے کے آدمی کو اظہار رائے کی آزادی تھی۔ اس لیے داتا رام پانی وقت بے وقت اپنی رائے سے ہم لوگوں کو مستفید کرتا رہتا تھا اور خاص طور پر میرے تمسخر سے دوچار ہوتا تھا۔

ہم لوگوں نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا لیکن ایس مگر جی نے اس عورت کو جس کا نام پارہ تھا پر ایگنڈہ فلم کے ایک رول کے لیے منتخب کر لیا چنانچہ رائے بہادر چونی لال نے فوراً اس سے ایک فلم کنٹریکٹ معمولی سی مابانہ تنخواہ پر کر لیا۔

اب پارہ ہر روز اسٹوڈیو آنے لگی۔ بہت ہنس کھد اور گھلو مٹھو ہو جانے والی طوائف تھی۔ میرٹھ اس کا وطن تھا جہاں وہ شہر کے قریب قریب ہر تلکین مزاج رئیس

کی منظور نظر تھی۔ اس کو یہ لوگ میرٹھ کی قینچی کہتے تھے۔ اس لیے کہ وہ کاٹتی تھی اور بڑا مہین کاٹتی تھی۔

ہزاروں میں کھیلتی تھی۔ پر اسے فلموں میں آنے کا شوق تھا جو اسے فلمستان لے آیا۔

جب اس سے کل کر باتیں کرنے کا موقع ملا تو معلوم ہوا کہ حضرت جوش ملیح آبادی اور مسٹر ساغر نظامی بھی اکثر اس کے ہاتھ آیا جایا کرتے تھے اور اس کا مجرا سنتے تھے۔

اس کی زبان بہت صاف تھی۔ اور جلد بھی جس سے میں بہت زیادہ متاثر ہوا۔ چھوٹی آستینوں والے پھینے پھینے پلاؤز میں اس کی نگلی بانیں ہاتھی دانتوں کی طرح دکھائی دیتی تھیں..... سفید سڈول اور متناسب اور خوبصورت۔ جلد میں ایسی چکنی چمک تھی جو بالکل مزی پرندہ پھیرنے سے پیدا ہوتی ہے۔

صبح سو ڈیو آئی۔ نہانی دھوئی۔ صاف ستھری اجلی سفید یا ہلکے رنگ کی ساری میں ملبوس۔ کسی صابن کا اشتہار معلوم ہوئی۔ شام کو گھر روانہ ہوتی تو دن گزرنے کے باوجود گرد و غبار کا ایک ذرہ تک اس پر نظر نہ آتا۔ ویسی ہی تروتازہ ہوتی۔ جیسی صبح کو ہوتی۔

دنا رام پائی اس پر اور زیادہ لٹو ہو گیا۔ شوٹنگ شروع نہیں ہوئی تھی اس لیے اسے فراغت ہی فراغت تھی۔ چنانچہ اکثر پارو کے ساتھ باتیں کرنے میں مشغول رہتا..... معلوم نہیں وہ اس بھونڈے اور کرخت لہجے اور اس کے اوندھے سیدھے دانتوں اور اس کے ان کئے میل بھرے ناخنوں کو کیسے برداشت کرتی تھی.....

صرف ایک ہی بات سمجھ آتی ہے کہ طوائف اگر برداشت کرنا چاہے تو بہت کچھ برداشت کر سکتی ہے۔

پراپیٹنڈ فلم کی کہانی کا ڈھانچہ میرے حوالے کیا گیا کہ بڑے غور سے اس کا مطالعہ کروں اور جو ترمیم و متنسج میری سمجھ میں آئے بیان کر دوں۔ میں نے اس ڈھانچے کے تمام جوڑ دیکھے اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ایسا بے جوڑ ڈھانچہ شاید ہی کسی سے تیار ہو سکے۔ کوئی سر تھا نہ پیر۔ چونکہ میری قابلیت کا امتحان تھا اس لیے میں نے ایک اور ڈھانچہ تیار کیا بڑے خلوص اور بڑی محنت سے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ڈائریکشن کے فرائض میرے کہنے پر سادک و اچا کو سونے جانے والے تھے جو میرا عزیز دوست تھا۔

نیا ڈھانچہ جب فلمستان کی ”فل پنچ“ کے سامنے پیش ہوا تو میری وہ حالت تھی جو کسی مجرم کی ہو سکتی ہے۔

ایس مکر جی نے اپنا فیصلہ ان چند الفاظ میں دیا ”ٹھیک ہے مگر اس میں ابھی کافی اصلاح کی گنجائش ہے۔“

گیان مکر جی سے پوچھا گیا تو انہوں نے اپنی عادت کے مطابق منہ سکڑ کے صرف اتنا کہا ”آل موسٹ ٹھیک“ ہے یہ وہ حضرات تھے جو ایک مکر جی کی ڈائریکٹ کی ہوئی تمام فلموں کے ڈائریکٹر کہلاتے تھے حالانکہ انہوں نے اپنی زندگی میں ایک فن فلم بھی ڈائریکٹ نہیں کی تھی۔

اصل میں فلمستان میں کام کرنے کا ڈھب ہی نرا تھا۔ ساری فلم آپ نے ڈائریکٹ کی ہے لیکن پردے پر میرا نام دیا جا رہا ہے۔ کہانی میری ہے لیکن اس کا

مصنف آپ کو بتا دیا گیا ہے۔ بات یہ تھی کہ وہاں سب مل جل کر کام کرتے تھے۔ آپ اس سے اندازہ لگا لیجیے کہ دتا رام جسے معلوم ہی نہیں تھا کہ فلمی کہانی کیا ہوتی ہے مجھے مشورے دیا کرتا تھا۔

پراپیگنڈہ فلم کی کہانی لکھنے کی دشواریاں وہی سمجھ سکتا ہے جس نے کبھی ایسی کہانی لکھی ہو سب سے زیادہ مشکل میرے لیے یہ تھی کہ مجھے پارو کو اس کی شکل و صورت اس کے قد اور اس کی فنی کمزوریوں کے پیش نظر اس کہانی میں داخل کرنا تھا۔ بہر حال بڑی مغز پاشیوں کے بعد تمام مراحل طے ہو گئے۔ کہانی کی نوک پلک نکل آئی اور شوٹنگ شروع ہو گئی۔

ہم نے باہم مشورہ کر کے یہ طے کیا کہ جن مناظر میں پارو کا کام ہے وہ سب سے آخر میں فلمائے جائیں تاکہ پارو فلمی فضا سے اور زیادہ مانوس ہو جائے اور اس کے دل و دماغ سے کسرے کی جھجک نکل جائے۔

کسی منظر کی بھی شوٹنگ ہو وہ برابر ہمارے درمیان ہوتی۔ دتا رام پانی اب اس سے اتنا کھل گیا تھا کہ باہم مذاق بھی ہونے لگے تھے۔ پانی کی یہ چھیڑ چھاڑ مجھے بہت بھونڈی معلوم ہوتی تھی۔ میں پارو کی عدم موجودگی میں اس کا تسخراڑ اتنا کم بخت بڑی ڈھٹائی سے کہتا ”سالے تو کیوں جلتا ہے؟“

جیسا کہ میں اس سے پہلے بیان کر چکا ہوں پارو بہت ہنس کھڑا اور کھلوٹو مٹھو ہو جانے والی طوائف تھی۔ اسٹوڈیو کے ہر کارکن کے لیے وہ اونچ نیچ سے بے پروا بڑے تپاک سے ملتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جھوڑے عرصے میں مقبول ہو گئی۔ نچلے طبقے نے اسے احرام پارو دیوی کہنا شروع کر دیا۔ یہ اتنا عام ہوا کہ فلم کے عنوانات

میں پارو کی بجائے پارو دیوی لکھا گیا۔

دتا رام پائی نے ایک قدم اور آگے بڑھایا کچھ ایسی ٹپس لڑائی کہ ایک دن اس کے گھر پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر بیٹھا۔ پارو سے اپنی خاطرمدارت کرائی اور چلا آیا۔ اسکے بعد اس نے غفٹے میں ایک دو مرتبہ باقاعدگی سے وہاں جا دھمکنا شروع کر دیا۔

پارو اکیلی نہیں تھی اس کے ساتھ ایک اویڑ عمر کا مرد رہتا تھا۔ قد و قامت میں اس سے دو گنا۔ میں نے دو تین مرتبہ اسے پارو کے ساتھ دیکھا۔ وہ اس کا پتی دیو کم تھا اور تھا موزیادہ معلوم ہوتا تھا۔

پائی ایسے فخر و ابھار سے کینٹین میں پارو سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر نیم عاشقانہ انداز میں کرتا کہ ہنسی آ جاتی۔ میں اور ساوک واپا اس کا خوب مذاق اڑاتے مگر وہ کچھ ایسا ڈھیٹ تھا کہ اس پر کچھ اثر نہیں ہوا تھا۔ کبھی کبھی پارو بھی موجود ہوتی۔ میں اس کی موجودگی میں بھی پائی کے خام اور بھوندے عشق کا مذاق اڑاتا۔ پارو براندہ مانتی اور مسکراتی رہتی۔ اس مسکراہٹ سے اس نے میرے دل میں جانے کتنے دلوں کو اپنی قینچی سے کتر اہو گا۔

پارو میں عام طوائفوں ایسا بھڑکیلا اور چھپورا پن نہیں تھا۔ وہ مہذب محفلوں میں بیٹھ کر بڑی شائستگی سے گفتگو کر سکتی تھی۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ میرے دل میں اس کے یہاں آنے جانے والے ایسے غیرے نھو خیرے نہیں ہوتے تھے۔ ان کا تعلق سوسائٹی کے اس طبقہ سے تھا جو شائستگی کی طرف محض تفریح کی خاطر مائل ہوتا ہے۔

پارو اب سٹوڈیو کی فضا میں اچھی طرح گھل مل گئی تھی۔ فلمی دنیا میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی عورت یا لڑکی نئی ایکٹریس بنتی ہے تو اس کو کوئی نہ کوئی فوراً دبوچ لیتا ہے جیسے کہ وہ گیند ہے جسے بے کے ساتھ کسی نے ہٹ لگائی ہے اور فیلڈ میں کھڑے کھلاڑی اس تاک میں ہیں کہ وہ ان کے ہاتھوں میں چلی آئے۔

لیکن پارو کے ساتھ ایسا نہ ہوا۔ شاید اس لیے کہ فلمستان دوسرے نگار خانوں کے مقابلے میں بہت حد تک پاکباز تھا۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ پارو کو کوئی اتنی زیادہ جلدی نہیں تھی۔

محسن عبداللہ (پراسرار دنیا کا سابق خاوند) اپنی ایک آبگ خشک مجر زندگی سے اکتا کر پارسی لڑکی ویرا کو جس کی زندگی اسی کی زندگی کی مانند سپاٹ تھی شریک حیات بنانے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ اسی غرض کے لیے اسے ہمارے ساتھ سیکنڈ کلاس میں سفر کرنا چھوڑ دیا تھا کیونکہ ویرا فرسٹ کلاس میں سفر کرتی تھی۔ اس کے بعد اس کو ایچی کیٹ کے مطابق آتے جاتے اس کی کتیا کی زنجیر تھا منہ پڑتی.... عاشقوں کے امام میاں مجنوں کو بھی تو لیلیٰ کی کتیا عزیر تھی۔

واچا کا اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے بڑی مشکلوں کے بعد تازہ تازہ اپنی بدکار فرانسسی بیوی سے نجات حاصل کی تھی۔ ایس مکر جی پری چہرہ نسیم بانو کے عشق کے چکر میں تھا۔ گیان مکر جی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ ایک عورت سے شادی کر کے ہی بھر پایا تھا.... اپنے متعلق صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ مجھے پارو کی جلد بہت پسند تھی۔ ایک دن شاہد لطیف (جواب ڈائریکٹر اور پڑھ ڈیوٹر ہے) سے اس کا ذکر کیا تو اس نے مسکرا کر کہا۔

”جلد بہت پسند ہے ٹھیک ہے لیکن تمہیں کیا معلوم کہ اندر کتاب کیسی ہے
مضمون کیسا ہے؟“

پائی کی حالت اب بہت زیادہ مضحکہ خیز ہو گئی تھی۔ اس لیے کہ پارو نے ایک
روز اسے گھر مدعو کیا تھا اور اپنے ہاتھ سے اسے دو پیگ جانی وا کرو سکی کے پائے
تھے۔ جب اس کو زیادہ نشہ ہو گیا تھا تو پارو نے اس کو بڑے پیار سے صوفے پر لٹا
دیا تھا۔۔۔۔۔۔ اب اس کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ اس پر مرتی ہے اور ہم لوگ چونکہ نامکام
رہے ہیں اس لیے حسد کی آگ میں جلتے ہیں۔ اس بارے میں پارو کا رد عمل کیا تھا
مجھے معلوم نہیں۔

شوٹنگ جاری تھی میرا اس فلم کی ہیروئن تھی۔ سائیڈ ہیروئن کارول پارو کو ادا کرنا
تھا۔ اسے ہر ما کے کسی آزاد قبیلے کی ایک شوخ و شنگ تیز طرار لڑکی کا روپ دھارنا
تھا۔ جوں جوں اس کے مناظر فلمائے جانے کا وقت آتا گیا میرے اندیشے بڑھتے
گئے مجھے ڈر تھا کہ وہ امتحان میں پوری نہ اترے گی ہم سب کی کوفت کا موجب ہو
گی۔

آخر وہ دن آ گیا جب اس کا پہلا شوٹنگ ڈے تھا۔ میک اب اور کسٹایوم سے
مزین ہو کر اسے کیمرے کے سامنے لایا گیا۔ عجیب و غریب تراش کی بھڑکیلے
رنگوں والی پھنسی پھنسی چوٹی ناف سے اوپر پیٹ کی ہلکی سی جھلک گھٹنوں سے
بالشت بھر اوپر لہنگا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کیمرے مائیک اور خیرہ کن روشنیوں سے قطعاً مرعوب
یا خائف نہیں۔ مکالمہ اس کو اچھی طرح یاد کروا دیا گیا تھا۔ امید تھی کہ بول جائے گی

مگر جب ٹیک کا وقت آیا تو اس سارا وجود لکڑی ہو گیا۔ منہ کھول تو مکالمہ سپاٹ۔
 کئی ریہر ملیں کرائی گئیں مگر اس لکڑی میں جان کے آثار پیدا نہ ہوئے۔ پیشہ
 ور رقاصوں کی طرح اپنے امید و نچاتی جیسے بھاؤ بتا رہی ہے۔ تین چار ری ٹیک
 ہوئے تو میں بالکل مایوس ہو گیا۔ واپا طبعاً بہت جلد گھبرا جانے والا ہے۔ اس نے
 دیکھا کہ اونٹنی کی کوئی کل سیدھی نہیں تو ایس مکر جی سے کہا کہ وہ اسے ٹھیک کرے۔
 مکر جی اسے کیا ٹھیک کرتے۔ وہ بنی ہی کچھ ایسے آب و گل کی تھی جس میں بھاؤ
 بھاؤ اور نرت کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ چنانچہ ایک ٹیک میں اس نے کسی
 قدر گوارا ایکٹنگ کیا تو مکر جی نے غنیمت سمجھ کر صاف کر دیا۔

ہم سب نے بڑکوشش کی کہ اس کا قلع اور چوٹی پن کسی نہ کسی طریقے سے دور
 ہو جائے مگر ناکام رہے۔ شوٹنگ جاری رہی اور وہ بالکل نہ سدھری۔ اس
 کو کیمرے اور مائیک کا کوئی خوف نہیں تھا۔ مگر سیٹ پر وہ حسب منشاء اداکاری کے
 جو ہر دکھانے سے قاصر تھی۔۔۔۔۔ اس کی منہ میرٹھ کے مجروں کے سوا اور کیا ہو سکتی
 تھی۔ ہر حال اتنی امید ضرور تھی کہ وہ کسی نہ کسی روز سمجھ جائے گی۔

چونکہ مجھے اس کی طرف سے بہت مایوسی ہوئی تھی اس لیے میں نے اس کے
 رول میں کٹر بیونت شروع کر دی تھی۔ میری اس چالاک کی کا علم اس کو پانی کے
 ذریعے سے ہو گیا۔ چنانچہ اس نے خالی اوقات میں میرے پاس آنا شروع کر
 دیا۔ گھنٹوں ٹیلچی ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہتی۔ بڑے شانستہ انداز میں مناسب و
 موزوں الفاظ میں جن میں چالپوسی کا رنگ بظاہر ظاہر نہ ہوتا میری تعریف کرتی۔
 ایک دو مرتبہ اس نے مجھے گھر پر مدعو کیا۔ میں شاید چلا جاتا لیکن ان دنوں بہت

مصروف تھا۔ ہر وقت اعصاب پر پراپیگنڈہ فلم کا منظر نامہ سوار رہتا تھا۔ یوں تو میرا ہاتھ بنانے کے لیے تین آدمی موجود تھے۔ راجہ مہدی علی خاں، محسن عبداللہ اور ڈکٹ۔

راجہ مہدی علی خاں نے تعاون سے انکار کر دیا تھا۔ اس لیے کہ وہ ہر وقت اپنی روٹھی ہوئی بیوی کو خط لکھنے میں مصروف رہتا تھا۔ محسن عبداللہ میرا سے اپنے تعلقات مستحکم کرنے میں مصروف تھے اور مسٹر ڈکٹ پارو کو مکالمے یاد کراتے رہتے تھے۔

میں کچھ عرصے سے نوٹ کر رہا تھا کہ پارو اور اشوک سیٹ پر جب آئے سامنے آتے ہیں تو اشوک سے پارو کو اپنے جارہا نہ عشق کا اظہار کرتا ہوتا ہے تو اس کی آنکھیں اشوک کی آنکھوں میں گڑ جانا چاہتی ہیں۔ جیسے اس کو یہ بتانا مقصود ہے کہ دیکھو یہ جو کچھ ہو رہا ہے جھوٹ نہیں سچ ہے۔

اشوک طبعاً بہت جھینپو قسم کا آدمی ہے۔ وہ کسی عورت سے کھلم کھلا اظہار عشق نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔۔ یہ مجھے معلوم تھا کہ اشوک کو پارو پسند ہے لیکن اس میں اتنی جرات نہیں تھی کہ اس سے جسمانی تعلق پیدا کر لیتا۔

اس کی زندگی میں سینکڑوں نہیں ہزاروں لڑکیاں آئیں۔ وہ لارڈ باہرن بن سکتا تھا۔ مگر شرمیلی طبیعت کے باعث ان آسانی سے بھینس جانے والی تیلیوں کو نا امید کرتا رہا۔

اشوک سمار کا یہ وہ زمانہ تھا جب وہ کسی بھی ایکٹرس پر ہاتھ ڈال سکتا تھا۔ بڑی آسانی سے کئی ایکٹرس اپنا دل اس کے قدموں میں پانداز کی طرح بچھانے کے

لیے تیار تھیں۔ میں نے سوچا، اگر پارو کے دل میں بھی کھد بد ہو رہی ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں..... پھر پارو نووا رو تھی۔ خود اشوک کے ساتھ منسلک کر کے وہ بام شہرت پر بڑی جلدی پہنچ سکتی تھی۔

فلم میں پارو کا رول ایک آزاد قبیلے کی نیم جنگلی خود سر اور جارحانہ قسم کا عشق کرنے والی لڑکی کا تھا۔ وہ اشوک سے محبت کرتی تھی مگر وہ میرا کے عشق میں گرفتار تھا۔ یہ فلمی سٹیٹ پارو کے اندرونی جذبات کو مشتعل کرنے کے لیے کافی سامان مجھ پہنچا رہی تھی۔

شوٹنگ جاری تھی..... ان ڈور آؤٹ ڈور۔ ایک دن کشتیوں کا مین فلمایا جانے والا تھا۔ اس کے لیے بہت دور ایک کھاڑی منتخب کی گئی۔ دو کشتیاں تھیں۔ ایک میں اشوک مارکو سوار ہونا تھا دوسری میں پارو کو۔ اسے یہ ہدایت تھی کہ جب اس کی کشتی اشوک کی کشتی کے پاس پہنچے تو وہ اس میں کود جائے۔

پانی بہت گہرا تھا۔ حسب ہدایت اشوک مارکی کشتی میں کودی مگر ایسا کرتے وقت دونوں کشتیوں کا فاصلہ کچھ زیادہ ہو گیا اور وہ پانی میں گر پڑی۔ واچا لد کے لیے چلایا۔ فوراً ساحل پر سیدو تین چھیرے پانی کے اندر گھسے اور پارو کو گھسیٹے ہوئے پانی سے باہر لے آئے۔

عورت زاد! مگر حیرت ہے کہ اس حادثے نے اسے بالکل خوفزدہ نہ کیا۔ کپڑے خشک ہوئے تو وہ دوسرے ٹیک کے لیے تیار تھی۔

جب وہ اپنے بھیکے ہوئے کپڑے نچوڑ رہی تھی تو میں نے اور اشوک نے اس کی ایک ٹانگ کی جھلک دیکھی تھی جو کافی دلچسپ اور شرمیلی تھی۔

جب ہم لوکیشن سے فارغ ہو کر گھر کی طرف روانہ ہوئے تو راستے میں اشوک نے مجھ سے کہا ”منلو..... پارو کی ٹانگ بڑی اچھی تھی..... جی چاہتا تھا رو سٹ بنا کے کھا جاؤں“۔

عجیب بات۔ ہیکہ اشوک ایسا ڈرپوک اور جھینپو اندرونی طور پر سادیت پسند تھا۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ وہ چونکہ اپنے خیالات و بادینے کا عادی تھا اس لیے رو عمل کی صورت میں یہ سادگی پیدا ہو گئی تھی۔

ٹوسنڈ ایم جی کار میں اشوک اور میں دونوں اسٹوڈیو سے گھر واپس جایا کرتے تھے اور راستے میں ادھر ادھر کی مختلف باتیں کیا کرتے تھے۔ موٹر اس مڑک پر سے بھی گزرتی تھی جس سے ملحدت گلی میں پارو کا فلیٹ تھا۔ ایک شام جب ہم وہاں سے گزرے تو جھوڑی دور آگے نکل کر اشوک نے موٹر روک لی۔ میں نے اس سے پوچھا ”کیا بات ہے؟“

مڑ کر اشوک نے اس گلی کی طرف دیکھا اور کہا ”آج ہولی کی خوشی میں پارو نے دعوت دی ہے جاؤں یا نہ جاؤں؟“
 ”مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے جاؤ“۔
 ”تو چلو تم بھی چلو“۔

میں نے کہا ”میں کیوں چلوں مجھے اس نے مدعو نہیں کیا۔“
 ”کوئی بات نہیں“ یہ کہہ کر اس نے تیزی سے موٹر گھمائی اور پارو کے فلیٹ کے پاس بریک لگائی۔ ہارن بجایا تو بالکنی میں واپا اور پانی نمودار ہوئے۔
 پانی نے مجھے دیکھا تو اپنے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا ”ارے تم بھی آ

گئے۔“

واچا نے اشوک سے کہا ”آؤ دادا مٹی آؤ تمہارا ہی انتظار ہو رہا تھا۔“
 پارو خلاف معمول بناری ساڑھی میں ملبوس دلہن سی بنی بیٹھی تھی۔ ہم کمرے
 میں داخل ہوئے تو اس نے اچھک کر استقبال کیا۔ مجھے دیکھ کر اس نے بڑے مناسب
 و موزوں الفاظ میں معذرت کی کہ مجھے مدعو کرنا بھول گئی۔“

فورا شراب کا دور شروع ہو گیا۔ پہلا پیگ ختم ہوا تو پانی جھونے لگا۔ واچا نے
 فرمائش کی ایک آدھ گلا ہو جائے۔ پارو نے کھانے والی نگاہوں سے اشوک کی
 طرف دیکھا اور کہا ”کیوں اشوک صاحب آپ کچھ نہیں گے؟“
 اشوک جھینپ گیا اور اپنے مخصوص اکھڑ انداز میں صرف اتنا کہہ رکھا ”آپ
 گائیں گی تو میں سنوں گا۔“

گلا شروع ہوا بازاری قسم کی خمیری تھی۔ اس کے بعد ایک غزل شروع ہوئی۔
 پھر کوئی فلمی گیت۔ اس دوران میں پارو کا شوہر یا جو کوئی بھی وہ تھا گلاسوں میں
 شراب اور سوڈا اندیلنا رہا۔ دوسرے پیگ کے بعد پانی کی آنکھیں منہ نے لگیں۔
 اشوک زیادہ پینے کا عادی نہیں اس لیے وہ ڈیڑھ پیگ سے آگے نہ بڑھ سکا۔ واچا
 نے تیسرے کے بعد اپنے گلاس کا منہ بند کر دیا۔

خمیریاں غزلیں گیت بہت دیر تک ہوتی رہیں۔ آخر میں جب اس نے بھجن
 سنایا تو اس نے میری موجودگی کا احساس کرتے ہوئے ایک نعت شروع کی۔ لیکن
 میں نے فوراً اس کو روک دیا ”پارو دیوی! یہ محفل نشاط ہے۔ شراب کے دور چل
 رہے ہیں۔ یہاں کالی کملی والے کا ذکر نہ کیا جائے تو اچھا ہے۔“

اس نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور معافی کی طلب گار ہوئی۔

کھانا بہت اچھا تھا..... اشوک جلدی سے فارغ ہو گیا۔ اس کے ہاتھ دھلوانے کے لیے پارو اٹھی..... جب اشوک واپس آیا تو گھبرایا ہوا تھا۔ جلدی جلدی رخصت چاہی اور مجھے ساتھ لے کر وہاں سے چل دیا۔

راستے میں کوئی بات نہ ہوئی اس نے مجھے میرے گھر چھوڑا اور چلا گیا۔

کئی دن گزر گئے۔ شوٹنگ باقاعدگی سے ہو رہی تھی۔ ایک شام جب میں اور اشوک واپس جا رہے تھے تو شیواجی پارک کے پاس جہاں پارو کا فلیٹ تھا اشوک نے موٹر کی رفتار کم کی اور مجھ سے مخاطب ہوا ”منو! تمہیں ایک بات بتاؤں“ اس کے لہجے میں کسی قدر کپکپاہٹ تھی۔

میں نے ایک لمحہ کے لیے سوچا کہ یہ دلچسپ بات کیا ہو سکتی ہے ”بتاؤ“۔

اشوک ہنسنے لگا کہ تمہیں یاد ہے اس روز جب ہم پارو کے ہاں کھانا کھا رہے تھے تو وہ میرے ہاتھ دھلوانے کے لیے اٹھی تھی۔“

اشوک نے یہ کہا تو مجھے اس کی گھبراہٹ یاد آ گئی ”ہاں..... ہاں.....“

”جب غسل خانے میں مجھے اس نے تولیہ دیا تو آہستہ سے کہا کل آپ اکیلے آئے..... شام کو ساڑھے چھ بجے..... میں گھبرا گیا اور تولیہ پھینک کر باہر نکل آیا۔“

اس نے موٹر سڑک کے کنارے ٹھہرائی۔ میں نے اس سے پوچھا ”تم گئے“

”ہاں.....“ اشوک نے اسٹیرنگ و ہیل سے ہاتھ اٹھائے اور انہیں زور زور سے ملنے لگا ”لیکن بھاگ گیا۔“

میں تفصیل جاننا چاہتا تھا ”ہوا کیا..... پورا سبز یو بتاؤ“۔
 ”میں بڑا ڈرپوک ہوں..... جانے مجھے ایسے موقعوں پر کیا ہو جاتا ہے.....
 اس نے مجھے صوفے پر بٹھایا اور آپ قالین پر میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ دو پیگ
 مجھے پلائے۔ خود بھی تھوڑی سی پی اور پھر..... وہ لگی اپنی محبت جتانے..... میں سنتا
 رہا اور کاٹتا رہا۔ جب اس نے میرا ہاتھ دبایا تو میں نے اسے بڑے زور سے
 جھٹک دیا..... اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے لیکن فوراً کہیں غائب ہو گئے..... وہ
 مسکرائے لگی..... بھیا اشوک! میں تو آپ کا امتحان لے رہی تھی..... میں نے یہ سنا
 تو چکر اگیا۔ اٹھا تو اس نے پھر کہا۔ اشوک صاحب! میں تو آپ کو اپنا بھائی سمجھتی
 ہوں۔ میں نے کچھ نہ کہا اور نیچے اتر گیا..... کار میں بیٹھا..... گھر پہنچ کر میں نے
 آدھا پیگ پی کر سوچا تو مجھے گزرے ہوئے واقع پر بڑا افسوس ہوا۔ کیا حرج تھا اگر
 میں.....؟“

اشوک کے لہجے میں تاہف تھا۔

میں نے کہا ”ہاں کوئی حرج نہیں تھا“۔

اشوک کے لہجے میں تاہف اور زیادہ ہو گیا۔

یہ سن کر میرے سامنے وہ منظر آ گیا جو اس وقوع کے روز رات کے نوبتے
 اسٹوڈیو سے باہر سخت سردی میں فلمایا جا رہا تھا۔ جشن مسرت میں لوگ ناچ رہے
 تھے..... اشوک اپنی ہیروئن ویرا کی بانہوں میں بانہیں ڈالے ٹھوڑا تھا اور پارو
 ایک طرف مجسمہ افسردگی بنی اکیلی کھڑی تھی۔

☆☆☆

نامکمل تحریر

میں جب کبھی ذیل کا واقعہ یاد کرتا ہوں میرے ہونٹوں پر سوئیاں چبھنے لگتی ہیں۔
 ساری رات بارش ہوتی رہی تھی۔ جس کے باعث موسم خشک ہو گیا تھا۔ جب
 میں صبح سویرے غسل کے لیے ہوٹل سے باہر نکلا تو دھلی ہوئی پہاڑیوں اور نہائے
 ہوئے ہرے بھرے چیلوں کی تازگی دیکھ کر طبیعت پر وہی کیفیت پیدا ہوئی جو
 خوبصورت کنواریوں کے جھرمٹ میں بیٹھنے سے پیدا ہوتی ہے۔
 بارش بند تھی البتہ ننھی ننھی پھوار پڑ رہی تھی۔ پہاڑیوں کے اونچے اونچے
 درختوں پر آوارہ بدلیاں اوکھ رہی تھیں گویا رات بھر برسنے کے بعد تھک کر چور ہو گئی
 ہوں۔

میں چشمے کی طرف روانہ ہوا۔ کاندھے پر تولیہ تھا۔ ایک ہاتھ میں صابن دانی
 تھی۔ دوسرے میں نیکر۔ جب سڑک کا موڑ طے کرنے لگا تو آنکھوں کے سامنے
 دھندلی دھند نظر آئی۔ بادل کا ایک بھولا بھلا گلڑا جو شاید آسانی فضا سے اکتا کر
 ادھر آ نکلا تھا۔ اس بادل نے سڑک کیک دوسرے حصے کو آنکھوں سے بالکل اوجھل
 کر دیا تھا۔ میں نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ وہاں بھی سپیدی ہی سپیدی نظر
 آئی اور ایسا معلوم ہوا کہ اوپر سے کوئی دھنکی ہوئی روئی نکھیر رہا ہے۔

اتنے میں ہوا کے تیز جھونکوں نے اس سپیدی میں ارتعاش پیدا کیا اور اس دھند
 میں سے دو مثال بنارات علیحدہ ہونے لگے اور میری نگلی ہانہوں سے مس
 ہوئے۔ برف سے اٹھتے ہوئے دھوکم کی سردی کے احساس سے وہی کیفیت پیدا

ہوتی ہے جو ان بخارات نے پیدا کی۔

اس بادل میں سے گزرتے وقت کے سانس کے ذریعے یہ سپید سپید بخارات میرے اندر داخل ہو گئے جس سے پچھپھروں کو بڑی راحت محسوس ہوئی۔ میں نے جی بھر کے اس سے لطف اٹھایا۔ جب بادل کے اس ٹکڑے کو طے کر کے میں باہر آیا تو آنکھوں کو کچھ بھائی نہ دیا۔ میرے چہرے کے شیشے کاغذ کے مانند سفید ہو گئے تھے۔ پھر ایک ایسی مجھے سردی محسوس ہونے لگی۔ اور جب میں نے اپنے کپڑوں کی طرف دیکھا تو وہ شبنم آلود ہیکے کی طرح گیلے ہو رہے تھے۔

میں غسل کے معاملے میں بے حد سست ہوں اور سردیوں کے موسم میں تو روزانہ غسل کا میں بالکل قائل نہیں۔ دراصل نہانے دھونے کا فائدہ میری سمجھ سے بالاتر رہا ہے۔ غسل کا مطلب ہے کہ غلاظت دور کی جائے اور روز نہانے کا مطلب یہ ہوا کہ آدمی رات..... میں غلیظ اور گندہ ہو جاتا ہے۔ ہاتھ منہ دھویا جائے پیر صاف کر لیے جائیں سر کے بال دھو لیے جائیں اس لیے کہ یہ سب چیزیں جلدی میلی ہو سکتی ہیں مگر ہر روز بدن کیوں صاف کیا جائے جب کہ یہ بہت دیر کے بعد میلا ہوتا ہے۔ گرمیوں میں تو خیر نہانے کا مطلب میں سمجھ سکتا ہوں مگر سردیوں میں اس کا کوئی مصرف مجھے نظر نہیں آتا۔ آخر کیا مصیبت پڑی ہے کہ ہر روز صبح سویرے انسان غسل خانے میں جائے۔ سردی کے مارے پورے دو گھنٹوں تک دانت بچتے رہیں۔ انگلیاں سن ہو جائیں تاک برف کی ڈلی بن جائے..... غسل نہ ہوا اچھی خاصی مصیبت ہوئی۔

غسل کے بارے میں میرا اب بھی یہی خیال ہے۔ لیکن جس پہاڑی گاؤں کا

میں ذکر کر رہا ہوں وہاں کی فضا ہی کچھ اس قسم کی تھی کہ جو چیزیں مجھے اب مہمل نظر آتی ہیں یا اس سے پہلے نظر آیا کرتی تھیں وہاں بامعنی دکھائی دیتی تھیں..... اس غسل ہی کو لیجیے اس پیٹری گاؤں میں جتنا عرصہ میں رہا بروزمیرا پہا کا م یہ ہوتا تھا کہ نہاؤں اور میر تک نہاتا رہوں۔

چشمے پر پہنچ کر میں نے کپڑے اتارے۔ نیکر پہنی اور جب پانی کی اس گرتی ہوئی دھار کے پاس گیا جو پتھروں پر گر کر ننھے ننھے چھینٹے اڑا رہی تھی تو پانی کی ایک سر د بوند میری پیٹھ پر آ گری۔ میں تڑپ کر ایک طرف ہٹ گیا۔ جہاں بوند گری تھی اس جگہ گدگدی پر کار کی نوک کی طرح چھبی اور سارے جسم پر پھیل گئی۔ میں سستا، کانپا اور سوچنے لگا مجھے واقعی نہانا چاہیے یا نہیں۔ قریب تھا کہ میں باقی ہو جاؤں لیکن آس پاس نکاح دوڑائی تو ہر شے نہانی ہوئی نظر آئی چنانچہ جو باغیانہ خیال میرے دماغ میں اس شرم بوند نے پیدا کیے تھے ٹھنڈے ہو گئے۔

سر د پانی کی گدگدیاں شروع ہوئیں تو مجھے بہت ناگوار گزریں مگر جب میں جی کڑا کر کے دھار کے نیچے بیٹھ گیا تو وہ لطف آیا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ دونوں ہاتھوں کے ساتھ زور زور سے پانی کے چھینٹے اڑانے سے سردی کی شدت کم ہو جاتی تھی۔ چنانچہ جب میں نے یہ گر معلوم کر لیا تو پھر اس لطف میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

سر د پانی کی موٹی دھار نے عجیب کیفیت پیدا کر دی۔ پھر جب پانی کے دباؤ سے بال پیشانی پر نیچے لٹک آئے اور انہوں نے آنکھوں اور منہ میں گھسنا شروع کر دیا تو زور زور سے پھونکیں مار کر ان کو ہٹانے کی ناکام سعی نے مزہ اور بھی دو با لاکر

دیا۔ کبھی کبھی ڈوب کر ابھرتے ہوئے آدمی کا احساس مجھے بھی ہوا اور میں نے سوچا کہ جو لوگ ڈوب کر مر جاتے ہیں ان کو ایسی موت میں بے حد لطف آتا ہوگا۔ چشمے کا پانی آنسوؤں کی طرف شفاف تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میرے ارد گرد بلبلوں اور پانی کے چھینٹوں کا مشاعرہ ہو رہا ہے۔

خسل سے فارغ ہو کر میں نے تو لیے سے بدن پونچھا اور سردی کا احساس کم کرنے کے لیے دھیمے دھیمے سروں میں ایک گیت گنگنانا شروع کر دیا۔ کبھی کبھی یہ سریلی گنگناہٹ ہوا کے جھونکوں سے مرعش ہو جاتی اور میں یہ سمجھتا کہ میرے بجائے کوئی اور آدمی بہت دور گارہا ہے اس پر میں تو لیے کو زیادہ زور کے ساتھ بدن پر ملنے لگتا۔

بدن خشک ہو گیا تو میں نے کپڑے پہنے اس اثنا میں بوند باندی شروع ہو گئی..... میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ میرے عین اوپر بادل کا ایک آئینج نما ککڑا چھتری کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ میں نے جلدی جلدی پہاڑی پر سے نیچے اترنا شروع کیا اور فوراً ہی کودتا پھاندا سڑک میں اتر آیا۔ متوقع بارش سے بچنے کے لیے میں نے قدم تیز کر دیے لیکن ابھی سڑک پر بمشکل ایک جریب کا فاصلہ طے کرنے پایا تھا کہ ”اے بکری بکری“ کی آواز بلند ہوئی پھر اس کے ساتھ ہی دور پہاڑیوں نے اس آواز کو دبوچ کر دوبارہ ہوا میں اچھال دیا۔ میرے جی میں آئی کہ میں بھی اس آواز کو گیند کی طرح دبوچ لوں مگر ہمیشہ کے لیے اپنی جیب میں ڈال لوں۔

میں ٹھہر گیا۔ وہی مانوس صدا تھی جو اس سے قبل میں کئی مرتبہ سن چکا تھا۔ بظاہر

”اے بکری بکری“ تین معمولی لفظ ہیں اور کاغذ پر کوئی ایسا تصویر پیش نہیں کرتے جو انوکھا اور حسین ہو مگر واقعہ ہے کہ میرے لیے ان میں وہ سب کچھ تھا جو روح کو مسرور کر سکتا ہے۔ جونہی یہ آواز میری سماعت سے مس ہوئی مجھے یہ معلوم ہوتا کہ پہاڑ کی چھاتی میں سے صدیوں کی رکی ہوئی یہ آواز نکلی ہے اور سیدھی آسمان تک پہنچ گئی ہے۔

”اے“ بالکل جیسی آواز میں اور ”بکری بکری“ بلند اور فلک رس سروں میں۔ ایک لمحہ کے لیے یہ نعرہ شباب پہاڑیوں کی سنگین دیواروں میں گونجتا ڈوبتا ابھرتا تھر تھراتا اور ربات کے تاروں کی آخری لرزش کی طرح کانپتا فنا میں گھل مل جاتا۔ کالی کالی بدلیاں چھا رہی تھیں۔ فنا نم آلود تھی۔ ہوا کے جھونکوں میں اس نمی نے غنودگی کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ میں نے اوپر پہاڑی پر اگی ہوئی ہری ہری جھاڑیوں کی طرف دیکھا اور ان کے عقب میں مجھے دو تین سفید بکریاں نظر آئیں..... میں نے اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ ایک منہ زور بکری وزیر کو گھسیٹے لیے جا رہی تھی۔ اور وہ اس کو ڈانٹ بتانے کے لیے ”اے بکری بکری“ پکار رہی تھی۔ اس کا منہ غصہ اور زور لگانے کے باعث کھلے ہوئے تانبے کی رنگت اختیار کر گیا تھا۔ بکری کے گلے میں بندھی ہوئی رسی کو پوری طاقت سے کھینچنے میں اس کا سینہ غیر معمولی طور پر تن گیا تھا۔ سر پیچھے جھکا تھا۔ دونوں ہاتھ آگے بڑھے ہوئے تھے سر پر سے ڈوپٹہ اتر کر بانہوں میں چلا آیا تھا۔ پیشانی پر سیاہ بالوں کی لٹیس بل کھاتی ہوئی سنپولیاں معلوم ہو رہی تھیں۔

ایک سبز جھاڑی کے پاس پہنچ کر بکری دفعتاً ٹھہر گئی اور اس کے نرم نرم پتوں کو

اپنی تھوکتھی سے سونگھنا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر وزیر نے اطمینان کا سانس لیا اور اپنا
اتر اہوا ڈوپٹا ایک برے سے پتھر پر رکھ کر اس نے پاس والے درخت کے تنے
سے بکری کے گٹے میں بندھی ہوئی رسی باندھی اور دوسرے پیر کی جھکی ہوئی ٹہنی پکڑ
کر جھولا جھولنے لگی۔

میں جھاڑیوں کے پیچھے کھڑا تھا۔ بازو اوپر اٹھانے کے باعث اس کی کھلی
آستینیں نیچے ڈھلک آئیں۔ کپڑے کے یہ جھکے جب اترے تو اس کے بازو
کنڈھوں تک عریاں ہو گئے۔ بڑی خوبصورت بانٹیں تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ
ہاتھی کے دو بڑے دانت اوپر کواٹھے ہوئے ہیں بے داغ ہموار اور زندگی سے
بھرپور۔

وہ جھولا جھول رہی تھی اور اس کے دونوں بازو کچھ اس انداز سے اوپر کی جانب
اٹھے ہوئے تھے کہ مجھے یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ وہ آسمان کی طرف پرواز کر جائے
گی۔ جھاڑیوں کے عتب سے نکل کر میں اس کے سامنے آ گیا۔ دفعتاً اس نے
میری طرف نگاہیں اٹھائیں۔ سٹ پٹائی ٹہنی کو اپنے ہاتھوں کی گرفت سے آزاد کر
دیا۔ گری سنبھلی اور حلق میں سے ایک مدھم چیخ نکالتی دوڑ کر ڈوپٹا لینے کے لیے
پتھر کی طرف بڑھی..... مگر ڈوپٹا میری بغل میں تھا۔

اس نے ڈوپٹا کی تلاش میں یہ جانتے بوجھتے کہ وہ میری بغل میں ہے ادھر
ادھر دیکھا اور مسکرا دی۔ اس کی آنکھوں میں حیا کے گلابی ڈورے ابھر آئے۔ گال
اور سرخ ہو گئے اور سینے کی کوشش کرنے لگی۔ دونوں بازوؤں کی مدد سے اس نے
اپنے سینے کی شوخیوں کو چھپا لیا اور انہیں اور زیادہ چھپانے کی کوشش کرتی وہ پتھر پر

بیٹھ گئی۔ اس پر بھی جب اسے اطمینان نہ ہوا تو اس نے گھٹنے اوپر کر لیے اور بگڑ کر مجھ سے کہنے لگی۔

”یہ آپ کیا کر رہے ہیں میرا ڈوپٹا لائیے۔“

میں بڑھا اور بغل میں سے دوپٹہ نکال کر اس کے گھٹنے پر رکھ دیا۔ مجھے اس کے بیٹھنے کا انداز بہت ہی پسند آیا چنانچہ میں بھی اسی طرح اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کی طرف غور سے دیکھا تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وزیر جوان آوازوں کا ایک بہت بڑا انبار ہے اور میں۔۔۔ اور میں خدا معلوم کیا ہوں۔ اس کو ہاتھ لگاؤں تو وہ باجے کی طرح بچنا شروع ہو جائے گی۔ ایسے سر اس میں سے نکلیں گے جو مجھے اوپر بہت اوپر لے جائیں گے اور زمین اور آسمان کے درمیان کسی ایسی جگہ معلق کر دیں گے جہاں میں کوئی آواز نہ سن سکوں گا۔

وزیر نے مجھے جنگلی بلی کی طرح گھور کر دیکھا گویا کہنا چاہتی ہے اب جاؤ یہاں دھڑنا دیکر کیوں بیٹھ گئے ہو۔ میں نے اس کے خاموش کلم کی کوئی پروا نہ کی اور کہا۔ ”چشمے سے واپس آ رہا تھا کہ تمہاری آواز سنی۔ بے اختیار کھنچا چلا آیا۔ وزیر۔۔۔ تمہاری یہ آواز مجھے یقیناً پاگل بنا دے گی۔۔۔ جانتی ہو پاگل آدمی بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔“

میری بات سن کر اس کو حیرت ہوئی ”یہ کیا پاگل پن ہے۔۔۔ میری آواز کسی کو کیوں پاگل بنانے لگی۔“

میں نے کہا ”جیسے کچھ جانتی ہی نہیں ہو۔۔۔ دنیا میں یہ راگ راگیاں کہاں سے آتی ہیں۔۔۔ لیکن چھوڑو اس قصے کو یہ بتاؤ میری ایک بات مانو گی؟“

”مان لوں گی پر آپ یہ تو کہیے بات کیا ہے؟“
 ”ایک دفعہ میری خاطر بکری بکری کا نعرہ بلند کرو۔“
 مجھے ہاتھ سے دھکا دے کر اس نے تیز لہجے میں کہا ”یہ کیا پاگل پن ہے
 بنانے کے لیے ایک صرف میں ہی رہ گئی ہوں۔“
 ”وزیر بھدا میں تمہیں بنائیں رہا۔ مجھے تمہاری یہ آواز پسند ہے۔۔۔۔۔ جھوٹ
 کہوں تو۔۔۔۔۔ لے اب مان بھی جاؤ۔۔۔۔۔ بس ایک بار۔“
 ”جی نہیں۔“
 ”میں تم سے التجا کرتا ہوں۔“
 ”میں نے یہ آواز نہ کبھی نکالی ہے نہ اب نکالوں گی۔“
 ”میں ایک بار پھر درخواست کرتا ہوں۔“
 ”یا اللہ۔۔۔۔۔ یہ کیا مصیبت ہے۔“ وزیر نے اپنا بدن سکڑ لیا ”اور اگر میں نہ
 مانوں تو۔۔۔۔۔ یعنی یہ بھی کیا ضروری ہے کہ میں اسی وقت آپ کے کہنے پر بیکار چلا نا
 شروع کروں۔۔۔۔۔ آپ تو خواہ مخواہ چھیڑ خانی کر رہے ہیں اور میں گورڈی جانے کیا
 سمجھ رہی ہوں۔۔۔۔۔ بھئی ہوگا ہمیں یہ مذاق اچھا نہیں لگتا۔“
 ”وزیر! میں نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا ”میری طرف دیکھو۔۔۔۔۔ میرے
 چہرے سے تم اس بات کا اطمینان کر سکتی ہو کہ میں ہنسی مذاق نہیں کر رہا۔“
 اس نے میرے چہرے کی طرف مصنوعی غور سیدیکھا اور میری ناک پر انگلی رکھ
 کر کہا ”آپ کی ناک پر یہ ننھا سا تل کتنا بھلا دکھائی دیتا ہے۔“
 اس وقت میرے جی میں آئی کہ میں اس پتھر پر جس پر وہ بیٹھی ہوئی ہے میں

اپنی ناک گھسنا شروع کر دوں تاکہ وہ ننھا سا تل ہمیشہ کے لیے مٹ جائے۔ وزیر نے میری طرف دیکھا تو وہ یہ سمجھی کہ میں روٹنے کا ارادہ کر رہا ہوں چنانچہ اسے فوراً اپنی بکریوں کی طرف دیکھا اور مجھ سے کہا ”بابا آپ ننھانہ ہو جیے۔“

قریب تھا کہ وہ اپنی مخصوص آواز بلند کرے کہ ایک ایک کی جھجک اس پر غالب آ گئی۔ بہت زیادہ شرمناک اس نے اپنی گردن جھکانی ”پر میں پوچھتی ہوں اس میں خاص بات ہی کیا ہے۔“

میں نے بڑ کر کہا ”وزیر تم اب باتیں نہ بناؤ۔“

دوسری طرف منہ کر کے اس نے ایک ایک کی بلند آواز میں ”اے بکری بکری“ پکارا اس کے بعد شرمیلی ہنسی کا ایک فوارہ سا اس کے منہ سے چھوٹ پڑا۔ میں بلند یوں میں پرواز کر گیا۔ کتنی صاف اور شفاف آواز تھی۔ دھلی ہوئی فضا میں اس کی گونج دیر تک دو نظر سے اوجھل ہو جانے والے پرندوں کے پروں کی طرح چمکتی رہی پھر جذب ہو گئی۔

وزیر کی طرف میں نے دیکھا۔ اب وہ خاموش تھی۔ اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر صاف تھا۔ آنکھیں نہاتی ہوئی چڑیوں کی طرح بے قرار تھیں ہنسنے کے باعث ان میں آنسو بھر آئے تھے۔ ہونٹ اس انداز سے کھلے ہوئے تھے کہ میرے ہونٹوں میں سرسراہٹ پیدا ہو گئی۔ خدا معلوم کیا ہوا۔ میں نے وزیر کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ اس کا سر میری گود میں ڈھلک آیا۔ لیکن ایک ایک کی زور سے وہ اپنا بازو میرے ہچکے ہوئے سر اور اپنے متحیر چہرے کے درمیان لے آئی اور دھڑکتے ہوئے لہجہ میں کہنے لگی ”آہ۔۔۔۔۔ ہٹائیے۔۔۔۔۔ ہٹائیے ان ہونٹوں کو۔“

میری گود سے نکل کر وہ بھاگ گئی اور میرے ہونٹوں کی تحریر یہ نامکمل رہ گئی۔
اس واقعہ کو ایک زمانہ گزر چکا ہے مگر جب کبھی میں اس کو یاد کرتا ہوں میرے
ہونٹوں میں سوئیاں سی چبھنے لگتی ہیں..... یہ نامکمل بوسہ ہمیشہ میرے ہونٹوں میں
انکار ہے گا۔

☆☆☆

نعرہ

اسے یوں محسوس ہوا کہ اس سنگین عمارت کی ساتوں منزلیں اس کے کاندھوں پر دھردی گئی ہیں۔

وہ ساتویں منزل سے ایک ایک میڑھی کر کے نیچے اتر اور ان تمام منزلوں کا بوجھ اس کے چوڑے مگردیلے کاندھوں پر سوار ہو گیا۔ جب وہ مکان کے مالک سے ملنے کے لیے اوپر چڑھ رہا تھا تو اسے یوں محسوس ہوا تھا کہ اس کا کچھ بوجھ ہلکا ہو گیا ہے اور کچھ ہلکا ہو جائیگا۔ اس لیے کہ اس نے اپنے دل میں سوچا تھا۔ مالک مکان جسے سب سیٹھ کے نام سے پکارتے ہیں اس کی چٹا ضرور سنے گا اور کرایہ چکانے کے لیے اسے ایک مہینے کی اور مہلت بخش دے گا۔۔۔۔۔ بخش دیگا۔۔۔۔۔ یہ سوچتے ہوئے اس کے غرور کو ٹھیس لگی تھی لیکن فوراً ہی اس کو اصلیت معلوم ہو گئی تھی۔ وہ بھیک مانگنے تو جا رہا تھا اور بھیک ہاتھ پھینکا کر آنکھوں میں آنسو بھر کر اپنے دکھ درد سنا کر اور اپنے گھاؤ دکھا کر ہی مانگی جاتی ہے۔۔۔۔۔

اس نے یہی کچھ کیا۔ جب وہ اس سنگین عمارت کے بڑے دروازے میں داخل ہونے لگا تو اس نے اپنے غرور کو اس چیز کو جو بھیک مانگنے میں عام طور پر رکاوٹ پیدا کیا کرتی ہے۔ نکال کر فٹ پاتھ پر ڈال دیا تھا۔

وہ اپنا دیا بجھا کر اور اپنے آپ کو اندھیرے میں لپیٹ کر مالک مکان کے اس روشن کمرے میں داخل ہو گیا جہاں وہ اپنی وہ بلندگوں کا کرایہ وصول کرتا تھا اور ہاتھ جوڑ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ سیٹھ کے تلمک لگے ہاتھ پر کئی سلوٹیں پڑ گئیں۔

اس کا بالوں بھرا ہاتھ ایک موٹی سی کاپی کی طرف بڑھا۔ وہ بڑی بڑی آنکھوں نے اس کاپی پر کچھ حروف پڑھے اور ایک بھدی سی آواز گونجی۔
 ”کیٹو لال..... کھولی پانچویں دوسرا مال..... دو مینوں کا کرایہ..... لے آئے ہو کیا؟“

یہ سن کر اس نے اپنا دل جس کے سارے پرانے اور نئے گھاؤ وہ میڑھیاں چڑھتے ہوئے کرید کرید کر برے کر چکا تھا۔ سیٹھ کر دکھانا چاہا۔ اسے پورا یقین تھا کہ اسے دیکھ کر اس کے دل میں ضرور ہمدردی پیدا ہو جائے گی پر..... سیٹھ جی نے کچھ سننا نہ چاہا اور اس کے سینے میں ایک بلڑ سا مچ گیا۔

سیٹھ کے دل میں ہمدردی پیدا کرنے کے لیے اس نے اپنے وہ تمام دکھ جو بیت چکے تھے گئے گزرے دنوں کی گہری کھائی سے نکال کر اس نے اپنے دل میں بھر لیے تھے اور ان تمام زخموں کی جلن جو مدت ہوئی مٹ چکے تھے۔ اس نے بڑی مشکل سے اکٹھی کر کے اپنی چھاتی پر جمع کی تھی۔ اب اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اتنی چیزوں کو کیسے سنبھالے؟

اس کے گھر میں بن بلائے مہمان آگئے ہوتے تو وہ ان سے بڑے رو کھے پن سے کہہ سکتا تھا ”جاؤ بھئی جاؤ میرے پاس اتنی جگہ نہیں ہے کہ تمہیں بٹھاسکوں اور نہ میرے پاس اتنا روپیہ ہے کہ تم سب کی خاطر مدد کر سکوں“ لیکن یہاں تو قصہ ہی دوسرا تھا۔ اس نے تو اپنے بھولے بھٹکے دکھوں کو ادھر ادھر سے پکڑ کر اپنے سینے میں جمع کیا تھا۔ اب بھلا وہ باہر نکل سکتے تھے؟

افرا تفری میں اسے کچھ پتا نہ چلا تھا کہ اس کے سینے میں کتنی چیزیں بھر گئی

ہیں۔ پر جوں جوں اس نے سوچنا شروع کیا۔ وہ پہچاننے لگا کہ فلاں دکھ فلاں وقت کا ہے اور فلاں درد اسے فلاں وقت پر ہوا تھا اور جب یہ سوچ بچار شروع ہوئی تو حافظے نے بڑھ کر درد و حسد بنا دی جو ان پر لپٹی ہوئی تھی اور کل کے تمام درد آج کی تکلیفیں بن گئے اور اس نے اپنی زندگی کی باسی روٹیاں پھر انگاروں پر سینکنا شروع کر دیں۔

اس نے سوچا تھوڑے سے وقت میں اس نے بہت کچھ سوچا۔ اس کے گھر کا اوندھ حالیپ کئی بار اس کے پیوند لگے کپڑے ان کھونٹیوں پر لٹک کر پھر اس کے میلے بدن سے چٹ گئے جو دیوار میں گڑی چمک رہی تھیں۔ کئی بار اسے ان داتا بھگوان کا خیال آیا جو بہت دور جانے کہاں بیٹھا تھا اپنے بندوں کا خیال رکھتا ہے مگر اپنے سامنے سیٹھ کو کرسی پر بیٹھا دیکھ کر جس کے قلم کی ایک جنبش کچھ کا کچھ کر سکتی تھی وہ اس بارے میں کچھ بھی نہ سوچ سکا۔ کئی بار اسے خیال آیا اور وہ سوچنے لگا کہ اسے کیا خیال آیا تھا مگر وہ اس کے پیچھے بھاگ دوڑ نہ کر سکا۔ وہ سخت گھبرا گیا۔ اس نے آج تک اپنے سینے میں اتنی کھلبلی نہیں دیکھی تھی۔

وہ اس کھلبلی پر ابھی تعجب ہی کر رہا تھا کہ مالک مکان نے غصے میں آ کر اسے گائی دی۔ گائی..... یوں سمجھئے کہ کانوں کے راستے پگھلا ہوا سیہ۔ شائیں شائیں کرتا اس کے دل میں اتر گیا اور اس کے سینے کے اندر جو بلڑ مچ گیا۔ اس کا تو کچھ ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ جس طرح کسی گرم گرم جلے میں کسی شرارت سے بھگدڑ مچ جایا کرتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح اس کے دل میں ہلچل پیدا ہو گئی۔ اس نے بہت جتن کیے کہ اس کے وہ دکھ درد جو سیٹھ کو دکھانے کے لیے اکٹھے کیے تھے چپ چاپ

رہیں۔ پر کچھ نہ ہو سکا۔ گالی کا سیٹھ کے منہ سے نکلنا تھا کہ تمام بے چین ہو گئے اور اندھا دھند ایک دوسرے کے ساتھ لکرائے گئے۔ اب تو وہ یہ نئی تکلیف بالکل نہ سہہ سکا اور اس کی آنکھوں میں جو پہلے ہی سے تپ رہی تھیں۔ آنسو آ گئے جس سے ان کی گرمی اور بھی بڑھ گئی اور ان سے دھواں نکلنے لگا۔

اس کے جی میں آئی کہ اس گالی کو جسے وہ بڑی حد تک نگل چکا تھا۔ سیٹھ کے جھریاں پڑے ہوئے چہرے پر تپ کر دی مگر وہ اس خیال سے باز آ گیا کہ اس کا غرور تو باہر فٹ پاتھ پر پڑا ہے اپولو بندر پر نمک لگی مونگ پھلی بیچنے والے کا غرور..... اس کی آنکھیں ہنس رہی تھیں اور ان کے سامنے نمک لگی مونگ پھلی کے وہ تمام دانے جو اس کے گھر میں ایک تھیلے کے اندر رکھا کے باعث گیلے ہو رہے تھے مچنے لگے۔

اس کی آنکھیں نہیں اس کا دل بھی ہنسیا یہ سب کچھ ہوا پر وہ کڑواہٹ دور نہ ہوئی جو اس کے گلے میں سیٹھ کی گالی نے پیدا کر دی تھی۔ یہ کڑواہٹ اگر صرف زبان پر ہوتی تو وہ اسے جھوک دیتا مگر وہ تو بہت بری طرح اس کے گلے میں اٹک گئی تھی۔ اور نکالنے نہ نکلتی تھی اور پھر ایک عجیب قسم کا دکھ جو اس گالی نے پیدا کر دیا تھا۔ اس کی گھبراہٹ کو اور بھی بڑھا رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس کی آنکھیں جو سیٹھ کے سامنے رہا فضول سمجھتی تھیں۔ اس کے سینے کے اندر اتر کر آنسو بہا رہی ہیں۔ جہاں ہر چیز پہلے ہی سے سوگ میں تھی۔

سیٹھ نے اسے پھر گالی دی۔ اتنی ہی موٹی بتنی اس کی چربی بھری گردن تھی اور اسے یوں لگا کہ کسی نے اوپر سے اس پر کوڑا کرکٹ پھینک دیا ہے۔ چنانچہ اس کا

ایک ہاتھ اپنے آپ چہرے کی طرف حفاظت کے لیے بڑھا پر اس گالی کی ساری گرد اس پر پھیل چکی تھی..... اسے کچھ خبر نہ تھی..... وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ ایسی حالتوں میں کسی بات کی سمدھ بدھ نہیں رہا کرتی۔

وہ جب نیچے اترتا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس سنگین عمارت کی ساتوں منزلیں اس کے کاندھوں پر دھری رہ گئی ہیں۔

ایک نہیں دو گالیاں..... بار بار دو گالیاں جو سینٹھ نے بالکل پان کے پیک کے مانند اپنے منہ سے اگل دی تھیں اس کے کانوں کے پاس زیریلی بھڑوں کی طرح جھنجھٹا شروع کر دیتی تھیں اور وہ سخت بے چین ہو جاتا تھا وہ کیسے اس..... اس..... اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس گڑ بڑ کا نام کیا رکھے جو اس کے دل اور دماغ میں ان گالیوں نے مچا رکھی تھی۔ وہ کیسے اس خپ کو دور کر سکتا تھا جس میں وہ پھنکا جا رہا تھا۔ کیسے؟..... پر وہ سوچ بچار کے قابل بھی تو نہیں رہا تھا۔ اس کا دماغ تو اس وقت ایک ایسا اکھاڑ بنا ہوا تھا جس میں بہت سے پہلو ان کشتی لڑ رہے ہوں جو خیال بھی وہاں پیدا ہوتا کسی دوسرے خیال سے جو پہلے ہی وہاں موجود ہوتا بھڑ جاتا اور وہ کچھ سوچ نہ سکتا تھا۔

چلتے چلتے جب ایک ایسی جگہ کی صورت میں باہر نکلنے کو تھے۔ اس کے جی میں آئی جی میں کیا آئی مجبوری کی حالت میں وہ اس آدمی کو روک کر جو لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کے پاس سے گزر رہا تھا۔ یہ کہنے ہی والا تھا۔ ”بھیا میں روگی ہوں“ مگر جب اس نے اس راہ چلتے آدمی کی شکل دیکھی تو بجلی کا وہ کھمبا جو اس کے پاس ہی زمین میں گڑھا تھا۔ اسے اس آدمی سے کہیں زیادہ حساس دکھائی دیا اور جو

کچھ وہ اپنے اندر سے باہر نکالنے والا تھا ایک ایک گھونٹ کر کے پھر نکل گیا۔
 فٹ پاتھ پر چوکور پتھر ایک ترتیب کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ وہ ان
 پتھروں پر چل رہا تھا آج تک کبھی اس نے ان کی تختی محسوس نہ کی تھی مگر آج ان کی
 تختی اس کے دل تک پہنچ رہی تھی۔ فٹ پاتھ کا ہر ایک پتھر جس پر اس کے قدم پڑ
 رہے تھے۔ اس کے دل کے ساتھ نکل رہا تھا۔۔۔۔۔ سینھ کے پتھر کے مکان سے نکل کر
 ابھی وہ جموڑی ہی دوڑ گیا ہو گا کہ اس کا بند ڈھیلا ہو گیا۔
 چلتے چلتے ایک لڑکی سے ٹکرائی اور اسے یوں محسوس ہوا کہ وہ ٹوٹ گیا ہے۔
 چنانچہ اس نے جھٹ اس آدمی کی طرح جس کی جھوٹی سے پیر کر رہے ہوں۔ ادھر
 ادھر اپنے ہاتھ پھیلائے اور اپنے آپ کو اکٹھا کر کے ہولے ہولے چلنا شروع کر
 دیا۔

اس کا دماغ اس کی ناگوں کے مقابلے میں زیادہ تیزی کے ساتھ چل رہا تھا۔
 چنانچہ کبھی کبھی چلتے چلتے اسے یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس کا نچلا دھڑ سارے کا سارا
 بہت پیچھے رہ گیا ہے اور دماغ بہت آگے نکل گیا۔ کئی بات اسے اس خیال سے
 ٹھہرنا پڑا کہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہو جائیں۔
 وہ فٹ پاتھ پر چل رہا تھا۔ جس کے ایک طرف سڑک پر پون پون کرتی
 موٹروں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ گھوڑے گاڑیاں ٹرامیں بھاری بھر کم ٹرک لاریاں یہ
 سب سڑک کی کالی چھاتی پر دنداتی ہوئی چل رہی تھیں۔ ایک شور مچا ہوا تھا۔ پرا
 سکے کانوں کو کچھ سنائی نہ دیتا تھا وہ تو پہلے ہی سے شائیں شائیں کر رہے تھے جیسے
 ریل گاڑی کا انجن زائد بھاپ باہر نکال رہا ہے۔

چلتے چلتے ایک لنگڑے کتے سے اس کی ٹکر ہوئی۔ کتے نے اس خیال سے کہ شاید اس کا زخمی پیر کچل دیا گیا ہے۔ ”چاؤں“ کیا اور پرے ہٹ گیا اور وہ سمجھا کہ سیٹھ نے اسے پھر گالی دی ہے۔۔۔۔۔ گالی۔۔۔۔۔ گالی ٹھیک اسی طرح اس سے الجھ کر رہ گئی تھی جیسے جھاڑی کے کانٹوں سے کوئی کپڑا۔ وہ جتنی کوشش اپنے آپ کو چھڑانے کی کرتا تھا۔ اتنی ہی زیادہ اس کی روح زخمی ہوتی جا رہی تھی۔

اسے اس نمک لگی موگ چلی کا خیال نہیں تھا۔ جو اسکے گھر میں برکھا کے باعث گیلی ہو رہی تھی اور نہ اسے روئی کپڑے کا خیال تھا۔ اس کی عمر تیس برس کے قریب تھی اور ان تیس برسوں میں جن پر ماتا جانے کتنے دن ہوتے ہیں۔ وہ کبھی بھوکا نہ سویا تھا۔ وہ اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ بھرے۔ اس بکرے جیسی ڈاڑھی والے حکیم کی دوائیوں کے دام دے۔ شام کو تارڑی کی ایک بوتل کے لیے دو نو پیسے پیدا کرے یا اس گنہگار سیٹھ کے مکان کے ایک کمرے کا کرایہ ادا کرے۔ مکان اور کرایوں کا فلسفہ اس کی سمجھ سے سدا اونچا رہا تھا۔ وہ جب بھی دس روپے گن کر سیٹھ یا اس کے منیم کی ہتھیلی پر رکھتا تھا تو سمجھتا کہ زبردستی اس سے یہ رقم چھین لی گئی ہے اور اب اگر وہ پانچ برس تک برابر کرایہ دیتے رہنے کے بعد صرف دو مہینے کا حساب چکنا نہ کر سکا تو کیا سیٹھ کو اس بات کا اختیار ہو گیا کہ وہ اسے گالی دے؟ سب سے بڑی بات تو یہی تھی جو اسے کھائے جا رہی تھی۔ اسے ان بیس روپوں کی پروا نہ تھی جو اسے آج نہیں مل سکتے تھے وہ ان دو گالیوں کی بابت سوچ رہا تھا جو ان بیس روپے کے بیچ میں سے نکلی تھیں۔ نہ وہ بیس روپے کا مقروض ہوتا اور نہ سیٹھ کے کھٹائی جیسے منہ سے یہ کندی باہر نکلتی۔

ٹھیک ہے اسے کرایہ چاہیے پر میں کہاں سے لاؤں؟ پانچ برس تک اس کو دیتا ہی رہا ہوں۔ جب ہو گا دے دوں گا۔ پچھلے برس برسات کا سارا پانی ہم پر ٹپکتا رہا۔ پر میں نے اسے کبھی گالی نہ دی۔ حالانکہ مجھے اس سے کہیں زیادہ ہولناک گالیاں یاد ہیں۔ میں نے سیٹھ سے ہزار بار کہا کہ میٹرچی کا ڈنڈا ٹوٹ گیا ہے۔ اسے بنوا دیجیے۔ پر میری ایک نہ سنی گئی۔ میری پھول سی پچی گری۔ اس کا داہنا ہاتھ ہمیشہ کے لیے بے کار ہو گیا۔ میں گالیوں کے بجائے اسے بدو عادی سماتا تھا پر مجھے اس کا دھیان ہی نہیں آیا..... دو مہینے کا کرایہ نہ چلانے پر میں گالیوں کے قابل ہو گیا۔ اس کو یہ خیال تک نہ آیا کہ اس کے بچے اپولو بندر پر میرے قتلے سے مٹھیاں بھر بھر کر مونگ پھلی کھاتے ہیں۔

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس کے پاس اتنی دولت نہیں تھی جتنی کہ اس وہ
بلڈگوں والے سیٹھ کے پاس تھی اور ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کے پاس اس سے
بھی زیادہ دولت ہوگی پر وہ غریب کیسے ہو گیا؟..... اسے غریب سمجھ کر ہی تو گالی
دی گئی تھی۔ ورنہ اس گھنے سیٹھ کی کیا مجال تھی کہ کمری پر بڑے اطمینان سے پیٹھ کر
اسے دو گالیاں سنا دیتا۔ گویا کسی کے پاس دشمن دولت کا نہ ہونا بہت بڑی بات ہے
۔ اب یہ اس کا قصور نہیں تھا کہ اس کے پاس دولت کی کمی تھی۔ سچ یہ کہ جیسے تو اس نے

کبھی دھن دولت کے خواب دیکھے ہی نہ تھے۔ وہ اپنے حال میں مست تھا۔ اس کی زندگی بڑے مزے میں گزر رہی تھی۔ پر پچھلے مہینے ایک ایسی کی بیوی بیمار پڑ گئی اور اس کے دوا دارہ پر وہ تمام روپے خرچ ہو گئے جو کرائے میں جانے والے تھے۔ اگر وہ خود بیمار ہوتا تو ممکن تھا کہ وہ وہاں پر روپیہ خرچ نہ کرتا۔ لیکن یہاں اس کے ہونے والے بچے کی بات تھی جو ابھی اپنی ماں کے پیٹ ہی میں تھا۔ اس کو اولاد بہت پیاری تھی جو پیدا ہو چکی تھی۔ اور جو پیدا ہونے والی تھی۔ سب کی سب اسے عزیز تھی۔ وہ کیسے اپنی بیوی کا علاج نہ کراتا؟ کیا وہ اس بچے کا باپ نہ تھا؟ باپ تھا۔۔۔۔۔ وہ تو صرف وہ مہینے کے کرایے کی بات تھی۔ اگر اسے اپنے بچے کے لیے چوری کرنا پڑتی تو وہ کبھی نہ چوکتا۔۔۔۔۔

چوری نہیں نہیں وہ چوری کبھی نہ کرتا۔۔۔۔۔ یوں سمجھئے کہ وہ اپنے بچے کے لیے بڑی سے بڑی قربانی کرنے کے لیے تیار تھا۔ مگر وہ چور کبھی نہ بنتا۔۔۔۔۔ وہ اپنی چھٹی ہوئی چیز واپس لینے کے لیے لڑنے مرنے کو تیار تھا۔ پر وہ چوری نہیں کر سکتا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو اس وقت جب سیٹھ نے اسے گالی دی تھی۔ آگے بڑھ کر اس کا ٹینٹا دبا دیتا اور اس تجوری میں سے وہ تمام نیلے اور سبز رنگ کے نوٹ نکال کر بھاگ جاتا۔ جن کو وہ آج تک لاجوتی کے پتے سمجھا کرتا تھا۔۔۔۔۔ نہیں نہیں وہ ایسا کبھی نہیں کرتا۔ لیکن پھر سیٹھ نے اسے گالی کیوں دی؟۔۔۔۔۔ پچھلے برس چو پانی پر ایک گاہک نے اسے گالی دی تھی۔ اس لیے کہ دو پیسے کی مونگ پھلی پر چار دانے کڑوے چلے گئے تھے اور اس کے جواب میں اس کی گردن پر ایسی دھول جمانی تھی کہ دو رنچ پر بیٹھے ہوئے آدمیوں نے بھی اس کی آواز سن لی تھی۔ مگر سیٹھ نے اسے

دو گالیاں دیں اور وہ چپ رہا۔۔۔ کیشو لال کھاری سینک والا جس کی بابت مشہور تھا کہ ناک پر کبھی نہیں بیٹھنے دیتا۔۔۔ سیٹھ نے ایک گالی دی وہ کچھ نہ بولا اور دوسری گالی دی تو بھی وہ خاموش رہا جیسے مٹی کا پتلا ہے۔۔۔ پر مٹی کا پتلا کیسے ہوا؟ اس نے ان دو گالیوں کو سیٹھ کے تھوک بھرے منہ سے نکلنے دیکھا جیسے دو برے بڑے چوہے موریوں سے باہر نکلتے ہیں۔ وہ جان بوجھ کر خاموش رہا اس لیے کہ وہ اپنا غرو ریٹے چھوڑ آیا تھا۔۔۔ مگر اس نے اپنا غرو اپنے سے کیوں الگ کیا؟ سیٹھ سے گالیاں لینے کے لیے؟

یہ سوچتے ہوئے اسے ایک ایسی خیال آیا کہ شاید سیٹھ نے اسے نہیں کسی اور کو گالیاں دی تھیں۔۔۔ نہیں نہیں گالیاں اسے ہی دی گئی تھیں۔ کسی اور کو دی گئی ہوتیں تو اس سوچ بچار کی ضرورت ہی کیا تھی اور یہ جو اس کے سینے میں بلر سا بچ رہا تھا کیا بغیر کسی وجہ کے اسے دکھ دے رہا تھا؟ اس کو دو گالیاں دی گئی تھیں۔

جب اس کے سامنے ایک موٹر نے اپنے ماتھے کی بتیاں روشن کیں تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ دو گالیاں پگھل کر اس کی آنکھوں میں دھنس گئی ہیں۔۔۔ گالیاں۔۔۔ گالیاں۔۔۔ وہ جھنجھلا گیا۔۔۔ وہ جتنی کوشش کرتا تھا کہ ان گالیوں کی بابت نہ سوچے اتنی ہی شدت سے اسے ان کے متعلق سوچنا پڑتا تھا اور یہ مجبوری اسے بہت چڑچڑاہا رہی تھی۔ چنانچہ اس چڑچڑے پن میں اس نے خواہ مخواہ دو تین آدمیوں کو جو اس کے پاس سے گزر رہے تھے دل ہی دل میں گالیاں دیں۔

”یوں اکڑ کے چل رہے تھے۔ جیسے ان کے باوا کا راج ہے۔“

اگر اس کا راج ہوتا تو وہ سیٹھ کو مزہ چکھا دیتا جو اسے اوپر تلے دو گالیاں سنا کر

اپنے گھر میں یوں آرام سے بیٹھا تھا جیسے اس نے اپنی گدے دار کرسی میں سے وہ کھنل نکال کر باہر پھینک دیے ہیں۔۔۔۔۔ کچھ اُگر اس کا اپنا راج ہوتا تو وہ چوک میں بہت سے لوگوں کو اکٹھا کر کے سیٹھ کو پیپوں بچ کھڑا کر دیتا اور اس کی گنجی چندیا پر اس زور سے دھپا مارتا کہ بلبل اٹھتا پھر وہ سب لوگوں سے کہتا کہ ہنسو جی بھر کر ہنسو اور خود اتنا ہنستا کہ ہنستے ہنستے اس کا پیٹ دکھنے لگتا۔۔۔۔۔ پر اس وقت اسے بالکل ہنسی نہیں آتی تھی۔۔۔۔۔ کیوں؟۔۔۔۔۔ وہ اپنے راج کے بغیر بھی تو سیٹھ کے گنچے سر پر دھپا مارتا تھا۔ اسے کس بات کی رکاوٹ تھی۔۔۔۔۔ رکاوٹ تھی۔۔۔۔۔ رکاوٹ تھی تو وہ گالیاں سن کر خاموش ہو رہا۔

اس کے قدم رک گئے اس کا دماغ بھی ایک دوپل کے لیے سستایا اور اس نے سوچا کہ چلو ابھی اس جھنجھٹ کا فیصلہ کر ہی دوں۔۔۔۔۔ بھاگا ہوا جاؤں اور ایک ہی جھٹکے میں سیٹھ کی گردن مروڑ کر اس کی تجوری پر رکھ دوں جس کا ڈھکنا مگر چھو کے منہ کی طرح کھلتا ہے۔۔۔۔۔ لیکن وہ کھبے کی طرح زمین میں کیوں گر گیا تھا؟ سیٹھ کے گھر کی طرف پلٹا کیوں نہیں تھا؟۔۔۔۔۔ کیا اس میں جرات نہ تھی؟

اس میں جرات نہ تھی۔۔۔۔۔ کتنے دکھ کی بات ہے کہ اس کی ساری طاقت سرد پڑ رہی تھی۔۔۔۔۔ یہ گالیاں۔۔۔۔۔ وہ ان گالیوں کو کیا کہتا۔۔۔۔۔ ان گالیوں نے اس کی چوڑی چھاتی پر رولسا پھیر دیا تھا۔۔۔۔۔ صرف دو گالیوں نے۔۔۔۔۔ حالانکہ پچھلے ہندو مسلم فسادات میں ایک ہندو نے اسے مسلمان سمجھ کر لٹھیوں سے بہت پیٹا تھا اور اوجھ مو اکرو دیا تھا اور اسے اتنی محسوس نہ ہوئی تھی جتنی کہ اب ہو رہی تھی۔۔۔۔۔ کیشو لال کھاری سینک والا جو اپنے دوستوں سے بڑے فخر کے ساتھ کہا کرتا تھا کہ وہ کبھی

پیار نہیں ہوا۔ آج یوں چل رہا تھا جیسے برسوں کا روگی ہے..... اور یہ روگ کس نے پیدا کیا تھا؟..... دو گالیوں نے!

گالیاں..... گالیاں..... کہاں تھیں وہ دو گالیاں؟ اس کے جی میں آئی کہ اپنے سینے کے اندر ہاتھ ڈال کر وہ ان دو پتھروں کو جو کسی حیلے گلتے ہی نہ تھے۔ باہر نکال دے جو کوئی بھی اس کے سامنے آئے اس کے سر پر دے مارے پر یہ کیسے ہو سکتا تھا..... اس کا سینہ مرے کامرتبان جھوڑی تھا۔

ٹھیک ہے لیکن پھر کوئی اور ترکیب بھی تو سمجھ میں آئے۔ جس سے یہ گالیاں دور دفع ہوں..... کیوں نہیں کوئی شخص بڑھ کرا سے دکھ سے نجات دلانے کی کوشش کرتا؟ کیا وہ ہمدردی کے قابل نہ تھا؟..... ہو گا پر کسی کو اس کے دل کے حال کا کیا پتا تھا۔ وہ کھلی کتاب جھوڑی تھا اور نہ اس نے اپنا دل باہر لٹکا رکھا تھا۔ اندر کی بات کسی کو کیا معلوم؟

نہ معلوم ہو!..... پر مانتا کرے کسی کو معلوم نہ ہو..... اگر کسی کو اندر کی بات کا پتہ چل گیا تو کیشو مال کھاری سینگ والے کے لیے ڈوب مرنے کی بات تھی گالیاں سن کر خاموش رہنا معمولی بات تھی کیا؟

معمولی بات نہیں بری بات تھی..... ہمالہ پہاڑ جتنی بڑی ہے..... اس سے بھی بڑی بات ہے۔ اس کا غروڑ مٹی میں مل گیا تھا۔ اس کی ذلت ہوئی ہے..... اس کی ناک کٹ گئی ہے..... اس کا سب کچھ لٹ گیا ہے۔ چلو بھئی چھٹی ہوئی۔ اب تو یہ گالیاں اس کا پیچھا چھوڑ دیں..... وہ کمینہ تھا۔ ذلیل تھا۔ بچ تھا۔ گندگی صاف کرنے والا بھنگی تھا۔ کتا تھا۔ اس کو گالیاں ماننا ہی چاہیے تھیں..... نہیں نہیں کسی کو کیا

مجال تھی کہ اسے گالیاں دے اور بغیر کسی قصور کے۔ وہ اسے چانہ چہا جاتا..... اماں
ہٹاؤ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں..... تم نے تو سیٹھ سے یوں گالیاں سنیں جیسے میٹھی
میٹھی بولیاں تھیں۔

میٹھی میٹھی بولیاں تھیں۔ بڑے مزیدار گھونٹ تھے چلو یہی سی..... اب تو میرا
پچھپچھا چھوڑ دو ورنہ سچ کہتا ہوں دیوانہ ہو جاؤں گا۔ یہ لوگ جو بڑے آرام سے ادھر
ادھر چل رہے ہیں۔ میں ان سے ہر ایک کا سر پھوڑ دوں گا۔ بھگوان کی قسم مجھے اب
زیادہ تاب نہیں رہی۔ میں ضرور دیوانے کتے کی طرح سب کو کاٹنا شروع کر دوں
گا۔ لوگ مجھے پاگل خانے میں بند کر دیں گے اور میں دیواروں کے ساتھ اپنا سر ٹکرا
ٹکرا کر مر جاؤں گا..... مر جاؤں سچ کہتا ہوں مر جاؤں گا اور میری رادھا دھوا اور
میرے بچے انا تھ ہو جائیں گے..... یہ سب کچھ اس لیے ہو گا کہ میں نے سیٹھ
سے دو گالیاں سنیں اور خاموش رہا جیسے میرے منہ پر تالا لگا ہوا ہے۔ میں لولا انگڑا
اپا بچ تھا..... پر ماتما کرے میری ناک میں اس موٹر کے نیچے آ کر ٹوٹ جائیں میرے
باتھ کٹ جائیں۔ میں مر جاؤں گا کہ یہ بک بک تو ختم ہو..... تو پ..... کوئی ٹھکانہ
ہے اس دکھ کا۔ کپڑے پھاڑ کر رنگا نا چنا شروع کر دوں..... اس ٹرام کے نیچے
سر دے دوں زور زور سے پلانا شروع کر دوں..... کیا کروں کیا نہ کروں؟

یہ سوچتے ہوئے اسے ایک ایسی خیال آیا کہ بازار کے سچ کھڑا ہو جائے اور
سب ٹریفک کو روک کر جو اس کی زبان پر آئے بکنا چاہا جائے۔ حتیٰ کہ اس کا سینہ
سارے کا سارا خالی ہو جائے یا پھر اس کے جی میں آئی کہ کھڑے کھڑے یہیں
سے پلانا شروع کر دے ”مجھے بچاؤ..... مجھے بچاؤ“۔

استے میں ایک آگ بجھانے والا انجن مرک پر ٹن ٹن کرتا آیا اور ادھر اس موٹر میں گم ہو گیا۔ اس کو دیکھ کر وہ اونچی آواز میں کہنے ہی والا تھا ”ٹھہرو..... میری آگ بجھاتے جاؤ“۔ مگر نہ جانے کیوں رک گیا۔

ایک ایسی اس نے اپنے قدم تیز کر دیے۔ اسے ایسا محسوس ہوا تھا کہ اس کی سانس رکنے لگی ہے اور اگر وہ تیز نہ چلے گا تو بہت ممکن ہے کہ وہ پھٹ جائے۔ لیکن جونہی اس کی رفتار بڑھی۔ اس کا دماغ آگ کا ایک چکر سا بن گیا۔ اس چکر میں اس سارے پرانے اور نئے خیال ایک بار کی صورت میں گندھ گئے..... دو مہینے کا کرایہ اس کا پتھر کی بلندنگ میں درخواست لے کر جانا..... سات منزلوں کے ایک سو بارہ زینے سیٹھ کی بھدی آواز اس کے گنبے سر پر مسکراتا ہوا بجلی کا لیمپ اور..... یہ موٹی گالی..... پھر دوسری..... اور اس کی خاموشی..... یہاں پہنچ کر آگ کے اس چکر میں تڑتڑ گولیاں سی ٹکانا شروع ہو جاتیں اور اسے ایسا محسوس ہوتا کہ اس کا سینہ چھلنی ہو گیا ہے۔

اس نے اپنے قدم اور تیز کیے اور آگ کا یہ چکراتی تیزی سے گھومنا شروع ہوا کہ شعلوں کی ایک بہت بڑی گیند سی بن گئی جو اس کے آگے آگے زمین پر اچھلنے کودنے لگی۔ وہ اب دوڑنے لگا لیکن فوراً ہی خیالوں کی بھیڑ بھاڑ میں ایک نیا خیال بلند آواز میں پلایا ”تم کیوں بھاگ رہے ہو؟ کس سے بھاگ رہے ہو؟ تم بزدل ہو؟“

اس کے قدم آہستہ آہستہ اٹھنے لگے۔ بریک سی لگ گئی اور وہ بولے بولے چلنے لگا..... وہ سچ مجبوز دل تھا..... بھاگ کیوں رہا تھا؟..... اسے تو انتقام لینا

تھا..... انتقام..... یہ سوچتے ہوئے اسے اپنی زبان پر لہو کا نمکین ذائقہ محسوس ہوا اور اس کے بدن میں ایک جھرجھری سی پیدا ہوئی..... لہو..... لہو..... اسے آسمان زمین سب لہو ہی میں رنگے ہوئے نظر آنے لگے..... لہو..... اس وقت اس میں اتنی قوت تھی کہ پتھر کی رگوں میں بھی لہو نہچوڑ سکتا تھا۔

اس کی آنکھوں میں الال ڈورے ابھر آئے۔ مٹھیاں بچھ گئیں اور قدموں میں مضبوطی پیدا ہو گئی..... اب وہ انتقام پر تل گیا تھا۔
وہ بڑھا۔

آنے جانے والے لوگوں میں سے تیر کے مانند اپنا راستہ بناتا آگے بڑھتا رہا۔ آگے..... آگے۔

جس طرح تیز چلنے والی ریل گاڑی چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں کو چھوڑ جایا کرتی وہ اسی طرح وہ بکلی کے کھمبوں دکانوں اور لمبے لمبے بازاروں کو اپنے پیچھے چھوڑتا آگے بڑھ رہا تھا۔ آگے..... آگے..... بہت آگے۔

راستے میں ایک سینما کی رنگین بلڈنگ آئی۔ اس نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور اس کے پاس سے بے پروا ہوا کہ مانند بڑھ گیا۔
وہ بڑھتا گیا۔

اندر ہی اندر اس نے اپنے ہر ذرے کو ایک ہم بنالیا تھا تا کہ وقت پر کام آئے۔ مختلف بازاروں سے زہریلے سانپ کی مانند پھنکارتا ہوا وہ اپلو بندر پر پہنچا..... اپلو..... گیٹ وہ آف انڈیا کے سامنے بے شمار موٹریں قطار اندر قطار کھڑی تھیں۔ ان کو دیکھ کر اس نے یہ سمجھا کہ بہت سے گدھ پر جوڑے کسی لاش کے ارد

گرد و غبار ہیں۔ جب اس نے خاموش سمندر کی طرف دیکھا تو اسے یہ لمبی چوڑی
 لاش معلوم ہوئی..... اس سمندر کے اس طرف ایک کونے میں الال لال روشنی کی
 لکیریں ہولے ہولے بل کھا رہی تھیں۔ یہ ایک عالی شان ہوٹل کی پیشانی کا برقی
 نام تھا۔ جس کی الال روشنی سمندر کے پانی میں لگدگی پیدا کر رہی تھی۔

کیٹو الال کھاری سینک والا اس عالی شان ہوٹل کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ اس
 برقی بورڈ کے عین نیچے قدم گاڑ کر اسے اوپر دیکھا..... سنگین عمارت کی فطرت جس
 کے روشن کمرے چمک رہے تھے اور..... اس کے حلق سے ایک نعرہ..... کان کے
 پردے پھاڑ دینے والا نعرہ پگھلے ہوئے گرم گرم لاوے کی مانند نکلا..... ”ہت
 تیری.....!“

جتنے کبوتر ہوٹل کی منڈیروں پر اونگھ رہے تھے ڈر گئے اور پھڑپھڑانے لگے۔
 نعرہ مار کر جب اس نے اپنے قدم زمین سے بڑی مشکل کے ساتھ علیحدہ کیے اور
 واپس مڑا تو اسے اس بات کا پورا یقین تھا کہ ہوٹل کی سنگین عمارت اڑاڑاؤم نیچے
 گر گئی ہے۔

اور یہ نعرہ سن کر ایک شخص نے اپنی بیوی سے جو یہ شور سن کر ڈر گئی تھی کہا ”پگلا
 ہے۔“



نکی

طلاق لینے کے بعد وہ بالکل پخت ہو گئی تھی۔ اب وہ ہر روز کی دانتا کل کل اور مار کٹائی نہیں تھی۔ نکی بڑے آرام و اطمینان سے اپنا گزراوقات کر رہی تھی۔

یہ طلاق پورے دس برس کے بعد ہوئی تھی۔ نکی کا شوہر بہت ظالم تھا۔ پرلے درجے کا کھٹواو ر شرابی کہانی۔ بھنگ چرس کی بھی لت تھی۔ کئی کئی دن ہسٹل خانوں اور تکیوں میں پڑا رہتا تھا۔ ایک لڑکا ہوا تھا۔ وہ پیدا ہوتے ہی مر گیا۔ برس کے بعد ایک لڑکی ہوئی جو زندہ تھی اور اب نو برس کی تھی۔

نکی سے اس کے شوہر گام کو اگر کوئی دلچسپی تھی تو صرف اتنی کہ وہ اس کو مار پیٹ سکتا تھا۔ جی بھر کے گالیاں دے سکتا تھا۔ طبیعت میں آئے تو کچھ عرصے کے لیے گھر سے نکال دیتا تھا۔ اس کے علاوہ نکی سے اس کو اور کوئی سروکار نہیں تھا۔ نہیں محنت مزدوری کی جب تھوڑی سی رقم نکی کے پاس جمع ہوتی تھی تو وہ اسے زبردستی چھین لیتا تھا۔

طلاق بہت پہلے ہو چکی ہوتی۔ اس لیے کہ میاں بیوی کے نباہ کی کوئی صورت ہی نہیں تھی۔ یہ صرف گام کی ضد تھی کہ معاملہ اتنی دیر لٹکا رہا۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ تھی کہ نکی کے آگے پیچھے کوئی بھی نہ تھا۔ ماں باپ نے اس کو ڈولی میں ڈال کر گام کے سپرد کر دیا اور دو مہینے کے اندر اندر رانی ملک بٹا ہوئے جیسے انہوں نے صرف اسی غرض کے لیے موت کو روک رکھا تھا۔ انہیں اپنی بیٹی کو ایک لمبی موت کے لیے گام کے حوالے کرنا تھا۔ بہت دور کے دو ایک رشتہ دار ہوں گے۔ مگر نکی

سے ان کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ انہوں نے خود کو اور زیادہ دور کر لیا تھا۔
 گام کیا ہے یہ کئی کے ماں باپ اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کی بیٹی ساری عمر
 روتی رہے گی۔ یہ بھی ان کو اچھی طرح معلوم تھا۔ مگر انہیں تو اپنی زندگی میں ایک
 فرض سبکدوش ہونا تھا اور وہ ایسے سبکدوش ہوئے کہ سارا بوجھ کئی کے ماتواں
 کا نڈھوں پر ڈال گئے۔

طلاق لینے کے لیے کئی کا یہ مطلب نہیں تھا کہ کسی شریف سے نکاح کرنا چاہتی
 تھی دوسری شادی کا اس کو کبھی خیال تک بھی نہ آیا تھا۔ طلاق ہونے کے بعد وہ کیا
 کرے گی۔ کیا نہیں کرے گی اس کے متعلق کئی نے بھی نہیں سوچا تھا۔ اصل میں وہ
 ہر روز کی بک بک اور جھک جھک سے صرف ایک اطمینان کا سانس لینا چاہتی تھی۔
 اس کے بعد جو ہونے والا تھا اس کو کئی جنوشی برداشت کرنے کے لیے تیار تھی۔

لڑائی جھگڑے کا آغاز تو پہلے ہی روز سے ہو گیا تھا۔ جب کئی دلہن بن کر گام
 کے گھر گئی تھی لیکن طلاق کا سوال اس وقت پیدا ہوا تھا۔ جب وہ گام کے سدھار
 کے لیے دوائیں مانگ مانگ کر عاجز آ گئی تھی اور اس کے ہاتھ اپنی یا اس کی موت
 کے لیے اٹھنے لگے تھے۔ جب یہ حیلہ بھی بے اثر ثابت ہوا تو اس نے اپنے شوہر کی
 منت سماجت کی کہ وہ اسے بخش دے اور علیحدہ کر دے مگر قدرت کی ستم ظریفی
 دیکھیے کہ دس برس کے بعد بچے میں ایک ادھیڑ عمر کی میراٹھن سے گام کی آنکھ لڑی
 اور ایک دن اس کے کہنے پر اس نے کئی کو طلاق دے دی اور بیٹی پر بھی اپنا کوئی حق
 نہ جتایا۔ حالانکہ کئی کو اس بات کا ہمیشہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ اگر اس کا شوہر طلاق پر
 راضی بھی ہو گیا تو وہ بیٹی کبھی اس کے حوالے نہیں کرے گا..... بہر حال کئی نچنت ہو

گئی اور ایک چھوٹی سی کوٹھڑی کرائے پر لے کر چین سے دن گزارنے لگی۔
 اس کے دس برس اس خاموشی میں گزر گئے تھے۔ دل میں ہر روز اس کے
 بڑے بڑے طوفان جمع ہوتے تھے مگر وہ خاوند کے سامنے آف تک نہ کر سکتی تھی۔
 اس لیے کہ اسے بچپن ہی سے یہ تعلیم ملی تھی کہ شوہر کے سامنے بولنا ایسا گناہ ہے جو
 کبھی بخشا ہی نہیں جاتا۔ اب وہ آزاد تھی اس لیے وہ چاہتی تھی کہ اپنے دس برس کی
 بھڑاس کسی نہ کسی طرح نکالے۔ چنانچہ ہمسایوں سے اکثر اس کی لڑائی بھڑائی
 ہونے لگی۔ معمولی توں توں میں میں ہوتی جو گالیوں کی جنگ میں تبدیل ہو جاتی۔
 نکلی پہلے جس قدر خاموش تھی۔ اب اسی قدر ہی اس کی زبان چلتی تھی۔ منافقتی
 میں وہ اپنے مقابل کی ساتوں پیڑھیاں پن کر رکھ دیتی۔ ایسی ایسی گالیاں اور
 سٹھنیاں دیتی کہ حریف کے چپٹے چھوٹ جاتے۔

آہستہ آہستہ سارے محلے پر نکلی کی دھماک بیٹھ گئی۔ یہاں کاروباری قسم کے
 مرد رہتے تھے۔ جو صبح سویرے اٹھ کر کام پر نکل جاتے تھے اور رات دیر سے گھر
 لوٹتے۔ سارے دن میں عورتوں میں جو لڑائی جھگڑا ہوتا۔ اس سے وہ مرد بالکل
 الگ تھلگ رہتے تھے ان میں سے شاید کسی کو پتا بھی نہیں تھا کہ نکلی کون ہے اور محلے
 کی ساری عورتیں اس سے کیوں دیتی ہیں۔

چرخہ کات کر بچوں کے لیے گڑے گڑیاں بنا کر اور اسی طرح کے چھوٹے
 موٹے کام کر کے وہ گزراوقات کے لیے کچھ نہ کچھ پیدا کر لیتی تھی۔ طلاق لیے
 اسے قریب قریب ایک برس ہو چلا تھا۔ اس کی بیٹی بھوئی اب گیارہ کے لگ بھگ
 تھی اور بڑی سرعت سے جوان ہو رہی تھی نکلی کو اس کے شادی بیاہ کی بڑی فکر تھی۔

اس کے اپنے زیور تھے۔ جو ایک ایک کر کے گام نے چٹ کر لیے تھے۔ ایک صرف تاک کی کیل باقی رہ گئی تھی۔ وہ بھی گھس گھسا کر آدھی رہ گئی تھی۔ اسے بھولی کا پورا جہیز بنا دیا تھا۔ اور اسکے لیے کافی روپیہ درکار تھا۔ تعلیم تھی وہ اس نے اپنی طرف سے ٹھیک دی تھی۔ قرآن ختم کر دیا تھا۔ معمولی حرف شناسی بھی کر لیتی تھی کھانا پکانا خوب آتا تھا۔ گھر کے دوسرے کام کاج بھی اچھی طرح جانتی تھی۔ چونکہ نکلی کو اپنی زندگی میں بہت تلخ تجربہ ہوا تھا اس لیے اس نے بھولی کو خاوند کا اخاعت گزار ہونے کے لیے کبھی اشارہ بھی نہیں کہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کی بیٹی سسرال میں چھپر کٹ پر بیٹھی راج کرے۔

ماں کے ساتھ جو کچھ بیٹا تھا اس پپٹا کا حال بھولی کو معلوم تھا۔ مگر ہمایوں کے ساتھ جب نکلی کی لڑائی ہوتی تھی۔ تو وہ پانی پی پی کر اسے کوستی تھیں اور یہ طعنہ دیتی تھیں کہ وہ مطلقہ ہے جس کو خاوند نے صرف اس لیے علیحدہ کر دیا تھا کہ اس غریب کاناگ میں دم کر رکھا تھا۔ اور بہت سی باتیں اپنی ماں کے کردار کے طور و اطوار کے متعلق اس کی سماعت میں آتی تھیں۔ مگر وہ خاموش رہتی تھی۔ بڑے بڑے معرکے کی لڑائیاں ہوتیں مگر وہ کان سمیٹے اپنے کام میں لگی رہتی۔۔۔۔۔

جب سارے محلے پر نکلی کی دھاک بیٹھ گئی تو عورتوں نے مرعوب ہو کر اسے پاس آنا جانا شروع کر دیا۔ کئی اس کی سہیلیاں بن گئیں۔ جب ان کی اپنی کسی پڑوسن سے لڑائی ہوتی تو نکلی ساتھ دیتی اور ہر ممکن مدد کرتی۔ اس کے بدلے میں اس کو کبھی قمیص کے لیے کپڑا مل جاتا تھا۔ کبھی پھل کبھی مٹھائی اور کبھی کبھی کوئی بھولی کے لیے سوٹ بھی سلوا دیتا تھا۔ لیکن جب نکلی نے دیکھا کہ ہر دوسرے تیسرے دن

اسے محلے کی کسی نہ کسی عورت کی لڑائی میں شریک ہونا پڑتا ہے اور اسکے کام کاج کا برج ہوتا ہے۔ تو اس نے پہلے وہی زبان سے پھر کھلے لفظوں میں اپنا معاوضہ مانگنا شروع کر دیا۔ اور آہستہ آہستہ اپنی فیس بھی مقرر کر لی۔ معرکے کی جنگ ہو تو پچیس روپے۔ دن زیادہ لگیں تو چالیس۔ معمولی جج کے صرف چار روپے اور دو وقت کا کھانا۔ درمیانے درجے کی لڑائی کے پندرہ روپے۔ کسی کی سفارش ہو تو وہ کچھ رعایت بھی کر دیتی تھی۔

اب چونکہ اس نے دوسروں کے لیے لڑنا اپنا پیشہ بنالیا تھا اس لیے اس محلے کی تمام عورتوں اور ان کی بہو بیٹیوں کے تمام فیسے یاد رکھنے پڑتے تھے۔ ان کا تمام حسب و نسب معلوم کر کے اپنی یادداشت میں محفوظ کرنا پڑتا تھا مثال کے طور پر اس کو معلوم تھا کہ اونچی حویلی والی سوداگر کی بیوی جو اپنی ناک پر کبھی نہیں بیٹھنے دیتی ایک موچی کی بیٹی ہے اس کا باپ شہر میں لوگوں کے جوتے گاڑتا پھرتا ہے۔ اور اس کا خاوند جو جناب شیخ صاحب کہلاتا تھا معمولی قصائی ہے اس کے باپ پر ایک رنڈی مہربان ہو گئی تھی۔ وہ اسی کے نطن سے تھا۔ اور یہ اونچی حویلی اس طوائف نے اپنے یا رکوبنا کر دی تھی۔

کس لڑکی کا کس کے ساتھ معاشرت ہے۔ کون کس کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ کون کتنے حمل گرا کی ہے۔ اس کا حساب سب لگی کو معلوم تھا۔ یہ تمام معلومات حاصل کرنے میں وہ کافی محنت کرتی تھی۔ کچھ مصالحہ اس کو اپنے موکلوں سے مل جاتا تھا۔ اسے اپنی معلومات کے ساتھ ملا کر وہ ایسے ایسے بم بناتی کی مد مقابل کے چمکے چھوٹ جاتے تھے۔ ہوشیارو کیلوں کی طرح وہ سب سے وزنی ضرب صرف

اسی وقت استعمال کی کرتی تھی جب لوہا پوری طرح سرخ ہو جاتا۔ چنانچہ یہ ضرب سولہ آنے فیصلہ کن ثابت ہوتی۔

جب وہ اپنے موکل کے ساتھ کسی محاز پر جاتی تھی تو گھر سے پوری طرح کیل کانٹے سے لیس ہو کر جاتی تھی۔ طعنے مہنوں اور گالیوں اور سٹھنیوں کو مصور بنانے کے لیے مختلف اشیاء بھی استعمال کرتی تھی۔ مثال کے طور پر گھسا ہوا جوتا بھٹی ہوئی قمیص، چمنا، پھلکی وغیرہ وغیرہ کوئی خاص تشبیہ دینی ہو یا کوئی خاص الخاص اشارہ یا کنایہ مطلوب ہو تو وہ اس غرض کے لیے کارآمد شے گھر ہی سے لے کر چلتی تھی۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ آج وہ جتنے کے لیے خیراں سے لڑی ہے۔ تو وہ ڈھائی مہینے کے بعد اسی خیراں سے ڈبل فیس لے کر اسے جتنے سے لڑنا پڑتا تھا۔ ایسے موقعوں پر وہ گھبراتی نہیں تھی۔ اس اپنے فن میں اس قدر مہارت ہو گئی تھی اور اس کی پریکٹس میں وہ اتنی مخلص تھی کہ اگر کوئی فیس دیتا تو وہ اپنی بھی دھجیاں بکھیر دیتی۔

نکی اب فارغ البال تھی۔ ہر مہینے اسے اب اتنی آمدن ہونے لگی تھی کہ اس نے پس انداز کر کے اپنی بھولی بھالی بیٹی کا جینز بنانا شروع کر دیا تھا۔ چھوڑے ہی عرصے میں اتنے گہنے پاتے اور کپڑے لے ہو گئے تھے کہ وہ کسی بھی وقت اپنی بیٹی کو ڈولی میں ڈال سکتی تھی۔

اپنے ملنے والیوں سے وہ بھولی کے لیے کوئی اچھا سا برستلاش کرنے کی بات کئی مرتبہ کر چکی تھی۔ شروع شروع میں تو اس کی کوئی اتنی جلدی نہیں تھی۔ مگر جب بھولی سولہ برس کی ہو گئی تو لوٹھا کی لوٹھا۔ قد کاٹھ کی چونکہ ایسی تھی۔ اس لیے چودھویں

برس ہی میں پوری جوان عورت بن گئی تھی۔ ستر ہوئیں میں تو ایسے لگتا تھا کہ وہ اس کی چھوٹی بہن ہے۔ چنانچہ اب نکی کو دن رات اس کے بیاہ کی فکر ستانے لگی۔ نکی نے بڑی دوڑ دھوپ کی۔ کوئی صاف انکار نہیں کرتا تھا۔ مگر دل سے ہامی بھی نہیں بھرتا تھا۔ اس نے یہ محسوس کیا کہ ہونہ ہو لوگ اس سے ڈرتے ہیں۔ اس کی یہ صفت کہ لڑنے کے فن میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ دراصل اس کے آڑے آ رہی تھی۔ بعض گھروں میں تو وہ خود ہی سلسلہ جنمانی نہ کرتی۔ کہ اسکی کسی عورت کا اس نے مطلقہ بند کیا تھا۔ دن پر دن چڑھتے جا رہے تھے اور گھر میں پہاڑی جوان بیٹی کنواری بیٹھی تھی۔

نکی کو اپنے پیشے سے اب گھن آنے لگی تھی۔ اس نے سوچا کہ ایسا ذلیل کام کیوں اس نے اختیار کیا۔ مگر وہ کیا کرتی محلے میں آرام چین کی جگہ پیدا کرنے کے لیے اسے پڑوسیوں کا مقابلہ کرنا ہی تھا۔ اگر وہ نہ کرتی تو اسے دب کے رہنا پڑتا۔ پہلے خاوند کے جوتے کھاتی تھی پھر ان کے پیراز کی غلامی کرنی پڑتی۔ یہ عجیب بات تھی کہ برسوں دبیل رہنے کے بعد جب اسے اپنا جھکا ہوا سراٹھایا اور مخالف قوتوں کا مقابلہ کر کے ان کو شکست دی۔ یہ قوتیں جھک کر اس کی امداد کی طالب ہوئیں۔ کہ دوسری قوتوں کو شکست دیں اور اس کو اس امداد پر کچھ اس طرح راغب کیا گیا کہ اس کو چسکہ ہی پڑ گیا۔

اس کے متعلق وہ سوچتی تو اس کا دل نہ مانتا تھا۔ کیونکہ اس نے صرف بھولی کی خاطر اس پیشے کو جسے اب لوگ ذلیل سمجھنے لگے تھے اختیار کیا تھا۔ یہ بھی کم عجیب چیز نہیں تھی۔ نکی کو روپے دے کر کسی عورت پر انگلی رکھ دی جاتی تھی اور اس سے کہا جاتا

تھا کہ وہ اس کی ساتوں پیڑھیاں پن ڈالے..... اس کے آباؤ اجداد کی ساری کمزوریاں ماضی کے طے سے کرید کرید کر نکالے اور اس کے وجود پر ڈھیر کر دے۔ مکی یہ کام بڑی ایمانداری سے کرتی وہ گالیاں جو ان کے منہ پر ٹھیک نہیں بیٹھتی تھیں اپنے منہ میں بٹھاتی۔ ان کی بہو بیٹیوں کے عیوب پر پردے ڈال کر وہ دوسروں کی بہو بیٹیوں میں کیڑے نکالتی۔ غلیظ سے غلیظ گالیاں اپنے ان موکلوں کی خاطر خود بھی کھاتی..... پر اب کہ اس کی بیٹی کے بیاہ کا سوال آیا تھا۔ وہ کمینی بچ اور ذلیل بن گئی تھی۔

ایک مرتبہ تو اس کے جی میں آئی کہ محلے کی ان تمام عورتوں کو جنہوں نے اس کی بیٹی کو رشتہ دینے سے انکار کر دیا تھا بچہ چوراہے میں جمع کرے اور ایسی گالیاں دے کہ ان کے دل کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں مگر وہ سوچتی کہ اگر اس نے یہ غلطی کر دی تو غریب بھولی کا مستقبل بالکل تیرہ دھار ہو جائے گا۔

جب چاروں طرف سے مایوسی ہوئی تو مکی نے شہر چھوڑنے کا ارادہ کر لیا صرف یہی راستہ تھا۔ جس سے بھولی کی شادی کا کٹھن مرحلہ طے ہو سکتا تھا چنانچہ اس نے ایک روز بھولی سے کہا ”بیٹا! میں نے یہ سوچا ہے کہ اب کسی اور شہر میں جا کر رہیں۔“

بھولی نے چونک کر پوچھا ”کیوں ماں!“

”بس اب یہاں رہنے کو جی نہیں چاہتا“ مکی نے اس کی طرف متنا بھری نظروں سے دیکھا اور کہا ”تیرے بیاہ کی فکر میں کھلی جا رہی ہوں۔ یہاں بیل منڈے نہیں چڑے گی۔ تیری ماں کو سب رزائل سمجھتے ہیں۔“

بھولی کافی سیانی ہو گئی تھی فوراً کئی کامطلب سمجھ گئی اس نے صرف اتنا کہا ”ہاں
ماں!“

کئی کو ان دو لفظوں سے سخت صدمہ پہنچا بڑے دھکی لچے میں اس نے بھولی
سے سوال کیا ”کیا تو بھی مجھے رزائل سمجھتی ہے؟“
بھولی نے جواب نہ دیا اور آٹا گوند جسنے میں مصروف ہو گئی۔

اس دن کئی نے عجیب عجیب باتیں سوچیں۔ اس کے سوال کرنے پر بھولی
خاموش کیوں ہو گئی تھی۔ کیا وہ اسے واقعی رزائل سمجھتی تھی کیا وہ اتنا بھی نہیں کہہ سکتی
تھی کہ نہیں ماں کیا یہ باپ کے خون کا اثر تھا؟ بات میں سے بات نکل آتی اور وہ
بری طرح ان میں الجھ جاتی۔ اسے بیٹے ہوئے دس برس یاد آتے۔ بیاہی زندگی
کے دس برس جس کا ایک ایک دن مارچٹ اور گالی گلوچ سے بھرا تھا۔ پھر وہ اپنی
نظروں کے سامنے مطلقہ زندگی کے دن الاتی..... ان میں بھی گالیاں ہی گالیاں
تھیں جو وہ پیسے کی خاطر دوسروں کو دیتی رہی تھی تھک ہار کر وہ بعض اوقات کوئی
سہارا ٹٹولنے لگتی اور سوچتی کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ طلاق نہ لیتی..... آج بیٹی کا بوجھ
گام کے کندھوں پر ہوتا۔ نکھٹو تھا۔ پرلے درجے کا ظالم تھا۔ یہی تھا مگر بیٹی کے لیے
ضرور کچھ نہ کچھ کرتا۔ یہ اس کے بجز کی انتہا تھی۔

پرانی ماریں اور ان کے دیے ہوئے درد اب آہستہ آہستہ کئی کے جوڑوں میں
ابھرنے لگے۔ پہلے اس نے کبھی اف تک نہیں کی تھی۔ پر اب اٹھتے بیٹھتے ہائے
ہائے کرنے لگی۔ اس کے کانوں میں ہر وقت ایک شور سا برپا ہونے لگا۔ جیسے ان
کے پردوں پر وہ تمام گالیاں اور سٹھنیاں ٹکرا رہی ہیں جو ان گنت لڑائیوں میں اس

نے استعمال کی تھیں۔

عمر اس کی زیادہ نہیں تھی۔ چالیس کے لگ بھگ تھی۔ مگر اب نکی کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ بوڑھی ہو گئی ہے۔ اس کی کمر جواب دے چکی ہے اس کی زبان جو قینچی کی طرح چلتی تھی اب کند ہو گئی ہے بھولی سے گھر کے کام کاج کے متعلق معمولی سی بات کرتے ہوئے اس کو مشقت کرنی پڑتی تھی۔

نکی بیمار پڑ گئی اور چارپائی کے ساتھ لگ گئی۔ شروع شروع میں تو وہ اس بیماری کا مقابلہ کرتی رہی۔ بھولی کو بھی اس نے خبر نہ ہونے دی کہ اندر ہی اندر کون سی دیمک اسے چاٹ رہی ہے۔ لیکن ایک دم وہ ایسی غڑھال ہوئی کہ اس سے اٹھا تک نہ گیا۔ بھولی کو بہت تشویش ہوئی۔ اس نے حکیم بلایا۔ جس نے نبض دیکھ کر بتایا کہ فکر کی کوئی بات نہیں پرانا بکار ہے۔ علاج سے دور ہو جائے گا علاج باقاعدہ ہوتا رہا۔ بھولی سعادت مند بیٹیوں کی طرح ماں کی ہر ممکن خدمت بجا لاتی رہی تھی۔ اس سے نکی کے دکھی دل کو کافی تسکین ہوتی تھی۔ مگر مرض دور نہ ہوا۔ بخار پہلے سے تیز ہو گیا۔ اور آہستہ آہستہ نکی کی بھوک غائب ہو گئی۔ جس کے باعث وہ بہت ہی لاغر اور نحیف ہو گئی۔

عورتوں میں ایک خدا داد وصف ہوتا ہے کہ مریض کی شکل دیکھ کر ہی پہچان لیتی ہیں کہ وہ کتنے دن کا مہمان ہے۔ ایک دو عورتیں جب بیمار پر سی کے لیے نکی کے پاس آئیں تو انہوں نے اندازہ لگایا کہ وہ بمشکل دس روز نکالے گی چنانچہ یہ بات سارے محلے کو معلوم ہو گئی۔

کوئی بیمار ہو مرنے کے قریب ہو تو عورتوں کے لیے ایک اچھی خاصی تفریح کا

بہانہ نکل آتا ہے۔ گھر سے بن سنور کر نکلتی ہیں اور مریض کے سر ہانے بیٹھ کر اپنے تمام مرحوم عزیزوں کو یاد کرتی ہیں ان کی بیماریوں کا ذکر ہوتا ہے وہ تمام علاج بیان کیے جاتے ہیں جو اعلیٰ علاج ثابت ہوئے تھے۔ پھر گفتگو کا رخ پٹ کر قیصوں کے ڈیزائنوں کی طرف آ جاتا ہے۔

کلی ایسی باتوں سے بہت گھبراتی تھی۔ لیکن وہ خود چونکہ مریضوں کے سر ہانے ایسی ہی باتیں کرتی رہی تھی اس لیے مجبوراً اسے یہ خرافات سننی پڑتی تھی..... ایک روز جب محلے کی بہت سی عورتیں اس کے گھر میں جمع ہو گئیں تو اس احساس نے اس کو بہت مضطرب کیا کہ اس کے جانے کا وقت آچکا ہے ان میں سے ہر ایک کے چہرے پر یہ فیصلہ مرقوم تھا کہ کلی کے درہ زے پر موت دستک دے رہی ہے۔ جو عورت آتی۔ اپنے ساتھ یہ کھٹ کھٹ لاتی۔ نکل آ کر کئی دفعہ کلی کے جی میں آتی کہ کنڈی کھول دے اور دستک دینے والے فرشتے کو اندر بلا لے۔

ان بیمار پرس عورتوں کو سب سے بڑا افسوس بھولی کا تھا۔ کلی سے وہ بار بار اس کا ذکر کرتیں کہ ہائے اس پچاری کا کیا ہوگا۔ دنیا میں اس غریب کی صرف ایک ماں ہے۔ وہ بھی چلی گئی تو اس کا کیا ہوگا۔ پھر وہ اللہ میاں سے دعا کرتیں کہ وہ کلی کی زندگی میں چند دنوں کا اضافہ کر دے۔ تاکہ وہ بھولی کی طرف سے مطمئن ہو کر مرے۔

کلی کو اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ دعا بالکل جھوٹی ہے۔ انہیں بھولی کا اتنا خیال ہوتا تو وہ اس کے رشتے سے انکار کیوں کرتیں۔ صاف انکار نہیں کیا تھا۔ اس لیے کہ یہ دنیا داری کے اصول کے خلاف تھا مگر کسی نے ہامی نہیں بھری تھی۔

وہ چھوٹا سا کمرہ جس میں نکی کی چار پائی پڑتی تھی۔ بیمار پرس عورتوں سے بھرا ہوا تھا..... بھولی نے انکے تھکنے کا انتظام ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ہی سے کر رکھا تھا۔ بیڑھیاں کم تھیں اس لیے اس نے کھجور کے پتوں کی چٹائی بچھا دی تھی۔ بھولی اس اہتمام و انتظام سے نکی کو بڑا صدمہ پہنچا تھا گویا وہ بھی دوسری عورتوں کی طرح اس کی موت کے استقبال کے لیے تیار تھی۔

بخاریز تھا دماغ تپا ہوا تھا۔ نکی نے اوپر تلے بہت سی تکلیف دہ باتیں سوچیں تو بخار اور زیادہ تیز ہو گیا اور اس پر ہڈیانی کیفیت طاری ہو گئی۔ جلی جلدی اس نے بے جوڑ باتیں کرنے لگی۔ بیمار پرس عورتوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وہ جوائنٹھ کر جانے والی تھیں نکی کا وقت قریب دیکھ کر بیٹھ گئیں۔

نکی بکے جا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی سے لڑ رہی ہے۔ میں تیری ہشت پشت کو اچھی طرح جانتی ہوں..... جو کچھ تو نے میرے ساتھ کیا ہے وہ کوئی دشمن کے ساتھ بھی نہیں کرتا۔ میں نے اپنے خاوند کی دس برس غلامی کی۔ اس نے مار مار کر میری کھال اوڑھ لڑ دی۔ پر میں نے اف تک نہ کی..... اب تو نے..... اب تو نے مجھ پر یہ ظلم شروع کیے ہیں..... پھر وہ کمرے میں جمع شدہ عورتوں کو پچھی پچھی نظروں سے دیکھتی ”تم..... تم یہاں کیا کرنے آئی ہو..... نہیں نہیں..... میں کسی نفیس پر بھی لڑنے کے لیے تیار نہیں..... تم میں سے ہر ایک کے عیب وہی ہیں۔..... پرانے..... صدیوں کے پرانے جو کیڑے..... جو کیرے پھاں می ہیں وہی تم سب میں ہیں..... تم میں سے قریب قریب ہر ایک کا خصم رنڈی باز ہے..... جو بری بیماری پھا تو کے خاوند کو لگی ہے وہی جنت کے گھر والے کو چھڑی ہوئی ہے..... تم

سب کو رنجی ہو..... اور یہ کوڑھ تم نے مجھے بھی دے دیا ہے..... لعنت ہو تم سب پر
 خدا کی..... خدا کی..... خدا.....“ اور وہ ہنسنے لگی۔ ”میں اس خدا کو بھی جانتی
 ہوں..... اس کی بہشت پشت کو اچھی طرح جانتی ہوں..... یہ کیا دنیا بنائی ہے تو
 نے..... یہ دنیا جس میں گام ہیں۔ جس میں پھاماں ہے جو اپنے خاوند کو چھوڑ کے
 دوسروں کے بستر گرم کرتی ہے..... اور مجھے نفیس دیتی ہے..... بیس روپے گن کر
 میرے ہاتھ پر رکھتی ہے کہ میں نورفشاں کے پرانے یاروں کا پول کھولوں.....
 اور نورفشاں میرے پاس آتی ہے کہنگی یہ پانچ زیادہ لو اور جاؤ امینہ سے لڑو وہ مجھے
 ستاتی ہے..... یہ کیا چکر چلایا ہوا ہے تو نے اپنی دنیا میں..... میرے سامنے آ.....“
 ذرا میرے سامنے آ.....“

آوازنگی کے حلق میں رکنے لگی۔ جھوڑی دیر بعد گھٹکھر و بجنے لگا تنج سے وہ تنج و
 تاب کھار ہی تھی اور ہندیانی کیفیت میں چلا رہی تھی ”گام مجھے نہ مار..... او گام.....
 او خدا مجھے نہ مار..... او خدا..... او گام!“

او خدا او گام بڑبڑاتی آخرنگی بیمار پرس عورتوں کے اندازے کے عین مطابق مر
 گئی۔ جھولی جوان عورتوں کی خاطر دار میں مصروف تھی۔ پانی کا گلاس ہاتھ سے گرا
 کر دھڑ دھڑ اپنا سر پیٹنے لگی۔

☆☆☆

نگلی آوازیں

بھولو اور گاما دو بھائی تھے بے حد ختی بھولو قلعی گرتھا۔ صبح دھونکی سر پر رکھ کر نکلتا اور دن بھر شہر کی گلیوں میں بھانڈے قلعی کرا لو۔ کی صدائیں لگاتا رہتا۔ شام کو گھر لوٹتا تو اس کے تہہ بند کے ڈب میں تین چار روپے کا کرپا نہ ضرور ہوتا۔

گاما خواجہ فروش تھا۔ اسکو بھی دن بھر چھاڑی سر پر اٹھائے گھومنا پڑتا تھا تین چار روپے یہ بھی کمالیتا تھا۔ مگر اس کو شراب کی لت تھی۔ شام کو دینے کے بھیمار خانے سے کھانے سے پہلے ایک پاؤ شراب اسے ضرور چاہیے تھی۔ پینے کے بعد وہ خوب چمکتا۔ دینے کے بھیمار خانے میں رونق لگ جاتی۔ سب کو معلوم تھا کہ وہ پیتا ہے اور اسی سہارے جیتا ہے۔

بھولو اور گاما سے جو کہ اس سے دو سال بڑا تھا بہت سمجھایا کہ دیکھو یہ شراب کی لت بہت بری ہے۔ شادی شدہ ہو۔ بیکار پیسہ برباد کرتے ہو۔ یہی جو تم ہر روز ایک پاؤ شراب پر خرچ کرتے ہو بچا کر رکھو تو بھائی ٹھاٹ سے رہا کرے۔ نگلی بچی اچھی لگتی ہے تجھے اپنی گھر والی۔ گاما نے اس کان سے سنا اور اس کان سے نکال دیا۔ بھولو جب تھک ہار گیا تو اس نے کہنا ہی چھوڑ دیا۔

دونوں مہاجر تھے ایک بڑی بلندنگ کے ساتھ سرونٹ کوارڈ تھے۔ ان پر جہاں اوروں نے قبضہ جما رکھا تھا۔ وہاں ان دونوں بھائیوں نے بھی ایک کوارڈ جو کہ دوسری منزل پر تھا اپنی رہائش کے لیے محفوظ کر لیا تھا۔

سر دیاں آرام سے گزر گئیں۔ گرمیاں آئیں تو گاما کو بہت تکلیف ہوئی۔

بھولوتو اوپر کوٹھے پر کھٹا بچھا کر سو جاتا تھا۔ گاما کیا کرتا۔ بیوی تھی اور اوپر پر دے کا کوئی بندہ بست ہی نہیں تھا۔ ایک گاما ہی کو یہ تکلیف نہیں تھی۔ کوارٹروں میں جو بھی شادی شدہ تھا اسی مصیبت میں گرفتار تھا۔

کلن کو ایک بات سوچھی۔ اس نے کوٹھے پر کونے میں اپنی اور اپنی بیوی کی چارپائی کے ارد گرد ٹان تان دیا۔ اس طرح پر دے کا انتظام ہو گیا۔ کلن کی دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی اس ترکیب سے کام لیا۔ بھولو نے بھائی کی مدد کی اور چند ہی دنوں میں بانس وغیرہ گاڑ کر ٹان اور کمبل جوڑ کر پر دے کا انتظام کر دیا۔ یوں ہوا تو رک جاتی تھی مگر نیچے کوارٹر کے دوزخ سے ہر حالت میں یہ جگہ بہتر تھی۔

اوپر کوٹھے پر سونے سے بھولو کی طبیعت میں ایک عجیب انقلاب پیدا ہو گیا۔ وہ شادی بیاہ کا بالکل قائل نہیں تھا۔ اس نے دل میں عہد کر رکھا تھا کہ یہ خیال کبھی نہیں پالے گا۔ جب گاما کبھی اس سے بیاہ کی بات چھیڑتا تو وہ کہا کرتا بھائی میں اپنے نروے پنڈے پر جو کمیں نہیں لگوانا چاہتا لیکن جب گرمیاں آئیں اور اس نے اوپر کھٹا بچھا کر سونا شروع کیا تو دس پندرہ روزی میں اس کے خیالات بدل گئے۔ ایک شام کو دینے کے بھیا رخانے میں اپنے بھائی سے کہا ”میری شادی کر دو نہیں تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔“

گاما نے جب یہ سنا تو اس نے کہا ”یہ کیا مذاق سوچا ہے تمہیں۔“
بھولو بہت سنجیدہ ہو گیا ”تمہیں نہیں معلوم..... پندرہ راتیں ہو گئی ہیں مجھے جاگتے ہوئے۔“

گاما نے پوچھا ”کیوں کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں یار..... دائیں بائیں جدھر نظر ڈالو کچھ نہ کچھ ہو رہا ہے..... عجیب عجیب آوازیں آتی ہیں نیند کیا آئے گی خاک؟“

گاما زور سے اپنی گھنٹی مونچھوں میں ہنسا۔ بھولو شرمایا گیا، ”وہ جو کلن ہے اسے تو حد ہی کر دی..... سالہا رات بھر بکواس کرتا رہتا ہے۔ اس کی بیوی سالی کی زبان بھی تالو سے نہیں لگتی..... بچے پڑے رو رہے ہوتے ہیں مگر وہ.....“

گاما حسب معمول نشے میں تھا۔ بھولو گایا تو اس نے دینے کے بھیا رخانے میں اپنے سب واقف کاروں کو خوب چمک چمک کر بتایا کہ اس کے بھائی کو آج کل نیند نہیں آتی اس کا باعث جب اس نے اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا تو سننے والوں کے پیٹ میں ہنس ہنس کے بل پڑ گئے۔ جب ہی لوگ بھولو سے ملے تو اس کا خوب مذاق اڑایا۔ کوئی اس سے پوچھتا ”ہاں بھئی کلن اپنی بیوی سے کیا باتیں کرتا ہے؟“ کوئی کہتا ”میاں مفت میں مزے لیتے ہو..... ساری رات فلمیں دیکھتے رہتے ہو..... سو فیصدی گاتی بولتی“۔

بعضوں نے گندے گندے مذاق کیے بھولو چہرہ گیا۔ گاما صوفی حالت میں تھا تو اس نے اس سے کہا ”تم نے تو میرا مذاق بنا دیا ہے..... دیکھو جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے جھوٹ نہیں ہے۔ میں انسان ہوں خدا کی قسم مجھے نیند نہیں آتی۔ آج بیس دن ہو گئے ہیں جاگتے ہوئے..... تم میری شادی کا بندوبست کرو ورنہ قسم بیچ تن پاک کی میرا خانہ خراب ہو جائے گا..... بھابی کے پاس میرا بچہ سو رہا ہے جمع ہے..... جلدی کرو بندوبست“۔

گاما نے اپنی مونچھ مروڑ کر پہلے کچھ سوچا پھر کہا ”اچھا ہو جائے گا بندوبست

تمہاری بھابی سے آج ہی بات کرتا ہوں کہ وہ اپنی ملنے والیوں سے پوچھ گچھ کرے۔“

ڈیڑھ مہینے کے اندر اندر بات چلی ہو گئی۔ صد قلمی گر کی لڑکی عانشہ گاما کی بیوی کو بہت پسند آئی۔ خوبصورت تھی۔ گھر کا کام کاج جانتی تھی۔ ویسے صد شریف تھا ملے والے اس کی عزت کرتے تھے۔ بھولو بھولتی تھا۔ تندرست تھا۔ جن کے وسط میں شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ صد نے بہت کہا کہ وہ لڑکی اتنی گرمیوں میں نہیں بیاہے گا مگر بھولو نے جب زور دیا تو وہ مان گیا۔

شادی سے چار دن پہلے بھولو اپنی دلہن کے لیے اوپر کوٹھے پر ٹاٹ کے پردے کا بندہ بست کیا۔ بانس بڑی مضبوطی سے فرش میں گاڑے۔ ٹاٹ خوب کس کر لگایا۔ چار پائیوں پر نئے کھیس بچھائے۔ نئی صراحی منڈیر پر رکھی۔ شیشے کا گلاس بازار سے خریدا۔ سب کام اس نے بڑے اہتمام سے کیا۔

رات کو جب وہ ٹاٹ کے پردے میں گھر کر سویا تو اس کا عجیب سا لگا۔ وہ کھلی ہوا میں سونے کا عادی تھا مگر اب اس کو عادت ڈالنی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ شادی سے چار دن پہلے ہی اس نے یوں سوتا شروع کر دیا تھا۔ پہلی رات جب وہ لیٹا اور اس نے اپنی بیوی کے بارے میں سوچا تو وہ پسینے میں تر ہو گیا۔ اس کے کانوں میں وہ آوازیں گونجنے لگیں جو اسے سونے نہیں دیتی تھیں اور اس کے دماغ میں طرح طرح کے پریشان خیالات دوڑاتی تھیں۔

کیا وہ بھی ایسی ہی آوازیں پیدا کرے گا۔ کیا آس پاس کے لوگ ی آوازیں سنیں گے۔ کیا وہ بھی اسی کے مانند راتیں جاگ جاگ کر کاٹیں گے۔ کسی

نے اگر جھانک کر دیکھ لیا تو کیا ہوگا؟

بھولو پہلے سے بھی زیادہ پریشان ہو گیا۔ ہر وقت اس کو یہی بات ستاتی رہتی کہ
 ٹاٹ کا پردہ بھی کوئی پردہ ہے۔ پھر چاروں طرف لوگ بکھرے پڑے ہیں۔ رات
 کی خاموشی میں ہلکی سی ہرگوشی بھی دوسرے کے کانوں تک پہنچ جاتی ہے..... لوگ
 کیسے یہ ننگی زندگی بست کرتے ہیں..... ایک کوٹھا ہے اس چارپائی پر بیوی لیٹی
 ہے۔ اس چارپائی پر خامند پڑا ہے۔ سینکڑوں آنکھیں سینکڑوں کان اس پاس کھلے
 ہیں۔ نظر نہ آنے پر بھی آدمی سب کچھ دیکھ لیتا ہے۔ ہلکی سی آہٹ پوری تصویر بن کر
 سامنے آ جاتی ہے..... یہ ٹاٹ کا پردہ کیا ہے۔ سورج نکلتا ہے تو اس کی روشنی ساری
 چیزیں بے نقاب کر دیتی ہے۔ وہ سامنے کلن اپنی بیوی کی چھاتیاں دبا رہا ہے۔ وہ
 کونے میں اس کا بھائی گاما لینا ہے۔ تہہ بند کلن کر ایک طرف پڑا ہے۔ ادھر عیدو
 حلوائی کی کنواری بیٹی شاداں کا پیٹ چھدرے ٹاٹ سے جھانک جھانک کر دیکھ رہا
 ہے۔

شادی کا دن آیا تو بھولو کا جی چاہا کہ وہ کہیں بھاگ جائے مگر کہاں جاتا۔ اب تو
 وہ جکڑا جا چکا تھا۔ غائب ہو جاتا تو صدمہ ضرور خود کشی کر لیتا۔ اس کی لڑکی پر جانے کیا
 گزرتی جو طوفان مچتا وہ الگ۔

”اچھا جو ہوتا ہے ہونے دو..... میرے ساتھی اور بھی تو ہیں آہستہ آہستہ
 عادت ہو جائے گی مجھے بھی“۔ بھولو نے خود کو ڈھارس دی اور اپنی نئی نویلی دلہن کی
 ڈوبلی گھر لے آیا۔

کوارٹروں میں چہل پہل پیدا ہو گئی۔ لوگوں نے بھولا اور گاما کو خوب

مبارکباد دیں دیں۔ بھولو کے جو خاص دوست تھے۔ انہوں نے اس کو چھیڑا اور پہلی رات کے لیے کئی کامیاب گربٹائے۔ بھولو خاموشی سے سنتا رہا۔ اس کی بھابی نے اوپر کوٹھے پر ٹاٹ کے پردوں کے نیچے بستر کا بندوبست کر دیا تھا۔ گاما نے چار موٹے کے بڑے بڑے ہار تکیے کے پاس رکھ دیے۔ ایک دوست اس کے لیے جلیبیوں والا دو دھلے آیا۔

دیر تک وہ نیچے کوارٹر میں اپنی دلہن کے پاس بیٹھا رہا۔ وہ بے چاری شرم کی ماری سر نیوڑھائے گھونگھٹ کاڑھے سمٹی ہوئی تھی۔ سخت گرمی تھی۔ بھولو کانپا کرتا اس کے جسم کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ پنکھا جھل رہا تھا۔ مگر ہوا جیسے بالکل غائب ہی ہو گئی تھی۔ بھولو نے پہلے سوچا تھا کہ وہ اوپر کوٹھے پر نہیں جائے گا نیچے کوارٹر ہی میں ساری رات کالے لگا مگر جب گرمی انتہا کر پہنچ گئی تو وہ اٹھا اور دلہن سے چلنے کو کہا۔ رات آدھی سے زیادہ ہو چکی تھی۔ تمام کوارٹر خاموشی میں لپٹے ہوئے تھے۔ بھولو کو اس بات کی تسکین تھی کہ سب سو رہے ہوں گے۔ کوئی اسکو نہیں دیکھے گا۔ چپ چاپ وہ قدموں سے وہ اپنے ٹاٹ کے پردے کے پیچھے اپنی دلہن سمیت داخل ہو جائے گا۔ اور صبح منہ اندھیرے نیچے اتر جائے گا۔

جب وہ کونچھی پر پہنچا تو بالکل خاموشی تھی۔ دلہن نے شرمائے ہوئے قدم اٹھائے تو پازیب کے نظر نے گھٹکھٹکھٹو بجنے لگے۔ ایک دم بھولو نے محسوس کیا کہ چاروں طرف جو نیند بکھری ہوئی تھی چونک کر جاگ گئی ہے۔ چار پانیوں پر لوگ کروٹیں بدلنے لگے۔ کھانسنے کھٹکھٹانے کی آوازیں ادھر ادھر ابھریں۔ دہنی دہنی سرگوشیاں اس تپتی ہوئی فضا میں تیرنے لگیں۔ بھولو نے گھبرا کر اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑا

اور تیزی سے ٹاٹ کی اوٹ میں پھانسیا گیا۔ دہنی دہنی ہنسی کی آواز اس کے کانوں کے ساتھ لگرائی۔ اس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ بیوی سے بات کی تو پاس ہی کھسر پھسر شروع ہو گئی۔ دور کوٹنے میں جہاں کلن کی جگہ تھی وہاں پر چار پانی پر چہ چوں چہ چوں ہونے لگی۔ یہ دیکھی پڑی تو گاما کی لوہے کی چار پانی بولنے لگی..... عیدو حلوانی کی کنواری بیٹی نے دو تین بار اٹھ کر پانی پیا۔ گھرے کے ساتھ اس کا گاہک نکراتا تو ایک چھٹا سا پیدا ہوتا۔ خیرے قصائی کے لڑکے کی چار پانی سے بار بار ماچس جلانے کی آواز آتی تھی۔

بھولوا اپنی دہن سے کوئی بات نہ کر سکا۔ اسے ڈر تھا کہ اس پاس کے کھلے ہوئے کان فوراً اس کی بات سن لیں گے اور ساری چار پائیاں چہ چوں چہ چوں کرنے لگیں گی۔ دم سادھے وہ خاموش لیٹا رہا کبھی کبھی سہمی ہوئی نگاہوں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھ لیتا جو گھڑی سی بنی دوسری چار پانی پر لیٹی تھی۔ کچھ دیر جاگتی رہی پھر سو گئی۔

بھولو نے چاہا کہ وہ بھی سو جائے مگر اس کو نیند نہیں آتی تھی۔ جموڑے جموڑے وقفوں کے بعد اس کے کانوں میں آوازیں آتی تھیں..... آوازیں جو فوراً تصویر بن کر اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر جاتی تھیں۔

اس کے دل میں بڑے بڑے دلو لے تھے۔ بڑا جوش تھا جس اس نے شادی کا ارادہ کیا تھا تو وہ تمام لذتیں جن سے وہ نا آشنا تھا اس کے دل و دماغ میں چکر لگاتی رہتی تھیں۔ اس کو گرمی محسوس ہوتی تھی۔ بڑی راحت بخش گرمی مگر اب جیسے پہلی رات سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔ اس نے رات میں کئی بار یہ دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش

کی مگر آوازیں..... وہ تصویر کھینچنے والی آوازیں سب کچھ درجہ بدرجہم کر دیتیں۔ وہ
کو دیکھنا محسوس کرتا۔ الف بنگا۔ جس کو چاروں طرف سے لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ
کر دیکھ رہے ہیں اور ہنس رہے ہیں۔

صبح چار بجے کے قریب وہ اٹھا اور باہر نکل کر اس نے ٹھنڈے پانی کا ایک
گلاس پیا۔ کچھ سوچا۔ وہ جھجک جو اس کے دل کے اندر بیٹھ گئی تھی اس کو کسی قدر دور
کیا۔ اب ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ جو کافی تیز تھی..... بھولو کی نگاہیں کونے کی
طرف مڑیں کلن کا گھسا ہوا ناٹ بل رہا تھا۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ بالکل ننگ
دھڑنگ لیٹا تھا۔ بھولو کو بڑی گھن آئی۔ ساتھ ہی منہ بھی آیا کہ ہوا ایسے کونٹوں پر
چلتی چلتی ہے تو ناٹوں کو کیوں چھیڑتی ہے۔ اس کے جی میں آئی کہ کوئے پر جتنے
ناٹ ہیں سب نوچ ڈالے اور بنگا ہو کر مرنے لگے۔

بھولو نیچے اتر گیا۔ جب کام پر نکلا تو کئی دوست ملے۔ سب نے اس سے پہلی
رات کی سرگزشت پوچھی پھو بے درزی نے اس کو وہ رہی سے آواز دی ”کیوں
استاد بھولو کیسے رہے کہیں ہمارے نام پر بھ تو نہیں لگا دیا تم نے“۔

چھاگے ٹین باز نے اس سے بڑے راز دارانہ لہجے میں کہا ”دیکھو اگر کوئی گڑبڑ
ہے تو بتا دو۔ ایک بڑا اچھا نسخہ میرے پاس موجود ہے“۔

بالے نے اس کے کاندھے پر زور سے دھپا مارا ”کیوں پہلوان کیسا رہا
دنگل؟“

بھولو خاموش رہا۔

صبح اس کی بیوی میکے چلی گئی۔ پانچ چھ روز بعد آئی تو بھولو کو پھر اسی مصیبت کا

سامنا کرنا پڑا۔ کوئلے پر سونے والے جیسے اس کی بیوی کی آمد کے منتظر تھے۔ چند راتیں خاموشی رہی تھی لیکن جب وہ اوپر سونے تو پھر وہی کھسر پھسر وہی چہ چوں چہ چوں وہی کھانسا کھکا رہا۔۔۔۔۔ وہی گھڑے کے ساتھ گلاس ٹکرانے کے چھٹا کے۔۔۔۔۔ کروٹوں پر کروٹیں۔ دہلی دہلی نہی۔۔۔۔۔ بھولو ساری رات اپنی چارپائی پر لیٹا آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔ کبھی کبھی ایک ٹھنڈی آہ بھر کر اپنی دہن کو دیکھ لیتا اور دل میں کڑھتا ”مجھے کیا ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔“

سات راتوں تک یہی ہوتا رہا۔ آخر تنگ آ کر بھولو نے اپنی دہن کو میٹکے بھیج دیا۔ بیس پچیس دن گزر گئے تو گامانے بھولو سے کہا ”یا تم بڑے عجیب و غریب آدمی ہوئی نئی شادی اور بیوی کو میٹکے بھیج دیا۔ اتنے دن ہو گئے ہیں اسے گئے ہوئے۔ تم اکیلے سوتے کیسے ہو؟“

بھولو نے صرف اتنا کہا ”ٹھیک ہے۔“

گامانے پوچھا ”ٹھیک کیا ہے۔۔۔۔۔ جو بات ہے بتاؤ کیا تمہیں پسند آئی ہے غائش؟“

”یہ بات نہیں“

”یہ بات نہیں ہے تو اور کیا ہے؟“

بھولو بات گول کر گیا مگر جھوڑے ہی دنوں کے بعد اس کے بھائی نے پھر بات چھیڑی۔ بھولو اٹھ کر کوارٹر کے باہر چلا گیا۔ چارپائی پر ہی تھی اس پر بیٹھ گیا۔ اندر سے اس کو اپنی بھابی کی آواز سنائی دی۔ وہ گاما سے کہہ رہی تھی ”تم جو کہتے ہو نا کہ

بھولو کو عائشہ پسند نہیں آئی غلط ہے۔“

گاما کی آواز آئی ”تو اور کیا بات ہے..... بھولو کو اس سے کوئی دلچسپی ہی نہیں۔“
”دلچسپی کیا ہو؟“

”کیوں؟“

گاما کی بیوی کا جواب بھولو نہ سن سکا مگر اس کے باوجود اس کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کی ساری ہستی کسی نے ہاؤن میں ڈال کر کوٹ دی ہے۔ ایک دم گاما اونچی آواز میں بولا ”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ یہ تم سے کس نے کہا؟“
گاما کی بیوی بولی ”عائشہ نے اپنی کسی سہیلی سے ذکر کیا..... بات اڑتی اڑتی مجھ تک پہنچ گئی۔“

بڑی صدمہ زدہ آواز میں گاما نے کہا ”یہ تو بہت برا ہوا۔“

بھولو کے دل میں چھری سی پیوست ہو گئی۔ اس کا دماغی توازن بگڑ گیا۔ اٹھا اور کوٹھے پر چڑھ کر جتنے ٹاٹ تھے اکھیڑنے شروع کر دیے۔ کھٹ کھٹ پھٹ پھٹ سن کر لوگ جمع ہو گئے۔ انہوں نے اس کو روکنے کی کوشش کی تو وہ لڑنے لگا۔ بات بڑھ گئی۔ کلن نے بانس اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔ بھولو چکرا کر گر ا اور بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو اس کا دماغ چل چکا تھا۔
اب وہ الف ہنگا بازاروں میں گھومتا پھرتا ہے کہیں ٹاٹ لٹکا دیکھتا ہے تو اس کو اتار کر نکلے نکلے کر دیتا ہے۔

☆☆☆

نیا سال

کیلنڈر کا آخری پتا جس پر مونے حروف میں 31 دسمبر چھپا ہوا تھا ایک لمحہ کے اندر اس کی پتلی انگلیوں کی گرفت میں تھا۔ اب کیلنڈر ایک ٹنڈ منڈ درخت سا نظر آنے لگا۔ جس کی ٹہنیوں پر سے سارے پتے خزاں کی پھونکوں نے اڑا دیے ہوں۔

دیوار پر آویزاں کلاک ٹک ٹک کر رہا تھا۔ کیلنڈر کا آخری پتا جو ڈیرہ صرب پر کانڈ کا ایک ٹکڑا تھا اس کی پتلی انگلیوں میں یوں کانپ رہا تھا گویا سزائے موت کا قیدی پھانسی کے سامنے کھڑا ہے۔

کلاک نے بارہ بجائے پہلی ضرب پر انگلیاں متحرک ہوئیں اور آخری ضرب پر کانڈ کا وہ ٹکڑا ایک ننھی سی گولی بنا دیا گیا۔ انگلیوں نے یہ کام بری بے رحمی سے کیا اور جس شخص کی یہ انگلیاں تھیں اور بھی زیادہ بے رحمی سے اس گولی کو نگل گیا۔

اس کے لبوں پر ایک تیزابی مسکراہٹ پیدا ہوئی اور اس نے خالی کیلنڈر کی طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھا اور کہا ”میں تمہیں کھا گیا ہوں..... بغیر چبائے نگل گیا ہوں۔“

اس کے بعد ایک ایسے قہقہے کا شور بلند ہوا جس میں ان توپوں کی گونج دب گئی جو نئے سال کے آغاز پر داغی جا رہی تھیں۔

جب تک ان توپوں کا شور جاری رہا اس کے سوکھے ہوئے حلق سے قہقہے آتھیں اوڑے کی طرح نکلتے رہے وہ بے حد خوش تھا بے حد خوش یہی وجہ تھی کہ اس

پر دیوانگی کا عالم طاری تھا۔ اس کی مسرت آخری درجہ پر پہنچی ہوئی تھی وہ سارے کا سارا ہنس رہا تھا۔ مگر اس کی آنکھیں رو رہی تھیں اور جب اس کی آنکھیں بستیں تو آپ اس کے سگڑے لبوں کو دیکھ کر یہی سمجھتے کہ اس کی روح کسی نہایت ہی سخت عذاب میں سے گزر رہی ہے۔

بار بار وہ نعرہ بلند کرتا ”میں تمہیں کھا گیا ہوں..... بغیر چبائے نگل گیا ہوں۔ ایک ایک کر کے تین سو چھیاسٹھ دنوں کو لپ دن سمیت۔“

خانی کیلنڈراس کے اس عجیب و غریب دعوے کی تصدیق کر رہا تھا۔

آج سے ٹھیک چار برس پہلے جب وہ اپنے کاندھوں پر مسیبتوں کا پھاڑاٹھا کر اپنی روٹی آپ مانے کے لیے میدان میں نکلا تو کتنے آدمیوں نے اس کا منہ کھٹکھٹایا تھا..... کتنے لوگ اس کی ہمت پر زیر لب ہنسے تھے۔ مگر اس نے ان باتوں کی کوئی پروا نہ کی تھی۔ اور اسے اب بھی کسی کی کیا پروا تھی اس کو صرف اپنے آپ سے غرض تھی اور بس دوسروں کی جنت پر وہ ہمیشہ اپنی دوزخ کو ترجیح دیتا رہا تھا۔ اور اب بھی اسی چیز پر پابند تھا۔ وہ ان دنوں گدھوں کی سی مشقت کر رہا تھا۔ کتوں سے بڑھ کر ذلیل زندگی بسر کر رہا تھا۔ مگر یہ چیزیں اس کے راستے میں حائل نہ ہوتی تھیں۔

کئی بار اسے ہاتھ پھیلاتا پڑا..... اس نے ہاتھ پھیلایا لیکن ایک شان کے ساتھ..... وہ کہا کرتا تھا ”یہ سب بھکاری جو سڑکوں پر جھولیاں پھیلائے اور کھٹکھٹاتے بڑھائے پھرتے ہیں گولی مار کر اڑا دینے چاہئیں..... بھیک لے کر یہ ذلیل کتے شکر گزرا نظر آتے ہیں۔ حالانکہ انہیں شکر یہ گالیوں سے ادا کرنا چاہیے۔ جو بھیک

ماتلتے ہیں وہ اسنے لعنتی نہیں جتنے کہ یہ لوگ جو دیتے ہیں۔ وہ ان پن کے طور پر.....
جنت میں ایک ٹھنڈی کوٹھڑی بک کرنے والے سوداگر!

اس کو کوئی مرتبہ روپے پیسے کی امداد حاصل کرنے کی خاطر شہر کے دھنواؤں کے پاس جانا پڑا..... اس نے ان دو ٹمنڈوں سے امداد حاصل کی..... ان کی کمزوریاں انہی کے پاس بچ کر..... اور اس نے یہ سودا کبھی انارڈی دکاندار کی خاطر نہیں کیا۔

آپ شہر کی صحت کے محافظ مقرر کیے گئے ہیں لیکن درحقیقت آپ بیماریاں فراہم کرنے کے ٹھیکیدار ہیں۔ حکومت کی کتابوں میں آپ کے نام کے سامنے ہیلتھ آفیسر لکھا جاتا ہے۔ مگر میری کتاب میں آپ کا نام امراض فروشو کی فہرستوں میں درج ہے..... پرسوں مارکیٹ میں آپ نے سگستروں کے دو سو نوکرے پاس کر کے بھجوائے جو طبی اصول کے مطابق صحت عامہ کے لیے سخت مضر تھے۔ دس روز پہلے آپ نے قریباً دو ہزار کیلوں پر اپنی آنکھیں بند کر لیں جن میں سے ہر ایک ہیضہ کی پڑیا تھا اور آج آپ نے اس بوسیدہ اور غلیظ عمارت کو بچالیا جہاں بیماریاں پرورش پاتی ہیں اور.....

اسے عام طور پر آگے کہنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی تھی اس لیے کہ اس کا سودا بہت کم گفتگو ہی سے طے ہو جاتا تھا۔

وہ ایک سستے اور بازاری قسم کے اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ جس کی اشاعت دو سو سے زیادہ نہ تھی..... دراصل وہ اشاعت کا قائل ہی نہ تھا..... وہ کہا کرتا تھا ”جو لوگ اخبار پڑھتے ہیں بے وقوف ہیں اور جو لوگ اخبار پڑھ کر اس میں لکھی باتوں پر

یقین کرتے ہیں۔ سب سے بڑے بے وقوف ہیں۔ جن لوگوں کی اپنی زندگی ہنگامے سے پر ہوان کو ان چھپے ہوئے چیتروں سے کیا مطلب؟“

وہ اخبار اس لیے نہیں نکالتا تھا کہ اسے مضامین لکھنے کا شوق تھا یا وہ اخبار کے ذریعے سے شہرت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ نہیں بالکل نہیں..... ایک دو گھنٹے کی مصروفیت کے سوا جو اس کے اخبار کی اشاعت کے لیے ضروری تھی وہ اپنا بقیہ وقت ان خوابوں کی تعبیر دیکھنے میں گزارا کرتا تھا جو ایک زمانے سے اس کے ذہن میں موجود تھے۔ وہ اپنے لیے ایک ایسا مقام بنانا چاہتا تھا جہاں اسے کوئی چھیڑ نہ سکے..... جہاں وہ اطمینان حاصل کر سکے۔ خواہ وہ دو سینڈ ہی کا کیوں نہ ہو۔

”جنگ کے میدان میں فتح بر لب گورہی نصیب ہو۔ مگر ہو ضرور..... اور اگر شکست ہو جائے تو پٹنا پرے تو بھی کیا ہرج ہے..... شکست کھائیں گے لیکن فتح حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے..... موت ان کی ہے جو موت سے ڈر کر جان دیں اور جو زندہ رہنے کی کوشش میں موت سے لپٹ جائیں زندہ ہیں اور ہمیشہ رہیں گے کم از کم اپنے لیے۔“

دنیا اس کے خلاف تھی۔ جو شخص بھی اس سے ملتا تھا اس سے نفرت کرتا تھا۔ وہ خوش تھا۔ نفرت میں محبت سے زیادہ تیزی ہوتی ہے..... اگر سب لوگ مجھ سے محبت کرنا شروع کر دیں گے تو میں اس پیسے کی مانند ہو جاؤں جس میں اندر باہر اوپر نیچے سب جگہ تیل دیا گیا ہو..... میں کبھی اس گاڑی کو آگے نہ دھکیل سکوں گا جسے لوگ زندگی کہتے ہیں۔

قریب قریب سب اس کے خلاف تھے اور وہ اپنے ان مخالفین کی طرف یوں

دیکھا کرتا تھا گویا وہ موٹر کے انجن میں لگے ہوئے پرزوں کو دیکھ رہا ہے۔
 ”یہ کبھی ٹھنڈے نہیں ہونے چاہئیں۔“

اور اس نے اب تک ان کو ٹھنڈا نہ ہونے دیا تھا۔ وہ اس الاؤ کو جلائے رکھتا تھا۔ جس پر وہ ہاتھ تپ کر اپنا کام کیا کرتا تھا۔ جس روز وہ اپنے مخالفین میں کسی نے آدمی کا اضافہ کرتا تو اپنے دل سے کہا کرتا تھا ”آج میں نے الاؤ میں ایک اور سوکھی لکری جھونک دی ہے جو دیر تک جلتی رہے گی۔“

اس کے ایک مخالف نے جلسے میں اس کے خلاف بہر زہرا گلا اس کو بہت برا بھلا کہا۔ حتیٰ کہ اسے نکلی گالیاں بھی دیں۔ اس کے مخالف کا خیال تھا کہ یہ سب کچھ سن کر اسے نیند نہ آئے گی مگر اس کے برعکس وہ تو اس روز معمول کے خلاف بہت آرام سے سویا اور اسے خود ساری رات آنکھوں میں کانٹا پڑی۔ شب بھر اس کا ضمیر اسے ستاتا رہا حتیٰ کہ صبح اٹھ کر وہ اس کے پاس آیا اور بڑے ندامت بھرے لہجہ میں اس سے معذرت طلب کی۔

”مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے آپ جیسے بلند اخلاق انسان کو برا بھلا کہا۔ گالیاں دیں۔ دراصل میں نے یہ سب کچھ جلد بازی میں کیا۔ سوچے سمجھے بغیر۔۔۔۔۔ مجھے اکسایا گیا تھا۔ میں اپنے کیے پر تادم ہوں اور مجھے امید ہے کہ آپ مجھے معاف فرمادیں گے۔ مجھ سے سخت غلطی ہوئی۔“

بلند اخلاق۔۔۔۔۔ اسے اس لفظ اخلاق سے بہت چڑھتی۔۔۔۔۔ اخلاق۔۔۔۔۔ رخ انسانیت کا ناز۔۔۔۔۔ اخلاق۔۔۔۔۔ اخلاق، اخلاق۔۔۔۔۔ یعنی چہ؟ یہ نہ کرو وہ نہ کرو کی بے معنی گردان۔۔۔۔۔ انسان کی آزادانہ سرگرمیوں پر بٹھایا ہوا سنسر۔

اس کو معلوم تھا کہ اس کے کمزور دل مخالف نے جھوٹ بولا ہے۔ مگر نامعلوم اس کے دل میں کیوں غصہ پیدا نہ ہوا..... بخلاف اس کے اسے ایسا محسوس ہوا کہ جو شخص اس کے سامنے بیٹھا معافی مانگ رہا ہے اس کی کوئی نہایت ہی عزیز شے فنا ہو گئی ہے۔ وہ نہایت درجہ بے رحم تصور کیا جاتا تھا اور اصل میں وہ تھا بھی بے رحم نرم و نازک جذبات سے اس کا سینہ بالکل پاک تھا۔ مگر آج اس پتھر پر اسے کوئی چیز رہتی ہوئی نظر آئی۔ اسے اس شخص پر رحم آنے لگا۔

”آج تم روحانی طور پر مر گئے ہو..... اور مجھے تمہاری اس موت پر افسوس ہے۔“

یہ سن کر اس کے مخالف کو پھر گالیاں دینا پڑیں مگر اس کے کانوں تک کوئی آواز نہ پہنچ سکی۔ مدت ہوئی وہ اس کو کسی دور دراز قبرستان میں دفن کر چکا تھا۔

چار برس سے وہ اسی طرح جی رہا تھا زبردستی دنیا کی مرضی کے خلاف..... بہت سی قوتیں اس کو پسپا کر دینے پر تلی رہتی تھیں مگر وہ اپنے وجود کا ایک ذرہ بھی جنگ کے بغیر ان کے حوالے کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ جنگ..... جنگ..... ہر مخالف قوت کے خلاف جنگ۔ رحم و ترحم سے نا آشنائی۔ عشق و محبت سے پرہیز۔ امید خوف اور استقبال سے بیگانگی..... اور پھر جو ہو سو ہو۔

چار برس سے وہ زمانے کی تیز و تند ہوا میں ایک تناور اور مضبوط درخت کی طرح کھڑا تھا۔ موسموں کے تغیر و تبدل نے ممکن ہے اس کے جسم پر اثر کیا ہو مگر اس کی روح پر ابھی تک کوئی چیز اثر انداز نہ ہو سکی تھی..... وہ ابھی تک ویسی ہی تھی جیسی کہ آج سے چار برس پہلے تھی فوٹا کی طرح سخت یہ سختی قدرت کی طرف سے

عطا کی گئی تھی بلکہ خود اس نے پیدا کی تھی۔

وہ کہتا تھا ”نرم و نازک روح کو اپنے سینے میں دبا کر تم زمانے کی پتھریلی زمین پر نہیں چل سکو گے۔ جو پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر کاٹنا چاہے اسے پاگل خانے میں بند کر دینا چاہیے۔“

شاعرانہ خیالات کو اس نے اپنے دماغ میں کبھی داخل نہ ہونے دیا تھا اور اگر کبھی کبھار غیر ارادی طور پر وہ اس کے دماغ میں پیدا ہو جاتے تھے تو وہ ان ”حرامی بچوں“ کا فوراً گلا گھونٹ دیا کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا ”میں ان بچوں کا باپ نہیں بننا چاہتا جو میرے کاندھوں کا بوجھ بن جائیں۔“

اس نے اپنے ساز حیات سے ساری طریقیں اتار دی تھیں۔ اس نے اس میں سے وہ تمام تار نوچ کر باہر نکال دیے تھے جن میں سے نرم و نازک سر نکلتے ہیں۔ زندگی کا صرف ایک راز ہے اور وہ راز ہے..... جو آگے بڑھنے حملہ کرنے مرنے اور مارنے کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ اس کے سوا باقی تمام راگنیاں فضول ہیں جو اعضا پر تھکاوٹ طاری کرتی ہیں۔“

اس کا دل شباب کے باوجود عشق و محبت سے خالی تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے سے ہزار باخوبصورت لڑکیاں اور عورتیں گزر چکی تھیں مگر ان میں سے کسی ایک نے بھی اس کے دل پر اثر نہ کیا تھا وہ کہا کرتا تھا ”اس پتھر میں عشق کی جو تک نہیں لگ سکتی۔“

وہ اکیلا تھا..... بالکل اکیلا..... کھجور کے درخت کی مانند جو کسی تپتے ہوئے ریگستان میں تنہا کھڑا ہو..... مگر وہ اس تنہائی سے کبھی نہ گھبرایا تھا۔ دراصل وہ کبھی تنہا

رہتا ہی نہ تھا۔

”جب کام میں مشغول ہوتا ہوں تو وہی میرا ساتھی ہوتا ہے اور جب میں اس سے فارغ ہو جاتا ہوں تو میرے دوسرے خیالات و افکار میرے گرد و پیش جمع ہو جاتے ہیں۔ میں ہمیشہ اپنے دوستوں کے جھمکنے میں رہتا ہوں۔“

وہ اپنے دن یوں بسر کرتا تھا جیسے آم کھا رہا ہے۔ شام کو جب وہ بستر پر دراز ہوتا تو تو ایسا محسوس کیا کرتا تھا کہ اس نے دن کو چوسی ہوئی گتھلی کے مانند پھینک دیا ہے۔ اگر آپ اس کے کمرے کی ایک دیوار ہوتے تو کئی بار آپ کے ساتھ یہ الفاظ نکلرتے جو کبھی کبھی سوتے وقت اس کی زبان سے نکلا کرتے تھے ”آج کا دن کتنا کٹھا تھا اس برس کے نوکرے میں اگر بھلیا دن بھی اس قسم کے ہوئے تو مزہ آ جائے گا۔“

اور راتیں..... خواہ تار یک ہوں یا منور اسکی نظر میں داشتائیں تھیں۔ جن کی وہ رو وطلوع آفتاب کے ساتھ ہی بھول جاتا تھا۔

چار برس سے وہ اسی طرح زندگی بسر کر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک اونچے چوڑے پر بیٹھا ہے۔ ہاتھ میں ہتھوڑا لیے۔ زمانے کا اپنی فیتہ اس سے سامنے سے گزر رہا ہے اور وہ اس فیتے پر ہتھوڑے کی ضربوں سے ٹھپہ لگائے جا رہا ہے۔ ایک دن جب گزرنے لگتا ہے تو وہ فیتے کو تھوڑی دیر کے لیے تھام لیتا ہے اور پھر اسے چھو کر کہتا ہے ”اب جاؤ میں تمہیں اچھی طرح استعمال کر چکا ہوں۔“

بعض لوگوں کو افسوس ہوا کرتا ہے کہ ہم نے فلاں کام فلاں وقت پر کیوں نہیں کیا اور یہ پچھتاوا وہ دیر تک محسوس کیا کرتے ہیں۔ مگر اسے آج تک اس قسم کا

افسوس یا رنج نہیں ہوا..... جو وقت سوچنے میں ضائع ہوتا ہے۔ وہ اس سے بغیر سوچے سمجھے فائدہ اٹھانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ خواہ انجام کار اسے نقصان ہی کیوں نہ پہنچے۔ اگر سوچ کر چلنے ہی میں فائدہ ہوتا تو ان پیغمبروں اور نیکوکاروں کی زندگی تکلیفوں اور ناکامیوں سے بھری ہوئی ہرگز نہ ہوتی جو ہر کام بڑے غور و فکر سے کیا کرتے تھے۔ اگر سوچ بچار کے بعد بھی نقصان ہو۔ یا ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے تو کیا اس سے یہ بہتر نہیں کہ غور و فکر میں پڑنے کے بغیر ہی نتائج کا سامنا کر لیا جائے۔

اسے ان چار برسوں میں ہزار ہا ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ صرف منہ ہی نہیں بلکہ ان کو سر سے پیر تک دیکھنا پڑا تھا۔ مگر وہ اپنے اصول پر اسی طرح قائم تھا جس طرح تندلہروں میں ٹھوس چٹان کھڑی رہتی ہے۔

آج رات بارہ بجے کے بعد نیا سال اس کے سامنے آ رہا تھا اور پرانے سال کو وہ ہضم کر گیا تھا بغیر ڈکار لیے۔

نئے سال کی آمد پر وہ خوش تھا۔ جس طرح اکھارے میں کوئی نامور پہلوان اپنے نئے مد مقابل کی طرف خم ٹھونک کر بڑھتا ہے۔ اسی طرح وہ نئے سال کے مقابلے میں اپنے ہتھیاروں سے لیس ہو کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اب وہ بلند آواز میں کہہ رہا تھا ”میں تم جیسے چار پہلوانوں کو پچھاڑ چکا ہوں۔ اب تمہیں بھی چاروں شانے چیت گرا دوں گا“۔

جی بھر کر خوشیاں منانے کے بعد وہ نئے کیلنڈر کی طرف بڑھا جو میلی دیوار پر اوپر کی طرف سمت رہا تھا۔ تاریخ نما سے اس نے اوپر کا کاغذ ایک جھٹکے سے علیحدہ

کر دیا اور کہا۔ ”ذرا نقاب ہٹاؤ تو..... دیکھوں تمہاری شکل کیسی ہے..... میں ہوں
تمہارا آقا..... تمہارا مالک..... تمہارا سب کچھ۔“ کیم جنوری کی تاریخ کا پتا عریاں
ہو گیا۔ ایک قہقہہ بلند ہوا اور اس نے کہا۔
”کل رات تم فنا کر دیے جاؤ گے۔“

☆☆☆

نیا قانون

منگلو کو چوان اپنے اڈے میں بڑا غفلت انداز میں سمجھا جاتا تھا۔ گواہ کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور اس نے کبھی سکول کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود اسے دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اڈے کے وہ تمام کوچوان جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کہ دنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے استاد منگلو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔

چھپیلے دنوں جب استاد منگلو نے اپنی ایک سواری سے اسپین میں جنگ چھڑ جانے کی افواہ سنی تھی تو اس نے گاماچو دھری کے چوڑے کاندھے پر تھپکی دے کر مدبرانہ انداز میں پیش گوئی کی تھی ”دیکھ لیماچو دھری! تھوڑے ہی دنوں میں اسپین کے اندر جنگ چھڑ جائے گی۔“

اور جب گاماچو دھری نے اس سے یہ پوچھا تھا کہ اسپین کہاں واقع ہے تو استاد منگلو نے بڑی متانت سے جواب دیا ”والایت میں اور کہاں؟“

اسپین میں جنگ چھڑی اور جب ہر شخص کو اس کا پتہ چل گیا تو اسٹیشن کے اڈے میں جتنے کوچوان حلقہ بنائے حقہ پی رہے تھے دل ہی دل میں استاد منگلو کی بڑائی کا اعتراف کر رہے تھے اور استاد منگلو اس وقت مال روڈ کی چمکیلی سطح پر تانگہ چلا رہے ہوئے اپنی سواری سے تازہ ہندو مسلم فساد پر تبادلہ خیال کر رہا تھا۔

اس روز شام کے قریب جب وہ اڈے پر آیا تو اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر متملایا ہوا تھا۔ حقے کا دور چلتے چلتے جب ہندو مسلم فساد کی بات چھڑی تو استاد منگلو

نے سر پر سے خاکی گٹری اتاری اور بغل میں داب کر بڑے منگھرانہ انداز میں کہا:
 ”یہ کسی پیر کی بدعا کا نتیجہ ہے کہ آئے دن ہندوؤں اور مسلمانوں میں چاقو،
 چھریاں چلتے رہتے ہیں۔ اور میں نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ اکبر بادشاہ نے
 کسی درویش کا دل دکھایا تھا اور اس درویش نے جل کر یہ بدعا دی تھی کہ جا
 تیرے ہندوستان میں ہمیشہ فساد ہی ہوتے رہیں گے۔ یہ کہہ کر اس نے ٹھنڈی
 سانس بھری اور پھر حقے کا دم لگا کر اپنی بات شروع کی ”یہ کانگریسی ہندوستان کو آزاد
 کرانا چاہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ لوگ ہزار سال بھی سر پٹکتے رہیں تو بھی کچھ نہ
 ہوگا۔ بری سے بڑی بات ہوگی کہ کانگریز چلا جائے گا اور کوئی اٹلی والا آجائے گا یا وہ
 روس والا جس کی بابت میں نے سنا ہے کہ بہت ٹکڑا آدمی ہے لیکن ہندوستان سدا
 غلام رہے گا۔ ہاں میں یہ کہنا بھول ہی گیا کہ پیر نے یہ بدعا بھی دی تھی کہ
 ہندوستان پر ہمیشہ باہر کے آدمی راج کرتے رہیں گے۔“

استاد منگو کو کانگریزیوں سے بڑی نفرت تھی اور اس نفرت کا سبب تو وہ یہ بتلایا
 کرتا تھا کہ وہ اس کے ہندوستان پر اپنا سکہ چلاتے ہیں اور طرح طرح کے ظلم
 ڈھاتے ہیں مگر اس کے تنفر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورے اسے
 بہت ستایا کرتے تھے۔ وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے گویا وہ ایک ذلیل
 کتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے ان کا رنگ بھی بالکل پسند نہ تھا۔ جب کبھی وہ گورے
 کے سرخ و سپید چہرے کو دیکھتا تو اسے متلی سی آ جاتی۔ نہ معلوم کیوں۔ وہ کہا کرتا تھا
 کہ ان کے اہل جھریوں بھرے چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آ جاتی ہے جس کے
 جسم پر سے اوپر کی جھلی گل گل کر جھڑ رہی ہو۔

جب کسی شرابی گورے سے اس کا جھگڑا ہو جاتا تو سارا دن اس کی طبیعت مکدر رہتی اور وہ شام کو اڈے میں آکر بل مارکہ سگریٹ پیتے یا حقے کے کش لگاتے ہوئے اس گورے کو جی بھر کا سنایا کرتا۔

”.....“ یہ موٹی گالی دینے کے بعد وہ اپنے سر کو ڈھیلی پگڑی سمیت جھٹکاوے کر کہا کرتا تھا ”آگ لینے آئے تھے اب گھر کے مالک ہی بن کے بیٹھ گئے۔ تاک میں دم کر رکھا ہے ان بندروں کی اولاد نے یوں رعب گانٹتے ہیں گویا ہم ان کے باوا کے نوکر ہیں۔“

اس پر بھی اس کا قصہ ٹھنڈا نہیں ہوتا تھا۔ جب تک اس کا کوئی ساتھی اس کے پاس بیٹھا رہتا وہ اپنے سینے کی آگ اگلتا رہتا۔

”شکل دیکھتے ہو تا تم اس کی..... جیسے کوڑھ ہو رہا ہے..... بالکل مردار ایک دھچے کی مار اور پٹ پٹ گٹ پٹ یوں بک رہا تھا جیسے ماری ڈالے گا۔ تیری جان کی قسم پہلے پہل جی میں آئی کہ ملعون کی کھوپڑی کے پرزے اڑادوں لیکن اس خیال سے ٹل گیا کہ اس مردہ کو مارنا اپنی ہتک ہے.....“ یہ کہتے کہتے وہ جموڑی دیر کے لیے خاموش ہو جاتا اور تاک کو خاکی قمیص کی آستین سے صاف کرنے کے بعد پھر بڑبڑانے لگ جاتا:

”قسم ہے بھگوان کی ان لاث صاحبوں کے ناز اٹھاتے اٹھاتے تک آگیا ہوں۔ جب کبھی ان کا منہ چہرہ دیکھتا ہوں تو رگوں میں خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ کوئی نیا قانون و انون بنے تو ان لوگوں سے نجات ملے۔ تیری قسم جان میں جان آئے۔“

اور جب ایک روز استاد منگو نے کچہری سے اپنے تانگے پر دو سواریاں لادیں اور ان کی گفتگو سے اسے پتہ چلا کہ ہندوستان میں جدید آئین کا نفاذ ہونے والا ہے تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

دو مارواڑی جو کچہری میں اپنے دیوانی مقدمے کے سلسلے میں آئے تھے۔ گھر جاتے ہوئے جدید آئین یعنی انڈیا ایکٹ کے متعلق آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔

”سنا ہے کہ پہلی اپریل سے ہندوستان میں نیا قانون چلے گا۔ کیا ہر چیز بدل جائے گی؟“

”ہر چیز تو نہیں بدلے گی مگر کہتے ہیں کہ بہت کچھ بدل جائے گا اور ہندوستانوں کو آزادی مل جائے گی۔“

”کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا؟“

”یہ پوچھنے کی بات ہے کل کسی وکیل سے دریافت کریں گے۔“

ان مارواڑیوں کی بات چیت استاد منگو کے دل میں ناقابل بیان خوشی پیدا کر رہی تھی۔ وہ اپنے گھوڑے کو ہمیشہ گالیاں دیتا تھا اور چابک سے بری طرح چٹا کرتا تھا مگر اس روز وہ بار بار پیچھے مڑ کر مارواڑیوں کی طرف دیکھتا اور اپنی بڑھتی ہوئی مونچھوں کے بال ایک انگلی سے بڑی صفائی کے ساتھ اونچے کر کے گھوڑے کی پیٹھ پر باگیں ڈھیلی کرتے ہوئے بڑے پیار سے کہتا ”چل بیٹا! چل بیٹا..... ذرا ہوا سے باتیں کر کے دکھا۔“

مارواڑیوں کو ان کے ٹھکانے پر پہنچا کر اس نے انارکلی میں دینو حلوئی کی دکان

پر آدھ سیر دی کی لسی پی کر ایک بڑی ڈکار لی اور مونچھوں کو منہ میں دبا کر ان کو چوستے ہوئے ایسے ہی بلند آواز میں کہا ”بٹ تیری ایسی کی تیری“۔

شام کو جب وہ اڈے کو لوٹا تو خلاف معمول اسے وہاں اپنی جان پہچان کا کوئی آدمی نہ مل سکا۔ یہ دیکھ کر اس کے سینے میں ایک عجیب و غریب طوفان برپا ہو گیا۔ آج وہ ایک بڑی خبر اپنے دوستوں کو سنانے والا تھا..... بہت بڑی خبر اور اس خبر کو اپنے اندر سے باہر نکالنے کے لیے وہ سخت مجبور ہو رہا تھا لیکن وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔

آدھ گھنٹے تک وہ چابک بغل میں دبائے سٹیشن کے اڈے کی گھنی چھت کے نیچے بے قراری کی حالت میں ٹہکتا رہا۔ اس کے دماغ میں برے اچھے اچھے خیالات آرہے تھے۔ نئے قانون کے نفاذ کی خبر نے اس کو ایک نئی دنیا میں لاکر کھڑا کر دیا تھا۔ وہ اس نئے قانون کے متعلق جو پہلی اپریل کو ہندوستان میں نافذ ہونے والا تھا اپنے دماغ کی تہاتریاں روشن کر کے غور و فکر کر رہا تھا۔ اس کے کانوں میں مارواڑی کا یہ اندیشہ ”کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا؟“ بار بار گونج رہا تھا اور اس کے تمام جسم میں مسرت کی ایک لہر دوڑا رہا تھا۔ کئی بار اپنی گھنی مونچھوں کے اندر ہنس کر اس نے ان مارواڑیوں کو گالی دی..... ”غریبوں کی کھٹیا میں گھسے ہوئے کھٹل..... نیا قانون ان کے لیے کھولتا ہوا پانی ہوگا“۔

وہ بے حد مسرور تھا۔ خاص کر اس وقت اس کے دل کو بہت ٹھنڈک پہنچتی۔ جب وہ خیال کرتا کہ گوروں..... سفید چوہوں (وہ ان کو اسی نام سے یاد کیا کرتا تھا) کی جمو تھنیاں نئے قانون میں آتے ہی ہمیشہ کے لیے یلوں میں غائب ہو

جائیں گی۔

جب تھوگنجا پگڑی بغل میں دبائے اڈے میں داخل ہوا تو استاد منگو بڑھ کر اس سے ملا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بلند آواز سے کہنے لگا۔ ابا ہاتھ ادھر..... ایسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے..... تیری اس گنجی کھوپڑی پر بال اگ آئیں۔“

یہ کہہ کر منگو نے بڑے..... مزے لے لے کر نئے قانون کے متعلق اپنے دوست سے باتیں شروع کر دی دوران گفتگو اس نے کئی مرتبہ تھوگنجا کے سر پر زور سے اپنا ہاتھ مار کر کہا ”تو دیکھتا رہ کیا بنتا ہے۔ یہ روس والا بادشاہ کچھ نہ کچھ ضرور کر کے رہے گا۔“

استاد منگو موجودہ سوویت نظام کی اشتراکی سرگرمیوں کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا اور اسے وہاں کے نئے قانون اور دوسری چیزیں بہت پسند تھیں۔ اسی لیے اس نے ”روس والے بادشاہ“ کو ”انڈیا ایکٹ“ یعنی جدید آئین کے ساتھ ملا دیا اور پہلی اپریل کو پرانے نظام میں جو نئی تبدیلیاں ہونے والی تھیں۔ وہ انہیں ”روس والے بادشاہ“ کے اثر کا نتیجہ سمجھتا تھا۔

کچھ عرصے سے پشاور اور دیگر شہروں میں سرخ پوشوں کی تحریک جاری تھی۔ استاد منگو نے اس تحریک کو اپنے دماغ میں روس والے بادشاہ اور پھر نئے قانون کے ساتھ غلط ملط کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ جب کبھی وہ کسی سے سنتا کہ فلاں شہر میں اتنے بم ساز پکڑے گئے ہیں۔ یا فلاں جگہ اتنے آدمیوں پر بغاوت کا الزام میں مقدمہ چلایا گیا ہے۔ تو ان تمام واقعات کو نئے قانون کا پیش خیمہ سمجھتا اور دل ہی

دل میں بہت خوش ہوتا تھا۔

ایک روز اس کے تانگے میں دو بیرسٹر بیٹھے نئے آئین پر بڑے زور سے تنقید کر رہے تھے اور وہ خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ان میں سے ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا:

”جدید آئین کا دوسرا حصہ فیڈریشن ہے جو میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا۔ ایسی فیڈریشن دنیا کی تاریخ میں آج تک نہ دیکھی گئی ہے۔ سیاسی نظریہ کے اعتبار سے بھی یہ فیڈریشن بالکل غلط ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ کوئی فیڈریشن ہے ہی نہیں۔“

ان بیرسٹروں کے درمیان جو گفتگو ہوئی چونکہ اس میں بیشتر الفاظ انگریزی میں تھے اس لیے استاد منگو صرف اوپر کے کئی ہی کو کسی قدر سمجھا اور اس نے خیال کیا کہ یہ لوگ ہندوستان میں نئے قانون کی آمد کو برا سمجھتے ہیں اور نہیں چاہتے ہیں ان کا وطن آزاد ہو۔ چنانچہ اس خیال کے زیر اثر اس نے کئی مرتبہ ان دو بیرسٹروں کو حقارت بھری نظروں سے دیکھ کر دل ہی دل میں کہا ”ٹوڈی بچے!“

جب کبھی وہ کسی کو دہی زبان میں ”ٹوڈی بچے“ کہتا تو دل میں یہ محسوس کر کے بڑا خوش ہوتا تھا کہ اس نے اس نام کو صحیح جگہ استعمال کیا ہے اور یہ کہ وہ شریف آدمی اور ”ٹوڈی بچے“ میں تمیز کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

اس واقعے کے تیسرے روز وہ گورنمنٹ کالج کے تین طلباء کو اپنے تانگے میں بٹھا کر مزنگ جا رہا تھا کہ اس نے ان تین لڑکوں کو آپس میں باتیں کرتے سنا:

”نئے آئین نے میری امید بڑھا دی ہے..... صاحب اسمبلی کے ممبر ہو گئے تو

کسی سرکاری دفتر میں ملازمت ضرور مل جائے گی۔
 ”ویسے بھی بہت سی جگہیں نکلیں گی۔ شاید اسی گڑبڑ میں ہمارے ساتھ کبھی کچھ
 آجائے۔“

”ہاں..... ہاں..... کیوں نہیں۔“

وہ بیکار گریجوئیٹ جو مارے مارے پھر رہے ہیں ان میں کچھ تو کمی ہوگی۔
 اس گفتگو نے استاد منگو کے دل میں جدی آئین کی اہمیت اور بھی بڑھادی اور
 وہ اس کو ایسی چیز سمجھنے لگا جو بہت چمکتی ہو۔ ”نیا قانون.....“ وہ دن میں کئی بار
 سوچتا۔ ”یعنی کوئی نئی چیز!“ اور ہر بار اس کی نظروں کے سامنے اپنے گھوڑے کا وہ
 نیا ساز آ جاتا جو اس نے دو برس ہوئے چودھری خدا بخش سے بڑی اچھی طرح
 ٹھونک بجا کر خریدا تھا۔ اس ساز پر جب وہ نیا تھا۔ جگہ جگہ لوہے کی نکل چڑھی ہوئی
 کیلیں چمکتی تھیں اور جہاں جہاں پتیل کا کام تھا۔ وہ تو سونے کی طرح دمکتا تھا۔
 اس لحاظ سے بھی ”نئے قانون“ کا درخشاں دتا ہاں ہونا ضروری تھا۔

پہلی اپریل تک استاد منگو نے جدید آئین کے خلاف اور اس کے حق میں بہت
 کچھ سنا۔ مگر اس کے متعلق جو تصور وہ اپنے ذہن میں قائم کر چکا تھا۔ بدل نہ سکا۔ وہ
 سمجھتا تھا کہ پہلی اپریل کو نئے قانون کے آتے ہی سب معاملہ صاف ہو جائے گا
 اور اس کو یقین تھا کہ اس کی آمد پر جو چیزیں نظر آئیں گی۔ ان سے اس کی آنکھوں
 کو ضرور ٹھنڈک پہنچے گی۔

آخر کار مارچ کے اکتیس دن ختم ہو گئے اور اپریل کے شروع ہونے میں رات
 کے چند خاموش گھنٹے باقی رہ گئے۔ موسم خلاف معمول سرد تھا اور ہوا میں تازگی

تھی۔ پہلی اپریل کو صبح سویرے استاد منگو اٹھا اور اسٹبل میں جا کرتا گئے میں گھوڑے کو جوتا اور باہر نکل گیا۔ اس کی طبیعت آج غیر معمولی طور پر مسرور تھی..... وہ نئے قانون کو دیکھنے والا تھا۔

اس نے صبح کے سرد و ہند کے میں کئی تنگ اور کھلے بازاروں کا چکر لگایا مگر اسے ہر چیز پرانی نظر آئی..... آسمان کی طرح پرانی۔ اس کی نگاہیں آج خاص طور پر نیارنگ دیکھنا چاہتی تھیں مگر سوائے اس کافی کے جو رنگ رنگ کے پروں سے بنی تھی اور اس کے گھوڑے کے سر پر جمی ہوئی تھی اور سب چیزیں پرانی نظر آتی تھیں۔ یہ نئی کافی اس نے نئے قانون کی خوشی میں ۳۱ مارچ کو چودھری خدا بخش سے ساڑھے چودہ آنہ میں خریدی تھی۔

گھوڑے کی ناپوں کی آواز کالی سڑک اور اس کے آس پاس چھوڑا چھوڑا افاصلہ چھوڑ کر لگائے ہوئے بکلی کے کھمبے دکانوں کے بورڈ اس کے گھوڑے کے گلے میں پڑے ہوئے گھنٹھرو کی جھنجھناہٹ بازار میں چلتے پھرتے آدمی..... ان میں سے کون سی چیز نئی تھی؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں لیکن استاد منگو مایوس نہیں تھا۔

”ابھی بہت سویرا ہے دکانیں بھی تو سب بند ہیں“۔ اس خیال سے اسے تسکین تھی۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی سوچتا تھا ”ہائی کورٹ میں نو بجے کے بعد ہی کام شروع ہوتا ہے اب اس سے پہلے نئے قانون کا کیا نظر آئے گا؟“

جب اس کا تانگہ گورنمنٹ کالج کے دروازے کے قریب پہنچا۔ تو کالج کے گھڑیال نے بری رعونت سے نوبجائے۔ جو طلبا کالج کے بڑے دروازے سے باہر نکل رہے تھے خوش پوش تھے۔ مگر استاد منگو کو نہ جانے ان کے کپڑے میلے

سے کیوں نظر آئے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی نگاہیں آج کسی خیرہ کن جلوے کا نظارہ کرنے والی تھیں۔

تائنگے کو دائیں ہاتھ موڑ کر وہ جموڑی دیر کے بعد پھر انا رکلی میں تھا۔ بازار کی آدھی دکانیں کل پکی تھیں اور اب لوگوں کی آمد و رفت بڑھ گئی تھی۔ حلوائی کی دکانوں پر گاہکوں کی خوب بھیڑ تھی۔ منہاری والوں کی نمائشی چیزیں شیشے کی الماریوں میں لوگوں کو دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں اور بنگلی کے تاروں پر کئی کبوتر آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے۔ مگر استاد منگو کے لیے ان تمام چیزوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی..... وہ نئے قانون کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح وہ اپنے گھوڑے کو دیکھ رہا تھا۔

جب استاد منگو کے گھر میں بچہ پیدا ہونے والا تھا۔ تو اس نے چار پانچ مہینے بڑی بے قراری میں گزارے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ بچہ کسی نہ کسی دن ضرور پیدا ہو گا۔ مگر وہ انتظار کی بے قراری نہیں کاٹ سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے بچے کو صرف ایک نظر دیکھ لے۔ اس کے بعد وہ پیدا ہوتا رہے۔ چنانچہ اسی غیر مطلوب خواہش کے زیر اثر اس نے کئی مرتبہ اپنی بیمار بیوی کے پیٹ کو دبا دبا کر اس کے اوپر کان رکھ رکھ کر اپنے بچے کے متعلق کچھ جاننا چاہا تھا مگر ناکام رہا تھا۔ ایک مرتبہ وہ نظارہ کرتے کرتے اس قدر تنگ آ گیا تھا کہ اپنی بیوی پر برس پڑا تھا۔

”تو ہر وقت مردے کی طرح پڑی رہتی ہے۔ اٹھو ذرا چل پھر تیرے انگ میں جموڑی سی طاقت تو آئے۔ یوں تختہ بنے رہنے سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ تو سمجھتی ہے کہ اس طرح لیٹے لیٹے بچہ جن دے گی؟“

استاد منگلو طبعاً بہت جلد باز واقع ہوا تھا۔ وہ ہر سبب کی عملی شکل دیکھنے کا نہ صرف خواہش مند تھا بلکہ تجسس تھا۔ اس کی بیوی گنگا دائی اس کی اس قسم کی بے قرار یوں کو دیکھ کر عام طور پر یہ کہتا کرتی تھی ”ابھی کنواں کھو دیا نہیں گیا اور تم یہ اس سے بے حال ہو رہے ہو“۔

کچھ بھی ہو مگر استاد منگلو نے قانون کے انتظار میں اتنا بے قرار نہیں تھا جتنا کہ اسے اپنی طبیعت کے لحاظ سے ہونا چاہیے تھا۔ وہ آج نئے قانون کو دیکھنے کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے وہ گاندھی یا جواہر لال کے جلوس کا نظارہ کرنے کے لیے نکلتا تھا۔

لیڈروں کی عظمت کا اندازہ استاد منگلو ہمیشہ اس نے جلوس کے ہنگاموں اور ان کے گٹے میں ڈالے ہوئے پھولوں کے باروں سے کیا کرتا تھا۔ اگر کوئی لیڈر گیندے کے پھولوں سے لدا ہو تو استاد منگلو کے نزدیک وہ بڑا آدمی تھا اور اگر کسی لیڈر کے جلوس میں بھیڑ کے باعث دو تین فساد ہوتے ہوتے رہ جائیں تو اس کی نگاہوں میں وہ اور بھر بڑا تھا۔ اب نئے قانون کو وہ اپنے ذہن میں اسی ترازو سے تولنا چاہتا تھا۔

انارکلی سے نکل کر وہ مال روڈ کی چمکیلی سطح پر اپنے تانگے کو آہستہ آہستہ چلا رہا تھا کہ موٹروں کی دکان کے پاس اسے چھاؤنی کی ایک سواری مل گئی۔ گرایہ طے کرنے کے بعد اس نے اپنے گھوڑے کو چابک دکھایا اور رول میں یہ خیال کیا:

”چلو یہ بھی اچھا ہوا..... شاید چھاؤنی سے ہی کچھ نئے قانون کا پتہ چل جائے۔“

چھاؤنی پہنچ کر استاد منگو نے سواری کو اس کی منزل مقصود پر اتار دیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر بائیں ہاتھ کی آخری دو انگلیوں میں دبا کر ساگایا اور اگلی نشست کے گدے پر بیٹھ گیا۔۔۔۔۔ جب استاد منگو کو کسی سواری کی تلاش نہیں ہوتی تھی یا اسے کسی بیتے ہوئے واقعے پر غور کرنا ہوتا تھا تو وہ نام طور پر اگلی نشست چھوڑ کر پچھلی نشست پر بڑے اطمینان سے بیٹھ کر اپنے گھوڑے کی باگیں دائیں ہاتھ کے گرد لپیٹ لیا کرتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کا گھوڑا تھوڑا سا ہنہانے کے بعد بڑی جیسی چال چلنا شروع کر دیتا تھا۔ گویا اسے کچھ دیر کے لیے بھاگ دوڑ سے چھٹی مل گئی ہے۔

گھوڑے کی چال اور استاد منگو کے دماغ کے خیالات کی آمد بہت سست تھی جس طرح گھوڑا آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا۔ اسی طرح استاد منگو کے ذہن میں نئے قانون کے متعلق نئے قیاسات داخل ہو رہے تھے۔

وہ نئے قانون کی موجودگی میں میونسپل کمیٹی سے تاگوں کے نمبر ملنے کے طریقے پر غور کر رہا تھا اور اس قابل غور بات کو آئین کی جدید روشنی میں دیکھنے کی سعی کر رہا تھا۔ وہ اس سوچ بچار میں غرق تھا۔ اسے یوں معلوم ہوا جیسے کسی سواری نے اسے بلایا ہے پیچھے پلٹ کر دیکھنے سے اسے سڑک کے اس طرف دور بکلی کے کھمبے کے پاس ایک ”گورا“ کھڑا نظر آیا جو اسے ہاتھ سے بلارہا تھا۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ استاد منگو کو گوروں سے بے حد نفرت تھی۔ جب اس نے اپنے تازہ گاہک کو گورے کی شکل میں دیکھا تو اس کے دل میں نفرت کے جذبات بیدار ہو گئے۔ پہلے تو اس کے جی میں آئی کہ بالکل توجہ نہ دے اور اس کو چھوڑ

کر چلا جائے مگر بعد میں اس کو خیال آیا ”ان کے پیسے چھوڑنا بھی بے وقوفی ہے۔
کافی پر جو مفت میں ساڑھے چودہ آنے خرچ کر دیے ہیں ان کی جیب سے ہی
وصول کرنے چاہئیں۔ چلو چلتے ہیں۔“

خالی سڑک پر بڑی صفائی سے تانگہ موڑ کر اس نے گھوڑے کو چابک دکھایا اور
آنکھ جھپکنے میں وہ بجلی کے کھمبے کے پاس تھا۔ گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اس نے
تانگہ ٹھہرایا اور پچھلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے پوچھا۔
”صاحب بہادر کہاں جانا مانگتا ہے؟“

اس سوال میں بلا کا طنز یہ انداز تھا۔ صاحب بہادر کہتے وقت اس کا اوپر کا
مونچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھینچ گیا اور پاس ہی گال کے اس طرف جو دم
سی لکیر ناک کے تختے سے جھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آرہی تھی ایک لرزش کے
ساتھ گہری ہو گئی گویا کسی نے نوکیلے چاقو سے شیشم کی سانولی لکڑی میں دھار ڈال
دی ہے۔ اس کا سارا چہرہ ہنس رہا تھا اور اپنے اندر اس نے ”گورے“ کو سینے کی
آگ میں جلا کر بھسم کر ڈالا تھا۔

جب گورے نے جو بجلی کے کھمبے کی اوٹ میں ہوا کا رخ بچا کر سگریٹ ساگرا رہا
تھا مڑ کر تانگے کے پاندان کی طرف قدم بڑھایا تو اچانک استاد منگو کی اور اس کی
ٹکاہیں چار ہوئیں اور ایسا معلوم ہوا کہ بیک وقت آٹھ سائے کی بندھنوں سے
گولیاں خارج ہوئیں اور آپس میں ٹکرائیں آتشیں بگولابن کر اوپر کواڑ گئیں۔

استاد منگو جو اپنے دائیں ہاتھ سے بال کے بل کھول کر تانگے پر سے نیچے
اترنے والا تھا۔ اپنے سامنے کھڑے گورے کو یوں دیکھ رہا تھا گویا وہ اس کے وجود

کے ذرے ذرے کو اپنی نگاہوں سے چبا رہا ہے اور گورا کچھ اس طرح اپنی نیلی پتلون پر سے غیر مرنی چیزیں جھاڑ رہا ہے گویا وہ استاد منگو کے اس حملے سے اپنے وجود کے کچھ حصے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

گورے نے سگریٹ کا دھواں نکالتے ہوئے کہا ”جانا مانگنا یا پھر گڑ بڑ کرے گا؟“

”وہی ہے“ یہ لفظ استاد منگو کے ذہن میں پیدا ہوئے اور اس کی چوڑی چھاتی کے اندر مچنے لگے۔

”وہی ہے“۔ اس نے یہ لفظ اپنے منہ کے اندر ہی اندر دہرائے اور ساتھ ہی اسے پورا یقین ہو گیا کہ وہ گورا جو اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہی ہے۔ جس نے پچھلے برس اس کی جھڑپ ہوئی تھی۔ اور اس خواہ مخواہ کے جھگڑے میں جس کا باعث گورے کے دماغ میں چہرہ ہی ہوئی شراب تھی۔ اسے طوعاً بہت سی باتیں سہنا پڑی تھیں۔ استاد منگو نے گورے کا دماغ درست کر دیا ہوتا بلکہ اس کے پرزے اڑا دیے ہوتے۔ مگر وہ کسی خاص مصلحت کی بنا پر خاموش ہو گیا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس قسم کے جھگڑوں میں عدالت کا نزاع عام طور پر کوچوانوں پر ہی گرتا ہے۔

استاد منگو نے پچھلے برس کی لڑائی اور پہلی اپریل کے نئے قانون پر غور کرتے ہوئے گورے سے کہا ”کہاں جانا مانگنا ہے؟“

استاد منگو کے لہجے میں چابک ایسی تیزی تھی۔

گورے نے جواب دیا ”ہیر امنڈی“۔

”کرا یہ پانچ روپے ہوگا“ استاد منگو کی مونچھیں تھر تھرائیں۔

یہ سن کر گوراجیران ہو گیا۔ وہ چلایا ”پانچ روپے..... کیا تم.....؟“
 ”ہاں..... ہاں..... پانچ روپے“ یہ کہتے ہوئے استاد منگو کا داہنا بالوں بھرا
 ہاتھ بچھ کر ایک وزنی گھونسے کی شکل اختیار کر گیا ”کیوں جاتے ہو یا بیکار کی باتیں
 بناؤ گے؟“

استاد منگو کو لہجہ زیادہ سخت ہو گیا۔

گور اچھلے برس کے واقعے کو پیش نظر رکھ کر استاد منگو کے سینے کی چوڑائی کو نظر
 انداز کر چکا تھا۔ وہ خیال کر رہا تھا کہ اس کی کھوپڑی پھر کھجلا رہی ہے۔ اس حوصلہ
 افزا خیال کے زیر اثر وہ تانگے کی طرف آکر کر بڑھا اور اپنی چھتری سے استاد منگو کو
 تانگے سے نیچے اتارنے کا اشارہ کیا۔ بید کی یہ پالش کی ہوئی پتلی چھری استاد منگو کی
 موٹی ران کے ساتھ دو تین مرتبہ چھوئی۔ اس نے کھڑے کھڑے اوپر سے پست قدم
 گورے کو دیکھا۔ گویا وہ اپنی نگاہوں کے وزن سے ہی اسے پیس ڈالنا چاہتا ہے۔
 پھر اس کا گھونسہ سمان میں سے تیر کی طرح اوپر اٹھا اور چشم زدوں میں گورے کی
 ٹھنڈی کے نیچے جم گیا دھکا دے کر اس نے گورے کو پرے ہٹایا اور نیچے اتر کر اسے
 دھڑا دھڑا پیٹنا شروع کر دیا۔

ششدر و متحیر گورے نے ادھر ادھر سمت کر استاد منگو کے وزنی گھونسوں سے
 بچنے کی کوشش کی اور جب دیکھا کہ اس کے مخالف پر دیوانگی کی کیفیت طاری ہو گئی
 ہے اور اس کی آنکھوں میں شرارے سے برس رہے ہیں تو اس نے زور زور سے
 چلاتا شروع کر دیا۔ اس کی چیخ و پکار نے استاد منگو کی باہوں کا کام اور بھی تیز کر دیا۔
 وہ گورے کو جی بھر کے پیٹ رہا تھا اور ساتھ ساتھ یہ کہتا جاتا تھا:

”پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑ فوں..... پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑ فوں..... اب ہمارا راج ہے بچہ!“

لوگ جمع ہو گئے اور پولیس کے دو سپاہیوں نے بڑی مشکل سے گورے کو استاد منگو کی گرفت سے چھڑایا۔ استاد منگو دو سپاہیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اس کی چوری چھاتی اور پھولی ہوئی سانس کی وجہ سے اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا اور اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے حیرت زدہ مجمع کی طرف دیکھ کر وہ ہانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔

”وہ دن گزر گئے جب ظلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے..... اب نیا قانون ہے میاں نیا قانون!“

اور بے چارہ گورا اپنے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ بے وقوفوں کے مانند کبھی استاد منگو کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی جھوم کی طرف۔

استاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے میں لے گئے۔ راستے میں اور تھانے کے اندر کمرے میں وہ نیا قانون..... نیا قانون چلاتا رہا مگر کسی نے ایک نہ سنی۔

”نیا قانون..... نیا قانون..... کیا بک رہے ہو..... قانون وہی ہے پرانا!“ اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔

☆☆☆

وہ لڑکی

سو بارہ بج چکے تھے لیکن دھوپ میں وہی تمازت تھی جو وہ پہر کو بارہ بجے کے قریب تھی۔ اس نے بالکنی میں آکر باہر دیکھا تو اسے ایک لڑکی نظر آئی جو بظاہر دھوپ سے بچنے کے لیے ایک سایہ دار درخت کی چھاؤں میں آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔

اس کا رنگ گہرا سناٹا تھا۔ اتنا سناٹا کہ وہ درخت کی چھاؤں کا ایک حصہ معلوم ہوتا تھا۔ سریندر نے جب اس کو دیکھا تو اس نے محسوس کیا کہ وہ اس کی قربت چاہتا ہے حالانکہ وہ اس موسم میں کسی کی قربت کی بھی خواہش نہ کر سکتا تھا۔ موسم بہت واہیات قسم کا تھا۔ گرمی تھی۔ سو چار بج چکے تھے۔ سورج غروب ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا لیکن موسم نہایت ذلیل تھا۔ پسینہ تھا کہ چھوٹا جا رہا تھا۔ خدا معلوم کہاں سے مساموں کے ذریعے اتنا پانی نکل رہا تھا۔

سریندر کے کئی مرتبہ غور کیا تھا کہ پانی اس نے زیادہ سے زیادہ چار گھنٹوں میں صرف ایک گلاس پیا ہو گا مگر پسینہ بلا مبالغہ چار گلاس کا ہو گا آخر یہ کہاں سے آیا؟“

جب اس نے اس لڑکی کو درخت کی چھاؤں میں آلتی پالتی مارے دیکھا تو اس نے سوچا کہ دنیا میں سب سے خوش یہی ہے۔ جسے دھوپ کی پروا ہے نہ موسم کی۔ سریندر پسینے میں لت پت تھا۔ اس کی بنیان اس کے جسم کے ساتھ بری طرح چمٹی ہوئی تھی۔ وہ کچھ اس طرح محسوس کر رہا تھا کہ اس کے بدن پر کسی نے موہل

آئل مل دیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود جب اس نے درخت کی چھاؤں میں بیٹھی ہوئی لڑکی کو دیکھا تو اس کے جسم میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اس کے پسینے کے ساتھ ٹھل ٹھل جائے اس کے مساموں کے اندر داخل ہو جائے۔

آسمان خاکستری تھا۔ کوئی بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ بادل میں یا محض گرد و غبار..... بہر حال اس گرد و غبار یا بادلوں کے باوجود دھوپ کی جھلک موجود تھی اور وہ لڑکی بڑے اطمینان سے پتیل کی چھاؤں میں بیٹھی ستارہ تھی۔

سریندر نے اب کی غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا رنگ گہرا سا نوا تھا۔ مگر نقش بہت تیکھے تھے۔ اس قدر تیکھے کہ وہ سریندر کی آنکھوں میں کئی مرتبہ چبھے۔ مزدور پیشہ لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ بھکارن ہو لیکن سریندر اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا۔ اصل میں وہ یہ فیصلہ کر رہا تھا کہ آیا اسے اس لڑکی کو اشارہ کرنا چاہیے یا نہیں۔

گھر میں وہ بالکل اکیلا تھا۔ اس کی بہن مری میں تھی۔ ماں بھی اس کے ساتھ تھی باپ مر چکا تھا۔ ایک بھائی تھا اس سے چھوٹا وہ بورڈنگ میں رہتا تھا۔ سریندر کی عمر ستائیس اٹھائیس سال کے قریب تھی۔ اس سے قبل وہ اپنی دو ادھیڑ عمر نوکرانیوں سے دو تین مرتبہ سلسلہ لڑا چکا تھا۔

معلوم نہیں کیوں لیکن موسم کی خرابی کے باوجود سریندر کے دل میں خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ وہ پتیل کی چھاؤں میں بیٹھی ہوئی لڑکی کے پاس جائے یا اسے اوپر ہی سے اشارہ کر دے تا کہ وہ اس کے پاس آجائے اور وہ دونوں ایک دوسرے کے پسینے میں غوطے لگائیں اور کسی نامعلوم جزیرے میں پہنچ جائیں۔

سریندر نے بالکنی کے کھڑے کے پاس کھڑے ہو کر زور سے کھنکارا مگر لڑکی متوجہ نہ ہوئی۔ سریندر نے جب کی مرتبہ ایسا کیا اور کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو اس نے آواز دی ”ارے بھئی..... ذرا ادھر دیکھو“۔

مگر لڑکی نے پھر بھی اس کی طرف نہ دیکھا۔ وہ اپنی پنڈلی کھجانی رہی۔ سریندر کو بہت الجھن ہوئی۔ اگر لڑکی کے بجائے کوئی کتا ہوتا تو وہ یقیناً اس کی آواز سن کر اس کی طرف دیکھتا۔ اگر اسے اس کی یہ آواز نا پسند ہوتی تو بھونکتا مگر اس لڑکی نے جیسے اس کی آواز سنی ہی نہیں تھی۔ اگر سنی تھی تو ان سنی کر دی تھی۔ سریندر دل ہی دل میں بہت خفیف ہو رہا تھا۔ اس نے ایک بار بلند آواز میں اس لڑکی کو پکارا ”اے لڑکی!“

لڑکی نے پھر بھی اس کی طرف نہ دیکھا۔ جھنجھلا کر اس نے اپنا ملل کا کرتہ پہنا اور نیچے اتر۔ جب اس لڑکی کے پاس پہنچا تو وہ اپنی نگلی پنڈلی کھجاری تھی۔ سریندر اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ لڑکی نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور شلوار نیچی کر کے اپنی نگلی پنڈلی ڈھانپ لی۔

سریندر نے اس سے پوچھا ”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“
لڑکی نے جواب دیا ”بیٹھی ہوں“۔
”کیوں بیٹھی ہو؟“

لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی ”لو اب کھڑی ہو گئی ہوں“۔

سریندر بوکھلا گیا ”اس سے کیا ہوتا ہے سوال یہ ہے کہ تم اتنی دیر سے یہاں بیٹھی کیا کر رہی تھیں؟“

لڑکی کا چہرہ اور زیادہ سنو لا گیا ”تم چاہتے کیا ہو؟“
 سریندر نے تھوڑی دیر اپنے دل کو ٹٹولا ”میں کیا چاہتا ہوں..... میں کچھ نہیں
 چاہتا..... میں گھر میں اکیلا ہوں۔ اگر تم میرے ساتھ چلو تو بڑی مہربانی ہوگی۔“
 لڑکی کے گہرے سانولے چہرے پر عجیب و غریب قسم کی مسکراہٹ نمودار ہوئی
 ”مہربانی..... کا ہے کی مہربانی..... چلو!“
 اور دونوں چل دیے۔

جب اوپر پہنچے تو لڑکی صوفے کے بجائے فرش پر بیٹھ گئی اور اپنی پندلی کھجانے
 لگی۔ سریندر اس کے پاس کھڑا سوچتا رہا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔
 اس نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ خوب صورت نہیں تھی۔ لیکن اس میں وہ تمام
 قوتیں اور تمام خطوط موجود تھے جو ایک جوان لڑکی میں ہوتے ہیں۔ اس کے
 کپڑے میلے تھے۔ لیکن اس کے ہاؤ جو اس کا مضبوط جسم اس سے باہر جھانک رہا
 تھا۔

سریندر نے اس سے کہا ”یہاں کیوں بیٹھی ہو..... ادھر صوفے پر بیٹھ جاؤ۔“
 لڑکی نے جواب میں صرف اس قدر کہا ”نہیں۔“
 سریندر اس کے پاس فرش پر بیٹھ گیا ”تمہاری مرضی..... لو اب یہ بتاؤ کہ تم
 کون ہو اور درخت کے نیچے تم اتنی دیر سے کیوں بیٹھی تھیں؟“
 ”میں کون ہوں اور درخت کے نیچے کیوں بیٹھی تھی..... اس سے تمہیں کوئی
 مطلب نہیں۔“ لڑکی نے یہ کہہ کر اپنی شلوار کا پانچو نیچے کر دیا اور پنڈلی کھجائے بند کر
 دی۔

سریندر اس وقت اس لڑکی کی جوانی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ وہ اس کا اور ان دو ادھیڑ عمر نوکرانیوں کا مقابلہ کر رہا تھا جن سے دو تین مرتبہ سلسلہ ہو چکا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ اسلوکی کے مقابلے میں ڈھیلی ڈھالی تھیں۔ جیسے برسوں کی استعمال کی ہوئی سائیکس لیکن اس کا ہر پرزہ اپنی جگہ پر کسا ہوا تھا۔

سریندر نے ان ادھیڑ عمر نوکرانیوں سے اپنی طرف سے کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ خود اس کو کھینچ کر اپنی کوٹھڑیوں میں لے جاتی تھیں۔ مگر سریندر اب محسوس کرتا تھا کہ یہ سلسلہ اس کو اب خود کرتا پڑے گا حالانکہ وہ اس کی تکنیک سے قطعاً ناواقف تھا۔ بہر حال اس نے اپنے ایک بازو کو تیار کر لیا اور اسے لڑکی کی کمر میں حاصل کر دیا۔

لڑکی نے ایک زور کا جھٹکا دیا ”یہ کیا کر رہے ہو تم؟“
سریندر ایک بار پھر بوکھلا گیا ”میں..... میں..... کچھ بھی نہیں۔“
لڑکی کے سانولے ہونٹوں پر عجیب قسم کی مسکراہٹ نمودار ہوئی ”آرام سے بیٹھ رہو۔“

سریندر آرام سے بیٹھ گیا مگر اسکے سینے میں ہلچل اور زیادہ بڑھ گئی۔ چنانچہ اس نے ہمت سے کام لے کر لڑکی کو پکڑ کر اپنے سینے کے ساتھ بچھنچھنچ لیا۔
لڑکی نے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن سریندر کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ وہ فرش پر چپت گر پڑی۔ سریندر اس کے اوپر تھا۔ اس نے دھڑا دھڑا اس کے گہرے سانولے ہونٹ چومنے شروع کر دیے۔
لڑکی بے بس تھی۔ سریندر کا بوجھ اتنا تھا کہ وہ اسے اٹھا کر پھینک نہیں سکتی تھی۔

بدرجہ مجبوری وہ اس کے بوجھل گیلے بو سے برداشت کرتی رہی۔

سریندر نے یہ سمجھا کہ وہ رام ہو گئی ہے۔ چنانچہ اس نے مزید راز دہتی شروع کی اس کی قمیص کے اندر ہاتھ ڈالا۔ وہ خاموش رہی۔ اس نے ہاتھ پاؤں پلانے بند کر دیے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے مدافعت کو اب فضول سمجھا ہے۔

سریندر کو اب یقین ہو گیا کہ میدان اس کے ہاتھ رہے گا۔ چنانچہ اس نے دراز دہتی چھوڑ دی اور اس سے کہا ”چلو آؤ پلنگ پر لیٹتے ہیں۔“

لڑکی انھی اور اس کے ساتھ چل دی۔ وہ دونوں پلنگ پر لیٹ گئے۔ ساتھ ہی تپائی پر ایک طشتری میں چند مالٹے اور ایک تیز چھری پڑی تھی۔ لڑکی نے ایک مالٹا اٹھایا اور سریندر سے پوچھا ”میں کھالوں؟“

”ہاں ہاں..... ایک نہیں سب کھاؤ۔“

سریندر نے چھری اٹھائی اور مالٹا چھیلنے لگا مگر لڑکی نے اس سے یہ دونوں چیزیں لے لیں۔

”میں خود چھیلوں گی۔“

اس نے بڑی نفاست سے مالٹا چھیلا۔ اس کے چھلکے اتارے پھانکوں پر سے سفید سفید چھلی ہٹائی۔ پھر پھانکیں علیحدہ کیں۔ ایک پھانک سریندر کو دی دوسری اپنے منہ میں ڈالی اور مزہ لیتے ہوئے پوچھا ”تمہارے پاس پستول ہے؟“

سریندر نے جواب دیا ”ہاں..... تمہیں کیا کرنا ہے؟“

لڑکی کے گہرے سانولے ہونٹوں پر پھر وہی عجیب و غریب مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”میں نے ایسے ہی پوچھا تھا..... تم جانتے ہو نا کہ آج کل ہندو مسلم فساد ہو رہے ہیں۔“

سریندر نے دوسرا مالٹا شستری سے اٹھایا ”آج سے ہو رہے ہیں..... بہت دنوں سے ہو رہے ہیں..... میں اپنے پستول سے چار مسلمان مار چکا ہوں..... بڑے خونی قسم کے۔“

”سچ؟“ یہ کہہ کر لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی ”مجھے ذرا وہ پستو تو دکھانا۔“

سریندر اٹھا اور دوسرے کمرے میں جا کر اس نے اپنے میز کا دراز کھولا اور پستول لے کر باہر آیا ”یہ لو..... لیکن بھروسہ۔“ اس نے پستول کا سیفٹی کچھ ٹھیک کر دیا۔ کیونکہ اس میں گولیاں بھری تھیں۔

لڑکی نے پستول پکڑا اور سریندر سے کہا ”میں بھی آج ایک مسلمان کو ماروں گی یہ کہہ کر اس نے سیفٹی کچھ کو ایک طرف کیا اور سریندر پر پستول داغ دیا..... وہ فرش پر گر پڑا اور جان کنی کی حالت میں کراہنے لگا ”یہ تم نے کیا کیا؟“

لڑکی کے گہرے سانولے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی ”وہ چار مسلمان جو تم نے مارے تھے ان میں میرا باپ بھی تھا۔“

☆☆☆

وہ خط جو پوسٹ نہ کیے گئے

حوا کی ایک بیٹی کے چند خطوط جو اس نے فرصت کے وقت محلے کے چند لوگوں کو لکھے۔ مگر ان وجوہ کی بنا پر پوسٹ نہ کیے گئے جو ان خطوط میں نمایاں نظر آتی ہیں۔

(نام اور مقام فرضی ہیں)

پہلا خط مسز کرپانی کے نام

خاتون مکرم

آداب عرض۔ معاف فرمائیے گا۔ میں یہ سطور بغیر تعارف کے لکھ رہی ہوں۔ مگر مجھے چند ضروری باتیں آپ سے کہنا ہیں۔ آپ کو میں ایک عرصے سے جانتی ہوں۔ ہر روز صبح ساڑھے آٹھ بجے اٹھ کر جب میں بستر سے بالکنی میں آتی ہوں تو آپ کو بازار میں سیر سے واپس آتے دیکھا کرتی ہوں۔ مجھے تعجب ہے مسز کرپانی جنہیں ساڑھے آٹھ بجے گھر سے دفتر پہنچنے کے لیے نک جانا ہوتا ہے۔ صرف ایک بدھمی نوکرانی کی موجودگی اور آپ کی غیر حاضری میں ناشتہ کیسے کرتے ہیں۔ کپڑے کیوں کرتبدیل کرتے ہیں اور پھر آپ کا بچہ بھی تو ہے ان کی دیکھ بھال کون کرتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سیر آپ کی صحت کے لیے مفید ہے۔ مگر اس سیر کا اثر آپ کے شوہر پر کیا پڑے گا۔ کیا آپ نے اس کی بابت کبھی غور کیا ہے.....؟ میں نے پرسوں مسز کرپانی کو دیکھا۔ ان کی حالت قابل رحم تھی۔ آپ نے سر پر ہیٹ

الٹا لٹا رکھا تھا۔ اور اگر میری نگاہوں نے دھوکا نہیں کھایا تو ان کے بوٹ کا ایک تسمہ کھلا ہوا تھا۔ جو بار بار ان کے پاؤں میں الجھ رہا تھا۔ کل بھی آپ کی حالت ایسی ہی تھی۔ ان کی پتلون شکنوں سے بھرپور تھی اور مائی کی گرہ بھی درست نہیں تھی۔

اگر آپ کی صبح کی سیر اسی طرح جاری رہی تو مجھے اندیشہ ہے کہ ایک روز مسٹر کرپانی اس افراتفری میں دفتر کا رخ کریں گے کہ سر راہ چلتی عورتوں کو اپنی آنکھیں بند کرنی پڑیں گی۔

اور ہاں دیکھیے کل آپ نے جو ساڑھی پہن رکھی تھی وہ آپ کی نہیں ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سزاؤوانی نے یہ ساڑھی کچھلی دیوانی پر خریدی تھی۔ دوسروں کے کپڑے پہننا بہت معیوب ہے۔ آپ کے پاس کم از کم میں ساڑھیاں موجود ہیں۔ سزاؤوانی کی ساڑھی مستعار لے کر آپ نے کیوں پہنی۔ یہ میں ابھی تک سمجھ نہیں سکی۔

ایک بات اور وہ یہ کہ آپ کو بغیر آستینوں کا بلاؤز اچھا معلوم نہیں ہوتا آپ کے کاندھوں پر ضرورت سے زیادہ گوشت ہے۔ جس کی نمائش آنکھوں پر بہت گراں گزرتی ہے۔ آپ کے جسم کا یہ عیب آستینوں والے بلاؤز میں چھپ جاتا ہے۔ اس لیے آپ کو ہمیشہ اسی تراش کا بلاؤز پہننا چاہیے۔۔۔۔۔

اونچی ایزھی کا شو آپ کیوں پہنتی ہیں؟..... آپ کا قد ماشاء اللہ کافی اونچا ہے۔ پرسوں آپ نے غیر معمولی اونچی ایزھی کا سینڈل پہن رکھا تھا۔ معاف فرمائیے معلوم ہوتا تھا آپ کے پیروں کے ساتھ سٹول بندھے ہوئے ہیں۔ اونچی ایزھی کا جوتا پہن کر آپ آسانی سے چل بھی نہیں سکتیں۔ خواہ مخواہ کیوں اپنے آپ کو تکلیف

دیتی ہیں۔

آپ کی.....

دوسرا خط مسز اوڈوانی کے نام

محترم بہن

تسلیمات! میں نے پچھلے دنوں آپ کو باند رہ کے میلے پر چند ہیلیوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ آپ نے پیلے رنگ کی جار جٹ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ بارڈر کے بغیر بلاؤز کالی ساٹن کا تھا۔ کھلے گٹے کا آئینوں کے بغیر۔ گٹے پر زرد رنگ کی ساٹن کا پائنگ تھا اور سامنے سینے پر اسی رنگ کا پھول۔ پاؤں میں آپ کے سنہری سینڈل تھیں۔ چھاتا سیاہ رنگ کا تھا اور جس کی مونڈ زرد رنگ کے سلوا ایڈ کی تھی۔ کالے بالوں میں پیلا ربن تھا۔ سیاہی اور زردی کا یہ میل مجھے بہت پسند آیا تھا۔ آپ کے ذوق کی میں بے حد معترف ہوں۔ رنگوں کے صحیح التزام کا آپ خوب سلیقہ رکھتی ہیں۔ مگر کل آپ جب بس پر سے اتریں تو مجھے یہ دیکھ کر سخت صدمہ ہوا کہ آپ نے کالی ساڑھی کے ساتھ بھوسلے رنگ کا بلاؤز پہن رکھا ہے۔ آپ کے بالوں میں نیلا ربن گندھا ہے۔ اور جو تاسفید کینوس کا پہن رکھا ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ ایسی اعلیٰ ذوق رکھنے والی خاتون نے کیونکر ایسے بھونڈے لباس میں باہر نکلتا گوارا کیا اور پھر غضب یہ ہے کہ آپ بس میں کہیں دوڑ گئی تھیں۔ آئندہ اگر میں نے آپ کو ایسے بے تکلف لباس میں دیکھا تو مجھے اتنا صدمہ ہوگا کہ میں بیان نہیں کر سکوں گی۔

ایک بات اور میری سمجھ میں نہیں آتی کہ آپ کی نوکرانی اتنا بناؤ سنگسار کیوں

کرتی ہے؟ اس کی عمر میرے اندازے کے مطابق اٹھارہ برس ہے۔ بظاہر وہ کنواری ہے۔ اس عمر میں اور خاص کر کنوارے میں اس کا یوں بن سنور کر سودا سلف لینے باہر بازار میں ٹکنا اتنا خطرناک نہیں۔ جتنا کہ آپ کا ااپ کے گھر میں اپنے بناؤ سنگسار پر توجہ دینا ہے۔ آپ عموماً گھر سے باہر رہتی ہیں اور مسٹر اڈوانی چونکہ دفتر نہیں جاتے۔ اس لیے وہ اکثر گھر ہی میں رہتے ہیں۔ آپ کی غفلت حد سے بڑھ گئی ہے۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتی۔

میرا خیال ہے کہ آپ کی دائیں آنکھ بائیں آنکھ سے چھوٹی ہے۔ اگر آپ چشمہ پہنا کریں تو یہ عیب بالکل دور ہو جائے گا۔ کیونکہ شیشوں میں سے یہ معمولی فرق نظر نہ آئے گا۔

ہاں یہ آپ نے اپنی آنکھوں کو اپنی ساڑھیاں پہننے کے لیے کیوں دے دیا کرتی ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ بدعت معاشرتی نقطہ نظر سے بہت بری ہے۔ اس کے علاوہ سہیلیاں خواہ کتنی محتاط ہوں۔ مستعار کپڑے کو نہایت بے دردی کے ساتھ استعمال کرتی ہیں۔ اگر آپ کو یقین نہ ہو تو اپنی ساڑھی کو غور سے دیکھیے جو آپ نے ایک روز مسز کرپانی کو پہننے کے لیے دی تھی۔ اس کا تلے کا کام کئی جگہ سے اکھڑ گیا ہے۔

بازار میں چلتے وقت آپ بار بار ساڑھی کا پلو نہ سنبھالا کریں۔ مجھے اس سے بڑی الجھن ہوتی ہے۔

آپ کی.....

تیسرا خط مسٹر ایوب خاں انسپکٹر پولیس کے نام

مکرمی محترمی..... سلام مسنون

کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ دن میں دو بار اپنی ڈاڑھی منڈوانا چھوڑ دیں.....
میں سمجھتی ہوں کہ مارل آدمی کی ڈاڑھی کے بال مارل حالت میں اتنی جلدی نہیں
اگ سکتے۔

پولیس ٹیشن جاتے ہوئے اور وہاں سے شام کو آتے ہوئے آپ کا پہلا کام یہ
ہوتا ہے کہ سیلون میں داخل ہو جائیں..... میرا خیال ہے کہ آپ کو MANIA ہو
گیا ہے۔ اگر آپ کا دماغی توازن درست ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ دن میں دو بار
صبح و شام اپنی ڈاڑھی پر استرا پھر انہیں..... کیا سیلون کا نانی آپ کی اس عجیب و
غریب عادت پر زیر لب کبھی نہیں مسکرایا؟

اور پھر آپ اپنے سر کے بال کس طور سے کٹواتے ہیں.....؟ واللہ بہت برے
معلوم ہوتے ہیں۔ گردن سے لے کر کھوپڑی کے بالائی حصے تک آپ بالوں کا
بالکل صفایا کر دیتے ہیں اور کانوں کے اوپر تک باریک مشین پھروا کر آخر آپ کیا
فیشن پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت آپ کی گردن کے اوپر تک باریک مشین پھروا
کر آخر آپ کیا فیشن پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت آپ کی گردن بہت بھدی ہے
اور آپ کے سر کے نچلے حصے پر پھوڑوں کے نشان ہیں جو صرف بال ہی چھپا سکتے
ہیں۔ اور کیا آپ نے کبھی غور فرمایا ہے کہ بار بار بال مونڈنے سے آپ کی گردن
موٹی ہو جائے گی۔

آپ کے کان بہت بڑے ہیں جس فیشن کی حجامت کا آپ کو شوق ہے۔ اس
سے یہ اور بھی زیادہ بڑے دکھائی دیتے ہیں۔ میری رائے ہے کہ آپ قلمیں رکھیں

اور کانوں کے قریب سے بال زیادہ نہ کنوائیں۔ گردن پر اگر آپ چھوڑے سے بال اگنے دیں تو کوئی حرج نہیں۔ اس سے آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

ہاتھ میں چھتری لے کر جب آپ بازار میں چلتے ہیں تو دماغ میں اس خیال کو جگہ جگہ نہ دیا کریں کہ ہر سکول جانے والی لڑکی آپ کو دیکھ رہی ہے..... کسی شائستہ مذاق لڑکی کی آنکھیں آپ کی طرف نہیں اٹھ سکتیں۔ اس لیے کہ آپ کے کاندھوں پر ایسا بھونڈا سراٹھائے پھرتے ہیں۔ جس کو آپ کے ایجاد کردہ فیشن نے اور بھی زیادہ بد نما بنا رکھا ہے۔

بار بار آپ اپنے کوٹ سے کیا جھاڑا کرتے ہیں؟ کیا گردوغبار کے ذرے صرف آپ ہی کے کوٹ پر آ بیٹھتے ہیں..... یا پھر آپ حد سے زیادہ نفاست پسند ہیں؟

کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ چالیس برس کے ہونے پر بھی آپ کنوارے ہیں؟ اگر یہ سچ ہے تو اس سے آپ کو عبرت حاصل کرنا چاہیے۔ میرا مشورہ لیجیے اور دن میں دو بار سیلون میں جا کر ڈاڑھی منڈوانا چھوڑ دیجیے۔ خدا آپ کی حالت پر رحم کرے۔

آپ کی مخلص.....

چوتھا: مس ڈی سلوا کے نام

ڈیئر مس ڈی سلوا

تمہاری حالت پر مجھے بہت افسوس ہوتا ہے۔ تم روز بروز مومٹی ہوتی جا رہی ہو۔ اگر تمہارا مونا پاپا اسی رفتار سے بڑھتا گیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ تم کسی مرد کے قابل نہ

رہو گی۔ سکول جانے کے لیے جب تم ”جم“ پہن کر گھر سے نکلتی ہو تو میرے دل میں عجیب و غریب خیال پیدا ہوتے ہیں۔ میں سوچتی ہوں کہ اس کمرے پر تم ڈانس کیسے کر سکو گی۔ ایک دو قدموں میں ہی تمہارا پسینہ چھوٹ جائے گا اور تمہارا ساتھی کیوں کر تمہاری ہانہوں کو حسب منشا حرکت میں لاسکے گا۔ تمہاری بغلوں کے نیچے اس قدر گوشت جمع ہو رہا ہے کہ تم ڈانس کرنے کے بالکل قابل نہیں رہی ہو۔ خدا کے لیے اپنا علاج کرو اور اس موٹاپے کو جلد سے جلد ختم کرنے کی کوشش کرو۔

ایک نصیحت میری اور سن لو۔ شام کو تم ہر روز ٹیرس پرائیکلی جاتی ہو اور سامنے والے مکان پر ڈی کو سنا کے بڑے لڑکے کو اشارے کرتی ہو۔ اول تو یہ شریف لڑکیوں کا کام نہیں دوسرے یہ اشارے چہ نبی بھرے گوشت کے مانند بھدے اور بے لذت ہوتے ہیں تم جیسی موٹی لڑکیوں کو ایسی اشارہ بازی نہیں کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ اشارہ ایک لطیف یعنی باریک اور پتلی چیز کا نام ہے۔ تمہارے اشارے اشارے نہیں ہوتے۔ ان کے لیے مجھے کوئی اور نام تلاش کرنا ہو گا۔

جس لونڈے کے ساتھ تم رومان لڑانا چاہتی ہو۔ اس کے متعلق بھی سن لو۔ وہ ایک آوارہ مزاج لڑکا ہے۔ ڈھائی مہینے سے کالی کھانسی میں مبتلا ہے۔ ماں باپ نے ناقابل اصلاح سمجھ کر اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ اس کے پاس صرف تین پتلومیں ہیں۔ جن کو بدل بدل کر پہتا ہے۔ ہر روز اپنی قمیص اور پتلون پر وہ دو بار استری کرتا ہے۔ تاکہ باہر کے لوگوں کی نظر میں اس کی وضع داری قائم رہے۔ مجھے ایسے آدمیوں سے سخت نفرت ہے۔

تم اپنی پنڈلیوں کے بال استرے سے نہ مونڈا کرو۔ بال اڑانے کے سب

پاؤڈر اور سب کریمیں بھی فاضول ہیں۔ بال ہمیشہ کے لیے کبھی غائب نہیں ہو سکتے
اس لیے کہ تم اپنی پنڈلیوں پر ظلم نہ کرو۔ بال رہنے دو اور لمبی جرابیں پہنا کرو۔
تمہارا دوست آج دوپہر کو اپنا پھنسا ہوا جوتا خود مرمت کر رہا تھا۔
تمہاری خیر خواہ.....

پانچواں خط کوشلیا دیوی کے نام
شریمتی کوشلیا دیوی نمسکار

اس میں کوئی شک نہیں اپنے گھر میں ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ آرام دہ سے
آرام دہ لباس پہنے اور تکلفات سے آزاد رہے۔ مگر دیوی جی آپ ململ کی باریک
دھوتی پہن کر اس آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ اور پھر یہ دھوتی آپ کچھ
اس بے تکلفی سے پہنتی ہیں کہ جب آپ اتفاق سے نظر آ جائیں تو یہ سوچنا پڑتا ہے
کہ آپ کو کس زاویے سے دیکھا جائے۔

آپ کو معلوم ہونا چاہیے روشنی کے سامنے کھڑے ہونے سے آپ کی ململ کی
دھوتی کا وجود ہونے نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ آپ کی عمر اس وقت چوالیس
برس کے قریب ہے۔ عمر کی اس زیادتی نے آپ کے جسم کو بالکل ڈھیلا کر دیا ہے۔
یہی وجہ ہے کہ باریک دھوتی میں آپ کی بھدی ناگلوں کی نمائش آنکھوں پر گواہی دیتی
ہے۔

آپ کے فلیٹ کا دروازہ عام طور پر کھلا رہتا ہے اور میں نے اکثر آپ کو
باورچی خانہ کے پاس یہی باریک دھوتی پہنے دیکھا ہے۔ اگر آپ کو اس کا استعمال
ترک نہیں کرنا ہے تو براہ کرم اپنے فلیٹ کا دروازہ بند رکھا کریں۔

آپ کی.....

چھنا خط مسٹر سعید حسن جرنلسٹ کے نام

جناب من.....تسلیم

آپ ہر روز صبح بالکونی میں پتلون پہنتے ہیں۔ آپ کا یہ فعل کمیونزم کی بدترین مثال ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ خط پڑھ کر آپ ضرور شرمسار ہوں گے اور آئندہ سے پتلون شریف آدمیوں کی طرح اپنے کمرے میں پہنا کریں گے۔

مخلص.....

مکرر: آپ کے بال بہت بڑھ گئے ہیں۔ سیلون آپ کے گھر کے نیچے ہے۔ ہمت کر کے آج ہی کٹوا دیں۔

ساتواں خط مسز قاسمی کے نام

خاتون مکرم السلام علیکم

میں بہت عرصے سے آپ کو یہ خط لکھنے کا ارادہ کر رہی تھی۔ مگر چند در چند وجوہ کے باعث ایسا نہ کر سکی۔ میں نے سنا ہے کہ دو گھروں میں نفاق پیدا کرنے کے لئے آپ کو بہت سے گرزبانی یاد ہیں۔ مسز اڈوانی اور مسز کرپانی کے درمیان ایک دفعہ آپ ہی کی کوششوں سے رنجش پیدا ہوئی تھی۔ اور پچھلے دنوں سیٹھ گوپال داس کی لڑکی پشپا کے بارے میں آپ نے جو افواہیں مشہور کی تھیں۔ ان سے سیٹھ گوپال داس اور سیٹھ رام داس کے خاندانوں میں اچھا خاصہ ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ مجھے آپ کی صلاحیتوں کا اعتراف ہے مگر میں سوچتی ہوں۔ ابھی تک آپ کے اور مسز قانونگو کے درمیان کشیدگی پیدا کیوں نہ ہوئی۔ اب تک آپ نے جس عورت کو

اپنی پہلی بنایا ہے اس سے تیسرے چوتھے مہینے آپ کی تو تو میں میں ضرور ہوتی ہے
لیکن مسز قانونگو سے آپ کی دوستی کو چھ مہینے ہو گئے ہیں۔ جو کئی برسوں کے برابر
ہیں۔ میں اب زیادہ انتظار نہیں کر سکتی۔ اس مہینے میں مسز قانونگو سے آپ کی جج
ضرور ہو جانی چاہیے۔ آپ کو اپنی روایات برقرار رکھنی چاہئیں۔

ہاں یہ ضرور بتائیے کہ آپ کہاں پیدا ہوئی تھیں۔ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ آپ
پنجاب کی رہنے والی ہیں۔ مگر آپ کا چہرہ نیپالیوں اور تبتیوں سے کیوں ملتا جلتا
ہے؟..... آپ کی ناک بالکل نیپالیوں جیسی چوٹی ہے اور گالوں کی ہڈیاں بھی انہی
کی طرح ابھری ہوئی ہیں البتہ آپ کا قد ان کی طرح پست نہیں ہے۔

آپ نے عید پر جو ساڑھی پہنی تھی۔ مجھے پسند نہیں آئی۔ آپ کا ذوق نہایت
فضول ہے۔ اگر آپ بھڑکیے اور شوخ رنگوں کے بجائے ہلکے رنگ کے کپڑے
انتخاب کیا کریں تو بہت اچھا ہو۔ لمبے قد کی عورتوں کو کھڑی لیکروں کی قمیص نہیں
پہننی چاہیے۔ کیونکہ لمبے قد کی عورتوں کے لیے یہ موزوں نہیں ہوتا۔ اور پھر آپ تو
ویسے بھی دہل پتلی ہیں۔ آپ کے کندھے پر بلاؤز کے اٹھے ہوئے پلہ بہت
برے معلوم ہوتے ہیں۔

آپ کی خیر اندیش.....

آٹھواں خط مس را بکلماری ایکٹرس کے نام

مس را بکلماری

مجھے تم سے نفرت ہے۔ تم عورت نہیں ہو سوٹ کیس ہو۔

تم سے نفرت کرنے والی.....

نواں خط مسٹر صالح بھائی کٹریاٹر کے نام

جناب صالح بھائی صاحب..... تسلیم

مجھے آپ کے خلاف کوئی شکایت نہیں لیکن پھر بھی میں آپ کو پسند نہیں کرتی۔
 نامعلوم کیا وجہ ہے کہ آپ کو دیکھ کر میرے دل میں غیض و غضب پیدا ہو جاتا ہے۔
 آپ بہت شریف آدمی ہیں۔ آپ کی شکل و صورت بھی کوئی خاص بری نہیں لیکن
 میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر آپ کو میں ناپسندیدگی کی نگاہ سے کیوں دیکھتی
 ہوں..... آپ کے چہرے پر قیمتی برستی ہے۔ آپ کی چال بھی نہایت واہیات
 ہے۔

آپ کی ہمدرد.....

دعوائے مس رضیہ صلاح الدین کے نام

ڈائریکٹر مس رضیہ..... سلام مسنون

تم ابھی ابھی پنجاب کے کسی گاؤں سے آئی ہو۔ پہلے ساڑھی پہننے کی عادت
 اختیار کرو پھر اس لباس میں باہر نکلو۔ تمہیں یہ لباس پہننے کا بالکل سلیقہ نہیں ہے۔ خدا
 کے لیے اپنے آپ کو متماشہ نہ بناؤ۔
 تمہاری خیر خواہ.....

☆☆☆

تھک

دن بھر کی تھکی ماندی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر لیٹی تھی اور لیٹتے ہی سو گئی تھی۔ میونسپل کمیٹی کا دارو نہ صفائی جسے وہ سیٹھ کے نام سے پکارا کرتی تھی ابھی ابھی اس کی ہڈیاں پسلیاں جھنجھور کر شراب کے نشے میں چور گھر واپس گیا تھا۔۔۔۔۔ وہ رات کو یہاں بھی ٹھہر جاتا مگر اسے اپنی دھرم پتی کا بہت زیادہ خیال تھا جو اس سے بے حد پریم کرتی تھی۔

وہ روپے جو اس نے اپنی جسمانی مشقت کے بدلے اس دارو نہ سے وصول کیے تھے۔ اس کی جسٹ اور جموک بھری چولی کے نیچے سے اوپر کو ابھرے ہوئے تھے۔ کبھی کسی سانس کے اتار چڑھاؤ سے چاندی کے سکے کھٹکھٹانے لگتے اور ان کی کھٹکھٹاہٹ اس کے دل کی غیر آہنگ دھڑکنوں میں گل مل جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ان سکوں کی چاندی پگھل کر اس کے دل کے خون میں ٹپک رہی ہے۔

اس کا سینہ اندر سے تپ رہا تھا۔ یہ گرمی تو کچھ اس براندی کے باعث تھی جس کا اوصا دارو نہ ساتھ لایا تھا اور کچھ اس بیوڑا کا نتیجہ تھی جس کا سوڈا ختم ہونے پر دونوں نے پانی ملا کر پیا تھا۔

وہ ساگو ان کے لمبے اور چوڑے پلنگ پر او نہ سے منہ لیٹی تھی۔ اس کی باہیں جو اس کے کاندھوں تک نگلی تھیں پتنگ کی اس کانپ کی طرح پھیلتی ہوئی تھیں جو اس میں بھیگ جانے کے باعث پتلے کاغذ سے جدا ہو جائے۔۔۔۔۔ دائیں بازو کی بغل میں شکمن آلود گوشت ابھرا ہوا تھا جو بار بار موندنے کے باعث نیلی رنگت اختیار کر

گیا تھا۔ جیسے نچی ہوئی مرنی کی کھال کا ایک ٹکڑا وہاں پر رکھ دیا گیا ہے۔
 کمرہ بہت چھوٹا تھا جس میں بے شمار چیزیں بے ترتیبی کے ساتھ بکھری ہوئی
 تھیں۔ تین چار سو کچے سڑے چپل پلنگ کے نیچے پڑے تھے جن کے اوپر منہ رکھ کر
 ایک خارش زدہ کتا سو رہا تھا اور رفیند میں کسی غیر مرئی چیز کو منہ چڑھا رہا تھا۔ اس کتے
 کے بال جگہ جگہ سے خارش کے باعث اڑے ہوئے تھے۔ دوسرے اگر کوئی اس
 کتے کو دیکھتا تو سمجھتا کہ پیر پوٹھنے والا ایک پرانا ماٹ دوہرا کر کے زمین پر رکھا ہے۔

اس طرف چھوٹے سے دیوار گیر پر سنگار کا سامان رکھا تھا۔ گالوں پر لگانے کی
 سرخی ہونٹوں کی سرخی جتنی پاؤڈر، کنگھی اور لوہے کی پن جوہر غالباً اپنے جوڑے
 میں لگایا کرتی تھی۔ پاس ہی ایک لمبی کھوئی کے ساتھ سبز طوطے کا پنجرہ لٹک رہا تھا
 جو گردن کو اپنی پیٹھ کے بالوں میں چھپائے سو رہا تھا۔ پنجرہ میں کچے امرود کے
 ٹکڑوں پر چھوٹے چھوٹے کالے رنگ کے مچھر یا پتنگے اڑ رہے تھے۔

پلنگ کے پاس ہی بید کی ایک کرسی پڑی تھی جس کی پشت پر ٹھیکے کے باعث
 بے حد میلی ہو رہی تھی۔ اس کرسی کے دائیں ہاتھ ایک خوبصورت تپائی تھی جس پر
 ہنر ماسٹر واکس کا پورٹ اینبل گراموفون رکھا تھا۔ گراموفون پر منڈھے ہوئے
 کالے کپڑے کی بہت بری حالت تھی۔ رنگ آلود سونیاں تپائی کے علاوہ کمرے
 کے ہر کونے میں بکھری ہوئی تھیں۔ اس تپائی کے عین اوپر دیوار پر چار فریم لٹک
 رہے تھے جن میں مختلف آدمیوں کی تصویریں جڑی تھیں۔

ان تصویروں سے ذرا ادھر ہٹ کر یعنی دروازے میں داخل ہوتے ہی بائیں

طرف کی دیوار کے کونے میں شوخ رنگ کے گنیش جی کی تصویر تھی جو تازہ اور سوکھے ہوئے پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ شاید یہ تصویر کپڑے کے کسی تھان سے اتار کر فریم میں جڑوائی گئی تھی۔ اس تصویر کے ساتھ چھوٹے سے ایک دیوار گیر پر جو کہ بے حد چمکنا ہو رہا تھا تیل کی پیالی دھری تھی جو دیے کو روشن کرنے کے لیے وہاں رکھی گئی تھی۔ پاس ہی دیا پڑا تھا۔ جس کی لوہا بند ہونے کے باعث ماتھے کے تلک کی مانند سیدھی کھڑی تھی۔ اس دیوار گیر پر دھول کی چھوٹی بڑی مروڑیاں کبھی کی پڑی تھیں۔

جب وہ بوہنی کرتی تھی دور سے گنیش جی کی اس مورتی سے روپے چھو کر اور پھر اپنے ماتھے کے ساتھ لگا کر انہیں اپنی چوٹی میں رکھ لیا کرتی تھی۔ اس کی چھاتیاں کیونکہ کافی ابھری ہوئی تھیں۔ اس لیے وہ جتنے روپے بھی اپنی چوٹی میں رکھتی محفوظ رہتے تھے۔ البتہ کبھی کبھی جب مادھو پونے سے چھٹی لے کر آتا تو اسے اپنے کچھ روپے پلنگ کے پائے کے نیچے اس چھوٹے سے گڑھے میں چھپاتا پڑتے تھے جو سنے خاص اس کام کی غرض سے کھودا تھا۔ مادھو سے روپے رکھنے کا یہ سلیقہ سوگندھی کو رام لال دلال نے بتایا تھا۔ اس نے جب یہ سنا تھا کہ مادھو پونے سے آکر سوگندھی پر دھواہا بولتا ہے تو کہا تھا ”اس سالے کو تو نے کب سے یار بنایا ہے۔۔۔۔۔۔ یہ بری انوکھی ناشتی معشوقی ہے۔۔۔۔۔۔ سالہ ایک پیسہ بھی جیب سے نہیں نکالتا اور تیرے ساتھ مزے اڑاتا رہتا ہے۔ مزے الگ رہے تجھ سے کچھ لے بھی مرتا ہے۔۔۔۔۔۔ سوگندھی مجھے کچھ دال میں کالا کالا نظر آتا ہے۔ اس سالے میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے جو تجھے بھا گیا ہے۔۔۔۔۔۔ سات سال سے یہ دھندا کر رہا ہوں تم

چھو کر یوں کی ساری کمزوریاں جانتا ہوں۔“

یہ کہہ کر رام لال دلال نے جو بمبئی شہر کے مختلف حصوں سے دس روپے سے لے کر سو روپے تک والی ایک سو بیس چھو کر یوں کا دھندا کرتا تھا..... سو گندھی کو بتایا..... ”سالی اپنا دشمن یوں نہ برباد کر تیرے انگ پر سے یہ کپڑے بھی اتار کر لے جائے گا۔ وہ تیری ماں کا یا را! اس پلنگ کے پائے کے نیچے ایک چھوٹا سا گڑھا کھود کر اس میں سارے پیسے دبا دیا کرو اور جب وہ یا ر آیا کرے تو اس سے کہا کر..... تیری جان کی قسم ماں ہو آج صبح سے ایک دھیلے کا منہ نہیں دیکھا۔ باہر والے سے کہہ کر ایک کوپ چائے اور ایک افلاطون بسکٹ تو منگا۔ بھوک سے میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں..... سمجھیں؟ بہت مازک وقت آ گیا ہے میری جان..... اس سالی کا ٹکڑا لیس نے شراب بند کر کے بازار بالکل مندا کر دیا ہے۔ پر تجھے تو کہیں نہ کہیں سے پینے کو مل ہی جاتی ہے۔ بھگوان قسم جب تیرے یہاں کبھی رات کی خالی کی ہوئی بوتل دیکھتا ہوں اور وارو کی باس سو گھٹتا ہوں تو جی چاہتا ہے تیری جون میں چلا جاؤں۔“

سو گندھی کو اپنے جسم میں سب سے زیادہ اپنا سینہ پسند تھا۔ ایک بار جمنانے اس سے کہا تھا ”نیچے سے ان بمب کے گولوں کو باندھ کر رکھا کر۔ انگلیا پہنا کرے گی تو اس کی تختانی ٹھیک رہے گی۔“

سو گندھی یہ سن کر فیس دی ”جمنانے تو سب کو اپنے سری کا سمجھتی ہے دس روپے میں لوگ تیری بوئیاں فوج کر چلے جاتے ہیں تو تو سمجھتی ہے کہ سب کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہو گا۔ کوئی موالگائے تو ایسی ویسی جگہ ہاتھ..... ارے ہاں کل کی بات تجھے

سناؤں رام لال رات کے دو بجے ایک پنجابی کو لایا۔ رات کا تیس روپے طے ہوا۔۔۔۔۔ جب سونے لگے تو میں نے جی بجا دی۔۔۔۔۔ ارے وہ تو ڈرنے لگا۔۔۔۔۔ سختی ہو جتنا؟ تیری قسم اندھیرا ہوتے ہی اس کا ساراٹھاٹھر کرکرا ہو گیا۔۔۔۔۔ وہ ڈر گیا۔ میں نے کہا چلو دیر کیوں کرتے ہو تین بجنے والے ہیں۔ ابھی دن چڑھ آئے گا۔۔۔۔۔ بولا۔۔۔۔۔ روشنی کرو۔۔۔۔۔ روشنی کرو۔۔۔۔۔ میں نے کہا یہ روشنی کیا ہوا۔۔۔۔۔ بولا لائٹ لائٹ۔۔۔۔۔

اس کی بھٹی ہوئی آواز سن کر مجھ سے ہنسی نہ رکی ”بھٹی میں تو لائٹ نہ کروں گی۔“ اور یہ کہہ کر میں نے اس کی پرگوشت ران پر چنگلی لی۔۔۔۔۔ تڑپ کر اٹھ بیٹھا اور لائٹ آن کر دی۔ میں نے جھٹ سے چادر اوڑھ لی اور کہا تجھے شرم نہیں آتی ہے مردودے!“ وہ پلنگ پر آیا تو میں انھی اور لپک کر لائٹ بجھا دی۔۔۔۔۔ وہ پھر گھبرانے لگا۔۔۔۔۔ تیری قسم بڑے مزے میں رات کئی۔۔۔۔۔ کبھی اندھیرا کبھی اجالا۔۔۔۔۔ کا بھی اجالا کبھی اندھیرا۔۔۔۔۔ غرام کی کھڑکھڑ ہوئی تو پتلون پہن کر وہ اٹھ بھاگا۔۔۔۔۔ سالے نے تمیں روپے سٹے میں جیتے ہوں گے جو یوں مفت دے گیا۔۔۔۔۔ جتنا تو بالکل اکھڑ ہے۔ بڑے بڑے گریادیں مجھے ان لوگوں کے ٹھیک کرنے کے لیے۔“

سو گندھی کو واقعی بہت سے گریاد تھے جو اس نے اپنی دو ایک ہیلیوں کو بتائے بھی تھے۔ عام طور پر وہ یہ گرسب کو بتایا کرتی تھی ”اگر شریف آدمی ہو زیادہ باتیں نہ کرنے والا ہو تو اس سے خوب شرارتیں کرو ان گنت باتیں کرو اسے چھیڑو سناؤ اس کے گدگدی کرو اس سے کھیلو۔۔۔۔۔ اگر ڈاڑھی رکھتا ہو تو اس میں انگلیوں سے کنگھی کرتے کرتے دو چار بال بھی نوج لو۔ پیٹ بڑا ہو تو تھپتھاؤ۔۔۔۔۔ اس کو اتنی

مہلت ہی نہ وہ کہ اپنی مرضی کے مطابق کچھ کرنے پائے..... وہ خوش خوش چلا جائے اور تم بھی بچی رہو گی..... ایسے مرد جو گپ چپ رہتے ہوں بڑے خطرناک ہوتے ہیں بہن..... ہڈی پہلی توڑ دیتے ہیں اگر ان کا داؤ چل جائے۔“

سو گندھی اتنی چالاک نہیں تھی جتنی خود کو ظاہر کرتی تھی۔ اس کے گاہک بہت کم تھے۔ غایت درجہ جذباتی لڑکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام گرجا سے یاد تھے۔ اس کے دماغ سے پھسل کر اس کے پیٹ میں آ جاتے تھے جس پر ایک بچہ ہونے سے کئی لکیریں بڑھ گئی تھیں ان لکیروں کو پہلی مرتبہ دیکھ کر اسے ایسا لگا تھا کہ اس کے خروش زدہ کتے نے اپنے پنجے سے یہ نشان بنادیے ہیں..... جب کوئی کتیا بڑی بے اعتنائی سے اس کے پالتو کتے کے پاس سے گزر جاتی تھی تو وہ شرمندگی دور کرنے کے لیے زمین پر اپنے پنجوں سے اسی قسم کے نشان بنایا کرتا تھا۔

سو گندھی دماغ میں زیادہ رہتی تھی لیکن جوئی کوئی نرم و نازک بات..... کوئی کوئل بول اس سے کہتا تو جھٹ پھسل کر ہوا اپنے جسم کے دھیرے حصوں میں پھیل جاتی۔ گوردا اور عورت کے جسمانی ملاپ کو اس کا دماغ بالکل فضول سمجھتا تھا۔ مگر اس کے جسم کے باقی اعضاء سب کے سب اس کے بہت بری طرح قائل تھے وہ تھکن چاہتے تھے..... ایسی تھکن جو انہیں جھنجھوڑ کر..... انہیں مار کر سالانے پر مجبور کر دے ایسی نیند جو تھک کر چور چور ہونے کے بعد آئے۔ کتنی مزیدار ہوتی ہے..... وہ بے ہوش جو مار کھا کر بند بند ڈھیلے ہو جانے پر ہو جاتی ہے۔ کتنا آئندہ دیتی ہے..... کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم ہو اور کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نہیں ہو۔ اور اس ہونے اور نہ ہونے کے بیچ میں کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ تم ہو امیں

بہت اونچی جگہ لگی ہوئی ہو۔ اوپر ہوائیں چھو ہوا دانیوں ہوا پائیں ہوا۔ بس ہوا ہی ہوا اور پھر اس ہوا میں دم گھٹنا بھی ایک خاص مزہ دیتا ہے۔

بچپن میں جب وہ آنکھ چھوٹی کھلیا کرتی تھی اور اپنی ماں کا بڑا صندوق کھول کر اس میں چھپ جایا کرتی تھی۔ اس کا جی چاہتا کہ ساری عمر اس صندوق میں چھپ کر گزر دے جس کے باہر ڈھونڈنے والے پھرتے رہیں۔ کبھی کبھی اس کو ڈھونڈ نکالیں تاکہ وہ بھی ان کو ڈھونڈنے کی کوشش کرے۔ یہ زندگی جو وہ پانچ برس سے گزرا رہی تھی۔ آنکھ چھوٹی ہی تو تھی کبھی وہ کسی کو ڈھونڈ لیتی تھی اور کبھی کوئی اسے ڈھونڈ لیتا تھا..... بس یونہی اس کا بیون بیت رہا تھا۔ وہ خوش تھی اس لیے کہ وہ اس کو خوش رہنا پڑتا تھا۔ ہر روز رات کو کوئی نہ کوئی مرد اس کے چوڑے سا گوان کے پلنگ پر ہوتا تھا اور سو گندھی جس کو مردوں کے ٹھیک کرنے کے بے شمار گریا دتھے۔ اس بات کا بار بار تہیہ کرنے پر بھی کہ وہ ان مردوں کی ایسی ویسی کوئی بات نہیں مانے گی اور ان کے ساتھ بڑے روکھے پن کے ساتھ پیش آئے گی ہمیشہ اپنے جذبات کے دھارے میں بہہ جایا کرتی تھی۔ اور فقط ایک پیاسی عورت رہ جایا کرتی تھی۔

ہر روز رات کو اس کا پرانا یا نیا ملاقاتی اس سے کہا کرتا تھا ”سو گندھی میں تجھ سے پریم کرتا ہوں“۔ اور سو گندھی یہ جان بوجھ کر کہہ جھوٹ بولتا ہے۔ بس موم ہو جاتی تھی اور ایسا محسوس کرتی تھی جیسے سچ مچ اس سے پریم کیا جا رہا ہے..... پریم..... کتنا سندر بول ہے وہ چاہتی تھی کہ اس کو گھٹا کر اپنے سارے انگوں پر مل لے۔ اس کی ماش کرے تاکہ یہ سارے کا سارا اس کے مساموں میں رچ جائے..... یا

پھر وہ خود اس کے اندر چلی جائے۔ سمٹ سمٹا کر اس کے اندر داخل ہو جائے اور اوپر سے ڈھکنا بند کر دے۔ کبھی کبھی جب پریم کرنے اور پریم کیے جانے کا جذبہ اس کے اندر بہت شدت اختیار کر لیتا تو کئی بار اس کے جی میں آتا کہ اپنے پاس پڑے ہوئے آدمی کو گود میں لے کر تھپتھپانا شروع کر دے اور لوریاں دے کر اسے اپنی گود ہی میں سما دے۔

پریم کرنے کی اہلیت اس کے اندر اس قدر زیادہ تھی کہ ہر اس مرد سے جو اس کے پاس آتا تھا وہ محبت کر سکتی تھی اور پھر اس کو نباہ بھی سکتی تھی۔ اب تک چار مردوں سے تو اپنا پریم نباہ رہی تھی۔ جن کی تصویریں سامنے دیوار پر لٹک رہی تھیں۔ ہر وقت یہ احساس اس کے دل میں موجود رہتا تھا کہ وہ بہت اچھی ہے لیکن یہ اچھا پن مردوں میں کیوں نہیں ہوتا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔۔۔۔۔ ایک بار آنینہ دیکھتے ہوئے بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا ”سوگندھی تجھ سے زمانے نے اچھا سلوک نہیں کیا“۔

یہ زمانہ یعنی پانچ برسوں کے دن اور ان کی راتیں اس کے جیون کے ہر تار کے ساتھ وابستہ تھا۔ گو اس زمانے سے اس کو خوشی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ جس کی خواہش اس کے دل میں موجود تھی۔ تاہم وہ چاہتی تھی کہ یوں ہی اس کے دن بیتے چلے جائیں۔ اسے کون سے محل کھڑے کرنا تھے جو وہ پے پیسے کا لالچ کرتی۔ دس روپے کا نام نرخ تھا جس میں سے ڈھائی روپے رام لال اپنی دلالی کے کاٹ لیتا تھا۔ ساڑھے سات روپے اسے رو زمل ہی جایا کرتے تھے جو اس کی اکیلی جان کے لیے کافی تھے اور جب مادھو جب پونے سے بقول رام لال دلال سوگندھی پر

دعاوے بولنے کے لیے آتا تو وہ دس پندرہ روپیہ خراج بھی ادا کرتی تھی۔ یہ خراج صرف اس بات کا تھا کہ سوگندھی کو اس سے کچھ ہو گیا تھا۔ رام لال دلال ٹھیک کہتا تھا اس میں ایسی بات ضرور تھی جو سوگندھی کو بہت بھاگتی تھی۔ اب اس کو چھپانا کیا ہے بتا ہی کیوں نہ دیں..... سوگندھی سے جب مادھو کی پہلی ملاقات ہوئی تو اس نے کہا تھا ”تجھے لاج نہیں آتی اپنا بھاؤ کرتے۔ جانتی ہے تو میرے ساتھ کس چیز کا سودا کر رہی ہے؟..... اور میں تیرے پاس کیوں آیا ہوں؟..... چچی چچی چچی..... دس روپے اور جیسا کہ تو کہتی ہے ڈھائی روپے دلالی کے باقی رہے ساڑھے سات روپیوں پر تو مجھے ایسی چیز دینے کا وجہ دیتی ہے جو تو دے ہی نہیں سکتی اور میں ایسی چیز لینے آیا ہوں جو میں لے ہی نہیں سکتا..... مجھے عورت چاہیے پر تجھے کیا اس وقت اسی گھڑی مرد چاہیے۔ مجھے تو عورت بھی بھا جائے گی۔ پر کیا میں تجھے چتا ہوں..... تیرا میرا ناٹھ ہی کیا ہے۔ کچھ بھی نہیں..... بس یہ دس روپے جن میں ڈھائی دلالی میں چلے جائیں گے اور باقی ادھر ادھر بکھر جائیں گے۔ تیرے اور میرے سچ میں بچ رہے ہیں..... تو بھی ان کا بچنا سن رہی ہے اور میں بھی تیرا من کچھ اور سوچتا ہے میرا من کچھ اور..... کیوں نہ کوئی ایسی بات کریں کہ تجھے میری ضرورت ہو اور مجھے تیری۔ پونے میں حوالدار ہوں۔ مہینے میں ایک بار آیا کروں گا تین چار دن کے لیے..... یہ دھندا چھوڑ..... میں تجھے خرچ دیا کروں گا..... کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا؟“

مادھو نے اور بھی بہت کچھ کہا تھا جس کا اثر سوگندھی پر اس قدر زیادہ ہوا تھا کہ وہ چند لمحات کے لیے خود کو حوالدار فی سمجھنے لگی تھی۔ باتیں کرنے کے بعد مادھو نے

اس کے کمرے کی بکھری ہوئی چیزیں قرینے سے رکھی تھیں اور نگلی تصویریں جو سوگندھی نے اپنے سر ہانے لگا رکھی تھیں بنا پوتھے پگھے پھاڑ دی تھیں..... اور کہا تھا..... سوگندھی بھی میں ایسی تصویریں نہیں رکھنے دوں گا..... اور یہ پانی کا گھڑا..... دیکھا کتنا میلا ہے اور یہ..... یہ چیتھڑے..... یہ چندریاں..... اف کتنی بری باس آتی ہے اٹھا کر باہر پھینک ان کو..... اور تو نے اپنے بالوں کا کیا ستیا ناس کر رکھا ہے..... اور.....

تین گھنٹے کی بات چیت کے بعد سوگندھی اور مادھو دونوں آپس میں گھل مل گئے تھے اور سوگندھی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ برسوں سے حوالدار کو جانتی ہے۔ اس وقت تک اس نے بھی کمرے میں بدبودار چیتھڑوں میں گھڑے اور نگلی تصویروں کی موجودگی کا خیال نہیں رکھا تھا اور نہ کبھی کسی نے اس کو یہ محسوس کرنے کا موقع دیا تھا کہ اس کا ایک گھر ہے۔ جس میں گھریلو پن آ سکتا ہے۔ لوگ آتے تھے اور بستر تک کی غنائتیں محسوس کیے بغیر چلے جاتے تھے۔ کوئی سوگندی سے یہ نہیں کہتا تھا کہ ”دیکھو آج تیری ناک کتنی لال ہو رہی ہے۔ کہیں زکام نہ ہو جائے تجھے.....“ ٹھہر میں تیرے واسطے دوالاتا ہوں“۔ مادھو کتنا اچھا تھا۔ اس کی ہر بات ہاؤن تولہ اور پاؤرتی کی تھی۔ کیا کھری کھری سنائی تھیں اس نے سوگندھی کو..... اسے محسوس ہونے لگا کہ اسے مادھو کی ضرورت ہے۔ چنانچہ دونوں سے سمبندھ ہو گیا۔

مہینے میں ایک بار مادھو پونے آتا تھا اور واپس جاتے ہوئے ہمیشہ سوگندھی سے کہا کرتا تھا ”دیکھ سوگندھی اگر تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا تو بس تیری میری ٹوٹ جائے گی.....“ اگر تو نے ایک بار بھی کسی مرد کو اپنے یہاں ٹھہرایا تو چٹیا

سے پکڑ کر باہر نکال دوں گا..... دیکھا اس مہینے کا خرچ میں تھے پونا سے منی آرڈر کر دوں گا..... ہاں کیا بھڑا ہے اس کھولی کا.....“

نہ مادھو نے کبھی پونا سے خرچ بھیجا تھا اور نہ سوگندھی نے اپنا دھندلا بند کیا تھا۔ دونوں اچھی طرح جانتے تھے کیا ہو رہا ہے۔ نہ سوگندھی نے کبھی مادھو سے کہا تھا ”تو یہ ٹرڈ کیا کرتا ہے۔ ایک پھوٹی کوڑی بھی دی ہے کبھی تو نے؟“ اور نہ مادھو نے سوگندھی سے پوچھا تھا ”یہ مال تیرے پاس کہاں سے آیا ہے جب کہ میں تھے کچھ دیتا ہی نہیں.....“ دونوں جھوٹے تھے۔ دونوں ایک طمع کی ہونی زندگی بسر کر رہے تھے..... لیکن سوگندھی خوش تھی۔ جس کا اصل سونا پہننے کو نہ ملے وہ طمع کیے ہوئے گہنوں پر ہی راضی ہو جایا کرتا ہے۔

اس وقت سوگندھی تھکی ماندی سو رہی تھی۔ بجلی کا قنقرہ جسے اوف کرنا وہ بھول گئی تھی اسکے سر کے اوپر لٹک رہا تھا۔ اس کی تیز روشنی اس کی مندی ہوئی آنکھوں کے ساتھ لگ رہی تھی مگر وہ گہری نیند سو رہی تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی..... رات بے دو بجے یہ کون آیا تھا؟ سوگندھی کے خواب آلود کانوں میں دستک کی آواز بھنکنا ہٹ بن کر پٹپٹی۔ دروازہ جب زور سے کھٹکٹایا گیا تو چونک کر اٹھ بیٹھی..... دوہلی جلی شرابوں اور دانتوں کی ریخوں میں پھنسے ہوئے مچھلی کے ریزوں نے اس کے منہ کے اندر ایسا لعاب پیدا کر دیا تھا جو بے حد کسایا اریس دار تھا۔ دھوتی کے پلو سے اس نے یہ بدبودار لعاب صاف کیا اور آنکھیں ملنے لگی۔ پلنگ پر وہ اکیلی تھی۔ جھک کر اس نے دیکھا تو اس کا کتا سوکھے ہوئے چپلوں پر منہ رکھے سو رہا تھا اور نیند میں کسی غیر مرئی چیز کا منہ چڑا رہا

تھا اور طوطا پیچھے کے بالوں میں سر دیے سو رہا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ سوگندھی بستر پر سے اٹھی۔ سر درو کے مارے پھٹا جا رہا تھا۔ گھڑے سے پانی کا ایک ڈونکا نکال کر اس نے کلی کی اور دوسرا ڈونکا غنائت پی کر اس نے دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھولا اور کہا ”رام لال؟“

رام لال جو باہر دستک دیتے دیتے تھک گیا تھا۔ بھنا کر کہنے لگا ”تجھے سانپ سوگھ گیا تھا یا کیا ہو گیا تھا۔ ایک کارک (گھنٹے) سے باہر کھڑا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوں۔ کیا مر گئی تھی؟“۔ پھر آواز دبا کر اس نے ہولے سے کہا تھا ”اندرا کوئی ہے تو نہیں؟“

جب سوگندھی نے کہا ”نہیں“ تو رام لعل کی آواز پھر اونچی ہو گئی۔ ”تو دروازہ کیوں نہیں کھولتی؟..... بھی حد ہو گئی۔ کیا نیند پانی ہے۔ یوں ایک ایک چھو کر می اتارنے میں دو دو گھنٹے سر کھپانا پڑے تو میں اپنا دھندلا کر چکا..... اب تو میری منہ کیا دیکھتی ہے جھٹ پٹ یہ دھوتی اتار کر وہ پھولوں والی ساڑھی پہن پاؤ ڈرو ڈر لگا اور چل میرے ساتھ..... باہر موٹر میں ایک سیٹھ بیٹھے تیرا انتظار کر رہے ہیں..... چل چل ایک دم جلدی کر“۔

سوگندھی آرام کرسی پر بیٹھ گئی اور رام لال آنینے کے سامنے اپنے بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔

سوگندھی نے تپائی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بام کی شیشی اٹھا کر اس کا ڈھکنا کھولتے ہوئے کہا ”رام لال آج میرا جی اچھا نہیں۔“

رام لال نے کنگھی دیوار پر رکھ دی اور مڑ کر کہا ”تو پہلے ہی کہہ دیا ہوتا“

سوگندھی نے ماتھے اور کنپٹیوں پر بام ملتے ہوئے رام لال کی غلط فہمی دور کر دی۔

”وہ بات نہیں رام لال..... ایسے ہی میرا جی اچھا نہیں..... بہت پی گئی۔“
 رام لال کے منہ میں پانی بھر آیا ”تھوڑی بچی ہو تو لا..... ذرا ہم بھی منہ کا مزہ ٹھیک کر لیں۔“

سوگندھی نے بام کی شیشی تپائی پر رکھ دی اور کہا ”بچائی ہوتی تو یہ مواسر دردی کیوں ہوتا..... دیکھو رام لال! وہ جو باہر موٹر میں بیٹھا ہے اسے اندر ہی لے آؤ۔“
 رام لال نے جواب دیا ”نہیں بھئی! وہ اندر نہیں آ سکتے۔ جنٹل مین آدمی ہیں۔ وہ تو موٹر گلی کے باہر کھڑی کرتے ہوئے بھی گھبراتے تھے۔ تو کپڑے اوڑھ لے اور ذرا گلی کے کنارے تک چل..... سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

ساڑھے سات روپے کا سودا تھا۔ سوگندھی اس حالت میں جب کہ اس کے سر میں شدت کا درد ہو رہا تھا کبھی قبول نہ کرتی مگر اسے روپوں کی سخت ضرورت تھی۔ اس کے پاس وانی کھولی میں ایک مدد راسی عورت رہتی تھی جس کا خاوند موٹر کے نیچے آ کر مر گیا تھا۔ اس عورت کو اپنی جوان لڑکی سمیت وطن جانا تھا۔ لیکن اس کے پاس چونکہ کرایہ ہی نہیں تھا۔ اس لیے وہ کسمپرسی کی حالت میں پڑی تھی۔ سوگندھی نے کل ہی اس کو ڈھارس دی تھی اور اس سے کہا تھا ”بہن تو چنانہ کر میرا مرد پونے سے آنے ہی والا ہے۔ میں اس سے کچھ روپے لے کر تیرے جانے کا بندوبست کر دوں گی۔“ مادھو پونا سے آنے والا تھا مگر روپوں کا بندوبست تو سوگندھی ہی کو کرنا تھا۔ چنانچہ وہ انھی اور جلدی سے کپڑے تبدیل کرنے لگی۔ پانچ منٹوں میں اس

نے دھوتی اتاری اور پھولوں والی ساڑھی پہنی اور سرخ گالوں پر سرخ پاؤڈر لگا کر تیار ہو گئی۔ گھرے کے خندے پانی کا ایک اور ڈونگا پیا اور رام لال کے ساتھ ہوئی۔

گلی جو کہ چھوٹے شہروں کے بازار سے بھی کچھ بڑی تھی بالکل خاموش تھی۔ گیس کے وہ لیمپ جو کہ کھمبوں پر جڑے تھے پہلے کی نسبت دھندلی روشنی دے رہے تھے۔ جنگ کے باعث ان کے شیشوں کو گدا کر دیا گیا تھا۔ اس اندھی روشنی میں گلی کے آخری سرے پر ایک موٹر نظر آرہی تھی۔

کمزور روشنی میں اس سیاہ رنگ کی موٹر کا سایہ سا نظر آتا اور رات کے پچھلے پہر کی بھیدوں بھری خاموشی..... سوگندھی کو ایسا لگا کہ اس کے سر کا درد فضا پر بھی چھا گیا ہے۔ ایک سیما پن اسے ہوا کے اندر بھی محسوس ہوتا تھا۔ جیسے برآمدی اور بیوڑا کی باس سے وہ بو جھل ہو رہی ہے۔

آگے بڑھ کر رام لال نے موٹر کے اندر بیٹھے ہوئے آدمیوں سے کچھ کہا۔ اتنے میں جب سوگندھی موٹر کے پاس پہنچ گئی تو رام لال ایک طرف ہٹ کر کہا ”بیچے وہ آگئی..... بڑی اچھی چھو کڑی ہے جھوڑے ہی دن ہوئے ہیں اسے دھندلا شروع کیے“۔ پھر سوگندھی سے مخاطب ہو کر کہا ”سوگندھی ادھر آ بیٹھ جی بلاتے ہیں“۔

سوگندھی ساڑھی کا ایک کنارہ اپنی انگلی میں لپیٹتی ہوئی آگے بڑھی اور موٹر کے دروازے کے پاس کھڑی ہو گئی۔ سیٹھ صاحب نے بیٹری اس کے چہرے کے پاس روشن کی۔ ایک لمحے کے لیے اس روشنی نے سوگندھی کی خمار آلود آنکھوں میں

چکا چونہ پیدا کی۔ ہٹن دہانے کی آواز پیدا ہوئی اور روشنی بجھ گئی۔ ساتھ ہی سیٹھ صاحب کے منہ سے اونہہ نکلا پھر ایک دم موٹر کا انجن پھڑپھڑایا اور کار یہ جاوہ جا.....

سوگندھی کچھ سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ موٹر چل دی۔ اس کی آنکھوں میں ابھی بیڑی کی تیز روشنی تھی ہوئی تھی۔ وہ ٹھیک طرح سے سیٹھ کا چہرہ بھی تو نہ دیکھ سکی تھی۔ یہ آخر ہوا کیا تھا۔ اس اونہہ کا مطلب تھا جو ابھی تک اس کے کانوں میں بجھنا رہی تھی کیا؟..... کیا؟

رام لال دلال کی آواز سنائی دی ”پسند نہیں کیا تجھے؟..... اچھا ابھی میں چتا ہوں دو گھنٹے مفت میں ہی برباد کیے۔“

یہ سن کر سوگندھی کی ٹانگوں میں اس کی ہانپوں میں اس کے ہاتھوں میں ایک زبردست حرکت پیدا ہوئی۔ کہاں ہے وہ موٹر..... کہاں ہے وہ سیٹھ..... تو اونہہ کا مطلب یہ تھا کہ اس نے مجھے پسند نہیں کیا..... اس کی.....

گالی اس کے پیٹ کے اندر سے اٹھی تھی اور زبان کی نوک پر آکر رک گئی۔ وہ آخر گالی کسے دیتی۔ موٹر جا چکی تھی۔ اس کی دم کی سرخ بتی اس کے سامنے بازار کے اندھیارے میں ڈوب رہی تھی اور سوگندھی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ لال لال انگارہ اونہہ ہے جو اس کے سینے میں برے کی طرح اتر جا رہا ہے۔ اس کے جی میں آئی کہ زور سے پکارے ”اوسیٹھ..... اوسیٹھ..... ذرا موٹر روکنا اپنی..... بس ایک منٹ کے لیے“۔ پر وہ سیٹھ تھڑی ہے اس کی ذات سے بہت دور نکل چکا تھا۔ وہ سنان بازار میں کھڑی تھی۔ پھولوں والی ساڑھی جو وہ خاص خاص موقعوں

پر پہنا کرتی تھی رات کے پچھلے پہر کی ہلکی پھلکی ہوا سے ہر اہری تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس ساڑھی کے چیتھرے اڑا دے۔ کیونکہ ساڑھی ہوا میں ہر اہرا کر اونہہ اونہہ کر رہی تھی۔

گالوں پر اس نے پاؤ ڈر لگایا تھا اور ہونٹوں پر سرخی۔ جب اسے خیال آیا کہ یہ سنگار اس نے اپنے آپ کو پسند کرانے کے واسطے کیا تھا تو شرم کے مارے پسینہ آ گیا۔ یہ شرمندگی دور کرنے کے لیے اس نے کچھ نہ سوچا۔ ”میں نے اس موئے کو دکھانے کے لیے اپنے آپ کو سجایا تھا۔ یہ تو میری عادت ہے۔ میری کیا سب کی یہی عادت ہے۔۔۔۔۔۔ پر۔۔۔۔۔۔ پر۔۔۔۔۔۔ یہ رات کے دو بجے رام لال دالال اور۔۔۔۔۔۔ یہ بازار۔۔۔۔۔۔ اور وہ موٹر اور بیڑی کی چمک۔“ یہ سوچتے ہی روشنی کے دھبے اس کی حد تک فضا میں ادھر ادھر تیرنے لگے اور موٹر کے انجن کی پھڑ پھڑ ابٹ اسے ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ سنائی دینے لگی۔

اس کے ماتھے پر بام کا لپ جو سنگار کرنے کے دوران میں بالکل ہکا ہو گیا تھا۔ پسینہ آنے کے باعث اس کے مساموں میں داخل ہونے لگا اور سو گندھی کو اپنا ماتھا کسی اور کا ماتھا معلوم ہونے لگا۔ جب ہوا کا ایک جھونکا اس کے عرق آلود ماتھے کے پاس سے گزرا تو اسے ایسا لگا کہ سردی و ٹھن کا لکڑا کاٹ کر اس کے ماتھے کے ساتھ چسپاں کر دیا گیا ہے۔ سر میں درد ویسے کا ویسا موجود تھا۔ مگر خیالات کی بھیڑ بھاڑ اور ان کے شور نے اس کے درد کو اپنے نیچے دبا رکھا تھا۔ سو گندھی نے کئی بار اس درد کو اپنے خیالات کے نیچے سے نکال کر اوپر لانا چاہا مگر نام کام رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح اس کا انگ انگ دکھنے لگے۔ اس کے سر میں درد ہوا اس کی

ناگلوں میں درد ہو۔ اس کے پیٹ میں درد ہو اس کی ہانہوں میں درد ہو..... ایسا درد کہ صرف وہ درد کا ہی خیال کرے اور سب کچھ بھول جائے۔ یہ سوچتے سوچتے اس کے دل میں کچھ ہوا..... کیا یہ درد تھا؟..... ایک لمحے کے لیے اس کا دل سکڑا اور پھر پھیل گیا..... یہ کیا تھا؟..... لعنت! یہ تو وہی اونہہ تھی جو اس کے دل کے اندر کبھی سکڑتی اور کبھی پھیلتی تھی۔

گھر کی طرف سو گندھی کے قدم اٹھے ہی تھے کہ رک گئے اور وہ ٹھہر کر سوچنے لگی۔ رام لال دلال کا خیال ہے کہ اسے میری شکل پسند نہیں آئی۔ شکل کا تو اس نے ذکر نہیں کیا۔ اس نے تو یہ کہا تھا ”سو گندھی تجھے پسند نہیں کیا۔ اسے..... اسے..... صرف میری شکل ہی پسند نہیں آئی..... نہیں آئی تو کیا ہوا؟..... مجھے تو کئی آدمیوں کی شکل پسند نہیں آئی..... وہ جو اماؤس کی رات کو آیا تھا کتنی بری صورت تھی اس کی..... کیا میں نے ناک بھوں نہیں چڑھائی تھی؟ جب وہ میرے ساتھ سونے لگا تھا مجھے گھن نہیں آئی تھی؟..... کیا مجھے ابکائی آتی آتی نہیں رک گئی تھی؟..... ٹھیک ہے پر سو گندھی..... تو نے اسے دھکا رانہیں تھا۔ تو نے اسے ٹھکرایا نہیں تھا..... اس موڑ والے سیٹھ نے تو تیرے منہ پر جھوکا ہے..... اونہہ..... اس اونہہ کا اور مطلب ہی کیا ہے؟..... یہی کہ اس چھوٹے سر میں چنبیلی کا تیل..... اور..... یہ منہ اور مسور کی دال..... ارے رام لال تو یہ چھپکلی کہاں سے پکڑ کر لے آیا ہے..... اس لونڈیا کی اتنی تعریف کر رہا ہے تو..... دس روپے اور یہ عورت..... خچر کیا پری ہے.....“

سو گندھی سوچ رہی تھی اور اس کے چہرے کے انگوٹھے سے لے کر چوٹی تک گرم

لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اس کو کبھی اپنے آپ پر غصہ آتا تھا اور کبھی رام لال دلال پر جس نے رات کے دو بجے اسے بے آرام کیا لیکن فوراً ہی دونوں کو بے قصور پا کر وہ سیٹھ کا خیال کرتی تھی۔ اس کے خیال کے آتے ہی اس کی آنکھیں۔ اس کے کان۔ اس کی باہیں، اس کی ٹانگیں، اس کا سب کچھ مڑتا تھا، کہ اس سیٹھ کو کہیں دیکھ پائے۔۔۔ اس کے اندر یہ خواہش بڑی شدت سے پیدا ہو رہی تھی کہ جو کچھ ہو چکا ہے ایک بار پھر ہو۔۔۔ صرف ایک بار۔۔۔ وہ ہولے ہولے موڑ کی طرف بڑھے۔ موڑ کے اندر سے ایک ہاتھ بیڑی نکالے اور اس کے چہرے پر روشنی پھینکے اونہہ کی آواز آئے اور وہ۔۔۔ سو گندھی۔۔۔ اندھا دھند اپنے دونوں پنچوں سے اس کا منہ نوچنا شروع کر دے۔ وحشی بی بی کی طرح جھپٹے اور۔۔۔ اپنی انگلیوں کے سارے ناخن جو اس نے موجودہ فیشن کے مطابق بڑھا رکھے تھے اس سیٹھ کے گالوں میں گاڑ دے۔۔۔ بالوں سے پکڑ کر اسے باہر گھسیٹ لے اور دھڑ دھڑ کے مارنا شروع کر دے اور جب تھک جائے۔۔۔ جب تھک جائے تو رونا شروع کر دے۔

رونے کا خیال سو گندھی کو صرف اس لیے آیا تھا کہ اس کی آنکھوں میں غصے اور بے بسی کی شدت کے باعث تین چار بڑے بڑے آنسو بن رہے تھے۔ ایک ایک سو گندھی نے اپنی آنکھوں سے سوال کیا کہ ”تم روتی کیوں ہو؟ تمہیں کیا ہوا ہے کہ ٹپکنے لگی ہو؟“ آنکھوں سے کیا ہوا سوال چند لمحات تک ان آنسوؤں میں تیرتا رہا جو اب پلکوں پر کانپ رہے تھے سو گندھی ان آنسوؤں سے دیر تک اس خلا کو گھورتی رہی جدھر سیٹھ کی موڑ گئی تھی۔

پچھڑ پچھڑ۔۔۔ یہ آواز کہاں سے آئی ہے؟۔۔۔ سو گندھی نے چونک کر ادھر

ادھر دیکھا لیکن کسی کو نہ پایا..... ارے یہ تو اس کا دل پھڑپھڑایا ہے۔ وہ کبھی تھی کہ موٹر کا انجن بولا ہے..... اس کا دل..... یہ کیا ہو گیا تھا اس کے دل کو..... آج ہی یہ روگ لگ گیا تھا اسے..... اچھا بھلا چلتا چلتا ایک جگہ رک کر دھڑا دھڑا کیوں کرتا تھا..... بالکل اس گھسے ہوئے ریکارڈ کی طرح جو سوئی کے نیچے ایک جگہ رک جاتا تھا "رات کئی گن گن تارے" کہتا کہتا تارے تارے کی رٹ لگا دیتا تھا۔

آسمان تاروں سے اٹا ہوا تھا۔ سو گندھی نے ان کی طرف دیکھا اور کہا "کتنے سندر ہیں"..... وہ چاہتی تھی کہ اپنا دھیان کسی اور طرف پٹ دے۔ پر جب اس نے سندر کہا تو جھٹ سے یہ خیال اس کے دماغ میں کودا "یہ تارے سندر ہیں پر تو کتنی بھونڈی ہے۔ کیا بھول گئی کہ ابھی ابھی تیری صورت کو بھونکا رہا گیا ہے؟"

سو گندھی بد صورت تو نہیں تھی۔ یہ خیال آتے ہی وہ تمام کس ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگے۔ جوان پانچ برسوں کے دوران میں وہ آئینے میں دیکھ چکی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا رنگ روپ اب وہ نہیں رہا تھا جو آج سے پانچ سال پہلے تھا۔ جب کہ وہ تمام فکروں سے آزاد اپنے ماں باپ کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ لیکن وہ بد صورت تو نہیں ہو گئی تھی۔ اس کی شکل و صورت ان عام عورتوں کی سی تھی جن کی طرف مرد گزرتے گزرتے گھور کر دیکھ لیا کرتے ہیں۔ اس میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو سو گندھی کے خیال میں ہر مرد ایک عورت کے لیے ضروری سمجھتا ہے جس کے ساتھ اسے ایک دو راتیں بسر کرنا ہوتی ہیں۔ وہ جوان تھی۔ اس کے اعضاء متناسب تھے۔ کبھی کبھی نہاتے وقت اس کی ٹکاہیں اپنی رانوں پر پڑتی تھیں تو وہ خود ان کی گواہی اور گدراہٹ کو پسند کیا کرتی تھی۔ وہ

خوش خلق تھی۔ ان پانچ برسوں کے دوران میں شاید ہی کوئی آدمی اس سے ناخوش ہو کر گیا ہو..... بڑی ملمسار تھی بڑی رحم دل تھی۔ پچھلے دنوں کر مس مین جب وہ گول پیٹھا میں رہا کرتی تھی۔ ایک نوجوان لڑکا اس کے پاس آیا تھا۔ صبح اٹھ کر جب اس نے دوسرے کمرے میں جا کر کھوئی سے اپنا کوٹ اتارا تو بٹوہ غائب پایا۔ سو گندھی کا نوکر یہ بٹوہ لے اڑا تھا۔ بے چارہ بہت پریشان ہوا۔ چٹیاں گزرنے کے لیے حیدر آباد سے ہمیں آیا تھا۔ اب اس کے پاس واپس جانے کے لیے دام نہ تھے۔ سو گندھی نے ترس کھا کر اس کے دس روپے واپس کر دیے تھے۔ ”مجھ میں کیا برائی؟“ سو گندھی نے یہ سوال ہر اس چیز سے کیا تھا جو اس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ گیس کے اندھے لیمپ لوہے کے کھمبے فٹ پاتھ کے چوکور پتھر اور سڑک پر اکھڑی ہوئی بجری..... ان سب چیزوں کی طرف اس نے باری باری دیکھا پھر آسمان کی طرف دیکھا ہیں اٹھائیں جو اس کے اوپر جھکا ہوا تھا مگر سو گندھی کو کوئی جواب نہ ملا۔ جواب اس کے اندر موجود تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بری نہیں اچھی ہے۔ پر وہ چاہتی تھی کہ کوئی اس کی تائید کرے..... کوئی..... کوئی..... اس وقت کوئی اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر صرف اتنا کہہ دے ”سو گندھی کون کہتا ہے تو بری ہے جو تجھے برا کہے وہ آپ برا ہے“۔ نہیں یہ کہنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ کسی کا اتنا کہہ دینا کافی تھا ”سو گندھی! تو بہت اچھی ہے“۔

وہ سوچنے لگی کہ وہ کیوں چاہتی ہے کہ کوئی اس کی تعریف کرے۔ اس سے پہلے اسے اس بات کی اتنی شدت سے ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ آج کیوں وہ بے جان چیزوں کو بھی ایسی نظروں سے دیکھتی ہے جیسے ان پر اپنے اچھے ہونے کا

احساس طاری کرنا چاہتی ہے۔ اس کے جسم کا ذرہ ذرہ کیوں ماں بن رہا تھا۔ وہ ماں بن کر دھرتی کی ہر شے کو اپنی گود میں لینے کے لیے کیوں تیار ہو رہی تھی؟۔۔۔۔۔ اس کا جی کیوں چاہتا تھا کہ سامنے والے گیس کے ہٹنی کھبے کے ساتھ چٹ جائے اور اس کے سر دلوں پر اپنے گال رکھ دے۔۔۔۔۔ اپنے گرم گرم گال اور اس کی ساری سر دی چوس لے۔

تھوڑی دیر کے لیے اسے ایسا محسوس ہوا کہ گیس کے اندر سے لپ لپوہے کے کھبے فٹ پاتھ کے چوکور پتھر اور ہر وہ شے جو رات کے سناٹے میں اس کے آس پاس تھی ہمدردی کی نظروں سے اسے دیکھ رہی ہے اور اس کے اوپر جھکا ہوا آسمان بھی جو میا لے رنگ کی ایسی موٹی چادر معلوم ہوتا ہے جس میں بے شمار سوراخ ہو رہے ہوں۔ اس کی باتیں سمجھتا تھا اور سو گندھی کو بھی ایسا لگتا تھا کہ وہ تاروں کا ٹمٹما سمجھتی ہے۔۔۔۔۔ لیکن اس کے اندر یہ کیا گڑبڑ تھی۔۔۔۔۔ وہ کیوں اپنے اندر اس موسم کی فضا محسوس کرتی تھی جو بارش سے پہلے دیکھنے میں آتا ہے۔۔۔۔۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس کے جسم کا ہر مسام کھل جائے اور جو کچھ اس کے اندر ابل رہا ہے ان کے رستے سے باہر نکل جائے۔ پر یہ کیسے ہو۔۔۔۔۔ کیسے ہو؟

سو گندھی گلی کے ٹکڑ پر خط ڈالنے والے اہل بھیکے کے پاس کھڑی تھی۔۔۔۔۔ ہوا کے تیز جھونکے نے اس بھیکے کی ہٹنی زبان جو اس کے کھلے منہ میں لٹکتی رہتی ہے لڑکھڑاتی ہوئی سو گندھی کی نکالیں یک یک اس طرف انھیں جدھر موڑ گئی تھی مگر اسے کچھ نظر نہ آیا۔ اسے کتنی زبردست آرزو تھی کہ وہ موڑ ایک بار پھر آئے اور۔۔۔۔۔

اور۔۔۔۔۔

”نہ آئے..... بلا سے..... میں جان کیوں بیکار ہاں کروں..... گھر چلتے ہیں اور آرام سے لمبی تان کر سوتے ہیں۔ ان جھٹڑوں میں رکھا ہی کیا ہے۔ مفت کی دوسری ہی تو ہے۔ چل سو گندھی گھر چل..... ٹھنڈے پانی کا ایک ڈونکا پی اور تھوڑا سا بام ل کر سو جا..... فرسٹ کلاس نیند آئے گی سب ٹھیک ہو جائے گا..... سیٹھ اور اس کی موٹر کی ایسی تہی“۔

یہ سوچتے ہوئے سو گندھی کا بو جھہکا ہو گیا۔ جیسے وہ کسی ٹھنڈے تالاب سے نہا دھو کر باہر نکلی ہے جس طرح پوجا کرنے کے بعد اس کا جسم ہلکا ہو جاتا تھا اسی طرح اب بھی ہلکا ہو گیا تھا۔ گھر کی طرف چلنے لگی تو خیالات کا بو جھہ نہ ہونے کے باعث اس کے قدم کئی بار لڑکھڑائے۔

اپنے مکان کے پاس پہنچی تو ایک ٹیس کے ساتھ پھر تمام واقعہ اس کے دل میں اٹھا اور دردی طرح اس کے روئیں روئیں پر چھا گیا..... قدم پھر بو جھل ہو گئے اور وہ اس بات کو شدت کے ساتھ محسوس کرنے لگی کہ گھر سے بلا کر باہر بازار میں منہ پر روشنی کا چائنا مار کر ابھی ابھی اس کی جین کی ہے۔ یہ خیال آیا تو اس نے اپنی پسلیوں پر کسی سخت انگوٹھے محسوس کیے جیسے کوئی اسے بھیڑ بکری کی طرح دبا دبا کر دیکھ رہا ہے کہ آیا گوشت بھی ہے یا بال ہی بال ہیں..... اس سیٹھ نے..... پر ماتما کرے..... سو گندھی نے چاہا کہ اس کو بدعا دے مگر سوچا بدعا دینے سے کیا بنے گا۔ مزہ تو جب تھا کہ وہ سامنے ہوتا اور وہ اس کے وجود کے ہر ذرے پر اپنی لعنتیں لکھ دیتی..... اس کے منہ پر کچھ ایسے الفاظ کہتی کہ زندگی بھر بے چین رہتا..... کپڑے پھاڑ کر اس کے سامنے نکلی ہو جاتی اور کہتی ”یہی لینے آیا تھا نہ تو؟..... لے

وام دیے بنالے جا اسے..... پر جو کچھ میں ہوں جو کچھ میرے اندر چھپا ہوا ہے وہ تو کیا تیرا باپ بھی نہیں خرید سکتا۔“

انتقام کے نئے نئے طریقے سوگندھی کے ذہن میں آرہے تھے۔ اگر اس سینٹھ سے ایک بار..... صرف ایک بار..... اس کی مڈ بھینٹ ہو جائے تو وہ یہ کرے..... یوں اس سے انتقام لے نہیں یوں نہیں یوں..... لیکن جب سوگندھی سوچتی کہ سینٹھ سے اس کا وہ بارہ مانا محال ہے تو وہ اسے ایک چھوٹی سی گالی دینے پر خود کو راضی کر لیتی..... بس صرف ایک چھوٹی سی گالی جو اس کی ناک پر چپکواکھی کی طرح بیٹھ جائے اور ہمیشہ وہیں جمی رہے۔

اسی ادھیڑ بن میں وہ دوسری منزل میں اپنی کھولی کے پاس پہنچ گئی۔ چولی سے چابی نکال کر تالا کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو چابی ہوا ہی میں گھوم کر رہ گئی۔ کندھے میں تالا نہیں تھا۔ سوگندھی نے کواڑ کے اندر کی طرف دبائے تو ہلکی سی چہرہ اٹھ پیدا ہوئی۔ اندر سے کسی نے کندھی کھولی اور دروازے پر جھانکی..... سوگندھی اندر داخل ہو گئی۔

مادھو موٹھوں میں ہنسا اور دروازہ بند کر کے سوگندھی سے کہنے لگا ”آج تو نے میرا کہا مان ہی لیا..... صبح کی سیر تندرستی کے لیے بڑی اچھی ہوتی ہے۔ ہر روز صبح اٹھ کر اس طرح گھومنے جایا کرے گی تو تیری ساری سستی دور ہو جائے گی اور وہ تیری کمر کا درد بھی غائب ہو جائے گا جس کی بابت تو آئے دن شکایت کیا کرتی ہے..... وکنور یہ گارڈن تک تو ہو آئی ہو گی تو؟..... کیوں؟

سوگندھی نے کوئی جواب نہ دیا اور نہ مادھو نے جواب کی خواہش ظاہر کی۔

دراصل جب مادھو بات کیا کرتا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا تھا کہ سوگندھی ضرور اس میں حصہ لے اور سوگندھی جب کوئی بات کرتی تھی تو یہ ضروری نہیں ہوتا تھا کہ مادھو اس میں حصہ لے۔ چونکہ کوئی بات کرنا ہوتی تھی اس لیے وہ کچھ کہہ دیا کرتے تھے۔

مادھو بید کی کرسی پر بیٹھ گیا جس کی پشت پر اس کے تیل سے چڑے ہوئے سر نے میل کا بہت بڑا دھبہ بنا رکھا تھا۔ اور ناگ پر ناگ رکھ کر اپنی مونچھوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

سوگندھی پانگ پر بیٹھ گئی اور مادھو سے کہنے لگی ”میں آج تیرا انتظار کر رہی تھی۔“

مادھو بڑا شپٹایا ”انتظار؟..... تجھے کیسے معلوم ہوا کہ میں آنے والا ہوں؟“

سوگندھی کے ہنسنے ہوئے لب کھلے۔ ان پر ایک پیلی مسکراہٹ نمودار ہوئی ”میں نے رات تجھے سنے میں دیکھا تھا..... اٹھی تو کوئی بھی نہ تھا سو جی نے کہا چلو کہیں باہر گھوم آئیں اور.....“

مادھو خوش ہو کر بولوا اور میں آ گیا..... بھی بڑے لوگوں کی باتیں بڑی پکی ہوتی ہیں۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے دل کو دل سے راہ ہے..... تو نے یہ سنا کب دیکھا تھا؟“

سوگندھی نے جواب دیا ”چار بجے کے قریب۔“

مادھو کرسی پر سے اٹھ کر سوگندھی کے پاس بیٹھ گیا ”اور میں نے ٹھیک دو بجے سنے میں دیکھا..... جیسے تو پھولوں والی ساڑھی..... ارے بالکل یہی ساڑھی سنے

میرے پاس کھڑی ہے۔ تیرے ہاتھوں میں..... کیا تھا تیرے ہاتھوں میں.....
 ہاں تیرے ہاتھوں میں روپوں سے بھری ہوئی تھیلی تھی۔ تو نے یہ تھیلی میری جھولی
 میں رکھ دی اور کہا ”مادھو تو چتا کیوں کرتا ہے..... لے یہ تھیلی..... ارے تیرے
 میرے روپے کیا وہ ہیں؟“..... سو گندھی تیری جان کی قسم میں فوراً اٹھا اور نکلت کنا
 کر ادھر کا رخ کیا..... کیا سناؤں بڑی پریشانی ہے..... بیٹھے بٹھائے ایک کیس ہو
 گیا ہے اب بیس تیس روپے ہوں تو..... انسپکٹر کی مٹھی گرم کر کے چھٹکارا ملے.....
 تھک تو نہیں گئی تو؟ لیٹ جا میں تیرے کو دبا دوں۔ سیر کی عادت نہ ہو تو تھکن ہو ہی
 جایا کرتی ہے..... ادھر میری طرف پیر کر کے لیٹ جا۔“

سو گندھی لیٹ گئی۔ دونوں باہوں کا تکیہ بنا کر وہ ان پر سر رکھ کر لیٹ گئی اور اسی
 لہجے میں جو اس کا اپنا نہیں تھا۔ مادھو سے کہنے لگی ”مادھو یہ کس موئے نے تجھ پر کیس
 کیا ہے؟..... جیل ویل کا ڈر ہو تو مجھ سے کہہ دے..... بیس تیس کیا سو پچاس بھی
 ایسے موقعوں پر پولیس کے ہاتھ میں تھما دیے جائیں تو فائدہ اپنا ہی ہے..... جان
 بچی لاکھوں پائے..... بس بس اب جانے دے..... تھکن کچھ زیادہ نہیں ہے۔ مٹھی
 چا پی چھوڑ اور مجھے ساری بات سنا..... کیس کا نام سنتے ہی میرا دل دھک دھک
 کرنے لگا ہے..... واپس کب جائے گا تو؟“

مادھو کو سو گندھی کے منہ سے شراب کی باس آئی۔ اس نے یہ موقع اچھا سمجھا اور
 جھٹ سے کہا ”دو پیر کی گاڑی سے واپس جانا پڑے گا۔ اگر شام تک سب انسپکٹر کو
 سو پچاس نہ تھمائے تو..... زیادہ دینے کی ضرورت نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ پچاس
 میں کام چل جائے گا۔“

”پچاس“ یہ کہہ کر سوگندھی بڑے آرام سے اٹھی اور ان چار تصویروں کے پاس آہستہ آہستہ گئی جو دیوار پر لٹک رہی تھیں۔ بائیں طرف والے فریم میں مادھو کی تصویر تھی۔ بڑے بڑے پھولوں والے پردے کے آگے کرسی پر وہ دونوں رانوں پر اپنے ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔ پاس ہی تپائی پر وہ موٹی موٹی کتابیں دھری تھیں۔ تصویر اتر والے وقت تصویر اتر والے کا خیال مادھو پر اس قدر غالب تھا کہ اس کی ہر شے تصویر سے باہر نکل کر گویا پکار رہی تھی ”ہمارا فوٹو اترے گا ہمارا فوٹو اترے گا“۔ کیمرے کی طرف مادھو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فوٹو اتر والے وقت اسے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔

سوگندھی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی کچھ ایسی تیکھی اور نوکیلی تھی کہ مادھو کے سونیاں سی چھیں۔ پلنگ پر سے اٹھ کر وہ سوگندھی کے پاس گیا۔ ”کس کی تصویر دیکھ کر تو اس قدر زور سے ہنسی ہے؟“

سوگندھی نے بائیں ہاتھ کی پہلی تصویر کی طرف اشارہ کیا جو میونسپلٹی کے داروندر صفائی کی تھی ”غشی پائی کے اس داروندر کی..... دیکھو تو اس کا ہمو بڑا..... کہتا تھا ایک رانی مجھ پر عاشق ہو گئی تھی..... اونہ یہ منہ اور مسور کی وال“۔ یہ کہہ کر سوگندھی نے فریم کو اس زور سے کھینچا کہ دیوار میں سے کیل بھی پلستر سمیت اکھڑ آئی۔

مادھو کی حیرت ابھی دور نہ ہوئی تھی کہ سوگندھی نے فریم کو کھڑکی کے باہر پھینک دیا۔ دو منزلوں سے یہ فریم نیچے زمین پر گر ا اور کچھ کے ٹوٹنے کی جھجکارسنائی دی۔ سوگندھی نے اس جھجکار کے ساتھ کہا ”رانی بھنگن کچرا اٹھانے آئے گی تو میرے

اس رولہ کو بھی ساتھ لے جائے گی۔“

ایک بار پھر اسی نوکیلی اور تیکھی ہنسی کی پھوار سوگندھی کے ہونٹوں پر گرنا شروع ہوئی۔ جیسے وہ ان پر چاقو چھری کی دھارتیز کر رہی ہے۔ مادھو بڑی مشکل سے مسکرایا پھر ہنسا ”ہی ہی ہی“۔

ایک ہاتھ سے سوگندھی نے پگڑی والے کی تصویر اتاری اور دوسرا ہاتھ اس فریم کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایک سینڈ میں فریم کیل سمیت سوگندھ کے ہاتھ میں تھا۔ زور کا قہقہہ لگا کر اس نے اونہ کی اور دونوں فریم ایک ساتھ کھڑکی میں سے باہر پھینک دیے۔ دو منزلوں سے جب فریم زمین پر گرے اور کانچ کے ٹوٹنے کی آواز آئی تو مادھو کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے۔ بڑی مشکل سے اس نے ہنس کر کہا کہ مجھے بھی یہ فوٹو پسند نہیں تھے۔“

آہستہ آہستہ سوگندھی مادھو کے پاس آئی اور کہنے لگی ”تجھے یہ فوٹو پسند نہیں تھا..... پر میں پوچھتی ہوں تجھ میں کون سی ایسی چیز ہے جو کسی کو پسند آسکتی ہے..... یہ تیری پکوڑا ایسی ناک، یہ تیرا بالوں بھرا ماتھا، یہ تیرے سونجھے ہوئے تھن، یہ تیرے مڑے ہوئے کان، یہ تیرے منہ کی باس، یہ تیرے بدن کا میل؟..... تجھے اپنا فوٹو پسند نہیں تھا اونہ..... پسند کیوں ہوتا تیرے عیب جو چھپا رکھے تھے اس نے..... آج کل زمانہ ہی ایسا ہے جو عیب چھپائے وہ ہی برا۔“

مادھو سے پیچھے ہٹا گیا۔ آخر جب وہ دیوار کے ساتھ لگ گیا تو اس نے اپنی آواز میں زور پیدا کر کے کہا ”دیکھ سوگندھی مجھے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تو نے پھر سے اپنا دھندلا شروع کیا ہے..... اب تجھ سے آخری بار کہتا ہوں.....“

سوگندھی نے اس سے آگے مادھو کے لہجے میں کہنا شروع کیا ”اگر تو نے پھر سے اپنا دھندلا شروع کیا تو بس تیری میری ٹوٹ جائے گی۔ اگر تو نے پھر کسی کو اپنے ہاں ٹھہرایا تو چٹیا سے پکڑ کر تجھے باہر نکال دوں گا۔ اس مہینے کا خرچ میں تجھے پونا پہنچتے ہی منی آرڈر کر دوں گا..... ہاں کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا؟“
مادھو چکرا گیا۔

سوگندھی نے کہنا شروع کیا ”میں بتاتی ہوں..... پندرہ روپیہ بھاڑا ہے اس کھولی کا..... اور دس روپے بھاڑا ہے میرا..... اور جیسا تجھے معلوم ہے ڈھائی روپے دالال کے باقی رہے ساڑھے سات رہے نہ ساڑھے سات! ساڑھے سات روپوں میں میں نے ایسی چیز دینے کا وچن دیا تھا جو میں دے ہی نہیں سکتی تھی اور تو ایسی چیز لینے آیا تھا جو تو لے ہی نہیں سکتا تھا..... تیرا میرا ماطہ ہی کیا ہے۔ کچھ بھی نہیں بس یہ دس روپے تیرے اور میرے سچ میں بچ رہے تھے۔ سو ہم دونوں نے مل کر ایسی بات کی کہ تجھے میری ضرورت ہوئی اور مجھے تیری..... پہلے میرے اور تیرے سچ دس روپے بچتے تھے آج پچاس بچ رہے ہیں۔ تو بھی ان کا بچنا سن رہا ہے اور میں بھی ان کا بچنا سن رہی ہوں۔ یہ تو نے اپنے بالوں کا کیا ستیا ناس مار رکھا ہے؟“

یہ کہہ کر سوگندھی نے مادھو کی ٹوپی انگلی سے ایک طرف اڑا دی۔ یہ حرکت مادھو کو بہت ناگوار گزری۔ اس نے بڑے کڑے لہجے میں کہا ”سوگندھی“۔

سوگندھی نے مادھو کی جیب سے رو مال نکال کر سونگھا اور زمین پر پھینک دیا ”یہ چیترے، یہ چندیاں..... اف کتنی بری باس آتی ہے۔ اٹھا کے باہر پھینک ان

کو.....“

مادھو چایا ”سوگندھی“۔

سوگندھی نے تیز لہجے میں کہا ”سوگندھی کے بچے تو آیا کس لیے ہے یہاں؟ تیری ماں رتی یہ اس جگہ جو تجھے پچاس روپے دے گی؟ یا تو کوئی ایسا بڑا گھبرو جوان ہے جو میں تجھ پر عاشق ہو گئی ہوں..... کتے کینے مجھ پر رعب گانٹتا ہے؟ میں تیری دہیل ہوں کیا؟..... بھک مگنے تو اپنے آپ کو سمجھ کیا بیٹھا ہے؟..... میں پوچھتی ہوں تو ہے کون؟..... چور یا گھکتر؟..... اس وقت تو میرے مکان میں کیا کرنے آیا ہے؟..... باؤں پولیس کو؟..... پونے میں تجھ پر کیس ہونہ ہو۔ یہاں تو تجھ پر ایک کیس کھڑا کر دوں.....“

مادھو سم گیا۔ دے ہوئے لہجے میں صرف اس قدر کہہ سکا ”سوگندھی تجھے کیا ہو گیا ہے؟“

”تیری ماں کا سر..... تو ہوتا کون ہے مجھ سے ایسے سوال کرنے والا..... بھاگ یہاں سے ورنہ.....“ سوگندھی کی باند آواز سن کر اس کا خارش زدہ کتا جو سوکھے ہوئے چیلوں میں منہ رکھے سو رہا تھا۔

ہڑبڑا کر اٹھا اور مادھو کی طرف منہ اٹھا کے بھونکنا شروع کر دیا۔ کتے کے بھونکنے کے ساتھ ہی سوگندھی زور زور سے ہنسنے لگی۔

مادھو ڈر گیا۔ گرمی ہوئی ٹوپی اٹھانے کے لیے وہ جھکا تو سوگندھی کی گرج سنا دی ”خبردار!..... پڑی رہنے دے وہیں..... تو جاتیرے پوتا بچتے ہی میں اس کو منی آرڈر کر دوں گی“۔ یہ کہہ کر وہ اور زور سے ہنسی اور ہنستی ہنستی کرسی پر بیٹھ گئی۔

اس کے خارش زدہ کتے نے بھونک بھونک کر مادھو کو کمرے سے باہر نکال دیا۔
 میٹھیاں اتار کر جب کتنا اپنی دم ہلاتا ہوا سو گندھی کے پاس واپس آیا اور اس کے
 قدموں کے پاس بیٹھ کر کان پھڑپھڑانے لگا تو سو گندھی چونکی..... اس نے اپنے
 چاروں طرف ایک ہولناک سناو دیکھا..... ایسا سناو جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا
 تھا۔ اسے ایسا لگا کہ ہر شے خالی ہے..... جیسے مسافروں سے لدی گاری اسٹیشنوں
 پر مسافر کو اتار کر اب لوہے کے شید میں بالکل اکیلی کھڑی ہے۔

یہ خلا جو اچانک سو گندھی کے اندر پیدا ہو گیا تھا۔ اسے بہت تکلیف دے رہا تھا
 ۔ اس نے کافی دیر تک اس خلا کو بھرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ وہ ایک ہی وقت
 میں بے شمار خیالات اپنے دماغ میں ٹھوسستی تھی مگر بالکل چیلانی کا سا حساب تھا۔ ادھر
 دماغ کو پر کرتی تھی ادھر وہ خالی ہو جاتا تھا۔

بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اس کو اپنا
 دل پرچانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور
 ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اسے پہلو میں لٹا کر سو گئی۔

☆☆☆

یزید

سن سینتالیس کے ہنگامے آئے اور گزر گئے۔ بالکل اسی طرح جس طرح موسم میں خلاف معمول چند دن خراب آئیں اور پلے جانیں۔ یہ نہیں کہ کریم دادو مولا کی مرضی سمجھ کر خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے اس طوفان کا مردانہ وار مقابلہ کیا تھا۔ مخالف قوتوں کے ساتھ وہ کئی بار بھڑا تھا۔ شکست دینے کے لیے نہیں صرف مقابلہ کرنے کے لیے۔ اس کو معلوم تھا کہ دشمنوں کی طاقت بہت زیادہ ہے۔ مگر ہتھیار ڈال دینا وہ اپنی ہی نہیں ہر مرد کی توہین سمجھتا تھا۔ سچ پوچھے تو اس کے متعلق یہ صرف دوسروں کا خیال تھا ان کا جنہوں نے اسے وحشی نما انسانوں سے بڑی جاں بازی سے لڑتے دیکھا تھا۔ ورنہ اگر کریم دادو سے اس بارے میں پوچھا جاتا کہ مخالف قوتوں کے مقابلے میں ہتھیار ڈالنا کیا وہ اپنی یا مرد کی توہین سمجھتا ہے۔ وہ یقیناً سوچ میں پڑ جاتا۔ جیسے آپ نے اس سے حساب کا کوئی بہت ہی مشکل سوال کر دیا ہے۔

کریم دادو جمع تفریق اور ضرب تقسیم سے بالکل بے نیاز تھا۔ سن سینتالیس کے ہنگامے آئے اور گزر گئے۔ لوگوں نے بیٹھ کر حساب لگانا شروع کیا کہ کتنا جانی نقصان ہوا ہے کتنا مالی مگر کریم دادو اس سے بالکل الگ تھلک رہا۔ اس کو صرف اتنا معلوم تھا کہ اس کا باپ رحیم دادو اس جنگ میں کام آیا ہے۔ اس کی لاش خود کریم دادو نے اپنے کندھوں پر اٹھائی تھی اور ایک کنوئیں کے پاس گڑھا کھود کر دفنانی تھی۔ گاؤں میں اور بھی کئی وارداتیں ہوئی تھیں۔ سینکڑوں جوان اور بوڑھے قتل

ہوئے تھے کئی لڑکیاں غائب ہوئی تھیں۔ کچھ کہ بہت ظالمانہ طریقے سے بے
آبروئی ہوئی تھی۔ کس کے بھی یہ زخ آئے تھے رہتا تھا۔ اپنے پھولے نصیبوں اور
دشمنوں کی بے رحمی پر مگر کریم داد کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ نکلا۔ اپنے باپ رحیم
داد کی شہرہ زوری پر اسے مارتا تھا جب وہ بچپن میں برچھیوں اور کلہاڑیوں سے مسلح
بلوانیوں کا مقابلہ کرتے کرتے بڑھال ہو کر گر پڑا تھا اور کریم داد کو اس کی موت کی
خبر ملی تو اس نے اس کی روح کو مخاطب کر کے صرف اتنا کہا تھا ”یار تم نے یہ ٹھیک نہ
کیا۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ ایک ہتھیار اپنے پاس ضرور رکھا کرو۔“

اور اس نے رحیم داد کی لاش اٹھا کر کنوئیں کے پاس گھڑا کھود کر دفنا دی تھی اور
اس کے پاس کھڑے ہو کر فاتحہ کے طور پر صرف یہ چند الفاظ کہے تھے ”گناہ ثواب
کا حساب خدا جانتا ہے اچھا تجھے بہشت نصیب ہو۔“

رحیم داد جو نہ صرف اس کا باپ تھا بلکہ ایک بہت بڑا دوست بھی تھا بلوانیوں
نے بڑی بے دردی سے قتل کیا تھا۔ لوگ جب اس کی افسوس ناک کا ذکر کرتے
تھے تو قاتلوں کو بڑی گالیاں دیتے تھے مگر کریم داد خاموش رہتا تھا۔ اس کی کئی
کھری فصلیں تباہ ہو گئی تھیں۔ دو مکان جل کر راکھ ہو گئے تھے۔ مگر اس نے اپنے
ان نقصانوں کا کبھی حساب نہیں لگایا تھا۔ وہ کبھی کبھی صرف اتنا کہا کرتا تھا ”جو کچھ
ہوا ہماری اپنی غلطی سے ہوا ہے۔“ اور جب کوئی اس سے اس غلطی کے متعلق
استفسار کرتا تو وہ خاموش رہتا۔

گاؤں کے لوگ ابھی سوگ میں مصروف تھے کہ کریم داد نے شادی کر لی۔ اسی
میار جیناں سے ساتھ جس پر ایک عرصے سے اس کی نگاہ تھی۔ جیناں سوگوار تھی۔

اس کا شبہ تیر جیسا کڑیل جوان بھائی بلووں میں مارا گیا تھا۔ ماں باپ کی موت کے بعد ایک صرف وہی اس کا سہارا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جیناں کو کمری داو سے بے پناہ محبت تھی مگر بھائی کی موت کے غم نے یہ محبت اس کے دل میں سیاہ پوش کر دی تھی اب ہر وقت اس کی سدا مسکراتی آنکھیں نمناک رہتی تھیں۔

کریم داد کو رونے دھونے سے بہت چہرہ تھی۔ وہ جیناں کو جب بھی سوگ زدہ حالت میں دیکھتا تو دل ہی دل میں بہت کڑھتا۔ مگر وہ اس سے اس بارے میں کچھ کہتا نہیں تھا۔ یہ سوچ کر کہ عورت ذات ہے۔ ممکن ہے اس کے دل کو اور زیادہ دکھ پہنچے مگر اس روز اس سے رہا نہ گیا۔ کھیت میں اس نے جیناں کو پکڑ لیا اور کہا۔۔۔۔۔ ”مردوں کو کفنائے دفنائے پورا ایک سال ہو گیا ہے اب تو وہ بھی اس سوگ سے گھبرا گئے ہوں گے۔۔۔۔۔ چھوڑ میری جان! ابھی زندگی میں جانے اور کتنی موتیں دیکھنی ہیں۔ کچھ آنسو تو اپنی آنکھوں میں جمع رہنے دے۔“

جیناں کو اس کی یہ باتیں بہت ناگوار معلوم ہوتی تھیں۔ مگر وہ اس سے محبت کرتی تھی اس لیے اکیلے میں اس نے کئی گھنٹے سوچ سوچ کر اس کی باتوں میں معنی پیدا کیے اور آخر خود کو یہ سمجھنے پر آمادہ کر لیا کہ کریم داد جو کچھ کہتا ہے ٹھیک ہے۔

شادی کا سوال آیا تو بڑے بوڑھوں نے مخالفت کی مگر یہ مخالفت بہت ہی کمزور تھی۔ وہ لوگ سوگ منا منا کراتے نہ تھے کہ ایسے معاملوں میں سو فیصدی کامیاب ہونے والی مخالفتوں پر بھی زیادہ دیر تک نہ جھرے سکے۔۔۔۔۔ چنانچہ کریم داد کا بیاہ ہو گیا۔ باجے گاجے آئے ہر رسم ادا ہوئی اور کریم داد اپنی محبوبہ جیناں کو دلہن بنا کر گھر لے آیا۔

فسادات کے بعد قریب قریب ایک برس سے سارا گاؤں قبرستان سا بنا تھا۔ جب کریم داد کی برات چلی اور خوب دھوم دھڑکا ہوا تو گاؤں کے کئی آدمی سہم گئے۔ ان کو ایسا محسوس ہوا کہ یہ کریم داد کی نہیں کسی بھوت پریت کی برات ہے۔ کریم داد کے دوستوں نے جب اس کو یہ بات بتائی تو وہ خوب ہنسا۔ ہنستے ہنستے ہی اس نے ایک روز اس کا ذکر اپنی نئی نویلی دلہن سے کیا تو وہ ڈر کے مارے کانپ اٹھی۔ کریم داد نے جیناں کی سوہے چوڑے والی کلائی اپنے ہاتھ میں لی اور کہا ”یہ بھوت تو اب ساری عمر تمہارے ساتھ چٹا رہے گا۔۔۔۔۔ رحمان سائیں کی جھاڑ پھونک بھی اتار نہیں سکے گی۔“

جیناں نے اپنی مہندی میں رچی ہوئی انگلی دانتوں تلے دبا کر اور ذرا شرمائل کر صرف اتنا کہا ”کیسے تجھ کو کسی سے بھی ڈر نہیں لگتا۔“ کریم داد نے اپنی ہلکی ہلکی سیاہی مائل بھوری مونچھوں پر زبان کی نوک پھیری اور مسکرا دیا۔۔۔۔۔ ”ڈر بھی کوئی لگنے کی چیز ہے؟“

جیناں کا غم اب بہت حد تک دور ہو چکا تھا۔ وہ ماں بننے والی تھی۔ کریم داد کی جوانی کا نکھار دیکھتا تو بہت خوش ہوتا اور جیناں سے کہتا ”خدا کی قسم جیناں تو پہلے کبھی اتنی خوبصورت نہیں تھی۔ اگر تو اتنی خوبصورت اپنے ہونے والے بچے کے لیے بنی ہے تو میری اس سے لڑائی ہو جائے گی۔“

یہ سن کر جیناں شرمائل کر اپنا ٹھلٹھا سا پیٹ چادر میں چھپا لیتی کریم داد ہنستا اور اسے چھیڑتا ”چھپاتی کیوں ہو اس چور کو۔۔۔۔۔ میں کیا جانتا نہیں کہ یہ سب بناؤ سنگھار صرف تم نے اسی سو رکے بچے کے لیے کیا ہے۔“

جیناں ایک دم سنجیدہ ہو جاتی ”کیوں گالی دیتے ہو اپنے کو؟“
 کریم داو کی سیاہی مائل مونچھیں ہنسی سے تھر تھرا نے لگتیں ”کریم داو بہت بڑا
 سو رہے۔“

چھوٹی عید آئی۔ بڑی عید آئی۔ کریم داو نے یہ دونوں تہوار بڑے ٹھاٹ سے
 منائے۔ بڑی عید سے بارہ روز پہلے اس کے گاؤں پر بلوائیوں نے حملہ کیا تھا اور
 اس کا باپ رحیم داو اور جیناں کا بھائی فضل الہی قتل ہوئے تھے جیناں ان دونوں کی
 موت کو یاد کر کے بہت رونی تھی مگر کریم داو کی صدموں کو یاد رکھنے والی طبیعت کی
 موجودگی میں اتنا غم نہ کر سکی جتنا اسے اپنی طبیعت کے مطابق کرنا چاہیے تھا۔

جیناں کبھی سوچتی تھی تو اس کو بڑا تعجب ہوتا تھا کہ وہ اتنی جلدی اپنی زندگی کا اتنا
 بڑا صدمہ کیسے بھولتی جا رہی ہے۔ ماں باپ کی موت تو اس کو قطعاً نہیں تھی۔ فضل
 الہی اس سے چھ سال بڑا تھا۔ وہی اس کا باپ تھا وہی اس کی ماں اور وہی اس کا
 بھائی۔ جیناں اچھی طرح جانتی تھی کہ صرف اسی کی خاطر اس نے شادی نہیں کی اور
 یہ تو سارے گاؤں کو معلوم تھا کہ جیناں ہی کی عصمت بچانے کے لیے اس نے اپنی
 جان دی تھی۔ اس کی موت جیناں کی زندگی کا یقیناً بہت ہی بڑا حادثہ تھا۔ ایک
 قیامت تھی جو بڑی عید سے ٹھیک بارہ روز پہلے اس پر یکا یک ٹوٹ پڑی تھی۔ اب
 وہ اس کے بارے میں سوچتی تھی تو اس کو بڑی حیرت ہوتی تھی کہ وہ اس کے
 اثرات سے کتنی دور رہتی جا رہی ہے۔

محرم قریب آیا تو جیناں نے کریم داو سے اپنی پہلی فرمائش کا اظہار کیا کہ اسے
 تعزیے دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ اپنی سہیلیوں سے وہ ان کے متعلق بہت کچھ سن

چکی تھی۔ چنانچہ اس نے کریم داد سے کہا ”میں ٹھیک ہوئی تو لے چلو گے مجھے تعز یہ دکھانے؟“

کریم داد نے مسکرا کر جواب دیا ”تم ٹھیک نہ بھی ہوئیں تو بھی لے چلوں گا..... اس سور کے بچے کو بھی۔“

جیاں کو یہ گالی بہت ہی بری لگتی تھی چنانچہ وہ اکثر بگڑ جاتی تھی۔ مگر کریم داد کی گفتگو کا انداز کچھ ایسا پر خلوص تھا کہ جیہاں کی تلخی فوراً ہی ایک ناقابل بیان مٹھاس میں تبدیل ہو جاتی تھی اور وہ سوچتی تھی کہ سور کے بچے میں کتنا پیار کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔

ہندوستان اور پاکستان کی جنگ کی افواہیں ایک عرصے سے اڑ رہی تھیں۔ اصل میں تو پاکستان بنتے ہی یہ بات گویا ایک طور پر طے ہو گئی تھی کہ جنگ ہوگی۔ اور ضرور ہوگی۔ کب ہوگی اس کے متعلق گاؤں میں کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ کریم داد سے جب کوئی اس کے متعلق سوال کرتا تو وہ یہ مختصر سا جواب دیتا ”جب ہوئی ہوگی ہو جائے گی فضول سوچنے سے کیا فائدہ!“

جیہاں جب اس ہونے والی لڑائی بھڑائی کے متعلق سنتی تو اس کے اوسان خطا ہو جاتے تھے۔ وہ طبعاً بہت ہی امن پسند تھی۔ معمولی تو تو میں میں سے بھی سخت گھبراتی تھی۔ اس کے علاوہ گزشتہ بلووں میں اس نے کئی کشت و خون دیکھے تھے اور انہیں میں اس کا پیارا بھائی فضل الہی کام آیا تھا۔ بے حد سہم کروہ کریم داد سے اتنا کہتی ”کیسے کیا ہوگا؟“

کریم داد مسکرا دیتا ”مجھے کیا معلوم لڑکا ہو گا یا لڑکی؟“

یہ سن کر جیناں بہت ہی زچ ہوتی مگر فوراً ہی کریم داد کی دوسری باتوں می لگ کر ہونے والی جنگ کے متعلق سب کچھ بھول جاتی۔ کریم داد طاقتور تھا نہ رتھا جیناں سے اسکو بے حد محبت تھی۔ ہندو ق خریدنے کے بعد وہ جموڑے ہی عرصے میں نشا نے کا بہت پکا ہو گیا تھا۔ یہ سب باتیں جیناں کو حوصلہ دلاتی تھیں۔ مگر اس کے باوجود ترنجنوں میں جب وہ اپنی کسی خوف زدہ بھجولی سے جنگ کے بارے میں گاؤں کے آدمیوں کی اڑائی ہوئی ہو لٹاک افواہیں سنتی تو ایک دم سن سی ہو جاتی۔

بختو دائی جو ہر روز جیناں کو دیکھنے آتی تھی ایک دن یہ خبر لائی کہ ہندوستان والے دریابند کرنے والے ہیں۔ جیناں اس کا مطلب نہ سمجھی۔ وضاحت کے لیے اس نے بختو دائی سے پوچھا ”دریابند کرنے والے ہیں؟ یہ کون سے دریابند کرنے والے ہیں؟“

بختو دائی نے جواب دیا ”وہ جو ہمارے کھیتوں کو پانی دیتے ہیں۔“ جیناں نے کچھ دیر سوچا اور منس کر کہا ”موسیٰ کیا تم بھی پاگلوں کی سی باتیں کرتی ہو دور یا کون بند کر سکتا ہے وہ بھی کوئی موریایں ہیں۔“

بختو نے جیناں کے پیٹ پر ہولے ہولے مالش کرتے ہوئے کہا۔ ”بی بی مجھے معلوم نہیں جو کچھ میں نے سنا تھا تمہیں بتا دیا یہ بات اب تو اخباروں میں بھی آگئی ہے۔“

”کون سی بات؟“ جیناں کو یقین نہیں آتا تھا۔
بختو نے اپنے جھریوں والے ہاتھ سے جیناں کا پیٹ ٹٹولتے ہوئے کہا ”یہ

دریا بند کرنے والی، پھر اس نے جیناں کے پیٹ پر اس کی قمیص کھینچی اور اٹھ کر بڑے ماہرانہ انداز میں کہا ”اللہ خیر رکھے بچے آج سے پورے دس روز کے بعد ہو جانا چاہیے۔“

کریم داد گھر آیات سب سے پہلے جیناں نے اس سے دریاؤں کے متعلق پوچھا اس نے پہلے بات ٹالنی چاہی پر جب جیناں نے کئی بار اپنا سوال دہرایا تو کریم داد نے کہا ہاں کچھ ایسا ہی سنا ہے۔
جیناں نے پوچھا ”کیا؟“
”یہی کہ ہندوستان والے ہمارے دریا بند کر دیں گے۔“
”کیوں؟“

کریم داد نے جواب دیا کہ ہماری فصلیں تباہ ہو جائیں۔
یہ سن کر جیناں کو یقین ہو گیا کہ دریا بند کیے جاسکتے ہیں چنانچہ نہایت بے چارگی کے عالم میں اس نے صرف اتنا کہا ”کتنے ظالم ہیں یہ لوگ۔“
کریم داد اس دفعہ کچھ دیر کے بعد مسکرایا ”ہٹاؤ اس کو یہ بتاؤ موسیٰ بختو آئی تھی۔“

جیناں نے بے دلی سے جواب دیا..... ”آئی تھی۔“
”کیا کہتی تھی؟“
”کہتی تھی آج سے پورے دس روز کے بعد بچہ ہو جائے گا۔“
کریم داد نے زور کا غرہ لگایا ”زندہ ہاؤ۔“
جیناں نے اسے پسند نہ کیا اور بڑبڑائی ”تمہیں خوشی سو جیتی ہے جانے یہاں

کیسی بلا آنے والی ہے۔“

کریم داد چو پال چلا گیا۔ وہاں قریب قریب سب مرد جمع تھے چودھری نتھو کو گھیرے اس سے دریا بند کرنے والی خبر کے متعلق باتیں پوچھ رہے تھے۔ کوئی پنڈت نہرو کو پیٹ بھر کے گالیاں دے رہا تھا۔ کوئی بدو غائیں مانگ رہا تھا کوئی یہ ماننے ہی سے یکسر منکر تھا کہ دریاؤں کا رخ بدلا جاسکتا ہے۔

کچھ ایسے بھی تھے جن کا یہ خیال تھا کہ جو کچھ ہونے والا ہے وہ ہمارے گناہوں کی سزا ہے۔ اسے مٹانے کے لیے سب سے بہت طریقہ یہی ہے کہ مل کر مسجد میں دعا مانگی جائے۔

کریم داد ایک کونے میں بیٹھا خاموش سنتا رہا۔ ہندوستان والوں کو گالیاں دینے میں چودھری نتھو سب سے پیش پیش تھا۔ کریم داد کچھ اس طرح سے بار بار اپنی نشست بدل رہا تھا جیسے اسے بہت کوفت ہو رہی ہے۔ سب بیک زبان ہو کر یہ کہہ رہے تھے کہ دریا بند کرنا بہت ہی اوجھا ہتھیار ہے۔ انتہائی کمینہ پن ہے۔ رزالت ہے۔ عظیم ترین ظلم ہے۔ بدترین گناہ ہے یزید پن ہے۔

کریم داد دو تین مرتبہ اس طرح کھانا جیسے وہ کچھ کہنے کے لیے خود کو تیار کر رہا ہے۔ چودھری نتھو کے منہ سے جب ایک اور لہر موٹی موٹی گالیوں کی اٹھی تو کریم داد چیخ پڑا ”گالی نہ دے چودھری کسی کو۔“

ماں کی ایک بہت بڑی گالی چودھری نتھو کے حلق میں پھنسی کی پھنسی رہ گئی اس نے پلٹ کر ایک عجیب انداز سے کریم کی طرف دیکھا جو سر پر اپنا صاف ٹھیک کر رہا تھا ”کیا کہا؟“

کریم داو نے آہستہ مگر مضبوط آواز میں کہا ”میں نے کہا گالی نہ دے کسی کو۔“
 حلق میں پھنسی ہوئی ماں کی گالی بڑے زور سے باہر نکال کر چودھری نتھو نے
 بڑے تیکھے لہجے میں کریم داو سے کہا ”کسی کو؟ کیا کہتے ہیں وہ تمہارے؟“ اس کے
 بعد وہ چوپال میں جمع شدہ آدمیوں سے مخاطب ہوا ”سنا تم لوگوں نے..... کہتا ہے
 گالی نہ دے کسی کو..... پوچھو اس سے وہ کیا کہتے ہیں اس کے؟“
 کریم داو نے بڑے تحمل سے جواب دیا ”میرے کیا کہتے ہیں؟ میرے دشمن
 کہتے ہیں۔“

چودھری کے حلق سے پھٹا پھٹا سا قہقہہ بلند ہوا۔ اس قدر زور سے کہ اس کی
 مونچھوں کے بال کھڑکے۔ ”سنا تم لوگوں نے دشمن کہتے ہیں..... اور دشمن کو پیار
 کرنا چاہیے کیوں برخوردار۔“

کریم داو نے بڑے برخوردارانہ انداز میں جواب دیا ”نہیں چودھری.....
 میں یہ نہیں کہتا کہ پیار کرنا چاہیے۔ میں نے صرف یہ کہا ہے کہ گالی نہیں دینی
 چاہیے۔“

کریم داو کے ساتھ ہی اس کا لٹوٹا دوست میراں بخش بیٹھا تھا۔ اس نے
 پوچھا ”کیوں؟“

کریم داو صرف میراں بخش سے مخاطب ہوا ”کیا فائدہ ہے یار..... وہ پانی بند
 کر کے تمہاری زمینوں کو بخر بنانا چاہتے ہیں۔ اور تم انہیں گالی دے کر یہ سمجھتے ہو کہ
 حساب بے باق ہوا۔ یہ کہاں کی عقل مندی ہے۔ گالی تو اس وقت دی جاتی ہے
 جب اور کوئی جواب پاس نہ ہو۔“

میراں بخش نے پوچھا ”تمہارے پاس کوئی جواب موجود ہے؟“
 کریم داد نے تھوڑے توقف کے بعد کہا ”سوال میرا نہیں ہزاروں اور انہوں
 آدمیوں کا ہے۔ اکیلا میرا جواب سب کا جواب نہیں ہو سکتا..... ایسے معاملوں میں
 سوچ سمجھ کر ہی کوئی پختہ جواب تیار کیا جاسکتا ہے..... وہ ایک دن میں دریاؤں کا
 رخ نہیں بدل سکتے۔ سال لگیں گے لیکن یہاں تو تم لوگ گالیاں دے کر ایک منٹ
 میں اپنی بھڑاس نکال باہر کر رہے ہو۔“ پھر اس نے میراں بخش کے کاندھے پر
 ہاتھ رکھا اور بڑے خلوص کے ساتھ کہا ”میں تو اتنا جانتا ہوں یا رکہ ہندوستان کو
 کمینہ رذیل اور ظالم کہنا بھی غلط ہے۔“

میراں بخش کی بجائے چودھری نتھو چلایا ”لو اور سنو۔“
 کریم داد میراں بخش ہی سب سے مخاطب رہا ”دشمن سے میرے بھائی رحم و
 کرم کی توقع رکھنا بے وقوفی ہے۔ لڑائی شروع ہو اور یہ رونا رویا جائے کہ دشمن
 بڑے بڑے رانٹیں استعمال کر رہا ہے ہم چھوٹے ہم گراتے ہیں وہ بڑے گراتا
 ہے۔ تم اپنے ایمان سے کہو یہ شکایت بھی کوئی شکایت ہے چھوٹا چاقو بھی مارنے
 کے لیے استعمال ہوتا ہے اور بڑا چاقو بھی..... کیا میں جھوٹ کہتا ہوں۔“
 میراں بخش کی بجائے چودھری نتھو نے سوچنا شروع کیا۔ مگر فوراً ہی جھنجھلا گیا۔
 ”لیکن سوال یہ ہے کہ وہ پانی بند کر رہے ہیں..... ہمیں بھوکا پیاسا مارنا چاہتے
 ہیں۔“

کریم داد نے میراں بخش کے کاندھے سے اپنا ہاتھ تلخہ کیا اور چودھری نتھو
 سے مخاطب ہوا ”چودھری جب کسی کو دشمن کہہ دیا تو پھر یہ گلہ کیسا کہ وہ ہمیں بھوکا

پیا سامارنا چاہتا ہے۔ وہ تمہیں بھوکا پیا سانئیں مارے گا۔ تمہاری ہری بھری زمینیں
ویران اور خجڑ نہیں بنائے گا تو کیا وہ تمہارے لیے پٹاؤ کی دیکیں اور شربت کے منگے
وہاں سے نیچے گا تمہاری سیر تفریح کے لیے یہاں باغ نیچے لگائے گا۔“

چودھری تھو بھٹا گیا۔ ”یہ تو کیا بکواس کر رہا ہے؟“

میراں بخش نے ہولے سے کریم داد سے پوچھا ”ہاں یا رے کیا بکواس ہے؟“
”بکواس نہیں ہے میراں بخشا“، کریم داد نے سمجھانے کے انداز میں میراں
بخش سے کہا ”تو ذرا سوچ تو سہی کہ لڑائی میں دونوں فریق ایک دوسرے کو
پچھاڑنے کے لیے کیا کچھ نہیں کرتے پہلوان جب لٹکر لگتے کس کے اکھاڑے
میں اتر آئے تو اسے ہر داؤ استعمال کرنے کا حق ہوتا ہے۔“
میراں بخش نے اپنا گھٹا ہوا سر ہلایا ”یہ تو ٹھیک ہے۔“
کریم داد مسکرایا ”تو پھر دریا بند کرنا بھی ٹھیک ہے۔ ہمارے لیے یہ قلم ہے مگر
ان کے لیے روا ہے۔“

”روا کیا ہے..... جب تیری جیب پیاس کے مارے لٹک کر زمین تک آ
جائے گی تو میں پھر پوچھوں گا کہ ظلم روا ہے یا ناروا..... جب تیرے بال بچے اناج
کے ایک ایک دانے کو ترسیں گے تو پھر بھی یہی کہنا کہ دریا بند کرنا بالکل ٹھیک تھا۔“
کریم داد نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور کہا ”میں جب بھی یہی
کہوں گا چودھری..... تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ صرف ہو ہمارا دشمن نہیں ہے کیا
ہم اس کے دشمن نہیں۔ اگر ہمارے اختیار میں ہوتا تو ہم نے بھی اس کا دانہ پانی بند
کیا ہوتا..... لیکن اب کہ وہ کر سکتا ہے اور کرنے والا ہے تو ہم ضرور اس کا کوئی توڑ

سوچیں گے..... بیکار گالیاں دینے سے کیا ہوتا ہے..... دشمن تمہارے لیے دودھ کی نہریں جاری نہیں کرے گا چودھری تھو..... اس سے ہو سکا تو وہ تمہارے پانی کی ہر لونڈ میں زہر ملا دے گا تم اسے قلم کہو گے وحشیانہ پن کہو گے اس لیے کہ مارنے کا یہ طریقہ تمہیں پسند نہیں..... عجیب سی بات ہے کہ لڑائی شروع کرنے سے پہلے دشمن سے نکاح کی سی شرطیں پڑھوائی جائیں..... اس سے کہا جائے کہ دیکھو مجھے بھوکا پیاسا نہ مارنا بندوق سے اور وہ بھی اتنے بوری بندوق سے البتہ تم مجھے شوق سے ہلاک کر سکتے ہو۔ اصل بکواس تو یہ ہے..... ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو۔“

چودھری تھو جھنجھلاہٹ کی آخری حد تک پہنچ گیا ”برف لا کے رکھ میرے دل پر۔“

”یہ بھی میں ہی لاؤں“ یہ کہہ کر کریم داد ہنسا۔ میاں بخش کے کاندھے پر تھکی دے کراٹھا اور چوپال سے چلا گیا۔

گھر کی ڈیوڑھی میں داخل ہو ہی رہا تھا کہ اندر سے بختو دائی نکلی۔ کریم داد کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر پو پو ملی مسکراہٹ پیدا ہوئی.....

مبارک ہو کیے چاند سا بیٹا ہوا ہے اب کوئی اچھا سا نام سوچ اس کا۔“

”نام؟“ کریم داد نے ایک لمحوں کے لیے سوچا ”یزید..... یزید!“

بختو دائی کامنہ حیرت سے کھٹاکا کھٹا رہ گیا۔ کریم داد نے لگاتار گھر میں داخل ہوا۔ جیناں چار پانی پر لیٹی تھی۔ پہلے سے کسی قدر زرد اس کے پہلو میں ایک گل گوتھنا سا بچہ چڑچڑاہٹا اٹھوٹھا چوس رہا تھا۔ کریم داد نے اس کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھا اور اس کے گل کو ایک انگلی سے چھیڑتے ہوئے کہا ”اوئے

میرے یزید!“

جیناں کے منہ سے ہلکی سی متعجب چیخ نکلی ”یزید؟“

کریم داد نے غور سے اپنے بیٹے کا ناک نقشہ دیکھتے ہوئے کہا ”ہاں یزید.....“

یہ اس کا نام ہے۔“

جیناں کی آواز بہت نحیف ہو گئی ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو کیسے..... یزید؟“

کریم داد مسکرایا ”کیا ہے اس میں؟ نام ہی تو ہے؟“

جیناں صرف اس قدر کہہ سکی ”مگر کس کا نام؟“

کریم داد نے سنجیدگی سے جواب دیا ”ضروری نہیں کہ یہ بھی وہی یزید ہو.....“

اس نے دریا کا پانی بند کیا تھا..... یہ کھولے گا!“

۱۱۳ اکتوبر ۱۹۵۱ء

☆☆☆

